حسن بن صباح، اس کے باطنی فدائیوں اور مصنوعی بہشت کی پُراسرار داستان
فردوسِ ابلیس
عنایت اللہ

فردوسِ ابلیس

پہلا حصہ

حسن بن صباح اور اُس کی بہشت کی پُراسرار داستان

عنایت اللہ

خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اُردو بازار لاہور ۷۳۱۶۹

پیش لفظ

حسن بن صباح ایک ایسا نام ہے جس سے شاید ہی کوئی مسلمان ناواقف ہو گا۔ یہ نام ذہن میں آتا ہے تو وہ بہشت (جنّتِ ارضی) لازماً یاد آتی ہے جو حسن بن صباح نے وادی الموت میں بنائی تھی۔ ایک بار جو اس بہشت میں داخل ہو گیا وہ اپنے دین و ایمان کو، اپنے ماں باپ اور بچّوں کو، دنیا کو اور اللہ کو بھی بھول گیا۔ اس نے حسن بن صباح کو اپنا باپ اور اپنا خدا مان لیا۔

حسن بن صباح نے اسے کہا کہ اپنے خنجر سے اپنا پیٹ چاک کر دو پھر تم ہمیشہ ایسی بہشت میں رہو گے جو اس بہشت سے زیادہ دلنشین اور سحرانگیز ہو گی ... اس "بہشتی" نے پلک جھپکتے خنجر نکالا اور اپنا پیٹ چاک کر لیا۔ کسی سے کہا کہ اس محل کی چھت پر چڑھ جاؤ اور اپنے آپ کو سر کے بل زمین پر گراؤ .... اس شخص نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور اتنی بلند چھت سے سر کے بل کُود کر جان دے دی۔

یہ تھے حسن بن صباح کے فدائین جو اپنی جان دینے یا کسی دوسرے کی جان لینے کو یوں سمجھتے تھے جیسے پانی کا گھونٹ پی لیا۔ تاریخ کو لرزہ براندام کر دینے والی اس داستان میں آپ کو ایسے ہی چند ایک واقعات ملیں گے جن کی تاریخ گواہی دیتی ہے۔

اس بہشت کی حقیقت کیا تھی؟ .... میں نے اس سوال کا جواب اتنی تفصیل سے پیش کیا ہے کہ یہ دو جلدوں پر پھیل گیا ہے۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا، مؤرخوں اور بعد کے مستند تاریخ نویسوں، وقائع نگاروں اور مبصّروں

کے حوالوں سے بات کی ہے۔ یہ افسانے یا من گھڑت قصے ہیں۔ کسی دانشمند نے بالکل درست کہا ہے کہ حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔

اس تاریخی داستان میں ایسی دلچسپیاں ملیں گے جو آپ کو حیرت زدہ بھی کریں گی' آپ کی جذباتی دنیا کو زلزلے جیسے جھٹکوں سے ہلا ڈالیں گی پھر آپ سوچوں میں کھو جائیں گے کہ یہ سب ہوا کیسے؟ یقین نہیں آتا کہ صرف ایک انسان نے لوگوں کے دلوں میں اپنی ایسی عقیدت پیدا کر لی کہ لوگوں نے اپنے ہوش و حواس بھی اس کے حوالے کر دیئے اور دنیا سے لاتعلق ہو کر اسی کے ہو کے رہ گئے۔

حیران ہونے والی کوئی بات نہیں' حسن بن صباح نے انسان کی فطری کمزوریوں کو ابھارا' انسانی فطرت کی دکھتی رگوں کو مٹھی میں لیا اور انہیں ہپناٹائز کر لیا۔ اُس دور میں علمِ نفسیات کا وجود نہیں تھا۔ آج کی ہپناٹزم سے بھی کوئی واقف نہیں تھا لیکن انسان اپنی تمام تر نفسیاتی کمزوریوں کے ساتھ موجود تھا۔ اسے گمراہ کرنے والے اپنی اہلیت کے ساتھ موجود تھے۔

حضرت آدمؑ جو انسانی زندگی کے پہلے انسان تھے ابلیس کے فریب میں آ کر جنت سے نکالے گئے اور زمین پر پھینکے گئے تھے۔ میں نے اس داستان کو عنوان دیا ہے ــــ "فردوس ابلیس" ــــ کیونکہ حسن بن صباح نے جو بہشت بنائی تھی وہ اس کے ابلیسی ذہن کی تخلیق تھی۔

یہ کہنا غلط نہیں کہ حسن بن صباح جیسا ماہر نفسیات اور ہپناسٹ تاریخ نے نہ کبھی پہلے دیکھا تھا نہ اس کے بعد۔ اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبروں نے لوگوں کو انسانی عظمت کی راہ پر ڈالا تھا لیکن حسن بن صباح نے اپنے پیروکاروں کو انسانیت کی راہ سے ہٹا کر ابلیسیت کی راہ پر ڈال دیا۔

اس کی بہشت کی اصل حقیقت حشیش میں پوشیدہ تھی۔ حشیش کو عام فہم زبان میں بھنگ کہا گیا ہے لیکن یہ بھنگ سے ملتا جلتا ایک پودا تھا جس کا نشہ بھی بھنگ سے ملتا جلتا تھا مگر اثرات بھنگ سے زیادہ اور کچھ مختلف تھے۔ ان سے انسان بڑے ہی حسین تصورات دیکھتا اور انہیں حقیقت سمجھتا تھا۔

اس نشے کے ساتھ حسین و جمیل لڑکیاں فردوس ابلیس کو مکمل کر دیتی تھیں۔ ان لڑکیوں کو خصوصی ٹریننگ دی ہوئی تھی۔ یہی انسان کی وہ کمزوریاں ہیں جو اسے اللہ کی جنت سے نکلوا کر ابلیس کی بہشت میں پہنچا دیتی ہیں.... عورت' نشہ' حقائق سے فرار اور لذت پرستی!

حسن بن صباح سلجوقیوں کے دورِ حکومت میں اُٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے عروج تک جا پہنچا۔ سلجوقی اسلام کے شیدائی' اسلام کی عسکری روایات کے رکھوالے اور مردانِ حُر تھے۔ ایک سلجوقی حکمران نے حسن بن صباح کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن یہ شخص قبل از وقت پتہ چل جانے سے فرار ہو گیا پھر کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ وہ کہاں گیا' کدھر ڈوبا' کدھر نکلا' یہ بڑی ہی دلچسپ اور سنسنی خیز واقعات سے بھرپور داستان ہے جو میں اس کتاب میں پیش کر رہا ہوں۔

فردوسِ ابلیس کے اس خالق نے ایک جنگجو لشکر تیار کر لیا تھا۔ چند ایک قلعوں اور میدانوں میں اس لشکر کی سلجوقی مسلمانوں کے ساتھ خونریز لڑائیاں ہوئیں مگر حسن بن صباح کی شاطرانہ اور زمین دوز کارروائیوں نے مسلمانوں کے قدم کسی بھی میدانِ جنگ میں جمنے نہ دیئے۔

حسن بن صباح کے پیروکاروں' خصوصاً" اس کے فدائیوں کو حشیشین کہا جاتا تھا کیونکہ وہ حشیش کے نشے میں اپنی تمام پُراسرار کارروائیاں کرتے تھے۔ پھر انہوں نے بڑی بڑی شخصیات کو قتل کرنے میں خصوصی شہرت حاصل کی تھی۔ انہوں نے صلاح الدین ایوبی پر چار قاتلانہ حملے کیے تھے۔ غالباً" ایوبی واحد شخصیت تھی جسے حشیشین قتل کرنے میں ناکام رہے ورنہ ان کے ہاتھوں کوئی زندہ نہیں رہتا تھا۔ اس داستان میں آپ کو یہ تفصیلات بھی ملیں گی کہ انہوں نے کیسی کیسی شخصیات کو کیسے کیسے طریقوں سے قتل کیا۔

تاریخ کی ایک مشہور و معروف شخصیت نظام الملک جو بہت بڑا عالم دین اور دانشور تھا' عمرِ خیام اور حسن بن صباح ایک ہی مدرسے میں پڑھتے تھے اور گہرے

دوست بن گئے تھے۔ آگے چل کر تینوں کے راستے جدا ہو گئے۔ نظام الملک سلجوقی حکومت کا وزیرِ اعظم بنا اور حسن بن صباح کو نوکری دلوائی لیکن ایک وقت آیا کہ حسن بن صباح نے نظام الملک کو قتل کروا دیا۔ یہ اس داستان کا ایک خاص حصہ ہے جو آپ کو قدم بہ قدم پر چونکا دے گا۔

یہ تمام سنسنی خیز اور فکر انگیز تفصیلات تو آپ اس داستان میں پڑھیں گے ہی' یہاں اتنا سا اور کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ حسن بن صباح کی موت کے بعد اس کے فدائین پیشہ ور قاتل بن گئے تھے۔ جنہیں آگے چل کر عیسائیوں نے بھی اُجرت پر استعمال کیا تھا اسی لئے انگریزی بولنے والی قوموں نے حشیشین کی بجائے ان کا نام ASSASSINS رکھ دیا تھا۔ انگریزی میں آج تک انہیں اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ بھی بتا دوں کہ حسن بن صباح کے فدائی ابھی موجود ہیں۔ میری یہ کہانی جب "حکایت" میں بالاقساط چل رہی تھی تو اس دوران مجھے چار خط ملے۔ لکھنے والوں نے مجھے بہت کوسا کہ میں ایک نبی کی توہین کر رہا ہوں اور جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں یہ سب تعصب کا مظاہرہ ہے۔ ایک صاحب نے کچھ گالیاں بھی لکھی تھیں لیکن گلگت کے ایک صاحب نے اپنے خط میں لکھا ––– "آپ اپنی یہ بکواس بند کر دیں' میں آپ کو وارننگ دیتا ہوں کہ حسن بن صباح کے فدائی اب بھی موجود ہیں جو کسی بھی وقت آپ تک پہنچ سکتے ہیں"۔

میں نے ایک دو نہیں' کم و بیش ایک درجن مستند تاریخ نویسوں کی تحریریں پڑھ کر یہ داستان مکمل کی ہے۔ ان میں تین یورپی مؤرخ بھی شامل ہیں۔ بہرحال کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے' پڑھیں اور اپنی رائے خود قائم کریں۔ میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ یہ کتاب آپ نے شروع کر دی تو ختم کر کے ہی اُٹھیں گے۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

اولادِ آدم کی داستانِ حیات اتنی ہی طویل ہے جتنی لمبی لمبی صدیاں گذر گئی ہیں۔

انسان اتنے لمبے اور ایسے کٹھن سفر میں اکیلا نہیں تھا۔ ابلیس اس کا ہمسفر رہا۔۔۔ آخری منزل تک ہمسفر رہے گا۔۔۔ اس کا نتیجہ یہ کہ اولادِ آدم کی زندگی کی کہانی سزا و جزا کی داستان بن گئی ہے مگر عجوبہ یہ کہ انسان اپنی ہی آپ بیتی پر نگاہ ڈالتا ہے تو محوِ حیرت ہو جاتا ہے' عبرت حاصل نہیں کرتا' شرمسار نہیں ہوتا بلکہ خود فریبی سے اپنا دل پرچا لیتا ہے' اور اُس ابلیس کے آگے سجدہ ریز ہو جاتا ہے جس نے اللہ کے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا تھا کہ آدم کے آگے سربسجدہ ہو جا۔

کہانی کوئی بھی ہو' کسی کی بھی ہو' اسی صورت میں دلچسپ' سنسنی خیز' عبرتناک اور خیال افروز بنتی ہے جب اس کہانی کے کردار اللہ والے ہوں سوائے ایک دو کے جو ابلیس کے پجاری ہوں۔ اگر ابلیس اللہ کا حکم مان لیتا اور آدم کے آگے سجدے میں گر پڑتا تو بات اللہ کی عظمت اور بندوں کی بندگی پر اور عابد و معبود تک ہی رہ جاتی۔

اللہ نے نیک اور پارسا بندوں سے جنت کا وعدہ کیا ہے۔

ابلیس نے بندوں کو بدی کے راستے پر ڈال کر انہیں دنیا میں جنت دکھا دی ہے۔

اور یہی ہے وہ ابلیس کی جنت جس نے اولادِ آدم کی سوانح حیات میں قوسِ قزح جیسے رنگ بھرے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ابلیس نے اپنے پجاریوں کے لئے جو بھی جنت بنائی اور اسے بڑے ہی دلنشیں رنگ دیئے' وہ کچھ عرصے بعد صرف ایک رنگ میں روپوش ہو گئی۔۔۔ یہ رنگ خون کا تھا۔

شداد حضرت موسیٰؑ کے دور کے لگ بھگ ایک ملک کا حکمران تھا۔ مورخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ صحیح طور پر وہ کس دور کا بادشاہ تھا۔ جب بھی تھا' جہاں بھی تھا' اس میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس حقیقت پر سب مؤرخ متفق ہیں کہ شداد کے مزاجِ شاہی میں فرعونیت تھی' اس کا طرزِ حکومت فرعونوں جیسا تھا۔ رعایا کو وہ اُس کے بندے نہیں سمجھتا تھا جس نے انہیں پیدا کیا تھا بلکہ وہ انہیں اپنا غلام اور اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ درندہ صفت بادشاہ تھا۔

مقہور و مجبور رعایا نے جب اس کے آگے سجدے کرنے شروع کر دیئے تو اس نے خدائی کا دعویٰ کر دیا اور بھوکی ننگی رعایا نے اسے خدا مان لیا۔ وہ معبود بن گیا۔

وہ خدا ہی کیا جس کے پاس جنت نہ ہو۔ شداد نے ایک جنت بنائی جو آج تک باغِ ارم کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں اس نے جنت کی تمام تر رنگینیاں اور رعنائیاں سمو ڈالیں۔ اس جنت میں اس نے حوروں کو بھی لا بسایا۔ یہ حسین اور نوجوان لڑکیاں تھیں۔ شراب کے مٹکے رکھوا دیئے اور ابلیسیت کے تمام تر دلنشیں'

رنگ و رب اور سحر انگیز اہتمام کیے۔

جنّت مکمل ہو چکی تو شدّاد اپنی جنّت دیکھنے کے لئے گیا مگر جنّت کے صدر دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ تیورا کر گرا اور مر گیا۔

"خدا" کو اپنی جنّت میں قدم رکھنا بھی نصیب نہ ہُوا۔

روایت ہے کہ اللہ بزرگ و برتر نے فرشتۂ اجل سے پوچھا کیا کبھی تجھے کسی جسم سے روح نکالتے وقت افسوس بھی ہُوا ہے؟

"ہاں اے پروردگارِ عالم!" ——— فرشتۂ اجل نے جواب دیا ——— "دو بار ... ایک بار ایک جہاز سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ مسافروں میں سے صرف ایک ماں زندہ بچ نکلی تھی جس کی گود میں دو تین ماہ عمر کا بچہ تھا۔ وہ بچے کو بھی زندہ نکال لائی تھی.... باری تعالیٰ! آپ نے حکم دیا کہ اس عورت کی روح نکال لاؤ۔ مجھے بہت دکھ ہُوا کہ ماں زندہ نہ رہی تو بچے کا کیا بنے گا لیکن خدائے بزرگ و برتر! موت و حیات آپ کے اختیار میں ہے۔ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی"۔

"اور دوسری بار؟"

"اے پروردگارِ عالم!" ——— فرشتۂ اجل نے کہا ——— "شدّاد علو ایک بادشاہ تھا۔ اُس نے بڑی محنت سے جنّت بنائی تھی۔ اس پر خزانے لُٹا دیے تھے۔ اس کی تکمیل میں اُس کی عمر کا ایک حصہ گذر گیا تھا۔ اُس نے اپنی جنّت کی تعمیر اُس وقت شروع کی تھی جب جوان تھا۔ تکمیل اُس وقت ہوئی جب جوانی گذر گئی تھی۔ وہ اپنی جنّت کو دیکھنے گیا تو آپ نے حکم دیا کہ یہ شخص اپنی بنائی ہوئی جنّت میں داخل ہونے لگے تو اس کی روح نکال لاؤ....

"میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی، اپنا فرض ادا کیا لیکن میرا دل رنج و ملال میں مبتلا ہو گیا کہ یہ شخص اپنی بنائی ہوئی جنّت میں قدم بھی نہ رکھ سکا کہ اس کا بے روح جسم جنّت کے دروازے میں گر پڑا لیکن اے خالقِ کائنات! میں چون و چرا نہیں کر سکتا"۔

"جانتے ہو یہ شدّاد کون تھا؟" ——— باری تعالیٰ نے پوچھا اور خود ہی جواب دیا ——— "یہ وہی بچہ تھا جسے ماں سمندر میں سے زندہ نکال لائی تھی اور میں نے تجھے کہا تھا کہ اس کی ماں کی روح نکال لاؤ"۔

"یَاحیُّ یَاقَیّوُمُ یَامُمِیتُ!" ——— فرشتۂ اجل نے رکوع میں جا کر کہا ——— "بے شک آپ ہمیشہ زندہ رہنے والے، زندگی اور موت دینے والے ہیں"۔

پھر تاریخوں میں ایک اور جنّت کا ذکر ملتا ہے جو شدّاد کے باغِ ارم جیسی پرانی بات نہیں بلکہ کل کی بات لگتی ہے۔ پانچویں صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) کو تاریخ پرانی بات نہیں کہتی۔ تاریخ میں سال لمحوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ ابلیس کے حکم سے بنائی ہوئی دوسری ارضی جنّت تھی جس کا خالق حسن بن صباح تھا۔ اس نے خدائی کا دعویٰ تو نہیں کیا تھا لیکن بلا خوفِ تردید یہ دعویٰ کرتا تھا کہ خداوند تعالیٰ اس پر وحی نازل کرتا ہے اور براہِ راست احکام دیتا ہے۔

اس کے بنائے ہوئے فرقے کے پیروکار آج بھی موجود ہیں۔ حسن بن صباح نے ابلیس کی حکومت قائم کر دی تھی۔ اس نے جو فرقہ بنایا تھا وہ انتہائی خوفناک سازشوں، زعماء کے قتل اور بے حد شرمناک اور ہولناک گناہوں کی وجہ سے مشہور ہُوا۔ اس فرقے کی بنیاد ہی بدی پر رکھی گئی تھی۔

جتنی بھیانک وارداتیں حسن بن صباح نے کرائیں وہ سن کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حسین اور نوجوان لڑکیوں کا جو استعمال حسن بن صباح نے کیا، وہ اس سے پہلے یا بعد کے ادوار میں کبھی نہیں ہُوا .... اور اولادِ آدم اور ابلیس کی جو پُراسرار، سنسنی خیز اور فکر انگیز کہانیاں اس دَور میں ملتی ہیں وہ کسی اور دَور میں نہیں ملتیں۔

بھنگ جسے حشیش کہتے ہیں، اس فرقے کی روحانی غذا تھی۔ اس فرقے کی کامیابی کا راز بھنگ میں تھا۔ حسن بن صباح کی جنّت میں دو ہی تو چیزیں تھیں جو انسان کو ابلیس کا چیلا نہیں بلکہ مکمل ابلیس بنا دیتی تھیں۔ یہ چیزیں تھیں حشیش اور حوریں۔ اس جنّت میں حیران کن حد تک خوبصورت اور نوخیز لڑکیاں رکھی جاتی تھیں۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ حُوریں ان سے زیادہ کیا خوبصورت ہوں گی۔

نشہ شراب کا ہو خواہ حشیش کا، چرس کا ہو خواہ ہیروئن کا، اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسے اُم الخبائث کہا ہے۔ اس میں نسوانی حسن اور جنّت کا نشہ شامل ہو جائے تو انسان خود خباثت کا چلتا پھرتا مجسمہ بن جاتا ہے۔

اولادِ آدم جب راہِ حیات کے اس موڑ پر آئی جہاں حسن بن صباح نے جنّت بنائی تھی تو اسے ابلیس کے قہقہے سنائی دینے لگے۔ یہاں سے ایسے قصوں اور کہانیوں نے جنم لیا جو آج بھی سنو تو دل پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ کبھی شک ہوتا ہے کہ یہ واقعات صداقت کے پیمانے پر پورے نہیں اُترتے لیکن یہ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل تک سچے ہیں۔

اعمالِ صالح کہانی نہیں بنا کرتے۔ کہانیاں اعمالِ بد کی کوکھ سے جنم لیا کرتی ہیں۔

یہ کوئی کہانی نہیں ہوتی کہ ایک انسان نے ایک پیاسے کو پانی پلایا۔ کہانی اس سے بنتی ہے کہ ایک انسان نے ایک انسان کا خون پی لیا۔

پانی کا پیاسا کسی کہانی کا کردار نہیں بنا کرتا۔ کہانی اُس انسان سے بنتی ہے جو انسان کے خون کا پیاسا ہو۔

آج داستان گو آپ کے لئے اُس دور کی داستانیں لے کر آیا ہے جو سلجوقیوں کا دورِ حکومت تھا۔ خلافت بغداد کی چولیں ڈھیلی ہو گئی تھیں۔ اسلام کا پرچم یوں پھڑپھڑا رہا تھا جیسے شمع بجھنے سے پہلے ٹمٹمایا کرتی ہے۔ طوائف الملوکی اسلام کے تار و پود بکھیر رہی تھی۔ اہلِ صلیب پرچم ستارہ و ہلال کو ہمیشہ کے لئے گرا دینے کو

طوفان کی طرح بڑھے آرہے تھے۔

اللہ نے اپنے دین کو ہر دور میں سنبھالا اور سہارا دینے کا سبب پیدا کیا ہے۔ اس پُر آشوب دور میں جب خلفاء ہوسِ اقتدار سے دیوانے ہو کر اپنے فرائض کو بھلا بیٹھے تھے اور مسلمانوں کی عسکری قوت خلفاء کی عدم توجہی اور شاہانہ طرزِ بود و باش کی وجہ سے کمزور ہوتی چلی جا رہی تھی' اللہ نے سلجوقیوں کو بھیجا۔ ان ترک جنگجوؤں نے آکر اسلام کے گرتے ہوئے پرچم کو تھاما' دین کی بنیادیں مستحکم کیں' طوائف الملوکی کا خاتمہ کیا' فوج میں عسکری روح بیدار کی اور اہلِ صلیب کے لشکروں کے آگے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کھڑی کر دی۔

اس دور میں فرقہ باطنیہ نے سر اٹھایا اور حسن بن صباح ابلیس کے روپ میں سامنے آیا اور جسدِ اسلام کا کینسر بن گیا۔

حسن بن صباح آیا کہاں سے تھا؟

○

تھوڑا سا ذکر سلجوقیوں کا بھی ہو جائے تاکہ داستان گو کی بات سمجھنے میں آسانی رہے۔ ان کا دورِ حکومت اسلام کے عروج اور عظمت و اقبال کا زمانہ تھا۔ سلجوقی ایک غیر مسلم تُرک جنگجو سلجوق بن یکاک کی نسل سے تھے۔ سلجوق تُرکستان کے خانِ اعظم کے ہاں ملازم تھا۔ یہ لوگ فطرتاً" جنگجو تھے۔

اللہ نے اس غیر مسلم خاندان کو اسلام کی بقا' سلطنتِ اسلامیہ کی سلامتی اور توسیع اور دین کے فروغ کی سعادت عطا کرنی تھی۔ اس کا سبب یوں بنا کہ سلجوق بن یکاک نے خانِ ترکستان کی ملازمت چھوڑ دی اور اپنے خاندان کے ساتھ بخارا چلا گیا۔ اس کا قبیلہ بھی اس کے ساتھ ہی ہجرت کر گیا کیونکہ اس میں کچھ ایسے اوصاف تھے کہ قبیلہ اسے اپنا پیر و مرشد مانتا تھا۔

سلجوق اپنے اوصاف اور صلاحیتوں کو کسی بہتر اور عظیم مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ وہ یقیناً" کسی ایسے عقیدے اور ایسے مذہب کی تلاش میں تھا جو فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہو۔ بخارا میں وہ اسلام سے متعارف ہُوا تو اس نے بلا پس و پیش اسلام قبول کر لیا اور اپنے خاندان اور قبیلے کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے روشناس کرا کے کہا کہ وہ سب مسلمان ہو جائیں۔ وہ تو حکم کے منتظر تھے۔ پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔

یہ ایک معجزہ تھا۔ "کُنْ فَیَکُوْن" کا مظاہرہ تھا۔ آلِ سلجوق تو ترکستان میں وحشی' جنگلی اور تہذیب و تمدن سے بے بہرہ مشہور تھے۔ جنگجو ایسے کہ ان کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا لیکن اللہ نے انہی سے اپنے دین کا تحفظ کرانا تھا۔ سلجوق صرف مسلمان ہی نہ ہوئے بلکہ اسلام کو سربلند کرنے کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی۔

یہ ایک اور داستان ہے کہ سلجوقیوں نے سلطنتِ اسلامیہ کی عنان کس طرح اپنے ہاتھ میں لی۔ مختصر یہ کہ غیر مہذب اور آوارہ گرد تُرک تہذیب اور شائستگی کے پیکر بن گئے۔ تعلیم سے بے بہرہ سلجوقیوں نے عالموں

اور فاضلوں کو دربار میں اکٹھا کر کے ان کی پذیرائی کی۔ ان کی خانہ بدوش ذہنیت مدنیت کے رنگ میں رنگی گئی۔

یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ دینِ اسلام کا اور توحید و رسالت کا محافظ و ناصر خود اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔ اس کی ذاتِ باری نے جس طرح عرب کے بوریا نشینوں' صحرا نوردوں' گناہوں اور جاہلیت میں ڈوبے ہوئے بندوں کو رسالت اور اپنے دین سے نوازا تھا' اسی طرح پسماندہ ترکوں کو اعزاز بخشا کہ انہیں عسکری قوت اور کردار کی عظمت عطا کی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایران' عراق' شام' الجزیرہ اور ایشیائے کوچک پر چھا گئے۔ ان کے سامنے جو بھی اسلام دشمن طاقت آئی اُسے کچل اور مسل کر ختم کر دیا۔

بنیادی تبدیلی تو یہ آئی کہ خلافتِ عباسیہ کے کردار کی کمزوریوں نے سلطنت میں جو طوائف الملوکی پیدا کر دی تھی اس کا قلع قمع ہو گیا۔ سلجوقیوں نے اس کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک بادشاہی قائم کر دی اور افغانستان سے بحیرۂ روم تک کا علاقہ ایک سلطنت بن گیا اور یہ سلطنتِ اسلامیہ تھی۔

بادشاہت کا نظامِ حکومت اسلام کے منافی ہے لیکن سلجوقیوں نے سلطنت کو ایک مرکز کے تحت لانے کے لئے بادشاہت کا نظام اپنایا تھا۔ اس کے نتیجے میں یہ فائدہ حاصل ہُوا کہ سلطنت میں جو انتشار اور عدم اتحاد پیدا ہو گیا تھا وہ یک جہتی اور قومی اتحاد میں بدل گیا۔

پھر ان سلجوقیوں نے یورپ کے اہلِ صلیب کی یلغار کو یوں قہر و غضب سے روکا کہ انہیں بار بار حملے کرنے کے قابل نہ چھوڑا۔

سلجوق بن یکاک کی حکومت اس کے پوتوں طغرل بیگ سلجوقی اور چغرا بیگ سلجوقی تک پہنچی۔ بادشاہوں کے خاندانوں میں یہ روایت لازمی طور پر چلتی رہی ہے کہ سگے بھائی تخت نشینی پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے تھے۔ اگر کوئی بہن ہوتی تو وہ الگ سازشیں کرتی تھی۔ محلاتی سازشیں شاہی خاندانوں میں لازمی سمجھی جاتی تھیں لیکن سلاطینِ آلِ سلجوق آپس میں عناد رکھنے کو گناہ سمجھتے تھے۔

طغرل بیگ اور چغرا بیگ سگے بھائی تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ان کا آپس میں پیار تھا کہ تخت کا وارث بڑا بھائی تھا لیکن بڑے نے چھوٹے بھائی کو اقتدار میں اپنے ساتھ رکھا اور دو دارالسلطنت بنا دیئے۔ چغرا بیگ کے لئے ترکستان کا مَرو اور خراسان کا شہر نیشاپور جو طغرل بیگ کا دارالسلطنت تھا۔ اس طرح بھائیوں میں پیار اور اتحاد بھی قائم رہا اور سلطنت چونکہ وسیع تھی اس لئے دو دارالسلطنت بننے سے انتظام پہلے سے بہتر ہو گیا۔

آلِ سلجوق نے خلیفہ کو نہ چھیڑا اور اُسے کچھ علاقہ دے کر اُس کی حیثیت برقرار رکھی تھی۔ یہاں ایک واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہو گا۔ اُس وقت خلیفہ قائم بامراللہ تھا۔ 450ھ کا ذکر ہے کہ بساسیری نام کے ایک غیر مسلم نے خلیفہ قائم کو کمزور اور تنہا سمجھ کر بغداد پر حملہ کر دیا اور خلیفہ کو قید میں ڈال دیا۔

طغرل بیگ کو اطلاع ملی تو اس نے بساسیری پر حملہ کر دیا اور اسے بہت بُری شکست دے کر اسے گرفتار کر

دیا۔ حکم دیا کہ اس کا سر کاٹ کر میرے حوالے کیا جائے۔ تھوڑی ہی دیر میں سر اس کے سامنے پڑا تھا۔ طغرل بیگ نے سر اٹھو لیا اور خلیفہ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ خلیفہ کو بساسیری کی قید سے رہا کرا لیا گیا تھا۔

طغرل بیگ نے بساسیری کا سر خلیفہ کے قدموں میں رکھ دیا۔

"طغرل!" — خلیفہ قائم بامراللہ نے کہا — "کیا تم چار سال انتظار کر سکتے ہو؟"

"کیسا انتظار؟" — طغرل بیگ نے پوچھا۔

"میں اس احسان کا تمہیں صلہ دینا چاہتا ہوں جو تم نے مجھ پر کیا ہے" — خلیفہ قائم نے کہا۔

"پہلی بات یہ ہے محترم خلیفہ!" — طغرل بیگ نے کہا — "کہ میں نے آپ پر احسان نہیں کیا' فرض ادا کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں چار سال انتظار کا مطلب نہیں سمجھ سکا"۔

"میری ایک ہی بیٹی ہے" — خلیفہ نے کہا — "ابھی کمسن ہے۔ بارہ تیرہ سال عمر ہے۔ چار سال بعد جوان ہو جائے گی تو اس کی شادی تمہارے ساتھ کراؤں گا۔ یہ ایسا انعام ہے یا تحفہ ہے جو میں کسی غیر عباسی کو نہیں دے سکتا۔ ہم اپنی لڑکیاں عباسیوں میں ہی بیاہتے ہیں۔ تم سلجوقی ہو لیکن تمہارے احسان کا صلہ اس سے کم نہیں دوں گا۔ میں نے اپنی بیٹی تمہیں دے دی۔ چار سال بعد شادی ہو جائے گی"۔

چار سال بعد خلیفہ نے اپنی بیٹی کی شادی طغرل بیگ سے کر دی۔

○

بادشاہوں کے ہاں یہ رواج رہا ہے کہ انہیں وزیروں کی ضرورت نہیں ہوتی تھی لیکن رسمی طور پر وہ ایک وزیرِ اعظم اور برائے نام دو تین وزیر رکھ لیتے تھے۔ حکم تو بادشاہ کا چلتا تھا۔ وزیر تائید اور خوشامد کرتے تھے۔ ان کے مشیر بھی حاشیہ بردار اور جی حضوری ہوتے تھے۔ بادشاہ ان سے رسماً" کسی کام یا کسی مسئلے کا مشورہ لیتا تو وہ بادشاہ کی مرضی اور مزاج کے مطابق مشورہ دیا کرتے تھے لیکن سلجوقیوں کے ہاں یہ رواج نہیں تھا۔

سلاطینِ آلِ سلجوق علم و فضل کے قدر دان تھے۔ ان کی کامیابی کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ بادشاہوں' جیسے دربار نہیں لگاتے تھے اس لئے وہ خوشامدیوں اور درباریوں کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان کے فیصلے دو ٹوک اور اٹل ہوتے تھے۔

چغرا بیگ اور طغرل بیگ کا دورِ حکومت تھا جنہوں نے دو دار السلطنت بنا لئے تھے۔ چغرا بیگ مرو میں تھا۔ ایک روز ایک جواں سال آدمی اس کی ملاقات کے لئے آیا۔ اس شخص کا لباس بتا رہا تھا کہ وہ معمولی سا کوئی سوالی نہیں' وہ کوئی عالم یا کسی اونچے درجے کے خاندان کا فرد لگتا تھا۔

"سلطان کو کیا بتاؤں آپ کون ہیں؟" — دربان نے پوچھا — "اور غرضِ ملاقات کیا ہے؟"

"میرا نام خواجہ حسن طوسی ہے" — ملاقاتی نے بتایا — "نیشا پور سے آیا ہوں۔ نیشا پور کے امام موافق کا شاگرد ہوں۔ ان کے مدرسے سے فارغ التحصیل ہو کر آیا ہوں۔ فقیہ اور محدث ہوں۔ غرضِ ملاقات سلطان کو بتاؤں گا"۔

دربان کے لئے حکم تھا کہ کوئی عالم ملاقات کے لئے آجائے تو اسے روکا نہ جائے۔ چنانچہ دربان نے اندر جا کر سلطان چغرا بیگ کو اطلاع دی۔

"کیا وہ فقیہ اور محدث لگتا ہے؟" — سلطان نے پوچھا۔

"ہاں سلطانِ محترم!" — دربان نے جواب دیا — "زبان شائستہ اور لباس عالمانہ ہے۔ چہرے سے مہذب لگتا ہے"۔

"تو اسے اتنی دیر باہر کھڑا رکھنا خلافِ تہذیب ہے" — سلطان نے کہا — "اسے فوراً" اندر بھیج دو"۔

چند لمحوں بعد خواجہ حسن طوسی سلطان چغرا بیگ کے سامنے کھڑا تھا۔ سلطان نے اسے احترام سے بٹھایا۔

"اے نوجوان!" — سلطان نے پوچھا — "میں کیسے مان لوں کہ تو امام موافق کا شاگرد ہے؟ ہم جانتے ہیں امام موافق کی شاگردی کتنا بڑا اعزاز ہے"۔

"میرے پاس سند ہے" — خواجہ طوسی نے سند سلطان کے حوالے کرتے ہوئے کہا — "میں نے فقہ اور حدیث کی اور دیگر دینی امور کی تعلیم پائی ہے"۔

"کیا تو فارغ التحصیل ہو گیا ہے؟" — سلطان نے پوچھا۔

"نہیں سلطانِ عالی مقام!" — خواجہ طوسی نے جواب دیا — "میں مدرسے سے فارغ ہوا ہوں تحصیلِ علم سے نہیں۔ علم ایک سمندر ہے۔ موتی اسی کے ہاتھ آتا ہے جو اس سمندر میں غوطہ زن ہو کر تہہ سے سیپی اٹھا لانے کا عزم رکھتا ہے"۔

سلطان چغرا بیگ کچھ متاثر ہوا۔

"ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ تو کتنا کچھ دانشمند ہے" — سلطان نے کہا — "کتابیں علم دے سکتی ہیں عقل نہیں.... تو اپنے آپ کو کتنا دانشمند سمجھتا ہے؟"

"سلطانِ محترم!" — خواجہ حسن طوسی نے کہا — "انسان اتنا ہی احمق ہے جتنا وہ اپنے آپ کو دانشمند سمجھتا ہے' اور انسان اتنا ہی چھوٹا ہے جتنا وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔ یہ فیصلہ دوسرے کیا کرتے ہیں کہ فلاں احمق اور فلاں دانشمند ہے"۔

"ایک بات بتا طوسی!" — سلطان نے پوچھا — "حکمران میں کیا صفات اور کیسے اوصاف ہونے چاہئیں کہ وہ رعایا میں ہر دلعزیز ہو اور مرنے کے بعد بھی لوگ اسے اچھے الفاظ سے یاد کریں؟"

"وہ اپنے دین اور سلطنت کے لئے آگ کا طوفان ہو" — خواجہ حسن طوسی نے جواب دیا — "رعایا کے لئے پانی ہو' زمین کی طرح فیاض اور آسمان کی طرح مربی ہو' عقاب کی مانند تیز نگاہ' کوے کی طرح محتاط اور

کوئل کی طرح خوش گلو ہو، شیر کی طرح بے خوف اور چاند ستاروں کی مانند راست رو ہو، یوں نہیں کہ آج اِدھر کل اُدھر بھٹکتا پھرے"۔

"کیا یہ صفات ہم میں ہیں؟" ——— سلطان نے پوچھا۔

"اگر میں نے کہا ہاں ہیں تو یہ خوشامد ہوگی" ——— خواجہ طوسی نے کہا ——— "خوشامد منافقت ہے۔ میں منافق نہیں بننا چاہتا۔ اگر میں نے کہا کہ سلطان میں کچھ صفات کی کمی ہے تو میں معتوب ہوں گا۔ مجھ میں تابِ عتاب نہیں"۔

"اے نوجوان!" ——— سلطان نے کہا ——— "تیری صاف گوئی قابلِ داد ہے لیکن ایک بات بتا... اگر ان صفات اور اوصاف میں سے ایک یا دو ہم میں نہ ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے؟"

"سلطانِ عالی مقام!" ——— خواجہ حسن طوسی نے کہا ——— "تسبیح میں ایک سو دانے اور گرہ صرف ایک ہوتی ہے۔ اگر یہ ایک گرہ کھل جائے تو تمام دانے بکھر جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کی وہ صفت اور وہ وصف کمزور ہو جو گرہ کی حیثیت رکھتا ہے تو گرہ کسی بھی وقت صفات و اوصاف کے دانے بکھیر دے گی"۔

"خواجہ حسن طوسی!" ——— سلطان چغرا بیگ نے پُرجوش لہجے میں کہا ——— "ہم نے تجھے مشیر مقرر کیا۔ اگر تُو نے راست گوئی اور صداقت پسندی کو قائم رکھا تو یہ ہماری پیشین گوئی ہے کہ ایک روز تُو اس سلطنت کا وزیرِ اعظم ہوگا"۔

بیس بائیس سال بعد سلطان چغرا بیگ کی پیشن گوئی پوری ہو گئی۔ خواجہ حسن طوسی وزیرِ اعظم بن گیا۔ اُس کا وقت سلطان چغرا بیگ کا پوتا سلطان ملک شاہ حکمران تھا۔ مرو یعنی دوسرے دار السلطنت میں سلطان الپ ارسلان تھا۔ خواجہ طوسی سلطان الپ ارسلان کا وزیرِ اعظم تھا۔

خواجہ حسن طوسی تاریخِ اسلام کی مشہور و معروف شخصیت ہے۔ اسے سلجوقی سلطانوں نے نظام الملک کا خطاب دیا تھا۔ تاریخوں میں اسے خواجہ حسن طوسی کم نظام الملک زیادہ لکھا گیا ہے اس لئے وہ اسی نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ وہ دینی امور کا اور فقہ و حدیث کا عالم تھا۔

نظام الملک نے بغداد میں مدرسۂ نظامیہ بنایا تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اور اس کے ساتھی بہاؤالدین شدّاد جو اُس وقت کا مشہور سکالر تھا اسی مدرسے میں اکٹھے پڑھے تھے۔

○

ایک روز نظام الملک طوسی اپنے کام کاج میں مصروف تھا کہ اسے اطلاع ملی کی نیشاپور سے ایک شخص اسے ملنے آیا ہے اور اپنا نام عمر خیام بتاتا ہے۔ نظام الملک نے ذہن پر زور دیا۔ یہ نام اسے کچھ مانوس لگا اور ایک شک کی بنا پر کہا اسے اندر بھیج دو۔

عمر خیام اندر آیا۔ نظام الملک نے اسے دیکھا تو اچھل کر اٹھا۔ اس نے عمر خیام کو پہچان لیا تھا۔ دونوں اس

بھی میں نے اعتراض کر دیا کہ میں روٹی کمانے کے لئے اس کا ساتھ نہیں دیتا"۔

"تمہیں کوئی نہ کوئی ذریعۂ معاش تو تلاش کرنا ہی ہوگا" ——— نظام الملک نے کہا ——— "بغیر کام کے زندگی تنگی ترشی میں ہوتی"۔

"میں تمہیں ایک عہد نامہ یاد دلانے آیا ہوں خواجہ!" ——— عمر خیام نے کہا ——— "عہد نامہ جو ہم نے لڑکپن میں کیا تھا"۔

"عہد نامہ؟" ——— نظام الملک نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا ——— "بائیس تیئس سال گذر گئے ہیں عمر! ذرا سا اشارہ دے دو"۔

نظام الملک اور عمر خیام کا ایک ہم جماعت اور بھی تھا۔ اُس نے تو تاریخ میں ایسا نام پایا ہے کہ اسے تاقیامت بھلایا نہیں جا سکے گا۔ یہ تھا جنتِ ارضی کا خالق حسن بن صباح۔ ان کے ہم جماعت تو اور بھی تھے لیکن نظام الملک، عمر خیام اور حسن بن صباح کی آپس میں دوستی اتنی گہری ہو گئی تھی کہ وہ ایک ہی کمرے میں رہتے اور جدھر ایک نے جانا ہوتا اُدھر تینوں جاتے تھے۔

ایک روز حسن بن صباح نے ایک عہد نامہ پیش کیا اور تینوں دوستوں نے آپس میں یہ عہد کیا۔ یہ ان کا ایک تاریخی عہد نامہ ہے جس کا ذکر تقریباً ہر مؤرخ نے کیا ہے۔ اتنی مدت بعد عمر خیام نظام الملک سے ملا تو نظام الملک عہد نامہ بھول چکا تھا۔

"مدرسے کی ایک رات یاد کرو خواجہ!" ——— عمر خیام نے نظام الملک کو عہد نامہ یاد دلانے کے لئے کہا ——— "ہم تینوں دوست اُس روز کا پڑھا ہوا سبق دہرا کر فارغ ہوئے تو حسن بن صباح نے کہا کہ اہلِ مدرسے کی یہ روایت ہے کہ جو یہاں سے پڑھ کر نکلا اور جسے امام موافق نے ذہین اور لائق کہا وہ کسی نہ کسی اونچے رتبے پر پہنچا۔ پھر حسن بن صباح نے کہا تھا کہ ضروری نہیں کہ ہم تینوں اونچے رتبوں پر پہنچیں گے۔ ہو سکتا ہے ہم تینوں میں سے کوئی ایک کسی بلند رتبے تک جا پہنچے اور باقی دو بڑی مشکل سے دو وقت کی روٹی کما سکیں۔

"پھر حسن بن صباح نے کہا تھا کہ تو آپس میں عہد کریں کہ ہم میں سے جو بھی کسی اونچے منصب یا رتبے پر پہنچا تو وہ دونوں دوستوں کی مالی معاونت کرے گا اور انہیں اپنی خوش بختی میں برابر کا شریک بنائے گا یا ان کے ذریعۂ معاش کا بندوبست کرے گا اور طوطا چشمی اور خود غرضی سے گریز کرے گا... ہم تینوں نے پوری سنجیدگی اور سچے دل سے عہد و پیمان کئے تھے کہ ایسے ہی ہوگا"۔

"ہاں عمر!" ——— نظام الملک نے مسکراتے ہوئے کہا ——— "مجھے یاد آ گیا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے سب سے زیادہ پُرجوش طریقے سے عہد کیا تھا کہ مجھے اللہ نے کوئی بڑا رتبہ دے دیا اور میرے دونوں دوستوں کو میری ضرورت محسوس ہوئی تو میں ان کی مالی اور ہر طرح کی معاونت کروں گا"۔

"تو پھر خواجہ!" ——— عمر خیام نے کہا ——— "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ لمبا عرصہ میرا کوئی ذریعۂ معاش نہیں...

طرح بغلگیر ہو کر ملے جیسے لمبی مدت کے بچھڑے ہوئے دوست ملا کرتے ہیں۔

وہ تھے ہی پرانے اور بچھڑے ہوئے دوست۔ امام موافق کے مدرسے میں ہم جماعت تھے۔ اس مدرسے کے متعلق تاریخوں میں لکھا ہے کہ طلباء کم ہوا کرتے تھے اور جو بھی طالب علم امام موافق کی شاگردی سے فارغ ہوتا تھا وہ حکومت یا معاشرے میں اونچے درجے پر فائز ہو جاتا تھا۔ اس کی ایک مثال خواجہ حسن طوسی کی تھی جو سلطنتِ سلجوق کا وزیر اعظم بنا' نظام الملک کا خطاب پایا اور تاریخ میں آج تک اس کا نام زندہ ہے اور تابد زندہ رہے گا۔

پھر ایک اور مثال عمر خیام کی ہے۔ عمر خیام کی رباعیاں آج بھی مشہور ہیں۔ اردو میں بھی ان رباعیوں کا ترجمہ ہوا ہے اور انگریزی میں بھی۔ اس طرح عمر خیام اردو اور انگریزی ادب کا ایک مقبول شاعر بن گیا ہے۔

عمر خیام کوئی عام قسم کا شاعر نہ تھا' وہ فلسفی شاعر تھا۔ اس کی رباعیوں میں نسوانی حسن کی رعنائیاں تو بہت تھیں لیکن ان رباعیوں میں زندگی کا فلسفہ اور دانش ہوتی تھی۔ اس کی رباعیاں خیال کی گہرائیوں کی بدولت آج بھی زندہ ہیں۔

یہی نہیں عمر خیام حکیم بھی تھا۔ اس نے حکمت کی پریکٹس ہی نہیں کی تھی بلکہ بعض لاعلاج امراض کی دوائیاں بھی ایجاد کی تھیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ عمر خیام نے آبِ حیات بھی تیار کر لیا تھا جو ہر مرض کی دوا اور لامحدود عمر کا ضامن تھا لیکن یہ محض روایت ہے۔ کسی بھی مورخ نے آبِ حیات کا ذکر نہیں کیا۔

یہ تھا عمر خیام جو اپنے پرانے ہم جماعت خواجہ حسن طوسی نظام الملک سے ملنے آیا تھا۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ عمر خیام کسی امیر باپ کا بیٹا نہیں تھا۔ اس کا باپ' جس کا نام عثمان تھا' موٹے کھدر کا کپڑا بنتا تھا۔ یہ اس کا خاندانی پیشہ تھا۔ اس کے بعد اس نے خیموں کی سلائی کا کام شروع کر لیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ خیام کہلانے لگا۔۔۔ عثمان خیام۔۔۔ اس کے بیٹے عمر نے جب دیکھا کہ وہ شعر موزوں کر سکتا ہے تو اس نے باپ کے پیشے کی مناسبت سے اپنا تخلص خیام رکھ لیا۔ یہ تخلص اس کے نام کا حصہ بن گیا اور عمر خیام کے نام سے مشہور ہوا۔

○

"کہو عمر!" ۔۔۔ نظام الملک نے پُرمسرت لہجے میں کہا ۔۔۔ "اتنا عرصہ کہاں رہے؟ آج تم نے لڑکپن یاد دلا دیا ہے"۔

"پہلی بات یہ ہے خواجہ!" ۔۔۔ عمر خیام نے کہا ۔۔۔ "میں اب عمر نہیں عمر خیام ہوں۔ شعر و شاعری میں مقام پیدا کر لیا ہے۔ حکمت میں قسمت آزمائی کر رہا ہوں۔ علم و ادب کی کتابیں بھی پڑھ رہا ہوں اور حکمت کی بھی' لیکن ذریعۂ معاش کوئی نہیں۔ باپ خیمہ سازی کرتا ہے۔ میں نے اس پیشے کو اپنانے کی کوشش کی تھی لیکن میرے ذہنی رجحان نے اسے قبول نہیں کیا۔ میری صلاحیتیں مجھے کسی اور طرف لے جا رہی تھیں۔ باپ کو

بتایا"۔

"میں اس کا کچھ بندوبست کر دوں گا" ۔۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔۔ "تم صاحب علم و فضل ہو۔ فلسفہ' شاعری اور حکمت میں دسترس رکھتے ہو۔ میں سلطان سے کہوں گا کہ تم سلطنت کے لئے معتمد اور سود مند ثابت ہو سکتے ہو' اور میں سلطان سے یوں کہوں گا کہ تمہیں میرے ساتھ ملازمت دے دی جائے اور تمہیں میرا معاون بنا دیا جائے۔ یہ سلاطین مجھے اچھا جانتے ہیں اور مجھ سے بہت ہی متاثر ہیں"۔

"میں تمہارے کردار کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں" ۔۔۔ عمر خیام نے کہا ۔۔۔ "لیکن خواجہ! تم تو مجھے اعلیٰ منصب پر اپنے ساتھ بٹھانا چاہتے ہو لیکن میں اس منصب کے قابل نہیں۔ میں ساری عمر تمہارا مشکور و ممنون رہوں گا"۔

"نہیں عمر!" ۔۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔۔ "میرا خیال ہے کہ ذریعۂ معاش کے بغیر تم نے جو اتنا عرصہ گزارا ہے' اس کے زیرِ اثر تمہیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہا۔ میں تمہارا اعتماد بحال کرنا چاہتا ہوں اور مجھے پوری امید ہے کہ سلطانِ محترم میرے کہنے پر تمہیں اچھے منصب پر قبول کر لیں گے"۔

"نہیں خواجہ! یہ بات نہیں" ۔۔۔ عمر خیام نے کہا ۔۔۔ "میں کام کرنے سے نہیں گھبراتا اور بے روزگاری نے مجھ پر کوئی نقصان دہ اثر نہیں چھوڑا۔ میری صلاحیتیں جس طرف چل نکلی ہیں میں چاہتا ہوں کہ میں اسی راستے کی منزل تک پہنچ جاؤں۔ میں اپنی تحریریں' اشعار اور حکمت کے وہ نسخے جو میں نے دریافت کئے ہیں' اپنے ساتھ لایا ہوں۔ میں علم و ادب اور حکمت میں مزید تحقیقات کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ایک نظر انہیں دیکھ لو۔ میرے پاس کوئی پیسہ نہیں جس سے میں اپنے اس تحقیقی مسلک کو آگے بڑھاؤں۔ اگر میں نے ملازمت قبول کر لی تو اس سے صرف یہ حاصل ہو گا کہ میں اور میرے اہل و عیال باعزت روٹی کھا لیں گے اور مجھے عزت حاصل ہو جائے گی۔

"میری اس بات پر غور کرو خواجہ!۔۔۔ میں صرف اپنے اور اپنے گھر والوں کے لئے روٹی نہیں چاہتا' میں بنی نوع انسان کے لئے کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں نے نایاب اور انتہائی کارآمد جڑی بوٹیاں تلاش کرنی ہیں اور کچھ قیمتی سامان بھی درکار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میرے پاس اتنی رقم ہونی چاہئے جس سے میں گھر والوں کو دو وقت کی روٹی مہیا کر سکوں"۔

نظام الملک نے اس کے کاغذات کا پلندہ دیکھا۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ یہ شخص علم و ادب کے لئے اور حکمت کے لئے کتنا بڑا کام کر رہا ہے اور اگر اسے مالی معاونت مل جائے تو بنی نوع انسان کے لئے اس کی یہ کوششیں بہت ہی سود مند ثابت ہوں گی۔ چنانچہ اس نے عمر خیام کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور اس کا یہ تحقیقی کام سلطان الپ ارسلان کو دکھایا اور اسے اس تحقیق کی افادیت اور اہمیت بتائی۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سلاطینِ سلجوق علم و فضل اور عمر خیام جیسے تحقیقی کام کرنے والوں کی بہت قدر

کرتے تھے۔ سلطان نے عمر خیام کے لئے بارہ سو مثقال سونا سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ آج کی کرنسی کے حساب سے بارہ سو مثقال پینتیس ہزار روپے کے برابر تھے۔ عمر خیام پہلا وظیفہ وصول کر کے نیشاپور چلا گیا۔

عمر خیام کو اتنی زیادہ مالی سہولت حاصل ہو گئی تو وہ علم و حکمت کے تحقیقی کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اس نے اپنی پہلی جو کتاب لکھی وہ عقیدت مندی اور شکریے کے طور پر خواجہ نظام الملک کے نام سے منسوب کی۔ پھر اس نے اپنی تحقیق اور تجربات کی ایک اور کتاب مرتب کی جس کا نام "علم المساحۃ والمکعبات" تھا اور پھر اس نے اقلیدس کے اصول و مسائل پر ایک کتاب لکھی۔ عمر خیام علم قیافہ میں بھی دسترس رکھتا تھا۔ ان کتابوں کی بدولت عمر خیام ایران میں اس قدر مشہور و مقبول ہو گیا کہ اسے بوعلی سینا کا ہم پلہ سمجھا جانے لگا۔

عمر خیام کا مستقل قیام نیشاپور میں تھا۔ نیشاپور خراسان کا دارالسلطنت تھا اور وہاں کا سلطان ملک شاہ تھا۔ سلطان ملک شاہ ارباب علم اور اہل نظر کا اتنا قدردان تھا کہ اس نے عمر خیام کی شہرت سنی تو اسے نیشاپور بلایا اور اسے اصلاحِ تقویم کی ذمہ داری سونپ دی۔ عمر خیام علم الاعداد میں بھی دسترس رکھتا تھا۔ اس علم میں اس نے خاصی اصلاح و ترمیم کی۔

○

یہ تھا عمر خیام جسے خواجہ حسن طوسی نظام الملک نے بام عروج پر پہنچایا۔ ان کا ایک تیسرا دوست بھی تھا "حسن بن صباح"۔۔۔ ہم ذرا پیچھے چلتے ہیں جہاں عمر خیام نظام الملک کے پاس گیا تھا۔ عمر خیام نے نظام الملک کو مدرسے کے دور کا عہد نامہ یاد دلایا تو حسن بن صباح کا ذکر آیا۔

"کیا جانتے ہو عمر! وہ کہاں ہے؟" ۔۔۔ نظام الملک نے پوچھا۔

"میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ رے چلا گیا تھا" ۔۔۔ عمر خیام نے جواب دیا ۔۔۔ "وہ وہیں کا رہنے والا تھا۔ تمہیں یاد ہو گا" وہ خاصا ہوشیار اور چالاک ہوا کرتا تھا۔ تمہیں شاید یاد نہ ہو' اس نے مدرسے کے ایک لڑکے کے کچھ پیسے چرا لئے تھے۔ ہم دونوں نے اس کی وکالت کی تھی کہ حسن چور نہیں ہو سکتا لیکن اس نے یہ چوری کی تھی' پھر بھی ہم نے اسے دوست بنائے رکھا تھا"۔

"ہاں عمر!" ۔۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔۔ "مجھے یاد آ گیا ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو ہمیں اتنی اچھی لگتی تھی کہ میں اس کے بغیر اپنے آپ کو ادھورا سمجھتا تھا"۔

"یہ اس کی زبان کا کمال تھا" ۔۔۔ عمر خیام نے کہا ۔۔۔ "بولتے تو ہم بھی ہیں لیکن وہ جب بولتا تھا تو کچھ اور ہی تاثر پیدا ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہ خوبرو تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی تاثیر تھی کہ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا تھا تو سننے والا بلا پس و پیش اس کی بات مان لیتا تھا"۔

دونوں دوست حسن بن صباح کی باتیں کرتے رہے۔ دو تین دنوں بعد عمر خیام چلا گیا۔

چار پانچ دن گذرے ہوں گے کہ نظام الملک کو اطلاع ملی کہ رے سے ایک آدمی اسے ملنے آیا ہے' اپنا نام حسن بن صباح بتاتا ہے۔

"حسن بن صباح!" ۔۔۔ نظام الملک نے بڑے اشتیاق سے کہا اور اٹھتے ہوئے بولا ۔۔۔ "اسے فوراً اندر بھیجو"۔

حسن بن صباح اندر آیا تو نظام الملک کو اپنے استقبال کے لئے دروازے میں کھڑا پایا۔ دونوں ہم جماعت اور دوست بغل گیر ہوئے۔

"میں نے سنا کہ میرا دوست وزیراعظم ہو گیا ہے تو میں خوشی سے پھٹنے لگا" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "میں اٹھ دوڑا کہ اپنے لڑکپن کے جگری یار کو وزارتِ عظمیٰ کی مسند پر بیٹھا دیکھوں"۔

"وہ تو تم نے دیکھ لیا ہے" ۔۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔۔ "یہ بتاؤ یہ بائیس تئیس سال کہاں رہے اور ذریعۂ معاش کیا ہے؟"۔

"خاک ہے میرا ذریعۂ معاش!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "بہت قسمت آزمائی کی۔ مصر تک گیا لیکن قسمت نے کہیں بھی ساتھ نہ دیا۔ کچھ دنوں کے لئے روزگار ملا پھر وہی بے روزگاری۔۔۔ ایک جگہ گیا تو مجھے بہت اچھا جواب ملا۔ مجھے کہا گیا کہ تم نے تعلیم ایسی اور اتنی زیادہ پائی ہے کہ تم کوئی چھوٹی نوکری نہیں کر سکتے اور اسی وجہ سے تمہارا دماغ تجارت کو بھی قبول نہیں کرتا"۔

"ہاں حسن!" ۔۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔۔ "اس شخص نے دانشمندی کی بات کی ہے۔ امام موافق کا شاگرد کوئی عام سی نوکری نہیں کر سکتا اور نہ دکانداری بھی نہیں کر سکتا۔۔۔ ہمارا دوست عمر آیا تھا۔ وہ اب عمر خیام ہے۔ اس نے فلسفہ' علم و ادب اور حکمت میں بہت کام کیا ہے لیکن ذریعۂ معاش کوئی نہیں"۔

"ہاں۔ عمر!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "ہمارا پیارا دوست۔ اس نے فلسفی اور شاعر ہی بننا تھا"۔

"اس نے مجھے عہد نامہ یاد دلایا تھا" ۔۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔۔ "میں تو اس عہد نامے کو بھول گیا تھا جو ہم تینوں دوستوں نے ایک رات مدرسے میں کیا تھا"۔

"پھر تم نے اس کے لئے کچھ کیا ہے؟"

"ہاں حسن!" ۔۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔۔ "میں نے اس کے لئے سالانہ وظیفہ منظور کرا لیا ہے"۔

"میں بھی تمہیں وہی عہد نامہ یاد دلانے آیا ہوں" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "لیکن مجھے وظیفہ نہیں چاہئے۔ مجھے اپنی تعلیم اور خاندانی حیثیت کے مطابق ملازمت چاہئے"۔

"میں دوستی کا حق ادا کروں گا حسن!" ۔۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔۔ "اور میں لڑکپن کے عہد نامے کا پورا پاس کروں گا۔ تم سلطان سے ملنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ میں اس کے ساتھ پہلے ہی بات کر لوں گا"۔

معروف تاریخ نویس ابنِ اثیر نے چند ایک مورخوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ عہدِ طفلی کا ایک

عہد نامہ تھا جس کی حیثیت ایک مذاق سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں تھی نہ ہی یہ عہد نامہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر حلفیہ کیا گیا تھا لیکن نظام الملک صاحبِ کردار اور دیندار آدمی تھا۔ سلطان ملک شاہ نے اس میں یہی اوصاف دیکھ کر اسے اعلیٰ منصب پر فائز کیا تھا اور انہی اوصاف کی بدولت وہ سلطنت کا وزیرِ اعظم بن گیا تھا۔ اس نے لڑکپن کے عہد نامے کا اتنا پاس کیا کہ سلطان کے آگے حسن بن صباح کے کردار، تعلیم اور دانشمندی ایسے انداز سے بیان کی کہ سلطان متاثر ہو گیا۔

اس نے حسن بن صباح سے کہا وہ اسے سلطان سے ملوائے گا اور وہ اپنی تعلیم اور دانشمندی کا پُر اثر مظاہرہ کرے۔

حسن بن صباح فنِ گفتگو کا تو استاد تھا۔ نظام الملک نے اسے سلطان کے سامنے پیش کیا تو اس نے زبان کا جادو چلا کر سلطان کو متاثر کر لیا۔ اس کا راستہ تو نظام الملک نے پہلے ہی صاف کر دیا تھا۔

”یہ فیصلہ وزیرِ اعظم کو کرنا چاہئے کہ اس دانشمند شخصیت کو کس منصب پر فائز کیا جائے“ — سلطان نے کہا۔

”میں حسن بن صباح کو سلطانِ عالی مقام کے معتمدِ خاص کے رتبے سے کم درجے کا آدمی نہیں سمجھتا“ — نظام الملک نے کہا — ”سلطانِ عالی مقام کو ایک معتمدِ خاص کی ضرورت بھی ہے“۔

”ہمیں منظور ہے“ — سلطان نے کہا — ”آپ انہیں رکھ لیں اور انہیں اچھی طرح بتا دیں کہ ان کا کام کیا ہو گا۔ انہیں تمام تر امورِ سلطنت سمجھا دیں۔ کچھ دن اپنی نگرانی میں رکھیں“۔

اس طرح حسن بن صباح کو وہ رتبہ مل گیا جو اختیارات کے لحاظ سے وزارت سے کم نہ تھا۔ وہ اُسی دن اپنا سامان اور بیوی بچوں کو لانے کے لئے رے روانہ ہو گیا۔

نظام الملک محسوس نہ کر سکا کہ اُس نے ابلیس کے لئے جنت کا دروازہ کھول دیا ہے۔

○

حسن بن صباح کون تھا؟

اُس کا باپ خراسان کے شہر طُوس کا رہنے والا تھا۔ اس کا نام علی بن احمد تھا اور وہ اسماعیلی مذہب کا پیروکار تھا۔ حسن بن صباح طوس میں پیدا ہُوا تھا۔ اس کا باپ شہر رے میں جا کر رہائش پذیر ہو گیا تھا۔ رے کا حاکم ابو مسلم رازی تھا۔ علی بن احمد نے ابو مسلم رازی تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اس کا کام تھا ابو مسلم رازی کی خوشامد کرنا اور لوگوں کے خلاف مخبری کرنا۔ وہ چاہتا تو کسی شریف آدمی کو ناکردہ گناہ میں گرفتار کرا دیتا اور کسی مجرم کو جھوٹ کے ذریعے بیگناہ ثابت کرا دیتا۔

رے تجارت کا مرکز تھا جہاں غیر ملکی تاجر آئے رہتے تھے۔ علی بن احمد منڈی میں چلا جاتا اور کسی نہ کسی غیر ملکی تاجر کو جھانسہ دے کر اس کا مال اُڑا لیتا یا کچھ رقم بٹور لیتا تھا۔ یہ کام وہ ایسی مہارت سے اور ایسے معزز

انداز سے کرتا تھا کہ نقصان اٹھانے والے اس پر ہاتھ ڈالنے سے جھجکتے تھے۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ رے کے حاکم ابو مسلم رازی کا خاص آدمی اور اس کا منظورِ نظر ہے۔

علی بن احمد کی عیاری کے قصے اتنے کم نہیں کہ داستان کو سارے سنا دے۔ وہ بردہ فروشی تک کرتا تھا لیکن یوں نہیں کہ ایک لڑکی کو اغوا کیا اور اسے بیچ ڈالا۔ وہ کسی حسین اور نوجوان لڑکی کو یا کسی جوان سال بیوہ کو نہایت باعزت طریقے سے ورغلاتا اور ایسے سبز باغ دکھاتا کہ لڑکی پر سحر طاری ہو جاتا تھا۔ نوخیز لڑکی ہوتی یا جوان سال عورت، نتائج سے بے خبر اس کے جال میں آجاتی تھی۔ وہ چار دن اسے اپنے پاس رکھ کر عیش و عشرت کرتا تھا۔ اس فریب کاری میں لڑکی کو اسے بتائے بغیر کوئی نشہ بھی پلاتا تھا۔ اس دوران وہ گاہک کی تلاش میں رہتا اور ایک دن اُسے کسی مالدار گاہک کے حوالے کر دیتا تھا۔

کسی گھر میں لڑائی جھگڑا ہوتا یا بازار میں دو دکانداروں کے درمیان جھگڑا ہو جاتا یا تاجروں کا آپس میں کوئی تنازعہ ہوتا تو وہ ثالث یا منصف بن کر اپنے آپ کو ان پر مسلط کر کے تصفیہ کراتا تھا۔

لوگ جانتے تھے کہ یہ شخص عیار اور فریب کار ہے پھر بھی اس کی عزت کرتے اور اس سے مشورے اور مدد لیتے تھے۔ لوگوں میں مقبولِ عام بننے کے لئے وہ ان کے چھوٹے موٹے مسئلے حل کر دیا کرتا تھا۔ اس میں ڈھیٹ پن اتنا زیادہ تھا کہ کہیں سے دھتکار دیا جاتا تو وہاں سے ایک دروازے سے نکل کر دوسرے دروازے سے پھر اندر چلا جاتا اور عیاری کا کوئی اور حربہ استعمال کر کے دھتکارنے والوں کو شیشے میں اتار لیتا تھا۔

لوگوں میں یہ جو مشہور تھا کہ وہ حاکم ابو مسلم رازی کا منظورِ نظر ہے، غلط نہ تھا۔ ابو مسلم جابر اور دانشمند حاکم تھا لیکن علی بن احمد کمال استادی سے اسے دوستانہ سطح پر لے آیا کرتا تھا۔ ابو مسلم رازی اہلِ سنت و جماعت تھا۔ علی بن احمد بلا شک و شبہ اسماعیلی تھا لیکن ابو مسلم کو اس نے یقین دلا رکھا تھا کہ وہ اہلِ سنت ہے۔ ایک بار ابو مسلم کو مصدقہ اطلاع ملی کہ علی بن احمد سُنی نہیں اسماعیلی ہے۔ ابو مسلم نے اس سے جواب طلبی کی۔ اس نے قرآن ہاتھوں پر اٹھا کر قسم کھائی اور کہا کہ وہ سُنی مسلمان ہے۔

اس کا بیٹا حسن بن صباح کئی سالوں سے ایک اسماعیلی عالم اور اتالیق عبدالملک بن عطاش کے ہاں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس کا علم ابو مسلم کو ہو گیا۔ اس نے ایک روز علی بن احمد کو بلایا۔

”کس کا بچہ کہاں پڑھتا ہے، مجھے کیا!“ — ابو مسلم نے علی سے کہا — ”اپنی اولاد کے متعلق ماں باپ کے فیصلوں کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں لیکن تمہارے بیٹے کے متعلق میں اس لئے بات کر رہا ہوں کہ تم اہلِ سُنت و جماعت ہو لیکن اپنے بیٹے کو تم نے اسماعیلی عالم کی شاگردی میں بٹھا رکھا ہے.... کیوں؟.... کیا یہ تمہارے اسماعیلی ہونے کا ثبوت نہیں؟“

”نہیں ابو مسلم!“ — علی بن احمد نے کہا — ”یہ میری ایک مجبوری کا ثبوت ہے۔ میں اپنے بیٹے کو نیشاپور امام موافق کی شاگردی میں بھیجنا چاہتا ہوں لیکن میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ اپنی اس خواہش کی

تکمیل کر سکوں"۔

"پیسے میں دلواتا ہوں" — ابو مسلم رازی نے کہا — "میں سرکاری خزانے سے پیسے دلواؤں گا"۔

علی بن احمد نے ایسے انداز سے خوشی کا اظہار کیا جیسے اس کا ایک لاینحل مسئلہ حل ہو گیا ہو۔ اس نے سرکاری خزانے سے رقم وصول کی اور حسن بن صباح کو نیشاپور امام موافق کے مکتب میں بھیج دیا۔ امام موافق کٹر اہل سنت تھا۔ تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابو مسلم رازی علی بن احمد کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا لیکن اسے دھتکار بھی نہیں سکتا تھا۔

○

حسن بن صباح اپنے باپ کی عیارانہ سرگرمیوں سے بڑی اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے باپ سے متاثر ہو کر عیاری کو ہی اپنا اصول بنا لیا تھا۔ اس نے باپ کے خاص کمرے میں بڑی حسین اور نوخیز لڑکیاں بھی دیکھی تھیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا باپ کبھی کبھار ایسی ایک لڑکی یا ایک جوان عورت لاتا ہے اور اسے ایک نشہ پلاتا ہے۔ حسن بن صباح نے یہ نشہ دیکھ لیا اور اس کی تھوڑی مقدار شربت میں ملا کر پی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے یوں نظر آنے لگا تھا جیسے یہ خرابات ہی حسین ہو گئی ہو۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ اسے بوڑھی عورتیں بھی جوان نظر آنے لگی تھیں۔

اس نے جرب زبانی باپ سے سیکھی تھی۔ لڑکپن میں ہی اس زبان کے جادو کا ماہر ہو گیا تھا۔ اپنے باپ کو وہ اپنا بہترین استاد سمجھتا تھا۔ اس کے باپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے بیٹے میں اُسی کے ذہنی رجحانات پیدا ہو گئے ہیں۔ اُس نے بیٹے کو کبھی روکا ٹوکا نہیں تھا بلکہ نیشاپور امام موافق کے مکتب میں بھیجتے وقت اس نے بیٹے کو کچھ ہدایات دی تھیں۔

"یہ نہ بھولنا بیٹے!" — اس نے حسن بن صباح سے کہا تھا — "ہم اسماعیلی ہیں اہل سنت نہیں۔ تم نے اہلِ سنت کا درس لینا ہے اور رہنا اسماعیلی ہے۔ اس مدرسے سے جو طلباء اچھے درجے میں کامیاب ہو کر نکلتے ہیں وہ اونچے رتبوں پر فائز ہو جاتے ہیں۔ تم ایسے ایک دو لائق لڑکوں کے ساتھ دوستی کر لینا۔ آگے چل کر یہ تمہارے کام آئیں گے"۔

باپ کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ اُس کا بیٹا اسی عمر میں اُس سے کہیں زیادہ چالاک ہو گیا ہے جتنا وہ سمجھتا ہے۔ بیٹے نے مدرسے میں خواجہ حسن طوسی اور عمر خیام کو دوستی کے لئے منتخب کر لیا۔ اُس کی دوربین نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ دونوں پڑھنے میں بہت تیز ہیں اور یہ بڑے ہو کر اونچے رتبے پر پہنچیں گے۔

"ہمہ تن جلیس" میں واضح طور پر لکھا ہے کہ تینوں دوستوں میں یہ جو معاہدہ ہوا تھا کہ جو دوست کسی اعلیٰ منصب پر فائز ہو گیا وہ دونوں دوستوں کی مدد کرے گا اور اپنے مال و دولت میں بھی انہیں شریک سمجھے گا، یہ معاہدہ حسن بن صباح کے عیار دماغ کی اختراع تھا۔

اس معاہدے سے عمر خیام نے بھی فائدہ اٹھایا لیکن وہ جائز فائدہ تھا۔ عمر خیام کے شاہکار آج تک زندہ ہیں، لیکن حسن بن صباح نے نظام الملک سے اس معاہدے کا جو فائدہ اٹھایا وہ ایک ابلیس کا کارنامہ تھا۔ یہ حسن بن صباح کا پہلا قدم تھا۔ وہ جب نظام الملک کے پاس یہ سن کر گیا تھا کہ وہ وزیر اعظم ہو گیا ہے تو اس نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ اتنا عرصہ بے روزگار رہا ہے۔ وہ کچھ خفیہ سرگرمیوں میں مصروف رہا تھا۔ وہ اپنا ایک فرقہ بنانے کے لئے زمین ہموار کر رہا تھا۔

اس مقصد کے لئے وہ مصر تک چلا گیا تھا۔ مصر میں عبیدیوں کی حکومت تھی جو ظاہری طور پر اسماعیلی کہلاتے تھے لیکن وہ دراصل باطنی تھے۔ وہاں بات چیت کر کے واپس رے آ گیا۔ کچھ دنوں بعد عبیدیوں کا ایک وفد اس کے پاس رے گیا۔ وفد چلا گیا تو ابو مسلم رازی کو اطلاع ملی اور اسے حسن بن صباح کے عزائم معلوم ہوئے۔ ابو مسلم نے حسن بن صباح کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ حسن بن صباح کو قبل از وقت پتہ چل گیا اور وہ بھاگ گیا۔

وہ اس وقت زمین دوز روپوشی سے ابھرا جب وہ نظام الملک کی معرفت اور کوششوں سے سلطان ملک شاہ کے معتمدِ خاص کا منصب حاصل کر چکا تھا اور رے اپنا سلطان اور اپنے بیوی بچے لینے آیا تھا۔ ابو مسلم خاموش ہو گیا۔

اُس وقت اس کا باپ بسترِ مرگ پر پڑا تھا۔ حسن بن صباح نے آ کر اسے خوشخبری سنائی کہ اسے یہ رتبہ مل گیا ہے۔

"اب میں سکون سے مر سکوں گا" — باپ نے کہا — "میں تمہیں اسی منصب پر دیکھنا چاہتا تھا... جانتے ہو اب تم نے کیا کرنا ہے؟"

"جانتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "سب سے پہلے نظام الملک کو اس کرسی سے اٹھانا، نکال دینا اور خود وزیر اعظم بننا ہے"۔

"شاباش!" — باپ نے کہا — "تم دروازے میں داخل ہو گئے ہو۔ اہم کمروں پر قبضہ کرنا تمہارا کام ہے... یاد رکھو بیٹے! بدی میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے زیادہ طاقت عورت اور نشے میں ہے۔ ان دو چیزوں کے ذریعے تم دنیا کے سب سے زیادہ طاقتور بادشاہ کو اپنے قدموں میں بٹھا سکتے ہو"۔

باپ کو ہچکی آئی اور اس کے ناپاک جسم سے روح نکل گئی لیکن وہ اپنی ابلیسیت اپنے بیٹے میں منتقل کر گیا۔

یہاں سے عورت اور نشے کی، عیاری اور بدی کی ایسی داستانوں نے جنم لیا جن سے زمین و آسمان کانپ اٹھے۔ آج بھی سنو تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

○

داستان کو اس داستان کو یہاں تک لے گیا ہے جہاں حسن بن صباح خواجہ طوسی نظام الملک کی سفارش سے سلجوقی سلطان ملک شاہ کا معتمد خاص بن جاتا ہے۔ حسن اور خواجہ طوسی امام موافق کے مدرسے سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے تو ان کی ملاقات بیس اکیس سال بعد سلطان ملک شاہ کے محل میں ہوئی تھی۔ اگر اس بیس اکیس سال کے عرصے کی روئیداد نہ سنائی جائے تو تاریخ کی یہ ہولناک اور شرمناک داستان ادھوری رہ جائے گی۔ یہی وہ عرصہ ہے جس میں حسن بن صباح حسن بن ابلیس بنا تھا۔ اسی عرصے میں اس نے علمِ نجوم اور علمِ سحر میں دسترس حاصل کی تھی۔

کیا یہ اچھا نہ ہو گا کہ داستان کو آپ کو بیس اکیس سال پیچھے لے جائے جب حسن کے باپ علی بن احمد نے اسے امام موافق کے مدرسے میں داخل کرانے سے بہت پہلے ایک اسماعیلی عالم عبدالملک بن عطاش کی شاگردی میں بٹھایا تھا؟

کوئی انسان اپنے آپ ہی گناہگار نہیں بن سکتا اور کوئی انسان اپنے آپ ہی زاہد اور متقی نہیں بن سکتا۔ کچھ حالات اور چند انسان مل کر ایک انسان کو بگاڑتے یا بناتے ہیں۔

حسن بن صباح کا کردار اُسی روز ایک خاص سانچے میں ڈھلنا شروع ہو گیا تھا جس روز باپ اسے عبدالملک بن عطاش کے پاس لے گیا تھا۔ عبدالملک حسن کے باپ کو اچھی طرح جانتا تھا جس طرح ایک جسم کے دو ہاتھ ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے ہیں۔ عبدالملک علی ابن احمد کی عیاریوں سے بھی واقف تھا اور وہ علمِ جوتش و نجوم کی بھی سُوجھ بُوجھ رکھتا تھا۔

"لے ابنِ عطاش!" ——— حسن کے باپ نے اسے عبدالملک بن عطاش کے سامنے بٹھا کر کہا ——— "یہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے مرنے کے بعد یہ گمنام ہو جائے۔ یہ اس سے زیادہ شہرت حاصل کرے، جو میں نے حاصل کی تھی"۔

"ایک پہلو اپنی زندگی کا یہ بھی سامنے رکھ علی!" ——— ابنِ عطاش نے کہا ——— "تُو نے شہرت تو اتنی حاصل کی ہے کہ اس خطے کے حاکم کے ساتھ بھی تیرا اٹھنا بیٹھنا ہے لیکن یہ کوئی اچھی شہرت نہیں"۔

"شہرت تو ہے ابنِ عطاش!" ——— علی بن احمد نے کہا ——— "میں کہتا ہوں یہ نام پیدا کرے، اچھا یا بُرا"!

"اسے بچے کو اندر لے آ"!

علی بن احمد اپنے بیٹے حسن بن صباح کو اندر لے گیا اور عبدالملک ابنِ عطاش کے سامنے بٹھا دیا۔ عبدالملک نے حسن کے سر سے دستار اتار دی اور اس کے سر پر اس طرح ہاتھ رکھا کہ اُس کی انگلیاں حسن کی پیشانی پر تھیں۔ عبدالملک نے انگلیاں اس کی پیشانی پر آہستہ آہستہ پھیریں پھر اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر ذرا اوپر کیا اور حسن کی آنکھوں میں بڑی غور سے دیکھا، پھر اس کے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں پھیلا کر دیکھیں۔ ہتھیلیوں کو غور سے دیکھتے دیکھتے عبدالملک نے اپنا چہرہ یوں تیزی سے پیچھے کر لیا جیسے اس بچے کی ہتھیلیوں سے اچانک سانپ نکل آیا ہو۔

عبدالملک بن عطاش نے کاغذ قلم لے کر کاغذ پر قلم سے خانے بنائے اور ہر خانے میں کچھ لکھا، وہ وقفے وقفے سے حسن کے چہرے کو دیکھتا تھا۔

"جا بچے!" ——— ابنِ عطاش نے حسن سے کہا ——— "تُو باہر جا بیٹھ!"

حسن بن صباح باہر نکل گیا تو ابنِ عطاش نے اُس کے باپ کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔

"جو کہنا ہے کہہ دے ابنِ عطاش!" ——— علی نے کہا ——— "میں جانتا ہوں کہ جو تو کہے گا وہ تجھے تیرے علم اور ستاروں نے بتایا ہے"۔

"تیری بیوی کی کوکھ سے ایک نبی پیدا ہوا ہے" ——— ابنِ عطاش نے کہا۔

"نبی؟" ——— علی بن احمد نے حیران سا ہو کے پوچھا ——— "نبوت کا سلسلہ تو ختم ہو چکا ہے"۔

"نبوت کا سلسلہ اللہ کی طرف سے ختم ہوا ہے" ——— ابنِ عطاش نے کہا ——— "اللہ کے بندوں کی طرف سے یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا نہ کبھی ختم ہو گا۔ اب تک کتنے ہی آدمی نبوت کا دعویٰ کر چکے ہیں۔ کیا تُو نے صاف ابنِ صیاد مدنی کی نبوت کا قصہ نہیں سنا؟ وہ یہودی تھا۔ اُس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا اور آپؐ سے اس کی ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اُس سے پوچھا کیا تجھ پر وحی نازل ہوتی ہے؟ صاف ابنِ صیاد نے جواب دیا، میرے پاس ایک صادق اور ایک کاذب آتا ہے"۔

"صادق اور کاذب کا کیا مطلب؟" ——— علی بن احمد نے پوچھا۔

"مطلب سمجھنے کی کوشش کرو علی!" — ابنِ عطاش نے جواب دیا — "مطلب یہ کہ میرے پاس ایک فرشتہ آتا ہے اور ایک ابلیس۔ وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ فرشتہ بھی اور ابلیس بھی اس کے دماغ میں اپنے اپنے اشارے اور اپنے اپنے امورِ غیب ڈال جاتے ہیں۔ دراصل بات یہ تھی کہ صاف ابنِ صیاد علمِ سحر میں مہارت رکھتا تھا۔ ساحر ہم میں بھی ہیں۔ اس علم کے اسرار و رموز میرے پاس بھی ہیں لیکن یہ علم یہودیوں کو اتنا مرغوب ہے کہ انہوں نے اسے بہت ہی طاقتور بنا دیا ہے اور اس میں ابلیسیت بھر دی ہے۔ ان کے ساحر بالکل صحیح پیش گوئی کر سکتے ہیں۔ صاف ابن صیاد بھی پیش گوئی کر سکتا تھا۔ اسے اُس نے یوں بیان کیا کہ ایک فرشتہ اُس کے پاس آتا ہے جو اُسے خدا کا پیغام دیتا ہے اور ابلیس بھی آتا ہے جو اُسے آنے والے حالات بتاتا جاتا ہے"۔

"تم میرے بیٹے کی بات کر رہے تھے" — حسن بن صباح کے باپ نے کہا — "یہ کس قسم کا نبی بنے گا؟"

"جیسے کئی اور بنے ہیں" — ابنِ عطاش نے کہا — "تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی مانو نہ مانو، میں اس حدیث کا منکر نہیں ہو سکتا.... جھوٹے نبی آتے رہیں گے اور تمہارے سامنے ایسی ایسی باتیں کریں گے جو تم نے ہی نہیں، تمہارے باپ دادوں نے بھی نہ سنی ہوں گی۔ ان سے خبردار رہنا اور اپنے ایمان کو ان سے محفوظ رکھنا۔ یہ تم میں گمراہی اور فتنہ پھیلائیں گے'.... طلیحہ اسدی نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ تم نے مسیلمہ کذاب کا نام سنا ہو گا۔ پھر ایک عورت سجاح بنتِ حارث نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا..... پھر ہوا کیا؟.... صاف ابن صیاد نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ طلیحہ مسلمان ہو گیا تھا۔ اس نے نبی بن کر اتنی شہرت حاصل نہیں کی تھی جتنی مسلمان ہو کر میدانِ جنگ میں اُسے ملی"۔

"اگر تو آنے والے وقت کے پردے اٹھا سکتا ہے تو بتا!" — علی بن احمد نے کہا — "میرے بیٹے کا مستقبل کیا ہو گا؟ یہ کس انجام کو پہنچے گا؟"

"انسان کو اپنی فطرت انجام کو پہنچایا کرتی ہے" — ابنِ عطاش نے کہا — "انجام اچھا بھی ہو سکتا ہے بُرا بھی۔ اس کا انحصار انسان کے اپنے اعمال پر ہے۔ اگر میں تیرے بیٹے کی آنکھوں میں عکس غلط نہیں دیکھ رہا تو یہ اتنی زیادہ طاقت کا مالک ہو گا کہ یہ جس کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر دیکھے گا وہ اس کے آگے سجدہ ریز ہو جائے گا اور یہ جس عورت پر نگاہ ڈالے گا وہ عورت اپنے آپ کو اس کی ملکیت میں دے دے گی لیکن یہ طاقت نبیوں والی نہیں ہو گی بلکہ یہ ابلیسی طاقت ہو گی"۔

"کیا یہ طاقت میرے بیٹے کے حق میں اچھی ہو گی؟" — علی بن احمد نے پوچھا۔

"کیا تیری فطرت تیرے حق میں اچھی نہیں؟" — ابنِ عطاش نے کہا — "حاکمِ وقت تک تیری رسائی ہے۔ تیرے جاننے والوں میں کون ایسا ہے جس کا دل تجھے پسند کرتا ہے؟ لیکن کون ہے جو تیرے آگے تعظیم سے جھک نہیں جاتا؟ کون ہے جو سانپ سے پیار کرتا ہے لیکن ہر کوئی سانپ سے ڈرتا ہے"۔

"کیا تو اس کا راستہ بدل سکتا ہے؟" — علی بن احمد نے پوچھا — "کیا تو اس کے دل میں خوفِ خدا پیدا کر سکتا ہے؟"

"دنیا کا بادشاہ خدا ہے" — ابنِ عطاش نے کہا — "سب جانتے ہیں کہ یہ دنیا خدا نے بنائی ہے اور ایک روز خدا اسے تباہ کر دے گا اور یہ قیامت ہو گی لیکن خدا کے بندوں کے دلوں پر ابلیس کی حکمرانی ہے۔ اسے کہتے ہیں ابلیسی قوت!"

"میں کہتا ہوں میرا بیٹا نام پیدا کرے" — علی بن احمد نے کہا۔

"نام پیدا کرے گا" — ابنِ عطاش نے کہا — "نام بھی ایسا پیدا کرے گا کہ رہتی صدیوں تک دنیا اسے یاد کرے گی لیکن اس کی تاریخ خون سے لکھی جائے گی۔ اس پر گناہوں کی سیاہی کے حاشیے ہوں گے"۔

"پارسائی میں کیا رکھا ہے ابنِ عطاش!" — علی بن احمد نے ایسی مسکراہٹ سے کہا جو مسرت سے خالی تھی — "میں بچہ تیری شاگردی میں بٹھا رہا ہوں۔ اسے ایسے راستے پر ڈال دے کہ تجھ جیسا عالم بن جائے"۔

علی بن احمد اپنے بیٹے حسن کو عبدالملک بن عطاش کے حوالے کر کے چلا گیا۔

○

تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ عبدالملک علی بن احمد کے گھر گیا۔ ان دونوں کی ملاقاتیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں لیکن اُس رات عبدالملک ابنِ عطاش کسی خاص مقصد سے وہاں گیا تھا۔

"محترم احمد!" ــــ ابنِ عطاش نے کہا ــــ "میں نے تیرے بیٹے کو دینی اور معاشرتی علوم میں رواں کرنے کا قصد کیا تھا لیکن لڑکے کا ذہن کسی اور طرف لے جا رہا ہے۔ میں تیرے ساتھ یہ بات کرنے آیا ہوں کہ تیرا بیٹا اپنے فرقے کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر تو اجازت دے دے تو میں اسے اسی راستے پر ڈال دوں اور فن علوم اور عملیات کا اسے ماہر بنا دوں جو اس کے لئے ضروری ہیں"۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حسن بن صباح کا باپ جیسا خود تھا ویسا ہی اپنے بیٹے کو بنانا چاہتا تھا۔ عبدالملک ابن عطاش اپنے فرقے کا صرف مذہبی پیشوا ہی نہ تھا بلکہ وہ اپنے عقیدے کی تبلیغ اور فرقے کی سربلندی کے لئے زمین دوز کارروائیوں میں بھی لگا رہتا تھا۔ اُس کا اپنا ایک بیٹا احمد جوان ہو رہا تھا۔ اس بیٹے کا نام احمد بن عبدالملک ہونا چاہئے تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو احمد بن عطاش کہلانا زیادہ پسند کیا۔ عبدالملک نے اسے اپنے فرقے کی تبلیغ اور دیگر کارروائیوں کے لئے بھیج دیا تھا۔ اُس نے حسن بن صباح کو جو تربیت دینی شروع کی تو اس کے پیشِ نظر اپنا یہی مشن تھا۔ اس نے اس کمسن لڑکے میں بڑے کام کے جوہر دیکھ لئے تھے۔

عبدالملک نے حسن کو علمِ نجوم اور سحر کے سبق دینے شروع کر دیئے تھے۔ اس نے دیکھا کہ یہ لڑکا بڑی تیزی اور پورے انہماک سے یہ علوم سیکھ رہا تھا۔ یہ اس کی اضافی تعلیم تھی۔ اصل تعلیم تو دینی اور معاشرتی علوم کی تھی۔

داستان گو پہلے سنا چکا ہے کہ اس شہر رے کے حاکم ابو مسلم رازی کو پتہ چل گیا کہ علی بن احمد کا بیٹا عبدالملک ابنِ عطاش کی شاگردی میں بیٹھا ہے۔ رازی جانتا تھا کہ عبدالملک اسماعیلی ہے۔ علی بن احمد نے رازی کو حلفیہ طور پر یقین دلا رکھا تھا وہ اہلِ سنت ہے۔ ایک روز ابو مسلم رازی نے اس سے پوچھا کہ وہ اہلِ سنت ہے تو اس نے اپنے بیٹے کو اسماعیلی اتالیق کی شاگردی میں کیوں بٹھا لیا ہے؟

علی بن احمد نے جواب دیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو نیشاپور امام موافق کی شاگردی میں بٹھانا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس اتنے پیسے نہیں۔ ابو مسلم رازی نے اسے سرکاری خزانے سے اتنی رقم دلا دی کہ اس نے اپنے بیٹے کو نیشاپور امام موافق کے پاس بھیج دیا۔

حسن بن صباح فارغ التحصیل ہو کر رے اپنے گھر چلا گیا۔

پھر وہ بیس اکیس برس بعد اپنے ہم جماعت اور دوست خواجہ حسن طوسی کے پاس گیا تھا۔ اُس وقت خواجہ طوسی سلجوقی سلطنت کا وزیرِ اعظم بن کر سلجوقی سلطان سے نظام الملک کا خطاب بھی حاصل کر چکا تھا۔ حسن نے نظام الملک سے کہا تھا کہ اس نے اپنی عمر کا یہ اتنا لمبا اور اتنا قیمتی عرصہ روزگار کی تلاش میں دربدر ٹھوکریں کھاتے گزارا ہے اور اب اسے پتہ چلا ہے کہ خواجہ طوسی وزیرِ اعظم ہے۔

حسن بن صباح نے جھوٹ بولا تھا۔ یہی وہ عرصہ تھا جس عرصے میں وہ ایک طاقت اور ایک انتہائی خطرناک انسان بن گیا تھا۔ وہ آگ میں سے گذر کر کندن بن گیا تھا۔ اُس نے ہزارہا پیروکار ہی نہیں بنا لئے تھے بلکہ ان پر اپنی عقیدت کا پاگل پن طاری کر دیا تھا اور اُس کے یہ جنونی پیروکار کسی ایک شہر یا قصبے میں نہیں بلکہ بڑے وسیع علاقوں میں جنگلوں میں پھیل گئے تھے۔

اُس نے یہ مقبولیت اور یہ طاقت کس طرح حاصل کی تھی؟

○

نیشاپور سے رے پہنچتے ہی وہ اپنے پہلے اتالیق کے ہاں گیا۔ اتالیق عبدالملک ابنِ عطاش نے اسے لپک کے ملا کہ اُسے گلے سے لگایا اور کچھ دیر گلے سے ہی لگائے رکھا۔

"مجھے پوری امید تھی کہ تم ایسے ہی خوبصورت جوان نکلو گے" ــــ ابنِ عطاش نے اسے اپنے سامنے بٹھا کر کہا اور اس کے بازوؤں پھر کندھوں کو ہاتھوں سے دباتے ہوئے بولا ــــ "پٹھوں میں جوانی کی طاقت آ گئی ہے" ــــ پھر اُس کے سر کے دائیں اور بائیں ہاتھ رکھ کر کہنے لگا ــــ "میں کیسے جان سکتا ہوں کہ تیرے دماغ میں بھی کچھ گیا ہے یا نہیں"۔

"محترم اتالیق!" ــــ حسن نے کہا ــــ "دماغ میں تو بہت کچھ بھر لایا ہوں۔ یہ علم ہے.... یوں کہہ لیں کہ علم کے الفاظ ہیں جو دماغ میں ٹھونس لایا ہوں لیکن ایک تشنگی ہے، جو بیقراری بن کر دماغ کو ایک سوچ پر قائم نہیں رہنے دیتی"۔

"کیا تو علم کی تشنگی محسوس کرتا ہے؟"

"عمل کی!" ــــ حسن نے کہا ــــ "میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ پیٹ بھرنے کے لئے نہیں.... میں کیا چاہتا ہوں؟.... میں اپنے آپ کو اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا.... آپ کی شاگردی میں بیٹھا تو آپ نے بتایا کہ مذہب کیا اور فرائض کیا ہیں، پھر آپ نے مجھے ستاروں سے

روشناس کرلیا اور مجھ پر سحر کے بھید کھولے" — وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا اور اس حسن کی طرف
بائیں دیکھنے لگا جیسے بے چینی اور اضطراب پر اس کا قابو نہ رہا ہو۔ کچھ دیر بعد بولا — "آپ
بتائیں محترم اتالیق! میں کیا چاہتا ہوں؟ — میری منزل کیا ہے؟ کہاں ہے میری منزل؟"
"تیری منزل تیرے اپنے دماغ میں ہے" — ابنِ عطاش نے کہا — "دماغ کو کھنگال
"یہ کام آپ کریں" — حسن نے کہا — "ہاں... دو تین بار خیال آیا ہے جیسے میں
فرعون بننا چاہتا ہوں"۔

عبدالملک ابنِ عطاش نے زوردار قہقہہ لگایا۔ حسن حیرت سے اس کے منہ کو دیکھنے لگا۔
"تو نے اپنی منزل کا سراغ پا لیا ہے" — ابنِ عطاش نے کہا — "اب تیری بیقراری کو
ختم کرنا میرا کام ہے۔ کچھ وقت لگے گا حسن! محنت، مشق اور ریاض کی ضرورت ہے۔ وہ میں
کرلوں گا۔ تیرے اندر ایک ایسی طاقت ہے جو ہر کسی میں نہیں ہوتی۔ یہی طاقت ہے جو تجھے
بیقرار اور بے چین رکھتی ہے۔ تو اس کا تابع ہے لیکن تو اس سے ناآشنا ہے۔ اگر تو نے اسے نہ
ابھارا تو ایک دن تو اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ لے گا یا تو اپنے ماں باپ کو قتل کر دے گا اور تیری
گردن جلاد کے ہاتھوں کٹے گی"۔

"ہاں اتالیق!" — حسن بن صباح نے کہا — "آپ کے اس انکشاف نے میرے دل میں
شمع روشن کر دی ہے۔ میں کچھ ایسا ہی محسوس کیا کرتا ہوں کہ میں قتل کروں گا یا قتل ہو جاؤں گا۔
کیا آپ میری راہنمائی کر سکتے ہیں؟"
"صرف میں ہوں" — ابنِ عطاش نے کہا — "میرے سوا اور کوئی نہیں جو تیری
راہنمائی کر سکے۔ لیکن حسن! تجھے اپنے باپ سے اجازت لینی پڑے گی"۔
"مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں میرے بزرگ اتالیق!" — حسن نے دو ٹوک لہجے
میں کہا — "میں یہ جانتا ہوں کہ میں وہ سیلابی دریا ہوں کہ میرے سامنے جو رکاوٹ آئی وہ تنکوں
کی طرح بہہ جائے گی۔ یہ بھی سوچئے کہ میرا باپ کہاں کا زاہد اور پارسا ہے۔ اس نے عیاری
اور مکاری میں شہرت پائی ہے۔ میری فطرت اسی کے سانچے میں ڈھلی ہے۔ مجھے بھروسہ ہے تو
صرف آپ کی ذات پر ہے"۔

○

مورخ لکھتے ہیں کہ عبدالملک ابنِ عطاش کو حسن بن صباح کے مستقبل کے ساتھ کوئی ایسی دلچسپی نہیں تھی کہ اپنی توجہ اور کاوشیں اسی پر مرکوز کرلیتا۔ اس کی دلچسپی اپنے فرقے کی تبلیغ اور فروغ کے ساتھ تھی۔ اسلام نے اولیں مسلمانوں کے حسنِ اخلاق سے مقبولیت حاصل کی تھی۔ وہ دور دُور پیچھے رہ گیا تھا۔ پانچویں صدی گذر رہی تھی۔

فرقہ بندی نے اسلام کی بنیادیں ہلا ڈالی تھیں۔

اسلام اگر کھانے پینے والی کوئی چیز تھا تو اس میں زہریلی ملاوٹیں گھول دی گئی تھیں۔

اسلام اگر پیرہن تھا تو اس کا گریبان، بھی اس کا دامن بھی تار تار ہوا جا رہا تھا۔ اس کی صرف آستینیں محفوظ تھیں اور ان آستینوں میں سانپ پرورش پا رہے تھے۔

عبدالملک ابنِ عطاش انہی سانپوں میں سے تھا۔ حسن بن صباح کے باپ کی بات تو داستان گو سنا چکا ہے کہ حاکمِ شہر ابو مسلم رازی کی دوستی قائم رکھنے کی خاطر قسمیں کھا کر کہتا تھا کہ وہ اہلِ سنت و جماعت ہے لیکن وہ اسماعیلی تھا' بلکہ وہ اسماعیلی فرقے کے لئے بھی سراپا توہین تھا۔ اس کا اگر کوئی مذہب تھا تو وہ فریب کاری تھی۔ اس کا عقیدہ اگر تھا تو وہ عیاری تھی۔

تاریخ ایک دلچسپ بات بتاتی ہے۔ حسن بن صباح علی بن احمد کا بیٹا تھا اس لئے اس کا نام حسن بن علی ہونا چاہئے تھا لیکن حسن نے حسن بن صباح کہلانا زیادہ پسند کیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے پردادے کا نام صباح تھا۔ اس کے کردار کے متعلق جو روایات سینہ بہ سینہ حسن تک پہنچی تھیں' وہ عیاری اور فریب کاری کی وارداتیں تھیں۔ اُس وقت کی سوسائٹی میں اُس کا کوئی مقام اور کوئی رُتبہ نہیں تھا لیکن بادشاہ اور بڑے بڑے حاکموں تک اُس کی رسائی تھی اور لوگ اس کی فطرت سے آگاہ ہوتے ہوئے اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

حسن بن صباح کو اپنے پردادا کی یہ فطرت اور اُس کی یہ شہرت اتنی اچھی لگی کہ اس نے اپنا نام حسن بن علی کی بجائے حسن بن صباح رکھ لیا۔ تاریخوں میں اس کا نام حسن بن صباح حمیری لکھا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسن بن صباح کس فطرت کا انسان تھا۔

اُس نے ایک بار پھر عبدالملک ابنِ عطاش کی شاگردی کرلی لیکن اب یہ شاگردی در پردہ تھی کیونکہ ابنِ عطاش اسے بڑے ہی پُراسرار راستے پر ڈال رہا تھا۔ ابنِ عطاش اسے کہا کرتا تھا کہ اس کا کام شہروں اور قصبوں میں نہیں ہوگا بلکہ اس کی زیادہ تر زندگی جنگلوں' بیابانوں اور غاروں

میں گزرے گی۔

اگر حسن بن صباح کے ماں باپ دیکھ لیتے کہ عبدالملک ابنِ عطاش ان کے نوجوان بیٹے کو کس قسم کی تربیت دے رہا ہے تو وہ اسے اس استاد کی شاگردی سے فوراً اٹھا لیتے۔ ابنِ عطاش اُسے کئی کئی گھنٹے مسلسل ایک ٹانگ پر کھڑا رکھتا تھا۔ وہ گرنے لگتا تو اُسے ایک دو کوڑے لگا دیتا تھا۔

دو دو تین تین دن اُسے بھوکا رکھتا اور اس کے بعد اسے کھانے کو جَو کے کچھ دانے دیتا تھا۔

اپنے آپ کو پوری طرح قابو میں رکھنے کے لئے ابنِ عطاش نے اُسے اس امتحان میں بھی ڈالا کہ ایک کمرے میں ایک انتہائی خوبصورت اور نوخیز لڑکی کو برہنہ کر کے اس کے سامنے بٹھا دیا۔ اُس کے سامنے دیوار پر ایک چھوٹا سا سیاہ دائرہ بنا کر کہا کہ وہ اپنی نظریں اس دائرے پر مرکوز رکھے اور ایک لمحے کے لئے بھی لڑکی کی طرف نہ دیکھے۔

علمِ سحر کے عامل لکھتے ہیں کہ تربیت کے اس مرحلے سے کامیاب نکلنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے، خصوصاً نوجوانی کی عمر میں یہ مرحلہ اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ حسن بن صباح جیسے کردار کا نوجوان اس مرحلے کو برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ استاد اس مشق کو اس طرح اور زیادہ مشکل بنا دیا کرتا تھا کہ حسن دیوار کے دائرے پر نظریں مرکوز رکھتا تو لڑکی کبھی اُس کا ایک ہاتھ پکڑ لیتی، کبھی اُس کے قریب ہو جاتی اور کبھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگتی۔ کمرہ بند ہوتا تھا اور کمرے میں ایک حسن ہوتا اور یہ حسین لڑکی۔

اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی یہ مشق حسن سے بارہا کرائی گئی اور حسن سُوئی کے اس ناکے میں سے بھی گذر گیا۔ حسن کو معلوم نہیں تھا کہ اس کمرے کے دروازے کے ایک کواڑ میں چھوٹا سا ایک سوراخ تھا جس میں سے اُس کا استاد اسے دیکھتا رہتا تھا۔

"تُو ساری دنیا کو فتح کرنے کی طاقت اور صلاحیت رکھتا ہے" ——— ایک روز عبدالملک ابنِ عطاش نے اُسے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ——— "عورت میں اتنی طاقت ہے کہ وہ جابر بادشاہ کو تخت سے اٹھا کر اپنے قدموں میں بٹھا سکتی ہے۔ معلوم نہیں امام موافق نے تجھے ایسی کوئی کہانی سنائی ہے یا نہیں۔ جولیس سیزر روم کا بڑا ہی زبردست، طاقتور اور جنگجو بادشاہ تھا۔ اُس زمانے میں روم ہی ایک جنگی طاقت تھی جس کے خوف سے دنیا لرزتی تھی۔ جولیس سیزر نے

مصر پر فوج کشی کی۔ اُس وقت قلوپطرہ مصر کی ملکہ تھی۔ اُسے اطلاع ملی کہ روم کی فوج شہر کے باہر پہنچ گئی ہے۔ قلوپطرہ نے جولیس سیزر کی طرف اپنا ایلچی اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ وہ اُس سے ملنا چاہتی ہے۔

"جولیس سیزر نے سن رکھا تھا کہ قلوپطرہ کے ہاتھ میں کوئی ایسا جادو ہے جو ہر حملہ آور بادشاہ کو اس کا غلام بنا دیتا ہے۔ جولیس سیزر کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ قلوپطرہ کے ہاتھ میں کوئی جادو ہے یا نہیں، وہ اپنی پُرشباب نسوانیت کا ایسا جادو چلاتی ہے کہ حملہ آور بادشاہ کتنا ہی پتھر دل کیوں نہ ہو، اس کے آگے موم ہو جاتا ہے۔ ان حکایات و روایات کے پیشِ نظر جولیس سیزر نے قلوپطرہ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ ملکۂ مصر کو اُس وقت دیکھے گا جب رومی فوج شہر میں داخل ہو کر مصری فوج سے ہتھیار ڈلوا چکی ہو گی۔۔۔

"جولیس سیزر نے شہر کو محاصرے میں لینے کا حکم دے دیا۔ وہ بادشاہ تھا۔ اُس کا خیمہ ایک سفری محل تھا۔ محاصرہ مکمل ہونے کے ایک دو روز بعد ایک ادھیڑ عمر آدمی جو مصری تھا اپنے کندھے پر ایک قالین اٹھائے جولیس سیزر کے خیمے کے سامنے آن رکا۔ قالین گولائی میں رول کیا ہُوا تھا جو اس مصری نے کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ اُس نے جولیس سیزر کے محافظوں سے کہا وہ قالین باف ہے اور یہ قالین جو بہت ہی قیمتی اور بہت ہی خوبصورت ہے، بادشاہ کو دکھانا چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے بادشاہ کو قالین پسند آ جائے اور وہ اسے خرید لے، اس سے غریب آدمی کا بھلا ہو جائے گا۔۔۔

"رومی محافظ اُسے دھکے دے کر پیچھے ہٹانے لگے کہ وہ بادشاہ کے آرام میں مخل نہ ہو۔ مصری قالین باف نے بڑی اونچی آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں یہ قالین تمہارے بادشاہ کو دے کر ہی جاؤں گا۔ یہ شور شرابہ خیمے میں جولیس سیزر کے کانوں میں پڑا تو اُس نے وہیں سے حکم دیا کہ یہ جو کوئی بھی ہے، اسے اندر بھیج دو۔ محافظوں نے اُسے خیمے میں بھیج دیا۔۔۔

"خیمے میں جا کر مصری نے جولیس سیزر سے کہا کہ وہ ایک بار قالین دیکھ لے، یہ قالین روم کے بادشاہ کے لئے ہی موزوں ہے۔ جولیس سیزر نے کہا کہ قالین کھول کر دکھاؤ۔ اُس آدمی نے کندھے سے قالین زمین پر رکھا۔ یہ چوڑائی میں رول کیا ہُوا تھا۔ جب اسے کھولا تو اس میں سے

قلوپطرہ نکلی۔ جولیس سیزر کا چہرہ عتابِ شاہی سے سرخ ہو گیا لیکن قلوپطرہ نے جب اپنی پُرکشش نسوانیت کا جادو چلایا تو کچھ ہی دیر بعد روم کا اتنا زبردست اور طاقتور بادشاہ جیسے بھول ہی گیا ہو کہ وہ بحیرۂ روم کی لہروں کو چیرتا مصر میں کیوں آیا تھا...

"پھر جانتے ہو حسن کیا ہُوا؟... جولیس سیزر جو حملہ آور تھا' ایک شاہی مہمان کی حیثیت سے قلوپطرہ کے ساتھ شہر میں داخل ہُوا۔ بہت دنوں بعد جولیس سیزر اپنی فوج کو ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔ اُس کے جرنیلوں نے روم میں اپنے ساتھی جرنیلوں کو بتایا کہ مصر میں ان کے بادشاہ نے کیا کیا تھا۔ ایک روز جولیس سیزر محل میں بیٹھا تھا کہ اُسے اطلاع دی گئی کہ فلاں جگہ فوراً" پہنچے۔ وہ اٹھ کر چل دیا۔ محل کے قریب ہی ایک اور عمارت تھی جس میں اُسے جانا تھا۔ وہ جونہی اس عمارت میں داخل ہُوا' دس بارہ آدمیوں نے اسے گھیر لیا اور خنجروں سے اسے بڑی ہی بیدردی سے قتل کر دیا"۔

"ہاں محترم اتالیق!" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں۔ اس سبق کو نہیں بھولوں گا"۔

"لیکن حسن!" ـــــ ابنِ عطاش نے کہا ـــــ "اس کا یہ مطلب نہیں کہ تجھے عورت سے دُور رہنا پڑے گا' عورت انتہائی حسین اور نوجوان لڑکیوں کی صورت میں تیرے ساتھ رہے گی۔ یہ تیرا ایک ہتھیار ہو گا لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو میں نے تجھے کہیں اور بھیجنا ہے۔ اگر تُو اس مرحلے سے بھی زندہ و سلامت نکل آیا تو پھر تجھ میں ایسی طاقت آجائے گی کہ آسمان کی طرف دیکھ کر تُو جس ستارے کی طرف اشارہ کرے گا وہ تیری جھولی میں آگرے گا"۔

○

ابنِ عطاش نے حسن بن صباح کو تربیت کے اگلے مرحلے میں ڈال دیا جس میں اُسے قبروں میں مدفون انسانوں کی مختلف ہڈیوں کا استعمال سکھایا جاتا تھا۔ ابنِ عطاش نے اسے پہلی بار آدھی رات کے وقت کہا کہ وہ قبرستان میں جائے اور کوئی ایسی قبر تلاش کرے جو بہت ہی پرانی ہو۔

"پرانی قبر کی نشانی کیا ہو گی؟" ـــــ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"کوئی ایسی قبر دیکھ جو نیچے کو دھنس گئی ہو" ـــــ ابنِ عطاش نے کہا ـــــ "تجھے کچھ قبریں ایسی بھی نظر آجائیں گی جو پوری طرح نیچے کو دھنسی ہوئی ہوں گی اور ان میں مُردوں کی ہڈیاں نظر آتی ہوں گی۔ ایسی کسی قبر میں سے ایک کھوپڑی اور کندھے سے کہنی تک دائیں اور بائیں بازو کی دو ہڈیاں بھی لانی ہیں"۔

حسن بن صباح قبرستان میں چلا گیا۔ وہ جنگ و جدل کا زمانہ تھا۔ لڑائیاں ہوتی ہی رہتی تھیں اس لئے قبرستان بہت ہی وسیع و عریض تھے۔ آدھی رات کے وقت چاند پورا تھا۔ حسن بن صباح قبرستان میں دھنسی ہوئی قبر تلاش کرنے لگا۔ استاد نے اسے تلوار ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

قبرستان کو شہرِ خموشاں کہا جاتا ہے لیکن وہاں عالم یہ تھا کہ زندہ انسانوں کا شہر خاموش تھا اور مرے ہوئے انسانوں کی اس بستی میں کئی ایک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ علاقہ سرسبز تھا۔ پیڑ پودے بہت زیادہ تھے۔ دو تین اُلو باری باری بولتے تھے۔ جھینگروں اور مینڈکوں کی آوازیں بھی مسلسل آرہی تھیں۔ اُسے بھاگتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ اُس نے ڈر کے اُدھر دیکھا۔ ایک بلی بہت تیز بھاگتی آرہی تھی۔ دو بھیڑیئے اُس کے تعاقب میں تھے۔ وہ اس کے قریب سے گذر گئے اور آگے جا کر غائب ہو گئے۔

وہ اپنا دل مضبوط کر کے چل پڑا۔ وہ ہر قبر کو دیکھ رہا تھا۔ اُسے دھنسی ہوئی کوئی قبر نظر نہیں آرہی تھی۔ کچھ دور جا کر اُسے ایک گڑھا نظر آیا جو قبر کی طرح لمبوترا تھا۔ یہ قبر ہی ہو سکتی تھی۔ اس کے ہر طرف قبریں تھیں۔ یہ قبر اُس کے مطلب کی تھی۔ قبر کے کنارے پہنچ کر اُس نے نیچے دیکھا تو پہلے اُس نے ایسی آوازیں سنیں جیسے کُتے غرایا کرتے ہیں۔ پھر یکلخت قبر میں سے دو کُتے اچھل کر اوپر آ گئے۔ تب اُس نے دیکھا کہ یہ بھیڑیئے ہیں۔

اُس نے فوراً" تلوار نکالی اور زور زور سے گھمانے لگا۔ بھیڑیئے سمتیں بدل بدل کر اُس پر جھپٹنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اُس کی گھومتی ہوئی تلوار بھیڑیوں کو قریب نہیں آنے دے رہی تھی۔ ایک بار وہ اس دھنسی ہوئی قبر کے کنارے پر اس طرح چلا گیا کہ اُس کی پیٹھ قبر کی طرف تھی۔ بھیڑیوں سے بچنے کے لئے وہ ذرا سا پیچھے ہٹا تو قبر میں جا پڑا۔ اُس کی ایک ٹانگ گھٹنے تک مٹی میں دھنس گئی۔ اُسے مری ہوئی ایک بلی نظر آگئی جو قبر میں پڑی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ وہی بلی ہے جس کے پیچھے بھیڑیئے دوڑ رہے تھے۔ بلی شاید اس قبر میں گر پڑی یا چھپنے کے لئے اس میں اُتر گئی تھی۔ بھیڑیوں نے اُسے وہیں دبوچ لیا۔ بھیڑیئے اُس وقت بلی کو کھا رہے تھے

www.paksociety.com

جب حسن وہاں پہنچا۔

بھیڑیئے یہ سمجھے کہ یہ شخص ان سے ان کا شکار چھیننے آیا ہے۔ حسن نے فوراً چیری پھاڑی ہوئی بلی کو ٹانگ سے پکڑا اور اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ اگر وہ ایک لمحہ اور بھیڑیوں کا شکار باہر نہ پھینکتا تو وہ اوپر سے اس پر حملہ کر کے اسے چیر پھاڑ دیتے۔ بھیڑیئے اپنا شکار اٹھا کر چلے گئے لیکن حسن بن صباح پر ایسا خوف طاری ہو گیا کہ وہ اپنے جسم میں لرزہ محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے تو یہ بھی سوچ لیا تھا کہ وہاں سے بھاگ آئے لیکن استاد کے ڈر سے اُس نے بھاگنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

اُس نے کچھ اس قسم کی کہانیاں سن رکھی تھیں کہ بعض لوگ اللہ کو اتنے عزیز ہوتے ہیں کہ وہ مر جائیں اور کوئی ان کی قبروں کی توہین کرے تو اللہ اُس پر اُسی وقت عذاب نازل کرتا ہے۔ اس خیال نے اُس کے خوف میں اضافہ کر دیا لیکن ابنِ عطاش نے اُسے کہا تھا کہ مطلوبہ ہڈیاں ہر حالت میں لانی ہیں اور خوف پر قابو پانا ہے۔ حسن نے اپنی دھنسی ہوئی ٹانگ باہر کھینچی۔ یہ لحد تھی جس میں ہڈیاں ہونی چاہئیں تھیں۔

اُس نے دیکھا کہ وہاں سے ایک سِل نیچے کو گری ہوئی تھی۔ اُس نے ہاتھوں سے مٹی باہر پھینکی پھر سِل اٹھا کر الگ رکھ دی۔ چاندنی میں مُردے کی ہڈیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ یہ مُردے کا اوپر والا حصہ تھا۔ اُس نے کھوپڑی اٹھالی اور دونوں بازوؤں کی ہڈیاں بھی اٹھالیں۔ عین اُس وقت اُس نے دیکھا کہ چاندنی بجھ گئی ہے اور ایک سایہ اُس کے اوپر سے گزر رہا ہے۔ اُس نے گھبرا کر اوپر دیکھا کالی گھٹا آگے کو بڑھ رہی تھی اور رات تاریک ہوتی چلی جا رہی تھی۔ حسن کھوپڑی اور ہڈیاں اٹھا کر تیزی سے قبر سے نکلا۔ اچانک بجلی بڑی زور سے چمکی۔ دو تین سیکنڈ بعد بجلی کی کڑک سنائی دی جو اتنی خوفناک تھی کہ حسن بن صباح جیسا دلیر نوجوان بھی سُن ہو کے رہ گیا اور اُسے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دینے لگی۔

اِن علاقے میں بارش کا اچانک آجانا کوئی عجیب چیز نہیں تھی لیکن حسن کے دل پر یہ خوف سوار [illegible] یہ کسی برگزیدہ بزرگ کی قبر ہے۔ جس کی توہین پر آسمان اپنی بجلیاں گرانے پر اُتر آیا ہے۔ حسن کو پھر وہی خیال آیا کہ یہ کھوپڑی اور دونوں ہڈیاں لحد میں واپس رکھ دے لیکن اُسے اپنے استاد کی یہ بات بھی یاد آ گئی کہ اگر تو ڈر گیا یا ویسے ہی ناکام لوٹا تو پھر یہ علم سیکھنے کے لئے نہ جانے کتنے سال درکار ہوں گے۔ اُس نے بڑی مشکل سے اپنا حوصلہ مضبوط کیا اور وہاں سے چل

پڑا۔

اچانک مُوسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بارش کے قطرے کنکریوں کی طرح جسم کو لگتے تھے۔ وہ دوڑ پڑا۔ ایک جگہ اُس نے سامنے دیکھا تو اُسے تین چار قدم دور ایک آدمی کھڑا نظر آیا جس کے خدوخال صاف نظر نہیں آتے تھے۔ وہ دھندلا سا سایہ تھا جو سیدھا کھڑا تھا۔ اُس کا قد اتنا لمبا تھا کہ عام انسان سے زیادہ تھا۔ اُس نے دونوں بازو کندھوں کی سیدھ میں دائیں بائیں پھیلا رکھے تھے جیسے حسن کو آگے بڑھنے سے روک رہا ہو۔ اُس کا سر گول نہیں بلکہ لمبوترا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔

حسن رک گیا۔ دل پر خوف کی گرفت ایسی جیسے ایک مضبوط ہاتھ اُس کے دل سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑنے کے لئے شکنجے کی طرح دباتا جا رہا ہو۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ کھوپڑی اس خوفناک آدمی کے قدموں میں رکھ دے گا۔ بجلی بار بار چمکتی اور کڑکتی تھی۔ اس چمک سے حسن کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ بارش بڑی ہی تیز تھی۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے یہ غیر معمولی طور پر لمبا تڑنگا انسان اوپر نیچے اور دائیں بائیں حرکت کر رہا ہو، پھر ایک بار اُسے یوں لگا جیسے یہ آدمی آگے بڑھ رہا ہو۔

اچانک حسن کی مردانگی بیدار ہو گئی۔ یہ شاید موت سے بچنے کی آخری کوشش تھی۔ اُس نے تلوار نکالی اور بڑی ہی تیزی سے آگے بڑھ کر تلوار اس آدمی کے پیٹ میں گھونپی۔ اُسے امید تھی کہ جس طاقت سے اُس نے یہ وار کیا ہے، تلوار اس پُراسرار آدمی کے پیٹ میں سے گذر کر پیٹھ کی طرف سے نکل جائے گی لیکن تلوار کی نوک بھی پیٹ میں نہ گئی۔ حسن نے بجلی کی سی تیزی سے تلوار پیچھے کھینچی اور اس طرح تلوار پہلو کی طرف چلائی جس طرح تلوار کا وار کیا جاتا ہے لیکن اُس کے اپنے ہاتھ کو بڑی زور سے جھٹکا لگا اور تلوار پیچھے کو آ گئی۔ اس آدمی کے بازو پھیلے رہے۔ حسن اس سے ایک دو قدم ہی دور تھا۔ اب جو بجلی چمکی تو حسن نے آگے بڑھ کر اس کو ہاتھ لگایا تب اُسے پتہ چلا کہ یہ ایک ٹُنڈ مُنڈ درخت ہے جو خشک ہو چکا ہے اور اس کے ٹوٹے ہوئے دو ٹُہن دائیں اور بائیں پھیلے ہوئے ہیں۔

حسن کھوپڑی اور بازوؤں کی ہڈیوں کو مضبوطی سے پکڑے دوڑ پڑا۔ قبرستان سے نکلتے نکلتے وہ دو تین بار پھسل کر گرا اور جب قبرستان سے نکل آیا تو ذرا آرام سے چلنے لگا۔ عبدالملک ابنِ

عطاش نے اُسے کہا تھا کہ وہ گھر میں اُس کا منتظر ہوگا خواہ ساری رات گذر جائے۔

حسن اُس کے گھر پہنچا تو وہ جاگ رہا تھا۔ حسن کے کپڑوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ گھٹنوں تک کیچڑ تھا۔ کچھ تو وہ بارش کی وجہ سے کانپ رہا تھا اور کچھ خوف سے۔ اُس نے کھوپڑی اور ہڈیاں ابنِ عطاش کے آگے رکھ دیں۔ ابنِ عطاش نے اُسے شاباش دی پھر اُس کے کپڑے تبدیل کرائے اور پوچھا کہ وہ ڈرا تو نہیں؟

"میں بتا نہیں سکتا کہ میں کتنا زیادہ ڈر گیا تھا" ــــ حسن بن صباح نے جواب دیا۔ چند لمحے سوچ کر کہنے لگا ــــ "محترم اتالیق! کیا یہ بھی میری تربیت کے لئے ضروری ہے؟"

"اتنا ہی ضروری جتنا جسم کے لئے پانی اور ہوا کی ضرورت ہے" ــــ ابنِ عطاش نے کہا ــــ "اب بتا یہ ہڈیاں قبر سے تُو کیسے نکال لایا؟"

حسن نے تفصیل سے سنایا کہ اُس پر کیا گذری ہے۔

"محترم اتالیق!" ــــ حسن نے کہا ــــ "میں نے آج رات سچ مان لیا ہے کہ کسی برگزیدہ شخصیت کی قبر اور اس کی ہڈیوں کے ساتھ یہ سلوک کرو جو میں نے کیا ہے تو اُسی وقت عذاب نازل ہوتا ہے" ــــ اُس نے ڈری ہوئی سی آواز میں پوچھا ــــ "کیا مجھ پر مزید عتاب نازل ہوگا؟"

○

"نہیں!" ــــ ابنِ عطاش نے جواب دیا ــــ "جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ راز کی ایک بات ہے۔ اسے دل اور دماغ میں محفوظ کر لے۔ تُو مُردے کی قبر میں اترا تجھ پر بھیڑیئے ٹوٹ پڑے ہڈیوں کو ہاتھ لگایا تو بجلیاں کڑکنے لگیں۔ کیا اس سے تُو یہ نہیں سمجھا کہ مرے ہوئے انسان میں بھی طاقت ہوتی ہے؟ کیا تُو نے کبھی روح یا بدروح نہیں سنی؟ میں نے تجھے کس علم میں ڈال دیا ہے' یہ علم تجھے روحوں اور بدروحوں سے ملاقات کرائے گا اور یہ علم تجھے یہ بھی سکھائے گا کہ مرے ہوئے انسانوں میں جو طاقت ہوتی ہے وہ تیرے قابو میں آجائے اور اسے تُو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرے لیکن ابھی نہیں۔ یہ طاقت تجھے کہیں سے حاصل ہوگی اور اپنی ہڈیاں تڑوا کر تُو یہ طاقت حاصل کرے گا۔ جہنم کی آگ میں سے گذر کر تُو جنت میں داخل ہوگا"۔

عبدالملک ابنِ عطاش نے اسے کھوپڑی اور ہڈیوں کے متعلق ایک سبق دیا اور اسے گھر بھیج دیا۔

○

اگلے دن حسن بن صباح شہر کے قریب سے گذرنے والی ندی کے کنارے ٹہل رہا تھا۔ اُس کے دماغ میں اپنے استاد کے سبق گھوم رہے تھے۔ گذشتہ رات کی طوفانی بارش سے ندی کی کیفیت تھی اور ہر طرف کیچڑ تھا۔ حسن نے تنہائی میں' شہر کے ہنگامے سے دور کسی جگہ بیٹھ کر نجوم اور سحر کے سبق دہرانے تھے۔ کیچڑ میں وہ بیٹھنے کے لئے کوئی خشک جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔

کچھ دور جا کر اُسے اتنا بڑا پتھر پڑا نظر آگیا جس پر وہ آسانی سے بیٹھ سکتا تھا۔ وہ اُفق سے ابھرتے ہوئے سورج کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا' آنکھیں بند کر لیں اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ اُس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ اس کے سامنے سورج ہونا چاہئے تھا لیکن سورج نہیں تھا۔ اس کی بجائے ایک رنگ دار کپڑا تھا جو اُس کے اور سورج کے درمیان آگیا۔ حسن سُن سا ہو گیا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے اور بہت ہی آہستہ آہستہ نظریں اوپر اٹھائیں۔ اُسے ایک بڑا ہی حسین نسوانی چہرہ نظر آیا... یہ ایک نوخیز لڑکی کا چہرہ تھا۔ ہونٹوں پر ادھ کھلی کلی جیسی مسکراہٹ تھی۔ لڑکی اُس سے صرف ایک قدم دور کھڑی تھی۔

حسن ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ یہ چہرہ پہلے بھی کہیں دیکھا ہے' کہاں دیکھا ہے؟

اُسے یہ خیال بھی آیا کہ یہ سحر کا کرشمہ ہوگا۔

"پہچاننے کی کوشش کر رہے ہو؟" ــــ لڑکی کی آواز میں ترنم تھا۔

حسن بن صباح نے سر کو ہلایا کہ ہاں' وہ پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔

"میں تنی دیر تمہارے سامنے برہنہ بیٹھی رہی تھی" ــــ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" ــــ حسن کو یاد آگیا ــــ "تم وہ ہو .... ایک بات بتاؤ .... کیا تم حقیقت ہو یا میرے استاد کا تخلیق کیا ہوا تصور ہو جو اُس نے حقیقی روپ میں میرے ذہن میں ڈال دیا ہے؟"

"ہو' دیکھ لو" ــــ لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھ حسن کے آگے کر کے کہا ــــ "میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر محسوس کرو کہ میں تصور ہوں یا جیتی جاگتی ایک لڑکی ہوں"۔

حسن نے اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں پر لے کر دبائے' ان کی حرارت محسوس کی' ان کا گداز

محسوس کیا۔

"تم کون ہو؟" ـــــ حسن نے جھنجلا کر پوچھا ـــــ "کیا ہو تم؟ اگر تم حقیقت میں لڑکی ہی ہو تو کس کی بیٹی ہو؟ ـــــ تم آبرو باختہ لڑکی ہو جو برہنہ ایک نوجوان مرد کے سامنے بند کمرے میں بیٹھی رہی ہو"۔

"میری آبرو محفوظ ہے" ـــــ لڑکی نے کہا ـــــ "اگر میں ایسی ہوتی جیسی تم کہہ رہے ہو تو عبدالملک ابنِ عطاش جیسا درویش مجھ سے منہ نہ لگاتا۔ میں کنواری ہوں حسن! میری طرف بہت سے ہاتھ بڑھے ہیں، مجھ پر دو جاگیرداروں کے بھی ہاتھ لپکے ہیں۔ میں کسی کے ہاتھ نہیں آئی"۔

"تم کس باپ کی بیٹی ہو؟" ـــــ حسن نے پوچھا۔

"میرا باپ گڈریا ہے" ـــــ اُس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا ـــــ "وہ دیکھو میری بکریاں!"

حسن نے گردن گھما کر بکریاں دیکھ تو لیں لیکن اس کی دلچسپی لڑکی کے ساتھ تھی۔

"تم میرے سامنے برہنہ کس طرح بیٹھ گئی تھیں؟" ـــــ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"اُس برگزیدہ آدمی نے حکم دیا تھا جسے ہم پیرو مرشد مانتے ہیں" ـــــ لڑکی نے جواب دیا ـــــ "میں ان کے حکم کو ٹال نہیں سکتی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ یہ آدمی تجھ پر ہاتھ ڈالے تو مجھے آواز دینا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کواڑ کے چھوٹے سے سوراخ سے دیکھتے رہیں گے"۔

"کیا اب بھی تم میرا امتحان لینے آئی ہو؟" ـــــ حسن نے پوچھا۔

"نہیں!" ـــــ لڑکی نے جواب دیا ـــــ "اب اپنے دل کے کہنے پر آئی ہوں۔ تمہارے لئے آئی ہوں..... اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میں تمہارے ساتھ جسموں کا لین دین کرنے نہیں آئی۔ اگر تم قبول کر لو تو اپنے دل میں جگہ دے دو، پھر ہم ساری عمر کا ساتھ نبھائیں گے..... تم تو بولتے ہی نہیں۔ کچھ کہو نا!"

لڑکی کا حسن ایسا تھا کہ حسن بن صباح جیسے کردار کا نوجوان کہہ ہی نہیں کہ وہ اسے دل میں جگہ نہیں دے گا لیکن اُس کے دل پر اُس کے استاد عبدالملک ابن عطاش کا قبضہ تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کا دل اپنے اختیار میں نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُسے یہ ڈر تھا کہ یہ بھی امتحان ہے۔ اُس نے اس امتحان میں پورا اترنے کا تہیہ کر لیا۔

وہ پتھر پر بیٹھا تھا۔ لڑکی زمین پر بیٹھ گئی اور ہاتھ اُس کے زانو پر رکھ دیئے پھر اُس نے اپنی ٹھوڑی بھی اُس کے ایک زانو پر رکھ دی۔ لڑکی کے سر پر سیاہ چادر تھی۔ اس میں اُس کا گورا چہرہ اور ایک گال پر لہراتے دو تین بال جو ریشم کے تاروں جیسے تھے، حسن جیسے نوجوان کو اس لڑکی کے قدموں میں بٹھا سکتے تھے۔

"تمہارا نام؟" ـــــ حسن نے پوچھا۔

"فرح!" ـــــ لڑکی نے جواب دیا ـــــ "نام تو فرحت ہے، گھر والے فرح کہتے ہیں، سہیلیاں فرحی کہتی ہیں۔ تم بھی فرحی کہو تو مجھے اچھا لگے گا"۔

"ایک بات بتاؤ" ـــــ حسن نے پوچھا ـــــ "تمہیں مجھ میں کیا خوبی نظر آئی ہے کہ جاگیرداروں کو ٹھکرا کر تم میرے پاس چلی آئی ہو؟"

"یہ میرے دل کا معاملہ ہے" ـــــ لڑکی نے کہا ـــــ "جاگیرداروں نے تو میرے باپ کو دولت پیش کی تھی۔ میرا باپ ہے تو گڈریا لیکن عزت اور غیرت والا آدمی ہے۔ ایک بات اور بھی ہے۔ میرے باپ نے امام سے بات کی تھی"۔

"امام کون؟"

"وہ جو تمہارے استاد ہیں" ـــــ لڑکی نے جواب دیا ـــــ "عبدالملک ابنِ عطاش..... انہوں نے کہا تھا کہ اس لڑکی کو ضائع نہ کرنا اور دولت کی چمک سے اندھے ہو کر اس کا ہاتھ کسی امیر کبیر کے ہاتھ میں نہ دے دینا۔ اس لڑکی کی زندگی کا راستہ کوئی اور ہے..... میں امام کے گھر جاتی رہتی ہوں۔ انہوں نے مجھے کہا ہے اپنی عصمت کو پاک رکھنا اور اپنا جسم صرف اپنے خاوند کو پیش کرنا..... میں تمہیں اپنا خاوند بنانا چاہتی ہوں"۔

"میں نے پوچھا تھا کہ تم نے مجھ میں کیا خوبی دیکھی ہے؟"

"میں نے کہا تھا کہ یہ میرے دل کا معاملہ ہے" ـــــ لڑکی نے جواب دیا ـــــ "تم میں وہ مردانگی ہے جو مجھے اچھی لگی ہے۔ میں اتنی دیر تمہارے سامنے برہنہ بیٹھی رہی اور تم نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بڑے مضبوط مرد ہو اور دلوں کی محبت کا مطلب سمجھتے ہو"۔

فرحی معصوم سی لڑکی تھی اور ایک گڈریے کی بیٹی تھی۔ وہ عالم اور فلسفی نہیں تھی کہ تجزیہ کر کے بتا سکتی کہ وہ حسن کی محبت میں کیوں گرفتار ہوئی ہے۔ اُس نے ایسے انداز سے حسن کو اپنی محبت وفا کا یقین دلایا کہ حسن نے اُس کی محبت کو قبول کر لیا۔

"فرحی!" — حسن نے کہا — "تم میرے دل پر غالب آ گئی ہو لیکن میں اپنے بزرگ استاد سے اجازت لے کر تمہیں جواب دوں گا"۔

"کل یہاں آؤ گے؟" — فرحی نے پوچھا۔

"آجاؤں گا" — حسن نے جواب دیا۔

فرحی چلی گئی۔

○

ابو مُسلم رازی رے کا حاکم تھا۔ رے ایران کا بہت بڑا شہر تھا۔ تجارتی مرکز تھا اور اتنا زیادہ پھیل گیا تھا کہ اس کی وسعت صوبے جیسی ہو گئی تھی۔ اتنے وسیع و عریض شہر کے لئے بڑے ہی دانشمند اور قابل حاکم کی ضرورت تھی۔ ابو مسلم رازی میں یہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ بعض تاریخوں میں اسے رے کا سلطان لکھا گیا ہے۔ یہ صحیح نہیں' البتہ یہ صحیح ہے کہ اسے تقریباً "سلطان کے اختیارات حاصل تھے' یعنی وہ سلطان سے اجازت لئے بغیر انتہائی اہم فیصلے کر سکتا تھا۔ کٹر اہلِ سنت والجماعت تھا۔

داستان گو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہے کہ حسن بن صباح کی زندگی بڑی ہی پُراسرار تھی۔ جنت بنانے تک اُس کی زیادہ تر سرگرمیاں زمین دوز رہی ہیں۔ وہ کس طرح ایسی شخصیت بنا کہ اُس کے پیروکاروں کا حلقہ پھیلتا ہی چلا گیا؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب قلمبند کرنا آسان نہیں۔ یہ اُس کی پس پردہ جدوجہد تھی جس میں مورخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً "کسی واقعہ میں بعض نے لکھا کہ اُس وقت حسن کی عمر اتنی تھی لیکن بعض نے کچھ اور ہی عمر لکھی۔ بعض شخصیات اور کرداروں کے ناموں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔

ہماری تاریخ کا یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ اسلام میں فرقہ بندی جڑ پکڑ چکی ہے۔ تاریخ ہر فرقے کے تاریخ نویسوں نے لکھی۔ جس سے تاریخ کے ساتھ یہ زیادتی ہوئی کہ لکھنے والوں نے اپنے اپنے فرقے کے نظریات' مفادات اور تعصبات کو سامنے رکھا اور واقعات کو مسخ کر ڈالا۔

جب ایک ہی واقعہ مختلف تاریخوں میں مختلف شکلوں میں نظر آتا ہے تو ہمیں تمام تر پس منظر کو غور سے دیکھ کر فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا۔ یہ امر کتنا افسوسناک ہے کہ مسلمانوں نے فرقوں میں تقسیم ہو کر اپنی تاریخ کو بھی فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ حسن بن صباح اپنے استاد عبدالملک ابنِ عطاش کے ہاں بیٹھا تھا اور اُسے سنا رہا تھا کہ فرحی اُسے ملی تھی اور اُس نے کیا کہا تھا۔

"ایسی ہی ایک لڑکی نے تیری زندگی میں داخل ہونا تھا" — ابنِ عطاش نے کہا — "لیکن ابھی تیری شادی نہیں ہو گی۔ اُس نے کہہ دیا ہے کہ وہ تجھے چاہتی ہے تو وہ تجھے ہی چاہتی رہے گی۔ کوئی اُس کے آگے دولت کے ڈھیر لگا دے گا تو وہ قبول نہیں کرے گی۔ وہ ہمیشہ تمہاری رہے گی"۔

"لیکن محترم اتالیق!" — حسن نے کہا — "کوئی شاہی جاگیردار اُسے اغوا نہ کرا لے"۔

"نہیں!" — ابنِ عطاش نے کہا — "اُسے کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ میں نے اس کے گرد حصار کھینچ دیا ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی جابر اور کتنا ہی بڑا حاکم کیوں نہ ہو' فرحی کو بُری نیت سے پھانسنے کی کوشش کرے گا تو منہ کی کھائے گا"۔

"میں تو سمجھا تھا کہ آپ نے میرا امتحان لینے کے لئے اُسے میرے پاس بھیجا ہے" — حسن نے کہا۔

"نہیں!" — ابنِ عطاش نے کہا — "یہ کوئی امتحان نہ تھا لیکن یہ بات دماغ میں رکھ لے حسن! خوبصورت عورت مرد کے لئے بہت بڑا امتحان ہوتی ہے۔ میں تجھے یہ سبق دے چکا ہوں۔ فرحی جیسی حسین لڑکی تجھ پر اپنا نشہ طاری کر کے تیری کھال بھی اتار سکتی ہے۔ آگے چل کر میں تجھے بتاؤں گا کہ دوسروں کو پھانسنے کے لئے عورت کو جال میں دانے کے طور پر کس طرح استعمال کیا جاتا ہے"۔

"تو کیا میں فرحی سے مل سکتا ہوں؟"

"ہاں!" — ابنِ عطاش نے جواب دیا — "تو اُسے مل سکتا ہے۔ تو اُس کے ساتھ پیار محبت کی باتیں کر سکتا ہے' اور تیرا امتحان ہو گا کہ تو گناہ سے دامن بچا کر رکھنے کے قابل ہو جائے"۔

"کیا آپ مجھے پارسا بنائیں گے؟"

"نہیں!" — ابنِ عطاش نے کہا — "کبھی ایسے سوال مت پوچھ۔ میں ابھی تجھے اندر اور باہر سے مضبوط کر رہا ہوں.... اب اپنے گھر چلا جا۔ میں تجھے پھر کہتا ہوں کہ کسی کو نہیں بتانا کہ میں تجھے کیسی تعلیم اور کیسی تربیت دے رہا ہوں۔ میں آج تجھے کوئی اور سبق نہیں دوں گا" کچھ لوگ آرہے ہیں"۔

حسن بن صباح اپنے استاد کے گھر سے نکل رہا تھا کہ چار آدمی حویلی میں داخل ہوئے۔

○

عبدالملک ابنِ عطاش انہی آدمیوں کے انتظار میں تھا۔

"کیا یہی وہ لڑکا ہے جسے آپ تیار کر رہے ہیں؟" — ایک آدمی نے پوچھا — "ہم نے اسے باہر نکلتے دیکھا ہے"۔

"ہاں!" — ابنِ عطاش نے جواب دیا — "یہی ہے"۔

"کیا یہ ہمارے محاذ اور مقصد کے لئے تیار ہو جائے گا؟" — اسی آدمی نے پوچھا۔

"مجھے پوری امید ہے" — ابنِ عطاش نے جواب دیا — "میں نے تمہیں پہلے بتایا ہے کہ اس نوجوان میں جس کا نام حسن بن صباح ہے میں نے ایسے جوہر دیکھے ہیں جو شاذ و نادر ہی کسی آدمی میں پائے جاتے ہیں۔ ایسی صلاحیتوں اور ایسے اوصاف والا انسان اللہ کا برگزیدہ اور لوگوں کا مرشد بنتا ہے یا مجسم ابلیس بن جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ لوگوں میں مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ مقبولیت بھی ایسی کہ اس کے مرید اور معتقد اس کے اشاروں پر ناچتے بلکہ اس کے اشارے پر جان تک قربان کر دیتے ہیں"۔

"یہ لڑکا کس طرف جاتا نظر آتا ہے؟"

"میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا" — ابنِ عطاش نے جواب دیا — "مجھے شک ہے کہ اس میں ابلیسی اوصاف کچھ زیادہ ہیں۔ اگر یہ اس راستے پر چل نکلا تو بھی ہمارے لئے سود مند ہوگا۔ رہے گا میرے قبضے میں ہی۔ میں اس کو روحانی تقویت دے رہا ہوں"۔

"کیا ہمیں تبلیغ کا کام تیز نہیں کر دینا چاہیے؟"

"تبلیغ تو ہو رہی ہے" — ابنِ عطاش نے جواب دیا — "لیکن ہم یہ کام آزادی سے

نہیں کر سکتے کیونکہ حکومت اہلِ سنّت کی ہے اور آبادی کی اکثریت بھی سُنّی ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں ہماری تبلیغ دیہات میں زیادہ ہونی چاہیے۔ وہاں پکڑے جانے کا خطرہ کم ہے"۔

"ہم نے دیہاتی علاقوں میں اپنے عقیدے کی تبلیغ کے لئے مبلّغ بھیجنے شروع کر دیئے ہیں" — ایک آدمی نے کہا۔

"صرف تبلیغ کافی نہیں" — ابنِ عطاش نے کہا — "حکومت اپنے ہاتھ میں آنی چاہیے۔ حکومت ہاتھ آجائے تو ہم سُنّی مسلک کو آسانی سے ختم کر کے لوگوں کو بتا سکتے ہیں کہ اصل اسلام ہمارے پاس ہے.... لیکن حکومت آسانی سے ہاتھ نہیں آئے گی۔ ہمیں مصر کے عبیدیوں کی مدد حاصل کرنی پڑے گی"۔

"میں ایک شک میں پڑ گیا ہوں" — ایک اور بولا — "مصر کے حکمران تو عبیدی ہی ہیں لیکن سنا ہے وہ باطنی ہیں"۔

"نہیں!" — ابنِ عطاش نے کہا — "وہ پکے اسماعیلی ہیں اور وہ ہماری مدد کو ضرور آئیں گے۔ میں انہیں سلجوقی سلطنت پر حملے کے لئے اکساؤں گا لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ اِدھر ہمارے لوگ تیار ہوں لیکن یہ تیاری پوشیدہ رہے۔ مصری حملہ آور آئیں اور ہمارے لوگ ہتھیار بند ہو کر ان سے جا ملیں۔ اتنی تیاری کے لئے بہت وقت چاہیے"۔

اسی شہر رے کے حاکم ابو مسلم رازی کے پاس دو سپہ سالار بیٹھے تھے۔ دو آدمی اور بھی تھے جو فوجی نہیں لگتے تھے۔ یہ دونوں جاسوسی اور مخبری کے محکمے کے حاکم تھے۔

"....اپنے مخبروں کو اور تیز کرو" — ابو مسلم رازی نے کہا — "میں تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ شہر سعدؓ بن ابی وقاص نے فتح کیا تھا اور آتش پرست ایرانیوں کو اٹھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ سلطنتِ کسریٰ کے تابوت میں آخری کیل یہیں ٹھونکی گئی تھی۔ ان اوّلین مجاہدین نے یہاں اسلام کا نُور پھیلایا تھا۔ ان کی قبروں کے کہیں نشان نہیں ملتے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی ہڈیاں یہیں دفن ہیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں جانیں قربان کی تھیں۔ ان کی روحیں یہیں ہیں۔ ہمیں دیکھ رہی ہیں اور یقیناً بے چین ہوں گی کہ اُمّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ہو گیا ہے کہ فرقوں میں بٹ گئی ہے....

"میرے رفیقو! میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا اور یہ بات معمولی سے دماغ کا آدمی بھی سمجھ

سکتا ہے کہ ملت میں اتحاد تھا تو مجاہدین نے تھوڑی سی تعداد میں دنیا کی اُس وقت کی دو سب سے بڑی جنگی طاقتوں، قیصرِ روم اور کسریٰ فارس، کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا مگر آج وہی ملت فرقوں میں بٹ کر خانہ جنگی کے خطرے میں آن پڑی ہے۔ اس کا فائدہ اسلام اور سلطنتِ اسلامیہ کے دشمنوں کو پہنچے گا"۔

"ہمیں مصر کی طرف سے چوکنا رہنا چاہئے" ـــــ جاسوسی نظام کے ایک حاکم نے کہا ـــــ "وہاں کے حکمران اسماعیلی کہلاتے ہیں لیکن ہماری اطلاع یہ ہے کہ وہ فرقہ باطنیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اسماعیلیوں کو بدنام کر رہے ہیں۔ خطرہ یہ ہے کہ وہ اسماعیلیوں کو دھوکے میں اپنے ساتھ ملا کر ہم پر حملہ کر سکتے ہیں"۔

"ہاں!" ـــــ ابو مسلم رازی نے کہا ـــــ "آپ کے جاسوسوں کی تمام اطلاعات میرے سامنے ہیں۔ مصر میں اپنے جاسوسوں کا موجود رہنا بہت ضروری ہے، اور یہاں اس شہر کے ہر گھر اور ہر فرد پر نظر رکھیں۔ اسلام کی وحدت کو پیشِ نظر رکھیں۔ قرآن کے اس فرمان کو اپنی حکومت کا بنیادی اصول بنائیں کہ اُمتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جماعت ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی تھے۔ آپؐ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ یہ فرقے بعد میں پیدا ہوئے اور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ نبیوں نے نہیں عام قسم کے انسانوں نے بنائے ہیں اور یہ اس اسلام کے منافی ہیں جس کے ہم پیرو کار ہیں۔ اصل اسلام وہ ہے جو اللہ کے آخری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے تھے۔ یہاں کسی کے متعلق پتہ چلے کہ وہ فرقہ بندی کو ہوا دے رہا ہے تو مجھے اطلاع دو۔ میں اُسے ساری عمر کے لئے قید خانے میں ڈال دوں گا"۔

○

وقت گزرتا چلا گیا۔ عبدالملک ابنِ عطاش نے حسن بن صباح کی تربیت جاری رکھی۔

حسن بھی بڑا خوبصورت جوان نکلا۔ عیاری اور فریب کارانہ اداکاری میں تو اُس نے مہارت حاصل کر لی۔ فرحی کے ساتھ اُس کی ملاقاتیں جاری رہیں۔ فرحی غیر معمولی طور پر دلیر لڑکی نکلی جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اُسے ابنِ عطاش کی حوصلہ افزائی حاصل تھی۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ ابنِ عطاش کی مرید تھی اور اُس کی ہر بات کو فرحی آسمان سے اُتری ہوئی بات سمجھتی تھی۔ ابنِ عطاش نے اُسے کہہ دیا تھا کہ اُس کی زندگی کا ساتھی حسن

بن صباح ہے"۔

حسن بن صباح پر پہلے جو خوف سا طاری رہتا تھا، وہ اب ختم ہو چکا تھا۔ اُسے ابن عطاش نے کئی بار آدھی رات کے وقت قبرستان میں بھیجا تھا۔ ہر بار وہ حسن کو مُردے کی کوئی نہ کوئی ہڈی لانے کو کہتا تھا یا قبرستان میں بیٹھ کر کوئی عمل کرنا ہوتا تھا۔

ایک رات حسن قبرستان میں دو پرانی قبروں کے درمیان بیٹھا کوئی عمل کر رہا تھا۔ اُس رات بھی چاند پورا تھا۔ وہ اپنے عمل میں محو تھا کہ اُس کے قریب "سی سی" کی آوازیں اُٹھیں۔ اُس نے ذہن کو ایک مقام پر کرنے اور دنیا سے لاتعلق ہو جانے کی اس قدر مہارت حاصل کر لی تھی کہ اُسے جیسے یہ آواز سنائی ہی نہ دی ہو۔ اُس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

اس نے اپنے عمل کے مطابق آنکھیں کھولیں تو وہ چونک پڑا۔ اُس سے صرف دو قدم کے فاصلے پر اُس کے سامنے سیاہ کالا ایک ناگ پھن پھیلائے ہوئے "سی سی" کر رہا تھا۔ استاد نے اُسے بتا رکھا تھا کہ قبرستان میں سانپ ہوتے ہیں۔ اگر کبھی سانپ سے آمنا سامنا ہو جائے تو وہ بے حس ہو جائے۔ کوئی حرکت نہ کرے۔ اس سے سانپ کو یہ تاثر ملے گا کہ یہ کوئی بے جان چیز ہے جس سے اُسے کوئی خطرہ نہیں۔ پھر سانپ چلا جائے گا۔

حسن بن صباح نے ناگ کو دیکھا تو پتھر مار کر اُسے بھگانے کی بجائے بیٹھا رہا اور انگلی تک نہ ہلائی۔ ناگ اُسے دیکھتا رہا اور اس کا پھن دائیں بائیں جھولتا رہا۔ حسن نے ننگی تلوار زمین میں گاڑ رکھی تھی۔ اُس نے تلوار کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔ اُس کے دل میں خوف آنے لگا لیکن اُس نے ہوش ٹھکانے رکھے۔

ناگ ذرا سا آگے آیا۔ حسن کے لئے اپنے آپ پر قابو پانا محال ہو گیا۔ اُس کے لئے دو ہی صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ اٹھ کر بھاگ جائے، دوسری یہ کہ تیزی سے زمین سے تلوار اکھاڑے اور ناگ کو مارے لیکن ناگ نے اپنا پھن لپیٹا اور پیچھے کو مڑ کر چلا گیا۔ حسن نے اپنا عمل مکمل کیا اور گھر چلا گیا۔

○

اگلی صبح عبدالملک ابن عطاش کے ہاں گیا۔ پہلے اُسے بتایا کہ اُس نے عمل مکمل کر لیا ہے پھر بتایا کہ ایک ناگ اُس کے سامنے آ گیا تھا۔ اُس نے تفصیل سے سنایا کہ ناگ کس طرح آیا

اور کس طرح گیا۔

"سانپ سانپ کو نہیں ڈسا کرتا" ــــ ابنِ عطاش نے کہا۔ "میری بات سمجھ..."

میں تجھے اسی مقام پر لانا چاہتا تھا۔ تو اپنی منزل کے آدھے راستے تک پہنچ گیا ہے۔ اب منزل تک تجھے کوئی اور پہنچائے گا۔ میری استادی یہاں پر ختم ہو جاتی ہے"۔

"تو کیا مجھے کوئی اور استاد ڈھونڈنا پڑے گا؟" ــــ حسن نے پوچھا ــــ "یا آپ مجھے کسی کے پاس بھیجیں گے؟"

"اس سوال کا جواب تجھے خواب میں ملے گا" ــــ ابنِ عطاش نے جواب دیا ــــ "گزشتہ رات کا عمل جو تجھ سے کروایا ہے' وہ کوئی معمولی عمل نہیں۔ ناگ کا تمہارے پاس آنا اور تجھے ڈسے بغیر چلے جانا اس عمل کی کامیابی کا ثبوت ہے۔ اگر تو بھاگ آتا یا ناگ تجھے ڈس لیتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ تو نے عمل صحیح نہیں کیا یا عمل کسی اور وجہ سے ناکام ہو گیا ہے۔ پانچ سات دنوں کے اندر تو خواب میں کچھ دیکھے گا۔ وہ ایک راستہ ہو گا جو بہت ہی دشوار گزار ہو سکتا ہے اور بالکل آسان بھی...

"میری دعا ہے کہ تجھے راستہ دشوار نظر آئے۔ سکھ دکھوں میں سے گزر کر ہی ملتا ہے۔ دولت آسانی سے ہاتھ آجائے تو انسان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ خون پسینہ بہا کر اور محنت مشقت سے اپنی ہڈیاں تڑوا کر پیسہ پیسہ اکٹھا کیا جائے تو انسان اس پیسے کی قدر کرتا ہے۔ اگر گلاب کے پھول کے ساتھ کانٹے نہ ہوں تو اس پھول کی قدر و قیمت ختم ہو جائے...

"گزشتہ رات کے عمل نے تیرے دل و دماغ پر ایسا اثر چھوڑ دیا ہے کہ تو ایک خواب دیکھے گا۔ تو کہیں جا رہا ہو گا۔ اس راستے کو ذہن میں محفوظ کر لینا۔ جونہی آنکھ کھلے کاغذ قلم لے کر یہ راستہ اور اس کے اشارے کاغذ پر اتار لینا۔ ہو سکتا ہے خواب میں تمہیں دو پہاڑوں کے درمیان ایک وادی نظر آئے۔ ایک غار بھی نظر آئے گا۔ اسے ذہن میں محفوظ کر لینا"۔

"محترم اتالیق!" ــــ حسن نے پوچھا ــــ "کیا یہ خدائی اشارہ ہو گا؟"

عبدالملک ابنِ عطاش نے سر جھکا لیا اور کچھ دیر کچھ بھی نہ بولا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے شاگرد کے اس سوال کا جواب نہ دینا چاہتا ہو۔ اس نے آخر سر اٹھایا اور نظریں اپنے شاگرد کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

"اگر یہ کوئی راز کی بات ہے تو نہ بتائیں محترم اتالیق!" ــــ حسن نے کہا۔

"ہاں حسن!" ــــ ابنِ عطاش نے کہا ــــ "بات راز کی ہی ہے لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ یہ راز بھی تجھے دے دوں۔ تو اس قابل ہو گیا ہے کہ ہر راز کو اپنے سینے میں محفوظ رکھ سکتا ہے۔

"میں نے آج تک تجھے جو سبق دیئے ہیں اور جو عمل کروائے ہیں اور گزشتہ رات کا جو عمل تھا' یہ خدائی عمل نہیں۔ یہ ابلیسی علم ہے۔ اس سے تجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے... کیا تو اپنے آپ میں روحانی سکون محسوس نہیں کر رہا؟"

"ہاں محترم اتالیق!" ــــ حسن نے جواب دیا ــــ "میں آپ کو بتانا یہ چاہتا تھا کہ میں اپنے آپ میں ایسا سکون محسوس کرتا ہوں جیسے میں فضا میں اڑ رہا ہوں' اور اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ میرے وجود میں ایک طاقت آگئی ہے جو چٹانوں کے بھی جگر چاک کر سکتی ہے"۔

"میں تجھے بتاتا ہوں" ــــ ابنِ عطاش نے کہا ــــ "تیرے اندر ایسے اوصاف غالب تھے جو ایسے ہی عملیات سے تجھے سکون اور طاقت دے سکتے تھے۔ یہ سب ابلیسی عملیات ہیں جنہیں اسلام نے گناہ قرار دیا ہے۔ یہ علم فرعونوں کے زمانے میں بھی تھا اور پھر اس علم کو یہودیوں نے اپنا لیا اور اس میں شہرت حاصل کی... تو نے ایک بار کہا تھا کہ تو فرعون بننا چاہتا ہے۔ میں نے تیرے اندر اتنی طاقت پیدا کر دی ہے کہ تو اس غار تک پہنچے گا جو تجھے خواب میں نظر آئے گا۔ وہاں تیرا یہ علم مکمل ہو جائے گا۔ اب یہ مت سوچ کہ یہ علم خدائی ہے یا ابلیسی"۔

یہ سحر کا علم تھا جسے آجکل کالا جادو کہا جاتا ہے۔ ابنِ عطاش اس علم میں جتنی دسترس رکھتا تھا وہ اس نے حسن کے دماغ میں ڈال دیا تھا۔ اس دوران وہ حسن کو علمِ نجوم بھی پڑھاتا رہا تھا۔

تیسرے چوتھے دن حسن بن صباح ایک کاغذ اٹھائے اپنے استاد کے ہاں دوڑا گیا اور کاغذ اس کے آگے رکھ کر کہا کہ میں نے خواب میں یہ راستہ دیکھا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ یہ راستہ اگر خواب جیسا ہی ہے تو بہت ہی خوفناک ہے۔ وہاں تک زندہ پہنچنا مشکوک نظر آتا ہے۔

"میں جانتا ہوں" ــــ ابنِ عطاش نے کہا ــــ "اگر تو نے یہ سفر بخیر و خوبی کر لیا تو سمجھ لے کہ تو نے ساری دنیا فتح کر لی۔ کل اس وقت نکل جا جب تجھے فجر کی اذان سنائی دے"۔

اگلے روز جب سورج افق سے ابھرا تو شہر سے کوسوں دور دو گھوڑے جا رہے تھے۔ ایک پر حسن بن صباح سوار تھا اور دوسرے گھوڑے پر فرحی سوار تھی۔ گزشتہ روز جب وہ فرحی سے ملا تو اُس نے فرحی کو بتایا کہ وہ کس سفر پر روانہ ہو رہا ہے۔ فرحی نے کہا کہ وہ بھی ساتھ جائے گی۔ حسن نے اُسے روکنے کے لئے بہت کچھ کہا لیکن فرحی نہ مانی۔ وہ تو اُس کے پیچھے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

"میری زندگی تمہارے ساتھ ہے حسن!" — فرحی نے کہا تھا — "میں پیچھے رہ گئی تو کسی جاگیردار یا کسی امیر وزیر کے ہاتھ چڑھ جاؤں گی۔ امام عبدالملک کب تک میری حفاظت کریں گے۔ تم جس سفر پر جا رہے ہو یہ بڑا خطرناک ہے۔ معلوم نہیں زندہ لوٹ سکو گے یا نہیں۔ میں تمہارے ساتھ جینا اور تمہارے ساتھ مرنا چاہتی ہوں۔ اگر تم ساتھ نہیں لے چلو گے تو میں تمہارے پیچھے پیچھے آجاؤں گی۔ اس شہر میں نہیں رہوں گی"۔

حسن بن صباح اتنا مجبور ہو گیا کہ وہ فرحی کو روک نہ سکا۔ حسن تو اپنے گھر والوں کو بتا کر گھر سے نکلا تھا۔ اُسے اُس کے باپ نے خود ہی عبدالملک ابن عطاش کی شاگردی میں بٹھلایا تھا لیکن فرحی گھر والوں کو بتائے بغیر نکلی تھی۔ وہ اُس وقت جاگ اٹھی تھی جب گھر والے گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ گھوڑا اُس کے ایک بھائی کا تھا۔ وہ اندھیرے میں ہی گھر سے نکل آئی تھی۔ وہ جس قدر خوبصورت تھی اس سے کہیں زیادہ مضبوط حوصلے والی تھی۔ حسن ابھی شہر سے تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ فرحی اس سے جا ملی۔

حسن کے ذہن میں خواب کی باریک سے باریک تفصیل بھی محفوظ تھی اور اس کے پاس کاغذ بھی تھا جس پر اُس نے اشارے لکھ لئے تھے۔ اگر یہ کوئی سیدھا راستہ ہوتا تو وہ بہت ہی دور نکل گئے ہوتے لیکن یہ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ جنگل تھا کہیں بنجر علاقہ تھا اور پھر پتھریلا علاقہ شروع ہو گیا۔ پہلے ایک ندی آئی جو اتنی گہری نہیں تھی۔ ان کے گھوڑے اس میں سے گذر گئے لیکن آگے جو ندی آئی وہ خاصی گہری تھی اور پانی کا بہاؤ بھی خاصا تیز تھا۔ حسن نے راستے والا کاغذ ایک ہاتھ میں لے کر ہاتھ اونچا کر لیا تاکہ یہ بھیگ نہ جائے اور انہوں نے گھوڑے ندی میں ڈال دیئے۔ چونکہ بہاؤ تیز تھا اس لئے گھوڑے سیدھے جانے کی بجائے بہاؤ کے ساتھ بہتے

گئے اور خاصی دور جا کر کنارے پر چڑھے۔

حسن نے ذہن پر زور دیا اور دیکھنے لگا کہ وہ نشانیاں کہاں ہیں جو اسے خواب میں نظر آئی تھیں۔ اس نے کاغذ سے بھی مدد لی اور آگے بڑھنے لگے۔ آگے علاقہ چٹانی تھا۔ اونچی نیچی چٹانیں بے آب و گیاہ تھیں۔ ان میں بعض نوکیلی اور بعض اوپر سے چپٹی تھیں۔ بعض کا رنگ سلیٹی اور بعض کوئلے کی طرح سیاہ تھیں۔ حسن دو چٹانوں کے درمیان چلا گیا۔ تھوڑی ہی دور جا کر یہ راستہ ایک طرف کو جاتا تھا۔ وہ اُدھر مڑا تو اُسے بائیں کو مڑنا پڑا۔ اس طرح اسے چٹانوں نے کبھی دائیں کبھی بائیں اتنا زیادہ موڑا کہ وہ بھول ہی گیا کہ اُسے کس سمت کو جانا ہے اور وہ ان بھول بھلیوں میں کس طرف سے داخل ہوا تھا۔

اُس نے سورج سے سمت معلوم کر لی لیکن یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ آگے بڑھ رہا ہے یا ایک ہی جگہ پر گھوم رہا ہے یا پیچھے کو جا رہا ہے۔ سورج اپنے روز مرہ سفر پر چلا جا رہا تھا اور افق سے تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا۔ حسن پریشان ہو گیا۔ اُسے شام گہری ہونے سے پہلے پہلے وہاں سے نکلنا تھا۔ اُس نے گھوڑے کی رفتار اور تیز کر لی۔

"معلوم ہوتا ہے تم خواب والا راستہ بھول گئے ہو" — فرحی نے کہا۔

"میں خواب میں بھی اسی طرح ان بھول بھلیوں میں گھومتا رہا تھا" — حسن نے کہا — "راستہ مل جائے گا"۔

ان چٹانی بھول بھلیوں میں گھومتے پھرتے اُسے ایک ایسی چٹان نظر آئی جو اوپر سے آگے کو جھکی ہوئی تھی۔ یہ قدرت کا ایک شاہکار تھا۔ یہ بغیر ستونوں کے برآمدے جیسی تھی۔ وہاں پہنچ کر حسن نے گھوڑا روک لیا اور فرحی سے کہا کہ کچھ دیر آرام کر لیا جائے۔

دونوں گھوڑوں سے اُتر آئے اور برآمدے کی چھت جیسی چٹان کے نیچے بیٹھ گئے۔ یہ کوئی غار تو نہیں تھا لیکن چٹان اندر سے ایک وسیع کھوہ جیسی ہو گئی تھی۔ اس کا فرش زمین کی سطح سے گز ڈیڑھ گز نیچے تھا۔ حسن تو بیٹھ گیا لیکن فرحی کھوہ میں دیکھنے لگی۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ رات گذارنی پڑی تو یہیں گذاریں گے۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔

حسن تیزی سے اٹھا اور فرحی تک پہنچا۔

"نیچے دیکھو حسن!" — فرحی نے کہا۔

حسن نے نیچے دیکھا۔ انسانی ہڈیوں کے دو پنجر پڑے تھے۔ ان کے کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ہڈیاں بالکل خشک ہو چکی تھیں۔ ایک پنجر مرد کا تھا اور دوسرا عورت کا۔ عورت کی نشانی بڑی صاف تھی۔ اس کے لمبے لمبے بال کھوپڑی کے قریب ہی پڑے تھے۔ دونوں اس پوزیشن میں نہیں تھے جس طرح لاش کو قبر میں سیدھا رکھا جاتا ہے۔

حسن کود کر نیچے چلا گیا۔ اُس نے مرد کی پسلیوں میں دیکھا وہاں ایک خنجر پڑا ہوا تھا۔ جن دو پسلیوں کے درمیان یہ خنجر پھنسا ہوا تھا' وہاں سے دونوں پسلیاں تھوڑی تھوڑی کٹی ہوئی تھیں۔ ایک تلوار دونوں ڈھانچوں کے قریب پڑی تھی۔

"معلوم نہیں یہ کون تھے" ــــ فرحی نے کہا۔

"کوئی ہم جیسے ہی ہوں گے" ــــ حسن نے کہا ــــ "لیکن یہ کچھ اور معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ اس آدمی کو سینے میں خنجر مار کر مارا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے عورت کو اس تلوار سے مارا گیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ہماری طرح ان بھول بھلیوں میں پھنس گئے ہوں اور یہاں رات گذارنے کے لئے رک گئے ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھوک اور پیاس سے مرے تھے۔ ان کے پاس پانی نہیں تھا۔ ہوتا تو یہاں مشکیزہ پڑا ہوتا"۔

"حسن!" ــــ فرحی نے کہا ــــ "میں کبھی ڈری نہیں لیکن میں دل پر خوف کی گرفت محسوس کر رہی ہوں۔ ہم یہاں نہیں رکیں گے"۔

"پھر ہمیں یہاں سے جلدی چل پڑنا چاہئے" ــــ حسن نے کہا۔

دونوں گھوڑوں پر سوار ہوئے اور دو چٹانوں کے درمیان چلنے لگے۔ یہ تنگ سا راستہ انہیں ایسی جگہ لے گیا جہاں چٹانیں پیچھے رہ گئی تھیں اور ذرا کھلا میدان تھا۔ تین اطراف چٹانیں تھیں۔ چوتھی طرف کی چٹان کے درمیان تھوڑا سا راستہ تھا۔ حسن اُس طرف ہو لیا۔

دونوں گھوڑے پہلو بہ پہلو چلے جا رہے تھے۔ جب دونوں اس تنگ سے راستے کے قریب گئے تو دونوں گھوڑے اپنے آپ ہی رک گئے۔ پہلے وہ کچھ بے چینی سے اِدھر اُدھر ہونے لگے پھر دونوں گھوڑے کانپنے لگے۔ انہوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی' باگیں جھٹکیں لیکن گھوڑے کانپتے رہے اور آگے بڑھنے کی بجائے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔

"وہ دیکھو فرحی!" ــــ حسن نے کہا ــــ "گھوڑے آگے نہیں بڑھیں گے"۔

فرحی نے دیکھا ان سے دس بارہ قدم دور ویسا ہی ایک کالا ناگ پھن پھیلائے ہوئے تھا جیسا حسن نے قبرستان میں دیکھا تھا۔ یہ گھوڑے کی نفسیات ہے کہ اس کی پیٹھ پر سوار موجود ہو اور وہ اپنے راستے میں سانپ دیکھ لے تو رک کر خوف سے کانپنے لگتا ہے۔ اگر سوار نہ ہو تو گھوڑا سر پٹ بھاگ اٹھتا ہے۔

ناگ تیزی سے گھوڑوں کی طرف آیا۔ حسن نے دیکھا کہ اس کے پیچھے پیچھے ایسا ہی ایک ناگ اور ہے۔ گھوڑوں نے جب ناگوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو فوراً پیچھے بھاگ اٹھے۔

حسن اور فرحی نے گھوڑوں کو قابو میں رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن گھوڑے قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ حسن کا گھوڑا آگے تھا اور اپنے آپ ہی دائیں بائیں مڑتا جا رہا تھا۔ حسن بار بار پیچھے دیکھتا تھا کہ فرحی کتنی دور ہے۔

گھوڑے دوڑتے' ان بھول بھلیوں میں دائیں بائیں مڑتے رہے اور حسن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا گھوڑا اُس جگہ جا نکلا جہاں سے وہ ان بھول بھلیوں میں داخل ہوئے تھے۔ وہ میدان تھا۔ چٹانیں پیچھے رہ گئی تھیں۔

حسن نے بڑی مشکل سے گھوڑے کو قابو میں کیا اور اسے روک لیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ فرحی کے گھوڑے کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اُسے فرحی کا گھوڑا تو نظر آ گیا لیکن فرحی اُس کی پیٹھ پر نہیں تھی۔ حسن نے اس گھوڑے کی طرف اپنا گھوڑا دوڑا دیا اور اس کی لگام پکڑ لی۔ اُس نے فرحی کو آوازیں دیں' بہت پکارا لیکن فرحی کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ حسن آہستہ آہستہ ان چٹانی بھول بھلیوں کی طرف چل پڑا۔ وہ فرحی کو ڈھونڈنے جا رہا تھا۔

حسن بن صباح کے ہوش اڑ گئے تھے۔ وہ دنیا کو اپنے عزائم کو اور اپنی منزل کو بھول گیا تھا!

وہ ایک بار پھر چٹانوں کی بھول بھلیوں میں داخل ہو گیا اور بڑی ہی بلند آواز سے فرحی کو پکار رہا تھا لیکن چٹانوں سے گذرتی ہوئی تیز ہوا کی سرسراہٹ کے سوا اسے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

یہیں سے وہ باہر نکلا تھا مگر اب وہ وہیں سے اندر گیا تو اسے وہ جگہ ایسی اجنبی محسوس ہوئی جیسے پہلے کبھی دیکھی ہی نہ ہو۔ ایک چٹان اُس کے سامنے تھی۔ اس کے پہلوؤں سے دو راستے جاتے تھے اور ایک راستہ دائیں کو جاتا تھا۔ حسن بن صباح کو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ ان تینوں میں سے کون سے راستے سے باہر آیا تھا۔

سامنے والی چٹان کا یہ اِدھر والا سرا تھا اور اس کی ڈھلان بڑی آسان تھی۔ حسن بن صباح نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور چٹان پر چڑھ گیا۔ اس نے فرحی کے گھوڑے کی باگ اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ لی تھی۔ اوپر جا کر اس نے ہر طرف نظریں گھمائیں۔ دور دور تک اونچی نیچی چٹانوں کی چوٹیوں کے سوا کچھ اور نظر نہ آیا۔ کچھ چٹانیں اوپر سے چپٹی تھیں اور کچھ ایسی بھی تھیں جو چٹانیں لگتی ہی نہیں تھیں۔ وہ بہت ہی بڑے بڑے بتوں کی مانند تھیں۔ کوئی بت انسانوں جیسا اور کوئی کسی جانور جیسا تھا۔ ایک چٹان ایسی تھی جو مندر کے مینار کی طرح اوپر چلی گئی تھی۔ اس کی چوٹی پر ایک بہت بڑا گول پتھر یوں رکھا ہوا تھا جیسے کسی عورت نے سر پر گھڑا رکھا ہوا ہو۔

یہ سارا منظر اس دنیا کا خطہ لگتا ہی نہیں تھا۔ یہ تو خواب کا منظر تھا۔ یہ خطہ تین میل لمبا چوڑا ہو سکتا تھا اور چار میل بھی۔

"فرحی!" ___ حسن پھیپھڑوں کا سارا ہی زور لگا کر پکارنے لگا ___ "کہاں ہو فرحی.... فرحی!"

کوئی جواب نہیں.... خاموشی!

"وہ دوڑتے گھوڑے سے گر کر بیہوش پڑی ہوگی" ___ اس نے اس طرح اونچی آواز میں کہا جیسے اپنے پاس کھڑے کسی آدمی کو بتا رہا ہو۔

اس کے پاس دو گھوڑوں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ اسے فرحی تک جلدی پہنچنا تھا۔ ہو سکتا تھا وہ گر کر مر گئی ہو یا مر رہی ہو اور یہ بھی ناممکن نہ تھا کہ وہ گری تو اسے ناگ نے ڈس لیا ہو گا۔

حسن بن صباح کو اپنے استاد عبدالملک ابن عطاش کا ایک سبق یاد آ گیا کہ راستہ یاد نہ رہے

مسافر کہیں کھو جائے یا کوئی چیز گم ہو جائے تو کیا عمل کیا جائے۔

وہ گھوڑے سے اترا اور نیچے دیکھا۔ چٹان کی ایک سِل سلیٹ کی طرح ہموار تھی۔ حسن اکڑوں بیٹھ گیا اور چھوٹا سا ایک پتھر اٹھا لیا۔ ابن عطاش نے اسے مراقبے میں جانے کی بہت مشق کرائی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور دو تین بار لمبے سانس لئے۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور انگلیوں میں پکڑے ہوئے کنکری جیسے پتھر سے سِل پر اوٹ پٹانگ سے خانے بنانے لگا۔

ان خانوں کو اس نے غور سے دیکھا اور کسی خانے میں ایک حرف اور کسی میں ایک ہندسہ لکھا۔ ان پر کچھ دیر نظریں جمائے رکھیں اور اٹھ کھڑا ہوا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر وہ چٹان سے اتر آیا اور اس چٹان کے ساتھ ساتھ آگے کو چل پڑا۔

○

سورج غروب ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ یہ راستہ کچھ آگے جا کر ایک طرف مڑ گیا۔ تھوڑا آگے جا کر اس راستے کو ایک گول چٹان نے روک لیا تھا اور وہاں دو راہا بن گیا تھا۔ حسن رک گیا اور دونوں راستوں کو دیکھا۔ اس نے گھوڑا روک لیا تھا۔ آنکھیں بند کر کے اس نے کچھ سوچا۔

دائیں طرف اسے ہلکی سی کوئی آہٹ یا آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور ادھر دیکھا۔ کچھ دور ایک نیولہ کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حسن نیولے کو دیکھتا رہا۔ نیولہ ایک طرف دوڑ پڑا۔ حسن گھوڑا اس طرف لے گیا اور وہاں تک چلا گیا جہاں نیولہ کھڑا تھا۔ اس طرف دیکھا جس طرف نیولہ گیا تھا۔

یہ دو چٹانوں کے درمیان بہت ہی تنگ راستہ تھا جو کچھ دور تک چلا گیا تھا لیکن سیدھا نہیں بلکہ کئی ایک گول گول اور کچھ منحنی سی چٹانوں سے گھومتا مڑتا جاتا تھا۔

حسن بن صباح جو فرحی کے لئے پریشان ہو رہا تھا اور اسے پکارتا بھی رہا تھا اب یوں اطمینان سے چلا جا رہا تھا جیسے اسے فرحی مل گئی ہو یا فرحی اس کے دل سے اتر گئی ہو۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے چٹان پر بیٹھ کر سحر (کالے جادو) کا ایک عمل کیا تھا جس میں اسے واضح اشارہ ملا تھا کہ وہ فرحی تک پہنچ جائے گا لیکن ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا کہ فرحی جس جگہ ہے وہاں تک راستہ کون سا جاتا ہے البتہ یہ پتہ چل گیا تھا کہ اسے اشارے ملتے رہیں گے جنہیں سمجھنے کے لئے وہ اپنی

عقل استعمال کرے۔

تاریخ کی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حسن بن صباح نے پراسرار علوم سیکھ لیئے تھے۔
ابن خلدون "تاریخ ابن خلدون" حصہ پنجم میں لکھتا ہے —— "علم نجوم و سحر میں حسن بن صباح کو ید طولیٰ حاصل تھا" —— ابن تاثیر اور دیگر مورخوں نے بھی لکھا ہے کہ حسن بن صباح انتہا درجے کا عیار اور مکار تو تھا ہی' اس نے علم سحر میں بھی خصوصی مہارت حاصل کرلی تھی۔

اس نے ان پراسرار علوم میں اس سفر کے بعد مہارت حاصل کی تھی۔ اس سفر کے دوران اس کے پاس سحر کی اتنی ہی طاقت تھی جو اسے اپنے اتالیق ابن عطاش سے حاصل ہوئی تھی۔ وہ ان علوم کی تکمیل کے لئے ہی جا رہا تھا۔

وہ جا تو رہا تھا لیکن ایسے چٹانی خطے میں پھنس کے رہ گیا تھا جسے وہ کبھی کبھی خواب سمجھتا تھا۔ اس میں بھی شاید کوئی راز تھا کہ اسے بڑے دشوار گذار راستے پر ڈالا گیا تھا۔ اسے اس راستے کا اشارہ خواب میں ملا تھا۔

داستان گو سنا رہا تھا کہ حسن بن صباح ایک تنگ راستے پر عجیب و غریب سی شکلوں کی چٹانوں کی دنیا میں جا رہا تھا کہ پھر ایک مقام آ گیا جو دوراہا تھا۔ حسن نے رک کر دونوں راستوں کو دیکھا۔ دونوں راستے تھوڑی تھوڑی دور جا کر مڑ جاتے تھے۔ حسن کبھی ادھر کبھی ادھر دیکھتا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ غیب سے اسے کوئی اشارہ ملے گا لیکن کچھ بھی نہ ہوا سوائے اس کے کہ وہ جس گھوڑے پر سوار تھا' وہ آہستہ سے ہنہنایا اور کھر مارنے لگا۔ دوسرے گھوڑے نے بھی یہی حرکت کی۔ اس انداز سے گھوڑے کا ہنہنانا اور گھوڑے کا کھر مارنا اس کی بے چینی کا اظہار ہوتا ہے۔

حسن نے قدرے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کہ گھوڑوں نے پھر سانپ دیکھ لیا ہے لیکن اسے خیال آیا کہ گھوڑا ڈر کا اظہار کسی اور انداز سے کرتا ہے۔ وہ گھوڑوں کا زمانہ تھا۔ لوگ گھوڑوں کی نفسیات سمجھتے تھے۔ حسن سمجھ گیا کہ گھوڑے بھوکے ہیں۔ شاید پیاسے بھی ہوں۔

گھوڑا اپنے آپ ہی ایک راستے پر چل پڑا۔ حسن نے لگام کھینچ لی لیکن گھوڑا رکنے کی بجائے اور تیز ہو گیا۔ اس کی زین کے ساتھ بندھا ہوا گھوڑا اس سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہا

تھا۔ حسن نے کچھ سوچ کر گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی۔ یہ اشاروں پر چلنے والا گھوڑا تھا اور حسن کو اس گھوڑے پر اعتماد تھا۔

گھوڑا سر نیچے کر کے دوڑ پڑا۔ وہ سر کسی اور ہی طرح دائیں بائیں جھٹک رہا تھا۔

○

گھوڑا اگلا موڑ سوار کے اشارے کے بغیر ہی مڑ گیا۔ حسن دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آگے چٹانوں میں گھری ہوئی کشادہ جگہ تھی جہاں ہری بھری گھاس تھی اور سرسبز درخت تھے۔ یہ جگہ صحرا میں نخلستان جیسی تھی۔

گھوڑا اور تیز دوڑا اور وہاں تک پہنچ گیا۔ وہاں سبزے میں گھرا ہوا ایک چشمہ تھا۔ پانچ سات گز لمبائی چوڑائی میں بارش سے دھلے ہوئے آسمان جیسا شفاف اور نیلا پانی جمع تھا۔ شفاف بھی اتنا کہ اس کی تہہ میں کنکریاں بھی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ فالتو پانی کہاں غائب ہو رہا تھا۔

گھوڑا بے صبری سے پانی پینے لگا۔ حسن نے اتر کر دوسرے گھوڑے کی باگ اپنے گھوڑے کی زین سے کھول دی۔ اس نے بھی بے تابی سے چشمے سے منہ لگا لیا۔ تب حسن کو خیال آیا کہ گھوڑے پیاسے تھے۔

جانور' خصوصاً گھوڑے اور خچر' پانی کی مشک دور سے پا لیتے ہیں۔ گھوڑا بے لگام اور منہ زور ہو کر پانی تک پہنچ جاتا ہے۔

حسن بن صباح نے گھوڑوں کو پانی پیتے دیکھا تو اسے بھی پیاس محسوس ہونے لگی۔ چشمے کے کنارے گھٹنے ٹیک کر وہ پانی پر جھکا اور چلو بھر بھر کر پانی پینے لگا۔ اس کا سر جھکا ہوا اور نظریں پانی پر لگی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ رک گئے اور اس نے ذہن پر زور دیا۔

اسے اپنا خواب یاد آ گیا جس میں اس نے اس سفر کا راستہ دیکھا تھا۔ اسے یاد آیا کہ خواب میں اس نے چشمہ دیکھا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس چشمے سے روشنی سی پھوٹی تھی... ذہن پر زور دینے کے باوجود اسے اس سے آگے یاد نہ آیا لیکن اسے اطمینان ہو گیا کہ وہ غلط راستے پر نہیں جا رہا۔

وہ ایک بار پھر چلو بھرنے کے لئے پانی میں ہاتھ ڈالنے لگا تو اس کے ہاتھ ایک بار پھر رک گئے

اور نظریں پانی پر جم گئیں۔ پانی کے سامنے والے کنارے کے نیچے پانی میں ایک آدمی کا عکس جھلملا رہا تھا۔ پانی ساکن نہیں تھا۔ چھوٹی چھوٹی لہریں اس کنارے سے اُس کنارے تک جا رہی تھیں۔ اس آدمی کا عکس ان لہروں پر تیر رہا تھا۔

حسن سُن ہو کے رہ گیا۔ وہ بزدل نوجوان نہیں تھا۔ اُس کے پاس تلوار تھی اور ایک خنجر بھی تھا لیکن اسے اپنی ذات سے یہ اشارہ مل رہا تھا کہ یہ آدمی کوئی مسافر نہیں جو پیاس بجھانے سر راہ چشمے پر آگیا ہو۔

حسن نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔ اُس سے بیس بائیس قدم دور ایک ٹیکری پر ایک لمبا تڑنگا آدمی کھڑا تھا۔ لباس سے وہ اسی خطے کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے سر پر اس خطے کی مخصوص پگڑی تھی اور پگڑی پر اتنا بڑا سیاہ رومال پڑا ہوا تھا جس نے اُس کے کندھوں اور پیٹھ کے کچھ حصے کو بھی ڈھانپ رکھا تھا۔ سلیقے سے تراشی ہوئی اُس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔

حسن نظریں اُس پر جمائے ہوئے آہستہ آہستہ اٹھا۔ اُس آدمی نے اسی طرح اُس پر نظریں جما رکھی تھیں۔ اُس کے جسم میں ذرا سی بھی حرکت نہیں تھی۔ یہ شک غلط معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ بُت ہے۔

○

آخر اس آدمی میں حرکت ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔

اُس کے عقب میں منظر یہ تھا کہ ایک چٹان دائیں سے بائیں گئی ہوئی تھی۔ قدرت نے درمیان سے اس طرح کاٹ دیا تھا کہ ایک گلی بن گئی تھی جس میں سے ایک گھوڑا آسانی سے گذر سکتا تھا۔ گلی کی طرف چٹان کے دونو حصے دیواروں کی طرح عمودی تھے۔

وہ آدمی اُلٹے قدم چلتا اس گلی میں داخل ہو گیا۔ حسن بن صباح نے فرحی کے گھوڑے کی باگ اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھی، اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور گلی میں داخل ہو گیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس پر کچھ اثر ہو گیا ہے اور وہ اب اسی اثر کے قبضے میں ہے۔

وہ آدمی اس قدرتی گلی کے اگلے سرے پر کھڑا تھا۔ اُس کے پیچھے ایک اور چٹان تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں یہ گلی بند ہو گئی ہو۔ اُس آدمی نے اپنا بایاں بازو بائیں طرف لمبا کیا اور اُس طرف غائب ہو گیا۔

حسن وہاں تک جا کر اُسی طرف مڑ گیا جس طرف اُس آدمی نے اشارہ کیا تھا۔ وہ آدمی آگے جا کر ایک اور موڑ مڑ رہا تھا۔ حسن اس طرح اُس کے پیچھے جاتا رہا جیسے اُس کا پالتو جانور ہو یا جیسے اُس شخص نے اسے ہپناٹائز کر لیا ہو۔

وہ جگہ کشادہ تھی۔ بے آب و گیاہ چٹانوں کی بجائے وہاں ہری بھری ٹیکریاں تھیں۔ یہ ہریالی اُس چشمے کی بدولت تھی جو قریب ہی تھا۔

حسن آگے جا کر ایک سرسبز ٹیکری سے مڑا تو سامنے کا منظر دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ یہ منظر اُس کے لئے غیر متوقع تھا۔ اُس کے سامنے ایک اونچی ٹیکری تھی جو دائیں بائیں گئی ہوئی تھی۔ یہ سرسبز گھاس اور پھولدار جنگلی پودوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ انسانی ہاتھوں سے بنائی گئی ہو لیکن اُس کی چھت اور دیواریں بتا رہی تھیں کہ یہ قدرت کی تعمیر ہے۔ اس کے اوپر سے خودرو بیلیں لٹک رہی تھیں۔

وہ آدمی جس کی راہنمائی میں حسن وہاں پہنچا تھا، اس گُفا کے باہر کھڑا تھا۔ حسن وہاں گیا تو اُسے اندر کا منظر نظر آیا۔ کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی خاصی لمبی چوڑی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ سامنے ایک آدمی گاؤ تکئے سے لگا بیٹھا تھا۔ اُس کی داڑھی لمبی اور خشخشی تھی۔ اُس کے سر پر خرگوش کی کھال کی ٹوپی تھی اور ٹوپی پر کالے رنگ کا رومال تھا جو اس کے کندھوں سے بھی نیچے آیا ہوا تھا۔ اُس نے سبز رنگ کا چغہ پہن رکھا تھا۔ اس کی وجاہت سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مذہبی پیشوا ہے۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ کس فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔

تین آدمی اُس کے ایک طرف اور تین دوسری طرف آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کے سروں پر ایک مخصوص انداز کی پگڑیاں تھیں اور ان پر سیاہ رنگ کے رومال تھے جو ان کے کندھوں سے نیچے تک آئے ہوئے تھے۔

اس بزرگ نے جس کے چہرے پر جلال تھا، اس آدمی کو ہاتھ سے اشارہ کیا جس کی راہنمائی میں حسن وہاں پہنچا تھا۔ وہ آدمی اندر چلا گیا۔ اس کشادہ گُفا میں ایک چوڑا ٹیلہ سا تھا۔ وہ آدمی اس کے پیچھے چلا گیا۔ وہاں سے باہر آیا تو اس کے ساتھ فرحی تھی جو ذرا لنگڑا کر چل رہی تھی۔

فرحی کو دیکھ کر حسن بن صباح کو یقیناً اطمینان ہُوا ہو گا کہ وہ زندہ ہے لیکن یہ سوال اُسے پریشان کر رہا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور فرحی ان کے پاس کیسے آگئی ہے؟

یہ لوگ ڈاکو اور رہزن تو نہیں لگتے تھے لیکن ڈاکوؤں اور رہزنوں کے سروں پر سینگ تو نہیں ہوتے۔ بزرگ کے اشارے پر فرحی کو اُس کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ سورج اپنا اُس روز کا سفر پورا کر کے اُفق کے پیچھے جا سویا تھا۔ شام تاریک ہو گئی تھی۔ گُف میں مشعلیں رکھ دی گئی تھیں۔ عجیب عجیب سے سائے گُف کی دیواروں پر ناچ رہے تھے۔

○

داستان گو اس بزرگ کو درویش کے تو زیادہ موزوں ہو گا۔

"اے نوجوان!" — درویش نے حسن بن صباح سے کہا — "کیا گھوڑے سے اتر کر ہمارے درمیان بیٹھنا تجھے گوارا نہیں؟ ہم سب تیرے انتظار میں بیٹھے ہیں"۔

"میں ابھی چہرے پڑھنے کے قابل نہیں ہُوا!" — حسن نے کہا — "میں دل کی نیت کو آنکھوں کے آئینے میں نہیں دیکھ سکتا۔ اگر آپ کے دل میں بھی وہی جلال ہے جو آپ کے چہرے پر دیکھ رہا ہوں تو آپ میرے اس سوال کا جواب ضرور دیں گے کہ میری یہ ہمسفر آپ تک کس طرح پہنچی؟"

"گھوڑے سے اُتر اے نوجوان!" — درویش نے کہا — "تجھے ہر سوال کا جواب ملے گا اور تُو ہمارے سوالوں کے بھی جواب دے گا۔ یہ لڑکی تیری ہمسفر ہے ہماری نہیں۔ آ اس کے ساتھ بیٹھ اور اس کے ساتھ روانہ ہو"۔

حسن گھوڑے سے اُترا اور جوتے اتار کر چٹائی پر گیا۔ درویش نے اپنا دایاں ہاتھ حسن کی طرف بڑھایا تو حسن نے دونوں ہاتھوں سے اس کے ساتھ مصافحہ کیا۔ درویش کے اشارے پر وہ فرحی کے پاس بیٹھ گیا۔

فرحی نے اُس کی طرف اور اُس نے فرحی کی طرف دیکھا۔ فرحی کے چہرے پر خوف کی ذرا سی بھی جھلک نہیں ملتی تھی۔ وہ گھبرائی ہوئی بھی نہیں لگتی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ حسن کے چہرے پر تذبذب کا جو تاثر تھا وہ اُڑ گیا اور اُس کے چہرے پر رونق آ گئی۔

"تمہارا نام؟" — درویش نے پوچھا۔

"حسن بن صباح!"

"تیرے اس کٹھن سفر کی منزل کیا ہے؟" — درویش نے پوچھا — "کہاں ہے منزل

تیری؟"

"خوابوں کے سفر کی منزل بیان نہیں کی جا سکتی"۔ — حسن نے کہا۔

"خوابوں کے سفر کی منزل ہوتی ہی نہیں اے نوجوان!" — درویش نے کہا — "کیا تُو نیند میں خواب دیکھا کرتا ہے یا بیداری میں؟"

"نیند میں خواب جو دیکھا کرتا ہوں انہیں بیداری میں حقیقت بنانے کی کوشش کیا کرتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا۔

"تُو شاید نہیں جانتا اے نوجوان!" — درویش نے کہا — "نیند کے خواب خواہشوں اور آرزوؤں کے چلتے پھرتے عکس ہوتے ہیں۔ آنکھ کھلتے ہی بُلبلوں کی طرح پھٹ جاتے ہیں... اور بیداری کے خواب فرار کا ایک سفر ہے جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی"۔

"اے درویش!" — حسن نے کہا — "میں خواہشوں اور آرزوؤں کا پجاری نہیں نہ میں نے کبھی اپنی روح کو خواہشوں اور آرزوؤں کی غذا دی ہے"۔

"پھر تُو روح کو کیا غذا دیا کرتا ہے؟"

"عزم!" — حسن نے جواب دیا — "میں اپنی ہر آرزو کو عزم کے سانچے میں ڈھال لیا کرتا ہوں"۔

"اپنے سفر کی بھی کچھ بات کر اے نوجوان!" — درویش نے کہا۔

"یہ بھی ایک خواب ہے" — حسن نے کہا — "خواب میں جو دیکھا تھا وہ میرے سامنے آتا جا رہا ہے"۔

"ہمیں بھی دیکھا تھا کیا؟" — درویش نے پوچھا — "ہم بھی تو تیرے سامنے آئے ہیں؟"

"دیکھا تھا اے درویش!" — حسن نے جواب دیا — "شفاف پانی کا ایک چشمہ دیکھا تھا۔ اس میں سے ایک عکس نکلا جس نے انسان کا روپ دھار لیا۔ اُس نے خاموشی کی زبان میں میری راہنمائی کی۔ میں نے سات غزال دیکھے جو ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے"۔

"کہاں ہیں وہ غزال؟"

"چھ میرے سامنے بیٹھے ہیں" — حسن نے جواب دیا — "ساتواں کھڑا ہے"۔

"اس سے تُو کیا سمجھا؟"

"یہ کہ میں سیدھے راستے پر جا رہا ہوں" ـــــ حسن نے جواب دیا۔

حسن بن صباح نے دیکھا کہ صرف یہ درویش بولتا ہے اور باقی سب بالکل چپ بیٹھے ہیں۔ درویش کے ہونٹوں پر تبسم ہے اور باقی سب کے چہرے بے تاثر ہیں۔ درویش بولتا ہے تو سب اس کی طرف دیکھتے ہیں اور حسن بولتا ہے تو سب اُس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔

"قابلِ احترام درویش!" ـــ حسن نے پوچھا ـــ "کیا میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں؟"

"تمہارا اس لڑکی پر کوئی حق نہیں اے نوجوان!" ـــ درویش نے کہا ـــ "اس لڑکی کا ہم پر کچھ حق تھا' جو ہم نے ادا کر دیا ہے"۔

حسن کے چہرے پر حیرت کا تاثر آ گیا۔ وہ کبھی درویش کو اور کبھی فرحی کو دیکھتا تھا۔

"ہم نے یہ پھول ان پتھروں سے اٹھایا ہے" ـــ درویش نے کہا ـــ "یہ تیری ہمسفر ہے۔ اسے تیرے ساتھ ہی جانا ہے' لیکن ہم یہ ضرور دیکھنا چاہیں گے کہ تو اُس لڑکی کے قابل ہے یا نہیں.... حیران مت ہو لڑکے! غصے کو بھی اپنے قابو میں رکھ۔ ہم تجھے راز کی یہ بات بتاتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں تُو کہاں جا رہا ہے۔ اُتنے طویل اور کٹھن سفر میں اتنا حسین ہمسفر مل جائے تو مسافت آسان ہو جاتی ہے اور فاصلے سمٹ آتے ہیں لیکن راہِ حیات کے جو مسافر عورت کو صرف اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک خوبصورت جسم ہے' اُن کی آسان مسافتیں بھی کٹھن ہو جایا کرتی ہیں.... ہم یہ دیکھنا چاہیں گے کہ تُو عورت کو کیا سمجھتا ہے"۔

"اس لڑکی کا آپ پر کیا حق تھا؟" ـــ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"تُو ہی اسے بتا دے اے لڑکی!" ـــ درویش نے فرحی سے کہا۔

"ہمارے گھوڑے ناگوں سے ڈر کر بھاگ اٹھے تھے نا!" ـــ فرحی نے حسن سے کہا ـــ "میرا گھوڑا بے قابو ہو کر ایک اور ہی طرف نکل گیا۔ میں سنبھل نہ سکی اور گر پڑی۔ گرنے تک یاد ہے۔ ہوش میں آئی تو یہاں پڑی تھی۔ انہوں نے میری دیکھ بھال ایسی کی کہ خوف سے نجات مل گئی۔ صرف تمہارا غم تھا۔ انہوں نے کہا تم آ جاؤ گے اور تم آ گئے"۔

"کیا تم نے انہیں بتایا ہے ہم کہاں جا رہے ہیں؟" ـــ حسن نے فرحی سے پوچھا۔

"نہیں!" ـــ فرحی نے جواب دیا ـــ "یہ پوچھتے رہے میں کہتی رہی کہ میرا ہمسفر بتانا

چاہے گا تو بتا دے' میں نہیں بتاؤں گی۔ پھر انہوں نے کہا کہ یہ کہہ دو مجھے معلوم نہیں۔ میں نے کہا مجھے معلوم ہے۔ بتاؤں گی نہیں۔ انہوں نے کہا ہم تمہیں بے آبرو کر کے مار ڈالیں گے۔ میں نے کہا تب بھی نہیں بتاؤں گی۔ انہوں نے کہا ہم تمہاری آبرو کے محافظ ہیں' تمہیں گھر چھوڑ آئیں گے۔ میں نے کہا پھر بھی نہیں بتاؤں گی.... اس بزرگ نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا' آفرین! ہم تمہاری پُوجا کریں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ تیرے ہمسفر کو یہاں لانے کے لئے آدمی چلا گیا ہے"۔

"حسن لیا اے نوجوان؟" ـــ درویش نے حسن سے پوچھا ـــ "اب ہم نے دیکھنا ہے کہ تُو اس لڑکی کے جسم کو چاہتا ہے یا روح کو؟"

درویش نے اُس آدمی کو جو حسن کو یہاں لایا تھا' اشارہ کیا۔ وہ آدمی گپھا کے اندر ہی کہیں غائب ہو گیا۔

○

وہ مشعلوں کی روشنی میں سامنے آیا تو اُس کے ہاتھوں میں تین گڑیا تھیں۔ یہ مٹی کے بنے ہوئے تین عورتوں کے بُت تھے۔ خوبصورتی سے بنائے گئے تھے۔ ہر بُت تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچا اور ہر بُت برہنہ تھا۔

"تینوں بُت اور گولی اس کے آگے رکھ دو" ـــ درویش نے کہا۔

اُس کے حکم کی تعمیل ہوئی۔

"کوئی ایک گڑیا اٹھا" ـــ درویش نے حسن سے کہا ـــ "اور اس کے دائیں کان میں گولی ڈال"۔

حسن نے ایک بُت اٹھا کر اس کے کان میں گولی ڈالی۔

یہ گولی بُت کے منہ سے نکل کر زمین پر گر پڑی۔

"اب دوسری گڑیا اٹھا لے" ـــ درویش نے کہا ـــ "اور گولی اس کے کان میں ڈال"۔

حسن بن صباح نے یہ بُت اٹھایا اور گولی بھی اٹھائی۔ یہ گولی ایک گول کنکری تھی۔ یہ کانچ کی ان گولیوں جتنی تھی جن سے آج کل بچے کھیلا کرتے ہیں۔ حسن نے پتھر کی یہ گولی بُت کے کان میں ڈال دی۔ کان میں ایک سوراخ تھا۔ گولی اس کان میں گئی اور دوسرے کان سے باہر آ

گئی۔

"تم ایک اور گڑیا اٹھا" — درویش نے کہا — "اور یہ گولی اس کے دائیں کان میں ڈال"۔

حسن نے دوسرا بُت الگ رکھ کر تیسرا بُت اٹھایا۔ گولی اٹھا کر اس بُت کے کان میں ڈالی۔ یہ گولی اندر ہی کہیں غائب ہو گئی۔

"زور زور سے ہلا اسے" — درویش نے کہا — "گولی کو باہر آنا چاہئے"۔

حسن نے بُت کو بہت ہلایا، جھنجھوڑا، الٹا کیا، دائیں اور بائیں پہلو پر کر کے ہلایا مگر گولی باہر نہ آئی۔

"یہ گڑیا بیکار ہے" — درویش نے کہا — "اسے الگ رکھ دے۔ اس بدبخت نے ہماری گولی ہضم کر لی ہے"۔

حسن نے یہ بُت رکھ دیا۔

"کیا یہ بُت خوبصورت نہیں؟" — درویش نے پوچھا — "کیا یہ تجھے اچھے نہیں لگتے؟"

"خوبصورت ہیں" — حسن نے جواب دیا — "دل کو اچھے لگتے ہیں۔ بنانے والے نے عورت کی رعنائیاں ان بتوں میں سمو دی ہیں۔ ان میں صرف جان ڈالنی باقی رہ گئی ہے"۔

"ہم تجھے انعام دینا چاہتے ہیں" — درویش نے کہا — "کوئی ایک گڑیا اٹھا لے.... تینوں ایک جیسی ہیں"۔

حسن بن صباح نے سب سے آخر والا بُت اٹھا لیا جس کے کان میں گولی ڈالی تو کسی طرف سے گولی باہر نہیں آئی تھی۔ درویش نے اسے بیکار کہہ کر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

"تو نے عقل سے کام نہیں لیا اے نوجوان!" — درویش نے کہا — "یا تو نے سنا نہیں کہ میں نے اس گڑیا کے متعلق کہا تھا کہ اس نے ہماری گولی ہضم کر لی ہے، اسے الگ پھینک دو"۔

"محترم درویش!" — حسن نے کہا — "میں عقل اور توجہ سے کام نہ لیتا تو آپ کی اس گڑیا کو ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ دوسری دو میں سے کوئی ایک اٹھا لیتا لیکن میری عقل نے مجھے بتایا کہ یہ گڑیا اٹھا لے"۔

"تیری عقل نے اس میں کیا خوبی دیکھی ہے؟" — درویش نے پوچھا۔

"ایک کے کان میں گولی ڈالی تو وہ اس کے دوسرے کان سے نکل گئی" — حسن نے کہا — "اے درویش عالی مقام! آپ یقیناً ایسی بیٹی کو پسند نہیں کریں گے جو اپنے باپ کی پند و نصیحت ایک کان سے سنے اور دوسرے کان سے نکال دے.... ایسی بہن بھی بری ایسی بیوی بھی بری....

"دوسری کے کان میں گولی ڈالی تو اس نے منہ کے رستے نکال دی۔ ایسی عورت تو اور زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ وہ گھر کا کوئی راز اپنے دل میں رکھ نہیں سکتی۔ بات سنی اور ہر کسی کے آگے اگلنا شروع کر دی۔ ایسی عورت اپنے گھر کا اور اپنے ملک کا بھی بیڑہ غرق کرا دیا کرتی ہے....

"اور جسے آپ نے بیکار کہا ہے، یہ بڑی قیمتی عورت ہے، جو راز کی بات اپنے دل میں دفن کر دیا کرتی ہے۔ میں نے اس بُت کو یا گڑیا کو بہت ہلایا، الٹا کیا، ہر پہلو پر کر کے زور زور سے جھنجھوڑا لیکن اس نے گولی نہیں اگلی۔ اسے آپ توڑ پھوڑ کر اس کا وجود ختم کر دیں تو ہی آپ اس کے اندر سے گولی نکال سکتے ہیں....

"یہ وہ خوبی ہے جو آپ نے فرحی میں دیکھی ہے۔ آپ آٹھ ہیں اور یہ اکیلی۔ کیا آٹھ آدمیوں سے ڈر کر اس نے آپ کو بتا دیا تھا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ میں اسے اپنی عمر کی ہمسفر بناؤں گا"۔

"آفرین اے نوجوان!" — درویش نے کہا — "خدا نے تجھے وہ دانش اسی عمر میں دے دی ہے جو اوروں کو عمر بھر کا تجربہ حاصل کر کے بڑھاپے میں بھی نہیں ملتی.... تو پیدائشی دانشمند ہے" — درویش نے اپنے آدمی سے کہا — "تینوں گڑیوں کو اٹھا کر سنبھال لو۔ ان کے امتحان میں شاید ہی کبھی کوئی کامیاب ہوا ہو"۔

ایک آدمی نے تینوں بُت اٹھائے اور مشعلوں کی روشنی سے نکل گیا۔

"کھانا گرم کرو" — درویش نے حکم کے لہجے میں کہا — "دسترخوان لگ جائے.... فوراً.... یہ دونوں بھوکے ہیں"۔

○

اس ویرانے میں اتنا پرتکلف کھانا حسن بن صباح کے لئے حیران کن تھا۔ حسن اور فرحی اس قدر بھوکے تھے کہ بے صبری سے کھانا نگلتے چلے گئے۔

کھانے کے بعد درویش نے حسن بن صباح کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ باقی سب وہاں سے چلے گئے۔ حسن اور فرحی کے سونے کا الگ انتظام کر دیا گیا۔ فرحی جا کر سو گئی تھی۔

"حسن!" ـــ درویش نے کہا ـــ "تیرا نام حسن بن علی ہونا چاہئے تھا لیکن تُو نے حسن بن صباح کہلانا زیادہ پسند کیا"۔

"میرے آباؤاجداد میں صباح حمیری ایک شخص ہو گزرا ہے" ـــ حسن نے کہا ـــ "میرا باپ کچھ کم استاد نہیں لیکن صباح کے متعلق سنا ہے کہ اُس نے بہت ہی شہرت اور عزت پائی تھی، اور اُس کا کمال یہ تھا کہ کسی کو شک تک نہ ہونے دیا کہ وہ عیاروں کا عیار اور فریب کاروں کا اُستاد ہے۔ بس یہ وجہ ہوئی کہ میں نے بن علی کی بجائے بن صباح حمیری کہلانا زیادہ پسند کیا.... لیکن آپ کو میرا نام کس نے بتایا ہے؟"

"صرف نام ہی نہیں حسن!" ـــ درویش نے جواب دیا ـــ "تمہارے متعلق مجھے بہت کچھ بتایا گیا ہے۔ تم جس جگہ سے آ رہے ہو اور جس جگہ جا رہے ہو، میں ان کے درمیان ایک رابطہ ہوں، ایک رشتہ ہوں، پُل سمجھ لو اور...."

"رک جائیں" ـــ حسن اچانک بول پڑا ـــ "مجھے یاد آ گیا.... میرے استاد عبدالملک ابنِ عطاش نے مجھے بتایا تھا کہ خواب میں مجھے ایک غار نظر آئے گا اور اس غار میں میرا علم مکمل ہو جائے گا.... میں آپ کی ذات میں ایسا گم ہو گیا تھا کہ یاد ہی نہ رہا کہ میں نے خواب میں ایک غار دیکھا تھا۔ اس غار پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ اتنا ہی پتہ چلتا تھا کہ اس دھند میں کچھ ہے۔ میں نے پہلے جن غزالوں کا ذکر کیا ہے کہ خواب میں دیکھے تھے، وہ اسی دھند میں غائب ہو گئے تھے.... محترم درویش! یہ میرے خواب والا غار تو نہیں؟"

"ہاں حسن!" ـــ درویش نے کہا ـــ "غار وہی ہے لیکن تیرا علم یہاں مکمل نہیں ہو گا یہاں سے تجھے روشنی ملے گی جس میں تجھے اپنی منزل، اپنا مستقبل اور اپنی شخصیت بہت ہی بڑی نظر آئے گی.... اب تُو یہ پوچھے گا کہ میں کون ہوں اور میں یہاں کیا کر رہا ہوں"۔

"یہ تو میں نے پوچھنا ہی ہے" ـــ حسن نے کہا۔

"اس سے پہلے کچھ ضروری باتیں سن لے حسن!" ـــ درویش نے کہا ـــ "مجھے معلوم تھا تو آئے گا۔ یہ ہمارا ایک زمین دوز نظام ہے۔ اس نظام کو ہم زمین کے اوپر لانے کی کوشش کر

رہے ہیں۔ یہاں سے وہ علاقہ شروع ہوتا ہے جس پر ہم نے قبضہ کرنا ہے۔ آگے بہت سے قلعے ہیں جن میں کچھ چھوٹے اور بعض بہت ہی چھوٹے ہیں اور چند ایک ذرا بڑے ہیں۔ ان میں کئی ایک ایسے ہیں، جو چند ایک امراء کی ذاتی ملکیت بنے ہوئے ہیں۔ ہم نے ان پر قبضہ کرنا ہے"۔

"قلعے فتح کرنے کے لئے تو فوج کی ضرورت ہوتی ہے" ـــ حسن نے کہا ـــ "ہم فوج کہاں سے لائیں گے؟"

"لوگوں کی فوج بنائیں گے" ـــ درویش نے کہا۔

"لیکن کس طرح؟" ـــ حسن نے پوچھا۔

درویش نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

○

"یہ ہے وہ سبق جو میں نے تجھے دینا ہے" ـــ درویش نے کہا ـــ "تُو نے عبدالملک ابنِ عطاش کی شاگردی کر لی ہے۔ اب تُو ایک اور شخص کی شاگردی کرے گا، وہ ہے احمد بن عطاش۔ آگے ایک قلعہ ہے جس کا نام قلعہ اصفہان ہے۔ احمد بن عطاش اس قلعے کا والی ہے۔ وہ تجھے علمِ سحر کا ماہر بنا دے گا...

"اب میں جو بات کہنے لگا ہوں اس کا ایک ایک لفظ غور سے سننا اور ہر لفظ کو سینے میں محفوظ رکھتے جانا۔ بنی نوع انسان دو طاقتوں کے نرغے میں ہے۔ یوں کہہ لو کہ دنیا پر دو طاقتوں کی حکومت ہے۔ ایک ہے خدا اور دوسرا ہے ابلیس۔ انسان خدا کو کوئی روپ دے کر اس کی عبادت کرتا ہے۔ انسان نے سورج کو خدا بنایا، آگ کو، سانپ کو اور آسمانی بجلی کو بھی انسان نے خدا بنایا۔ آخر اسلام نے آ کر انسان کو بتایا کہ خدا کیا ہے۔ یہ بھی بتایا کہ یہ سورج، چاند، آسمانی بجلیاں، آگ، سانپ وغیرہ خدا نہیں بلکہ یہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اس خدا کی وحدانیت کو لوگوں نے مان لیا...

"ہم بھی خدا کو ماننے والے مسلمان ہیں لیکن ہم نے اپنا الگ فرقہ بنا لیا ہے اور ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ صحیح اسلام ہمارے پاس ہے لیکن اہلِ سنت نے لوگوں کے دلوں پر اپنے عقائد ایسے طریقے سے نقش کر دیئے ہیں کہ اب ہم ان کے عقائد کو نہیں بدل سکتے۔ ہمیں کوئی اور طریقہ

اختیار کرنا پڑے گا"۔

"کیا آپ نے کوئی طریقہ سوچا ہے؟" — حسن نے پوچھا۔

"ہاں!" — درویش نے کہا — "یہی بتانے لگا ہوں لیکن یہ طریقہ ایسا نہیں کہ پتھر اٹھاؤ اور کسی کے سر پر مارو۔ یہاں معاملہ نظریات کا ہے اور اس معاملے کو صرف تم سمجھ سکتے ہو"۔

"صرف میں کیوں؟" — حسن نے کہا — "میرا علم ابھی خام ہے اور تجربہ کچھ نہیں"۔

"تمہارے پاس سب کچھ ہے" — درویش نے کہا — "پہلے وہ سن لو جو ہم نے سوچا ہے' پھر تم خود محسوس کرو گے کہ یہ تو پہلے ہی تمہارے دل میں تھا.... بات یہ ہے حسن! اہلِ سنّت نے لوگوں کا رشتہ خدا کے ساتھ براہِ راست قائم کر دیا ہے۔ عیسائیت نے بھی خدا کو ہی اوّل اور آخر قرار دیا ہے اور وہ عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ یہودی ہیں' آتش پرست ہیں' یہ بھی خدا کو مانتے ہیں۔ ہمارے لئے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ حکومت اہلِ سنّت کی ہے"۔

"شاید آپ کو معلوم ہو گا" — حسن نے کہا" — کہ ہمارا امیر ابو مسلم رازی اس قدر کٹر سُنّی ہے کہ اُس نے میرے باپ سے کہا تھا کہ تم اپنے آپ کو اہلِ سنّت ظاہر کرتے ہو تو اپنے بیٹے کو ایک اسماعیلی پیشوا عبدالملک ابن عطاش کی شاگردی میں کیوں بٹھا رکھا ہے؟.... میرے باپ نے ابو مُسلم رازی کے عتاب سے بچنے کے لئے مجھے امام موافق کے مدرسے میں بھیج دیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہُوا ہے کہ ابو مسلم نے اپنے جاسوس پھیلا رکھے ہیں جو گھر گھر کی خبر رکھتے ہیں کہ کہیں سُنّی عقیدہ کے خلاف کوئی بات تو نہیں ہو رہی"۔

"ہاں حسن!" — درویش نے کہا — "ابو مُسلم رازی نے اپنے جاسوس پھیلا رکھے ہیں۔ اُسے معلوم نہیں کہ ہم نے اُس کے جاسوسوں کے پیچھے جاسوس چھوڑے ہوئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سلجوقی سلاطین کی حکومت ہماری دشمن ہے لیکن ہم ان کی جڑیں کھوکھلی کر دیں گے۔ ہمیں مصریوں پر بھروسہ ہے۔ وہ عبیدی ہیں اور ہمارے ہم عقیدہ بھی ہیں"۔

"محترم درویش!" — حسن نے کہا — "معلوم نہیں کیوں مجھے خیال آتا ہے کہ میں مصر جاؤں اور وہاں سے سلجوقیوں کے خلاف طاقت حاصل کروں"۔

درویش عجیب سی طرح ہنسا اور کچھ دیر حسن بن صباح کے منہ کو دیکھتا رہا۔

"کیوں محترم درویش؟" — حسن نے ذرا کھسیانا سا ہو کر پوچھا — "کیا میں نے غلط بات

کہہ دی ہے؟"

"نہیں حسن!" — درویش نے کہا — "میں تمہاری اس بات سے خوش اور مطمئن ہُوا ہوں کہ تمہیں مصر کا خیال آیا ہے۔ میں خوش اس لئے ہوں کہ یہ خیال ویسے ہی نہیں آیا بلکہ تم میں ایک پُراسرار طاقت ہے جو تمہیں اشارے دیتی ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ پیشین گوئی کرتا ہوں کہ تم میں نبوّت کے نمایاں آثار پائے جاتے ہیں۔ تم نبی بنو یا نہ بنو' تمہیں اتنی ہی شہرت ملے گی جو صرف نبیوں کو ملا کرتی ہے۔ آنے والی نسلیں اور ان کی نسلیں ہمیشہ تمہارا نام لیتی رہیں گی.... لیکن ضروری نہیں کہ تمہیں اچھے نام سے ہی یاد کیا جائے گا.... لوگ تمہیں یاد ضرور رکھیں گے"۔

پہلے درویش کی ہنسی نکلی تھی اب حسن ہنس پڑا۔

"آپ کو میری بات سے خوشی حاصل ہوئی تھی" — حسن نے کہا — "اور مجھے آپ کی بات سے خوشی حاصل ہوئی ہے۔ معلوم نہیں کیوں مجھے بُرائی سے مسرّت حاصل ہوتی ہے"۔

"میں تمہیں اسی بات پر لا رہا تھا" — درویش نے کہا — "میں خدا کا جو ذکر کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ ایک قوّت خدا کی ہے اور دوسری ابلیس کی۔ خدا کا نام لے کر لوگوں کو ان کے عقیدوں سے ہٹانا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کام کو ہم اس طرح آسان کریں گے کہ ہم دوسری قوّت کو استعمال کریں گے' یعنی ابلیس کی قوّت....

"بدی میں بڑی طاقت ہے حسن! بدی میں کشش ہے' بدی میں لذت ہے اور بدی میں نشہ ہے۔ یہ قوّت تمہارے دل و دماغ میں موجود ہے۔ ہم لوگوں پر بدی کا نشہ طاری کریں گے۔ تمہارے ساتھ یہ جو لڑکی ہے' یہ تمہارا کام آسان کرے گی۔ اس کے ساتھ ہی ہم علمِ سحر کو کام میں لائیں گے۔ یہ علمِ سحر کا ہی کرشمہ ہے کہ تم مجھ تک پہنچے ہو۔ اب ہم نے تمہارے اس علم کی تکمیل کرنی ہے....

"انسان میں خدا نے یہ کمزوری شروع سے ہی رکھ دی تھی کہ وہ بدی کی طرف جلدی آ جاتا ہے۔ وہ ابلیس ہی تھا جس نے انسان کو بہکا کر جنّت سے نکالا تھا.... ہم لوگوں کو دنیا میں ہی جنّت دیں گے' اور یہ تم دو گے"۔

"محترم درویش!" — حسن نے کہا — "میرا خیال ہے کہ مزید باتوں کی ضرورت نہیں۔

w w w . p a k s o c i e t y . c o m

آپ جو کچھ بھی کہے جا رہے ہیں یہ پہلے ہی میرے ذہن میں موجود ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آپ مجھے میری اس منزل تک پہنچا دیں، جہاں سے میں اپنا محاذ کھول سکوں گا"۔

"کل صبح تم یہاں سے روانہ ہو جاؤ گے" ــــ درویش نے کہا ــــ "اس لڑکی کو بھی تعلیم و تربیت دی جائے گی"۔

○

حسن بن صباح کا اس درویش کے پاس اس انداز سے پہنچنا جس انداز سے اسے پہنچایا گیا، پُراسرار افسانہ لگتا ہے لیکن فرقہ باطنیہ اسی طرح زمین دوز اور پُراسرار طریقوں سے پھلا پھولا تھا۔ سلجوقی سلاطین اہلِ سنت والجماعت تھے اس لئے وہ کسی اور فرقے کا وجود برداشت نہیں کرتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے جاسوسوں اور مخبروں کے ذریعے اپنی سلطنت کے ہر گوشے میں نظر رکھی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ فرقہ باطنیہ زمین دوز ہو گیا اور اس کے پیشواؤں نے اپنی کارروائیوں کو اتنا خفیہ کر دیا کہ جاسوسوں اور مخبروں کو بھی ان کی کارروائیوں کا علم نہیں ہوتا تھا۔

حسن بن صباح کا استاد عبدالملک ابن عطاش کوئی معمولی شخصیت نہیں تھا۔ وہ فرقہ باطنیہ کا صفِ اوّل کا پیشوا تھا۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ وہ ایک قلعے کا مالک بھی تھا۔

اگلی صبح سورج ابھی افق سے نہیں ابھرا تھا جب چار گھوڑے ان چٹانی بھول بھلیوں سے نکلے۔ ان کا رُخ خراسان کی طرف تھا۔ ایک گھوڑے پر حسن بن صباح سوار تھا۔ دوسرے پر فرحی، تیسرے پر درویش اور چوتھے پر درویش کا ایک آدمی سوار تھا۔

جب سورج اُفق سے اٹھ آیا اُس وقت یہ چاروں گھوڑے ایک سرسبز پہاڑی کی ڈھلان پر چڑھتے جا رہے تھے۔ یہ باقاعدہ راستہ تھا جس پر بیل گاڑیاں اور گھوڑا گاڑیاں بھی چلا کرتی تھیں۔ درویش نے گھوڑا روک لیا۔ باقی تین گھوڑے بھی رک گئے۔ درویش نے اپنے گھوڑے کا منہ اُس طرف پھیر دیا جس طرف سے وہ آئے تھے۔

"پیچھے دیکھو حسن!" ــــ درویش نے کہا ــــ "اور تم بھی فرحی!"

حسن اور فرحی نے پیچھے دیکھا۔ ان کے چہروں کے تاثر بدل گئے۔ اس بلندی سے انہیں دُور دُور تک پھیلا ہوا جو منظر نظر آ رہا تھا وہ کچھ عجیب سا تھا۔ جس پہاڑی کی بلندی پر وہ کھڑے تھے،

بڑی خوبصورت گھاس، پھول اور پودوں اور خوشنما درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ پہاڑی کے دامن میں کچھ دور تک روح افزاء سبزہ زار تھا۔ دور ایک ندی ابھرتے سورج کی کرنوں میں چمک رہی تھی۔

اس سحر انگیز خطے میں میلوں رقبے میں پھیلا ہُوا ایک بے آب و گیاہ چٹانی سلسلہ تھا جو گولائی میں تھا۔ چٹانیں نوکیلی بھی تھیں۔ بعض کی چوٹیاں مخروطی تھیں۔ کچھ بہت بڑے بڑے انسانی بُتوں جیسی تھیں اور زیادہ تر اس طرح گول تھیں جیسے قدرت کے ہاتھوں نے انہیں بڑی محنت سے بنایا ہو۔ ان کے وسط میں کچھ جگہ ہری بھری نظر آ رہی تھی جہاں چند ایک درخت بھی کھڑے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں درویش کا ڈیرہ تھا۔ ان چٹانوں کا رنگ سلیٹی بھی تھا اور سیاہ بھی، اور یہ خطہ ڈراؤنا سا لگتا تھا۔

"دیکھ رہے ہو حسن!" ــــ درویش نے کہا ــــ "تم بھی دیکھو فرحی! میں یہاں سے آگے نہیں جاؤں گا۔ یہاں تک تمہارے ساتھ اس لئے آیا ہوں کہ ایک آخری بات کہنی تھی جو یہاں آ کر ہی کہی جا سکتی تھی.... زندگی ہری بھری گھاس اور پھولوں کی سیج ہی نہیں، اس میں ایسی ایسی دشواریاں بھی ہیں کہ انسان ہمت ہارنے کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ کامیاب وہی ہوتے ہیں جو ان دشواریوں میں سے گذر جاتے ہیں....

"تمہارا استاد عبدالملک ابنِ عطاش تمہیں سیدھے راستے پر بھی ڈال سکتا تھا لیکن اُس نے تمہیں اپنے علمِ سحر کے ذریعے ایسا خواب دکھایا جس میں تم کو یہ راستہ نظر آیا۔ تم ان چٹانوں کے اندر آ گئے۔ تمہیں راستہ نہیں مل رہا تھا۔ دو ناگوں نے تمہیں بھگا کر پھر وہیں پہنچا دیا جہاں سے تم اس سلسلۂ کوہ میں داخل ہوئے تھے۔ انسان کی زندگی میں ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ اُسے سمجھ نہیں آتی کہ نجات کا راستہ کون سا ہے۔ وہ حالات اور کئی طرح کی دشواریوں میں اس طرح بھٹک جاتا ہے جیسے بھُول بھلیوں میں آ گیا ہو....

"ان چٹانوں کے اندر زندگی کا ایک سبق ہے۔ دیکھو قدرت نے کیسی خوفناک جگہ کے اندر کتنا شفاف چشمہ بنا رکھا ہے اور اس کے ساتھ ہی کتنی اچھی پناہ گاہ ہے۔ ایسے چشموں تک وہی پہنچ سکتے ہیں، جو ان چٹانوں سے ڈرتے نہیں، بھٹک بھٹک کر راستہ تلاش کر لیتے ہیں اور میٹھے چشمے تک پہنچ جاتے ہیں....

"ہم یہاں موجود تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ تم آ رہے ہو۔ ہمارے آدمی تمہیں دیکھ رہے تھے۔ ہمیں پہلے بتا دیا گیا تھا کہ تم آ رہے ہو۔ یہ تو تم جان ہی چکے ہو کہ اس لڑکی کو ہمارے آدمی اٹھا کر لے آئے تھے۔ ہمارا کوئی آدمی ان بھول بھلیوں میں بھٹک نہیں سکتا..... میں اُس وقت تم سے بہت چھوٹا تھا جب میرا استاد مجھے یہاں لایا تھا۔ وہ باہر بیٹھ گیا تھا۔ اُس نے میری کلائی کے ساتھ ایک دھاگہ باندھ دیا تھا۔ یہ بڑا ہی لمبا دھاگہ تھا جو گولے کی شکل میں استاد نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ میں باہر بیٹھوں گا' تم اندر چلے جاؤ' اندر ایک چشمہ ہے' ایک کوزہ اس چشمے کے پانی کا بھر لاؤ.....

"استاد نے مجھے بتایا کہ یہ دھاگہ راستے میں چھوڑتے جانا اور میں باہر بیٹھا گولے سے دھاگہ ڈھیلا کرتا جاؤں گا۔ اگر تم تھک ہار گئے اور چشمے کو نہ پا سکے تو اس دھاگے کو دیکھ دیکھ کر واپس آجانا۔ خیال رکھنا کہ دھاگہ ٹوٹ نہ جائے ورنہ اندر جا کر باہر نہیں نکل سکو گے..... میں اندر چلا گیا' استاد دھاگہ ڈھیلا چھوڑتا گیا..... یہ ذرا لمبی بات ہے کہ میں چشمے تک کس طرح پہنچا۔ میں اتنا زیادہ بھٹکا تھا کہ ٹانگیں اکڑ گئیں اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور چلتا گیا.....

"پھر میرے ہوش و حواس اندھیرے میں ہی گم ہو گئے۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میں چشمے کے کنارے پڑا ہوا تھا۔ میں اچھل کر اٹھا۔ مٹی کا کوزہ جو میرے ہاتھ میں تھا وہ ٹوٹا پڑا تھا۔ میں بیہوش ہو کر گرا تو کوزہ پتھر پر گر کر ٹوٹ گیا تھا.....

"اپنے استاد کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ میں چشمے تک پہنچ گیا تھا' میں کپڑوں سمیت چشمے میں اتر گیا اور باہر آ کر چل پڑا۔ میری راہنمائی کے لئے دھاگہ موجود تھا جو میں راستے میں پھینکتا آیا تھا۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا کہ میں باہر اپنے استاد کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ کوزہ ٹوٹ گیا ہے اور میں چشمے میں اتر کر اپنے کپڑے بھگو لایا ہوں.....

"میں تمہیں وہ سبق دینا چاہتا ہوں جو استاد نے مجھے دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ زندگی کے چشمے خود چل کر کسی کے پاس نہیں آجایا کرتے' انسان کو چل کر ان کے پاس جانا پڑتا ہے' اور پھر زندگی کے چشمے ان کا استقبال کیا کرتے ہیں جو ان کی تلاش میں سنگلاخ وادیوں' سوکھی سڑی چٹانوں کی بھول بھلیوں میں اور پُر خار راستوں پر چلتے ہی جاتے ہیں اور پایۂ استقلال میں لغزش

نہیں آنے دیتے.....

"اور استاد نے کہا تھا کہ یہ دھاگہ جو میں نے تمہاری کلائی سے باندھا تھا' اسے صرف ایک دھاگہ ہی نہ سمجھنا۔ یہ دھاگہ انسانی رشتوں کی علامت ہے۔ انسانی رشتے ٹوٹنے نہیں چاہئیں۔ تم اکیلے کچھ بھی نہیں' تم تنہا رہ گئے تو سمجھو تمہاری ذات ہی ختم ہو گئی۔ ہمیشہ یاد رکھنا کہ رشتوں کا یہ دھاگہ نہ ٹوٹنے دینا۔ ذرا سوچو۔ اگر یہ دھاگہ ٹوٹ جاتا تو میرا اور تمہارا رشتہ ٹوٹ جاتا اور تم ان بھول بھلیوں سے نکل نہ سکتے.....

"تو یہ ہے وہ آخری سبق جو میں نے تم تک پہنچانا تھا حسن! ثابت قدم رہنا۔ تم نے فوج کے بغیر قلعے سر کرنے ہیں۔ انسانی فطرت کی کمزوریوں کو اپنے مقاصد اور مفادات کے لئے استعمال کرنا ہے۔ انسانوں پر نشہ طاری کر دو۔ نشہ دولت کا بھی ہوتا ہے' عورت بھی آدمی کے لئے نشہ بن جایا کرتی ہے۔ نشوں کی کمی نہیں حسن! ابلیسی اوصاف میں بڑی طاقت ہے۔ میں تمہیں راز کی ایک بات بتاتا ہوں۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو نماز اپنا فرض اور خدا کی عبادت سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ عام لوگ نماز صرف اس لئے پڑھتے ہیں کہ اگلے جہان جنت میں جائیں گے جہاں حوریں اور شراب ملے گی اور سوائے عیش و عشرت کے کوئی کام نہیں ہو گا"۔

"میں ان لوگوں کو دنیا میں جنت دکھا دوں گا" ——— حسن نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"زندہ باد حسن بن صباح!" ——— درویش نے کہا ——— "اب جاؤ' میں یہاں سے واپس جا رہا ہوں..... الوداع!"

"الوداع!"

○

دو دنوں کی مسافت کے بعد حسن بن صباح فرحی اور اپنے رہبر کے ساتھ ایران کے جس قلعے میں داخل ہوا وہ قلعہ اصفہان تھا۔ عام طور پر اسے قلعہ شاہ در کہا جاتا تھا۔ یہ سلجوقی سلطان ملک شاہ نے تعمیر کروایا اور ذاکر نام کے ایک سرکردہ فرد کو امیرِ قلعہ یا والیٔ قلعہ مقرر کیا تھا۔

ذاکر سلجوقیوں کی طرح پکا مسلمان اور اسلام کا شیدائی تھا۔ یہ کوئی بڑا قلعہ نہیں تھا کہ اس کے اندر شہر آباد ہوتا۔ اندر آبادی تو تھی لیکن چند ایک معزز اور اچھی حیثیت اور سرکاری رتبوں اور عہدوں والے لوگ' انتظامیہ کے اور لوگوں کے ذاتی ملازم رہتے تھے۔ آبادی قلعے سے باہر اور

ذرا دور دور تھی۔ اس آبادی میں فرقۂ باطنیہ کے لوگ بھی رہتے تھے لیکن وہ اپنی اصلیت ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔

ذاکر کی عمر کم و بیش پچاس سال تھی اور اس کی دو بیویاں تھیں۔ دونوں کی عمریں چالیس سال سے اوپر ہو گئی تھیں۔ ذاکر کوئی عیاش آدمی تو نہ تھا پابندِ صوم و صلوٰۃ تھا لیکن انسانی فطرت کی کمزوریاں تو ہر انسان میں موجود ہوتی ہیں۔ ایک روز وہ ہرنوں کے شکار کو گیا۔ وہ ہرا بھرا سرسبز علاقہ تھا۔ پیڑ پودوں نے جنّت کا منظر بنا رکھا تھا۔ شفاف پانی کی دو ندیوں نے کچھ اور ہی بہار بنا رکھی تھی۔

ذاکر گھوڑے پر سوار ایک ندی کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ چار محافظ اور دو مصاحب تھے۔ ذاکر ان کے آگے آگے جا رہا تھا۔ ندی کا موڑ تھا۔ درخت تو بہت تھے لیکن دو درخت اس کے قریب تھے۔ ایک خود رو بیل دونوں کے تنوں سے اس طرح لپٹی اور پھیلی ہوئی تھی کہ چھت سی بن گئی تھی اور اس کی شکل مٹی کے ٹیلے میں گُپھا جیسی بنی ہوئی تھی۔ بوٹے کے پھولوں جیسے اس کے پھول تھے۔ نیچے خوشنما گھاس تھی۔

ذاکر نے وہاں جا کر گھوڑا روک لیا۔ پہلے تو اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر آیا پھر ہونٹوں پر تبسّم آیا۔

پھولدار بیل کی چھت کے نیچے ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جس کی عمر سترہ سال سے ذرا کم یا ذرا ہی زیادہ تھی۔ اس کی گود میں ہرن کا بچہ تھا۔ لڑکی کی آنکھیں ہرن کے بچے جیسی نشیلی، سیاہ اور موہنی تھیں اور اس کا حسین چہرہ بیل کے پھولوں کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اس کے ریشمی بالوں میں سے دو چار بال اس کے سرخی مائل سپید چہرے پر آئے ہوئے تھے۔

"یہ بچہ کہاں سے لائی ہو لڑکی؟" ——— ذاکر نے پوچھا۔

"اس جنگل میں اکیلا بھٹکتا پھر رہا تھا" ——— لڑکی نے جواب دیا ——— "بہت دن ہو گئے ہیں۔ ماں کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا....."

"کھڑی ہو کر بات کر لڑکی!" ——— ایک محافظ نے لڑکی کو ڈانٹ کر کہا ——— "امیرِ قلعہ کے احترام میں کھڑی ہو جا"۔

ذاکر نے اس محافظ کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

"تم سب آگے چلو" ——— ذاکر نے محافظوں اور مصاحبوں کو حکم دیا ——— "پل پر میرا انتظار کرو"۔

لڑکی کے چہرے پر خوف کا تاثر آ گیا اور وہ آہستہ آہستہ اٹھنے لگی۔ ذاکر گھوڑے سے اتر آیا اور لڑکی کے قریب جا کر ہرن کے بچے کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ لڑکی نے ہرن کا بچہ پیچھے کر لیا۔ اس کے ہونٹوں پر جو لطیف سا تبسّم تھا وہ غائب ہو گیا اور خوف کی جھلک اس کی غزالی آنکھوں میں بھی ظاہر ہونے لگی۔ ذاکر نے اپنے ہاتھ پیچھے کر لئے۔

"ڈر کیوں گئی لڑکی؟" ——— ذاکر نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ——— "اس بدبخت نے تمہیں ڈرا دیا ہے۔ میرے دل کو تم اور ہرن کا یہ بچہ ایسا اچھا لگا کہ میں رک گیا۔ میں امیرِ قلعہ ضرور ہوں لیکن تم پر میں کوئی حکم نہیں چلاؤں گا"۔

"میں ہرن کا یہ بچہ نہیں دوں گی"۔

"میں تم سے یہ بچہ لوں گا بھی نہیں" ——— ذاکر نے کہا اور اس سے اس کا نام پوچھا۔

"زرّیں!" ——— لڑکی نے جواب دیا۔

"کیا اس بچے کے ساتھ تمہیں بہت پیار ہے؟" ——— ذاکر نے پوچھا اور لڑکی کا جواب سنے بغیر بولا ——— "یہ بچہ اتنا پیارا ہے کہ ہر کسی کو اس پر پیار آتا ہے"۔

"نہیں امیر!" ——— لڑکی نے خوف سے نکل کر کہا ——— "یہ پیارا اور خوبصورت تو ہے لیکن میں اس سے کسی اور وجہ سے پیار کرتی ہوں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ یہ ماں کے بغیر جنگل میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا جب میں بھی جنگل میں بھٹک گئی تھی اور میں اپنی ماں کو ڈھونڈتی پھرتی تھی"۔

ذاکر اس لڑکی میں اتنا محو ہو گیا کہ لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بٹھا دیا اور خود اس کے پاس بیٹھ گیا۔ لڑکی نے اس سے پرے ہٹنے کی کوشش نہ کی۔

"پھر تمہیں ماں کہاں ملی تھی؟" ——— ذاکر نے پوچھا۔

"ماں آج تک نہیں ملی" ——— زرّیں نے جواب دیا ——— "اس وقت میری عمر تین چار سال تھی۔ چھوٹا سا ایک قافلہ تھا جس کے ساتھ ہم جا رہے تھے۔ میرے ماں باپ غریب لوگ تھے۔ ان کی عمر خانہ بدوشی میں گزر رہی تھی۔ میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو ان کے ساتھ

جنگلوں، پہاڑوں اور بیابانوں میں چلتے پھرتے اور نقل مکانی کرتے پایا"۔

"تم ان سے بچھڑ کس طرح گئی تھیں؟"

"بڑا ہی تیز و تند طوفان باد و باراں آ گیا تھا" ـــــ زریں نے جواب دیا ـــــ "قافلے والے نفسا نفسی کے عالم میں تتر بتر ہو گئے۔ چند ایک گھوڑے تھے اور دو تین اونٹ تھے۔ سب سامان سمیت ادھر ادھر بھاگ گئے۔ میرے چار اور بہن بھائی بھی تھے۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ ہر کوئی جدھر منہ آیا ادھر پناہ لینے کو اٹھ دوڑا۔ میں اکیلی رہ گئی۔ طوفان کے تھپیڑے اس قدر تند تھے کہ میرے پاؤں اکھڑ گئے۔ میں چھوٹی سی تو تھی، طوفان نے مجھے اپنے ساتھ اڑانا شروع کر دیا۔ اب میں باد و باراں کے رحم و کرم پر تھی...

"وہ شاید ندی نہیں تھی جس میں میں گر پڑی تھی، ویسے ہی پانی کا ریلا تھا جو مجھے اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ میں نے چیخنا چلانا اور ماں کو پکارنا شروع کر دیا لیکن طوفان کی چیخیں اتنی بلند تھیں کہ میری چیخیں اس میں دب جاتی تھیں۔ پھر اس طرح یاد آتا ہے جیسے بڑا ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ میں پوری طرح بیان نہیں کر سکتی۔ یہ بڑی اچھی طرح یاد ہے کہ میں ڈوب رہی تھی اور دو ہاتھوں نے مجھے پانی سے نکال لیا۔ میں اس وقت کچھ ہوش میں اور کچھ بے ہوش تھی۔ لگتا یاد ہے کہ وہ ایک بزرگ صورت آدمی تھا جس نے مجھے اسی طرح اپنے سینے سے لگا لیا تھا جس طرح میں اس بچے کو گود میں اٹھائے رکھتی ہوں۔ بس یہ وجہ ہے کہ میں نے کچھ دن پہلے اس بچے کو جنگل میں بھٹکتے دیکھا تو اسے اٹھا لیا۔ میں اسے اپنے ہاتھ سے دودھ پلاتی ہوں"۔

"تو کیا اس شخص نے تمہیں پالا پوسا ہے؟" ـــــ ذاکر نے پوچھا ـــــ "یا تمہیں ماں باپ مل گئے تھے؟"

"نہیں امیر!" ـــــ زریں نے جواب دیا ـــــ "وہ کہاں ملتے۔ معلوم نہیں بے چارے خود بھی زندہ ہیں یا نہیں۔ مجھے اس بزرگ ہستی نے اپنی بیٹی سمجھ کر پالا پوسا ہے۔ میں انہیں ہی اپنا باپ اور ان کی بیوی کو اپنی ماں سمجھتی ہوں۔ ان سے مجھے بہت پیار ملا ہے اور ایسی زندگی ملی ہے جیسے میں شہزادی ہوں"۔

"کون ہیں یہ لوگ؟"

"احمد بن غناش!" ـــــ زریں نے جواب دیا ـــــ "قلعے کے باہر رہتے ہیں۔ مذہب کے

عالم ہیں اور پکے اہلِ سنت ہیں"۔

زریں کا اندازِ بیاں ایسا معصوم اور بھولا بھالا تھا کہ ذاکر اس میں جذب ہو کے رہ گیا جیسے اس کی اپنی کوئی حیثیت ہی نہ رہی ہو۔ کچھ تو لڑکی بڑی پیاری تھی اور کچھ یہ وجہ بھی تھی کہ لڑکی نے اپنی زندگی کی ایسی کہانی سنائی تھی جس سے ذاکر کے دل میں اس کی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے لڑکی کے ساتھ ایسے انداز سے اور اس قسم کی باتیں شروع کر دیں جیسے ہمجولی کیا کرتے ہیں۔ زریں میں اتنی معصومیت اور سادگی تھی کہ وہ بچوں کی طرح ذاکر میں گھل مل گئی۔

ذاکر نے ہاتھ بڑھا کر بیل سے ایک پھول توڑا۔

"زریں!" ـــــ ذاکر نے بڑے پیار سے کہا ـــــ "اس پھول میں میرا پیار ہے۔ یہ تم لے لو"۔

زریں نے پھول لے لیا اور چھوٹے سے بچے کی طرح ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی ایسی تھی جیسے جلترنگ سے نغمہ پھوٹا ہو۔

"ایک بات بتاؤ زریں!" ـــــ ذاکر نے کہا ـــــ "کیا تم نے میرا یہ پھول دل سے قبول کر لیا ہے؟"

"ہاں تو!" ـــــ زریں نے کہا ـــــ "پیار کو کون قبول نہیں کرتا!"

"تو کیا تم میرے گھر آنا پسند کرو گی؟" ـــــ ذاکر نے کچھ التجا کے لہجے میں پوچھا۔

"وہ کیوں؟"

"میں تمہیں ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا" ـــــ ذاکر نے کہا ـــــ "میں تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہوں"۔

"تو پھر میں کیوں آؤں؟" ـــــ زریں نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا ـــــ "آپ کیوں نہیں آتے؟"

"نہیں زریں!" ـــــ ذاکر نے کہا ـــــ "تم اتنی معصوم ہو کہ میری بات سمجھ نہیں سکیں۔ میں تمہیں اپنے گھر لانا چاہتا ہوں۔ تم مجھے اس پھول جیسی پیاری لگتی ہو"۔

"پھول کسی کے پاس چل کر نہیں جایا کرتے امیرِ محترم!" ـــــ زریں نے مسکراتے ہوئے کہا ـــــ "پھولوں کے شیدائی خود چل کر پھولوں کے پاس جایا کرتے ہیں اور وہ کانٹوں میں سے

بھی پھول توڑ لیا کرتے ہیں۔ آپ نے یہ پھول جو مجھے دیا ہے' ہاتھ لمبا کر کے توڑا ہے۔ آپ سی پھول کو حکم دیں کہ وہ آپ کے پاس آجائے۔ کیا پھول آپ کے حکم کی تعمیل کرے گا؟"

ذاکر نے قہقہہ لگایا اور اس کے ساتھ ہی لڑکی کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر اپنے قریب کر لیا۔ زریں نے مزاحمت نہ کی۔

"تم جتنی حسین ہو اتنی ہی دانشمند ہو" ــــ ذاکر نے کہا ــــ "اب تو میں تمہیں ہر قیمت پر حاصل کروں گا۔"

"اور میں اپنی جان کی قیمت دے کر بھی آپ سے بھاگوں گی" ــــ زریں نے پہلے جیسی شگفتگی سے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"میں نے بادشاہوں کی بہت کہانیاں سنی ہیں" ــــ زریں نے کہا ــــ "آپ جیسے امیر بھی بادشاہ ہوتے ہیں۔ مجھ جیسی لڑکی پر فریفتہ ہو کر اسے زر و جواہرات میں تول کر اپنے حرم میں ڈال لیتے ہیں اور جب انہیں ایسی ہی ایک اور لڑکی مل جاتی ہے تو وہ پہلی لڑکی کو حرم کے کباڑ خانے میں پھینک دیتے ہیں۔ میں فروخت نہیں ہونا چاہتی اے امیر قلعہ!.... ہاں اگر آپ کے سپاہی مجھے زبردستی اٹھا کر آپ کے محل میں پہنچا دیں تو میں کچھ نہیں کر سکوں گی۔ میرا بوڑھا باپ احمد بن غطاش بھی سوائے آنسو بہانے کے کچھ نہیں کر سکے گا۔ وہ بوڑھا بھی ہے' عالم دین بھی ہے اور وہ شاید تلوار بھی نہیں چلا سکتا۔"

"نہیں زریں!" ــــ ذاکر نے کہا ــــ "احمد بن غطاش کی طرح میں بھی سُنی مسلمان ہوں۔ کیا تم نے کبھی مسلمانوں میں کوئی بادشاہ دیکھا ہے؟ پھر میں کسی ملک کا حکمران نہیں۔ میں سلجوقی سلطان کا ملازم ہوں۔ حکومت سلطان ملک شاہ کی ہے۔ وہ بھی اپنے آپ کو بادشاہ نہیں سمجھتے۔ میرے پاس کوئی حرم نہیں۔ دو بیویاں ہیں جو جوانی سے آگے نکل گئی ہیں۔ وہ تمہاری خدمت کیا کریں گی اور وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔"

اُس دور میں عربوں میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا رواج تھا۔ اُس وقت سوکن کا تصور نہیں تھا۔ بیویاں ایک دوسری کے ساتھ خوش و خرم رہتی تھیں۔ یہاں تک بھی ہوتا تھا کہ خاوند عیاش طبیعت ہو تو کبھی کبھی کوئی بیوی اپنی کسی سہیلی کو ایک آدھ رات کے لئے اپنے

خاوند کو تحفے کے طور پر پیش کرتی تھی۔ داستان گو جس دور اور جس خطے کی کہانی سنا رہا ہے' وہاں سلجوقی سلاطین کی حکومت تھی۔ سلجوقی ترک تھے۔ ان کے ہاں بھی یہی رواج تھا۔ اسلام قبول کر کے انہوں نے بھی اپنے آپ کو پابند کر لیا تھا کہ ایک آدمی زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ حرم کا تصوّر عربوں کی طرح ان کے ہاں بھی ناپید تھا۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ سلجوقی بیویوں کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔

زریں نے جب ذاکر سے یہ سنا کہ اس کی دو بیویاں ہیں اور دونوں جوانی سے آگے نکل گئی ہیں تو اُس پر ایسا کوئی اثر نہ ہُوا کہ اس کی دو سوکنیں ہوں گی۔

"میں تمہیں زبردستی نہیں اٹھواؤں گا زریں!" ــــ ذاکر نے کہا ــــ "نہ میں تمہیں زر و جواہرات میں تولوں گا۔ میں اللہ اور رسولؐ کے احکام کے مطابق تم سے نکاح پڑھواؤں گا۔ فیصلہ تم کرو گی۔"

"تو پھر اُس پودے کے پاس جائیں جس کا پھول توڑنا ہے" ــــ زریں نے کہا۔

"ہاں زریں!" ــــ ذاکر نے کہا ــــ "میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں۔ میں احمد بن غطاش کے ساتھ بات کروں گا.... میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں زریں! پہلے تو مجھے تمہارا یہ معصوم حسن اچھا لگا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ تم میں عقل و دانش بھی ہے تو میں نے کہا تھا کہ میں تمہیں ہر قیمت پر حاصل کروں گا۔ یہ اس لئے کہا تھا کہ میں اس قلعے کا حاکم ہوں۔ تم جیسی دانشمند بیوی میرے لئے سود مند ثابت ہو گی۔ تم مجھے سوچ بچار میں مدد دو گی۔"

"میرے باپ سے فیصلہ لے لیں" ــــ زریں نے قدرے سنجیدگی سے کہا ــــ "میں نے آپ کو ٹھکرایا نہیں لیکن میں آپ کو یہ بتا دیتی ہوں کہ مجھے دولت نہیں محبت چاہیے۔"

ذاکر نے زریں کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر زرا ملا اور کچھ دبایا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"زریں!" ــــ ذاکر نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا ــــ "میری فطرت بادشاہوں جیسی ہوتی تو میں درہم و دینار کی ایک تھیلی تمہارے قدموں میں رکھ دیتا لیکن نہیں۔ میں محبت کو محبت سے خریدوں گا۔"

ذاکر گھوڑے پر سوار ہُوا اور ایڑ لگا دی۔ اس کے محافظ اور مصاحب ندی کے پل پر اس کے منتظر تھے۔

"ایک بات غور سے سن لو" ——— ذاکر نے کہا ——— "اگر کوئی ہرن سامنے آئے تو مجھے دیکھ کر یہ ضرور بتا دیا کرو کہ یہ نر ہے یا مادہ۔ بھی کسی ہرنی کو نہیں مارنا۔ ہو سکتا ہے وہ بچے والی ہو"۔

○

ذاکر شکار سے واپس آ رہا تھا۔ اُس نے ایک ہی ہرن مارا تھا لیکن اُس روز وہ بہت بڑا شکار کھیل آیا تھا۔ وہ زرّین تھی جو ادھ کھلے پھول کی طرح معصوم تھی۔

ذاکر کو ابھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ شکار کر کے آیا ہے یا خود شکار ہو گیا ہے۔

زرّین نے اُسے اپنی بستی بتا دی تھی جو قلعے سے تھوڑی ہی دور تھی۔ اس بستی کے قریب آ کر ذاکر نے گھوڑا روک لیا اور اپنے ایک مصاحب سے کہا کہ یہاں احمد بن غطاش نام کا ایک عالمِ دین رہتا ہے، اُسے میرا سلام پہنچایا جائے۔

ایک مصاحب نے گھوڑا دوڑا دیا اور وہ بستی کی گلیوں میں غائب ہو گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اُس کے ساتھ ایک آدمی تھا جو سر سے پاؤں تک سفید چغے میں ملبوس تھا۔ اُس کے سر پر سلجوقی ٹوپی تھی اور ٹوپی پر سفید رومال تھا جو کندھوں تک لٹک رہا تھا۔ اس کی داڑھی لمبی تھی اور اس کے لباس کی طرح سفید۔ ذاکر نے اسے بستی سے نکلتے دیکھا تو گھوڑے سے کود کر اترا اور بہت ہی تیز چلتا اس شخص تک پہنچا۔ جھک کر سلام کیا پھر اُس کے گھٹنے چھو کر مصافحہ کیا۔

"احمد بن غطاش؟"

"ہاں امیرِ قلعہ!" ——— اس شخص نے کہا ——— "احمد بن غطاش میں ہی ہوں... میرے لئے حکم؟"

"کوئی حکم نہیں اے عالمِ دین!" ——— ذاکر نے التجا کے لہجے میں کہا ——— "ایک درخواست ہے... کیا آپ آج کا کھانا میرے ہاں کھانا پسند فرمائیں گے؟"

"زہے نصیب!" ——— احمد بن غطاش نے کہا ——— "حاضر ہو جاؤں گا... مغرب کی نماز کے بعد؟"

ذاکر نے ایک بار پھر جھک کر اُس سے مصافحہ کیا اور واپس آ گیا۔

مغرب کی نماز کے بعد احمد بن غطاش ذاکر کے محل نما مکان میں اُس کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا تھا۔ کھانے کے دوران ہی ذاکر نے درخواست کے لہجے میں احمد بن غطاش سے کہا کہ وہ اس

کی بیٹی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ زرّین اُسے کہاں ملی تھی اور یہ بھی کہ زرّین نے اسے بتایا تھا کہ وہ احمد بن غطاش کی بیٹی کس طرح بنی تھی۔

"اللہ نے میری دعائیں قبول کر لی ہیں" ——— احمد بن غطاش نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا ——— "میں نے اس بچی کو طوفان میں سے نکالا تھا اور اسے بڑے پیار سے پالا ہے۔ میں دعائیں مانگا کرتا تھا کہ اس بچی کی زندگی خانہ بدوشوں جیسی نہ ہو اور اس کا مستقبل روشن ہو۔ اگر آپ نے اسے اپنی رفاقت کے قابل سمجھا ہے تو بچی کے لئے اور میرے لئے اور خوش نصیبی کیا ہو گی"۔

○

دو چار ہی دنوں بعد زرّین دلہن کے لباس میں ذاکر کی زندگی میں داخل ہو گئی۔ ذاکر کی دونوں بیویوں نے بڑے پیار سے اس کا استقبال کیا۔ ذاکر نے دو خادمائیں زرّین کے لئے وقف کر دیں۔

"مجھے کسی خادمہ کی ضرورت نہیں" ——— زرّین نے ذاکر سے کہا ——— "میں آپ کی خدمت اپنے ہاتھوں کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ رات کو آپ دودھ پیتے ہیں تو وہ خادمہ آپ کو دیتی ہے۔ آئندہ یہ دودھ میں خود آپ کے لئے تیار کیا کروں گی۔ میں جانتی ہوں آپ دودھ میں شہد ملا کر پیتے ہیں"۔

ذاکر کی عمر پچاس سال ہو چکی تھی۔ اسے غالباً توقع نہیں تھی کہ سترہ سال عمر کی اتنی حسین لڑکی اس پر فریفتہ ہو جائے گی۔ اُس نے زرّین کو اجازت دے دی کہ رات کا دودھ وہ خود اسے پلایا کرے گی۔

کچھ دنوں بعد زرّین نے ذاکر سے کہا کہ جس شخص نے اسے طوفان سے بچایا اور اتنے پیار سے پالا ہے، اس کے بغیر وہ اپنی زندگی بے مزہ سی محسوس کرتی ہے۔ ذاکر احمد بن غطاش کو اجازت دے دے کہ وہ ایک دو دنوں بعد کچھ وقت یہاں گزارا کرے۔

مختصر یہ کہ یہ نوخیز لڑکی ذاکر کے دل و دماغ پر چھا گئی۔ ذاکر نے احمد بن غطاش کو بلا کر بڑے احترام سے کہہ دیا تھا کہ وہ جب چاہے اس کے گھر آ جایا کرے اور جتنے دن چاہے رہا کرے۔

ذاکر کو ذرا سا بھی شک نہ ہوا کہ احمد بن غطاش چاہتا ہی یہی ہے کہ اسے ذاکر کے گھر میں داخلہ مل جائے اور احمد اپنی سازش کو اگلے مرحلے میں داخل کرے۔ وہ اجازت مل گئی اور احمد ذاکر

www.paksociety.com

کے گھر جانے لگا۔

ذاکر کو یہ شک بھی نہ ہُوا کہ احمد بن غطاش کٹر باطنی ہے اور فرقۂ باطنیہ کا پیشوا اور اس فرقے کی زمین دوز تنظیم کا بڑا ہی خطرناک لیڈر ہے۔ وہ جس بستی میں رہتا تھا وہاں باقاعدہ خطیب بنا ہُوا تھا اور ہر کوئی اسے اہلِ سُنّت سمجھتا تھا۔

تاریخ نویس ابوالقاسم رفیق دلاوری مرحوم نے مختلف مؤرخوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک طرف ایک نوخیز لڑکی امیرِ قلعہ کے اعصاب پر غالب آ گئی اور دوسری طرف احمد بن غطاش نے مذہب کے پردے میں اپنی زبان کا جادو چلانا شروع کر دیا۔ ذاکر احمد بن غطاش سے اس قدر متاثر ہُوا کہ اُس نے بعض سرکاری امور میں بھی اُس سے مشورے لینے شروع کر دیئے۔ زرّیں کو خصوصی ٹریننگ دی گئی تھی جس کے مطابق وہ ذاکر کو ہپناٹائز کئے رکھتی تھی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس لڑکی نے ذاکر کو یہ جو پیشکش کی تھی کہ اُسے وہ خود دودھ پلایا کرے گی' اس سازش کی ایک اہم کڑی تھی۔ وہ دودھ میں اُسے ہر روز کچھ گھول کر پلاتی تھی جس کے فوری طور پر اثرات ظاہر ہونے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یہ اثرات اندر ہی اندر اپنا کام کر رہے تھے۔ اس دوائی میں نشے کا بھی کچھ اثر تھا جو کچھ اس طرح تھا کہ ذاکر کے مزاج میں بڑی خوشگوار تبدیلی آ جاتی تھی اور وہ زرّیں کے ساتھ ہم عمر ہجولیوں کی طرح کھیلنے لگتا تھا۔

صرف ایک بار ایسے ہُوا کہ ذاکر کی ایک بیوی نے زرّیں کو یہ دوائی دودھ میں ڈالتے دیکھ لیا اور زرّیں سے پوچھا بھی کہ اس نے دودھ میں کیا ڈالا ہے۔ زرّیں نے بڑی خود اعتمادی سے کہا کہ اُس نے کچھ بھی نہیں ڈالا۔ اس بیوی نے ذاکر کو بتایا اور کہا کہ اُسے شک ہے کہ زرّیں ذاکر کو دودھ میں کوئی نقصان دہ چیز پلا رہی ہے۔ ذاکر کا ردِ عمل یہ تھا کہ اُس نے اس بیوی کو طلاق تو نہ دی لیکن اسے یہ سزا دی کہ اسے الگ کر دیا اور اُس کے ساتھ کچھ عرصے کے لئے میاں بیوی کے تعلقات ختم کر دیئے۔

کم و بیش تین مہینوں بعد ذاکر صاحبِ فراش رہنے لگا لیکن وہ یہ بیان نہیں کر سکتا تھا کہ بیماری کیا ہے اور تکلیف کس نوعیت کی ہے۔ طبیبوں نے اس کے علاج میں اپنا پورا علم صرف کر ڈالا لیکن نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اٹھ کر ایک قدم بھی چلنے کے قابل نہ رہا۔

اُس کے بستر کے قریب احمد بن غطاش اور زرّیں ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اس کیفیت میں

مریض کو وہ انسان فرشتہ لگتا ہے جو اُس کی تیمار داری پوری ہمدردی سے کرے اسے یہ احساس دلاتا رہے کہ وہ جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔

احمد بن غطاش نے اُس کے پاس بیٹھ کر بڑی ہی پُر سوز آواز میں تلاوتِ قرآن پاک شروع کر دی۔ ذاکر کو اس سے کچھ سکون ملتا تھا۔

پھر وہ وقت بھی آ گیا کہ ذاکر نے کہا کہ وہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اُس نے سلطان ملک شاہ کے نام ایک پیغام لکھوایا جس میں اُس نے احمد بن غطاش کی دانشمندی اور علم و فضل کا ذکر کیا اور لکھوایا کہ اُس کی آخری خواہش ہے کہ اس قلعے کا امیر احمد بن غطاش کو مقرر کیا جائے۔

ذاکر مرتے دم تک احمد بن غطاش کو سُنّی سمجھتا رہا۔ دو چار روز بعد وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔

اُس کی موت کی اطلاع سلطان ملک شاہ کو ملی تو اُس نے پہلا حکمنامہ یہ جاری کیا کہ آج سے قلعہ شاہ در کا امیر احمد بن غطاش ہے۔

اُس وقت تک بہت سے باطنیوں کو قید میں ڈالا جا چکا تھا۔ سلجوقی چونکہ اہلِ سُنّت و الجماعت تھے اس لئے انہیں جوں ہی پتہ چلتا تھا کہ فلاں شخص اسمٰعیلی یا باطنی ہے' اُسے قید میں ڈال دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ زیادہ تر باطنی اپنے آپ کو سُنّی کہلاتے تھے لیکن خفیہ طریقوں سے وہ بڑی ہی خوفناک سازشیں تیار کر رہے تھے۔

احمد بن غطاش نے امیرِ قلعہ بنتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اُن تمام باطنیوں کو جو قلعے کے قید خانے میں بند تھے' رہا کر دیا' پھر اُس نے درپردہ باطنیوں کو قلعے کے اندر آباد کرنا شروع کر دیا اور باطنیوں پر جو پابندیاں عائد تھیں وہ منسوخ کر دیں۔

اس کے فوراً بعد قافلے لٹنے لگے اور رہزنی کی وارداتیں بڑھنے لگیں۔ ان وارداتوں کا مقصد پیسہ اکٹھا کرنا تھا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ احمد بن غطاش علمِ نجوم اور علمِ سحر کا ماہر تھا۔ خطابت میں اُس کی مہارت ایسی تھی کہ سننے والے پر طلسماتی سا تاثر طاری ہو جاتا تھا۔

یہ تھا وہ قلعہ شاہ در جس میں حسن بن صباح فرحی اور اپنے راہبر کے ساتھ داخل ہُوا تھا۔ راہبر اُسے سیدھا امیرِ قلعہ احمد بن غطاش کے گھر لے گیا۔ یہ گھر محل جیسا مکان تھا۔ احمد بن غطاش کو اطلاع ملی کہ رے سے حسن بن صباح آیا ہے تو اُس نے کہا کہ اسے فوراً اندر بھیجا

جائے۔

"آ نوجوان!" ـــ احمد بن غطاش نے حسن بن صباح کو اپنے سامنے دیکھ کر کہا ـــ "میں نے تیری بہت تعریفیں سنی ہیں۔ آج آرام کرلو کل صبح سے تمہیں بتلایا جائے گا کہ کیا کرنا ہے اور اب تک کیا ہو چکا ہے"۔

حسن بن صباح نے جھک کر سلام کیا اور باہر نکل آیا۔ لالِ سنت سلطان ملک شاہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اُس کی سلطنت میں ابلیس اُتر آیا ہے

حسن بن صباح اُس جگہ پہنچ گیا جہاں سے اُس نے اپنے تاریخی سفر کا آغاز کرنا تھا۔ ابلیس اُس کا ہمسفر اور ابلیس ہی اُس کا میرِ کارواں تھا۔

حسن بن صباح ایک انسان تھا.... تنِ تنہا.... اکیلا انسان.... سلاطینِ سلجوق کی سلطنتِ اسلامیہ کا ایک فرد جس کی حیثیت ایک عام اور گمنام آدمی سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ کسی قبیلے کا سردار نہیں تھا۔ اُس کے پاس کوئی لشکر نہیں، کوئی فوج نہیں تھی۔ دو چار آدمی بھی اس کے ساتھ نہیں تھے جو تیغ زن یا تیر انداز ہوتے۔ وہ خود بھی تو شمشیر زن اور شہسوار نہیں تھا۔

اُس کے پاس صرف ایک طاقت تھی، اور وہ تھی ابلیسیت!

اس ایک آدمی نے اسلام کی عمارت کو بھونچال کے جھٹکوں کی طرح ہلا ڈالا اور ثابت کر دیا تھا کہ ابلیسی طاقتیں خدائی طاقت کو چیلنج کر سکتی ہیں۔ یہ بعد کی بات ہے کہ خدائی طاقت کو چیلنج کرنے والے کیسے کیسے بھیانک انجام کو پہنچے

اسلام آج تک ابلیسی طاقتوں کے لئے چیلنج بنا ہُوا ہے۔ ایک وقت تھا کہ مسلمانوں نے اُس دور کی دو سپر پاورز، روم اور فارس کو ریت کے گھروندوں کی مانند روند کر ان ملکوں میں اللہ کی حکومت قائم کر دی تھی۔ پھر مسلمان جدھر کا رخ کرتے ادھر بغیر لڑے قلعے ان کے حوالے کر دیئے جاتے تھے۔ مسلمانوں نے ملک نہیں لوگوں کے دل فتح کئے تھے۔ انہوں نے اپنی دہشت طاری نہیں کی دستگیری کی تھی ـــ مظلوم و مجبور رعایا کی دستگیری!

آج مسلمان ابلیسی طاقتوں کے محاصرے میں آئے ہوئے ہیں اور ان کا قتلِ عام ہو رہا ہے۔ یہ اسلام کو ختم کرنے کے جتن ہیں لیکن:

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

قتل مسلمان ہو رہے ہیں، اسلام زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

پروانے جل رہے ہیں، چراغ روشن ہے اور روشن رہے گا۔

جس چراغ کو غارِ حرا کی تاریکی نے نور عطا کیا تھا، وہ اسلام کے جاں نثاروں کے لہو سے جل رہا ہے۔

دنیا میں مسلمانوں کا نام و نشان نہیں رہے گا۔ صرف ایک مسلمان حاملہ عورت زندہ رہے

گی۔ اُس کے بطن سے جو بچہ پیدا ہوگا' وہ اسلام کو زندہ رکھے گا۔

داستان گو حسن بن صباح کی داستان سنا رہا ہے لیکن وہ محسوس کرتا ہے کہ مختصر سا قصہ تکذیب کے اُن علمبرداروں کا بھی سنا دے جنہوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے ساتھ ہی نبوّت کے دعوے کیے اور اپنے اپنے انجام کو پہنچے تھے۔

حسن بن صباح بھی اپنے ذہن اور دل میں نبوّت کے عزم کی پرورش کر رہا تھا۔

تکذیب اور ارتداد کا مقصد اسلام کی بیخ کنی تھا۔ یہ سلسلہ بڑا ہی دراز ہے۔ داستان گو اس کی جھلک پیش کرے گا تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ دین کے دشمن اُسی روز سے اسلام کے درپے ہیں جس روز پہلے آدمی نے اسلام قبول کیا اور اس شہادت کا اقرار کیا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں 'اللہ واحدہ' لاشریک ہے' محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

اسلام نے یہود و نصاریٰ اور تکذیب و ارتداد کے بڑے تیز و تند طوفان دیکھے ہیں لیکن اللہ کا سچا دین تاقیامت زندہ و پائندہ رہنے کے لیے آیا تھا۔

حسن بن صباح کی جنت اسی اسلام دشمن سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

○

آیئے' ذرا ابلیس کا رقص دیکھ لیجیے پھر حسن بن صباح کو سمجھنا آسان ہو جائے گا ورنہ بے خبر لوگ جو اُس کے صرف نام سے واقف ہیں' اُسے افسانوی کردار ہی سمجھتے رہیں گے۔

سجاح بنت حارث تمیمہ ہوازن کے قبیلہ بنو تمیم کی سرکردہ عورت تھی۔ عیسائیت کی پرچار کار تھی اور وہ دریائے دجلہ اور فرات کے اُس درمیانی علاقے کی رہنے والی تھی جو الجزیرہ کہلاتا ہے۔ وہ عالم شباب میں تھی اور حسین بھی تھی۔

اُس کے حُسن کے متعلق مؤرخ لکھتے ہیں کہ بنو تمیم میں اُس سے زیادہ حسین عورتیں بھی موجود تھیں لیکن سجاح کی شکل و شباہت اور جسم کی ساخت میں کوئی ایسا تاثر تھا جو دیکھنے والوں کو مسحور کر لیتا تھا۔ اس کا زیرِ لب تبسّم اپنا ایک اثر پیدا کرتا تھا لیکن اُس کا اصل حُسن اُس کے اندازِ دلربائی میں تھا۔ وہ جب بات کرتی تھی تو اُس کے ہاتھوں کی حرکت' آنکھوں کے بدلتے ہوئے زاویے اور گردن کے خم دوسروں کے دل موہ لیتے تھے۔

اُس نے اپنے آپ میں یہ خوبی بھی پیدا کر رکھی تھی کہ اُس کے پاس کوئی عبادت گزار اور پارسا آ بیٹھتا تو وہ ایسے انداز سے بات کرتی تھی کہ پارسا اُسے اپنے سے زیادہ پارسا سمجھ لیتے اور اس کے عقیدت مند ہو جاتے تھے۔ کوئی عیاش دولت مند اُس کے پاس آتا تو وہ اس عورت کو اپنے جیسی سمجھ کر اُس پر دولت نچھاور کرنے لگتا مگر سجاح اُسے اپنے جسم سے دو ہاتھ دور ہی رکھتی تھی۔ وہ شخص اُس کا گرویدہ ہو جاتا اور اُس کے اشاروں پر ناچتا تھا۔

کوئی امیر ہوتا یا غریب' گناہ گار ہوتا یا نیکوکار' وہ سجاح کو اپنا مونس و غم خوار سمجھتا تھا۔

مؤرخوں نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ سجاح کاہنہ تھی۔ اُس زمانے میں وہ آدمی جو مذہبی پیشوا ہونے کے ساتھ ساتھ علم جوتش و نجوم کا بھی ماہر ہوتا اور آنے والے وقت کے متعلق پیش گوئی کی اہلیت رکھتا وہ کاہن کہلاتا تھا اور ایسی عورت کو کاہنہ کہتے تھے۔

وہ توہم پرستی اور پسماندگی کا دور تھا۔ لوگ جوتشیوں اور نجومیوں کے آگے سجدے کرتے اور قسمت کا حال پوچھتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ کاہن بگڑی ہوئی قسمت کو سنوار سکتے ہیں۔

تاریخ نویس ابوالقاسم رفیق دلاوری' ابن اثیر' بلاذری اور "دبستان مذاہب" کے حوالوں سے لکھتے ہیں ـــــ "سجاح بنت حارث فصیح اور بلیغ اور بلند حوصلہ عورت تھی۔ اسے تقریر و گویائی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ جدتِ فہم' جودتِ طبع اور اصابتِ رائے میں اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی"۔

ایک تو عالم شباب تھا' دوسرے اندازِ دلربائی تھا اور تیسرے یہ کہ اُس نے شادی نہیں کی تھی۔ دولت والے' جاگیروں والے وہ تاجر جن کا مال سینکڑوں اونٹوں پر آتا اور جاتا تھا' اُس کی رفاقت کے امیدوار تھے۔ وہ اپنا دامن بچائے رکھتی اور کسی کو مایوس بھی نہیں کرتی تھی۔

انسانی فطرت کے عالم لکھتے ہیں کہ عربی عراق کی یہ عورت کاہنہ تھی یا نہیں البتہ اپنے ناز و انداز سے وہ جس طرح پتھروں کو بھی موم کر لیتی تھی' اس سے یہ یقینی تاثر ابھرتا تھا کہ وہ ساحرہ ہے۔ وہ اپنے مذہب عیسائیت کی پیشوا بنی ہوئی تھی یہ اُس کا ظاہری روپ تھا جو دراصل بہروپ تھا۔ اُس نے اندرونی طور پر اپنے کردار میں ابلیسی اوصاف پیدا کر لیے تھے اور وہ اُس مقام پر پہنچ گئی تھی جہاں انسان مکمل ابلیس بن جاتا ہے اور اس میں مسحور کر لینے والے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں۔

○

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرما گئے تو نبوّت کے متعدد دعویدار پیدا ہو گئے۔ ان

میں جس نے سب سے زیادہ شہرت پائی وہ مسیلمہ تھا۔ اُس کا نام مسیلمہ بن کبیر تھا۔ رحمٰن یمامہ کے نام سے مشہور تھا۔ آخر وہ مسیلمہ کذاب اور کذابِ یمامہ کے نام سے مشہور ہُوا کیونکہ جھوٹ بولنے میں وہ یکتا تھا۔ جھوٹ بھی وہ ایسے انداز سے بولتا تھا کہ جو لوگ جانتے تھے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے وہ بھی اُس کے جھوٹ کو سچ مان لیتے تھے۔

عجیب بات یہ ہے کہ مسیلمہ کی عمر سو سال کے لگ بھگ تھی جب اُس نے نبوّت کا دعویٰ کیا تھا۔ اُس کی جسمانی صحت کا یہ عالم تھا کہ جسمانی طاقت کے مظاہروں میں جوان بھی اُس کے مقابلے میں بعض اوقات پیچھے رہ جاتے تھے۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ خوراک اچھی ہونے کے علاوہ وہ فطری طور پر متحمل مزاج تھا۔ کوئی اُس کے منہ پر اس کے خلاف بُری بات کہہ دیتا تو اسے بھی وہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رہتی تھی۔ غصہ تو اسے آتا ہی نہیں تھا۔ اپنے دشمن سے بھی انتقام نہیں لیتا تھا بلکہ ایسی بُردباری اور نرمی سے بات کرتا تھا کہ دشمن بھی اُس کے قائل ہو جاتے تھے۔

ایسے کردار اور عادات کی بدولت ایک تو اُس کی صحت ضعیف العمری میں بھی جوانوں جیسی رہی اور دوسرے یہ اثرات دیکھنے میں آئے کہ اُس نے نبوّت کا دعویٰ کیا تو لوگ اُس کے گرویدہ ہو گئے۔

مسیلمہ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک میں ہی نبوّت کا دعویٰ کر دیا تھا لیکن اُس نے یہ نہیں کہا تھا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول نہیں بلکہ اُس نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ رسالت میں برابر کا شریک ہے اور اُس پر بھی وحی نازل ہوتی ہے۔ اُس نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں خط لکھا تھا کہ وہ نبوّت میں آپؐ کا برابر کا شریک ہے اور عرب کی سرزمین نصف آنحضورؐ کی اور نصف اُس کی ہے۔

تاریخوں میں آیا ہے کہ جب یہ خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو آپؐ نے قاصد سے کہا — "اگر قاصد کا قتل جائز ہوتا تو میں تجھے قتل کر دیتا" — یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ یہ پہلا قاصد تھا جسے آنحضورؐ نے یہ الفاظ کہے تھے۔ اس کے بعد آپؐ کے یہ الفاظ ایک قانون یا ضابطے کی صورت اختیار کر گئے۔ کسی کا قاصد یا ایلچی مسلمانوں کے ہاں آتا اور خلیفہ کے سامنے کیسی ہی بدتمیزی کیوں نہ کرتا اُسے معاف کر دیا جاتا تھا۔

مسیلمہ کے پیروکاروں میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچنے لگی۔ اُس نے اپنی آیات لکھنی اور انہیں پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ یہ آیات اُس پر بذریعہ وحی آئی ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرما گئے تو مسیلمہ کھل کر سامنے آ گیا۔ اُس نے معجزے دکھانے بھی شروع کر دیئے تھے۔

حیرت ہے کہ لوگ یہ دیکھتے تھے کہ مسیلمہ کوئی معجزہ دکھانے لگتا تو وہ بالکل اُلٹ ظاہر ہوتا' پھر بھی لوگ بیعت کرتے چلے جا رہے تھے۔

داستان گو نے حسن بن صباح کی داستان شروع کی تھی لیکن بات سے بات نکلی تو بہت دُور جا پہنچی۔ چونکہ مسیلمہ کے معجزات دلچسپی سے خالی نہیں اس لئے داستان گو چند ایک "معجزات" سناتا ہے۔

ایک روز مسیلمہ کے پاس ایک عورت آئی اور بولی کہ ان کے نخلستان میں ہریالی ختم ہو رہی ہے اور وہاں جو دو تین چشموں جیسے کنوئیں ہیں وہ خشک ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

"یا رسول!" — اُس عورت نے کہا — "ایک بار حزمان کا نخلستان خشک ہو گیا تھا کیونکہ اس کے چشمے نے پانی دینا چھوڑ دیا تھا۔ وہاں کے لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور عرض کی کہ ان کا نخلستان خشک ہو گیا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے چُلو بھر پانی اپنے منہ میں ڈالا اور چشمے میں اُگل دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چشمہ اس طرح پھوٹ پڑا کہ وہاں جھیل بن گئی اور خرما کے درختوں کی جو شاخیں سوکھ کر لٹک آئی تھیں وہ ہری بھری ہو گئیں"۔

مؤرخوں نے لکھا ہے کہ مسیلمہ کذاب نے یہ سنا تو اُسی وقت اٹھا اور اونٹ پر سوار ہو کر اُس عورت کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ جب اُس نخلستان میں پہنچا تو دیکھا کہ کنوؤں میں بہت ہی تھوڑا پانی ہے' اُس نے حکم دیا کہ ایک کنوئیں سے تھوڑا سا پانی نکالا جائے۔ پانی نکالا گیا۔ مسیلمہ نے کچھ پانی اپنے منہ میں ڈالا اور کنوؤں میں تھوڑا تھوڑا اُگل دیا۔

تاریخ گواہ ہے کہ کنوؤں میں جو تھوڑا تھوڑا پانی رہ گیا تھا' وہ بھی خشک ہو گیا اور خرما کے درختوں کی جو چند ایک ٹہنیاں ابھی سبز تھیں' وہ بھی سوکھ کر لٹک گئیں۔ اس کے بعد یہ نخلستان مکمل طور پر ریگستان بن گیا۔

اُس کے ساتھیوں میں نہار نام کا ایک خاص ساتھی تھا۔ اُس نے ایک روز مسیلمہ سے کہا کہ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس کسی کے بچے کو دیکھتے اُس بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔ یہ دیکھا گیا تھا کہ جس بچے کے سر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ پھیرا اُس بچے میں ایسی ذہانت پیدا ہو گئی کہ لڑکپن میں پہنچتے تک وہ بچہ نامور مجاہد یا دانشور رہتا۔

مسیلمہ نے یہ بات سنی تو اُس نے باہر نکل کر اپنے قبیلے بنو حنیفہ کے چند ایک بچوں کو بلایا اور اُن کے سروں پر اور اُن کی ٹھوڑیوں پر ہاتھ پھیرا۔ لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ اُن بچوں کے سروں کے بال گرنے لگے اور سورج غروب ہونے تک یہ تمام بچے گنجے ہو گئے۔ اُن کی ٹھوڑیوں پر ہاتھ پھیرنے کا یہ اثر ہُوا کہ یہ تمام بچے زبان کی لکنت یعنی ہکلاہٹ میں مبتلا ہو گئے۔

مسیلمہ نے کسی سے سنا کہ کسی شخص کی آنکھیں خراب ہو جاتیں اور وہ آشوبِ چشم کا مریض ہو جاتا تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی آنکھوں پر اپنا لعابِ دہن لگاتے تو آنکھوں کا جو بھی مرض ہوتا وہ رفع ہو جاتا تھا۔ مسیلمہ نے بھی ایک بار آنکھوں کے ایک مریض کی آنکھوں پر اپنا لعابِ دہن لگا دیا اور وہ شخص بینائی سے ہی محروم ہو گیا۔

ایک عورت اُس کے پاس یہ شکایت لے کر آئی کہ اُس کی اچھی بھلی بکری نے دودھ دینا چھوڑ دیا ہے۔ مسیلمہ کے کہنے پر وہ عورت بکری کو لے آئی۔ مسیلمہ نے بکری کی پیٹھ پر اور پھر تھنوں پر ہاتھ پھیرا۔ نتیجہ یہ سامنے آیا کہ بکری جو چند قطرے دودھ دیتی تھی وہ بھی خشک ہو گئے۔

تاریخوں میں ایک واقعہ نے زیادہ شہرت پائی ہے۔ ایک بیوہ مسیلمہ کے پاس آئی اور کہا کہ وہ بیوہ ہے اور اس کا سہارا بیٹے تھے لیکن زیادہ تر بیٹے مر گئے ہیں، صرف دو زندہ ہیں۔ یا رسول! دعا کریں کہ یہ دونوں بیٹے زندہ رہیں۔

مسیلمہ نے اپنے اوپر مراقبہ طاری کر کے اُس بیوہ کو مژدہ سنایا کہ تمہارے یہ دونوں بیٹے بڑی لمبی عمر پائیں گے۔ بیوہ خوشی خوشی وہاں سے گھر کو چلی۔ گھر پہنچتے ہی اُسے اطلاع ملی کہ اُس کا ایک بیٹا کنوئیں میں گر کر مر گیا ہے۔ اُسی رات دوسرا اور آخری بیٹا تڑپنے لگا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اُسے کیا ہُوا ہے۔ صبح طلوع ہونے تک وہ بھی مر گیا۔

یہ چند ایک واقعات ہیں۔ ایسے بہت سے واقعات تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اُلٹے اثرات کو بھی لوگ معجزہ ہی کہتے تھے جس کی وجہ یہ ہے کہ مسیلمہ ایسے انداز اور ایسے الفاظ میں اُن کی تاویلیں پیش کرتا تھا کہ لوگ انہیں سچ مان لیتے تھے۔

پھر یہ کیا تھا؟ یہ غیرتِ خداوندی تھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نبوت کے ایک جھوٹے دعویدار کو اپنے محبوب رسولﷺ کی برابری میں کھڑا نہیں کر سکتا تھا۔ بعض اوقات ایک عام انسان بھی کوئی معجزہ کر گزرتا ہے لیکن اس آدمی کے کردار اور اس کی فطرت کو دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس شخص کی روحانی قوتیں بیدار ہیں، اس کے قابو میں ہیں اور قابو میں اس لئے ہیں کہ وہ شخص دین دار اور ایمان دار ہے۔ مسیلمہ تو تھا ہی کذاب یعنی جھوٹ بولنے والا۔ جھوٹ ایک ایسی لعنت ہے جو بنے بنائے کام بھی بگاڑ دیتا ہے اور وہ انسان اللہ کے حضور جو دعا کرتا ہے اُس کا اثر اُلٹا ہوتا ہے۔

مسیلمہ کی مقبولیت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد اتنی بڑھی کہ اُس نے ایک لشکر تیار کر لیا۔ خلیفہ اوّل حضرت ابو بکر صدیقؓ کو مسیلمہ کی اس جنگی طاقت کی اطلاع ملی تو انہوں نے اُس کے خلاف اعلانِ جہاد کیا۔ مسیلمہ کی لڑائیاں تین سالاروں سے ہوئی تھیں۔ ایک تھے عکرمہؓ دوسرے تھے شرجیل بن حسنہ اور تیسرے تھے خالد بن ولیدؓ۔ آخر شکست تو مسیلمہ کو ہوئی تھی لیکن اُس کی جنگی طاقت کا یہ عالم تھا کہ اُس نے تاریخِ اسلام کے ان تین نامور سپہ سالاروں کو حیران و پریشان کر دیا تھا۔ کئی ایسے مواقع آئے جب یوں پتہ چلتا تھا کہ فتح مسیلمہ کی ہو گی۔

یہ لڑائیاں ایک الگ اور بڑی ہی ولولہ انگیز داستان ہے لیکن داستان گو اپنی داستان کی طرف لوٹتا ہے۔

○

بات سجاح بنتِ حارث کی ہو رہی تھی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اس حسین ساحرہ کے دماغ میں آئی کہ مسیلمہ اس بڑھاپے میں نبوت کا دعویٰ کر کے ایک لشکرِ جرار بھی تیار کر سکتا ہے تو کیوں نہ وہ بھی نبوت کا دعویٰ کرے۔ اُسے اپنے ان اوصاف کا پوری طرح احساس تھا جو لوگوں کے دل موہ لیا کرتے تھے۔ اس وقت تک اس عورت میں ابلیسی اوصاف کُوٹ کُوٹ کر بھرے جا چکے تھے۔

ایک روز اُس نے اپنے قبیلے کو اکٹھا کیا اور اعلان کیا کہ گزشتہ رات خدا نے اُسے نبوت عطا

کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک وحی شائع کی۔ وہ عیسائی مذہب کی عورت تھی لیکن نبوت کے اس جھوٹے دعوے کے ساتھ ہی عیسائی مذہب ترک کر دیا۔ چونکہ وہ حسین عورت تھی اس لئے لوگ اُس سے متاثر ہو گئے۔

اُس میں جو اوصاف تھے اور جو کشش تھی وہ پہلے بیان ہو چکی ہے۔ اُس کے قبیلے کے سردار اُس کے امیدوار بھی تھے۔ سب سے پہلے ان سرداروں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ سب سے پہلے بنو تغلب نے اُس کی نبوت کو تسلیم کیا جس کی وجہ یہ تھی کہ اس قبیلے کا ایک سردار جو سب سے زیادہ اثر و رسوخ والا تھا سجاح کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ ایسا ہی ایک سردار ابن ہبیرہ بنو تمیم کا تھا وہ بھی سجاح کا مرید ہو گیا۔

اُس وقت کا معاشرہ قبیلوں میں منقسم تھا۔ قبیلوں پر سرداروں کا اثر و رسوخ تھا۔ ایک سردار جس طرف جاتا، پورا قبیلہ اُس کے پیچھے جاتا تھا۔ سجاح نے سب سے پہلے قبیلوں کے سرداروں کو زیرِ اثر لیا اور بہت تھوڑے سے عرصے میں کئی ایک قبیلوں نے اُس کی نبوت کو تسلیم کر لیا۔ یہاں تک کہ بہت سے ایسے لوگ جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، اسلام سے منحرف ہو کر سجاح کے پیروکار بن گئے۔ سجاح نے مسیلمہ کی طرح ایک لشکر تیار کر لیا اور اُس نے مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اُس کے اپنے ایک مشیر مالک بن نمیو نے اُسے مدینہ پر حملہ کرنے سے روک دیا اور ان قبیلوں سے نمٹنے کا مشورہ دیا جو اُس کی نبوت کو تسلیم نہیں کر رہے تھے۔ اس طرح سجاح نے اچھی خاصی لڑائیاں لڑیں۔

خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سجاح کی سرکوبی کے لئے خالد بن ولیدؓ کو بھیجا۔ شرجیل بن حسنہ اور عکرمہؓ ابن ابی جہل بھی ساتھ تھے۔ خالد بن ولیدؓ کو اطلاع ملی کہ ان کا مقابلہ ایک نہیں بلکہ دو لشکروں کے ساتھ ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے پیش قدمی اس غرض سے روک لی کہ دشمن کی قوت کا اندازہ جاسوسوں سے کر لیا جائے۔

اُدھر مسیلمہ نے محسوس کیا کہ وہ شکست کھا جائے گا۔ اُس نے سجاح کو پیغام بھیجا کہ وہ اُسے ملنا چاہتا ہے۔ وہ دراصل سجاح کو اپنے ساتھ ملانا چاہتا تھا اور اُس کا ارادہ یہ بھی تھا کہ سجاح پر حاوی ہو کر اُسے اپنے زیرِ اثر کر لے۔ وہ سجاح کی نبوت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔

سجاح نے مسیلمہ کو ملاقات کے لئے اپنے ہاں بلا لیا۔

○

مسیلمہ اپنے ساتھ چالیس ایسے پیروکار لے گیا جو ذہنی لحاظ سے بہت ہوشیار اور دانش مند تھے اور تیغ زنی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ مسیلمہ سن چکا تھا کہ سجاح میں کیا کیا خوبیاں ہیں اور اُس کا حُسن کس قدر سحرانگیز ہے۔

مسیلمہ اپنے ساتھ بڑا ہی خوش نما اور بڑے سائز کا خیمہ لے گیا تھا۔ شراب و کباب کا انتظام بھی اس کے ساتھ تھا۔ رنگا رنگ روشنی دینے والے فانوس بھی تھے۔ مختصر یہ کہ عیش و عشرت اور زیب و زینت کا پورا سامان مسیلمہ کے ساتھ تھا۔ وہ ایسے عطر اپنے ساتھ لے گیا تھا جن کی مہک مخمور کر دیتی تھی۔

مسیلمہ اور سجاح کی ملاقات ایک نخلستان میں ہوئی۔ مسیلمہ نے یہ تو سن رکھا تھا کہ سجاح میں ایسے اوصاف موجود ہیں جو پتھر دل مرد کو بھی موم کر دیتے ہیں لیکن وہ سجاح کے سامنے گیا تو اُس نے محسوس کیا کہ سجاح کی شخصیت اس سے زیادہ سحرانگیز ہے جتنی اُس نے سنی تھی۔ تب اُس نے محسوس کیا کہ اس حسین ساحرہ کا میدانِ جنگ میں مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ یہ خطرہ وہ پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ اسی لئے وہ اپنے ساتھ یہ سارا ساز و سامان لے گیا تھا۔ اس نے سجاح سے کہا کہ وہ اس کے خیمے میں چلے کیونکہ یہ جگہ اس قابل نہیں کہ سجاح جیسی عورت کسی غیر سے بیٹھ کر بات کرے۔

مسیلمہ معمر اور تجربہ کار آدمی تھا۔ اُس میں دانش مندی بھی تھی۔ اُس نے باتوں باتوں میں سجاح کو اتنا اونچا چڑھا دیا کہ وہ پھولی نہ سمائی اور مسیلمہ کی باتوں میں آ گئی۔ اُسی وقت اٹھی اور مسیلمہ کے ساتھ اس کے خیمے میں چلی گئی۔ اس نے جب خیمے کے اندر زیب و زینت اور آرام و آرائش کا سامان دیکھا تو اس پر کچھ اور ہی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دماغ پر کچھ اور ہی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

یہ اثرات جو اس کے دماغ پر مرتب ہو رہے تھے، یہ اس عطر کی مہک کے اثرات تھے۔ یورپی مؤرخوں میں سے دو نے لکھا ہے کہ یہ ایک خاص عطر تھا جس کی مہک ذہن میں رومانی خیالات پیدا کر دیتی تھی۔

مسیلمہ نے خیمے میں جو بستر لگوایا تھا اس پر ریشمی گدّے اور پلنگ پوش تھے۔ اُس نے سجاح کو اس بستر پر بٹھایا اور خود اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"میں تمہیں یہاں ایک خاص مقصد کے لئے لایا ہوں"۔۔۔ مسیلمہ نے سجاح سے کہا۔

"مرے نبی!"۔۔۔ سجاح نے کہا۔۔۔ "اس خیمے میں آکر میں کچھ اور ہی محسوس کرنے لگی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے میں یہاں سے نکلنا ہی نہیں چاہوں گی۔ کیا اب آپ مجھے بتائیں گے کہ آپ کا مقصد کیا ہے؟"

"ایک خواہش ہے"۔۔۔ مسیلمہ نے ایسے انداز سے کہا جیسے وہ سجاح کا گرویدہ ہو گیا ہو۔۔۔ "میں تمہاری باتیں سننا چاہتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ تمہاری زبان میں ایسی شیرینی ہے کہ دشمن بھی تمہارے قدموں میں سر رکھ دیتا ہے"۔

"نہیں!"۔۔۔ سجاح نے کہا۔۔۔ "میں چاہتی ہوں کہ آپ کوئی بات کریں"۔

"تمہارے سامنے میں کیا بات کر سکتا ہوں!"۔۔۔ مسیلمہ نے کہا۔

"کوئی تازہ وحی نازل ہوئی ہو تو وہ سنا دیں"۔۔۔ سجاح نے کہا۔

مسیلمہ نے اپنی دماغی قوتوں اور ابلیسی دانش کو بروئے کار لاتے ہوئے سجاح کے ساتھ کچھ باتیں کی اور اُس کے سامنے سے اٹھ کر بستر پر اس طرح بیٹھ گیا کہ اُس کا جسم سجاح کے جسم کے ساتھ لگ گیا۔ اس نے ایک وحی سجاح کو سنائی۔

مشہور مورخ ابنِ اثیر نے لکھا ہے کہ یہ وحی عورتوں کے متعلق تھی اور اس قدر فحش کہ اس کا ترجمہ تحریر میں لایا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کے ساتھ ہی مسیلمہ نے سجاح کے جسم کے ساتھ آہستہ آہستہ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

مسیلمہ نے سجاح کے چہرے پر ایک تبدیلی دیکھی اور اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ دیکھی جو پہلے اس کے ہونٹوں پر نہیں تھی۔ مسیلمہ کو معلوم تھا کہ اس عورت کا شباب جوبن کے انتہائی درجے پر پہنچا ہُوا ہے اور اس نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ پھر اس نے یہ سوچا کہ اس عورت نے نبوّت کا دعویٰ کر رکھا ہے اس لئے کوئی مرد اس کے جسم کے ساتھ تعلق رکھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ اس کے تمام پیروکار اس کے جسم کو مقدس اور لائقِ عبادت سمجھتے ہیں لیکن یہ جوان عورت ہے، انسان ہے اور اس میں انسانی جذبات بھی ہیں جن میں حیوانی جذبات بھی

شامل ہیں۔ مسیلمہ کی صرف ایک فحش بات سے ہی سجاح کا چہرہ تمتما اُٹھا تھا۔

مسیلمہ نے ایک اور وحی سنا دی جو پہلی وحی سے زیادہ فحش تھی اور حیوانی جذبات کے لئے اشتعال انگیز بھی تھی۔ اس کے بعد مسیلمہ نے ایسی ہی بلکہ اس سے زیادہ اشتعال انگیز اور بڑی ہی بے حیائی کی باتیں شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ سجاح کے حسن کی تعریفیں کرتا جاتا تھا اور یہ بھی تسلیم کرتا تھا کہ سجاح سچّی نبی ہے۔

سجاح کو عطر کی مہک نے اور ریشمی بستر کے گداز نے اور مسیلمہ کی باتوں اور اُس کے انداز نے نبوّت کے درجے سے ہٹا کر ایک ایسی جوان عورت کے درجے پر گرا دیا تھا جو جذبات کی تشنگی سے مری جا رہی تھی۔ مسیلمہ اُس کے خیالوں کی یہ تبدیلی اس کے چہرے اور اس کی سانسوں سے محسوس کر رہا تھا جو اُکھڑی جا رہی تھیں۔ مسیلمہ معمر آدمی تھا لیکن اس کا انداز جوانوں والا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے اعضاء پر عمر کی طوالت نے ذرا سا بھی اثر نہیں کیا۔

سجاح نے بے قابو ہو کر مسیلمہ کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور اپنے سینے پر رکھ دیا۔

"میرا ایک مشورہ مانو سجاح!"۔۔۔ مسیلمہ نے کہا۔۔۔ "آؤ ہم شادی کر لیتے ہیں"۔

"وہ کیوں؟"۔۔۔ سجاح نے پوچھا۔۔۔ "کیا آپ کو میرا جسم اتنا اچھا لگا ہے؟"

"جسم کی بات نہ کرو"۔۔۔ مسیلمہ نے کہا۔۔۔ "نبی جسموں کے ساتھ تعلق نہیں رکھا کرتے۔ روح کی بات کرو۔ میں جانتا ہوں تمہارا جسم تشنہ ہے لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں نبی ہیں۔ اگر ہماری فوجیں الگ الگ مسلمانوں کا مقابلہ کرتی رہیں تو دونوں شکست کھا جائیں گی۔ اگر ہماری فوجیں مل کر ایک ہو جائیں تو ہم سارے عرب پر قبضہ کر لیں گے۔ صرف مسلمان ہیں جو ہماری نبوّت کو قبول نہیں کرتے اور ہمیں ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ہم دونوں مل کر مسلمانوں کو ختم کر دیں اور پورے عرب پر قابض ہو کر دوسرے ملکوں پر چڑھائی کریں اور اپنی نبوّت کو دور دور تک پھیلا دیں"۔

اُس وقت سجاح پر کچھ اور ہی کیفیت طاری تھی۔ اُس پر ابلیسیت کا غلبہ تھا۔ اُس نے اپنے آپ میں خاص طور پر ابلیسی اوصاف پیدا کئے تھے۔ یہ اوصاف اُس پر ایسے غالب آئے کہ اُس

نے مسیلمہ کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور کہا کہ وہ ابھی اس کی بیوی بننے کو تیار ہے۔

مسیلمہ کے ساتھ چالیس آدمی آئے تھے۔ وہ خیمے سے کچھ دور چاق و چوبند کھڑے تھے کہ نہ جانے مسیلمہ کا کوئی حکم کس وقت آجائے۔ تقریباً اتنے ہی آدمی برچھیوں اور تلواروں سے مسلح سجاح کے ساتھ آئے تھے۔ وہ الگ تیار کھڑے تھے۔

دونوں طرف کے یہ مسلح آدمی یقیناً یہ سوچ رہے ہوں گے کہ خیمے کے اندر دو نبیوں میں جو مذاکرات ہو رہے ہیں، ان کا نتیجہ نہ جانے کیا ہوگا۔ توقع یہی تھی کہ مذاکرات ناکام ہو جائیں گے کیونکہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔

دونوں طرف یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ خیمے کے اندر کوئی اور ہی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ بغیر کسی اعلان کے اور بغیر کوئی رسم ادا کئے مسیلمہ اور سجاح میاں بیوی بن چکے تھے اور خیمہ حجلہ عروسی بنا ہوا تھا۔ سجاح ہوش و حواس گم کر بیٹھی تھی اور اُس نے اپنی نسائیت اور نبوّت مسیلمہ کے حوالے کر دی تھی۔

مؤرخ لکھتے ہیں کہ مسیلمہ اور سجاح تین دن اور تین راتیں خیمے سے باہر نہ نکلے۔ خیمے میں صرف کھانا اور شراب جاتی تھی۔ باہر کے لوگ پریشان ہوتے رہے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ آخر چوتھے روز وہ باہر نکلے۔ سجاح کے چہرے پر شرم و ندامت کے تاثرات آگئے۔ یہ اُس وقت آئے جب اس نے اپنے مسلح آدمیوں کو دیکھا۔

وہ سر جھکائے ہوئے اپنے لشکر میں پہنچی۔

○

سجاح کے مشیر اور خاص پیروکاروں نے اُس سے پوچھا کہ بات چیت کس نتیجے پر پہنچی ہے۔

"میں نے مسیلمہ کی نبوّت کو تسلیم کر لیا ہے" ــــ سجاح نے کہا ــــ "اُس کی نبوّت برحق ہے۔ میں نے اس کے ساتھ نکاح کر لیا ہے۔ اب نبوّت میری ہو یا اس کی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا"۔

"نکاح تو ہو گیا" ــــ سجاح سے پوچھا گیا ــــ "مہر کیا مقرر ہوا ہے؟"

"مہر؟" ــــ سجاح نے کہا ــــ "یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ مہر بھی مقرر کرنا تھا"۔

مؤرخوں نے لکھا ہے کہ یہ جواب دے کر سجاح کی آنکھیں جھک گئیں جیسے وہ نادم اور شرمسار ہو۔ اس کا نبوّت والا انداز بالکل ہی بدل گیا تھا۔

ان مشیروں نے اسے مشورہ دیا کہ جب کوئی عورت کسی مرد کی زوجیت میں جاتی ہے تو وہ نکاح میں اسے قبول کرنے سے پہلے اپنا مہر مقرر کرواتی ہے۔ اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ مسیلمہ کے پاس جائے اور مہر مقرر کروا کر آئے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ اگر مسیلمہ نے اُسے اپنی بیوی بنایا تھا تو اسے اپنے ساتھ لے جاتا لیکن اُس نے اسے عصمت سے محروم کر کے اس کے لشکر میں بھیج دیا۔ یہ معلوم نہیں کہ اُس نے سجاح کو کیا کہہ کر اسے اس کے لشکر میں بھیجا تھا۔ اس کے مشیر سجاح کی اس حرکت پر پریشان سے ہوئے اور اسے بار بار یہی کہا کہ وہ مسیلمہ کے پاس جا کر مہر مقرر کروا لے۔

○

مسیلمہ سجاح کو اُس کے لشکر میں بھیج کر خود بڑی تیزی سے وہاں سے کوچ کر گیا اور اپنے قلعہ میں جا پہنچا۔

"تم سب کو چوکنا اور محتاط رہنا ہو گا" ــــ مسیلمہ نے قلعے میں جا کر اپنے محافظوں اور مصاحبین سے کہا ــــ "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ سجاح کے ساتھ میں نے کیا سلوک کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے پیروکار اور مصاحبین یہ سن کر بھڑک اٹھیں کہ اُس نے میرے ساتھ شادی کر لی ہے۔ اگر ان کا ردِ عمل یہ ہوا تو وہ ہم پر حملہ کر سکتے ہیں۔ یہ سوچ لو کہ اُدھر مسلمانوں کا لشکر آ رہا ہے۔ اگر سجاح کے لشکر نے بھی ہم پر حملہ کر دیا تو ہم پس جائیں گے۔ قلعے کے دروازے دن کے وقت بھی بند رکھو"۔

یہ کوئی بڑا قلعہ نہیں تھا۔ مسیلمہ کا اپنا مکان تھا جو قلعے کی طرح تھا۔ اُس نے اندر سے دروازے بند کر لئے تھے۔ سجاح کو اپنے ہاں رکھنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اگلے روز سجاح مسیلمہ کے قلعہ نما گھر کے دروازے پر پہنچی۔ دروازہ بند پا کر اس نے کہا کہ مسیلمہ کو اطلاع دی جائے کہ اس کی بیوی سجاح آئی ہے۔ مسیلمہ کو اطلاع پہنچی تو وہ ڈر گیا کیونکہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی کہ وہ اگلے ہی روز اس کے پاس پہنچ جائے۔ مسیلمہ کو یہ بھی بتایا گیا کہ سجاح کے ساتھ اس کا محافظ دستہ بھی ہے۔

تاریخوں میں آیا ہے کہ مسیلمہ نے یہ نہ کہا کہ اسے اندر لے آؤ اور نہ وہ خود دروازے پر آیا۔ وہ مکان کی چھت پر چلا گیا اور وہاں سے سجاح کو پکارا۔

"دروازہ کھلواؤ" ـــ سجاح نے کہا ـــ "میں اندر آنا چاہتی ہوں"۔

"اس وقت تمہارا اندر آنا ٹھیک نہیں" ـــ مسیلمہ نے کہا ـــ "یہ بتاؤ تم کیوں آئی ہو"۔

"اپنا مہر مقرر کروانے کے لئے" ـــ سجاح نے جواب دیا ـــ "نکاح اتنی عجلت میں ہوا ہے کہ مجھے مہر مقرر کروانے کا خیال ہی نہیں رہا"۔

"تو سن لو" ـــ مسیلمہ نے کہا ـــ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے پانچ نمازیں فرض کروا کے لائے تھے۔ اب میں خدا کا رسول ہوں۔ میں تمہیں، تمہارے پیروکاروں اور تمہارے لشکر کو دو نمازیں، صبح اور عشاء کی تمہارے مہر میں معاف کرتا ہوں۔ واپس جا کر منادی کرا دو کہ تم نے مہر میں دو نمازیں معاف کروائی ہیں"۔

سجاح واپس چل پڑی۔ اُس کے ساتھ محافظ دستے کے علاوہ اُس کا مؤذن شیث بن ربیع بھی تھا۔ تقریباً تمام مسلمان مورخوں نے لکھا ہے کہ سجاح کے یہ مصاحب کچھ شرمسار سے تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ مسیلمہ نے ان کی نبی کے ساتھ بڑا ہی شرمناک سلوک کیا ہے۔ وہ خود بھی شرمسار ہو رہے تھے۔ سجاح کا ایک خاص مصاحب عطا ابن حاجب بھی تھا۔

"ہماری نبی ایک عورت ہے جسے ہم ساتھ لئے پھرتے ہیں" ـــ عطا ابن حاجب نے کہا ـــ "لیکن لوگوں کے نبی مرد ہوتے ہیں اور انہیں شرمسار نہیں ہونا پڑتا"۔

تاریخوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ مسیلمہ نے علاقہ یمامہ کے محصولات سجاح کو ایک سال کے لئے دے دیئے تھے لیکن مسلمانوں نے انھیں محصولات وصول کرنے کی مہلت نہ دی۔ خالدؓ بن ولید اپنے لشکر کے ساتھ پہنچ گئے۔ مسیلمہ کے ساتھ نکاح کرنے سے سجاح کی قدر و منزلت اپنے پیروکاروں میں بڑی تیزی سے ختم ہو گئی تھی۔ بڑے اچھے اور قابل پیروکار اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔

سجاح نے جب دیکھا کہ اُس کے پاس لڑنے کی طاقت بھی نہیں رہی تو وہ بھاگ اٹھی اور بنو تغلب میں جا پہنچی۔ ابنِ اثیر اور ابنِ خلدون نے لکھا ہے کہ سجاح بالکل ہی بجھ کے رہ گئی اور اُس نے ایک خاموش اور گمنام زندگی کا آغاز کیا۔ نہ اُس میں اندازِ دلربائی رہا نہ وہ جاہ و جلال رہا۔

یہاں تک کہ امیر معاویہؓ کا زمانہ آ گیا۔

اُسی سال ایسا خوفناک قحط پڑا کہ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ سجاح کا قبیلہ بنو تغلب فاقہ کشی سے گھبرا کر بصرہ جا آباد ہُوا۔ سجاح بھی ان کے ساتھ تھی۔ مسلمانوں کے سلوک اور اناج کی مساوی تقسیم سے متاثر ہو کر بنو تغلب کے تمام قبیلے نے اسلام قبول کر لیا۔ سجاح بھی مسلمان ہو گئی اور اُس نے سچے دل سے اللہ کی عبادت شروع کر دی۔ اُس کے کردار میں جو ابلیسی اوصاف پیدا ہو گئے تھے وہ عبادتِ الٰہی سے ڈھلنے لگے حتیٰ کہ وہ بالکل ہی متقی اور عبادت گزار بن گئی۔

تھوڑے ہی عرصے بعد وہ بیمار پڑی اور مر گئی۔ ان دنوں ایک صحابی سمرہؓ ابن جندبؓ بصرہ کے حاکم تھے۔ انہوں نے سجاح کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔

سجاح پر اللہ نے اپنا خاص کرم کیا کہ وہ دین داری کی حالت میں مری اور اُس کی عاقبت محفوظ ہو گئی لیکن مسیلمہ کا انجام کچھ اور ہُوا۔ اُس نے مسلمانوں کے خلاف بڑی خونریز لڑائیاں لڑی تھیں۔ معمر ہونے کے باوجود وہ جوانوں کی طرح لڑتا تھا۔

آخری لڑائی میں جب اُس نے دیکھا کہ خالدؓ بن ولید کا لشکر اُس کے گھر تک آ پہنچا ہے تو وہ خود زرہ اور آہنی خود پہن کر گھوڑے پر سوار ہُوا اور باہر نکلا۔

پہلے وہ باغ میں گیا جہاں لڑائی ہو رہی تھی پھر وہ باغ سے نکلا۔ جونہی وہ آگے آیا۔ ایک برچھی اُس کے سینے میں دل کے مقام پر اُتر گئی۔

برچھی مارنے والا عرب کا مشہور برچھی باز وحشی تھا۔ اُس کا نام ہی وحشی تھا۔ اُس کی برچھی بازی کا ایک کمال تاریخ کے دامن میں محفوظ ہے۔ ایک رقاصہ کے سر پر ایک کڑا جو عورتیں اپنے بازوؤں میں ڈالتی ہیں، سیدھا کھڑا کر کے بالوں کے ساتھ باندھ دیا گیا اور رقاصہ ناچنے لگی۔ اُس کا جسم تھرک رہا تھا اور وہ بار بار گھومتی اور اِدھر اُدھر ہوتی تھی۔

وحشی ہاتھ میں برچھی لئے رقاصہ سے بارہ چودہ قدم دور اُس کی حرکت کے ساتھ حرکت کرتا کڑے کا نشانہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے برچھی کو ہاتھ میں تولا اور تاک کر رقاصہ کے سر پر برچھی پھینکی۔ رقاصہ اُس سے بے نیاز رقص کی اداؤں میں محو تھی۔ وحشی کی پھینکی ہوئی برچھی رقاصہ کے سر پر بندھے ہوئے کڑے میں سے اس طرح گذر گئی کہ رقاصہ کو احساس تک نہ ہُوا۔

جنگِ اُحد میں وحشی اہلِ قریش کے ساتھ تھا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ کو اسی وحشی نے پیٹ میں برچھی مار کر شہید کیا تھا۔ اس کے بعد جب خالدؓ بن ولید نے اسلام قبول کیا' وحشی نے بھی اسلام قبول کر لیا اور اگلے معرکوں میں تاریخ میں نام پیدا کیا۔ یہ سعادت اُسی کے نصیب میں لکھی تھی کہ مسیلمہ کذاب جیسے بڑے ہی طاقتور جھوٹے نبی کو جہنم واصل کیا۔

تاریخ میں یوں آیا ہے کہ مسیلمہ کو ہلاک کرنے والے دو مجاہد تھے۔ ایک تو وحشی تھا جس نے اُسے برچھی ماری تو وہ گھوڑے سے گرا۔ اُس کے ساتھ ہی مدینہ کے ایک انصاری نے اُس پر تلوار کا بھرپور وار کیا۔ وحشی نے مسیلمہ کا سر تن سے کاٹا اور برچھی کی انّی پر اُڑس کر برچھی بلند کی۔

"میں نے اُحد کا گناہ معاف کرا لیا ہے" ـــ وحشی مسیلمہ کا سر برچھی پر اٹھائے میدانِ جنگ میں دوڑتا اور اعلان کرتا پھر رہا تھا۔

بعد میں اُس نے کئی بار کہا تھا کہ حضرت حمزہؓ کے قتل کا افسوس اُسے ہمیشہ پریشان کرتا رہا۔ مسیلمہ کو قتل کر کے اُسے اُحد کے افسوس اور پچھتاوے سے نجات ملی ہے۔

یہ تھا انجام دو جھوٹے نبیوں کا۔ یہ ابلیس کا رقص تھا۔ انسان جب اپنے کردار میں ابلیسی اوصاف پیدا کر لیتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اُسے نتائج سے بے خبر کر دیتے ہیں۔ انہیں پکڑنے کے لئے اللہ آسمان سے فرشتے نہیں اتارا کرتا۔ یہ لوگ اپنے قدموں چل کر انجام کو پہنچ جایا کرتے ہیں۔

کوئی عبرت حاصل نہیں کرتا۔

○

"ہمیں مصر کے عبیدیوں سے مدد لینی پڑے گی" ـــ قلعہ شاہ در میں احمد بن عطاش حسن بن صباح سے کہہ رہا تھا ـــ "لیکن کسی طرح یہ یقین کر لینا بہت ہی ضروری ہے کہ وہ ہماری مدد کریں گے بھی یا نہیں"۔

"کیوں نہیں کریں گے؟" ـــ حسن بن صباح نے پوچھا اور کہا ـــ "وہ ہمارے ہی فرقے کے لوگ ہیں"۔

"کچھ شک والی بات ہے" ـــ ابنِ عطاش نے کہا ـــ "پہلے تو یہ جائزہ لینا ہے کہ وہ اسماعیلی ہیں یا نہیں۔ پتہ چلا ہے کہ ظاہری طور پر وہ اسماعیلی ہیں لیکن درپردہ وہ کوئی اپنا ہی نظریہ رکھتے ہیں"۔

"اگر یہ جائزہ لینا ہے تو مجھے مصر جانا پڑے گا" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "اور میں مصر چلا ہی جاؤں گا"۔

"ہاں حسن!" ـــ ابنِ عطاش نے کہا ـــ "میں تمہیں مصر بھیجوں گا۔ ہمارا پہلا مقصد یہ ہے کہ اہلِ سنت کی حکومت کا تختہ اُلٹنا ہے۔ سلجوقیوں کا خاتمہ لازمی ہے"۔

"محترم استاد!" ـــ حسن بن صباح نے پوچھا ـــ "میں عبیدیوں کو نہیں جانتا.... ان کی جڑیں کہاں ہیں؟"

احمد بن عطاش نے حسن بن صباح کو اپنے رنگ اور اپنے انداز سے تفصیلاً سنایا کہ عبیدیوں کی جڑیں کہاں ہیں اور اس فرقے نے کہاں سے جنم لیا تھا۔ مستند مؤرخوں اور اُس دور کے علماءِ دین کی تحریروں سے عبیدیوں کا پس منظر اور پیش منظر واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ یہ بھی اسلام پر فرقہ پرستوں کی ایک یلغار تھی۔

داستان گو نے پہلے کہا ہے کہ اسلام نے' خصوصاً اہلِ سنت والجماعت نے' جو تیز و تند طوفان برداشت کئے ہیں وہ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں۔ ایک تو صیہونی اور صلیبی یلغار تھی جس نے اسلام کے تناور درخت کو جڑوں سے اکھاڑنا چاہا تھا۔ آج کے دور میں یہ یلغار ایک بار پھر شدت اختیار کر گئی ہے۔

یہ تو بیرونی یلغار ہے' اہلِ اسلام کے اندر سے جو حملہ آور اٹھے' اُن کا ہدف اہلِ سنت تھے۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے تھے لیکن اُن کے عزائم اور سرگرمیاں نہ صرف غیر اسلامی یا اسلام کے منافی تھیں بلکہ اسلام کی بقا' سلامتی اور فروغ کے لئے بے حد خطرناک تھیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

عبیدیت ایسا ہی ایک فتنہ تھا جو تیسری صدی ہجری میں اٹھا۔ یہ اسماعیلیوں کی ایک شاخ تھی لیکن اصل میں یہ فرقہ باطنی تھا اور اس کے بانی پیشواؤں میں بھی ابلیسی اوصاف پائے جاتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے۔

"کیا ہم تمہیں بتائیں کہ شیاطین کن پر اُترا کرتے ہیں؟ وہ ایسے لوگوں پر نازل ہوتے (اور ان پر قابض ہوتے ہیں) جو جھوٹ بولنے والے اور بدکردار ہوتے ہیں" — (سورہ 26 - آیت 221)۔

عبیدی فرقے کا بانی عبیداللہ تھا جس کے متعلق پورے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں کا رہنے والا تھا۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ وہ کوفہ کا رہنے والا تھا اور کچھ نے لکھا ہے کہ وہ حمص کے علاقے کے ایک گاؤں سلمیہ کا رہنے والا تھا۔ اُس کے باپ کا نام محمد حبیب تھا اور وہ اپنے قبیلے کا سرکردہ فرد تھا۔

محمد حبیب کو ایک خواہش پریشان رکھتی تھی۔ وہ عمر کے آخری حصے میں پہنچ چکا تھا۔ اُس کا بیٹا عبیداللہ جوان ہو گیا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا کہ عبیداللہ میں ایسے ابلیسی اوصاف پائے جاتے ہیں کہ وہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کے لئے ہر ڈھنگ کھیل سکتا ہے۔ اُس کی خواہش یہ تھی کہ تھوڑے سے علاقے میں اُس کی اپنی سلطنت قائم ہو جائے۔

محمد حبیب نے اعلان کر دیا کہ اُس کا بیٹا مہدی آخرالزماں ہے۔ یہ بڑی لمبی داستان ہے کہ عبیداللہ اور اُس کے باپ نے کیسے کیسے ڈھنگ کھیل کر اور کیسی کیسی فریب کاریوں سے اپنے پیروکار بنالئے اور اُن کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔

عبیداللہ نے 270 ہجری میں مہدویت کا اعلان کیا تھا اور اُس نے اپنے فرقے کو فرقہ مہدویہ کا نام دیا تھا۔ اُس نے 278 ہجری میں حج کیا اور وہاں اپنے مہدی موعود ہونے کا پروپیگنڈہ ایسے انداز سے کیا کہ بنوکنانہ کے پورے قبیلے نے اُسے امام مہدی تسلیم کر لیا۔

محمد حبیب نے اپنے بیٹے کو مہدی تسلیم کرانے کے لئے قبیلوں کے سرداروں کو بڑی خوبصورت لڑکیوں اور سونے چاندی کے انعامات کے ذریعے بھی پھانسا تھا۔ جب اس فرقے میں پیروکاروں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو مہدیوں نے خفیہ اور پُراسرار قتل کا سلسلہ شروع کر دیا۔ قتل اہلِ سنت کے علماء کو کیا جاتا تھا اور پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ قاتل کون ہے۔ چونکہ اس فرقے کی مخالفت اہلِ سنت کی طرف سے ہوتی تھی اس لئے وہی قتل ہوتے تھے۔ جہاں کہیں سے بھی مخالفانہ آواز اٹھتی تھی وہاں کے چیدہ چیدہ آدمی ہمیشہ کے لئے لاپتہ ہو جاتے تھے۔

"تاریخ الخلفاء" میں لکھا ہے کہ ایک روز ایک سرکردہ فرد ابن طباطبا علوی عبیداللہ سے ملنے گیا۔ عبیداللہ دربار لگائے بیٹھا تھا۔ وہاں کچھ امراء بھی تھے اور عام حاضرین کی تعداد خاصی تھی۔

"اے عبیداللہ!" — علوی نے کہا — "میں تجھے مہدی آخرالزماں تسلیم کر لوں گا۔ پہلے یہ تو بتا کہ تیرا حسب و نسب کیا ہے اور کون سا قبیلہ تیری پہچان ہے؟"

عبیداللہ نے اپنی نصف تلوار نیام سے کھینچی اور بولا — "یہ ہے میرا نسب!" — پھر وہ ایک تھیلی میں ہاتھ ڈال کر سونے کی بہت سی اشرفیاں نکال کر دربار کے حاضرین کی طرف پھینک کر بولا — "اور یہ ہے میرا حسب!"

درباری اشرفیوں پر ٹوٹ پڑے۔ ابن طباطبا علوی وہاں سے چُپ چاپ باہر نکل گیا۔

یہ تھی عبیداللہ کی کامیابی کی اصل وجہ۔ اس کے علاوہ اُس نے اس قسم کے عقیدے رائج کر دیئے کہ ایک آدمی بیک وقت اٹھارہ عورتوں کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔ جب کہ اسلام نے صرف چار بیویوں کی اجازت دی تھی اور وہ بھی مخصوص حالات میں۔ اُس کا دوسرا عقیدہ یہ تھا کہ حکومت کا جو سربراہ ہو اور مذہب کا جو امام ہو، وہ گناہوں سے پاک ہوتا ہے اور اُس سے اُس کے اعمال پر کوئی باز پُرس نہیں کی جا سکتی۔ ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ امام کسی عورت سے یہ کہہ دے کہ تم فلاں کی بیوی ہو تو اس عورت پر یہ فرض ہو جاتا تھا کہ وہ اس کی بیوی بن جائے۔

اس قسم کے عقائد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عبیداللہ نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کے لئے ان کے دل پسند عقائد تخلیق کیے تھے۔

○

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ عبیداللہ کے عروج و زوال کی داستان بہت لمبی ہے، اسے اختصار سے پیش کیا جا رہا ہے تاکہ جو اصل داستان ہے اُس کی طرف پوری توجہ دی جا سکے۔

عبیداللہ کے باپ محمد حبیب نے سوچا کہ اپنی سلطنت قائم کرنے کے لئے کوئی ایسا آدمی چاہیے جو ذہنی طور پر بہت ہی ہوشیار ہو اور فریب کاریوں میں خصوصی مہارت رکھتا ہو۔

اُسے عبیداللہ کے پیروکاروں میں سے ایک شخص بہت ہی ذہین، ہوشیار اور چالاک نظر آیا۔ اُس کا نام ابو عبداللہ تھا۔ محمد حبیب نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا اور اسے اپنے ڈھنگ کی ٹریننگ دینے لگا۔ پھر اُسے بتایا کہ اس کا اصل مقصد کیا ہے۔

ابو عبداللہ اپنے ایک بھائی ابو عباس کو بھی ساتھ لے آیا اور انہوں نے ایک منصوبہ تیار کر

لیا۔ عبیداللہ نے باقاعدہ فوج تیار کرنی شروع کر دی۔ ابو عبداللہ حج پر گیا اور وہاں ایسی اداکاری کی کہ لوگوں نے اُسے بہت بڑا عالم سمجھ لیا۔ وہاں سے اُسے بہت زیادہ حمایت ملی۔

سلطنت قائم کرنے کے لئے ان لوگوں نے سوچا کہ شمالی افریقہ بڑی اچھی جگہ ہے۔ وہ بربروں کا علاقہ تھا بربر ضعیف الاعتقاد تھے اور جنگجو بھی تھے۔ مختصر یہ کہ ابو عبداللہ اور ابو عباس شمالی افریقہ گئے اور وہاں لوگوں کو سبز باغ دکھا دکھا کر ایک فوج بنالی۔ یہ سب لوگ مالِ غنیمت کے لالچ میں ان بھائیوں کے ساتھ ہو گئے تھے۔ بہر حال انہوں نے وہاں ایک اپنی سلطنت قائم کر لی۔

عبیداللہ بھی وہاں چلا گیا۔ یہ شخص مکمل طور پر ابلیس بن چکا تھا۔ اس نے ابو عبداللہ اور ابو عباس کی کوششوں سے بنی ہوئی سلطنت پر قبضہ کر لیا اور وہاں باقاعدہ حاکم بن گیا۔ دونوں بھائی اس کے خلاف ہو گئے۔ ابو عباس نے تو صاف کہنا شروع کر دیا کہ عبیداللہ مہدی نہیں ہے۔

وہاں کے ایک شخص نے جو شیخ الشلخ تھا' عبیداللہ سے کہا کہ وہ اگر مہدی ہے تو کوئی معجزہ دکھائے۔ عبیداللہ نے تلوار نکالی اور اس عالم دین کی گردن کاٹ دی۔

ابو عبداللہ اور ابو عباس نے یہ سکیم بنائی کہ عبیداللہ کو قتل کر دیا جائے۔ اس محفل میں جس میں یہ سکیم بنی تھی' عبیداللہ کے جاسوس بھی موجود تھے۔ یہ فیصلہ ایک بڑے ہی طاقتور شخص ابو زاکی کے گھر میں ہُوا تھا۔

عبیداللہ نے ابو زاکی کو طرابلس کا گورنر بنا کر بھیج دیا اور اس کے ساتھ ہی وہاں اپنے آدمی درپردہ بھیجے۔ انہیں یہ کام سونپا کہ طرابلس میں ابو زاکی کو اس کے کمرے میں' جب وہ سویا ہُوا ہو قتل کر دیا جائے۔

عبیداللہ کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ ابو زاکی گورنر تھا۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ جس عبیداللہ نے اسے یہ رتبہ دیا ہے وہ اسے قتل بھی کروا دے گا۔ وہ سکون اور اطمینان سے سو گیا پھر کبھی بھی نہ جاگا۔ اُس کے محافظ دستے میں سے ایک آدمی اُس کے کمرے میں گیا اور اُس کا سر اُس کے جسم الگ کر دیا اور پھر اُس کا سر عبیداللہ کے پاس بھیج دیا۔

اس کے بعد عبیداللہ نے اسی طرح ابو عبداللہ اور ابو عباس کو بھی قتل کروا دیا۔ انہی بھائیوں نے یہ سلطنت قائم کی تھی۔

عبیداللہ نے اپنی بیعت کے لئے ہر طرف مبلغ پھیلا دیئے لیکن بہت کم لوگوں نے اس کی طرف دھیان دیا بلکہ مخالفت شروع ہو گئی۔ عبیداللہ نے قتل و غارت کا طریقہ اختیار کر لیا۔ اہلِ سنت کے علماء کو سب سے پہلے قتل کیا گیا۔ پھر جہاں کہیں اشارہ ملتا کہ یہ گھر اہلِ سنت کا ہے' اس گھر کے تمام افراد کو قتل کر دیا جاتا۔ ان کا مال و اسباب عبیداللہ کے پیروکاروں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ وہ دراصل اسماعیلیت کی تبلیغ کر رہا تھا۔ جو شخص اُس کے زیادہ سے زیادہ مرید بناتا تھا' اُسے وہ جاگیریں عطا کرتا اور بعض کو اُس نے زر و جواہرات سے مالا مال کر دیا۔

عبیداللہ نے طاقت جمع کر کے مصر پر حملہ کیا۔ ایک ہی معرکے میں سات ہزار عبیدی مارے گئے لیکن عبیداللہ نے ہمت نہ ہاری۔ ایک بار اُس کے لشکر میں کوئی ایسی وباء پھوٹ پڑی کہ انسان اور گھوڑے مرنے لگے۔ عبیداللہ نے کچھ عرصے کے لئے مصر کی فتح کا ارادہ ترک کر دیا آخر 356 ہجری میں اُس نے مصر فتح کر لیا۔ مصر کے سب سے بڑے شہر قاہرہ کی بنیاد اُسی نے رکھی تھی۔ عبیداللہ تو مر گیا اور اُس کا خاندان 567 ہجری تک مصر پر حکومت کرتا رہا۔

حسن بن صباح کے دَور میں عبیدی ہی مصر پر حکومت کر رہے تھے۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ تاتاریوں نے بغداد میں مسلمانوں کا اتنا قتلِ عام نہیں کیا تھا جتنا عبیداللہ نے اہلِ سنّت کا کیا۔

○

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ پرستی کے ایک اور فتنے کا ذکر کر دیا جائے۔ اس فرقے کا نام قرامطی تھا اور اس کا بانی ابو طاہر سلیمان قرامطی تھا۔ اس کا باپ ابو سعید جنابی 301 ہجری میں اپنے ایک خادم کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ ابو طاہر قرامطی بھائیوں میں چھوٹا تھا۔ اس میں حسن بن صباح والے اوصاف موجود تھے۔ اُس نے اپنے بڑے بھائی سعید پر ایسے ظلم و ستم کئے کہ اُسے ذہنی اور جسمانی لحاظ سے مفلوج کر دیا اور خود باپ کا جانشین بن گیا۔

اس خاندان کی اپنی ایک سلطنت تھی جس میں طائف' بحرین اور ہجر جیسے اہم مقامات شامل تھے۔ ابُو طاہر نے نبوّت کا اعلان کر دیا۔ اس شخص کے متعلق بھی مؤرخوں نے لکھا ہے کہ اسلام اور اہلِ سُنّت کے لئے تاتاریوں اور عبیداللہ سے بھی زیادہ خطرناک قاتل ثابت ہُوا۔

دس سال تک ابو طاہر اپنی نبوّت کی تبلیغ کرتا رہا اور فوج بھی تیار کرتا رہا۔ اس کا ارادہ بصرہ کو فتح کرنے کا تھا۔ آخر ایک رات اُس نے ایک ہزار سات سو آدمی اپنے ساتھ لئے اور بصرہ پر حملہ

کر دیا۔ وہ اپنے ساتھ بڑی لمبی لمبی سیڑھیاں لے گیا تھا۔

یہ سیڑھیاں شہر پناہ کے ساتھ لگا کر حملہ آور اوپر گئے اور شہر میں داخل ہو گئے۔ حملہ غیر متوقع اور اچانک تھا۔ ابو طاہر کے آدمیوں نے شہر کی سوئی ہوئی مختصر سی فوج کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ لوگ باہر کو بھاگنے لگے۔ ابو طاہر کے حکم سے شہر کے دروازے کھول دیئے گئے اور لوگ کھلے دروازوں کی طرف بھاگے۔ ہر دروازے کے ساتھ قرامطی کھڑے تھے۔ انہوں نے لوگوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر الگ ساتھ لے گئے۔ تمام گھروں اور سرکاری خزانے میں لوٹ مار کی اور اس طرح بصرہ شہر کو تباہ و برباد کر کے اور اس کی گلیوں میں خون کے دریا بہا کر قرامطی اپنے مرکزی شہر ہجر کو چلے گئے۔

اُسی سال ابو طاہر نے حاجیوں کے قافلوں کو لُوٹنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ قرامطی صرف لُوٹ مار نہیں کرتے تھے بلکہ وہ قتلِ عام بھی کرتے تھے۔ انہوں نے حج سے واپس آنے والے حاجیوں کو لُوٹ کر قتل کیا۔ اس طرح ہزارہا حاجی شہید ہو گئے۔

خلیفۂ وقت نے قرامطیوں کی سرکوبی کے لئے لشکر بھیجے۔ قرامطی اتنے طاقتور ہو چکے تھے کہ انہوں نے ہر جگہ خلیفہ کے لشکر کو شکست دی اور شہروں میں داخل ہو کر شہریوں کا قتلِ عام کیا۔ خلیفہ اپنے لشکر کو کمک بھیجتا رہا لیکن ابو طاہر کا لشکر اتنا تیز اور ہوشیار تھا کہ وہ خلیفہ کے لشکر کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ قرامطیوں میں سرفروشی اور جانثاری اس وجہ سے تھی کہ ابو طاہر تمام مالِ غنیمت ان کے حوالے کر دیتا تھا اور شہروں سے جتنی جوان عورتیں پکڑی جاتی تھیں وہ بھی ان ہی کو دے دیتا تھا۔ لشکر کو شراب تک پینے کی کھلی اجازت تھی۔ حادثہ یہ کہ قرامطی اپنے آپ کو اہلِ اسلام کہتے تھے اور ابو طاہر نبی بنا ہُوا تھا۔

مسلمانوں یعنی اہلِ سُنّت کی کمزوری یہ تھی کہ خلافت خلفائے راشدین جیسی مخلص اور دین دار نہیں تھی۔ خلافت اقتدار کی کرسی یا شہنشاہیت کا تخت بن گئی تھی۔ خلافت کے لشکر میں خلفائے راشدین کے دَور والا جذبہ اور اللہ کی راہ میں شوقِ شہادت نہیں رہا تھا۔ ایک وہ وقت تھا کہ مجاہدین کے چالیس ہزار کے لشکر نے آتش پرستوں کے ایک لاکھ بیس ہزار کے طاقتور لشکر کو ہر میدان میں شکست دے کر سلطنتِ فارس کو ختم کر دیا تھا مگر اب خلیفہ کے دس ہزار فوجی ایک ہزار قرامطیوں پر غالب آنے سے معذور تھے۔

ابلیسی طاقتیں اسلام کا قلع قمع کرنے کے لئے تیز و تند طوفان کی طرح اٹھ آئی تھیں۔

○

یہاں بھی ابلیس کا رقص دیکھئے۔

ابو طاہر نے شہر ہجر کو اپنا دارالحکومت بنایا اور وہاں ایک عالی شان مسجد تعمیر کروائی۔ اس کا نام دارالہجرت رکھا گیا۔ جب مسجد مکمل ہو گئی تو ابو طاہر قرامطی اسے دیکھنے کے لئے اندر آیا۔

"میرے قرامطیو!" ـــ اُس نے منبر پر کھڑے ہو کر اعلان کیا ـــ "اصل اسلام کے علمبردار تم ہو۔ وہ مسلمان نہیں جو قرامطی نہیں اور جو مجھے نبی نہیں مانتا۔ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ اب حج مکہ میں نہیں یہاں ہجر میں ہُوا کرے گا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ حجرِ اسود کو مکہ سے اٹھا کر یہاں اس مسجد میں رکھا جائے"۔

"ہم تیرے شیدائی ہیں" ـــ ایک آدمی نے اٹھ کر کہا ـــ "ہمیں یہ بتا کہ وہ پتھر جسے ہم حجرِ اسود کہتے ہیں، یہاں کس طرح لایا جائے گا۔ اہلِ سنت ہمیں یہ پتھر اٹھانے کی ہمت نہیں کرنے دیں گے، پھر ہم کیا کریں گے؟"

"کیا تمہاری تلواریں کند ہو گئی ہیں؟" ـــ ابو طاہر نے کہا ـــ "ہم نے کہاں کہاں اہلِ سنت کا خون نہیں بہایا؟ کیا تم خانہ کعبہ میں ان منکروں کا خون بہانے سے گریز کرو گے؟.... ہم اس سال حج کے موقع پر مکہ جائیں گے اور خانہ کعبہ کی وہ حالت کر دیں گے کہ اہلِ سنت آئندہ مکہ کی طرف دیکھیں گے بھی نہیں"۔

○

319 ہجری میں ابو طاہر قرامطی نے مکہ معظمہ کا رخ کیا۔ حاجی وہاں پہنچ چکے تھے بلکہ وہ بیت اللہ کے طواف میں مصروف تھے۔ بعض نماز پڑھ رہے تھے۔ ابو طاہر سب سے پہلے گھوڑے پر سوار، تلوار ہاتھ میں لئے مسجدِ حرام میں داخل ہُوا۔ اُس نے شراب منگوائی اور گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے شراب پی۔

مورخ لکھتے ہیں کہ جب ابو طاہر گھوڑے پر بیٹھا شراب پی رہا تھا، اس کے گھوڑے نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔

"دیکھا تم سب نے؟" ـــ ابو طاہر نے قہقہہ لگا کر بڑی بلند آواز سے کہا ـــ "میرا گھوڑا

بھی مجھے اور میرے عقیدے کو سمجھتا ہے"۔

مسجد حرام میں کچھ مسلمان موجود تھے۔ انہوں نے شور شرابہ کیا۔ اُدھر سے حجاج دوڑے آئے۔ وہ سب نہتے تھے اور سب نے احرام باندھ رکھے تھے۔ ابو طاہر کے اشارے پر قرامطیوں نے ان کا قتلِ عام شروع کر دیا۔

وہاں سے ابو طاہر خانہ کعبہ میں گیا اور وہاں بھی حجاج کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ ابو طاہر کے حکم سے خانہ کعبہ کا دروازہ اکھاڑ دیا گیا۔

"میں خُدا ہوں" ___ ابو طاہر نے جو گھوڑے پر سوار تھا متکبرانہ اعلان کیا ___ "اور خدا میری ذات میں ہے۔ تمام خلقت پر میری بندگی فرض ہے" ___ پھر اس نے کہا ___ "اے گدھو! تمہارا قرآن کہتا ہے کہ جو شخص بیت اللہ میں داخل ہو جائے اُسے امن مل جاتا ہے.... کہاں ہے وہ امن؟ میں نے جسے چاہا زندہ رہنے دیا اور جسے چاہا اُسے خون میں نہلا دیا"۔

ایک حاجی آگے بڑھا اور اس نے ابو طاہر کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔

"اے منکرِ دین!" ___ اس شخص نے ابو طاہر سے کہا ___ "تو نے قرآن کی یہ آیت غلط پڑھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بیت اللہ میں داخل ہو جائے اُسے امن دو اور اُس پر ہاتھ نہ اٹھاؤ"۔

اس شخص کے عقب سے ایک تلوار حرکت میں آئی اور اُس کا سر کٹ کر دُور جا پڑا۔

ابو محلب امیرِ مکہ تھا۔ اس کے پاس اتنی فوج نہیں تھی کہ وہ قرامطیوں کا مقابلہ کرتا۔ وہ اپنے چند ایک آدمیوں کو لے کر ابو طاہر کے پاس گیا۔ یہ سب لوگ تلواروں سے مسلح تھے۔ ابو محلب نے ابو طاہر سے کہا کہ وہ اپنے آپ کو نبی کہتا ہے اور مسلمان بھی لیکن وہ خدا کے اس گھر کی اس طرح بے حُرمتی کر رہا ہے۔

"حجاج کے قتل سے ہاتھ کھینچ لے ابو طاہر!" ___ ابو محلب نے کہا ___ "اللہ کے عذاب سے ڈر کہیں ایسا نہ ہو کہ تجھے اسی دنیا میں اس کی سزا مل جائے"۔

"اس شخص کو عذابِ الٰہی دکھاؤ" ___ ابو طاہر نے بلند آواز سے کہا۔ بہت سے قرامطی ابو محلب اور اس کے آدمیوں پر ٹوٹ پڑے۔ ابو محلب اور اس کے آدمیوں نے جو سب کے سب تلواروں سے مسلح تھے جم کر مقابلہ کیا لیکن وہ اتنے تھوڑے تھے کہ اتنے زیادہ آدمیوں کے

ہاتھوں شہید ہو گئے۔

کعبہ معلّیٰ کے اوپر میزاب نصب تھا جو سونے سے مرصع تھا۔ ابو طاہر نے حکم دیا کہ اوپر چڑھ کر میزاب اتار کر اس کے گھوڑے کے قدموں میں رکھا جائے۔

ایک قرامطی کعبہ معلّیٰ پر چڑھا۔ تاریخ میں ایک شخص محمد بن ربیع بن سلیمان کا نام آیا ہے۔ وہ دُور کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بعد میں مسلمانوں کو بتایا کہ جب قرامطی کعبہ معلّیٰ پر چڑھا تو محمد بن ربیع نے ہاتھ پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا ___ "یا اللہ تیری بُردباری کی کوئی حد نہیں۔ کیا تیری ذاتِ باری اس شخص کو بھی بخش دے گی؟" ___ محمد بن ربیع نے لوگوں کو بتایا کہ وہ قرامطی جو کعبہ معلّیٰ پر چڑھ گیا تھا، نہ جانے کیسے اوپر سے سر کے بل گرا اور گرتے ہی مر گیا۔

محمد بن ربیع کا ہی بیان ہے کہ ابو طاہر نے بڑے غصے میں ایک اور قرامطی کو کعبہ پر چڑھنے کا حکم دیا۔ یہ آدمی اوپر پہنچنے والا ہی تھا کہ اُس کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ بھی سر کے بل گر پڑا اور مر گیا۔

ابو طاہر اور زیادہ غصے میں آ گیا۔ اُس نے ایک اور قرامطی کو حکم دیا کہ وہ اوپر جائے۔ تقریباً تمام مؤرخوں نے لکھا کہ یہ تیسرا شخص ایسا خوفزدہ ہوا کہ اوپر چڑھنے کی بجائے ایک ہی جگہ کھڑا تھر تھر کانپنے لگا اور اچانک باہر کی طرف بھاگ گیا۔

ابو طاہر پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ اس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ کچھ دیر کعبہ معلّیٰ کو دیکھتا رہا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس کے خیالوں میں کچھ تبدیلی آئی ہے لیکن ابلیس کا غلبہ اتنا شدید تھا کہ وہ اچانک آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ غلافِ کعبہ کو کھینچ کر اس کے چھوٹے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔

قرامطی غلافِ کعبہ پر ٹوٹ پڑے اور تلواروں سے غلافِ کعبہ کو کاٹ کاٹ کر اس کے ٹکڑے سارے لشکر میں تقسیم کر دیئے۔

ابو طاہر نے بیت اللہ کا سارا خزانہ اپنے قبضے میں لے لیا۔

جو حجاج قتلِ عام سے بچ گئے تھے انہوں نے بغیر امام کے حج کا فریضہ ادا کیا۔

○

ابو طاہر حجرِ اسود کو اپنے دارالحکومت ہجر لے جانا چاہتا تھا۔ اس پتھر پر حضرت ابراہیم کا نقشِ پا

ہے۔ رات کا وقت تھا۔ بچے کھچے حجاج ابھی وہیں تھے۔ کسی ذریعے سے انہیں پتہ چل گیا کہ ابو طاہر حجرِ اسود اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔

حجاج کے جذبہ کو دیکھئے۔ انہوں نے رات ہی رات اتنے وزنی پتھر کو وہاں سے اٹھایا اور مکہ کی گھاٹیوں میں لے جا کر چھپا دیا۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا۔ ایک تو پتھر بہت وزنی تھا اور دوسرے جان کا خطرہ بھی تھا۔ وہاں ہر طرف قرامطی موجود تھے۔ وہ دیکھ لیتے تو ان تمام حجاج کے جسموں کے ٹکڑے اُڑا دیتے۔ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر پتھر اٹھا لے جانا اور غائب کر دینا ایک معجزہ تھا۔

دوصبح طلوع ہوئی۔ ابو طاہر پھر خانہ کعبہ میں آن دھمکا اور حکم دیا کہ حجرِ اسود اٹھالو۔

"پتھر وہاں نہیں ہے"۔۔۔ کسی قرامطی نے پتھر کی جگہ خالی دیکھ کر ابو طاہر سے کہا۔

"وہ بہت وزنی پتھر تھا"۔۔۔ ابو طاہر نے کہا۔۔۔ "مجھے مت بتاؤ کہ کوئی انسان اسے اٹھا کر لے گیا ہے"۔

اُس کے کانوں سے پھر یہ آواز ٹکرائی کہ پتھر وہاں نہیں ہے۔ تب اُس نے خود جا کر دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پتھر وہاں نہیں ہے۔ اُس نے قہر و غضب سے حکم دیا کہ پتھر کو تلاش کیا جائے۔ حجاج وہاں سے جانے کی تیاریاں کر رہے تھے اور کچھ جا بھی چکے تھے۔ قرامطیوں نے چند ایک حجاج سے پوچھا کہ پتھر کہاں ہے۔ جس کسی نے لاعلمی کا اظہار کیا اُسے قتل کر دیا گیا۔

تلاش کرتے کرتے پتھر مل گیا۔ ابو طاہر نے اُسی وقت پتھر ایک اونٹ پر لدوایا اور ہجر کی طرف روانگی کا حکم دے دیا۔

یہ واقعہ بروز دوشنبہ ذوالحجہ 317 ہجری کا ہے۔

ابو طاہر نے چشمہ زم زم کی جگہ کو بھی مسمار کروا دیا۔ بعض مورخ لکھتے ہیں کہ وہ چھ دن مکہ معظمہ میں رہا اور بعض نے گیارہ دن لکھے ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب مصر میں عبیداللہ کا طوطی بول رہا تھا اور وہ مہدی موعود بنا ہوا تھا۔ وہ اُس کے عروج کا زمانہ تھا۔ عجیب بات ہے کہ ابو طاہر قرامطی بھی اُس کے اس دعوے کو تسلیم کرتا تھا کہ وہ مہدی آخر الزماں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ عبیداللہ کی طاقت سے ڈرتا ہو اور اُسے خوش رکھنے کا یہی ایک طریقہ ہو سکتا تھا کہ وہ اُسے مہدی آخر الزماں مان لے۔

ابو طاہر نے حجرِ اسود کو مکہ سے لا کر اپنی بنائی ہوئی مسجد دار الہجرت کی غربی جانب رکھا اور عبیداللہ کے نام ایک پیغام لکھوا کر بھیجا۔ اس میں اُس نے عبیداللہ کو لکھوایا کہ میں نے حکم دے دیا ہے کہ خطبے میں آپ کا نام لیا جائے۔ میں نے اپنی سلطنت میں آپ کے نام کا خطبہ جاری کر دیا ہے۔

اُس نے اس پیغام میں عبیداللہ کی عقیدت کا اظہار بڑے جذباتی انداز میں کیا اور پھر لکھا کہ اُس نے مکہ میں کس طرح تباہی مچائی ہے اور خانہ کعبہ کے اندر اور مکہ کی گلیوں میں اہلِ سنت کے خون کی ندیاں بہا دی ہیں۔ اس نے اس پیغام میں اہلِ سنت کو اہلِ فساد اور اہلِ ذلت لکھا۔

اسے توقع تھی کہ عبیداللہ اس کے اس پیغام سے بہت خوش ہوگا لیکن اس کا قاصد پیغام کا جواب لے کر آیا تو ابو طاہر حیران رہ گیا۔ عبیداللہ نے لکھا کہ تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہاری ان بداعمالیوں پر تمہیں خراجِ تحسین پیش کروں۔ تُو نے خانہ کعبہ کی توہین کی اور اتنی مقدس جگہ میں مسلمانوں کا خون بہایا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے جو حجاج آئے تھے انہیں قتل کیا اور پھر حجرِ اسود کو اکھاڑ کر لے گیا۔ تُو نے یہ بھی نہ سوچا کہ حجرِ اسود اللہ کی کتنی بڑی امانت ہے جسے ایک جگہ سنبھال کر رکھا گیا تھا۔ جماعتِ عبیدیہ تجھ پر کفر اور الحاد کا فتویٰ عائد کرتی ہے۔ ہم تمہیں کوئی انعام نہیں دے سکتے۔

ابو طاہر نے یہ پیغام پڑھا تو آگ بگولہ ہو گیا اور اُس نے اعلان کر دیا کہ کوئی قرامطی عبیداللہ کو مہدی آخر الزماں نہ مانے۔

○

پورے دس سال۔۔۔ 317 ہجری سے 327 ہجری تک۔۔۔ فریضہ حج ادا نہ کیا جا سکا۔ کوئی بھی حاجی کعبہ کو نہ گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حج کو جانے والے قرامطیوں سے ڈرتے تھے اور دوسرے یہ کہ وہاں اب حجرِ اسود نہیں تھا۔

ایک شخص ابو علی عمر بن یحییٰ علوی ابو طاہر کا گہرا دوست تھا۔ ایک روز وہ ابو طاہر کے پاس گیا۔

"غور کرو ابو طاہر!"۔۔۔ ابو علی عمر نے کہا۔۔۔ "دس سالوں سے حج بند ہے۔ اس کی وجہ تم خود جانتے ہو۔ صرف تمہارے ظلم و تشدد کی وجہ سے مسلمان فریضہ حج ادا نہیں کر سکتے۔ اس

بے نتیجے میں لوگ تمہاری عقیدت سے منحرف ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا ہے کہ حج کرنے والوں کو امن کا یقین دلاؤ اور ان پر محصول مقرر کر دو۔ پانچ دیناری اونٹ محصول وصول کرو"۔

ابو طاہر کو یہ تجویز اچھی لگی۔ اس سے ایک تو اُس کی ساکھ بحال ہوتی تھی اور دوسرے اُسے بے شمار رقم محصول کے ذریعے حاصل ہو رہی تھی۔ اُس نے ہر طرف قاصد دوڑا دیئے کہ وہ اعلان کرتے جائیں کہ آئندہ حج پر کوئی مداخلت نہیں ہو گی اور حجاج کو امن کی ضمانت دی جاتی ہے۔ اُس نے محصول کا اعلان بھی کر دیا۔

ابنِ خلدون نے لکھا ہے کہ خلیفہ کے حاجب محمد بن یاقوت نے بھی ابو طاہر کو لکھا تھا کہ حجاج پر ظلم و تشدد چھوڑ دو اور حجرِ اسود واپس کر دو۔ اس کے عوض خلیفہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جو علاقہ اس وقت تمہارے قبضے میں ہے وہ تمہارا ہی رہے گا اور اس سلسلے میں تمہیں خلافت اپنا دشمن نہیں سمجھے گی۔

ابو طاہر نے اس کے جواب میں یہ یقین دہانی کرا دی کہ آئندہ قرامطی فریضۂ حج کی ادائیگی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کریں گے لیکن ابو طاہر نے حجرِ اسود واپس دینے سے انکار کر دیا۔

ابو طاہر نے جو محصول نافذ کیا تھا یہ دراصل آج کے دور کا جگا ٹیکس تھا۔ خلافت اتنی کمزور تھی کہ وہ ابو طاہر کا ہاتھ روکنے سے قاصر تھی۔

ابو طاہر کو توقع تھی کہ لوگ حجرِ اسود کی خاطر ہجر آئیں گے اور پھر آہستہ آہستہ حج ہجر میں ہی ہُوا کرے گا لیکن کوئی بھی اہلِ سنت ان دس سالوں میں وہاں نہ گیا۔ خلیفہ مقتدر باللہ نے ابو طاہر کو پچاس ہزار درہم پیش کئے کہ اس رقم کے عوض حجرِ اسود واپس کر دے لیکن ابو طاہر نے صاف انکار کر دیا۔

اس کے بعد خلیفہ مطیع باللہ کچھ عرصے بعد مسندِ خلافت پر آیا تو اُس نے تیس ہزار دینار ابو طاہر کو پیش کئے کہ وہ حجرِ اسود واپس کر دے۔ ابو طاہر نے یہ سودا قبول کر لیا۔ صرف ایک مؤرخ نے لکھا ہے کہ ابو طاہر نے حجرِ اسود اللہ کے نام پر واپس کیا تھا اور لیا کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ تحریر اس وجہ سے مشکوک لگتی ہے کہ یہ بیان ایسے شخص کا ہے جو اسماعیلی تھا۔

10 محرم 339 ہجری ابو طاہر کا ایک آدمی جس کا نام شبیر بن حسین قرامطی تھا، حجرِ اسود لے کر

مکہ مکرمہ پہنچا۔ دن سہ شنبہ تھا۔ اُسی روز حجرِ اسود کو اپنی اُس جگہ پر رکھ دیا گیا جہاں سے اُسے اکھاڑا گیا تھا۔ خلیفہ نے اس کے ارد گرد چاندی کا حلقہ چڑھوا دیا۔ اس چاندی کا وزن 14 سیر تھا۔

حجرِ اسود چار روز کم بائیس سال ابو طاہر قرامطی کے قبضے میں رہا۔

اللہ کی کرامت ملاحظہ فرمایئے۔ جب حجرِ اسود مکہ سے ہجر لے جایا گیا تھا تو اس کے وزن کے نیچے چالیس اونٹ اس سفر کے دوران مر گئے تھے۔ وہ اس طرح کہ پہلے یہ پتھر ایک اونٹ پر لادا گیا۔ وزن خاصا زیادہ تھا جو یہ اونٹ کچھ فاصلے تک ہی برداشت کر سکا۔ آخر یہ اونٹ بیٹھ گیا اور پھر ایک پہلو پر لڑھک گیا اور مر گیا۔ پھر یہ دوسرے اونٹ پر لادا گیا۔ یہ اونٹ بھی کچھ فاصلہ طے کر کے گرا اور مر گیا۔ اسی طرح چالیس اونٹ اس پتھر تلے مرے اور پتھر ہجر تک پہنچا لیکن یہی پتھر جب ہجر سے مکہ کو واپس لایا گیا تو صرف ایک اونٹ وہاں سے مکہ تک لے آیا۔ پتھر کا وزن اتنا ہی تھا اور اسے لانے والا اونٹ کوئی غیر معمولی طور پر طاقتور نہ تھا۔ یہ خدائی معجزہ تھا اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کی نظر میں اس پتھر کی اہمیت اور تقدس کتنا زیادہ ہے۔

اللہ نے ابو طاہر کو بڑی لمبی رسّی دی تھی۔ حجرِ اسود کی واپسی کے بعد یہ رسّی ختم ہو گئی۔ حجرِ اسود مکہ معظمہ پہنچا اور اُدھر ابو طاہر چیچک کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ وہ اس مرض میں بہت دن زندہ رہا لیکن اُس کی حالت جو کوئی بھی دیکھتا تھا وہ کانوں کو ہاتھ لگاتا اور وہاں سے بھاگ آتا۔ بعض عقل والے قرامطی اُس کی یہ حالت دیکھ کر تائب ہو گئے اور اہلِ سنت کے عقیدے میں واپس آ گئے۔

ابو طاہر چیختا اور چلاتا تھا اور ایک روز اُس کی چیخیں اور اُس کا تڑپنا بند ہو گیا اور وہ اپنے پیچھے اپنے گھر میں اپنے گلے سڑے جسم کی بدبُو چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

آج بھی کہیں کہیں قرامطی پائے جاتے ہیں۔ کسی وقت انہوں نے ملتان کو اپنا مرکز بنا لیا تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے جب اپنے ایک حملے کے دوران ملتان پر چڑھائی کی تھی تو اُسے پتہ چلا تھا کہ یہاں اکثریت قرامطیوں کی ہے۔ محمود غزنوی کی لڑائی ہندوؤں سے تھی لیکن ملتان میں قرامطی اُس کے مقابلے میں آ گئے تھے۔ ہم نے ان لڑائیوں کی تفصیلات اپنی کتاب "اور ایک بُت شکن پیدا ہُوا" میں پیش کی ہیں۔ محمود غزنوی خود ایک سپاہی کی طرح لڑا تھا۔ محمود غزنوی کے غضب کا یہ عالم تھا کہ سارا دن تلوار چلاتا رہا اور اُس کی تلوار کے دستے پر اتنا خون جم گیا تھا کہ

اُس کا دلیاں ہاتھ بڑی مشکل سے تلوار کے دستے سے اکھاڑا گیا تھا۔ ملتان کی گلیوں میں بارش کے پانی کی طرح خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔ محمود غزنوی نے قرامطیوں کا خاتمہ کر دیا تھا اور قرامطیوں نے اہلِ سنت کا جو خون بہایا تھا' اس کا انتقام لے لیا تھا۔ اس کے بعد کم از کم ملتان میں قرامطی پھر کبھی نہ اٹھ سکے۔

حسن بن صباح قلعہ شاہ در میں احمد بن غطاش کے پاس بیٹھا تھا۔ احمد بن غطاش جس طرح اس قلعے کا والی بنا تھا' وہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ وہ حسن بن صباح کو بتا چکا تھا کہ اس نے اس قلعے پر کس طرح قبضہ کیا ہے۔

"..... لیکن حسن!" ــــ احمد بن غطاش نے کہا ــــ "لوگ کہتے ہوں گے کہ احمد بہت بڑا فریب کار تھا جو قلعہ کا والی بن گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو طاقت تم میں ہے وہ مجھ میں نہیں ہے۔ تم ان چند ایک لوگوں میں سے ہو جنہیں خدا ایک خاص طاقت دے کر دنیا میں بھیجتا ہے۔ میں نے تمہیں عبیداللہ کی بات سنائی ہے۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف اُس کا باپ تھا جس نے اُس کی پشت پناہی کی تھی۔ دیکھ لو' وہ مصر کا حکمران بنا اور آج بھی مصر عبیدیوں کے قبضے میں ہے۔ ابو طاہر قرامطی بیوقوف آدمی تھا۔ وہ اپنی عقل کی حدود سے آگے نکل گیا تھا"۔

"استادِ محترم!" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "یہ تو میں جانتا ہوں کہ مجھ میں کوئی مافوق الفطرت طاقت ہے لیکن مجھے ایسی رہنمائی کی ضرورت ہے جس سے میں جان سکوں کہ یہ طاقت کیا ہے اور اسے کس طرح استعمال کروں"۔

"وہ طاقت تم اپنے ساتھ لے آئے ہو" ــــ احمد بن غطاش نے کہا۔

"وہ تو میں جانتا ہوں" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "وہ میرے اندر موجود ہے"۔

"نہیں حسن!" ــــ احمد بن غطاش نے کہا ــــ "میں تمہارے اندر کی طاقت کی بات نہیں کر رہا۔ میں اس لڑکی کی بات کر رہا ہوں جو تمہارے ساتھ آئی ہے۔ کیا نام ہے اس کا..... فرح!..... کیا تم نے محسوس نہیں کیا کہ تم اس لڑکی کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے؟"

"ہاں استادِ محترم!" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "میں اس لڑکی کے بغیر نہیں رہ سکتا"۔

"کہتے ہیں عورت مرد کی بہت بڑی کمزوری ہے" ــــ احمد بن غطاش نے کہا ــــ "وہ غلط

نہیں کہتے۔ حسین عورت بہت بڑی طاقت ہے۔ دلکش عورت ایک نشہ ہے۔ عورت کی دلربائی نے پتھر دل بادشاہوں کے تختے الٹے ہیں۔ تم اس طاقت کو استعمال کرو گے۔

"میں نے تمہیں سجاح بن حارث اور مسیلمہ کی کہانی سنائی ہے۔ سجاح نے اتنا بڑا لشکر کس طرح اکٹھا کر لیا تھا؟ اُس نے کئی قبیلوں کے سرداروں کو کس طرح اپنا پیروکار بنا لیا تھا؟ صرف اس لئے کہ وہ حسین عورت تھی۔ وہ نشہ بن کر آدمی پر طاری ہو جاتی تھی"۔

"لیکن استادِ محترم!" ــــ حسن بن صباح نے مسکرا کر کہا ــــ "وہ تو ایک مرد سے مار کھا گئی تھی"۔

"نہیں حسن!" ــــ احمد بن غطاش نے کہا ــــ "مسیلمہ نے اُسے تین روز اپنے خیمے میں رکھ کر اُسے بیوی بنائے رکھا تھا۔ یہ اُس کی بہت بڑی کمزوری تھی اور اگر غور کرو تو اس کے بعد ہی مسیلمہ کا زوال شروع ہُوا تھا۔ میں تمہیں طریقے بتاؤں گا کہ جو طاقت تم اپنے ساتھ لائے ہو' اس سے تم نے خود کس طرح بچنا ہے اور اسے کس طرح استعمال کرنا ہے"۔

"کیا آپ مجھے علمِ سحر بھی سکھائیں گے؟" ــــ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ہاں" ــــ احمد بن غطاش نے جواب دیا ــــ "وہ تو میں نے تمہیں سکھانا ہی ہے لیکن یہ خیال رکھو حسن! سحر کے علاوہ کچھ پُراسرار علوم اور بھی ہیں۔ اگر تم ان میں سے کسی ایک علم کے بھی ماہر ہو جاؤ تو معجزے کر کے دکھا سکتے ہو لیکن بھروسہ اسی طاقت پر کرنا ہے جو تمہاری اپنی ہے۔ اپنی روحانی قوتوں کو بیدار کرو تو پھر تم دیکھو گے کہ معجزے کس طرح ہوتے ہیں لیکن ہمیں کسی اور قوت کی ضرورت ہے"۔

احمد بن غطاش نے اُس کے ساتھ تقریباً وہی باتیں کیں جو اس سے پہلے ابنِ عطاش اور پھر ایک اور درویش اُس کے ساتھ کر چکے تھے۔ احمد ابنِ غطاش نے اسے ایک بات یہ بتائی کہ اس علاقے میں جو چھوٹے بڑے قلعے ہیں ان پر قبضہ کرنا ہے۔

"میں نے تمہیں کچھ تربیت دینی ہے" ــــ احمد بن غطاش نے کہا ــــ "اور تمہیں تیار کرنا ہے کہ کسی طرح سلجوقیوں کی حکومت میں داخل ہو جاؤ۔ وہاں تمہیں کوئی عہدہ مل جائے' پھر وہاں تم نے حاکموں کے حلقے میں اپنے ہم خیال پیدا کرنے ہیں اور پھر سلجوقیوں کی جڑیں کاٹنی ہیں"۔

اُسی رات سے احمد بن غطاش نے حسن بن صباح اور فرح کو تربیت دینی شروع کر دی اور انہیں اس طرح کے سبق دینے لگا کہ اپنے ہم خیال کس طرح پیدا کرتے ہیں۔ اُس نے دیکھا کہ فرح کچھ جھینپی ہوئی سی تھی۔

"دیکھ لڑکی!" ــــ احمد بن غطاش نے فرح سے کہا ــــ "ہم نے تجھے ہر کسی مرد کا کھلونا نہیں بنانا۔ ذرا سوچ' پودے کے ساتھ ایک پھول ہے۔ اسے نہ جانے کتنے لوگ سونگھتے ہیں لیکن پھول کی خوشبو اور تازگی ختم نہیں ہوتی۔ ہم نے تجھے ایسا ہی پھول بنانا ہے لیکن ہم تجھے ایسا پھول نہیں بننے دیں گے جسے شاخ سے توڑ لیا جاتا ہے۔ شاخ سے ٹوٹا ہُوا پھول مُرجھا جاتا ہے یا پتّی پتّی ہو کر مسلا جاتا ہے۔ میں تجھے یہ طریقے بتاؤں گا کہ تُو کس طرح شاخ کے ساتھ رہے گی اور تیری خوشبو اور تازگی ہمیشہ زندہ رہے گی"۔

اسلام کا قافلہ ساڑھے چار صدیوں کی مسافت طے کر چکا تھا۔
اس قافلے نے لق و دق صحرا' جسموں کا پانی چوس لینے والے ریگزار اور خون کے دریا پار کئے تھے۔ اس قافلے نے جوش میں آئی ہوئی جوئے کہستاں کی مانند چٹانوں کے جگر چاک کئے تھے۔
اس قافلے نے دشوار گذار جنگلوں کے سینے چیر دیئے تھے۔
اس قافلے نے تیروں اور برچھیوں کی بوچھاڑوں میں۔ بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیئے تھے اور زرتشت کے پجاری اپنی سلطنت مجاہدین کے اس قافلے کے قدموں میں پھینک کر بھاگ گئے تھے۔
اس قافلے نے تیز و تند طوفانوں کے منہ موڑ دیئے تھے۔
مگر کذب و ارتداد کی ایسی آندھی آئی کہ یہ قافلہ بکھرنے اور بھٹکنے لگا۔
حسن بن صباح بڑے ہی خوفناک طوفان کا ہراول تھا۔ اس کا خطرہ روز بروز شدید ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ آنے والا وقت کس کے عروج اور کس کے زوال کی داستان سنائے گا۔

داستان گو نے خیر اور شر کی اس داستان کو قلعہ شاہ در تک پہنچایا تھا۔ اس قلعے پر ایک اسماعیلی احمد بن غطاش نے ایک بڑی حسین و جمیل دوشیزہ زریں کے ذریعے قبضہ کیا تھا۔ قلعہ فوج فتح کیا کرتی ہے۔ قلعے کا محاصرہ کیا جاتا ہے' محاصرہ طول بھی پکڑ لیا کرتا ہے' قلعے میں داخل ہونے کے لئے کمندیں پھینکنے اور دروازے توڑنے کی کوششیں ہوتی ہیں' اوپر سے تیروں اور برچھیوں کا مینہ برستا ہے' محاصرہ کرنے والے لہولہان ہوتے ہیں' تڑپتے ہیں اور مرتے ہیں اور خون کے دریا بہا کر ایک قلعہ سر ہوتا ہے لیکن قلعہ شاہ در ایک نوخیز لڑکی نے بڑے ہی پیارے انداز سے قلعے کے والی کی چہیتی بیوی بن کر فتح کر لیا۔ اس والیٔ قلعہ کا نام ذاکر تھا جس کی تفصیلی داستانِ رومان پہلے سنائی جا چکی ہے۔ قلعہ احمد بن غطاش کے قبضے میں آ گیا۔
پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حسن بن صباح اس قلعے میں کس طرح پہنچا تھا۔ اس کے ساتھ فرح نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ حسن بن صباح اور فرح اُس محبت کی زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے جس کا تعلق دلوں اور روحوں سے ہوتا ہے۔ احمد بن غطاش نے دونوں کی تربیت شروع کر دی تھی۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ احمد بن غطاش نے اُن تمام اسماعیلیوں کو جو قلعہ شاہ در کے قید خانے میں بند تھے رہا کر دیا تھا' اور پھر قافلے لٹنے لگے۔ راہزنی کی وارداتوں میں اضافہ ہو گیا۔

تاریخ بتانے سے قاصر ہے کہ حسن بن صباح اس استاد کی شاگردی میں کتنا عرصہ گزار چکا تھا۔ غالباً" دو اڑھائی سال گزر گئے تھے۔ ایک تو حسن بن صباح دنیا میں آیا تو شیطانی اوصاف اپنے ساتھ لایا تھا' اس کے بعد اس نے ان ہی اوصاف کو اُبھارا اور پھر ابنِ عطاش اور احمد بن غطاش نے ان اوصاف کو پختہ تر کر کے اسے پکا ابلیس بنا دیا تھا۔ اسے علمِ سحر بھی سکھا دیا اور غالباً" اسے احمد بن غطاش کچھ ایسی تربیت بھی دے رہا تھا جو زمین دوز تخریب کاری کے لئے کارآمد ہوتی ہے۔ ان لوگوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ اسلام کو اسلام ہی رہنے دیں لیکن اللہ کے اس دین کو اپنے نظریات اور اپنی نفسانی خواہشات کے سانچے میں ڈھال لیں۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی جو ان لوگوں نے زمین کے نیچے جا کر لڑنی تھی۔

کسی عمارت کو گرانا ہو تو اسے اوپر سے نہیں توڑا جا سکتا۔ وقت لگتا ہے اور توڑنے والے منڈیر کی ایک دو اینٹیں ہی اکھاڑیں گے تو پکڑے جائیں گے۔ عمارت کی بنیادوں میں پانی چھوڑ دیا جائے تو عمارت ملبے کا ڈھیر بن جاتی ہے اور لوگ اس کے سوا کچھ نہیں کہتے کہ عمارت کی بنیادوں میں پانی چلا گیا تھا۔

اسلام کی فلک بوس عمارت کو مسمار کرنے کا یہی طریقہ اختیار کیا جا رہا تھا۔ اس طریقۂ جنگ کے لئے ہتھیاروں کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی مال و دولت کی ہوتی ہے۔ اس میں انسان خریدے جاتے ہیں۔ دین داروں کے دین و ایمان کی قیمت دی جاتی ہے۔ احمد بن غطاش نے زر و جواہرات کی فراہمی کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔

سلطنتِ اسلامیہ میں قافلوں کو لوٹنے کا سلسلہ کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔ کوئی لٹیرا رہزنی کی جراُت نہیں کرتا تھا۔ قافلے کے ساتھ بے شمار لوگ ہوتے ہیں' اکیلا آدمی مال و دولت لئے پاپیادہ دشت و بیابان میں بے دھڑک سفر کرتا تھا۔

سلجوقی تو اس معاملے میں اور زیادہ سخت تھے لیکن سلجوقی سلطان ملک شاہ کے دور میں اگر قافلے لُٹنے لگے۔ یہ سراغ نہیں ملتا تھا کہ اچانک لُٹیروں کے یہ گروہ کہاں سے آ گئے ہیں۔ یہ تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ سرکاری طور پر اس کا کیا سدِباب ہُوا تھا البتہ یہ واضح ہے کہ قافلوں کی آمد و رفت تقریباً" بند ہو گئی تھی۔

ایک روز احمد بن غطاش سے ملنے ایک آدمی آیا۔ حسن بن صباح بھی اس کے پاس بیٹھا تھا۔ دربان نے جونہی احمد بن غطاش کو اس آدمی کی اطلاع دی تو احمد بن غطاش نے چونک کر کہا کہ اسے جلدی اندر بھیجو۔

"خوش آمدید میرے بھائی!" ۔۔۔ احمد بن غطاش نے اس آدمی کو دیکھتے ہی پُر مسرت لہجے میں پوچھا ۔۔۔ "بیٹھنے سے پہلے یہ سناؤ کہ کوئی خوشخبری لائے ہو؟"

"بہت بڑی خوشخبری!" ۔۔۔ اس آدمی نے بیٹھتے ہوئے کہا ۔۔۔ "ایک بہت بڑا قافلہ آ رہا ہے۔ اور جوں جوں یہ آگے بڑھتا آ رہا ہے' اس کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے"۔

"اور مال و دولت میں اضافہ ہوتا آ رہا ہے" ۔۔۔ حسن بن صباح نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس شخص نے جو قافلے کی خبر لایا تھا' یہ بتانا شروع کر دیا کہ قافلہ کہاں ہے اور یہ کس راستے پر جا رہا ہے۔ یہ راستہ شاہ در سے بہت دُور سے گزرتا تھا۔ وہ علاقہ پہاڑی بھی تھا اور یہ پہاڑ اور وادیاں درختوں سے لدی پڑی تھیں اور جو علاقہ میدانی تھا وہ سب جنگلاتی تھا۔ چونکہ قافلے جو پہلے لُٹ چکے تھے وہ شاہ در سے بہت دُور لُٹے تھے اس لئے کسی کو ذرا سا بھی شُبہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ قافلے لُوٹنے والے احمد بن غطاش کے آدمی ہیں اور یہ ساری دولت احمد بن غطاش کے قبضے میں جا رہی ہے۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس قافلے میں کیا کچھ ہے؟" ۔۔۔ احمد بن غطاش نے پوچھا۔

"کیوں نہیں!" ۔۔۔ اس شخص نے فاتحانہ انداز سے جواب دیا ۔۔۔ "میں نے اس قافلے کے ساتھ دو پڑاؤ سفر کیا ہے اور پوری تفصیلات اپنی آنکھوں دیکھ کر اور کچھ قافلے والوں سے سن کر آیا ہوں"۔

"ہمیں تم جیسے آدمیوں کی ضرورت ہے" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "اب بتاؤ کیا دیکھ آئے ہو"۔

"زیادہ تر تاجر ہیں" ۔۔۔ اس شخص نے جواب دیا ۔۔۔ "ان میں بعض تو بہت ہی امیر کبیر لگتے ہیں۔ بیس بیس تیس تیس اونٹوں پر ان کا مال جا رہا ہے"۔

"مال کیا ہے؟"

"اناج بھی ہے" ۔۔۔ اس شخص نے جواب دیا ۔۔۔ "کپڑا ہے' چمڑا ہے اور سونے چاندی کے زیورات بھی ہیں۔ چند ایک کنبے بھی قافلے کے ساتھ ہیں"۔

"تو جوان لڑکیاں بھی ہوں گی!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"زیادہ تو نہیں!" ۔۔۔ اس شخص نے جواب دیا ۔۔۔ "سات آٹھ اچھی خاصی خوبصورت اور نوخیز لڑکیاں ہیں۔ چھوٹی عمر کی بچیاں بھی ہیں"۔

"یہ تو اور زیادہ اچھا ہے" ۔۔۔ احمد بن غطاش نے کہا ۔۔۔ "ہمیں پنیری چاہئے جسے ہم اپنی

www.paksociety.com

رغنی سے جہاں چاہیں گے وہاں لگا دیں گے اور اپنے انداز سے اس کی آبیاری کریں گے"۔

"سوچنے والی ایک بات ہے"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "کئی ایک قافلے لُوٹے جا چکے ہیں پھر ان تاجروں وغیرہ نے یہ جرأت کیسے کی ہے کہ وہ اتنا مال و دولت اور اتنا بڑا قافلہ لے کر چل پڑے ہیں؟.... شاید ان لوگوں نے یہ سوچا ہو گا کہ کچھ عرصے سے قافلوں کو لُوٹنے کا سلسلہ بند ہے اس لئے لُٹیرے کسی اور علاقے میں چلے گئے ہوں گے"۔

"میرا خیال کچھ اور ہے"۔۔۔ قافلے کی خبر لانے والے آدمی نے کہا۔۔۔ "قافلے میں جو کوئی بھی شامل ہوتا ہے اسے کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس تلوار اور برچھی لازمی طور پر ہونی چاہئے اور اس میں حملے کی صورت میں لڑنے کا جذبہ بھی ہونا چاہئے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جہاں پڑاؤ ہوتا ہے وہاں کئی ایک نوجوان رضاکارانہ طور پر پورے پڑاؤ کے ارد گرد گھوم پھر کر پہرہ دیتے ہیں۔ قافلے میں نوجوان آدمیوں کی تعداد ذرا زیادہ ہے۔ میں یہی بات آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ قافلے کے ساتھ حفاظت کا انتظام بھی موجود ہے اس لئے ہمیں زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہے اور سب سے بڑی ضرورت احتیاط کی ہے"۔

"ہاں.... یہ سوچنے والا معاملہ ہے"۔۔۔ احمد بن غطاش نے کہا اور گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

"ہم اس قافلے کو محافظ دیں گے"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا اور قافلے کی خبر لانے والے سے مخاطب ہوا۔۔۔ "تم کچھ دیر میرے پاس بیٹھنا.... اور استادِ محترم یہ کوئی پریشان کرنے والا معاملہ نہیں"۔

اس شخص نے بتایا کہ اس وقت تک قافلے کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہو چکی ہے اور جس بستی اور شہر کے قریب سے یہ قافلہ گزرتا ہے اس میں لوگ شامل ہوتے جا رہے ہیں۔

"میں اس کی وجہ سمجھتا ہوں"۔۔۔ احمد بن غطاش نے کہا۔۔۔ "ایک عرصے بعد لوگوں نے ایک قافلہ دیکھا ہے اس لئے لوگ اس قافلے کے ساتھ چل پڑے ہیں"۔

"یہ قافلہ منزل پر نہیں پہنچنا چاہئے"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔

"اسی لئے تو میں اتنی دُور سے آیا ہوں"۔۔۔ اس شخص نے کہا۔۔۔ "مجھے فوراً بتائیں کہ میں نے کیا کرنا ہے۔ مجھے جلدی روانہ ہو جانا چاہئے"۔

احمد بن غطاش اور حسن بن صباح نے اسے ہدایات دینی شروع کر دیں۔

○

یہ شخص گھوڑے پر سوار، قلعے سے اس طرح نکلا کہ کسی نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں

کہ یہ کون ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ شہر سے کچھ دُور جا کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دیکھتے ہی دیکھتے سرسبز ٹیکریوں اور جنگل میں غائب ہو گیا۔

اس کے جانے کے فوراً بعد احمد بن غطاش نے اپنے دو خاص مصاحبین کو بلایا اور انہیں کچھ ہدایات دیں۔ دونوں بڑی تیزی سے چلے گئے۔ پہلے تو وہ شاہ در میں کچھ لوگوں سے ملے اور پھر دیہات میں نکل گئے۔

اسی شام کو سورج غروب ہونے کے بعد شاہ در سے سات آٹھ میل دُور کم و بیش پچاس گھوڑ سوار اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے احمد بن غطاش کی ہدایت کے مطابق اپنا ایک امیر یا کمانڈر مقرر کر لیا اور اُس طرف چل پڑے جس طرف سے قافلے نے گزرنا تھا۔ انہیں راستہ وغیرہ سمجھا دیا گیا تھا۔ ان کے سامنے دو اڑھائی دنوں کی مسافت تھی۔

قافلے کا راستہ وہاں سے تقریباً ساٹھ میل دُور تھا۔ اس وقت تک قافلے کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے تجاوز کر گئی تھی۔ اس میں بوڑھے آدمی بھی تھے، بوڑھی عورتیں بھی تھیں، جوان اور نوجوان لڑکے زیادہ تھے، نوجوان لڑکیاں اور بچے بھی تھے، اونٹ بے شمار تھے، تجارتی مال اور گھریلو سامان سے لدی ہوئی چار پانچ بیل گاڑیاں اور مال بردار گھوڑا گاڑیاں بھی تھیں۔ قافلے کے زیادہ تر آدمی گھوڑوں پر سوار تھے۔

ایک پڑاؤ سے علی الصبح قافلہ چلا۔ ابھی چند میل ہی طے کئے ہوں گے کہ قافلے کے آگے آگے جانے والے رک گئے۔

"ڈاکو.... ڈاکو"۔۔۔ قافلے کے آگے سے بڑی بلند آواز سے اعلان ہوا۔۔۔ "ہوشیار ہو جاؤ جوانو! ڈاکو آ گئے ہیں۔ تیار ہو جاؤ"۔

قافلے کی لمبائی ایک میل سے کہیں زیادہ تھی۔ اعلان کئی بار دہرایا گیا۔ اس کے جواب میں قافلے میں جتنے بھی نوجوان لڑکے، جوان اور ادھیڑ عمر آدمی تھے تلواریں اور برچھیاں تان کر ایسی ترتیب میں ہو گئے کہ قافلے کو محاصرے میں لے لیا۔ تب پتہ چلا کہ قافلے میں کئی ایک ایسے لوگ ہیں جن کے پاس کمانیں اور تیروں سے بھری ہوئی ترکشیں ہیں۔

"لڑکیوں اور بچیوں کو درمیان میں کر لو"۔۔۔ اعلان ہوا۔۔۔ "کچھ آدمی لڑکیوں کے ساتھ رہیں"۔

ایک طرف سے کم و بیش پچاس گھوڑ سوار قافلے کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے آنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ حملہ کرنے نہیں آ رہے۔ ان کے پاس تلواریں تھیں لیکن تلواریں نیاموں

میں تھیں۔ بعض کے پاس برچھیاں تھیں اور کچھ ایسے تھے جن کے پاس جنگی کلہاڑے تھے۔
گھوڑوں کی رفتار حملے والی یا تیز بولنے والی نہیں تھی۔ وہ جب قریب آئے تو ان کے آگے آگے
دو سوار تھے، ان دونوں نے ہاتھ اوپر کر کے لہرائے جو ایک پُرامن اشارہ تھا۔
قافلے میں جو تیر انداز تھے وہ ایک صف میں کھڑے ہو گئے اور کمانوں میں ایک ایک تیر ڈال
لیا۔

"ہم دوست ہیں" — آنے والے ایک سوار نے کہا — "ہمیں دشمن نہ سمجھو۔"

"پھر وہیں رک جاؤ" — قافلے میں سے ایک آدمی نے کہا — "صرف ایک آدمی آگے
آ کر بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو۔ ہمارے تیر اندازوں کو تیغ زنوں اور برچھی والوں کو دیکھ لو۔ تم اتنے
تھوڑے ہو کہ تھوڑی سی دیر میں تم اپنے خون میں ڈوب جاؤ گے اور تمہارے گھوڑے اور
ہتھیار ہمارے پاس ہوں گے۔"

ان مشکوک گھڑسواروں کے آگے آگے آنے والے دونوں سواروں نے پیچھے مڑ کر اپنے
ہاتھ ہلائے جو اشارہ تھا کہ باقی سوار پیچھے ہی رک جائیں۔ تمام سوار رک گئے اور یہ دونوں سوار
قافلے کے قریب آ گئے۔

"اب بتاؤ تمہارا ارادہ کیا ہے!" — قافلے کے اس معزز آدمی نے کہا جس نے اپنے آپ کو
خود ہی میرِ کارواں بنا لیا تھا۔

"ڈرو نہیں دوستو!" — ایک سوار نے کہا — "ہم پیشہ ور لوگ ہیں۔ ہمارا پیشہ امیر لوگوں
کی حفاظت کرنا ہے۔ ہم میں اتنی جرأت اور طاقت نہیں کہ اتنے بڑے قافلے پر حملہ کریں۔
ہمیں پتہ چلا کہ ایک قافلہ جا رہا ہے اور ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ قافلوں کو لوٹنے والے بھی موجود
ہیں تو ہم نے اپنے ان دوستوں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ چلو اس قافلے کے پیچھے جاتے ہیں اور امیر
لوگوں کو حفاظت مہیا کریں گے اور حلال کی روزی کما لیں گے۔ تمہارا سفر ابھی بہت لمبا باقی ہے
قافلے پر کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ حملہ ہو سکتا ہے۔ ہماری التجا ہے کہ ہمیں قافلے کی
حفاظت کے لئے اپنے ساتھ لے چلو۔ ہم راتوں کو پہرہ بھی دیں گے۔"

"کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ ہمارے ساتھ کتنے آدمی ہیں!" — میرِ کارواں نے کہا — "کیا
تم انہیں اپنی حفاظت خود کرنے کے قابل نہیں سمجھتے؟"

"نہیں!" — ایک سوار نے جواب دیا — "ان میں ہمیں ایک بھی ایسا نظر نہیں آتا
جس نے کبھی لڑائی لڑی ہو۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ قافلوں کو لوٹنے والے لڑنے اور مرنے کی

مہارت رکھتے ہیں؟ تمہارے ان آدمیوں نے جب اپنے ساتھیوں کے جسموں سے خون کے
فوارے پھوٹتے دیکھے تو یہ سب بھاگ جائیں گے...... ہمیں اپنے محافظ بنا کر اپنے ساتھ لے
چلیں ہم اتنی زیادہ اُجرت نہیں مانگیں گے، جو تم دے ہی نہ سکو۔ تم میں بڑے بڑے امیر تاجر
بھی ہیں، جوان لڑکیوں کے باپ بھی ہیں۔ پھر آپ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں۔
آپ سب مل جل کر ہمیں اتنی سی اُجرت تو دے ہی سکتے ہیں جس سے کچھ دن ہمارے بچے بھی
روٹی کھا لیں گے۔"

"ایک بات میں بھی کہوں گا" — دوسرے سوار نے کہا — "اگر آپ ہمیں حلال روزی
مہیا نہیں کریں گے اور ہمیں کہیں سے بھی روزی نہیں ملے گی تو ایک روز ہم بھی راہزنی شروع
کر دیں گے اور قافلوں کو لوٹنے کا گروہ بنا لیں گے۔"

"روزی دینے والا خدا ہے" — ایک بزرگ نے آگے آ کر کہا — "میرے ہمسفرو! معلوم
ہوتا ہے خدا نے ان کی روزی ہمارے ذمے کر دی ہے۔ نہ جانے یہ بیچارے کتنی دُور سے ہمارے
پیچھے آئے ہیں اور یہ حلال کی روزی کے پیچھے آئے ہیں۔ انہیں مایوس نہ کرو اور ان کے ساتھ
اُجرت طے کر لو۔ انہیں ساتھ لے لینے سے ہماری حفاظتی طاقت میں اضافہ ہو جائے گا۔ ان
سے بات کر لو۔"

ان سے اُجرت پوچھی گئی جو انہوں نے بتائی اور ان کے ساتھ سودا طے کر لیا گیا۔ ان محافظ
سواروں نے دو شرطیں پیش کیں۔ ایک یہ کہ انہیں اُجرت پیشگی دے دی جائے اور دوسری یہ
کہ ان کا کھانا پینا قافلے کے ذمے ہو گا۔

ان کی دونوں شرطیں مان لی گئیں۔ قافلے کے ہر فرد نے اتنی رقم دے دی جو حساب کے
مطابق ہر ایک کے ذمے آتی تھی۔

قافلہ چل پڑا۔ ان پچاس محافظوں نے اپنے آپ کو اس طرح تقسیم کر لیا کہ کچھ قافلے کے
آگے ہو گئے، کچھ قافلے کے پیچھے اور باقی قافلے کے دائیں اور بائیں ہو گئے۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ
وہ محنت مزدوری کرنے والے لوگ ہیں اور وہ پیشہ ور چوکیدار اور محافظ ہیں۔

پہلا پڑاؤ آیا تو ان میں سے بہت سے آدمیوں نے رات بھر دو دو ہو کر پڑاؤ کے چاروں طرف
پہرہ دیا۔ اس سے قافلے والے ان سے مطمئن اور متاثر ہو گئے۔ اگلی رات بھی انہوں نے اسی
طرح پہرہ دیا۔

تیسرے پڑاؤ تک پہنچتے قافلے میں ڈیڑھ دو سو مزید افراد کا اضافہ ہو چکا تھا۔

قافلہ ایک اور پڑاؤ کے لئے رک گیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ لوگ رات بسر کرنے کے لئے اپنے اپنے انتظامات میں مصروف ہو گئے۔ عورتیں کھانا تیار کرنے لگیں۔ پانی کی وہاں کوئی قلت نہیں تھی۔ علاقہ سرسبز اور پہاڑی تھا۔ پہاڑیاں ذرا پیچھے ہٹی ہوئی تھیں اور ان کے درمیان ہری بھری گھاس کا میدان تھا۔ قریب ہی سے شفاف پانی کی ندی گزرتی تھی۔ پڑاؤ کے لئے یہی جگہ موزوں تھی۔

قافلے والے دن بھر کے تھکے ہوئے تھے کھانا کھا کر لیٹے اور لیٹتے ہی سو گئے۔ محافظ سوار پہرے پر کھڑے ہو گئے اور ہر رات کی طرح پڑاؤ کے ارد گرد گھوم پھر کر پہرہ دینے لگے۔ آدھی رات سے کچھ پہلے تھوڑی دور سے الو کے بولنے کی آواز آئی۔ ایک الو پڑاؤ کے بالکل قریب سے بولا۔ ایک بار پھر دور سے الو کی آواز آئی۔

قافلے والے گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ پچاس ساٹھ گھوڑ سوار قافلے کے پڑاؤ کی طرف آرہے تھے۔ وہ جب پہاڑوں میں پہنچے اور پڑاؤ انہیں اپنے سامنے نظر آنے لگا تو وہ وہیں رک گئے۔ گھوڑوں سے اترے اور آہستہ آہستہ چلتے پڑاؤ کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ چند ایک کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں۔ وہ جو پچاس محافظ تھے' ان میں سے کچھ پہرے پر کھڑے تھے اور باقی سوئے ہوئے تھے۔ ان کے جو ساتھی پہرے پر کھڑے تھے' ان میں سے کچھ آہستہ آہستہ آئے اور انہیں جگایا۔

تمام سوئے ہوئے محافظ آہستہ آہستہ اٹھے۔ انہوں نے تلواریں نکال لیں پھر یہ سب ایک جگہ اکٹھے ہوئے۔ اُدھر سے وہ بھی آگئے جنہوں نے گھوڑے پہاڑیوں کے پیچھے کھڑے کئے تھے۔ یہ سب یعنی محافظ بھی اور اُدھر سے آنے والے بھی ایک جگہ آپس میں ملے۔ محافظوں میں سے ایک نے نئے آنے والوں کو بتانا شروع کر دیا کہ کون کہاں ہے' یعنی فلاں جگہ امیر کبیر تاجر ہیں اور فلاں جگہ نوجوان لڑکیاں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب' محافظ بھی اور اُدھر سے آنے والے بھی تعداد میں ایک سو سے زیادہ ہو گئے۔ محافظ دراصل لٹیرے ہی تھے جنہوں نے دھوکہ دے کر قافلے کے ساتھ رہنا تھا اور ان کے پچاس ساٹھ ساتھیوں نے راستے میں آکر ان سے ملنا تھا۔ یہ محافظ اس لئے قافلے میں شامل ہوئے تھے کہ انہوں نے پیچھے دیکھ لیا تھا کہ قافلے میں لڑنے والے جوانوں کی تعداد خاصی زیادہ ہے۔

جو آدمی احمد بن غطاش کو اس قافلے کی اطلاع دینے گیا تھا' اس نے بتایا تھا کہ اس قافلے پر حملہ ناکام بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں لڑنے والے آدمیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ احمد بن غطاش یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا لیکن حسن بن صباح کے دماغ نے فوراً" یہ ترکیب سوچ لی تھی کہ لٹیروں کے گروہ کے آدھے آدمی پیشہ ور محافظ بن کر قافلے میں شامل ہو جائیں گے تاکہ قافلے والے راتوں کو خود پہرہ نہ دیں اور وہ اپنی حفاظت سے بے فکر ہو جائیں۔ حسن بن صباح نے اطلاع لانے والے کو یہ ترکیب بڑی اچھی طرح سمجھا دی تھی۔

یہ شخص بڑی تیزی سے لٹیروں کو اکٹھا کرتا پھرا اور ان کا جو لیڈر تھا' اسے اس نے یہ ترکیب سمجھا دی۔ لیڈر نے بڑی خوش اسلوبی سے اس ترکیب پر عمل کیا۔

قافلے والے سمجھ ہی نہ سکے کہ جنہیں وہ محافظ سمجھ بیٹھے ہیں وہ راہزن ہیں۔ ان راہزنوں نے قافلے کے بچے بچے پر اپنا اعتماد قائم کر لیا تھا۔

ان ایک سو سے زیادہ رہزنوں نے پڑاؤ کے ایک طرف سے قتلِ عام شروع کیا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ نوجوان لڑکیوں' کمسن بچیوں اور بچوں کو زندہ لانا ہے۔ جب قافلے والوں کا قتلِ عام شروع ہوا تو دوسروں کی آنکھ کھل گئی لیکن راہزنوں نے انہیں سنبھلنے کی مہلت نہ دی۔ اس کے بعد ایک ہڑبونگ تھی۔ قیامت کا سماں تھا۔ جو کوئی ہڑبڑا کر اٹھتا تھا اس کے جسم میں برچھی اتر جاتی یا تلوار اس کی گردن صاف کاٹ دیتی۔ وہاں ان کی چیخ و پکار سننے والا اور سن کر مدد کو پہنچنے والا کوئی نہ تھا۔ لڑکیوں اور بچوں کی دلدوز چیخیں تھیں جو راہزنوں اور قاتلوں کے دلوں کو موم نہیں کر سکتی تھیں۔

کچھ زیادہ دیر نہ لگی کہ قافلے کا صفایا ہو گیا۔ لٹیروں نے سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ پھر انہوں نے یہ سامان اونٹوں' بیل گاڑیوں اور گھوڑا گاڑیوں پر لاد لیا۔ نوجوان لڑکیوں' بچیوں اور بچوں کو ہانک کر ایک طرف لے جانے لگے۔

قیامت کی اس خونریزی میں ایک دو اونٹ اور ایک دو گھوڑے کھل کر اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ شاید چند انسان بھی زندہ بچ گئے ہوں۔ راہزن بڑی جلدی میں تھے۔ انہوں نے لڑکیوں اور بچوں کو ایک گھوڑا گاڑی پر سوار کر لیا اور چار پانچ آدمی ان کے ساتھ سوار ہو گئے اور وہ پہاڑیوں کے پیچھے غائب ہو گئے۔

○

صبح کا اجالا سفید ہوا تو آسمان نے اس میدان میں لاشوں پر لاشیں پڑی دیکھیں۔ لاشوں کے سوا وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ قریب کی ایک ٹیکری کے اوپر ایک بوڑھا آدمی لیٹا ہوا تھا۔ اس نے آہستہ

آہستہ سر اٹھایا اور ان کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنی اتنی لمبی عمر میں ایسے منظر پہلے بھی دیکھے ہوں گے۔ وہ کوئی تجربہ کار آدمی تھا۔ وہ اسی قافلے کا ایک فرد تھا۔ رات کو جب قتلِ عام شروع ہوا تو وہ کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلا اور ٹیکری پر چڑھ کر اونچی گھاس میں چھپ گیا تھا۔ وہ رات بھر اپنے ہمسفروں اور ان کے بچوں اور عورتوں کی چیخ و پکار سنتا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھا اور ٹیکری سے اترا۔ اسے ایسا کوئی ڈر نہ تھا کہ ڈاکو پھر آ جائیں گے اور اُسے قتل کر دیں گے۔

وہ آہستہ آہستہ لاشوں کو دیکھتا گیا۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے خواب میں چل رہا ہو۔ وہ اپنے کنبے کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہاں تو کوئی کہاں اور کوئی کہاں پڑا تھا۔ اُسے بہت ہی چھوٹے سے ایک بچے کی لاش پڑی نظر آئی۔ بچے کی عمر چند مہینے ہی ہو گی۔ وہ کچھ دیر اس غنچے کو دیکھتا رہا جو بن کھلے مرجھا گیا تھا۔ بچے سے نظریں ہٹا کر اس نے ہر طرف دیکھا۔ اسے کچھ دُور ایک اونٹ نظر آیا جو بڑی بے پروائی سے اس خونی منظر سے بے نیاز گھاس چر رہا تھا۔

بوڑھے نے آسمان کی طرف دیکھا جیسے خدا کو ڈھونڈ رہا ہو۔ اچانک اُسے ایک خیال آیا۔ وہ بڑی تیزی سے اونٹ کی طرف چل پڑا۔ اونٹ کے پاس جا کر اس کی مُہار پکڑی اور وہیں بٹھا دیا۔ پھر وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسے ایک کجاوا ایک جگہ پڑا دکھائی دیا۔ وہ گیا اور کجاوا اٹھا کر اونٹ کے پاس لے گیا۔ اونٹ کی پیٹھ پر رکھ کر اس نے کجاوا کس دیا، پھر اس دودھ پیتے بچے کی خون آلود لاش اٹھا کر لے گیا۔ لاش کو کجاوے میں رکھا اور خود بھی اونٹ پر سوار ہو گیا اور اونٹ کو اٹھایا۔

اس نے اونٹ کا رخ مَرو کی طرف کر دیا۔ اُس وقت مَرو سلجوقی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ سلطان ملک شاہ وہیں ہوتا تھا۔

ملک شاہ روایتی بادشاہوں جیسا بادشاہ نہیں تھا لیکن جہاں وہ رہتا تھا وہ محل سے کم نہ تھا۔ ایک روز وہ اپنے مصاحبوں وغیرہ میں بیٹھا ہُوا تھا۔

"میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں" — ملک شاہ نے کہا اور کچھ دیر سوچ کر بولا — "قافلوں کے لُٹنے کا خطرناک سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ ہم کسی کو پکڑ تو نہیں سکے لیکن پکڑنے اور سزا دینے والا اللہ ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے میری مدد کی اور قافلے محفوظ ہو گئے"۔

"سلطانِ محترم!" — دربان نے اندر آ کر کہا — "ایک ضعیف العمر شتر سوار آیا ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے"۔

"کہاں سے آیا ہے؟" — سلطان نے پوچھا — "کیا چاہتا ہے؟ کچھ پوچھا تم نے؟"

"نہیں سلطانِ عالی مقام!" — دربان نے جواب دیا — "اس کی حالت اچھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے بڑی لمبی مسافت طے کر کے آیا ہے۔ اُس نے بہت چھوٹے سے بچے کی لاش اٹھا رکھی ہے۔ لاش کو جیسے خون سے نہلایا گیا ہے"۔

"لاش؟" — ملک شاہ نے چونک کر کہا — "چھوٹے سے بچے کی لاش؟ اُسے فوراً اندر بھیجو۔ یہ فریادی معلوم ہوتا ہے"۔

وہ ضعیف العمر ہانپتا کانپتا، جھکا جھکا، بازوؤں پر چند ماہ عمر کے بچے کی خون آلود لاش اٹھائے ملک شاہ کے سامنے آیا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں کا نور بجھ چکا تھا۔

"آؤ میرے بزرگ!" — ملک شاہ اٹھ کھڑا ہُوا اور پوچھا — "کیا مشکل تمہیں یہاں لے آئی ہے؟"

"ایک بچے کی لاش لایا ہوں اے سلطان!" — بوڑھے نے کہا — "یہ آپ کا بچہ ہے" — اس نے آگے بڑھ کر لاش سلطان کے قدموں میں رکھ دی — "اونٹ کی پیٹھ پر تین دن اور تین راتیں سفر کیا ہے۔ نہ اونٹ نے کچھ کھایا ہے نہ میں نے۔ یہ اللہ کی امانت تھی جس میں سلجوقی سلطان نے خیانت کی.... دیکھ سلطان دیکھ... اس بِن کھلی کلی کو دیکھ... اس ننھے سے بچے میں ابھی یہ احساس بھی پیدا نہیں ہُوا تھا کہ یہ زندہ ہے اور مرتے وقت اسے یہ احساس نہیں ہُوا ہو گا کہ موت نے اسے ماں کی آغوش سے اٹھا کر اپنی گود میں لے لیا ہے"۔

سلطان ملک شاہ نے دربان کو بلوایا اور کہا کہ وہ بچے کی لاش لے جائے، اسے غسل دے کر کفن پہنایا جائے۔

"اے بزرگ انسان!" — سلطان نے بوڑھے سے کہا — "کیا یہ اچھا نہیں ہو گا کہ شکوے اور شکایت سے پہلے یہ بتا دو کہ یہ بچہ کس کا ہے اور اسے کس نے قتل کیا ہے؟"

"یہ میرے کسی ہمسفر کا بچہ تھا" — بوڑھے نے کہا — "میں اس کے باپ کو نہیں جانتا۔ اس کی ماں کو نہیں جانتا۔ انہیں میں کبھی بھی نہیں جان سکوں گا۔ وہ بھی قتل ہو گئے ہیں۔ وہ کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ کہاں جا رہے تھے؟ میں نہیں جانتا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ ہمارے قافلے کے ساتھ تھے۔ قافلے پر ڈاکوؤں کا حملہ ہو گیا"۔

بوڑھے نے تفصیل سے سنایا کہ قافلہ کہاں سے چلا تھا، کس طرح اس میں مسافروں کا اضافہ ہوتا گیا اور پھر کس طرح اور کہاں قافلے پر اُس وقت حملہ ہُوا جب سب گہری نیند سو رہے تھے۔

سلطان غصے کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔ وہ بار بار ایک ہاتھ کا گھونسہ دوسرے کی ہتھیلی پر مارتا تھا۔ اُس کے چہرے پر قہر اور عتاب کے آثار گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

"کچھ عرصہ پہلے قافلوں پر حملے شروع ہوئے تھے" ـــــ بوڑھے نے کہا ـــــ "پھر یہ حملے خود ہی ختم ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ نے ڈاکوؤں کی سرکوبی کا کوئی بندوبست کر دیا تھا بلکہ لوگوں نے سفر کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ہم بدقسمت اس خوش فہمی میں نکل کھڑے ہوئے کہ منزل پر پہنچ جائیں گے"۔

"اس بچے کی لاش یہاں کیوں لے آئے ہو؟" ـــــ سلطان ملک شاہ نے پوچھا۔

"سلطان کو یہ دکھلانے کے لئے کہ سلطانوں کے گناہوں کی سزا رعایا کو ملا کرتی ہے" ـــــ بوڑھے نے کہا ـــــ "میں عقیدے کا سُنّی ہوں۔ آپ مجھے معاف کریں یا نہ کریں، مجھے اس کا کوئی ڈر نہیں، میں خلفاءِ راشدین کی بات کروں گا جن کے دور میں ہر طرف مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ ہر مذہب کے لوگوں کی عزت محفوظ ہو گئی تھی، جان محفوظ ہو گئی تھی اور لوگوں کے مال و اموال محفوظ ہو گئے تھے۔ وہ رعایا کو اور رعایا کے بچوں کو اللہ کی امانت سمجھتے تھے.... میں بچے کی لاش اس لئے یہاں لایا ہوں کہ سلطان اس معصوم کی کھلی اور ٹھہری ہوئی آنکھوں میں اپنے گناہوں کا عکس دیکھ لے"۔

"دیکھ لیا ہے میرے بزرگ!" ـــــ سلطان نے کہا ـــــ "ہم ان قزاقوں کو پکڑیں گے"۔

"ہمارے قافلے سے تمام نوجوان لڑکیوں اور بچیوں کو قزاق اپنے ساتھ لے گئے ہیں"۔ بوڑھے نے کہا ـــــ "وہ نہیں وہ قتل نہیں کریں گے، انہیں امراء کے گھروں میں فروخت کیا جائے گا۔ انہیں عیش و عشرت کا ذریعہ بنایا جائے گا۔ اُمتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بچیاں رقاصہ بنیں گی، عصمت فروش بنیں گی اور ساری عمر اپنے سلطان کے اس گناہ کی سزا بھگتتی رہیں گی کہ سلطان نے اپنے فرائض سے نظریں پھیر لی تھیں۔ سلطان کی نیندیں حرام ہو جانی چاہئیں.... میں قافلے والوں کی روحوں کا یہ پیغام لے کر آیا ہوں"۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سلجوقی سلطان اسلام کے سچے پیروکار تھے۔ ان میں روایتی بادشاہوں والی خُو نہیں تھی۔ اس بوڑھے نے ایسی سخت باتیں بھی کہہ ڈالی تھیں جو کوئی معمولی سا حاکم بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا لیکن سلطان ملک شاہ نے نہ صرف یہ کہ بوڑھے کا غصہ بھی برداشت کیا اور طنز بھی بلکہ حکم دیا کہ اسے مہمان خانے میں رکھا جائے اور جب تک یہاں قیام کرنا چاہے اسے سلطان کے ذاتی مہمان کی حیثیت سے رکھا جائے۔

ملک شاہ نے اُسی وقت فوج کے سپہ سالار اور کوتوال کو بلا کر انہیں وہ جگہ بتائی جہاں قافلہ لوٹا گیا اور قافلے والوں کا قتلِ عام ہُوا تھا۔ اُس نے حکم دیا کہ ہر طرف، ہر شہر اور ہر آبادی میں جاسوس پھیلا دیئے جائیں۔

"یہ کوئی بہت بڑا اور منظم گروہ ہے" ـــــ سلطان ملک شاہ نے کہا ـــــ "ہم جاسوسوں اور مخبروں کے بغیر اس کا سراغ نہیں لگا سکتے۔ مجھے ان چھوٹے چھوٹے قلعوں کے مالکوں اور قلعہ داروں پر بھی شک ہے۔ ان کے ساتھ ہمیں مروّت سے پیش آنا پڑتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ کسی بھی وقت خود مختاری کا اعلان کر سکتے ہیں۔ میں ان پر فوج کشی نہیں کرنا چاہتا ورنہ یہ سرکش اور باغی ہو جائیں گے"۔

"سلطان عالی مقام!" ـــــ سپہ سالار نے کہا ـــــ "میری نظر قلعہ شاہ در کے والی احمد بن عطاش پر بار بار اُٹھتی ہے۔ مجھے شک ہے کہ وہ کوئی زمین دوز کارروائیوں میں مصروف ہے۔ شاہ در ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں کی آبادی خاصی زیادہ ہے۔ احمد کو اس آبادی سے فوج مل سکتی ہے"۔

"اسے شاہ در کا والی میں نے ہی بنایا تھا" ـــــ سلطان نے کہا ـــــ "اور یہ شہر اس کے حوالے اس کی کچھ خوبیاں دیکھ کر کیا تھا۔ اس کی شہرت یہ ہے کہ وہ اہلِ سنت ہے اور وہ جب وعظ اور خطبہ دے رہا ہوتا ہے تو کفر کے پتھر بھی موم ہو جاتے ہیں۔ پہلے والی ذاکر نے وصیت کی تھی کہ شاہ در کا والی احمد بن عطاش کو مقرر کیا جائے"۔

"گستاخی معاف سلطان محترم!" ـــــ کوتوال نے کہا ـــــ "کسی کی خطابت سے متاثر ہونا اور بات ہے لیکن ایسے خطیب کی نیّت اور دل میں چھپے ہوئے عزائم کو سمجھنا بالکل ہی مختلف معاملہ ہے اور یہی ایک راز ہے جو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ مجھے کچھ ایسی اطلاعیں مل رہی ہیں جن سے یہ شک پیدا ہوتا ہے کہ شاہ در میں اسماعیلی اکٹھے ہو رہے ہیں"۔

"یہ شک ایک اور وجہ سے بھی پختہ ہوتا ہے" ـــــ سپہ سالار نے کہا ـــــ "احمد نے قلعے کا والی بنتے ہی ان تمام اسماعیلیوں کو رہا کر دیا تھا جنہیں سُنّی عقیدے کے خلاف کام کرتے پکڑا گیا تھا لیکن اب ہم اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ تین سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ اب ہم صرف یہ کر سکتے ہیں، اور ہمیں یہ کرنا بھی چاہئے کہ کسی ایسے جاسوس کو شاہ در بھیج دیتے ہیں جو بہت ہی ذہین، دانشمند اور ہر بات کی گہرائی میں اتر جانے والا ہو۔ وہ ذرا اونچی حیثیت کا آدمی

ہونا چاہئے جو والیٔ قلعہ کی محفلوں میں بیٹھنے کے قابل ہو"۔

"ایسا کوئی آدمی تمہاری نظر میں ہے؟" ——— سلطان نے پوچھا۔

"میرے پاس دو ایسے آدمی ہیں" ——— کوتوال نے کہا ——— "ان دونوں میں جو بہتر ہے' اگر آپ حکم دیں' تو میں اُسے شاہ در بھیج دوں گا۔ بھیجنے سے پہلے میں اسے کچھ دن تربیت دوں گا"۔

"بھیج دو" ——— ملک شاہ نے کہا ——— "اگر فوج کشی کی ضرورت پڑی تو میں حیل و حجت نہیں کروں گا۔ میں اپنی ذات کی توہین برداشت کر سکتا ہوں' اپنے عقیدے کے خلاف ایک لفظ بھی گوارا نہیں کروں گا"۔

اُس شخص کا نام یحییٰ ابن الہادی تھا۔ اس کی عمر تیس سال سے کچھ اوپر تھی۔ عراقی عرب تھا۔ خوبرو اتنا کہ ہجوم میں ہوتا تو بھی دیکھنے والوں کی نظریں اُس پر رک جاتی تھیں۔ جسم گٹھا ہُوا اور ساخت پُرکشش۔ ایسا ہی حُسن اُس کی زبان میں تھا۔ عربی اُس کی مادری زبان تھی۔ فارسی بھی بولتا اور سلجوقوں کی زبان بھی سمجھ اور بول لیتا تھا۔ یہ تُرکی زبان تھی۔ شہسوار تھا۔ تیغ زنی اور تیر اندازی میں خصوصی مہارت رکھتا تھا۔

کوتوال نے اسے آٹھ دس دن اپنے ساتھ رکھا اور تربیت دیتا رہا۔

"ابن الہادی!" ——— کوتوال نے اسے شاہ در روانہ کرنے سے ایک روز پہلے کہا ——— "یہ تو تم جان چکے ہو کہ تم شاہ در جاسوسی کے لئے جا رہے ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم کامیاب لوٹو گے لیکن ایک بار پھر سن لو کہ تمہارا مقصد کیا ہے۔ شک یہ ہے کہ احمد بن غطاش کی کچھ زمین دوز سرگرمیاں ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اسماعیلیوں اور باطنیوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو یہ تم نے دیکھنا ہے کہ اُس کے درپردہ عزائم کیا ہیں۔ کیا یہ عزائم سلطنت کے حق میں ہیں یا احمد سرکشی اور خودمختاری کی طرف بڑھ رہا ہے"۔

"میں آپ تک خبریں کس طرح پہنچایا کروں گا؟" ——— یحییٰ ابن الہادی نے پوچھا۔

"سنان تمہارے ساتھ جا رہا ہے" ——— کوتوال نے اسے بتایا ——— "وہ تمہیں ملتا رہا کرے گا۔ میں تمہیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں ابن الہادی!"

اگلی صبح یحییٰ ابن الہادی اور سنان شاہ در کو روانہ ہو گئے۔

○

احمد بن غطاش کو بتایا جا چکا تھا کہ قافلہ کامیابی سے لُوٹ لیا گیا ہے۔ آٹھ دس دنوں بعد وہ تمام زر و جواہرات' جو قافلے سے ملے تھے' احمد کے حوالے کر دیئے گئے تھے' پھر باقی سامان بھی

تھوڑا تھوڑا اس کو پہنچایا جاتا رہا۔ کسی کو شک تک نہ ہُوا کہ قافلہ والیٔ شاہ در کے کہنے پر لُوٹا گیا تھا۔

"محترم استاد!" ——— ایک روز حسن بن صباح نے احمد بن غطاش سے پُر مسرت لہجے میں کہا ——— "کیا اتنا مال و دولت اور اتنی حسین نوخیز لڑکیاں پہلے بھی آپ کو کسی قافلے سے ملی تھیں؟"

"نہیں حسن!" ——— احمد نے کہا ——— "میں نے اب تک جتنے قافلوں پر حملے کروائے ہیں' ان سب کا لُوٹا ہُوا مال اکٹھا کیا جائے تو لتنا نہیں بنتا جتنا اس ایک قافلے سے حاصل ہُوا ہے" ——— احمد خاموش ہو گیا اور حسن بن صباح کو غور سے دیکھ کر بولا ——— "کیوں حسن! آج تم کچھ زیادہ ہی خوش نظر آ رہے ہو"۔

"ہاں استاد!" ——— حسن نے کہا ——— "میں اس لئے خوش نہیں کہ اس قافلے نے ہمیں مالا مال کر دیا ہے بلکہ میری خوشی کی وجہ یہ ہے کہ میری بتائی ہوئی ترکیب کامیاب رہی ہے.... میں کوئی اور بات کہنے لگا تھا... اس کامیابی کا جشن منانا چاہئے اور اس جشن میں شہر کے لوگوں اور ارد گرد کے لوگوں کو بھی شامل کیا جائے"۔

"کیا لوگوں کو کھانا کھلاؤ گے؟" ——— احمد بن غطاش نے پوچھا ——— "ناچ گانا کراؤ گے؟... جو کچھ بھی کرو گے وہ بعد کی بات ہے پہلے تو سوچنے والی بات یہ ہے کہ لوگوں کو کیا بتاؤ گے کہ یہ کیسا جشن ہے؟"

"بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" ——— حسن نے کہا ——— "جشن تو ہم منائیں گے۔ لوگوں کو کسی اور طریقے سے شامل کرنا ہے۔ وہ اس طرح کہ کم از کم دو دن گھوڑ دوڑ' نیزہ بازی' تیغ زنی' تیر اندازی' کُشتی وغیرہ کے مقابلے کرائیں گے اور جیتنے والوں کو انعام دیں گے... ہم نے جشن تو اپنا منانا ہے لیکن اس سے ایک فائدہ یہ حاصل ہو گا کہ لوگ خوش ہو جائیں گے۔ لوگوں کے ساتھ آپ کا رابطہ بہت ضروری ہے لیکن یہ احتیاط ضروری ہو گی کہ میں لوگوں کے سامنے نہیں آؤں گا یا انہیں اپنا چہرہ نہیں دکھاؤں گا کیونکہ میں نے بعد میں کسی اور روپ میں سامنے آنا ہے۔ ۔ جشن آپ کو ہردلعزیز بنانے کے لئے ضروری ہے"۔

احمد بن غطاش کو یہ تجویز اتنی اچھی لگی کہ اُس نے اُسی وقت جشن کی تفصیلات طے کرنی شروع کر دیں پھر حکم دیا کہ شہر میں اور ارد گرد کے علاقے میں ایک ہی دن میں یہ منادی کرا دی جائے کہ فلاں دن شاہ در میں گھوڑ دوڑ' نیزہ بازی' تیغ زنی' کُشتی وغیرہ کے مقابلے ہوں گے جن میں جو چاہے شریک ہو کر انعام حاصل کر سکتا ہے۔

اس منادی سے شاہ در کے اِرد گرد کے علاقے میں نئی جان پڑ گئی۔ لوگ ایک دو دن پہلے شاہ در پہنچنا شروع ہو گئے۔ شہر کے ارد گرد خیموں کی ایک وسیع و عریض بستی آباد ہو گئی۔ گھوڑوں اور اونٹوں کا ہی کوئی شمار نہ تھا۔

مقابلے کے دن سے ایک دن پہلے خیموں کی بستی اتنی دُور دُور تک پھیل گئی تھی کہ اس کے درمیان شاہ در گاؤں سا لگتا تھا۔ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے حسن بن صباح اپنے استاد اور پیر و مرشد احمد بن غطاش کے ساتھ محل نما مکان کے بالا خانے کی کھڑکی میں کھڑا باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان کی تعداد سینکڑوں نہیں ہزاروں تھی۔

"میرے مُرشد!" —— حسن بن صباح نے احمد سے کہا —— "یہ ہے وہ مخلوقِ خدا جسے ہم نے اپنی مریدی میں لینا ہے۔۔۔ کیا یہ ممکن ہے؟"

"ناممکن بھی نہیں حسن!" —— احمد نے کہا —— "ہمارا کام آسان تو نہیں۔ ہم نے ناممکن کو ممکن کر دکھانا ہے۔ تمہارے ساتھ یہ باتیں پہلے ہو چکی ہیں۔ اگر حکومت ہماری ہوتی تو پھر کوئی مشکل نہیں تھی۔ ہمارے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ حکمران سلجوقی ہیں اور وہ اہلِ سُنّت ہیں۔ ہم تعداد میں تھوڑے ہیں۔ ہم نے ان لوگوں کے دلوں پر قبضہ کرنا ہے۔ تم مجھ سے زیادہ عقلمند ہو۔ اس ہجوم کو دیکھ کر مجھے معلوم ہُوا ہے کہ تمہاری یہ تجویز کتنی قیمتی ہے"۔

"تفریح استادِ محترم!" —— حسن نے کہا —— "انسان کی فطرت تفریح چاہتی ہے۔ انسان حقیقت کا منفور ہے۔ لذت چاہتا ہے۔ آپ استاد ہیں۔ آفتاب ہیں آپ، میں آپ کے سامنے چراغ سے بڑھ کر کیا حیثیت رکھتا ہوں۔ مجھے آپ کا سبق یاد ہے۔ ہر انسان کی ذات میں کمزوریاں ہیں اور ہر انسان اپنی کمزوریوں کا غلام ہے۔ اس ہجوم میں بڑے امیر لوگ بھی ہیں۔ زرپرستی اور برتری ان کی کمزوری ہے اور جو غریب ہیں وہ ایسے خدا کی تلاش میں ہیں جو انہیں بھی امیر بنانے کی قدرت رکھتا ہے"۔

"وہ نہیں یہ خدا ہم دیں گے" —— احمد نے کہا —— "وہ نہیں ہم اپنے عقیدے میں لے آئیں گے"۔

سورج غروب ہو گیا۔ شاہ در اور اس کے ارد گرد خیموں کی دنیا کی گہما گہمی رات کی تاریکی اور سکوت میں دم توڑتی چلی گئی۔ باہر کے لوگ نیند کی آغوش میں مدہوش ہو گئے تو احمد اور حسن کی دنیا کی رونق عروج پر پہنچ گئی۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ نیک و بد کی تمیز ختم ہو چکی تھی۔

صبح طلوع ہوئی تو ہزارہا انسانوں کا انبوہِ بے کراں اس میدان کے ارد گرد جمع ہو گیا جس میدان میں مختلف مقابلے منعقد ہونے تھے۔ یہ بہت ہی وسیع و عریض میدان تھا۔ مقابلے میں شرکت کرنے والوں کو منتظمین نے الگ جگہ دے دی تھی۔ اس طرف کسی تماشائی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

احمد بن غطاش کے بیٹھنے کی جگہ ایک چبوترے پر تھی جو اسی مقصد کے لئے بنایا گیا تھا۔ شاہی مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام بھی اسی چبوترے پر تھا۔ اس پر بڑا ہی خوبصورت شامیانہ تنا ہُوا تھا۔ برچھی بردار سنتری اور چوب دار چمکیلے اور رنگ دار لباس میں چبوترے کے نیچے اور اوپر چاک و چوبند کھڑے تھے۔ ہر لحاظ سے یہ اہتمام شاہانہ لگتا تھا۔ روم کے شہنشاہوں کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔

اچانک دو نقارے بجنے لگے۔ ایک طرف سے احمد بن غطاش شاہی مہمانوں، اپنے خاندان کے افراد اور مصاحبوں کے جلوس میں شاہانہ چال چلتا آیا۔ اُس کے ساتھ ایک باریش آدمی تھا جو سراپا ہلکے سبز رنگ کی عبا میں ملبوس تھا۔ اُس کا چہرہ پوری طرح نظر نہیں آتا تھا کیونکہ اُس نے سر پر جو کپڑا لے رکھا تھا اس کپڑے نے اس کا آدھا چہرہ اس طرح ڈھکا ہُوا تھا کہ اس کی آنکھیں اور ناک ہی نظر آتی تھی۔ وہ حسن بن صباح تھا جس نے اپنے آپ کو لوگوں سے مستور رکھا تھا۔

احمد بن غطاش حسن بن صباح کے ساتھ یوں چل رہا تھا جیسے حسن بن صباح کوئی بہت ہی معزز اور برگزیدہ بزرگ ہو۔ یہ سب لوگ چبوترے پر آ کر اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ احمد بن غطاش اُٹھا اور چبوترے پر دو چار قدم آگے آیا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" —— اُس نے بڑی ہی بلند آواز سے کہا —— "میں نے ان مقابلوں کا اہتمام اس لئے کر دیا ہے کہ اسلام کی پاسبانی کے لئے قوم کے ہر فرد کا مجاہد بننا لازمی ہے۔ جہاد کے لئے تیاری کرتے رہنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ہم میں کتنے لوگ جہاد میں دشمن کو تہِ تیغ کرنے کے قابل ہیں"۔

اُس نے ہاتھ بلند کر کے نیچے کیا جو اشارہ تھا کہ مقابلے شروع کر دیئے جائیں۔

گھوڑ دوڑ شروع ہو گئی۔ لوگوں نے داد و تحسین کا شور و غل بپا کر دیا۔

اس کے بعد گھوڑ سواری کے کرتبوں کے مقابلے ہوئے اور اس کے بعد شتر سوار میدان میں اترے۔ جب اونٹوں کی دوڑ ختم ہو گئی تو اعلان ہُوا کہ اب تیر اندازی کا مقابلہ ہو گا۔ اس

اعلان کے ساتھ ہی چار آدمی ایک بہت بڑا پنجرہ اٹھائے ہوئے میدان میں آئے۔ پنجرے میں ڈیڑھ دو سو کبوتر بند تھے۔ ایک آدمی نے اعلان کیا کہ ایک کبوتر اُڑایا جائے گا اور ایک تیرانداز اس کبوتر کو تیر سے گرائے گا۔ یہ بھی کہا گیا کہ کوئی تیرانداز پہلے تیر سے کبوتر کو نہ گرا سکے تو وہ دوسرا اور پھر تیسرا تیر بھی چلا سکتا ہے۔ اوّل انعام ان تیراندازوں کو دیئے جائیں گے جو پہلے ہی تیر سے کبوتر کو نشانہ بنا لیں گے۔

کم و بیش ایک سو تیرانداز ایک طرف کھڑے تھے۔ پہلے تیرانداز کو بلایا گیا۔ پنجرے میں سے ایک کبوتر نکال کر اوپر کو پھینکا گیا۔ تیرانداز نے کمان میں تیر ڈالا اور جب کبوتر ذرا بلندی پر گیا تو اُس نے تیر چلایا لیکن کبوتر تیر کے راستے سے ہٹ گیا تھا۔ تیرانداز نے بڑی پھرتی سے ترکش سے دوسرا تیر نکال کر کمان میں ڈالا اور کبوتر پر چلایا۔ وہ بھی خطا گیا۔ تیسرا تیر بھی کبوتر کے دور سے گزر گیا۔

ایک اور تیرانداز کو بلایا گیا۔ میدان کے وسط میں کھڑے ہو کر اس نے کمان میں تیر ڈالا اور تیار ہو گیا۔ پنجرے سے ایک کبوتر نکال کر اوپر کو چھوڑا گیا۔ یہ تیرانداز بھی کبوتر کو نہ گرا سکا۔

دس بارہ تیرانداز آئے۔ کوئی ایک بھی کبوتر کو نہ گرا سکا۔ اگر پرندہ سیدھی اُڑان میں اُڑا آئے تو ماہر تیرانداز اسے نشانہ بنا سکتا ہے لیکن جو کبوتر پنجرے سے نکلتا تھا وہ اتنا ڈرا ہُوا ہوتا تھا کہ بلندی پر بھی جاتا تھا اور بڑی تیزی سے دائیں اور بائیں بھی ہوتا تھا۔ اُس کی اُڑان کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اب یہ کس طرف گھوم جائے گا۔ ایسے پرندے کو تیر سے مارنا بہت ہی مشکل تھا۔

ایک اور تیرانداز آگے آیا اور ایک کبوتر اُس کے لئے چھوڑا گیا۔ اس تیرانداز نے بھی یکے بعد دیگرے تین تیر چلائے مگر تینوں خطا گئے۔ لوگوں نے شور و غل بلند کیا۔ تیر اوپر جاتے اور گرتے صاف نظر آتے تھے۔ یہ کبوتر تین تیروں سے بچ گیا اور تماشائیوں کے اوپر ایک چکر میں اُڑتا بلند ہوتا جا رہا تھا۔ ایک اور تیرانداز میدان میں آ رہا تھا۔

تماشائی ابھی اوپر اس کبوتر کو دیکھ رہے تھے جو تین تیروں سے بچ کر محوِ پرواز تھا۔ احمد بن غطاش کے چبوترے کے قریب جو تماشائی کھڑے تھے ان میں سے ایک کی کمان میں سے تیر نکلا جو کبوتر کے پیٹ میں اتر گیا اور کبوتر پھڑپھڑاتا ہُوا نیچے آنے لگا۔ تماشائیوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ ان کی حیرت قدرتی تھی۔ کبوتر زیادہ بلندی پر چلا گیا تھا اور ابھی تک گھبراہٹ کے عالم میں یوں اُڑ رہا تھا جیسے پھڑپھڑا رہا ہو۔

"یہ تیرانداز کون ہے؟" — احمد بن غطاش نے اٹھ کر اور چبوترے پر آگے آ کر کہا — "سامنے آؤ — خدا کی قسم مَیں اس تیرانداز کو اپنے ساتھ رکھوں گا"۔

ایک گھوڑ سوار تماشائیوں میں سے نکلا اور چبوترے کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ اُس کے ہاتھ میں کمان تھی اور کندھے کے پیچھے ترکش بندھی ہوئی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" — احمد بن غطاش نے اُس سے پوچھا — "کہاں سے آئے ہو؟ کیا تم شاہدر کے رہنے والے ہو؟"

"میرا نام یحییٰ ابن الہادی ہے" — تیرانداز نے جواب دیا — "بہت دُور سے آیا ہوں اور بہت دُور جا رہا ہوں۔ یہاں کچھ دیر کے لئے رُکا تھا۔ لوگوں کا ہجوم دیکھا تو ادھر آ گیا۔ اگر اجازت ہو تو میں دوڑتے گھوڑے سے تیراندازی کا مظاہرہ کر سکتا ہوں۔ میں دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا کہ آپ کو کچھ بہتر تماشا دکھا سکوں"۔

"اجازت ہے" — احمد بن غطاش نے کہا۔

یحییٰ ابن الہادی نے گھوڑے کو دوڑایا اور میدان میں لے جا کر کہا کہ جب اس کا گھوڑا دوڑنے لگے تو ایک کبوتر چھوڑ دیا جائے۔ وہ گھوڑے کو ایک طرف لے گیا اور گھوڑا دوڑا دیا۔ پنجرے سے ایک کبوتر نکال کر چھوڑ دیا گیا۔ یحییٰ نے دوڑتے گھوڑے پر ترکش سے ایک تیر کمان میں ڈالا اور کبوتر کو نشانے میں لینے لگا۔ آخر اس کی کمان سے تیر نکلا جو کبوتر کے ایک پر کو کاٹتا ہُوا اوپر چلا گیا اور کبوتر پھڑپھڑاتا ہُوا نیچے آ پڑا۔

"آفرین!" — احمد بن غطاش نے اٹھ کر بے ساختہ کہا — "میں تمہیں آگے نہیں جانے دوں گا۔ شاہدر تمہاری منزل ہے"۔

"ایک خالی اونٹ میدان میں دوڑا دیا جائے" — یحییٰ نے بلند آواز سے کہا اور اُس نے گھوڑے کو روک لیا۔

ایک قوی ہیکل اونٹ کو میدان کے ایک سرے پر لا کر پیچھے سے مارا پیٹا گیا۔ اونٹ ڈر کر دوڑ پڑا۔ تین چار آدمی اس کے پیچھے پیچھے دوڑے تاکہ اس کی رفتار تیز ہو جائے۔ یحییٰ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور گھوڑے کو گھما پھرا کر اونٹ کے پہلو کے ساتھ کر لیا۔ گھوڑے کو اپنے ساتھ دوڑتا دیکھ کر اونٹ اور تیز ہو گیا۔ اونٹ کی پیٹھ پر کجاوا کسا ہُوا تھا جو ایک آدمی کی سواری کے لئے تھا۔ اس کی مہار زین کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ یحییٰ نے رکابوں سے پاؤں نکالے اور دوڑتے گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑا ہو گیا۔ وہاں سے اچھلا اور اونٹ کی پیٹھ پر پہنچ

گیا۔ اُس نے اونٹ کی مہار پکڑ لی۔ گھوڑا اونٹ سے الگ ہو گیا تھا۔ یحییٰ اونٹ کو گھوڑے کے پہلو میں لے گیا اور اونٹ کی پیٹھ سے کود کر گھوڑے کی پیٹھ پر آ گیا۔ اُس نے یہ کرتب دکھلانے سے پہلے اپنی کمان پھینک دی تھی۔ اُس نے گھوڑے کو موڑا اور چبوترے کے سامنے جا رکا۔

یہ وہی یحییٰ ابن الہادی تھا جسے سلطان ملک شاہ کے کوتوال نے جاسوسی کے لئے شاہ در بھیجا تھا۔ وہ دو روز پہلے شاہ در پہنچا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اپنا کام کس طرح شروع کرے۔ ان ہی دنوں مقابلوں کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا۔ پھر مقابلے کا دن آ گیا اور وہ تماشائیوں میں جا کھڑا ہوا۔ اُس نے جب اُڑتے کبوتروں پر تیر چلتے اور خطا ہوتے دیکھے تو اس نے سامنے آئے بغیر ایک کبوتر پر تیر چلا دیا۔ اس طرح اس کا رابطہ براہِ راست احمد بن غطاش سے ہو گیا۔ موقع بہتر جان کر اُس نے گھوڑ سواری کا کرتب بھی دکھا دیا۔

○

ایک ایک تیر انداز آ کے آتا رہا، اُڑتے کبوتروں پر تیر چلتے رہے، کوئی ایک بھی تیر انداز کبوتر کو نشانہ نہ بنا سکا۔ یحییٰ ابن الہادی کی شکل و شباہت، قد کاٹھ، جسم کی ساخت، ڈیل ڈول اور انداز ایسا تھا کہ احمد بن غطاش نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے حسن بن صباح سے کہا کہ یہ جوان سال گھوڑ سوار کوئی معمولی آدمی نہیں لگتا۔

"اگر یہ مان جائے تو میں اسے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں" — احمد بن غطاش نے حسن سے کہا — "ہمیں اس قسم کے آدمیوں کی ضرورت ہے"۔

"پوچھ لیں" — حسن نے کہا — "لگتا تو مسلمان ہے۔ معلوم نہیں کون سے قبیلے اور کس فرقے کا آدمی ہے"۔

احمد بن غطاش نے ایک چوبدار کو بھیج کر یحییٰ کو بلایا۔ یحییٰ آیا تو احمد نے اسے چبوترے پر بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ یحییٰ کا گھوڑا ایک چوبدار نے پکڑ لیا تھا۔ میدان میں مختلف مقابلے یکے بعد دیگرے ہو رہے تھے۔ لیکن احمد کی توجہ اُدھر سے ہٹ گئی تھی۔ وہ یحییٰ کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ پہلا اور قدرتی سوال یہ تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں جا رہا ہے۔

"اپنی منزل کا مجھے کچھ پتہ نہیں" — یحییٰ نے کہا — "شاید میں بھٹک گیا ہوں"۔

"کیا تم بات صاف نہیں کرو گے؟" — احمد بن غطاش نے کہا — "مجھے تمہاری بات میں دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ کیا تم کچھ دن میرے مہمان رہنا پسند کرو گے؟"

"رک جاؤں گا" — یحییٰ نے جواب دیا — "اگر میری روح کو یہاں تسکین مل گئی تو اسی

شہر کو اپنا ٹھکانہ بنا لوں گا... لیکن آپ مجھے یہاں روک کر کریں گے کیا؟"

"میں چاہتا ہوں کہ لوگ تم سے تیر اندازی سیکھیں" — احمد نے کہا — "اور تم یہاں ایک محافظ دستہ تیار کرو۔ یہ دستہ گھوڑ سوار ہو گا۔ تم نے ہر ایک محافظ کو شہسوار بنانا ہے"۔

"کیا آپ اپنی فوج تیار کرنا چاہتے ہیں؟" — یحییٰ نے پوچھا۔

یحییٰ نے یہ سوال جاسوس کی حیثیت سے کیا تھا۔ اُسے پوری طرح اندازہ نہیں تھا کہ اس کا سامنا کس قدر گھاگ اور کلیاں آدمی سے ہے۔

"اپنی فوج!" — احمد بن غطاش نے چونک کر کہا — "میں اپنی فوج نہیں بنا سکتا۔ میں تو یہاں کا والی ہوں۔ فوج تیار کرنا سلطان کا کام ہے۔ میں یہاں لوگوں کو جہاد کے لئے تیار کرنا چاہتا ہوں۔ تم نے دیکھا ہے کہ یہاں ایک بھی ایسا تیر انداز نہیں جو اُڑتے کبوتر کو نشانہ بنا سکے۔ گھوڑ سواری میں یہ لوگ اتنے ماہر نہیں جتنا انہیں ہونا چاہئے۔ اگر میں ایک دستے کی صورت میں کچھ لوگوں کو تیار کر لوں گا تو وہ سلطان کے ہی کام آئیں گے... تم یقیناً اہلِ سُنّت والجماعت ہو!"

"میں مسلمان ہوں" — یحییٰ نے کہا — "لیکن میں عقیدوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا ہوں۔ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا ہوں کہ کون سا عقیدہ خدا کا اُتارا ہوا ہے اور کون سا انسانوں نے خود گھڑ لیا ہے۔ کبھی کہتا ہوں کہ اسماعیلی صحیح راستے پر جا رہے ہیں اور پھر خیال آتا ہے کہ اہلِ سُنّت صراطِ مستقیم پر ہیں... میں تو مرد میدان تھا۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے لیکن دماغ میں ان سوالوں نے سر اٹھا لیا اور مجھے منزل منزل کا بھٹکا ہوا مسافر بنا ڈالا۔ میری روح تشنہ اور بے چین ہے"۔

احمد نے حسن بن صباح کی طرف دیکھا جس کا آدھا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ حسن بن صباح نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ کہہ دیا۔

"ہم تمہیں بھٹکنے نہیں دیں گے یحییٰ!" — احمد نے کہا — "خدا نے ہم پر یہ کرم کیا ہے کہ یہ بزرگ ہستی ہمیں عنایت کی ہے۔ یہ دینی علوم کے بہت بڑے عالم ہیں۔ میں ان سے درخواست کروں گا کہ یہ تمہیں اپنی شاگردی میں بٹھا لیں اور تمہارے شکوک و شبہات رفع کر دیں۔ مجھے امید ہے کہ تمہاری روح کی تشنگی ختم ہو جائے گی"۔

"اے بھٹکے ہوئے مسافر!" — حسن بن صباح نے کہا — "مرد میدان ہو، تمہیں علم اور خصوصاً دینی علم کے جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہئے۔ اپنی صلاحیتیں ضائع نہ کرو۔ ہم تمہیں اپنے پاس بٹھائیں گے۔ کچھ روشنی دکھائیں گے اور تمہاری تسکین کر دیں گے"۔

تیغ زنی وغیرہ کے مقابلے ہو رہے تھے۔ تماشائیوں نے بے ہنگم شور و غوغا بپا کر رکھا تھا۔ میدان سے اتنی گرد اڑ رہی تھی کہ مقابلہ کرنے والے اچھی طرح نظر بھی نہیں آتے تھے۔

دوپہر کے بعد کا وقت ہو گیا تھا۔ احمد بن غطاش نے اعلان کروایا کہ باقی مقابلے کل صبح ہوں گے اور جو لوگ اس وقت تک مقابلوں میں کامیاب رہے ہیں انہیں مقابلے ختم ہونے کے بعد انعامات دیئے جائیں گے۔

احمد بن غطاش اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہی مہمان وغیرہ بھی اٹھے اور وہ سب چلے گئے۔ احمد نے یحییٰ کو اپنے ساتھ رکھا۔ گھر لے جا کر اس کا منہ ہاتھ دھلوایا اور پھر وہ دسترخوان پر جا بیٹھے۔ کھانے کے دوران بھی ان کے درمیان باتیں ہوتی رہیں۔ یحییٰ نے اپنے متعلق یہ تاثر دیا کہ وہ اپنے قبیلے کے سردار خاندان کا فرد ہے اور اس کا اثر و رسوخ صرف اپنے قبیلے پر ہی نہیں بلکہ دوسرے قبیلے بھی اس کے خاندان کے رعب و دبدبے کو مانتے ہیں۔

یہ بڑا ہی اچھا اتفاق تھا کہ یحییٰ انہی لوگوں میں پہنچ گیا تھا جن کے متعلق اس نے معلوم کرنا تھا کہ ان کے اصل چہرے کیا ہیں اور کیا انہوں نے کوئی بہروپ تو نہیں چڑھا رکھا؟... اب یہ اس کی ذہانت اور تجربے کا امتحان تھا کہ وہ ان لوگوں سے کس طرح راز کی باتیں اگلوا سکتا ہے۔

چونکہ احمد بن غطاش حاکم تھا اس لئے اسے اپنے متعلق یہ جتانا ضروری تھا کہ وہ سرداری کی سطح کا آدمی ہے اور دو چار قبیلوں پر اس کا اثر و رسوخ کام کرتا ہے۔ اس نے ان کے سامنے اپنی ایک مصنوعی کمزوری بھی رکھ دی تھی کہ وہ دینی علوم کے راز حاصل کرنے کے لئے بھٹکتا پھر رہا ہے۔

○

"تم آج بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو" — احمد بن غطاش نے کھانے کے کچھ دیر بعد یحییٰ سے کہا — "تمہارے لئے اسی مکان میں رہائش کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ شام کا کھانا وہیں پہنچے گا۔ آج آرام کر لو۔ کل کام کی باتیں ہوں گی"۔

"مسلسل سفر میں ہوں" — یحییٰ نے کہا — "آپ نے ٹھیک جانا ہے۔ میں بہت ہی تھکا ہوا ہوں.... ایک درخواست ہے۔ میرا ملازم بھی میرے ساتھ ہے۔ اگر اس کی رہائش کا بھی انتظام ہو جائے..."

"ہو جائے گا" — احمد نے کہا — "اسے یہیں لے آؤ"۔

جسے یحییٰ نے اپنا نوکر کہا تھا وہ بنان تھا۔ سنان کو اس کام کے لئے اپنے ساتھ لایا تھا کہ کوئی ضروری اطلاع وغیرہ ہو گی تو وہ سنان لے کر موجائے گا۔

ایک ملازم کو بلا کر یحییٰ کو اس کے ساتھ اس کے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ یحییٰ کمرہ دیکھ کر حیران رہ گیا وہ تو شاہانہ کمرہ تھا۔ یحییٰ بہت خوش تھا کہ وہ ٹھیک ٹھکانے پر پہنچ گیا ہے اور وہ چند دنوں میں اپنا کام مکمل کر لے گا۔

"اب بتاؤ حسن!" — احمد بن غطاش نے یحییٰ کے جانے کے بعد حسن بن صباح سے پوچھا — "اس شخص کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ ایک تو ہم اس سے یہ فائدہ اٹھائیں گے کہ ہمیں تیر انداز اور شہ سوار تیار کر دے گا۔ ہم نے قلعہ الموت تک جتنے قلعہ نما شہر سامنے آتے ہیں انہیں اپنے قبضے میں لینا ہے۔ یہ ہمیں لڑ کر ہی لینے پڑیں گے۔ اس کے لئے ہمیں جانباز فوج کی ضرورت ہے۔ اس کی نفری چاہے تھوڑی ہی ہو۔ یہ شخص خاصا عقل مند لگتا ہے۔ دو تین قبیلوں پر بھی اس کا اثر و رسوخ ہے۔ اسے اگر ہم اپنے سانچے میں ڈھال لیں تو یہ بڑے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا ہے"۔

"ہاں استادِ محترم!" — حسن بن صباح نے کہا — "آدمی تو کام کا لگتا ہے لیکن ہمیں اس پر نظر رکھنی پڑے گی کہ یہ قابلِ اعتماد بھی ہے یا نہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ ہم اسے راز کی باتیں بتانی شروع کر دیں۔ جیسا کہ یہ کہتا ہے کہ یہ منزل منزل کا مسافر ہے' یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کسی روز ہمیں بتائے بغیر غائب ہی ہو جائے۔ احتیاط لازمی ہے"۔

صورت یہ پیدا ہو گئی کہ جو جاسوس بن کر آیا تھا' اس کی بھی درپردہ جاسوسی ہونے لگی۔ صبح اسے کمرے میں ہی ناشتہ دیا گیا اور ناشتے کے بعد ایک چوبدار اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ ایک کمرے میں حسن بن صباح اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس کے اشارے پر یحییٰ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"اب بات کرو یحییٰ!" — حسن نے کہا — "کیا وہم ہے کیا مسئلہ ہے جو تم اپنے دماغ میں لئے پھرتے ہو؟"

"کیا میں خدا کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر جا رہا ہوں؟" — یحییٰ نے پوچھا — "کیا میرا عقیدہ صحیح ہے؟"

"یہ بات نہیں یحییٰ!" — حسن نے کہا — "اصل سوال جو تمہارے دماغ میں تڑپ رہا ہے اور تمہارے لئے بے چینی کا باعث بنا ہوا ہے وہ یہ ہے کیا خدا کا وجود ہے؟ اگر ہے تو خدا کہاں ہے؟... خدا نظر ہی نہیں آتا تو یہ راستہ اور یہ عقیدہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟"

حسن بن صباح یحییٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس طرح بات کر رہا تھا جیسے ندی کا

شفاف پانی پتھروں پر آہستہ آہستہ جل ترنگ بجاتا بہا جا رہا ہو۔ حسن کے ہونٹوں پر روح افزا مسکراہٹ تھی۔ یحییٰ کے ذہن میں ایسا کوئی سوال نہیں تھا۔ وہ تو ان لوگوں کی اصلیت معلوم کرنے کی کوشش میں تھا۔ اسے توقع تھی کہ احمد بن غطاش اسماعیلی ہُوا تو اس کے سوال سن کر یہ لوگ اس کے ذہن میں اسماعیلیت ٹھونسنی شروع کر دیں گے لیکن اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے دشمن نے اسے تہہِ تیغ کر کے نہتا کر دیا ہو حالانکہ حسن بن صباح نے اپنی بات ابھی شروع ہی کی تھی۔

"خدا وہ نہیں جو انسان کو نظر آتا ہے" — حسن کہہ رہا تھا — "نظر آنے والا خدا ایک نہیں، کئی ایک ہیں اور یہ سب انسان کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے خدا ہیں۔ کسی نے پتھر کو تراش کر خدا کو آدمی کی شکل دے دی، کسی نے خدا کو عورت بنا دیا، کسی نے شیر، کسی نے سانپ اور کسی نے دھڑ جانور کا اور چہرہ انسان کا بنا دیا۔ بات یہ سمجھنے والی ہے یحییٰ! خدا انسان کی تخلیق نہیں بلکہ انسان خدا کی تخلیق ہے اور انسان کا ہر قول اور فعل خدا کے حکم کا پابند ہے۔ یہ صراطِ مستقیم ہی ہے کہ تم یہاں پہنچ گئے ہو۔ یہاں تمہارے سارے شکوک صاف ہو جائیں گے لیکن یہ ایک دن کا معاملہ نہیں۔ کچھ دن لگیں گے۔ تم اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔ انسان وہی کامل بنتا ہے جو اپنے آپ کو کسی کامل پیرو مرشد کے حوالے کر دیتا ہے"۔

"قابلِ تعظیم بزرگ!" — یحییٰ نے التجا کی — "مجھے اپنی مریدی اور شاگردی میں قبول فرما لیں"۔

"دین کی تبلیغ میرا فرض ہے" — حسن نے کہا — "میں تمہیں تمہارے متعلق ایک بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ تم مردِ میدان ہو۔ خدا تمہیں منزل پر لے آیا ہے۔ تم نے لوگوں کو اپنے جیسا تیر انداز اور شہسوار بنانا ہے۔ انہیں کفر کے خلاف جہاد کے لئے تیار کرنا ہے۔ میں عالم ہوں، تم عامل ہو۔ خدا کی نگاہ میں تمہارا رتبہ مجھ سے زیادہ بلند ہے۔ یہاں سے جانے کی نہ سوچنا"۔

یحییٰ ابن الہادی تو چاہتا ہی یہی تھا۔ وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اُس کی ذاتِ باری نے اُس کا کام بہت ہی آسان کر دیا تھا اور اُس کے آگے آگے راستہ صاف ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اُس کے ساتھی سنان کی رہائش وغیرہ کا انتظام کہیں اور کیا گیا تھا۔ اُس نے سنان کو بلا کر

اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا کہ اُس سے کوئی پوچھے کہ وہ کہاں سے آئے ہیں تو وہ کیا جواب دے اور وہ سیدھا سادا بلکہ بیوقوف سا نوکر بنا رہے جو معمولی سی بات سمجھنے میں بھی بہت وقت لگاتا ہے۔

○

کچھ دیر بعد یحییٰ احمد بن غطاش کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ اُسے احمد نے بلایا تھا۔ وہاں چار لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ چاروں نوجوان تھیں اور ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت۔ وہ بہت ہی شوخ اور چنچل تھیں۔ ایک دوسری کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ یحییٰ کی موجودگی کا انہیں جیسے احساس ہی نہیں تھا۔

"یحییٰ!" — احمد بن غطاش یحییٰ سے کہہ رہا تھا — "تم خوش قسمت ہو کہ اتنے بڑے عالمِ دین نے تم پر کرم کیا ہے کہ تمہیں اپنی مریدی میں قبول کر لیا ہے اور تمہیں کہا ہے کہ یہیں رہو اور تیر اندازی اور شہسواری کا ہنر جو تم میں ہے وہ دوسروں کو بھی سکھا دو.... یہ تو کسی کے ساتھ بات ہی نہیں کرتے۔ خدا کی یاد میں ڈوبے رہتے ہیں اور خدا سے ہی ہمکلام ہوتے ہیں"۔

"ہر حکم بجا لاؤں گا" — یحییٰ نے کہا — "اُن آدمیوں کو میرے حوالے کر دیں جنہیں میں نے سکھلائی دینی ہے"۔

"بسم اللہ ان لڑکیوں سے کرو" — احمد نے کہا — "یہ میرے خاندان کی لڑکیاں ہیں۔ یہ جب تیر اندازی میں تم جیسی مہارت حاصل کر لیں گی تو دوسری لڑکیوں کی سکھلائی کریں گی۔ ہماری عورتوں کو تیر انداز ہونا چاہئے، پھر انہیں گھوڑ سواری کی مشق کرانی ہے.... میں تمہاری باقاعدہ تنخواہ مقرر کر دوں گا"۔

"میں آج ہی یہ کام شروع کر دوں گا" — یحییٰ نے کہا — "مجھے تیر اندازی کے لئے ایسی جگہ دکھا دیں جہاں سامنے تیروں کے لئے رکاوٹ ہو ورنہ تیر ہر طرف اُڑتے پھریں گے اور راہ چلتے لوگ زخمی ہوں گے"۔

احمد بن غطاش کے حکم سے سارے انتظامات کر دیئے گئے اور یحییٰ چاروں لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ دو کمانیں اور تیروں کا ایک ذخیرہ بھی ساتھ گیا تھا۔ یحییٰ نے لڑکیوں کی سکھلائی شروع کر دی۔ پہلے دن وہ انہیں کمان کھینچنا اور بازوؤں کو سیدھا رکھنا سکھاتا رہا۔ کمانیں بہت سخت تھیں۔ لڑکیاں کمان کھینچتی تھیں تو ان کے دونوں بازو کانپتے تھے۔ یحییٰ انہیں بتا رہا تھا کہ بازوؤں کو اپنے قابو میں کس طرح رکھنا ہے کہ ان میں لرزہ پیدا نہ ہو۔

اُدھر میدان میں کشتیوں اور دو ڈلوں وغیرہ کے مقابلے ہو رہے تھے۔ احمد بن غطاش اور حسن بن صباح وہاں چلے گئے تھے۔ وہ دونوں بہت خوش تھے کہ انہوں نے اتنے زیادہ لوگ اکٹھے کر لئے تھے۔ وہ کھیل تماشوں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے تھے، بلکہ وہ اپنے اس منصوبے پر گفتگو کر رہے تھے کہ اس مخلوقِ خدا کو اپنے عزائم میں استعمال کرنا ہے۔

ان چار لڑکیوں میں جو یحییٰ ابن الہادی سے تیر اندازی سیکھنے گئی تھیں، داستان گو دو کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہے۔ ایک تھی فرح جو حسن بن صباح کی محبت سے مجبور ہو کر اس کے ساتھ گئی تھی۔ دوسری زرّیں تھی جس نے شاہ در کے مرحوم والی ذاکر کو اپنے حسن و جوانی اور بھولپن کے جال میں پھانسا اور اسے دھوکے سے شربت میں زہر ملا ملا کر ایسی بیماری میں مبتلا کر دیا تھا کہ کچھ دنوں بعد ذاکر مر گیا۔ طبیب سر پٹختے رہ گئے تھے کہ ذاکر کی بیماری کیا تھی۔

زرّیں غیر معمولی طور پر حسین اور نوجوان لڑکی تھی۔ احمد بن غطاش نے اُس کی تربیت ایسی کی تھی کہ تجربہ کار اور معمر استاد بھی اُس کے ہاتھوں میں عقل و ہوش سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ یحییٰ خاص طور پر خوبرو اور پُرکشش جوان تھا اور اس نے تیر اندازی اور گھوڑ سواری کے جو کرتب دکھلائے تھے، ان سے اس نے لوگوں سے بے ساختہ داد و تحسین حاصل کی تھی اور کچھ دلوں میں اس نے ہلچل بپا کر دی تھی۔ اُس زمانے میں مرد ایسے ہی اوصاف اور کمالات سے باعزت اور قابلِ محبت سمجھے جاتے تھے۔

زرّیں نے اپنے استاد سے فریب کاری سیکھی تھی اور یہ مفروضہ اُس کا عقیدہ بن گیا تھا کہ عورت کا حُسن مردوں کو فریب دینے کے لئے ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ احمد نے اُس کے دل سے جذبات نکال دیئے تھے۔ وہ دانش مند تھا، خوب جانتا تھا کہ عورت ہو یا مرد، دونوں میں سے کوئی بھی جذبات میں الجھ جائے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔

”صرف یہ راز اپنے دل میں بند کر لو زرّیں!“ ___ احمد بن غطاش نے اُسے کئی بار کہا تھا ___ ”تم ایک ایسا حسین بلکہ طلسماتی پھندہ ہو جس میں انتہائی زہریلا ناگ بھی آجائے گا اور جانداروں کو چیر پھاڑ دینے والا درندہ بھی تمہارے پھندے میں آکر تمہارا غلام ہو جائے گا۔ تم نے اس کے لئے ایسا حسین فریب بنے رہنا ہے کہ وہ تمہاری فریب کاری کو بھی تمہارے حُسن کا حصہ سمجھے۔ اُسے یہ تاثر دیئے رکھو کہ تم اُس کی محبوبہ ہو اور تم اُسے خدا کے بعد کا درجہ دیتی ہو اور پھر عملی طور پر ایسے مظاہرے کرتی رہو جیسے تم اُس کے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ اُس کے جذبات کے ساتھ کھیلو اور ناز و انداز کے علاوہ اُس کے قدموں میں یوں لوٹ پوٹ ہوتی

رہو جیسے تم اس کی زر خرید لونڈی ہو۔ اس طرح اُس پر اپنے حسن و جوانی اور فریب کاری کا نشہ طاری کر کے اُس کی کھال اتارتی رہو اور اُس کا خون چوستی رہو“۔

یہ ایک بنیادی سبق تھا جو احمد لڑکپن کے پہلے دن سے زرّیں کو دیتا چلا آیا تھا لیکن اس نے اُسے یہ سبق وعظ کی صورت میں ہی نہیں دیا تھا بلکہ عملی طور پر بھی اسے سمجھایا تھا۔ اُس کے پاس ذرا بڑی عمر کی تین چار عورتیں تھیں جنہوں نے زرّیں کو اس سبق کے عملی مظاہرے کر کے دکھلائے تھے۔ ان عورتوں نے زرّیں کو بڑا ہی حسین اور روشنی میں رنگا رنگ شعاعیں دینے والا پتھر یا ہیرا بتا دیا تھا۔ اسے ایسا ہی ایک خوبصورت ہیرا دکھایا بھی گیا تھا۔

”یہ ہیرا دیکھ رہی ہو زرّیں!“ ___ اسے ہیرا دکھا کر کہا گیا تھا ___ ”کیا تم نہیں چاہو گی کہ یہ ہیرا تمہارے گلے کی یا انگلی کی زینت بنے؟“

”کیوں نہیں چاہوں گی!“ ___ زرّیں نے کہا تھا۔

”اگر تمہیں اس کی قیمت بتائی جائے تو تمہارے ہوش اُڑ جائیں“ ___ اُسے کہا گیا تھا ___ ”ایسے ایک ایک ہیرے پر بادشاہوں کے تختے اُلٹے ہیں لیکن اس اتنے دلکش اور قیمتی ہیرے کو تم نگل لو تو مر جاؤ گی۔ یہ اس ہیرے کے زہر کا اثر ہو گا.... تم نے یہ ہیرا بننا ہے۔ تمہیں کوئی جنگجو اور جابر بادشاہ بھی دیکھے تو وہ تمہیں حاصل کر لینے کے لئے اپنی بادشاہی کو بھی بازی پر لگا دے لیکن جو تمہیں نگل لے یعنی تمہیں زیر کر کے تم پر قبضہ کر لے وہ زندہ نہ رہے“۔

داستان گو آگے چل کر وہ واقعات سنائے گا جو ثابت کریں گے کہ عورت کتنی بڑی قوت ہے، کتنا زبردست جادو اور کیا طلسم ہے۔ حسن بن صباح کی کامیابی کا جو راز تھا اس راز کا نام عورت ہے۔ حسین عورت جسے چاہے قتل کروا سکتی ہے اور جسے چاہے اسے زندہ لاش بنا سکتی ہے۔ عورت قاتل کو تختہ دار سے بھی اتروا سکتی ہے۔

زرّیں کی ذات میں یہ سارا زہر بھر دیا گیا تھا۔ اس نے اپنا پہلا شکار بڑی کامیابی سے مار لیا تھا۔ وہ ذاکر تھا۔ کامیابی صرف یہی نہیں تھی کہ اس قلعہ نما شہر کا والی مر گیا تھا بلکہ زرّیں نے شاہ در جیسا شہر اپنے استاد احمد بن غطاش کی جھولی میں ڈال دیا تھا، پھر یہ احمد کی فریب کاری کا کمال تھا کہ سلجوقی سلطان نے اُسے اس قلعے کا والی مقرر کر دیا تھا۔

زرّیں اس کامیابی پر بہت خوش تھی اور وہ اگلے شکار کے انتظار میں تھی لیکن اُس نے یحییٰ ابن الہادی کو دیکھا تو اُس نے اپنے آپ میں کچھ ایسی ہلچل محسوس کی جسے وہ سمجھ نہ سکی۔ اُس کا دل چاہنے لگا کہ وہ یحییٰ کے پاس بیٹھ کر اُس سے پوچھے کہ اُسے دیکھ کر اُس کے اندر بھونچال کے

جو ہلکے ہلکے اور لطیف سے جو جھٹکے محسوس ہوتے ہیں یہ کیا ہیں۔

یحیٰی میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ خوش طبع آدمی تھا۔ کسی بات میں تلخی ہوتی تو اس بات میں بھی وہ شگفتگی پیدا کر لیا کرتا تھا۔ چاروں لڑکیاں اُس کی اس زندہ مزاجی کو اتنا پسند کرتی تھیں کہ اُسے اُکساتی تھیں کہ وہ باتیں کرے۔ یحیٰی بھی ان لڑکیوں کو باتوں باتوں میں خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ لڑکیاں تیر اندازی میں دلچسپی لیتی رہیں لیکن زریں کی جذباتی حالت کچھ اور ہی تھی۔ کبھی تو وہ کچھ دُور بیٹھ کر یحیٰی کو دیکھتی رہتی تھی۔ زریں بھی کچھ طبعاً" اور کچھ خصوصی تربیت کے زیر اثر زندہ اور شگفتہ مزاج لڑکی تھی لیکن یحیٰی کو دیکھ کر اُس پر سنجیدگی سی طاری ہو جاتی تھی جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

یحیٰی ان لڑکیوں کو تیر اندازی اس طرح سکھاتا تھا کہ کمان لڑکی کے ہاتھ میں دیتا اور خود اُس کے پیچھے کھڑا ہوتا تھا۔ سکھانے کا طریقہ بھی یہی تھا۔ وہ اپنا بازو لڑکی کے کندھے سے ذرا اوپر کر کے اُس کے ہاتھوں میں کمان کو سیدھا کرتا تھا۔ اس طرح اکثر یوں ہوتا کہ لڑکی کی پیٹھ یحیٰی کے سینے کے ساتھ لگ جاتی تھی۔ باقی لڑکیوں کی توجہ تیر اندازی میں ہوتی تھی۔ وہ شاید محسوس بھی نہیں کرتی تھیں کہ ان کا جسم ایک جوان آدمی کے ساتھ لگ رہا ہے لیکن زریں کا معاملہ کچھ اور تھا۔ وہ دانستہ اپنی پیٹھ یحیٰی کے ساتھ لگا لیتی تھی اور پھر اُس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کچھ دیر یحیٰی کے ساتھ اسی حالت میں رہے۔ شاید یحیٰی بھی زریں کے ان جذبات کو سمجھنے لگا تھا۔

○

شام گہری ہو چکی تھی۔ یحیٰی سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اُس کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ یحیٰی نے دروازہ کھولا۔ باہر زریں کھڑی تھی جو دروازہ کھلتے ہی فوراً" اندر آ گئی۔ یحیٰی اُسے یوں اندر آتا دیکھ کر ذرا سا بھی حیران یا پریشان نہ ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ والیٔ شہر کے خاندان کی لڑکی ہے۔ اسے اور دوسری لڑکیوں کو بھی وہ آزادی سے گھومتے پھرتے دیکھا کرتا تھا۔

"میں یہاں کچھ دیر بیٹھنا چاہتی ہوں" —— زریں نے کہا —— "تم بُرا تو نہ جانو گے؟"

"بُرا کیوں جانوں گا زریں!" —— یحیٰی نے کہا —— "نیت بُری نہ ہو تو بُرا جاننے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی" —— یحیٰی نے زریں کو کچھ غور سے دیکھا اور بولا —— "تم کچھ بجھی بجھی سی اور اُکھڑی سی لگ رہی ہو۔ تم تو ان سب لڑکیوں سے زیادہ ہنس مُکھ ہو"۔

"میرے پاس بیٹھ جاؤ" —— زریں نے سنجیدہ اور متین سے لہجے میں کہا —— "یہاں.... میرے قریب بیٹھو"۔

یحیٰی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ زریں نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یحیٰی بھی آخر جوان آدمی تھا اور اُسے خدا نے ایسی عقل اور نظر دی تھی کہ وہ پردوں کے پیچھے کی بات بھی سمجھ جایا کرتا تھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو یحیٰی!" —— زریں نے یحیٰی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں آہستہ آہستہ مسلتے ہوئے کہا —— "میرے دل کی جو کیفیت ہے وہ میرے چہرے سے ظاہر ہو رہی ہے۔ میں اتنی سنجیدہ کبھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں تو سمجھتی تھی کہ میں دنیا میں ہنسنے کھیلنے کے لئے ہی آئی ہوں لیکن تم میرے سامنے آئے ہو تو میں نے اپنے اندر ایسا انقلاب محسوس کیا ہے کہ میرے لئے اپنے آپ کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ بار بار یہی جی میں آتی ہے کہ تمہارے پاس آ بیٹھوں اور تمہاری باتیں سنوں.... کیا تم نے محسوس نہیں کیا کہ تم جب میرے ہاتھ میں کمان دیتے ہو اور میرے پیچھے کھڑے ہو کر کمان میں تیر سیدھا رکھنے کو کہتے ہو تو میں تمہارے ساتھ لگ جاتی ہوں اور دانستہ کمان کو دائیں بائیں یا اوپر نیچے کر دیتی ہوں تاکہ تم کچھ دیر اسی طرح میرے ساتھ لگے رہو اور بار بار میرے ہاتھ پکڑ کر کمان اور تیر سیدھا کرتے رہو"۔

یحیٰی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ جس ہاتھ میں زریں نے اُس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اُس ہاتھ کو یحیٰی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یک لخت یحیٰی کے دل میں یہ احساس بیدار ہو گیا کہ ان چاروں لڑکیوں میں یہ لڑکی اسے زیادہ اچھی لگتی تھی اور کبھی کبھی وہ تیر اندازی کی سکھلائی دیتے ہوئے اس لڑکی کو اپنے کچھ زیادہ ہی قریب کر لیا کرتا تھا۔ زریں نے جب اپنے جذبات کا اظہار کیا تو یحیٰی نے نمایاں طور پر محسوس کیا کہ زریں نے اپنے نہیں بلکہ اس کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

"کیا تم میرے ان جذبات کی تسکین کر سکتے ہو؟" —— زریں نے کہا —— "میں تمہیں صاف بتا دوں کہ تم میری روح میں اُتر گئے ہو.... کیا تم میری محبت کو قبول کرو گے؟"

"سوچ لو زریں!" —— یحیٰی نے کہا —— "تم شہزادی ہو اور میں ایک مسافر ہوں جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اُس کی منزل کیا ہے، کہاں ہے۔ ہو سکتا ہے ہماری محبت کوئی قربانی مانگ بیٹھے جو تم نہ دے سکو.... میں تو اپنی جان بھی دے دوں گا"۔

"وہ تم دیکھ لو گے" —— زریں نے کہا —— "کوئی ایسا خطرہ ہُوا تو جہاں کہو گے تمہارے ساتھ چل پڑوں گی"۔

"میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں زریں!" —— یحیٰی نے کہا —— "تمہیں دیکھ کر میرے اندر بھی

ایسے ہی جذبات اُمنڈے تھے لیکن میں خاموش رہا۔ میرے دل کی بات تم نے کہہ دی ہے۔ صرف ایک بات کا خیال رکھنا کہ اس محبت کا تعلق جسموں کے ساتھ نہ ہو"۔

"یہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے"۔۔۔ زرّیں نے کہا۔۔۔ "میں نے کہا ہے کہ تم میری روح میں اُتر گئے ہو۔ میں یہاں آتی رہا کروں گی"۔

"اور میں تمہارا انتظار کیا کروں گا"۔۔۔ یحییٰ نے کہا۔

○

اُس رات کے بعد یحییٰ اور زرّیں بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے وجود میں تحلیل ہوتے چلے گئے۔

تیر اندازی' تیغ زنی وغیرہ کے مقابلوں کا جو میلہ لگا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ جیتنے والے انعام و اکرام لے کر چلے گئے تھے۔ خیموں کی بستی اُجڑ گئی تھی۔

یحییٰ ان چاروں لڑکیوں کو تیر اندازی کی مشق کروا رہا تھا۔ لڑکیوں کے تیر اب ٹھکانے پر لگتے تھے۔ یحییٰ اور زرّیں کے دلوں میں جو تیر اُتر گئے تھے ان سے ابھی دوسرے ناواقف تھے۔ زرّیں کوئی پردہ دار لڑکی تو نہ تھی کہ اس کے باہر نکلنے پر پابندی ہوتی۔ وہ ہر رات یحییٰ کے کمرے میں پہنچ جاتی اور دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو کر بیٹھے رہتے اور دلوں کی باتیں کرتے رہتے تھے۔

یحییٰ کی جذباتی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ وہ جب لڑکیوں کو تیر اندازی کے لئے باہر لے جاتا تو صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ زرّیں میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہا ہے۔

وہ جو کہتے ہیں کہ عشق اور مُشک چھپے نہیں رہ سکتے' وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ زرّیں کی ساتھی لڑکیاں بھانپ گئیں کہ یہ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ انہوں نے احمد بن غطاش کو بتایا۔ احمد بن غطاش کچھ پریشان سا ہو گیا۔ احمد کو معلوم نہیں تھا کہ یحییٰ نے یہ راز چھپا کر نہیں رکھا۔ جس وقت لڑکیاں احمد بن غطاش کو یہ بتا رہی تھیں بالکل اُسی وقت یحییٰ حسن بن صباح کے پاس بیٹھا اُسے اپنے دل کی یہی بات بتا رہا تھا۔

یحییٰ حسن بن صباح سے متاثر ہی نہیں تھا بلکہ مرعوب تھا۔ اس مرعوبیت میں ڈر اور خوف نہیں تھا بلکہ احترام اور تقدس کا تاثر تھا جو اس پر طاری ہو جایا کرتا تھا۔ یہ مرعوبیت ایسی تھی جیسے حسن بن صباح نے اُس کو ہپناٹائز کر رکھا ہو۔ حسن اس کے ساتھ دینی امور پر باتیں کرتا تھا۔ ان باتوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ حسن راسخ العقیدہ مسلمان ہے اور اس کا درجہ نبیوں سے ذرا سا ہی کم

ہے۔

"پیر و مُرشد!"۔۔۔ یحییٰ نے ایک روز اُس کے سامنے بیٹھے ہوئے کہا۔۔۔ "وادی شاہ در کے خاندان کی ایک لڑکی' زرّیں' اسے دل و جان سے چاہتی ہے اور اُس کے اپنے دل میں بھی اس لڑکی کی محبت پیدا ہو گئی ہے' اور ہم دونوں تنہائی میں بیٹھ کر پیار و محبت کی باتیں کیا کرتے ہیں۔۔۔ کیا میں بد دیانتی اور دھوکہ دہی کا ارتکاب تو نہیں کر رہا؟"

"نہیں؟"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "اگر اس محبت کا تعلق جسموں کی بجائے روحوں کے ساتھ ہے تو یہ گناہ نہیں"۔

"یہ ہماری روحوں کا معاملہ ہے پیر و مرشد؟"۔۔۔ یحییٰ نے کہا۔

"پھر یہ ٹھیک ہے"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔

اِدھر احمد بن غطاش نے زرّیں کو بلایا اور اُس سے پوچھا کہ یحییٰ کے ساتھ اُس کے تعلقات کس نوعیت کے ہیں اور ان کی ملاقاتیں کس قسم کی ہیں۔

"یہ شخص مجھے اچھا لگتا ہے"۔۔۔ زرّیں نے کہا۔۔۔ "اور میرا اس کے ساتھ جو تعلق ہے وہ مرد عورت والا تعلق نہیں"۔

"میری بات غور سے سنو!"۔۔۔ احمد بن غطاش نے کہا۔۔۔ "میں سمجھ گیا ہوں۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم اس محبت کو گناہ کہا کرتے ہیں جو فرائض سے ہٹا دے"۔

"میں فرائض سے نہیں ہٹی"۔۔۔ زرّیں نے کہا۔۔۔ "جہاں آپ مجھ میں یہ خامی دیکھیں کہ میں اپنا کوئی ایک بھی فرض بھول گئی ہوں تو مجھے جو سزا چاہیں دے دیں"۔

"تم نے شاید سزا کا نام رسمی طور پر لیا ہے"۔۔۔ احمد بن غطاش نے قدرے بارعب آواز میں کہا۔۔۔ "لیکن تمہیں بھولنا نہیں چاہئے کہ یہ سزا کیا ہو گی"۔

"میں جانتی ہوں"۔۔۔ زرّیں نے کہا۔۔۔ "مجھے قتل کر دیا جائے گا"۔

"قتل نہیں کیا جائے گا"۔۔۔ احمد بن غطاش نے کہا۔۔۔ "تمہیں قید خانے میں ان قیدیوں میں پھینک دیا جائے گا جو کئی کئی سالوں سے وہاں بند ہیں۔ وہ سب وحشی آدمی ہیں۔ پھر تمہیں اُس کال کوٹھڑی میں بند رکھا جائے گا جہاں زہریلے کیڑے مکوڑے رہتے ہیں۔ یہ مت بھولنا کہ تم نے دوسروں کو پھانسا ہے' خود پھنس کے بیکار نہیں ہو جانا"۔

اُسی رات احمد بن غطاش اور حسن بن صباح نے اس مسئلے پر تبادلۂ خیال کیا۔ انہیں نقصان یہ نظر آ رہا تھا کہ محبت کے نشے میں ایک قیمتی اور تجربہ کار لڑکی ضائع ہو جائے گی۔ حسن

بن صباح نے اس لڑکی کو اپنے کمرے میں بلایا۔ زرّیں جب اُس کے کمرے سے نکلی تو اُس کے چہرے پر کچھ اور ہی تاثر تھا۔

○

دن گزرتے چلے گئے۔ یحییٰ اور زرّیں ایک دوسرے میں گم ہو گئے۔ یحییٰ نے ان لڑکیوں کو تیر اندازی میں طاق کر دیا تھا اور اب اسے کہا گیا تھا کہ انہیں شہسوار بنا دے۔

شہر کے لوگ دیکھتے تھے کہ پانچ گھوڑے ہر صبح جنگل کو نکل جاتے ہیں۔ ایک پر یحییٰ اور باقی چار پر لڑکیاں سوار ہوتی تھیں۔ صبح کے گئے ہوئے یہ گھوڑے آدھا دن گزار کر واپس آتے تھے۔ یحییٰ کبھی کبھی زرّیں کو اپنے ساتھ رکھ کر باقی لڑکیوں سے کہتا کہ وہ دُور کا چکر لگا کر آئیں۔ لڑکیاں یہ رپورٹ احمد بن غطاش کو دے دیا کرتی تھیں۔

اُدھر مَرو میں سلطان ملک شاہ اور اُس کا کوتوال ہر روز انتظار کرتے تھے کہ یحییٰ کی طرف سے کوئی پیغام آئے گا لیکن ہر روز انہیں مایوسی ہوتی تھی۔

یحییٰ کے ذہن سے نکل ہی گیا تھا کہ وہ شاہ در کیوں آیا تھا اور اُسے ایک روز واپس بھی جانا ہے۔ وہ اپنے ساتھی سنان سے ہر روز ملتا اور اُسے کہتا تھا کہ ان لوگوں کا کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ یہ کیا ہیں۔ دو چار دنوں بعد کچھ پتہ چل جائے گا۔

زرّیں کے اظہارِ محبت میں اچانک دیوانگی پیدا ہو گئی۔ اُس نے یحییٰ کو یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس میں اب انتظار کی تاب نہیں رہی اور یحییٰ اُسے اپنے ساتھ لے چلے۔ یحییٰ نے اُسے ابھی تک نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا تھا۔ زرّیں نے اس سے کئی بار پوچھا اور یحییٰ نے ہر بار اُسے جذبات میں الجھا کر ٹال دیا تھا۔

ایک رات زرّیں اس کے کمرے میں آئی تو اس نے اپنی چادر میں چھپائی ہوئی چھوٹی سی صراحی نکالی۔

"میں آج تمہارے لئے ایک خاص شربت لائی ہوں" ——زرّیں نے صراحی یحییٰ کے ہاتھ میں دے کر کہا—— "یہ احمد بن غطاش خود پیا کرتا ہے اور صرف یہ بزرگ عالم ہے جسے کبھی کبھی پلاتا ہے۔ میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ اس میں شہد ملا ہوا ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس میں ایسے پھولوں کا رس ڈالا گیا ہے جو کسی دُور کے ملک میں ہوتے ہیں۔ احمد کی بیویاں کہتی ہیں کہ اُس نے اس شربت کا مشکیزہ بہت سے سونے کے عوض منگوایا ہے۔ سنا ہے یہ شربت پینے والا دو سو سال زندہ رہے تو بھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ میں چُرا کے لائی ہوں۔ پی کے دیکھو۔"

یحییٰ نے صراحی ہی منہ سے لگا لی اور پھر آہستہ آہستہ اُس نے سارا شربت پی لیا۔ اس دوران زرّیں اس کے ساتھ پیار و محبت کی باتیں ایسے والہانہ انداز سے کرتی رہی جیسے وہ نشے میں ہو۔ زرّیں طلسم کی مانند یحییٰ پر طاری رہتی ہی تھی لیکن اُس رات یحییٰ کی جذباتی حالت کچھ اور ہی ہو گئی۔ وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے اُسے دنیا بھر کی حاکمیت مل گئی ہو۔

"آخر ہمارا انجام کیا ہو گا یحییٰ؟" ——زرّیں نے کہا—— "کیا تم میرے ساتھ یونہی محبت کا کھیل کھیلتے رہو گے؟ تم تو اتنا بھی نہیں بتاتے کہ تم ہو کہاں کے... میں کہتی ہوں کہ جہاں کہیں کے بھی ہو، یہاں سے نکلو اور مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ آج کی رات یہاں کی آخری رات ہونی چاہئے۔ میں تیار ہوں۔ مردانہ لباس پہن لوں گی"۔

یحییٰ نے قہقہہ لگا کر زرّیں کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اُس نے اس طرح کا قہقہہ پہلے کبھی نہیں لگایا تھا۔ زرّیں نے مچل مچل کر اسے کہنا شروع کر دیا کہ وہ اُسے اپنے متعلق کچھ بتائے۔

"سن زرّیں!" ——یحییٰ نے شگفتہ سی سنجیدگی سے کہا—— "یہ بھی سن لے کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں۔ اب مجھے تم پر اعتبار آ گیا ہے.... میں یہاں ایک فرض ادا کرنے آیا تھا۔ وہ ابھی ادا نہیں ہُوا۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے"۔

"پھر مجھے بتاتے کیوں نہیں!" ——زرّیں نے بڑی پیاری سی جھنجھلاہٹ سے کہا—— "میں کئی بار کہہ چکی ہوں کہ تمہاری محبت پر میں اپنی جان بھی قربان کر دوں گی"۔

"میں مَرو سے آیا ہوں" ——یحییٰ نے اپنے راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا—— "میں سلجوقی سلطان ملک شاہ کا جاسوس ہوں۔ وہاں یہ شک پایا جاتا ہے کہ احمد بن غطاش اسماعیلی ہے اور یہاں شاہ در میں اہلِ سنّت سلطنت کے خلاف اسماعیلی مرکز بن گیا ہے۔ میں یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ اس شک میں حقیقت کتنی ہے یا کچھ حقیقت ہے بھی یا نہیں"۔

"کچھ پتہ چلا؟" ——زرّیں نے پوچھا۔

"میں ابھی شک میں ہوں" ——یحییٰ نے جواب دیا—— "یوں کہہ لو کہ میرا شک ابھی موجود ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ احمد بن غطاش اسماعیلی ہے لیکن میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص اہلِ سنّت ہے۔ اس کے ساتھ جو عالم ہے، اُس نے دینی مسائل کے مجھے بہت سبق دیئے ہیں۔ اس میں مجھے اسماعیلیوں والی کوئی بات نظر نہیں آئی لیکن میں نے ان دونوں کو کبھی نماز پڑھتے بھی نہیں دیکھا۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ اس شہر میں اسماعیلیوں کی اکثریت ہے"۔

"تمہارا یہ ساتھی سنان بھی جاسوس ہی ہو گا؟" ——زرّیں نے پوچھا۔

"ہاں!" — یحییٰ نے کہا — "اُسے میں نے دو تین دنوں بعد یہ بتا کر واپس بھیجنا ہے کہ میں نے اب تک یہاں کیا دیکھا ہے"۔

"یحییٰ!" — زرّیں نے یحییٰ کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر جذباتی لہجے میں کہا — "میری ایک بات مان لو...، مَرو واپس نہ جاؤ۔ یہاں بھی نہ رہو۔ چلو آگے۔ ایران چلے چلتے ہیں۔ تم جہاں جاؤ گے تمہیں وہاں کے حاکم ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ تم جیسا تیر انداز اور شہسوار کہاں ملتا ہے۔ مذہب اور فرقوں کے چکر سے نکلو"۔

"میں تمہیں ایک بات صاف بتا دیتا ہوں زرّیں!" — یحییٰ نے کہا — "میرے دل میں تمہاری جو محبت ہے' اس میں کوئی دھوکہ یا بناوٹ نہیں۔ تم میری پہلی اور آخری محبت ہو لیکن میں اپنے فرض کو محبت پر قربان نہیں کروں گا"۔

"اگر میں تمہارے سامنے کسی اور آدمی کے ساتھ چل پڑوں تو...." — زرّیں نے کہا۔

"تو میں نظریں پھیر لوں گا" — یحییٰ نے کہا — "اپنے فرض سے نظریں نہیں ہٹاؤں گا۔ سلجوقیوں نے ہزار ہا جانیں قربان کر کے اور خون کے چڑھاوے چڑھا کر یہ سلطنت بنائی ہے۔ اسے وہ سلجوقی سلطنت نہیں اسلامی سلطنت کہتے ہیں۔ اسلام میں کوئی فرقہ نہیں۔ جو مسلمان یہ کہتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت سے ہے وہ اگر سنّت سے منحرف ہے تو وہ رسولؐ کا اُمتی نہیں' وہ کچھ اور ہے۔ سلجوقی سلاطین اہلِ سنّت والجماعت ہیں اس لئے وہ اللہ کے سچے دین کے پاسبان ہیں۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام اور سلجوقی سلطان کا نمک حلال ملازم ہوں۔ یہ میرا ایمان ہے۔ اگر تم اس دعوے میں سچی ہو کہ میری محبت تمہاری روح میں اُتری ہوئی ہے تو میرے فرض کی ادائیگی میں میری مدد کرو۔ مجھے ان لوگوں کی اصلیت بتاؤ"۔

"کل!" — زرّیں اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی — "کل اسی وقت تمہیں راز معلوم ہو جائے گا اور تم اپنے فرض سے فارغ ہو جاؤ گے"۔

○

یحییٰ پر فاتحانہ کیفیت طاری تھی۔ وہ بہت خوش تھا کہ کل اُس کا کام ختم ہو جائے گا۔ وہ یہاں سے ایک قیمتی راز اور ایک حسین لڑکی ساتھ لے کر رخصت ہو گا"۔

زرّیں اپنے کمرے میں گئی تو پلنگ پر لوندھے منہ گر کر ایسی روئی کہ اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ یہ لڑکی ایک حسین اور نشہ آور دھوکہ تھی لیکن یحییٰ کے ساتھ اُس کی محبت دھوکہ نہیں تھا۔ اُس کی

محبت کا سرچشمہ اُس کی روح تھی۔ وہ روحانی محبت کے نشے سے سرشار ہو گئی تھی مگر محبت ایسے بھنور میں آ گئی تھی جس سے اُس کا سلامت نکل آنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

لڑکیوں نے احمد بن غطاش اور حسن بن صباح کو بتا دیا کہ زرّیں یحییٰ کے ساتھ عشق و محبت کا کھیل کھیل رہی ہے۔ احمد اور حسن نے اس اطلاع سے یہ رائے قائم کی کہ زرّیں کے اندر انسانی جذبات ابھی زندہ ہیں اور اس کی ذلت میں ابھی وہ عورت زندہ ہے جو مرد کی محبت کی پیاسی ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ زرّیں ایک ایسے شخص کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی جو ابھی مشکوک تھا۔ حسن بن صباح عالمِ دین کے بہروپ میں یحییٰ کو ہر روز اپنے پاس بٹھاتا اور اُسے دینی امور سمجھاتا تھا لیکن اُس سے باتیں کروا کے یہ جاننے کی کوشش کرتا تھا کہ یہ شخص ہے کون؟ سلجوقیوں کا ہی آدمی تو نہیں؟.... حسن کچھ جان تو نہ سکا تھا لیکن اُس نے وثوق سے کہہ دیا تھا کہ یہ شخص مشکوک ہے۔

اب حسن بن صباح کو پتہ چلا کہ زرّیں یحییٰ کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہے تو اُس نے زرّیں کو اپنے پاس بلایا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس کے ذہن پر قابض ہو گیا۔ لڑکی کی جو تربیت آٹھ دس سال عمر سے شروع ہوئی اور جوانی میں آ کر بھی جاری تھی' وہ اُبھر آئی اور زرّیں کی عقل پر غالب آ گئی۔

"تم اس سے اُگلواؤ گی وہ کون ہے' یہاں کیوں آیا ہے" — حسن بن صباح نے کہا۔

"ہاں میں اُس سے اُگلواؤں گی وہ کون ہے' یہاں کیوں آیا ہے" — زرّیں نے یوں کہا جیسے اُس پر غنودگی طاری ہو۔

"وہ شربت تمہارے ساتھ ہو"۔

"وہ شربت میرے ساتھ ہو گا"۔

اس شربت میں جو زرّیں صراحی میں لے کر یحییٰ کے پاس گئی تھی' اس میں شہد تو ضرور ملا ہوا تھا لیکن اس میں کسی پھول کا رس نہیں تھا۔ اس میں حشیش ڈالی گئی تھی اور اس میں ایک خوشبو ملائی گئی تھی۔ یہ شربت پینے کے بعد یحییٰ نے جو قہقہہ لگایا تھا وہ حشیش کے زیرِ اثر تھا جسے وہ زرّیں کے حسن و شباب اور محبت کے والہانہ اظہارِ محبت کا خمار سمجھتا رہا۔ اس نشے نے اس کے سینے سے راز نکال کر زرّیں کے آگے رکھ دیا۔

یحییٰ کا ایمان اتنا پختہ تھا کہ اُسے یہ یاد رہا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت سے

ہے اور لالِ سنت ہے' اور اُسے یہ بھی یاد رہا کہ اس کا فرض کیا ہے اور یہ جذبۂ ایثار بھی زندہ رہا کہ وہ محبت کو فرض پر قربان کر دے گا لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ اُس نے زرّیں کو اس کا فرض یاد دلا دیا ہے۔ وہ یہ عزم لے کر یحییٰ کے کمرے سے نکلی تھی کہ یہ شخص فرض کا لستا پکا ہے تو میں اپنے فرض کو کیوں قربان کروں؟

زرّیں رات بہت دیر تک روتی رہی۔ اُس کے اندر خونریز معرکہ بپا تھا۔ یہ اُس کی ذات کے دو حصے تھے جو ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے تھے —— محبت اور فرض —— اور اُس کی تربیت!

صبح طلوع ہوتے ہی زرّیں نے پہلا کام یہ کیا کہ احمد بن غطاش اور حسن بن صباح کو بتایا کہ یحییٰ ابن الہادی جاسوسی کے لئے یہاں آیا ہے اور سنان اُس کا ساتھی ہے۔ زرّیں نے یحییٰ کی ساری باتیں سنائیں۔ یہ باتیں سناتے ہوئے زرّیں کی زبان بار بار ہکلاتی تھی اور اُس کے آنسو بھی نکل آئے۔ یہ یحییٰ کی محبت کا اثر تھا ورنہ یہ وہ لڑکی تھی جس نے ذاکر کو اپنے ہاتھوں زہر پلایا تھا۔

زرّیں کو اُس کے کمرے میں بھیج دیا گیا۔

کچھ دیر بعد ایک ملازم روز مرّہ کی طرح یحییٰ کے کمرے میں ناشتہ لے کر گیا۔ ساتھ شہد ملا دودھ تھا۔ سنان کو بھی ایسا ہی دودھ بھیجا گیا۔ دونوں نے دودھ پیا اور کچھ ہی دیر بعد دونوں کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا' پھر ان آنکھوں نے دنیا کا اجالا کبھی نہ دیکھا۔

"ادھر آؤ.... زرّیں کو آ کے دیکھو" —— ایک ملازمہ زرّیں کے کمرے سے چیختی چلّاتی نکلی —— "جلدی آؤ۔ زرّیں کو دیکھو"۔

احمد بن غطاش اور حسن بن صباح بھی زرّیں کے کمرے میں گئے۔ ایک تلوار زرّیں کے پیٹ میں داخل ہوئی اور پیٹھ سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ وہ ابھی زندہ تھی۔

"تمہیں کس نے مارا ہے زرّیں؟" —— احمد بن غطاش نے پوچھا۔

"میں نے خود!" —— زرّیں نے کہا —— "میں نے دو آدمی قتل کروائے ہیں... یحییٰ اور سنان... اور میں نے اپنی محبت کو بھی قتل کیا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو موت کی سزا دی ہے۔ میں خود ہی جلّاد بن گئی تھی"۔

زرّیں بھی مر گئی۔

یحییٰ اور سنان کی لاشیں بوریوں میں بند کر کے دریا میں بہا دی گئیں۔

"ہمیں کوئی اور ڈھنگ کھیلنا پڑے گا" —— حسن بن صباح نے کہا —— "سلطان کو شک ہو گیا ہے۔ مجھے عبیدیوں کی مدد حاصل کرنے کے لئے مصر جانا چاہئے"۔

"نہیں حسن!" —— احمد بن غطاش نے کہا —— "پہلے ہم دو تین اور قلعوں پر قبضہ کر لیں پھر ہماری کوشش یہ ہو گی کہ تمہیں سلطان کی حکومت میں کوئی بڑا عہدہ اور رتبہ مل جائے پھر ہم اس سلطنت کی بنیادیں کمزور کر سکتے ہیں"۔

سلطان ملک شاہ نے مرو میں اپنے سپہ سالار اور کوتوال کو بلا رکھا تھا اور باتیں یحییٰ ابن الہادی اور سنان کے متعلق ہو رہی تھیں۔

"میں کہہ رہا ہوں بہت دن گزر گئے ہیں" ــــ ملک شاہ کہہ رہا تھا ــــ "بلکہ مہینے گزر گئے ہیں۔ شاید یہ تیسرا چاند طلوع ہوا ہے۔ اُس نے کوئی اطلاع نہیں دی۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی گیا تھا"۔

"سنان!" ــــ کوتوال نے کہا ــــ "یہ دونوں میرے قابلِ اعتماد آدمی ہیں۔ زمین کے نیچے سے بھی راز نکال لاتے ہیں"۔

"یحییٰ کو چاہیے تھا کہ سنان کو ایک بار تو بھیج دیتا" ــــ سلطان ملک شاہ نے کہا ــــ "کہیں پکڑا نہ گیا ہو"۔

"ایک اور آدمی کو بھیج دیتے ہیں" ــــ سپہ سالار نے کہا ــــ "وہ انہیں ڈھونڈ لے گا"۔

"دو چار دن اور انتظار کرو" ــــ ملک شاہ نے کہا۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دربان نے اندر آ کر اطلاع دی کہ قلعہ شاہ در سے ایک آدمی آیا ہے۔

"فوراً اندر بھیج دو" ــــ ملک شاہ نے کہا۔

ایک ادھیڑ عمر آدمی اندر آیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ لمبے سفر سے آیا ہے۔ ملک شاہ نے سلجوقی اندازِ میزبانی کے مطابق اسے بٹھایا، دربان کو بلا کر اس کے لئے پھل اور مشروب منگوائے پھر پوچھا کہ وہ کیوں آیا ہے۔

"آپ کا ایک آدمی یحییٰ ابن الہادی شاہ در گیا تھا" ــــ اس آدمی نے کہا ــــ "وہ میرا دوست ہے۔ اُسے آپ نے سنان نام کے ایک آدمی کے ساتھ جاسوسی اور مخبری کے لئے بھیجا تھا"۔

"اس کی کیا خبر لائے ہو؟" ــــ کوتوال نے بیتابی سے پوچھا ــــ "فوراً بولو"۔

"ٹھیک خبر لایا ہوں" ــــ اُس نے کہا ــــ "اتنا پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اُس نے اپنا کام بہت ہی محنت اور جانفشانی سے کیا ہے۔ وہ اور اُس کا ساتھی میرے گھر میں ٹھہرے تھے۔ میں نے یحییٰ کی بہت مدد اور راہنمائی کی تھی"۔

"وہاں کی خبر کیا ہے!" ــــ ملک شاہ نے کہا ــــ "اس کے بعد ہم کوئی اور بات

سنیں گے"۔

"خبر یہ ہے" ــــ اُس نے کہا ــــ "آپ نے یحییٰ کو یہ دیکھنے کے لئے بھیجا تھا کہ والئ شاہ در احمد بن عطاش اسماعیلی ہے اور شاہ در اسماعیلیوں کا مرکز بن گیا ہے..... سلطان عالی مقام! آپ کا یہ شک صحیح نہیں۔ احمد بن عطاش اسماعیلیوں کو بالکل پسند نہیں کرتا"۔

"کیا یہ غلط ہے کہ اس نے شاہ در کا والی بنتے ہی اُن تمام اسماعیلیوں کو رہا کر دیا ہے جو اہلِ سنت کا جینا حرام کئے رکھتے تھے؟" ــــ ملک شاہ نے پوچھا ــــ "کیا مرحوم والی ذاکر نے انہیں اسی جرم میں قید میں نہیں ڈالا تھا؟"

"یہ صحیح ہے سلطانِ محترم!" ــــ اس آدمی نے کہا ــــ "احمد بن عطاش نے قید خانے میں پڑے ہوئے تمام اسماعیلیوں کو رہا کر دیا تھا لیکن اُس نے ان سب سے کہا تھا کہ انہیں بے گناہ سمجھ کر رہا نہیں کیا جا رہا بلکہ انہیں موقع دیا جا رہا ہے کہ اپنے دلوں سے مذہبی تعصب نکال دیں اور سُنّی عقیدے کو سمجھنے اور اسے قبول کرنے کی کوشش کریں.. ...دراصل احمد بن عطاش پیار اور بھائی چارے کا حربہ استعمال کر رہا ہے اور اس حربے کے اثرات بھی دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ احمد بن عطاش نے اسماعیلیوں میں اپنے مخبر چھوڑے ہوئے ہیں۔ ان مخبروں کی اطلاعیں امید افزا ہیں"۔

"اور یہ جو قافلے لُوٹے جا رہے ہیں!" ــــ ملک شاہ نے پوچھا ــــ "کیا اس میں احمد بن عطاش کا ہاتھ نہیں؟"

"سلطانِ عالی مقام!" ــــ اس آدمی نے کہا ــــ "احمد بن عطاش عالمِ دین ہے۔ یہ وہی احمد بن عطاش ہے جسے آپ عالمِ دین کی حیثیت سے ہی جانتے ہیں۔ قافلے شاہ در سے بہت دور لُوٹے گئے ہیں۔ احمد بن عطاش کے خلاف یہ افواہ اسماعیلیوں نے پھیلائی تھی کہ قافلوں کو احمد بن عطاش کے آدمی لُوٹتے ہیں۔ ایسے تین اسماعیلی پکڑے گئے تھے۔ انہیں پہلے کوڑے مارے گئے پھر انہیں قید خانے میں ڈال دیا گیا تھا"۔

"یحییٰ کہاں ہے؟" ــــ سپہ سالار نے پوچھا ــــ "اُس نے سنان کو کیوں نہیں بھیجا؟ تمہیں کیوں بھیجا ہے؟ اگر شک رفع ہو گیا تھا تو وہ اتنا عرصہ شاہ در کیوں رہا اور واپس کیوں نہیں آیا؟"

"ہمیں شک تھا کہ احمد بن عطاش درپردہ اسماعیلیوں کی پشت پناہی کر رہا ہو گا" ــــ

اس آدمی نے کہا ——"یہ شک رفع کرنے کے لئے میں اور یحییٰ احمد بن عطاش کے اندرونی حلقوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہے۔ دو عورتوں کو ہاتھ میں لیا اور ان سے معلوم کروایا۔ اس کام میں بہت وقت لگا۔ بہرحال ہمارا یہ شک بھی رفع ہو گیا..... یحییٰ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ میں آپ کو پوری اطلاع دے دوں۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے..... سلطانِ محترم! آپ کو شاہ در کی طرف سے مطمئن ہو جانا چاہئے۔ اگر احمد بن عطاش کی طرف سے آپ کے لئے کوئی خطرہ اٹھا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہاں اہلِ سنت کی اور آپ کے وفاداروں کی تعداد زیادہ ہے"۔

"ہم تو مطمئن ہو گئے" —— سلطان ملک شاہ نے کہا —— "لیکن یحییٰ نے سنان کو کیوں نہیں بھیجا؟ اگر اس کا کام ختم ہو گیا تھا تو وہ خود کیوں نہیں آیا؟"

"وہ خود ہی ایک اور کام کے پیچھے پڑ گیا ہے" —— اس آدمی نے جواب دیا —— "وہ کہتا تھا کہ اُسے ایک ایسا اشارہ ملا ہے جس کے پیچھے وہ گیا تو وہ ان ڈاکوؤں تک پہنچ جائے گا۔ جنہوں نے پہلے قافلوں کو لوٹا ہے اور شاید یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اب ایک اور قافلے کو لوٹ لیا اور سب کو قتل کر دیا ہے..... سلطانِ عالی مقام! میں نے اُسے روکا تھا لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کتنے بڑے خطرے میں سنان کو ساتھ لے کر چلا گیا ہے۔ مجھے یہ بھی شک ہے کہ ایک جواں سال عورت بھی اُس کے ساتھ گئی ہے۔ یحییٰ نے میرے ساتھ اس عورت کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے مجھے شک ہو رہا ہے کہ وہ سیدھا کسی جال میں جا رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس عورت کو ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ چونکہ اُس نے مجھ سے اس عورت کو چھپائے رکھا تھا اس لئے مجھے خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ وہ کسی سازش کا شکار ہو جائے گا"۔

"ایک بات بتاؤ" —— کوتوال نے پوچھا —— "یہ سازش احمد بن عطاش نے ہی تو تیار کی ہو!"

"نہیں!" —— اس نے جواب دیا —— "یہ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ سازش ہی ہے تو احمد بن عطاش کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مجھے ایک شک اور بھی ہے۔ یحییٰ نے مجھ سے بالا بالا کوئی اور تعلق پیدا کر لیا تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو اس سے صرف سنان واقف تھا"۔

"کیا تم بتا سکتے ہو وہ کہاں گیا ہے؟" —— ملک شاہ نے پوچھا۔

"نہیں سلطانِ محترم!" —— اُس نے جواب دیا —— "اگر معلوم ہوتا تو میں چوری چھپے اس کے پیچھے چلا جاتا"۔

"تم یہ تو نہیں بتا سکتے کہ وہ کب تک واپس آئے گا" —— ملک شاہ نے پوچھا۔

"نہیں سلطانِ عالی مقام!" —— اُس نے جواب دیا —— "ہمیں دعا کرنی چاہئے کہ وہ زندہ و سلامت واپس آجائے..... کیا اب مجھے جانے کی اجازت ہے؟..... میں نے پیغام آپ تک پہنچانا تھا وہ پہنچا دیا ہے۔ آپ کہیں یا نہ کہیں میں شاہ در میں آپ کے جاسوس کی حیثیت سے کام کرتا رہوں گا"۔

"ہاں، تم جا سکتے ہو" —— سلطان نے کہا —— "اگر ہمارے لیئے کام کرتے رہو گے تو ہم تمہیں اس کا پورا معاوضہ دیں گے"۔

"نہیں سلطانِ محترم!" —— اس شخص نے کہا —— "میں یہ کام بلا معاوضہ کروں گا اور اپنا فرض سمجھ کر کروں گا"۔

یہ آدمی چلا گیا۔

جس وقت شاہ در سے آیا ہوا یہ آدمی سلطان ملک شاہ کو یحییٰ ابن الہادی کا پیغام دے رہا تھا، اُس وقت یحییٰ اور اس کے ساتھی سنان کی لاشوں کو دریا بہت دُور لے گیا تھا۔ مچھلیوں نے بوری پھاڑ کر لاشوں کو کھانا شروع کر دیا ہو گا۔

اس شخص کو حسن بن صباح نے بھجوایا تھا۔ زرّیں نے خودکشی سے پہلے یحییٰ ابن الہادی کے متعلق بتا دیا تھا کہ وہ سلطان ملک شاہ کا جاسوس ہے اور یہاں کیا معلوم کرنے آیا تھا۔ یحییٰ اور سنان کو زہر دے کر مار دیا گیا تھا لیکن حسن بن صباح کا خیال تھا کہ یہ خطرہ دونوں کو مار ڈالنے سے ختم نہیں ہوا۔

"ہمیں ان دو جاسوسوں کا تو پتہ چل گیا اور ہم نے انہیں ختم کر دیا ہے" —— احمد بن عطاش نے کہا تھا —— "مجھے شک ہے کہ یہاں سلجوقیوں کے اور جاسوس اور مخبر بھی ہوں گے۔ ان کا سراغ لگانا بہت ضروری ہے۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اپنے مخبروں سے کہہ دیا جائے کہ شہر میں کسی اجنبی کو دیکھیں تو اُس کا پیچھا کریں اور یقین کر لیں کہ وہ جاسوس نہیں اور یہ دیکھیں کہ وہ کس کام کے لئے یہاں آیا ہے"۔

"میں سلجوقیوں کو گمراہ کر سکتا ہوں" —— حسن بن صباح نے کہا تھا —— "ہم ایک

آدمی کو مرو بھیجیں گے جو سلطان ملک شاہ کے پاس یحییٰ ابن الہادی کا پیغام لے کر جائے گا۔ اس آدمی کو پیغام میں بتاؤں گا۔ آدمی بڑا ہوشیار اور ذہین ہونا چاہئے"۔

"میں تمہیں ایک آدمی دوں گا" ـــــ احمد بن غطاش نے کہا تھا ـــــ "تم یہ بتاؤ کہ پیغام کیا دو گے!؟"

حسن بن صباح نے یہ سارا پیغام احمد بن غطاش کو سنایا۔

"زندہ باد" ـــــ احمد بن غطاش نے بے اختیار کہا ـــــ "تم میں اتنی اہلیت ہے کہ نبوت کا دعویٰ کر سکتے ہو۔ یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی"۔

"نہیں استادِ محترم!" ـــــ حسن بن صباح نے کہا تھا ـــــ "پیرو مرشد آپ ہی ہیں۔ میں جو کچھ بھی ہوں وہ آپ کی شخصیت کا معمولی سا عکس ہوں..... یہ پیغام میرے دماغ میں اس لئے آیا ہے کہ اس سے سلجوقیوں کو اطمینان ہو جائے گا کہ شاہ در میں سب ان کے وفادار ہیں اور یہاں سلجوقی سلطنت کے خلاف کوئی سازش یا کوئی گڑبڑ نہیں ہو رہی۔ ان دونوں جاسوسوں کی غیر حاضری کے متعلق سلطان ملک شاہ کو یہ شک نہیں ہو گا کہ انہیں غائب کر دیا گیا ہے۔ انہیں اس پیغام سے یقین ہو جائے گا کہ وہ آگے نکل گئے ہیں اور وہ شاہ در میں نہیں"۔

احمد بن غطاش نے اُسی وقت ایک آدمی کو بلا لیا تھا اور حسن بن صباح نے اُسے یہ پیغام دے کر کہا تھا کہ وہ احمد بن غطاش کو سلطان ملک شاہ تک لے جائے اور یہ پیغام اُسے دے۔

اس آدمی نے ویسے ہی کیا۔ حسن بن صباح نے کئی مقامات پر اس کی تصحیح کی اور اچھی طرح مشق کرائی اور اسے یہ بھی بتایا کہ چہرے پر کس طرح کا تاثر رکھے اور اس کی آواز کا اتار اور چڑھاؤ کس طرح ہو۔

یہ ایک بڑا ہی ذہین اور ہوشیار آدمی تھا جو اس پیغام کی غرض و غایت سمجھ گیا اور ایک دو دفعہ بولنے سے حسن بن صباح کی تسلی ہو گئی اور اس شخص کو اگلی صبح مرو کو روانہ کر دیا گیا تھا۔

ایک روز یہ آدمی سلطان ملک شاہ کو حسن بن صباح کا یاد کرایا ہوا پیغام دے کر واپس آ گیا۔

"وہاں کیا تاثر چھوڑ آئے عابدین؟" ـــــ احمد بن غطاش نے پوچھا۔

"وہی جو آپ پیدا کرنا چاہتے تھے" ـــــ عابدین نے کہا ـــــ "اگر آپ وہاں ہوتے تو آپ بھی اس پیغام کو سچ مان لیتے۔ میں انہیں یقین دلا آیا ہوں کہ اپنے جاسوس یحییٰ ابن الہادی اور اس کے ساتھی سنان کا انتظار نہ کریں۔ وہ مجھے یہ بتا گئے ہیں کہ انہیں ڈاکوؤں کا سراغ ملا ہے اور وہ دیکھیں گے کہ وہ کون ہیں اور کتنے ہیں لیکن مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ ایک عورت کو ساتھ لے گئے ہیں۔ میں نے سلطان ملک شاہ کو یہ بھی کہا ہے کہ وہ سیدھے کسی جال میں چلے گئے ہیں جہاں سے ان کی واپسی ممکن نظر نہیں آتی، اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں سلجوقی سلطنت کے لئے شاہ در میں جاسوسی کرتا رہوں گا......

سلطان ملک شاہ کے پاس ایک سپہ سالار اور کوتوال بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ان دونوں نے بھی ہمارے پیغام کو سچ مان لیا ہے"۔

"ہاں عابدین!" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "اگر وہ ہمارے جھوٹ کو سچ نہ مان لیتے تو تم اس وقت یہاں نہ ہوتے۔ مرو کے قید خانے میں ہوتے یا تمہارا یہ سر تمہارے جسم کے ساتھ نہ ہوتا"۔

حسن بن صباح نے احمد بن غطاش کی طرف دیکھا۔ احمد اشارہ سمجھ گیا۔ وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں سونے کے چند ایک سکے تھے جو اس نے عابدین کو دیئے۔ عابدین نے اٹھ کر اور جھک کر یہ انعام وصول کیا۔

"اب تمہارے ذمے ایک کام اور ہے عابدین!" ـــــ احمد بن غطاش نے کہا ـــــ "اس شہر میں سلجوقیوں کے اور جاسوس بھی ہو سکتے ہیں۔ انہیں تلاش کرو۔ کوئی اجنبی یا مشکوک آدمی نظر آئے، اُس کے پیچھے اپنا ایک مخبر سائے کی طرح لگا دو۔ اپنے آدمیوں کو اچھی طرح سمجھا دو۔ میں اس کا کچھ اور انتظام بھی کروں گا"۔

"آپ اپنا انتظام کریں پیرو مرشد!" ـــــ عابدین نے کہا ـــــ "میرا اپنا انتظام ہے۔ میں ایسا جال بچھاؤں گا کہ اس میں سے کوئی مشکوک آدمی نکل کر نہیں جائے گا۔ سلجوقیوں کے ان دو جاسوسوں نے مجھے چوکنا کر دیا ہے"۔

○

حسن بن صباح انسان سے ابلیس کس طرح بنا؟

اس سوال کا جواب تقریباً تمام مؤرخوں نے اور اُس دور کے بعد آنے والے تاریخ نویسوں نے اپنی اپنی بساط اور اپنی اپنی تحقیق کے مطابق دیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ احمد بن غطاش اور حسن بن صباح نے شاہ در سے آگے جو قلعے تھے، ان پر قبضہ

کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس علاقے میں اپنے عقیدے کی اور اپنے فرقے کے نظریات کی تبلیغ شروع کر دی اور لوگوں کو اپنا ہم خیال ہی نہیں بلکہ اپنا مرید بنا لیا۔

کیا یہ کام اتنا سہل تھا کہ دو چار باتیں کہیں اور سننے والے اپنے باپ دادا کے عقیدوں سے منحرف ہو گئے اور نئے عقیدے اور ایک نئے ہی فرقے کے پیروکار بن گئے؟

داستان گو سے پوچھئے جو اُس دور کے داستان گوؤں کے حوالے سے بات کرے گا مؤرخوں میں ابنِ اثیر کی "تاریخ کامل" کو پڑھ لیں، ابو القاسم رفیق دلاوری کی "آئمہ تلبیس" کی، ابنِ جوزی کی "تلبیسِ ابلیس" کی ورق گردانی کر لیں، "دبستان مذاہب" کا، "سینِ اسلام" کا اور ابنِ خلدون کی "تاریخ ابنِ خلدون" کا مطالعہ کر لیں۔ سب نے ایک دوسرے کی تصدیق اور تائید کی ہے کہ حسن بن صباح نے اپنے فرقے کے عقائد اور نظریات کی تبلیغ کر کے لوگوں کو اپنا پیروکار بنا لیا تھا۔

لیکن کیسے؟

اللہ تبارک و تعالیٰ نے بھٹکی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم دکھانے کے لئے پیغمبر مبعوث کئے لیکن لوگوں نے ان کے مذاق اڑائے، ان پر پھبتیاں کسیں، بعض کو ذلیل و رسوا کیا، دھتکارا، اور پھر کچھ لوگ ان سے متاثر ہو گئے۔

حضرت موسیٰؑ پر کیا کیا ظلم و ستم نہ ہوئے۔

حضرت عیسیٰؑ کے پیروکاروں کو رومیوں نے شیروں کے آگے ڈال کر چیر پھڑوا دیا۔

حضرت عیسیٰؑ کو صلیب کے ساتھ کھڑا کر کے ہاتھوں اور پاؤں میں کیل گاڑ دیئے گئے۔

خاتم النبیین، محبوبِ خدا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے اور سمجھنے کی بجائے آپؐ کے قتل کے منصوبے بنے۔ حضرت بلالؓ کو کوڑے مار مار کر تپتی ریت پر تڑپایا گیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی۔ اللہ کے عظیم دین کی مقبولیت کو کچھ وقت لگا تھا۔

پھر حسن بن صباح اتنی جلدی لوگوں کے دلوں میں کس طرح سما گیا؟

گزری ہوئی صدیوں کے کھنڈرات میں اُس دور کے قصہ گوؤں کی سرگوشیاں سنئے:

یہ تو سنایا جا چکا ہے کہ احمد بن غطاش حسن بن صباح کا استاد اور پیرو مرشد تھا اور عالم و فاضل تھا، دانشمندوں کا دانشمند تھا لیکن اُس نے علم و فضل کو خیر کی بجائے شر کے

لئے استعمال کیا۔ انسان کو نفس پر قابو پانے کے سبق دینے کی بجائے اسے نفس کا غلام بنایا۔ ابلیس سے بچنے کی بجائے اپنے آپ میں ابلیسی اوصاف پیدا کئے۔

وحی کی آواز سنئے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں:

"بھلا دیکھو اُس شخص کو جس نے اپنی خواہشات کو پوجنا زیادہ پسند کیا۔ اے رسولؐ کیا تو ایسے شخص (کی نجات کی) ذمہ داری لے سکتا ہے؟ کیا تو یہ توقع رکھتا ہے کہ ایسے اشخاص میں بہت سے ایسے ہوں گے جو سنتے اور سمجھتے ہوں گے؟ نہیں۔ یہ حیوانوں کے برابر ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں راہ سے"۔ (الفرقان-43'44)

یہ تو اللہ کی آواز تھی کہ وہ لوگ انسان نہیں حیوان ہیں جو خواہشات کے پجاری ہوتے ہیں لیکن حسن بن صباح نے انسان کو نہایت دلکش خواہشات دے کر حیوان بنایا۔ یہ سبق اسے اس کے استاد نے دیا تھا۔

○

"اب بتاؤ حسن!" ـــ عابدین کے جانے کے بعد احمد بن غطاش نے حسن بن صباح سے پوچھا ـــ "اس صورتِ حال میں ہمیں کیا پیش بندی یا تحفظ کرنا چاہئے!"۔

"ہاں استادِ محترم!" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "ہمارے پاس کوئی فوج نہیں کہ ہم اپنا تحفظ کر سکیں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں یہ کہوں گا کہ ہمیں اس علاقے پر چھا جانا چاہئے۔ تبلیغ کا سلسلہ صرف شروع ہی نہیں کرنا بلکہ اسے بہت تیز کرنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہماری لڑکیوں میں ابھی جذبات زندہ ہیں۔ انہیں تربیت کی ضرورت ہے، لیکن اس سے زیادہ ضروری تبلیغ ہے۔ ہم لوگوں کو زیرِ اثر لے کر ان کی فوج بنائیں گے"۔

"لوگوں سے کیا کہو گے؟" ـــ احمد بن غطاش نے پوچھا۔

"ہم ان کے سامنے اپنے عقیدے رکھیں گے" ـــ حسن نے کہا ـــ "اور انہیں بتائیں گے کہ دوسرے تمام مذہب اور اُن کے نظریات باطل ہیں"۔

"پیغمبروں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا" ـــ احمد بن غطاش نے کہا ـــ "ان کی کسی نے نہیں سنی تھی۔ ہمیں کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جس سے لوگوں کے

دلوں پر قبضہ کیا جا سکے"۔

"کیا آپ کے سامنے کوئی ایسا طریقہ ہے؟" ــــ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ہاں حسن!" ــــ احمد بن عطاش نے کہا ــــ "تم مجسّم وہ طریقہ ہو۔ تم میں وہ اوصاف موجود ہیں جو کسی بھی انسان کو گرویدہ کر سکتے ہیں"۔

"ہاں استادِ محترم!" ــــ حسن نے کہا ــــ "یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ مجھ میں کوئی ایسی طاقت ہے جو ہر انسان میں نہیں ہوتی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ میں سیدھے راستے پر چلنے والے لوگوں کو جس راستے پر ڈالنا چاہوں ڈال سکتا ہوں"۔

"ضرورت یہ ہے کہ تمہاری اس قوت کو ابھارا جائے" ــــ احمد بن عطاش نے کہا ــــ "دوسرے مذاہب نے انسان کو بدی سے ہٹنے کے سبق دیئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے کسی بھی مذہب کو یا کسی بھی عقیدے کو قبول کرنے میں بہت دیر لگائی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بدی میں لذت ہوتی ہے اور انسان میں خدا نے یہ کمزوری رکھ دی ہے کہ اسے لذت پرست اور عیش پسند بنا دیا ہے"۔

"لیکن استادِ محترم!" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "میرے استادِ ابنِ عطاش نے مجھے بتایا تھا کہ انسان میں یہ کمزوری خدا نے نہیں بلکہ ابلیس نے پیدا کی ہے اور انسان کی بدنصیبی یہ ہے کہ اس کی ذات نیکی اور بدی کی معرکہ آرائی کا میدانِ جنگ بنی رہتی ہے"۔

"یوں ہی سہی!" ــــ احمد بن عطاش نے کہا ــــ "میرا مطلب یہ ہے کہ انسانوں میں بدی کو ابھارا جائے..... انسانی فطرت کا یہ بنیادی اصول یاد رکھو حسن! اسے تم انسان کی کمزوری بھی کہہ سکتے ہو۔ وہ یہ ہے کہ ہر انسان بہشت میں جانا چاہتا ہے لیکن مرنا کوئی بھی نہیں چاہتا..... ان کی ضرورت یہ ہے کہ انہیں دنیا میں ہی بہشت دکھا دی جائے۔ پھر دیکھنا کہ یہ لوگ کس طرح تمہیں نبی اور پیغمبر ماننے ہیں"۔

"میں انہیں دنیا میں بہشت دکھا سکتا ہوں" ــــ حسن نے کہا ــــ "یہ بہشت میرے خیالوں میں ہے جو میں سب کو دکھا دوں گا۔ میں اگر انسانی فطرت کو غلط نہیں سمجھا تو میری رائے یہ ہے کہ انسان اسراریت کے پیچھے زیادہ بھاگتا ہے۔ ایک چیز اس کے سامنے رکھ دی جائے تو وہ اسے ذرا مشکل سے ہی قبول کرتا ہے۔ اگر اسی چیز کو پُراسرار بنا دیا جائے تو انسان اس کی طرف لپکتا ہے، پردے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے، پردوں کے

پیچھے جھانکتا ہے اور جب یہ چیز اس کے سامنے آجاتی ہے تو وہ اسے گوہرِ نایاب سمجھ کر سینے سے لگا لیتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنا طریقہ استعمال کروں"۔

"ہاں حسن!" ــــ احمد بن عطاش نے کہا ــــ "اگر تم انسانی فطرت کی بنیادی کمزوریاں سمجھ گئے ہو تو اس میدان میں اُترو۔ میں اس شہر کا والی ہوں۔ مجھ سے جو بھی اور جیسی بھی مدد مانگو گے وہ میں دوں گا۔ تم کتنا ہی انتہائی اقدام کر گزرو مجھے اپنے ساتھ پاؤ گے..... یہ یاد رکھو کہ انسان خدا کے حکم کو نظرانداز کر کے ابلیس کی بات مان لیتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کی کمزوری ہے کہ وہ شجرِ ممنوعہ کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ میں نے تمہیں سحر کی طاقت بھی دے دی ہے۔ تم کسی بھی انسان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگو تو وہ آدمی مسحور ہو جائے گا۔ میں نے تمہیں علم نجوم بھی دیا ہے۔ تم ستاروں کی گردش اور چال دیکھ کر صحیح فیصلہ کر سکتے ہو کہ تمہارا اگلا قدم آگے بڑھنا چاہئے یا پیچھے ہٹنا چاہئے"۔

دونوں نے مل کر ایک ایسا منصوبہ تیار کیا جس نے انسانیت کو ہلا کر رکھ دیا اور تاریخ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ تاریخ نے اس کی ہر ایک تفصیل کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا تاکہ رہتی دنیا تک انسان اپنی تاریخ کا یہ حیرت انگیز، سنسنی خیز اور شرمناک باب پڑھتا رہے۔ انسان نے آج تک عبرت حاصل نہیں کی۔ آج بھی انسان اسراریت اور بدی کی دلکشی کا رسیا ہے۔ وہ اپنے خیالوں میں حسن بن صباح کی جنّت آباد کئے رکھتا ہے اور اس کا زیادہ تر وقت اسی جنت میں گزرتا ہے۔

○

قلعہ شاہ در سے آگے خلجان نام کا ایک اور قلعہ تھا۔ اس وسیع و عریض خطّے میں ایسے چند اور قلعے بھی تھے جن میں سب سے زیادہ مشہور قلعہ الموت تھا جو کچھ عرصے بعد حسن بن صباح کا مرکز بنا اور یہیں اُس نے اپنی جنّت بنائی جس کی تفصیلات تاریخ میں آج تک محفوظ ہیں۔ احمد بن عطاش اور حسن بن صباح کے منصوبے کی پہلی کڑی یہ تھی کہ ان تمام قلعوں پر قبضہ کیا جائے۔ ان کے پاس کوئی فوج تو تھی نہیں۔ پھر بھی انہیں یقین تھا کہ وہ اپنے عزائم میں کامیاب ہو جائیں گے۔

قلعہ شاہ در سے بارہ چودہ کوس دُور ایک بڑا خوبصورت کوہستانی خطّہ تھا جس میں اونچی نیچی ٹیکریاں اور ان سے اونچی پہاڑیاں تھیں۔ یہ ایک سبزہ زار تھا جو قدرت کے

ہاتھوں نے بڑی محنت اور بڑی محبت سے تیار کیا تھا۔ اس میں ایسے درخت تھے جو کسی اور خطے میں نظر نہیں آتے تھے۔ بعض ٹیکریوں اور پہاڑیوں پر شاہ بلوط کے گھنے درخت تھے۔ شفاف پانی کی ندیاں بہتی تھیں۔ درختوں میں سے گزرتی ہوئی ہوا اور ندیوں کا جل ترنگ یہاں سے گزرنے والوں پر سحر طاری کر دیا کرتا تھا۔

کچھ دنوں سے اس علاقے میں رہنے والے لوگوں میں یہ خبر پھیل گئی تھی کہ رات کے وقت کبھی کبھی شاہ بلوط کے ایک درخت میں سے ایک ستارہ سا چمکتا ہے جو بجھتا ہے اور کچھ دیر بعد پھر چمکتا ہے۔ یہ خبر شاہ در تک پہنچی اور پھر یہ اس تمام علاقے میں پھیل گئی۔

اس کی شہرت ایسی پھیلی کہ لوگ دور دور سے آنے لگے۔ وہ اس ہرے بھرے جنگل میں اس ستارے کی چمک کے انتظار میں تین تین چار چار دن وہاں قیام کرتے۔ ستارہ چمکتا تو کسی پر خوف اور کسی پر تقدس کا تاثر طاری ہو جاتا۔ کوئی کہتا کہ یہ کسی پیغمبر کے ظہور کی نشانی ہے اور اکثر لوگ یہ کہتے تھے کہ اس خطے پر خدا کی نوازشیں اور رحمتیں نازل ہوں گی۔ زیادہ تر کا خیال یہی تھا کہ یہ کوئی برا شگون نہیں۔

کچھ دن اور گزرے تو ستارے کی چمک سے پہلے نقارہ اور شہنائیاں بجتیں اور پھر شاہ بلوط کی گھنی شاخوں میں سے ستارے کی چمک دکھائی دیتی۔

کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ آگے بڑھتا اور دیکھتا کہ یہ چمک کیسی ہے۔ دن کے وقت لوگوں نے اس درخت سے دور رہنا پسند کیا۔ بزرگوں اور دانشمندوں نے بھی لوگوں سے یہی کہا کہ ادھر نہ جانا کیونکہ یہ جنات بھی ہو سکتے ہیں اور یہ کوئی خدائی اشارہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جنات ناراض ہو کر اس سارے علاقے پر قہر نازل کریں یا خدا ہی ناراض نہ ہو جائے۔

کچھ دن اور گزرے تو سبز ریشمی چغوں میں ملبوس آدمی لوگوں کے ہجوم میں نظر آنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں تسبیحیں تھیں اور ان کے ہونٹ یوں ہلتے تھے جیسے کچھ پڑھ رہے ہوں۔ لباس، چال ڈھال اور انداز سے وہ عالم فاضل لگتے تھے۔ وہ جو کوئی بھی تھے، ایک ایک کر کے لوگوں میں بکھر گئے۔

"خدائے بزرگ و برتر اس علاقے کو باران نعمت سے نواز رہا ہے" —— ان میں سے ہر ایک آدمی یہی کہتا پھرتا تھا۔

"خدا کی طرف سے کوئی برگزیدہ ہستی اس جگہ اتر رہی ہے"۔

"یہ حضرت عیسیٰؑ بھی ہو سکتے ہیں"۔

"ہو سکتا ہے حضرت موسیٰؑ ہی ہوں"۔

"یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہو سکتے ہیں"۔

"کوئی نبی یا پیغمبر نہ ہوا تو خدا کا ایلچی ہو گا"۔

"راتوں کو جاگتے رہو۔ ستارہ چمکے تو سجدے میں گر پڑو"۔

"چمک کی طرف دیکھتے نہ رہا کرو کہ یہ خدا کے مقدس ایلچی کی توہین ہو گی"۔

اور اس قسم کی اور بھی بہت سی قیاس آرائیاں، پیشین گوئیاں اور ہدایتیں تھیں جو سبز چغوں والوں کی زبانوں کا ورد بن گئی تھیں۔ لوگ ان کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ انہوں نے بڑی ہی پر اثر آواز میں وعظ شروع کر دیئے۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ ہر کوئی ان سے متاثر ہو جاتا تھا۔

○

ایک رات نقارہ اور اس کے ساتھ شہنائیاں بجیں تو لوگوں نے ادھر دیکھنا شروع کر دیا جدھر ستارے کی چمک دکھانے والا شاہ بلوط کا درخت تھا۔ رات تاریک تھی۔ نقارہ اور شہنائیاں بجتی رہیں لیکن ستارے کی چمک نظر نہ آئی۔

"بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھو" —— سبز چغے والے ایک آدمی نے بلند آواز سے کہا۔

وہاں اب ہزاروں انسانوں کا ہجوم تھا۔ ان میں مسلمان زیادہ تھے۔ باقی عیسائی، یہودی اور دوسرے عقیدوں کے لوگ تھے۔ مسلمانوں نے کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیا۔ دوسروں نے اپنے اپنے مذہب کے مطابق کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔

"سجدے میں گر پڑو" —— ایک آواز آئی۔

تمام لوگ سجدے میں چلے گئے۔ جو مسلمان نہیں تھے وہ بھی سر بسجدہ ہو گئے۔

"اے خدائے ذوالجلال!" —— ایک بڑی ہی بلند آواز ابھری —— "یہ سب تیرے گناہ گار اور عاجز بندے ہیں۔ ان کے گناہ بخش دے اور ہمیں اپنی خدائی کا جلوہ دکھا دے۔ ہم سے اپنے نور کے نزول کا اتنا انتظار نہ کرا"۔

پراسرار رات خاموش ہو گئی۔ لوگ جو کلمہ طیبہ کا ورد کر رہے تھے وہ اس آواز پر

خاموش ہو گئے تھے۔ ہر آدمی کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔

"اٹھو اور دیکھو" ـــــ ایک اور آواز ابھری۔

لوگوں نے شاہ بلوط کے درخت کی طرف دیکھا۔ وہاں ستارہ تو نہیں تھا لیکن ایک روشنی آہستہ آہستہ اوپر سے نیچے آئی جس میں درخت کی گھنی شاخوں کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ یہ روشنی زیادہ پھیلی ہوئی نہیں تھی' یہ تقریباً" تین فٹ لمبی اور اتنی ہی چوڑی تھی۔ یہ پہلے درخت پر گھومتی پھرتی رہی پھر نیچے آئی۔ دُور سے شاہ بلوط کا یہ درخت یوں لگتا تھا جیسے بہت بڑی چھتری ہو۔

روشنی اس وسیع و عریض چھتری پر گھومتے گھومتے آہستہ آہستہ نیچے آئی تو ایک انسان کا ہیولہ نظر آیا جو سر سے پاؤں تک سفید کپڑوں میں ملبوس تھا۔ کبھی تو یوں لگتا تھا جیسے یہ کفن میں لپٹی ہوئی لاش ہو۔ روشنی اس کے سر سے پاؤں تک آئی اور پھر پاؤں سے سر تک چلی گئی۔ غور سے دیکھنے سے معلوم ہُوا کہ اس نے بڑا لمبا سفید چغہ پہن رکھا ہے اور اس کے سر پر دستار ہے۔

اُس نے اپنے بازو پھیلا دیئے۔ تھوڑی دیر بعد روشنی بجھ گئی اور یہ آدمی غائب ہو گیا۔

لوگوں پر خوف و ہراس بھی اور تقدّس بھی طاری ہوا اور وہ پہلے سے زیادہ بے تاب ہونے لگے کہ کوئی انہیں بتائے کہ یہ کون ہے اور یہ سب کیا ہے۔

سبز چغوں والے آدمی رات ہی رات کہیں غائب ہو گئے۔ اگلی رات وہ پھر وہاں موجود تھے۔ لوگوں نے انہیں گھیر لیا اور ان سے پوچھنے لگے کہ یہ سب کیا ہے۔

"صرف ایک شخص ہے جو ہم سب کی راہنمائی کر سکتا ہے"ـــ چغوں والوں میں سے ایک نے کہا ـــ "لیکن اسے یہاں لانا بہت مشکل ہے"۔

"ہمیں بتاؤ وہ کون ہے!" ـــ ایک آدمی نے پوچھا اور اُس نے کہا ـــ "وہ جہاں کہیں بھی ہُوا ہم اُسے لے آئیں گے۔ ہمیں جو بھی قیمت دینی پڑی ہم دیں گے"۔

"وہ قلعہ شاہ در کا والی ہے" ـــ ایک سبز پوش نے کہا ـــ "اس کا نام احمد بن عطاش ہے۔ اُس کے پاس کوئی ایسا علم ہے جس کے زور پر وہ غیب میں چھپے ہوئے راز بھی بتا دیا کرتا ہے"۔

"ہمیں اس کے پاس لے چلو" ـــ لوگوں نے سبز پوشوں سے کہنا شروع کر دیا۔

"لیکن ایک بات سوچ لو" ـــ ایک بزرگ سبز پوش نے انہیں کہا ـــ "وہ تمہیں سب کچھ بتا دے گا لیکن تمہیں اس کی بات ماننی پڑے گی"۔

"وہ کیا بات منوائے گا؟"

"وہ تم سے جان کی قربانی نہیں مانگے گا" ـــ سبز پوش نے کہا ـــ "پہلے وہ یہ دیکھے گا کہ جس ہستی کا ہیولہ نظر آیا ہے' وہ کون تھا اور کیا تھا اور کیا وہ پھر بھی نظر آئے گا؟ اس کے بعد وہ بتائے گا کہ لوگوں کو کیا کرنا چاہئے"۔

"ہم اُس کے پاس جائیں گے" ـــ کئی ایک آوازیں اٹھیں۔

○

اس علاقے میں تھوڑے سے گھروں کی ایک بستی تھی جن میں زیادہ تر گھر عیسائیوں کے تھے اور دو یا تین گھر یہودیوں کے تھے۔ اس بستی کے لوگ بھی شاہ بلوط میں چمکنے والے ستارے کو دیکھنے جایا کرتے تھے اور ان میں کچھ تو ایسے تھے جو کئی دنوں سے وہیں جا بیٹھے تھے جہاں سے شاہ بلوط کا وہ درخت نظر آتا تھا۔

یہودیوں میں ایک بوڑھا مذہبی پیشوا بھی تھا اور عیسائیوں کا ایک بوڑھا پادری بھی تھا۔ ایک روز پادری یہودیوں کے رِبّی (مذہبی پیشوا) کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ اس ستارے کے معاملے میں وہ خاصا پریشان ہے۔

"میں خود پریشان ہوں فادر!" ـــ ربّی نے کہا ـــ "یہ کوئی شعبدہ بازی ہے اور یہ لوگوں کے عقیدے خراب کرنے کے لئے تخریب کاری ہو رہی ہے۔ نبی اور پیغمبر اس طرح ظاہر نہیں ہُوا کرتے نہ ہی خدا عام بندوں کو یوں اپنا نور دکھایا کرتا ہے جس طرح ہم یہ تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ خدا نے اپنا جلوہ حضرت موسیٰؑ کو کوہِ طور پر دکھایا تھا۔ وہ بھی صرف ایک بار۔ اسے آپ بھی مانتے ہیں' ہم بھی مانتے ہیں اور مسلمانوں کا بھی یہی عقیدہ ہے"۔

"کچھ سوچیں محترم ربّی!" ـــ پادری نے کہا ـــ "مجھے شک ہے کہ یہ مسلمانوں کا ناٹک ہے۔ میرے خیال میں یہ ناٹک اس لئے کھیلا جا رہا ہے کہ اسلام کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دیا جا سکے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام میں کتنے فرقے پیدا ہو گئے ہیں"۔

"میں بڑے غور اور دلچسپی سے دیکھ رہا ہوں فادر!" ——رَبّی نے کہا—— "میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایک فرقہ اور پیدا ہو رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہم اپنے آدمی مسلمانوں کے روپ میں اس فرقے میں داخل کریں گے تاکہ یہ نیا فرقہ پھلے پھولے اور اسلام مزید کمزور ہو۔ ہمارے آدمی مسلمان مولویوں اور خطیبوں کے بہروپ میں دُور دراز آبادیوں میں بکھر جائیں گے اور اس نئے فرقے کی حمایت میں قرآن اور احادیث کے حوالے دے دے کر مسجدوں میں وعظ کرتے پھریں گے، لیکن یہ معلوم کرنا ضروری ہو گیا ہے کہ یہ کیسی شعبدہ بازی ہو رہی ہے"۔

"یہ پُراسرار سلسلہ مسلمانوں کا ہی معلوم ہوتا ہے" ——پادری نے کہا—— "یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جس رات روشنی میں ایک سفید پوش آدمی دکھایا گیا' اُس رات سبز چغوں میں ملبوس کچھ آدمیوں نے لوگوں سے کہا تھا کہ وہ کلمہ پڑھیں اور سجدہ ریز ہو جائیں۔ یہ کلمہ مسلمانوں کا ہے اور سجدے بھی مسلمان ہی کیا کرتے ہیں..... لوگ پسماندہ ہیں اس لئے وہ شعبدہ بازی کو بھی خدا کا معجزہ سمجھ لیتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کو گمراہ کیا جا رہا ہے تو یہ ہمارا مسئلہ نہیں"۔

"بلکہ ہمیں خوش ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کو گمراہ کیا جا رہا ہے۔ ہمیں اپنی قوم کا خیال رکھنا چاہئے کہ انہیں کوئی گمراہ نہ کرے"۔

"لیکن کیا کیا جائے!" ——پادری نے کہا—— "میں ایک دو عقل اور جرأت والے جوان دے سکتا ہوں جو دن یا رات کے وقت پہاڑیوں کے اندر جا کر دیکھ لیں گے کہ یہ روشنی مصنوعی دکھائی جا رہی ہے یا یہ کوئی مافوق الفطرت روشنی ہے"۔

"میں نے ستارے کی چمک خود جا کے دیکھی ہے" ——رَبّی نے کہا—— "وہ چراغ کی یا مشعل کی روشنی نہیں۔ روشنی سفید ہوتی ہے جو چمکتی ہے اور یک لخت بجھ جاتی ہے۔ اگر مشعل ہو تو صاف پتہ چل جائے کہ یہ شعلہ ہے' اِدھر سے آیا ہے اور اُدھر چلا گیا۔ شاہ بلوط کی چمک میں شعلہ نہیں ہوتا..... آپ صرف ایک آدمی تیار کریں اور ایک آدمی میں تیار کر لوں گا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ اسلام کا خاتمہ اور اس کے لئے ہر وقت مصروفِ عمل رہنا ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔ میں آپ کے آدمی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا' میں اپنے آدمی کے متعلق بتا سکتا ہوں کہ میرے حکم پر جان قربان کر دے گا"۔

"پھر ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے" ——پادری نے کہا۔

"آج رات اپنے آدمی کو ساتھ لے کر میرے پاس آ جائیں" ——رَبّی نے کہا

○

رات کو جب ہزارہا لوگ شاہ بلوط سے دُور ستارے کی چمک کے انتظار میں گھروں سے دُور بیٹھے تھے' اُس وقت دو جواں سال آدمی یہودیوں کے مذہبی پیشوا کے گھر اُس کی اور پادری کی باتیں سن رہے تھے۔ ان دونوں نے بھی شاہ بلوط میں ستارے کو چمکتے دیکھا تھا اور وہ بھی قائل ہو گئے تھے کہ یہ آسمان کا ستارا ہے جو شاہ بلوط کے اس پرانے درخت کی گھنی شاخوں میں اتر آیا ہے۔

"آسمان کے ستارے زمین پر نہیں اُترا کرتے" ——رَبّی نے ان دونوں سے کہا—— "اگر یہ مان لیا جائے کہ خدا اپنا جلوہ دکھا رہا ہے تو یہ سوچو وہ کسے دکھا رہا ہے۔ کیا حضرت موسیٰؑ پھر دنیا میں آ گئے ہیں یا حضرت عیسیٰؑ پھر زمین پر اُتر آئے ہیں؟..... نہیں...... بار بار اپنا جلوہ دکھانے کی خدا کو کیا ضرورت پیش آ گئی ہے؟ کیا یہاں کے انسانوں نے خدا کو رَد کر کے کسی اور کی عبادت شروع کر دی ہے؟ کوئی مسلمان ہے یا عیسائی یا کوئی یہودی ہے' یہ سب اپنے اپنے طور طریقے سے خدا کو یاد کر رہے ہیں..... میری بات غور سے سنو میرے بچو! جس پہاڑی پر یہ درخت ہے اس کے پیچھے کہیں روشنی کا انتظام نہیں تو یہ کوئی شعبدہ بازی ہے۔ تم نے چُھپ چُھپ کر وہاں پہنچنا ہے اور دیکھنا ہے۔ اگر تمہیں کوئی ایسی چیز نظر آئے اور پتہ چل جائے کہ یہ کیا راز ہے تو تم نے وہاں کوئی کارروائی نہیں کرنی۔ خاموشی سے واپس آ جانا ہے"۔

"یہ ہمارا ذاتی کام نہیں" ——پادری نے کہا—— "یہ ہمارا مذہبی معاملہ ہے۔ یہ کوئی نیا فرقہ اٹھ رہا ہے جس سے لوگ بڑی تیزی سے متاثر ہوئے جا رہے ہیں۔ اگر لوگوں کی عقیدت مندی کا یہی حال رہا تو یہ عیسائیت اور یہودیت کے لئے بہت ہی نقصان دہ ہو گا۔ اگر یہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ ہے تو ہم اسے مزید ہوا دیں گے۔ یہ اب تمہاری ذمہ داری ہے کہ ہمیں صحیح خبر لا کر دو"۔

"ہم کل سورج غروب سے کچھ پہلے روانہ ہو جائیں گے" ——یہودی جوان نے کہا۔

"جگہ دُور ہے" ——عیسائی جوان بولا—— "ہم سیدھے تو جا نہیں سکتے۔ سیدھے

جائیں تو ہمارے لئے یہ فاصلہ کچھ بھی نہیں۔ ہمیں پیدل جانا پڑے گا۔ گھوڑوں پر جائیں گے تو گھوڑوں کو چھپائیں گے کیسے! گھوڑا کہیں بھی ہنہنا کر اپنی نشاندہی کر دے گا"۔

"میں ایک بات صاف کر دوں" — یہودی جوان نے کہا — "میں یہ وعدہ نہیں کرتا کہ یہ کام ایک ہی رات میں ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے دو یا تین راتیں ہم واپس ہی نہ آسکیں"۔

"ایسی کوئی پابندی نہیں" — ربّی نے کہا — "تم نے اپنے آپ کو بچا کر رکھنا ہے اور پوری کوشش کرنی ہے کہ زندہ واپس آجاؤ تاکہ ہمیں صحیح صورتِ حال معلوم ہو جائے اور ہم اس کا کوئی سدِّباب کر سکیں"۔

"آپ کو یہ وہم نہیں ہونا چاہئے کہ ہم آپ کو دھوکہ دیں گے" — یہودی جوان نے کہا — "ہم آپ کا مقصد سمجھ گئے ہیں"۔

"اب تم دونوں چلے جاؤ" — ربّی نے کہا — "پانی کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہو گا کھانے کے لئے کھجوریں ساتھ لے جاؤ"۔

باہر آکر ان دونوں جوانوں نے آپس میں طے کر لیا کہ وہ کہاں ملیں گے۔ یہودی جوان اپنے گھر سیدھا جانے کی بجائے ایک اور طرف سے گیا۔ ایک گھر کے سامنے بچے کھیل رہے تھے۔ ایک بچے سے اس نے پوچھا کہ اُس کی بہن میرا کہاں ہے۔ بچے نے اسے بتایا کہ تھوڑی دیر ہوئی وہ بکریوں کو لے کر نکلی ہے۔

یہودی اپنے گھر جانے کی بجائے اُس طرف چلا گیا جس طرف میرا گئی تھی۔ گاؤں سے کچھ دور بڑی اچھی چراگاہ تھی جہاں چھوٹی گھاس بھی تھی اور اونچی بھی۔ یہ دونوں اسی جگہ ملا کرتے تھے۔ وہاں سے چھوٹی سی ایک ندی گزرتی تھی۔ ندی کے کنارے گھنی جھاڑیاں تھیں اور خودرُو بیلیں درختوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ یہودی اُدھر جا رہا تھا کہ میرا نے اسے دیکھ لیا اور وہ اس کی طرف دوڑ پڑی۔ یہودی جوان نے بھی اپنے قدم تیز کر لئے اور دونوں اس طرح ملے جیسے بے خیالی میں ان کی ٹکر ہو گئی ہو۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ انہیں ایسی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ کوئی انہیں دیکھ رہا ہو گا۔ سب جانتے تھے کہ یہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور ان کی شادی ہو جائے گی۔ اس لئے بھی بے حجاب تھے کہ یہودی تھے۔ کسی کو بے حیا کہنے کی بجائے یہودی کہہ دینا ہی کافی ہوتا تھا۔ یہودی کی تمام تر تاریخ فتنہ و فساد، فریب کاری اور عیاری کی تاریخ ہے

اور یہودی نے ہمیشہ اسلام کو اپنا ہدف اور مسلمانوں کو دشمن نمبر ایک بنائے رکھا ہے۔ آج بھی یہ قوم اسلام کی بیخ کنی میں مصروف ہے۔

اپنے ان ابلیسی عزائم کی کامیابی کے لئے یہودی اپنی لڑکیوں کو بڑے فخر سے استعمال کیا کرتے تھے اور اپنی بیٹیوں کا شعور بیدار ہوتے ہی انہیں بے حیائی کے سبق دینے لگتے تھے۔ سرِعام فحش حرکتیں کرنا اور مردوں کے ساتھ قابلِ اعتراض اور شرمناک حالت میں دیکھے جانا ان کے ہاں معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اپنی بیٹی، بہن یا بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ دیکھ کر اعتراض کرنا قابلِ اعتراض فعل سمجھا جاتا تھا۔ البتہ ایسی نوجوان لڑکی یا عورت کے پیشِ نظر ذاتی عیاشی نہیں بلکہ قومی مقصد ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔

اس جواں سال یہودی اور ایک نوجوان لڑکی کا یوں ملنا کہ ان کے جسموں کے درمیان سے ہوا بھی نہ گذر سکے، قابلِ اعتراض فعل نہیں تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے ندی تک گئے اور وہاں بیٹھ گئے۔

"میں تمہیں الوداع کہنے آیا ہوں میرا!" — یہودی جوان نے کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو اسحاق؟" — میرا نے بدک کر اس سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟"

"ایک مہم پر!" — اسحاق نے کہا۔

"کیسی مہم؟ کون سی مہم؟" — میرا نے پوچھا — "کیا یہ کوئی خطرناک کام ہے؟"

"خطرناک ہو سکتا ہے" — اسحاق نے کہا — "اور آسان اتنا کہ ہو سکتا ہے میں کل ہی واپس آجاؤں ...... تم نے وہ ستارہ دیکھا ہے نا جو دُور پہاڑی پر چمکتا ہے۔ ہم دونوں نے اکٹھے دو تین بار دیکھا ہے۔ میں دیکھنے جا رہا ہوں یہ کیا ہے۔ میرے ساتھ بنو تغلب کا ایک عیسائی آسر بن جوئیل بھی جا رہا ہے"۔

اسحاق نے میرا کو اپنے ربّی اور پادری کی ساری باتیں سنائیں اور بتایا کہ یہ راز معلوم کرنا کیوں ضروری ہے۔

"اگر یہ جنات ہوئے" — میرا نے کہا — "یا کوئی اور غیر انسانی مخلوق ہوئی تو پھر کیا کرو گے؟"

"ہم دُور سے دیکھ کر واپس آجائیں گے" — اسحاق نے کہا — "ہم نے ان پر حملہ تو نہیں کرنا، صرف دیکھنا ہے کہ وہاں ہم جیسے انسان ہیں یا یہ کوئی خدائی اشارہ ہے"۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی" ــــ میرا نے کہا ــــ "میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گی"۔

"جذباتی نہ بنو میرا!" ــــ اسحاق نے کہا ــــ "وہاں تمہارا کوئی کام نہیں۔ میں دو تین دنوں بعد واپس آجاؤں گا"۔

"مجھے ساتھ نہیں لے جانا تو تم بھی نہ جاؤ" ــــ میرا نے روتے ہوئے کہا ــــ "میں جذباتی بات نہیں کر رہی۔ میرا دل خوف کی گرفت میں آگیا ہے" ــــ اس نے اسحاق کے گلے میں باہیں ڈال کر رندھی ہوئی آواز میں کہا ــــ "نہ جاؤ اسحاق! جانا ہے تو مجھے بھی ساتھ لے چلو"۔

اسحاق کو اس نے اتنا مجبور کر دیا کہ اسحاق نے اُسے کہا کہ وہ ربّی کے پاس جائے اگر ربّی اجازت دے دے تو وہ اُسے ساتھ لے جائے گا۔

یہ لڑکی اسحاق کو اس قدر چاہتی تھی کہ اُسی وقت ربّی کے گھر کی طرف دوڑی اور اسے بھی جا کر کہا کہ وہ اسحاق کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔

"اسحاق اپنے فرض کے لئے جا رہا ہے" ــــ ربّی نے کہا ــــ "اور تم محبت کے لئے جا رہی ہو۔ فرض آدمی کو آگے ہی آگے دھکیلتا ہے لیکن محبت پاؤں کی زنجیر بن جایا کرتی ہے..... نہیں میرا! تم ان لڑکوں کے ساتھ نہ جاؤ۔ یہ دو تین دنوں تک واپس آجائیں گے"۔

"مجھے معلوم ہے وہ کیوں جا رہے ہیں" ــــ میرا نے کہا ــــ "وہاں انہیں میری ضرورت ہو گی۔ اسحاق نے مجھے بتا دیا ہے کہ وہ مہم کیا ہے جس پر وہ جا رہے ہیں"۔

"نادان لڑکی!" ــــ ربّی نے کہا ــــ "یہ کام آدمی کر سکتے ہیں۔ یہ کسی عورت کے کرنے کا کام نہیں"۔

لڑکی ہنس پڑی۔ ربّی اور زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔

"جو کام میں کر سکتی ہوں وہ اسحاق اور آسر نہیں کر سکتے" ــــ میرا نے کہا ــــ "دیکھنا یہ ہے کہ وہاں کوئی ہم جیسے انسان ہیں یا یہ کوئی مافوق الفطرت مظاہرہ ہے۔ اگر ا[illegible] دو آدمی آگے گئے تو وہ مارے بھی جا سکتے ہیں۔ اگر میں آگے چلی گئی تو وہاں ا[illegible] ہوئے تو ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی کو دیکھ کر اس طرح دوڑے آئیں گے جس طرح پرندہ دانے کو دیکھ کر جال میں آتا ہے۔ پھر ہمارے آدمی انہیں پکڑ لیں گے۔

دیکھ کر واپس آجائیں گے کہ وہاں جنات یا کوئی آسمانی مخلوق نہیں بلکہ ہم جیسے انسان ہیں"۔

"وہ تمہیں پکڑ لیں گے" ــــ ربّی نے کہا ــــ "کیا تم نہیں جانتی کہ وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

"جانتی ہوں ربّی!" ــــ میرا نے کہا ــــ "کچھ قربانی تو دینی پڑے گی لیکن میں انہیں دھوکہ دے کر وہاں سے نکل آؤں گی۔ میں اس مقصد کو سمجھتی ہوں جس مقصد کے لئے آپ ان دونوں آدمیوں کو بھیج رہے ہیں۔ یہ ہمارا قومی مقصد ہے..... اور محترم ربّی! جہاں تک جذبات کا تعلق ہے، میں اسحاق کا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔ اگر اس نے مرنا ہے تو میں بھی اس کے ساتھ مروں گی۔ اگر آپ مجھے نہیں جانے دیں گے تو میں اسحاق کو بھی نہیں جانے دوں گی"۔

ربّی کے بوڑھے چہرے کی لکیریں سُکڑنے لگیں۔ وہ گہری سوچ میں کھو گیا تھا۔ میرا اسے چپ چاپ دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد ربی نے میرا کی طرف دیکھا۔

"ہاں لڑکی!" ــــ ربّی نے کہا ــــ "اگر تم محبت کی بجائے فرض کو ترجیح دیتی ہو تو اسحاق کے ساتھ چلی جاؤ۔ تم ان کی کامیابی کا باعث بن سکتی ہو اور تم انہیں ناکام بھی کر سکتی ہو۔ اگر تم نے عقل سے کام لیا اور ذاتی جذبات کو دبائے رکھا تو تم اس قومی مقصد میں کامیاب لوٹو گی"۔

میرا وہاں سے اٹھ دوڑی اور سیدھی اسحاق تک پہنچی۔

میرا کے باپ کو پتہ چلا تو وہ ربّی کے ہاں دوڑا گیا۔ ربّی نے اُسے مطمئن کر دیا۔

○

سورج غروب ہو گیا تھا جب اسحاق، آسر اور میرا گاؤں سے نکلے۔ وہ اکٹھے نہیں نکلے تھے۔ انہیں چوری چھپے نکلنا تھا کیونکہ گاؤں میں مسلمان بھی رہتے تھے جنہیں اس مہم سے بے خبر رکھنا تھا۔ وہ اکیلے اکیلے نکلے تھے اور بہت دور جا کر اکٹھے ہوئے تھے۔ تینوں کے پاس خنجر تھے۔ اسحاق اور آسر کے پاس تلواریں بھی تھیں۔ وہ بہت دُور کا چکر کاٹ کر جا رہے تھے۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ لوگ اُس جگہ اکٹھے ہونے شروع ہو گئے تھے جہاں سے شاہ بلوط کا درخت نظر آتا تھا۔ جس کم اونچی پہاڑی پر وہ درخت تھا، اُس تک وہ سیدھے

تھوڑے سے وقت میں پہنچ سکتے تھے لیکن انہیں اس پہاڑی کے پیچھے جانا تھا۔ وہ اس ہجوم سے دور ہی دور ہٹتے گئے جو اس انتظار میں وہاں جمع ہو گیا تھا کہ آج رات بھی ستارہ چمکے گا یا وہ سفید پوش آدمی روشنی میں نظر آئے گا جو ایک بار نظر آ چکا ہے۔

اسحاق، آمر اور میرا اُس ندی تک پہنچ گئے جو ان کے گاؤں کے قریب سے گزرتی تھی۔ وہاں یہ ندی گہری بھی تھی اور اس کا بہاؤ تیز بھی تھا کیونکہ یہ پہاڑی ندی تھی۔ وہاں کوئی پل نہیں تھا۔ تینوں ندی میں اُتر گئے اور بازو ایک دوسرے میں الجھا لئے۔ پانی یخ تھا اور بہت ہی تیز۔ ان کے پاؤں اٹھنے لگے۔ تینوں نے اپنا ایک ایک بازو ایک دوسرے سے آزاد کر کے تیرنا شروع کر دیا۔ پانی کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ اگلے کنارے کی بجائے پانی انہیں اپنے ساتھ لے جا رہا تھا اور پانی یخ اتنا کہ ان کے جسم اکڑنے لگے۔ ندی بہت چوڑی تو نہیں تھی لیکن یوں پتہ چلتا تھا جیسے یہ میلوں چوڑی ہو گئی ہو۔

وہ آگے جانے کی بجائے خاصا پیچھے کنارے پر لگے۔ تینوں نے کپڑے اتار دیئے اور انہیں نچوڑا۔ رات کی یخ ہوا نے ان کے جسموں کو لکڑیوں کی طرح اکڑا دیا۔ میرا کو ایسا کوئی خیال نہ آیا کہ وہ دو جواں سال آدمیوں کے سامنے برہنہ ہو گئی ہے۔ تینوں نے نچوڑے ہوئے کپڑے پہن لئے اور اسحاق کے کہنے پر تینوں نے ناچنا کودنا شروع کر دیا تاکہ جسم گرم ہو جائیں۔ میرا آخر عورت تھی۔ قدرتی طور پر اس کا جسم مردوں جیسا سخت جان نہیں تھا اس لئے اُس نے محسوس کیا کہ وہ چل نہیں سکے گی۔ اسحاق اور آمر نے اُسے اپنے درمیان کھڑا کر کے ٹخنوں سے کندھوں تک اُس کے جسم کو دبانا اور ملنا شروع کر دیا اور اس طرح کچھ دیر بعد وہ چلنے کے قابل ہو گئی۔

وہ تینوں ندی کے ساتھ ساتھ چلتے گئے۔ وہ پہاڑی قریب آ گئی تھی جس پر شاہ بلوط کا درخت تھا لیکن یہ اس پہاڑی کا ایک سرا تھا۔ شاہ بلوط کا درخت اس کے دوسرے سرے پر تھا۔ جو سرا ان تینوں کے قریب تھا وہاں یہ پہاڑی ختم ہو جاتی تھی۔ پھر وہاں سے ذرا پیچھے ہٹ کر ایک اور پہاڑی شروع ہوتی تھی۔ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سے یہ تینوں شاہ بلوط والی پہاڑی کے پیچھے جا سکتے تھے۔

وہ چلتے گئے۔ چونکہ ان کی رفتار تیز تھی اس لئے ان کے جسم گرم ہو گئے اور اکڑن ختم ہو گئی۔ انہیں یہ تو معلوم تھا کہ پہاڑی کے پیچھے جانا ہے لیکن اس علاقے میں وہ پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح دور سے یہ خطہ سرسبز اور خوبصورت نظر آتا ہے اسی طرح سفر کے معاملے میں بھی یہ سہل اور خوبصورت ہوگا، لیکن آگے گئے تو انہیں پتہ چلا کہ اس خطے نے تو اپنے حسن میں کیسے کیسے خطرے چھپا رکھے ہیں۔

وہ جب دونوں پہاڑیوں کے درمیان پہنچے تو انہیں یوں محسوس کیا کہ وہ کسی اور ہی دنیا میں جا نکلے ہوں۔ ان کے سامنے تین طرف پہاڑیاں دیواروں کی طرح کھڑی تھیں۔ یہ دیواریں کسی پرانے قلعے کی پتھروں کی دیواروں جیسی تھیں۔ اندھیرے کے باوجود نظر آ رہا تھا کہ ان کے درمیان گدلا پانی جمع ہے۔ ایک طرف اس پانی اور دیوار کے درمیان اتنی جگہ خالی تھی کہ دو تین آدمی پہلو بہ پہلو آرام سے گزر سکتے تھے لیکن کچھ دور آگے پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ راستہ آگے جاتا ہے یا پانی میں ہی کہیں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ خوفناک سی جگہ تھی۔ صرف یہی ایک راستہ تھا جو پہاڑی کے پیچھے جاتا تھا۔ پہاڑی کے اوپر سے تو وہ جا ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ اوپر جا کر وہ نظر آ سکتے تھے۔

وہ اس راستے پر اس طرح چلے کہ میرا ان کے پیچھے تھی۔ ذرا ہی آگے گئے ہوں گے کہ انہیں اپنے پیچھے پانی میں ہلچل سی محسوس ہوئی! انہوں نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ اچانک میرا کی چیخ بلند ہوئی۔ اسحاق اور آمر نے پیچھے دیکھا۔ میرا گر پڑی تھی اور چیخ چلا رہی تھی۔ انہوں نے یہ دیکھ لیا کہ ایک مگرمچھ کا سر اور اگلی ٹانگیں پانی سے باہر ہیں اور میرا کا پاؤں ٹخنے تک مگرمچھ کے منہ میں ہے۔ مگرمچھ میرا کو پانی میں گھسیٹ رہا تھا۔

قدرت نے مگرمچھ کے دانت نوکیلے اور ایسے تیکھے نہیں بنائے کہ وہ انسان یا جانور کے گوشت میں اُتر جائیں۔ اُس کے دانتوں کے نیچے والے سرے گول ہوتے ہیں جو شکار کو صرف پکڑتے ہیں اور اوپر نیچے کے دانت بڑا مضبوط شکنجہ بن جاتے ہیں۔

اسحاق اور آمر نے صرف ایک بار مگرمچھ دیکھا تھا۔ وہ دونوں اُس وقت کم سن لڑکے ہوا کرتے تھے۔ دو آدمی ان کے گاؤں کے قریب سے گزرتے وہاں رک گئے تھے۔ انہوں نے ایک مرا ہوا مگرمچھ گھوڑے پر ڈال رکھا تھا۔ اسحاق اور آمر نے دیکھا تھا اور ان دونوں آدمیوں نے بتایا بھی تھا کہ مگرمچھ کے سر اور پیٹھ پر نہ برچھی اثر کرتی ہے نہ تلوار۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اس کا پیٹ اتنا نازک ہوتا ہے کہ ایک خنجر بھی پیٹ میں اتر جاتا ہے۔ اس کا دوسرا نازک حصہ اس کا منہ ہے۔ اگر اس کے کھلے ہوئے منہ کے اندر برچھی ماری جائے تو مگرمچھ مرتا تو نہیں زخمی ہو کر بھاگ جاتا ہے یا اس کی آنکھوں میں برچھی یا تلوار ماری جائے تو بھی یہ بھاگ جاتا ہے۔

مگرمچھ میرا کو پانی میں گھسیٹ رہا تھا۔ اسحاق نے بڑی تیزی سے تلوار نکالی۔ اندھیرا تو تھا لیکن پانی کی چمک میں مگرمچھ کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ اسحاق نے مگرمچھ کی آنکھ کا اندازہ کر کے تلوار کا زور دار وار کیا۔ آسر نے یہ دلیری کر دکھائی کہ پانی میں اتر گیا جو اُس کے گھٹنوں تک گہرا تھا۔ اُس نے مگرمچھ کے قریب جا کر نیچے سے تلوار برچھی کی طرح مگرمچھ کے پیٹ میں اتار دی۔

یہ دونوں وار ایسے ٹھکانے پر پڑے کہ مگرمچھ کے منہ سے بڑی خوفناک آواز نکلی اور وہ میرا کا پاؤں چھوڑ تڑپتا پھڑ پھڑاتا ہُوا پانی میں ڈبکی لگا گیا۔ میرا بڑی تیزی سے اٹھی۔ اسحاق اور آسر نے اسے ہاتھوں پر اٹھا لیا اور دوڑ پڑے۔ آگے انہیں راستہ ملتا گیا۔ پانی میں بڑی زور کی ہلچل ہو رہی تھی یہ یقیناً" زخمی مگرمچھ تھا جو تڑپ رہا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے مگرمچھ بھی ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔

یہ راستہ کچھ دُور تک چلا گیا۔ پانی پیچھے رہ گیا تھا۔ پانی سے کچھ دُور جا کر وہ رکے اور میرا کے پاؤں کا جائزہ لینے لگے۔ جس جگہ مگرمچھ نے اس کا ٹخنہ پکڑا تھا' وہاں ہاتھ پھیرا تو صاف پتہ چلتا تھا کہ خون بہہ رہا ہے۔ اگر مگرمچھ کے دانت درندوں کی طرح نوکیلے ہوتے تو میرا کی ہڈی بھی کٹ جاتی اور اُس کا پاؤں مگرمچھ کے ساتھ ہی چلا جاتا۔ چونکہ اس لڑکی کا پاؤں مگرمچھ کے جبڑوں کے شکنجے میں آیا تھا اور لڑکی زور لگا کر اپنا پاؤں کھینچ رہی تھی اور مگرمچھ اسے پانی میں کھینچ رہا تھا اس لئے لڑکی کے ٹخنے سے تھوڑی سی کھال اُتر گئی تھی اور ہڈی پر اچھی خاصی ضرب لگی تھی۔

اسحاق نے اپنے سر پر ڈالا ہُوا کپڑا اتار اور کس کر میرا کے ٹخنے پر باندھ دیا۔ میرا کے لئے درد ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا اور وہ چلنے میں دشواری محسوس کر رہی تھی۔

"میری ایک بات غور سے سنو" — میرا نے کہا — "یہ اچھا شگون نہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہیں سے واپس چلے چلو"۔

"ہوش ٹھکانے رکھو میرا!" — اسحاق نے کہا — "یہاں تک آ کر ہم واپس نہیں جائیں گے"۔

"ربّی اور فادر ہمیں بزدل کہیں گے" — آسر نے کہا — "وہ کہیں گے کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ تم یہیں کہیں چھپ کر بیٹھ جاؤ اور ہم اپنا کام کر کے واپس آئیں اور تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے"۔

"نہیں!" — میرا نے خوفزدہ آواز میں کہا — "میں یہاں اکیلی نہیں رہوں گی۔ میں کہہ رہی ہوں واپس چلو۔ میں اتنا زیادہ کبھی بھی نہیں ڈری تھی"۔

"تمہیں مگرمچھ نے ڈرا دیا ہے" — اسحاق نے کہا — "یہ خوف دل سے اتار دو"۔

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں!" — میرا نے کہا — "میرے دل پر کوئی خوف نہیں۔ اگر ہم ویسے گھومنے پھرنے آئے ہوتے اور مگرمچھ مجھے یوں پکڑ لیتا تو میں اتنا نہ ڈرتی۔ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ یہ شگون اچھا نہیں۔ مگرمچھ نے کسی غیبی طاقت کے اشارے پر مجھے پکڑ لیا تھا۔ یہ تمہارے لئے اشارہ ہے کہ یہیں سے واپس چلے چلو ورنہ آگے موت ہے"۔

"اسحاق بھائی!" — آسر نے کہا — "وقت ضائع نہ کرو۔ اگر تم اس لڑکی کی باتوں میں آ گئے تو ہم اپنا کام کس طرح کریں گے۔ ربّی اور فادر کو کیا جواب دیں گے؟ تم جانتے ہو کہ انہیں ہم دونوں پر کتنا بھروسہ ہے"۔

"میری بات سنو میرا!" — اسحاق نے کہا — "تم نے ربّی کے ساتھ جو باتیں کی تھیں وہ نہ بھولو۔ تم نے کہا تھا کہ تم ہماری مدد کرو گی۔ تم نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر یہاں کوئی آدمی ہوئے تو تم انہیں اپنے حسن و جوانی کے جال میں لے لو گی۔ تمہاری ان باتوں سے متاثر ہو کر ربّی نے تمہیں ہمارے ساتھ آنے کی اجازت دی تھی۔ ربّی نے تمہیں پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ تم وہی کام کر رہی ہو جس کا ربّی نے خدشہ کہا تھا کہ تم ہمارے پاؤں کی زنجیر بن جاؤ گی۔ ہم تو اب اپنا فرض ادا کر کے ہی جائیں گے"۔

"مجھے صاف نظر آ رہا ہے اسحاق!" — میرا نے کہا — "تم یہاں سے زندہ واپس نہیں جاؤ گے"۔

اسحاق اور آسر جھنجھلا اٹھے۔ اسحاق نے میرا کا بازو پکڑا اور اسے اٹھا کر کہا کہ وہ اس کے ساتھ چلے۔

میرا اُس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ چلنے میں دشواری اور درد محسوس کر رہی تھی۔ وہ اب اُس [illegible] پاؤں سے [illegible] کی وجہ سے اسحاق اور آسر کی رفتار بھی سست ہو گئی تھی۔

میں وہ اوپر سے کسی کو نظر نہیں آ سکتے تھے۔ اس پہاڑی کے اوپر جو کچھ بھی تھا' اسے دیکھنے کے لئے پچھلی پہاڑی پر جانا ضروری تھا۔ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان کم و بیش ساٹھ قدم فاصلہ تھا۔ نیچے میدان تھا جس میں اونچی گھاس تھی اور درخت بھی تھے۔ پیچھے والی پہاڑی ایسی نہیں تھی کہ اس کی صرف ڈھلوان ہوتی۔ یہ پہاڑی اونچی نیچی چٹانوں کا جھرمٹ تھی جن پر چڑھنا ذرا دشوار تھا۔

تھوڑا اور آگے گئے تو انہیں دونوں پہاڑیوں کے درمیان روشنی سی نظر آئی جو سامنے والی پہاڑی پر کہیں اوپر تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ کسی نے آگ جلا رکھی ہے۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتے گئے، روشنی زیادہ ہوتی گئی اور اس کے ساتھ ہی انہیں کسی کی باتوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ کچھ آدمی بہت دور باتیں کر رہے تھے۔

اسحاق اور آسر نے آپس میں مشورہ کیا اور اس فیصلے پر پہنچے کہ وہیں سے پچھلی پہاڑی پر چڑھ جائیں کیونکہ پیچھے بلندی پر جا کر ہی پتہ چل سکتا تھا کہ یہ آگ کہاں جل رہی ہے اور باتیں کرنے والے کہاں ہیں۔ وہ کچھ اور آگے جا کر پچھلی پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ وہ پہاڑی کچھ عجیب سی تھی۔ کہیں ننگی اور سیدھی کھڑی چٹان آجاتی تھی اور کہیں دوسری پہاڑیوں کی طرح سبزہ زار اور درخت آجاتے تھے۔ ایسی ایک چٹان پر چڑھتے چڑھتے اسحاق کا پاؤں پھسل گیا اور وہ چٹان سے گر کر نیچے والی چٹان پر جا پڑا اور وہاں سے لڑھکتا ہوا نیچے جا رکا۔

میرا اس کے پیچھے اترنے لگی لیکن آسر نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔

"نہیں زہرا!" ——— آسر نے کہا ——— "تم بھی پھسل کر گرو گی۔ وہ تو مرد ہے' برداشت کر لے گا۔ تم پہلے ہی زخمی ہو"۔

اسحاق اٹھا۔ اُسے چوٹ تو آئی تھی لیکن وہ چوٹ سے بے نیاز پہاڑی پر چڑھنے لگا اور اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ میرا نے ایک بار پھر اپنے اسی وہم کا اظہار کیا کہ یہ دوسرا بڑا شگون ہے اور یہ کسی آسمانی مخلوق کے اشارے ہیں کہ واپس چلے جاؤ اور ان کے مظاہر میں دخل نہ دو...... اسحاق نے جیسے اُس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ اس طرح پہاڑی کے اوپر اوپر چل پڑا جیسے اُس نے آسمانی مخلوق کا چیلنج قبول کر لیا ہو۔ اُس کے چلنے کے انداز میں قہر اور عتاب تھا۔

اُدھر پہاڑی سے کچھ دور لوگوں کا ہجوم اس امید پر پہاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ آج پھر شاہ بلوط میں ستارہ چمکے گا یا وہ سفید پوش نظر آئے گا جو ایک بار نظر آ چکا ہے۔ تین چار دن نہ ستارہ چمکا تھا نہ سفید پوش نے جلوہ دکھایا تھا۔ یہ خبر اس علاقے میں دور دور تک پھیل گئی تھی اس لئے تماشائیوں کا ہجوم بہت ہی زیادہ ہو گیا تھا۔

اُس رات لوگوں کی مراد بر آئی۔ پہلے نقارہ بجا۔ اس کی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتے ہوتے رات کی تاریکی میں تحلیل ہو گئی' پھر ایک سے زیادہ شہنائیوں کی ایسی لَے ابھری جس میں سحر انگیز سوز تھا۔ ہجوم کا شور و غل ایسے سکوت میں دم توڑ گیا جیسے وہاں کوئی ذی روح' کوئی جاندار زندہ ہی نہ ہو۔ زمین و آسمان پر' پیڑ پودوں اور پہاڑیوں پر جیسے وجد طاری ہو گیا ہو۔

لوگوں کو اندھیرے میں شاہ بلوط کیا نظر آتا' وہ پہاڑ بھی نظر نہیں آ رہا تھا جس پر وہ درخت کھڑا تھا۔ لوگ نغمے میں محو تھے کہ کئی آوازیں اٹھیں ——— "وہ چمکا" ——— اور اس کے ساتھ ہی لوگوں نے کلمہ طیبہ کا وِرد شروع کر دیا۔ ایک گونج تھی جس مین وجد آفریں تاثر' محویت اور تقدس تھا۔ اس کے ساتھ رات کی تاریکی میں ہوا کی لہروں پر شہنائیوں کی تیرتی ہوئی لَے ایسا سماں باندھ رہی تھی جس کا تعلق اس دنیا سے معلوم نہیں ہوتا تھا۔

ستارہ بجھ گیا اور پھر پہلے کی طرح ایک روشنی چھتری نما شاہ بلوط پر چلنے لگی' پھر یہ ایک مقام پر رک گئی اور نیچے آنے لگی۔ جیسا پہلے ایک رات ہُوا تھا' روشنی نیچے آئی تو سفید پوش کا سر' کندھے اور سینہ نظر آیا۔ اُس کے بازو کچھ باہر کو اور کچھ آگے کو یوں پھیلے ہوئے تھے جیسے دعا مانگ رہا ہو۔ روشنی آہستہ آہستہ نیچے گئی اور سفید پوش کے پاؤں تک چلی گئی۔

ہجوم میں جو چند ایک سبز پوش تھے' انہوں نے کہنا شروع کر دیا ——— "سجدے میں چلے جاؤ..... ہمارا نجات دہندہ زمین پر اُتر آیا ہے"۔

کچھ لوگ تو پہلے ہی سجدے میں چلے گئے تھے۔ باقی بھی سجدہ ریز ہو گئے۔

لوگ سجدے سے اٹھے اور انہوں نے سامنے دیکھا۔ وہاں نہ ستارہ تھا نہ سفید پوش۔

"خدا کے ایلچی کا ظہور ہو گیا ہے" ——— پہاڑ کی طرف سے ایک بڑی ہی بلند آواز ہجوم تک پہنچا ——— "وہ دو چار دنوں میں تمہارے سامنے آجائے گا..... خدا کا پیغام لائے

www.paksociety.com

گا..... خدا کا شکر ادا کرو لوگو!"

اُس وقت جب ستارہ ابھی نہیں چمکا تھا' اسحاق' آسر اور میرا پچھلی پہاڑی پر اتنا آگے چلے گئے تھے کہ انہیں شاہ بلوط والی پہاڑی کی پچھلی ڈھلان پر ایک خاصا کشادہ غار دکھائی دیا۔ اس کے اندر لکڑیوں کے ایک بہت بڑے ڈھیر کو آگ لگی ہوئی تھی۔ اس کے شعلے غار کی چھت تک پہنچ رہے تھے۔ اس آگ کی روشنی چونکہ پیچھے والی ڈھلان میں تھی اس لئے اس کی روشنی پہاڑی کی اُس جانب نہیں جا سکتی تھی جس جانب لوگوں کا ہجوم ستارہ دیکھنے کے لئے اکٹھا ہو گیا تھا۔

اسحاق اور اس کے ساتھیوں نے وہاں پانچ چھ آدمی گھومتے پھرتے دیکھے۔ ایک آدمی تھوڑے تھوڑے وقفے سے آگ میں لکڑیاں پھینک رہا تھا۔ غار سے کچھ دور تقریباً" ایک گز لمبی اور اسی قدر چوڑی کسی دھات کی ایک چادر سی رکھی ہوئی تھی۔ کبھی تو شک ہوتا تھا کہ یہ آئینہ ہے اور کبھی یوں لگتا جیسے یہ کسی ایسی دھات کا چادر نما ٹکڑا ہے جو آئینے کی طرح چمکتا ہے یا اس پر چاندی کا پانی چڑھایا گیا ہے یا ابرق جیسی چمکنے والی کوئی چیز چپکائی گئی ہے۔

اسحاق وغیرہ دو درختوں کے تنوں کے پیچھے کھڑے دیکھ رہے تھے۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ انہیں ہر آدمی اور ہر چیز اچھی طرح نظر آ رہی تھی۔

سامنے والی پہاڑی کی پچھلی ڈھلان پر شاہ بلوط کے درخت کے قریب وہ چمکتی چادر پڑی تھی۔ دو آدمیوں نے آکر یہ چادر اٹھائی اور ادھر اُدھر سے پکڑ کر ایسے زاویے پر کر لیا کہ اس کی چمک سیدھی پچھلی پہاڑی پر اُن دو درختوں پر پڑی جہاں اسحاق وغیرہ چھپے دیکھ رہے تھے۔ چمک فلڈ لائٹ جیسی تھی۔ اتنی تیز کہ ان تینوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ فوراً" تنوں کے پیچھے ہو گئے۔

یہ چادر رکھ دی گئی۔ ایک آدمی نہ جانے کہاں سے سامنے آیا۔ وہ سر سے پاؤں تک سفید لبادے میں ملبوس تھا۔

"چلو بھائی آجاؤ" ___ سفید پوش نے کہا ___ "اوپر کون جائے گا!"

ایک آدمی آگے آیا۔ اُس نے ایک جگہ سے ایک چیز اٹھائی یہ یقیناً" آئینہ تھا جس کی لمبائی تقریباً" ایک فٹ اور چوڑائی اس سے کچھ کم تھی۔ اُس نے پہلے تو یہ اپنے

سامنے کر کے یوں دیکھا جس طرح آئینہ دیکھا جاتا ہے' پھر اُس نے اسے آگ کی طرف کر کے اِدھر اُدھر ہلایا۔ اس کی چمک پہاڑی کی ڈھلان پر اسی طرح دکھائی دی جس طرح آئینہ سورج کے آگے رکھو تو سامنے کی اشیاء پر اس کی چمک دکھائی دیتی ہے۔

یہ آدمی آئینہ اٹھائے ہوئے پہاڑی پر شاہ بلوط کی طرف چڑھ گیا۔ اب وہ اندھیرے میں تھا۔ غار کی آگ کی روشنی اُس تک نہیں پہنچتی تھی۔ اسحاق اور اس کے ساتھیوں کا صرف اندازہ تھا کہ یہ آدمی درخت پر چڑھ گیا ہے۔ کچھ دیر بعد انہیں درخت کے اندر چمک دکھائی دی جو فوراً" ختم ہو گئی۔

"جانتے ہو درخت میں کیا ہو رہا ہے؟" ___ اسحاق نے آسر سے پوچھا۔

"تمہارے ربّی کا شک غلط نہیں نکلا" ___ آسر نے کہا ___ "میں بتا سکتا ہوں اوپر کیا ہو رہا ہے۔ اس آگ کی چمک اس آئینے پر پڑ رہی ہے جو وہ آدمی اوپر لے گیا ہے اور آئینے کی چمک اُن لوگوں کو دکھائی دے رہی ہے جو پہاڑی کے اُس طرف ہجوم کی صورت میں موجود ہیں"۔

"دیکھو آگ کتنی زیادہ ہے" ___ اسحاق نے کہا ___ "اگر اتنی آگ پہاڑی کی چوٹی پر جلائی جائے تو یہ سارا علاقہ روشن ہو جائے..... اب تصور میں لاؤ کہ شاہ بلوط کی شاخوں میں تم نے ستارہ چمکتا دیکھا ہے..... سمجھنا کوئی مشکل نہیں..... یہ سب انسان ہیں"۔

"لیکن یہ ہیں کون؟" ___ میرا نے پوچھا ___ "یہ کیسے معلوم کرو گے؟"

"ہم تین ہیں" ___ اسحاق نے کہا ___ "بلکہ ہم دو ہیں۔ میرا کو شامل نہ کرو۔ وہ پانچ چھ ہیں۔ ہم ان پر حملہ نہیں کر سکتے۔ اگر ہمارے ساتھ دو تین آدمی اور ہوتے تو کسی اور طرف سے اس پہاڑی پر جا کر ان میں سے ایک دو کو زندہ پکڑ لیتے"۔

"ٹھہرو اسحاق!" ___ آسر نے کہا ___ "وہ آدمی درخت سے اُتر آیا ہے..... وہ دیکھو..... سفید پوش اوپر جا رہا ہے"۔

"میں بتاتا ہوں اب کیا ہو گا" ___ اسحاق نے کہا ___ "یہ سفید لبادے والا آدمی درخت کے نیچے جا کھڑا ہو گا اور اس پر چمکتی ہوئی دھات کی چادر کی روشنی ڈالی جائے گی۔ لوگ سمجھیں گے کہ کسی پیغمبر کا ظہور ہُوا ہے"۔

ایسے ہی ہُوا۔ وہ آدمی درخت کے نیچے چلا گیا۔ اُدھر وہ چادر آگ کے سامنے ایسے زاویے پر رکھی گئی کہ اس کی چمک اس آدمی پر پڑنے لگی۔ پہلے اس روشنی کو

درخت پر گھمایا گیا پھر اسے اُس آدمی پر مرکوز کر دیا گیا۔ اُدھر ہجوم نے کلمۂ طیبہ کا بلند ورد شروع کیا تو اس کی گونج ان پہاڑیوں تک سنائی دینے لگی۔

کچھ دیر بعد یہ پلیٹ یا چادر رکھ دی گئی اور ایک آدمی انتہائی بلند آواز سے اعلان کرنے لگا:

"خدا کے ایلچی کا ظہور ہو گیا ہے"۔

"وہ دو چار دنوں میں تمہارے سامنے آجائے گا"۔

"خدا کا پیغام لائے گا"۔

خدا کا شکر ادا کرو لوگو"۔

○

پھر وہ سفید پوش واپس آگیا۔

"ہم نے یہ تو دیکھ لیا ہے کہ یہ ہماری طرح انسان ہیں" ——— اسحاق نے کہا ——— "یہ ہم رتبیؔ اور فادر کو بتائیں گے۔ معلوم نہیں وہ کیا کریں گے۔ میں انہیں مشورہ دوں گا کہ جس طرح ہم تینوں یہاں تک پہنچ گئے ہیں اسی طرح کل شام بیس پچیس آدمی سامنے والی پہاڑی کے ایک طرف چھپ کر بیٹھ جائیں اور ان سب کو موقعہ پر پکڑ لیں پھر لوگوں کو رات کو ہی اس پہاڑی پر لے آئیں اور انہیں دکھائیں کہ یہ شیطان لوگ کس طرح انہیں گمراہ کر رہے تھے..... مجھے یقین ہے یہ مسلمان ہیں"۔

اسحاق یہ بات کر ہی رہا تھا کہ میرا کی دلدوز اور بڑی ہی بلند چیخ سنائی دی۔ اسحاق اور آسر نے گھبرا کر ادھر دیکھا۔ غار میں جلتی ہوئی آگ کی روشنی ان تک پہنچ رہی تھی۔ اس روشنی میں انہوں نے دیکھا کہ جس درخت کی اوٹ میں میرا چھپی ہوئی تھی اس کے تنے پر ایک خاصا لمبا سانپ نیچے کو آرہا تھا۔ میرا کا شاید ہاتھ سانپ کو لگ گیا۔ سانپ نے اُسے بازو پر کاٹا تھا۔

اسحاق نے بڑی تیزی سے تلوار نکالی اور سانپ کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ میرا اپنے بازو پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے منہ سے عجیب سی چیخیں نکل رہی تھیں۔ اسحاق اور آسر اس کے پاس بیٹھ گئے اور دیکھنے لگے کہ سانپ نے کہاں کاٹا ہے۔ سانپ کی دہشت نے اور میرا کی بگڑتی ہوئی حالت نے ان کے ہوش و حواس اس حد تک گم کر دیئے کہ انہوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ سامنے والی پہاڑی پر سفید پوش اور اُس کے ساتھی ان کی

طرف دیکھ رہے ہیں اور انہوں نے ان تینوں کو دیکھ لیا ہے۔ میرا کی چیخ اتنی بلند تھی کہ سامنے والی پہاڑی کے لوگوں نے سن لی تھی اور انہوں نے چونک کر اس طرف دیکھا تھا۔

سانپ کا زہر میرا کے جسم میں سرایت کر رہا تھا۔ وہ تڑپنے لگی۔ تکلیف کی شدت سے اٹھی اور چکرا کر گری اور ایسی گری کہ اوپر سے لڑھکتی ہوئی نیچے جا پڑی۔ اسحاق اور آسر یہ فراموش کر کے کہ وہ کہاں ہیں' اس کے پیچھے بڑی تیزی سے پہاڑی سے اُترے۔ میرا تڑپ رہی تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ نیلا بلکہ سیاہ ہوتا جا رہا تھا اور وہ بُری طرح تڑپ رہی تھی۔ اسحاق اور آسر اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اسے اٹھاؤ اسحاق!" ——— آسر نے کہا ——— "کچھ تم اٹھاؤ کچھ میں اٹھاتا ہوں اور یہاں سے نکلتے ہیں"۔

"یہ تو راستے میں مر جائے گی" ——— اسحاق نے کہا ——— "مر گئی تو اسے مگرمچھوں والے پانی میں پھینک جائیں گے"۔

وہ دونوں میرا کو اٹھانے ہی لگے تھے کہ انہیں قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ انہوں نے بدک کر پیچھے دیکھا تو ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ سات آٹھ آدمیوں کے نرغے میں آگئے تھے۔ ان میں سفید پوش بھی تھا۔ ان میں سے کسی کے پاس تلوار تھی اور کسی کے پاس برچھی۔ سفید پوش نے آگے بڑھ کر ان دونوں کی نیاموں میں سے تلواریں نکال لیں۔ ان میں سے ایک اور آدمی آگے بڑھا اور اس نے ان کے کمر بندوں میں اڑسے ہوئے خنجر بھی لے لئے۔

میرا کا تڑپنا خاصا کم ہو گیا تھا۔ اسے مرنا تھا۔ وہ ہوش میں نہیں تھی۔ غار کی آگ کی روشنی نیچے تک آرہی تھی۔

"انہیں اوپر لے چلو" ——— سفید پوش نے کہا اور اسحاق اور آسر سے کہنے لگا ——— "اس لڑکی کو یہیں پڑا رہنے دو۔ یہ چند لمحوں کی مہمان ہے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ اسے سانپ نے ڈسا ہے۔ اس جگہ کے سانپ جسے ڈس لیں اسے زندہ نہیں رہنے دیا کرتے۔ یہ جوان تھی اس لئے ابھی تک اس کا جسم ذرا ذرا حرکت کر رہا ہے"۔

"کیا تم لوگ ہمیں رہا نہیں کر دیتے؟" ——— اسحاق نے التجا کے لہجے میں کہا۔

"اگر ہم اتنے احمق ہوتے تو اتنی زیادہ مخلوقِ خدا سے یہ نہ منوا سکتے کہ شاہ بلوط کے

نیچے ایک نبی کا ظہور ہو رہا ہے"۔ — سفید پوش نے کہا — "جن کے پاس ہمارا اتنا نازک راز ہے انہیں ہم رہا نہیں کر سکتے"۔

"ہم دونوں آپ کے ساتھ ہو جائیں گے" — آسر نے کہا — "اور آپ جو بھی کام بتائیں گے کریں گے"۔

"تم کون ہو؟" — سفید پوش نے اسحاق سے پوچھا — "تمہارا مذہب کیا ہے؟ سچ سچ بتا دو تو شاید ہم تم پر رحم کر دیں"

"میرا نام اسحاق ہے" — اسحاق نے جواب دیا — "اور میں یہودی ہوں"۔

"میرا نام آسر ہے" — آسر نے کہا — "اور میں عیسائی ہوں"۔

"یہاں کیوں آئے تھے؟" — سفید پوش نے پوچھا اور کہا — "مجھے یہ نہ بتانا کہ تم دونوں اس لڑکی کو ساتھ لے کر یہاں سیر اور تفریح کے لئے آئے تھے۔ یہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ ایک طرف مگرمچھوں نے راستہ بند کر رکھا ہے اور دوسری طرف ایسی دلدل ہے جس میں سے کوئی گزر نہیں سکتا"۔

اسحاق نے اسے بالکل سچ بتا دیا کہ وہ دونوں یہاں کیوں آئے تھے اور یہ لڑکی کس طرح ساتھ چل پڑی تھی۔

"تمہاری سزا بڑی اور پادری کو ہم ایک سبق دیں گے" — سفید پوش نے کہا — "اب یہودیوں کا جادو نہیں چل سکتا۔ اب حسن بن صباح کا جادو چلے گا"۔

اسحاق اور آسر کو اوپر لے گئے۔ وہ اب بھی منت سماجت کر رہے تھے کہ انہیں چھوڑ دیا جائے۔ انہیں باتوں باتوں میں آگ کے قریب لے گئے۔ تپش اتنی زیادہ تھی کہ وہاں کھڑا نہیں رہا جا سکتا تھا۔ مشکیزوں والے آدمی آگ پر پانی پھینکنے لگے تھے کیونکہ اب آگ کی ضرورت نہیں تھی۔ سفید پوش نے اشارہ کر کے انہیں پیچھے ہٹا دیا پھر اس نے دوسرے آدمیوں کو ایسا اشارہ دیا کہ دو تین نے اسحاق کو اور دو تین نے آسر کو پکڑ لیا اور انہیں دھکیلتے گھسیٹتے ہوئے آگ کے قریب لے گئے۔ دونوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ انہیں آگ میں دھکیلا جا رہا ہے۔ سفید پوش کے آدمیوں نے دونوں کو اتنی زور سے دھکے دیئے کہ وہ آگ میں جا پڑے۔ آگ اس قدر زیادہ تھی کہ وہ اس میں گرے اور پھر ان کی آواز بھی نہ نکلی۔

جب وہ جل کر کوئلہ ہو گئے تو سفید پوش نے مشکیزوں والوں سے کہا کہ اب آگ

پر پانی پھینک دو۔ اس رات کا ناٹک ختم ہو چکا تھا اس لئے اب آگ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

○

اگلے روز شاہ در میں احمد بن عطاش اپنے خاص کمرے میں بڑی بے تابی سے حسن بن صباح کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے دوبار اپنا آدمی اُسے بلانے کے لئے بھیجا تھا اور دونوں بار وہ یہ جواب لے کر آیا تھا کہ حسن رات بہت دیر سے آیا تھا اس لئے بڑی گہری نیند سویا ہوا ہے۔

وہ سفید پوش جو شاہ بلوط کے نیچے لوگوں کو نظر آتا تھا وہ حسن بن صباح ہی تھا۔ رات اسحاق اور آسر کی وجہ سے حسن کو وہاں زیادہ وقت رہنا پڑا تھا اس لئے صبح وہ دیر سے اٹھا۔ وہ جگہ شاہ در سے خاصی دور تھی۔ شاہ در سے وہاں تک یہ لوگ اونٹوں پر جاتے اور صبح طلوع ہونے سے پہلے واپس آ جاتے تھے۔ اونٹوں پر آنے جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے قدموں کی آہٹ نہیں ہوتی۔ رات کے سناٹے میں گھوڑے کے ٹاپ دور دور تک سنائی دیتے ہیں اس لئے پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں جگہ سے ایک یا ایک سے زیادہ گھوڑ سوار گزرے تھے۔

سورج سر پر آ گیا تھا جب حسن بن صباح کی آنکھ کھلی اور وہ بڑی تیزی سے غسل وغیرہ کر کے احمد بن عطاش کے ہاں جا پہنچا۔

"آؤ حسن!" — احمد بن عطاش نے کہا — "مجھے تمہارے ساتھی بتا چکے ہیں کہ رات ایک یہودی اور ایک عیسائی نے نبی کے ظہور کا راز اپنی آنکھوں دیکھ لیا تھا..... تم نے اچھا کیا کہ دونوں کو آگ میں پھینک دیا"۔

"ان کی ساتھی لڑکی کو تو سانپ نے پہلے ہی ختم کر دیا تھا" — حسن بن صباح نے کہا — "ان دونوں آدمیوں میں جو عیسائی تھا اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس لڑکی کو پہلے ایک مگرمچھ نے پاؤں سے پکڑ لیا تھا اور ان دونوں نے تلواروں سے مگرمچھ کو زخمی کر کے لڑکی کو مگرمچھ کے منہ سے نکال لیا تھا"۔

"یہ اُس سحر کا اثر تھا جو میں نے تمہارے ہاتھوں کروایا تھا" — احمد بن عطاش نے کہا — "میں نے اس سحر میں یہ اثر پیدا کیا تھا کہ تمہارے راز تک پہنچنے والے خیریت سے نہ پہنچ سکیں اور اگر پہنچ جائیں تو تمہیں ان کی موجودگی کا اشارہ مل جائے۔ ہمارا جادو

غائب رہا"۔

"محترم استاد!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "میں نے اس ربّی اور پادری کا پتہ معلوم کر لیا ہے جنہوں نے ان دونوں آدمیوں کو بھیجا تھا۔ انہیں ہمیشہ کے لئے غائب کر دیا جائے تو بہتر ہے' ورنہ ان کا خطرہ موجود رہے گا کہ یہ کسی اور طرح ہمارا راز پا لیں گے۔ ہمیں یہ اطمینان ہوا ہے کہ یہ جاسوس سلجوقیوں کے نہیں تھے"۔

"ہاں حسن!" ۔۔۔ احمد بن عطاش نے کہا ۔۔۔ "ہمارا منصوبہ ایسا ہے کہ کسی سے ذرا سے بھی خطرے کا صرف شک ہی ہو' اسے بالکل ہی غائب کر دینا ضروری ہے۔ تمہارے پاس آدمی ہیں۔ انہیں استعمال کرو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم ان دونوں کو کس طرح غائب کرتے ہو"۔

"یہ میں کر کے بتاؤں گا کہ میں نے یہ کام کس طرح کیا ہے" ۔۔۔ حسن بن صباح نے ہنستے ہوئے کہا ۔۔۔ "آپ کی شاگردی میں مجھے اتنی سوجھ بوجھ مل گئی ہے کہ میں اس گاؤں کے بچوں سے بوڑھوں تک کو ایسا لاپتہ کر سکتا ہوں جیسے کبھی وہ دنیا میں آئے ہی نہیں تھے"۔

"اب میری ایک دو باتیں غور سے سنو" ۔۔۔ احمد بن عطاش نے کہا ۔۔۔ "ہمارا یہ طریقہ سو فیصد سے کچھ زیادہ کامیاب رہا ہے۔ اب تم نے ان لوگوں کے سامنے آنا ہے۔ یہ ہزاروں لوگ تمہارے مرید ہو چکے ہیں۔ اب ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اگلے قلعے بھی ہمارے ہیں۔ ۔۔ یہ تمہیں میں بتاؤں گا کہ تم لوگوں کے سامنے کس طرح آؤ گے۔ دوسری بات یہ ذہن میں رکھ لو کہ سحر اور جادو پر بھروسہ نہیں رکھنا۔ بھروسہ اپنی عقل اور فہم و فراست پر کرنا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ طلسم سامری کو توڑنے والا اب کوئی موسیٰ نہیں رہا اور نہ ہی کوئی موسیٰ آئے گا لیکن یہ یاد رکھ لو کہ سحر اور جادو ہر قسم کے حالات میں تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔ اپنی عقل کا جادو چلاؤ۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو تمہیں میں بعد میں بھی سمجھاؤں گا......

"تم نے دیکھ لیا ہے کہ میری اس بات میں کتنی حقیقت ہے کہ لوگوں کو تم بدی کا سبق دو گے تو وہ تمہارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو ہم سے پہلی قوموں نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ کیا تھا۔ لوگوں کو اپنا مرید بنانے کا طریقہ یہی ہے کہ بدی کے پراسرار طریقے استعمال کرو جو مافوق الفطرت نظر آئیں اور جن میں ایسا اثر ہو کہ لوگ بلا سوچے سمجھے تمہاری اسراریت سے متاثر ہو کر سجدہ ریز ہو جائیں۔ تم نے دیکھ لیا ہے۔ ہزاروں لوگوں نے تمہارے آگے سجدہ کیا ہے...... میں پیغمبر نہیں حسن! لیکن میں آنے والے وقت کے متعلق پیشین گوئی کر سکتا ہوں کہ لوگ جادوگروں اور ساحروں کے پاس جایا کریں گے اور ان سے اپنی مشکلات حل کروائیں گے اور سحر کے ذریعے ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں گے اور کچھ لوگ لوگوں کو ساحری کا دھوکہ دے کر لوٹیں گے۔ آج کے لوگوں کی یہ کمزوری ان کی نسلوں در نسلوں تک جائے گی...... یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ تم اس یہودی ربّی اور عیسائی پادری کا بندوبست کرو"۔

دو ہی دن گزرے' سورج غروب ہونے کے بعد دو اجنبی اس یہودی ربّی کے ہاں گئے جس نے اسحاق کو بھیجا تھا۔ انہوں نے نہایت پُراثر انداز میں ربّی کو بتایا کہ اسحاق اور آسربام کے دو آدمی اور میرا نام کی ایک لڑکی وہ راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس کے لئے انہیں بھیجا گیا تھا لیکن ایک جگہ پھنس گئے ہیں۔ جہاں وہ پھنسے ہیں وہاں کے سرکردہ آدمی اپنے ہی ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ جب تک ربّی اور پادری خود نہیں آئیں گے' وہ ان تینوں کو نہیں چھوڑیں گے۔ وہ لوگ ہماری پوری مدد کریں گے لیکن ربّی اور پادری کا وہاں تک جانا ضروری ہے۔

ان دو آدمیوں نے زبان کے ایسے جادو چلائے کہ ربّی اور پادری اُن کے ساتھ چل پڑے۔ ان دو آدمیوں نے انہیں اپنے گھوڑوں پر سوار کر لیا تھا اور خود پیدل چل رہے تھے۔

وہ ایک اور راستے سے دو پہاڑیوں کے درمیان سے اُس جگہ پہنچے جہاں پانی جمع تھا اور ایک مگرمچھ نے میرا کا پاؤں پکڑ کر اسے پانی میں گھسیٹا تھا۔ اُس رات بھی ہزارہا لوگوں کا ہجوم شاہ بلوط والی پہاڑی سے کچھ دور اس امید پر بیٹھا تھا کہ ستارہ چمکے گا اور پیغمبر کا ظہور ہو گا لیکن اُس رات حسن بن صباح نے یہ تماشہ نہیں دکھانا تھا۔

پانی کے قریب جا کر ان دونوں آدمیوں نے ربّی اور پادری کو یہ کہہ کر گھوڑوں سے اتارا کہ گھوڑے پانی پی لیں۔ جونہی یہ دونوں مذہبی پیشوا گھوڑوں سے اترے ان دونوں آدمیوں میں سے ایک نے پادری کو اور دوسرے نے ربّی کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ پانی میں جا پڑے۔ دونوں بوڑھے تھے۔ دونوں آدمیوں سے دھکے سے وہ پانی میں خاصا دور جا پڑے تھے۔

پالیا مجرا ... ست نیچی۔ تین چار مگرمچھ بڑی تیزی سے آئے اور ربی اور پادری کو جبڑوں میں جکڑ کر اس قدرتی تالاب کی تہہ میں لے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ان دونوں کے جسموں کے ٹکڑے مگرمچھوں کے پیٹ میں جا چکے تھے اور وہ دونوں اجنبی گھوڑوں پر سوار شاہ در کے راستے پر جا رہے تھے۔

اس خطے کے لوگ ابلیسیت کے جال میں آ گئے تھے۔

یہودیوں کا ربّی اور عیسائیوں کا پادری جس بستی کے رہنے والے تھے اُس بستی میں ہر کسی کی زبان پر یہی سوال تھے:

"ربّی کہاں گیا؟"

"فادر کہاں گیا؟"

"اسحاق اور آسر کہاں گئے؟"

"میرا کہاں گئی؟"

چند گھروں کی یہ بستی تھی۔ ربّی اور پادری تو مذہبی پیشوا تھے، کوئی نہایت معمولی سا فرد بستی سے تھوڑی سی دیر کے لئے غیر حاضر ہوتا تو ساری بستی اُس کی غیر حاضری کو محسوس کر لیتی تھی۔ ربی اور فادر کا لاپتہ ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اسحاق، آسر اور میرا بھی اس بستی کے اہم نوجوان تھے۔ لوگ ان کے متعلق کچھ پریشان ہونے لگے۔

ایک صبح ایک مجذوب سا آدمی جس نے سبز چغہ پہن رکھا تھا اور سر پر سبز پگڑی لپیٹی ہوئی تھی، بستی میں داخل ہُوا۔ وہ "حق ہُو، حق ہُو" کے دھماکہ خیز نعرے لگا رہا تھا۔ اُس کی داڑھی بڑی لمبی تھی سر کے بال بھی اتنے لمبے کہ شانوں سے نیچے چلے گئے تھے اور اس کی آنکھیں گوشت کی طرح سرخ تھیں۔ وہ بستی کے وسط میں جا کر رک گیا۔ پہلے بچے اُس کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے پھر دوسرے لوگ بھی اس کے قریب آنے لگے۔

"کچھ نہیں رہے گا" — اُس نے دایاں ہاتھ آسمان کی طرف کر کے کہا — "سب گم ہو جائیں گے..... کچھ نہیں رہے گا..... نام و نشان مٹ جائے گا..... مانو اُسے جو روشنی دکھاتا ہے..... حق ہُو، حق ہُو"

وہ توہم پرستی اور ذہنی پسماندگی کا زمانہ تھا۔ داستان گو نے پہلے سنایا ہے کہ لوگ ہر اُس چیز کے پیچھے دوڑ پڑتے تھے جو اسراریت کے سیاہ پردوں میں ڈھکی ہوئی ہوتی تھی، اور لوگ اُسے مانتے تھے جس کی زبان میں چاشنی اور کشش ہوتی تھی۔ مانا اُسے جاتا تھا جو الفاظ اور اداکاری کا ماہر ہوتا تھا۔ اس مجذوب کے الفاظ اور اُس کا انداز ایسا تھا کہ ساری بستی اُس کے ارد گرد اکٹھی ہو گئی۔ وہ اور زیادہ اونچی آواز میں نعرے لگانے لگا۔ ایک بوڑھا آدمی آگے بڑھا۔

"کیا تو بتائے گا نہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے؟" — بوڑھے نے اس سے پوچھا۔

"جو مطلب نہیں سمجھے گا وہ نہیں رہے گا" — مجذوب نے کہا۔ "سمجھو....

لوگو! سمجھو"۔

"کیا تو ہمارے پاس بیٹھے گا نہیں؟" ——بوڑھے نے پوچھا۔

"ہم سمجھنا چاہتے ہیں" ——ایک اور بولا۔

"بیٹھ جا" ——بوڑھے نے کہا—— "ہمیں اپنی کچھ خدمت کرنے دے"۔

مجذوب وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ سب بیٹھ جائیں۔ سب اُس کے سامنے بیٹھ گئے۔

"حق ہو' حق ہو" —— مجذوب نے آسمان کی طرف منہ کر کے ہُوک لگانے کے انداز سے نعرے لگائے اور بولا —— "جو نہیں مانتے وہ گم ہو گئے"۔

"تو کس کی کہہ رہا ہے کہ وہ گم ہو گئے؟" ——بوڑھے نے پوچھا۔

"اس بستی کے باپ گم ہو گئے ہیں" —— مجذوب نے کہا—— "بچے بھی گم ہو گئے ہیں"۔

"کیا تو ہمارے پادری کی بات کرتا ہے؟" ——ایک عیسائی نے پوچھا۔

مجذوب چپ چاپ آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔

"کیا تو ہمارے ربّی کی بات کرتا ہے؟" ——ایک یہودی نے پوچھا۔

مجذوب پھر بھی چپ رہا۔

"کیا تیرا اشارہ میرے بیٹے اسحاق کی طرف ہے؟" ——ایک آدمی نے پوچھا۔

مجذوب کچھ بھی نہ بولا۔

"کیا تُو میرے بیٹے آسر کی بات کر رہا ہے؟" ——ایک اور آدمی نے پوچھا۔

"میری بیٹی میرا بھی تو لاپتہ ہے" —— پیچھے کھڑی ایک عورت بولی۔

"ان سب کی بات ایک ہے" —— مجذوب بولا —— "وہ نہیں مانتے تھے..... اور وہ جو تمہارے مذہبی باپ تھے' وہ بھی نہیں مانتے تھے..... سب گم ہو گئے ہیں"۔

"کیا نہیں مانتے تھے؟" —— بوڑھے نے پوچھا۔

"اُسے نہیں مانتے تھے جو روشنی میں سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اُس روشنی کو بھی نہیں مانتے تھے جو خدا اپنے بندوں کو دکھاتا ہے"۔

وہ یک لخت اٹھ کھڑا ہوا اور پھر "حق ہو' حق ہو" کے دھماکہ نما نعرے لگاتا ایک طرف چل پڑا۔

"وہ آرہا ہے" —— وہ کہتا جا رہا تھا —— "وہ اُتر رہا ہے۔ جو نہیں مانے گا وہ گم ہو جائے گا"۔

لوگ کچھ دور تک اُس کے پیچھے گئے۔ وہ چلتا گیا۔ آگے ایک گھاٹی آگئی جو ندی میں اترتی تھی۔ مجذوب گھاٹی اتر کر ندی میں چلا گیا اور پانی میں یوں چلتا گیا جیسے میدان میں جا رہا ہو۔ درمیان میں پہنچا تو پانی اس کے سینے تک گہرا ہو گیا پھر بھی وہ اس طرح چلتا گیا جیسے میدان میں چل رہا ہو۔ لوگ اوپر کھڑے اسے دیکھتے رہے اور وہ ندی پار کر کے چلا گیا۔ اپنے پیچھے وہ ایک دہشت اور تذبذب کی کیفیت چھوڑ گیا۔

وہ جب نظروں سے اوجھل ہو گیا تو لوگ واپس ہونے لگے۔ اُن پر خاموشی طاری تھی۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بات کرنے سے ڈر رہے تھے۔ اگر ان کے دونوں مذہبی پیشوا موجود ہوتے تو وہ ان سے پوچھتے کہ یہ سب کیا ہے لیکن مذہبی پیشوا ہی تو لاپتہ ہو گئے تھے۔

"ربّی اور فادر کہتے تھے کہ یہ جو روشنی نظر آتی ہے یہ سب ایک پُراسرار ڈھونگ ہے" —— بستی میں آکر بوڑھے نے کہا —— "میں تو کہتا ہوں کہ انہیں اسی کی سزا ملی ہے"۔

"میں راز کی ایک بات بتاتا ہوں" ——ایک جواں سال آدمی بولا —— "اسحاق میرا گہرا دوست تھا۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ میں کسی کو نہ بتاؤں۔ اُسے اور آسر کو ربّی اور فادر نے کہا تھا کہ وہ اس پہاڑی کے پیچھے جائیں جس پر یہ روشنی اور پھر روشنی میں ایک سفید پوش نظر آتا ہے۔ میرا بھی ان کے ساتھ گئی تھی"۔

"اس پہاڑی کے پیچھے؟" ——ایک اور معمر آدمی نے کہا—— "کیا کبھی کسی سے سنا ہے کہ کوئی اس پہاڑی کے پیچھے گیا ہے۔ کبھی کوئی گیا ہے تو اُسے کسی نے واپس آتا نہیں دیکھا وہ موت کی وادی ہے۔ وہاں خونخوار اور آدم خور مگرمچھ ہیں' وہاں ایسے زہریلے سانپ ہیں کہ ڈستے ہیں تو پلک جھپکتے آدمی مر جاتا ہے۔ زمین پر سانپ' درختوں پر سانپ' پانی میں سانپ' وہاں تو کوئی جنگلی جانور اور کوئی درندہ بھی نہیں جاتا"۔

"اب بات سمجھ میں آتی ہے" —— دوسرے بوڑھے نے کہا—— "اگر روشنی انسان دکھاتے ہیں اور روشنی میں ظاہر ہونے والا سفید پوش بھی انسان ہے تو وہ اس پہاڑی پر جاتے کدھر سے ہیں؟..... نہیں..... وہ انسان نہیں ہو سکتے"۔

"میں مانتا ہوں" — ایک اور آدمی بولا — "وہ انسان نہیں ہو سکتے۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ جس سانپ کی عمر ایک سو سال ہو جاتی ہے وہ انسان کے روپ میں آجاتا ہے؟..... میں کہتا ہوں یہ انسانوں کے روپ میں سانپ ہیں' اور روشنی میں وہ جو سفید پوش نظر آتا ہے وہ شیش ناگ ہو گا"۔

کچھ لوگوں نے اس آدمی کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جن میں تائید تھی اور خوف بھی۔

"لوگ کہتے ہیں یہ ایک اور نبی ہے" — معمر آدمی نے کہا — "اُسے صرف ہم ہی نہیں دیکھ رہے' یہ ہزار ہا لوگ اتنی دُور دُور سے آکر اسے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ظاہر ہوتا ہے تو سب سجدے میں چلے جاتے ہیں۔ تم نے وہاں درویش صورت انسان دیکھے ہوں گے' وہ بھی سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ یہ کوئی نیا عقیدہ یا نیا پیغام آرہا ہے۔ اس کی کوئی مخالفت نہ کرے ورنہ پوری بستی کو نقصان ہو گا"۔

○

یہ کیفیت صرف اس بستی میں ہی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ لوگ خوفزدہ بھی تھے اور "آنے والے" کے منتظر بھی۔ اس علاقے میں جتنی بستیاں تھیں' ان سب میں یہی کیفیت تھی۔ یہ مجذوب جو اس بستی میں گیا تھا' کئی اور بستیوں میں گیا اور اپنے مخصوص مجذوبانہ انداز میں یہ خبر سنا آگیا کہ ایک عیسائی اور ایک یہودی مذہبی پیشوا نے روشنی والے کے خلاف بات کی تھی اور دونوں کو آسمان کی غیر مرئی مخلوق اٹھا کر لے گئی ہے۔

اور ایک روز "وہ" زمین پر اُتر آیا۔

داستان گو پہلے سنا چکا ہے کہ جس پہاڑی پر شاہ بلوط کا درخت تھا' اس کے سامنے وسیع و عریض میدان میں جو سرسبز تھا اور جہاں درختوں کی بہتات تھی' خیموں کی ایک بستی آباد ہو گئی تھی۔ یہ قبیلوں کے سرکردہ افراد اور سرداروں کے خیمے تھے۔ ہزاروں لوگ کھلے آسمان کے نیچے وہاں موجود رہتے تھے۔

ایک صبح لوگ جاگے تو انہوں نے دیکھا کہ پہاڑی کے دامن میں جو ٹیکری تھی' اس پر پلنگ کی طرح کا ایک تخت رکھا تھا۔ اس کے پائے رنگین اور خوشنما تھے۔ اس پر بڑا قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ ٹیکری ہری بھری تھی۔ تخت کے دائیں' بائیں اور پیچھے درخت تھے۔ ان درختوں کے ساتھ پھولدار بیلیں باندھ کر خوشنما چھت بنا دی گئی تھی۔

لوگوں نے دیکھا تو وہ آہستہ آہستہ اُس طرف چل پڑے۔ وہاں ابھی کوئی آدمی نظر نہیں آرہا تھا۔ لوگ جب قریب پہنچے تو ٹیکری پر ایک آدمی نمودار ہوا۔ وہ عقب سے اوپر چڑھتا آرہا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں برچھی اور دوسرے ہاتھ میں سبز جھنڈا تھا۔ اُس کا لباس شاہی چوبداروں جیسا تھا۔ تخت کے ایک طرف سے گذر کر وہ تخت سے آگے آکر لوگوں کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے جھنڈا ٹیکری پر گاڑ دیا۔

"وہ جو معبودِ برحق ہے' آرہا ہے" — چوبدار نے بڑی ہی بلند آواز میں اعلان کیا۔ "خوش نصیب ہو تم کہ وہ تمہارے سامنے آرہا ہے۔ وہ آئے تو سجدے میں چلے جاؤ"۔

لوگوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔

"قبیلوں کے سردار آگے آجاؤ" — چوبدار نے اعلان کیا — "سرکردہ آدمی سب سے آگے آکر بیٹھ جاؤ"۔

لوگوں میں سے کئی ایک آدمی آگے چلے گئے اور بیٹھ گئے۔ ان کے لباس اور رنگ ڈھنگ بتا رہے تھے کہ وہ سرکردہ افراد ہیں۔

ہوا کچھ تیز چل رہی تھی۔ ٹیکری پر چھ آدمی نمودار ہوئے۔ ان کے لباس معمولی سے تھے۔ وہ ملازم لگتے تھے۔ ہر ایک نے ایک ایک دیگچہ نما برتن اٹھا رکھا تھا۔ وہ ٹیکری اتر آئے اور ہجوم کے اُس پہلو کو چلے گئے جدھر سے ہوا آرہی تھی۔ انہوں نے یہ برتن تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکھ دیئے۔ یہ لوگوں سے دور رکھے گئے تھے۔ پھر ان میں آگ لگا دی گئی لیکن شعلہ کسی میں سے بھی نہ نکلا۔ ہر برتن میں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھنے لگا۔ ہوا کا رخ لوگوں کی طرف تھا اس لئے یہ دھواں ہجوم میں سے گذرنے لگا۔

وہ آدمی وہیں کھڑا رہے۔

"خدا کی رحمتیں نازل ہو رہی ہیں" — ٹیکری سے چوبدار کی آواز آئی۔

لوگوں نے ایسی خوشبو محسوس کرنی شروع کر دی جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ پُرکیف اور روح پرور خوشبو تھی۔ یہ اُس دھوئیں کی خوشبو تھی جو برتنوں سے اٹھ رہا تھا۔

نقارہ بجنے لگا اور اس کے ساتھ تین چار شہنائیوں کی لَے اُبھری۔ یہ صحرائی نغمے کی لَے تھی جس میں وجد طاری کر دینے والا سوز تھا۔ تخت کے عقب سے ایک آدمی

ابھرنے لگا جو ایک شاہانہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ کرسی اس آدمی کو اٹھائے اوپر ہی اوپر اٹھتی آئی پھر چار آدمیوں کے سر ابھرے اور فوراً ہی یہ چاروں آدمی پورے اوپر آ گئے۔ کرسی بڑی تھی اور چوڑی تھی۔ ان چار آدمیوں نے کرسی کو اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ چاروں آدمی عربی لباس میں ملبوس تھے اور جو کرسی پر بیٹھا تھا' لباس اُس کا بھی عربی تھا لیکن کپڑا ریشمی اور چمکدار تھا۔

"سجدہ!" — ایک آواز گرجی — "سجدہ!"

وہاں جتنے لوگ تھے' سب سجدہ ریز ہو گئے۔

چار آدمیوں نے بڑے آرام سے کرسی تخت پر رکھ دی جس پر قالین بچھا ہُوا تھا۔ کرسی پر جو بیٹھا ہُوا تھا' وہ بادشاہ لگتا تھا۔ داڑھی سلیقے سے تراشی ہوئی تھیں۔ اُن کے چہرے کا رنگ سفیدی مائل گندمی تھا۔ نقش و نگار میں مردانہ حسن' آنکھوں میں ایسی چمک اور ایسا تاثر کہ کوئی بڑی مضبوط شخصیت والا ہی ان آنکھوں کا سامنا کر سکتا تھا۔ زیرِ لب تبسم چہرے کی جاذبیت میں اضافہ کرتا تھا۔

اس نے سجدہ ریز ہجوم پر نگاہ دوڑائی۔ اس کا زیرِ لب تبسم مسکراہٹ کی صورت کھِل گیا۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ لوگ سجدے سے اٹھیں۔

"اللہ اکبر" — ایک آواز گرجی۔

ہجوم نے سجدے سے سر اٹھائے۔ ہجوم میں عیسائی بھی' یہودی بھی اور مسلمان بھی تھے اور چند ایک بے دین بھی تھے۔ اللہ اکبر کا مطلب یہ تھا کہ یہ جو شاہانہ مسند پر بیٹھا ہے' مسلمان ہے ہجوم بھی سب لوگ اسے دیکھنے اور اسے سننے کو بیتاب ہوئے جا رہے تھے۔ اسلام کے سب سے بڑے دشمن یہودی تھے لیکن اللہ اکبر کی صدا پر ان کے دلوں میں تعصب نے سر نہیں اٹھایا تھا۔

لوگ اپنے آپ میں ایک پُرلطف سی تبدیلی محسوس کر رہے تھے۔ اُن کے دلوں سے خوف نکل گیا تھا۔ وہ ہلکے پھلکے ہو گئے تھے۔ اُن کے دلوں میں پیار اور محبت کی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔

○

وہ جو شاہانہ کرسی پر بیٹھا ہُوا تھا وہ حسن بن صباح تھا۔ وہ اٹھا اور اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔

"میں تم میں سے ہوں" — اُس نے کہا — "میری روح اُس نور سے پیدا ہوئی ہے جو تم شاہ بلوط کے درخت میں دیکھتے رہے ہو..... میں تم میں سے ہوں..... مجھے خدا نے اپنا ایلچی منتخب کیا ہے۔ میں تمہارے لئے خدا کا پیغام لے کر آیا ہوں لیکن ابھی پورا پیغام سنانے کا وقت نہیں آیا۔ ابھی اتنی سی بات بتاؤں گا کہ خدا کا منشا ہے کہ اُس کی زمین پر اُس کے بندوں کی حکومت ہو۔ جس طرح خدا نے فرعونوں کا خاتمہ کر دیا تھا اسی طرح خدا بادشاہوں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ اللہ کی رضا اب اس میں ہے کہ کھیتی کا پورا حق اُسے ملے جو اس میں ہل چلاتا اور بیج پھینکتا ہے..... خدا نے مجھے اپنی رضا کی تکمیل کے لئے تمہارے درمیان اتارا ہے..... کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے جیسے بندوں کی غلامی سے آزاد ہو جاؤ؟"

"ہاں..... ہاں!" — ہجوم سے بے شمار آوازیں اٹھیں — "ہم آزاد ہونا چاہتے ہیں"۔

"لیکن یہ کام آسان نہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "تمہیں متحد ہو کر میرے پیچھے چلنا پڑے گا"۔

"ہم تمہارے پیچھے چلیں گے" — ہجوم سے پُرجوش آوازیں اٹھیں۔

"یاد رکھو" — حسن بن صباح نے کہا — "تم یہ وعدہ میرے ساتھ نہیں' اُس خدا کے ساتھ کر رہے ہو جس نے مجھے ایلچی بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے۔ تم وعدے سے پھر گئے تو تم پر خدا کا عذاب نازل ہو گا۔ اگر تم نے خدا سے وعدہ نبھایا تو تم دنیا میں جنت دیکھ لو گے"۔

"ہم خدا کو ناراض نہیں کریں گے" — ہجوم میں سے آوازیں اٹھیں۔

یہ حسن بن صباح کی رُونمائی تھی۔ اس روپ میں وہ پہلی بار لوگوں کے سامنے آیا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ اتنا بڑا ہجوم اُس کا ہمنوا ہو گیا ہے تو اُس نے نہایت پُراثر الفاظ میں وعظ شروع کر دیا۔ مؤرخوں کا بیان ہے کہ حسن بن صباح کی اس تقریر میں زبان کا جادو اور خطابت کا کمال تھا' علم و فضل کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ لوگوں کے دلوں کی بات کر رہا تھا۔

لوگوں کو اُس کے اندازِ خطابت نے تو متاثر کرنا ہی تھا کیونکہ اس فن میں اُس نے کمال حاصل کیا تھا' لوگوں کے ذہنوں کو اُس نے اس دھوئیں کے ذریعے بھی اپنے قابو

میں کر لیا تھا جو دیگچہ نما برتنوں سے اٹھ رہا تھا۔ یہ ایک یا ایک سے زیادہ جڑی بُوٹیوں کی دُھونی تھی جن کے اثرات ویسے ہی تھے جیسے آج کل مسکّن (ٹرانکولائزر) گولیوں کے ہوتے ہیں۔ حسن بن صباح نے آگے چل کر قلعہ الموت میں جو جنت بنائی تھی اُس میں ان جڑی بُوٹیوں کا بے دریغ استعمال ہُوا تھا۔

بعض مؤرخوں نے یہی لکھا ہے کہ اُس نے ہجوم پر اس دُھونی کا نشہ طاری کر دیا تھا لیکن دو مؤرخوں نے لکھا ہے کہ وہاں پانی کے بہت سے مٹکے رکھ دیئے گئے تھے جن میں تھوڑا سا سرور پیدا کرنے والی دوائی ملا دی گئی تھی اور لوگوں سے کہا گیا تھا کہ اس پانی میں آبِ کوثر ملا ہُوا ہے' سب یہ پانی پئیں۔ لوگوں پر اس پانی نے ایسا نشہ طاری کر دیا تھا کہ ان کے ذہن حسن بن صباح کے ایک ایک لفظ کو دل و جان سے قبول کرتے جا رہے تھے۔

البتہ تاریخوں میں یہ واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ حسن بن صباح نے قبیلوں اور بستیوں کے سرکردہ افراد اور سرداروں کو پہلے ہی الگ کر لیا تھا۔ اُس نے لوگوں کے ہجوم کو وہاں سے چلتا کیا اور سرداروں وغیرہ کو اوپر ٹیکری پر بلا لیا۔ ٹیکری کے اوپر جگہ اتنی سرسبز اور خوشنما تھی جیسے انسانوں نے اپنے بادشاہ کے بیٹھنے کے لئے یہ جگہ بڑی محنت سے تیار کی ہو۔

ان سرکردہ افراد کی تعداد کوئی زیادہ نہیں تھی' بارہ چودہ ہی تھے۔ انہوں نے حسن بن صباح کے سامنے جا کر اس طرح تعظیم دی کہ رکوع کی حالت میں چلے گئے۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ یہ کوئی انسان ہے یا آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق ہے یا یہ کوئی فریب کار ہی تو نہیں۔ یہ سب اس سے مرعوب ہو گئے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جڑی بُوٹیوں کی دھونی کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں پر قبضہ کیا گیا تھا لیکن حسن بن صباح کے پاس لوگوں پر چھا جانے کا ایک ذریعہ اور بھی تھا۔ یہ تھا سحر یعنی جادو۔ اس کے استاد اور پیرو مرشد نے اسے سحرکاری کی خصوصی تربیت دی تھی۔ بعض مؤرخوں نے وثوق سے لکھا ہے کہ حسن بن صباح نے لوگوں کے ہجوم پر نظر ڈالی تو تمام کا تمام ہجوم ہپناٹائز ہو گیا تھا۔ سردار وغیرہ اوپر گئے تو وہ بھی ہپناٹائز کر دیئے گئے تھے۔ اسے اجتماعی ہپناٹزم کہا جاتا ہے۔

حسن بن صباح کی ابلیسیّت کی داستان کو بعض لوگ محض افسانہ سمجھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں یقین نہیں آتا کہ ایک انسان کی ایسی فریب کاری جو لاکھوں انسانوں کو اپنی زد میں لے لے اور لوگ اسے پیغمبر تسلیم کر لیں' من گھڑت قصہ ہی ہو سکتی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ حسن بن صباح اور اس کے گروہ کے بعض کارنامے اور کمالات ایسے ہیں جو قابلِ یقین نہیں لگتے لیکن حسن بن صباح نے جو ذرائع استعمال کئے تھے وہ حیران کن کمالات دکھا سکتے تھے۔ سحرکاری اس دور میں کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ اتنا ضرور ہے کہ اُس دور میں سحر یا کسی بھی قسم کا جادو ہر کسی کے ہاتھ میں نہیں آ سکتا تھا۔ مثال کے طور پر فرعونوں کے پاس جادوگر موجود تھے۔ یہودیوں نے اس فن میں کمال حاصل کیا لیکن یہ فن ایسا عام اور سہل نہیں تھا کہ ہر کوئی سیکھ لیتا۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حسن بن صباح کے ہاتھ کوئی ایسی جڑی بُوٹی لگ گئی تھی جس کی بُو یا دُھونی انسان کو بڑے دلکش تصورات میں لے جاتی تھی' مثلاً" اس بُوٹی کی بُو کے زیرِ اثر کوئی آدمی کنکریاں اور مٹی کھا رہا ہوتا تو وہ پورے یقین کے ساتھ یہ سمجھتا تھا کہ وہ من و سلویٰ کھا رہا ہے۔ پتھروں پر لیٹ کر اُسے نرم و گداز بستر کا لطف آتا تھا۔

آگے چل کر جب داستان تو آپ کو حسن بن صباح کی جنت میں لے جائے گا تو آپ دیکھیں گے کہ وہ جنت کس طرح آباد کی گئی تھی۔ وہ ایک جہنم تھا جسے لوگ جنت سمجھتے تھے۔

یہ بھی انسانی فطرت کی ایک حقیقت ہے کہ انسانی ذہن نیکی کو سوچ سوچ کر اور خاصا وقت لگا کر قبول کرتا ہے لیکن بدی کی دلکشی کو وہ فوراً" قبول کر لیتا ہے۔ کوئی بھی انسان اپنے آپ میں ابلیسی اوصاف پیدا کرنے شروع کر دے اور ذرا سی بھی اچھائی کو قبول نہ کرے تو تھوڑے سے وقت میں وہ مکمل ابلیس بن جاتا ہے۔ اُس کی زبان میں ایسی چاشنی پیدا ہو جاتی ہے جو پتھروں سے بھی دودھ نکال لیتی ہے۔ ایسا شخص جھوٹ کا سہارا لیتا ہے اور اتنی خوبصورتی سے جھوٹ بولتا ہے کہ لوگ دل و جان سے اُس کے جھوٹ کو سچ مان لیتے ہیں۔ مختصریات یہ ہے کہ انسان انسانیت کے درجے سے دستبردار ہو جائے اور یہ ذہن میں بٹھا لے کہ وہ اشرف المخلوقات نہیں تو وہ شخص شیطانیت کے میدان میں معجزہ کر کے دکھا سکتا ہے۔ جو شخص اپنی ماں بہن' بہو بیٹی کی عزت اور آبرو سے دستبردار ہو جائے وہ حیران کن کارنامے کر کے دکھا سکتا ہے۔

اگر بات حسن بن صباح کی نفسیات کی لے بیٹھیں تو اسی پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے لیکن بات سمجھانے کے لئے بہتر یہ ہے کہ واقعات بیان کر دیئے جائیں اور یہ پڑھنے والے پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ یہ سب کیا تھا۔ سمجھنے والی اصل بات یہ ہے کہ حسن بن صباح اور اُس کے استادوں اور اُس کے گروہ کا وجود اور ان کی یہ طلسماتی کارستانیاں اسلام کی سچائی پر بڑا ہی شدید حملہ تھا اور اسلام کے لئے اتنا بڑا چیلنج جو صلیبیوں کے چیلنج سے بھی بڑا اور خطرناک تھا۔

صلیبی تو میدان میں آ کر لڑے تھے' انہوں نے زمین دوز کارروائیاں اگر کی تھیں تو وہ اتنی سی تھیں کہ انہوں نے اپنی اور یہودیوں کی انتہائی خوبصورت لڑکیاں جاسوسی اور اخلاقی تخریب کاری کے لئے مسلمان امراء اور سالاروں کے درمیان مسلمان لڑکیوں کے روپ میں چھوڑ دی تھیں۔ اس کے برعکس حسن بن صباح جو اسماعیلی مسلک کا علمبردار تھا' اس لئے خطرناک تھا کہ وہ میدان میں لڑنے والا نہیں تھا۔ اُس کے حربے اتنے حسین تھے جنہیں نہ صرف عام لوگ بلکہ ذمہ دار لوگ بھی قبول کر لیتے تھے۔

○

اب داستان گو کے ساتھ آئیں وہ آپ کو اُس ٹیکری پر لے چلتا ہے جہاں بارہ چودہ سرکردہ افراد حسن بن صباح کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگوں کے ہجوم کو حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ بہت دور چلے جائیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہ سرکردہ افراد مرعوبیت کی کیفیت میں تھے اور ان پر دُھونی کا اور حسن بن صباح کی نظروں کا بھی اثر تھا۔ ان پر مجموعی طور پر ایسی کیفیت طاری تھی جیسے وہ اس لئے سانس لے رہے ہیں کہ حسن بن صباح سانس لے رہا تھا۔ اگر حسن بن صباح کے سانسوں کا سلسلہ رک جاتا تو یہ لوگ بھی اپنی سانسیں روک لیتے۔

"تم ان لوگوں کے سردار ہو" — حسن بن صباح نے کہا — "یہ گھوڑے ہیں اور یہ مویشی ہیں۔ تم جدھر چاہو انہیں ہانک کر لے جا سکتے ہو۔ میں تمہارے لئے اور خلقِ خدا کے لئے خوش بختی اور خوش حالی لے کر آیا ہوں۔ آج تک جتنے مذہب آئے ہیں انہوں نے انسانوں کو نظریئے' عقیدے اور پابندیاں دی ہیں لیکن خوش بختی اور خوشحالی کوئی مذہب نہیں دے سکا۔ مذہب صرف اسلام ہے لیکن اسلام بھی تم تک صحیح شکل میں نہیں پہنچا۔ میں تمہیں اس عظیم مذہب کی صحیح شکل دکھاتا ہوں۔ تم نے صرف یہ

کرنا ہے کہ اپنے اپنے قبیلے کو لگام ڈال کر اُس راستے پر چلانا ہے جو راستہ خدا نے مجھے دکھا کر زمین پر اتارا ہے"۔

حسن بن صباح نے اسماعیلی مسلک کی تبلیغ شروع کر دی اور ان سرداروں کو ایسے سبز باغ دکھائے کہ وہ اس کے قائل ہو گئے۔

"اب تمہارے پاس میرے مبلغ آئیں گے" — حسن بن صباح نے کہا — "تمہارا فرض ہے ان مبلغوں کی مدد کرنا اور لوگوں کو اس مسلک پر متحد کرنا...... کیا تم یہ کام کرو گے؟"

"ہاں اے قابلِ احترام ہستی!" — ایک معمر سردار نے کہا — "ہم یہ کام کریں گے"۔

"ہم تمہارے حکم پر جانیں قربان کر دیں گے"۔

"ہمیں آزما کے دیکھ!"

ایسی ہی آوازیں تھیں جو ان بارہ چودہ سرداروں کے سینوں سے پُرجوش طریقے سے نکلیں۔ حسن بن صباح پہلی ہی بار بغیر کسی دِقّت کے کامیاب ہو گیا۔ یہ صرف اس علاقے اور چند ایک بستیوں کا معاملہ تھا۔ اگلے ہی روز اُس نے چند ایک مبلغ جنہیں احمد بن عطاش نے پہلے ہی تیار کر رکھا تھا' ان بستیوں میں پھیلا دیئے اور ایک نئے فرقے کی تبلیغ شروع ہو گئی۔

لوگ یہ مطالبہ کرنے لگے کہ حسن بن صباح ان کے علاقے میں آئے' اپنی زیارت کرائے اور انہیں خدا کی باتیں سنائے۔ حسن بن صباح ایک اور علاقے میں اسی شان و شوکت سے جس شان و شوکت سے اس نے پہلی بار زیارت کروائی تھی ایک اور علاقے میں بڑے ہی ڈرامائی اور پُراسرار طریقے سے اپنی زیارت کروائی۔ اُس کی شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی تھی۔ لوگوں نے حسبِ عادت اس کے متعلق ایسی ایسی باتیں مشہور کر دیں تھیں جو محض زیبِ داستان تھیں۔

بھولے بھالے لوگوں نے جب بھی دھوکہ کھایا ہے وہ اپنی اسی فطری عادت کی وجہ سے کھایا ہے کہ جس سے متاثر ہوئے اُسے پیغمبری کا درجہ دے دیا اور اُس کی عام سی باتوں کو اس طرح پھیلایا جیسے یہ باتیں ان سے براہِ راست خدا نے کی ہوں۔ لوگ ان کے من گھڑت معجزے بھی بیان کرتے ہیں۔ یہ پسماندگی کے اُس دور میں بھی ہُوا اور یہ

آج بھی ہو رہا ہے جب انسان ترقی کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گیا ہے۔
پاکستان کے پیر اور عامل حسن بن صباح کے پیروکار ہیں۔ اپنے مریدوں اور اپنے سائلوں کو خیالی جنّت دکھا کر ان کے مال و دولت اور ان کی عزت و آبرو بھی لُوٹ لیتے ہیں۔

○

داستان گو پہلے سنا چکا ہے کہ قلعہ شاہ در پر احمد بن عطاش نے کس طرح قبضہ کیا تھا۔ اب آگے ایک اور قلعہ تھا جس کا نام خلجان تھا۔ اس قلعے کے امیر کا نام صالح نمیری تھا۔ اُس وقت اُس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ بہت دنوں سے سن رہا تھا کہ اس علاقے میں ایک شخصیت کا ظہور ہُوا ہے۔ شاہ بلوط کے درخت میں چمکنے والے ستارے کے متعلق بھی خبریں صالح نمیری تک پہنچی تھیں۔
یہ ساری باتیں خلجان کے لوگوں تک بھی پہنچی تھیں اور کئی لوگ اس جگہ آئے بھی تھے جہاں ستارہ دیکھنے کے لئے لوگ موجود رہتے تھے۔ حسن بن صباح جب لوگوں کے سامنے آیا تو خلجان کے کچھ لوگ اُس کی زیارت کو آئے تھے۔ وہ بھی وہی مرعوبیت لے کر گئے تھے جو ہر کسی پر طاری ہو گئی تھی۔ انہوں نے خلجان میں جا کر لوگوں کو ایسے دلفریب انداز میں حسن بن صباح کا ظہور اور اس کی باتیں سنائیں کہ لوگ حسن بن صباح کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہونے لگے۔ کچھ اور لوگ حسن بن صباح کی زیارت کو چل پڑے۔
صالح نمیری اپنے دوستوں اور مشیروں سے پوچھتا رہتا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ ابتدا میں اُسے یہی بتایا جاتا رہا کہ یہ کوئی ویسا ہی آدمی معلوم ہوتا ہے جیسے پہلے بھی نبی اور پیغمبر بن کر آ چکے ہیں۔ یہ کوئی نیا نبی ہو گا لیکن شہر میں حسن بن صباح کے چرچے اتنے زیادہ ہونے لگے کہ یہ آوازیں صالح نمیری کے کانوں تک پہنچیں۔ اُس نے اپنے مشیروں کو بلایا۔
"یہ میں کیا سن رہا ہوں" ــــ صالح نمیری نے کہا ــــ "مجھے اطلاع ملی ہے کہ شہر کے بچے بچے کی زبان پر اس کا نام ہے جو آسمان سے اُترا ہے اور اُس کی روح میں ستاروں کی روشنی ہے"۔
"ہاں آقا!" ــــ ایک مشیر نے کہا ــــ "آپ کو جو خبریں ملی ہیں وہ بالکل ٹھیک

ہیں۔ لوگ اُسے دیکھ بھی آئے ہیں۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ زمین کی نہیں آسمان کی مخلوق ہے"۔
"ایک خبر میں نے بھی سنی ہے" ــــ محفل میں بیٹھے ہوئے ایک اور آدمی نے کہا ــــ "میں نے سنا ہے کہ اس کے مبلّغ اس سارے علاقے میں پھیل گئے ہیں، اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اس کے دو تین مبلّغ کل یہاں بھی پہنچ رہے ہیں"۔
"خیال رکھو" ــــ صالح نمیری نے حکم کے لہجے میں کہا ــــ "یہ مبلّغ آئیں تو انہیں سیدھا میرے پاس لے آؤ۔ شہر کا کوئی شخص ان مبلّغوں کو اپنے گھر میں جگہ نہ دے۔ بہتر ہے اعلان کرا دو کہ مبلّغ سب سے پہلے والیٔ قلعہ سے ملے بغیر کسی کے ساتھ بات نہ کریں"۔
"حکم کی تعمیل ہو گی آقا!" ــــ اس آدمی نے کہا ــــ "ہم خود بھی ان مبلّغوں کو لوگوں سے دور رکھنا چاہیں گے۔ پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ یہ ہیں کون اور یہ کس عقیدے اور کس مسلک کی تبلیغ کر رہے ہیں"۔
"یہ اسلام کا ہی کوئی اور فرقہ پیدا ہو گیا ہو گا" ــــ صالح نمیری نے کہا ــــ "میں تمہیں سختی سے کہتا ہوں کہ کسی اور فرقے کو سر اٹھانے کی اجازت نہیں ہو گی۔ اسلام چھوٹے چھوٹے فرقوں میں تقسیم ہوتا جا رہا ہے اور سلطنتِ اسلامیہ چھوٹی چھوٹی بادشاہیوں میں تقسیم ہوتی جا رہی ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں بڑی سختی سے اہلِ سُنّت ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر یہ خوشی ہوتی ہے کہ سلجوقیوں نے اسلام کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دے دیا ہے۔ ان کی سلطنت میں کوئی شخص سُنّی عقیدے کے خلاف بات بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے ایک شک یہ بھی ہے کہ اسماعیلی درپردہ اپنے فرقے کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ یہ ہم سب کا فرض ہے کہ اس تبلیغ کو روکیں"۔
"ہاں آقا!" ــــ مشیر نے کہا ــــ "ہم اسلام کی صداقت اور اسلام کی اصل روح کو قائم رکھنے کے لئے اپنی جان و مال قربان کر دیں گے۔ ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہمارے پاس فوج نہیں"۔
"ہم فوج کیسے رکھ سکتے ہیں!" ــــ صالح نمیری نے کہا ــــ "فوج کو کھلائیں گے کہاں سے اور اسے تنخواہ کہاں سے دیں گے..... ہم نے کسی سے لڑنا نہیں۔ اگر ہم پر

حملہ ہو گیا تو سلجوقی ہماری مدد کو پہنچیں گے..... یہ بھی ذہن میں رکھو کہ کسی نئے عقیدے یا باطل نظریئے کو تلواروں اور برچھیوں سے نہیں روکا جا سکتا۔ باطل کی تبلیغ کا جواب حق کی تبلیغ سے ہی دیا جا سکتا ہے۔ اگر بہت سے لوگ سچ بولنے کے عادی ہوں تو ایک جھوٹا آدمی فوراً پکڑا جاتا ہے اور اس کا جھوٹ نہیں چل سکتا..... ان مبلغوں کو آنے دو اور انہیں سیدھا میرے پاس لے آؤ"۔

○

دوسرے ہی دن صالح نمیری کو اطلاع ملی کہ دو مبلّغ آ گئے ہیں۔ اُس نے انہیں اُسی وقت اندر بلا لیا۔ ان کے ساتھ صالح نمیری کا اپنا ایک اہل کار تھا۔ مبلغوں کی وضع قطع شریفانہ اور پُروقار تھی۔ چال ڈھال اور بات چیت سے وہ خاصے معزز لگتے تھے۔ صالح نمیری نے انہیں بڑے احترام سے بٹھایا اور ان سے پوچھا کہ وہ کس عقیدے کی تبلیغ کر رہے ہیں۔

"اس کا نام حسن بن صباح ہے" ـــــ ایک مبلّغ نے بتایا ـــــ "وہ اسلام کا علمبردار ہے"۔

"کیا وہ نبوّت کا دعویٰ کرتا ہے؟" ـــــ صالح نمیری نے پوچھا۔

"نہیں!" ـــــ مبلغ نے جواب دیا ـــــ "وہ اللہ کا ایلچی بن کر آیا ہے۔ وہ پہلے ایک ستارے کی طرح شاہ بلوط کے درخت میں چمکتا رہا پھر آسمان کی ایک روشنی میں اس کا ظہور ہوا اور ایک روز وہ زمین پر اُتر آیا"۔

"میری ایک بات غور سے سن لو" ـــــ صالح نمیری نے کہا ـــــ "جس علاقے میں تم تبلیغ کرتے پھر رہے ہو اور جس علاقے میں تمہارے خدا کے اس ایلچی کا ظہور ہُوا ہے اُس علاقے پر میرا کوئی عمل دخل نہیں لیکن ایک اہلِ سنّت مسلمان کی حیثیت سے میں خدا کے اس ایلچی کا راستہ روکنے کی پوری کوشش کروں گا۔ اس وقت تم دونوں کے لئے میرا حکم یہ ہے کہ اس شہر میں جس طرح داخل ہوئے تھے اسی طرح اس شہر سے نکل جاؤ۔ کبھی کوئی نبی یا خدا کا کوئی ایلچی شاہ بلوط کے درخت کے ذریعے آسمان سے نہیں اُترا۔ نبوّت کا سلسلہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا ہے۔ اگر تم یہ کہو کہ یہ حسن بن صباح کوئی درویش، دانشور یا عالم ہے تو میں آگے بڑھ کر اُس کا استقبال کروں گا"۔

"امیرِ قلعہ!" ـــــ ایک مبلّغ نے کہا ـــــ "اگر آپ صرف ایک بار تھوڑی سی دیر کے لئے اسے مل لیں تو آپ کا شک رفع ہو جائے گا۔ یہ تو ہم کہہ رہے ہیں کہ وہ خدا کا ایلچی ہے۔ ہم اُس کے اس پیغام سے متاثر ہوئے ہیں جو اُس نے ہمیں دیا ہے۔ وہ مسلمان ہے اور اہلِ سُنّت ہے۔ ہو سکتا ہے آپ انہیں ملیں تو آپ کو صحیح اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کوئی دانا عالم ہے یا اس کے دل و دماغ میں کوئی باطل نظریہ ہے"۔

"اور یہ بھی ہو سکتا ہے" ـــــ دوسرا مبلّغ بولا ـــــ "آپ جیسا عالم اور دانش مند امیرِ قلعہ اس کے ساتھ گفتگو کرے تو ہمیں بھی اس کی اصلیت معلوم ہو جائے گی ہو سکتا ہے ہم ہی غلطی پر ہوں اور ویسے ہی اس کی شخصیت سے متاثر ہو گئے ہوں"۔

"کیا وہ یہاں آئے گا؟" ـــــ صالح نمیری نے پوچھا۔

"شاید نہیں!" ـــــ ایک مبلّغ نے جواب دیا ـــــ "ہم ابھی چلے جاتے ہیں اور اُن سے بات کر کے آپ کو بتائیں گے کہ وہ آپ کے پاس آئیں گے یا آپ کو اُن کے پاس جانا پڑے گا..... اگر وہ آپ کو کسی جگہ بلائیں تو کیا آپ وہاں آ جائیں گے؟"

"ہاں!" ـــــ صالح نمیری نے کہا ـــــ "میں آؤں گا"۔

دونوں مبلّغ چلے گئے۔

○

اُن دنوں حسن بن صباح قلعہ شاہ در میں تھا۔ شاہ در میں بھی وہ لوگوں کے سامنے خدا کے ایلچی کے روپ میں آ گیا تھا۔ دونوں مبلّغ ایک دن اور ایک رات کی مسافت طے کر کے شاہ در پہنچے اور حسن بن صباح سے ملے۔ یہ مبلّغ اُس کے اپنے گروہ کے آدمی تھے۔ انہیں خصوصی تربیت دی گئی تھی۔ انہوں نے حسن بن صباح کو خلجان کے امیر قلعہ صالح نمیری کی باتیں سنائیں اور بتایا کہ وہ اسے ملنا چاہتا ہے۔

"میں اُسے ملوں گا" ـــــ حسن بن صباح نے کہا۔

"میں صالح نمیری کو کچھ کچھ جانتا ہوں" ـــــ پاس بیٹھے ہوئے احمد بن غطاش نے کہا۔

اکھڑ سا آدمی ہے اور بڑا پکا اہلِ سنّت ہے۔ وہ ذرا مشکل سے ہی مانے گا۔

"استادِ محترم!" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اس کے اکھڑپن کو توڑ نہیں سکوں گا؟"

"میں تمہاری حوصلہ شکنی نہیں کر رہا حسن!" ـــــ احمد بن غطاش نے کہا ـــــ "میں

یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ شخص ایک پتھر ہے جسے ذرا طریقے سے ہی توڑنا پڑے گا"۔

"آپ نے اچھا کیا کہ مجھے بتا دیا ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے یہ معلوم ہونا چاہئے تھا کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے..... ہمیں اس شخص کی نہیں بلکہ اس کے قلعے کی ضرورت ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ میں خلجان کا قلعہ اور یہ پورے کا پورا شہر آپ کی جھولی میں ڈال دوں گا"۔

"اُسے ملوگے کہاں؟" — احمد بن غطاش نے پوچھا

"نہ میں اُسے یہاں ملوں گا نہ اُس کے پاس جاؤں گا" — حسن بن صباح نے کہا

"میں اسے چشمے پر ملوں گا جہاں میں دوسری بار لوگوں سے ملا تھا"۔

وہ علاقہ بہت ہی سرسبز اور روح افزا تھا وہاں ایک چشمہ تھا اور چھوٹی سی ایک جھیل تھی۔ پانی اتنا شفاف کہ تہہ میں پڑی ہوئی کنکریاں بھی نظر آتی تھیں۔ چشمے کے اردگرد تھوڑا سا کھلا میدان تھا جس میں مخمل جیسی قدرتی گھاس تھی۔ چشمے کی نمی کی وجہ سے وہاں پھولدار پودوں کی بہتات تھی۔ بعض پھول بھینی بھینی خوشبو دیتے تھے۔ ذرا پیچھے ہٹ کر چھوٹی چھوٹی ٹیکریاں تھیں جو اونچی نیچی گھاس سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان ٹیکریوں پر بڑے خوبصورت درخت تھے۔ بڑے خوشنما درخت چشمے کے ارد گرد بھی تھے۔ یہ چھوٹا سا خطہ اس قدر دلنشیں اور عطر بیز تھا کہ جاں بلب مریض بھی وہاں جا کر اپنے وجود میں روحانی تازگی محسوس کرتا تھا۔

حسن بن صباح اس جگہ آچکا تھا اور اُسے یہ جگہ بہت ہی اچھی لگی تھی۔ اُس نے احمد بن غطاش سے کہا کہ اُس جگہ وہ بڑے خیمے لگا دے اور کھانا پکانے کا انتظام بھی وہیں کردے۔ اس نے بتایا کہ خیمے کس ترتیب میں گاڑے جائیں۔

یہ جگہ شاہ در سے کم و بیش تیس میل دُور تھی۔ وہاں سے خلجان بھی کچھ اتنا ہی دُور تھا۔ احمد بن غطاش نے اُسی وقت خیمے اور دیگر ساز و سامان وہاں تک پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ تمام سامان اونٹوں پر لاد کر بھیج دیا گیا۔ رات کے وقت حسن بن صباح گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔

وہ اکیلا نہیں گیا تھا۔ اُس کے ساتھ اپنے گروہ کے چند ایک آدمی تھے۔ یہ سب اُس کے بانکے اور چیلے چانٹے تھے۔ انہیں مختلف رول دیئے گئے تھے۔ دو علمائے دین کے

روپ میں تھے۔ دو خاص مرید اور حاشیہ بردار تھے اور باقی ایسے معتقد تھے جو یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ حسن بن صباح کی خدمت میں حاضر رہنے کو اپنی روح کی ضرورت سمجھتے ہیں۔

تین لڑکیاں بھی ساتھ تھیں جن میں ایک فرح تھی۔ یہ وہ لڑکی تھی جو حسن بن صباح کی محبت میں دیوانی ہو گئی تھی۔ محبت بھی ایسی کہ جب حسن بن صباح شاہ در کے لئے روانہ ہوا تھا تو فرح گھر سے بھاگ آئی اور حسن بن صباح کے راستے میں کھڑی ہو گئی تھی۔ اُس نے حسن بن صباح کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ جہاں بھی جا رہا ہے اسے ساتھ لے چلے۔

فرح بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ جسمانی اور ذہنی لحاظ سے چست اور تیز تھی۔ احمد بن غطاش نے اسے دیکھا تو اس نے اس کی خصوصی تربیت شروع کر دی تھی۔ حسن بن صباح تو جیسے اسے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔

چشمے پر پہنچ کر حسن بن صباح نے اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق خیمے نصب کرائے۔ یہ عام سی قسم کے خیمے نہیں تھے۔ یہ بڑے سائز کے چوکور خیمے تھے۔ اندر سے یہ خیمے لگتے ہی نہیں تھے، خوشنما، سجے سجائے کمرے لگتے تھے۔ اندر کی طرف ریشمی کپڑے لگائے گئے تھے۔ ان کی بلندی بھی کمروں جیسی تھی۔

حسن بن صباح نے اپنے اور صالح نمیری کے خیموں کے درمیان فاصلہ زیادہ رکھا تھا۔ ان کے درمیان لڑکیوں کا خیمہ اور تین چار خیمے اس کے چیلوں چانٹوں کے تھے۔ ایک ٹیکری کے پیچھے باورچی خانہ بنا دیا گیا تھا۔

حسن بن صباح نے ان ہی دو مبلغوں کو جو پہلے خلجان گئے تھے، صالح نمیری کے نام یہ پیغام دے کر بھیجا کہ وہ تین چار دنوں کے لئے اُس کے ساتھ رہے۔

○

اگلی ہی شام صالح نمیری ان دو مبلغوں کے ساتھ آ گیا۔ حسن بن صباح نے آگے جا کر اس کا استقبال کیا اور پورے احترام سے اسے خیموں تک لایا۔ صالح نمیری کے ساتھ اس کے چار محافظ تھے جو اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ صالح نمیری جب چشمے کے قریب پہنچا تو تینوں لڑکیوں نے اس کے آگے پھول پھینکنے شروع کر دیئے جو انہوں نے چھوٹی چھوٹی ٹوکریوں میں اٹھا رکھے تھے۔

"نہیں!" — صالح نمیری نے آگے بڑھ کر لڑکیوں سے کہا — "میں اتنا بڑا آدمی

نہیں ہوں۔ مجھے پھولوں کو روندنے کا گناہ گار نہ کریں"۔

"آپ کے ہاں رواج کچھ اور ہو گا" ـــ فرح نے جانفزا مسکراہٹ سے کہا ـــ "ہمارے ہاں کوئی معزز مہمان آتا ہے تو ہم اس کے راستے میں پھول بچھاتے ہیں"۔

"ہمارا بھی ایک رواج ہے" ـــ صالح نمیری نے کہا ـــ "ہمارے ہاں آپ جیسا کوئی مہمان آتا ہے تو ہم اُس کے راستے میں آنکھیں بچھاتے ہیں"۔

حسن بن صباح نے زوردار قہقہہ لگایا۔ صالح نمیری لڑکیوں کے قریب سے گزرتے انہیں دیکھتا رہا اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

صالح نمیری کی خاطر تواضع یوں کی گئی جیسے وہ کسی ملک کا بادشاہ ہو۔ وہ بادشاہ تو نہیں تھا لیکن وہ لگتا بادشاہ ہی تھا۔ خوبرو آدمی تھا۔ چہرے کا رنگ سرخی مائل سفید تھا اور اُس کے انداز اور چال ڈھال میں تمکنت تھی۔

رات کھانے کے بعد وہ اور حسن بن صباح اکیلے بیٹھ گئے۔

"کیا آپ نے نبوّت کا دعویٰ کیا ہے؟" ـــ صالح نمیری نے پوچھا۔

"نہیں تو!" ـــ حسن بن صباح نے جواب دیا ـــ "مجھے کچھ حاصل ضرور ہُوا ہے لیکن یہ نبوّت نہیں۔ میں کچھ سمجھ نہیں سکا یہ کیا ہے۔ میں یہ پورے یقین سے کہتا ہوں کہ میرا درجہ عام انسانوں سے ذرا اوپر ہو گیا ہے۔ یہ مجھے آپ بتائیں گے کہ میں کیا ہوں اور خدا نے مجھے کیوں یہ درجہ بخشا ہے"۔

"پہلے تو مجھے یہ بتائیں" ـــ صالح نمیری نے پوچھا ـــ "آپ آسمان سے کس طرح اُترے ہیں اور آپ کی روح میں ستاروں کا نور کہاں سے آ گیا ہے؟ لوگ شاہ بلوط کے درخت میں جو ستارہ دیکھتے رہے ہیں یہ کیا تھا اور اس کی حقیقت کیا ہے؟"

"میں کچھ نہیں بتا سکتا" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "میں بھی سنا کرتا تھا کہ ایک درخت میں دوسری تیسری رات ایک ستارہ نظر آتا ہے۔ میری بھی خواہش تھی کہ یہ ستارہ دیکھوں لیکن ستارے کے ظہور کے وقت مجھ پر غشی طاری ہو جاتی تھی۔ میں یہ ستارہ دیکھنے گیا تو لوگوں کے ہجوم کے ساتھ میں بھی انتظار ہی کرتا رہا، ستارہ نظر نہ آیا"۔

"یہ غشی کیسی ہوتی تھی؟" ـــ صالح نمیری نے پوچھا۔

"اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے" ـــ حسن بن صباح نے جواب دیا ـــ "غشی میں یہ ہوتا تھا کہ ایک بڑی ہی نورانی صورت والا بزرگ مجھے اپنے پاس بٹھا لیتا اور بتاتا تھا

کہ لوگوں کی رہنمائی کی سعادت خدا نے مجھے دی ہے۔ معلوم نہیں یہ بزرگ کون تھے جو مجھے سبق دیا کرتے تھے کہ میں لوگوں کی راہنمائی کس طرح کروں گا، پھر ایک روز کسی غیبی طاقت نے مجھے......"

"حسن بن صباح!" ـــ صالح نمیری نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ـــ "کوئی نئی کہانی سناؤ۔ تم سے پہلے بھی ایسے ہی نبی ہو گزرے ہیں جنہیں غشی میں ایک بزرگ آ کر بتایا کرتے تھے کہ خدا نے تمہیں اپنا ایلچی منتخب کر لیا ہے..... دیکھو حسن! خدا نے اپنے ایلچی بھیجنے کا سلسلہ غار حرا سے اپنا آخری ایلچی بھیج کر بند کر دیا ہے"۔

حسن بن صباح نے صالح نمیری کے ساتھ بحث نہ کی بلکہ وہ اس طرح کی باتیں کرتا رہا جیسے وہ تذبذب میں ہو کہ وہ کیا محسوس کر رہا ہے اور اس تبلیغ کا سلسلہ کیوں شروع کر دیا ہے۔

"اگر میں غلط راستے پر چل نکلا ہوں تو مجھے راہِ راست پر لائیں" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "آپ کچھ دن میرے پاس ٹھہریں۔ میں اپنے متعلق یہ بتا سکتا ہوں کہ میں سحری طاقت رکھتا ہوں اور زمین میں دبے ہوئے راز بتا سکتا ہوں۔ مجھ میں کوئی مافوق الفطرت طاقت موجود ہے۔ احمد بن غطاش میرا پیرو مرشد ہے۔ اُس نے مجھے ایک پُراسرار علم دیا ہے"۔

"شاہ در کا والی احمد بن غطاش؟" ـــ صالح نمیری نے پوچھا۔

"ہاں!" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "وہی احمد بن غطاش!"

"میں نے پہلے بھی سنا ہے" ـــ صالح نمیری نے کہا ـــ "ہاں حسن! میں نے پہلے بھی سنا ہے کہ وہ سحر کا یا کسی اور پُراسرار علم کا ماہر ہے اور وہ مستقبل کے پردوں میں جھانک سکتا ہے..... کیا تم نے اُس سے کچھ سیکھا ہے؟"

"بہت کچھ!" ـــ حسن بن صباح نے جواب دیا ـــ "ستاروں کی چال بھانپ سکتا ہوں۔ ہاتھوں کی لکیریں پڑھ سکتا ہوں"۔

صالح نمیری نے کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ پھیلا کر حسن کے آگے کر دیا۔

"تمہارا امتحان ہے" ـــ صالح نمیری نے کہا۔

صالح نمیری سمجھ نہ سکا کہ حسن بن صباح نے بات کا رخ پھیر دیا ہے۔ وہ اس بات کو گول کر گیا کہ وہ خدا کا ایلچی ہے اور اُس نے وسیع پیمانے پر اپنے عقیدے کی تبلیغ

شروع کر دی ہے۔ وہ کمال استادی سے گفتگو کو سحر، نجوم اور دست شناسی کی بھول بھلیوں میں لے گیا تھا۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ صالح نمیری واقعی پتھر ہے جسے توڑنا آسان کام نہیں۔

○

حسن بن صباح نے صالح نمیری کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کی ہتھیلی کو پھیلایا اور ہاتھ کی لکیریں دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اُس نے ہتھیلی پر اپنا سر اس طرح جھکا لیا جیسے لکیروں کو اور زیادہ غور سے دیکھ رہا ہو۔

اُس نے یوں تیزی سے اپنا سر اوپر کر لیا جیسے صالح نمیری کی ہتھیلی سے سانپ نے اُس پر حملہ کر دیا ہو، پھر اُس نے اپنے چہرے پر حیرت کا تاثر پیدا کر کے صالح نمیری کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"کیا نظر آیا ہے؟" —— صالح نمیری نے پوچھا

حسن چپ رہا۔ اس نے قلم دوات منگوا کر کپڑے کی طرح کے ایک کاغذ پر خانے بنائے۔ کسی خانے میں ایک دو ہندسے اور کسی میں ایک دو حروف لکھے۔ بعض خانوں میں ٹیڑھی سیدھی لکیریں ڈالیں اور بہت دیر انہیں دیکھتا اور سوچتا رہا۔

"کچھ بتاؤ گے؟" —— صالح نمیری نے پوچھا۔

"چار دن ہمیں انتظار کریں" —— حسن نے کہا —— "بات ابھی دھندلکے میں ہے"۔

"بات اچھی ہے یا بُری؟"

"اچھی بھی ہو سکتی ہے بُری بھی!" —— حسن نے کہا —— "اچھی ہے یا بُری، بات معمولی نہیں۔ شاہی بھی ہو سکتی ہے گدائی بھی..... چار دن دیکھوں گا۔ پانچویں دن لکیروں اور ستاروں کا بھید آپ کے سامنے آ جائے گا"۔

صالح نمیری اذیت ناک تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ حسن بن صباح کے کہنے پر وہ اپنے خیمے میں جا کر سو گیا۔

علی الصبح فرح اُس کے خیمے میں ناشتہ لے کر گئی۔ اُسے ناشتہ رکھ کر واپس آ جانا چاہئے تھا لیکن وہیں کھڑی رہی۔

"کچھ اور چاہئے؟" —— فرح نے پوچھا۔

"میں تو یہ ناشتہ دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں" —— صالح نمیری نے کہا —— "اور تم پوچھتی ہو کچھ اور چاہئے"۔

"نہیں کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھ جاؤں؟" —— فرح نے شرمیلی سی آواز میں پوچھا۔

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟" —— صالح نمیری نے مسکراتے ہوئے کہا —— "یہاں میرے پاس بیٹھو..... تم کون ہو؟ حسن بن صباح کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"میں والیٔ شاہ در احمد بن غطاش کی بھانجی ہوں" —— فرح نے جھوٹ بولا —— "انہوں نے مجھے ان کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے بھیجا ہے"۔

"شادی ہو چکی ہے؟"

"نہیں!" —— فرح نے جواب دیا۔

"اب تک تو تمہاری شادی ہو جانی چاہئے تھی" —— صالح نمیری نے کہا۔

"میرے والدین فوت ہو گئے ہیں" —— فرح نے دوسرا جھوٹ بولا —— "ماموں احمد بن غطاش نے مجھے اجازت دے رکھی ہے کہ میں جس کسی کو پسند کروں، انہیں بتا دوں اور وہ اس کے ساتھ میری شادی کر دیں گے۔ انہوں نے شرط صرف یہ رکھی ہے کہ وہ آدمی اچھی حیثیت والا ہونا چاہئے"۔

"تو کیا ابھی تک تمہیں اپنی پسند کا آدمی نہیں ملا؟"

"اب ملا ہے" —— فرح نے جواب دیا۔

"وہ خوش نصیب کون ہے؟"

فرح نے صالح نمیری کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

"اتنا زیادہ شرمانے کی کیا ضرورت ہے؟" —— صالح نمیری نے کہا اور پوچھا —— "کیا اُس آدمی کو معلوم ہے کہ تم نے اسے پسند کیا ہے؟"

"نہیں!"

"اُسے بتا دینا تھا" —— صالح نمیری نے کہا۔

"ڈرتی ہوں" —— فرح نے کہا —— "وہ یہ نہ کہہ دے کہ میں اُسے پسند نہیں"۔

"وہ کوئی جنگلی جانور ہو گا جو تمہیں پسند نہیں کرے گا!" —— صالح نمیری نے کہا۔

"کیا آپ مجھے پسند کریں گے؟" —— فرح نے جھینپتے شرماتے پوچھا۔

"کیا تم مجھے قبول کر لو گی؟" —— صالح نمیری نے اس کے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

فرح نے آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ صالح نمیری کی طرف سرکایا۔ دوسرے لمحے اُس کی انگلیاں صالح نمیری کی انگلیوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ پھر صالح نمیری کو یاد ہی نہ رہا کہ اُس کے آگے ناشتہ پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

اُس روز فرح کو ذرا سا بھی موقع ملتا وہ صالح نمیری کے خیمے میں چلی جاتی اور ہنس کھیل کر واپس آجاتی۔

○

اگلی رات حسن بن صباح اور صالح نمیری کھانے کے بعد الگ بیٹھے اس موضوع پر باتیں کرتے رہے کہ حسن بن صباح صحیح ہے یا غلط یا اسے وہم ہو گیا ہے کہ وہ خدا کا ایلچی ہے۔ حسن بن صباح کا اندازِ گفتگو یہ تھا کہ وہ بحث میں نہیں الجھتا تھا اور اُس کی کوشش یہ تھی کہ کوئی ایسی بات نہ کہہ بیٹھے جس سے صالح نمیری خفا ہو جائے۔ صالح نمیری کا گزشتہ رات کا انداز بڑا جارحانہ تھا لیکن اگلی رات اُس کے مزاج میں وہ برہمی نہیں تھی۔ اس کی بجائے وہ خاصا نرم تھا اور کسی وقت یوں پتا چلتا تھا جیسے وہ حسن بن صباح کا قائل ہوتا جا رہا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ صالح نمیری کے مزاج کی یہ تبدیلی اس وجہ سے نہیں تھی کہ حسن بن صباح نے اسے متاثر کر لیا تھا بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ وہ فرح کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ حسن بن صباح نے اُس کا ہاتھ دیکھا اور ستاروں کی گردش کا کچھ حساب لگایا تھا اور وہ یوں چپ ہو گیا تھا جیسے اُس نے کوئی بڑی ہی خاص بات چھپالی ہو۔ قدرتی امر ہے کہ وہ یہ راز معلوم کرنے کو بے تاب تھا۔

اُس رات صالح اور حسن خاصی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر صالح اپنے خیمے میں جا کر سو گیا۔ آدھی رات کا وقت ہو گا، صالح نے اپنے چہرے پر کوئی نرم اور ملائم سی چیز رینگتی ہوئی محسوس کی۔ وہ بڑی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ خیمے میں تاریکی تھی۔ صالح نے اپنے منہ پر ہاتھ مارا تو ایک نرم و ملائم ہاتھ اس کے ہاتھ میں آیا۔ اُس نے اندھیرے میں بھی اس ہاتھ کو پہچان لیا۔ اس نے اس ہاتھ کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور دوسرا ہاتھ اس کی کمر پر ڈال دیا جس کا یہ ہاتھ تھا۔

فرح اُس کے اوپر گری اور اُس کی ہنسی نکل گئی۔ صالح نمیری کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی اور فرح پچیس چھبیس سال کی تھی لیکن جسمانی صحت کے لحاظ سے صالح

نمیری فرح جیسا ہی جوان لگتا تھا۔ اس کا انداز بھی پُرشباب تھا۔ اُس نے فرح کو اس طرح اپنے بازوؤں میں لے کر بھینچا جیسے اسے اپنے وجود میں سمیٹ لینا چاہتا ہو۔

"ابھی نہیں!" — کچھ دیر بعد فرح نے کہا — "پہلے شادی..... ابھی بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں سب سوئے ہوئے ہیں"۔

صالح اٹھ کر بیٹھ گیا اور فرح کو اپنے پاس اس طرح بٹھائے رکھا کہ فرح اس کے ایک بازو میں تھی اور فرح کا سر صالح کے سینے پر تھا۔ وہ کچھ دیر اسی حالت میں پیار و محبت کی باتیں کرتے رہے۔ وہ دلی اور زبانی طور پر ایک دوسرے میں جیسے تحلیل ہو گئے تھے۔

"ایک کام کرو فرح!" — صالح نے فرح کو پلنگ پر اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے کہا — "حسن بن صباح نے میرا ہاتھ دیکھا تھا اور اُس نے ستاروں کی گردش بھی دیکھی تھی۔ پھر وہ یوں چپ ہو گیا تھا جیسے اُس نے میری قسمت میں کوئی ایسی بات دیکھ لی ہو جو وہ مجھے نہیں بتانا چاہتا۔ میں نے اُس کے چہرے پر کچھ اور ہی تاثر دیکھا تھا..... وہ مجھے کچھ نہیں بتا رہا۔ کہتا ہے چار روز انتظار کرو۔ میں یہاں اتنا رکنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ میں اس شخص سے متاثر نہیں ہوا نہ میں اُس کے اس دعوے کو مانتا ہوں کہ یہ خدا کا ایلچی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں یہ راز معلوم کرنے کے لئے رکا ہوں کہ اس نے میرے ہاتھ کی لکیروں میں کیا دیکھا ہے..... کیا تم اس سے معلوم کر سکتی ہو؟"

"ہاں!" — فرح نے جواب دیا — "اگر کوئی بہت ہی خطرناک بات نہ ہوئی تو وہ مجھے بتا دے گا"۔

"کبھی خیال آتا ہے کہ میں چلا جاؤں" — صالح نمیری نے کہا — "میں کٹر اہلِ سنت ہوں۔ قسمت میں جو لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا لیکن تم میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہو"۔

"اب آپ جہاں بھی جائیں گے یہ زنجیر آپ کے ساتھ رہے گی" — فرح نے بڑے ہی جذباتی لہجے میں کہا اور اس طرح بولی جیسے اسے اچانک یاد آگیا ہو — "اوہ! میں آپ کے لئے پھول لائی تھی"۔

اُس نے پلنگ پر ہاتھوں سے ٹٹولا اور پھول اُس کے ہاتھ آ گئے۔ یہ بڑے بڑے تین پھول تھے جنہیں اس نے گلدستے کی طرح ایک دھاگہ لپیٹ کر باندھ رکھا تھا۔ اُس نے

پھول صالح نمیری کی ناک کے ساتھ لگا دیئے۔

"اتنی پیاری خوشبو!" ــــ صالح نے کہا ــــ "میں نے اس علاقے کے وہ پھول بھی سونگھے ہیں جو دور دراز جنگلوں میں کھلتے ہیں لیکن اس پھول کی خوشبو میرے لئے بالکل نئی ہے"۔

اُس نے بار بار ان پھولوں کو سونگھا اور جوں جوں لمحے گزرتے گئے' صالح پر ایسی کیفیت طاری ہوتی گئی کہ وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ فرح کے لئے پیدا ہُوا تھا اور باقی عمر اس کی غلامی میں گزارے گا۔

"میرا ایک مشورہ مانیں" ــــ فرح نے کہا ــــ "حسن بن صباح کو یہ دعوت دیں کہ وہ کچھ دن خلجان میں آپ کا مہمان رہے۔ اگر یہ یہیں سے واپس چلا گیا تو پھر یہ آپ کے ہاتھ کی لکیریں اور ستاروں کا راز اپنے ساتھ لے جائے گا۔ دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ یہ یہاں سے واپس گیا تو مجھے بھی ساتھ لے جائے گا۔ ہم خلجان چلے گئے تو میں اسے کہہ سکتی ہوں کہ میں واپس نہیں جاؤں گی..... میں نے اب باقی عمر آپ کے ساتھ ہی رہنا ہے"۔

"میں ایسے ہی کرتا ہوں" ــــ صالح نے کہا ــــ "میں اسے کہوں گا۔ میرے ساتھ خلجان چلو اور مجھے قائل کرو کہ تم خدا کی بھیجی ہوئی برگزیدہ شخصیت ہو اور میں تمہیں صرف مان ہی نہیں لوں گا بلکہ تمہارے عقیدے کی اتنی تبلیغ کروں گا کہ تم حیران رہ جاؤ گے"۔

فرح بہت دیر بعد اُس کے خیمے سے نکلی۔ صالح نمیری کو وہ اس جذباتی کیفیت میں چھوڑ آئی کہ اُس نے باقی رات کروٹیں بدلتے گزار دی۔ وہ رہ رہ کر یہی چاہتا تھا کہ فرح کے پاس چلا جائے یا اُسے اپنے خیمے میں لے آئے۔

○

ایک روز بعد ایک قافلہ خلجان کی طرف جا رہا تھا۔ صالح نمیری نے حسن بن صباح کو خلجان کی دعوت دی تھی جو اُس نے بخوشی قبول کر لی تھی۔ اُس نے دونوں لڑکیوں کو واپس شاہ در بھیج دیا تھا صرف فرح کو ساتھ رکھا تھا۔ باورچیوں کو بھی واپس بھیج دیا تھا۔ تمام خیمے اور دیگر سامان بھی واپس چلا گیا اور حسن بن صباح کے ساتھ فرح کے علاوہ چند آدمی رہ گئے تھے۔

صالح نمیری خلجان کا والی اور امیر تھا۔ اُس کی رہائش گاہ محل جیسی تھی۔ رہن سہن

امیرانہ تھا۔ اُس نے وہاں پہنچتے ہی حسن بن صباح اور فرح کے کمرے الگ کر دیئے اور دوسرے آدمیوں کی رہائش کا بھی بڑا اچھا انتظام کیا۔

اُس نے فرح کو وہ کمرہ دیا جو اُس کی اپنی خواب گاہ کے بہت قریب تھا۔ اُس کی دو بیویاں تھیں جو اپنے اپنے کمروں میں رہتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امیر کبیر آدمی چار چار بیویاں رکھتے تھے اور ان بیویوں کی حیثیت بیوی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتی تھی۔ ہر بیوی کا یہ فرض تھا کہ خاوند کو تفریح اور جسمانی آسودگی مہیا کرے۔ اُس زمانے میں سوکن کا تصور ناپید تھا۔ ہر بیوی کو اُس کے حقوق ملتے تھے۔

صالح نمیری کے لئے ایک اور بیوی لے آنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

خلجان میں پہلی رات فرح نے وہی حرکت کی جو وہ پہلے کر چکی تھی۔ وہ آدھی رات کے وقت صالح کے کمرے میں چلی گئی۔ صالح کو توقع تھی کہ فرح آئے گی اس لئے اُس نے دونوں بیویوں میں سے کسی ایک کو بھی اپنے کمرے میں نہیں رکھا تھا۔

"ایک راز تو مل گیا ہے" ــــ فرح نے کہا ــــ "بڑی مشکل سے حسن نے بتایا ہے کہ آپ کی قسمت میں ایک خزانہ لکھا ہے بلکہ ایک خزانہ آپ کی راہ دیکھ رہا ہے"۔

"اُس نے یہ راز مجھ سے چھپایا کیوں ہے؟"

"میں اس سوال کا جواب بھی لے آئی ہوں" ــــ فرح نے کہا ــــ "وہ کہتا ہے کہ خزانہ ایسی جگہ ہے جہاں تک پہنچنے کے لئے جان کی بازی لگانی پڑے گی! پھر جس جگہ یہ خزانہ ہے وہاں بھی بڑا ہی خوفناک خطرہ ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں ایک یا ایک سے زیادہ بڑے زہریلے اور بڑے لمبے سانپ ہوں۔ اگر سانپ نہ ہوئے تو صحرائی بچھو ہوں گے جو سانپوں جیسے ہی زہریلے ہوتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہوئے تو وہاں درندے ہوں گے ..... ان تمام خطروں سے نمٹنے کا انتظام ہو تو کامیابی ہو سکتی ہے"۔

"خزانہ کتنا کچھ ہے؟" ــــ صالح نے پوچھا ــــ "خزانے میں کیا ہے؟..... کیا اُس نے یہ نہیں بتایا؟"

"اس نے تفصیل نہیں بتائی" ــــ فرح نے کہا ــــ "اُس نے یہ کہا ہے کہ خزانہ اتنا زیادہ ہے کہ اس سے خلجان جیسے دس بارہ شہر خریدے جا سکتے ہیں اور یہ خزانہ اتنے شہر خرید کر بھی سات پشتوں تک ختم نہ ہو"۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے فرح" ــــ صالح نے کہا ــــ "حسن بن صباح خود اس خزانے

تک پہنچ جائے۔ اُس کے ہاتھ میں سحر اور نجوم کی طاقت ہے"۔

"نہیں میرے آقا!" ـــــ فرح نے کہا ـــــ "اُسے دنیا کے مال و دولت اور ان خزانوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ اس وقت آپ اسے جا کر دیکھیں تو وہ آپ کو عبادت میں مصروف نظر آئے گا۔ اُس کا دھیان خدا کی خوشنودی پر مرکوز رہتا ہے۔ دنیاوی لطف اور لذّت سے وہ دُور رہتا ہے"۔

"پھر اُس نے تمہیں اپنے ساتھ کیوں رکھا ہُوا ہے؟" ـــــ صالح نمیری نے پوچھا۔

"میرے ساتھ اس کا وہ تعلق نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں" ـــــ فرح نے کہا ـــــ "میں اپنے ماموں کی اجازت سے سیر و تفریح کے لئے اس کے ساتھ آئی ہوں لیکن اس سے مجھے انکار نہیں کہ یہ شخص میرے ساتھ بہت پیار کرتا ہے۔ یہ پیار کسی اور نوعیت کا ہے۔ مجھے اپنے پاس بیٹھا لیتا ہے اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہتا ہے کہتا ہے کہ تمہارے یہ نرم و ملائم ریشمی بال مجھے بہت ہی اچھے لگتے ہیں۔ یہ تو اُس نے کئی بار کہا ہے کہ میں تمہیں ایک پھول سمجھتا ہوں' پھول کو سونگھا جاتا ہے اسے ناپاک نہیں کیا جاتا اور اسے مسلا نہیں جاتا..... میں آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اس کے دل میں میرے لئے ایسا پیار ہے جو آبِ کوثر جیسا مقدس ہے۔ آپ کوئی وہم دل میں نہ رکھیں"۔

"میں دل میں وہم نہیں رکھوں گا فرح!" ـــــ صالح نمیری نے کہا ـــــ "تم اسے کہو کہ مجھے وہ جگہ اور اس جگہ کا راستہ بتا دے جہاں وہ خزانہ ہے۔ میں ایسا انتظام کر کے جاؤں گا کہ کوئی بھی خطرہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ میرے ساتھ اتنے برچھی بردار اور تیغ زن ہوں گے جو سینکڑوں سانپوں کو ختم کر دیں گے۔ ذرا سوچو فرح اگر ہمیں یہ خزانہ مل جائے تو ہماری زندگی کس قدر خوبصورت اور شاہانہ ہو گی"۔

"اس خزانے کے ساتھ میری دلچسپی بھی اتنی ہی ہے جتنی آپ کی ہے" ـــــ فرح نے کہا ـــــ "میں تو پوچھ کر ہی دم لوں گی"۔

جب فرح صالح کے کمرے میں سے آنے لگی تو صالح نے اسے روک لیا۔

"فرح!" ـــــ صالح نے کہا ـــــ "وہ پھول جو تم اُس رات خیمے میں میرے لئے لائی تھیں' وہ یہاں سے نہیں مل سکتا؟"

"مل سکتا ہے" ـــــ فرح نے جواب دیا ـــــ "آپ کو وہ خوشبو پسند ہے تو میں اس

پھول کی بجائے وہ خوشبو تھوڑی سی رُوئی پر لگا کر آپ کو دے سکتی ہوں لیکن یہ مجھے چوری کرنی پڑے گی۔ یہ عطر حسن بن صباح کے پاس ہے جسے وہ چھپا کر رکھتا ہے۔ یہ اُسی پھول کا عطر ہے۔ وہ تو اتفاق سے وہاں مجھے دو تین پھول نظر آ گئے تھے جو میں نے آپ کو دے دیئے تھے"۔

○

اگلی شام صالح نمیری اور حسن بن صباح کھانے کے لئے بیٹھے تو صالح نمیری نے اپنی مونچھوں پہ بھی عطر لگا رکھا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے فرح موقعہ دیکھ کر تھوڑی سی رُوئی پر ایک قطرہ عطر کا لگا کر صالح نمیری کو دے آئی تھی۔ صالح نمیری نے کھانے سے پہلے یہ عطر اپنی مونچھوں پر لگا لیا تھا۔

صالح نمیری نے اپنے مزاج میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ ہنسے اور مسکرائے اور اس زندگی سے پورا لطف اٹھائے۔

"فرح کو بھی نہ بلا لیں؟" ـــــ کھانے کے بعد صالح نے حسن سے کہا ـــــ "وہ بھی آخر ایک امیرِ شہر کی بھانجی ہے"۔

"بلا لینا چاہئے" ـــــ حسن نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد فرح آ گئی۔

"میری ایک بات مان لیں" ـــــ فرح نے حسن بن صباح سے کہا ـــــ "امیرِ خلجان بہت پریشان ہیں۔ آپ نے ان کا ہاتھ دیکھا اور نجوم کا بھی حساب کتاب دیکھا لیکن انہیں آپ نے کچھ بتایا نہیں"۔

"ہاں حسن!" ـــــ صالح نمیری نے کہا ـــــ "اس سے بہتر تھا کہ آپ میرا ہاتھ نہ دیکھتے۔ اگر کوئی خطرناک معاملہ ہے تو وہ بھی مجھے بتا دیں۔ آپ کی خاموشی نے مجھے اذّیت میں مبتلا کر رکھا ہے"۔

"بتا دیں" ـــــ فرح نے بچّوں کے سے انداز سے کہا ـــــ "اب بتا دیں"۔

حسن بن صباح خاموش رہا۔ اُس نے سر جھکا لیا وہ کچھ دیر اسی حالت میں رہا۔ صالح اور فرح سراپا سوال بنے اسے دیکھتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد حسن بن صباح نے سر اٹھایا اور صالح نمیری کی طرف دیکھا۔

"آپ کے ہاتھ کی لکیروں میں ایک خزانہ ہے" ـــــ حسن بن صباح نے انتہائی

سنجیدہ لہجے میں کہا — "لیکن یہ خزانہ ایسا نہیں کہ آپ وہاں جائیں گے اور وہ خزانہ وہاں سے اٹھالائیں گے۔ اس میں جان جانے کا خطرہ ہے۔ ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ آپ وہ پورے کا پورا خزانہ اٹھالائیں۔ اس خزانے کا ایک حصہ الگ کرنا پڑے گا"۔

"آپ جتنا حصہ مانگیں گے میں دوں گا" — صالح نمیری نے کہا۔

"یہ بات نہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے حصہ نہیں چاہئے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ میں آپ کو اس خزانے کی خبر دے ہی نہیں رہا تھا۔ یہ میرے علم کی کچھ شرطیں ہیں جو آپ کو پوری کرنی پڑیں گی۔ اگر نہیں کریں گے تو پھر آپ کا انجام ایسا ہو گا جو میں آپ کو بتاؤں تو اس کے تصور سے ہی آپ کانپ اٹھیں"۔

"اگر حصہ لینا ہی ہے تو یہ فرح لے سکتی ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "میں نہیں لے سکتا۔ آپ کا اور کوئی قریبی عزیز لے سکتا ہے..... بات یہ ہے امیرِ خلجان! یہ خزانہ اس علم کے ذریعے مجھے نظر آیا ہے۔ میں اسی علم کے ذریعے یہ کر سکتا ہوں کہ آپ کو خزانہ مل جائے اور آپ کی جان بھی محفوظ رہے۔ مجھے حکم ملا ہے کہ جب تک اس قلعے کا کوئی قائم مقام والی مقرر نہ ہو جائے آپ اس خزانے تک نہیں پہنچ سکتے"۔

"میری بات سنو حسن!" — صالح نمیری نے کہا — "آپ مجھے کچھ نہ بتائیں۔ آپ کا یہ علم اور عمل جو کچھ بھی کہتا ہے' اس کی پابندی کریں۔ مجھے صرف خزانہ چاہئے"۔

"پھر آپ میری ہر بات کی پابندی کریں" — حسن بن صباح نے کہا — "خزانہ لینے آپ جائیں گے۔ یہ سارا انتظام آپ کا ہو گا۔ خزانہ مل جائے گا تو اس کا ایک چوتھائی حصہ اُسے ملے گا جو آپ کی جگہ یہاں قائم مقام والیٔ قلعہ ہو گا"۔

"والیٔ قلعہ تو کوئی میرا ہی عزیز ہو گا" — صالح نمیری نے کہا۔

"نہیں!" — حسن بن صباح نے کہا — "میں یہ بھی اپنے علم کی روشنی میں دیکھ چکا ہوں۔ پہلے میں آپ کو یہی بتا دیتا ہوں۔ قلعے اور اس شہر کے ہر فرد و بشر کی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی ہے لیکن میں یہ ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ میرے لئے حکم ہے کہ قلعے کا قائم مقام میں مقرر کروں۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ قائم مقام کون ہو گا۔ میں یہ قلعہ کسی کو بغیر سوچے تو نہیں دے سکتا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ شاہ در کا والی احمد بن عطاش آپ کی جگہ عارضی طور خلجان کا بھی والی ہو گا اور جب آپ واپس

آئیں گے تو آپ خزانے کا چوتھا حصہ اسے دیں گے اور وہ شہر آپ کے حوالے کر کے شاہ در چلا جائے گا"۔

"مجھے منظور ہے" — صالح نمیری نے بلا سوچے کہا۔

"اس کی آپ کو تحریر دینی پڑے گی" — حسن بن صباح نے کہا — "آپ کو خزانے کا راستہ اور خزانے کی جگہ اُس وقت بتائی جائے گی جب آپ یہ تحریر دے دیں گے۔ یہ ایک معاہدہ ہو گا جس پر آپ کے دستخط اور آپ کی مُہر ہو گی۔ احمد بن عطاش کی جگہ میں دستخط کروں گا اور گواہوں کے طور پر یہاں کی دو مسجدوں کے امام اور اسی شہر کے قاضی کے دستخط ہوں گے۔ اگر آپ زندہ واپس نہ آسکے تو خلجان کا امیرِ شہر احمد بن عطاش ہی ہو گا۔ وہ جسے چاہے گا یہ شہر دے دے گا۔ نہیں دینا چاہے گا تو اس سے کوئی بھی یہ شہر نہیں لے سکے گا"۔

"کیا موت کا خطرہ یقینی ہے؟" — صالح نمیری نے پوچھا۔

"خطرہ یقینی ہے" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "لیکن موت یقینی نہیں۔ زندہ واپس آنے کا امکان موجود ہے۔ آپ کے انتظامات جتنے مضبوط ہوں گے موت کا خطرہ اتنا ہی کم ہو گا"۔

صالح نمیری کی ایک طرف ذہنی پختگی کا یہ عالم تھا کہ وہ حسن بن صباح کی اس حیثیت کو تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ وہ ایک روشنی کے ذریعے آسمان سے اُترا ہے لیکن دوسری طرف اُس کی شخصی کمزوری کا یہ عالم تھا کہ حسن بن صباح اُسے جو کچھ بھی کہے جا رہا تھا وہ اُسے تسلیم کر رہا تھا۔ وہ اتنا بھی نہیں سوچ رہا تھا کہ خزانے کا حصول یقینی نہیں لیکن لالچ کا یہ حال کہ وہ اتنا بڑا شہر ایک غیر آدمی کو لکھ کر دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

اُس زمانے میں بلکہ اس سے بہت پہلے سے یوں ہوتا تھا کہ ڈاکوؤں اور راہزنوں کے بہت بڑے بڑے گروہ جو بہت ہی بڑے بڑے قافلوں کو لُوٹتے تھے' لُوٹ مار کا قیمتی سامان مثلاً" ہیرے اور جواہرات کسی ایسی جگہ رکھ دیتے تھے جو دشوار گزار ہوتی تھی اور وہاں تک کوئی اور انسان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بادشاہوں میں بھی یہ رواج تھا کہ وہ اپنا خزانہ کسی خفیہ مقام پر دفن کر دیتے تھے۔ کچھ بادشاہ ایسے ہو گذرے تھے جو ساری دنیا کو فتح کرنے کے لئے نکلے تھے۔ وہ شہروں اور بستیوں کو لُوٹتے اور بادشاہوں کے خزانے صاف کرتے چلے جاتے تھے۔ جب اُن کے پاس اتنا زیادہ خزانہ اکٹھا ہو جاتا جو سنبھالا نہیں جاتا تھا تو

اسے وہ کسی بڑے ہی دشوار گزار علاقے میں اس توقع پر دفن کر جاتے تھے کہ واپس آکر نکال لے جائیں گے"۔

اُن زمانوں سے اب تک یہ عقیدے یا روایتیں چلی آرہی ہیں کہ کوئی عامل یا جوتشی یا پُراسرار علوم کا کوئی ماہر اس قسم کے خزانے کی نشان دہی کر سکتا ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ جو کوئی اس قسم کا خزانہ نکالنے کے لئے جاتا ہے وہ زندہ واپس نہیں آسکتا۔ یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس قسم کے مدفون خزانوں کی حفاظت بڑے زہریلے سانپ کرتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس قسم کے خزانوں کی حفاظت جنات کیا کرتے ہیں۔

ان تمام خطرات کے باوجود اس قسم کی کہانیاں مشہور تھیں کہ فلاں شخص کو مدفون خزانہ ملا اور وہ بادشاہ بن گیا۔ ایسے لوگ بھی ہو گذرے ہیں جنہوں نے ایسے خزانوں کی تلاش میں ہی زندگی گزار دی تھی۔

دولت اور عورت دو ایسی چیزیں ہیں جن کی خاطر انسان نے اپنے مذہب تک کو خیرباد کہا ہے۔ خزانے کا لالچ ایک نشے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نشے میں اگر عورت کا نشہ شامل ہو جائے تو انسان کی عقل پر سیاہ پردہ پڑ جاتا ہے۔

صالح نمیری اسی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ چالیس سال کی عمر میں ایک نوجوان لڑکی اُس کی محبت کا دم بھرنے لگی تھی اور وہ اس کی محبت میں اس قدر بے چین اور بے تاب تھی کہ راتوں کو چھُپ چھُپ کر اس کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ اس لڑکی نے اُسے پھر سے جوان کر دیا تھا۔ پھر اس لڑکی نے اُسے ایسے خزانے کی خبر دے دی جس سے وہ خلجان جیسے دس شہر خرید سکتا تھا اور باقی خزانہ اس کی سات پشتوں کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔

وہ صالح نمیری جو اپنے آپ کو اہل سنت اور بڑا پکا مسلمان کہتا تھا روزمرہ کی نمازیں ہی بھول گیا تھا۔ فرح اور خزانہ اُس کے ذہن میں عقیدے کی صورت اختیار کر گئے تھے۔

یہ تو انسانی فطرت کی کمزوریاں تھیں جنہوں نے صالح نمیری کی عقل پر پردے ڈال دیئے تھے اور وہ ذہنی طور پر اس طرح مفلوج ہو گیا تھا کہ اپنے آپ کو وہ بہت بڑا دانا سمجھنے لگا تھا۔ اُن مؤرخوں نے جنہوں نے اس قسم کے واقعات ذرا تفصیل سے لکھے ہیں' ایک اور راز سے پردہ اٹھایا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ فرح نے صالح نمیری کو رات کی ایک ملاقات میں تین پھول دیئے تھے۔ جنہیں سونگھ کر صالح نے پوچھا تھا کہ یہ پھول کہاں

سے آئے ہیں؟ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس علاقے کا کوئی پھول ایسا نہیں جو اس نے نہ سونگھا ہو لیکن اس پھول کی خوشبو سے وہ ناآشنا تھا۔

یہ پھول سونگھنے کے بعد اُس نے اپنے مزاج میں اور ذہنی کیفیت میں بڑی ہی خوشگوار تبدیلی محسوس کی تھی جس کے زیر اثر اس پر خود سپردگی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ خلجان میں آکر جب فرح اُس کے کمرے میں گئی تو اس نے فرح سے پوچھا تھا کہ وہ پھول یہاں کہیں ملتا ہے یا نہیں فرح نے اسے بتایا تھا کہ پھول تو نہیں ملے گا' اس کا عطر مل جائے گا۔ اگلی شام فرح نے اس عطر کا ایک قطرہ تھوڑی سی رُوئی پر لگا کر صالح نمیری کو دے دیا تھا۔ صالح نے یہ عطر اپنی مونچھوں پر مل لیا تھا۔ اس کے بعد وہ حسن بن صباح سے کھانے پر ملا تھا۔

حسن بن صباح نے جب خزانے کی بات شروع کی تو وہ جو کچھ بھی کہتا رہا' صالح بلا سوچے سمجھے قبول کرتا رہا یہاں تک کہ اُس نے اپنا شہر بھی احمد بن عطاش کے نام لکھ دینے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ یہ خزانے کا لالچ اور فرح کی محبت کا خمار نہیں تھا بلکہ یہ اس عطر کے اثرات تھے جو اس نے مونچھوں کو لگایا تھا۔ تاریخوں میں آیا ہے کہ فرح اُس کے پاس جو تین پھول لے گئی تھی اُن پر بھی یہی عطر ملا ہوا تھا۔ اس عطر کے اثرات دماغ پر اس طرح کے ہوتے تھے کہ انسان حقیقت سے لاتعلق ہو جاتا اور جو کچھ بھی اُس کے ذہن میں ڈالا جاتا اسے وہ حقیقت سمجھتا تھا۔ یوں کہہ لیں کہ اُس کا دماغ اُس شخص کے قبضے میں آجاتا تھا جو اُس کے سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہوتا تھا۔

داستان گو پہلے سنا چکا ہے کہ حسن بن صباح کی ابلیسی قوتیں اپنے کرشمے دکھاتی تھیں لیکن اُس نے سحرکاری کے علاوہ ایسی جڑی بوٹیاں اور پھول وغیرہ دریافت کر لئے تھے جن کی دُھونی یا خوشبو انسانی ذہن کو حقیقت سے ہٹا کر بڑے حسین تصورات میں لے جاتی تھی۔ یہی اس شخص کی قوت تھی جس نے اپنے دور کے لاکھوں انسانوں کو دنیا میں جنت دکھا دی تھی۔

صالح نمیری بے تاب تھا کہ اسے خزانے کا راستہ بتایا جائے۔ وہ تو دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ حسن بن صباح نے قلم دوات منگوا کر نقشہ بنانا شروع کر دیا۔ ساتھ وہ صالح نمیری کو بتاتا جا رہا تھا کہ اس راستے پر کیا کیا دشواریاں پیش آئیں گی اور فلاں جگہ کیا خطرہ ہو سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

"آپ یہ علاقے دیکھ کر حیران رہ جائیں گے" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "آپ سمجھیں گے کہ یہ کوئی اور ہی دنیا ہے اور یہ وہ زمین نہیں جس پر انسان آباد ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ایسا جنگل آئے گا جو آپ کو ٹھنڈک پہنچائے گا۔ آپ وہیں رک جانا چاہیں گے۔ زمین کا تھوڑا سا ٹکڑا ایسا آئے گا جہاں آپ کو ہلکا ہلکا کیچڑ نظر آئے گا۔ آپ گھوڑوں پر سوار اس کیچڑ میں سے گزریں گے تو آپ کے گھوڑے دھنس جائیں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اس دلدل سے نہیں نکال سکے گی۔ آپ گھوڑوں سمیت اس دلدل میں ڈوب کر ہمیشہ کے لئے گم ہو جائیں گے"۔

"میں ایسی جگہوں پر نظر رکھوں گا" ـــــ صالح نمیر نے کہا ـــــ "ایسی جگہ دیکھ کر پہلے وہاں پتھر پھینکوں گا۔ اس سے پتہ چل جائے گا کہ یہ دلدل ہے"۔

"پھر آپ کو ایسی ریت ملے گی جو آپ کو دلدل کی طرح اپنے اندر غائب کر دے گی" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "راستے میں ایسا صحرا آئے گا جہاں سے کبھی کوئی انسان نہیں گزرا۔ وہاں صحرائی جانور اور کیڑے مکوڑے بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ آپ کو اپنے ساتھ پانی کا بے شمار ذخیرہ لے جانا پڑے گا۔ جس علاقے میں یہ خزانہ ہے وہاں ایسی چٹانیں کھڑی ہوں گی جیسے دیواریں کھڑی ہوں۔ ان پر سے گھوڑوں کے پاؤں پھسلیں گے۔ بہتر یہ ہو گا کہ گھوڑے پیچھے چھوڑ کر پیدل جائیں۔ بعض چٹانوں پر آپ یوں چلیں گے جیسے دیوار پر چل رہے ہوں۔ وہاں پاؤں پھسلنے کا امکان زیادہ ہو گا"۔

"میں اپنے ساتھ جانباز اور عقل والے آدمی لے جاؤں گا" ـــــ صالح نمیری نے کہا ـــــ "آپ مجھے جگہ اچھی طرح سمجھا دیں"۔

حسن بن صباح نے اسے وہ جگہ بڑی اچھی طرح سمجھا دی۔

"آپ کے ساتھ ایک اونٹنی ہونی چاہئے" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "اور اونٹنی دودھ دینے والی ہونی چاہئے۔ جب آپ خزانے والی جگہ پہنچ جائیں تو اونٹنی کا دودھ دوہ کر ایک پیالے میں ڈال دیں اور پیالہ خزانے کی اصل جگہ سے کچھ دور رکھ دیں۔ اس سے یہ ہو گا کہ وہاں جتنے بھی سانپ ہوں گے وہ دودھ پر ٹوٹ پڑیں گے اور آپس میں لڑیں گے۔ سانپ دودھ کا عاشق ہوتا ہے۔ اتنی دیر میں آپ خزانہ نکال لیں... میں نہیں بتا سکتا کہ اس غار کے اندر کیا چیز ہو گی جو اس خزانے کی حفاظت کے لئے بیٹھی ہو گی۔ میں یہ بتا سکتا ہوں کہ آپ کے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعلیں ہونی چاہئیں۔ وہ چیز آگ سے ڈر کر بھاگ جائے گی۔ اگر وہاں بچھو ہوئے تو انہیں جلتی ہوئی مشعلوں سے جلایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور ہوا تو وہ آپ اپنی عقل اور ہمت سے سنبھال سکتے ہیں"۔

"میں خدا کی مدد مانگوں گا" ـــــ صالح نمیری نے کہا ـــــ "میں صبح سے ہی جانے کی تیاری شروع کر دوں گا"۔

"ایک ضروری بات رہ گئی ہے" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "آپ کو اس جگہ سے آدھی رات کے وقت اس طرح روانہ ہونا چاہئے کہ کوئی آپ کو دیکھ نہ سکے"۔

"شہر کے چوکیدار تو دیکھ لیں گے" ـــــ صالح نمیری نے کہا ـــــ "انہیں کیا کہا جائے؟"

"اگر کوئی دیکھ لے تو اسے اصل بات نہ بتائیں" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "آپ امیرِ شہر ہیں۔ آپ سے کوئی نہیں پوچھے گا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ کوئی پوچھے تو خاموش رہیں"۔

○

صالح نمیری نے اُسی رات اُن آدمیوں کا انتخاب کر لیا جنہوں نے اُس کے ساتھ جانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے اس سامان کی فہرست تیار کر لی جو اُس کے لئے ضروری تھا جو اُس نے ساتھ لے جانا تھا۔

صبح فجر کی نماز کے فوراً بعد اُس نے ان تمام آدمیوں کو جن کی تعداد دس گیارہ تھی، اپنے ہاں بلایا اور انہیں صرف یہ بتایا کہ ایک سفر پر جانا ہے جو اگر بخیر و خوبی طے ہو گیا تو سب کو سونے اور جواہرات کی شکل میں انعام ملے گا۔ انہیں یہ بھی بتایا کہ کسی کے ساتھ یہ ذکر نہ ہو کہ وہ کہیں جا رہے ہیں۔ اگر کسی کی زبان سے ایسی بات نکل گئی تو اُسے قتل کر دیا جائے گا۔

اُس نے ان آدمیوں کو بہت سی ہدایات دیں اور کہا کہ وہ آدھی رات کے وقت کوچ کریں گے۔ صالح نمیری کا حکم چلتا تھا۔ اُس کے حکم سے تمام ضروری سامان، اونٹ اور دودھ والی ایک اونٹنی شام سے پہلے پہلے تیار ہو گئے۔ صالح نمیری نے اس تمام سامان کا معائنہ کیا اور مطمئن ہو گیا۔

رات جب لوگ سو گئے تو فرح چوری چھپے اُس کے کمرے میں آئی۔ اُس نے تو آنا

ہی تھا کیوں کہ وہ حسن بن صباح کی اس سازش میں شامل تھی کہ صالح نمیری قلعے کی تحریر لکھ دے اور یہاں سے چلا جائے۔ انہیں یقین تھا کہ صالح نمیری اس خوفناک سفر سے زندہ واپس نہیں آسکے گا۔ انہوں نے صالح نمیری سے شہر، احمد بن عطاش کے نام لکھوا لیا تھا۔

فرح نے حسبِ معمول صالح کے ساتھ پیار و محبت کی باتیں اور حرکتیں شروع کر دیں۔ اُس نے رونے کی بھی اداکاری کی اور اس قسم کے الفاظ کہے کہ وہ اس کی جدائی کو برداشت نہیں کر سکے گی۔ صالح نمیری کی فرح کی محبت میں جذباتی کیفیت ایسی ہو چکی تھی جو اُس کی برداشت سے باہر تھی۔ اُس نے فرح سے کہا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ چلے۔

"میں چلی تو چلوں لیکن ایسا نہ ہو کہ ساتھ جانے سے آپ کی مہم کو کوئی نقصان پہنچے"۔

"کوئی نقصان نہیں پہنچے گا" — صالح نمیری نے کہا — "تم ساتھ ہو گی تو میری ہمت قائم رہے گی"۔

"پھر آپ مجھے اجازت لے دیں" — فرح نے کہا — "لیکن میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ مجھے اجازت نہیں ملے گی"۔

صالح نمیری اجازت لینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ حسن بن صباح سحر اور علم نجوم کا عامل ہے اور اس سے بڑھ کر اُس کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ حسن بن صباح کے اس علم اور عمل کا قائل ہو گیا تھا۔ اُس نے سچ مان لیا تھا کہ خزانہ موجود ہے اور اس کا وہی راستہ ہے جو حسن بن صباح نے اسے بتایا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس قسم کے جادوگر اپنے ساتھ ایک دو خوبصورت لڑکیاں رکھتے ہیں۔ فرح کو بھی اُس نے ایسی ہی لڑکی سمجھا تھا اور اُس نے یہ بھی مان لیا تھا کہ فرح امیرِ شاہ در احمد بن عطاش کی بھانجی ہے اور اس نے یہ بھی تسلیم کر لیا تھا کہ فرح اُسی کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہے۔

یہ سب کچھ جانتے ہوئے اُس نے اپنے آپ کو یقین دلا لیا تھا کہ فرح کو ساتھ لے جانے سے اس کی مہم پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑے گا۔ فرح اُس کا جذباتی معاملہ بھی بن گئی تھی لیکن یہ لڑکی اُس کے ساتھ جانے کو تیار نہیں تھی۔

صالح نمیری آخر اتنے بڑے شہر کا حکمران تھا۔ وہ برداشت نہ کر سکا کہ ایک لڑکی اُس کی بات نہیں مان رہی۔ اُس نے اُسی وقت دو آدمیوں کو بلایا اور انہیں حکم دیا کہ اس لڑکی کے منہ پر کپڑا باندھ کر اسے لکڑی کے تابوت جیسے بکس میں ڈال دیا جائے اور اس بکس میں ہر طرف سے سوراخ کر دیئے جائیں تاکہ ہوا کا گزر ہوتا رہے۔

صبح طلوع ہوئی۔ حسن بن صباح جاگا تو وہ اچھل کر بستر سے نکلا۔ اُس نے اپنے دو آدمیوں کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ صالح نمیری کا قافلہ چلا گیا ہے یا نہیں۔

"آپ کا تیر کبھی خطا نہیں گیا" — ایک آدمی نے ہنستے ہوئے کہا — "ہم اُس کی روانگی کو دیکھنے کے لئے جاگتے رہے ہیں"۔

"تم دونوں شاہ در چلے جاؤ" — حسن بن صباح نے کہا — "احمد بن عطاش سے کہو کہ میں نے خلجان لے لیا ہے۔ تم یہاں آجاؤ۔ اُسے ساری بات بتا دینا کہ صالح نمیری کو ہم نے کس طرح غائب کیا ہے۔ اُسے یہ بھی بتانا کہ اس میں فرح کا بھی کمال شامل ہے..... تم ابھی روانہ ہو جاؤ۔ فرح ابھی سوئی ہوئی ہو گی۔ اُسے سویا رہنے دو"۔

حسن بن صباح نے بہت دیر فرح کا انتظار کیا۔ اُسے ہر طرف تلاش کیا۔ وہ کہیں بھی نہ ملی۔

اُس وقت فرح سوراخوں والے تابوت میں بند نہ جانے کتنے میل خلجان سے دُور پہنچ چکی تھی۔ صالح نمیری کا قافلہ اُس جنگل میں داخل ہو چکا تھا جس میں حسن بن صباح کے کہنے کے مطابق بڑی خطرناک دلدل تھی۔

کیا حسن بن صباح پریشان ہو گیا تھا کہ فرح لاپتہ ہو گئی ہے؟

کیا اُس نے اپنے بالکوں کو حکم دیا تھا کہ صالح نمیری کے پیچھے جاؤ' فرح اُس کے ساتھ چلی گئی ہو گی!

کیا وہ فرح کے فراق میں دیوانہ ہُوا جا رہا تھا؟

نہیں..... اُس نے فرح کے تعاقب میں اپنے آدمی بھیجنے کی بجائے انہیں شاہ در احمد بن عطاش کے نام یہ پیغام دے کر بھیج دیا کہ میں نے خلجان کا شہر لے لیا ہے' "فوراً" یہاں آجائیں۔ اُس کی نگاہ میں ایک لڑکی کوئی ایسی اہمیت نہیں رکھتی تھی کہ اُس کے جذبات میں ہلچل بپا ہو جاتی۔ وہ ایک حسین لڑکی کو دوسروں کے جذبات میں ہلچل بپا کرنے اور دوسروں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا ذریعہ سمجھتا تھا۔

اس کی دنیا کی سرحد صرف ایک فرح کی محبت پر ختم نہیں ہو جاتی تھی۔ وہ ستاروں پر کمندیں ڈالنے والا انسان تھا۔

حسن بن صباح تھا تو انسان ہی لیکن اُس کی تاریخ کے واقعات گواہی دیتے ہیں کہ وہ انسانیت کی سرحدوں سے نکل کر ابلیسیّت کی سرحدوں میں داخل ہو گیا تھا۔

اُس کی نگاہیں اُفق کے اُس لامحدود گول دائرے تک دیکھ رہی تھیں جہاں آسمان جُھک کر زمین کو چومتا ہے۔ ایک فرح اُس کی نگاہوں کے آگے رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔

حسن بن صباح ایک آتش فشاں پہاڑ تھا اور وہ اپنے ابلیسی وجود میں ایسا لاوا پکا رہا تھا جس نے بڑی ہی اہم تاریخی شخصیات کو صفحۂ ہستی سے غائب کر دینا تھا اور بستیاں اجاڑ دینی تھیں۔

حسن بن صباح نے وہ مقام حاصل کیا کہ اُس نے کسی بادشاہ کے قتل کا حکم دیا تو اُس کے فدائین نے اُسے قتل کر دیا۔ اس نے جو فدائین تیار کئے تھے وہ پاگل پن کی حد تک جنونی تھے۔ داستان گو آگے چل کر سنائے گا کہ حسن بن صباح نے ان پر یہ جنون کس طرح طاری کیا تھا کہ ان میں سے بعض خود بھی قتل ہو جاتے تھے لیکن اپنے شکار کو قتل کر کے قتل ہوتے تھے۔

داستان گو کو حسن بن صباح کے حکم سے قتل ہونے والی جن اہم شخصیتوں اور حکمرانوں کے نام فوری طور پر یاد آئے ہیں' وہ یہ ہیں:

1092ء میں حسن بن صباح نے جو سب سے پہلی نہایت اہم شخصیت قتل کروائی' وہ سلجوقی سلطان ملک شاہ کا وزیر خواجہ حسن طوسی تھا جسے غیر معمولی قابلیت اور حسنِ کارکردگی کی بدولت نظام الملک کا خطاب دیا تھا۔ نظام الملک حسن بن صباح کا محسن تھا۔

1092ء میں ہی حسن بن صباح نے نظام الملک کے دو بیٹوں کو قتل کروایا تھا۔

1102ء میں حمس کے ایک شہزادے کو اُس وقت قتل کروایا جب وہ جامع مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا۔

1113ء میں مُوصل کے شہزادہ مودُود کو جامع مسجد میں نماز پڑھتے قتل کروایا۔

1114ء میں سلجوقی سلطان سنجر شاہ کے وزیر عبدالمظفر علی اور اس کے داوا چکر بیگ کو قتل کروایا۔

1121ء میں فارس کے ایک سلطان کی موجودگی میں مرغ کے ایک شہزادے کا کام بغداد میں تمام کروایا۔

1121ء میں ہی قاہرہ میں ایک مصری وزیر کو حسن بن صباح کے فدائیں نے قتل کیا۔

1126ء میں حلب اور مُوصل کے ایک شہزادے کو مسجد میں قتل کیا گیا۔

1127ء میں سنجر شاہ کے وزیر معین الدین کو فدائین نے قتل کیا۔

1129ء میں مصر کا خلیفہ حسن بن صباح کے فدائین کا شکار ہُوا۔

1134ء میں دمشق کا ایک شہزادہ فدائین کے ہاتھوں مارا گیا۔

1135ء سے 1138ء کے عرصے میں خلیفہ موسترشید' خلیفہ رشید اور آذربائی جان کا سلجوقی شہزادہ داؤد قتل ہوئے۔

1149ء میں طرابلس کا حکمران ریمانڈ فدائین کے ہاتھوں قتل ہُوا۔

1174ء سے 1176ء کے عرصے میں حسن بن صباح کے فدائین نے سلطان صلاح الدین ایوبی پر چار قاتلانہ حملے کئے اور سلطان ایوبی ہر بار بچ نکلا۔[1]

یہ تمام قتل حسن بن صباح کی زندگی میں نہیں ہوئے تھے۔ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے فدائین نے جو حشیشین کے نام سے مشہور ہوئے' اہم شخصیتوں کے قتل کا

ء ! ان قاتلانہ حملوں کی سنسنی خیز تفصیلات مکتبہ داستان کی شہرۂ آفاق کتاب "داستان ایمان فروشوں کی" (پانچ جلدوں) میں پڑھیں۔

سلسلہ جاری رکھا تھا' پھر آہستہ آہستہ یہ لوگ کرائے کے قاتل بن گئے تھے۔ انہیں عیسائی بادشاہوں اور جرنیلوں نے بھی ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لئے استعمال کیا تھا۔

○

یہ بہت بعد کی باتیں ہیں..... بہت بعد کے واقعات ہیں جب حسن بن صباح بے تاج بادشاہ اور ایک ہیبت کی علامت بن گیا تھا۔ قتل کے یہ تمام واقعات اپنے اپنے مناسب اور موزوں موقع پر سنائے جائیں گے۔ داستان گو ابھی داستان کے اس ابتدائی مرحلے میں ہے جہاں حسن بن صباح اپنے ابلیسی عزائم کی تکمیل کے لئے زمین ہموار کر رہا تھا۔ اُس نے اس خطے کا ایک اور قلعہ بند شہر خلجان لے لیا تھا۔

اُس کی نظر اب قلعہ المُوت پر تھی جسے اُس نے اپنا مرکز اور مستقر بنانا تھا۔ اتنے بڑے عزائم اور اتنے بڑے منصوبے میں فرح کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

”یا مرشد!“ — حسن بن صباح کے ایک خاص آدمی نے اُسے کہا — ”یہ تو معلوم کر لینا چاہئے وہ گئی کہاں؟ اگر وہ صالح نمیری کے ساتھ چلی گئی ہے تو خطرہ ہے کہ اُسے بخیر و عافیت واپس لے آئے گی“۔

”وہ اُسی کے ساتھ گئی ہے“ — حسن بن صباح نے کہا — ”اور اُسی کے ساتھ مرے گی۔ صالح نمیری کے دماغ پر جس طرح خزانہ سوار ہُوا ہے وہ واپس نہیں آئے گا“۔

اُس وقت صالح نمیری اُس جنگل میں داخل ہو چکا تھا جس کے اندر کہیں کہیں کچھ حصہ دلدلی تھا۔

فرح تابوت میں بند تھی۔ تابوت میں ہوا کے لئے سوراخ رکھے گئے تھے۔ تابوت ایک اونٹ پر لدا ہُوا تھا۔ فرح کے منہ پر کپڑا بندھا ہُوا تھا۔ صالح نمیری نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ ہم بہت دور آ گئے ہیں۔ اگر اس لڑکی کو واپس لے جانے کے لئے ہمارے پیچھے کوئی آتا تو وہ اب تک یہاں پہنچ چکا ہوتا۔ اب اس لڑکی کو تابوت سے نکال لیا جائے تو کوئی خطرہ نہیں۔

”ہاں امیر خلجان!“ — اُس کے ایک آدمی نے کہا — ”خطرہ کیسا؟ یہ بھاگ کر جائے گی کہاں؟“

تابوت کھول کر فرح کو نکال لیا گیا۔ ایک تو وہ تابوت میں گذشتہ رات سے بند تھی' اس کے ساتھ اونٹ کے ہچکولے' اُس کی ہڈیاں بھی دُکھ رہی تھیں۔ تابوت سے نکل کر کچھ دیر تو وہ بول ہی نہ سکی۔ صالح نمیری کے آدمی ان دونوں سے دور ایک اوٹ میں بیٹھ گئے تھے۔

”مجھے اپنے ساتھ کیوں لے آئے ہو؟“ — فرح نے ایسی آواز میں کہا جو رندھی ہوئی تھی اور غصیلی بھی تھی۔

”محبت کی خاطر!“ — صالح نمیری نے کہا۔

”اگر تمہیں میرے ساتھ اتنی ہی محبت ہے تو مجھے اتنی خطرناک مہم میں اپنے ساتھ نہ لے جاؤ“ — فرح نے کہا — ”کیا میں اتنی مشکلات اور اتنی زیادہ دشواریاں برداشت کر سکوں گی؟“

”محبت کی ابتدا تو تم نے کی تھی فرح!“ — صالح نمیری نے کہا — ”کیا تم میرے پاس محبت کا پیغام لے کر نہیں آئی تھیں؟ تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہو“۔

فرح کی محبت کی جو حقیقت تھی وہ فرح جانتی تھی۔ اُسے تو جال میں دانے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ وہ صالح نمیری کو جال میں لے آئی تھی۔ وہی جانتی تھی کہ اس خزانے کا وجود ہے ہی نہیں جس کی تلاش میں صالح نمیری جا رہا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ حسن بن صباح نے صالح نمیری کو موت کے منہ میں ڈال دیا ہے اور اس کا زندہ واپس آ جانا کسی صورت ممکن نہیں' لیکن اُس کے اپنے زندہ واپس آ جانے کے امکانات بھی ختم ہو چکے تھے۔

وہ تو اب یہ سوچ رہی تھی کہ حسن بن صباح سے وفا کرے یا اپنی زندگی سے۔ یہ عمر مرنے کی نہیں تھی جب اُس کا شباب عروج پر تھا۔ صالح نمیری کے ساتھ اُس نے بات کر کے دیکھ لی تھی۔ یہ شخص تو ایک چٹان تھا جسے اپنی جگہ سے سرکانا فرح کے بس کی بات نہیں تھی۔

اُس کے سامنے ایک راستہ یہ تھا کہ صالح نمیری کو بتا دے کہ وہ ایسے دھوکے کا شکار ہو رہا ہے جس کا انجام موت ہے اور وہ وہیں سے واپس چلا جائے' اور اگر وہ واپس نہ گیا تو وہ صرف مرے گا ہی نہیں بلکہ اس کا اتنا بڑا شہر خلجان اور قلعہ ہاتھ سے نکل جائے گا اور

اس کا خاندان بھکاری بن جائے گا۔

اُس نے اس پر غور کیا تو اُسے صاف نظر آنے لگا کہ اُسے حسن بن صباح غداری کے جرم میں قتل کرا دے گا۔ اُسے معلوم تھا کہ حسن بن صباح کا دل رحم اور بخشش کے جذبات سے خالی ہے۔ کسی کو قتل کرا دینے سے اُسے روحانی تسکین ملتی تھی۔

فرح کے لئے اِدھر بھی موت تھی اُدھر بھی موت۔ اسے یہ دیکھنا تھا کہ کون سی موت آسان ہے۔

اگر وہ حسن بن صباح سے وفا کرتی ہے تو وہ آگے آنے والے صحرا میں جھلس کر' پیاس سے تڑپ تڑپ کر بڑی ہی اذیّت ناک موت مرے گی۔ جل جل کر مرے گی.....

ایسی موت کے تصوّر سے ہی اُس نے اپنے وجود میں لرزہ محسوس کیا۔

پھر اسے دوسرا خیال آیا۔ وہ صالح نمیری کو واپس لے جاتی ہے اور حسن بن صباح کو اس کی غداری کا پتہ چل جاتا ہے تو وہ اپنے ہاتھوں یا اپنے کسی آدمی کے ہاتھوں اُس کا سر تن سے جدا کرا دے گا۔ یہ موت سہل ہو گی۔

وہ تو زندہ رہنا چاہتی تھی۔ حسن بن صباح نے اُسے آلۂ کار بنایا تھا اور اُسے شہزادی بنا کے رکھا ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ حسن بن صباح اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ حسن بادشاہوں کا بادشاہ بنتا جا رہا تھا' لیکن زندگی بڑی پیاری ہوتی ہے۔ وہ تو سوچ سوچ کر بے حال ہوئی جا رہی تھی۔

○

"کس گہری سوچ میں کھو گئی ہو فرح!" —— صالح نمیری نے کہا —— "واپس جانے کا خیال دل سے نکال دو۔ دل میں اس خزانے کو رکھو جو ہم لینے جا رہے ہیں۔ میں واپس آکر باقاعدہ فوج بناؤں گا اور اس علاقے کے تمام قلعے فتح کر لوں گا۔ میں بادشاہ ہوں گا' تم ملکہ ہو گی"۔

"اگر ہم زندہ واپس آئے تو!" —— فرح نے کہا۔

"ہم زندہ واپس آئیں گے" —— صالح نمیری نے کہا۔

"اگر میں کہوں کہ آپ جہاں جا رہے ہیں وہاں کوئی خزانہ نہیں تو کیا آپ مان لیں گے؟" —— فرح نے پوچھا۔

"بالکل نہیں!" —— صالح نمیری نے کہا۔

فرح نے دیکھا کہ صالح نمیری کے دماغ پر خزانہ ایسا سوار ہُوا ہے کہ اُس کا دماغی توازن صحیح نہیں رہا۔ اُس نے ایک اور دلیل سوچ لی۔

"آپ تو بڑے پکے مسلمان ہُوا کرتے تھے" —— فرح نے کہا —— "پتہ چلا تھا کہ آپ زاہد اور پارسا ہیں' اہلِ سُنّت ہیں لیکن اس خزانے نے تو آپ کے دل سے خدا کو نکال دیا ہے۔ میں آپ کی کچھ نہیں لگتی لیکن آپ مجھے اپنے ساتھ لے آئے ہیں' صرف اس لئے کہ میں خوبصورت اور جوان لڑکی ہوں"۔

"میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتی ہو" —— صالح نمیری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا —— "مجھے آگے جانے سے روکنے کے لئے تم یہ کہو گی کہ مسلمان اپنے دلوں میں خزانے کا لالچ نہیں رکھا کرتے۔ تم مجھے خلفائے راشدین کی سادگی کی باتیں سناؤ گی..... میری بات غور سے سن لو فرح! وہ وقت اور تھا' وہ مسلمان اور تھے۔ آج کے وقت کا تقاضا کچھ اور ہے۔ آج طاقت اُس کے پاس ہے جس کے پاس خزانہ ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ آج خدا بھی اُسی کا ہے جس کے پاس خزانہ ہے۔ میں نے خدا کے آگے رکوع و سجود کرتے ایک عمر گذار دی ہے لیکن خدا نے مجھے اس خزانے کا اشارہ نہیں دیا" —— اچانک اُس کی آواز اونچی اور تحکمانہ ہو گئی۔ اُس نے کہا —— "تم میری ملکیت ہو۔ تم اس سفر کی صعوبتوں اور خطروں کے اور موت کے خوف سے مجھے آگے بڑھنے سے روک رہی ہو۔ میں قلعہ خلجان کا والی اور امیرِ شہر ہوں۔ میرا حکم چلتا ہے۔ یہ گیارہ آدمی جو میرے ساتھ جا رہے ہیں' یہ میرے حکم کے غلام ہیں۔ تم بھی میرے حکم کی پابند ہو"۔

خزانے کے تو اپنے اثرات تھے لیکن صالح نمیری کو فرح نے ایک پھول دیا تھا جس کی خوشبو کی اُس نے بہت تعریف کی تھی۔ پھر فرح نے اُسے رُوئی پر اسی خوشبو کا عطر لگا کر دیا جو اُس نے اپنی مونچھوں پر مل لیا تھا۔ وہ نہ جان سکا کہ یہ خوشبو حسن بن صباح کی ایجاد ہے اور یہ خوشبو انسان کے خیالات کو بدل دیتی ہے۔ تصوّر کو انسان حقیقت اور حقیقت کو تصوّر سمجھنے لگتا ہے۔

فرح خاموش ہو گئی۔

دن ابھی آدھا گذرا تھا۔ صالح نمیری نے اپنے قافلے کو کوچ کا حکم دیا اور یہ حکم بھی کہ تابوت کو توڑ دیا جائے۔ انہوں نے چار گھوڑے فالتو ساتھ لے لئے تھے۔ سفر ایسا تھا

کہ گھوڑے مر سکتے تھے۔ یہ چار گھوڑے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ساتھ لے جائے جا رہے تھے۔ ایک گھوڑے پر فرح کو سوار کر دیا گیا۔

○

جنگل زیادہ گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں اونچی نیچی ٹیکریاں اور سلوں والی چٹانیں بھی تھیں۔ جگہ جگہ پانی جمع تھا۔ چلنے کا راستہ مشکل سے ہی ملتا تھا۔ ہر آٹھ دس قدموں کے بعد دائیں یا بائیں مڑنا پڑتا تھا۔ اس طرح فاصلہ زیادہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

سورج افق کے پیچھے چلا گیا۔ جنگل اتنا گھنا تھا کہ شام بہت جلد تاریک ہو گئی۔ صالح نمیری وہیں رک گیا اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ رات گذارنے کے لئے جگہ دیکھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک جگہ دیکھ لی گئی جو قدرے وسیع اور ہموار تھی۔ اس کے اردگرد ہری سرسبز ٹیکریاں تھیں۔ گھنے درختوں نے شامیانے تان رکھے تھے۔

دو مشعلیں جلا کر زمین میں گاڑ دی گئیں۔ صالح نمیری کا خیمہ نصب ہونے لگا تو فرح بگڑ گئی۔

”میں الگ خیمے میں سوؤں گی“ —— اُس نے کہا —— ”اپنے ساتھ چھوٹے خیمے بھی ہیں“۔

”آخر تم نے میری بیوی بننا ہے“ —— صالح نمیری نے کہا —— ”یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے۔ اگر تم میرے خیمے میں سوؤ گی تو یہ معیوب فعل نہیں ہو گا“۔

”بیوی بن جانے تک آپ میرے لئے غیر مرد ہیں“ —— فرح نے کہا —— ”میں مسلمان کی بیٹی ہوں۔ میں اسلام کی پوری پابندی کروں گی“۔

”ایک چھوٹا خیمہ اور لگا دو“ —— صالح نمیری نے حکم کے لہجے میں کہا۔

خیمہ گاہ میں دو چھوٹے اور دو بڑے خیمے کھڑے ہو گئے۔ بڑے خیمے گیارہ آدمیوں کے لئے تھے جو چھوٹے خیموں سے دور نصب کئے گئے تھے۔ دونوں چھوٹے خیموں کے درمیان فرح نے خاصا فاصلہ رکھوایا تھا۔ اُس نے صالح نمری کے ساتھ ایسی باتیں کی تھیں کہ یہ شخص اس سے متاثر ہو گیا اور وہ فرح کو شرم و حجاب والی با اخلاق لڑکی سمجھ بیٹھا۔ اُسے بتانے والا کوئی نہ تھا کہ یہ لڑکی حسن بن صباح کی شاگرد ہے اور زبان کا جادو چلانے میں مہارت رکھتی ہے۔ فرح نے اُسے اپنی محبت کا بھی یقین دلا دیا تھا۔

کھانا کھا کر سب سو گئے۔ دن بھر کی گھوڑ سواری نے ان کی ہڈیاں توڑ دی تھیں۔

انہیں بیہوشی جیسی نیند نے خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیا۔ صرف فرح تھی جو جاگ رہی تھی اور نیند پر غلبہ پانے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ وہ دوسروں کے سو جانے اور بہت سا وقت گذر جانے کی منتظر تھی۔ اُس نے کچھ سوچ کر صالح نمیری کے ساتھ وہ باتیں کی تھیں جن سے وہ متاثر بلکہ مسحور ہو گیا تھا۔

چاند اوپر آ گیا تھا۔ مشعلیں سونے سے پہلے بجھا دی گئی تھیں۔ جنگل اور صحرا کی چاندنی بڑی ہی شفاف ہوا کرتی ہے۔ چاندنی کی کرنیں درختوں سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ رات دبے پاؤں گذرتی جا رہی تھی۔

فرح اُس دَور کی لڑکی تھی جب عورتیں بھی اپنے مردوں کے دوش بدوش لڑنے کے لئے میدانِ جنگ میں پہنچ جایا کرتی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مرد انہیں پیچھے رکھتے لڑاتے نہیں تھے۔ اُس وقت عورتیں بھی گھوڑ سواری، تیغ زنی وغیرہ میں مہارت رکھتی تھیں۔ فرح تو خاص طور پر پھرتیلی اور چست و چالاک لڑکی تھی۔

نصف شب سے کچھ دیر پہلے فرح خیمے سے نکلی اور قریب کے ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئی۔ خیموں کو باری باری دیکھا۔ ہر خیمے کے پردے گرے ہوئے تھے۔ وہ پیچھے ایک اور درخت کی اوٹ میں چلی گئی۔ وہاں اونچی گھاس تھی۔ وہ اس گھاس کے پیچھے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چل پڑی۔

گھوڑے اور اونٹ خیموں سے کچھ دور ایک ٹیکری کے پیچھے باندھے گئے تھے۔ فرح خیموں سے دور چلی گئی تھی۔ گھاس، جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ میں وہ چکر کاٹ کر گھوڑوں تک پہنچی۔ زینیں وغیرہ گھوڑوں کے قریب پڑی تھیں۔ فرح نے ایک زین بغیر آواز پیدا کئے اٹھائی اور ایک گھوڑے کی پیٹھ پر رکھ کر کس دی پھر گھوڑے کے منہ پر لگام بھی چڑھا دیا۔ رکاب میں پاؤں رکھا اور گھوڑے پر سوار ہو گئی۔

اُس نے گھوڑے کو فوراً ”ایڑ نہ لگائی تاکہ قدموں کی آہٹ نہ ہو لیکن وہ زمین پتھریلی تھی، آواز پیدا ہو ہی گئی۔ رات کے سناٹے میں ہلکی سی یہ آواز اتنی اونچی سنائی دی کہ ایک آدمی کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے گھوڑے کے ٹاپ سنائی دینے لگے جو دور ہٹتے جا رہے تھے۔

وہ اپنے کسی ساتھی کو جگائے بغیر خیمے سے نکلا اور اپنے گھوڑوں کی طرف گیا۔ ایک گھوڑا کم تھا۔ زینیں دیکھیں۔ ایک زین کم تھی۔

"ایک گھوڑا کوئی لے گیا ہے اوئے!" ـــ اُس نے بلند آواز سے کہا۔

اُس کے ساتھی ہڑبڑا کر اُٹھے اور باہر کو دوڑے۔ اُدھر کچھ دور گھوڑے کے سرپٹ دوڑتے ٹاپ سنائی دیئے۔ فرح نے اس خیال سے گھوڑے کو ایڑ لگادی تھی کہ وہ خاصی دُور نکل آئی ہے۔ اسے واپسی کے راستے کا اندازہ تھا۔

ان سب کی آوازوں پر صالح نمیری بھی جاگ اُٹھا۔ خیمے سے نکل کر اس نے وہیں سے پوچھا یہ کیا شور ہے۔

"ایک گھوڑا چوری ہو گیا ہے" ـــ ایک آدمی نے کہا۔

صالح نمیری یہ سنتے ہی فرح کے خیمے کی طرف دوڑا۔ خیمے میں دیکھا۔ فرح وہاں نہیں تھی۔

"بدبختو!" ـــ صالح نمیری نے کہا ـــ "وہ بھاگ گئی ہے۔ دو آدمی فوراً اس کے پیچھے جاؤ۔ وہ موت کے ڈر سے میرا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ اُسے پکڑ کر لے آؤ۔ میں اُسے یہیں درخت کے ساتھ الٹا لٹکا کر آگے چلا جاؤں گا۔"

دو آدمیوں نے بہت تیزی سے گھوڑوں پر زینیں کسیں اور سوار ہو کر ایڑ لگادی۔

○

فرح دُور نکل گئی تھی اور وہ صحیح راستے پر جا رہی تھی۔ گھوڑا اس کا خوب ساتھ دے رہا تھا۔ شفاف چاندنی اُسے راستہ دکھا رہی تھی۔ وہ تین میل سے زیادہ فاصلہ طے کر گئی۔ ایک جگہ درخت کم ہو گئے تھے اور ایک دوسرے سے دور دور تھے۔

اُس نے بڑی زور سے باگ کھینچی۔ طاقتور گھوڑا فوراً رک گیا۔ فرح کو بیس پچیس گھوڑ سوار دکھائی دیئے جو دائیں سے بائیں طرف جا رہے تھے یعنی فرح کا راستہ کاٹ رہے تھے۔ فاصلہ ایک سو گز سے کچھ کم ہی ہو گا۔ فرح ان کے گزر جانے کا انتظار کرنے لگی۔ اُس کا راستہ یہی تھا۔ فرح اگر مرد ہوتی تو اسے رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ رات کو مسافر چلتے ہی رہتے ہیں لیکن فرح جوان اور بڑی ہی خوبصورت لڑکی تھی اور اس جنگل میں تنہا تھی۔ اُسے کسی آدمی نے بخشنا نہیں تھا۔

ان سواروں میں سے کسی نے فرح کو دیکھ لیا اور ایک آدمی کو بتایا جو اس قافلے کے آگے آگے جا رہا تھا۔ اُس نے حکم دیا کہ جاؤ دیکھو کون ہے، مجھے تو عورت لگتی ہے۔

ایک سوار نے فرح کی طرف گھوڑا دوڑایا۔ فرح نے اپنا گھوڑا ایک اور طرف دوڑا

دیا۔ حکم دینے والے آدمی نے کہا کہ دو تین اور آدمی جاؤ..... تین اور سواروں نے گھوڑے دوڑا دیئے۔ فرح نے ان سے بچنے کی بہت کوشش کی۔ گھوڑے کو بہت موڑا اور گھمایا لیکن وہ چار سواروں کے گھیرے میں آگئی اور پکڑی گئی۔

اُدھر سے صالح نمیری کے دو سوار آگئے۔ انہوں نے فرح کو دیکھا تو رک گئے۔

"یہ ہمارے امیر کی لڑکی ہے" ـــ ایک سوار نے کہا ـــ "اُس سے بھاگ آئی ہے۔ اسے ہمارے حوالے کر دو۔"

"نہیں!" ـــ فرح نے کہا ـــ "یہ جھوٹ کہتے ہیں۔ ان کے امیر کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مجھے اغوا کر کے لے جا رہے تھے اور میں بھاگ آئی۔ مجھے خلجان پہنچا دو۔"

"تم بھائیو جاؤ" ـــ صالح نمیری کے ایک سوار نے کہا ـــ "یہ جس کی لڑکی ہے وہ خلجان کا امیر اور والیٔ قلعہ ہے۔ ہم اسے اُس کے حوالے کریں گے۔"

فرح نے ان کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔ چار سواروں نے صالح نمیری کے سواروں سے کہا کہ وہ واپس چلے جائیں اور اس لڑکی کو بھول جائیں۔ دونوں سواروں نے ان چار سواروں کو عام مسافر سمجھ کر تلواریں نکال لیں۔ ان چاروں نے بھی تلواریں نکال لیں، پھر تلواروں سے تلواریں ٹکرانے لگیں۔ تب ان دو سواروں کو پتہ چلا کہ یہ تو بڑے ماہر تیغ زن ہیں۔ انہوں نے مقابلہ تو کیا لیکن وہ چار تھے۔ ان کی تلواروں نے ان دونوں کو بُری طرح کاٹ پھینکا۔

ان سواروں نے صالح نمیری کے سواروں کی تلواریں اٹھائیں، نیامیں اتار کر تلواریں ان میں ڈالیں، ان کے گھوڑے پکڑے اور فرح کو ساتھ لے کر چل پڑے۔

"تم کون لوگ ہو؟" ـــ فرح نے ان سے پوچھا ـــ "کہاں جا رہے ہو؟"

"غلط فہمی میں نہ رہنا لڑکی!" ـــ ایک نے کہا ـــ "ہم کسی کو دھوکے میں نہیں رکھا کرتے۔ ہم صحرائی قزاق ہیں۔ اپنے سردار کے پاس جا رہے ہیں۔"

"کیا تم لوگ مجھے خلجان پہنچا دو گے؟" ـــ فرح نے کہا ـــ "مجھے خلجان کے راستے پر ڈال دینا، میں اکیلی چلی جاؤں گی۔"

"تمہارے اس سوال کا جواب ہمارا سردار ہی دے سکتا ہے" ـــ ایک سوار نے کہا۔

"جواب مجھ سے سن لو" — ایک اور سوار بولا — "تم بہت حسین لڑکی ہو۔ ہیروں کی قدر صرف ہمارا سردار ہی کر سکتا ہے۔ وہ تمہیں نہیں جانے دے گا"۔

فرح کے لئے یہ خبر بہت ہی بُری تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی سوائے اس کے کہ ان کے ساتھ چلی جاتی۔ اُس نے کیا بھی یہی۔ مزاحمت تو دُور کی بات ہے' اُس نے زبان بھی نہ ہلائی اور اس طرح ان کے ساتھ چل پڑی جیسے وہ اپنی خوشی اور مرضی سے جا رہی ہو لیکن اُس کا دماغ بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔

اُس کے دل و دماغ پر حسن بن صباح طاری رہتا تھا اس لئے اُس کے سوچنے کا انداز حسن بن صباح جیسا ہی تھا..... اور یہ انداز ابلیسی تھا..... ایسے اندازِ فکر میں یہ پابندی نہیں ہُوا کرتی کہ کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے اور اپنا مفاد حاصل کرتے کرتے کسی اور کی حق تلفی نہ ہو جائے۔ اس لڑکی کے سوچنے کا انداز یہ تھا کہ باپ بیٹے کو ذبح کر دے' بہن بھائی کا گلا کاٹ دے' بیٹا ماں کا پیٹ چاک کر دے' میرا بھلا ہو جائے۔

قزاقوں کے سردار تک پہنچتے فرح کے دماغ نے اُسے راہِ نجات دکھا دی۔

○

"اوہ!" — سردار نے چاندنی میں فرح کا چہرہ دیکھ کر حیرت زدگی کے عالم میں کہا — "کیسے مان لوں کہ تُو نسلِ انسانی سے ہے اور تُو جہانِ دِگر کی پُراسرار مخلوق میں سے نہیں؟"

سردار لب و لہجے اور اندازِ تکلّم سے عربی لگتا تھا۔ عرب یوں بات کیا کرتے تھے جیسے آزاد نظم سنا رہے ہوں۔

"یہ کہتی ہے اسے امیرِ خلجان اغوا کر کے لے جا رہا تھا" — ایک سوار نے کہا۔

"دو سوار اس کے پیچھے آئے تھے" — ایک اور سوار بولا — "ہم نے دونوں کو مار ڈالا ہے"۔

"امیر خلجان؟" — سردار نے سوالیہ انداز سے پوچھا — "یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ یہ چاند نہیں سورج ہے۔ امیرِ خلجان کو کیا پڑی ہے کہ وہ ایک لڑکی کو اغوا کر کے لے جا رہا ہو؟..... کیا وہ تجھے کہیں سے زبردستی اُٹھوا کر خلجان لے جا رہا تھا؟..... گھوڑے سے اُترو' آؤ' ہمارے پاس بیٹھو اور گلاب کی ان پنکھڑیوں کو ذرا حرکت دو کہ ہم تیری اصلیت جان سکیں"۔

"پہلے ان پنکھڑیوں کی قدر و قیمت پہچانو" — فرح نے سردار کا اندازِ تکلّم بھانپ کر کہا — "تم پتھروں کے سوداگر ہو' ہیروں کی قدر کیا جانو!..... پہلے میں ایک امیرِ شہر کی داشتہ تھی' اب ایک قزاق کی لونڈی بن گئی ہوں۔ میری اصلیت کو قزاقوں کا سردار نہیں سمجھ سکتا"۔

"ہاہا' ہاہا!" — سردار نے فرمائشی قہقہہ لگا کر کہا — "میں چاندنی میں ہیروں کی طرح چمکتی ہوئی تیری آنکھوں کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ انسان کے نطفے سے پیدا ہونے والی کسی عورت کی آنکھیں اس قدر مخمور اور سحر انگیز ہو سکتی ہیں؟ لیکن تیری زبان کا حسن ان نشیلی آنکھوں کے سحر سے زیادہ اثر انگیز ہے"۔

"میرے حسن کو ہی نہ دیکھ اے سردار!" — فرح نے کہا — "میں تجھے ہفت اقلیم کا شہنشاہ بنا سکتی ہوں تیری ذرا سی ہمت کی ضرورت ہے۔ اب اپنی حالت دیکھ' اپنے آپ کو پہچان۔ کیا تُو شکار کی تلاش میں جنگل جنگل' صحرا صحرا مارا مارا نہیں پھر رہا؟ کسی بہت بڑے قافلے کو لُوٹ کر تُو بہت بڑا خزانہ حاصل کر لیتا ہے لیکن رہتا قزاق کا قزاق ہی ہے۔ میں تجھے ایک خزانے کا راستہ دکھاتی ہوں۔ وہ تیرے ہاتھ آ جائے تو تُو ایک فوج تیار کر کے سلطنتِ سلجوق پر قبضہ کر سکتا ہے' عرب اور مصر کو اپنی سلطنت میں شامل کر سکتا ہے"۔

"کیا تو اپنے ہوش و حواس میں ہے لڑکی؟" — سردار نے کہا — "اگر تو دہشت زدگی سے دماغی توازن کھو نہیں بیٹھی تو یوں بول کہ میں کچھ سمجھ سکوں"۔

فرح نے ایک پتھر سے دو پرندے مارنے کی جو ترکیب سوچی تھی وہ اُس نے قزاقوں کے سردار کو سنا دی۔

"امیرِ خلجان ایک بڑا خزانہ نکال لانے کے لئے جا رہا ہے" — فرح نے کہا۔

"کہاں سے؟"

"نقشہ اُس کے پاس ہے" — فرح نے کہا — "اس پر راستہ دکھایا گیا ہے۔ واضح نشانیاں بھی موجود ہیں اور جن خطروں کا امکان ہے وہ بھی نقشے میں دکھائے گئے ہیں اور اس جگہ کی نشانیاں صاف دکھائی ہوئی ہیں جہاں خزانہ ایک غار میں رکھا ہُوا ہے"۔

"خزانے کی نشاندہی کس نے کی ہے؟"

"ایک درویش نے!" — فرح نے جھوٹ بولا — "امیر خلجان صالح نمیری نے

اس کی بہت خدمت کی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ اس درویش کی کوئی خواہش تھی یا ضرورت تھی جو امیرِ غلجان نے بسرد چشم پوری کردی تھی"۔

"اور یہ بتا" ـــ سردار نے پوچھا ـــ "تُو مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہو گئی ہے کہ اتنا بڑا راز مجھے دے رہی ہے؟"

"اس کی وجہ بھی سن لے!" ـــ فرح نے کہا ـــ "میرے دل میں خزانے کی ذرا سی بھی محبت نہیں۔ اس دل میں ایک آدمی کی محبت ہے۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں امیرِ غلجان کی داشتہ تھی۔ کچھ وقت ملتا تو اُس آدمی سے مل لیتی تھی۔ امیرِ غلجان درویش کے بتائے ہوئے خزانے کی تلاش میں چلا تو میں بہت خوش ہوئی کہ یہ جا رہا ہے تو میں اپنے محبوب کے پاس چلی جاؤں گی اور ہماری شادی ہو جائے گی لیکن امیرِ غلجان مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے آیا۔ سفر میں آج ہماری پہلی رات ہے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور بھاگ نکلی۔ اگر تیرے آدمی مجھے پکڑ نہ لیتے تو میں کل اُس کے پاس ہوتی جو مجھے چاہتا ہے"۔

"کیا تُو یہ چاہتی ہے کہ میں تجھے چھوڑ دوں؟" ـــ سردار نے پوچھا۔

"ہاں!" ـــ فرح نے کہا ـــ "تُو خزانوں کا متلاشی ہے، میں محبت کی پیاسی ہوں"۔

"لیکن تجھے امیرِ غلجان تک چلنا پڑے گا" ـــ سردار نے کہا ـــ "تیری یہ بات دھوکہ بھی تو ہو سکتی ہے۔ مجھے نقشہ مل جائے گا تو تجھے آزاد کر دوں گا"۔

"تُو تو مجھے آزاد کر دے گا" ـــ فرح نے کہا ـــ "امیرِ غلجان کو تُو نے زندہ چھوڑ دیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا"۔

"وہ زندہ نہیں رہے گا" ـــ سردار نے کہا ـــ "اٹھو، اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ"۔

○

"وہ ابھی تک نہیں آئے" ـــ صالح نمیری کئی بار کہہ چکا تھا۔

"وہ اسے جانے نہیں دیں گے" ـــ ہر بار اُس کا کوئی نہ کوئی آدمی اُسے کہتا، یا یہ ـــ "جنگل میں بھٹک گئی ہوگی" ـــ یا یہ ـــ "جا نہیں سکتی۔ وہ اُسے لے کے ہی آئیں گے"۔

پھر انہیں گھوڑوں کے ٹاپ سنائی دینے لگے۔

"وہ آ رہے ہیں" ـــ دو تین آدمیوں نے کہا۔

"اب میں اُسے ہر رات باندھ کے رکھا کروں گا" ـــ صالح نمیری نے کہا۔

"نہیں امیرِ محترم!" ـــ ایک آدمی نے کہا ـــ "ہم اور آگے نکل جائیں گے تو یہ بھاگنے کی جرأت نہیں کرے گی۔ میں جانتا ہوں۔ کل کے سفر میں یہ جنگل ختم ہو جائے گا اور بے آب و گیاہ پہاڑی علاقہ شروع ہو جائے گا"۔

"ٹھہرو!" ـــ صالح نمیری نے کہا ـــ "سنو..... گھوڑے دو یا تین نہیں لگتے۔ کیا یہ بہت سے گھوڑے نہیں؟"

"ہاں امیرِ محترم!" ـــ ایک آدمی نے کہا۔

وہ ابھی سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ آنے والے گھوڑے دو ہیں، تین ہیں یا زیادہ ہیں کہ گھوڑوں کے ٹاپوں کا طوفان آ گیا اور اس کے ساتھ یہ للکار ـــ "جو جہاں ہے وہیں کھڑا رہے"۔

وہ تقریباً" پچیس قزاق تھے جنہوں نے صالح نمیری کی اس چھوٹی سی خیمہ گاہ کو گھیرے میں لے لیا۔

"امیرِ غلجان! نقشہ میرے حوالے کر دے" ـــ سردار نے کہا ـــ "وہ خزانہ ہمارا ہے"۔

صالح نمیری چپ چاپ اپنے خیمے میں چلا گیا۔ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔

"دیکھتے کیا ہو" ـــ اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا ـــ "ہتھیار اٹھاؤ۔ وہ خزانہ ہمارا ہے"۔

"ایک بار پھر سوچ لے صالح نمیری!" ـــ سردار نے کہا ـــ "ہم قزاق ہیں اور ہم زیادہ ہیں۔ نقشہ میرے حوالے کر دو اور زندہ واپس چلے جاؤ"۔

صالح نمیری کچھ جواب دیئے بغیر سردار کی طرف تیزی سے بڑھا۔ سردار کا گھوڑا اس کی طرف بڑھا۔ صالح نمیری تیزی سے بیٹھ گیا اور سردار کے گھوڑے کے پیٹ میں تلوار اتار دی۔ گھوڑا بڑی زور سے ہنہنایا اور اچھلنے کودنے لگا۔ سردار گھوڑے سے کود آیا۔

صالح نمیری کے ساتھ اب نو آدمی رہ گئے تھے۔ وہ جانباز قسم کے آدمی تھے۔ ان

میں سے بعض نے تلواریں اٹھائی تھیں اور بعض کے پاس برچھیاں تھیں۔ ان سب نے جانوں کی بازی لگا دی لیکن نو پیادے پچیس سواروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

معرکہ بڑا ہی خونریز تھا۔ فرح الگ کھڑی دیکھ رہی تھی اور اپنی چال کی کامیابی پر بہت ہی خوش تھی۔ وہ اب بھاگ نکلنے کا موقع دیکھ رہی تھی۔ اُس نے صرف یہ دیکھنا تھا کہ صالح نمیری مارا جاتا ہے یا نکل بھاگتا ہے۔ اُسے اتنے گھمسان کے معرکے اور اِدھر اُدھر بھاگتے دوڑتے، گھومتے مڑتے گھوڑوں میں صالح نمیری اور قزاقوں کا سردار نظر نہیں آ رہے تھے۔

"لڑکی اِدھر آ جا!" — فرح کو آواز سنائی دی — "اپنے امیر کے خیمے تک آ جا لڑکی!"

فرح گھوڑے سے اُتری اور صالح نمیری کے خیمے تک دوڑتی گئی۔ چاند سر پر آیا ہُوا تھا۔ چاندنی بہت ہی صاف ہو گئی تھی۔ اُس نے خیمے کے قریب صالح نمیری کی لاش پڑی دیکھی۔

"میرے ساتھ خیمے میں آ" — سردار نے فرح سے کہا — "اور بتا وہ نقشہ کہاں ہے"۔

سردار اور فرح اندر چلے گئے۔ فرح نے چمڑے کا ایک تھیلا اٹھا کر سردار کے حوالے کیا اور بتایا کہ نقشہ اس میں ہے۔ سردار تھیلا اٹھائے خیمے سے باہر آ گیا۔ تھیلے میں کچھ اور چیزیں پڑی تھیں جو سردار نے باہر پھینک دیں پھر اس میں سے نقشہ نکلا۔ فرح نے کہا یہی ہے اور وہ وہاں سے چل پڑی۔

"کہاں جا رہی ہے تُو؟" — سردار نے اس سے پوچھا۔

"تجھے خزانے کا نقشہ مل گیا ہے" — فرح نے چند قدم دُور رُک کر کہا — "سمجھ لے کہ تجھے خزانہ مل گیا ہے اور مجھے آزادی مل گئی ہے"۔

"ٹھہر جا!" — سردار نے کہا — "میں اتنی جلدی تجھے آزادی نہیں دوں گا۔ تو مرجھایا ہُوا پھول تو نہیں کہ بغیر سونگھے پھینک دوں"۔

وہ قزاقوں کا سردار تھا۔ کوئی شریف اور معزز آدمی نہیں تھا کہ اپنے وعدے کا پاس کرتا۔ اتنی خوبصورت لڑکی کو وہ کیونکر چھوڑ دیتا۔ فرح اپنے گھوڑے کی طرف دوڑی تو سردار اُس کے راستے میں آ گیا۔ فرح دوسری طرف دوڑ پڑی۔ لڑائی ابھی لڑی جا رہی

تھی۔ صالح نمیری کے آدمی مارے جا رہے تھے۔ انہوں نے مرنے سے پہلے کچھ قزاقوں کو بھی مار ڈالا تھا۔

فرح دوسری طرف دوڑی تو سردار اُس کے پیچھے گیا۔ فرح اس کوشش میں تھی کہ وہ مرے ہوئے کسی آدمی کے گھوڑے تک پہنچ جائے۔ سواروں کے بغیر گھوڑے اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے لیکن سردار فرح کو کسی گھوڑے کے قریب نہیں جانے دے رہا تھا۔ فرح پھرتیلی تھی۔ وہ تیز دوڑتی خیمہ گاہ سے کچھ دُور چلی گئی۔ سردار بھی تیز دوڑا۔

آگے اونچی اور گھنی جھاڑیاں تھیں جو باڑ کی طرح ایک دوسری سے ملی ہوئی تھیں۔ فرح ان میں سے گذر گئی لیکن آگے دلدل تھی۔ وہ راستہ بدلنے ہی لگی تھی کہ سردار پہنچ گیا۔ فرح دلدل میں چلتی آگے چلی۔ چند ہی قدم آگے گئی ہو گی کہ اُسے ایسے لگا جیسے اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ وہ نیچے جانے لگی۔

سردار چیتے کی طرح اُس پر جھپٹا اور وہ بھی نیچے ہی نیچے جانے لگا۔ یہ دلدل تھی جو ہر چیز کو اپنے اندر غائب کر دیا کرتی ہے۔ فرح اور سردار نے ایک دوسرے کو پکڑ لیا۔ فرح چیخ اور چلّا رہی تھی۔ سردار اپنے آدمیوں کو نام لے لے کر پکار رہا تھا اور وہ دونوں دلدل میں دھنستے چلے جا رہے تھے۔ سردار کے ہاتھ سے خزانے کا نقشہ چھوٹ گیا تھا۔ یہ نقشہ بے بنیاد تھا اور خزانہ ایک فریب اور ایک مفروضہ تھا۔

سردار کے تین چار آدمی پہنچ گئے۔ انہیں اپنے سردار اور فرح کے سر نظر آئے اور یہ بھی دلدل میں غائب ہو گئے۔

○

تیسرے یا چوتھے روز احمد بن غطاش شاہ در سے خلجان پہنچ گیا۔

"خلجان کا قلعہ مبارک ہو پیرو مُرشد!" — حسن بن صباح نے اُس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

"کیا صالح نمیری کی واپسی کا کوئی امکان نہیں؟" — احمد بن غطاش نے پوچھا۔

"نہیں!" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "خزانہ وہ اژدہا ہے جو آج تک نہ جانے کتنے انسانوں کو نگل چکا ہے۔ اس نے بڑے جابر بادشاہوں کو بھی نگلا ہے اور اس نے مومنین کو، زاہدوں اور پارساؤں کو بھی نگلا ہے۔ وہ صالح نمیری جو مجھ پر لعن طعن کرنے آیا تھا کہ تم خدا کے ایلچی کیسے بن گئے، اور وہ صالح نمیری جو دعویٰ کرتا تھا کہ اللہ

کے واحد عقیدے کے پیروکار صرف اہلِ سُنّت ہیں اور وہی اللہ کے قریب ہیں' وہ صلاح نمیری خدا اور اپنے عقیدے کو فراموش کر کے خزانے کی تلاش میں چلا گیا..... فرح بھی اُس کے ساتھ چلی گئی ہے"۔

"کیا تمہیں اس کا افسوس ہے؟" — احمد بن عطاش نے پوچھا۔

"نہیں مُرشد!" — حسن بن صباح نے کہا — "میں حیران ہوں کہ یہ جانتے ہوئے کہ ہم صلاح نمیری کو خزانے کا دھوکہ دے کر غائب کر رہے ہیں' وہ اُس کے ساتھ کیوں چلی گئی"۔

اتنے میں دربان نے اندر آکر بتایا کہ والیٔ خلجان صلاح نمیری کا ایک آدمی بہت بُری حالت میں آیا ہے۔ حسن بن صباح نے کہا کہ اُسے فوراً اندر لے آؤ۔

ایک آدمی دربان کے سہارے اندر آیا۔ اُس کے کپڑے خون سے لال تھے اور خون خشک ہو چکا تھا۔ اُس کے سر' بازوؤں پر اور ران پر کپڑے لپٹے ہوئے تھے۔ احمد بن عطاش کے کہنے پر اُسے پانی پلایا گیا۔ وہ تو جیسے آخری سانسیں لے رہا تھا۔

"کون ہو تم؟" — احمد بن عطاش نے پوچھا — "کہاں سے آئے ہو؟"

"ایک دن کی مسافت چار دنوں میں طے کی ہے" — اُس نے ہانپتی سانسوں کو سنبھال سنبھال کر بڑی ہی مشکل سے کہا۔

وہ ان گیارہ آدمیوں میں سے تھا جو صلاح نمیری کے ساتھ گئے تھے۔ یہ آدمی قزاقوں کے ساتھ لڑائی میں زخمی ہُوا اور اسے وہاں سے نکل آنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ صلاح نمیری کے نمک حلال اور وفادار ملازموں میں سے تھا۔ وہ صرف اطلاع دینے کے لئے خلجان آگیا تھا۔ راستے میں کئی بار بیہوش ہُوا۔ گھوڑے سے گرا' اٹھا اور چوتھے روز خلجان پہنچ گیا۔

اُس نے بتایا کہ صلاح نمیری مارا گیا ہے اور خزانے کا نقشہ قزاقوں کے سردار نے لے لیا ہو گا۔ فرح کے متعلق اُس نے بتایا کہ وہ قزاقوں کے قبضے میں تھی۔ اس نے فرح اور سردار کو دلدل میں ڈوبتے نہیں دیکھا تھا۔

یہ وفادار شخص باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گیا اور اُس کا سر ایک طرف لڑھک گیا۔ وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا تھا۔ حسن بن صباح نے کہا کہ اس کی لاش لے جاؤ اور دفن کر دو۔

"اب یہ قلعہ ہمارا ہو گیا ہے" — احمد بن عطاش نے کہا — "اب بتاؤ حسن! اس کامیابی سے تم نے کیا سبق حاصل کیا ہے؟"

"یہ کہ انسان نفسانی خواہشات کا غلام ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "کسی بھی انسان کی ان خواہشات کو ابھار دو اور اُسے یقین دلا دو کہ اُس کی یہ خواہشات پوری ہو جائیں گی تو اُسے جس راستے پر ڈال دو وہ اُسی راستے پر چل پڑے گا"۔

"میں تمہیں یہ سبق پہلے دے چکا ہوں" — احمد بن عطاش نے کہا — "ہر انسان کی ذات میں ابلیس موجود ہے اور ہر انسان کی ذات میں خدا بھی موجود ہے۔ یوں کہہ لو کہ انسان بیک وقت نیک بھی ہے بد بھی ہے۔ عبادت کیا ہے؟"

"بدی پر غلبہ پائے رکھنے کا ایک ذریعہ!" — حسن بن صباح نے کہا — "اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا ایک وسیلہ!"

"ہم نے ہر انسان میں ابلیس کو بیدار کرنا ہے" — احمد بن عطاش نے کہا — "صلاح نمیری پکا مومن تھا' زاہد اور پارسا تھا۔ تم نے اُسے ایسے خزانے کا راستہ دکھایا جس کا وجود ہی نہ تھا۔ اس دھوکے میں فرح جیسی حسین لڑکی شامل تھی۔ تم نے دیکھا کہ اس شخص کی پارسائی اس طرح اُڑ گئی جس طرح سورج کی تمازت سے شبنم اُڑ جاتی ہے"۔

○

"تلبیس ابلیس"، "آئمۂ تلبیس" اور "تاریخ ابنِ خلدون" میں تفصیل سے لکھا ہے کہ احمد بن عطاش اور حسن بن صباح نے راتوں کو آئینوں کی چمک دکھا کر جس طرح لوگوں کو دکھایا تھا کہ خدا کا ایلچی زمین پر اُترا ہے' اس کا اس وسیع و عریض علاقے کے لوگوں پر وہی اثر ہُوا تھا جو پیدا کرنا مقصود تھا۔

حسن بن صباح نے لوگوں کو اپنی زیارت بھی کرائی تھی اور ایک خاص جڑی بُوٹی کی دھونی اتنے بڑے مجمعے کو دے کر لوگوں کے ذہنوں پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ یہ تاریخ کی پہلی اجتماعی ہپناٹزم تھی۔

اگر یہ ڈھنگ اختیار نہ کیا جاتا تو بھی لوگ اُس کے قائل ہو جاتے کیونکہ لوگوں میں توہم پرستی اور افواہ پسندی جیسی کمزوریاں موجود تھیں۔ حسن بن صباح نے قبیلوں کے سرداروں کو خصوصی اہمیت دی تھی۔ حسن بن صباح کے مبلّغوں یعنی پروپیگنڈہ کرنے والوں کا بھی ایک گروہ پیدا ہو گیا۔ اس گروہ کے آدمی فقیروں اور درویشوں کے بھیس

میں بستی بستی پھرتے اور "خدا کے ایلچی" کے نزول اور اس کے برحق ہونے کا پروپیگنڈہ کرتے تھے۔

غلجان کا قلعہ بھی حسن بن صباح کے قبضے میں آگیا تو یہ مشہور کر دیا گیا کہ امیرِ حرم صالح نمیری خدا کے ایلچی سے اتنا متاثر ہوا ہے کہ اُس نے قلعہ خدا کے ایلچی کی نذر کر دیا ہے اور خود تارک الدنیا ہو کر کہیں چلا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ حسن بن صباح اور احمد بن غطاش نے باطنی نظریات اور عقیدے پھیلانے کے لئے زمین کا خاصا خطہ حاصل کر لیا اور فضا اور ماحول کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔

اب داستان گو اس داستان کو واپس اُس مقام پر لے جا رہا ہے جہاں حسن بن صباح خواجہ طوسی نظام الملک کے پاس اُسے ایک وعدہ یاد دلانے گیا تھا۔ اُس وقت نظام الملک نیشاپور میں سلطان ملک شاہ کا وزیراعظم مقرر کیا جا چکا تھا۔ داستان گو یاد دہانی کی خاطر ایک بار پھر مختصراً بتا رہا ہے کہ یہ وعدہ کیا تھا اور یہ کس طرح پورا ہوا۔

خواجہ حسن طوسی جو بعد میں نظام الملک کے نام سے مشہور ہوا، تاریخ کی ایک اور مشہور شخصیت عمر خیام اور حسن بن صباح ایک مشہور عالم امام موافق کے مدرسے میں پڑھتے تھے۔ مدرسے میں ایک روز حسن بن صباح نے اپنے ان دونوں ہم جماعتوں سے کہا کہ امام موافق کے شاگرد بڑے اونچے مقام پر پہنچا کرتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہم تینوں یہاں سے فارغ ہو کر اونچے مقام پر پہنچیں گے۔ آؤ وعدہ کریں کہ ہم میں جو کوئی کسی اونچے مقام پر پہنچ گیا وہ دوسرے دو دوستوں کی مدد کرے گا۔

تینوں دوستوں نے ہاتھ ملا کر یہ وعدہ کیا۔ نظام الملک اور عمر خیام کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ حسن بن صباح نے بڑے ہی مذموم مقاصد کی خاطر یہ وعدہ یا معاہدہ کیا ہے۔

پھر ایسے ہوا کہ تینوں تعلیم سے فارغ ہو کر اپنی اپنی راہ لگ گئے۔ کچھ عرصے بعد نظام الملک سلطان ملک شاہ کے ہاں گیا اور ملازمت مانگی۔ اُس کی قابلیت اور فہم و فراست کو دیکھتے ہوئے سلطان ملک شاہ نے اُسے اپنا وزیر بنا لیا اور کچھ ہی عرصے بعد اُسے وزیراعظم بنا دیا اور اس کے ساتھ ہی اُسے نظام الملک کا خطاب دے دیا۔

عمر خیام کو پتہ چلا کہ اُس کا ہم جماعت اور دوست وزیراعظم بن گیا تو وہ اُس سے جا ملا اور مدرسے کے زمانے کا وعدہ یاد دلایا۔ نظام الملک نے عمر خیام کو ملازمت دلانی چاہی

لیکن عمر خیام نے کہا کہ وہ تحقیق کے میدان میں جانا چاہتا ہے پھر وہ کتابیں لکھے گا۔ نظام الملک نے اُسے سلطان سے اچھی خاصی رقم دلوا دی۔ عمر خیام نے حکمت میں نام پیدا کیا اور ایسی کتابیں لکھیں جو آج تک سند کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔

اس کے بعد حسن بن صباح نظام الملک کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ وہ تلاشِ روزگار میں مارا مارا پھر رہا ہے اور ذلیل و خوار ہو رہا ہے۔ آخر مجبور ہو کر اُس کے پاس آیا ہے۔

"کیا تم اتنے لمبے لمبے سال بے روزگار پھرتے رہے ہو؟" —— نظام الملک نے پوچھا تھا۔

"اگر کہیں روزی کا ذریعہ ملا بھی تو کچھ دنوں بعد ختم ہو گیا" —— حسن بن صباح نے کہا تھا —— "مجھے تاجر بننے کا مشورہ دیا گیا لیکن تجارت کے لئے سرمایہ کہاں سے لاتا۔ دکان داری مجھ سے ہوتی نہیں۔ میں تو روزگار کی تلاش میں مصر تک چلا گیا تھا لیکن قسمت نے کہیں بھی ساتھ نہ دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم نے اتنا زیادہ علم حاصل کر لیا ہے کہ تم سرکاری عہدے پر ہی کام کر سکتے ہو"۔

نظام الملک شریف النفس اور مخلص انسان تھا۔ اُس نے اپنے دوست اور ہم جماعت کو اس افسردگی، مایوسی اور تنگ دستی کے عالم میں دیکھا تو اُس نے سلطان ملک شاہ کو بتایا کہ اُس کا ایک دوست آیا ہے جو غیر معمولی فہم و فراست کا مالک ہے اور اس کی تعلیمی سند یہ ہے کہ امام موافق کے مدرسے کا پڑھا ہوا ہے۔

"ہمارے لئے صرف آپ کی رائے سند ہے" —— سلطان نے کہا تھا —— "اسے آپ جس عہدے کے لئے مناسب سمجھتے ہیں، رکھ لیں"۔

نظام الملک کو صرف سلطان کی منظوری درکار تھی۔ وہ مل گئی تو نظام الملک نے اسے ایک اونچے عہدے پر فائز کر دیا۔ یہ شک تو اس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا کہ حسن بن صباح کچھ اور ہی مقاصد دل میں لے کر حکومت کی انتظامی مشینری میں شامل ہوا ہے۔

○

داستان گو نے ابتدا میں یہاں تک ہی سنایا تھا کہ حسن بن صباح سلجوقی سلطنت کی انتظامیہ میں کس طرح داخل ہوا تھا۔ وہ جو اُس نے نظام الملک کو درد بھری داستان سنائی تھی، وہ جھوٹ تھا۔ وہ مصر نہیں گیا تھا نہ اُس نے ذریعہ معاش کی تلاش کی تھی نہ وہ تنگ

دست رہا تھا۔ یہ سنایا جا چکا ہے کہ وہ اپنے استاد عبدالملک بن عطاش کے ہاں چلا گیا جس نے اُس کی تربیت شروع کر دی تھی پھر اُسے احمد بن عطاش کے پاس بھیج دیا گیا فرح اُس کے ساتھ گئی تھی۔

اُس نے خلجان کا شہر لے لیا تھا اور یہ کامیابی حاصل کی تھی کہ لوگوں نے اُسے خدا کا ایلچی یا خدا کی بھیجی ہوئی برگزیدہ شخصیت مان لیا تھا۔ اس کے بعد وہ نظام الملک کے پاس گیا اور اس کے آگے یہ رونا رویا تھا کہ وہ اتنا عرصہ بیروزگار اور تنگ دست رہا ہے۔

حسن بن صباح کو نظام الملک کس طرح یاد آیا تھا؟

ہر مستند تاریخ میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔ احمد بن عطاش نے شاہ در کا شہر اور قلعہ دھوکے میں لے لیا تھا، پھر حسن بن صباح نے فریب کاری سے خلجان کے امیر صالح نمیری سے تحریر لے کر اسے خزانے کا راستہ دکھا دیا اور وہ موت کے منہ میں چلا گیا۔ یہ شہر بھی ان باطنیوں کے قبضے میں آ گیا۔ اب یہ دونوں باطنی سوچنے لگے کہ اس سے آگے کیا کیا جائے۔

"تم نے دیکھ لیا ہے حسن!" — احمد بن عطاش نے کہا — "لوگوں کو اپنے جال میں لانا کوئی مشکل نہیں۔ لوگ افواہ، سنسنی اور پُراسراریت سے متاثر ہوتے ہیں"۔

"اور وہ زبان کے ہیر پھیر کا اثر قبول کرتے ہیں" — حسن بن صباح نے کہا۔

"اور ان لوگوں کے امراء اور سرداروں وغیرہ کا معاملہ ذرا الگ ہے" — احمد بن عطاش نے کہا — "انہیں یہ تاثر دے دو کہ تم لوگوں کے روزی رساں ہو، اور انہیں دولت اور عورت کی جھلک دکھا دو، پھر یہ تمہارے غلام ہو جائیں گے لیکن لوگوں کو ساتھ لے کر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہمیشہ ذہن میں رکھو کہ حکومت سلجوقیوں کی ہے اور سلجوقی اہلِ سُنت ہیں!!"

"ہم لوگوں کو اپنے اثر میں لے کر انہیں سلجوقیوں کے خلاف بغاوت پر اکسا سکتے ہیں" — حسن بن صباح نے کہا۔

"نہیں حسن!" — احمد بن عطاش نے کہا — "اس کے لئے کم از کم دو سال کا عرصہ چاہئے..... اور اس حقیقت کو کبھی نہ بھولنا کہ سلجوقی ترک ہیں اور بڑے ظالم اور جنگجو ہیں۔ ان کے پاس فوج ہے۔ اس وقت ضرورت یہ ہے کہ جس طرح ہم نے شاہ در اور خلجان لے لیا ہے اسی طرح سلجوقیوں کی سلطنت پر قبضہ کر لیں"۔

"یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا حسن!" — احمد بن عطاش نے کہا — "عزم پختہ، مقصد واضح اور دماغ حاضر ہونا چاہئے..... ہمیں ان سلاطین کی انتظامیہ میں گھس جانا چاہئے۔ یہ کام تم کر سکتے ہو۔ میں تمہیں ایک نیا محاذ دے رہا ہوں"۔

"میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں استادِ محترم!" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے یہ بتائیں میں نے کرنا کیا ہے!"

"میرے جاسوسوں نے مجھے ایک اطلاع دی ہے" — احمد بن عطاش نے کہا — "خواجہ حسن طوسی سلطان ملک شاہ کا وزیر اعظم بن گیا ہے۔ یہ تو مجھے کبھی کا معلوم تھا کہ اسے سلطان ملک شاہ نے اپنا وزیر بنا لیا ہے لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ وزیر اعظم بن جانا بہت بڑی بات ہے۔ یہی نہیں، مجھے اطلاع ملی ہے کہ سلطان ملک شاہ اس سے اتنا متاثر ہوا ہے کہ اسے نظام الملک کا خطاب دیا ہے"۔

"استادِ محترم!" — حسن بن صباح نے پوچھا — "وہ تو وزیر اعظم بن گیا ہے۔ یہ بتائیں میں نے کیا کرنا ہے..... کیا اُسے قتل کرانا ہے؟"

"قتل بعد کی بات ہے" — احمد بن عطاش نے کہا — "ہمارے راستے میں جو آئے گا وہ قتل ہو گا۔ ابھی یہ کرنا ہے کہ اس کی جگہ لینی ہے۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ خواجہ حسن طوسی تمہارا ہم جماعت تھا؟"

"ہاں میرے مُرشد!" — حسن بن صباح نے اُچھل کر کہا — "یہ تو میں بھول ہی گیا تھا"۔

"میں یہ بھی جانتا ہوں تم کیوں بھول گئے تھے" — احمد بن عطاش نے کہا — "مدرسے سے نکلتے ہی تمہیں عبدالملک بن عطاش کے حوالے کر دیا گیا تھا، پھر تمہاری سرگرمیاں ایسی رہیں کہ تمہیں اور کچھ یاد آ ہی نہیں سکتا تھا"۔

"مجھے کچھ اور بھی یاد آ گیا ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "مدرسے میں ہم تین دوست تھے۔ عمر، خواجہ حسن اور میں۔ ہم نے معاہدہ کیا تھا کہ مدرسے سے فارغ ہو کر ہم میں سے کسی کو کہیں بڑا عہدہ مل گیا تو وہ دونوں کو کسی اچھے عہدے پر فائز کرائے گا..... میرا کام تو آسان ہو گیا ہے۔ میں کل صبح روانہ ہو جاؤں گا اور خواجہ حسن کو اس کا وعدہ یاد دلاؤں گا"۔

"دیکھا حسن!" — احمد بن عطاش نے کہا — "ہمارا ہر کام آسان ہوتا چلا جارہا ہے۔ یہ ثبوت ہے کہ ہم حق پر ہیں اور خدا ہماری مدد کر رہا ہے..... یہ بھی یاد رکھو کہ سلطان ملک شاہ اب نیشاپور میں نہیں۔ اب اس کا دارالحکومت مَرو میں ہے"۔

○

اگلی صبح کا دھندلکا ابھی خاصا گہرا تھا جب حسن بن صباح اپنے اعلیٰ عربی نسل کے گھوڑے کی بجائے معمولی سے ایک گھوڑے پر سوار ہوا۔ اُس کا لباس بھی ایک عام آدمی کا لباس تھا۔ ایسے گھوڑے اور ایسے لباس میں وہ غریب آدمی لگتا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک گھوڑا اور تھا جس پر ایک جوان اور بڑی ہی دلکش لڑکی تھی۔ اُس کا لباس بھی غریبانہ تھا۔

"یاد رکھنا حسن!" — احمد بن عطاش نے کہا — "اپنے آپ کو اہلِ سُنّت ظاہر کرنا اور جمعہ کے روز مسجد میں چلے جایا کرنا۔ اگر تمہیں وہاں کوئی اچھا رتبہ مل گیا تو سلطان ملک شاہ کا منظورِ نظر بننے کی کوشش کرنا اور اس کے ساتھ یہ بھی دیکھتے رہنا کہ نظام الملک کو تم سلطان کی نظروں سے کس طرح گرا سکتے ہو۔ ایک بار وزارت کا عہدہ لے لو پھر سلجوقی سلطنت میں ہماری زمین دوز کارروائیاں شروع ہو جائیں گی۔ جاسوسوں کے ذریعے میرا تمہارے ساتھ رابطہ قائم رہے گا۔ ایک بار پھر سوچ لو کہ اس لڑکی کو تم نے اپنی بیوہ بہن ظاہر کرنا ہے۔ یہ بات تو ہو چکی ہے کہ اس لڑکی کو کس طرح استعمال کرنا ہے"۔

احمد بن عطاش اور حسن بن صباح کی سازش یہ تھی کہ نظام الملک کے خلاف غلط فہمیاں پیدا کر کے اسے معزول کراتا اور اس کی جگہ حسن بن صباح نے لینی ہے اور پھر بڑے عہدوں پر اپنے آدمی فائز کروانے ہیں اور سلطنتِ سلجوق کی جڑیں کھوکھلی کر کے عالمِ اسلام کو اپنے فرقے کے تابع کرنا ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی کی وضاحت ہو جائے تو بہتر ہے۔ ایک مقام تک ان لوگوں کی تبلیغ سے پتہ چلتا تھا کہ یہ اسماعیلی عقیدے کے لوگ ہیں لیکن شاہ در سے نکل کر انہوں نے جب خلجان کا رخ کیا اور نئے سے نئی تخریب کاریاں کرنے لگے تو واضح ہو گیا کہ یہ لوگ فرقہ باطنیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنا ہی ایک فرقہ بناتے چلے جارہے تھے' لہٰذا حسن بن صباح اور اس کے پیروکاروں کو کسی فرقے سے منسوب کرنا صحیح نہیں۔

داستان گو ایک بات اور کہنا چاہتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ حسن بن صباح ایک افسانوی کردار ہے اور قلعہ المَوت میں اُس کی خود ساختہ جنت کا بھی حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور یہ الف لیلیٰ کی ایک داستان ہے۔

ان حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ یہ داستان اگر خیالی ہوتی تو ابنِ خلدون جیسا مورخ اسے تاریخ کے دامن میں نہ ڈالتا۔ ابنِ اثیر اور ابن جوزی اس کا ذکر نہ کرتے۔ درجنوں مستند مورخوں نے حسن بن صباح اور اس کی جنت کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ یورپی مورخوں نے تو اور زیادہ تحقیق کر کے یہ حالات قلمبند کئے ہیں۔

اس باب میں اُن عظیم شخصیتوں کے نام دیئے گئے ہیں جو حسن بن صباح کے پیروکاروں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اس فہرست کو دیکھ کر بتائیں کہ یہ شخصیتیں افسانوی ہیں؟

○

داستان گو آپ کو مَرو لے چلتا ہے جہاں حسن بن صباح پہنچ چکا ہے اور نظام الملک کے پاس بیٹھا ہے۔ وہ نظام الملک کو بتا چکا ہے کہ فاطمہ اُس کی بہن ہے جو جوانی کی عمر میں ہی بیوہ ہو گئی ہے۔ نظام الملک نے اُس کی بہن کو اپنی بیوی کے پاس بھیج دیا ہے۔

حسن بن صباح نے نظام الملک کو مدرسے کے زمانے کا وعدہ یاد دلایا اور بڑے ہی درد ناک اور اثر انگیز لہجے میں اپنی بے روزگاری اور بدحالی کا قصہ سنایا۔

"میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا خواجہ!" — حسن بن صباح نے کہا — "تم وزیرِاعظم ہو اور میں تمہاری رعایا کا ایک نادار آدمی ہوں۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ تم ان مومنین میں سے ہو جو زہد اور تقویٰ کو اپنی زندگی سمجھتے ہیں۔ تم جیسے زاہد اور متقی اپنے وعدے پورے کیا کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وعدہ خلافی گناہ ہے..... یہ بھی سوچو کہ میں نے اتنا ہی علم حاصل کیا ہے جتنا تم نے کیا ہے لیکن تم وزیرِاعظم ہو اور میں دو وقت کی روٹی بھی نہیں کھا سکتا"۔

"اللہ کی ذات سے مایوس نہ ہو حسن!" — نظام الملک نے کہا — "میں اپنا صرف وعدہ ہی پورا نہیں کروں گا بلکہ تمہیں اپنی ذاتی املاک کا بھی برابر کا حصہ دار سمجھوں گا"۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نظام الملک نے سلطان ملک شاہ کو حسن بن صباح کی شخصیت اور علمی قابلیت کی ایسی تصویر دکھائی کہ سلطان نے اسے معتمدِ خاص کا رتبہ

دے دیا۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ یہ عہدہ وزیر کے برابر تھا لیکن حسن بن صباح کوئی ایسا عہدہ چاہتا تھا جس میں وہ آزادانہ فیصلے کر سکتا۔

نظام الملک اپنی آستین میں ایک سانپ پالنے لگا۔

تقریباً" تمام تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح نے نظام الملک کو سلطان کی نظروں میں گرانے کے لئے یہ طریقہ سوچا کہ اُن اہم رتبوں والے عہدیداروں کو ہاتھ میں لیا جائے جن کی بات سلطان توجہ اور دلچسپی سے سنتا ہے۔ ان میں ایک احتشام مدنی تھا جو سلطان کے تین مشیروں میں سے تھا۔ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ بھی تھا۔

احتشام مدنی شام کے وقت شہر کے ایک باغ میں چہل قدمی کے لئے جایا کرتا تھا۔

ایک شام وہ حسب معمول ٹہل رہا تھا کہ ایک جواں سال لڑکی اُس کے سامنے اچانک آگئی اور جھجک کر ایک طرف ہو گئی۔ یہ باغ خاص قسم کے لوگوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس لڑکی کو احتشام مدنی نے پہلی بار دیکھا تھا۔ لڑکی کسی عام سے گھرانے کی نہیں لگتی تھی۔ احتشام مدنی نے دیکھا کہ لڑکی اچانک سامنے آجانے سے کچھ گھبرا گئی تھی اور اس پر حجاب طاری ہو گیا تھا۔ ویسے بھی یہ لڑکی اُسے بہت اچھی لگی۔ اُس نے لڑکی کو بلا کر پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیوں آئی ہے؟

"میں حسن بن صباح کی بہن ہوں"۔۔۔ لڑکی نے جواب دیا۔

"حسن بن صباح؟"۔۔۔ احتشام مدنی نے پوچھا اور خود ہی بولا۔۔۔ "اچھا' اچھا' وہ حسن بن صباح جو چند دن پہلے سلطان کے معتمدِ خاص مقرر ہوئے ہیں"۔

یہ احتشام مدنی اور اس لڑکی کی پہلی ملاقات تھی۔ بیان ہو چکا ہے کہ یہ لڑکی حسن بن صباح کی بہن نہیں تھی نہ اُس کا نام فاطمہ تھا نہ ہی وہ بیوہ تھی۔ اُس نے باتوں باتوں میں احتشام مدنی کو بتایا کہ وہ بیوہ ہے اس لئے بھائی اسے ساتھ لے آیا ہے۔ اس سے احتشام مدنی کے دل میں اس لڑکی کی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ لڑکی نے ایسے انداز سے باتیں کیں جیسے وہ احتشام مدنی کی شخصیت سے متاثر ہو گئی ہو۔ احتشام مدنی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ لڑکی حسن بن صباح اور احمد بن غطاش جیسے ابلیسی باطنیوں کی تربیت یافتہ ہے اور یہ انسان کے روپ میں آئی ہوئی بڑی ہی زہریلی ناگن ہے۔

وہ جب وہاں سے چلی تو احتشام مدنی جیسے زاہد اور پارسا نے اپنے دل میں دھچکا سا محسوس کیا اور اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو گئی کہ یہ لڑکی اُسے ایک بار پھر ملے۔

لڑکی اُسے پھر مل گئی اور پہلے روز سے زیادہ بے تکلفی کی باتیں کیں۔ وہ ظاہر یہ کرتی تھی کہ بیوگی نے اُسے مغموم اور رنجیدہ کر رکھا ہے۔ اس طرح اُس نے احتشام مدنی کے دل میں اپنی ہمدردی پیدا کر لی۔

پھر اسی باغ میں شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ان دونوں کی کئی بار ملاقات ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ لڑکی نے احتشام مدنی کو ایک روز اپنے گھر بلا لیا۔ لڑکی نے اُسے کہا تھا کہ حسن بن صباح صبح چلا جاتا ہے اور شام کو واپس آتا ہے۔ یہ لڑکی تربیت کے مطابق احتشام مدنی پر ایک نشہ بن کر غالب آگئی تھی۔ اس حد تک کہ صوم و صلوٰۃ کا پابند یہ معزز شخص اپنا آپ فراموش کر بیٹھا۔

دن کے وقت وہ اس لڑکی کے گھر میں اس کے حسن و شباب سے مخمور اور مدہوش ہوا جا رہا تھا کہ صحن میں کسی کے قدموں کی آہٹ نے اُسے چونکا دیا۔

"یہ کون ہے؟"۔۔۔ احتشام مدنی نے گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا۔

"خادم ہو گا"۔۔۔ لڑکی نے بڑے اطمینان سے کہا۔۔۔ "میں دیکھتی ہوں"۔

پیشتر اس کے کہ لڑکی باہر نکلتی' حسن بن صباح کمرے میں داخل ہوا۔ احتشام مدنی جیسے مومن آدمی کو اپنی بہن کے پاس دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ احتشام مدنی اُس کے سامنے کھڑا کانپ رہا تھا۔

"میں تم دونوں کو سنگسار کراؤں گا"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "میں باہر دروازہ بند کر کے سلطان کے پاس جا رہا ہوں"۔

حسن بن صباح دروازے کی طرف مڑا تو لڑکی اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور رو رو کر کہنے لگی کہ اُس نے اس شخص کو نہیں بلایا تھا۔

"پھر یہ میرے گھر میں کس طرح آگیا؟"۔۔۔ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"یہ خود ہی آیا تھا"۔۔۔ لڑکی نے جواب دیا۔۔۔ "اور اس نے میرے ساتھ پیار اور محبت کی باتیں شروع کر دیں۔ اچھا ہوا کہ تم آگئے اور میں اس کی دست درازی سے بچ گئی"۔

احتشام مدنی نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس لڑکی نے اسے خود بلایا تھا۔

کچھ دیر یہی جھگڑا چلتا رہا۔

"حقیقت کچھ بھی ہے"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم

میرے گھر میں میری بہن کے پاس بُری نیت سے آئے بیٹھے ہو۔ میں سلطان کو ضرور بتاؤں گا"۔

احتشام مدنی صرف معزز آدمی ہی نہیں تھا بلکہ وہ سلطان ملک شاہ کا پسندیدہ مشیر بھی تھا۔ اُس کی جان چلی جاتی تو وہ قبول کر لیتا لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سلطان اسے معزول کر کے نکال دے۔ اس صورت میں اُس کی جو بے عزتی اور بدنامی ہونی تھی' اس کے تصور سے ہی وہ کانپ اٹھا۔ اُس نے حسن بن صباح کی منت سماجت شروع کر دی کہ وہ اسے معاف کر دے۔ لڑکی نے بھی حسن بن صباح سے کہا کہ یہ آخر معزز آدمی ہے' اسے بخش دیا جائے۔

حسن بن صباح گہری سوچ میں چلا گیا جو دراصل اداکاری تھی۔ سوچ سے بیدار ہو کر اُس نے احتشام مدنی کا بازو پکڑا اور اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ جب وہ دونوں باہر نکلے تو احتشام مدنی کے چہرے پر رونق عود کر آئی تھی۔ حسن بن صباح نے اس کے ساتھ سودا بازی کر لی تھی جو مختصراً یہ تھی کہ احتشام مدنی نظام الملک کے خلاف حسن بن صباح کا ساتھ دے گا۔

یہ شخص حسن بن صباح کا پہلا شکار تھا جسے اُس نے نظام الملک کو سلطان کی نظروں سے گرانے میں استعمال کرنا تھا۔

ابلیس نے خدا کی حکم عدولی کی اور انسان کے آگے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس نے اللہ سے کہا تھا' مٹی کا بنا ہوا یہ انسان زمین پر اپنے ہی بھائیوں کا خون بہائے گا' فتنہ اور فساد بپا کرے گا اور تیری عطا کی ہوئی اس عظمت کو بھول جائے گا کہ تیرے حکم سے فرشتوں نے اس کے آگے سجدہ کیا تھا۔

"اسے ہم نے اشرف المخلوقات بنایا ہے"——یہ اللہ کی آواز تھی۔

"یہ حشرات الارض سے بدتر ہو گا"——یہ ابلیس کی آواز تھی۔

"یہ میرے بتائے ہوئے راستے پر چلے گا"——اللہ نے کہا——"میں اس کی رہنمائی کے لئے نبی اور پیغمبر بھیجتا رہوں گا"۔

"میں اسے اپنے راستے پر چلاؤں گا"——ابلیس نے کہا——"جو طاقت مجھ میں ہے وہ اس میں نہیں۔ میں آگ سے بنا ہوں۔ یہ مٹی کا پُتلا ہے۔ میں اسے بڑی حسین اور دلفریب خواہشوں کا غلام بنا دوں گا"۔

"یہ میری عبادت کرے گا"۔

"میں اسے دنیا کی چمک دمک کا شیدائی بنا دوں گا"——ابلیس نے کہا——"یہ تیری عبادت کرے گا لیکن اس کا دل دولت کا پجاری ہو گا۔ یہ ہر اُس چیز کی پرستش کرے گا جس سے ذہنی اور جسمانی لذّت حاصل ہو گی' اور یہ ہر وہ کام کرے گا جس سے اسے روکا جائے گا۔ یہ بدی سے لطف اندوز ہو گا"۔

"جا' تُو تاقیامت ملعون رہے گا"——اللہ نے کہا اور ابلیس کو دھتکار دیا۔

پھر یوں ہوا کہ اللہ کا پہلا ہی بندہ جنّت سے نکالا گیا۔

پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا' وہ عورت جو آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی تھی' وہ آدمی کی جڑوں میں بیٹھتی چلی گئی اور آدمی کی ایسی کمزوری بن گئی کہ وہ مجبور اور بے بس ہو گیا۔

عورت آدمی کے لئے نشہ بن گئی۔

آدمی عورت کے دام میں آ کر ابلیس کا پجاری بن گیا۔

داستان گو اپنے آپ کو فنِ داستان گوئی تک ہی محدود رکھنا چاہتا ہے۔ ابلیس کے متعلق ایک پیرِ طریقت شیخ ابن عربیؒ کی ایک تحریر کا اقتباس پیش کرتا ہے:

"ابلیس اہلِ خلوت کو راہِ راست سے منحرف کرنے میں ایسے ایسے

کمال رکھتا ہے کہ انسانی علم و عمل کے بڑے مضبوط قلعے اس کی ادنیٰ فسوں طرازیوں سے آناً "فاناً" زیر و زبر ہو جاتے ہیں۔ اگر توفیقِ الٰہی اور ہدایتِ ازلی رفیقِ حال ہو تو انسان اس کی مغویانہ دست بُرد سے ہر وقت محفوظ ہے ورنہ جو بختِ خفتہ اور طالع گم گشتہ اپنی قسمت کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں' وہ ان کو ایسی بُری طرح پٹختا ہے کہ اس کا جھٹکا مشرق و مغرب تک محسوس ہوتا ہے"۔

○

سلجوقی سلطان ملک شاہ کا مشیرِ خاص اور منظورِ نظر احتشام مدنی پابند صوم و صلواۃ تھا' زاہد و پارسا اور معززانسان تھا۔ کوئی ایسا جواں سال بھی نہ تھا کہ جوشِ شباب میں ایک حسین لڑکی کو دیکھ کر بے قابو ہو جاتا مگر وہ فاطمہ کو دیکھ کر اپنے آپ کو اور اللہ کو بھی بھلا بیٹھا اور حسن بن صباح کے جال میں آگیا۔

وہ اُس کمرے سے جس میں حسن بن صباح اسے لے گیا تھا' نکلا تو اس کے چہرے سے شرمساری اور گھبراہٹ ڈھل گئی تھی اور رونق عود کر آئی تھی۔ یہ تو واضح ہے کہ حسن بن صباح نے اس کے ساتھ سودا بازی کر لی تھی کہ وہ وزیرِاعظم نظام الملک کو سلطان ملک شاہ کی نظروں میں گرانے میں اس کی مدد کرے گا لیکن ان کے درمیان باتیں کیا ہوئی تھیں؟

تاریخوں میں جو اشارے ملتے ہیں' ان سے یہ باتیں سامنے آتی ہیں کہ حسن بن صباح نے احتشام کو اندر لے جا کر یوں نہیں کہا تھا کہ احتشام اسے نظام الملک کی جگہ وزیرِاعظم بنوا دے۔

"تم بے شک سلطان کے مشیر ہو احتشام!" ــــ حسن بن صباح نے کہا تھا ــــ "لیکن میرا رتبہ بھی تم سے کم نہیں۔ میں جو بات کرنا چاہوں گا وہ براہِ راست سلطان کے ساتھ کر لوں گا لیکن تمہاری اس حرکت سے مجھے مایوسی ہوئی ہے۔ فوری طور پر مجھے جو خیال آتا ہے وہ یہ ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ میں تو دل میں سلطنتِ سلجوق کی بھلائی لے کر آیا تھا۔ میں اہلِ سنت والجماعت ہوں۔ مجھے کسی عہدے اور کسی رتبے کی ضرورت نہیں۔ قلعہ شاہ در سے قلعہ خلجان تک کے علاقے کے لوگ مجھے اپنا مُرشد اور عالمِ دین مانتے ہیں لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ سلطنت سلجوق اور اسلام کے خلاف کچھ

فتنے اٹھ رہے ہیں۔ میں یہاں ان خطروں کے انسداد کے لئے یہاں آیا تھا لیکن میں نے یہاں کچھ اور ہی دیکھا ہے"۔

"میں اپنی اس حرکت پر نادم ہوں میرے بھائی!" ــــ احتشام مدنی نے کہا۔

"صرف یہی ایک حرکت نہیں ہوئی" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "میں نے یہ ذرا سنبھالا تو نظام الملک نے سلطان کے اور تمہارے خلاف کان بھرنے شروع کر دیئے۔ تمہیں شاید معلوم ہو گا کہ میں اور نظام الملک امام مؤافق کے مدرسے میں اکٹھے رہے ہیں۔ ہم گہرے دوست ہُوا کرتے تھے۔ اس نے خود مجھے یہاں بلایا اور اس عہدے پر یہاں لگوالیا ہے۔ یہ سرکاری خزانے پر ہاتھ صاف کر رہا ہے اور اس کے ارادے بڑے خطرناک ہیں۔ یہ خلیفہ سے مل کر ایک فوج تیار کرنے کی کوشش میں ہے اور یہ سلجوقی سلطنت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے"۔

"میں سلطان کو خبردار کر دوں گا" ــــ احتشام مدنی نے کہا ــــ "سلطان صرف میری بات سنتا ہے"۔

"ایسی حماقت نہ کر بیٹھنا" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "نظام الملک پہلے ہی تمہیں یہاں سے ذلیل و خوار کر کے نکلوانا چاہتا ہے۔ یہ تو لڑکپن میں مدرسے میں اسی طرح جوڑ توڑ کرتا رہتا تھا۔ اس کا ذہن سازشی ہے۔ سلطان اگر تمہاری سنتا ہے تو سلطان اس کی بھی سنتا اور مانتا ہے۔ اگر تم نے جلد بازی سے کام لیا تو یہ شخص تمہیں یہاں سے نکلوائے گا نہیں بلکہ قید خانے میں بھجوا دے گا..... میں باہر کے خطروں کو تو بھول ہی گیا ہوں احتشام! سب سے بڑا خطرہ تو یہ ہے۔ یہ بڑا ہی زہریلا سانپ ہے جو سلطان کی آستین میں پرورش پا رہا ہے"۔

"مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟" ــــ احتشام نے پوچھا۔

"پہلے میری بات پوری ہونے دو" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "میں اس وزیرِاعظم کی سازشوں سے پریشان ہو رہا تھا اور یہی سوچا تھا کہ تمہارے ساتھ بات کروں گا لیکن تم نے جو حرکت کی ہے' اس سے میں بالکل ہی مایوس ہو گیا ہوں۔ اگر مشیرِ خاص یہ طرح کرے کہ حاکموں کے گھروں میں داخل ہو کر ان کی عزت کے ساتھ کھیلے تو اس سلطنت کا اللہ ہی حافظ ہے۔ میں سلطان کو یہ تو ضرور بتاؤں گا کہ اس کی ناک کے عین نیچے کیا ہو رہا ہے"۔

اعتشام مدنی نے حسن بن صباح کے آگے ہاتھ جوڑے اور منت سماجت شروع کر دی کہ وہ اسے معاف کر دے اور یہ بات سلطان تک نہ پہنچائے۔

"اگر میں نے تمہاری اس حرکت کی شکایت سلطان کو کر دی تو" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "تو تم نہیں جانتے کیا ہو گا۔ سلطان نظام الملک سے مشورہ لے گا۔ نظام الملک جس موقع کی تلاش میں ہے وہ اسے مل جائے گا' پھر تم سیدھے قید خانے میں جاؤ گے" ـــــ حسن بن صباح سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد بولا ـــــ "اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم دونوں نظام الملک کو سلطان کی نظروں سے گرانے کی کوشش کریں گے"۔

"مجھے اپنے ساتھ سمجھو" ـــــ اعتشام نے کہا۔

"لیکن نظام الملک کے ساتھ پہلے کی طرح دوستانہ رویّہ رکھنا" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "اُسے شک نہ ہو کہ ہم دونوں اُس کے خلاف کچھ کر رہے ہیں"۔

حسن بن صباح کے بولنے کا انداز ایسا تھا جو ایک خاص تاثر پیدا کرتا تھا۔ اعتشام مدنی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اُس شخص کے جال میں آ گیا ہے جس نے بڑی محنت سے اپنے آپ میں ابلیسی اوصاف پیدا کئے ہیں اور دو استادوں نے اُس میں ابلیس کی قوتیں پیدا کر کے اسے مکمل ابلیس بنا دیا ہے۔

نفسیاتی فطرت کے عالم کہتے ہیں کہ ایسے انسان میں جو اپنے آپ میں ابلیسی اوصاف پیدا کر لیتا ہے' ایک ایسی کشش پیدا ہو جاتی ہے کہ ہر کوئی اُس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ اس کے بولنے کے انداز میں چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ہر وقت بڑا ہی دلفریب تبسّم کِھلا رہتا ہے۔ ضرورت پڑے تو وہ اپنے اوپر ایسی اداسی' غمزدگی اور مظلومیت طاری کر لیتا ہے کہ دوسروں کو رُلا دیتا ہے' اور وہ جب کسی کے ساتھ خیرسگالی یا محبت کے جذبات کا اظہار کرتا ہے تو دل موہ لیتا ہے لیکن یہ محض اداکاری اور فریب کاری ہوتی ہے۔

اعتشام مدنی نے نظام الملک کے خلاف حسن بن صباح کی باتیں اپنے دل میں اتار لیں اور اس کے ساتھ اس طرح بے تکلف ہو گیا جیسے بچپن کے ہمجولی ہوں۔ حسن بن صباح نے تو اُس پر طلسماتی اثر پیدا کر دیا تھا۔ بے تکلفی یہاں تک بڑھی کہ اعتشام مدنی نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"میری ایک درخواست پر غور کرو گے حسن؟" ـــــ اعتشام نے پوچھا۔

"دوستوں میں یہ تکلف نہیں ہونا چاہئے اعتشام!" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "درخواست نہ کہو' بات کرو اور مجھ پر اپنا حق سمجھ کر بات کرو"۔

"کیا تم پسند کرو گے کہ میں تمہاری بہن کے ساتھ شادی کر لوں؟" ـــــ اعتشام نے پوچھا۔

"میرے سامنے مسئلہ اور ہے" ـــــ حسن بن صباح نے جواب دیا ـــــ "سوال یہ نہیں کہ میں پسند کروں گا یا نہیں' سوال یہ ہے کہ فاطمہ پسند کرے گی یا نہیں۔ تمہیں شاید میری یہ بات عجیب لگے کہ میں نے یہ فیصلہ اپنی بہن پر چھوڑ دیا ہے۔ بات یہ ہے اعتشام! اس بہن سے مجھے بہت ہی پیار ہے۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو اسے اچھا نہ لگے۔ اس کی پہلی شادی میری پسند پر ہوئی لیکن وہ آدمی ٹھیک نہ نکلا۔ فاطمہ کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتا تھا۔ اسے شاید اسی کی بددعا لگی کہ وہ ایک ہی سال بعد مر گیا۔ شادی سے یہ ایسی متنفّر ہوئی ہے کہ شادی کا نام نہیں سننا چاہتی"۔

"میں اسے کیسے یقین دلاؤں کہ میں اسے سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھوں گا" ـــــ اعتشام مدنی نے کہا ـــــ "میرے دل میں اس لڑکی کی محبت پیدا ہو گئی ہے"۔

"میں ایک کام کر سکتا ہوں" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "فاطمہ سے کہوں گا کہ تمہیں پسند کر لے۔ میں اسے تمہارے ساتھ ملنے سے روکوں گا نہیں"۔

"تو کیا اب میں جا سکتا ہوں؟" ـــــ اعتشام نے پوچھا۔

"ہاں اعتشام!" ـــــ حسن نے کہا ـــــ "ہم دشمنوں کی طرح ملے تھے' اللہ کا شکر ہے کہ تم بھائیوں کی طرح جا رہے ہو"۔

"اللہ کرے ہم ہمیشہ کے لئے بھائی بن جائیں" ـــــ اعتشام نے کہا۔

"میں پوری کوشش کروں گا میرے بھائی!" ـــــ حسن نے کہا ـــــ "میں فاطمہ کو منوا لوں گا"۔

○

اعتشام مدنی حسن بن صباح کے گھر سے نکل گیا تو لڑکی ساتھ والے کمرے سے نکلی۔

"شکار مار لیا یا نہیں؟" ـــــ لڑکی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"جال میں تم جیسا دانہ پھینکا جائے تو شکار کیوں نہیں پھنسے گا؟" ـــــ حسن بن صباح نے بازو پھیلا کر فاتحانہ لہجے میں کہا۔

لڑکی لپک کر اس کے بازوؤں میں چلی گئی اور حسن بن صباح نے اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

"وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے" ۔۔۔ لڑکی نے کہا ۔۔۔ "میں دروازے کے ساتھ کان لگا کر سن رہی تھی"۔

"یہ یاد رکھنا کہ تم اب فاطمہ ہو" ۔۔۔ حسن نے کہا ۔۔۔ "اپنا اصل نام بھول جاؤ.... ہاں' یہ شخص تمہارے ساتھ شادی کرنے کو بیتاب ہے۔ تم اسے ملتی رہنا اور اس کے لئے بڑا ہی حسین سراب بنی رہنا۔ تم نے یہ کہتے رہنا ہے کہ مجھے آپ سے پیار ہے لیکن میں شادی کا نام سنتی ہوں تو مجھ پر غشی طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ اس پر پیار کا ایسا نشہ طاری کئے رکھنا کہ یہ مدہوش رہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس سے ملاقات کے وقت تم نے اپنے کپڑوں اور بالوں پر کون سی خوشبو لگانی ہے۔ اسے پیار دو' اس کا پیار لو اور اپنے جسم کو اس سے بچائے رکھو"۔

"کیا مجھے یہ باتیں بتانا ضروری ہیں؟" ۔۔۔ لڑکی نے کہا ۔۔۔ "بارہ سال عمر سے میں آپ لوگوں سے جو تربیت لے رہی ہوں' یہ میری روح میں شامل ہو گئی ہے۔ یہ میرا عقیدہ بن گئی ہے"۔

"میں تمہیں اُس روز خراجِ تحسین پیش کروں گا جس روز میں اس سلطنت کا وزیرِ اعظم بن جاؤں گا" ۔۔۔ حسن نے کہا ۔۔۔ "تمہیں ایک خاص سبق دیا جاتا رہا ہے۔ یہ نہ بھولنا۔ میں تمہیں پھر بتا دیتا ہوں۔ تم حسین و جمیل لڑکی ہو۔ تمہارے جذبات بھی ہیں اور یہاں ایک سے بڑھ کر ایک خوبرو اور دلکش جسموں والے شہزادے اور امیر زادے موجود ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کی محبت میں مبتلا ہو جاؤ"۔

"ایسا نہیں ہو گا آقا!" ۔۔۔ لڑکی نے کہا۔

"اگر ایسا ہو گیا تو اس کی سزا سے تم واقف ہو" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "سزائے موت..... یہ موت اتنی سہل نہیں ہو گی کہ سر تن سے جدا کر دیا اور بات ختم ہو گئی۔ یہ بڑی اذیت ناک موت ہو گی"۔

"اس تک نوبت نہیں پہنچے گی آقا!" ۔۔۔ لڑکی نے کہا۔

○

دوسرے ہی دن احتشام مدنی سلطان ملک شاہ کے پاس بیٹھا کاروبارِ سلطنت کی باتیں

کر رہا تھا۔

"سلطانِ معظم!" ۔۔۔ احتشام نے پوچھا ۔۔۔ "اس نئے معتمدِ خاص حسن بن صباح کے متعلق آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟"

"جو رائے تمہاری ہو گی وہی میری ہو گی" ۔۔۔ سلطان نے کہا ۔۔۔ "میں اپنے اتنے سارے کارندوں اور امراء کے متعلق الگ الگ کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ مجھے خواجہ حسن طوسی نے کہا کہ حسن بن صباح اُس کا مدرسے کے زمانے کا دوست ہے' علم و فضل سے مالامال' باریک بین' دور اندیش اور دیانتدار ہے تو میں نے حسن طوسی کی رائے کو مستند مانا۔ مجھے اس وزیرِ اعظم پر اعتماد ہے۔ اسی لئے میں نے اسے نظام الملک کا خطاب دیا ہے..... تم میرے مشیرِ خاص ہو اور میں تمہیں قابلِ اعتماد سمجھتا ہوں۔ تم کسی کے متعلق جو رائے دو گے میں اسے صحیح مانوں گا..... تم میری رائے کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"مجھے حسن بن صباح میں کوئی ایسا وصف نظر آیا ہے جو ہم میں سے کسی میں بھی نہیں" ۔۔۔ احتشام نے کہا ۔۔۔ "آپ نے وزیرِ اعظم خواجہ حسن طوسی کو نظام الملک کا خطاب تو دے دیا ہے لیکن میں جو وصف حسن بن صباح میں دیکھ رہا ہوں وہ نظام الملک میں بھی نہیں"۔

"کیا تم میرے ساتھ صاف بات نہیں کرنا چاہو گے؟" ۔۔۔ سلطان نے پوچھا ۔۔۔ "تم حسن بن صباح کے متعلق میری ذاتی رائے کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"آپ نے مجھے بہت بڑا اعزاز بخشا ہے" ۔۔۔ احتشام مدنی نے کہا ۔۔۔ "مجھے آپ نے اپنا مشیرِ خاص بنایا ہے۔ یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ میں نے یہ ثابت کرنا ہے کہ میں اس اعزاز کے قابل ہوں۔ میں آپ کا نمک اسی طرح حلال کر سکتا ہوں کہ جو اچھی یا بُری چیز میں دیکھوں وہ آپ کو بھی دکھاؤں اور جو اچھی یا بُری بات میں سنوں وہ آپ کو بھی دکھاؤں..... آپ کسی وقت حسن بن صباح کو شرفِ باریابی بخشیں اور اس کی عقل و دانش کا امتحان لیں"۔

"اسے ابھی میرے پاس بھیج دو" ۔۔۔ سلطان ملک شاہ نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد حسن بن صباح سلطان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ سلطان اس کی فہم و فراست کا امتحان لینا چاہتا تھا۔

"حسن!" — سلطان نے پوچھا — "کوئی بادشاہ اپنی تمام تر رعایا کو کس طرح خوش اور راضی رکھ سکتا ہے؟"

"اپنے دل کو ناراض کر کے!" — حسن نے جواب دیا۔

"اس کی تشریح کرو گے؟"

"بادشاہ اپنے دل سے شاہانہ خواہشات نکال دے" — حسن نے کہا — "ہر بادشاہ عیش و عشرت کا دلدادہ ہوتا ہے۔ خزانہ اپنے اوپر لٹا دیتا ہے۔ رعایا کے محصولات میں اضافہ کر کے اپنا خزانہ بھرتا ہے اور رعایا کے خون پسینے کی کمائی پر فرعون بن جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے دل کو ایک عام انسان کا دل سمجھے تو عقل اُسے اُس راستے پر ڈال دے گی جس راستے کے دونوں طرف رعایا اُس کے دیدار کو کھڑی ہو گی"۔

"تم ہمارے معتمدِ خاص ہو" — سلطان نے پوچھا — "کیا تم بتا سکتے ہو ہمارا سب سے بڑا دشمن کون ہے جو ہماری سلطنت پر کسی بھی روز حملہ کر سکتا ہے؟"

"آپ کے دربار کے خوشامدی!" — حسن بن صباح نے جواب دیا۔

سلطان چونک پڑا۔

"میں دوسرے دشمن کی بات کر رہا ہوں!" — سلطان نے کہا — "کوئی دوسرا ملک، کوئی دوسری قوم!"

"سلطانِ عالی مقام!" — حسن بن صباح نے کہا — "جنگل میں یا کہیں اور آپ کے سامنے سانپ آجائے تو آپ اسے مار سکتے ہیں یا بھگا سکتے ہیں لیکن جو سانپ آپ کی آستین میں پل رہا ہو، اس کے ڈنک سے آپ نہیں بچ سکتے۔ وہ کسی بھی وقت حملہ کر سکتا ہے"۔

"کیا تم نے ہمارے کاروبارِ سلطنت میں کوئی خطرناک کمزوری یا خامی دیکھی ہے؟" — سلطان نے پوچھا۔

"ہاں سلطانِ عالی مقام!" — حسن بن صباح نے کہا — "یہاں میں نے جو سب سے بڑی خامی دیکھی ہے وہ ہے اپنے وزیر اور دیگر اہلکاروں پر اندھا اعتماد"۔

"کیا تم ہمارے وزیر اعظم میں کوئی خامی دیکھ رہے ہو؟" — سلطان نے پوچھا۔

"سلطانِ عالی مقام!" — حسن بن صباح نے کہا — "اگر میں وزیر اعظم یا کسی مشیر یا کسی اور حاکم کی خامیاں بیان کرنے لگوں تو یہ غیبت ہو گی۔ غیبت ایک ایسا گناہ ہے جو

بادشاہوں کی جڑیں کھوکھلی کر دیتا ہے۔ میں اُس وقت کوئی خامی بتاؤں گا جب کوئی ٹھوس ثبوت موجود ہو گا اور جو آپ کو صاف نظر آئے گا"۔

سلطان ملک شاہ دراصل یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ شخص کتنا ذہین ہے اور اس کی عقل میں باریک بینی اور دُور اندیشی ہے بھی یا نہیں۔

"کاروبارِ سلطنت سے ہٹ کر ایک بات پوچھتا ہوں" — سلطان نے پوچھا — "کیا تم نے کبھی شیر یا چیتے وغیرہ کا شکار کھیلا ہے؟"

"نہیں سلطانِ عالی مقام!"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا" — سلطان نے کہا — "کہ تم ان درندوں سے ڈرتے ہو..... کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ان درندوں سے ڈرنا چاہئے؟"

"نہیں سلطانِ محترم!" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "درندوں سے کسی کو بھی نہیں ڈرنا چاہئے۔ میں صرف ایک درندے سے ڈرتا ہوں اور آپ کے دل میں بھی اس کا ڈر پیدا کرنا چاہتا ہوں"۔

"ایسا کون سا درندہ ہے؟"

"دیمک!" — حسن بن صباح نے جواب دیا۔

سلطان ملک شاہ ہنس پڑا۔

"تم میں بذلہ سنجی بھی ہے" — سلطان نے کہا — "مجھے یہ وصف اچھا لگتا ہے۔ میں نے پہلی بار کسی کو دیمک کو درندہ کہتے سنا ہے"۔

"نہیں سلطانِ معظم!" — حسن بن صباح نے کہا — "میں اس وقت ہر بات پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ یہ موقع ہنسی مذاق کا نہیں..... درندہ آپ کے سامنے آتا ہے تو آپ اس پر تیر چلاتے ہیں یا اس سے بچنے کے لئے راستہ بدل لیتے ہیں یا درخت پر چڑھ جاتے ہیں لیکن دیمک وہ درندہ ہے جو سامنے نہیں آتا۔ آپ اس پر تیر نہیں چلا سکتے نہ آپ درخت پر چڑھ جانے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ آپ کو اُس وقت پتہ چلتا ہے جب دیمک اندر ہی اندر کھا کر سب کچھ کھوکھلا اور بے جان کر چکی ہوتی ہے۔ دیمک بادشاہ کے تخت کو لگ جائے تو بادشاہ کو اُس وقت پتہ لگتا ہے جب تخت بیٹھ جاتا ہے..... میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ ڈرو درباری خوشامدی سے، آستین کے سانپ سے اور اُن کارندوں اور درباریوں سے جو دیمک کی

طرح اندر ہی اندر سلطنت کو کھا رہے ہیں"۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ ہم نے تمہاری یہ باتیں سن کر کیا رائے قائم کی ہے؟" سلطان نے پوچھا۔

"رائے اچھی نہیں ہو سکتی" ——حسن بن صباح نے کہا—— "کیونکہ میں نے خوشامد نہیں کی بلکہ خوشامد کے خلاف بات کی ہے"۔

"نہیں حسن!" ——سلطان نے کہا—— "تمہاری یہ باتیں سن کر ہمیں خوشی ہوئی ہے کہ تم صاف گو اور صداقت پسند ہو..... تم جا سکتے ہو"۔

سلطان ملک شاہ حسن بن صباح کے جانے کے بعد کچھ دیر سوچ میں گم رہا۔ اُس کے ذہن میں حسن بن صباح کی باتیں گونج رہی تھیں۔ یہ باتیں بے مقصد اور بے معنی نہیں تھیں۔ اس نے احتشام مدنی کو بلایا۔

"احتشام!" ——سلطان نے کہا—— "میرا یہ معتمدِ خاص مجھ پر بڑا اچھا تاثر چھوڑ گیا ہے۔ یہ عمر کے لحاظ سے زیادہ جہاندیدہ اور عالم لگتا ہے"۔

احتشام مدنی جیسے اسی انتظار میں تھا کہ سلطان حسن بن صباح کے متعلق یہ رائے دے۔ سلطان کی اتنی اچھی رائے سن کر احتشام مدنی نے حسن بن صباح کی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے اور دبی زبان میں نظام الملک کے خلاف بھی ایک دو باتیں کہہ دیں۔

○

احتشام مدنی نے حسن بن صباح سے جو قیمت وصول کرنی تھی وہ تقریباً طے ہو چکی تھی لیکن یہ قیمت اُس نے اپنی کوشش سے حاصل کرنی تھی۔ اُس شام کا دھندلکا جب تاریک ہو گیا تو احتشام فاطمہ کے ساتھ باغ کے ایک ایسے گوشے میں بیٹھا تھا جہاں انہیں دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ جسم تو دو تھے لیکن اس طرح باہم پیوست کہ ان کے درمیان سے ہوا بھی نہیں گزر سکتی تھی۔

"کل رات تو تم نے مجھے مروا ہی دیا تھا فاطمہ!" ——احتشام نے کہا—— "تم نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ تم مجھے جانتی پہچانتی ہی نہیں"۔

"تو میں اور کیا کرتی!" ——فاطمہ نے ہنستے ہوئے کہا—— "اگر میں یہ کہہ دیتی کہ آپ کو میں نے خود بلایا تھا تو میرا بھائی میری گردن کاٹ دیتا۔ آپ مرد ہیں۔ سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔ میں جانتی تھی کہ آپ میرے بھائی کو ٹھنڈا کر لیں گے۔ وہ آپ نے کر لیا"۔

"میں تو اس سے بھی زیادہ اکھڑ اور جابر آدمیوں کو ٹھنڈا کر لیا کرتا ہوں" ——احتشام مدنی نے کہا—— "میرا تو خیال تھا کہ اب تم مجھے کبھی بھی نہیں ملو گی"۔

"یہ وہم دل سے نکال دیں" ——فاطمہ نے کہا—— "میں نے آپ سے محبت کی ہے اور یہ محبت وقتی اور جسمانی نہیں"۔

"محبت میری بھی وقتی نہیں" ——احتشام نے کہا—— "میں تمہیں اپنی زندگی کی رفیقہ بناؤں گا۔ کہو گی تو اپنی دونوں بیویوں کو طلاق دے دوں گا"۔

"نہیں!" ——فاطمہ نے کہا—— "ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کے دل میں میری محبت ہے تو میں دو عورتوں کو کیوں اجاڑوں"۔

اُس زمانے کے مسلمان معاشرے میں ایک آدمی چار نہیں تو دو یا تین بیویاں ضرور رکھتا تھا۔ ابھی سوکنوں کی رقابت کا تصور پیدا نہیں ہوا تھا۔ عرب کی چار دیواری کی دنیا میں تو یہ دستور بھی چلتا تھا کہ کوئی بیوی اپنی کسی خوبصورت سہیلی کو اپنے خاوند کو تحفے کے طور پر پیش کرتی تھی اور خاوند اس کے ساتھ شادی کر لیتا تھا۔ سلجوقیوں کے ہاں یہ رواج ذرا مختلف تھا لیکن احتشام نسلاً عربی تھا۔

"معلوم نہیں میرے بھائی حسن نے آپ کو بتایا ہو گا کہ میں شادی کے نام سے بھی بھاگتی ہوں" ——فاطمہ نے کہا۔

"ہاں فاطمہ!" ——احتشام نے کہا—— "حسن نے مجھے تمہارے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ میں خود تمہیں شادی کے لئے تیار کروں..... دیکھو فاطمہ! تمام آدمی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ تمہارا پہلا خاوند ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ اُس کا تو دماغی توازن بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا جو تم جیسے پھول کی قدر نہیں کر سکا"۔

"میں حیران ہوں کہ میں آپ کے پاس بیٹھی ہوئی ہوں" ——فاطمہ نے کہا—— "بیٹھی ہوئی بھی نہیں بلکہ آپ کے بازوؤں میں ہوں۔ حیران اس لئے ہوں کہ مجھے مرد کے تصور سے ہی نفرت ہو گئی ہے۔ آپ نے مجھے بڑے کڑے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ ایک طرف آپ کی شادی کی پیشکش ہے جو میں قبول کرنے سے ڈرتی ہوں، دوسری طرف آپ کی محبت ہے جس سے میں دستبردار نہیں ہو سکتی"۔

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں تمہارے پہلے خاوند جیسا آدمی نہیں" ——احتشام نے کہا—— "میں اپنی محبت کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتا"۔

"مجھے سوچنے کا موقع دیں" ۔۔۔ فاطمہ نے کہا ۔۔۔ "میں عجیب سی حالت میں پڑی ہوئی ہوں۔ میرے بھائی کو میرا خیال پریشان رکھتا ہے اور میں اپنے اس بھائی کے متعلق سوچتی رہتی ہوں"۔

"مجھے بتاؤ فاطمہ!" ۔۔۔ احتشام نے کہا ۔۔۔ "بھائی کے متعلق تم کیا سوچتی ہو؟"

"میرا بھائی بہت ہی قابل اور عالم فاضل ہے" ۔۔۔ فاطمہ نے کہا ۔۔۔ "یہ جتنا قابل ہے اتنا ہی سادہ آدمی ہے۔ وزیراعظم نظام الملک میرے بھائی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ وہ میرے بھائی سے مشورے لے کر سلطان کے ساتھ اس طرح بات کرتا ہے جیسے یہ مشورے اس کے اپنے دماغ سے نکلے ہیں۔ میں سلطان کو یہ بات بتا نہیں سکتی۔ سلطان کو اصل حقیقت کا علم ہونا چاہئے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس سلطنت کا وزیراعظم میرا بھائی ہو تو آپ اس سلطنت میں ایسی تبدیلیاں دیکھیں جو آپ کو حیرت میں ڈال دیں"۔

"مجھے کچھ وقت چاہئے فاطمہ!" ۔۔۔ احتشام نے کہا ۔۔۔ "حسن نے مجھے نظام الملک کے متعلق کچھ باتیں بتائی ہیں۔ میں نے آج ہی سلطان کے ساتھ بات کی ہے۔ معلوم نہیں حسن نے تمہیں بتایا ہے یا نہیں' سلطان نے حسن کو بلایا تھا اور ان کے درمیان خاصی دیر باتیں ہوئی تھیں۔ اس کے بعد سلطان نے مجھے بلایا اور اس نے صاف لفظوں میں بتایا کہ وہ حسن سے بہت متاثر ہوا ہے۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے سلطان کے آگے حسن کو اتنا چڑھایا کہ انتظامی قابلیت اور عقل و دانش کے لحاظ سے اسے آسمان تک پہنچا دیا"۔

"کیا میں دل کی بات صاف صاف نہ کہہ دوں؟" ۔۔۔ فاطمہ نے کہا۔

"کیوں نہیں!" ۔۔۔ احتشام نے اسے اپنے اور زیادہ قریب کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ "دل کی بات صاف لفظوں میں کہہ دو گی تو یہ مجھ پر احسان ہو گا"۔

"ایسی صورت پیدا کریں کہ سلطان نظام الملک کی جگہ میرے بھائی کو وزیراعظم مقرر کر دے" ۔۔۔ فاطمہ نے کہا ۔۔۔ "اگر ایسا ہو جائے تو میں اسی روز آپ کو اپنا خاوند تسلیم کر لوں گی"۔

"ایسا ہو کر رہے گا" ۔۔۔ احتشام نے کہا ۔۔۔ "لیکن کچھ وقت چاہئے۔ کسی کے دماغ کو ایک دو دنوں میں بدلا نہیں جا سکتا پھر بھی میں سلطان کو نظام الملک کے خلاف کر دوں

۴-

کیا احتشام مدنی جس کی عمر پینتیس چالیس سال کے درمیان تھی اور جو ایک اتنی بڑی سلطنت کے سلطان کا مشیرِ خاص تھا' اتنا سیدھا اور کم فہم تھا کہ ایک جواں سال لڑکی کے ہاتھوں اُلّو بن گیا تھا؟

وہ سیدھا تھا نہ کم فہم۔ وہ ذہنی طور پر بالغ آدمی تھا۔ سلطنت کے انتظامی امور کا خصوصی تجربہ رکھتا تھا۔ فنِ حرب و ضرب کی بھی سُوجھ بُوجھ تھی لیکن وہ انسان تھا' مرد تھا اور ہر مرد کی طرح عورت اس کی فطری کمزوری تھی۔ فاطمہ کوئی عام سی عورت نہیں بلکہ حسین و جمیل لڑکی تھی۔ اپنے حسن کے استعمال کی اسے تربیت دی گئی تھی۔ اسے بڑی ہی خرانٹ اور عمر رسیدہ عورتوں نے عملاً بتایا تھا کہ آدمی پر کس طرح حسن کا طلسم طاری کیا جاتا ہے۔

اس معاشرے میں جس میں مرد دو دو' تین تین اور چار چار بیویوں سے بھی مطمئن نہیں ہوتے تھے' احتشام کا ایک حسین لڑکی کے نشے میں مبتلا ہو جانا کوئی عجوبہ نہیں تھا۔

ایک تو اس لڑکی کا حسن اور اس کے خصوصی انداز تھے جنہوں نے احتشام کی عقل پر پردہ ڈال دیا' دوسرے وہ خوشبو تھی جو حسن بن صباح نے اس لڑکی کو اپنے کپڑوں اور بالوں پر لگانے کے لئے دی تھی۔ اس خوشبو نے احتشام کی سوچنے کی صلاحیت کو سُلا دیا تھا۔ احتشام کو محسوس ہی نہ ہُوا کہ وہ اپنے گھر اپنی دو بیویوں کے پاس پہنچ چکا ہے۔ اُس پر فاطمہ نشے کی طرح طاری تھی۔

○

یہ سلسلہ کچھ دن اسی طرح چلا کہ فاطمہ اور احتشام مدنی کی ملاقاتیں اسی باغ میں اسی جگہ ہوتیں۔ ہر ملاقات میں فاطمہ احتشام کی آغوش اور بازوؤں میں ہوتے ہوئے بھی اس سے بہت ہی دُور ہوتی۔ فاطمہ کی خوشبو احتشام کو مسحور کر لیتی اور وہ ایسی باتیں کرتا جیسے وہ ہوش و حواس میں نہ ہو یا نشے میں ہو۔

حسن بن صباح کی ہدایت کے مطابق فاطمہ احتشام کے لئے بڑا ہی حسین اور دلکش سراب بنی رہی۔

احتشام مدنی کو جب موقع ملتا' سلطان کے پاس جا بیٹھتا اور نظام الملک کے خلاف ایک دو باتیں کر کے حسن بن صباح کی تعریف کر دیتا۔

اس دوران ایک روز حسن بن صباح کے پاس خلجان سے ایک آدمی آیا۔ وہ احمد بن غطاش کا قاصد تھا۔

"قلعہ دار احمد بن غطاش نے پوچھا ہے کہ یہاں کے حالات کیا ہیں" — قاصد نے کہا — "کیا ہم اُس مقصد میں کامیاب ہو سکیں گے جس کے لئے آپ کو یہاں بھیجا گیا ہے؟"

"میں تحریری جواب نہیں دے سکتا" — حسن بن صباح نے کہا — "میرے مرشد احمد بن غطاش جانتے ہیں کہ ایسی باتیں تحریر میں نہیں لائی جا سکتیں۔ انہیں میرا سلام کہنا۔ پھر کہنا کہ آپ کا یہ ناچیز شاگرد کبھی ناکام نہیں ہوا' ہر مشکل سے بخیر و خوبی نکلا ہے اور اسے پوری امید ہے کہ وہ یہ مہم بھی سر کر لے گا۔ انہیں بتانا کہ آپ نے جو چیز میرے ساتھ بھیجی ہے اس نے بڑی کامیابی سے اپنا راستہ بنا لیا ہے۔ میری بات سلطان تک پہنچ گئی ہے اور باقاعدگی سے پہنچائی جا رہی ہے۔ اب میں عملی طور پر کچھ کروں گا... اب تم جاؤ کہ وہاں خلجان میں کیا ہو رہا ہے"۔

"وہاں اتنی زیادہ کامیابی حاصل ہو رہی ہے کہ اتنی متوقع نہیں تھی" — قاصد نے کہا — "لوگ ابھی تک خدا کے ایلچی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ خدا کا ایلچی لوگوں کو خدا کا پیغام اور اپنا دیدار دے کر واپس چلا گیا ہے۔ اور کسی روز اچانک واپس آئے گا۔ احمد بن غطاش نے کسانوں کے محصولات اور مالیہ وغیرہ بہت کم کر دیا ہے جس سے لوگ بہت خوش ہیں۔ وہ احمد بن غطاش کو خدا کے ایلچی کا خاص مرید اور نمائندہ سمجھتے ہیں۔ وہ جدھر جاتا ہے' لوگ اسے رکوع کی حالت میں جا کر سلام کرتے ہیں"۔

"میرے پیر استاد احمد بن غطاش خود دانش مند ہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "پھر بھی انہیں میری طرف سے کہہ دینا کہ ابھی اسلام اور اہلِ سنت کے خلاف کوئی بات نہ کریں' اور یہ بھی کہنا کہ ایک لشکر تیار کرنا شروع کر دیں جو تنخواہ دار نہیں ہو گا بلکہ ضرورت کے وقت اسے استعمال کیا جائے گا"۔

"یہ کام شروع ہو چکا ہے" — قاصد نے کہا — "لوگوں میں گھوڑ سواری' تیغ زنی اور تیر اندازی کا شوق پیدا کیا جا رہا ہے۔ عنقریب مقابلے منعقد کئے جائیں گے...... محترم قلعہ دار نے آخری بات یہ کہی ہے کہ آپ اگر یہاں کامیاب نہ ہو سکے اور کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ہمیں اطلاع دینا۔ ہم نظام الملک کو قتل کروانے کا انتظام کر

لیں گے یا اسے اغوا کر کے غائب کر دیں گے اور یہ ظاہر کریں گے کہ وہ خود ہی کہیں روپوش ہو گیا ہے"۔

"ابھی ایسی کوئی ضرورت نہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے امید ہے کہ میں مطلوبہ کامیابی حاصل کر لوں گا"۔

حسن بن صباح نے قاصد کو رخصت کر دیا۔

داستان گو سنا چکا ہے کہ حسن بن صباح نے جب ایسی سرگرمیاں شروع کی تھیں تو یوں پتہ چلتا تھا جیسے یہ شخص اور اس کا استاد اسماعیلی فرقے کے پیروکار ہیں اور اس فرقے اور مکتبۂ فکر کی تبلیغ کر کے اسلام کے دوسرے فرقوں خصوصاً "سنی عقیدے" کو ختم کر دیں گے لیکن آگے چل کر تاریخ صاف گواہی دیتی ہے کہ یہ فرقہ باطنیہ کے لوگ تھے اور یہ اپنا ہی کوئی عقیدہ پھیلا رہے تھے۔ چونکہ ان کے پاس اللہ کی اتاری ہوئی کوئی کتاب تو تھی نہیں نہ ان کی کوئی علمی' عقلی یا دینی بنیاد تھی اس لئے وہ فریب کاری اور قتل کا سہارا لے رہے تھے۔ یہ بھی پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ لوگ انسانی فطرت کی کمزوریوں کو ماہرانہ طریقے سے استعمال کر رہے تھے۔

○

تاریخوں میں دو اہم واقعات ملتے ہیں جن میں حسن بن صباح کو موقع ملتا ہے کہ وہ کھلم کھلا نظام الملک کو نالائق ثابت کرے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ خود بڑا ہی دانشمند ہے۔ ایک واقعہ "تقریباً" ہر مورخ نے لکھا ہے جو یوں ہے کہ ایک بار سلطان ملک شاہ حلب گیا۔ وہاں ایک خاص قسم کا پتھر پایا جاتا تھا جو سنگِ رخام کہلاتا تھا۔ اس پتھر سے برتن اور گلدان وغیرہ بنائے جاتے تھے۔ سلطان نے حکم دیا کہ پانچ سو من سنگِ رخام اصفہان پہنچایا جائے۔

یہ ذہن میں رکھیں کہ اُس زمانے میں اس علاقے کا من چالیس تولے اور آٹھ ماشے ہوتا تھا۔

دو عربی شتربان اصفہان جا رہے تھے۔ ایک کے چھ اور دوسرے کے چار اونٹ تھے۔ ان دونوں کے اونٹوں پر پہلے ہی پانچسو من سامان لدا ہوا تھا۔ انہوں نے پانچسو من سنگِ رخام بھی آپس میں تقسیم کر کے اونٹوں پر لاد لیا۔ اگر خالی اونٹ تلاش کئے جاتے تو کئی دن گزر جاتے۔ اتفاق سے یہ دو شتربان اصفہان کو ہی جا رہے تھے۔

سلطان واپس اپنے دارالحکومت میں پہنچ گیا۔ اُسے اطلاع ملی کہ سنگِ رخام پہنچ گیا ہے تو وہ حیران ہُوا اور خوش بھی کہ اس کے حکم کی تعمیل اتنی جلدی ہو گئی ہے۔ اُس نے حکم دیا کہ ان شتربانوں کو ایک ہزار دینار انعام کے طور پر دے دیئے جائیں۔

"خواجہ طوسی!" ——— سلطان نے نظام الملک سے کہا ——— "یہ رقم ان دونوں میں تقسیم کر دو"۔

نظام الملک نے چھ اونٹوں والے شتربان کو چھ سو اور چار اونٹوں والے کو چار سو دینار ادا کر دیئے۔

"یہ تقسیم غلط ہے" ——— حسن بن صباح جو وہاں موجود تھا' بول پڑا ——— "وزیرِاعظم کو سوچ سمجھ کر یہ رقم تقسیم کرنی چاہئے"۔

"تم اس غلطی کو صحیح کر دو حسن!" ——— سلطان نے کہا ——— "لیکن یہ بتا دو کہ اس تقسیم میں وزیرِاعظم نے کیا غلطی کی ہے؟"

"چھ اونٹوں والے شتربان کی حق تلفی ہوئی ہے" ——— حسن بن صباح نے کہا ——— "چھ اونٹوں والے کو آٹھ سو اور چار اونٹوں والے کو دو سو دینار ملنے چاہئیں"۔

"وہ کیسے؟" ——— سلطان نے پوچھا۔

"سلطانِ محترم!" ——— حسن بن صباح نے کہا ——— "غور فرمائیں' اونٹ دس ہیں اور وزن پندرہ سو من' اس لئے ہر اونٹ نے ڈیڑھ ڈیڑھ سو من وزن اٹھایا۔ جس کے چھ اونٹ ہیں وہ نو سو من وزن لایا ہے۔ وہ اس طرح کہ پانچسو من سامان اس کے اونٹوں نے پہلے ہی اٹھا رکھا تھا پھر چار سو من سنگِ رخام اس کے اونٹوں پر لادا گیا۔ دوسرے شتربان کے چار اونٹ تھے۔ اس کے اونٹوں پر چھ سو من وزن تھا جس میں سے پانچسو من پہلے ہی اونٹوں پر لدا ہُوا تھا اور ایک سو من سنگِ رخام اس کے اونٹوں پر لادا گیا۔ آپ نے ایک ہزار دینار پانچ سو من وزن کے لئے دیا ہے۔ حساب یہ بنا کہ دو سو دینار فی سو من کا انعام ہُوا۔ اس حساب سے چھ اونٹوں والے کو آٹھ سو دینار اور چار اونٹوں والے کو دو سو دینار ملنے چاہئیں..... یہ ہے ہمارے محترم وزیرِاعظم کی غلطی"۔

تاریخوں میں لکھا ہے کہ سلطان ملک شاہ نظام الملک کا بہت احترام کرتا تھا اور اُس کی قابلیت سے متاثر تھا۔ وہ حسن بن صباح کا حساب سمجھ گیا لیکن وہ نظام الملک کو شرمسار کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ اُس نے حسن بن صباح کا حساب ہنسی مذاق میں ٹال دیا

لیکن نظام الملک پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔ اُسے پہلی بار محسوس ہُوا کہ حسن بن صباح اُسے اور اُس کی حیثیت کو نقصان پہنچانے پر اُتر آیا ہے۔

اس سے پہلے نظام الملک کو اس کے کارندوں نے کچھ اس قسم کی اطلاعیں دی تھیں کہ حسن بن صباح اور احتشام مدنی اکثر راز و نیاز کی باتیں کرتے دیکھے جاتے ہیں۔ اسے ایک اطلاع یہ بھی ملی تھی کہ احتشام مدنی کو باغ میں حسن بن صباح کی بہن کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ تاریخوں کے مطابق' نظام الملک شریف النفس اور بڑے اونچے کردار کا آدمی تھا۔ یہ خبریں سن کر بھی اس کے دل میں حسن بن صباح کے خلاف شک پیدا نہ ہُوا۔ وہ کہتا تھا کہ اس نے حسن بن صباح کو جو رتبہ دلایا ہے' یہ ایسا احسان ہے جسے حسن بن صباح کبھی نہیں بھولے گا اور اسے گزند نہیں پہنچائے گا۔

○

نظام الملک اپنی فطرت کے مطابق مطمئن رہا لیکن حسن بن صباح اپنی فطرت کے مطابق نظام الملک کو ذلیل و خوار کرنے کے موقع کی تلاش میں رہا۔ حسن بن صباح کے سامنے صرف یہ مقصد تھا کہ وہ وزیرِاعظم بن جائے۔ اس کے بعد ان باطنیوں نے خفیہ قتل و غارت کا سلسلہ شروع کر کے سلجوقی سلطنت پر قبضہ کرنا تھا۔

حسن بن صباح کو ایک موقع مل ہی گیا جو اُس نے خود پیدا کیا تھا۔ وہ اس طرح کہ ایک روز سلطنت کے کچھ حاکم بیٹھے آپس میں تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔ کسی نے کہہ دیا کہ سلطان ملک شاہ عرصہ بیس سال سے سلطان ہے۔ اسے کچھ پتہ نہیں کہ اس عرصے میں رعایا سے محصولات وغیرہ کے ذریعے کتنی رقم وصول کی گئی ہے اور یہ رقم کہاں کہاں خرچ ہوئی ہے۔

"کون کہتا ہے کہ ساری رقم خرچ ہوئی ہے!" ——— حسن بن صباح نے کہا ——— "میں کہتا ہوں کہ اس میں سے بہت سی رقم خورد بُرد اور غبن ہوئی ہے۔ اگر سلطان مجھے اجازت اور سہولت مہیا کرے تو میں بیس سال کا حساب کتاب تیار کر کے سلطان کے آگے رکھ دوں گا"۔

احتشام مدنی بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے سلطان کو بتایا کہ حسن بن صباح نے بڑی عقل مندی کی بات کی ہے۔ احتشام نے سلطان کو پوری بات سنائی جو حاکموں کی اس محفل میں ہوئی تھی۔ احتشام نے خصوصی مشیر کی حیثیت سے سلطان کو مشورہ دیا کہ بیس

برسوں کا حساب ہونا چاہئے۔

"اس سے ہمیں کیا حاصل ہو گا؟" — سلطان نے پوچھا۔

"اگر کچھ رقم خورد بُرد ہوئی ہے تو وہ واپس نہیں ملے گی" — احتشام نے کہا۔

"حاصل یہ ہو گا کہ یہ پتہ چل جائے گا کہ ہمارے حکام میں بددیانت کون کون ہیں"۔

سلطان اور احتشام میں اس مسئلے پر کچھ دیر تبادلۂ خیالات ہُوا۔ احتشام نے سلطان کو قائل کر لیا کہ گذشتہ بیس برسوں کا حساب ہونا چاہئے۔ سلطان اپنے وزیرِاعظم نظام الملک کے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا کرتا تھا۔ اس نے نظام الملک کو بلایا اور یہ نیا مسئلہ اس کے آگے رکھا۔

"بیس سالوں کا حساب کتاب کتنے دنوں میں تیار ہو سکتا ہے؟" — سلطان نے نظام الملک سے پوچھا۔

"دنوں میں؟" — نظام الملک نے حیرت زدگی کے عالم میں جواب دیا — "برسوں کی بات کریں۔ پہلے اپنی سلطنت کی وسعت دیکھیں پھر بیس برسوں کے عرصے پر غور کریں، پھر دیکھیں کہ وہ جگہیں کتنی ہیں جہاں محصولات وصول کر کے سرکاری خزانے میں جمع کرائے جاتے ہیں۔ اگر حساب تیار کرنا ہی ہے، تو اس کے لئے مجھے دو سال چاہئیں"۔

اُس وقت احتشام مدنی اور حسن بن صباح بھی وہاں موجود تھے۔

"سلطانِ معظم!" — حسن بن صباح نے کہا — "میں حیران ہوں کہ محترم وزیرِاعظم نے دو سال کا عرصہ مانگا ہے۔ میں صرف چالیس دنوں میں یہ حساب بنا کر دے سکتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ میں جتنا عملہ مانگوں وہ مجھے دیا جائے اور ہر سہولت مہیا کی جائے"۔

سلطان ملک شاہ نے احکام جاری کر دیئے اور حسن بن صباح نے کام شروع کر دیا۔

تاریخ دان ابوالقاسم رفیق دلاوری نے مختلف مؤرخوں کے حوالوں سے لکھا ہے کہ خواجہ حسن طوسی نظام الملک عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ کبھی وہ پریشان ہو جاتا کہ حسن بن صباح نے یہ کام چالیس دنوں میں مکمل کر لیا تو وہ سلطان کی نظروں میں گر جائے گا اور کوئی بعید نہیں کہ سلطان اسے وزارتِ عظمیٰ سے معزول ہی کر دے، اور کبھی نظام الملک یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا کہ حسن بن صباح یہ کام چالیس دنوں میں تو دور کی بات

ہے، چالیس مہینوں میں بھی نہیں کر سکے گا اور خود ہی سلطان کی نظروں میں ذلیل ہو گا۔

البتہ ایک دکھ تھا جو نظام الملک کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ یہ دکھ حسن بن صباح کی احسان فراموشی کا تھا۔ اب تو تصدیق ہو گئی تھی کہ حسن بن صباح اسے معزول کرا کے خود وزیرِاعظم بننا چاہتا ہے۔

○

پھر حسن بن صباح نے معجزہ کر کے دکھا دیا۔ اس نے کاغذات کا ایک انبار سلطان ملک شاہ کے آگے رکھ دیا۔

"سلطانِ عالی مقام!" — حسن نے سلطان سے کہا — "میں نے چالیس دن مانگے تھے۔ آج اکتالیسواں دن ہے۔ یہ رہا بیس برسوں کا حساب۔ کیا وہ شخص وزیرِاعظم بننے کا حق رکھتا ہے جو کہتا ہے کہ یہ حساب مکمل کرنے کے لئے دو برس درکار ہیں؟..... اگر سلطانِ معظم کے دل پہ گراں نہ گذرے تو میں وثوق سے کہتا ہوں کہ وزیرِاعظم حسن طوسی جسے آپ نے نظام الملک کا خطاب دے رکھا ہے، محصولات کی رقمیں غبن کرتا رہا ہے۔ اپنی لُوٹ کھسوٹ پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ آپ کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ حساب تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ہو گا تو دو سال لگیں گے"۔

سلطان نے نظام الملک اور احتشام مدنی کو بلا لیا۔

"خواجہ طوسی!" — سلطان نے نظام الملک سے کہا — "یہ ہے وہ حساب جو آپ دو سالوں سے کم عرصے میں نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دیکھیں۔ حسن چالیس دنوں میں کر لایا ہے"۔

نظام الملک پر خاموشی طاری ہو گئی۔ اُس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ وہاں بیٹھ گیا اور معزولی کے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

سلطان نے کاغذات کی ورق گردانی شروع کر دی، اور ایک ورق پر رک گیا۔

"حسن!" — سلطان نے کہا — "اس ورق پر آمدنی اور اخراجات مشکوک سے نظر آتے ہیں۔ یہ مجھے سمجھا دو"۔

حسن بن صباح بغلیں جھانکنے لگا۔

سلطان نے ایک اور ورق پر رک کر کچھ پوچھا۔ حسن نے اس کا بھی جواب نہ دیا۔ سلطان نے کئی اور وضاحتیں پوچھیں۔ حسن کسی ایک بھی سوال کا جواب نہ دے سکا۔

"تم نے یہ اتنا لمبا چوڑا حساب تیار کیا ہے؟" ——سلطان نے کہا ——"لیکن تمہیں بھی معلوم نہیں کہ یہ کیا ہے"۔

"سلطانِ معظم!" ——نظام الملک بولا ——"میں نے ویسے ہی نہیں کہہ دیا تھا کہ اتنی وسیع و عریض سلطنت کے بیس برسوں کے اخراجات اور آمدنی کے گوشوارے تیار کرنے کے لئے کم از کم دو برس درکار ہیں"۔

"آپ میرے پاس رہیں حسن طوسی!" ——سلطان نے نظام الملک سے کہا ——"تم دونوں جاؤ۔ میں یہ تمام اعداد و شمار دیکھ کر تمہیں بلاؤں گا" ——ان کے جانے کے بعد سلطان نے پوچھا ——"یہ سب کیا ہے حسن طوسی؟ مجھے شک ہے کہ مجھے دھوکہ دیا گیا ہے"۔

"سلطانِ معظم!" ——نظام الملک نے کہا ——"یہ میرا ایمان ہے کہ کسی کو میرے ہاتھ سے نقصان نہ پہنچے لیکن جہاں میری اپنی حیثیت اور میرا اعتماد خطرے میں پڑ گیا ہے' میں حقیقت سے پردہ اٹھانا ضروری سمجھتا ہوں...... یہ حساب کتاب تیار کرنے میں آپ کے مشیرِ خاص احتشام مدنی کا ہاتھ زیادہ ہے۔ حسن بن صباح کے ساتھ اس کی ایک جوان سال بہن رہتی ہے جو اسی عمر میں بیوہ ہو گئی ہے۔ مجھے اطلاعیں ملی ہیں کہ احتشام اور اس لڑکی کو شام کے بعد باغ میں دیکھا گیا ہے اور یہ بھی کہ احتشام حسن بن صباح کے گھر زیادہ جاتا اور خاصا وقت وہاں گزارتا ہے...... جہاں تک مجھے یاد آتا ہے' حسن بن صباح کی کوئی بہن نہیں۔ میں اس کے خاندان کو مدرسے کے زمانے سے جانتا ہوں"۔

"طوسی!" ——سلطان نے کہا ——"میں یہ ساری سازش سمجھ گیا ہوں۔ کچھ عرصے سے احتشام میرے پاس بیٹھ کر حسن بن صباح کی تعریفیں کر رہا ہے' اور یہ شخص ذرا دبی زبان میں آپ کے خلاف بھی ایک آدھ بات کہہ جاتا ہے" ——سلطان بولتے بولتے گہری سوچ میں چلا گیا۔ ذرا دیر بعد سر اٹھایا اور بولا ——"آپ حسن پر ایسا تاثر پیدا کریں کہ میں نے اس کا تیار کیا ہوا حساب سمجھ لیا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے...... باقی کام مجھ پر چھوڑ دیں۔ میرے سامنے کوئی اور ہی عکس آ رہا ہے"۔

داستان گو پہلے سنا چکا ہے کہ سلجوقی جو ترک تھے اور جو اسلام کے دشمن ہوا کرتے تھے' مسلمان ہوئے تو اسلام کے شیدائی اور سرفروش بن گئے۔ وہ جنگجو تھے اور فہم و فراست کے لحاظ سے اتنے باریک بیں کہ ان کی نظریں جیسے پردوں کے پیچھے بھی دیکھ

سکتی ہوں۔ ان کے سلطان اپنی سلطنت میں کسی کی حق تلفی اور سلطنت کے امور میں کوتاہی اور بد دیانتی برداشت نہیں کرتے تھے"۔

نظام الملک باہر نکلا۔ حسن بن صباح اور احتشام مدنی باہر سر جوڑے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ نظام الملک کو دیکھ کر دونوں چونکے۔

"حسن مبارک ہو" ——نظام الملک نے کہا ——"تمہارا تیار کیا ہوا حساب بالکل ٹھیک ہے۔ تم جن سوالوں کے جواب نہیں دے سکے تھے' وہ میں نے دے دیئے ہیں۔ میں نے سلطان سے کہا ہے کہ حسن ابھی نیا ہے اس لئے اسے پچھلے امور وغیرہ کا علم نہیں...... سلطان تم پر بہت خوش ہیں۔ کہتے ہیں میں حسن کو انعام دوں گا"۔

"میں تمہارا یہ احسان ساری عمر نہیں بھولوں گا خواجہ!" ——حسن بن صباح نے نظام الملک سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا ——"تم نے میرا وقار محفوظ کر دیا ہے"۔

"تم دونوں چلے جاؤ" ——نظام الملک نے کہا ——"سلطان تمہیں کل بلائیں گے"۔

O

اُس رات احتشام اور فاطمہ کی ملاقات ایسی تھی جیسے وہ جشن منانے کے لئے اکٹھے ہوئے ہوں۔ گذرے ہوئے دنوں میں زیادہ تر باغ میں ملتے رہے تھے۔ تین مرتبہ وہ الگ الگ جنگل میں چلے گئے اور بہت وقت اکٹھے گذار کر آئے۔ فاطمہ یہ ظاہر کرتی تھی کہ وہ حسن سے چوری گھر سے نکلتی ہے۔ احتشام کو معلوم نہیں تھا کہ حسن خود اسے بھیجتا ہے۔

فاطمہ ابھی تک احتشام کے لئے سراب بنی ہوئی تھی۔ اس نے ابھی تک احتشام کے ساتھ شادی کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور انکار بھی نہیں کیا تھا۔ اُس نے ایسا والہانہ انداز اختیار کر لیا تھا جس سے احتشام پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی وہ تو اب حسن بن صباح اور فاطمہ کے اشاروں پر ناچنے لگا تھا۔ حسن بن صباح سے اُس نے کہا تھا کہ وہ اسے وزیرِ اعظم بنا کر دم لے گا۔

جس روز نظام الملک نے حسن بن صباح کو یہ خوشخبری سنائی اُس روز احتشام مدنی نے اپنے گھر کے قریب ہی چھوٹا سا ایک مکان جو خالی پڑا تھا' صاف کروا لیا اور ایک کمرے میں پلنگ اور نرم و گداز بستر بچھوا دیا تھا۔ اپنی خاص ملازمہ کے ذریعے اُس نے

فاطمہ کو پیغام بھیج دیا تھا کہ رات وہ فلاں طرف سے اس مکان میں آجائے۔

فاطمہ وہاں پہنچ گئی۔ اختشام پہلے ہی وہاں موجود تھا۔

"میرا ایک کمال دیکھ لیا فاطمہ؟" ـــ اختشام نے فاطمہ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے ہوئے کہا ـــ "جعلی حساب کتاب لکھ کر سلطان سے منوالیا ہے کہ یہ حساب بالکل صحیح ہے"۔

"آپ کو مبارک ہو" ـــ فاطمہ نے اپنے گال اختشام کے سینے سے رگڑتے ہوئے کہا ـــ "اب میرے بھائی کو وزیرِ اعظم بنوادیں"۔

"اب یہ کام آسان ہو گیا ہے" ـــ اختشام نے کہا ـــ "کل سلطان ہمیں بلائے گا۔ میں نظام الملک کے خلاف اُس کے ایسے کان بھروں گا کہ وہ اُسی وقت اسے معزول کر دے گا"۔

اختشام نے فاطمہ کو پلنگ پر بٹھالیا۔

"سلطان کل حسن کو انعام دے رہا ہے" ـــ اختشام نے کہا ـــ "میں نے آج تم سے انعام لینا ہے"۔

فاطمہ نے جھینپنے اور شرمانے کی ایسی اداکاری کی کہ اختشام نشے کی سی کیفیت میں بدمست ہو گیا۔ اُس نے فاطمہ کو لٹا دیا۔

"روحانی طور پر تو ہم میاں بیوی بن چکے ہیں" ـــ اختشام نے کہا ـــ "نکاح تو ایک رسم ہے۔ یہ بعد میں بھی ادا ہو سکتی ہے"۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ زنجیر چڑھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی کیونکہ باہر کا دروازہ بند تھا۔ مکان کا صحن کشادہ تھا۔ اختشام مدنی جب فاطمہ کے طلسماتی حسن' ناز و انداز اور دکھاوے کے شرم و حجاب میں مدہوش ہو چکا تھا' فاطمہ چونکی۔

"ذرا ٹھہریں" ـــ فاطمہ نے کہا ـــ "میں نے قدموں کی آہٹ سنی ہے"۔

"بلی ہو گی" ـــ اختشام نے نشے سے لڑکھڑاتی آواز میں کہا ـــ "کسی انسان میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ اس گھر میں قدم رکھے"۔

چار آدمی اس گھر میں قدم رکھ چکے تھے۔ وہ چھت کی طرف سے آئے تھے اور سیڑھیاں اُتر کر صحن میں آگئے تھے۔ فاطمہ نے ایک بار پھر اختشام کو پرے ہٹنے کو کہا' اسے ہلکا سا دھکا بھی دیا لیکن اختشام پر بدمستی طاری تھی

کمرے کا دروازہ کھلا۔ اختشام نے اُدھر دیکھا۔ دو آدمی اندر آئے۔ اختشام ان دونوں کو جانتا تھا۔ یہ دونوں کوتوال کے ماتحت تھے۔ ان کے پیچھے دو آدمی تھے۔ وہ بھی کوتوال کے کارندے تھے۔

"نکل جاؤ یہاں سے!" ـــ اختشام مدنی نے سلطان کے مشیرِ خاص کی حیثیت سے حکم کے لہجے میں کہا ـــ "تمہیں میرے گھر میں آنے کی جرأت کیسے ہوئی!"

"ہم سلطان کے حکم سے آئے ہیں عالی جاہ!" ـــ ایک نے کہا ـــ "آپ کو اور اس لڑکی کو سلطان کے پاس لے جانا ہے"۔

"چلو' تم نکلو یہاں سے!" ـــ اختشام نے کہا ـــ "میں تیار ہو کر آتا ہوں"۔

"آپ خود نہیں جائیں گے عالی جاہ!" ـــ کوتوال کے آدمی نے کہا ـــ "ہم آپ کو لے جائیں گے..... اس لڑکی کو بھی!"

"تیار ہونے کی ضرورت نہیں عالی جاہ!" ـــ دوسرا آدمی بولا ـــ "ہمیں حکم ملا ہے کہ آپ اور یہ لڑکی جس حالت میں ہوں اسی حالت میں ساتھ لے آنا ہے"۔

وہ دونوں نیم برہنہ حالت میں تھے۔ اختشام پر دو نشے طاری تھے۔ ایک اپنی سرکاری حیثیت کا۔ وہ سلطان کا مشیرِ خصوصی تھا' اور دوسرا نشہ فاطمہ کے حسن و شباب کا اور نفسانی جذبات کے اُبال کا تھا۔ یہ سب نشے ایک ہی بار ہوا ہو گئے۔

"منہ مانگا انعام دوں گا" ـــ اختشام نے کہا ـــ "چاروں کو..... جا کر سلطان سے کہہ دو کہ تم نے مجھے اور اس لڑکی کو کہیں بھی نہیں دیکھا"۔

فاطمہ کپڑے پہننے لگی تھی۔

"اس لڑکی کو پکڑ کر باہر لے چلو" ـــ اُس آدمی نے اختشام کی پیشکش کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے آدمیوں کو حکم دیا ـــ "اسی حالت میں گھسیٹ کر باہر لے جاؤ"۔

"میرے عہدے اور رتبے سے تم واقف ہو" ـــ اختشام مدنی نے کہا ـــ "میں تمہیں اتنی ترقی دلواؤں گا کہ حاکم بن جاؤ گے"۔

"مجھے چاہتے ہو تو حاضر ہوں" ـــ فاطمہ بولی۔

"ہاں بھائیو!" ـــ اختشام نے بڑے خوشگوار لہجے میں کہا ـــ "دیکھو کتنی خوبصورت لڑکی ہے"۔

"سلطان کے حکم کی تعمیل کرو" ـــ کوتوال کے آدمی نے کہا ـــ "انہیں پکڑو اور

لے چاؤ" ـــــ وہ احتشام سے مخاطب ہُوا ـــــ "عالی جاہ! ہمیں حکم ملا ہے کہ آپ اگر مزاحمت کریں تو آپ کے سر پر ضرب لگا کر بیہوش کر دیا جائے اور اٹھا کر زندان میں پھینک دیا جائے"۔

احتشام مدنی سر جھکائے ہوئے چل پڑا۔ دو آدمی پہلے ہی فاطمہ کو گھسیٹتے دھکیلتے باہر لے گئے تھے۔ اُس کے لئے نیم برہنگی یا مکمل برہنگی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ آبرو باختہ اور تربیت یافتہ لڑکی تھی۔

ان دونوں کو کوتوالی میں لے گئے اور انہیں الگ الگ کمرے میں بند کر دیا گیا۔

○

سلطان کا اپنا جاسوسی اور مخبری کا نظام تھا۔ اسے احتشام مدنی اور فاطمہ کی خفیہ ملاقاتوں کی اطلاعیں ملی تھیں لیکن یہ کوئی اہم یا نازک خبر نہیں تھی۔ یہ احتشام کا ذاتی معاملہ تھا۔ سلطان کو اس صورت میں ان دونوں کی ملاقاتوں میں خطرہ محسوس ہوتا کہ لڑکی مشکوک اور مشتبہ ہوتی۔ شک یہ ہوتا کہ یہ لڑکی عیسائی یا یہودی ہے اور جاسوس ہے۔ یہ پتہ چل گیا تھا کہ یہ معتمدِ خاص حسن بن صباح کی بہن ہے۔

درمیان میں معاملہ بیس برسوں کے حساب کتاب کا آ گیا تو پتہ چلا کہ حسن بن صباح اور احتشام مدنی نے سلطان کو دھوکہ دیا ہے۔ نظام الملک اور سلطان ملک شاہ کی آپس میں باتیں ہوئیں تو نئے شکوک پیدا ہو گئے۔ سلطان ملک شاہ عقل و دانش والا آدمی تھا۔ نظام الملک نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ حسن بن صباح کی کوئی بہن ہے ہی نہیں۔

سلطان نے نظام الملک سے کہا کہ وہ حسن بن صباح کو خوشخبری سنا دے کہ اُس نے بیس برسوں کا آمدنی اور اخراجات کا جو حساب تیار کیا ہے' وہ سلطان نے منظور کر کے اسے بالکل صحیح تسلیم کر لیا ہے۔ اس سے سلطان کا مقصد یہ تھا کہ حسن بن صباح اور احتشام مدنی بے فکر اور مطمئن ہو جائیں۔

سلطان نے اُسی وقت کوتوال کو بلایا اور اسے یہ ساری صورتِ حال بتا کر کہا کہ احتشام اور اس لڑکی کو اکٹھے پکڑنا ہے۔

"ابھی جا کر مخبر مقرر کر دو" ـــــ سلطان نے کہا ـــــ "وہ شام کے بعد ملتے ہیں۔ ایک آدمی احتشام کی نگرانی کرے اور ایک آدمی اس لڑکی کو دیکھتا رہے۔ یہ کہیں باہر اکٹھے ہوں تو احتشام کے رتبے کا خیال کئے بغیر دونوں کو کوتوالی میں بند کر دو۔ انہیں اسی حالت میں لانا ہے جس حالت میں پائے جائیں۔ ضروری نہیں کہ یہ آج ہی مل جائیں گے۔ کل ملیں' پرسوں ملیں' دس دنوں بعد ملیں' انہیں چھوڑنا نہیں"۔

کوتوال یہ ساری کارروائی اور اس کا پس منظر سمجھ گیا۔ اس نے اُسی وقت چار آدمی اس کام پر لگا دیئے۔ انہیں ضروری ہدایات اور احکام دے کر رخصت کر دیا۔

ایسی توقع نہیں تھی کہ وہ اُسی رات پکڑے جائیں گے لیکن احتشام مدنی نے اُس رات فاطمہ سے انعام وصول کرنا تھا۔ اُس نے فاطمہ کے بھائی حسن کی مدد کی تھی اور سلطان کو بڑی کامیابی سے دھوکا دیا گیا تھا۔

سورج غروب ہوتے ہی کوتوال کے دو آدمی بھیس بدل کر چلے گئے۔ ایک احتشام کے گھر کو دُور سے دیکھتا رہا اور دوسرا حسن بن صباح کے گھر کی نگرانی کرتا رہا۔ ان دونوں کے ساتھ ایک ایک اور آدمی تھا۔ یہ دونوں دور دور کھڑے تھے۔ پہلے احتشام گھر سے نکلا اور اُس مکان میں چلا گیا جو اُس نے اُس رات کے جشن کے لئے تیار کیا تھا۔ اُس کی نگرانی والا آدمی چھپ کر کھڑا رہا۔

پھر فاطمہ گھر سے نکلی۔ اُس کی نگرانی والا آدمی اُس کے پیچھے چل پڑا۔ فاطمہ بھی اسی مکان میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔ کوتوال کے دونوں مخبر آپس میں مل گئے۔ انہوں نے اپنے دوسرے دونوں ساتھیوں کو بھی بلا لیا۔ ان میں ایک عہدیدار تھا۔ انہوں نے کچھ وقت انتظار کیا پھر ساتھ والے گھر کے بڑے آدمی کو باہر بلا کر بتایا کہ وہ کوتوالی کے آدمی ہیں اور اس ساتھ والے گھر میں اترنا ہے۔

"آ جائیں" ـــــ اُس آدمی نے کہا ـــــ "میری چھت سے اس چھت پر چلے جائیں۔ میں آپ کو بتاؤں گا اس مکان کی سیڑھیاں کہاں ہیں"۔

چار آدمی اس شخص کی راہنمائی میں اس مکان میں اتر گئے جس کے ایک کمرے میں احتشام مدنی اور فاطمہ جشن منا رہے تھے۔

○

رات کوئی زیادہ نہیں گذری تھی۔ کوتوال کو اطلاع دی گئی کہ دونوں جس حالت میں تھے اُسی حالت میں پکڑ لائے ہیں۔ کوتوال کو سلطان نے کہا تھا کہ تحقیقات کر کے اسے بتائے کہ اس لڑکی کی حقیقت کیا ہے۔ کوتوال اُسی وقت کوتوالی پہنچا اور اُس کمرے میں چلا گیا جس میں لڑکی بند تھی۔

"نام کیا ہے لڑکی؟" — کوتوال نے پوچھا۔

"فاطمہ!" — لڑکی نے جواب دیا — "میں سلطان کے معتمدِ خاص حسن بن صباح کی بہن ہوں"۔

"ہمیں معلوم ہے حسن بن صباح کہاں کا رہنے والا ہے" — کوتوال نے کہا — "ہم وہاں سے معلوم کریں گے کہ اس کی کوئی بہن ہے بھی یا نہیں..... میری ایک بات سن لو۔ بہت ہی اذیت ناک موت مروگی۔ اپنے متعلق ہر بات سچ بتا دو"۔

"کیا آپ اس جسم کو اذیت دیں گے؟" — لڑکی نے جذبات کی حرارت سے کھلی ہوئی مسکراہٹ سے کہا — "ہاتھ لگا کر دیکھیں۔ گلاب کی پتیوں جیسی ملائمت ہے اس جسم کی!" — وہ نیم برہنہ تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو اور زیادہ برہنہ کر دیا۔ اُس کی مسکراہٹ اور زیادہ نشیلی ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں میں سفلی جذبات کا خمار تھا۔ کہنے لگی — "مرد اتنا زیادہ تو نہیں سوچا کرتے..... میرے قریب آجائیں"۔

اُس کے سر پر اوڑھنی نہیں تھی۔ اُس کے بال کھلے ہوئے تھے۔

"ان بالوں کو ہاتھ لگا کر دیکھیں" — اُس نے کہا — "ان پر ہاتھ پھیر کر دیکھیں۔ ریشم اور مخمل جیسے ملائم ہیں"۔

کوتوال آخر مرد تھا' فرشتہ نہیں تھا۔ اس لڑکی کے جسم اور بالوں کو دیکھ کر اُس کے جسم نے جھرجھری لی اور اُس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ آہستہ آہستہ لڑکی کی طرف بڑھا۔ اس کا دایاں ہاتھ اوپر اٹھ رہا تھا۔ قریب جا کر اس کا ہاتھ لڑکی کے سر پر چلا گیا اور اس کی انگلیاں لڑکی کے بالوں میں رینگنے لگیں۔ اس کا دوسرا ہاتھ لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ کوتوال فرائض کی دنیا سے ایک ہی اُڑان میں رومانوں کی کہکشاں میں جا پہنچا۔

"خدام!" — اُسے کسی کی آواز سنائی دی۔ کسی نے اُسے پکارا تھا۔

اُس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔

"ایک خیال رکھنا خدام!" — اسے کمرے میں وہی آواز پھر سنائی دی — "سنا ہے لڑکی بہت ہی حسین ہے۔ اگر تحقیقات تک نوبت آگئی تو یہ یاد رکھنا کہ تم کوتوال ہو..... یہ بھی یاد رکھنا کہ دھوکہ مجھے دیا گیا ہے۔ میں اس سلطنت کا سلطان ہوں۔ میں فرائض میں بددیانتی اور بدمعاشی برداشت نہیں کیا کرتا"۔

یہ الفاظ سلطان ملک شاہ کے تھے جو اُس نے احتشام مدنی اور لڑکی کو اکٹھے پکڑنے کی ہدایات دیتے ہوئے کہے تھے۔

کوتوال خدام کی انگلیاں لڑکی کے ریشم جیسے ملائم بالوں میں رینگ رہی تھیں اور لڑکی اس کے دوسرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں مسل رہی تھی۔ کوتوال کے ذہن میں سلطان ملک شاہ کے الفاظ ایسے گونجے جیسے سلطان اس بند کمرے میں کھڑا بول رہا ہو۔

کوتوال کی آنکھوں کے آگے بجلی سی چمکی پھر تاریکی آگئی۔ کوتوال کا وہی ہاتھ جو لڑکی کے نرم و ملائم بالوں میں رینگ رہا تھا' مٹھی بن گیا۔ اس مٹھی میں لڑکی کے بال تھے۔ کوتوال نے بالوں کو اتنی زور سے کھینچا کہ لڑکی کی چیخ نکل گئی۔ درد کی شدت سے اُس کا منہ کھل گیا۔

"سچ بتا تُو کون ہے!" — کوتوال نے بالوں کو مٹھی سے مروڑتے اور کھینچتے ہوئے کہا — "تیرے بال چھت کے ساتھ باندھ کر تجھے لٹکا دوں گا"۔

درد سے لڑکی کے دانت بجنے لگے۔ کوتوال نے لڑکی کو بالوں سے پکڑے ہوئے اوپر اٹھایا اور فرش پر پٹخ دیا۔

"مر جا یہاں!" — کوتوال نے کہا — "تیری کوئی نہیں سنے گا..... سچ بتا تُو کون ہے"۔

کوتوال کو اس پر بھی غصہ تھا کہ لڑکی نے اُسے بھٹکا دیا تھا۔ وہ بول نہیں رہی تھی۔ کوتوال نے اُس کے ایک ہاتھ کی انگلیاں ایک شکنجے میں جکڑ دیں اور شکنجے کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ لڑکی کی چیخوں سے چھت لرزتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ آخر لڑکی تھی' کہاں تک برداشت کرتی۔ اسے مردوں کو انگلیوں پر نچانے کی ٹریننگ دی گئی تھی' یہ تو اسے کسی نے بتایا ہی نہیں تھا کہ کبھی وہ پکڑی بھی جائے گی۔

اُس پر غشی طاری ہو رہی تھی' جب کوتوال نے اُس کی انگلیاں شکنجے سے نکال دیں۔ اُسے پانی پلایا لیکن وہ ابھی تک انکار کر رہی تھی۔ کوتوال نے اُس کا دوسرا ہاتھ شکنجے میں دینے کے لئے پکڑا تو وہ بلبلا اٹھی اور سچ بولنے پر آگئی۔ اُس نے بتا دیا کہ وہ حسن بن صباح کی بہن نہیں اور اسے وہ شاہ در سے لایا تھا۔

اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ حسن بن صباح اسے اس مقصد کے لئے ساتھ لایا تھا کہ ایسے حاکموں کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے جن کا سلطان پر اثر و رسوخ چلتا ہے۔ انہیں نظام الملک

کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ لڑکی نے بتایا کہ حسن بن صباح وزیراعظم بننا چاہتا ہے۔ لڑکی نے یہ بھی بتایا کہ احتشام مدنی کو اس نے کس طرح اپنے جال میں پھانسا تھا اور اسے شاہی کا لالچ دیئے رکھا تھا۔

"احتشام مدنی حسن بن صباح کی کس طرح مدد کر رہا تھا؟" ——کوتوال نے پوچھا۔

"کہتا تھا میں نظام الملک کے خلاف سلطان کے دل میں کدورت پیدا کر رہا ہوں" ——لڑکی نے کہا—— "یہ حساب کتاب کا جو مسئلہ کھڑا ہُوا تھا' اس کے پیچھے احتشام ہی تھا اور اُسی نے حسن بن صباح سے یہ حساب تیار کرایا تھا۔ احتشام کہتا تھا کہ اب ایسا موقع پیدا ہو گیا ہے کہ میں آسانی سے نظام الملک کو معزول کرا دوں گا"۔

مختصر یہ کہ لڑکی نے اپنی اصلیت اور حسن بن صباح کی نیت بے نقاب کر دی لیکن اُس نے یہ نہ بتایا کہ حسن بن صباح اور کیا کر رہا ہے اور شاہ در اور خلجان کے علاقے میں اس نے کیا ناٹک کھیلا اور آئندہ کے لئے اس کے کیا منصوبے ہیں۔

○

حسن بن صباح کو تو معلوم تھا کہ فاطمہ احتشام مدنی سے ملنے گئی ہے لیکن اُسے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی زیادہ دیر سے واپس آئے گی۔ آدھی رات ہو گئی تو اس نے اپنے ملازم کو جگا کر کہا کہ وہ احتشام مدنی کے ملازموں سے پوچھ آئے کہ وہ گھر ہے یا کہیں باہر گیا ہُوا ہے۔

ملازم گیا اور یہ خبر لایا کہ دربان احتشام کے انتظار میں جاگ رہا ہے۔ وہ ابھی نہیں آیا۔

حسن بن صباح مطمئن ہو گیا کہ احتشام واپس نہیں آیا تو فاطمہ اُس کے ساتھ ہی رہ گی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دونوں اس وقت کوتوالی میں بند ہوں گے۔ اس روز حسن بن صباح بہت خوش تھا۔ اُس نے نظام الملک کے مقابلے میں میدان مار لیا تھا۔

فجر کی اذان کے کچھ دیر بعد حسن بن صباح کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ سمجھا فاطمہ آئی ہے لیکن ملازم نے اسے بتایا کہ کوتوالی سے دو آدمی آئے ہیں۔ حسن نے انہیں اندر بلایا اور پوچھا وہ کیوں آئے ہیں۔

"حکم ملا ہے کہ آپ گھر سے باہر نہ نکلیں" ——ایک آدمی نے کہا۔

"کیوں؟" ——حسن بن صباح نے پوچھا—— "یہ حکم کس نے دیا ہے؟"

"وجہ ہمیں معلوم نہیں" ——اُس آدمی نے کہا—— "ہمیں یہ حکم کوتوال نے دیا ہے"۔

"آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ اپنے گھر میں قید ہیں" ——دوسرے آدمی نے کہا۔

کوتوال سلطان ملک شاہ کے گھر چلا گیا۔ سلطان فجر کی نماز کے لئے جلدی جاگا کرتا تھا۔ کوتوال نے اسے رات کی روداد سنائی۔ یہ بھی بتایا کہ اس نے احتشام مدنی سے بیان نہیں لیا اور حسن بن صباح کو اُس نے اُس کے گھر میں نظربند کر دیا ہے۔

سلطان نے حکم دیا کہ احتشام اور لڑکی کو فوراً اُس کے سامنے لایا جائے۔ سلطان نے نظام الملک اور حسن بن صباح کو بھی بلوا لیا۔

یہ سب آ گئے تو سلطان نے لڑکی سے کہا کہ گذشتہ رات اس نے کوتوال کو جو بیان دیا ہے وہ سب کے سامنے ایک بار پھر دے۔ لڑکی نے روتے ہوئے بیان دے دیا۔

"کیا یہ سچ ہے احتشام؟" ——سلطان نے احتشام سے پوچھا—— "اگر یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے تو بتاؤ سچ کیا ہے' میں اس لڑکی کو جلّاد کے حوالے کر دوں گا' اور اگر تم نے جھوٹ بولا تو....."

"نہیں سلطانِ معظم!" ——احتشام نے کہا—— "لڑکی کا بیان بالکل سچ ہے۔ میں سزا کا حقدار ہوں۔ میں نے آپ سے نمک حرامی کی ہے۔ اگر آپ مجھے معاف کر دیں گے تو بھی میں آپ کے زیرِ سایہ نہیں رہوں گا۔ میرا یہاں رہنا آپ کے سائے کی بھی توہین ہے"۔

"احتشام!" ——سلطان نے کہا—— "مجھے دکھ اس بات پر ہو رہا ہے کہ آپ جیسا دانشمند انسان ایک لڑکی کے فریب میں آ گیا"۔

"سلطانِ معظم!" ——احتشام مدنی نے بڑی پختہ آواز میں کہا—— "میں بھی اپنے آپ کو دانشمند سمجھا کرتا تھا۔ مجھے اپنی عقل و دانش پر اس لئے ناز تھا کہ میں نے آپ کو جو بھی مشورہ دیا وہ آپ نے قبول کیا اور عملاً" وہ مشورہ کامیاب اور کارآمد ثابت ہُوا لیکن میں اب محسوس کرتا ہوں کہ میرا علم اور میرا تجربہ خام تھا۔ میں نے سنا تھا کہ عورت مرد کی سب سے بڑی اور بڑی ہی خطرناک کمزوری ہوتی ہے لیکن اس کا مجھے عملی تجربہ نہیں ہُوا تھا۔ نسوانی حُسن میں ایک جادو ہے لیکن میں اس جادو سے واقف نہ تھا۔ اب میرا علم اور تجربہ مکمل ہو گیا ہے۔ اس تلخ اور شرمناک تجربے سے میں نے یہ سبق

حاصل کیا ہے کہ فریب کار عورت زیادہ دلفریب ہوتی ہے اور اس کے حسن و شباب سے بچنا ممکن نہیں ہوتا۔ اگر اس قسم کی ایک لڑکی مجھ جیسے جہاندیدہ اور دانشمند آدمی کو دامِ فریب میں لے سکتی ہے تو ان جوان سال آدمیوں کا کیا حشر ہوتا ہو گا جو عورت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت نے بادشاہوں کے تختے اُلٹے ہیں۔ میں یہی سبق لے کر آپ کے دربار میں سے ہی نہیں بلکہ آپ کی سلطنت سے ہی نکل جاؤں گا۔ اگر آپ سزا دینا چاہتے ہیں تو میرا سر حاضر ہے"۔

"اس کا فیصلہ میں بعد میں کروں گا" ــــ سلطان نے کہا ــــ "آپ بیٹھیں" ــــ سلطان حسن بن صباح سے مخاطب ہُوا ــــ "کیوں حسن! تم کیا کہتے ہو۔ اگر اس لڑکی کو جھٹلا سکتے ہو تو بولو لیکن بہتر یہ ہے کہ خاموش رہو۔ جھوٹ بولو گے تو بہت بُری سزا دوں گا"۔

"یہ لڑکی میری بہن نہیں" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "میں اسے ایک یتیم اور بیوہ لڑکی سمجھ کر اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اگر آپ کا کوئی حاکم اس لڑکی کو غلط راستے پر چلانے کی کوشش کرتا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اس لڑکی کی حالت دیکھیں، اس کا چہرہ دیکھیں، صاف پتہ چلتا ہے کہ اس پر تشدد کیا گیا ہے اور اس پر دہشت طاری کر کے یہ بیان دینے پر مجبور کیا گیا ہے"۔

حسن بن صباح کوئی ایسا کچا آدمی نہیں تھا کہ احتشام کی طرح فوراً "اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیتا۔ وہ بولتا رہتا اور سلطان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رکھتا تو سلطان پر غالب آ جاتا اور سلطان اُس کے حق میں فیصلہ دے دیتا لیکن اُس کے خلاف شہادت ایسی تھی جس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ گیا تھا۔ احتشام مدنی کا اعترافِ جرم لڑکی کے بیان کی تائید کرتا تھا۔

"خاموش!" ــــ سلطان گرج کر بولا ــــ "میں نے تمہیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ سچے ہو تو زبان کھولنا لیکن تم نے میرے اس حکم کی پرواہ نہ کی" ــــ سلطان نے کوتوال سے کہا ــــ "اسے اور اس لڑکی کو قید خانے میں پھینک دو۔ یہ دونوں قید خانے سے اُس وقت نکالے جائیں گے جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ ان کے دماغ صحیح راستے پر آ گئے ہیں..... احتشام مدنی! میں تمہیں قید خانے کی ذلت سے بچا رہا ہوں۔ تم آزاد ہو لیکن میں سوچ کر کوئی فیصلہ کروں گا"۔

"سلطانِ معظم!" ــــ خواجہ حسن نظام الملک اٹھ کھڑا ہُوا اور بولا ــــ "عفو اور درگزر کا جذبہ اللہ کو عزیز ہے۔ اسلام کی یہ شان ہے کہ دشمن کو بھی بخشا جا سکتا ہے۔ انہوں نے مجھے نقصان پہنچانے کا ایک منصوبہ بنایا تھا اور مجھے اُس عزت اور اس بلند مقام سے گرانے کی کوشش کی تھی جو مجھے اللہ نے عطا کیا ہے۔ میں انہیں اللہ کے نام پر معاف کرتا ہوں"۔

"میں انہیں معاف نہیں کر سکتا" ــــ سلطان نے غصے کے عالم میں کہا۔

"سلطانِ عالی مقام!" ــــ نظام الملک نے کہا ــــ "میں نے آج پہلی بار آپ سے ایک ذاتی درخواست کی ہے اور یہ میری آخری درخواست ہو گی۔ حسن بن صباح اور میں امام موافق جیسے عالمِ دین کے شاگرد ہیں۔ حسن کسمپرسی کی حالت میں میرے پاس آیا اور میں نے اسے روزگار اور وقار مہیا کیا تھا۔ میں اسے گناہ سمجھتا ہوں کہ یہ گناہ گار ہی سہی لیکن میری وجہ سے اسے قید میں پھینک دیا جائے"۔

سلطان کچھ دیر نظام الملک کے منہ کو دیکھتا رہا۔ وہ شاید سوچ رہا تھا کہ کوئی انسان اتنے بلند کردار والا بھی ہو سکتا ہے۔

"میں تمہاری قدر کرتا ہوں خواجہ حسن طوسی!" ــــ سلطان نے کہا ــــ "لیکن میں انہیں یہاں دیکھ نہیں سکتا۔ میں حسن بن صباح اور اس لڑکی کو زنداں میں بند نہیں کروں گا..... حسن بن صباح اور یہ لڑکی ابھی اس شہر سے نکل جائیں" ــــ سلطان نے کوتوال سے کہا ــــ "اپنے آدمی بھیجو جو انہیں شہر سے نکال کر آئیں"۔

حسن بن صباح اور اس لڑکی کو اُسی روز شہر بدر کر دیا گیا۔ نظام الملک کو روحانی اطمینان محسوس ہُوا کہ اس نے اتنے بڑے فریب کار کو معاف کر کے خداوند تعالیٰ کو راضی کر لیا ہے لیکن نظام الملک کو معلوم نہیں تھا کہ اُس نے ایک بڑے ہی زہریلے ناگ کو بخش دیا ہے اور وہ وقت بھی تیزی سے چلا آ رہا ہے جب نظام الملک ایک لشکر کے ساتھ حسن بن صباح کے لشکر کے مقابل آئے گا اور ایک ہی امام کے دو شاگرد تلواریں لہراتے ہوئے ایک دوسرے کو میدانِ جنگ میں للکاریں گے۔

تاریخوں میں اس حساب کتاب کے متعلق جو حسن بن صباح نے تیار کیا تھا، مختلف روایات ملتی ہیں۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ نظام الملک نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا "دستور الوزراء" اس کتاب میں نظام الملک نے لکھا تھا کہ حسن بن صباح

نے بڑا ہی کمال کیا تھا کہ صرف چالیس دنوں میں اتنے زیادہ علاقوں کے محصولات وغیرہ کی آمدنی اور اخراجات کا حساب تیار کر لیا تھا۔ نظام الملک نے یہ بھی لکھا ہے کہ حسن بن صباح کے دل میں حسد اور بغض تھا اس لئے خداوند تعالیٰ نے اُسے ذلیل و خوار کیا اگر وہ یہی کام نیک نیتی سے کرتا تو سلطان سے اسے انعام و اکرام ملتا۔

چونکہ یہ حساب کتاب ایک تاریخی واقعہ ہے اس لئے بہت سے مؤرخوں نے اسے قلمبند کیا ہے۔ "دبستان مذاہب" میں یہ روایت ملتی ہے کہ حسن بن صباح یہ حساب کتاب تیار کر چکا تو یہ تمام کاغذات نظام الملک نے دیکھنے کے لئے منگوائے اور ان کے کئی ورق بے ترتیب کر دیئے۔ یہ کاغذات جب سلطان کے پاس گئے تو اُس نے حسن بن صباح سے کچھ پوچھا تو وہ صحیح جواب نہ دے سکا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ نظام الملک نے اپنے رکابدار کو اس طرح استعمال کیا تھا کہ رکابدار نے حسن بن صباح کے ملازم کو کچھ لالچ دے کر پھانس لیا اور اُس سے ان کاغذات میں سے چند ایک کاغذات ضائع کروا دیئے تھے لیکن یہ روایات صحیح معلوم نہیں ہوتیں کیونکہ نظام الملک بڑا پکا ایماندار تھا۔ اُسے یہ کاغذات دکھائے ہی نہیں گئے تھے۔

حسن بن صباح اس لڑکی کے ساتھ رے پہنچا جہاں کا وہ رہنے والا تھا۔ اُس نے اپنے باپ کو سنایا کہ سلطان کے ہاں کیا واقعہ ہو گیا ہے۔

"تمہاری عقل ابھی خام ہے"۔۔۔ باپ نے حسن بن صباح سے کہا۔۔۔ "تم تمام کام بیک وقت اور بہت جلدی ختم کرنا چاہتے ہو۔ جلد بازی سے بچو۔ تم نے اپنی ملازمت ہی نہیں کھو دی بلکہ سلجوقی سلطنت کھو دی ہے۔ اب میں تمہیں مصر بھیجوں گا۔ وہاں کے کچھ لوگ یہاں آ رہے ہیں"۔

رے کا امیر ابو مسلم رازی تھا جو کٹر اہلِ سنت والجماعت تھا۔ اُسے خفیہ رپورٹیں مل رہی تھیں کہ حسن بن صباح کے باپ کے ہاں مصر کے عبیدی آتے رہتے ہیں۔ سلجوقی عبیدیوں کو اپنا اور اسلام کا بہت بڑا دشمن سمجھتے تھے کیونکہ عبیدیوں کا اپنا ہی ایک فرقہ تھا جو ایک جنگی طاقت بنتا جا رہا تھا۔ اُن دنوں مصر پر عبیدیوں کی حکومت تھی۔

سلطان ملک شاہ کی طرف سے ابو مسلم رازی کو ایک تحریری حکم نامہ ملا کہ اس کے شہر رے کے باشندے حسن بن صباح کو سرکاری عہدے سے سبکدوش کر کے نکال دیا گیا ہے۔ اس شخص پر نظر رکھی جائے کیونکہ یہ شخص بڑا پکا فریب کار ہے اور اپنے سابقہ

عہدے کو فریب کاری میں استعمال کر سکتا ہے۔

ابو مسلم رازی کو مخبروں سے کچھ ایسی رپورٹیں بھی ملی تھیں کہ حسن بن صباح رے سے دور دراز علاقوں میں اپنا ہی ایک فرقہ تیار کر رہا ہے اور اس فرقے کے عزائم خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔ ابو مسلم رازی نے حکم دے دیا کہ حسن بن صباح کو گرفتار کر لیا جائے۔

حسن بن صباح اور اس کے باپ نے مخبری اور جاسوسی کا اپنا ایک نظام قائم کر رکھا تھا۔ ان کا کوئی آدمی ابو مسلم رازی کے عملے میں ملازم تھا۔ اس آدمی نے فوراً حسن بن صباح کو اطلاع دے دی کہ اس کی گرفتاری کا حکم جاری ہو گیا ہے۔ حسن بن صباح نے اسی وقت شتربانوں کا لباس پہنا اور ایک اونٹ کی مہار پکڑ کر شہر سے نکل گیا۔ اُس کی گرفتاری کے لئے کوتوال کے آدمی اس کے گھر گئے تو اُس کے باپ نے کہا کہ وہ کچھ بتائے بغیر کہیں چلا گیا ہے۔

اُس وقت حسن بن صباح اونٹ پر سوار، شہر سے بہت دور چلا گیا تھا۔ اس کے قریب سے گزرنے والے اسے غریب سا شتربان سمجھتے تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شتربان کے لباس میں چھپا ہوا یہ شخص ایسے کارنامے کر دکھائے گا جو الف لیلیٰ کی داستانوں سے زیادہ سنسنی خیز، ناقابلِ یقین ہوں گے اور یہ شخص انسانیت اور تاریخ کے رونگٹے کھڑے کر دے گا

حسن بن صباح تو بھیس بدل کر نکل گیا لیکن وہ لڑکی جسے وہ اپنے ساتھ مَرو سے لایا تھا اور سب کو بتایا کہ یہ اُس کی بہن ہے اور اس کا نام فاطمہ رکھا تھا' وہ ایک بڑے ہی بے رحم شکنجے میں آگئی تھی۔ سلطان ملک شاہ نے اسے بھی حسن بن صباح کے ساتھ اپنے دارالسلطنت سے نکال دیا تھا۔ حسن بن صباح تو وہاں وزیرِ اعظم بننے گیا تھا اور اس لڑکی کو اس نے اس مقصد کے لئے استعمال کیا تھا لیکن اسی لڑکی کی زبان نے اُس کا وزیرِ اعظم بننے کا خواب چکنا چور کر دیا۔

اس لڑکی کا اصل نام شمونہ تھا — احمد بن عطاش کے آدمیوں نے ایک قافلہ لوٹا تھا اور دیگر مال و دولت کے ساتھ چند ایک لڑکیوں کو بھی پکڑ لائے تھے جن میں تین چار گیارہ سے چودہ سال عمر تک کی تھیں۔ انہیں شاہ در لے آئے تھے جہاں انہیں شہزادیوں کی طرح رکھا گیا اور انہیں اپنے مذموم مقاصد کے مطابق تربیت دی گئی تھی۔ انہیں بڑی محنت سے یہ تربیت دی گئی تھی کہ جس آدمی سے کام نکلوانا ہو اُس کے لئے کس طرح ایک بڑا ہی حسین سراب بنا جاتا ہے۔ انہیں ذہن نشین کرایا گیا تھا کہ اپنے جسموں کو کس طرح بچا کر رکھنا اور اپنے جال میں پھانسے ہوئے آدمی پر نشہ بن کر طاری ہو جانا ہے۔

شمونہ انہی لڑکیوں میں سے تھی۔ وہ بارہ تیرہ سال کی عمر میں قافلے سے اغوا ہوئی تھی۔ اب اُس کی عمر بیس سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ اُس نے کامیابی سے سلطان ملک شاہ کے مشیرِ خاص احتشام مدنی کو مسحور کر لیا تھا۔ یہ اُس کا پہلا شکار تھا۔ وہ اس معزز اور باوقار شخصیت پر طلسم ہوشربا بن کر طاری ہو گئی اور اپنا دامن بھی بچا کے رکھا تھا لیکن حسن بن صباح نے یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ نازک اندام لڑکی ہے' ایک جابر سلطان کو انگلیوں پر نچا سکتی ہے مگر یہی انگلیاں جابر سلطان کے شکنجے میں آگئیں تو یہ ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کرے گی اور تمام راز اُگل دے گی۔

حسن بن صباح اتنا کچا آدمی نہیں تھا کہ اُسے یہ احساس بھی نہ ہوتا کہ کمزور سی لڑکی ایذا رسانی برداشت نہیں کر سکے گی۔ وہ بے رحم انسان تھا۔ اُس کے جذبات اتنے نازک اور رومانی نہیں تھے کہ کسی کو اذیت میں دیکھ کر اُس کے دل میں ہمدردی پیدا ہوتی۔ اُس نے شمونہ جیسی ہر لڑکی کو اور اپنے گروہ کے تمام آدمیوں کو بتا رکھا تھا کہ اپنی جان دے دینا راز نہ دینا۔ اگر راز دے کر آؤ گے تو اس کے عوض تمہاری جان لے لی جائے گی۔

حسن بن صباح نے شمونہ کی جان اپنے ہاتھوں لینی تھی لیکن اُسے مہلت نہ ملی۔ امیرِ شہر ابو مسلم رازی کے حکم سے کوتوالی کے آدمیوں نے چھاپہ مارا۔ اگر اُسے پہلے اطلاع نہ مل چکی ہوتی تو وہ گرفتار ہو جاتا۔ وہ بروقت فرار ہو گیا تھا لیکن شمونہ کی قسمت کا فیصلہ سنا گیا تھا۔

"اس بدبخت لڑکی نے تھوڑا سا نقصان نہیں پہنچایا" — اُس نے فرار سے کچھ دیر پہلے اپنے دو خاص مصاحبوں سے کہا تھا — "اسے خلجان پہنچا دینا۔ میں وہاں پہنچ چکا ہوں گا۔ قلعے میں تمام لڑکیوں کے سامنے ایسی بری موت دوں گا جو ان لڑکیوں کے لئے باعثِ عبرت ہو گی۔ لڑکیوں کو بتاؤں گا کہ اس کا جرم کیا ہے۔ اسے ابھی کسی گھر میں قید میں رکھو۔ پانچ چھ دنوں بعد اسے یہاں سے نکالنا۔ ابھی کوتوال کے جاسوس میرے گھر کے اردگرد گھوم پھر رہے ہوں گے..... اگر یہ لڑکی اپنا حوصلہ ذرا مضبوط رکھتی تو میں وزیرِ اعظم بن جاتا"۔

شمونہ کو انہی آدمیوں میں ایک کے گھر رکھا گیا اور اسے کہا گیا کہ وہ باہر نہ نکلے اور چھت پر بھی نہ جائے۔ اُسے وجہ یہ بتائی گئی کہ امیرِ شہر نے اُس کی اور حسن بن صباح کی گرفتاری کا حکم دے رکھا ہے۔

○

شمونہ کو ذرا سا بھی شبہ نہ ہُوا کہ اُس کی زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس گھر میں مہمان سمجھنے لگی۔ اُس کے ساتھ بڑے ہی معزز مہمانوں جیسا سلوک روا رکھا گیا اور اُسے الگ کمرہ دیا گیا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کمرے کی قیدی اور لادنوں کی مہمان ہے۔

اس گھر میں ایک آدمی اور اُس کی دو بیویاں تھیں اور ایک ادھیڑ عمر نوکرانی تھی۔ شام کے کھانے کے بعد شمونہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ گھر کا آدمی ایک بیوی کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد دوسری بیوی شمونہ کے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے پوچھا کہ مَرو میں کیا ہُوا تھا..... شمونہ نے اسے سارا واقعہ سنا دیا۔

"کیا تمہارے آقا نے تمہیں معاف کر دیا ہے؟" — عورت نے پوچھا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی" — شمونہ نے کہا — "یہ بتا سکتی ہوں کہ اُس نے مَرو سے یہاں تک میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ صرف ایک بار اُس نے کہا تھا کہ تم نے

میرا ہی نہیں اپنی جماعت کا مستقبل تباہ کر رہا ہے..... میں نے اُسے پہلے بھی کہا تھا، ایک بار پھر کہا کہ میں مجبور ہو گئی تھی" — اُس نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دکھا کر کہا — "یہ نشان دیکھو۔ یہ انگلیاں لوہے کے شکنجے میں جکڑ دی گئی تھیں اور شکنجہ آہستہ آہستہ بند کیا جا رہا تھا۔ میری انگلیوں کی ہڈیاں چٹخنے اور پھر ٹوٹنے لگی تھیں۔ شکنجے کو اور زیادہ کسا جا رہا تھا اور مجھ پر غشی طاری ہو رہی تھی....."

"اب میری سُن لڑکی!" — عورت نے کہا — "آگے مت سنا۔ میں تیرے درد کو اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں..... تُو اپنے ماں باپ کے پاس کیوں نہیں جاتی؟"

"کہاں ہیں وہ؟" — شمونہ نے کہا — "کون ہیں وہ؟..... مجھے یاد نہیں۔ خواب کی طرح یاد ہے کہ ایک قافلہ جا رہا تھا۔ اسے ڈاکوؤں نے روک کر لوٹ لیا تھا۔ میرے ماں باپ شاید مارے گئے تھے۔ وہ مجھے یاد نہیں آتے۔ یاد آئیں بھی تو مجھے ان کی جدائی کا ذرا سا بھی افسوس نہیں ہوتا۔ ان سے جدا ہوئے صدیاں تو نہیں گزریں، چھ سات سال ہی گزرے ہیں۔ مجھے ڈاکو اپنے ساتھ لے آئے تھے"۔

"تجھے معلوم نہیں" — عورت نے کہا — "تجھے ایسی چیزیں پلائی اور کھلائی جاتی رہی ہیں کہ تیرے دماغ سے خون کے رشتے ڈھل گئے ہیں، اور میں جانتی ہوں تیری تربیت کس پیار سے ان لوگوں نے کی ہے۔ تو نہیں جانتی"۔

یہ حسن بن صباح اور احمد بن عطاش کا وہ طریقۂ کار تھا جسے آج کی صدی میں برین واشنگ کا نام دیا گیا ہے۔

"تم اتنی دلچسپی سے یہ باتیں کیوں پوچھ رہی ہو؟" — شمونہ نے پوچھا — "کیا تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے؟"

"ہاں لڑکی!" — عورت نے کہا — "مجھے تجھ سے ہمدردی ہے۔ میرا خاوند انہی لوگوں میں سے ہے۔ یہ لوگ میری چھوٹی بہن کو ورغلا کر لے گئے ہیں۔ بہت حسین لڑکی ہے۔ میں اُسے اس جال سے نہیں نکال سکتی، تجھے نکال سکتی ہوں لیکن تُو اب ان لوگوں کے نہیں بلکہ موت کے جال میں آگئی ہے"۔

"موت کے جال میں؟"

"ہاں لڑکی!" — عورت نے کہا — "تیری زندگی چار نہیں تو پانچ دن رہ گئی ہے"۔

"یہ کیسے؟"

"حسن بن صباح کسی کو معاف نہیں کیا کرتا" — عورت نے کہا — "میں جانتی ہوں تُو نے کس مجبوری کے تحت راز مَرو کے کوتوال کو دے دیا تھا لیکن یہ لوگ کہتے ہیں کہ تجھے اپنی جان دے دینی چاہئے تھی، راز نہ دیتی۔ حسن بن صباح کہہ گیا ہے کہ تجھے ملبان پہنچا دیا جائے۔ حسن بن صباح وہاں پہنچ جائے گا پھر تمہیں تم جیسی لڑکیوں کے سامنے بڑے ہی اذیّت ناک طریقے سے قتل کیا جائے گا تاکہ لڑکیوں کو عبرت حاصل ہو"۔

شمونہ کو غشی آنے لگی۔

"میں ابھی مرنا نہیں چاہتی" — شمونہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اور چاہتی میں بھی یہی ہوں کہ تُو زندہ رہے" — عورت نے کہا — "اگر میری یہ خواہش نہ ہوتی تو میں تمہارے پاس آتی ہی نہ"۔

"لیکن میں کروں کیا؟" — شمونہ نے پوچھا — "کہاں جا پناہ لوں"۔

"میں تمہیں یہاں سے نکال سکتی ہوں"۔

"کیا تم اس کی کچھ اُجرت لوگی؟"

"نہیں!" — عورت نے جواب دیا — "میرے لئے یہی اُجرت بڑی کافی ہوگی کہ تُو یہاں سے نکل جائے اور زندہ رہے۔ مجھ سے کچھ اور نہ پوچھنا، نہ کسی کو یہ بتانا کہ میں نے تمہیں یہاں سے نکالا ہے۔ صرف اتنا بتا دیتی ہوں کہ تجھے دیکھ کر مجھے اپنی بہن یاد آگئی ہے۔ تُو معصوم لڑکی ہے۔ خدا کرے تُو کسی گھر میں آباد ہو جائے"۔

"مجھے نکال تو دو گی" — شمونہ نے پوچھا — "میں جاؤں گی کہاں؟"

"رات ابھی زیادہ نہیں گزری" — عورت نے کہا — "میں تجھے راستہ بتا دوں گی۔ یہ راستہ تجھے امیرِ شہر ابو مسلم رازی کے گھر پہنچا دے گا۔ دروازے پر دستک دینا۔ دربان روکے تو کہنا کہ میں مظلوم لڑکی ہوں اور امیرِ شہر کے آگے فریاد کرنے آئی ہوں... تجھے کوئی نہیں روکے گا۔ امیرِ شہر خدا کا نیک بندہ ہے۔ وہ تجھے فوراً اندر بلا لے گا۔ اُسے ہر بات صحیح صحیح بتا دینا اور یہ مت کہنا کہ میں نے تجھے یہاں سے نکالا ہے، یہ کہنا کہ تو خود یہاں سے بھاگی ہے"۔

"پھر وہ کیا کرے گا؟"

تو اجو کچھ بھی کرے گا تیرے لئے اچھا ہی کرے گا" ــــ عورت نے کہا ــ "ہو سکتا ہے وہ تجھے کسی نیک آدمی کے سپرد کر دے ..... میں تجھے میلی سی ایک چادر دیتی ہوں۔ اس میں اپنے آپ کو ڈھانپ لینا۔ کوئی آدمی آگے آجائے تو ڈرنہ جانا، بڑی دلیری سے چلتی جانا۔ تو ہوشیار لڑکی ہے۔ تجھے تربیت بھی ایسی ہی دی گئی ہے۔ اس کے مطابق اپنی عقل استعمال کرنا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا..... اٹھو"۔

○

اس عورت کا خاوند دوسرے کمرے میں گہری نیند سو گیا تھا۔ یہ لوگ شراب اور حشیش کے عادی تھے۔ ان میں نشے کی علت حسن بن صباح نے پیدا کی تھی۔ اس اتنی بڑی حویلی کا مالک اپنی ایک جواں سال بیوی کو ساتھ لئے، نشے میں بدمست حقیقی دنیا سے بے خبر سو گیا تھا۔

اسی حویلی کے ایک کمرے میں اُس کی پرانی بیوی شمونہ کو چادر میں لپیٹ کر حویلی کی ڈیوڑھی میں لے گئی تھی۔ شمونہ کو اُس نے امیرِ شہر کے گھر کا راستہ سمجھا دیا تھا۔ اُس نے شمونہ سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ راستے سے بھٹک جائے تو کسی سے پوچھ لے۔ اُس نے شمونہ کو یقین دلایا تھا کہ ابو مسلم رازی سے لوگ اتنے ڈرتے ہیں کہ اکیلی دکیلی عورت پر کوئی ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔

اُس نے شمونہ کو حویلی سے نکال دیا۔ شمونہ گلی کا موڑ مڑ گئی تو اس عورت نے حویلی کا دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔ وہ مسرور اور مطمئن تھی کہ اُس نے ایک نوخیز لڑکی کو گناہوں کی بڑی ہی خطرناک دنیا سے نکال دیا تھا۔

شمونہ امیرِ شہر ابو مسلم رازی کے گھر تک پہنچ گئی۔ باہر دو دربان کھڑے تھے۔ انہوں نے اسے روکا اور پوچھا کہ وہ کون ہے اور کیوں آئی ہے۔

"مجھے فوراً امیرِ شہر تک پہنچا دو" ــــ شمونہ نے بڑی پختہ آواز میں کہا ــ "دیر نہ لگانا ورنہ پچھتاؤ گے"۔

"آخر بات کیا ہے؟" ــــ ایک دربان نے پوچھا۔

"انہیں اتنا ہی کہہ دو کہ ایک مظلوم لڑکی کہیں سے بھاگ کر آئی ہے" ــــ شمونہ نے کہا ــ "اور یہ بھی کہنا کہ وہ راز کی ایک بات بتائے گی"۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ابو مسلم رازی پکا مردِ مومن تھا۔ اسلام کے دینی نظریات اور

عقیدے جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کو دے گئے تھے، ان کی پاسبانی ابو مسلم رازی کی زندگی کا بہت بڑا نصب العین تھا۔ جس وقت شہر نیند کی آغوش میں مدہوش ہو گیا تھا، اُس وقت رازی دین کی ایک کتاب کھولے ہوئے مطالعہ میں مصروف تھا۔

دربان نے اُس کے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دربان کو ایسا ڈر نہیں تھا کہ امیرِ شہر خفا ہو گا اور اُسے ڈانٹے گا کہ رات کے اس وقت اُسے نہیں آنا چاہئے تھا۔ اُس نے حکمنامہ جاری کر رکھا تھا کہ کوئی مظلوم شخص رات کے کسی بھی وقت اُسے ملنے آئے تو اسے جگا لیا جائے۔ اُس رات دربان کی دستک پر اُس نے دربان کو اندر بلا لیا۔ دربان سے اس نے صرف یہ الفاظ سنے کہ ایک لڑکی آئی ہے تو اُس نے کہا کہ اسے فوراً اندر بھیج دو۔

چند لمحوں بعد ایک بڑی ہی حسین اور پُرکشش جسم والی نوخیز لڑکی اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ ابو مسلم رازی نے اسے بٹھا لیا۔

"کیا ظلم ہُوا ہے تجھ پر جو تُو اس وقت میرے پاس آئی ہے؟" ــــ ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"بات ذرا لمبی ہے" ــــ شمونہ نے کہا ــ "کیا امیرِ شہر کے دل میں اتنا درد ہے کہ اتنی لمبی بات سنے گا؟"

"ہاں لڑکی!" ــــ ابو مسلم رازی نے کہا ــــ "ہم دونوں کے درمیان اللہ کی ذات موجود ہے۔ میں اللہ کے ہاتھ میں پابند اور مجبور ہوں کہ اللہ کے ہر اُس بندے کی پوری بات سنوں جس پر ظلم کیا گیا ہے۔ تم بولو، میں سنوں گا..... امیرِ شہر نہیں سنے گا تو وہ اللہ کو کیا جواب دے گا"۔

"مجھے ڈاکوؤں نے تین چار سال پہلے ایک قافلے کو لوٹتے ہوئے میرے ماں باپ سے چھینا اور مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے" ــــ شمونہ نے کہا ــ "مجھ پر کوئی ظلم نہیں ہُوا، تشدد نہیں ہُوا، زیادتی نہیں ہوئی۔ ظلم یہ ہُوا ہے کہ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ میرے ماں باپ کون تھے۔ میں اغوا کے وقت دودھ پیتی بچی تو نہ تھی۔ مجھے اغوا کرنے والوں نے ایسی خوبصورت فضا دی اور ایسے شاہانہ ماحول میں میری تربیت کی کہ میں شہزادی بن گئی لیکن یہ تربیت ویسی نہیں تھی جیسی بچوں کو دی جاتی ہے۔ میری ذات میں ابلیسی

اوصاف پیدا کئے گئے۔ ایسا نہیں ہوا کہ میرے آقا میرے جسم کے ساتھ کھیلتے رہے اور مجھے ہوس کاری کے لئے استعمال کرتے بلکہ انہوں نے تربیت یہ دی کہ اپنے جسم کو مردوں سے کس طرح بچا کر رکھنا ہے"۔

"کون ہے وہ؟" ――― ابو مسلم رازی نے پوچھا ――― "کہاں ہے وہ؟"

"کیا آپ نے حسن بن صباح کا نام نہیں سنا؟" ――― شمونہ نے کہا ――― "میں اس کے ساتھ سلطان ملک شاہ کے زیرِ سایہ رہ چکی ہوں"۔

"وہ گیا کہاں؟" ――― ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"یہ میں نہیں بتا سکتی" ――― شمونہ نے جواب دیا ――― "میں اپنے متعلق سب کچھ بتا سکتی ہوں"۔

شمونہ نے ابو مسلم رازی کو تفصیل سے بتایا کہ وہ کس طرح اغوا ہوئی تھی اور پھر اُسے پہلے شاہ در پھر خلجان لے جا کر کس طرح کی تربیت دی گئی تھی۔ یہ بھی بتایا کہ اس جیسی اور لڑکیوں کو بھی اسی قسم کی تربیت دی جاتی ہے۔ پھر اُس نے بتایا کہ وہ حسن بن صباح کے ساتھ مرو گئی تو وہاں اسے حسن نے کس طرح استعمال کیا تھا۔

ابو مسلم رازی گہری سوچ میں کھو گیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے سوچ سے بیدار ہو کر شمونہ سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

"سب سے پہلے تو میں پناہ چاہتی ہوں" ――― شمونہ نے کہا ――― "اگر آپ نے مجھے پناہ نہ دی تو یہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے"۔

"تم میری پناہ میں ہو لڑکی!" ――― ابو مسلم رازی نے کہا۔

"میں اپنی ذات میں بہت بڑا خطرہ محسوس کر رہی ہوں" ――― شمونہ نے کہا ――― "میرے اندر، میرے دل اور میرے دماغ میں ابلیسیت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میں آپ کو صاف الفاظ میں بتا رہی ہوں کہ میں ایک ناگن ہوں اور ڈسنا میری سرشت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں آپ کو ہی ڈس لوں۔ میں انسان کے روپ میں آنا چاہتی ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری ذات میں کوئی انسانی جذبات ہیں ہی نہیں...... کیا آپ ایسا بندوبست کر سکتے ہیں کہ میری ایسی تربیت ہو جائے جس سے میں انسانوں کے روپ میں آ جاؤں؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا" ――― ابو مسلم رازی نے کہا ――― "میں فوری طور پر کسی بھلے

آدمی کے ساتھ تمہاری شادی کروا دوں گا"۔

"نہیں!" ――― شمونہ نے تڑپ کر کہا ――― "کسی بھلے آدمی پر یہ ظلم نہ کریں۔ میں ابھی کسی کی بیوی بننے کے قابل نہیں۔ بیوی وفادار ہوتی ہے لیکن میں فریب کاری کے سوا کچھ بھی نہیں جانتی۔ مجھے پہلے انسان بنائیں"۔

"تم آج رات آرام کرو" ――― ابو مسلم رازی نے کہا ――― "میں کل تمہارا کچھ بندوبست کر دوں گا"۔

ابو مسلم رازی نے شمونہ کو زنان خانے میں بھجوا دیا۔

○

اس شہر کے مضافات میں ایک آدمی رہتا تھا جو مذہب میں ڈوبا ہوا تھا اور تقریباً تارک الدنیا تھا۔ اُس کی عمر تقریباً چالیس برس ہو گئی تھی۔ اُس کے متعلق مشہور تھا کہ اس نے شادی نہیں کی تھی، اور یہ بھی مشہور تھا کہ وہ عورت کے وجود کو پسند ہی نہیں کرتا تھا۔ معلوم نہیں کس عمر میں اُس کے دل میں مذہب سے لگاؤ پیدا ہوا تھا۔ وہ زیادہ تر عبادت اور کتابوں میں مگن رہتا تھا۔

اُس کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ وہ کئی فرقے بدل چکا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صحیح عقیدے کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ اُس وقت تک مسلمان 72 فرقوں میں بٹ چکے تھے اور یہ شخص ان 72 فرقوں میں بھٹک رہا تھا۔ اب لوگ کہتے تھے کہ وہ سنی عقیدے کو قبول کر چکا ہے لیکن یقین کے ساتھ کہنا مشکل تھا کہ وہ کس عقیدے کو قبول کئے ہوئے ہے۔

وہ علمِ روحانیت میں بھی سر کھپاتا رہتا تھا۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ وہ راتوں کو جاگتا ہے اور جنات کو حاضر کر لیتا ہے۔ بہرحال لوگوں کے لئے وہ پُراسرار سی شخصیت بنا ہوا تھا۔ اُس کے معتقد اُس کے پاس جاتے رہتے اور وہ انہیں درس دیا کرتا تھا۔ وہ زیادہ تر زور اس پر دیتا تھا کہ عورت ایک حسین فریب ہے اور عورت گناہوں کی علامت ہے۔

ابو مسلم رازی اس بزرگ سے بہت متاثر تھا۔ اس کا نام نور اللہ تھا۔ ابو مسلم رازی اکثر اُس کے ہاں جاتا تھا۔ شمونہ نے جب ابو مسلم رازی سے یہ کہا کہ وہ بھٹکی ہوئی ایک لڑکی ہے اور جب تک دینی تربیت کے ذریعے اس کی ذات سے ابلیسیت نہیں نکالی جائے گی اُس وقت تک وہ کسی کی بیوی نہیں بنے گی، رازی کو نور اللہ یاد آیا تھا۔

اگلے روز کا سورج ابھی طلوع ہوا ہی تھا کہ ابو مسلم رازی نے شمونہ کو بلوایا۔ شمونہ آئی تو وہاں ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا تھا۔ اُس کی داڑھی ابھی بالکل سیاہ تھی۔ چہرے پر نور، سر پر سبز دستار اور اُس نے سبز رنگ کا چغہ زیب تن کر رکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی۔ اُس کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔

امیرِ شہر ابو مسلم رازی نے اسے فجر کی نماز کے کچھ دیر بعد بلوا لیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ باطنیہ فرقے کی ایک لڑکی اس کے پاس آئی ہے جو خود محسوس کرتی ہے کہ اُس کے وجود میں ابلیس حلول کر آیا ہے۔ ابو مسلم رازی نے نور اللہ کو شمونہ کے متعلق تمام تر باتیں بتائی تھیں جو نور اللہ انہماک سے سنتا رہا تھا لیکن ابو مسلم نے جب یہ کہا کہ اس لڑکی کی تربیت کرنا ہے تو نور اللہ پریشان اور بے چین ہو گیا۔

"کیا میں کچھ دیر کے لئے اس کے پاس آیا کروں گا؟" — نور اللہ نے پوچھا

"نہیں!" — ابو مسلم رازی نے کہا — "میں یہ لڑکی ایک امانت کے طور پر آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ یہ ہر وقت آپ کے زیرِ سایہ اور زیرِ تربیت رہے گی"۔

"میرے متعلق شاید آپ ایک بات نہیں جانتے!" — نور اللہ نے کہا — "میں آج تک عورت کے سائے سے بھی دور رہا ہوں اور میں نے شادی بھی نہیں کی۔ آپ اس لڑکی کو میرے حوالے کرنے کی بجائے اپنے پاس رکھیں، میں ہر روز یہاں آ جایا کروں گا"۔

"میں آپ کا احترام کرتا ہوں" — ابو مسلم رازی نے کہا — "اس احترام کی وجہ یہ ہے کہ آپ مذہب کے رنگ میں رنگے ہوئے انسان ہیں اور آپ کو اپنے نفس پر پورا پورا قابو حاصل ہو گا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ کس بنا پر عورت کے وجود سے گھبراتے ہیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ایک اور باطنی فرقہ بن چکا ہے جو لڑکیوں کو اپنی تبلیغ اور تشہیر کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ میں حکومت کی سطح پر اس کے انسداد کا کچھ بندوبست تو ضرور کروں گا لیکن میں نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچا ہے کہ اس لڑکی جیسی گمراہ کی ہوئی لڑکیوں کو آپ جیسے عالموں کے حوالے کر کے ان کی صحیح تربیت کی جائے۔ آپ اس لڑکی سے بسم اللہ کریں اور اسے اپنے ساتھ لے جائیں"۔

یہ حکم حاکم تھا جس کے آگے نور اللہ بول نہ سکا۔ ابو مسلم رازی نے شمونہ کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ کچھ دن نور اللہ کے ساتھ رہے گی۔

"تم نے وہاں مہمان بن کے نہیں رہنا" — ابو مسلم رازی نے شمونہ سے کہا — "تمہارا کام گھر میں جھاڑو دینا، اپنے اور ان کے کپڑے دھونا اور گھر کے دیگر کام تم نے کرنے ہیں۔ تم ان کی بیوی نہیں ہو گی بلکہ نوکرانی ہو گی اور تم ان کی خدمت کرو گی۔ جب تم خود کہو گی کہ تمہاری ذات سے ابلیسی اثرات دھل گئے ہیں تو کسی کے ساتھ تمہاری شادی کروا دی جائے گی"۔

ابو مسلم رازی نے نور اللہ سے کہا کہ وہ لڑکی کو ساتھ لے جائے۔ نور اللہ اُسے ساتھ لے گیا۔

O

اپنے ہاں لے جا کر نور اللہ نے شمونہ سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ سمجھتی ہے کہ اُس کی ذات میں شیطان حلول کر آیا ہے یا یہ کہ اُس پر شیطان غالب ہے۔ شمونہ نے اُسے اپنی زندگی کی اُس وقت تک کی روداد سنا ڈالی۔

"اپنا ماضی مار ڈالو" — نور اللہ نے کہا۔

"یہ کیسے ہو گا؟"

"اپنے آپ کو مٹی میں ملا دو" — نور اللہ نے کہا — "یہ بھول جاؤ کہ تمہارا رہن سہن شہزادیوں جیسا رہا تھا۔ اس گھر میں جھاڑو دو۔ میں نے یہیں چھوٹی سی مسجد بنا رکھی ہے۔ اسے صاف ستھرا رکھو۔ دھیان ہر وقت اللہ کی ذات پر رکھو اور اپنے دماغ میں اس حقیقت کو بٹھا لو کہ تم نے ایک نہ ایک دن اس مٹی میں مل کر مٹی ہو جانا ہے۔ اپنی نفسانی خواہشات کو اور جنسی جذبات کو کچل ڈالو"۔

اس طرح نور اللہ نے اس کی تعلیم و تربیت شروع کر دی۔ نور اللہ کے ہاں جب اس کے معتقد اور مرید آتے تھے، اُس وقت شمونہ کمرے میں چلی جاتی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے نور اللہ شمونہ کو اپنے سامنے بٹھا لیتا اور اسے مذہب کے سبق دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ شمونہ کو الگ کمرے میں بھیج کر اسے کہتا کہ اندر سے دروازہ بند کر لے۔ صبح اذان کے وقت وہ شمونہ کے دروازے پر دستک دیتا اور اسے جگا کر نماز پڑھاتا تھا۔

دن گزرتے چلے گئے۔ نور اللہ نے محسوس کیا کہ اُس کے دل میں عورت کی جو ناپسندیدگی یا نفرت تھی وہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ شمونہ نے محسوس کیا کہ اُس کے استاد کا رویہ تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ اس رویے میں کچھ ایسا تاثر تھا جیسے نور اللہ نے اُسے قبول کر

لیا ہو۔

ایک روز شمونہ گھر کے سارے کاموں سے فارغ ہو کر اتنی تھکن سی محسوس کرنے لگی جیسے اُسے نیند آ رہی ہو۔ وہ لیٹ گئی۔ نور اللہ کہیں باہر چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو شمونہ کو نہ دیکھ کر اُس کے کمرے کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ شمونہ بڑی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ وہ پیٹھ کے بل پڑی تھی۔ اُس کے سر سے اوڑھنی سرک گئی تھی۔ اُس کے چند ایک بال اُس کے گورے چٹے گالوں پر آ گئے تھے۔ اُس کا شباب بے نقاب تھا۔

نور اللہ کا ایک قدم دہلیز کے اندر چلا گیا تھا۔ اُس نے دوسرا قدم پیچھے کو اٹھایا لیکن اُس کی ذات سے ہی ایک قوت بیدار ہوئی جس نے اُسے پیچھے ہٹنے سے روک دیا اور اُس نے دوسرا پاؤں اٹھا کر دہلیز کے اندر کر دیا۔ نور اللہ کمرے میں داخل ہو گیا لیکن ایک ہی قدم آگے بڑھا کر رک گیا۔

شمونہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیسا خواب تھا کہ اُس کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا۔ نور اللہ کچھ دیر شمونہ کے تبسم کو دیکھتا رہا۔ اُس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ شمونہ کا تبسم ایسی مسکراہٹ کی صورت اختیار کر گیا جس سے اُس کے دانت ذرا ذرا سے نظر آنے لگے۔ اس مسکراہٹ نے شمونہ کے حسن میں طلسماتی سا تاثر پیدا کر دیا۔

نور اللہ ایک دو قدم اور آگے چلا گیا اور پھر رک گیا۔ اُس کے آگے بڑھنے اور رُکنے میں اُس کے اپنے ارادے اور اختیار کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ ایک ایسی حرکت تھی جو اُس نے اپنے ارادے سے کی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس لڑکی کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن وہ پیچھے نہ ہٹا۔ اُس کی ذات میں ایک کشمکش سی شروع ہو گئی تھی جسے وہ سمجھ نہ پایا۔

"آپ وہاں کیوں کھڑے ہیں!" — نور اللہ کے کانوں سے شمونہ کی خموری آواز ٹکرائی۔

وہ چونک کر اس کیفیت سے بیدار ہو گیا جو اُس پر طاری ہو چکی تھی۔ وہ بوکھلایا اور فوری طور پر یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ آگے بڑھے، شمونہ کو کوئی جواب دے یا باہر چلا جائے۔

شمونہ بڑی تیزی سے اٹھی۔ اُس کے دل میں نور اللہ کا احترام اور تقدس اتنا زیادہ تھا

کہ اُس پر مرعوبیت طاری رہتی تھی۔

"آپ کس وقت آئے؟" — شمونہ نے لونڈیوں اور غلاموں جیسے لہجے میں پوچھا اور کہنے لگی — "میں ذرا سو گئی تھی..... آپ چپ کیوں ہیں؟..... کیا آپ مجھ سے خفا ہو گئے ہیں؟"

"نہیں، نہیں!" — نور اللہ نے بوکھلائی ہوئی سی آواز میں کہا — "میں تمہیں دیکھنے اِدھر آ گیا تھا..... نہیں، نہیں میں خفا نہیں ہوں" — وہ پیچھے مڑا اور لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکل گیا۔

دو تین دنوں بعد نور اللہ شمونہ کو سامنے بٹھائے کچھ پڑھا رہا تھا۔ شمونہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ اُس کی اوڑھنی سر سے ذرا سرک گئی۔ اُس کے ریشم جیسے ملائم بال بے نقاب ہو گئے۔ شمونہ نے محسوس کیا کہ اُس کا قابلِ احترام استاد بولتے بولتے چپ ہو گیا ہے۔ اُس نے آہستہ سے سر اٹھایا تو دیکھا کہ استاد کی نظریں اُس کے ماتھے پر اس طرح مرکوز تھیں جیسے وہ آنکھیں جھپکنا بھول گیا ہو۔ ایک دو لمحوں بعد اُس کی نظریں شمونہ کی نظروں سے ٹکرائیں۔ نور اللہ پر بے خودی کی جو کیفیت طاری تھی وہ زلزلے جیسے جھٹکے سے تہ و بالا ہو گئی۔

شمونہ کوئی سیدھی سادی دیہاتن یا نادان بچی نہیں تھی۔ اُسے جو تربیت دی گئی تھی، اس میں خاص طور پر بتایا گیا تھا کہ مرد کسی خوبصورت عورت کو کیسی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اُن کے چہرے کا تاثر کیا ہوتا ہے۔

شمونہ نے وہ تاثر اپنے استاد کے چہرے پر دیکھا اور اُس نے اپنے استاد کی آنکھوں میں بھی ایک تاثر دیکھا جسے وہ اچھی طرح سمجھتی تھی لیکن وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی کہ مذہب میں ڈوبا ہوا یہ شخص جس کا دل عورت کو گناہوں کی علامت سمجھتا ہے اُسے ہوس کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اٹھو شمونہ!" — نور اللہ نے کہا — "آج اتنا ہی کافی ہے۔ اب تم کھانا تیار کرو۔"

شمونہ تو چولہے پر جا کر مصروف ہو گئی لیکن نور اللہ اپنی ذات میں ہلکے ہلکے جھٹکے محسوس کرتا رہا۔ شمونہ کا ذہن بھی پُرسکون نہ تھا۔ وہ اس سوچ میں کھوئی ہوئی تھی کہ اتنے معزز اور مقدس انسان کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایسے تاثرات کیوں آئے

تھے۔ اُس نے اپنے آپ کو یہ دھوکا دینے کی بھی کوشش کی کہ یہ اُس کی اپنی غلط فہمی ہے اور یہ اُس کے استاد کا تاثر نہیں تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کا استاد ایک ایسی کشمکش میں مبتلا ہو چکا ہے جو اُس کی روح کو بھی لذت پہنچا رہی ہے۔

○

جس قدرتی رفتار سے شب و روز گزرتے جا رہے تھے اس سے زیادہ تیز رفتار سے شمونہ اپنی ذات میں ایک پاکیزہ اور پُراثر تبدیلی دیکھ رہی تھی۔ وہ اُن دنوں کو بھولتی جا رہی تھی جو دن اُس نے حسن بن صباح کے گروہ میں گزارے تھے۔ وہ صاف طور پر محسوس کر رہی تھی کہ وہ ابلیس کے جال سے نکلتی آ رہی ہے۔

چند دن اور گزرے، دوپہر کے وقت شمونہ کچھ دیر کے لئے سو گئی۔ یہ اُس کا روز کا معمول تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو اُس نے اپنے استاد کو اپنی چارپائی کے قریب کھڑے دیکھا۔ اُسے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے استاد نے اُس کے سر پر اور شاید گالوں پر بھی ہاتھ پھیرا تھا۔ وہ ہاتھ کے لمس کو ابھی تک محسوس کر رہی تھی لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہاتھ اُس کے مقدس استاد کا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا آپ نے مجھے جگایا ہے؟" — شمونہ نے نور اللہ سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

نور اللہ نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں ایسا جواب دیا جس میں ہاں بھی تھی نہیں بھی۔ شمونہ کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ نور اللہ سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتا کمرے سے نکل گیا۔ شمونہ اُس روز کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئی۔ اُس نے دیکھا کہ نور اللہ شام تک چپ چاپ رہا۔ چپ رہنا اس کا معمول نہیں تھا۔

عصر اور مغرب کی نماز کے درمیان نور اللہ کے پاس ہر روز کی طرح اُس کے شاگرد اور معتقد وغیرہ آئے تو اس نے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے درس نہ دیا۔ وہ سب چلے گئے۔ نور اللہ وہیں بیٹھا رہا۔ شمونہ نے اسے دیکھا اور چپ رہی۔

عشاء کی نماز کے بعد جب نور اللہ ایک کتاب کھول کر پڑھنے لگا تو شمونہ اُس کے سامنے جا بیٹھی۔

"کیوں؟" — نور اللہ نے پوچھا — "آج سوئی نہیں؟"

"نہیں!" — شمونہ نے بڑی نرم آواز میں کہا — "میں آج آپ کے پاس بیٹھوں گی"۔

"تم نے دیکھا نہیں کہ میں نے شام کو درس نہیں دیا تھا؟" — نور اللہ نے کہا — "میرے سر میں گرانی ہے۔ اس وقت تمہیں بھی سبق نہیں دے سکوں گا۔ اگر میری بتائی ہوئی کوئی بات تمہاری سمجھ میں نہ آئی ہو تو وہ پوچھ لو اور جا کے سو جاؤ"۔

"ہاں میرے مرشد!" — شمونہ نے کہا — "ایک بات ہی پوچھنی ہے۔ یہ بات آپ نے پہلے کبھی نہیں بتائی۔ یہ مسئلہ میرے اپنے ذہن میں آیا ہے"۔

"پوچھو" — نور اللہ نے شگفتہ لہجے میں کہا اور کتاب بند کر کے الگ رکھ دی۔

"میں آپ میں ایک تبدیلی دیکھ رہی ہوں" — شمونہ نے کہا — "آپ روز بروز خاموش ہوتے چلے جا رہے ہیں"۔

"یہ میری عادت ہے" — نور اللہ نے کہا — "کبھی کبھی میں خاموش ہو جایا کرتا ہوں۔ کچھ دن اور میری یہی حالت رہے گی"۔

"نہیں میرے مرشد!" — شمونہ نے کہا — "میں گستاخی کی جرأت نہیں کر سکتی لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ آپ کی زبان نے جو کہا ہے یہ آپ کے دل کی آواز نہیں..... آپ مجھ سے خفا ہیں۔ آپ کے دل میں میرے لئے ناپسندیدگی ہے"۔

"ایک بات کہوں شمونہ!" — نور اللہ نے کہا — "میرے لئے مشکل یہ پیدا ہو گئی ہے کہ میرے دل میں تمہارے لئے ناپسندیدگی نہیں۔ تم جس پیار سے میری خدمت کر رہی ہو اس نے میری سوچیں بدل ڈالی ہیں"۔

"میں کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہوں میرے مرشد!" — شمونہ نے کہا — "میری عمر نہ دیکھیں، میری تربیت دیکھیں۔ میں سلطان ملک شاہ کے ہاں اس تربیت کا عملی تجربہ کر آئی ہوں۔ سلطان کا مشیرِ خاص احتشام مدنی جو زاہد اور پارسا تھا، میرے سامنے موم کی طرح پگھل گیا تھا..... میں نے یہ بات اس لئے کہی ہے کہ آپ مجھے نادان، ناتجربہ کار اور کمسن لڑکی نہ سمجھتے رہیں۔ میں کسی بھی آدمی کے دل کی بات اُس کے چہرے اور اُس کی آنکھوں سے پڑھ لیا کرتی ہوں"۔

"شمونہ!" — نور اللہ نے کہا — "تم فوراً وہ بات کیوں نہیں کہہ دیتیں جو تمہارے دل میں ہے؟"

"ڈرتی ہوں میرے آقا!"

"مت ڈرو" — نور اللہ نے کہا — "اللہ سچ بولنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔

"لیکن اللہ کے بندے بچ بننے کی تاب نہیں رکھتے" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "اگر آپ اللہ کی خوشنودی کے طلب گار ہیں تو میں بے خوف ہو کر بات کروں گی..... میں بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ میں آپ کے سامنے بیٹھتی ہوں تو آپ کی آنکھوں میں وہی تاثر ہوتا ہے جو میں عام سے لوگوں کی آنکھوں میں دیکھا کرتی ہوں..... پھر میں نے تین بار آپ کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ میں دن کے وقت سوئی ہوں اور آپ میرے پاس کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے میرے سر اور میرے منہ پر ہاتھ بھی پھیرا ہے"۔

"کیا تمہیں یہ اچھا نہیں لگا؟" ــــ نور اللہ نے پوچھا۔

"اگر آپ کو یوں ہی اچھا لگا ہے تو میں کچھ نہیں کہوں گی" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "لیکن میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ میں آپ کو کتنی کچھ اچھی لگتی ہوں؟"۔

"شمونہ!" ــــ نور اللہ نے لپک کر شمونہ کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا ــــ "تم نے میری آنکھوں میں جو پڑھا ہے ٹھیک پڑھا ہے اور تم نے غلط نہیں کہا کہ تمہیں سویا ہوا دیکھ کر میں تین چار دن تمہارے پاس جا کھڑا ہوا اور تمہیں دیکھتا رہا"۔

"کس نیت سے؟"

"اس نیت سے کہ تمہیں اپنی زندگی کی رفیقہ بنا لوں" ــــ نور اللہ نے کہا ــــ "کیا تم مجھے قبول کر لو گی؟"

"نہیں میرے مرشد!" ــــ شمونہ نے جواب دیا۔

"کیا میں چالیس برس کی عمر میں بوڑھا ہو گیا ہوں؟"

"نہیں اے مقدس ہستی!" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "میں آپ کے تقدس کو اپنے ناپاک وجود سے پامال نہیں کروں گی۔ یہ بات بھی ہے کہ میں نے آپ کو کبھی اپنی نگاہ لا کر دیکھا ہی نہیں۔ میرا دل خاوند کے روپ میں آپ کو قبول نہیں کرے گا"۔

"مجھے شک ہے تم مجھ سے اپنی قیمت وصول کرنا چاہتی ہو" ــــ نور اللہ نے قدرے غصیلے لہجے میں کہا ــــ "میں تمہیں شادی کے لئے تیار کرنا چاہتا ہوں' ہوس کاری کے لئے نہیں"۔

"اپنی محنت پر پانی نہ پھیریں میرے آقا!" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "میں بھٹک گئی تھی' آپ نے مجھے صراط مستقیم دکھائی ہے..... میں نے تو سنا تھا کہ آپ تارک دنیا

ہیں..... میں بھول گئی تھی میں کون ہوں' آپ نے میری آنکھوں کے آگے سے پردے ہٹا دیئے ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے۔ میری نگاہ میں آپ فرشتہ ہیں"۔

"جاؤ شمونہ!" ــــ نور اللہ نے کہا ــــ "جاؤ' سو جاؤ..... صرف ایک بات کہوں گا..... میں نے دنیا کو ترک نہیں کیا تھا' دنیا نے مجھے ترک کر دیا تھا"۔

شمونہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ نور اللہ کی بات سننے کے لئے پھر بیٹھنے لگی تھی لیکن نور اللہ نے اُسے کہا' جاؤ' سو جاؤ' تو وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

○

شمونہ کو اس کے کمرے میں بھیج کر وہ خود وہیں بیٹھا رہا۔ اُس کا ذہن پیچھے کو چل پڑا اور وہاں جا رکا جہاں اس کا شعور بیدار ہوا اور وہ بھاگنے دوڑنے کی عمر کو پہنچ گیا۔ اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ بچوں کے ساتھ پیار بھی کیا جاتا ہے۔ اُسے کوئی عورت یاد نہ آئی جس نے اُسے گود میں لیا ہو۔ صرف ایک یاد تھی جو اس کے ذہن کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ جہاں تک اس کی یاد ماضی کے دوسرے اُفق تک جاتی تھی' وہ اپنے آپ کو دریا کے کنارے ایک کشتی کو صاف کرتا' اس میں سے پانی نکالتا' کشتی میں مسافروں کا سامان رکھتا اور ساحل کی ہر قسم کی مشقت کرتا دیکھتا تھا۔ اُس وقت اس کی عمر چھ سات سال تھی جب اُسے ان کاموں پر لگا دیا گیا تھا۔ اس مشقت کے عوض اُسے دو وقت کی روٹی اور اپنے آقاؤں کی پھٹکار اور دھتکار ملتی تھی۔

دس گیارہ سال کی عمر میں اُسے بتایا گیا تھا کہ وہ اس جھونپڑی میں پیدا نہیں ہوا تھا جس جھونپڑی میں وہ رہتا تھا اور جس کے رہنے والوں کو وہ اپنے والدین سمجھتا تھا۔ یہ لوگ ملاح تھے جو مسافروں کو کشتی کے ذریعے دریا پار کراتے تھے۔ ایک روز اُس پر یہ انکشاف ہوا کہ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے یہ دریا سیلابی تھا اور ایک کشتی پار والے کنارے سے اس طرف آ رہی تھی اور یہ مسافروں سے اٹی پڑی تھی۔ کشتی اتنے زیادہ مسافروں کا بوجھ سہارنے کے قابل نہیں تھی۔ کشتی دریا کے وسط میں پہنچی تو اچانک سیلاب کا زور بڑھ گیا۔ کشتی اُلٹ گئی۔

ملاحوں نے مسافروں کو بچانے کے لئے اپنی اپنی کشتیاں دریا میں ڈال دیں لیکن سیلاب اتنا تیز و تند تھا کہ مسافر تنکوں کی طرح سیلاب میں گم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ایک کشتی کو اس کے ملاح ذرا آگے لے گئے۔ انہوں نے ایک عورت کو دیکھا جس نے

دودھ پیتے ایک بچے کو اپنے ہاتھوں میں لئے اس طرح اوپر اٹھا رکھا تھا کہ بچہ ڈوب نہ جائے۔ ملاحوں نے کشتی اُس کے قریب کر کے بچے کو پکڑ لیا۔ دوسرے ملاح نے ہاتھ لمبا کیا کہ عورت کو بھی سیلاب میں سے نکال لے لیکن عورت میں اتنی تاب نہیں رہی تھی کہ وہ دو گز اور تیر سکتی۔ اُس نے دیکھا کہ بچہ بچ گیا ہے تو اُس نے اپنے آپ کو سیلاب کے حوالے کر دیا اور ملاحوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس بچے کو ملاحوں نے اس طرح پالا کہ اسے کبھی بکری کا دودھ پلایا اور کبھی اونٹنی کا۔ وہ چار پانچ سال کا ہُوا تو اُسے کشتی رانی کی مشقت پر لگا دیا۔

ان ملاحوں نے اس بچے کا نام نور اللہ رکھا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلمان تھے۔

نور اللہ کو دس گیارہ سال کی عمر میں پتہ چلا کہ اُس کے ماں باپ دریا میں ڈوب گئے تھے اور اسے ملاحوں نے پالا تھا تو اُس کے دماغ میں جو دھماکہ ہُوا وہ اسے چالیس برس کی عمر میں بھی یاد تھا۔ وہ اسی کو زندگی سمجھتا تھا جس میں ملاحوں نے اسے ڈال دیا تھا لیکن اس انکشاف نے اس پر ایسی کیفیت طاری کر دی جیسے وہ بھٹکا ہُوا راہی ہو اور اپنی منزل کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہو۔

ایک روز کشتی سے مسافر اُترے تو ایک امیر کبیر آدمی نے اُسے کہا کہ اس کا سامان اٹھا کر وہاں تک پہنچا دے جہاں سے لوگ مل جاتے ہیں۔ نور اللہ نے اس کا سامان وہاں تک پہنچا دیا اور واپس چل پڑا۔ اُس آدمی نے اسے بلایا اور ایک دینار اُجرت دی۔ دس گیارہ سال عمر کا نور اللہ دینار کو ہاتھ لگاتے ڈرتا تھا۔ اس آدمی نے اُسے کہا کہ یہ اس کا حق ہے۔

"دنیا میں میرا کوئی حق نہیں" — نور اللہ نے کہا — "کسی پر میرا حق نہیں۔ میں مشقت کرتا ہوں اور روٹی اور رات کو جھونپڑی کی چھت مل جاتی ہے۔ ذرا سی سُستی کروں تو مجھے مارا پیٹا جاتا ہے۔ میں یہ اُجرت لے کر جاؤں گا تو وہ لوگ مجھ سے چھین لیں گے"۔

"تمہارا باپ ہے؟"

"نہیں..... اسی دریا میں ڈوب گیا تھا"۔

"ماں ہے؟"

"نہیں..... وہ بھی ڈوب گئی تھی"۔

"کوئی بھائی..... کوئی چچا، ماموں؟"

نور اللہ نے اسے وہ سارا واقعہ سنا دیا جو کچھ دن پہلے اسے سنایا گیا تھا۔

"میرے ساتھ چلو گے؟" — اس امیر کبیر آدمی نے پوچھا اور اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا — "تنخواہ بھی ملے گی، روٹی بھی ملے گی، کپڑے بھی ملیں گے اور رہنے کو بہت اچھی جگہ ملے گی"۔

نور اللہ نے یہ پہلا شخص دیکھا جس نے اُس کے ساتھ پیار سے بات کی تھی اور اُسے اس قابل سمجھا تھا کہ اسے اچھی جگہ رکھا جائے، اچھی قسم کا روٹی کپڑا دیا جائے اور اجرت بھی دی جائے۔ وہ وہیں سے اس شخص کے ساتھ چل پڑا۔

○

دونوں کرائے کے ایک ہی اونٹ پر سوار ہوئے اور شام کو شتربان نے انہیں ایک بڑے شہر میں پہنچا دیا۔ یہ شہر نیشاپور تھا۔ یہ آدمی وہیں کا رہنے والا تھا۔ اس کی حویلی بڑی ہی شاندار تھی۔ وہاں اس شخص کی دو بیویاں رہتی تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر اور دوسری نوجوان تھی۔ نور اللہ کو اس گھر میں نوکر رکھ لیا گیا۔ وہاں ایک عورت پہلے سے ملازم تھی۔

نور اللہ روز مرہ کے کام کاج کرتا رہا۔ اُسے اتنی زیادہ سہولتیں میسر آ گئی تھیں کہ وہ یوں سمجھتا تھا جیسے جہنم سے نکل کر جنت میں آ گیا ہو۔ کھانے پینے کو اتنا اچھا ملتا تھا کہ گیارہ بارہ سال کی عمر میں وہ سولہ سترہ سال کا نوجوان نظر آنے لگا۔

ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزر گیا۔

ایک روز اُس کا آقا اپنی ادھیڑ عمر بیوی اور بچوں کو ساتھ لے کر کچھ دنوں کے لئے شہر سے باہر چلا گیا۔ پیچھے اس کی نوجوان بیوی رہ گئی۔ اس سے اگلی رات کا واقعہ ہے۔ ملازمہ اپنا کام کاج ختم کر کے جا چکی تھی۔ نور اللہ کو ایسے شک ہُوا جیسے کوئی آدمی حویلی کے صحن میں سے گزرا ہے۔ اُس نے اٹھ کر دیکھا۔ ایک آدمی اُس کی نوجوان مالکن کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ نور اللہ دوڑ کر گیا۔ دروازہ اندر سے بند ہو چکا تھا۔ اُس نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور مالکن باہر آئی۔

"کیا ہے؟" — مالکن نے پوچھا۔

"یہ کون ہے جو اندر آیا ہے؟" — نور اللہ نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"تم کون ہو پوچھنے والے؟" — حسین اور نوجوان مالکن نے بڑے رعب سے پوچھا۔

"میں آقا کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں" — نور اللہ نے کہا — "آقا کہہ گئے تھے کہ گھر میں تم ہی ایک مرد ہو' گھر کا خیال رکھنا"۔

مالکن نے اُس کے منہ پر بڑی زور سے تھپڑ مارا۔ تھپڑ کی آواز پر وہ آدمی جو کمرے میں گیا تھا' باہر نکل آیا۔

"کون ہے یہ؟" — اس شخص نے پوچھا۔

"میرا پہرہ دار بن کے آیا ہے" — لڑکی نے کہا — "میں اس کی زبان ہمیشہ کے لئے بند کر دوں گی"۔

اس شخص نے نور اللہ کو بازو سے پکڑا' گھسیٹ کر اندر لے گیا اور اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا۔ پھر اس کی شہ رگ پر پاؤں رکھ کر دبایا اور خنجر نکال کر اس کے اوپر جھکا۔

"میں اس کا پیٹ چیر دوں گا" — اس شخص نے خنجر کی نوک نور اللہ کے پیٹ پر رکھ کر کہا — "اس کی لاش باہر کتوں کے آگے پھینک دوں گا"۔

"آج اسے معاف کر دو" — نوجوان مالکن نے اپنے آشنا کو پرے ہٹاتے ہوئے کہا — "یہ زبان بند رکھے گا۔ اس نے کبھی بھی زبان کھولی تو اس کے دونوں بازو کاٹ کر اسے جنگل میں پھینک دیں گے پھر اسے گیدڑ اور بھیڑیے کھائیں گے"۔

نور اللہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

"وعدہ کر کہ تُو زبان بند رکھے گا" — اس شخص نے خنجر کی نوک نور اللہ کی شہ رگ پر رکھ دی اور کہا — "خاموشی سے چلا جا اور خاموش رہنا"۔

نور اللہ ظلم و تشدد سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ چپ چاپ' خوفزدگی کی حالت میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس کے بعد اُس کے آقا کی واپسی تک یہ آدمی دو تین مرتبہ رات کو اس کی مالکن کے پاس آیا اور نور اللہ اپنے کمرے میں دبکا پڑا رہا۔ اُس کا آقا واپس آیا تو نور اللہ کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ اپنے آقا کو بتاتا کہ اُس کی غیر حاضری میں یہاں کیا ہوتا رہا ہے۔

ایک بار چھوٹی مالکن نے نور اللہ کو اپنے کمرے میں بلایا اور پیار سے بات کرنے کی بجائے اُسے پھر وہی دھمکی دی کہ اس کا پیٹ پھاڑ کر یا بازو کاٹ کر اسے بھیڑیوں' کتوں اور گیدڑوں کے آگے پھینک دیا جائے گا۔

نور اللہ کا کوئی مذہب نہیں تھا نہ اُس نے کبھی سوچا تھا کہ مذہب کے لحاظ سے وہ کون اور اس کا آقا کون ہے۔ نہ اُس نے خود کبھی عبادت کی تھی نہ اُس نے اپنے آقا یا اُس کی بیوی کو عبادت کرتے دیکھا تھا۔ اُس میں یہ احساس بیدار ہو گیا تھا کہ مذہب انسان کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اُس سے تین چار آدمی پوچھ چکے تھے کہ وہ مسلمان ہے یا عیسائی۔ وہ کسی کو بتاتا کہ وہ مسلمان ہے اور کسی کو عیسائی بتاتا۔ ایک بار ایک آدمی نے اسے کہا' تمہارا آقا تو باطنی معلوم ہوتا ہے..... اُسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ باطنی کیا ہوتے ہیں۔

ایک رات اُس کے آقا نے اُسے شراب لانے کو شراب خانے بھیجا۔ وہ مسجد کے قریب سے گزرا۔ عشاء کی نماز ہو چکی تھی اور خطیب درس دے رہا تھا۔ نور اللہ کے کانوں میں خطیب کے یہ الفاظ پڑے — "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں..... ہمیں اُن لوگوں کا سیدھا راستہ دکھا جن پر تیرا انعام نازل ہوا ہے نہ کہ ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا" — خطیب سورۂ فاتحہ کی تفسیر بیان کر رہا تھا۔ نور اللہ کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ قرآن کی آیت ہے اور قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اُسے صرف یہ احساس ہُوا کہ وہ بھی اُن لوگوں میں سے ہے جن پر اللہ کا غضب نازل ہُوا ہے۔

نور اللہ جلدی میں تھا۔ اُس کا آقا شراب کے انتظار میں تھا۔ وہ دوڑ گیا' شراب خریدی اور اپنے آقا کو جا دی۔ اُس کے ذہن میں خطیب کے یہ الفاظ اٹک کے رہ گئے تھے جو اس نے مسجد کے دروازے میں کھڑے ہو کر سنے تھے۔ وہ بھی مدد کا اور سیدھے راستے کی رہنمائی کا طلب گار تھا۔

○

اگلی رات نور اللہ روزمرّہ کلام کاج سے فارغ ہو کر مسجد کے دروازے پر جا پہنچا۔ خطیب روزمرّہ کی طرح درس دے رہا تھا۔ نور اللہ دروازے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ خطیب نے اسے دیکھا تو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ ڈرتے جھجکتے خطیب کے پاس چلا گیا۔

"دروازے میں کھڑے کیا کر رہے تھے؟" — خطیب نے پوچھا۔

"آپ کی باتیں سُن رہا تھا" ——— نور اللہ نے جواب دیا ——— "کل باہر کھڑا سنتا رہا ہوں"۔

"مسلمان ہو؟"

"معلوم نہیں" ——— نور اللہ نے بڑی سادگی سے جواب دیا ——— "میں یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میں کون ہوں..... اس وقت ایک شیخ کے گھر ملازم ہوں"۔

خطیب نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور اسے بتایا کہ جس شیخ کا اس نے نام لیا ہے وہ بے دین ہے۔ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں کہ وہ کس فرقے کا آدمی ہے اور اس کا عقیدہ کیا ہے۔

"کل سے تم میرے پاس آجایا کرو" ——— خطیب نے اُسے بڑے پیار سے کہا ——— "اب تم چلے جاؤ"۔

اگلے روز سے نور اللہ نے خطیب کے پاس جانا شروع کر دیا۔ اُس نے خطیب کو بتایا کہ اُس کے ماں باپ سیلاب میں ڈوب گئے تھے اور اُسے ملاحوں نے سیلاب سے نکالا تھا۔ اُس نے خطیب کو اپنی گزری ہوئی زندگی کا ایک ایک لمحہ سنایا۔ خطیب نے اُسے پڑھانا لکھانا شروع کر دیا۔ یہ خالصتاً" دینی تعلیم تھی۔ نور اللہ نے اس تعلیم میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ تقریباً" ایک سال بعد اُس نے خطیب سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اس شیخ کی نوکری چھوڑ کر خطیب کی اور مسجد کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ خطیب نے خندہ پیشانی سے اُسے اپنے پاس رکھ لیا۔

نور اللہ نے پندرہ سال اس خطیب کے ساتھ گزارے اور دین کے امور میں خاصی دسترس حاصل کر لی۔ خاص بات یہ ہوئی کہ اُس کے ذہن میں ابلیس اٹک گیا۔ اُس کا عقیدہ بن گیا کہ ہر بُرا کام ابلیس کرواتا ہے۔

دوسری خاص بات یہ ہوئی کہ خطیب کی ایک ہی بیوی تھی جو صرف تین سال کی رفاقت کے بعد مر گئی اور خطیب نے دوسری شادی نہ کی۔ خطیب نے کسی کو بھی نہ بتایا کہ اُس نے دوسری شادی کیوں نہیں کی۔ ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ اُسے اس بیوی سے اتنا زیادہ پیار تھا کہ اُس نے کسی اور عورت کو قبول ہی نہ کیا' یا یہ بات تھی کہ اس بیوی سے وہ اس قدر نالاں تھا کہ وہ مر گئی تو خطیب نے شادی سے توبہ کر لی۔

وجہ جو کچھ بھی تھی' خطیب نے اپنے شاگرد نور اللہ کو عورت سے متنفر کر دیا اور

اُس کے ذہن میں یہ عقیدہ ڈال دیا کہ عورت گناہوں کی علامت ہوتی ہے اور ابلیس عورت کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

چند برس اور گزرے تو خطیب فوت ہو گیا۔ نور اللہ ایسا دلبرداشتہ ہوا کہ وہ مسجد کو بھی چھوڑ گیا اور جنگل میں ایک کٹیا سی بنا کر وہاں جا ڈیرہ لگایا۔ اب وہ عالم دین کہلانے کے قابل ہو چکا تھا۔ خطیب کے جو شاگرد تھے وہ نور اللہ کے پاس جنگل میں پہنچنے لگے اور نور اللہ نے انہیں درس دینا شروع کر دیا۔ اُس کی شہرت سینہ بہ سینہ پھیلتی چلی گئی اور اُس کا نام ابو مسلم رازی تک پہنچا۔ ابو مسلم رازی رے کا امیر شہر تھا۔ دینی علوم سے اُسے دلی لگاؤ تھا۔ وہ اتنی دور جنگل میں جا کر نور اللہ سے ملا اور اُس سے متاثر ہوا۔ متاثر بھی اتنا ہوا کہ ایک روز اُس کے لئے سواری ساتھ لے کر اُسے اس میں بٹھایا اور اپنے شہر میں لے آیا۔ شہر میں اُسے بڑا اچھا مکان دیا اور کہا کہ یہاں وہ جو جی چاہے کرے اور لوگوں کو دین کی تعلیم دے۔

لوگ اُس کے پاس آنے لگے۔ بعض لوگ اُس سے اتنے زیادہ متاثر ہو گئے تھے کہ اُس سے غیب کا حال معلوم کرتے تھے۔ وہ زیادہ تر ابلیس اور عورت پر زور دیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ ان دو چیزوں سے اپنے جسم اور اپنی روح کی حفاظت کرو۔

○

آج نور اللہ اُسی مکان میں بیٹھا تھا جو اُسے ابو مسلم رازی نے دیا تھا لیکن اُس پر جو کیفیت طاری تھی وہ کوئی اجنبی دیکھتا تو یہ تسلیم نہ کرتا کہ یہ شخص عالم فاضل ہے۔ وہ اُسے ذہنی مریض سمجھتا۔ اُسے اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔ شمونہ اپنے کمرے میں گہری نیند سو گئی تھی۔ اُسے احساس ہی نہیں تھا کہ نور اللہ کے وجود میں اور جذبات میں وہ کیسے زلزلے بپا کر آئی ہے۔

اُسی نور اللہ نے جس نے ہمیشہ یہ سبق دیئے تھے کہ عورت سے دُور رہو' شمونہ سے کہا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے لیکن شمونہ جو گناہگاروں کی پروردہ تھی گناہوں کی دنیا سے نکل کر پارسائی میں داخل ہو گئی تھی' اُس شمونہ نے نور اللہ سے کہہ دیا تھا ——— "میں آپ کے تقدس کو اپنے ناپاک وجود سے پامال نہیں کروں گی" ——— شمونہ نے یہ بھی کہا تھا ——— "میرا اول خاوند کے روپ میں آپ کو قبول نہیں کرے گا"۔

نور اللہ کی آنکھوں کے آگے سے اُس کا پورا ماضی تیز رفتار گھوڑا گاڑیوں کی قطار

کی مانند گذر گیا۔ وہ اپنے وجود میں پیاس کی تلخی محسوس کر رہا تھا۔ ایک تشنگی تھی، برسوں کی محرومیاں تھیں جو کانٹوں کی طرح اُس کے حلق میں چبھ رہی تھیں۔

تلخی بڑھتی چلی گئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی ذات سے ایک شعلہ اٹھا جس نے اُس کے علم و فضل کے خرمن کو جلا ڈالا۔

وہ اپنے لئے اجنبی بن گیا۔

وہ بڑی تیزی سے اٹھا اور اُس کمرے میں داخل ہو گیا جس میں شمونہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ اُس رات شمونہ نے دروازہ بند نہیں کیا تھا کیونکہ اُسے توقع تھی کہ نور اللہ اُسے بلائے گا۔ وہ لیٹی اور نیند نے اُسے دبوچ لیا۔

نور اللہ اُس کے پلنگ پر جا بیٹھا۔ کمرہ تاریک تھا۔ برآمدے میں جلتے ہوئے دیئے کی ہلکی ہلکی روشنی دروازے سے اندر آ رہی تھی جس میں سمٹی ہوئی شمونہ کا سراپا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔

شمونہ گہری سانسیں لے رہی تھی۔ نور اللہ کی سانسیں بے قابو سی ہو گئیں اور اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اُس نے ہاتھ شمونہ کی طرف بڑھایا۔ یہ ہاتھ کچھ لرزتا ہوا آہستہ آہستہ شمونہ کے پُرشباب جسم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہاتھ جب شمونہ کے جسم کے قریب گیا تو آسمان پر اچانک گھٹاؤں کی گرج سنائی دی۔ نور اللہ نے یک لخت ہاتھ پیچھے کھینچ لیا جیسے چوری کرتے عین موقع پر پکڑا گیا ہو۔ جب اُسے احساس ہوا کہ یہ گھٹاؤں کی گرج تھی تو اُس کے دل کو حوصلہ ملا۔

اُس نے اب ذرا دلیری سے ہاتھ آگے بڑھایا اور شمونہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا..... اب کے گھٹا پہلے سے زیادہ زور سے گرجی۔ نور اللہ نے ہاتھ پیچھے کھینچنے کی بجائے شمونہ کا ہاتھ اور زیادہ زور سے پکڑ لیا اور اُس نے شمونہ کے ہاتھ کو اتنی زور سے دبایا کہ شمونہ کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے نور اللہ کو اپنے پلنگ پر بیٹھے اور اپنا ہاتھ نور اللہ کے ہاتھ میں دیکھا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''آپ؟'' — شمونہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا — ''یہاں کیوں؟''

''مت گھبراؤ شمونہ!'' — نور اللہ نے شمونہ کا ہاتھ چھوڑے بغیر کہا — ''آج میری پیاس مجھے جلا کر راکھ کر رہی ہے جسے میں نے پہلے کبھی محسوس ہی نہیں کیا تھا..... میری

ایک بات سن لو''

شمونہ کچھ ایسی ڈری کہ وہ پلنگ پر بیٹھے بیٹھے پیچھے کو سرکنے لگی۔ نور اللہ نے اُس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور اُسے اپنی طرف بڑے آرام سے کھینچا۔

''مجھے ماں کا پیار نہیں ملا'' — نور اللہ نے ایسی آواز میں کہا جو اُس کی قدرتی آواز نہیں تھی — ''مجھے بہن کا پیار نہیں ملا۔ میں بیٹی کے پیار سے بھی محروم رہا۔ میں نے کبھی کسی عورت کو ہاتھ لگا کر بھی نہیں دیکھا لیکن تم میرے قریب آئیں تو مجھ پر یہ راز کھلا کہ جس عورت کو میں نفرت کی علامت سمجھتا رہا ہوں وہ پیار کا سرچشمہ ہے.... تم ہو وہ سرچشمہ..... مجھ سے دُور نہ ہٹو'' — اُس نے شمونہ کو ذرا زور سے اپنی طرف کھینچا۔

''نہیں میرے مُرشد!'' — شمونہ نے رندھی ہوئی سی آواز میں کہا — ''میں بدی سے نیکی کی طرف، شر سے خیر کی طرف آئی ہوں۔ مجھے اس راستے پر آپ نے ہی ڈالا تھا، آپ اُس طرف نہ جائیں جدھر سے میں واپس آئی ہوں۔ مجھے اللہ اور ابلیس کے درمیان بھٹکتا نہ چھوڑیں''۔

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو شمونہ!'' — نور اللہ نے ایسی ڈگمگاتی ہوئی آواز میں کہا جیسے وہ نشے میں ہو — ''تھوڑی سی دیر کے لئے مجھے بھٹک جانے دو۔ مجھے پیاسا نہ لوٹاؤ''۔

آسمان پر بجلی بڑی زور سے کڑکی پھر گھٹا گرجی اور اس کے ساتھ ہی طوفانِ باد و باراں شروع ہو گیا۔ دروازے کے کھلے کواڑ زور زور سے بجنے لگے۔ برآمدے میں دیا بجھ گیا۔ نور اللہ نے شمونہ کو اپنی طرف کھینچا۔ شمونہ کا سینہ بڑی زور سے نور اللہ کے سینے سے ٹکرایا۔ نور اللہ اُس کے ہاتھ چھوڑ کر اُسے اپنے بازوؤں میں لینے لگا تو شمونہ اچھل کر پیچھے ہٹی اور بڑی زور سے ایک تھپڑ نور اللہ کے منہ پر مارا۔

''تم لوگوں کو جس ابلیس سے ڈراتے ہو'' — شمونہ نے بڑے ہی غضبناک لہجے میں کہا — ''وہ ابلیس تم خود ہو''۔

شمونہ اچھل کر پلنگ سے اٹھی اور فرش پر کھڑی ہو گئی۔ اُسے توقع ہو گی کہ نور اللہ اُس پر جھپٹے گا لیکن اندھیرے میں نور اللہ کے قدموں کی آہٹ اُبھری جو شمونہ کی طرف بڑھنے کی بجائے دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ شمونہ وہیں دبکی کھڑی رہی۔ نور اللہ

باہر نکل گیا۔ شمونہ کو اب یہ خوف محسوس ہونے لگا کہ نور اللہ رسّی لینے گیا ہے اور اسے باندھ کے گا یا چھری چاقو لا کر اسے قتل کر دے گا۔ ڈر کے مارے وہ پلنگ کے نیچے چھپ گئی۔

○

نور اللہ صحن میں چلا گیا۔ بارش بہت ہی تیز تھی اور اس کے ساتھ جھکڑ اور زیادہ تند تھا۔

"مجھے سکون دو" — نور اللہ نے بڑی بلند آواز میں کہا — "مجھے انسان کا لہو دو"۔

شمونہ نے یہ آواز سنی اور وہ پلنگ کے نیچے دبکی رہی۔

نور اللہ پر دیوانگی طاری ہو چکی تھی۔ وہ اسی حالت میں باہر نکل گیا۔ شہر کے لوگوں نے طوفانِ باد و باراں کے بھیانک شور و غل میں بڑی بلند آوازیں سنیں — "مجھے سکون دو..... میں جل رہا ہوں..... میرے اللہ! باد و باراں کو اور تیز کر دے..... میری روح کو تلخیوں سے نجات دلا دے"۔

شہر کے لوگوں نے یہ آوازیں مسلسل سنیں اور یہ دور ہٹتی گئیں اور پھر طوفان کے شور و غل میں تحلیل ہو گئیں اور لوگ یہ سمجھ کر ڈر گئے کہ یہ کسی کی بھٹکی ہوئی مظلوم بدروح ہے جو فضا میں چیختی چلاتی چلی جا رہی ہے۔

شمونہ پلنگ کے نیچے چھپی کانپ رہی تھی۔

نور اللہ شہر سے نکل کر جنگل میں چلا گیا تھا اور وہ بازو پھیلائے چلاتا چلا جا رہا تھا کہ مجھے سکون دو۔ شہر سے کچھ دور چھوٹی سی ایک ندی تھی جس میں سے بچے بھی گزر جایا کرتے تھے لیکن اوپر اتنی زور کا مینہ برسا تھا کہ ندی میں طغیانی آ گئی تھی۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ ندی پانی میں ہی کہیں چھپ گئی تھی۔ نور اللہ کچھ دور آگے گیا تو ایک ٹہن درخت سے ٹوٹ کر اس طرح گرا کہ نور اللہ کے سر پر لگا۔ وہ تو پہلے ہی دیوانگی کی حالت میں تھا اُسے یہ احساس بھی نہ تھا کہ جا کہاں رہا ہے۔ سر پر ٹہن گرا تو اس پر غشی طاری ہونے لگی۔ وہ گرا تو چند قدم آگے ندی کے کنارے پر گرا۔ کنارہ سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ سیلاب نور اللہ کو اپنے ساتھ ہی بہا لے گیا۔

اُسے اللہ نے سیلاب میں نئی زندگی دی تھی اور یہ زندگی سیلاب نے ہی واپس لے

لی۔

شمونہ صبح تک پلنگ کے نیچے چھپی رہی۔ صبح ڈرتے ڈرتے باہر نکلی تو نور اللہ وہاں نہیں تھا۔ طوفان ختم ہو چکا تھا۔ شمونہ گھر سے نکلی اور ابو مسلم رازی کے ہاں چلی گئی اور اُسے رات کی واردات سنائی۔

"ابلیس ہر انسان کی ذات میں موجود ہوتا ہے" — ابو مسلم رازی نے شمونہ سے کہا — "ایک خوبصورت عورت میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ کسی کے بھی ایمان کو سُلا کر ابلیس کو بیدار کر سکتی ہے لیکن جن کے ایمان مضبوط ہوتے ہیں، ابلیس ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا..... تمہارا اب کیا ارادہ ہے؟"

"میں آپ کی پناہ میں آئی تھی" — شمونہ نے التجا کی — "مجھے اپنی پناہ میں رکھیں..... یہ تو میرا ایک ارادہ ہے۔ میرا ایک ارادہ اور بھی ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ ایک خوبصورت عورت کسی کے بھی ایمان کو سُلا کر ابلیس کو بیدار کر سکتی ہے..... یہ آپ نے ٹھیک کہا ہے۔ حسن بن صباح لوگوں کو اور امراء و وزراء کو اپنا مرید بنانے کے لئے عورت کی یہی طاقت استعمال کر رہا ہے۔ میں اُس کی اس طاقت کو زائل کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ اس ارادے کی تکمیل کے لئے میں آپ کے زیرِ سایہ رہنا چاہتی ہوں"۔

اُسی روز شہر میں مشہور ہو گیا کہ رات کو ایک بے چین بدروح طوفانِ باد و باراں میں چلاتی گزر گئی تھی 'مجھے سکون دو' 'مجھے سکون دو'..... یہ باتیں امیرِ شہر تک پہنچیں تو شمونہ نے بھی سنیں۔ اُس نے بتایا کہ یہ الفاظ نور اللہ نے اپنے گھر کے صحن میں کہے تھے پھر وہ باہر نکل گیا تھا۔ وہ باہر بھی یہ نعرے لگاتے گیا ہو گا۔

تیسرے چوتھے دن شہر میں کچھ دور آگے ایک جگہ نور اللہ کی لاش مل گئی تو کڑیاں ملتے یہ کہانی سامنے آئی جو داستان گو نے سنائی ہے۔ یہ تاریخ کا ایک قصہ بن گیا۔

یہ آگے چل کر سنایا جائے گا کہ شمونہ نے اس داستان میں کیا رول ادا کیا تھا۔

○

حسن بن صباح اپنی گرفتاری کی اطلاع قبل از وقت مل جانے سے رے سے فرار ہو گیا تھا۔ اُس نے خلجان پہنچنا تھا۔ وہ اپنے خاص آدمیوں کو کہہ گیا تھا کہ شمونہ کو بھی خلجان پہنچا دینا۔ وہاں وہ اُسے سزائے موت دینا چاہتا تھا وہ خود بھی خلجان نہ پہنچ سکا۔ تاریخ

میں اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ خلجان کی طرف اونٹ پر جا رہا تھا۔ وہ شتربانوں کے بھیس میں تھا۔ اُس کی رفتار معمول کے مطابق تھی تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ اُس نے ابھی آدھا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ پیچھے سے ایک تیز رفتار گھوڑ سوار گیا اور اُسے جا لیا۔ وہ حسن کے اپنے گروہ کا آدمی تھا۔

"کیا خبر لائے ہو؟" ۔۔۔ حسن نے اُس سے پوچھا۔

"خلجان نہ جائیں" ۔۔۔ گھوڑ سوار نے کہا ۔۔۔ "ہمارا خیال ہے سلجوقی امیر کو شک ہو گیا ہے کہ آپ خلجان جا رہے ہیں۔ شاید وہ لوگ آپ کے تعاقب میں آئیں گے کسی اور طرف کا رخ کر لیں"۔

حسن رک گیا۔ کچھ دیر سوچا۔

"میں اصفہان چلا جاتا ہوں" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "تم خلجان چلے جاؤ۔ وہاں کے امیر احمد بن عطاش کو ساری بات سنا کر بتانا کہ میں اصفہان جا رہا ہوں۔ وہاں میرا ایک پرانا دوست رہتا ہے۔ نام ابوالفضل ہے۔ ہم امام موافق کے مدرسے میں اکٹھے پڑھے تھے۔ اب اُس کا شمار شہر کے رئیسوں میں ہوتا ہے۔ وہ مجھے پناہ دے گا اور مدد بھی کرے گا۔ احمد بن عطاش سے کہنا کہ میں کچھ دنوں بعد خلجان پہنچ جاؤں گا اور یہ بھی کہنا کہ شہر میں کوئی مشکوک آدمی نظر آئے تو اُس کے پیچھے اپنے جاسوس ڈال دے۔ وہ سلجوقیوں کا جاسوس ہو سکتا ہے۔ اُسے زندہ نہیں چھوڑنا"۔

"میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں" ۔۔۔ گھوڑ سوار نے کہا ۔۔۔ "آپ کو یہاں زیادہ دیر رکنا نہیں چاہئے"۔

گھوڑ سوار خلجان کی طرف اور حسن بن صباح اصفہان کی طرف چلا گیا۔

تاریخ سے پتہ نہیں چلتا وہ کتنے دنوں بعد اصفہان پہنچا۔ ابوالفضل اصفہانی کے گھر کا راستہ پوچھا اور اُس کے گھر جا پہنچا۔ ابوالفضل کو ملازم نے اندر جا کر اسے بتایا کہ ایک شتربان آیا ہے۔ ابوالفضل نے کہا کہ اُس نے کسی شتربان کو نہیں بلایا نہ کسی شتربان کی اُجرت اس کے ذمے ہے۔

"اس سے پوچھو کیوں آیا ہے!" ۔۔۔ ابوالفضل نے ملازم سے کہا۔

"آقا پوچھتے ہیں کیوں آئے ہو!" ۔۔۔ ملازم نے باہر جا کر حسن سے کہا ۔۔۔ "ان کا کسی شتربان سے کوئی کام نہیں ہو سکتا"۔

"آقا سے کہو یہ شتربان آپ سے ملے بغیر نہیں جائے گا" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔

ملازم اندر گیا اور واپس آ کر وہ حسن کو اندر لے گیا۔ معمولی سے ایک کمرے میں بٹھایا۔ ایک تو وہ شتربانوں کے لباس میں تھا' دوسرے وہ بڑی مسافت طے کر کے آیا تھا۔ چہرے پر تھکن کے آثار بھی تھے۔ ابوالفضل اصفہانی اس کمرے میں گیا۔ وہ حسن کو پہچان نہ سکا۔ حسن نے تعارف کرایا تو ابوالفضل نے اُسے پہچانا اور اُسے اس کمرے میں لے گیا جس میں اعلیٰ رتبے کے مہمانوں کو بٹھایا جاتا تھا۔

وہ کچھ دیر مدرسے کے زمانے کی باتیں کرتے رہے' پھر ابوالفضل نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔

"یوں سمجھو آسمان سے گرا ہوں" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "میں مرو سے آیا ہوں۔ سلطان ملک شاہ نے مجھے اپنا معتمد خاص بنا لیا تھا۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ ہمارا پرانا دوست نظام الملک سلطان ملک شاہ کا وزیر اعظم ہے" ۔۔۔ حسن بن صباح نے جھوٹ بولا ۔۔۔ "سلطان مجھے اپنا وزیر اعظم بنا رہا تھا لیکن نظام الملک نے خفیہ طریقے سے سلطان کو میرا دشمن بنا دیا اور پھر مجھے عہدے سے معزول کرا کے شہر بدر کروا دیا"۔

"دبستان المذاہب" کے حوالے سے "آئمہ تلبیس" میں لکھا ہے کہ ابوالفضل نے حسن سے پوچھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔

"میں سلجوقی سلطنت کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "مجھے تم جیسے دو دوست مل جائیں تو میں اس تُرک ملک شاہ اور خواجہ حسن طوسی کا جو نظام الملک بنا پھرتا ہے' پہلے خاتمہ کر دوں"۔

ابوالفضل چپ رہا۔ اتنے میں ملازموں نے دسترخوان چن دیا۔ ابوالفضل نے ایک الماری سے ایک شیشی نکالی اور اس میں جو سفوف پڑا ہوا تھا' اس میں ذرا سا سفوف ایک پیالے میں پانی ڈال کر گھولا۔

"لو حسن!" ۔۔۔ اُس نے پیالہ حسن کو دیتے ہوئے کہا ۔۔۔ "یہ پی لو"۔

"یہ کیا ہے؟" ۔۔۔ حسن نے پوچھا۔

"یہ دماغی تقویت کے لئے ایک دوائی ہے" ۔۔۔ ابوالفضل نے کہا ۔۔۔ "تم نے اتنا لمبا سفر کیا ہے کہ تھکان نے تمہارا دماغ شل کر دیا ہے ورنہ تم ایسی بہکی بہکی باتیں نہ

کرتے کہ تم سلطان ملک شاہ اور اس کے وزیر اعظم نظام الملک کا خاتمہ کر دو گے، مگر تمہیں پوری طرح احساس ہے کہ سلجوقی نہ آتے تو اسلام کی بنیادیں جو کھوکھلی ہوئی جا رہی تھیں، پوری عمارت کو لے بیٹھتیں۔ مسلمان 72 فرقوں میں بٹ چکے ہیں اور فرقوں کے اندر فرقے بن رہے ہیں۔ اسلام کی توڑ پھوڑ شروع ہو چکی ہے۔ سلجوقیوں نے آکر اسلام کی بنیادیں مضبوط کر دی ہیں اور قرآن کے اس فرمان کے مطابق کہ اُمت ایک جماعت ہے، ایک جماعت کی حکومت قائم کر دی ہے..... تم جیسا مسلمان یہ کہے کہ وہ سلطنتِ سلجوق کا خاتمہ کر دے گا تو یہ ثبوت ہے کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھا ہے! کسی وجہ سے اُس کے دماغ پر عارضی اثر ہو گیا ہے..... تمہارے دماغ پر سفر کی تھکان کا اثر ہے۔ یہ دوائی پی لو۔ دماغ تر و تازہ ہو جائے گا"۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جو ہر مؤرخ نے لکھا ہے۔ حسن بن صباح اپنے پرانے دوست ابوالفضل اصفہانی کے ہاں پناہ اور مدد امداد کے لئے گیا تھا لیکن اُس کے دوست نے اسے دماغی خرابی کا مریض قرار دے دیا۔ حسن کو ایک مایوسی تو یہ ہوئی کہ اس کا دوست سلجوقیوں کا حامی ہی نہیں بلکہ پیروکار نکلا۔ اس کے ساتھ ہی اسے خطرہ محسوس ہُوا کہ ابوالفضل کو اس کی اصلیت اور گرفتاری سے فرار کا پتہ چل گیا تو وہ اسے گرفتار کرا دے گا۔

حسن بن صباح نے اپنے متعلق یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ اہلِ سنت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شیدائی ہے۔ اسماعیلیوں میں جاتا تو اپنے آپ کو اسماعیلی بتاتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنا ہی ایک فرقہ بنا رہا تھا اور اُس نے نبوت کا دعویٰ کرنا تھا۔

اُس نے ابوالفضل کے ہاتھ سے پیالہ لے کر دوائی پی لی، کھانا کھایا اور باتوں میں مشغول ہو گیا۔ ابوالفضل نے اُسے جلدی سُلا دیا۔

وہ صبح بہت جلدی جاگ اٹھا۔ اپنے میزبان سے کہا کہ وہ اس سے رخصت چاہتا ہے۔ وہ وہاں سے بھاگنے کی فکر میں تھا۔ ابوالفضل کے گھر سے نکل کر وہ خلجان کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں گرفتاری کا خطرہ تو تھا لیکن وہ احمد بن غطاش سے مل کر آئندہ کا پروگرام بنانا چاہتا تھا۔

○

وہ تین دنوں کی مسافت طے کر کے وہ خلجان پہنچ گیا۔ اُس کا بہروپ اتنا کامیاب تھا کہ

احمد بن غطاش بھی اُسے نہ پہچان سکا۔ اُس نے پہلی بات یہ پوچھی کہ گرفتاری کا خطرہ ابھی ہے یا ٹل گیا ہے۔ دوسری بات یہ پوچھی کہ شمونہ آئی ہے یا نہیں۔ شمونہ کے متعلق اسے بتایا گیا کہ نہیں آئی، البتہ یہ اطلاع آئی ہے کہ وہ فرار ہو گئی ہے۔

"اس صورت میں اُسے قتل کرنا ضروری ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "اُسے یہاں لا کر قتل ہی کرنا تھا لیکن اب وہ ہمارے لئے زیادہ خطرناک ہو گئی ہے۔ اگر وہ سلجوقیوں کے پاس چلی گئی تو ہمارا سارا کھیل بے نقاب ہو جائے گا"۔

"تمہیں یہاں سے نکلنے کی ایک بڑی اچھی صورت پیدا ہو گئی ہے" — احمد بن غطاش نے کہا — "مصر کے دو عالم آئے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ مصر پر اسماعیلیوں کی حکومت ہے۔ وہ میرے مہمان اِس طرح ہوئے کہ ہمیں وہ اسماعیلی سمجھتے ہیں۔ میں نے انہیں یقین دلا دیا ہے کہ ہم اسماعیلی فرقے کے لوگ ہیں۔ یہ دونوں تبلیغ کے لئے آئے ہیں۔ ان میں ایک داعی الکبیر کہلاتا ہے۔ اس نے مجھے کہا ہے کہ اُسے ایسے ذہین اور پُر اثر گفتار والے آدمی دیئے جائیں جو اسماعیلی عقائد اور مسلک کی تبلیغ کریں اور لوگوں کو اس فرقے میں لائیں"۔

"میں ان میں شامل ہو جاتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "مصر جانے کے ارادے سے! یہ تو میں پہلے ہی سوچ رہا تھا کہ مصر جاؤں اور وہاں کے حکمرانوں کو قائل کروں کہ وہ سلجوقیوں پر حملہ کریں اور ہم انہیں نفری اور دیگر ضروریات کی مدد دیں گے..... ہمارا پہلا شکار سلجوقی سلطنت ہے۔ اس کا ہم نے خاتمہ کر دیا تو اس پر قابض ہونے والوں کے ہم پاؤں نہیں ٹکنے دیں گے"۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مصر پر عبیدیوں کی حکمرانی تھی جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اسماعیلی ہیں لیکن وہ باطنی تھے۔ یہ جو دو عالم خلجان گئے اور احمد بن غطاش سے ملے اسماعیلی ہی تھے جو اپنے فرقے کے مبلغ تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بھی معلوم نہیں تھا کہ مصر کے حکمران اسماعیلی نہیں بلکہ باطنی ہیں۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ دونوں عالم دراصل باطنی تھے اور اسماعیلیت کے پردے میں اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے پھرتے تھے۔ داستان گو کے لئے یہ عالم کوئی ایسے اہم نہیں کہ ان کے متعلق حتمی طور پر کہے کہ وہ کس فرقے کے لوگ تھے۔ اہم بات یہ ہے کہ

حسن بن صباح مصر جانا چاہتا تھا۔ اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان عالموں سے ملا اور تبلیغ کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ دوسروں پر اپنا طلسم طاری کرنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ اس کی زبان میں جادو کا اثر تھا۔ اس نے عالموں کو متاثر کر لیا اور انہوں نے اسے تبلیغ کے لئے رکھ لیا۔

حسن نے انہیں کہا کہ وہ اپنے علاقے میں تبلیغ کرنے کی بجائے مصر چلا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ اس نے ایسے دلائل دیئے جن سے یہ عالم متاثر ہو گئے اور اسے مصر جانے کے لئے تمام سہولتیں اور رقم وغیرہ دے دی۔

حسن مصر کو روانہ ہو گیا۔ اپنے دو آدمیوں کو ساتھ لے گیا۔

○

دو مہینوں کے سفر کے بعد حسن بن صباح مصر پہنچ گیا اور سیدھا اس وقت کے حکمران کے پاس گیا۔ اس نے حکمران کو بھی متاثر کر لیا لیکن اسے یہ نہ بتایا کہ وہ اسماعیلی عقائد کی تبلیغ کے لئے آیا ہے۔ اس نے حکمران پر دھاک بٹھانی شروع کر دی کہ وہ بہت بڑا عالم ہے اور وہ وزارت کے رتبے کا آدمی ہے۔ اس نے اپنے متعلق یہ بھی بتایا کہ وہ غیب دان بھی ہے اور آنے والے وقت کی پیشگوئی بھی کر سکتا ہے۔

عبیدی حکمران اتنے کچے نہیں تھے کہ فوراً ہی ایک اجنبی کی باتوں میں آجاتے۔ انہوں نے ظاہر یہ کیا کہ وہ اس سے متاثر ہو گئے ہیں لیکن اس کے ساتھ اپنے جاسوس لگا دیئے۔ ان میں ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی تھی جس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ پہلی نظر میں ہی حسن کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ حسن جان نہ سکا کہ وہ خود جو حربہ دوسروں کو ہاتھ میں لینے کے استعمال کیا کرتا ہے وہی حربہ اس پر استعمال ہو رہا ہے۔

حسن بن صباح کی حکمرانوں نے ایسی پذیرائی کی جیسے وہ آسمان سے اترا ہوا فرشتہ ہو۔ اس نے وہاں درپردہ اپنا ایک گروہ بنانا شروع کر دیا اور اس لڑکی کو بھی اپنے مقاصد اور مفادات کے لئے استعمال کیا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے حکمرانوں کو یہ مشورے دینے شروع کر دیئے کہ وہ سلجوقی سلطنت پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں۔ انہیں وہ اس قسم کی پیشگوئیاں سناتا تھا کہ وہ کامیاب ہو جائیں گے اور وہ خود ایک فرشتہ بن کر مصر میں آیا ہے۔

عبیدی حکمران یہی تو دیکھ رہے تھے کہ یہ شخص کیا کرنے آیا ہے۔ وہ دو عالم جنہوں

نے اسے مصر بھیجا تھا وہ بھی واپس مصر آگئے۔ وہ اسماعیلی مبلغ تھے جن کا عبیدی حکومت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ وہ اسماعیلی نہیں تھے۔ ایک روز حسن بن صباح ان عالموں کے بلاوے پر ان سے ملنے چلا گیا۔ جاسوسوں نے حکمرانوں کو بتا دیا۔ اس دوران جاسوسوں نے حکمرانوں کو یہ بھی اطلاعیں دی تھیں کہ اس شخص کی کارروائیاں صرف مشکوک ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی معلوم ہوتی ہیں۔

حسن بن صباح کے متعلق صحیح اطلاعیں تو اس لڑکی نے دیں جسے اس کے ساتھ لگایا گیا تھا اور جس نے یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ حسن بن صباح کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔

حکمرانوں کے لئے یہی کافی تھا اور وہ یہی معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ایک رات حسن اس لڑکی کو پاس بٹھائے شراب پی رہا تھا کہ اس کے کمرے کا دروازہ بڑی زور سے کھلا اور دو آدمی اندر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ انہوں نے حسن بن صباح کو ہتھکڑیوں میں جکڑ لیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے اور پھر اسے پیادہ چلا کے قید خانے تک لے گئے۔ تب اسے بتایا گیا کہ سلطانِ وقت کے حکم سے اسے قید خانے میں ڈالا جا رہا ہے اور یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ اسے کب رہائی ملے گی یا رہائی ملے گی بھی یا نہیں۔

مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس نے قید خانے کے دروازے پر کھڑے ہو کر نعرہ لگایا —
"مجھے قید کرنے والو! تمہاری تباہی اور بربادی کا وقت آگیا ہے"۔

اسے قید خانے میں تو دھکیل دیا گیا اور پھر ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا لیکن جس طرح اس نے تباہی کا نعرہ لگایا تھا وہ ایسا تھا کہ سننے والوں پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ یہ خبر حکمران تک پہنچ گئی۔

وہ جو کہتے ہیں کہ اللہ شیطان کو بڑی ڈھیل دیتا ہے وہ حسن بن صباح کے معاملے میں بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ اسے جس قید خانے میں بند کیا گیا تھا اس کا نام قلعہ دمیاط تھا۔ یہ ایک قدیم قلعہ تھا۔ ہوا یوں کہ جس رات حسن بن صباح کو اس قید خانے میں پھینکا گیا، اسی رات اس قلعہ کا سب سے بڑا برج گر پڑا۔ یہ تو کسی نے بھی نہ دیکھا کہ برج کے گرنے کی وجہ کیا ہے، سب پر یہ خوف طاری ہو گیا کہ یہ حسن بن صباح کی بددعا کا نتیجہ ہے۔ سلطانِ مصر کو اطلاع ملی تو اس نے حکم دیا کہ اس شخص کو مصر سے نکال دیا جائے۔

اتفاق سے ایک بحری جہاز کسی دور کے سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ تاریخ کے مطابق

اس کے تمام مسافر عیسائی تھے۔ حسن بن صباح کے ساتھ اُس کے دو آدمی بھی تھے جو اُس کے ساتھ ہی آئے تھے۔ جہاز ساحل سے بہت دُور سمندر کے درمیان پہنچا تو بڑا ہی تیز و تند طوفان آگیا۔ بادبان اُڑنے لگے پانی جہاز کے اندر آنے لگا اور ہر لمحہ یہ خطرہ تھا کہ جہاز ڈوب جائے گا۔

جہاز کے عملے اور مسافروں میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ہر کوئی جہاز میں سے پانی باہر نکالنے میں مصروف تھا۔ کچھ لوگ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے جہاز اور مسافروں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ صرف حسن بن صباح تھا جو ایک جگہ بڑے آرام سے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ جہاز کے کپتان نے اسے دیکھ لیا۔

"کون ہو تم!" — کپتان نے حسن بن صباح کو ڈانٹتے ہوئے کہا — "سب لوگ مصیبت میں گرفتار ہیں اور تم یہاں بیٹھے ہنس رہے ہو۔ اٹھو اور کوئی کام کرو"۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں" — حسن بن صباح نے بڑے آرام سے کہا — "طوفان گذر جائے گا۔ نہ جہاز کو کوئی نقصان پہنچے گا نہ کوئی مسافر زخمی یا ہلاک ہو گا۔ مجھے خدا نے بتا رہا ہے"۔

کچھ ہی دیر بعد طوفان تھم گیا۔ جہاز کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ تمام مسافر زندہ اور سلامت تھے۔ جہاز کے کپتان کے لئے یہ ایک معجزہ تھا۔

"تم کون ہو؟" — کپتان نے حسن بن صباح سے پوچھا۔

"میں طوفان لا بھی سکتا ہوں روک بھی سکتا ہوں" — حسن بن صباح نے جواب دیا۔

"میں جہاز رانی میں بوڑھا ہو گیا ہوں" — کپتان نے کہا — "میں نے ایسے شدید طوفان میں سے کبھی کوئی جہاز ٹھیک ٹھاک نکلتے نہیں دیکھا۔ یہ ایک معجزہ ہے کہ میرا جہاز اس طوفان سے نکل آیا ہے"۔

"یہ معجزہ میرا ہے" — حسن بن صباح نے کہا۔

"میں تمہیں کچھ انعام دینا چاہتا ہوں" — کپتان نے کہا — "کہو، کیا انعام دوں!"

"اگر انعام دینا ہے تو ایک کام کرو" — حسن بن صباح نے کہا — "جہاز کا رخ موڑ دو اور مجھے حلب پہنچا دو۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ میں جہاز میں موجود رہا تو ایک بار پھر طوفان آجائے"

کپتان بہت ہی خوف زدہ تھا۔ اُس نے جہاز کا رخ موڑا اور حلب کا رخ کر لیا۔ حلب پہنچ کر حسن بن صباح اور اُس کے دو ساتھیوں کو اتار دیا۔

"یہ بتاؤ حسن!" — اُس کے ساتھی نے پوچھا — "تمہیں کس طرح پتہ چل گیا تھا کہ جہاز طوفان سے خیریت سے نکل آئے گا؟"

"یہ تو ذرا عقل سے کام لو" — حسن بن صباح نے کہا — "اگر جہاز ڈوب جاتا تو مجھے یہ کہنے کے لئے کوئی بھی زندہ نہ رہتا کہ میری پیشگوئی غلط نکلی ہے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ طوفان گزر گیا تو سب پر میری دھاک بیٹھ جائے گی اور پھر میں کپتان سے اپنی یہ بات منوالوں گا کہ مجھے ملک شام کی بندرگاہ حلب پہنچا دے۔ ایسے ہی ہوا۔ ہمارا کام ہو گیا"

حسن بن صباح حلب سے بغداد گیا اور ایک بار اصفہان جا پہنچا۔ وہاں سے اس کا جو سفر شروع ہوا وہ ایسے پُراسرار واقعات کا تسلسل ہے جس پر تاریخ آج تک محوِ حیرت ہے۔

داستان گو نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح جہاز سے حلب اترا اور وہاں سے بغداد اور بغداد سے اصفہان پہنچا۔

کوئی غلط فہمی نہ رہے اس لئے داستان گو داستان کو ذرا پیچھے لے جاتا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ حلب بندرگاہ نہیں۔ بندرگاہ انطاکیہ تھی جہاں جہاز لنگر انداز ہوا اور حسن بن صباح وہاں اترا تھا۔ حلب وہاں سے ساٹھ میل دور ہے۔ حلب سے وہ بغداد گیا۔ یہ چار سو میل کی مسافت ہے۔ بغداد سے وہ اصفہان گیا۔ یہ فاصلہ بھی چار سو میل ہے۔ اس طرح حسن بن صباح نے انطاکیہ سے اصفہان تک آٹھ سو میل سفر کیا تھا۔

گھوڑے یا اونٹ کی پیٹھ پر عام رفتار سے چلنے سے یہ ایک مہینے کا سفر تھا۔ تیز رفتار سے جلدی بھی طے ہو سکتا تھا لیکن حسن بن صباح اپنی منزل اصفہان تک چھ ماہ بعد پہنچا تھا۔

اسے اصفہان تک پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اسے جلدی صرف یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے زیر اثر لے لے اور ان کی عقل پر اس طرح قابض ہو جائے کہ بلا سوچے سمجھے وہ اس کے اشاروں پر ناچیں۔ آگے چل کر حالات بتائیں گے کہ حسن بن صباح کے ذہن میں "اشاروں پر ناچنا" مشہور عام محاورہ ہی نہیں تھا' وہ اپنے پیروکاروں کو دیوانگی یا پاگل پن کے اس مقام پر لے جانا چاہتا تھا جہاں وہ کسی سے کہے کہ اپنے آپ کو ہلاک کر دو تو وہ اپنا خنجر اپنے ہی دل میں اتار لے۔ حسن بن صباح اپنے پیروکاروں کو جو فدائین کہلاتے تھے' اس مقام پر لے آیا تھا اور اس نے یہ مظاہرے کر کے بھی دکھا دیئے اور اپنے دشمنوں کو حیرت میں ہی نہیں بلکہ خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔

حسن بن صباح کی سوانح حیات افسانے سے زیادہ دلچسپ اور طلسم ہوشربا سے زیادہ حسین اور پُراسرار ہے۔

کوئی بھی انسان صرف اس صورت میں سنسنی خیز' پُراسرار اور چونکا دینے والی داستان کا ہیرو بنتا ہے جب بنی نوع انسان کی محبت میں وہ دیوانہ ہو جاتا ہے یا وہ انسان ہیرو بنتا ہے جس کے دل میں بنی نوع انسان کی محبت کا شائبہ تک نہ رہے اور اسے صرف اپنی ذات سے محبت ہو اور وہ آسمان میں اور زمین پر' سورج' چاند اور ستاروں میں صرف اپنی ذات کو دیکھ رہا ہو اور ساری کائنات کو اپنے تابع کرنا چاہتا ہو۔

ابتدا میں بیان ہو چکا ہے کہ ایسا انسان' عورت ہو یا مرد' خیر سگالی اور پیار و محبت کے

جذبے سے عاری ہوتا ہے۔ اس کا دل ابلیس کا آشیانہ ہوتا ہے لیکن وہ اپنے شکار کے لئے پیار و محبت کا جال پھیلاتا' خیر و برکت اور جذبۂ ایثار کی ایسی اداکاری کرتا ہے کہ پتھروں کو بھی موم کر لیتا ہے۔

یہ ہے ابلیسیت کا حسن اور شر کی سحر انگیزی!

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا ہے:

"انہیں باطل (اور بیہودہ باتوں) میں پڑا رہنے دو اور انہیں اپنا کھیل کھیل لینے دو اس دن تک جس دن کا ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے" —

(سورہ المعارج۔ آیت 42)۔

حسن بن صباح اُس دن سے پہلے پہلے جس دن کا اللہ نے وعدہ کیا ہے' اپنے عزائم پورے کرنے کی کوشش میں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ حساب کا اور عذاب کا دن ہو گا۔

○

حسن بن صباح کو جس طرح مصر سے عبیدیوں نے نکالا اور جس طرح بحری جہاز طوفان کی لپیٹ میں آکر نکلا اور جس طرح جہاز کے کپتان نے حسن بن صباح کو انعام کے طور پر شام کے ساحل پر اتارا' وہ پچھلے باب میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ وہاں سے آگے کی یہ پُراسرار اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان یوں آگے چلتی ہے کہ انطاکیہ کی بندرگاہ میں اترنے والا اکیلا حسن بن صباح نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ وہ اس کے اپنے ساتھی تھے جو اُس کے راز دار' ہمدرد اور بہی خواہ تھے' اور سات آٹھ آدمی جن میں ایک جوان عورت بھی تھی' حسن بن صباح کے ساتھ انطاکیہ اُتر گئے تھے۔

ان سات آٹھ آدمیوں نے اس بندرگاہ پر اُترنا تھا جو جہاز کی منزل تھی اور وہاں سے ملک شام جانا تھا۔ ان کی خوش قسمتی کہ حسن بن صباح نے جہاز کا رخ شام کی طرف کرا لیا اور وہ پیدل سفر سے بچ گئے۔

ان کے ساتھ جو عورت تھی وہ اپنا چہرہ نقاب میں رکھتی تھی۔ اُس کی صرف پیشانی اور آنکھوں پر نقاب نہیں ہوتا تھا۔ اُس کی پیشانی سفیدی مائل گلابی تھی جس پر ریشم کی باریک تاروں جیسے چند ایک بے ترتیب بال بہت ہی بھلے لگتے تھے۔ اُس کی آنکھیں غزال جیسی تھیں جن میں خمار کا سا تاثر تھا جو ان آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والے کو مسحور کر لیتا تھا۔ اُس کے کھڑے قد میں اور چال ڈھال میں جاذبیت تھی۔ ایسا

تاڑ گئے کہ یہ کوئی عام عورت نہیں اور اس کا تعلق کسی قبیلے کے سردار خاندان سے یا کسی بڑے ہی امیر کبیر تاجر خاندان سے ہے۔

یہ سب آدمی مصر کی بندرگاہ سکندریہ سے انطاکیہ تک حسن بن صباح کے ہم سفر رہے تھے۔ انہوں نے اتنے زیادہ طوفان میں حسن بن صباح کو پرسکون بیٹھے اور مسکراتے دیکھا تھا اور وہ اسے پاگل سمجھتے تھے جسے یہ احساس تک ہی نہیں کہ جہاز ڈوبنے والا ہے اور کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا۔ پھر انہوں نے حسن بن صباح کی یہ پیش گوئی سنی تھی کہ جہاز اس طوفان سے بخیر و خوبی گزر جائے گا۔

جہاز بپھرے ہوئے سمندر کی پہاڑوں جیسی طوفانی موجوں پر اوپر کو اٹھتا گرتا آخر طوفان سے نکل گیا۔ حسن بن صباح کے دونوں آدمیوں نے تمام مسافروں کو بتایا کہ جہاز کو اس برگزیدہ درویش نے طوفان سے نکالا ہے۔ مسافروں نے حسن بن صباح کے ہاتھ چومے اور اس کے آگے رکوع میں جا کر تعظیم و تکریم پیش کی تھی۔

یہ سات آٹھ آدمی تو حسن بن صباح کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ سب سے زیادہ فائدہ تو انہیں پہنچا تھا۔ یہ لوگ پیدل سفر سے بچ گئے تھے۔

○

انطاکیہ میں انہیں رکنا پڑا۔ یہ سرائے میں چلے گئے۔ حسن بن صباح اور اس کے دونوں ساتھیوں نے الگ کمرہ لے لیا اور باقی آدمی ایک بڑے کمرے میں چلے گئے۔ اس عورت اور اس کے خاوند کا کمرہ الگ تھا۔

حسن بن صباح اور اس کے ساتھی نہا چکے تھے اور اب انہوں نے سرائے کے لنگر سے کھانا لینے جانا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ سرائے کا مالک آیا تھا۔

"کیا میں خوش نصیب نہیں کہ آپ نے مجھے میزبانی کی سعادت عطا کی ہے؟" — سرائے کے مالک نے کہا — "میں سرائے کا مالک ابو مختار ثقفی ہوں۔ ابھی ابھی آپ کے مسافروں نے مجھے اپنے بحری سفر کی داستان سنائی ہے۔ خدا کی قسم! جہاز میں آپ نہ ہوتے تو یہ لوگ مجھے اس طوفان کی کہانی سنانے یہاں نہ آتے!"۔

"ابو ثقفی!" — حسن بن صباح نے کہا — "بیٹھ کر بات کرو...... یہ تو بتاؤ، ایک ثقفی اپنے وطن سے اتنی دور کیوں چلا آیا ہے؟"

"سنا ہے میرے آباؤ اجداد حجاج بن یوسف سے عداوت مول لے بیٹھے تھے" — ابو مختار نے جواب دیا — "ان میں سے کچھ قتل کر دیئے گئے، کچھ بھاگ کر وطن سے نکل گئے اور میرا کوئی بزرگ ادھر آ نکلا۔ یہ سرائے اس نے تعمیر کی تھی جو ورثے میں مجھ تک پہنچی ہے"۔

"کیا اس سرائے میں صرف مسلمان ٹھہرا کرتے ہیں؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"نہیں پیر و مرشد!" — ابو مختار نے جواب دیا — "اس سرائے کے دروازے ہر کسی کے لئے کھلے ہیں۔ یہ سرائے دنیا کی مانند ہے۔ یہاں ہر مذہب، ہر رنگ اور ہر نسل کے لوگ آتے ہیں، کچھ دن گزارتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ دنیا کی طرح اس سرائے میں بھی آمد و رفت لگی رہتی ہے۔ آپ جیسا ولی اللہ اور غیب کا بھید جاننے والا مدتوں بعد آیا ہے...... کیا میں مطلب کی بات نہ کہہ دوں؟"

"اجازت کی ضرورت نہیں" — حسن بن صباح نے کہا۔

"آج رات کا کھانا میری طرف سے قبول فرمائیں" — ابو مختار نے کہا — "اور میں نے آپ کے لئے الگ کمرہ تیار کیا ہے۔ آپ اسی کمرے میں آ جائیں"۔

کچھ دیر بعد حسن بن صباح اس کمرے میں اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا تھا۔ کھانا بہت ہی پرتکلف تھا۔ تین چار اور اجنبی بھی مدعو تھے۔ یہ ایک کشادہ کمرہ تھا جسے رنگا رنگ ریشمی پردوں اور فانوسوں سے سجایا گیا تھا۔ آدھے سے زیادہ کمرہ خالی تھا۔ دیوار سے دیوار تک دلکش رنگوں والا قالین بچھا ہوا تھا۔ دسترخوان کمرے کے وسط میں نہیں بلکہ ایک طرف جو لمبائی والی دیوار کے ساتھ بچھایا گیا تھا۔ دیوار کے ساتھ گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ پیچھے دیوار کے ساتھ ایک قالین لٹک رہا تھا جس پر ہرے بھرے جنگل کا منظر بنا ہوا تھا اور اس میں ایک شفاف ندی بہتی دکھائی گئی تھی۔

مختصر یہ کہ یہ شاہانہ انتظام اور یہ عالیشان ضیافت ایک اعزاز تھا جو حسن بن صباح کو دیا گیا تھا۔

"میں آپ کے مزاج سے واقف نہیں" — سرائے کے مالک نے حسن بن صباح سے کہا — "آپ کے ذوق کا بھی مجھے کچھ پتہ نہیں۔ گستاخی ہی نہ کر بیٹھوں۔ کیا آپ رقص گانا یا صرف سازوں کی موسیقی پسند کریں گے؟"

"تم نے مجھے کیا سمجھ کر یہ بات پوچھی ہے؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ایک برگزیدہ ہستی....!" — سرائے کے مالک نے جواب دیا — "اللہ کے اتنا قریب آپ ہیں اتنا ہم جیسے گنہگار تصور میں بھی نہیں لا سکتے"۔

"اللہ نے کسی بندے پر کوئی نعمت حرام نہیں کی" — حسن بن صباح نے کہا۔ "رقاصہ کے فن سے لطف اندوز ہونا گناہ نہیں' اس کے جسم کو اپنے قبضے میں لے کر اس سے لطف اور لذت حاصل کرنا بہت بڑا گناہ ہے"۔

"کیا اسلام نیم برہنہ رقاصہ کا رقص دیکھنے کی اجازت دیتا ہے؟" — سرائے کے مالک نے پوچھا۔

"ہاں!" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "اسلام جہاد میں ہر مسلمان سے جان کی قربانی مانگتا ہے اور مسلمان نعرے لگاتے ہوئے جانوں کی قربانی دیتے ہیں اس لئے اسلام ہر مسلمان کو دنیا کی ہر نعمت اور ہر تفریح سے لطف اٹھانے کی اجازت دیتا ہے"۔

"ہم نے آج تک جو سنا ہے....."

"وہ اسلام کے دشمنوں نے مشہور کیا ہے" — حسن بن صباح نے اپنے میزبان کی بات کاٹتے ہوئے کہا — "یہودیوں اور نصرانیوں نے دیکھا کہ اسلام تھوڑے سے عرصے میں آدھی دنیا میں مقبول ہو گیا ہے تو انہوں نے امام اور خطیب بن کر یہ بے بنیاد بات پھیلا دی کہ اسلام صرف قربانیاں مانگتا ہے اور دیتا کچھ بھی نہیں اور اسلام میں سوائے پابندیوں کے اور کچھ بھی نہیں"۔

تاریخ میں آیا ہے کہ حسن بن صباح اپنے آپ کو اسلام کا علمبردار کہلاتا تھا اور مسلمانوں کو اسلام کے نام پر مشتعل کر کے انہیں اسلام کے خلاف استعمال کرتا تھا۔ یہ ضرورت اسے اس لئے پیش آئی تھی کہ اس نے اپنی سرگرمیوں اور اپنے عزائم کے لئے جو علاقہ منتخب کیا تھا وہ مسلمانوں کی غالب اکثریت کا علاقہ تھا۔

سرائے کے مالک نے حسن بن صباح کی یہ باتیں سنیں تو اس نے کھانے پر حاضری دینے والے ایک ملازم کی طرف اشارہ کیا۔ ملازم بڑی تیزی سے باہر چلا گیا۔ فوراً ہی وہ واپس آگیا۔ اس کے پیچھے چار پانچ سازندے ساز اٹھائے کمرے میں آئے اور قالین پر بیٹھ گئے۔

سازوں کی آواز ابھری تو نیم برہنہ رقاصہ یوں کمرے میں داخل ہوئی جیسے جل پری

خلاف ندی میں تیرتی آرہی ہو۔ سازوں کی دھیمی دھیمی آواز کمرے کو گرما رہی تھی اور نوجوان رقاصہ کا مرمریں جسم ناگن کی طرح بل کھا رہا تھا۔ اس کے بازو رقص کی اداؤں میں یوں اوپر نیچے اور دائیں بائیں ہو رہے تھے جیسے فردوس بریں کے ایک بڑے ہی حسین پودے کی ڈالیاں ہوا کے جھونکوں سے ہل رہی ہوں۔ فانوسوں کی رنگارنگ روشنیوں کا اپنا ہی ایک حسن تھا۔

دسترخوان پر بیٹھے ہوئے مہمان کھانا بھول گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نوجوان رقاصہ نے سب کو ہپناٹائز کر لیا ہو لیکن حسن بن صباح اس لڑکی کو کسی اور ہی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی جوہری کے اس وقت کا تاثر تھا جب وہ ہیرا یا کوئی قیمتی پتھر پرکھ رہا ہوتا ہے۔

اس ضیافت' اس رقاصہ پھر ایک مغنیہ اور سازندوں نے اس رات کو الف لیلہ کی ایک ہزار ایک راتوں جیسی ایک رات بنا دیا تھا۔

○

رات آدھی گزر گئی تھی جب حسن بن صباح ضیافت سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ سرائے کا مالک بھی اس کے پیچھے کمرے میں چلا گیا۔ حسن بن صباح پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"پیرو مرشد!" — سرائے کے مالک نے نماز کی طرح اپنے دونوں ہاتھ پیٹ پر باندھ کر کہا — "کیا میں آپ کی خدمت میں کوتاہی تو نہیں کر رہا؟"

"یہ میرا مطلب نہیں تھا" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے تم بوریئے پر بٹھا کر اور روٹی پر دال رکھ کر دے دیتے تو بھی میں اللہ کا شکر ادا کرتا کہ اس کے ایک بندے نے مجھ پر اتنا بڑا کرم کیا ہے..... اب یہ بتا دو کہ تمہارے دل میں کوئی خاص مراد ہے یا تم کسی پریشانی میں مبتلا ہو!"

"اے طوفانوں کا منہ پھیر دینے والے امام!" — سرائے کے مالک نے کہا — "پہلے اس شہر میں صرف میری سرائے تھی اور تمام مسافر میری سرائے میں آتے تھے۔ تھوڑے عرصے سے دو یہودیوں نے ایک سرائے کھول لی ہے۔ وہ مسافروں کو شراب بھی پیش کرتے ہیں لڑکیاں بھی۔ اس سے میری آمدنی بہت کم ہو گئی ہے۔ آپ کو اللہ نے ایسی طاقت عطا کی ہے....."

"اُن کا بیڑہ غرق کرتا ہے یا اپنا بیڑہ پار لگاتا ہے؟" — حسن بن صباح نے اُس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"یہ فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں حضور!" — سرائے کے مالک نے کہا — "میں تو چاہتا ہوں کہ میری آمدنی پہلے جتنی ہو جائے"۔

"ہو جائے گی" — حسن بن صباح نے کہا — "کل ایک کالا بکرا ذبح کرو خواہ چھوٹا سا ہی ہو۔ اُس کے دونوں شانوں کی ہڈیاں میرے پاس لے آنا...... اور مجھے یہ بتاؤ کہ یہ رقاصہ کس کی ملکیت ہے؟"

"ایک بوڑھی رقاصہ کی بیٹی ہے یا ولی!" — سرائے کے مالک نے جواب دیا — "زیادہ تر میں ہی اسے اپنی سرائے میں خاص مہمانوں کے لئے بلایا کرتا ہوں..... کیا حضور کے دل کو یہ اچھی لگی ہے؟"

"ہاں!" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "لیکن اس مقصد کے لئے نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ اگر تم اس کی ماں کو بلاؤ تو میں اُسے اس لڑکی کے متعلق کچھ بتانا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ اس لڑکی کو صرف جسم سمجھتی ہو گی لیکن یہ کمسن لڑکی جسم سے کہیں زیادہ کچھ اور ہے"۔

سرائے کے مالک نے ایک ملازم کو بلا کر کہا کہ رقاصہ اور اس کی ماں کو یہاں لے آئے۔ وہ دونوں ابھی گئی نہیں تھیں۔ اطلاع ملتے ہی آ گئیں۔ سرائے کا مالک انہیں پہلے ہی حسن بن صباح کے متعلق بتا چکا تھا کہ یہ کوئی امام یا ولی ہے اور اس کے ہاتھ میں کوئی ایسی روحانی طاقت ہے جو طوفانوں کو روک دیتی ہے۔ رقاصہ اور اس کی ماں نے بے تابی سے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ حسن بن صباح سے ملنا چاہتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ رہی تھیں کہ امام نے خود ہی انہیں بلا لیا تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوئیں تو حسن بن صباح نے دیکھا کہ رقاصہ ابھی رقص کے لباس میں تھی۔ یہ کوئی لباس نہیں تھا۔ کمر سے اس نے ریشم کی رنگا رنگ رسیاں لٹکا رکھی تھیں۔ ان رسیوں نے اس کا کمر سے نیچے جسم ڈھانپ رکھا تھا لیکن وہ چلتی تھی یا ناچتی تھی تو اس کی ٹانگیں رسیوں سے باہر آ جاتی تھیں۔ اُس کے سینے کا کل لباس ایک انگیا تھی۔ اُس کے شانوں اور پیٹھ کو اُس کے نرم و ملائم بالوں نے ڈھانپ رکھا تھا جو اُس نے کھلے چھوڑے ہوئے تھے۔

"مستور ہو کر آ لڑکی!" — حسن بن صباح نے کہا — "میں تیرے جسم کا طلبگار نہیں۔ میں تیری روح کو برہنہ کر کے دیکھوں گا اور تجھے بھی دکھاؤں گا۔ تو اپنی روح سے انجان ہے؟" — اُس نے رقاصہ کی ماں سے کہا — "جا اسے ایسے کپڑے پہنا کے لا کہ اس کے صرف ہاتھ نظر آئیں اور کچھ چہرہ نظر آئے"۔

ماں بیٹی چلی گئیں۔ سرائے کا مالک وہیں بیٹھا رہا۔

"تمہارا کام ہو جائے گا" — حسن بن صباح نے اُسے کہا — "جب یہ ماں بیٹی آ جائیں تو تم چلے جانا اور صبح میرے پاس آنا"۔

سرائے کا مالک بھی چلا گیا۔

○

رقاصہ اور اُس کی ماں آ گئیں۔ رقاصہ نے ویسا ہی لباس پہن رکھا تھا جیسا حسن بن صباح نے اسے کہا تھا۔ اس لباس نے اس کے چہرے کے نقش و نگار میں سحر انگیز نکھار پیدا کر دیا تھا۔ وہ نوجوان تھی لیکن اب وہ کمسن لگتی تھی..... معصوم سی لڑکی!

"کیا تجھے یہ اس لباس میں اچھی نہیں لگتی؟" — حسن بن صباح نے رقاصہ کی ماں سے پوچھا۔

"ہاں مرشد!" — ماں نے جواب دیا — "یہ مجھے اسی لباس میں اچھی لگتی ہے"۔

"اس لئے یہ اچھی لگتی ہے کہ یہ ایک پاک روح ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "پاک جسم نہیں۔ اس کی قیمت پہچان!"

"میرے مرشد!" — رقاصہ کی ماں نے کہا — "میں بھٹکی ہوئی ایک بے آسرا عورت کیا جانوں ہم ماں بیٹی کا کل کیسا ہو گا۔ ہم نے آپ کی کرامت سنی تو سرائے کے مالک سے التجا کی یہ مجھے آپ کے حضور پیش کر دے اور میں آپ سے پوچھوں کہ بیٹی کو اسی پیشے میں رکھوں یا کوئی اور راستہ دیکھوں۔ مجھے آنے والے وقت کی کچھ خبر دے دیں"۔

حسن بن صباح نے سحر اور علم نجوم میں دسترس حاصل کر لی تھی۔ اُس نے نوجوان رقاصہ کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پھیلایا اور اس کی آڑی ترچھی لکیریں دیکھنے لگا۔ رقاصہ نے اس انتظار میں حسن بن صباح کے چہرے پر نظریں گاڑ دی تھیں کہ زمانے کا یہ برگزیدہ انسان جو بحری جہاز کو ایک خوفناک طوفان کے جبڑوں سے صحیح و

سلامت نکال لایا تھا، وہ اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر کیا پیش گوئی کرتا ہے۔

حسن بن صباح کے چہرے کے تاثرات میں تبدیلیاں نظر آرہی تھیں۔ ایک بار اُس نے اپنا سر یوں پیچھے کیا جیسے رقاصہ کی ہتھیلی کی کوئی لکیر سانپ بن گئی ہو۔ رقاصہ اور اُس کی ماں بھی چونک پڑیں۔

"کیا دیکھا ہے میرے مُرشد!" — سلمیٰ نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"پردے اُٹھ رہے ہیں" — حسن بن صباح نے اس عورت کی طرف دیکھے بغیر زیرِ لب کہا۔

پھر اُس نے رقاصہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اُس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لے کر ذرا اوپر اُٹھایا۔

"آنکھیں پوری کھلی رکھو" — اُس نے رقاصہ سے کہا۔

اُس کی آنکھوں نے رقاصہ کی آنکھوں کو جکڑ لیا۔ حسن بن صباح نے دونوں انگوٹھوں سے رقاصہ کی کنپٹیاں آہستہ آہستہ ملنی شروع کر دیں۔ وہ زیرِ لب کچھ کہہ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد رقاصہ نے دھیمی سی آواز میں کہا — "میں نے سیاہ پردے کے پیچھے دیکھ لیا ہے..... میں جاؤں گی..... یہ جسم نہ گیا تو میں اس سے آزاد ہو کر وہاں پہنچ جاؤں گی"۔

"یہ جسم تمہارے ساتھ جائے گا" — حسن بن صباح نے کہا۔

"یہ جسم میرے ساتھ جائے گا" — رقاصہ نے کہا۔

"کیا کرو گی اس جسم کو؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"یہ جسم ناچے گا نہیں" — رقاصہ نے کہا — "یہ دوسروں کو نچائے گا"۔

"تمہیں ایک قلعہ نظر آرہا ہے" — حسن بن صباح نے کہا۔

رقاصہ خاموش رہی۔ حسن بن صباح نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے چھ سات مرتبہ کہا — "تمہیں ایک قلعہ نظر آرہا ہے"۔

"ہاں!" — رقاصہ نے کہا — "مجھے ایک قلعہ نظر آرہا ہے"۔

"اس قلعے میں تم اپنے آپ کو دیکھ رہی ہو" — حسن بن صباح نے خوابناک سی آواز میں کہا اور یہ الفاظ چند مرتبہ دُہرائے۔

"دیکھ رہی ہوں!" — رقاصہ نے بچوں کی طرح مچلتے ہوئے کہا — "میں اپنے آپ کو دیکھ رہی ہوں"۔

"اپنے آپ کو کس حال میں دیکھ رہی ہو؟"

"چار لڑکیاں ہیں" — رقاصہ نے کہا — "شہزادیاں لگتی ہیں۔ میں انہی جیسے لباس میں ہوں اور ہم سب ایک خوشنما باغ میں اٹھکیلیاں کرتی پھر رہی ہیں"۔

حسن بن صباح نے رقاصہ کا چہرہ چھوڑ دیا اور کچھ دیر اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ رقاصہ نے اپنی آنکھیں تیزی سے جھپکیں اور سر جھکا لیا۔ اُس نے جب سر اٹھایا تو اُس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے کبھی حسن بن صباح کو اور کبھی اپنی ماں کو دیکھتی تھی۔ حسن بن صباح مسکرا رہا تھا۔

"میں کہاں چلی گئی تھی؟" — رقاصہ نے حیرت زدہ آواز میں پوچھا — "میں ایک تاریکی میں سے گذری تھی اور آگے کوئی اور ہی دنیا آگئی تھی"۔

"تمہاری اصل جگہ اُس دنیا میں ہے جو تم نے دیکھی ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "اب تم جہاں ہو یہ ایک فریب اور حسین دھوکہ ہے۔ یہاں تمہارا انجام بہت بُرا ہو گا۔ میرے خدا نے تمہاری قسمت میں بہت اونچا مقام لکھا ہے۔ میں نے تمہیں وہ مقام دکھا دیا ہے..... ماں کو بتاؤ تم نے کیا دیکھا ہے"۔

رقاصہ نے اپنی ماں کو بتایا۔

"لیکن پیر و مُرشد!" — رقاصہ کی ماں نے پوچھا — "ہم اُس مقام تک پہنچ کس طرح سکتی ہیں؟ کیا آپ ہماری راہنمائی اور مدد کر سکتے ہیں؟"

"کر سکتا ہوں!" — حسن بن صباح نے کہا — "لیکن کروں گا نہیں..... میں تمہیں اس کی وجہ بھی بتا دیتا ہوں۔ انسان کی فطرت ایسی ہے کہ میں تو انسان ہوں، انسان اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ میں نے دو تین آدمیوں کو اسی طرح ان کے اصل مقام دکھائے اور انہیں وہاں تک پہنچا بھی دیا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد انہوں نے میرے خلاف باتیں شروع کر دیں۔ اب تو میں کسی کو اس کے متعلق کچھ بتاتا نہیں۔ تم عورت ہو اور مجبوریوں نے یا درہم و دینار کے لالچ نے تمہیں غلط اور خطرناک راستے پر ڈال دیا ہے۔ پھر مجھے تمہاری اس بچی کا خیال آتا ہے۔ میں نے اس کا اصل روپ دیکھ لیا ہے۔ تم نے اس پر بہروپ چڑھا دیا ہے۔ میں اسے اس کے

مقام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ تم اس کے ساتھ ہو گی اور تمہیں ہماری کھوئی ہوئی تعظیم اور تکریم ملے گی"۔

"پھر ہم پر کرم کیوں نہیں کرتے یا مُرشد!" ــــ ماں نے التجا کی۔

"صرف ایک صورت میں کرم ہو سکتا ہے" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "اپنی سوچیں میرے حوالے کر دو۔ اپنے آپ کو بھی میرے حوالے کر دو"۔

"کر دیا مرشد!" ــــ ماں نے کہا۔ "آپ جو حکم دیں گے ہم ماں بیٹی مانیں گی"۔

"پھر سن لو!" ــــ حسن بن صباح نے کہا... "میں جب یہاں سے جاؤں گا تو تم دونوں میرے ساتھ چلو گی"۔

"چلیں گی یا مُرشد!" ــــ رقاصہ کی ماں نے کہا۔

"آج کا رقص تمہارا آخری رقص تھا" ــــ حسن بن صباح نے نوجوان رقاصہ سے کہا ــــ "اب تمہاری نئی اور حقیقی زندگی شروع ہو گئی ہے..... جاؤ اور سو جاؤ..... صبح سے بیمار پڑ جانا۔ سر کپڑے سے باندھ لینا۔ اس سرائے والا یا دوسرے سرائے کے یہودی تمہیں رقص کے لئے بلانے آئیں تو ہائے ہائے شروع کر دینا جیسے تم اس بیماری سے مری جا رہی ہو۔ میری کہنا کہ انہیں بلاؤ میرا علاج کریں۔ میں آکر کوئی بیماری بتا کر سب کو ڈرا دوں گا کہ اس لڑکی کے قریب کوئی نہ آئے ورنہ اُسے بھی یہ بیماری لگ جائے گی"۔

ماں بیٹی چلی گئیں۔ انہیں بتانے والا کوئی نہ تھا کہ اس شخص نے انہیں ایک عمل سے مسحور کر لیا تھا۔ یہ تھا عملِ تنویم جسے مغربی دنیا نے اپنی زبان میں ہپناٹزم کا نام دیا ہے۔

حسن بن صباح نے رقاصہ کو اپنے کام کی چیز سمجھ کر اسے ہپناٹائز کر لیا تھا اور رقاصہ کو وہی کچھ نظر آ رہا جو حسن بن صباح اسے دکھانا چاہتا تھا۔

عملِ تنویم کا تو اپنا اثر تھا، حسن بن صباح کے بولنے کے انداز کا اپنا ایک اثر تھا جو سننے والے کو مسحور کر لیتا تھا۔ یورپی تاریخ نویسوں نے بھی لکھا ہے کہ حسن بن صباح نے اپنے آپ میں ایسے اوصاف پیدا کر لئے تھے جو دوسروں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ یہ ابلیسی اوصاف تھے۔

رقاصہ اور اس کی ماں کے جانے کے بعد حسن بن صباح کے دونوں ساتھی اس کے کمرے میں آ گئے۔

"میں نے اپنی ترکش میں ایک اور تیر ڈال لیا ہے" ــــ حسن بن صباح نے فاتحانہ [انداز میں] اپنے ساتھیوں سے کہا ــــ "یہ رقاصہ ایسا دانہ ہے کہ عقابوں اور شہبازوں کو [ہمارے] جال میں لے آئے گا"۔

"[کیا یہ] ہمارے ساتھ جا رہی ہے؟" ــــ اس کے ایک ساتھی نے پوچھا۔

"دونوں ہمارے ساتھ جا رہی ہیں" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "انہیں کسی [طرح] چھپا کر ساتھ لے جانا پڑے گا"۔

"یہ انتظام ہو جائے گا" ــــ دوسرے نے کہا۔

○

دوسرے دن حسن بن صباح کے کمرے کے باہر اسے ملنے والوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا تھا لیکن کسی کو کمرے میں جانے نہیں دیا جا رہا تھا۔ لوگوں کو بتایا گیا تھا کہ "امام" عبادت میں مصروف ہیں۔

کچھ دیر بعد ایک آدمی اور ایک عورت کو اندر جانے کی اجازت دی گئی۔ یہ میاں بیوی تھے اور یہ سکندریہ سے اناکیہ تک حسن بن صباح کے ہمسفر تھے۔ یہ وہی عورت تھی جس کا پہلے ذکر آیا ہے کہ چہرہ نقاب میں رکھتی تھی۔ صرف پیشانی اور آنکھوں پر نقاب نہیں تھا۔ پیشانی اور آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ عورت حسین ہے۔ اس کے کھڑے قد میں کشش تھی۔ اس کی چال ڈھال میں ایسا جلال سا تھا جس سے لگتا تھا جیسے یہ کسی سردار خاندان کی خاتون ہو۔ بہر حال وہ کوئی معمولی عورت نہیں لگتی تھی۔

کمرے میں جا کر اس عورت کے خاوند نے حسن بن صباح کے آگے رکوع میں جا کر مصافحہ کیا۔ وہ پیچھے ہٹا تو عورت نے آگے بڑھ کر حسن بن صباح کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پہلے آنکھوں اور پھر ہونٹوں سے لگایا پھر اس کا ہاتھ احترام سے اس کی گود میں رکھ دیا۔

"بیٹھ جاؤ میرے ہمسفرو!" ــــ حسن بن صباح نے کہا اور خاوند سے پوچھا ــــ "تم لوگ کہاں گئے تھے اور کس منزل کے مسافر ہو؟"

"ہماری منزل رے ہے" ــــ خاوند نے جواب دیا ــــ "میں اصلاً اصفہانی ہوں... خلجہ اصفہانی میرا نام ہے..... رزق کے پیچھے بہت سفر کیا ہے اور اللہ نے جھولی بھر کے رزق دیا ہے..... دوسری تلاش علم کی ہے۔ علم کے حصول کے لئے بہت سفر کیا ہے

۔ا تھا مصر میں دو عالم ہیں جن کے پاس علم کا سمندر ہے۔ میں اپنی اس بیوی کو ساتھ لے کر مصر گیا تھا۔ ان علماء سے ملا لیکن انہوں نے علم کو اپنے ہی ایک نظریئے میں کھلا کر دیا ہے"۔

"وہ عبیدی ہیں" —— حسن بن صباح نے کہا —— "اور ظاہر کرتے ہیں کہ اسماعیلی ہیں..... تم کس فرقے اور کس عقیدے کے آدمی ہو؟"

"یا ولی!" —— حافظ اصفہانی نے کہا —— "میں ایک اللہ کو مانتا ہوں جو وحدہٗ لاشریک ہے' اس کے آخری کلام کو مانتا ہوں جو قرآن ہے اور اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتا ہوں جن کے ذریعے اللہ کا کلام ہم تک پہنچا۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ علم نہیں کہ میں کون سے فرقے سے تعلق رکھتا ہوں"۔

"اور اب رے کیوں جا رہے ہو؟"

"ابو مسلم رازی سے ملوں گا" —— حافظ اصفہانی نے جواب دیا —— "وہ وہاں امیر ہے۔ اللہ کو ماننے والا حاکم ہے"۔

"اس سے تمہیں کیا حاصل ہو گا؟"

"میں نے اسے کچھ بتانا ہے" —— حافظ اصفہانی نے جواب دیا —— "میں خلجان گیا تھا۔ وہاں ایک بڑا ہی خطرناک فرقہ سر اٹھا رہا ہے۔ ایک شخص احمد بن عطاش نے خلجان پر قبضہ کر لیا ہے۔ سنا ہے وہ شعبدہ بازی اور سحر کا ماہر ہے۔ سنا تھا کہ قلعہ شاہ در اور خلجان کے درمیان علاقے میں ایک پہاڑی پر اللہ کا ایلچی اُترا تھا اور اس علاقے کے لوگوں نے اسے دیکھتے ہی اللہ کا ایلچی مان لیا ہے۔ اس ایلچی کا نام حسن بن صباح ہے..... وہ آپ کا ہم نام ہے..... بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ آپ کے نام کی توہین ہے۔ آپ اللہ کے محبوب اور برگزیدہ بندے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ کو ولی کہوں یا امام کہوں"۔

"تم نے اُس کا نام غلط سنا ہے" —— حسن بن صباح نے کہا —— "اُس کا نام الحسن ابن سبا ہے۔ لوگوں نے اسے حسن بن سبا بنا دیا ہے"۔

"یہ تو بہت ہی اچھا ہے" —— حافظ اصفہانی نے کہا —— "اس کا صحیح نام سن کر مجھے روحانی اطمینان ہو گیا ہے۔ آپ کے نام کی بے ادبی نہیں ہو رہی۔ سنا ہے اس الحسن ابن سبا کی زبان میں اور بولنے کے انداز میں ایسا جادو ہے کہ پتھروں کو بھی موم کر لیتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اُس نے اور احمد بن عطاش نے لوگوں کی ایک فوج تیار کر

لی ہے۔ یہ باقاعدہ فوج نہیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں رہتے ہیں۔ انہیں تیغ زنی' تیر اندازی' برچھی بازی اور گھوڑ سواری کی تربیت دی جاتی ہے"۔

"کیا تم ان لوگوں کے متعلق ابو مسلم رازی کو بتاؤ گے؟" —— حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ہاں یا ولی!" —— حافظ اصفہانی نے جواب دیا —— "میں تو سلطان ملک شاہ تک بھی پہنچوں گا اور اسے اکساؤں گا کہ وہ اس باطل فرقے کو طاقت سے ختم کرے..... مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بڑی مدت سے یہ لوگ قافلوں کو لوٹ رہے ہیں۔ وہ زر و جواہرات لوٹتے ہیں اور لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ آٹھ دس سال عمر کی بچیوں کو بھی لے جاتے ہیں۔ انہیں اپنے مذموم مقاصد اور عزائم کے مطابق تربیت دیتے ہیں۔ زر و جواہرات کا استعمال بھی یہی ہوتا ہے"۔

"میں جانتا ہوں" —— حسن بن صباح نے کہا —— "وہ بہت خطرناک لوگ ہیں"۔

○

حافظ اصفہانی کو معلوم نہ تھا کہ اس نے جس حسن بن صباح کی باتیں کی ہیں وہ یہی شخص ہے جسے وہ ولی اور امام کہہ رہا ہے اور احمد بن عطاش اس کا استاد ہے۔ حسن بن صباح حافظ اصفہانی سے یہ باتیں سن کر ذرا سا بھی نہ چونکا نہ اُس نے کسی ردِ عمل کا اظہار کیا' بلکہ حافظ اصفہانی کی باتوں کی تائید کرتا اور احمد بن عطاش پر لعنتیں بھیجتا رہا۔

"اب ایک عرض سن لیں یا ولی!" —— حافظ اصفہانی نے کہا —— "اجازت ہو تو کہوں"۔

"اجازت کی کیا ضرورت ہے؟" —— حسن بن صباح نے کہا —— "کہو جو کہنا ہے"۔

"اولاد سے محروم ہوں" —— حافظ اصفہانی نے کہا —— "پہلی بیوی سے بھی اولاد نہیں ہوئی۔ وہ فوت ہو گئی تو کچھ عرصے بعد میں نے اس کے ساتھ شادی کر لی"۔

"اس کے ساتھ کب شادی کی ہے؟" —— حسن بن صباح نے پوچھا۔

"بارہ تیرہ سال ہو گئے ہیں" —— حافظ اصفہانی نے جواب دیا —— "اس کا پہلا خاوند ایک قافلے میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا گیا تھا"۔

"کیا اُس سے اس کا کوئی بچہ تھا؟"

"ایک بچی تھی!" —— حافظ نے جواب دیا —— "نو دس سال کی تھی۔ ڈاکو اسے اٹھا

لے گئے تھے"۔

میمنت خوبصورت بچی تھی" ـــــ حافظ کی بیوی نے کہا ـــــ "مجھے اُس سے بہت پیار تھا۔ شاید یہ اُس کے غم کا اثر ہے کہ میں کوئی بچہ پیدا نہ کر سکی"۔

"اور مجھے اس بیوی سے اتنا پیار ہے کہ میں صرف اولاد کی خاطر دوسری شادی نہیں کروں گا" ـــــ حافظ اصفہانی نے کہا ـــــ "آپ کو اللہ نے کرامت عطا کی ہے"۔

"چہرے سے نقاب ہٹا دو" ـــــ حسن بن صباح نے عورت سے کہا۔

عورت نے چہرہ بے نقاب کیا تو حسن بن صباح کو ایسا جھٹکا لگا کہ وہ بدک گیا اور اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ ہو گی کہ یہ عورت غیر معمولی طور پر حسین تھی۔ اس کی عمر زیادہ تھی لیکن اُس کے چہرے پر معصومیت ایسی کہ وہ پچیس سال کی جوان لڑکی لگتی تھی۔

حسن بن صباح کے بدک جانے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اسے یوں لگا جیسے شمونہ نے اس کے سامنے اپنا چہرہ بے نقاب کر دیا ہو۔ شمونہ وہ لڑکی تھی جسے حسن بن صباح لے گیا تھا اور اسے اپنی بیوی بنا لیا اور نام فاطمہ بتایا تھا۔ وہ نظام الملک کی جگہ وزیراعظم بننے کے لئے اس لڑکی کو استعمال کر رہا تھا کہ بھانڈہ پھوٹ گیا اور اسے اس لڑکی کے ساتھ شہر بدر کر دیا گیا تھا۔

اب اس کے سامنے جو چہرہ بے نقاب ہوا تھا وہ اسی لڑکی کا چہرہ تھا جس کا نام شمونہ تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" ـــــ حسن بن صباح نے اس سے پوچھا۔

"میمونہ!" ـــــ عورت نے جواب دیا۔

حسن بن صباح عام سے دماغ والا انسان نہیں تھا۔ اس نے اپنے دماغ میں ایسی طاقت پیدا کر لی تھی جسے تین مؤرخوں نے مافوق العقل کہا ہے۔

"میمونہ!" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "تمہیں واقعی اپنی بیٹی سے بہت محبت تھی۔ اسی لئے تم نے اس کا نام شمونہ رکھا تھا۔ یہ نام تمہارے نام سے ملتا ہے"۔

یہ حسن بن صباح کی قیاس آرائی یا قیافہ شناسی تھی۔ اس عورت کی بیٹی بچپن سے اغوا ہوئی تھی اور اس کی بیٹی کی شکل اس کے ساتھ ملتی تھی اس لئے حسن بن صباح نے بڑی گہری سوچ سے ہوا میں تیر چلایا جو ٹھیک نشانے پر جا لگا۔

"یا امام!" ـــــ میمونہ نے حیرت زدگی کے عالم میں کہا ـــــ "میں نے تو آپ کو اپنی بیٹی کا نام نہیں بتایا تھا!"

"نہیں میمونہ!" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "اگر تمہارے بتانے سے مجھے تمہاری بیٹی کا نام معلوم ہوتا تو پھر میرا کیا کمال ہوا!"

"یا امام!" ـــــ میمونہ نے کہا ـــــ "میں نے آپ کو امام مان لیا ہے..... آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ وہ زندہ ہے یا نہیں' اگر زندہ ہے تو کہاں ہے"۔

حسن بن صباح نے اپنے آپ پر مراقبے کی کیفیت طاری کر لی۔ آنکھیں بند کر لیں۔ ہاتھوں سے عجیب طرح کی حرکتیں کرنے لگا پھر ایک بار اُس نے تالی بجائی۔

"کہاں مر گئے تھے؟" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "میرے سوالوں کے جواب دو..... ہوں ..... اچھا..... وہ ہے کہاں؟..... ٹھیک ہے..... ہاں..... تم جا سکتے ہو"۔

"وہ زندہ ہے" ـــــ حسن بن صباح نے مراقبے سے بیدار ہو کر میمونہ سے کہا ـــــ "اور اُسے رے میں دیکھا گیا ہے"۔

"کیا یہ پتہ چل سکتا ہے کہ رے میں وہ کہاں مل سکتی ہے؟" ـــــ میمونہ نے پوچھا۔

"امیر شہر ابو مسلم رازی سے اس کا سراغ مل سکتا ہے" ـــــ حسن بن صباح نے جواب دیا ـــــ "شمونہ کے ساتھ مجھے ابو مسلم رازی کا چہرہ بھی نظر آیا ہے"۔

کیا حسن بن صباح کو عالم غیب سے اشارہ ملا تھا کہ شمونہ زندہ ہے اور رے میں ہے؟ کیا اس نے کسی پُراسرار عمل کے ذریعے معلوم کر لیا تھا؟

نہیں..... داستان گو پچھلے باب میں اصل حقیقت بیان کر چکا ہے۔ حسن بن صباح نے رے سے مفرور ہوتے وقت حکم دیا تھا کہ شمونہ کو قلعان پہنچا دیا جائے جہاں دوسری لڑکیوں کے سامنے اسے قتل کیا جائے گا لیکن حسن بن صباح کو فرار ہو کر مصر جانا پڑا۔ فرار سے پہلے اسے اطلاع مل گئی تھی کہ شمونہ کہیں بھاگ گئی ہے' پھر اسے یہ اطلاع بھی ملی تھی کہ شمونہ ابو مسلم رازی کے پاس چلی گئی ہے۔

میمونہ یہ سمجھ رہی تھی کہ حسن بن صباح کو مراقبے میں یہ جنات نے بتایا ہے کہ شمونہ اس وقت کہاں ہے۔

"کیا میری بیٹی مجھے مل جائے گی؟" ـــــ میمونہ نے پوچھا۔

"ہاں" ـــــ حسن بن صباح نے جواب دیا ـــــ "مل جائے گی"۔

"یا الٰہی!" — میمونہ نے کہا — "آپ یہ بتا دیں کہ میرا کوئی اور بچہ ہو گا یا نہیں"۔

حسن بن صباح ایک بار پھر مراقبے میں چلا گیا۔

"نہیں، نہیں!" — کچھ دیر بعد آنکھیں بند کیے ہوئے وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز سے بولا — "کچھ کرو..... کوئی طریقہ، کوئی ذریعہ بتاؤ۔ میں انہیں ایک بچہ دینا چاہتا ہوں..... اچھا..... ہاں، بتاتے چلو..... قبر کی نشانی بتاؤ..... ٹھیک ہے"۔

حسن بن صباح نے خاصی دیر بعد آنکھیں کھولیں۔

"ایک بچے کی امید بندھ گئی ہے" — حسن بن صباح نے میمونہ کے خاوند سے کہا — "لیکن میرے جنات نے جو طریقہ بتایا ہے وہ ذرا خطرناک ہے۔ ضروری نہیں کہ اس میں جان چلی جائے۔ میں تمہاری حفاظت کا انتظام کر دوں گا لیکن خطرے کے لیے بھی انہیں تیار رہنا چاہیے"۔

"آپ طریقہ بتائیں" — حافظ اصفہانی نے کہا۔

"یہ کام تمہیں ہی کرنا پڑے گا" — حسن بن صباح نے کہا — "میں کاغذ پر لکھ کر اور یہ کاغذ تہہ کر کے تمہیں دوں گا۔ رات کے وقت قبرستان میں جا کر کوئی ایسی قبر دیکھنا جو بیٹھ گئی ہو۔ ایک کدال ساتھ لے جانا۔ قبر میں اُتر جانا اور کدال سے اتنی مٹی نکال کر باہر پھینکنا جو تمہارے اندازے کے مطابق تمہارے جسم کے وزن جتنی ہو۔ مٹی دو بالشت چوڑی جگہ سے نکالنا تاکہ گڑھا بنتا چلا جائے۔ یہ گڑھا اُس طرف سے کھودنا ہے جس طرف مُردے کا سر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے مُردے کی کھوپڑی نظر آ جائے۔ کھدائی ختم کر دینا اور یہ کاغذ کھوپڑی پر رکھ کر کھودی ہوئی مٹی سے گڑھا بھر دینا اور واپس آ جانا۔ اگر کھوپڑی نظر نہ آئے تو یہ اندازہ کر لینا کہ تمہارے جسم کے وزن جتنی مٹی نکل آئی ہے۔ یہ کاغذ گڑھے میں رکھ کر گڑھا مٹی سے بھر کر آ جانا۔ گیارہ دنوں بعد تمہیں بیوی خوشخبری سنائے گی"۔

حسن بن صباح کے دونوں ساتھی اُس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

"تم دونوں کو معلوم ہے کون سی قبر موزوں ہے" — اس نے ان دونوں ساتھیوں سے کہا — "صبح اسے ساتھ لے جانا اور قبرستان میں کوئی بہت پرانی اور بیٹھی ہوئی قبر اسے دکھا دینا۔ رات کو یہ اکیلا جائے گا"۔

حسن بن صباح نے کاغذ کے ایک پرزے پر کچھ لکھا۔ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر

پھونکیں ماریں، کاغذ کی کئی تہیں کر کے حافظ اصفہانی کو دیا اور کہا کہ اسے کھول کر نہ دیکھے۔

حافظ اور اس کی بیوی میمونہ چلے گئے۔

○

"تم نے اس شخص کی باتیں سنی ہیں" — حسن بن صباح نے اپنے ساتھیوں سے کہا — "یہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ عہدیدار اور سردار ہے۔ یہ ابو مسلم رازی کے پاس جا رہا ہے۔ اُسے بتائے گا کہ خلجان میں کیا ہو رہا ہے"۔

"ہمارے خلاف طوفان کھڑا کرے گا" — ایک ساتھی نے کہا — "آپ حکم دیں کیا کرنا ہے"۔

"کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے؟" — حسن بن صباح نے کہا — "کل رات یہ قبرستان سے زندہ واپس نہ آئے۔ میں نے اسے سب کچھ تمہاری موجودگی میں بتایا ہے۔ تمہیں قبرستان میں پہلے سے موجود ہونا چاہیے"۔

"اب یہ ہم پر چھوڑ دیں" — اُس کے ساتھی نے کہا — "اس کی لاش اُسی قبر میں پڑی ملے گی جس میں کھدائی کر کے وہ تعویذ رکھنے جائے گا"۔

"اس کی اس بیوی کا کیا بنے گا؟" — دوسرے ساتھی نے پوچھا۔

"یہ ہمارے ساتھ جائے گی" — حسن بن صباح نے کہا — "ہمارے کام کی عورت ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے ذریعے اس کی بیٹی شمونہ واپس آ جائے"۔

اگلے روز ابھی سورج طلوع ہوا ہی تھا کہ حافظ اصفہانی حسن بن صباح کے ساتھیوں کے کمرے میں گیا۔ وہ انہیں قبرستان لے جانا چاہتا تھا۔ دونوں تیار تھے۔ اُس کے ساتھ چلے گئے۔

وہ ایک وسیع و عریض قبرستان تھا جس میں نئی قبریں بھی تھیں اور پرانی بھی اور کچھ اتنی پرانی کہ ان کے ذرا ذرا سے نشان باقی رہ گئے تھے۔ ضرورت ایسی قبر کی تھی جو بیٹھ گئی ہو یعنی جو اندر کو دھنس گئی ہو۔ قبرستان کا یہ حصہ ایسا تھا جو بارشوں کے بہتے پانی کے راستے میں آتا تھا۔ وہاں دھنسی ہوئی چند قبریں نظر آ گئیں۔ ایک قبر اتنی زیادہ دھنس گئی تھی کہ اس میں مدفون مُردے کی کھوپڑی اور کندھوں کی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔

"یہ قبر آپ کا کام کرے گی" — حسن بن صباح کے ایک ساتھی نے کہا —

آپ کو کھدائی نہیں کرنی پڑے گی۔ رات کو اس میں اُتریں اور امام کا دیا ہوا کاغذ اس کھوپڑی کے منہ میں رکھ دیں پھر اس پر کدال سے مٹی ڈال دیں"۔

"مٹی بہت ساری ڈالنا بھائی صاحب!" —— دوسرے ساتھی نے کہا —— "اپنے وزن کے برابر مٹی ہو ..... میں آپ کو ایک خطرے سے خبردار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ کو ننگی کھوپڑی مل گئی ہے۔ یہ آپ کی مراد پوری کر دے گی اور بہت جلدی کر دے گی لیکن آپ نے ذرا سی بھی بدپرہیزی یا بے احتیاطی کی تو یہ کھوپڑی آپ کی جان لے لے گی"۔

"پھر بھی اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھائیں" —— دوسرا ساتھی بولا —— "امام نے آپ کی حفاظت کا انتظام کر دیا ہے۔ اللہ کا نام لے کر رات کو آ جائیں"۔

"میں ضرور آؤں گا" —— حافظ اصفہانی نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

اُسے بتانے والا کوئی نہ تھا کہ یہ دن اس کی زندگی کا آخری دن ہے اور اُس کی آنکھیں کل کا سورج نہیں دیکھ سکیں گی۔

○

آدھی رات کے وقت وہ کدال اٹھائے قبرستان میں پہنچ گیا۔

چاندنی اتنی سی تھی جس میں دن میں دیکھی ہوئی قبر تک پہنچنا مشکل نہ تھا۔ وہ جب گھر سے چلا تھا تو میمونہ نے اُسے روک لیا تھا۔

"معلوم نہیں میرے دل پر بوجھ سا کیوں آ پڑا ہے" —— میمونہ نے کہا تھا —— "کیا میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکتی؟"

"نہیں میمونہ!" —— حافظ نے کہا —— "تمہارے سامنے امام نے کہا تھا کہ میں قبرستان میں اکیلا جاؤں۔ یہ شرط ہے جس کی خلاف ورزی ہوئی تو ہماری جانیں خطرے میں آ سکتی ہیں"۔

"میری ایک بات مانیں" —— میمونہ نے کہا تھا —— "مجھے بچہ نہیں چاہئے۔ آپ ہیں تو سب کچھ ہے۔ اس وقت قبرستان میں نہ جائیں"۔

"تم تو بڑے مضبوط دل والی تھیں میمونہ!" —— حافظ نے بڑے پیارے انداز میں کہا تھا —— "میں میدانِ جنگ میں نہیں جا رہا، میں طوفانی سمندر میں نہیں جا رہا۔ مجھے اللہ حافظ کہو میمونہ! میرے جانے کا وقت ہو رہا ہے"۔

"اللہ حافظ!" —— میمونہ نے کہا تھا۔

حافظ اصفہانی جب میمونہ کو اللہ حافظ کہہ کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا تو میمونہ کو ہچکی سی آئی اور اس کا دل ڈوب گیا تھا جیسے اُسے غیب سے اشارہ ملا ہو کہ کوئی انہونی ہونے والی ہے۔

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ کھلا رکھا۔ اسے نیند آ جانی چاہئے تھی لیکن اس کے جسم کا رواں رواں، ریشہ ریشہ بیدار تھا۔ بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔

رات کا آخری پہر شروع ہو گیا۔ میمونہ کو ذرا سی آہٹ سنائی دیتی تو دوڑ کر دروازے تک جاتی اور مایوس لوٹ آتی۔

اسے مؤذن کی آواز سنائی دی تو میمونہ کے دل سے ہوک اٹھی۔ مؤذن نے اذان کے الفاظ میں اعلان کر دیا تھا کہ رات گزر گئی ہے۔

"اتنا وقت نہیں لگنا چاہئے تھا" —— اس کے دل نے کہا۔

دل کانپ رہا تھا۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔

اُس نے وضو کیا اور مصلے پر کھڑی ہو گئی۔ فجر کی پوری نماز پڑھ کر اُس نے نفل پڑھنے شروع کر دیئے۔ ہر چار نفلوں کے بعد ہاتھ پھیلا کر اپنے خاوند کی سلامتی کی دعا مانگتی تھی۔

آنسو اُس کا حسن دھوتے رہے۔ اُس کا دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا تھا کہ وہ اس کی آواز سن سکتی تھی۔

جب صبح کا اجالا سپید ہو گیا تو وہ حسن بن صباح کے ساتھیوں کے کمرے کی طرف اٹھ دوڑی۔ دونوں ہاتھ زور سے دروازے پر مارے اور کواڑ دھماکے سے کھلے۔ دونوں آدمی ناشتہ کر رہے تھے۔ انہوں نے بدک کر دیکھا۔

"حافظ آدھی رات کے وقت قبرستان میں گئے تھے" —— میمونہ نے کہا —— "ابھی تک نہیں آئے ..... انہیں دیکھو"۔

"ہم دیکھنے جائیں گے" —— ایک نے کہا —— "ذرا دل مضبوط کریں۔ وہ آ جائیں گے"۔

اس شخص نے دراصل یہ کہنا تھا کہ حافظ اصفہانی کبھی واپس نہیں آئے گا۔

گزشتہ رات یہ دونوں حافظ اصفہانی سے پہلے قبرستان میں پہنچ گئے اور اس قبر سے کچھ دور ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔ چاندنی میں انہوں نے حافظ کو آتا دیکھ لیا۔ وہ قبر میں اُترا اور جھک کر کھوپڑی پر حسن بن صباح کا دیا ہوا تعویذ رکھنے لگا تو دونوں اٹھے اور حافظ کے عقب میں جا پہنچے۔

حافظ نے تعویذ کھوپڑی پر رکھ دیا۔ وہ جونہی سیدھا ہوا، پیچھے سے دو ہاتھوں نے اس کی گردن شکنجے میں جکڑ لی۔ دوسرے آدمی نے اس کے پیٹ میں پوری طاقت سے گھونسے مارنے شروع کر دیئے۔

تھوڑی سی دیر میں حافظ کا جسم ساکت و جامد ہو گیا۔ دونوں نے اچھی طرح تسلی کر لی کہ وہ مر گیا ہے، اسے دھنسی ہوئی قبر میں لٹا دیا اور واپس آ گئے۔

صبح میمونہ ان کے کمرے میں گئی اور بتایا کہ اس کا خاوند واپس نہیں آیا۔ دونوں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور قبرستان کی طرف چل دیئے۔ میمونہ نے کہا کہ وہ بھی ساتھ جائے گی۔ انہوں نے اسے ساتھ لے لیا۔

قبرستان میں پہنچے تو دُور سے انہیں اس قبر کے اردگرد چند ایک آدمی کھڑے نظر آئے۔ وہ میمونہ کے ساتھ پہنچے تو میمونہ کو دھنسی ہوئی قبر میں اپنے خاوند کی لاش پڑی دکھائی دی۔ میمونہ کی چیخ نکل گئی۔

لوگوں کی مدد سے لاش اٹھا کر سرائے میں لے آئے۔ حسن بن صباح کو اطلاع ملی تو دوڑا دوڑا باہر آیا۔ اُسے تو اُس کے ساتھیوں نے رات کو آکر بتا دیا تھا کہ وہ اس کے حکم کی تعمیل کر آئے ہیں۔ حسن بن صباح نے انہیں خاص شراب پلائی تھی۔

"یاد رکھو دوستو!" — حسن بن صباح نے انہیں کہا تھا — "جس پر ذرا سا بھی شک ہو اُسے ختم کر دو۔ یہ شخص ہمارے لئے خطرناک ہو سکتا تھا۔ اس کی بیوی اب ہمارے ساتھ رہے گی۔ اس کے پاس مال و دولت بھی ہے۔ یہ بھی اب ہمارا ہے..... اور صبح کا انتظار کرو۔"

صبح اسے اطلاع ملی کہ قبرستان سے حافظ اصفہانی کی لاش آئی ہے تو وہ کمرے سے دوڑتا نکلا اور لاش تک پہنچا۔ اُس نے لاش کو ہر طرف سے دیکھا، دونوں ہتھیلیاں رگڑیں اور گھبراہٹ کی ایسی اداکاری کی کہ دیکھنے والوں پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ اُس نے میمونہ کو دیکھا جس کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔

"میمونہ!" — حسن بن صباح نے کہا — "میرے ساتھ آؤ..... جلدی..... ایک لمحہ دیر نہ لگانا" — اُس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا — "تم بھی میرے ساتھ آؤ۔ وقت بہت تھوڑا رہ گیا ہے"۔

وہ میمونہ اور اپنے ساتھی کو اپنے کمرے میں لے گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

"دروازہ بند کر دو میمونہ!" — اُس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا — "فرش پر بیٹھ جاؤ۔ تمہارا خاوند کوئی غلطی کر بیٹھا ہے۔ ایک بڑی ہی خبیث بدروح نے اس کی جان لی ہے۔ یہ بدروح ابھی تک غصے میں ہے۔ میں نے اس کی سرگوشی سنی ہے۔ تمہاری جان بھی خطرے میں ہے۔ چونکہ یہ عمل اس لئے کیا گیا تھا کہ تمہاری کوکھ سے بچہ پیدا ہو اس لئے یہ بدروح تمہیں بھی اسی طرح مارنا چاہتی ہے۔ میں ابھی تمہاری حفاظت کا انتظام کر رہا ہوں"۔

اُس نے میمونہ کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کچھ بڑبڑانا شروع کر دیا۔ وقفے وقفے سے وہ میمونہ کی آنکھوں میں پھونک مارتا تھا۔ میمونہ جو بلک بلک کر رو رہی تھی اور ایسی بے چین کہ ہاتھ نہیں آتی تھی، پُرسکون ہونے لگی۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اُس نے سکون اور اطمینان کی لمبی آہ بھری جیسے اُس کا خاوند زندہ ہو گیا ہو۔ حسن بن صباح نے اسے فرش سے اٹھا کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"میں نے حافظ کو خبردار کر دیا تھا" — حسن بن صباح نے کہا — "لیکن اُسے ایک بچے کا اتنا شوق تھا کہ اُس نے میری پوری بات توجہ سے نہ سنی۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے تمہیں دیکھ لیا اور اس بے رحم بدروح کو بھی دیکھ لیا۔ وہ ابھی تک حافظ پر منڈلا رہی تھی اور بار بار تمہاری طرف دیکھتی تھی..... میں نے تمہیں محفوظ کر لیا ہے لیکن تمہیں دو چاند میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔ اگر تم اس سے پہلے میرے سائے سے دور ہو گئیں تو تمہارا انجام اپنے خاوند سے زیادہ بُرا ہو گا"۔

"یہ آپ کا کرم ہے یا امام!" — میمونہ نے کہا — "میں آپ کے سائے میں نہیں رہوں گی تو جاؤں گی کہاں۔ میری منزل اصفہان ہے"۔

"وہاں تک میں تمہیں بخیر و خوبی پہنچاؤں گا" — حسن بن صباح نے کہا — "میرے محافظ تمہاری منزل تک تمہارے ساتھ جائیں گے..... لیکن تمہارا خاوند کمہ

رہا تھا کہ وہ سلجوقی سلطنت کے حکمران سلطان ملک شاہ سے ملنے مرو جائے گا"۔

"اس لئے آپ کو یہ بھی بتایا تھا کہ وہ مرو کیوں جائے گا"— میمونہ نے کہا— "میرے خاوند نے خلجان' شاہ در اور اس علاقے میں جو دیکھا ہے وہ سلطان ملک شاہ کو بتانا تھا۔ خصوصاً خلجان میں کوئی ایسا فرقہ تیار ہو گیا ہے جس کے عقیدے لوگوں کے دلوں میں اتر گئے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں لیکن ان کے اعمال نہ صرف یہ کہ غیر اسلامی ہیں بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ فرقہ اسلام کو بالکل ہی مسخ کر دے گا۔ سنا ہے اس فرقے نے جانبازوں کا ایک گروہ تیار کر لیا ہے جو اپنی جانوں کی بازی لگا کر اپنے مخالفوں کی جانیں لیتا ہے"۔

"تمہارے خاوند نے مجھے یہ ساری باتیں بتائی تھیں"— حسن بن صباح نے کہا— "تم یہ بتاؤ کہ تم اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں"— میمونہ نے کہا— "وہ خاوند ہی نہیں رہا جو اسلام کا شیدائی تھا۔ میں تو چاہتی ہوں اصفہان پہنچ جاؤں اور سوچوں کہ مجھے اب اپنے مستقبل کے لئے کیا کرنا چاہئے"۔

"کیا تمہارے گھر میں سونا یا درہم و دینار ہیں؟"

"حافظ اصفہانی ایک جاگیر کا مالک تھا"— میمونہ نے جواب دیا— "سونا بھی ہے درہم و دینار بھی ہیں جو گھر کی ایک دیوار میں چھپا کر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ تو ایک دفنی خزانہ ہے لیکن زندگی کا ساتھی ہی نہ رہا تو میں اس خزانے کو کیا کروں گی..... کوشش کروں گی کہ اپنی بیٹی شمونہ کی تلاش میں مرو اور رے جاؤں۔ آپ ہی نے بتایا ہے کہ وہ امیر شہر ابو مسلم رازی کے پاس ہو گی"۔

حسن بن صباح کو دھچکہ سا لگا۔ وہ ایک رات پہلے اس عورت کو بتا چکا تھا کہ اس کی بیٹی کہاں ہے۔ اب اسے خیال آیا کہ اس عورت کو سلطان ملک شاہ اور ابو مسلم رازی کے پاس نہیں جانا چاہئے ورنہ وہ خلجان پر حملہ کرا دے گی یا اسے گرفتار کرا دے گی۔

"پہلے اپنی منزل پر پہنچو"— حسن بن صباح نے کہا— "مجھ سے پوچھے بغیر کہیں نہ جانا۔ تمہاری بیٹی زندہ ہے اور تمہیں مل جائے گی لیکن اپنے آپ اس کی تلاش میں چل پڑنا"۔

میمونہ جذبات کی ماری ہوئی تن تنہا عورت تھی۔ خاوند کی موت کے صدمے نے اس پر ڈوبے کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ وہ تنکوں کے سہارے ڈھونڈ رہی تھی۔ حسن بن صباح سے بہتر سہارا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اسے وہ امام مانتی تھی جو غیب کے پردوں کے پیچھے جھانک کر بتا سکتا تھا کہ کیا ہو چکا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔

میمونہ نے مان لیا تھا کہ حسن بن صباح نے اس کے خاوند کو ٹھیک عمل بتایا تھا لیکن ایک بدروح نے اس کی جان لے لی۔ اس مجبور اور مجبور عورت کو یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ جسے وہ غیب دان امام مانتی ہے' اس نے اسے ہپناٹائز کر لیا ہے اور اب وہ اس کے اشاروں پر چلے گی۔

وہ اس عورت کو ہپناٹائز نہ کرتا تو بھی وہ اس کے جال میں سے نکل نہیں سکتی تھی۔ تمام مؤرخوں نے خصوصاً" یورپی تاریخ نویسوں اور شخصیت نگاروں نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح نے اپنے آپ میں ایسے اوصاف پیدا کر لئے تھے کہ اس کے سامنے اس کا کوئی خونی دشمن اسے قتل کرنے کی نیت سے آجاتا تو وہ بھی اس کا مرید ہو جاتا تھا..... یہ ابلیسیت کا طلسم تھا۔

میمونہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ حسن بن صباح کے ساتھ رہے گی۔

اس کے خاوند کی لاش اس کے کمرے میں پڑی ہوئی تھی۔ حسن بن صباح نے سرائے کے مالک کو بلا کر کہا کہ وہ میت کے غسل اور کفن دفن کا انتظام کرے' اس کے اخراجات میمونہ ادا کرے گی۔

سہ پہر کے وقت حافظ اصفہانی کا جنازہ سرائے سے اٹھا۔ قبرستان میں جا کر حسن بن صباح نے نماز جنازہ پڑھائی۔ وہ جس قبرستان میں بچہ لینے گیا تھا اسی قبرستان میں دفن ہو گیا اور اپنے پیچھے یہ کہانی چھوڑ گیا کہ اسے ایک بدروح نے مارا ہے۔

میمونہ اپنے کمرے میں تنہا ڈرتی تھی۔ اس نے حسن بن صباح سے پوچھا کہ وہ اس کے کمرے میں رہ سکتی ہے؟ حسن بن صباح نے اسے اجازت دے دی۔ میمونہ اپنا سامان اٹھوا کر اس کے کمرے میں چلی گئی۔

اس سرائے میں مسافر اس مجبوری کے تحت رکے ہوئے تھے کہ کوئی قافلہ تیار نہیں ہو رہا تھا۔ لوگ قافلوں کی صورت میں سفر کیا کرتے تھے اکیلے دکیلے مسافروں کو رہزن لوٹ لیتے تھے۔

انہیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ چودہ پندرہ دنوں بعد ایک قافلہ تیار ہو گیا۔ یہ بہت بڑا قافلہ تھا۔ کچھ تاجر تھے' کچھ پورے پورے کنبے تھے۔ زندگی کے ہر شعبے کے لوگ اس قافلے میں شامل تھے۔ عورتیں بھی تھیں' بچے بھی تھے۔

سرائے میں اطلاع آئی تو سرائے خالی ہو گئی۔ حسن بن صباح' اس کے دو ساتھیوں اور میمونہ نے سامان باندھا اور قافلے سے جا ملے۔ انہوں نے ایک گھوڑا اور دو اونٹ کرائے پر لے لئے۔ ایک اونٹ پر بڑی خوبصورت پالکی بندھوائی۔ یہ میمونہ کے لئے تھی۔ قافلے کی روانگی سے پہلے میمونہ کو پالکی میں بٹھا دیا گیا اور حسن بن صباح اپنے ساتھیوں کے ساتھ ذرا پرے جا کھڑا ہوا۔

"اس عورت پر نظر رکھنا" ـــ حسن بن صباح نے اپنے ساتھیوں سے کہا ـــ "یہ اپنے خاوند سے زیادہ خطرناک ہو سکتی ہے۔ میں نے اس کا راستہ بند تو کر دیا ہے پھر بھی یہ دوسرے مسافروں سے نہ ہی ملے تو اچھا ہے۔ اس کا گھر اصفہان میں ہے۔ اپنے مکان کی ایک دیوار میں اس کے خاوند نے اچھا خاصا خزانہ چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس سے یہ خزانہ نکلوانا ہے اور اس کے گھر میں ہی اس عورت کو دفن کر دینا ہے۔ اگر اسے زندہ رہنے دیا گیا تو یہ کسی بھی دن اپنی بچی سے ملنے ابو مسلم رازی کے شہر کو روانہ ہو جائے گی"۔

○

قافلہ چل پڑا۔

بہت دنوں کی مسافت کے بعد قافلہ بغداد پہنچا۔ لوگ دو چار دن آرام کرنا چاہتے تھے۔ بہت سے مسافروں کی منزل بغداد ہی تھی۔ اتنے ہی مسافر بغداد سے قافلے سے آملے۔

حسن بن صباح اپنے ساتھیوں کو ایک سرائے میں لے گیا جس میں انہیں کمرے مل گئے۔ وہاں چند ایک عورتیں بھی ٹھہری ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے آدمی بھی تھے۔

دوسری صبح تھی۔ میمونہ اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ اسے اپنا خاوند بہت یاد آ رہا تھا اور وہ بہت ہی اداس ہو گئی تھی۔ حسن بن صباح نے خود ہی اسے کہا تھا کہ وہ باہر گھومے پھرے' سرائے کے باہر نہ جائے اور عورتوں میں جا بیٹھے۔

وہ باہر نکلی تو اسی کی عمر کی ایک عورت سامنے آگئی۔ وہ بھی حلب کی سرائے سے اپنے

بچے کے ساتھ قافلے میں شامل ہوئی تھی اور وہاں سرائے میں ٹھہری تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میمونہ کا خاوند قبرستان میں ایک بدروح کے ہاتھوں مارا گیا تھا لیکن یہ عورت میمونہ سے پوچھ نہیں سکی تھی کہ اس کا خاوند کس طرح مارا گیا تھا۔ بغداد میں میمونہ اس کے سامنے آگئی۔

"ہم عمر ہو کے ہم ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں" ـــ اس عورت نے میمونہ سے کہا ـــ "عورت کا درد عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔ کچھ دیر کے لئے میرے پاس نہیں آؤ گی؟..... میرے ساتھ میرا خاوند اور اس کا ایک بھائی ہے۔ دو بچے ہیں"۔

میمونہ اداس سی مسکراہٹ سے اس کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی۔ مرد ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔

"یہ تو بتاؤ بہن!" ـــ اس عورت کے خاوند نے میمونہ سے پوچھا ـــ "تمہارا خاوند رات کے وقت قبرستان میں کیا کرنے گیا تھا؟"

"امام نے اسے بھیجا تھا" ـــ میمونہ نے کہا ـــ "کہنا تو یہ چاہئے کہ اسے موت لے گئی تھی..... وہ ایک بچے کا خواہشمند تھا"۔

میمونہ نے ساری بات لفظ بلفظ سنا دی۔

"کیا تمہارے خاوند نے کوئی اور باتیں بھی کی تھیں؟" ـــ اس شخص نے پوچھا ـــ "میں دراصل یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہارا خاوند اس شخص کو جانتا تھا جسے تم امام کہتی ہو؟"

"باتیں تو بہت ہوئی تھیں" ـــ میمونہ نے جواب دیا ـــ "میرا خاوند امام کو پہلے نہیں جانتا تھا۔ ہم مصر سے جہاز میں آ رہے تھے۔ بڑا ہی تیز و تند طوفان آگیا۔ جہاز کا ڈوب جانا یقینی تھا لیکن اس امام نے کہا کہ جہاز نہیں ڈوبے گا' طوفان سے نکل جائے گا... جہاز نکل آیا"۔

یہاں سے بات چلی تو بہت سی باتیں ہوئیں۔ اس عورت کا خاوند کرید کرید کر باتیں پوچھ رہا تھا۔ میمونہ کو شک ہوا کہ یہ آدمی کوئی خاص بات معلوم کرنا چاہتا ہے۔

"میرے بھائی!" ـــ میمونہ نے پوچھا ـــ "معلوم ہوتا ہے آپ کوئی خاص بات معلوم کرنا چاہتے ہیں"۔

"ہاں بہن!" ـــ اس نے کہا ـــ "میرا خیال ہے کہ میں نے خاص بات معلوم کر لی

ہے۔ میں تمہیں اس آدمی سے خبردار کرنا چاہتا ہوں۔ اس شخص کا نام حسن بن صباح ہے اور یہ ایک شیطانی فرقے کا بانی ہے۔ اسے تم امام کہتی ہو۔ یہ اگر امام ہے تو اس شیطانی فرقے کا امام ہے۔ اس کا استاد احمد بن عطاش ہے اور ان لوگوں نے خلجان کو اپنے فرقے کا مرکز بنایا ہے۔ یہ دونوں شیطان کا نام لئے بغیر لوگوں کو شیطان کا پجاری بنا رہے ہیں اور نام اسلام کا لیتے ہیں"۔

"میرے خاوند نے اس کے ساتھ یہ بات کی تھی" ــــ میمونہ نے کہا ــــ "کہا تھا کہ وہ سلطان ملک شاہ اور حاکم رے ابو مسلم رازی کے پاس جا رہا ہے اور انہیں کہے گا کہ احمد بن عطاش اور حسن بن صباح کے خلاف جنگی کارروائی کریں اور اسلام کی اصل روح کو بچائیں۔ میرے خاوند نے جب اسے یہ کہا کہ وہ آپ کا ہمنام ہے تو حسن بن صباح نے کہا کہ اُس کا نام الحسن بن سنا ہے حسن بن صباح نہیں۔ میرے خاوند نے حسن بن صباح اور اُس کے فرقے کے خلاف بہت باتیں کی تھیں اور یہ اس نے دو تین بار کہا تھا کہ میں اس فرقے کو نیست و نابود کرا دوں گا"۔

"میری عزیز بہن!" ــــ اس آدمی نے جو خاصا دانشمند لگتا تھا کہا ــــ "تمہارا خاوند قتل ہُوا ہے۔ اتنی اچھی حیثیت اور عقل و ہوش والا آدمی یہ نہ سمجھ سکا کہ مُردے کسی زندہ انسان کو کچھ نہیں دے سکتے اور حسن بن صباح جیسے شیطان فطرت انسان کی لکھی ہوئی پرچی پر اللہ تبارک و تعالیٰ کسی کی مراد پوری نہیں کیا کرتا۔ حسن بن صباح نے تمہارے خاوند کی دلی مراد سنی تو اس نے فوراً سوچ لیا کہ اپنے اس خطرناک مخالف کو وہ کس طرح قتل کرا سکتا ہے۔ اُس نے تمہارے خاوند کو آدھی رات کے وقت قبرستان میں بھیجا اور پیچھے اپنے آدمی بھیج کر اسے قتل کرا دیا"۔

"میں بھی اُس کے ساتھ یہی باتیں کر چکی ہوں" ــــ میمونہ نے کہا ــــ "اور مجھے اب خیال آتا ہے کہ اس نے مجھ سے یہ بھی اگلوا لیا ہے کہ میرے خاوند نے اصفہان میں اپنے رہائشی مکان کی ایک دیوار میں بہت سا سونا اور اچھی خاصی رقم چھپا کر رکھی ہوئی ہے"۔

"اُس نے کیا کہا تھا؟"

"اُس نے کہا کہ میں تمہیں اصفہان تک اپنے آدمیوں کی حفاظت میں پہنچاؤں گا" میمونہ نے کہا۔

"وہ تمہارے ساتھ اپنے آدمی ضرور بھیجے گا" ــــ اُس شخص نے کہا ــــ "پھر جانتی ہو کیا ہو گا؟ ..... تمہارے خاوند کا خزانہ دیوار سے باہر آ جائے گا اور تم دیوار کے اندر ہو گی۔ کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ تم کہاں غائب ہو گئیں۔ اس حسن بن صباح کے حکم سے یہ فرقہ کئی سالوں سے قافلوں کو لوٹ رہا ہے۔ قافلوں سے یہ زر و جواہرات اور رقمیں لوٹتے ہیں اور خوبصورت کمسن اور نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں"۔

"میں ایک قافلے میں لٹ چکی ہوں" ــــ میمونہ نے کہا ــــ "میرا پہلا خاوند ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور وہ میری اکلوتی بچی کو اٹھا لے گئے تھے"۔

"تمہاری بچی انہی کے پاس ہو گی" ــــ اس آدمی نے کہا۔

"سب باتیں ہو چکیں" ــــ میمونہ نے کہا ــــ "میں نے سب باتیں سمجھ لی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ یہ شخص حسن بن صباح جب آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے تو اس کا ایک ایک لفظ دل میں یوں اُترتا جاتا ہے جیسے یہ الفاظ آسمان سے اُتر رہے ہوں..... میں حیران ہوں کہ سلجوقی سلطان اور ان کے امراء جو اپنے آپ کو صحیح العقیدہ مسلمان سمجھتے ہیں اور اسلام کی پاسبانی کا بھی دعویٰ کرتے ہیں' وہ بے خبر ہیں کہ ان کی سرحد کے ساتھ ساتھ کیا ہو رہا ہے"۔

"ان کے بے خبر ہونے کی ایک وجہ ہے" ــــ اس شخص نے کہا ــــ "ان کے جاسوس ان باطل پرستوں کے علاقے میں جاتے ہیں لیکن وہاں ان پر ایسا نشہ طاری ہو جاتا ہے کہ وہ وہیں کے ہو کے رہ جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض ان باطنیوں کے گرویدہ ہو کر ان کے جاسوس بن کے واپس آ جاتے ہیں۔ وہاں کی باتیں غلط بتاتے ہیں اور سلجوقی حکمرانوں کی صحیح خبریں باطنیوں کو دے کر ان کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو غداری نہیں کرتے' دیانتداری سے جاسوسی کرتے ہیں' وہ وہاں پُراسرار طریقوں سے قتل ہو جاتے ہیں۔ حسن بن صباح نے جاسوسوں اور مشکوک لوگوں کو پکڑنے کا جو نظام بنا رکھا ہے' اس میں اتنی گہری نظر رکھتے ہیں کہ باہر کے جاسوس کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔ انہیں حکم ملا ہُوا ہے کہ ایسا کوئی بھی آدمی نظر آئے اسے قتل کر دو"۔

"آپ یہ ساری باتیں جانتے ہیں" ــــ میمونہ نے پوچھا ــــ "پھر آپ یہ سلطان

ملک شاہ تک کیوں نہیں پہنچاتے؟"

"ان بچوں کی خاطر!" — اس نے کہا — "میں مارا گیا تو ان کا کیا بنے گا؟"

"میں مرو یا رے تک کیسے پہنچ سکتی ہوں؟" — میمونہ نے پوچھا — "پتہ چلا ہے میری بچی وہاں ہے۔ معلوم نہیں یہ کہاں تک سچ ہے لیکن مجھے اس بچی سے اتنی محبت ہے کہ میں اس کی تلاش میں جاؤں گی ضرور۔ مشکل یہ ہے کہ میں اس شخص حسن بن صباح کی قیدی ہوں۔ ہماری منزل کا راستہ دور سے گزرتا ہے۔ اگر میں وہاں تک پہنچ جاؤں تو سلطان تک بھی پہنچ جاؤں گی"۔

"تمہیں ویسے بھی یہاں سے نکل جانا چاہئے" — اس آدمی نے کہا — "اس شخص نے آخر تمہیں قتل کرنا ہے"۔

"میں اس عورت کے لئے ایک قربانی دے سکتا ہوں" — اس آدمی کے بھائی نے جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا کہا — "اگر یہ یہاں سے بھاگنے کے لئے تیار ہو تو آج ہی رات بھاگ چلے۔ میں اس کا ساتھ دوں گا۔ میرے پاس گھوڑا ہے۔ اس کے لئے کسی کا گھوڑا چوری کر لیں گے"۔

"ہمارے پاس [illegible] کا گھوڑا ہے" — میمونہ نے کہا — "اور میں پکی سوار ہوں۔ گھوڑا کیسا ہی منہ زور کیوں نہ ہو، زمین کیسی ہی ناہموار کیوں نہ ہو، میں سنبھل کر ہر چال اور ہر رفتار پر سواری کر سکتی ہوں"۔

"کیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں بھائی جان؟" — اس جوان سال آدمی نے اپنے بھائی سے پوچھا۔

"یہ ایک جہاد ہے" — بڑے بھائی نے کہا — "میں تجھے کیسے روک سکتا ہوں مزمل!"

انہوں نے میمونہ کو فرار کرا کے رے پہنچانے کا بڑا ہی دلیرانہ منصوبہ تیار کر لیا۔

○

میمونہ اپنے کمرے میں حسن بن صباح کے پاس چلی گئی۔

"یہ کیسے لوگ ہیں جن کے ہاں تم اتنا وقت گزار آئی ہو؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"کوئی عام سے لوگ ہیں" — میمونہ نے کہا — "اصفہان جا رہے ہیں۔ حافظ

اصفہانی کو جانتے تھے۔ اسی کی باتیں کرتے رہے"۔

"اب میں باہر جا رہا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "تم آرام کر لو"۔

حسن بن صباح کے جانے کے بعد میمونہ نے اپنی قیمتی چیزیں اور کپڑے چھوٹی سی ایک گٹھڑی میں باندھ کر پلنگ کے نیچے رکھ دیئے۔ رات کو حسن بن صباح گہری نیند سو گیا تو میمونہ نہایت آہستہ سے اٹھی، پلنگ کے نیچے سے گٹھڑی نکالی اور دبے پاؤں باہر نکل گئی۔ سب کے گھوڑے باہر بندھے ہوئے تھے۔ ان کی زینیں وغیرہ ان کے پاس ہی تھیں۔ میمونہ کا ہمسفر مزمل آفندی بہت پہلے باہر نکل گیا تھا۔ دن کے وقت اس نے میمونہ کا گھوڑا دیکھ لیا تھا۔ مزمل نے دونوں گھوڑوں پر زینیں کس دی تھیں۔

میمونہ پہنچ گئی، گٹھڑی اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھی اور گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ مزمل آفندی بھی گھوڑے پر سوار ہوا اور دونوں گھوڑے چل پڑے۔ پہلے وہ آہستہ آہستہ چلے پھر تیز ہو گئے اور جب شہر کے دروازے سے نکلے تو اور تیز ہو گئے۔ کچھ دور جا کر انہوں نے ایڑ لگائی اور گھوڑے سرپٹ دوڑ پڑے۔

صبح حسن بن صباح کی آنکھ کھلی تو اس نے میمونہ کو غائب پایا۔ اپنے ساتھیوں کے کمرے میں جا کر انہیں کہا کہ اسے ڈھونڈیں۔ اس وقت تک میمونہ بغداد سے ساٹھ میل دور پہنچ چکی تھی۔

"وہ سلجوقیوں کے پاس چلی گئی ہے" — حسن بن صباح نے اس وقت کہا جب اسے پتہ چلا کہ گھوڑا غائب ہے۔ اس نے کہا — "ہم قافلے کا انتظار نہیں کریں گے۔ ہمیں فوراً اصفہان پہنچنا چاہئے۔ وہاں سے خلجان کی صورت حال معلوم کر کے وہاں جائیں۔ احمد بن عطاش کو خبردار کرنا ضروری ہے"۔

ان کے پاس دو اونٹ تھے۔ انہوں نے ایک اچھی نسل کا گھوڑا کرائے پر لے لیا اور اسی وقت روانہ ہو گئے۔ دونوں اونٹوں کا مالک اور گھوڑے کا مالک بھی ان کے ساتھ تھے۔

مزمل آفندی اور میمونہ اتنی تیز گئے تھے اور انہوں نے اتنے کم پڑاؤ کئے تھے کہ تین دنوں بعد رے پہنچ گئے۔ وہ سیدھے امیر شہر ابو مسلم رازی کے ہاں چلے گئے۔ دربان سے کہا کہ وہ امیر شہر سے ملنا چاہتی ہے۔

"کام کیا ہے؟" — دربان نے پوچھا — "کہاں سے آئی ہو؟ تم ہو کون؟"

"کیا ہمارے گھوڑوں کا پسینہ نہیں بتا رہا کہ ہم بہت دور سے آئے ہیں؟"
میمونہ نے کہا — "ہمارے چہرے دیکھو، ہمارے کپڑوں پر گرد دیکھو۔ امیر سے کہو ایک ماں اپنی بیٹی کی تلاش میں آئی ہے"۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اور مزمل ابو مسلم رازی کے کمرے میں اُس کے سامنے کھڑے تھے۔

"بہت دور سے آئے لگتے ہو" — ابو مسلم رازی نے کہا۔

"بغداد سے!" — مزمل نے جواب دیا۔

"دربان نے بتایا ہے تم اپنی بیٹی کی تلاش میں آئی ہو" — ابو مسلم رازی نے کہا — "کون ہے تمہاری بیٹی؟ یہاں اُس کا کیا کام؟"

"اُس کا نام شمونہ ہے" — میمونہ نے کہا — "کسی نے بتایا تھا یہاں ہے"۔

"ہاں!" — ابو مسلم رازی نے کہا — "وہ یہیں ہے" — اُس نے دروازے کے باہر کھڑے خدمت گار کو بلا کر کہا — "شمونہ کو لے آؤ"۔

جب ماں بیٹی کا آمنا سامنا ہوا تو کچھ دیر دونوں چُپ چاپ ایک دوسری کو دیکھتی رہیں۔

"اپنی ماں کو پہچانتی ہو شمونہ؟" — ابو مسلم رازی نے کہا۔

ماں بیٹی یوں ملیں جیسے ایک دوسری کے وجود میں سما جانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ماں اپنی بیٹی کے بازوؤں سے نکل آئی اور ابو مسلم رازی کی طرف دیکھا۔

"میں صرف اپنی بیٹی کی تلاش میں نہیں آئی تھی امیر شہر!" — میمونہ نے کہا — "میرا اصل مقصد کچھ اور ہے...... کیا آپ حسن بن صباح کو جانتے ہیں؟"

"حسن بن صباح!" — ابو مسلم رازی نے کہا — "کیوں؟ ..... اسے جانتا ہوں..... سلطانِ معظم نے اُسے زندہ پکڑ لانے کے لئے ایک سالار امیر ارسلان کو حکم دے دیا ہے"۔

سلطان ملک شاہ نے سالار امیر ارسلان کو حکم تو دے دیا تھا کہ حسن بن صباح کو زندہ پکڑ لائے لیکن حسن بن صباح کا سراغ نہیں مل رہا تھا کہ وہ ہے کہاں۔ سلطان نے امیر ارسلان سے یہ کہا تھا کہ حسن بن صباح کا سراغ لگاؤ اور اسے پکڑو۔

"کیا آپ کو معلوم ہے وہ ہے کہاں؟" — مزمل آفندی نے جو میمونہ اور شمونہ کے ساتھ تھا، ابو مسلم رازی سے پوچھا۔

"نہیں!" — ابو مسلم رازی نے جواب دیا — "یہی ایک سوال ہے جس کا جواب کسی کے بھی پاس نہیں۔ ایک خبر ملی تھی کہ وہ مصر چلا گیا ہے اور یہ خبر بھی ملی ہے کہ مصر سے واپس آ گیا ہے"۔

"ہم اسے بغداد چھوڑ آئے ہیں" — مزمل آفندی نے کہا۔

"اور یہ میں آپ کو بتا رہی ہوں" — میمونہ نے کہا — "کہ وہ مصر سے واپس آ گیا ہے اور اصفہان جا رہا ہے۔ میں سکندریہ سے اپنے خاوند کے ساتھ اُس کی ہم سفر تھی۔ یہ میرا خاوند تھا جسے حلب میں حسن بن صباح نے قتل کروا دیا تھا"۔

"قتل کروا دیا تھا؟" — ابو مسلم رازی نے چونک کر پوچھا — "وہ کیسے؟"

میمونہ نے اسے سارا واقعہ سنا دیا۔

"اور پھر اس نے مجھے اپنے اثر میں لے لیا" — میمونہ نے کہا — "اس نے ایسے انداز اور ایسے طریقے سے میرے ساتھ باتیں کیں کہ میں اسے خدا کی طرف سے زمین پر اترا ہوا فرشتہ سمجھنے لگی۔ میں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ میرے خاوند کی جان ایک بدروح نے لی ہے اور یہ بدروح میری بھی جان لے گی اور اس بزرگ و برتر شخصیت حسن بن صباح نے مجھے اس بدروح سے محفوظ کر لیا ہے"۔

"کیا اس نے تمہیں اپنے ساتھ رکھ لیا تھا؟" — ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"سرائے میں وہ الگ کمرے میں رہتا تھا" — میمونہ نے جواب دیا — "میں اس کے ساتھ اس کمرے میں رہنے لگی تھی"۔

"میں حیران ہوں کہ تم اُس کے چنگل سے نکل کس طرح آئیں" — ابو مسلم رازی نے کہا۔

"مزمل آفندی اور اس کے بڑے بھائی کی راہنمائی اور مدد سے وہاں سے نکلی ہوں" — میمونہ نے کہا۔

www.paksociety.com

میمونہ نے تفصیل سے سنایا کہ وہ کس طرح مزمل آفندی اور اس کے بڑے بھائی سے اتفاقیہ ملی تھی اور بڑے بھائی نے اسے حسن بن صباح کی اصلیت بتائی تھی۔

"امیرِ شہر!" — مزمل آفندی نے کہا — "ہم اصفہان کے رہنے والے ہیں۔ تجارت ہمارا پیشہ ہے۔ ہم شہر شہر، قصبہ قصبہ جاتے ہیں، لوگوں سے ملتے ملاتے ہیں، ان کی باتیں سنتے ہیں اور چونکہ ہم اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلنے والے مسلمان ہیں اس لئے ہم جہاں بھی جاتے ہیں وہاں غور سے دیکھتے ہیں کہ کہیں اسلام کی روح کو مسخ تو نہیں کیا جا رہا"۔

"ان قلعوں کے علاقوں میں تم نے کیا دیکھا ہے؟" — ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"ان علاقوں میں لوگ حسن بن صباح کو خدا کا ایلچی سمجھتے ہیں" — مزمل آفندی نے کہا — "ان کا عقیدہ ہے حسن بن صباح آسمان سے زمین پر اترا تھا اور پھر آسمان پر چلا گیا ہے اور ایک بار پھر اس کا ظہور ہو گا"۔

"ہمیں معلوم ہو چکا ہے" — ابو مسلم رازی نے کہا — "لیکن ہم لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔ لوگ تو کھیتی کی مانند ہیں۔ کھیتی ہر بیج کو قبول کر لیتی ہے۔ حشیش کا پودا بھی کھیتی اگاتی ہے اور حنا بھی کھیتی ہی دیتی ہے۔ ہم اسے پکڑیں گے جو حنا پیدا کرنے والی زمین میں حشیش کا بیج بوتا ہے"۔

"مجھے ایک شک ہے امیرِ شہر!" — مزمل آفندی نے کہا — "ایسے لوگوں کو آپ فوج کہہ لیں یا احمد بن عطاش اور حسن بن صباح کے جانباز پیروکار کہہ لیں، انہیں حشیش پلائی جاتی ہے اور نشے کی حالت میں ان کے دماغوں میں وہ لوگ اپنے بے بنیاد عقیدے ڈالتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کی تو انہوں نے کایا پلٹ دی ہے۔ محصولات اور مالیہ اس قدر کم کر دیا گیا ہے جو انتہائی غریب کسان نہایت آسانی اور خوشی سے دیتا ہے"۔

"وہ محصولات اور مالیہ بالکل معاف کر سکتے ہیں" — ابو مسلم رازی نے کہا — "قافلے لوٹ لوٹ کر انہوں نے قارون جیسے خزانے اکٹھے کر لئے اور ابھی تک ان کی لوٹ مار جاری ہے۔ قتل و غارت گری ان لوگوں کا دستور ہے۔ اس عورت کو دیکھو۔ اس کی اس بچی شمونہ کو حسن بن صباح کے ڈاکوؤں نے چھوٹی سی عمر میں اغوا کر لیا تھا۔ اس کی ماں کو دیکھو۔ اس کے دو خاوند ان لوگوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں"۔

"امیرِ محترم!" — مزمل آفندی نے پوچھا — "آپ کے سالار امیر ارسلان حسن

بن صباح کی گرفتاری کے لئے کب روانہ ہو رہے ہیں؟"

"میں ضروری نہیں سمجھتا کہ تمہیں اس سوال کا جواب دوں" — ابو مسلم رازی نے کہا — "مجھے یہ بتاؤ کہ بغداد سے اس قافلے نے کب روانہ ہونا تھا؟"

"ابھی اس کی روانگی کے کوئی آثار نہیں تھے" — مزمل آفندی نے جواب دیا — "اگر روانہ ہو بھی چکا ہو تو ابھی راستے میں ہی ہو گا"۔

"تم بغداد اپنے بھائی کے پاس جانا چاہو گے؟" — ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"یقیناً!" — مزمل آفندی نے کہا — "وہ میرے لئے پریشان بھی ہوں گے مگر میں ایک خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ میں اس خاتون کو وہاں سے لایا ہوں۔ یہ دراصل حسن بن صباح کے قبضے میں تھی۔ اسے میں اُس کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچا کر لایا ہوں۔ ہو سکتا ہے حسن بن صباح پر یہ راز کھل جائے تو وہ مجھے قتل نہیں کرا دے گا؟"

"تم اکیلے نہیں جاؤ گے" — ابو مسلم رازی نے کہا — "میں مرو جا رہا ہوں۔ سلطان سے کہوں گا کہ سالار امیر ارسلان کو فوراً بغداد بھیج دے۔ اگر قافلہ اصفہان کی طرف روانہ ہو گیا ہو تو اس کا تعاقب کرے اور حسن بن صباح کو پکڑ کر لے آئے۔ تمہیں اس کے ساتھ جانا پڑے گا۔ میرا خیال ہے امیر ارسلان حسن بن صباح کو نہیں پہچانتا۔ یہ تم اسے بتاؤ گے۔ وہ تمہیں اپنی پناہ میں رکھے گا..... تمہیں یہاں تین یا چار دن رکنا پڑے گا۔ امیر ارسلان یہاں آ کر روانہ ہو گا"۔

○

ابو مسلم رازی اُسی روز مرو کو روانہ ہو گیا۔ اُس کے حکم سے مزمل آفندی کی رہائش کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ شمونہ کو ابو مسلم رازی نے اپنے مکان میں ٹھہرایا ہوا تھا۔ میمونہ اس کے ساتھ چلی گئی۔

مزمل آفندی نے جس وقت سے شمونہ کو دیکھا تھا اس کی نظریں شمونہ سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ شمونہ بہت ہی حسین لڑکی تھی لیکن اس کے چہرے پر ایک تاثر اور بھی تھا۔ مزمل آفندی محسوس کر رہا تھا کہ اس لڑکی کا حسن صرف جسمانی نہیں۔ اس لڑکی میں اسے کوئی اور ہی پرتو نظر آ رہا تھا۔

مزمل آفندی اپنے کمرے میں گیا تو وہ اپنے آپ میں ایسی ہلچل محسوس کر رہا تھا جو اُس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ بے قرار سا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کس

بہانے وہ ماں بیٹی کے کمرے میں جائے۔ وہ تین چار بار اس توقع پر نکلا شاید ماں یا بیٹی باہر نکلے تو اس کے پاس آجائے یا اسے بلا لے۔ اس نے میمونہ پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔

شام گہری ہونے کے بعد مزمل آفندی کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ شمونہ اس کے کمرے میں آگئی۔ مزمل آفندی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ شمونہ اس کے کمرے میں آئی ہے۔

"میں تمہارے چہرے پر حیرت کا تاثر دیکھ رہی ہوں" ـــ شمونہ نے کہا ـــ "کیا تمہیں عجیب لگا ہے کہ میں رات کے وقت تمہارے کمرے میں آئی ہوں؟"

"ہاں شمونہ!" ـــ مزمل آفندی نے کہا ـــ "مجھے تمہارا یہاں آنا عجیب لگا تھا لیکن جس بیباکی سے تم نے پوچھا ہے اس سے میری حیرت ختم ہو گئی ہے۔ میں تمہیں حرم کی ایک عام سی لڑکی سمجھا جو بچپن میں اغوا ہو کر یہاں تک پہنچی ہے"۔

"میں اغوا ہوئی تھی" ـــ شمونہ نے کہا ـــ "لیکن میں کسی کے حرم میں قید نہیں ہوئی نہ مجھے جسمانی تفریح کا ذریعہ بنایا گیا تھا بلکہ مجھے ایسی تربیت دی گئی کہ میں پتھر دل آدمی کو موم کی طرح پگھلا کر اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال سکتی ہوں"۔

"تمہیں یہ تربیت کس نے دی تھی؟" ـــ مزمل آفندی نے پوچھا۔

"حسن بن صباح کے فرقے نے!" ـــ شمونہ نے جواب دیا ـــ "لیکن مزمل! میں تمہیں یہ داستان سنانے نہیں آئی کہ میں کیا تھی اور اب کیا ہوں"۔

"ساری داستان نہ سہی" ـــ مزمل آفندی نے کہا ـــ "میں کچھ نہ کچھ تو ضرور معلوم کرنا چاہوں گا...... جس طرح تم نے میرے ساتھ بیباکی سے بات کی ہے اسی طرح میں بھی تھوڑی سی بیباکی کا حق رکھتا ہوں۔ اگر تمہیں اچھا نہ لگے تو مجھے روک دینا"۔

"آفندی!" ـــ شمونہ نے کہا ـــ "مجھے وہ انسان اچھا لگتا ہے جس کی زبان پر وہی ہو جو اس کے دل میں ہے"۔

"شمونہ!" ـــ مزمل آفندی نے کہا ـــ "میری زبان پر تمہارا نام ہے اور میرے دل میں بھی تم ہی ہو۔ میں نے تمہیں آج ہی دیکھا ہے اور میرے دل نے کہا ہے کہ اس لڑکی کا حسن جسمانی نہیں روحانی ہے اور 'خدا کی قسم' میں نے یقین کی حد تک محسوس کیا کہ میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں اور بچپن سے تم میرے دل میں موجود ہو۔ اگر تمہیں میری نیت پر شک ہو تو یہ سوچ لینا کہ میں اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر تمہاری

ماں کو یہاں لایا ہوں' اور اسے میں اس لئے نہیں لایا کہ تم خوش ہو جاؤ گی۔ تمہیں تو میں جانتا تک نہ تھا۔ میں ایک مظلوم اور فریب خوردہ عورت کو ایک ابلیس کے جال سے نکال کر لایا ہوں۔ یہ کہتی تھی کہ میری بیٹی سلجوقی سلطان یا کسی امیر کے پاس ہے۔ میں اسے محض خواب اور خیال سمجھتا تھا۔ میں تو یہ سوچ کر اسے لے آیا تھا کہ اسے ابو مسلم رازی کی پناہ میں چھوڑ کر لوٹ جاؤں گا"۔

"میں تمہاری بات سمجھ گئی ہوں آفندی!" ـــ شمونہ نے کہا ـــ "مجھے یقین ہے کہ تم میری خاطر نہیں آئے"۔

"یہ تو اتفاق ہے" ـــ مزمل آفندی نے کہا ـــ "اسے معجزہ کہوں تو بھی غلط نہیں ہو گا کہ تم یہاں مل گئیں"۔

"یہ اللہ کا انعام ہے" ـــ شمونہ نے کہا ـــ "اللہ نے میری توبہ قبول کر لی ہے.... میرے دماغ میں ابلیسیت ڈالی گئی تھی اور میرے خیالات اور میرے کردار کو ابلیسیت کے سانچے میں ڈھال دیا گیا تھا لیکن ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ میں ہوش میں آگئی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اپنے آپ کو ابلیسی اوصاف سے پاک کر کے انسانیت کے دائرے میں داخل ہو سکوں گی لیکن مجھ پر یہ راز کھلا ہے کہ انسان آخر انسان ہے اور وہ اول آخر انسان رہتا ہے۔ کبھی حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ انسان ابلیسیت کی طرف مائل ہو جاتا ہے یا ایسے انسانوں کے نرغے اور اثر میں آجاتا ہے کہ اسے ابلیسیت میں لذت حاصل ہوتی ہے اور وہ ابلیس کا پجاری بن جاتا ہے لیکن وہ رہتا انسان ہی ہے' وہ ابلیس نہیں بن جاتا۔ یہ سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے۔ اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ وہ ارادہ کر لے اور یہ سمجھ لے کہ اللہ نے اپنی نگاہ میں انسان کو کتنا اونچا مقام دیا ہے تو وہ ایک جھٹکے سے ابلیس کے چنگل سے نکل کر اللہ کے قریب ہو سکتا ہے...... یہ میں نے کیا اور اللہ نے یہ انعام دیا کہ مجھے میری بچھڑی ہوئی ماں دے دی"۔

"یہ عمر اور یہ حسن!" ـــ مزمل آفندی نے کہا ـــ "اور یہ سنجیدگی؟"

"کیا تمہیں یہ سنجیدگی اچھی نہیں لگی؟" ـــ شمونہ نے پوچھا۔

"یہی تو مجھے اچھی لگی ہے" ـــ مزمل آفندی نے کہا ـــ "تم چاہتی ہو کہ جو دل میں ہو وہی زبان پر آئے...... میرے دل کی آواز سن لو شمونہ! میرے دل میں تمہاری وہ محبت پیدا ہو گئی ہے جس کا تعلق روح کے ساتھ ہے اور تم نے ایسی محبت کے قصے سنے ہوں

گے"۔

شمونہ چونک پڑی۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا جیسے وہ خوفزدہ ہو گئی ہو۔ وہ آنکھیں پھاڑے مزمل آفندی کو دیکھنے لگی جیسے اس جواں سال اور خوبرو آدمی نے اسے کہہ دیا ہو کہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔

"کیوں شمونہ!" ــــ مزمل آفندی نے کہا ــــ "کیا میں نے تمہارے دل کو تکلیف پہنچائی ہے؟"

"نہیں آفندی!" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "مجھے شک ہے کہ میری محبت اور موت میں کوئی زیادہ فرق نہیں"۔

مزمل آفندی سراپا سوال بن گیا۔

"آج میں کچھ اور کہنے آئی تھی" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "میں تمہاری شکرگزار ہوں کہ تم میری ماں کو لے آئے ہو..... اور اس سے زیادہ اللہ کی شکرگزار ہوں کہ ماں نے مجھے انسان کے روپ میں دیکھا ہے۔ اس سے پہلے دیکھتی تو وہ کہتی 'نہیں' یہ میری بیٹی نہیں"۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم جا رہی ہو" ــــ مزمل آفندی نے کہا ــــ "میں کیا سمجھوں؟..... ناراض ہو کر جا رہی ہو؟....."

"کل آؤں گی آفندی!" ــــ شمونہ نے قدرے خوشگوار لہجے میں جواب دیا ــــ "میں ناراض نہیں ہوں۔ تمہاری نیت سمجھ گئی ہوں۔ میں چہرے سے نیت معلوم کر لیا کرتی ہوں..... میں نے تمہارے ساتھ کچھ اور باتیں بھی کرنی ہیں"۔

شمونہ چلی گئی۔

○

اگلے روز کا سورج طلوع ہوا۔ مزمل آفندی ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ شمونہ اپنی ماں میمونہ کے ساتھ اس کے کمرے میں آگئی۔

"مزمل!" ــــ میمونہ نے کہا ــــ "میری بیٹی نے بتایا ہے کہ تم نے اسے اپنے لئے پسند کیا ہے"۔

"نہیں!" ــــ مزمل آفندی نے کہا ــــ "اپنے لئے پسند کرنے کا مطلب کچھ اور

ہوتا ہے۔ شمونہ بازار کی کوئی چیز نہیں کہ یہ مجھے پسند آگئی ہے اور میں یہ چیز خرید لوں گا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں اس کی محبت کا اسیر ہو گیا ہوں اور یہ محبت میری روح میں اُتر گئی ہے اگر شمونہ مجھے قبول نہیں کرے گی تو میری روح سے اس کی محبت نکل نہیں سکے گی"۔

"تمہیں قبول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ شمونہ کرے گی" ــــ میمونہ نے کہا اور پوچھا ــــ "کیا تم اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"شادی صرف اس صورت میں کروں گا کہ یہ میری محبت کو قبول کر لے" ــــ مزمل آفندی نے کہا ــــ "لیکن اے قابلِ احترام خاتون! میں ابھی شادی کی بات ہی نہیں کروں گا۔ پہلے وہ مہم سر کروں گا جس کے لئے میں یہاں رکا ہوں..... حسن بن صباح کی گرفتاری..... سلطان نے حکم دیا ہے کہ حسن بن صباح کو زندہ اس کے سامنے لایا جائے لیکن وہ میرے سامنے آگیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میری تلوار اس کے خون کی پیاسی ہے"۔

"اس لئے کہ اس نے میرے پہلے خاوند کو ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل کر دیا تھا؟" ــــ میمونہ نے پوچھا ــــ "اور اس لئے کہ اس نے میرے دوسرے خاوند کو بھی قتل کروا دیا ہے؟..... کیا تم ہم ماں بیٹی کو خوش کرنا چاہتے ہو؟"

"نہیں!" ــــ مزمل آفندی نے جواب دیا ــــ "میں اللہ کو اور اللہ کے رسولؐ کی روحِ مقدس کو خوش کرنا چاہتا ہوں۔ حسن بن صباح نے بے شمار عورتوں کو بیوہ اور بے شمار بچوں کو یتیم کیا ہے اور وہ اسلام کی روح کو قتل کر رہا ہے"۔

"آفندی!" ــــ شمونہ بے اختیار بولی ــــ "اگر تم اس ابلیس کو قتل کر دو تو خدا کی قسم اپنا جسم اور اپنی روح تمہارے قدموں میں ڈال دوں گی"۔

"میں نے اس سے اپنے دو خاوندوں کے قتل کا انتقام لینا ہے" ــــ میمونہ نے کہا ــــ "اور اس نے میری بیٹی کو جو تربیت دی اور اس سے جو قابلِ نفرت کام کروائے ہیں میں نے اس کا بھی انتقام لینا ہے"۔

"لیکن ماں!" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "کیا آپ محسوس نہیں کر رہیں کہ آپ بھی اور آفندی بھی جذباتی باتیں کر رہے ہیں؟ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ حسن بن صباح کو قتل کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنی آسانی سے آپ قتل کے ارادے کی باتیں کر رہے ہیں؟ میں

www.paksociety.com

اُس کے ساتھ رہی ہوں۔ کوئی شخص اُس کے پاس اُسے قتل کرنے کے ارادے سے جائے گا تو وہ سوچ میں پڑ جائے گا کہ اس شخص کو قتل کروں یا نہ کروں"۔

"میں اُس کی یہ طاقت دیکھ چکی ہوں" ـــــ میمونہ نے کہا ـــــ "میں اسے طاقت نہیں جادو کہوں تو غلط نہیں ہو گا"۔

"طاقت کہو یا جادو!" ـــــ شمونہ نے کہا ـــــ "اُسے جتنا میں جانتی ہوں اتنا تم دونوں نہیں جانتے۔ میں کہہ رہی ہوں کہ اسے قتل کرنے کا کوئی اور طریقہ سوچنا پڑے گا۔ اب سلطان اسے پکڑ لانے کے لئے فوج بھیج رہا ہے۔ میں آپ کو بتاتی ہوں وہ نہیں پکڑا جائے گا۔ اگر پکڑا گیا تو بڑا ہی خوبصورت دھوکہ دے کر نکل جائے گا۔ اسے قتل کرانے کے لئے قرامطیوں کو استعمال کیا جائے تو کامیابی کی امید رکھی جا سکتی ہے"۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" ـــــ مزمل آفندی نے پوچھا۔

"یہ میں اس لئے کہہ سکتی ہوں کہ میں حسن بن صباح کے ساتھ رہی ہوں"۔ شمونہ نے جواب دیا ـــــ "اس نے تین چار بار یہ الفاظ کہے تھے کہ صرف قرامطی ہیں جن سے میں خطرہ محسوس کرتا ہوں..... میں نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے کہا تھا کہ قرامطی خونخوار لوگ ہیں اور ان کی تاریخ قتل و غارت گری سے بھری پڑی ہے۔ حسن بن صباح نے مجھے بتایا تھا کہ قرامطیوں نے خانہ کعبہ میں بھی مسلمانوں کا قتلِ عام کیا تھا"۔

"لیکن اب قرامطیوں میں وہ بات نہیں رہی" ـــــ میمونہ نے کہا۔

"میں حسن بن صباح کی بات کر رہی ہوں" ـــــ شمونہ نے کہا ـــــ "وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ خدا سے بھی نہیں ڈرتا لیکن اُس کے دل میں قرامطیوں کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ ایک بار اُس نے مجھے ایک ماں بیٹے کا قصہ سنایا اور کہا تھا کہ یہ سچا واقعہ ہے۔ اس کا راوی بغداد کا ایک مشہور طبیب ابوالحسین ہے جو عرصہ ہوا فوت ہو گیا ہے۔ اس کا سنا ہوا یہ واقعہ کاتبوں نے تحریر کر لیا تھا.....

"اس طبیب کے پاس ایک عورت آئی جس کے شانے پر تلوار کا گہرا اور لمبا زخم تھا۔ وہ زخم کی مرہم پٹی کرانے آئی تھی۔ طبیب نے پوچھا کہ یہ زخم کیسے آیا ہے۔ عورت نے زار و قطار روتے ہوئے کہا کہ اس کا اکلوتا اور نوجوان بیٹا کچھ عرصے سے لاپتہ ہے وہ شہروں اور قصبوں کی خاک چھانتی پھری مگر بیٹے کا کھوج نہ ملا.....

وہ قریہ قریہ میں تھی۔ بیٹا وہاں بھی نہیں تھا۔ کسی نے اسے کہا کہ وہ بغداد چلی جائے شاید بیٹا وہاں مل جائے۔ ماں بغداد کو روانہ ہو گئی۔ تھکی ہاری بغداد کے قریب پہنچی تو اسے اپنا بیٹا نظر آ گیا۔ وہ قرامطیوں کے ایک لشکر کے ساتھ جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ماں کی تھکن ختم ہو گئی۔ اس نے بیٹے کو پکارا۔ بیٹا اسے دیکھتے ہی لشکر سے نکل آیا۔ ماں نے اسے گلے لگا لیا۔ پھر اس سے خیر خیریت پوچھی اور گلے شکوے کرنے لگی کہ وہ ماں کو بھول گیا ہے.....

"بیٹا بولا' فضول باتیں بند کرو ماں' یہ بتاؤ تمہارا دین کیا ہے؟..... ماں نے حیرت زدگی کے عالم میں کہا' کیا باہر گھوم گھوم کر' دیس سے پردیسی ہو کر تیرا دماغ صحیح نہیں رہا؟ میں اسی دین کو مانتی ہوں جسے پہلے مانتی تھی۔ یہ دین اسلام ہے' سب مذہبوں میں سچا مذہب اسلام ہے..... بیٹا پھٹ کر بولا' مت غلط بات کہہ ماں! وہ باطل ہے جس کو ہم سچا دین مانتے رہے ہیں۔ سچا دین یہ ہے جس کا اب میں پجاری ہوں۔ یہ ہے قرامطی دین۔ اگر تم اسلام کو مانتی ہو تو قرامطی اسلام کو مانو.....

"ماں کے تو جیسے ہوش ہی اُڑ گئے۔ بیٹے نے صحابہ کرامؓ کے خلاف ایک بیہودہ بات کہہ دی۔ ماں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا اور کہا' کانوں کو ہاتھ لگا' توبہ کر اور کلمہ پڑھ احمق!..... بیٹے نے ماں کو غصے سے گھورا اور اپنے لشکر سے جا ملا۔ ماں کو جس بیٹے کی جدائی نے پاگل کر رکھا تھا اور جو بستی بستی' قریہ قریہ بیٹے کو ڈھونڈتی پھرتی تھی' بیٹے کو لشکر کے ساتھ جاتا دیکھتی رہ گئی.....

"شہر بغداد قریب تھا' ماں بغداد چلی گئی۔ وہ روتی اور فریادیں کرتی تھی۔ اسے اپنے جیسی ایک عورت مل گئی۔ اس نے اس مجبور ماں سے پوچھا کہ وہ کون سا دکھ ہے جو اسے رُلا رہا ہے۔ ماں نے حال دل کہہ سنایا۔ عورت نے اسے بتایا کہ وہ ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور قرامطیوں کی قید میں بھی رہ چکی ہے جس کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ دینِ اسلام سے منحرف نہیں ہوئی.....

"ہاشمی خاندان کی یہ خاتون اس غمزدہ ماں کو اپنے گھر لے جا رہی تھی کہ قرامطی بیٹا پھر سامنے آ گیا۔ اس نے ماں سے پوچھا' تو نے دینِ اسلام کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے یا نہیں؟..... ماں نے کہا' میں نے اپنے گمراہ بیٹے کو ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے..... بیٹے نے بڑی تیزی سے تلوار نیام سے نکالی اور للکار کر کہا' میں اپنی ماں کو قرامطی دین پر قربان

کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے ماں پر تلوار کا زوردار وار کیا۔ ماں وار بچا گئی لیکن کہ اُس کے شانے پر پڑی اور زخم گہرا آیا۔ کچھ لوگوں نے دوڑ کر بیٹے کو پکڑ لیا۔ ماں تڑ ہونے سے بچ گئی اور طبیب ابوالحسین کے ہاں جا پہنچی"۔

یہ واقعہ ابنِ اثیر نے "تاریخِ کامل" کی ساتویں جلد کے صفحہ 173 پر لکھا ہے۔ اس کی تحریر کے مطابق اس واقعہ کا اختتام یوں ہوا تھا کہ قرامطی تعداد میں تو بہت زیادہ ہو گئے تھے لیکن بغداد میں ابھی ان کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ اپنی ماں پر قاتلانہ حملہ کرنے والا بیٹا پکڑا گیا۔ ایک روز ماں طبیب سے مرہم پٹی کرا کے آ رہی تھی۔ اُس نے قیدیوں کی ایک ٹولی دیکھی۔ ہر قیدی کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ ان میں زخمی ماں کا بیٹا بھی تھا۔ ماں نے بیٹے کو دیکھا اور چلا کر بولی ۔۔۔ "اللہ تجھ سے بھلائی نہ کرے جس نے اپنے سچے دین کو باطل کہا اور رسولؐ کے ساتھیوں کی توہین کی۔ اس قید سے تو کبھی آزاد نہ ہو"۔

"حسن بن صباح نے مجھے یہ واقعہ سنایا تھا" ۔۔۔ شمونہ نے یہ واقعہ سنا کر کہا ۔۔۔ "وہ کہتا تھا کہ میں اس قسم کے پیروکار چاہتا ہوں جو اپنے عقیدے پر خواہ یہ عقیدہ باطل ہی ہو، اپنی ماں کو، اپنے باپ کو اور اپنے بچوں کو بھی ذبح کر دیں"۔

"ہم قرامطیوں کو کہاں سے لائیں؟" ۔۔۔ مزمل آفندی نے کہا۔

"مل جائیں گے" ۔۔۔ شمونہ نے کہا ۔۔۔ "میں امیرِ شہر سے بات کروں گی لیکن ابھی نہیں۔ ابھی وہ فوج بھیج رہے ہیں۔ خدا کرے وہ پکڑا جائے اگر نہ پکڑا گیا تو میں قرامطیوں کا انتظام کروں گی"۔

"شمونہ!" ۔۔۔ مزمل آفندی نے کہا ۔۔۔ "اگر میں وہی کام کر دوں جو تم سمجھتی ہو کہ قرامطیوں کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا تو....."

"تو جو انعام مانگو گے امیرِ شہر سے دلواؤں گی" ۔۔۔ شمونہ نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔

"نہیں شمونہ!" ۔۔۔ مزمل آفندی نے جذباتی سے لہجے میں کہا ۔۔۔ "میں نے کسی امیر، کسی وزیر اور کسی سلطان سے انعام نہیں لینا" ۔۔۔ اُس نے شمونہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

میمونہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ماں بیٹی کمرے سے نکل گئیں۔

○

امیرِ شہر کے محل نما مکان کے عقب میں کچھ دُور بڑا ہی خوشنما باغ تھا جس میں شہر کے لوگ داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس میں گھنے پھولدار پودے تھے۔ گھنی بیلیں اور سارے باغ پر سایہ کیے ہوئے درخت بھی تھے، اور یہ درخت تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ بعض بیلیں اس طرح درختوں پر چڑھی ہوئی تھیں کہ سبزے کے غار سے بنے ہوئے تھے۔

اسی دن کا پچھلا پہر تھا، شمونہ مزمل آفندی کے کمرے میں آئی اور یہ کہہ کر چلی گئی ۔۔۔ "میں باغ میں جا رہی ہوں۔ وہیں آ جاؤ"۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں باغ کے ایک بہت ہی دلنشیں اور ڈھکے چھپے گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"کیا میں یہ سمجھوں کہ تم نے میری محبت کو قبول کر لیا ہے شمونہ؟" ۔۔۔ مزمل آفندی نے پوچھا۔

"میں نے تمہاری محبت کو ٹھکرایا تو نہیں" ۔۔۔ شمونہ نے کہا ۔۔۔ "لیکن مزمل! میں تمہیں خبردار کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ میری محبت تمہیں راس نہیں آئے گی۔ حسن بن صباح کے ہاں مجھے ایک بڑا ہی خوبصورت دھوکہ بنایا گیا تھا اور مجھے یہ تربیت دی گئی تھی کہ جس آدمی کو جال میں لینا ہو اس پر نشہ بن کر طاری ہو جاؤ اور اسے ہوش ہی نہ آنے دو کہ وہ ایک بڑے ہی خطرناک دھوکے میں آ گیا ہے..... میں نے یہ کمال حاصل کیا اور مَرو میں اپنے اس کمال کو آزمایا اور ایک ایسے آدمی کی عقل کو اپنی مٹھی میں لے لیا جو بلاشک و شبہ زاہد، پارسا اور دانشمند تھا۔ میرا راز فاش ہونے کی وجہ کچھ اور تھی میں نے حسن بن صباح کا راز بھی فاش کر دیا.....

"میں یہاں آ گئی اور امیرِ شہر ابو مسلم رازی سے پناہ مانگی۔ انہوں نے مجھے پناہ میں لے لیا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ میرے اندر انسانیت زندہ ہے۔ میں نے اپنی فطرت کو ابلیسی اوصاف سے پاک کرنے کا عزم کر لیا۔ ابو مسلم رازی نے مجھے ایک ایسے عالمِ دین کے حوالے کر دیا جو واقعی عالمِ دین تھا۔ میں نے اسے اپنا پیرو مرشد مان لیا۔ وہ تو تارک الدنیا تھا۔ میں نے اس کی بہت خدمت کی لیکن ہوا یہ کہ میری روح کی پیاس بجھتی گئی اور میرے پیرو مرشد کی روح میں تشنگی پیدا ہوتی گئی"۔

شمونہ نے مزمل آفندی کو لورالفہ کا سارا واقعہ سنایا۔

"میں جانتی ہوں اُس نے اپنے آپ کو سزائے موت دی تھی" — شمونہ نے کہا — "وہ تو مر گیا لیکن میری ذات میں یا میری روح میں عجیب سی بے چینی اور تلخی پیدا ہو گئی۔ مجھے اپنے وجود سے نفرت ہو گئی۔ میرے دماغ پر یہ خیال غالب آ گیا کہ ہر عورت یا ہر خوبصورت عورت کے ساتھ شیطان کا تعلق ضرور ہوتا ہے۔ ابو مسلم رازی نے کہا تھا کہ ایک خوبصورت عورت میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی مرد کے ایمان کو تباہ کر اُس میں ابلیس کو بیدار کر سکتی ہے لیکن جن کے ایمان مضبوط ہوتے ہیں ان کا ابلیس کچھ نہیں بگاڑ سکتا"۔

"تم نے مجھے یہ واقعہ کیوں سنایا ہے؟" — مزمل آفندی نے پوچھا۔

"اس لئے کہ میرے دل نے تمہاری محبت کو قبول کر لیا ہے" — شمونہ نے کہا — "تم عام سے امیرزادے ہوتے تو اور بات تھی لیکن میں تم میں کوئی ایسا جذبہ دیکھ رہی ہوں جو ہر کسی میں نہیں ہوتا۔ میں ڈرتی ہوں کہ تم نے مجھے خوبصورت لڑکی سمجھ کر میری محبت کا نشہ اپنے دل پر طاری کر لیا تو میں اپنے آپ کو اس گناہ کی گنہگار سمجھوں گی۔ کبھی تو خدا سے گلہ شکوہ بھی کر لی ہوں کہ مجھے عورت کیوں بنایا تھا..... اگر میں تمہیں تفصیل سے سناؤں کہ میں بچپن میں اغوا ہوئی تھی تو اس عمر سے لے کر جوان ہونے تک مجھے کیسی تربیت ملی اور میں نے کیسی زندگی گزاری ہے تو تم آج بھی مجھ پر اعتبار نہ کرو۔ تم آج بھی مجھے ایک دلکش دھوکہ کہو گے، لیکن میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میری ذات میں جو انقلاب آیا ہے اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں، یہ ایک معجزہ ہے۔ میں نے یہ راز پا لیا ہے کہ خدا مجھ سے اپنے عظیم اور سچے دین کے لئے کوئی کام کروانا چاہتا ہے"۔

"معلوم نہیں تم نے یہ راز بھی پایا ہے یا نہیں!" — مزمل آفندی نے کہا — "اللہ کی ذاتِ باری نے تمہارے گناہ بخش دیئے ہیں..... اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میری تمہارے ساتھ یہ ملاقات جو غیر متوقع طور پر اور انوکھے طریقے سے ہوئی ہے، اس کا کوئی خاص مقصد ہے اور یہ مقصد اللہ کی ذاتِ باری نے متعین کیا ہے..... تم نے ٹھیک کہا ہے کہ میں اپنے دل پر تمہیں صرف خوبصورت لڑکی سمجھ کر محبت کا نشہ طاری نہ کروں..... نہیں شمونہ! میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں نے تمہیں پہلے کہا تھا کہ میں نے

تم میں کوئی خاص بات دیکھی ہے"۔

"میں تمہیں وہ خاص بات بتا دیتی ہوں" — شمونہ نے کہا — "میں حسن بن صباح کو قتل کرنا چاہتی ہوں۔ اس نے میرے دو باپ قتل کروائے ہیں۔ ایک سگا دوسرے سوتیلا۔ اس نے میری ماں کو دو بار بیوہ کیا ہے۔ یہ تو میرا ذاتی معاملہ ہے۔ دوسرا معاملہ اسلام کا ہے۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان اور اسلام کا شیدائی ظاہر کر رہا ہے لیکن وہ اسلام کی جڑیں کاٹ رہا ہے..... ایک بات اور بھی ہے۔ اُس نے میرے قتل کا حکم دے رکھا ہے۔ اُس نے مجھے ایک شخص کے گھر میں قیدی کی حیثیت سے رکھا تھا۔ اس شخص کی بیوی کو پتہ چل گیا کہ مجھے قتل کیا جائے گا۔ اس نے مجھے رات کو فرار کرا دیا اور میں امیرِ شہر ابو مسلم رازی کے پاس آ گئی"۔

"یہی عزم میرا ہے" — مزمل آفندی نے کہا — "یہ کام میں نے کرنا ہے۔ اگر میں اس مہم میں ناکام رہا اور مارا گیا تو یہ کام کرنے کی کوشش کرنا۔ میں اپنی زندگی میں تمہیں آگے نہیں جانے دوں گا۔ میں فوج کے ساتھ جا رہا ہوں۔ سالار امیر ارسلان حسن بن صباح کو سلطان کے حکم کے مطابق زندہ پکڑنے کی کوشش کرے گا اور پکڑ بھی لے گا لیکن میں اُسے وہیں قتل کر دوں گا"۔

حسن بن صباح کے قتل کی باتیں کرتے کرتے وہ ایک دوسرے میں گھل مل گئے اور جذباتی باتوں پر آ گئے۔ شمونہ جب وہاں سے نکلی تو وہ مزمل آفندی کی محبت سے سرشار تھی۔

○

تین چار دنوں بعد ابو مسلم رازی نے مزمل آفندی کو بلایا۔ سالار امیر ارسلان آ گیا تھا۔

"پانچ سو سواروں کا دستہ آ گیا ہے" — ابو مسلم رازی نے مزمل آفندی کو بتایا — "آج ہی جتنی جلدی ہو سکے روانہ ہونا ہے۔ اگر قافلہ بغداد سے نکل گیا ہو تو اس کے تعاقب میں جانا ہے۔ تم حسن بن صباح کو پہچانتے ہو۔ امیر ارسلان نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ تم ہمارے مہمان ہو اور ہمارے لشکری یا ملازم نہیں ہو اس لئے یہ فرض تم پر عائد نہیں ہوتا کہ وہاں اگر لڑائی ہو جائے تو تم بھی لڑو"۔

"کیا آپ کو توقع ہے کہ وہاں لڑائی ہوگی؟" — مزمل آفندی نے پوچھا۔

"ہاں!" ــــ ابو مسلم رازی نے جواب دیا ــــ "تم شاید نہیں سمجھتے۔ جسے تم قافلہ کہہ رہے ہو اس میں حسن بن صباح کے باقاعدہ لڑنے والے آدمی بھی ہوں گے"۔

"کیا ایک بات کہوں امیر شہر!" ــــ مزمل آفندی نے کہا ــــ "اگر بات لڑائی تک آگئی تو پھر میں یہ نہیں دیکھوں گا کہ لڑنا میرا فرض ہے یا نہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ سلطانِ معظم نے حسن بن صباح کو زندہ پکڑنے کا حکم دیا ہے لیکن امیرِ شہر! حسن بن صباح میرے سامنے آگیا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اسے زندہ ہی پکڑوں گا"۔

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں" ــــ ابو مسلم رازی نے کہا ــــ "اس شخص کو میں بھی زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ بہرحال میری طرف سے تمہارے لئے کوئی حکم اور کوئی پابندی نہیں"۔

دن کا پچھلا پہر تھا جب سالار امیر ارسلان کی قیادت میں پانچ سو سواروں کا دستہ رے سے کوچ کر گیا۔

انہیں بتانے والا کوئی نہ تھا کہ حسن بن صباح بغداد سے اس قافلے کو چھوڑ کر اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اسی روز اصفہان کی طرف روانہ ہو گیا تھا جس روز مزمل آفندی میمونہ کو ساتھ لے کر وہاں سے نکلا تھا۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ پانچ سو سواروں کا یہ دستہ کتنے پڑاؤ کر کے اور کتنے دنوں بعد بغداد پہنچا۔ اس دستے کی رفتار بہت ہی تیز تھی۔ دستہ جب بغداد پہنچا تو پتہ چلا کہ قافلے کو یہاں سے روانہ ہوئے تین دن گزر گئے ہیں۔ امیر ارسلان نے دستے کو کچھ دیر آرام دیا، کچھ کھلایا پلایا اور وہاں سے قافلے کے تعاقب میں کوچ کر گئے۔

جو قافلہ تین دن پہلے روانہ ہوا تھا اس تک سوار دستے کو پہنچنے کے لئے کم از کم دو دن تو ضرور ہی لگنے تھے۔ امیر ارسلان نے اپنے دستے کو صرف ایک پڑاؤ کرایا اور بڑی تیز رفتار سے قافلے کے تعاقب میں گیا۔

اُس روز جس روز سواروں کا دستہ قافلے تک پہنچا سورج سر پر آگیا تھا اور قافلہ ایک ہرے بھرے، سرسبز علاقے میں سے گزر رہا تھا۔ دو لمبی پہاڑیاں تھیں جن کے درمیان کشادہ وادی تھی۔

امیر ارسلان اور مزمل آفندی دستے کے آگے آگے جا رہے تھے۔ ان کا راستہ ایک پہاڑی کی ڈھلان پر تھا۔ وہ ایک موڑ مڑے تو نیچے انہیں قافلہ جاتا نظر آیا۔ قافلے میں ایک ہزار سے زیادہ لوگ تھے۔ چند ایک گھوڑے اور کچھ اونٹ بھی تھے۔ بعض لوگوں

رکھے ہوئے تھے۔ ان میں بھی مسافر سوار تھے۔ یہ مسافر یقیناً مالدار خاندانوں کی عورتیں تھیں۔ سالار امیر ارسلان نے اپنے دستے کو روک لیا۔

"تم بھی سوچ آفندی!" ــــ امیر ارسلان نے مزمل آفندی سے کہا ــــ "اگر ہم قافلے کے عقب سے گئے تو قافلے والے ہمیں ڈاکو سمجھ کر آگے کو بھاگ اٹھیں گے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ حسن بن صباح اور اس کے ساتھی اتنے ہوشیار اور چالاک ہیں کہ وہ پہاڑیوں میں بکھر کر غائب ہو جائیں گے"۔

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں" ــــ مزمل آفندی نے کہا ــــ "حسن بن صباح لومڑی کی خصلت کا انسان ہے۔ مجھے تو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو جاتا ہے۔ قافلے کو گھیرے میں لیا جائے"۔

سالار امیر ارسلان تجربہ کار سالار تھا۔ اس نے اپنے دستے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصے کے کمانڈر کو قافلہ دکھایا اور اسے کہا کہ وہ دور کا چکر کاٹ کر اس وادی کے اگلے سرے میں پہنچے اور قافلے کو اس طرح روک لے کہ کسی کو اِدھر اُدھر بھاگنے یا چھپنے کا موقع نہ ملے۔

امیر ارسلان خود دوسرے حصے کے ساتھ رہا۔ اُس نے ان سواروں کو اُس وقت آگے لے جانا تھا جب دوسرے حصے نے قافلے کا راستہ روک لینا تھا۔ دوسرے حصے کے کمانڈر نے بلندی پر کھڑے ہو کر قافلے کے ارد گرد کے علاقے کو دیکھا۔ وہ اپنے لئے راستہ دیکھ رہا تھا۔

○

قافلے کو دیکھنے والے سوار پیچھے مڑے اور جس پہاڑی کے ڈھلانی راستے پر وہ آرہے تھے، اس پہاڑی سے اترے۔ پہاڑیوں کے اندر اندر وہ دور تک چلے گئے۔ امیر ارسلان نے اپنے سواروں کو اس پہاڑی سے اتارا نہ وہ بلند راستے پر اس خیال سے نہ چلے کہ قافلے میں سے کسی نے گھوم کے دیکھ لیا تو وہ سارے قافلے کو خبردار کر دے گا اور حسن بن صباح کو نکل بھاگنے کا موقع مل جائے گا۔ قافلہ اپنی رفتار سے جا رہا تھا۔

اس پہاڑی علاقے میں داخل ہونے سے پہلے قافلے کے چار پانچ آدمیوں نے قافلے کو روک لیا تھا اور کہا تھا کہ اب ہم بڑی خطرناک جگہ پر آگئے ہیں۔ یہاں تین قافلے لٹ چکے ہیں۔ ڈاکو مال و دولت کے ساتھ جوان عورتوں کو بھی لے گئے تھے۔

"تمام جوان آدمی چوکس ہو جاؤ" ۔۔۔ ایک آدمی نے اعلان کیا ۔۔۔ "جس کے پاس جو بھی ہتھیار ہے وہ ہاتھ میں رکھے اور اگر ڈاکوؤں کا حملہ ہو گیا تو لڑنے والے تمام آدمی قافلے کے باہر باہر رہیں اور عورتوں اور بچوں کو ایک جگہ اکٹھا کر لیں اور لوگ انہیں اپنے نرغے میں لے لیں..... اپنے آپ پر ڈاکوؤں کا خوف طاری نہ کر لینا۔ دیکھا گیا ہے کہ لوگوں پر ڈاکوؤں اور رہزنوں کی دہشت طاری ہو جاتی ہے اور یہ دہشت اتنا کمزور کر دیتی ہے کہ دہشت زدہ لوگ ڈاکوؤں کے آگے بھاگ نکلتے ہیں یا ہتھیار ڈال دیتے ہیں"۔

دیکھتے ہی دیکھتے چار سو سے کچھ زیادہ نوجوان' جواں سال اور ادھیڑ عمر آدمی قافلے سے الگ ہو گئے۔ یہ سب لڑنے والے تھے۔ اُس دَور میں لوگ تلواریں اس طرح اپنے ساتھ رکھتے تھے جیسے عورتیں زیور پہنتی ہیں۔ ان میں زیادہ آدمیوں کے پاس تلواریں تھیں اور باقی جو تھے' ان میں سے کچھ برچھیوں سے مسلح تھے اور بعض کے پاس خنجر تھے۔ یہ سب آدمی قافلے کے پہلوؤں کے ساتھ' کچھ قافلے کے آگے اور باقی قافلے کے پیچھے ہو گئے۔ اس طرح قافلے کو اپنے حفاظتی حصار میں لے کر انہوں نے کہا کہ اب چلو۔

دو پہاڑیوں کے درمیان کشادہ وادی سے گزرتے قافلے کی ترتیب یہی تھی۔ قافلہ لڑنے والوں کے حصار میں تھا۔

عصر کا وقت تھا جب اچانک قافلے کے سامنے سے چند ایک سوار نمودار ہوئے۔ قافلہ بہت ہی لمبا تھا۔

"ہوشیار ہو جاؤ" ۔۔۔ یہ بڑا ہی بلند اعلان تھا جو قافلے میں سے ایک آدمی نے کیا ۔۔۔ "ڈاکو آ گئے ہیں..... ڈرنا نہیں۔ ہم لڑیں گے"۔

"ہم ڈاکو نہیں" ۔۔۔ سواروں کے کمانڈر نے بڑی ہی بلند آواز میں کہا ۔۔۔ "بے خوف ہو کر رک جاؤ"۔

"بزدلو' ڈاکوؤ!" ۔۔۔ قافلے میں سے للکار سنائی دی ۔۔۔ "آگے بڑھو' ہم تیار ہیں"۔

سواروں کے کمانڈر نے تمام سواروں کو سامنے لانے کی بجائے یہ عقلمندی کی کہ سواروں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دونوں پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر چڑھا دیا اور ساتھ ساتھ اعلان کیا کہ کوئی لڑنے کی حماقت نہ کرے' ہم سلطان کی فوج کے سپاہی ہیں' تمہیں حفاظت میں رکھنا ہماری ذمہ داری ہے۔

اتنے میں امیر ارسلان اپنے سواروں کو لے کر قافلے کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس نے جب اپنے دوسرے کمانڈر کی یہ عقلمندی دیکھی کہ اس نے گھوڑے ڈھلانوں پر چڑھا دیئے تھے تو امیر ارسلان نے بھی اپنے سواروں کو قافلے کے پہلوؤں پر لے جانے کی بجائے ڈھلانوں کی بلندی پر رکھا۔ قافلے میں قیامت برپا ہو گئی۔ عورتوں اور بچوں کی چیخیں زمین و آسمان کو ہلانے لگیں۔ سواروں کی طرف سے بار بار اعلان ہو رہا تھا کہ وہ ڈاکو نہیں لیکن قافلے میں جو لڑنے والے جوان تھے وہ سواروں کو للکار رہے تھے۔ سالار امیر ارسلان اور مزمل آفندی بلندی پر چلے گئے۔

"میں سالار امیر ارسلان ہوں" ۔۔۔ اُس نے اعلان کیا ۔۔۔ "حسن بن صباح اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ میرے سامنے آجائے..... حسن بن صباح! تم خود میرے سامنے آجاؤ گے تو زندہ رہو گے اور اگر میں نے تمہیں خود ڈھونڈ کر پکڑا تو پھر میں تمہاری زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا"۔

اس اعلان کے جواب میں بھی دو تین جوشیلے جوانوں نے للکار کر کہا کہ وہ دھوکے میں نہیں آئیں گے اور پورا مقابلہ کریں گے۔

"قافلے والو!" ۔۔۔ مزمل آفندی نے بلندی سے اعلان کیا ۔۔۔ "مجھے دیکھو اور پہچانو۔ میں نے تمہارے ساتھ بغداد تک سفر کیا ہے۔ میرا بڑا بھائی' اس کی بیوی اور بچے اس قافلے میں شامل ہیں۔ کیا تم مجھے بھی ڈاکو سمجھتے ہو؟"

مزمل آفندی کا بڑا بھائی ان میں سے نکلا اور دوڑتا ہوا ڈھلان پر چڑھا۔ مزمل آفندی گھوڑے سے کود کر اُترا اور اپنے بڑے بھائی سے بغلگیر ہو کر ملا۔ اس نے بھائی کو بتایا کہ یہ سلطان ملک شاہ کے فوجی ہیں اور حسن بن صباح کی گرفتاری کے لئے آئے ہیں۔

"وہ اس قافلے میں نہیں ہے" ۔۔۔ مزمل کے بڑے بھائی نے کہا ۔۔۔ "سالار محترم! میرا یہ بھائی ایک خاتون کو حسن بن صباح کے جال سے نکال کر بغداد سے نکلا تھا تو اس کے فوراً بعد حسن بن صباح بغداد سے نکل گیا تھا"۔

"کیا کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ وہ کس طرف گیا تھا؟" ۔۔۔ امیر ارسلان نے پوچھا۔

"اس قافلے کے بہت سے لوگ اس کے معتقد اور مرید ہو گئے تھے" ۔۔۔ مزمل کے بھائی نے جواب دیا ۔۔۔ "یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہ اللہ کی برگزیدہ ہستی ہے اور غیب کی خبر دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس نے جہاز کو بڑے ہی تیز و تند سمندری طوفان سے نکال لیا

تھا۔ وہ جب بغداد سے روانہ ہونے لگا تو اس کے مریدوں نے اسے گھیر لیا اور پوچھا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کچھ لوگ تو اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے تھے لیکن اُس نے سب کو روک دیا اور کہا تھا کہ اُسے آسمان سے اشارہ ملا ہے کہ وہ فوراً اصفہان پہنچے۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اصفہان جا کر اسے اللہ کی طرف سے ایک اور اشارہ ملے گا۔ پھر وہ چلا گیا تھا"۔

سالار امیر ارسلان نے اپنے چند ایک سواروں کو ساتھ لیا اور نیچے اتر آیا۔ وہ قافلے کے سامنے گیا۔ مزمل آفندی اور اس کا بڑا بھائی اس کے ساتھ تھے۔ اُس نے قافلے کے ہر ایک آدمی کو دیکھا اور قافلے کے ساتھ ساتھ چلا گیا۔ قافلہ تقریباً ایک میل لمبا تھا۔ حسن بن صباح کو پہچاننے کے لئے مزمل اور اس کا بھائی ساتھ تھے۔ امیر ارسلان نے اونٹوں کے کجاووں اور پالکیوں کے پردے ہٹا کر دیکھا اور اس طرح دیکھتے دیکھتے قافلے کے دوسرے سرے تک چلا گیا۔ چند اور آدمیوں سے حسن بن صباح کے متعلق پوچھا۔ ان سب نے بتایا کہ حسن بن صباح اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ کرائے کے گھوڑوں اور ایک اونٹ کے ساتھ ان جانوروں کے مالکوں سمیت بغداد سے چلا گیا تھا اور اس کی منزل اصفہان تھی۔

سواروں نے قافلے کو ایسے گھیرے میں لے لیا تھا کہ کسی کو نکل بھاگنے کا موقع مل ہی نہیں سکتا تھا۔

سالار امیر ارسلان نے اعلان کروایا کہ قافلہ جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کروایا کہ قافلے پر ڈاکوؤں کا کوئی گروہ حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرے گا کیونکہ یہ پانچ سو سوار اسی علاقے میں اصفہان تک موجود رہیں گے۔

امیر ارسلان نے اپنے سواروں کو بلا کر کوچ کی ترتیب میں کر لیا اور اصفہان کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان کے پیچھے پیچھے قافلہ بھی چل پڑا۔

○

سواروں کو اصفہان جلدی پہنچنا تھا اس لئے وہ قافلے سے دور آگے نکل گئے اور کچھ دیر بعد بڑی پہاڑیوں کے درمیان سے بھی نکل گئے۔ علاقہ تو آگے بھی پہاڑی ہی تھا لیکن پہاڑیاں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ بعض تو ٹیکریوں جیسی تھیں اور بکھری ہوئی تھیں۔

ان ٹیکریوں میں سے ایک گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں جو

گھوڑے کی رفتار سے دور ہٹتی جا رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک گھوڑا قافلے کی طرف سے سوار دستے کی طرف دوڑتا آیا اور سالار امیر ارسلان کے پہلو میں جا رکا۔

"محترم سالار!" — سوار نے کہا — "قافلے میں سے ایک سوار نکلا اور اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ مجھے شک ہے کہ وہ حسن بن صباح کے آدمیوں میں سے تھا اور وہ اصفہان جا کر یا جہاں کہیں بھی وہ ہے اطلاع دینے گیا ہے کہ اس کی گرفتاری کے لئے ایک سالار آ رہا ہے"۔

اس سوار کو پکڑنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے گھوڑے کے ٹاپ بھی اب سنائی نہیں دیتے تھے۔ امیر ارسلان اپنے سوار دستے کو سرپٹ تو نہیں دوڑا سکتا تھا کہ وہ اس سوار کے ساتھ ساتھ اصفہان پہنچ جاتا۔ اس نے سوار دستے کو ذرا تیز چلنے کا حکم دیا۔

اصفہان میں ایک بہت بڑا مکان تھا جس کی شکل و صورت ایک قلعے جیسی تھی۔ حسن بن صباح کچھ دن پہلے وہاں پہنچا تھا اور اس نے احمد بن عطاش کو اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ احمد بن عطاش خلجان میں تھا۔ اطلاع ملتے ہی وہ بڑی لمبی مسافت تھوڑے سے وقت میں طے کر کے اصفہان پہنچ گیا۔ حسن بن صباح نے اسے سنایا کہ مصر میں اس کے ساتھ کیا بیتی تھی اور اسے قید میں ڈال دیا گیا تھا اور کس طرح وہ قید سے رہا ہوا اور جس طرح وہ مصر سے حلب پہنچا تھا وہ ساری روداد سنائی پھر پوچھا کہ کب وہ خلجان آئے یا نہیں۔

"تمہیں آخر آنا ہی ہے حسن!" — احمد بن عطاش نے کہا — "لیکن ہمارے جاسوسوں نے جو اطلاعیں دی ہیں وہ یہ ہیں کہ سلطان ملک شاہ تمہیں گرفتار کرنے کی کوشش میں ہے۔ تم ابھی یہیں رہو"۔

"میرے پیر استاد!" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے یہ بتائیں کہ لوگ مجھے بھول تو نہیں گئے؟ کیا آپ نے اس سلسلے میں کوئی اور کام کیا ہے؟"

"تم بھول جانے کی بات کرتے ہو حسن!" — احمد بن عطاش نے کہا — "لوگ تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ میں نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ تم وہاں آ کر دیکھو گے۔ ہم لوگوں کو یہ بتا رہے ہیں کہ خدا کا ایلچی اب پہلے کی طرح اسی علاقے میں کہیں آسمان سے اترے گا اور جو بھی اس کا پیروکار بنے گا اُسے اس دنیا میں جنت مل جائے گی۔ لوگ تمہارے نام پر جانیں دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ہم نے جانبازوں کا ایک گروہ تیار کر

لیا ہے جو ایک اشارے کا منتظر رہتا ہے۔ ہم بہت جلدی سلجوقیوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس علاقے کی تقریباً" تمام مسجدوں میں جو امام یا خطیب ہیں وہ سب ہمارے آدمی ہیں۔ وہ لوگوں کو قرآن اور احادیث کی جو تفسیریں سنا رہے ہیں ان میں ہمارے عقیدے اور خدا کے ایلچی کے نزول کی پیش گوئیاں ہوتی ہیں۔ لوگ اسی کو صحیح اسلام سمجھ رہے ہیں"۔

"لڑکیوں کا گروہ تیار ہُوا ہے یا نہیں؟" ——— حسن بن صباح نے پوچھا۔ "اور کیا جانبازوں کو حشیش دی جا رہی ہے یا نہیں؟"

"حشیش نے ہی تو ہمارا کام آسان کیا ہے" ——— احمد بن عطاش نے کہا۔ "لوگوں کو خصوصاً" لڑنے والے لشکریوں کو معلوم ہی نہیں کہ ہم انہیں کھانے پینے کی اشیاء میں حشیش دے رہے ہیں۔ ہماری لڑکیوں نے جو کام کئے ہیں وہ تم وہاں آکر دیکھو گے۔ بعض قبیلوں کے سردار جو ہماری باتوں کا اثر قبول نہیں کر رہے تھے بلکہ ہمارے خلاف ہو گئے تھے' انہیں ہماری لڑکیوں نے ایسا رام کیا ہے کہ اب وہی سردار ہماری طاقت بن گئے ہیں"۔

تمام مؤرخوں نے تفصیل سے لکھا ہے کہ ان لوگوں نے انسانی فطرت کی کمزوریوں اور فطری مطالبات کے عین مطابق لوگوں کے ذہنوں میں اپنا باطل عقیدہ ڈالا تھا۔ داستان گو پہلے بیان کر چکا ہے کہ لوگوں کو اکٹھا کر کے آگ میں ایسی کوئی جڑی بُوٹی ڈال دی جاتی تھی جس کا دھواں اور جس کی بُو انسانی ذہن پر نشہ سا طاری کر دیتی تھی لیکن لوگ محسوس نہیں کرتے تھے کہ ان کے دماغوں پر کس طرح قبضہ کیا جا رہا ہے۔ وہ بظاہر ذہنی طور پر نارمل رہتے تھے لیکن ان جڑی بُوٹیوں کی وجہ سے حسن بن صباح کے ٹولے کے قبضے میں چلے جاتے تھے پھر اس ٹولے کے بڑے لوگ جب باطل کی بھی کوئی بات کرتے تھے تو ان کے دماغ باطل کو بھی قبول کر لیتے تھے۔

دراصل وہ پسماندگی کا دَور تھا۔ لوگ جو مسلمان تھے وہ اس لئے مسلمان تھے کہ دینِ اسلام ان کے ورثے میں چلا آ رہا تھا۔ جو اگر کسی کی باتوں میں نہیں آتے تھے تو وہ عیسائی اور یہودی تھے۔ اسلام کے دائرے میں رہ کر مسلمانوں کو کوئی نئی چیز بتائی جاتی تو وہ غور سے سنتے اور اسے اسلامی سمجھ کر قبول کر لیتے تھے۔ اگر آج کی زبان میں بات کی جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ کسی خاص جڑی بُوٹی کے دھوئیں اور قرآن کی نئی تفسیروں کے

ذریعے سیدھے سادے لوگوں کو ہپناٹائز کر لیا گیا تھا۔ لوگوں کو کچھ شعبدے بھی دکھائے گئے تھے۔ لوگ نہ سمجھ سکے کہ ان کے ذہنوں میں شیطانی نظریات ٹھونسے جا رہے ہیں۔ لوگوں کو انہیں بتائے بغیر جس جڑی بُوٹی کا دھواں دیا جاتا تھا وہ مؤرخوں کے کہنے کے مطابق' حشیش کا پودا تھا۔ سینکڑوں جانبازوں کا جو گروہ تیار کیا گیا اسے انہیں بتائے بغیر حشیش پلائی جاتی تھی۔

○

احمد بن عطاش ابھی وہیں تھا کہ اطلاع دی گئی کہ ایک سوار آیا ہے جس کی حالت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ اُسے فوراً" اندر بلا لیا گیا۔ اُس کی حالت بہت ہی بُری تھی۔ اصفہان تک جلدی پہنچنے کے ارادے سے اس نے اتنے لمبے سفر میں پڑاؤ کیا ہی نہیں تھا گھوڑے کو چند جگہوں پر روک کر پانی پلایا اور سفر جاری رکھا۔ اُس سے بولا بھی نہیں جاتا تھا۔

"سلطان کے پانچ چھ سو سوار آ رہے ہیں" ——— اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ "آپ کو گرفتار کریں گے۔ اچھا ہُوا آپ پہلے نکل آئے تھے۔ کسی نے بتا دیا ہے کہ آپ اصفہان چلے گئے ہیں۔۔۔۔۔ وہ اِدھر آ رہے ہیں" ——— اور وہ بیہوش ہو گیا۔

"مجھے یہاں سے نکل جانا چاہئے" ——— حسن بن صباح نے کہا ——— "لیکن جاؤں کہاں؟۔۔۔۔۔ خلجان؟۔۔۔۔۔ شاہ در؟"

"نہیں!" ——— احمد بن عطاش نے کہا۔ "کسی بھی بڑے شہر میں جانا خطرناک ہو گا۔ قلعہ تبریز گمنام سا قلعہ ہے' دور بھی نہیں۔ وہاں اپنے آدمی ہیں۔ سب قابلِ اعتماد ہیں اور ضرورت پڑی تو جانیں قربان کر دیں گے"۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حسن بن صباح کو رات کے سیاہ پردے میں قلعہ تبریز پہنچا دیا گیا۔ صرف ایک دن اور گزرا تو سالار امیر ارسلان پانچ سو سواروں کے ساتھ پہنچ گیا۔ یہ دستہ طوفان کی طرح اصفہان کی گلیوں میں بکھر گیا۔ سوار اعلان کرتے پھر رہے تھے کہ حسن بن صباح باہر آجائے۔ ہم ہر گھر کی تلاشی لیں گے۔ جس گھر سے حسن بن صباح برآمد ہو گا اُس گھر کے ہر مرد اور عورت کو ساری عمر کے لئے قید میں ڈال دیا جائے گا۔

اُس وقت اصفہان سلجوقیوں کے زیرِ نگیں تھا۔ کوئی خاندان کسی مشکوک آدمی کو پناہ نہیں دے سکتا تھا۔ اس قلعہ نما مکان پر کوئی شک نہیں کر سکتا تھا جہاں حسن بن صباح

ٹھہرا اور احمد بن عطاش اسے آکر ملا تھا۔ اس مکان میں مذہب پرست لوگ رہتے تھے لیکن وہ تجارت پیشہ تھے۔ وہ مسلمان تھے۔ احمد بن عطاش اب بھی وہاں موجود تھا لیکن اس نے اپنا حلیہ بدل لیا تھا۔ وہ اس مکان کے اصطبل کا سائیس بن گیا تھا۔ سر کے اور داڑھی کے بال بکھیر لئے تھے۔ کپڑے بوسیدہ سے پہن لئے اور ان پر گھوڑوں کی لید کے داغ دھبے لگا لئے تھے۔ وہ ذرا کبڑا بن گیا تھا۔

بہت دیر کے بعد جب کسی نے بھی نہ کہا کہ حسن بن صبّاح اُن کے گھر میں ہے، ایک ضعیف بڑھیا امیر ارسلان کے پاس آئی۔

"میں گزشتہ رات قلعہ تبریز سے آئی ہوں" — بڑھیا نے کہا — "میرا ایک نوجوان پوتا وہاں رہتا ہے۔ اُس سے مجھے بہت پیار ہے۔ کبھی کبھی اپنی گھوڑی پر اسے دیکھنے جاتی ہوں۔ وہاں وہ کوئی کام نہیں کرتا لیکن رہتا بڑی شان سے ہے۔ میں اُسے ملنے گئی تھی۔ رات سے پہلے واپسی سفر کو روانہ ہوئی۔ دروازہ کھلا ہُوا تھا۔ میں دروازے سے نکلنے لگی تو چھ گھوڑ سوار دروازے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے مجھے روک لیا اور پوچھا کون ہو.....

'میں نے کہا' خود ہی دیکھ لو۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ پوتے سے ملنے آئی تھی، واپس اصفہان جا رہی ہوں..... ان میں سے ایک نے کہا' جانے دو اسے۔ اسے تو اپنی ہوش نہیں..... اندر سے سات آٹھ آدمی دوڑے آئے۔ میں دروازے سے باہر آ گئی۔ ان میں سے ایک آدمی نے کہا' خوش آمدید حسن بن صباح' آج ہماری قسمت جاگ اٹھی ہے..... ایک اور آدمی کی آواز سنائی دی' نام مت لو احمق' تمہاری آواز اصفہان تک پہنچ سکتی ہے..... معلوم نہیں یہ وہی حسن بن صباح ہے جسے تم ڈھونڈ رہے ہو یا یہ کوئی اور ہے"۔

امیر ارسلان نے اس بڑھیا کے بیٹوں کو بلایا اور پوچھا کہ ان میں سے کس کا بیٹا قلعہ تبریز میں ہے۔

"وہ میرا بیٹا ہے" — ایک آدمی نے کہا۔

"یہ وہاں کیا کر رہا ہے؟"

"گمراہ ہو گیا ہے" — اُس نے جواب دیا — "باطنیوں کے جال میں آگیا ہے اور خدا کے ایلچی کا جانباز بن گیا ہے۔ ہم صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔ معلوم نہیں ہمارے بیٹے

ایک باسر بلی دکھائے گئے ہیں کہ وہ حسن بن صباح کے نام کا ہی ورد کرتا رہتا ہے"۔

اس طرح کڑی سے کڑی ملاتے یہ یقین ہو گیا کہ حسن بن صباح قلعہ تبریز میں ہے۔ سالار امیر ارسلان نے اُسی وقت کوچ کا اور قلعہ تبریز کو محاصرے میں لینے کا حکم دے دیا۔

○

یہاں ایک دو وضاحتیں ضروری ہیں۔ یہ قلعہ تبریز ایران کا آج والا شہر تبریز نہیں۔ یہ ایک گمنام سی بستی تھی جس کا نام و نشان ہی مٹ گیا ہے۔

دوسری وضاحت یہ کہ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح قلعہ الموت میں جا چھپا تھا اور امیر ارسلان نے وہاں حملہ کیا تھا۔ یہ صحیح نہیں۔ اُس وقت حسن بن صباح کے فرقے نے قلعہ الموت پر قبضہ ہی نہیں کیا تھا۔ قلعہ الموت پر اس فرقے کا قبضہ سال ڈیڑھ سال بعد ہُوا تھا اور وہاں خواجہ حسن طوسی نظام الملک نے حملہ کیا تھا۔ بعد کے اکثر تاریخ نویسوں نے قلعوں کے نام لکھنے میں غلطیاں کی ہیں۔ وہاں بہت سے چھوٹے بڑے قلعے تھے۔ ان میں سے بیشتر پر حسن بن صباح کے فرقے کا قبضہ ہو گیا تھا۔

تو یہ تھا قلعہ تبریز جسے سالار امیر ارسلان کے پانچ سو سواروں نے محاصرے میں لے لیا۔ انہوں نے دیواروں پر کمندیں پھینکنے کے لئے رسّے اور دیواریں توڑنے کے لئے سامان' کدالیں اور تیروں کا ذخیرہ اصفہان سے لے لیا تھا۔

"آثار تلبیس" اور "سنینِ اسلام" کے مطابق حسن بن صباح کے پاس لڑنے والے صرف ستر آدمی تھے اور یہ سب جانباز تھے۔ چھوٹے سے اس قلعے کے دو دروازے کھلے ہوئے تھے جو اُس وقت بند ہونے لگے جب امیر ارسلان کا سوار دستہ بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ چند ایک سواروں نے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی کہ وہ دونوں دروازوں سے اندر چلے جائیں۔

دروازے بند ہو رہے تھے۔ اندر کے جانبازوں نے ایسی بے خوفی اور بے جگری سے مقابلہ کیا کہ سوار دروازوں میں داخل نہ ہو سکے اور دروازے بند ہو گئے۔ یہ کوئی بڑا قلعہ نہیں تھا کہ اس کے دروازے لوہے اور شاہ بلوط کی لکڑی کے بنے ہوتے اور ٹوٹ ہی نہ سکتے۔ عام سی لکڑی کے دروازے تھے۔ سواروں نے گھوڑوں سے اُتر کر دروازے

توڑنے شروع کر دیئے۔

اُدھر سواروں نے دیوار پر کمندیں پھینکیں۔ کوئی کمند دیوار سے اٹک جاتی تو حسن بن صباح کے جانباز رسّہ کاٹ دیتے اور اوپر سے تیر بھی برساتے تھے۔ تیر ملں کے جواب میں سواروں نے بھی تیراندازی شروع کر دی۔ تیروں کے سائے میں چند ایک سپاہی اوپر چلے گئے۔ دیوار اتنی چوڑی نہیں تھی کہ اس پر لڑا جا سکتا۔ وہ اندر کود گئے۔ جانبازوں نے انہیں نرغے میں لے لیا لیکن ایک آواز نے ان کا زنجیر توڑ دیا۔

"دروازے ٹوٹ گئے ہیں" ــــ دونوں دروازوں سے للکار اٹھ رہی تھی ــــ "دروازوں پر آجاؤ۔ دشمن اندر نہ آجائے"۔

حسن بن صباح کے جانباز دروازوں کی طرف اٹھ دوڑے۔ امیر ارسلان کے آدمیوں نے جو اب سوار نہیں پیادے بن گئے تھے' ان جانبازوں پر تابڑ توڑ حملے کئے حالانکہ وہ قلعے کے اندر تھے اور ان کی تعداد بہت ہی تھوڑی تھی۔

باطنی جانبازوں نے باہر کے سواروں کو اندر تو نہ آنے دیا' انہوں نے جانوں کی بازی لگا دی تھی لیکن یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر اسی طرح جم کر نہیں لڑ سکیں گے۔

مؤرخ لکھتے ہیں کہ یہ چھوٹی سی لڑائی تھی جو چھوٹی سی ایک بستی میں لڑی گئی تھی لیکن اس کی اہمیت اس وجہ سے ایک بڑی لڑائی جتنی تاریخی ہے کہ یہ حسن بن صباح کے باطنی فرقے اور سلجوقی مسلمانوں کا پہلا مسلح تصادم تھا اور اسی تصادم میں اندازہ ہو گیا تھا کہ حسن بن صباح کے پاس کتنی طاقت ہے اور یہ طاقت کس قسم کی ہے۔

○

حسن بن صباح دیکھ رہا تھا کہ اس کے ستر جانباز اتنے بڑے سوار دستے کو روک نہیں سکیں گے۔ ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ حسن بن صباح ایک بلند چبوترے پر چڑھ گیا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی ہی بلند آواز سے کہہ رہا تھا ــــ "تیرا ایلچی مشکل میں آگیا ہے اللہ!..... فرشتوں کو بھیج اللہ..... اپنے نام پر جانیں قربان کرنے والوں کو اتنے سخت امتحان میں نہ ڈال اللہ!..... فرشتے اتار اللہ..... کفّار کے طوفان سے بچا اللہ!"

وہ چُپ ہو گیا اور آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کے جسم سے جانبازوں نے اسے دیکھا۔

"یا حسن!" ــــ اُس کے ایک آدمی نے قریب آکر گھبراہٹ سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ــــ "اپنے فدائین دل چھوڑ بیٹھے ہیں۔ وہ باہر کو بھاگنے کا راستہ دیکھ رہے ہیں"۔

حسن بن صباح نے اس شخص کو دیکھا۔ اس کے کپڑے خون سے لال ہو گئے تھے۔

حسن بن صباح نے آنکھیں بند کر کے آسمان کی طرف دیکھا۔

"وحی نازل ہو گئی ہے" ــــ اُس نے بلند آواز سے کہا ــــ "اللہ کا حکم آیا ہے کوئی شخص باہر نہ نکلے۔ جو نکلے گا وہ دنیا میں جلے گا اور جو ہمارے ساتھ رہے گا وہ دنیا میں فردوسِ بریں دیکھے گا۔ حوریں اتر رہی ہیں۔ فرشتے اُتر رہے ہیں۔ ہمارا ساتھ چھوڑنے والوں کے لئے آگ اُتر رہی ہے..... مدد آرہی ہے"۔

یہ "وحی" تمام جانبازوں تک پہنچا دی گئی۔ وہ فوراً" ثابت قدم ہو گئے اور جم کر لڑنے لگے۔

"ہم حسن بن صباح کے ساتھ رہیں گے" ــــ باطنیوں نے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

لڑائی میں نیا ہی جوش اور قہر پیدا ہو گیا۔ امیر ارسلان کے جو آدمی کمندوں کے ذریعے اندر اُتر گئے تھے انہیں باطنیوں نے کاٹ ڈالا۔

اور آسمان سے فرشتے بھی اتر آئے۔

یہ تین سو سوار اچانک کہیں سے نکلے۔ ان کے سرپٹ ٹاپوں کی آوازیں دُور سے سنائی دی تھیں۔ امیر ارسلان کو ذرا سا بھی شبہ نہیں ہُوا تھا کہ یہ ان کے دشمن سوار ہیں۔ اسے یہ توقع بھی نہیں تھی کہ اس کے لئے کہیں سے کمک آئے گی۔ اسے کمک کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پھر یہ بھی تو کسی کو معلوم نہیں تھا کہ امیر ارسلان کہاں ہے۔ بہرحال اُس کے ذہن میں یہ خدشہ آیا ہی نہیں کہ یہ سوار جو چلے آرہے ہیں یہ اس کے لئے ایک مصیبت چلی آرہی ہے جس کا وہ سامنا نہیں کر سکے گا۔ ان تین سو سواروں کی رفتار اتنی تیز تھی کہ امیر ارسلان کو کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا۔ گھنے جنگل کی ہری بھری جھاڑیوں' درختوں اور اونچی گھاس سے یہ سوار بے ترتیب سے گروہوں کی صورت میں سیلاب کی طرح چلے آرہے تھے۔ وہ جُوں جُوں قریب آتے گئے' پھیلتے گئے۔ بعض کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں اور باقیوں کے پاس تلواریں تھیں۔ انہوں نے یہ ہتھیار آگے کو کر رکھے تھے جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ حملہ کرنے آرہے ہیں۔

اُس وقت بھی امیر ارسلان نے کوئی دفاعی اقدام نہ کیا۔ حتیٰ کہ وہ سوار اُن کے سر پر آگئے اور انہوں نے نعرہ لگایا ـــ "حسن بن صباح زندہ باد" ـــ اُس وقت امیر ارسلان اور اس کے سواروں کو ہوش آئی لیکن سنبھلنے اور سنبھل کر مقابلے میں آنے کا وقت گزر چکا تھا۔ ان سواروں نے امیر ارسلان کے پانچ سو سواروں کو بے بس کر دیا۔ سلجوقیوں نے مقابلے میں جمنے کی بہت کوشش کی لیکن حملہ آوروں کے انداز میں اتنا قہر اور غضب تھا کہ انہوں نے سلجوقی سواروں کو بالکل ہی بے بس کر کے کاٹ ڈالا۔ انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ ان کا سالار امیر ارسلان مارا جا چکا ہے۔

امیر ارسلان کے سواروں میں سے چند ایک سوار نکل بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ سب زخمی حالت میں تھے۔ ان میں مزمل آفندی بھی تھا۔ وہ بھی زخمی تھا۔ باقی زخمی اِدھر اُدھر چھپ گئے۔ ان میں بھاگنے کی بھی ہمت نہیں تھی لیکن مزمل آفندی نے گھوڑے کا رخ مَرو کی طرف کر دیا اور ایڑ لگا دی۔

○

ذہن میں قدرتی طور پر سوال اٹھتا ہے کہ کیا یہ تین سو سوار واقعی فرشتے تھے جو اللہ نے حسن بن صباح کی مدد کے لئے بھیجے تھے؟ اور کیا واقعی اُس پر وحی نازل ہوئی تھی؟

نہیں...... یہ پہلے سے کیا ہوا ایک انتظام تھا اور یہ انتظام احمد بن غطاش نے کیا تھا۔ داستان گو سارا قصہ پہلے سنا چکا ہے۔ قافلے سے نکلتے ہوئے ایک سوار نے اصفہان پہنچ کر حسن بن صباح کو خبردار کر دیا تھا کہ سلجوقی سلطان نے اس کی گرفتاری کے لئے پانچ چھ سو گھوڑ سواروں کا دستہ بھیجا ہے اور یہ دستہ اصفہان کی طرف آ رہا ہے۔

احمد بن غطاش بھی حسن بن صباح کے ساتھ تھا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ حسن بن صباح قلعہ تبریز میں چلا جائے۔ وہ چلا گیا۔ ان لوگوں کو خداوند تعالیٰ نے بڑے ہی تیز اور بہت دُور تک سوچنے والے دماغ اور بہت دُور تک دیکھنے والی نگاہیں دی تھیں۔ انہوں نے اُسی وقت سوچ لیا تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ خطرہ یہی تھا کہ امیر ارسلان اصفہان میں اگر حسن بن صباح کو ڈھونڈے گا اور کسی نہ کسی طرح اسے پتہ چل جائے گا کہ حسن بن صباح قلعہ تبریز میں چلا گیا ہے۔

یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ احمد بن غطاش نے اسی مکان میں جہاں وہ اور حسن بن صباح ٹھہرے تھے، سائیس کا بہروپ دھار لیا تھا۔ یہ ایک قبیلے کے سردار کا مکان تھا اور یہ

سردار حسن بن صباح کا پیروکار باطنی تھا۔

احمد بن غطاش نے اس سردار سے کہا تھا کہ حسن بن صباح کو بچانے کے لئے زیادہ سے زیادہ ایسے سواروں کی ضرورت ہے جو شہسوار ہوں، تیغ زنی اور برچھی بازی کی مہارت رکھتے ہوں اور لڑائی میں جان کی بازی لگا دینے والے ہوں۔

یہ سردار اُسی وقت ایک گھوڑے پر سوار ہوا۔ اُس کے پیچھے ایک اور گھوڑا تھا جس کی باگ سائیس کے ہاتھ میں تھی اور سائیس پیدل چل رہا تھا۔ لوگ جو راستے میں آتے تھے، اس سردار کو جھک کر سلام کرتے تھے اور وہ سائیس کی طرف دیکھتے ہی نہیں تھے کیونکہ وہ اس سردار کا سائیس تھا۔ کسی کو ذرا سا بھی شبہ نہ ہوا کہ یہ سائیس ابلیس کا چیلا نہیں بلکہ سر تا پا اور اندر سے بھی وہی ابلیس ہے جسے خداوند تعالیٰ نے آدم کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں دھتکار دیا اور اس پر لعنت بھیجی تھی۔ اب وہ ابلیس آدم کی اولاد کے لئے بڑا ہی دلکش اور اسلام کے لئے بہت ہی خطرناک دھوکہ بنا ہوا تھا اور اولادِ آدم اس کے تخلیق کئے ہوئے ابلیس حسن بن صباح کی ایسی مرید اور معتقد بنتی جا رہی تھی کہ اس پر جانیں قربان کر رہی تھی۔

شہر سے کچھ دور جا کر یہ سائیس، جو دراصل احمد بن غطاش تھا گھوڑے پر چڑھ بیٹھا اور پھر سردار نے اور احمد بن غطاش نے گھوڑے دوڑا دیئے۔ اصفہان سے تھوڑی ہی دور قزوین نام کا ایک قصبہ تھا۔ آج کے نقشوں میں اس نام کا کوئی مقام نہیں ملتا اس لئے یہ بتانا ناممکن ہے کہ یہ اصفہان سے کتنی دور تھا۔ تاریخ میں اس قصبے کا نام موجود ہے۔ یہ مقام ان دونوں کی منزل تھی۔

قزوین کا رئیسِ شہر ابو علی تھا جس کا اس سارے علاقے میں اثر و رسوخ تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس شخص نے حسن بن صباح کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ یہ حسن بن صباح کی تربیت یافتہ ایک لڑکی کا اور اُس حشیش کا کارنامہ تھا جو یہ لڑکی اسے دھوکے میں پلاتی رہتی تھی۔ احمد بن غطاش اور اس کا ساتھی سردار ابو علی کے گھر گئے اور اسے اس صورتِ حال سے آگاہ کیا کہ سلجوقی سلطان نے حسن بن صباح کی گرفتاری کے لئے سینکڑوں سواروں کا ایک دستہ بھیجا ہے۔ اسے بتایا کہ صورتِ حال کیا بن سکتی ہے اور اس کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

ان تینوں نے فوراً فیصلہ کر لیا۔ ابو علی نے کہا کہ وہ جس قدر سوار مل سکے تیار کر

www.paksociety.com

لے گا۔ تاریخ میں ابو علی کا ہی آیا ہے کہ اُس نے بہت ہی تھوڑے سے وقت میں تین سو سوار تیار کر لئے اور پھر کمال یہ کیا کہ انہیں ایسی جگہ اکٹھا کر لیا جو قلعہ تبریز سے کچھ دور تھی۔ ان سواروں کو بتایا گیا کہ وہ ہر لمحہ تیاری کی حالت میں رہیں اور اشارہ ملتے ہی قلعہ تبریز پہنچ جائیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باطنیوں کی جڑیں کتنی مضبوط ہو کر کتنی دُور تک پہنچ گئی تھیں۔

ان کا جاسوسی کا نظام بھی بڑا تیز اور قابلِ اعتماد تھا۔ سالار امیر ارسلان کا دستہ اصفہان سے قلعہ تبریز پہنچا تو کسانوں اور تھکے ماندے مسافروں کے بہروپ میں باطنی جاسوس اسے دُور دُور سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے لڑائی بھی دیکھی تھی۔ ان ہی میں سے کسی نے دیکھا کہ سلجوقی سوار قلعے میں داخل ہو جائیں گے اور اندر تمام باطنی مارے جائیں گے اور حسن بن صباح گرفتار ہو جائے گا...... اس جاسوس نے ابو علی کو جا اطلاع دی۔

تین سو سوار تیار تھے۔ انہیں پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ ان کے دلوں میں سلجوقیوں کی اتنی نفرت پیدا کی گئی تھی کہ وہ اس انتظار میں تھے کہ سلجوقی سامنے آئیں تو ان کے جسموں کے پرخچے اڑا دیں۔

اب انہیں موقع مل گیا۔ اشارہ ملتے ہی وہ قلعہ تبریز پہنچے اور سلجوقیوں کو بے خبری میں جا لیا۔ سلجوقی بے خبری اور غلط فہمی میں مارے گئے ورنہ سلجوقیوں نے تو جنگجوئی میں دور دور تک دھاک بٹھائی ہوئی تھی مگر دھاک حسن بن صباح کی بیٹھ گئی۔ اس کے جانبازوں اور بستی تبریز کے باشندوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ "آسمان سے اترنے والے تین سو گھوڑ سوار فرشتوں" کا انتظام پہلے سے کر لیا گیا تھا۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ حسن بن صباح پر وحی نازل ہوئی تھی اور یہ مدد بھی حسن کے کہنے پر خدا نے بھیجی تھی۔

○

مزمل آفندی گھوڑا دوڑاتا مرو جا رہا تھا۔ اس نے اپنے زخموں پر کپڑے کس کر باندھ لئے تھے پھر بھی زخموں سے خون رس رہا تھا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ زندہ سلطان ملک شاہ تک پہنچ جائے اور ہوش میں رہے تاکہ اسے قلعہ تبریز کی لڑائی کی خبر دے سکے اور اسے کہے کہ وہ فوراً جوابی حملے کے لئے فوج بھیجے۔

یہ ایک دن اور ایک رات کی مسافت تھی جو مزمل آفندی نے کم سے کم وقت میں طے کی اور رات کو مرو پہنچا۔ سلطان ملک شاہ سو گیا تھا۔ سلطان کو جگانے کی جرأت کوئی

بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن مزمل خون میں نہایا ہوا اور نیم جاں تھا اور وہ سالار امیر ارسلان اور اس کے سوار دستے کی خبر لایا تھا۔ سلطان کو جگا کر بتایا گیا تو وہ بستر سے کود کر اٹھا اور ملاقات والے کمرے میں گیا۔

مزمل دروازے میں داخل ہوا تو اس کا وجود گرنے والے درخت کی طرح ڈول رہا تھا اور سر کبھی دائیں کبھی بائیں ڈھلک جاتا تھا۔ اس کے کپڑے خون سے لال ہو گئے اور زخموں سے تازہ خون رس رہا تھا۔ سلطان دوڑ کر اس تک پہنچا اور اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

"اسے دیوان پر لٹاؤ" ـــ سلطان ملک شاہ نے دربان سے کہا اور خود ہی مزمل کو اٹھا لیا۔

دربان نے بھی مدد کی اور مزمل کو دیوان پر لٹا دیا گیا۔ سلطان کے کپڑے بھی سامنے سے لال ہو گئے۔

"اسے دودھ شربت پلاؤ" ـــ سلطان نے دربان سے کہا ـــ "طبیب کو اور جراح کو بھی فوراً ساتھ لے آؤ"۔

سلطان ملک شاہ نے شربت کا گلاس دربان کے ہاتھ سے لیا اور اُسے دوڑا دیا پھر مزمل کو سہارا دے کر اٹھایا اور اسے اپنے ہاتھ سے شربت پلایا۔

"اب لیٹ جاؤ" ـــ سلطان نے مزمل آفندی کو لٹا کر پوچھا ـــ "تم بہت زخمی ہو"۔

"میں انشاء اللہ زندہ رہوں گا" ـــ مزمل آفندی نے بڑی مشکل سے ہانپتی کانپتی آواز میں کہا ـــ "میں نے حسن بن صباح کو قتل کرنے کا عہد کر رکھا ہے...... میرا نام مزمل آفندی ہے۔ آپ کی فوج کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں...... پہلے اپنے سوار دستے اور سالار امیر ارسلان کی خبر سن لیں...... امیر ارسلان مارا گیا ہے اور اپنے دستے کے شاید سارے ہی سوار بھی مارے گئے ہیں"۔

"کیا کہا؟" ـــ سلطان نے حیرت زدہ ہو کر کہا ـــ "ارسلان مارا گیا ہے؟...... یہ ہوا کیسے؟ یہ لڑائی کہاں لڑی گئی ہے؟"

"قلعہ تبریز میں!" ـــ مزمل آفندی نے جواب دیا۔

طبیب اور جراح دوڑے آئے۔ سلطان کے کہنے پر انہوں نے مزمل کے زخموں کو

دھونا شروع کر دیا۔ سلطان نے مزمل کے لئے پھل اور میوے منگوائے' پھر زخموں کی مرہم پٹی ہوتی رہی' مزمل پھل اور میوے کھاتا رہا اور سلطان کو سناتا رہا کہ وہ کس طرح میمونہ کو حسن بن صباح کی قید سے فرار کرا کے لایا تھا اور رے میں ابو مسلم رازی کے ہاں میمونہ کو اپنی بیٹی شمونہ مل گئی تھی۔ پھر اس نے حسن بن صباح کے تعاقب کا اور قلعہ تبریز کی لڑائی کا مکمل احوال سنا دیا۔

سلطان ملک شاہ آگ بگولہ ہو گیا۔ اُس نے اُسی وقت اپنے ایک سالار قزل ساروق کو بلایا۔ یہ سالار تُرک تھا۔ ابنِ اثیر نے لکھا ہے کہ قزل ساروق نامور سالار اور مشہور سلجوق جنگجو تھا۔ سلطان نے اسے کہا کہ وہ کم از کم ایک ہزار سواروں کا دستہ لے کر ابھی قلعہ تبریز کو روانہ ہو جائے۔

قزل ساروق سمجھ گیا کہ بہت جلدی تبریز پہنچنا ہے۔

وہ ایک ہزار منتخب سواروں کے ساتھ حیران کُن کم وقت میں قلعہ تبریز پہنچ گیا لیکن وہاں سالار امیر ارسلان اور اس کے سواروں کی لاشوں کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ کسی بھی لاش کے ساتھ ہتھیار نہیں تھا۔ ایک بھی گھوڑا نہیں تھا۔ ہتھیار بھی اور گھوڑے بھی باطنی لے گئے تھے۔

قزل ساروق قلعے کے اندر گیا۔ کوئی ایک بھی انسان نظر نہ آیا۔ مکان خالی پڑے تھے۔

"آگ لگا دو" — قزل ساروق نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد مکانوں سے شعلے اٹھنے لگے اور دھوئیں آسمان تک پہنچنے لگے۔

"قبریں کھودو اور اپنے ساتھیوں کو دفن کر دو" — قزل ساروق نے اپنے سواروں سے کہا — "ہم یہاں شاید اسی لئے آئے ہیں کہ اپنے ساتھیوں کو دفن کریں اور اس بستی کو آگ لگا دیں اور واپس چلے چلیں..... ہم یہاں کچھ دن ٹھہریں گے"۔

داستان گو جس دَور کی داستان سنا رہا ہے وہ ابلیس کا دَور تھا۔ قرآنِ حکیم کی وہ پیش گوئی جو سورۃ الاعراف کی آیات 11 سے 23 تک واضح الفاظ میں آئی ہے' حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ابلیس کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں دھتکار دیا اور اُسے کہا تو ذلیل و خوار ہوتا رہے گا تو ابلیس نے کہا کہ مجھے روزِ قیامت تک مہلت دے۔ اللہ نے اسے مہلت دے دی۔ ابلیس نے کہا اب دیکھنا میں تیرے ان انسانوں کو کس طرح گمراہی میں ڈالتا ہوں۔ میں تیرے سیدھے راستے پر گھات لگا کر بیٹھوں گا اور تیرے انسانوں کو آگے سے' پیچھے سے' دائیں سے' بائیں سے اور ہر طرف سے گھیروں گا پھر تو دیکھے گا کہ اُن میں سے بہت سے تمہارے شکر گزار نہیں رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوّا سے کہا کہ جنت میں رہو لیکن اُس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ گنہگاروں میں لکھے جاؤ گے۔ شیطان نے آدم سے کہا کہ اللہ نے اس درخت کو تمہارے لئے اس لئے شجرِ ممنوعہ قرار دیا ہے کہ تم فرشتے نہ بن جاؤ اور تمہیں وہ زندگی نہ مل جائے جس کی موت ہوتی ہی نہیں یعنی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی..... ابلیس نے قسم کھا کر کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔

ابلیس نے زبان کا ایسا جادو چلایا اور الفاظ کا ایسا طلسم پیدا کیا کہ آدم اور حوّا کو شیشے میں اتار لیا۔ انہوں نے شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھا اور اس حکم عدولی کے نتیجے میں آدم اور حوّا کے ستر بے نقاب ہو گئے اور وہ درختوں کے پتوں سے ستر ڈھانپنے لگے۔

بات یہ سامنے آئی کہ یہ ابلیس تھا جس نے آدم اور حوّا کو ایک دوسرے کی شرمگاہوں سے روشناس کیا۔ انسان میں تجسس کی بیتابی پیدا آئی اور یہ جذبہ بھی کہ اللہ

جس کام سے منع کرے وہ ضرور کر کے دیکھو اور شجرِ ممنوعہ کا پھل ضرور چکھو۔

حسن بن صباح نے یہی ابلیسی حربے استعمال کئے اور انسان کی ستر پوشی کو برہنگی میں بدل دیا۔ مرد پر عورت کی برہنگی کا طلسم طاری کیا اور یہ تاثر پیدا کیا کہ شجرِ ممنوعہ کا پھل ضرور کھاؤ۔

ابلیس اپنا یہ عہد پورا کر رہا تھا کہ اللہ کے سیدھے راستے پر گھات لگا کر جنوں کا اور اللہ کے بندوں کو ہر طرف سے گھیر کر اپنے راستے پر چلاؤں گا۔

پانچویں صدی ہجری میں حسن بن صباح اللہ کے سیدھے راستے پر گھات لگا کر اور اللہ کے بندوں کو ہر طرف سے گھیر کر اپنے راستے پر چلا رہا تھا۔

O

قلعہ تبریز کی لڑائی میں سلجوقی سالار امیر ارسلان مارا گیا' اُس کے پانچ سو مجاہدین ہلاک یا زخمی ہو گئے تو مزمل آفندی نے شدید زخمی حالت میں مرو پہنچ کر سلطان ملک شاہ کو لڑائی کے اس انجام کی اطلاع دی۔ اُس کا زندہ رہنا معجزہ تھا۔

جب سے مزمل آفندی سالار امیر ارسلان اور اُس کے پانچ سو سواروں کے ساتھ چلا گیا تھا' رے میں شمونہ نے روز مرہ کا معمول بنا لیا تھا کہ بار بار چھت پر چلی جاتی اور اُس راستے کو دیکھنے لگتی جس راستے پر مزمل آفندی چلا گیا تھا۔ شمونہ کو معلوم تھا کہ دو چار دنوں میں اُدھر سے کوئی اطلاع نہیں آئے گی۔ بغداد سے اتنی جلدی اطلاع آ ہی نہیں سکتی تھی لیکن شمونہ مزمل آفندی کی محبت میں پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ وہ حقائق کو تو قبول ہی نہیں کر رہی تھی۔ وہ چھت پر جا کر کبھی بالائی منزل کا اُس طرف والا دریچہ کھول کر اس راستے کو دیکھنے لگتی تھی۔ اُسے قاصد کا انتظار تھا۔

اور اسے انتظار تھا کہ مزمل آفندی اسی راستے سے واپس آئے گا۔ اُس کے چہرے پر فاتحانہ تاثر ہو گا۔ سینہ پھیلا ہوا اور گردن تنی ہوئی ہو گی اور حسن بن صباح اس کے ساتھ ہو گا..... زندہ یا مُردہ!

دنوں پہ دن گزرتے جا رہے تھے۔ نہ جانے کتنی راتیں بیت گئیں' مزمل آفندی نہ آیا۔ مرو سے کوئی قاصد نہ آیا۔

"شمونہ!" ـــ دو تین بار اُس کی ماں میمونہ نے اُسے کہا ـــ "ایک آدمی کی محبت میں گرفتار ہو کر تم دنیا کو بھول گئی ہو۔ تمہیں دن اور رات کا ہوش نہیں رہا۔ یوں تو

زندگی اجیرن ہو جاتی ہے"۔

"میں صرف اُس کا انتظار نہیں کر رہی جسے میں چاہتی ہوں" ـــ شمونہ نے ماں سے کہا تھا ـــ "میں حسن بن صباح کے انتظار میں ہوں۔ اگر وہ زندہ آیا تو میں اُسے زنجیروں میں بندھا دیکھنا چاہوں گی اور اگر اُس کی لاش آئی تو میں سمجھوں گی کہ میرا زندگی کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ مزمل اسے زندہ یا مُردہ لے ہی آئے گا"۔

شمونہ کو کوئی قاصد یا مزمل آفندی آتا نظر نہیں آتا تھا۔ راستہ ہر روز کی طرح شہر سے نکل کر درختوں اور کھیتوں میں بل کھاتا اور ایک پہاڑی میں گم ہو جاتا تھا۔ اسے ہر روز ویسے ہی اونٹ' گھوڑے' بوجھ اٹھائے ہوئے ٹٹو اور پیدل چلتے ہوئے لوگ نظر آتے تھے۔ شمونہ کی بے چینی اور بے تابی بڑھتی جا رہی تھی اور وہ اکتانے بھی لگی تھی۔ اُس کی مزاجی کیفیت بھی کچھ اکھڑی سی گئی تھی۔ آخر ایک روز دن کے پچھلے پہر دور سے اسے ایک گھوڑ سوار آتا نظر آیا۔ گھوڑے کی رفتار اور انداز بتاتا تھا کہ وہ کوئی عام سا مسافر نہیں۔ شمونہ کی نظریں اُس پر جم گئیں اور اُس کے ساتھ ساتھ شہر کی طرف آنے لگیں۔

گھوڑ سوار شہر میں داخل ہوا تو شمونہ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ شہر کی گلیوں میں گم ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ امیرِ شہر ابو مسلم رازی کے گھر کے قریب ایک گلی سے نکلا۔ شمونہ دوڑتی نیچے آئی۔ گھوڑ سوار اس شاہانہ حویلی کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا۔

"تم قاصد تو نہیں ہو!" ـــ شمونہ نے اس سے پوچھا۔

"ہاں بی بی!" ـــ سوار نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا ـــ "میں قاصد ہوں۔ امیرِ شہر سے فوراً ملنا ہے"۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"مرو سے آیا ہوں"۔

"سالار امیر ارسلان اور مزمل آفندی کی کوئی خبر لائے ہو؟" ـــ شمونہ نے بچوں کے سے بے تابانہ اشتیاق سے پوچھا۔

"اُن ہی کی خبر لایا ہوں"۔

"کیا خبر ہے؟" ـــ شمونہ نے تڑپ کر پوچھا۔

"امیرِ شہر کے سوا کسی اور کو بتانے والی خبر نہیں" ـــ قاصد نے جواب دیا۔

شمونہ دوڑتی اندر گئی۔ دربان کے روکنے پر بھی نہ رکی۔ ابو مسلم رازی اپنے کسی
کام میں مصروف تھا۔ شمونہ نے ایسی زور سے دروازہ کھولا کہ ابو مسلم رازی چونک اٹھا۔
"مرو سے قاصد آیا ہے" ——— شمونہ نے بڑی تیزی سے کہا ——— "اسے فوراً بلا لیں"۔

ابو مسلم رازی نے ابھی کچھ جواب نہیں دیا تھا کہ شمونہ باہر کو دوڑ پڑی اور قاصد کو ابو مسلم رازی کے پاس لے گئی۔

"کیا خبر لائے ہو؟" ——— ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

قاصد نے شمونہ کی طرف دیکھا اور پھر ابو مسلم رازی کی طرف دیکھا۔ بات بالکل صاف تھی۔ قاصد شمونہ کے سامنے پیغام نہیں دینا چاہتا تھا۔

"تم ذرا باہر چلی جاؤ شمونہ!" ——— ابو مسلم رازی نے کہا۔

شمونہ وہاں سے ہلی بھی نہیں اور کچھ بولی بھی نہیں۔ اس کی نظریں ابو مسلم رازی کے چہرے پر جم گئی تھیں اور اس کے اپنے چہرے کا تاثر یکلخت بدل گیا تھا۔ رازی کی دانشمندی نے راز پالیا۔ وہ شمونہ کی اس بات کو سمجھتا تھا۔ اس لڑکی نے ابو مسلم رازی کے دل میں اپنی قدر و منزلت پیدا کرلی تھی۔

"ہاں!" ——— ابو مسلم رازی نے قاصد سے پوچھا ——— "کیا خبر لائے ہو"۔

"خبر اچھی نہیں امیر شہر!" ——— قاصد نے کہا ——— "سالار امیر ارسلان مارے گئے ہیں اور ان کے پانچ سو سواروں میں سے شاید ہی کوئی زندہ بچا ہو"۔

"مزمل آفندی کی کیا خبر ہے؟" ——— شمونہ نے تیزی سے اٹھ کر پوچھا۔

"خاموش رہو شمونہ!" ——— ابو مسلم رازی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا ——— "میں تمہیں باہر بھیج دوں گا۔ تم ایک آدمی کا غم لئے بیٹھی ہو اور ہم اس سلطنت اور دین اسلام کے لئے پریشان ہو رہے ہیں" ——— اس نے قاصد سے کہا ——— "آگے بولو"۔

"مزمل آفندی زندہ ہیں" ——— قاصد نے کہا ——— "لیکن بہت بری طرح زخمی ہیں۔ وہ مرو میں سلطان عالی مقام کے پاس ہیں۔ وہی آگے کی خبر لائے تھے"۔

قاصد نے ابو مسلم رازی کو تفصیل سے وہ خبر سنائی جو مزمل آفندی نے سلطان ملک شاہ کو سنائی تھی۔ پھر اس نے یہ بتایا کہ اب سلطان مکرم نے سالار قزل ساروق کو ایک ہزار سوار دے کر حسن بن صباح کی گرفتاری اور اس کے پیروکاروں کی تباہی کے لئے بھیج

دیا ہے۔

قاصد پیغام دے چکا تو ابو مسلم رازی نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

"میں مرو جانا چاہتی ہوں" ——— شمونہ نے کہا ——— "آپ مجھے اسی قاصد کے ساتھ بھیج دیں"۔

"تم وہاں جا کر کیا کرو گی؟" ——— ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"میں مزمل آفندی کی تیمارداری کروں گی" ——— شمونہ نے جواب دیا ——— "اس شخص نے مجھ پر جو احسان کیا ہے کیا میں یہ بھول سکتی ہوں؟ اس نے مجھے بچھڑی ہوئی ماں سے ملایا ہے..... اور امیر شہر! میں نے اور مزمل آفندی نے عہد کیا ہے اور قسم کھائی ہے کہ حسن بن صباح کو ہم دونوں قتل کریں گے۔ اس مقصد کے لئے میں مزمل کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں"۔

"ایسے کام جذبات کے جوش سے نہیں ہوا کرتے شمونہ!" ——— ابو مسلم رازی نے کہا ——— "اس کے لئے تجربے کی اور دور اندیشی سے ہر پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ تم میرے ساتھ رہو۔ تمہاری ماں یہیں ہے۔ میرا بھی یہی مقصد ہے۔ حسن بن صباح جب یہاں آیا تھا تو میں نے اس کی گرفتاری کا حکم دے دیا تھا لیکن اسے قبل از وقت پتہ چل گیا اور وہ فرار ہو گیا۔ میں نے بھی حسن بن صباح کے قتل کو اپنی زندگی کا مقصد بنا رکھا ہے۔ پھر اس لئے بھی میں تمہیں وہاں نہیں بھیج سکتا کہ مزمل آفندی سلطان کے پاس ہے۔ میری بات اور ہے' سلطان کے ہاں فضا اور ماحول کچھ اور ہے۔ انہوں نے مزمل آفندی کو اپنی نگرانی میں رکھا ہو گا اور وہ پریشان بھی ہوں گے کہ امیر ارسلان جیسا سالار اپنے تمام سواروں کے ساتھ مارا گیا ہے۔ یہ پریشانی اب مجھے بھی لاحق ہو گئی ہے کہ حسن بن صباح کے پاس اتنی فوجی طاقت اکٹھی ہو گئی ہے کہ اس نے پانچ سو سلجوقی سواروں کو ختم کر دیا ہے۔ کسی کو سلجوقی کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ جان کی بازی لگا دینے والا جنگجو ہے اور ناقابل تسخیر۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حسن بن صباح کے پیروکار سلجوقیوں سے زیادہ سرفروش ہیں..... تم یہیں رہو۔ ہو سکتا ہے سلطان تمہارا وہاں جانا پسند نہ کریں' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں اس بنا پر شک کی نظروں سے دیکھیں کہ تم نے حسن بن صباح کے زیر سایہ تربیت حاصل کی ہے"۔

ابو مسلم رازی نے شمونہ کی ماں کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کے جذبات کو اپنے

قابو میں لے لے ورنہ یہ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کر بیٹھے گا۔

○

سالار قزل ساروق نے تبریز کی قلعہ نما بستی کو نذرِ آتش تو کر دیا لیکن وہ اس بستی کو نذرِ آتش کرنے کے لئے نہیں گیا تھا۔ یہ تو غصے کا اظہار تھا جو اُس نے کیا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ حسن بن صباح اور اس کے جنگجو پیروکار کہاں گئے۔ اُس نے جو لاشیں دیکھی تھیں ان میں سالار امیر ارسلان کے سواروں کی لاشیں زیادہ تھیں اور حسن بن صباح کے آدمیوں کی لاشیں بہت ہی تھوڑی تھیں۔

سالار قزل ساروق کے ساتھ جاسوسی کرنے والے آدمی بھی تھے۔ بھیس اور حُلیہ بدلنے کا بھی اُن کے پاس انتظام تھا۔ قزل ساروق نے اپنے چار آدمیوں کو جاسوسی کے لئے تیار کیا اور انہیں ضروری ہدایات دے کر اِدھر اُدھر بھیج دیا۔ اُس نے خود ذرا سا بھی آرام نہ کیا۔ اپنے دو تین ماتحت کمانداروں کو ساتھ لے کر تبریز سے کچھ دُور زمین کو کھوجنے کے لئے چلا گیا۔ اُس نے ہر طرف زمین دیکھی۔ حسن بن صباح اکیلا ہی تو نہیں تھا کہ اُس کا کھرا کھوج نہ ملتا۔ اُس کے ساتھ بہت سے لوگ تھے جن میں گھوڑ سوار بھی تھے۔

ایک جگہ مل ہی گئی۔ زمین گواہی دے رہی تھی کہ یہاں سے ایک قافلہ یا لشکر گزرا ہے۔ قزل ساروق زمین کے یہ نشان دیکھتا ہوا آگے ہی آگے چلتا گیا۔ یہ کوئی عام راستہ نہیں تھا۔ یہ لوگ اونچی نیچی زمین پر چلتے گئے۔ آگے ایک ندی تھی۔ وہ اس ندی میں سے بھی گزرے تھے۔ اگر یہ کوئی پُرامن لوگوں کا قافلہ ہوتا تو کسی باقاعدہ پگڈنڈی پر جا رہا ہوتا یا ہموار زمین پر چلتا۔ یہ قافلے لوٹنے والے ڈاکوؤں کا گروہ بھی ہو سکتا تھا اور یہ حسن بن صباح کا گروہ بھی ہو سکتا تھا۔

زمین کے ان نشانات سے تو صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ کس سمت کو جا رہے ہیں لیکن اصل بات تو یہ معلوم کرنی تھی کہ وہ گئے کہاں۔ آگے ایسا پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جس کے اندر کسی آبادی کا گمان نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سالار قزل ساروق ایک جگہ رُک گیا۔ اس کا آگے جانا ٹھیک نہیں تھا کیونکہ وہ دُور سے پہچانا جاتا تھا کہ یہ کسی شہر کا امیر یا فوج کا سالار ہے۔ اُس نے اپنے ماتحتوں سے کہا کہ اس طرف اپنا کوئی آدمی بھیس بدل کر جائے تو کچھ سراغ مل سکتا ہے۔ ایک ماتحت نے

نے کہا کہ تبریز واپس چل کر ایک اور آدمی کو اس سمت میں روانہ کر دیتے ہیں۔

وہ واپس تبریز آ گئے۔

بہت دیر بعد ایک شتر سوار آتا نظر آیا۔ وہ بڑی تیز رفتار سے آ رہا تھا۔ قریب آیا تو وہ ان کا ایک جاسوس نکلا جسے علی الصبح بھیجا گیا تھا۔ وہ اونٹ سے اُترا اور اپنے سالار کے پاس گیا۔

"سراغ مل گیا ہے" ـــ جاسوس نے کہا ـــ "میں نے گھوڑوں، اونٹوں اور آدمیوں کے پاؤں کے نشان دیکھے اور ان پر چلتا گیا۔ یہ نشان مجھے ایک جگہ لے گئے جہاں تین مکان تھے جن کے مکینوں کے بچے مکانوں سے کچھ دُور کھیل رہے تھے۔ میں اونٹ سے اُترا اور ان بچوں سے پوچھا کہ ادھر ایک قافلہ گیا ہے۔ میں اس قافلے سے بچھڑ گیا تھا کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ قافلہ کدھر گیا ہے۔ بچوں نے مجھے صرف سمت بتائی"۔

اس جاسوس نے اپنے سالار کو جو تفصیل بتائی وہ یوں تھی کہ جب یہ شخص بچوں سے پوچھ رہا تھا اُس وقت ان مکانوں کے رہنے والے کسی آدمی نے دیکھ لیا اور اس کے پاس آ کر پوچھا کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ اُس نے وہی بات کہی جو وہ بچوں سے کہہ چکا تھا کہ وہ اس قافلے سے بچھڑ گیا تھا۔

"وہ ایک عجیب قافلہ تھا" ـــ اُس آدمی نے کہا ـــ "اس میں بہت سے آدمی تھے جو زخمی تھے۔ ان کے کپڑے خون سے لال تھے۔ ان میں کچھ گھوڑوں پر سوار تھے اور کچھ اونٹوں پر اور چند ایک پیدل بھی چلے جا رہے تھے۔ ہمیں تو وہ قافلوں کو لوٹنے والے ڈاکو لگتے تھے۔ ان کے ساتھ جو اونٹ تھے ان میں سے دو اونٹوں پر پالکیاں تھیں۔ دونوں میں ایک ایک یا شاید دو دو عورتیں تھیں۔ ہمیں شک ہے کہ وہ ڈاکو تھے۔ انہوں نے کسی قافلے کو لوٹنے کی کوشش کی ہو گی اور قافلے والوں نے مقابلہ کر کے انہیں مار بھگایا ہو گا"۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو میرے دوست!" ـــ جاسوس نے کہا ـــ "وہ ڈاکوؤں کا ہی گروہ ہے۔ انہوں نے ایک قافلے پر حملہ کیا تھا لیکن ناکام رہے کیونکہ قافلے میں لڑنے والے بہت سے آدمی تھے۔ انہوں نے ان ڈاکوؤں کے کئی ایک آدمی مار ڈالے اور باقی بھاگ آئے۔ میں سلجوقی فوج کا آدمی ہوں اور اس قافلے کا سراغ لیتا پھر رہا ہوں۔ اگر تم بتا سکو کہ یہ لوگ آگے کہاں گئے ہیں تو تمہیں سلطان کی طرف سے جھولی بھر کر انعام

ملے گا"۔

"میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں گئے ہیں' میں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ اس پہاڑی علاقے کے اندر پرانے زمانے کا ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جو دراصل قلعے کے کھنڈرات ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اس قلعے میں گئے ہوں۔ ان پہاڑیوں کے اندر کوئی اور آبادی نہیں۔ بڑے بڑے غار ہیں جہاں صرف ڈاکو ہی جا سکتے ہیں' کسی اور نے وہاں جا کر کیا کرنا ہے"۔

قزل ساروق کا جاسوس وہیں سے واپس آگیا اور اپنے سالار کو بتایا۔

اس جاسوس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ جب وہاں سے قافلے کا سراغ لے کر آگیا تھا تو پیچھے کیا ہوا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ جب جاسوس وہاں سے چلا تو ایک بوڑھا آدمی مکان سے نکلا اور اس نے اپنے اس آدمی کو بلایا اور پوچھا کہ یہ شترسوار کون تھا اور کیا کہتا تھا۔ اس نے اس بوڑھے کو بتا دیا کہ وہ کیا پوچھ رہا تھا اور اس نے کیا بتایا تھا۔

"بیوقوف آدمی!" — بوڑھے نے کہا — "جانتے ہو تم نے کیا کیا ہے؟"

"یہ سلطان کی فوج کا آدمی تھا" — اس آدمی نے کہا — "وہ ڈاکوؤں کے اس گروہ کی تلاش میں تھا۔ میں جو جانتا تھا وہ اسے بتا دیا ہے۔ اگر سلطان کی فوج نے ان ڈاکوؤں کو پکڑ لیا تو مجھے انعام ملے گا"۔

"تمہیں انعام بعد میں ملے گا" — بوڑھے نے کہا — "لیکن انعام لینے کے لئے نہ تم زندہ رہو گے نہ ہم میں سے کوئی زندہ رہے گا۔ تم نے ہم سے پوچھ کر بات کرنی تھی۔ تم نے جس کی نشاندہی کی ہے وہ حسن بن صباح تھا۔ کیا تم نہیں جانتے حسن بن صباح کون ہے؟"

"ہاں!" — اس نے کہا — "وہ آسمان سے اُترا ہے اور خدا نے اسے اپنا ایلچی بنا کر بھیجا ہے"۔

"وہ خدا کے بندوں کو سیدھا راستہ دکھانے آیا ہے" — بوڑھے نے کہا — "اس کے مقابلے میں کتنا ہی بڑا لشکر آجائے وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ آسمان سے معلوم نہیں جنات اُترتے ہیں یا قہر برسانے والے فرشتے آجاتے ہیں جو لشکر کو کاٹ کر پھینک جاتے ہیں۔ کیا تم نے تبریز کی لڑائی نہیں سنی؟ ابھی چند دن ہی تو گزرے ہیں۔ سلطان کا پورے کا پورا لشکر اپنے ہی خون میں ڈوب گیا ہے"۔

"ہاں سنا تھا" — اس نے کہا۔

مکانوں سے ایک اور آدمی نکل آیا۔ بوڑھے نے اُسے بتایا کہ اس نے سلطان کے ایک جاسوس کو بتا دیا ہے کہ حسن بن صباح ادھر چلا گیا ہے۔

"یہ تو نیم پاگل ہے" — دوسرے آدمی نے کہا۔

"یہ تو میں جانتا ہوں" — بوڑھے نے کہا — "لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ سلطان نے حسن بن صباح کے پیچھے فوج بھیج دی تو کیا ہم نہ مارے جائیں گے؟..... سوچو ہم کیا کریں!"

وہ حسن بن صباح ہی تھا جو تبریز سے اپنے تمام پیروکاروں کو اور ابو علی کے قزوین سے بھیجے ہوئے تین سو سواروں کو اپنے ساتھ لے کر یہاں سے گزرا تھا۔ ان مکانوں کے قریب آیا تو تمام مکین باہر آکر راستے میں کھڑے ہو گئے تھے۔ حسن بن صباح نے انہیں دیکھا تو اپنے دو مصاحبوں سے کہا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ کسی کو پتہ نہ چلنے دیں کہ ہم ادھر سے گزرے ہیں۔ اگر انہوں نے کسی کو بتایا تو ان کے بچے سے بوڑھے تک کو قتل کر دیا جائے گا اور ان کے مکانوں کو آگ لگا دی جائے گی۔

اب ان کے لئے یہ صورت پیدا ہو گئی تھی کہ ان کے ایک آدمی نے جسے وہ نیم پاگل کہہ رہے تھے' ایک جاسوس کو بتا دیا تھا کہ وہ لوگ آگے گئے ہیں اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان پہاڑیوں کے اندر ایک قدیم قلعے کے کھنڈرات ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ اسی قلعے میں گئے ہوں۔

○

دوسرے جاسوس کسی اور طرف چلے گئے تھے۔ ان کی واپسی کے انتظار میں پوری رات گزر گئی۔ وہ اگلے روز یکے بعد دیگرے آئے تو آدھا دن گزر چکا تھا۔ ان سب نے یہی خبر دی کہ حسن بن صباح ان پہاڑیوں کے اندر گیا ہے۔ اس طرح تصدیق ہو گئی کہ اس وقت اُن کا شکار کہاں ہے۔ تبریز سے اُس جگہ کا فاصلہ کم و بیش چالیس میل بتایا گیا تھا۔

آدھا دن گزر چکا تھا جب قزل ساروق نے اپنے ایک ہزار سواروں کے لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔

لشکر انہی مکانوں کے قریب سے گزرا۔ ایک جاسوس نے راستہ معلوم کر لیا تھا۔ لشکر پہاڑی علاقے میں داخل ہو گیا۔ آگے راستہ بہت ہی دشوار تھا اس لئے لشکر کی رفتار

بہت ہی سُست رہی۔ ابھی پندرہ سولہ میل بھی طے نہیں ہوئے تھے کہ سورج غروب ہو گیا۔ چونکہ علاقہ پہاڑی اور جنگلاتی تھا اس لئے شام بہت جلدی گہری ہو گئی پھر بھی قزل ساروق نے سفر جاری رکھا۔ آگے راستہ دشوار ہوتا چلا گیا۔ یہ راستہ پہاڑی کے ساتھ ساتھ بل کھاتا جا رہا تھا۔ رات بالکل تاریک تھی پھر بھی سالار نے لشکر کو نہ روکا۔

وہ تھوڑا ہی اور آگے گئے ہوں گے لشکر میں شور سا سنائی دیا۔ ایک گھوڑا بڑی زور سے ہنہنایا۔ دو تین آوازیں سنائی دیں کہ ایک سوار کا گھوڑا پھسل کر نیچے چلا گیا ہے اس جگہ راستہ تنگ تھا۔ ایک طرف پہاڑی اور دوسری طرف وادی کی گہرائی تھی۔ اس طرف پہاڑ کی ڈھلان تقریباً عمودی تھی۔ پہاڑ پر درخت تو تھے لیکن اتنے زیادہ نہیں تھے جو گھوڑے یا سوار کو روک لیتے۔ کچھ دیر تک گھوڑے کے گرنے اور لڑھکتے ہوئے نیچے جانے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

قزل ساروق نے لشکر کو روک لیا۔ اُس کے کہنے پر اُس سوار کو آوازیں دی گئیں جو گر پڑا تھا۔ اُس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا یا مر گیا تھا۔

سالار قزل ساروق نے یہ کہہ کر کوچ کا حکم دے دیا کہ ایک سوار کے لئے پورے لشکر کی پیش قدمی نہیں روکی جا سکتی۔

سوار اور زیادہ محتاط ہو کر چلنے لگے۔ وہ چار اور موڑ مڑے تو راستہ نیچے کو جانے لگا۔ آخر وہ اُس پہاڑ سے اُترے تو آگے خاصی چوڑی وادی تھی جہاں قزل ساروق نے سواروں کو صبح تک کے لئے روک لیا۔ سواروں نے گھوڑوں کی زینیں اتاریں اور باقی رات آرام کرنے کے لئے ادھر اُدھر لیٹ گئے۔

صبح طلوع ہوئی تو کوچ کی تیاری کا حکم ملا۔ سوار گھوڑوں پر زینیں کس رہے تھے کہ ایک طرف سے ایک ادھیڑ عمر آدمی ایک عورت کے ساتھ آتا نظر آیا۔ اُن کے ساتھ دو لڑکے تھے جن میں سے ایک چودہ پندرہ سال کا اور دوسرا گیارہ بارہ سال کا تھا۔ آدمی نے ایک ٹٹو کی باگ پکڑ رکھی تھی اور ٹٹو پر کچھ سامان لدا ہوا تھا۔ اُنہوں نے وہیں سے گزرنا تھا جہاں لشکر کوچ کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ وہ ایک طرف سے گزرتے گئے۔ سالار قزل ساروق لشکر سے تھوڑا پرے تھا۔ وہ خود تیار ہو چکا تھا۔ اُس کا سائیس اُس کے گھوڑے کو تیار کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اُس کے تین چار ماتحت کماندار اُس کے پاس آ گئے۔ وہ بالکل تیار ہو کر

آئے تھے۔

"یہ کون ہے؟" — قزل ساروق نے ادھیڑ عمر آدمی اور عورت کو دیکھ کر پوچھا۔

"ہم نے پوچھا نہیں" — ایک کماندار نے جواب دیا۔

"ان سے پوچھو" — قزل ساروق نے کہا — "ان کے ادھر سے گزرنے کا مطلب ہے کہ آگے یا اس علاقے میں کہیں کوئی آبادی ہے۔ اگر یہ یہاں کے رہنے والے ہیں تو انہیں معلوم ہو گا کہ وہ قدیم قلعہ کہاں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم غلط راستے پر جا رہے ہوں"۔

وہ لوگ قریب آئے تو اُنہیں روک لیا گیا۔

"السلام علیکم" — ادھیڑ عمر آدمی نے کہا — "آپ اس لشکر کے سالار معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نہ روکتے تو بھی میں نے رُکنا تھا"۔

"آپ کہیں سے آ رہے ہیں یا کہیں جا رہے ہیں!" — قزل ساروق نے پوچھا۔

"ہم آ رہے ہیں سالارِ محترم!" — اُس نے جواب دیا — "ہم تقریباً ایک سال بعد واپس اپنے گھر آ رہے ہیں۔ الحمد للہ ہم فریضۂ حج ادا کرنے گئے تھے"۔

"کیا آپ پیدل ہی گئے تھے؟"

"پیدل بھی سمجھیں اور سوار بھی سمجھیں" — اس نے جواب دیا — "یہ ایک ٹٹو ساتھ تھا۔ باری باری اسی پر سوار ہوتے گئے۔ کہیں سب کو کرائے کی سواری مل گئی اور یوں ارضِ حجاز تک پہنچے، مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی، فریضۂ حج ادا کیا اور پھر جنگوں کے وہ میدان دیکھے جہاں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کفار سے لڑے تھے۔ بدر کا میدان دیکھا، اُحد کا میدان دیکھا اور پھر اُس جگہ کو سجدے میں جا کر چوما جہاں ہمارے رسول ؐ زخمی ہو کر گرے تھے ..... خدا کی قسم، وہاں سے واپس آنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن پیچھے بوڑھے ماں باپ کو لوگوں کے سپرد کر گئے تھے۔ ان کی خاطر واپس آ گئے ہیں"۔

"اللہ آپ کا حج قبول فرمائے" — قزل ساروق نے کہا — "آپ خوش نصیب ہیں جو اللہ کے گھر میں رکوع و سجود کر کے آئے ہیں ..... کیا آپ کی بستی یہاں کہیں قریب ہی ہے؟"

"ابھی قریب بھی نہیں" — حج سے آنے والے نے جواب دیا — "تقریباً"

پورے دن کی مسافت ہے"۔

"کیا اس علاقے میں کوئی بہت پرانا قلعہ بھی ہے؟" — قزل ساروق نے پوچھا اور خود ہی کہا — "سنا ہے اس کے کھنڈر باقی ہیں"۔

"ہاں محترم سالار!" — حاجی نے جواب دیا — "کہنے کو تو اس پہاڑی کے دوسری طرف ہے لیکن وہاں تک پہنچتے آج کا دن گزر چکا ہو گا..... کیا آپ اس قلعے تک جانا چاہتے ہیں؟"

"ہاں!" — قزل ساروق نے کہا — "قصد تو وہیں کا ہے، راستہ معلوم نہیں"۔

"راستہ مجھ سے پوچھیں" — حاجی نے کہا — "میرے ساتھ بیوی بچے نہ ہوتے تو میں آپ کے ساتھ چلتا تاکہ کہیں آپ بھٹک نہ جائیں۔ آپ جو فرض ادا کر رہے ہیں اسے میں تو فریضۂ حج کے برابر سمجھتا ہوں..... آپ یقیناً سلجوقی ہیں"۔

"اہل حجاز کے مسافر!" — قزل ساروق نے کہا — "میں سب سے پہلے مسلمان ہوں اس کے بعد سلجوقی ہوں"۔

○

اس اجنبی نے قزل ساروق کو اس قدیم قلعے کا راستہ سمجھانا شروع کر دیا۔ راستہ کوئی پیچیدہ تو نہیں تھا البتہ دشوار تھا۔ قزل ساروق کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ اس وادی سے الٹے رخ چلنے والا تھا۔

"آپ تو فرشتہ معلوم ہوتے ہیں" — قزل ساروق نے کہا — "ہم تو کسی اور ہی طرف چلنے والے تھے۔ اللہ نے آپ کو ہماری رہنمائی کے لئے بھیجا ہے"۔

"اللہ مسبب الاسباب ہے" — حاجی نے کہا — "اللہ نے یہ سعادت بھی میری قسمت میں لکھی تھی کہ مجاہدین کی رہنمائی کروں۔ مجھے آپ کے کام میں دخل تو نہیں دینا چاہئے لیکن پوچھنا چاہوں گا کہ آپ اس قدیم قلعے میں کیوں جا رہے ہیں؟"

"کیا آپ نے حسن بن صباح کا نام سنا ہے؟" — قزل ساروق نے پوچھا۔

"اس ابلیس کا نام کس نے نہیں سنا ہو گا!" — حاجی نے کہا — "میں بغداد پہنچا تو وہاں سے یہاں تک اسی کا نام سنتا آرہا ہوں۔ افسوس یہ ہو رہا ہے کہ لوگ اسے نبی اور اللہ کا ایلچی ماننے لگے ہیں۔ یہاں سے دور پیچھے مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ انہی قدیم قلعے میں ہے اور اس کے ساتھ بڑے خونخوار قسم کے جانباز ہیں..... اگر آپ اس ابلیس کو ختم کر

دیں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو حج اکبر کا ثواب ملے گا"۔

"ہماری کامیابی کی دعا کریں" — سالار قزل ساروق نے عقیدت مندی کے لہجے میں کہا۔

"انہیں مکہ کی ایک ایک کھجور کھلا دیں" — حاجی کی بیوی بولی — "اور زم زم کے پانی کا ایک ایک گھونٹ پلا دیں"۔

اس شخص نے ٹٹو کی پیٹھ پر لدے ہوئے سامان میں سے چھوٹا سا ایک تھیلا نکالا۔ اس میں سے کچھ کھجوریں نکالیں۔ ایک ایک کھجور سالار قزل ساروق اور اس کے ماتحتوں کو دی۔

"ان کی گٹھلیاں نکلی ہوئی ہیں" — حاجی نے کہا — "وہاں سے ایسے ہی ملتی ہیں۔ بڑی خاص قسم کی کھجوریں ہیں..... اگر آپ کے لشکر کے پاس بہت بڑا ڈول یا مٹکا ہو تو وہ پانی سے بھر لیا جائے تو میں اس میں زم زم کا پانی ملا دوں گا۔ پورے لشکر کو دو دو گھونٹ پلائیں"۔

یہ ایک ہزار کا لشکر تھا جس کے کھانے پینے کا انتظام اور برتن وغیرہ ساتھ تھے۔ پانی سے بھرے ہوئے بڑے مشکیزے اونٹوں پر لدے ہوئے تھے۔ قزل ساروق کے حکم سے دو تین مشکیزے لائے گئے۔ حاجی نے خشک چمڑے کی بنی ہوئی ایک صراحی نکالی جس کا منہ بڑی مضبوطی سے بند تھا۔ حاجی نے یہ صراحی تینوں مشکیزوں میں خالی کر دی اور کہا کہ کوچ سے پہلے ہر آدمی یہ پانی پی لے۔

"پھر آپ دیکھنا سالارِ محترم!" — حاجی نے کہا — "آپ کو راستے کی دشواریوں کا احساس تک نہیں ہو گا اور آپ اور آپ کا ہر سوار یہ محسوس کرے گا کہ وہ اڑ کر اس قلعے تک پہنچ گیا ہے"۔

قزل ساروق اور اس کے ماتحتوں نے ایک ایک کھجور کھائی پھر انہوں نے مشکیزے سارے لشکر میں اس حکم کے ساتھ گھمائے کہ ہر سوار پانی پیئے۔ لشکر کو یہ بھی بتایا گیا کہ یہ آب زم زم ہے۔

حاجی اپنی بیوی اور بیٹوں کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ سالار قزل ساروق نے صرف اس خیال سے اپنے آپ میں ایک نئی توانائی محسوس کی کہ اس نے مکے کی کھجور کھائی ہے اور آب زم زم پیا ہے۔ لشکر کے ہر سوار نے عقیدت مندی سے آب زم زم پیا اور پھر

لشکر اُس راستے پر چل پڑا جو حاجی نے بتایا تھا۔ حاجی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

○

لشکر کو ایک بار پھر پہاڑی راستے پر اوپر جانا پڑا۔ گزشتہ رات ان کا ایک گھوڑا اور اس کا سوار ضائع ہو چکے تھے۔ یہ راستہ اُس سے زیادہ تنگ اور خطرناک تھا۔ گھوڑے ایک دوسرے کے پیچھے جا رہے تھے۔ اُن کی رفتار بہت ہی سُست تھی۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتے جا رہے تھے، راستہ تنگ ہی ہوتا جا رہا تھا اور آگے جا کر راستہ ختم ہو گیا۔ آگے پہاڑی دیوار کی طرح کھڑی تھی۔

"کیا اُس حاجی نے یہی راستہ بتایا تھا؟" — سالار قزل ساروق نے اپنے ماتحتوں سے پوچھا جو اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔

"اس نے کہا تھا کہ یہ راستہ اوپر جا کر نیچے اُترے گا" — ایک ماتحت نے کہا — "یہاں اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں"۔

قزل ساروق نے اس پہاڑی کی ڈھلان کو دیکھا۔ اس سے آدمی سنبھل سنبھل کر اُتر سکتا اور گھوڑے بھی اُتر سکتے تھے لیکن سواروں کے بغیر۔

"کسی ایک سوار کو نیچے اُتارو" — قزل ساروق نے اپنے ماتحت کمانداروں سے کہا — "گھوڑے سے اتر کر..... گھوڑے کو ساتھ رکھے"۔

ایک جگہ ایسی مل گئی جہاں ڈھلان کا زاویہ زیادہ خطرناک نہیں تھا۔ ایک سوار گھوڑے سے اُترا اور باگ پکڑ کر ڈھلان سے اُترنے لگا۔ وہ کبھی دائیں ہوتا کبھی بائیں، جہاں پاؤں جمانے کو جگہ ملتی پاؤں جما کر اُتر آیا۔ گھوڑے، خچر اور گدھے کو پہاڑی پر چڑھنے اور اُترنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ قدرت نے ان کے پاؤں ایسے بنائے ہیں کہ پہاڑی سے پھسلتے نہیں۔

بلندی خاصی زیادہ تھی۔ وہ سوار آخر اُتر گیا۔ قزل ساروق نے حکم دیا کہ تمام سوار اسی طرح نیچے اتریں۔ یوں لگا جیسے پہاڑ کا بالائی حصہ ٹوٹ کر بہت بڑے بڑے تودوں کی طرح نیچے کو سرک رہا ہو۔ چند ایک گھوڑے گرے، لڑھکے اور سنبھل کر کھڑے ہو گئے۔ آدمی گرتے سنبھلتے اُترتے گئے اور جب سب اُتر گئے تو سورج اپنا بہت سا سفر طے کر گیا تھا۔

سواروں کو اکٹھا کر کے کوچ شروع ہوا۔ حاجی کی بتائی ہوئی نشانیوں کو دیکھتے وہ چلتے

گئے۔ بہت دور جا کر ایک پہاڑی کے درمیان سے انہیں راستہ مل گیا۔ قدرت نے یہاں سے پہاڑی کو کاٹ رکھا تھا۔ اس سے نکل کر آگے گئے تو ایک پُرشور ندی نے راستہ روک لیا۔ چونکہ یہ علاقہ پہاڑی تھا اس لیے ندی کا بہاؤ بہت ہی تیز تھا۔ پانی اتنا شفاف کہ اس کی تہہ میں کنکریاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ ندی کم و بیش بیس گز چوڑی تھی۔ درمیان میں اس کا بہاؤ بہت ہی تیز تھا۔ گہرائی اتنی نہیں تھی کہ گھوڑے ڈوب جاتے۔

گھوڑے ندی میں ڈال دیئے گئے۔ درمیان میں گہرائی اتنی ہی تھی کہ پانی رکابوں تک آ گیا تھا لیکن بہاؤ اتنا تیز کہ گھوڑوں کے پاؤں اکھڑنے لگے اور گھوڑے پہلو بہ پہلو ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ بعض گھوڑے بہاؤ کے ساتھ ہی چلے گئے اور دور جا کر کنارے لگے۔

آگے گھنا جنگل تھا۔ ایسا گھنا بھی نہیں کہ اس میں سے گزرا ہی نہ جا سکتا لیکن زمین ہموار نہیں تھی۔ نشیب و فراز تھے، گھاٹیاں اور ٹیکریاں تھیں، اور جگہ جگہ پانی جمع تھا۔ اس کے ارد گرد پھسلن اور دلدل تھی۔ گھوڑوں کو اسی میں سے گزارا گیا۔

○

یہ بہت ہی پرانا قلعہ تھا اور یہ کوئی بڑا قلعہ نہ تھا۔ ایک جگہ سے دیوار کے پتھر گر پڑے تھے اور دیوار کی بلندی آدھی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ آدمی گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑا ہو کر قلعے کے اندر دیکھ سکتا تھا۔ دروازوں کی لکڑی کو دیمک نے چاٹ لیا تھا۔ ان کے لوہے کے فریم سلامت تھے۔ ان فریموں نے ادھ کھائی لکڑی کو تھام رکھا تھا۔

قلعے کے اندر بہت ہی وسیع کھلی زمین تھی۔ اس پر مکانوں کا ملبہ بکھرا ہوا تھا۔ یہ ان لوگوں کے کچے پکے مکان تھے جو کبھی یہاں آباد تھے۔ اس ملبے کے ارد گرد قلعے کے کمرے تھے۔ زیادہ تر کمروں کی چھتیں بیٹھ گئی تھیں۔ کئی ایک کمرے ابھی سلامت تھے۔ ان کی چھتوں میں چمگادڑوں نے بسیرا کر رکھا تھا۔

بڑے دروازے کے پیچھے ڈیوڑھی تھی۔ اس کے پہلو میں بڑے کمرے تھے۔ دیواروں کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ فرش اور دیواروں پر کائی اُگ کر خشک ہو گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ کون تھے جنہوں نے یہ قلعہ بنایا تھا۔ اس سوال کا جواب بھی نہیں ملتا تھا کہ اس دشوار گزار علاقے میں آ کر یہ قلعہ کیوں تعمیر کیا گیا تھا۔ علاقہ سرسبز اور خوبصورت تھا۔ شاید صدیوں پہلے یہ علاقہ آباد ہو گا۔ اب تو یہ چمگادڑوں اور بدروحوں کا مسکن تھا۔ کوئی

زندہ انسان تو اس میں جھانکنے کی بھی جرأت نہیں کرتا تھا نہ جھانکنے کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔

یہ قلعہ گزرگاہوں سے بہت دُور تھا۔ شاید ڈاکو اور رہزن کبھی یہاں چھپنے کے لئے آتے ہوں گے ..... لیکن کچھ دنوں سے یہ قلعہ پھر سے آباد ہو گیا تھا۔ آباد ہونے والوں کی تعداد کم و بیش تین سو تھی۔ ان میں سات آٹھ عورتیں بھی تھیں۔ آدمی جو تھے' ان میں کئی ایک زخمی تھے۔ شدید زخمی بھی تھے۔ ان کے گھوڑے بھی تھے اور اونٹ بھی۔ وہ عارضی طور پر یہاں آئے تھے۔ یہاں سے انہوں نے اپنی منزل کو روانہ ہونا تھا لیکن ابھی انہوں نے منزل کے راستے کا تعین نہیں کیا تھا۔

سلجوقی سالار قزل ساروق کی یہی منزل تھی اور یہی اُس کا ہدف تھا۔ اُس کا شکار اسی قلعے میں موجود تھا۔ وہ حسن بن صباح تھا۔

حسن بن صباح تبریز خالی کر آیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ پانچ سو سلجوقی سواروں اور ان کے سالار کو مار کر اس کا راستہ صاف نہیں ہو گیا بلکہ راستے کی دشواریاں اب پیدا ہوئی ہیں۔ سلجوقیوں کے ساتھ اُس کا یہ پہلا تصادم تھا۔ اس نے سلجوقیوں کو اپنا خونی دشمن بنا لیا تھا۔ پہلے تو ان کے ساتھ اس کا نظریاتی اختلاف تھا۔ حسن بن صباح باطل عقیدے کا بانی اور علمبردار تھا۔ سلجوقی صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ وہ ایک اسلامی سلطنت میں حسن بن صباح کا وجود برداشت نہیں کر سکتے تھے مطلب نظریاتی اختلاف مرنے مارنے والی عداوت کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

تبریز کے خونریز تصادم کے بعد حسن بن صباح خلجان' شاہ در اور اپنے پیرو مرشد احمد بن عطاش کی تحویل میں کسی بھی قلعے میں جا سکتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ سلطان ملک شاہ اور خصوصاً" ابو مسلم رازی جوابی کارروائی کریں گے اور فوراً" کریں گے اور اُسے زمین کی ساتویں تہہ میں سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔

یہ سوچ کر تبریز میں اس کے جتنے پیروکار' فدائین اور وہاں تھوڑے سے جو لوگ آباد تھے' ان سب کو ساتھ لے کر اس قدیم قلعے میں آ گیا تھا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ اُسے کس نے مشورہ دیا تھا یا اُسے کس نے اس قلعے کی نشاندہی کر کے کہا تھا کہ وہاں جا کر روپوش ہو جائے۔

تاریخوں میں آیا ہے کہ اُس نے احمد بن عطاش کو اطلاع دے دی تھی کہ تبریز میں

کیسی خون ریزی ہوئی ہے اور اب وہ ایک ایسے قلعے کے کھنڈروں میں روپوش ہے جہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

○

سورج غروب ہونے میں ابھی بہت وقت رہتا تھا۔ حسن بن صباح ایک کمرے میں فرش پر بیٹھا تھا۔ یہ کمرہ اُس کے لئے خاص طور پر صاف کیا گیا تھا۔ اُس کے ساتھ جو لوگ آئے تھے' انہوں نے فرش پر کمبل' کھیس اور ان پر صاف ستھری چادریں بچھا دی تھیں۔ تکیے بھی رکھ دیئے۔ وہ ان لوگوں کا سردار یا سالار نہیں بلکہ ان کا روحانی پیشوا تھا۔ بعض نے اُسے "پیغمبری" کا درجہ دے دیا تھا۔ تبریز والوں نے دیکھا تھا کہ وہ بھاگنے کا راستہ دیکھ رہے تھے تو حسن بن صباح نے اللہ کو پکارا تھا۔ پھر اُس نے اعلان کیا تھا کہ مدد آ گئی ہے۔ اللہ کی مدد آ رہی ہے' پھر تین سو سوار آ گئے تھے جنہوں نے سلجوقی سواروں کو بے خبری میں آ لیا اور انہیں ان کے سالار سمیت کاٹ کر پھینک ڈالا تھا۔

"..... اور تم جانتے ہو" — حسن بن صباح کمرے میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے چھ ایک آدمیوں سے کہہ رہا تھا — "کہ ہر پیغمبر کو بھاگنا پڑا' روپوش ہونا پڑا' مصائب برداشت کرنے پڑے اور انہیں کہیں پناہ لینی پڑی۔ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھا لیا گیا' حضرت موسیٰؑ کو فرعون نے قتل کرنے کی کوشش کی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکے سے نکل کر مدینہ میں پناہ لینی پڑی۔ اگر میں آج ان کھنڈروں میں آن بیٹھا ہوں تو یہ نہ سمجھنا کہ مجھے اللہ نے فراموش کر دیا ہے۔ یہ اللہ کا اشارہ تھا کہ میں یہاں آ گیا ہوں۔ پیغمبروں کے ساتھیوں کو اللہ نے عام لوگوں سے زیادہ اونچا رتبہ دیا ہے۔ تم سب اللہ کی نگاہ میں اونچے رتبے کے افراد ہو۔ تم پر جب بھی مشکل وقت آئے گا' اللہ تمہاری مدد کو پہنچے گا....."

وہ یہیں تک کہہ پایا تھا کہ باہر سے ایک آدمی کی بڑی بلند آواز سنائی دی — "حملہ آ رہا ہے..... ہوشیار ہو جاؤ"۔

حسن بن صباح چپ ہو گیا اور اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

"سلجوقیوں کا لشکر آ رہا ہے"۔

"بہت بڑا لشکر ہے"۔

"کسی کو اطلاع دے دو"۔

ان آوازوں کے ساتھ جب دوڑتے قدموں کی آہٹیں سنائی دینے لگیں تو حسن بن صباح اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اُس نے اپنے آدمیوں میں بڑی ہڑبونگ بپا دیکھی۔ کچھ آدمی قلعے کی ٹوٹی ہوئی خستہ حال سیڑھیوں سے اوپر جا رہے تھے اور کچھ دوسری طرف کی سیڑھیوں سے دوڑتے اُتر رہے تھے۔ انہوں نے گھبراہٹ کے عالم میں شور و غل بپا کر رکھا تھا۔

"زخمیوں کا کیا بنے گا"

"ہم اتنے بڑے لشکر سے نہیں لڑ سکتے"۔

"رُک جاؤ" — حسن بن صباح نے اپنی مخصوص گرجدار آواز میں کہا — "جو جہاں ہے وہیں رہے"۔

حسن بن صباح بڑے تحمل اور اطمینان سے سیڑھیاں چڑھ گیا اور اُس طرف دیکھا جس طرف اس کے آدمی دیکھ رہے تھے۔ کم و بیش ڈیڑھ میل دور ایک ہزار سوار طوفانی سمندر کی لہر کی طرح چلے آ رہے تھے۔ ایک ہزار سوار بہت بڑی طاقت تھی۔ قلعہ تو محض ایک کھنڈر تھا جس کے دروازے دیمک نے کھا لئے تھے۔ حسن بن صباح کے ساتھ تین سو سے کچھ ہی زائد آدمی تھے جن میں آدھے تبریز کی لڑائی کے زخمی تھے۔ ابو علی نے قزوین سے تین سو آدمی بھیجے تھے ان میں سے زیادہ تر واپس چلے گئے تھے۔ زخمیوں میں چند ایک ہی تھے جو لڑنے کے قابل تھے۔ ان سب کا یہ واویلا بجا تھا کہ وہ اتنے بڑے لشکر سے نہیں لڑ سکیں گے لیکن وہ اپنے پیر و مرشد یا امام حسن بن صباح کے چہرے پر سکون اور اطمینان دیکھ رہے تھے۔

سالار قزل ساروق کے ایک ہزار سوار قریب آتے گئے۔ اُن کی رفتار اتنی سست تھی جیسے وہ آرام آرام سے سفر پر جا رہے ہوں۔

"کیا خیال ہے" — حسن بن صباح نے ایک آدمی سے پوچھا جو اُس کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔

"اور قریب آنے دیں" — ساتھ والے آدمی نے کہا — "ان کی رفتار بتاتی ہے کہ وار خالی نہیں گیا"۔

"یہ تو میں دیکھ رہا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "یہاں سے انہیں گھوڑے دوڑا دینے چاہئیں تھے۔ میں کچھ اثر دیکھ رہا ہوں"۔

قلعے کی دیوار پر اور نیچے حسن بن صباح کے آدمیوں نے بے پناہ غل غپاڑہ بپا کر رکھا تھا

کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

"ہر آدمی اپنا ہتھیار لے کر لڑنے کے لئے تیار ہو جائے" — حسن بن صباح نے دیوار سے اندر کی طرف منہ کر کے اپنے آدمیوں کو حکم دیا — "تیر انداز اوپر آ جائیں"۔

چونکہ یہ حسن بن صباح کا حکم تھا اور سب اسے نبی بھی مانتے تھے، امام بھی اور بعض نے تو اسے پیغمبر بھی بنا دیا تھا۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی لیکن بددلی اور بزدلی اُن کے چہروں پر صاف نظر آ رہی تھی۔ زخمیوں نے الگ ہنگامہ بپا رکھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ تو معذوری اور بے بسی کی حالت میں ہی مارے جائیں گے۔

"دوسری طرف سے نکل بھاگو" — قلعے سے ایک آواز اٹھی۔

"ہمیں ساتھ لے چلو بھائیو" — یہ زخمیوں کی آہ و بکا تھی۔

حسن بن صباح نے دیوار پر کھڑے تیر اندازوں کو دیکھا۔ پھر اندر کی طرف اپنے آدمیوں کو دیکھا اور ان کی باتیں سنیں۔ باہر دیکھا تو ایک ہزار سواروں کا لشکر قلعے کے قریب آ گیا تھا اور گھوڑے قلعے کے دائیں بائیں پھیلتے جا رہے تھے۔ سالار قزل ساروق اور اس کے سواروں کے چہروں پر وہ غیض و غضب نہیں تھا جو حملہ آوروں کے چہروں پر ہوا کرتا ہے۔ قزل ساروق کو تو آگ بگولہ ہونا چاہئے تھا کیونکہ ان باطنیوں نے اُس کے ساتھی سالار امیر ارسلان کو قتل کیا تھا اور انہوں نے پانچ سو سلجوقی سوار مار ڈالے تھے لیکن قزل ساروق کے چہرے پر اطمینان سا تھا۔

○

حسن بن صباح نے اپنے آدمیوں کا جائزہ لے لیا تھا۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ ان میں لڑنے کا دم نہیں اور نہ ہی ان میں جذبہ ہے۔ اس حقیقت سے تو وہ آگاہ تھا کہ اتنے تھوڑے سے آدمی ایک ہزار سواروں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ وہ اچانک دیوار سے ہٹ کر پیچھے کو مڑا اور وہیں سے اندر کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

"اللہ ..... مجھے زمین پر اتارنے والے اللہ" — حسن بن صباح نے دونوں ہاتھ اور منہ آسمان کی طرف کر کے بڑی ہی بلند آواز میں کہا — "تیرا ایلچی جسے تو نے امامت بخشی ہے بہت بڑی مشکل میں آ گیا ہے۔ اپنی راہ میں لڑ کر زخمی ہونے والے بندوں پر رحم فرما..... فرشتے اتار دے۔ میری امامت اور اپنی خدائی کی لاج رکھ لے"۔

حسن بن صباح پلٹ کر دیوار کی بیرونی طرف چلا گیا۔ سالار قزل ساروق اُس کے

سامنے تھا۔ اس سلجوقی سالار نے اپنے سواروں کو کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ وہ حسن بن صباح کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہو؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ہم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟" — قزل ساروق نے اپنے ایک ماتحت سے پوچھا جو اُس کے پاس موجود تھا۔

ماتحت نے اُس کے منہ کی طرف دیکھا اور پھر منہ اُوپر کر کے دیوار پر کھڑے حسن بن صباح کو دیکھنے لگا۔

حسن بن صباح ایک بار پھر پیچھے کو مُڑا۔ اُس نے بازو اُوپر کئے اور بڑی ہی گرجدار آواز میں اعلان کیا — "فرشتے اُتر آئے ہیں۔ حوصلوں کو مضبوط رکھو۔ دشمن بھاگ رہا ہے"۔

وہ پھر دیوار کے باہر کی طرف مُڑا' دو تیر اندازوں کو بلایا' انہیں کچھ کہا' انہوں نے ایک ایک تیر چلایا۔ ایک تیر ایک سوار کے سینے میں اور دوسرا ایک اور سوار کی شہ رگ میں اتر گیا۔ دونوں سوار گھوڑوں سے گر پڑے۔

"تم نے میرے سواروں کو کیوں مروایا ہے؟" — سالار قزل ساروق نے حسن بن صباح سے پوچھا۔

"اپنے سواروں کو یہاں سے لے جاؤ" — حسن بن صباح نے کہا — "ورنہ تمہارا ہر سوار اسی طرح مارا جائے گا پھر تمہیں گھوڑے کے پیچھے باندھ کر گھوڑے کو بھگا دیا جائے گا"۔

سالار قزل ساروق نے کچھ بھی نہ کہا۔ اُس نے اپنا گھوڑا پیچھے کو موڑا اور چل دیا۔ تمام سوار اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

"امام نے دشمن کو بھگا دیا ہے" — قلعے کی دیوار سے بڑی ہی بلند آواز اٹھی — "اوپر آکر دیکھو"۔

"اپنے پیر و مرشد کا معجزہ دیکھو" — ایک اور آواز اٹھی۔

"پیر و مرشد نہیں" — کسی نے گلا پھاڑ کر کہا — "نبی کہو..... خدا کا بھیجا ہوا امام کہو"۔

نیچے والے تمام آدمی جن میں چند ایک عورتیں بھی تھیں' دوڑتے ہوئے اوپر گئے

اور حیرت زدگی کے عالم میں جاتے ہوئے سواروں کو دیکھنے لگے۔ سلجوقی سوار جاتے جاتے جنگل کی ہریالی میں تحلیل ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی سورج مغرب والی بلند و بالا پہاڑیوں کے پیچھے چلا گیا۔

○

حسن بن صباح دیوار پر ہی کھڑا رہا اور اس کی نظریں اُدھر ہی لگی رہیں جدھر سالار قزل ساروق اور اس کے سوار نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

"امام کو سجدہ کرو" — کسی کی آواز اٹھی۔

سب لوگ جیسے اسی آواز کے منتظر تھے۔ جو دیوار پر تھے وہ دوڑتے آئے اور حسن بن صباح کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ نیچے والے آدمی جہاں تھے وہیں سے انہوں نے منہ حسن بن صباح کی طرف کر لئے اور سجدے میں چلے گئے۔

حسن بن صباح کا سینہ تن گیا۔ شروع سے اس کے ساتھ جو اُدھیڑ عمر آدمی موجود رہا تھا جسے اس نے کہا تھا کہ میں کچھ اثر دیکھ رہا ہوں' وہ بھی سجدے میں تھا۔ حسن بن صباح نے اُسے آہستہ سے پاؤں کی ٹھوکر ماری۔ اُس آدمی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ حسن بن صباح نے اُسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ آدمی اٹھا تو حسن بن صباح نے اُس کے کان میں کوئی بات کہی۔

"کیا ہم اپنے فرشتوں کو واپس بلا لیں؟" — اُس آدمی نے اپنی آواز کو بھاری کر کے جلالی لہجے میں کہا — "بولو میرے امام؟"

"اے خداوندِ دو عالم!" — حسن بن صباح نے کہا — "میں اپنے ان بندوں کی طرف سے تیری ذاتِ باری کا شکر ادا کرتا ہوں۔ تیرے فرشتوں نے ہمارے دشمن کو بھگا دیا ہے"۔

سب لوگ ابھی تک سجدے میں تھے۔ وہ حسن بن صباح کے ساتھی کی آواز کو خدا کی آواز سمجھے تھے۔

"اٹھو" — حسن بن صباح نے کہا — "تم نے اللہ کی آواز سن لی ہے"۔

سب سجدے سے اُٹھے۔ اب اُن کے چہروں پر کچھ اور ہی تاثر تھا۔ بعض کے منہ حیرت سے یا جوشِ عقیدت سے کھل گئے تھے اور وہ حسن بن صباح کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ بھی اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ تھا اور وہ ابھی غائب ہو جائے گا اور آسمان پر جا پہنچے گا۔

عورتیں جو نیچے تھیں' دوڑتی اوپر آئیں۔ ہر ایک نے باری باری آگے بڑھ کر حسن بن صباح کا دایاں ہاتھ پکڑا' آنکھوں سے لگایا اور چوما۔

شام کا دھندلکا گہرا ہو رہا تھا۔ قلعے کے اندر مشعلیں جل اٹھی تھیں۔ حسن بن صباح آہستہ آہستہ چلتا سیڑھیوں سے اُترا۔ اُس کی چال میں اور اُس کے چہرے پر جلالی تاثر تھا۔ اُس کے ہر آدمی کی یہ کوشش تھی کہ وہ اس کے قریب ہو کر اُسے ہاتھ لگائے اور دیکھے کہ یہ شخص انسان ہے یا اللہ کی پسندیدہ کوئی آسمانی مخلوق ہے۔ تبریز میں بھی اس نے اللہ سے مدد مانگی تھی تو "اللہ" نے ایسی مدد بھیجی تھی کہ سلجوقیوں کے تمام سوار مارے گئے تھے۔

○

شام کھانے کے بعد قلعے میں جشن کا سماں بندھ گیا۔ عورتوں نے گیت گائے' آدمی پاگلوں کی طرح ناچے۔ انہوں نے ایک اونٹ ذبح کر لیا تھا اور تھوڑے سے وقت میں پکا بھی لیا تھا۔ وہاں کوئی چیز نہیں تھی تو شراب نہیں تھی۔ شراب حسن بن صباح نے اپنے لئے رکھی ہوئی تھی۔ اُس کے پیروکار اور مرید اس شراب کو اللہ کے حضور پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

فتح کا یہ جشن بہت دیر بعد ختم ہوا۔ سب سے زیادہ خوش تو وہ زخمی تھے جو لڑنا تو دور کی بات ہے' چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھے۔ وہ بال بال بچ گئے تھے۔

وقت آدھی رات کا تھا۔ حسن بن صباح اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ فانوس جل رہا تھا۔ شراب کی صراحی اور پیالے سامنے رکھے تھے۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے پاس ایک اُدھیڑ عمر آدمی بیٹھا تھا اور ایک جواں سال عورت بھی تھی۔ وہ ایک حسین عورت تھی جس کی آنکھیں مسکراتی تھیں۔ اس کے ہونٹوں کے تبسم میں ایسا تاثر تھا کہ دیکھنے والا اُس سے نظریں ہٹا نہیں سکتا تھا۔

یہ ادھیڑ عمر آدمی وہی تھا جو قزل ساروق کو صبح سویرے وادی میں ملا تھا اور اُس نے اپنا تعارف کرایا تھا کہ وہ اپنی بیوی اور ان دو بیٹوں کے ساتھ حج کر کے آیا ہے۔ اُس کے ساتھ جو بیوی تھی وہ یہی عورت تھی جو حسن بن صباح کے پاس بیٹھی شراب پی رہی تھی۔ یہ اُس شخص کی بیوی نہیں تھی۔ یہ حسن بن صباح کے خصوصی اور خاص گروہ کی عورت تھی اور اس کے ساتھ صبح وادی میں جو دو لڑکے تھے وہ ان کے کچھ نہیں لگتے

تبریز سے آئے ہوئے ایک آدمی کے بیٹے تھے۔

"یہ صرف تمہارا کمال ہے اسماعیل!" — حسن بن صباح نے اس ادھیڑ عمر آدمی سے کہا — "مجھے توقع نہیں تھی کہ تم اتنی جلدی یہ کام کر سکو گے۔ نہ کر سکتے تو میں تمہیں بے قصور اور مجبور سمجھتا"۔

"وہاں نہ سہی" — عورت نے کہا — "یہ سلجوقی وہاں نہ ملتے تو کہیں اور مل جاتے۔ خوش نصیبی یہ ہوئی کہ یہ ہمیں جلدی مل گئے"۔

"میں نے انہیں غلط راستے پر ڈال دیا تھا" — اسماعیل نے کہا — "وہ ٹھیک راستے پر آ رہے تھے۔ اس راستے سے وہ جلدی یہاں تک پہنچ جاتے۔ میں نے یہ سوچ کر انہیں غلط راستے پر ڈال دیا تھا کہ کھجوروں اور پانی کو اپنا اثر پورا کرنے کا وقت مل جائے۔ آپ نے بتایا تھا کہ ان میں جو چیز ملائی گئی ہے' اس کا اثر دیر سے شروع ہوتا ہے"۔

"میں تمہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے ایک خوشی یہ بھی ہے کہ اس دوائی کا یہ پہلا تجربہ کیا گیا ہے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ اس حد تک کامیاب ہو گا کہ ایک ہزار کے لشکر کو ذہنی طور پر مفلوج کر دے گا' اور مفلوج بھی اس طرح کرے گا کہ متاثرہ آدمی ہر کام ٹھیک ٹھاک کرے گا لیکن جذباتی لحاظ سے اتنا سرد ہو جائے گا کہ کسی کو لڑنے جھگڑنے کے لئے نہیں للکارے گا اور اگر اُسے کوئی للکارے گا تو وہ بزدلوں کی طرح منہ موڑ جائے گا"۔

"تو کیا یہ لشکر صحیح و سلامت اپنی منزل پر پہنچ جائے گا؟" — اسماعیل نے پوچھا۔

"کیا وہ یہاں تک صحیح و سلامت نہیں پہنچ گئے تھے!" — حسن بن صباح نے کہا — "وہ جو تمہارے بتائے ہوئے اتنے دشوار راستے سے یہاں تک پہنچ گئے تھے' واپس بھی چلے جائیں گے"۔

"یہ اثر کب تک رہے گا؟" — اسماعیل نے پوچھا

"شاید دو دن تک" — حسن بن صباح نے جواب دیا۔

"ایک اور بات امام!" — اس جواں سال عورت نے پوچھا جو اس کام میں شامل تھی — "ایسا کیوں نہ کیا گیا کہ اسی دوائی کی زیادہ مقدار کھجوروں اور پانی میں ملا دی جاتی تاکہ یہ لشکر جہاں تھا وہیں سے واپس چلا جاتا؟"۔

"اس میں ایک راز ہے" — حسن بن صباح نے ہنستے ہوئے کہا — "اس لشکر کو

دینے سے واپس بھیجا جا سکتا تھا اور جس عقیدت سے انہوں نے تمہاری دی ہوئی کھجوریں اور ندی کے پانی کو آب زم زم سمجھ کے منہ میں ڈال لیا تھا" انہیں انہی کھجوروں اور پانی میں ایسا زہر بھی دیا جا سکتا تھا جس کا نہ کوئی ذائقہ ہوتا ہے نہ بو لیکن انہیں ملکے تک زندہ آنے اور زندہ واپس جانے دیا گیا..... ولی اور پیغمبر ہر کوئی نہیں بن سکتا' بنتا وہ ہے جس کی سوچ آسمانوں تک چلی جاتی ہے۔ میں نے ان لوگوں کو یہ معجزہ دکھانا تھا جو ہمارے ساتھ ہیں۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ میرے کہنے پر آسمان سے مدد آئی جو نظر نہیں آتی تھی پھر ان آدمیوں نے دیکھا کہ اتنا طاقتور گھوڑ سوار لشکر میری ہلکی سی للکار پر واپس چلا گیا۔ اب یہ لوگ جہاں جائیں گے میرا یہ معجزہ سنائیں گے۔ انسانی فطرت میں زیب داستان بھی موجود ہے اس لئے یہ لوگ میرا معجزہ بیان کرتے زیب داستان کے لئے مبالغہ آرائی بھی کریں گے۔ یہ تین سو انسان تین ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ تعداد کو میرے پاس کھینچ لائیں گے"۔

"بلکہ یہ تعداد بڑھتی ہوئی آئے گی" ——— اسماعیل نے کہا ——— "مسلمان کی عقیدت مندی کی بھی کوئی حد نہیں۔ ایسے کسی کی ذرا سی مٹی پڑیا میں باندھ کر دے دو اور کہو کہ یہ مکے اور مدینے کی سوغات ہے تو وہ بلا سوچے سمجھے یہ مٹی کھا لے گا۔ ایسے ہی اس سلجوقی سالار اور اس کے ساتھیوں نے میری دی ہوئی کھجوریں حجاز کی کھجوریں سمجھ کر بڑے احترام سے کھا لیں اور جب میں نے ندی میں سے بھری ہوئی صراحی دکھا کر کہا کہ یہ زم زم کا پانی ہے تو سالار نے فوراً "ایسا انتظام کر لیا کر سارے لشکر کو پانی پلا دیا"۔

"تم بڑے کام کی چیز ہو خدیجہ!" ——— حسن بن صباح نے اس جوان سال اور دلنشیں عورت کو بازو سے پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے کہا ——— "ابھی تو میں نے تم سے بہت کام لینا ہے" ——— حسن بن صباح نے خدیجہ کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے لیا اور اسماعیل کی طرف دیکھا۔

اسماعیل اشارہ سمجھ گیا اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

○

بیشتر مؤرخوں نے تبریز کی لڑائی کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ سالار امیر ارسلان اور اس کے سوار مارے گئے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک باطنی سردار علی نے قزوین سے تین سو باطنی سواروں کی کمک بھیجی تھی۔ پھر انہوں نے یہ بھی لکھا

ہے کہ سلطان ملک شاہ نے غصے کے عالم میں سالار قزل ساروق کو ایک ہزار سوار دے کر بھیجا تھا اور اس کے ساتھ حکم یہ دیا تھا کہ واپس آؤ تو حسن بن صباح تمہارے ساتھ ہو' زندہ یا مردہ۔

یہ سب باتیں تو ان مؤرخوں نے لکھی ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کوئی گمنام سا قلعہ تھا' یہاں سے بھی حسن بن صباح کے پیروکار بھاگ نکلنے پر اُتر آئے تھے اور حسن بن صباح نے تبریز والا مظاہرہ کیا تھا کہ وحی نازل ہو گئی ہے اور خدائی مدد آ رہی ہے۔ یہ سن کر سب کے حوصلے قائم ہو گئے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ ان مؤرخوں میں سے کسی نے بھی نہیں لکھا کہ اس لڑائی کا انجام کیا ہوا۔ یہاں آ کر ان کی لکھی ہوئی تاریخ ایسے اندھیرے میں چلی جاتی ہے جہاں کچھ نظر نہیں آتا۔ البتہ یہ بتایا گیا ہے کہ حسن بن صباح قلعہ الموت میں پہنچ گیا۔

داستان گو نے قزل ساروق اور اس کے سواروں کو ذہنی طور پر مفلوج کرنے کا جو واقعہ سنایا ہے یہ تین غیر معروف سے مؤرخوں نے کچھ ایسے حوالوں اور دلائل سے لکھا ہے کہ یہ قابل قبول اور مستند سمجھا جاتا ہے۔ ان میں اٹلی کا ایک تاریخ نویس ہانسوکی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کی تحریریں اطالوی زبان میں ملتی ہیں جن کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا گیا ہے۔

بظاہر یہ واقعہ افسانوی سا لگتا ہے لیکن حسن بن صباح کو خدا نے ایسا دماغ دیا تھا جسے اگر خارق الفطرت یا بالائے سطح انسانی کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اُس کی تاریخ کا مطالعہ گہرائی میں جا کر کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اُس نے اپنے ابلیسی فرقے کی بنیاد انسان کی فطری کمزوریوں پر رکھی تھی۔ ان میں ایک تو عورت اور دوسری تھی نشہ۔ یہ دونوں چیزیں جب انسان کے دماغ پر غالب آ جاتی ہیں تو پھر وہ انسان اگر ضرورت پڑے تو اپنے بچوں تک کو قتل کر دیتا ہے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حسن بن صباح کی کامیابی کا راز حشیش اور حسین عورت تھی۔

حسن بن صباح جہاں بھی جاتا تھا' اُس کا جاسوسی کا نظام اُس کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ تبریز سے نکلا تو اُس نے اپنے دو تین آدمی اس علاقے میں چھوڑ دیئے تھے۔ سالار قزل ساروق تبریز پہنچا تو اتنی دور بیٹھے ہوئے حسن بن صباح کو اطلاع مل گئی۔ اگر نیم پاگل سا شخص قزل ساروق کے جاسوس کو نہ بتاتا کہ حسن بن صباح کا قافلہ فلاں طرف گیا ہے تو

وہاں تک کوئی بھی نہ پہنچ سکا لیکن انہی دو تین مکانوں میں سے ایک آدمی نے حسن بن صباح تک اطلاع پہنچا دی کہ اس کی نشاندہی ہو گئی ہے اور ایک ہزار سواروں کا لشکر آ رہا ہے۔

حسن بن صباح کو اطلاع ملی تو اُس نے وہاں سے کہیں اور بھاگ جانے کی بجائے یہ طریقہ سوچ لیا جو بیان کیا گیا ہے۔ اُس نے اپنا خفیہ گروہ ساتھ رکھا ہوا تھا جس میں اسماعیل بھی تھا اور خدیجہ بھی۔ فوراً یہ طریقہ سوچ لیا گیا پھر جس طرح اسماعیل اور خدیجہ میاں بیوی کے روپ میں دو لڑکوں اور ایک ٹٹو کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ یہ حسن بن صباح کے دماغ کا بے مثال کمال تھا۔ اسماعیل اور خدیجہ رات بھر ان سواروں کے انتظار میں ایک جگہ بیٹھے رہے تھے۔ صبح انہیں یہ لشکر مل گیا۔

○

سالار قزل ساروق اپنے سواروں کے آگے آگے گھوڑے پر سوار چلا گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے ذہن سے یہ اتر ہی گیا ہو کہ وہ کس مقصد کے لئے ادھر آیا تھا۔ اُس کا انداز ایسا تھا جیسے لوگ سیر سپاٹے کے لئے آئے ہوں۔ ان کے دماغ صحیح کام کر رہے تھے۔ وہ راستہ بھولے نہیں تھے۔ ان کے دماغ اس وقت بھی حاضر تھے جب وہ بڑی خطرناک حد تک تنگ پہاڑی راستوں پر جا رہے تھے، البتہ انہیں یہ احساس نہیں تھا کہ کہیں رات بھر کے لئے پڑاؤ بھی کرنا ہے۔

انہوں نے دن کے وقت پڑاؤ کیا۔ کھانا تیار کیا، کھایا بھی اور سو گئے۔ چونکہ ان کا احساس زندہ نہیں تھا یا احساس سویا ہوا تھا، وہ ایسے سوئے کہ اگلی صبح جاگے اور چل پڑے۔

تاریخوں میں یہ کھوج نہیں ملتا کہ وہ کتنے پڑاؤ کر کے مرو پہنچے، یہ سراغ ملتا ہے کہ وہ مرو سے ابھی کچھ دور ہی تھے تو سالار قزل ساروق نے اپنے سر کو زور سے ہلایا اور لشکر کو روک لیا۔ اُس نے اپنے ماتحتوں کو بلایا۔ وہی ماتحت جو خوش و خرم چلے آ رہے تھے، اب کسی اور ہی ذہنی کیفیت میں تھے۔ ان کے چہروں پر حیرت اور تذبذب کے تاثرات تھے۔

"تم کیا محسوس کر رہے ہو؟" — سالار قزل ساروق نے ان سے پوچھا اور اپنی کیفیت یوں بیان کی — "لگتا ہے ہم خواب میں کہیں گھومتے پھرتے رہے ہیں اور شاید حسن بن صباح کو دیکھا تھا"۔

"ہمیں بھی یہی محسوس ہو رہا ہے" — ایک ادھیڑ عمر ماتحت نے کہا — "کچھ کچھ یاد آ رہا ہے کہ ہم وہاں تک پہنچے تھے"۔

"مجھے یاد ہے کہ ایک حاجی، اس کی بیوی اور دو بیٹے ملے تھے" — ایک اور ماتحت کماندار نے کہا — "پھر مجھے ندی تک سنیار ہے"۔

سالار قزل ساروق یوں چونک کر سیدھا ہو گیا جیسے اسے سب کچھ یاد آگیا ہو۔

"ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے" — اُس نے کہا — "ہم سلطان کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے لیکن میرے رفیقو! سلطان کے آگے جھوٹ نہیں بولنا۔ جو ہوا ہے وہ من و عن بیان کرنا ہے۔ اگر سلطان کو رحم آگیا تو وہ ہمیں معاف کر دے گا ورنہ وہ جو بھی سزا دے گا وہ ہم دل و جان سے قبول کریں گے"۔

"پھر یوں کرو دوستو!" — ایک ماتحت کماندار نے کہا — "اگر سلطان نے ہمیں سبکدوش کر دیا تو آؤ حلفیہ عہد کریں کہ ہم اپنے طور پر سب مل کر حسن بن صباح کو زندہ یا مردہ سلطان کے سامنے پیش کریں گے اور اس کے گروہ کے ایک بھی آدمی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔

"اگر سلطان نے ہمیں قید میں ڈال دیا" — ایک اور کماندار نے کہا — "تو ہم اسے کہیں گے کہ ہمیں اپنی اس غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لئے آزاد کرے"۔

"یہ بھی سوچ لو دوستو!" — سالار قزل ساروق نے کہا — "حسن بن صباح کی جگہ کوئی اور دشمن ہوتا تو سلطان ہماری اس غلطی کو جو ہم سے دھوکے میں ہوئی، معاف کر دیتا لیکن یہاں معاملہ حسن بن صباح اور اسلام کے تحفظ کا ہے، سلطان مجھے اور تم سب کمانداروں کو سزائے موت بھی دے سکتا ہے اور مجھے توقع سزائے موت کی ہی ہے لیکن ہماری وفاداری یہ ہے کہ ہم اُس کے سامنے جائیں گے اور مرنے کے لئے تیار ہو کر جائیں گے"۔

www.paksociety.com

سلطان ملک شاہ کو سالار قزل سارق پر اتنا زیادہ اعتماد تھا کہ اُس نے ایک بار بھی ایسے شک کا اظہار نہیں کیا تھا کہ اُس کا یہ سالار ناکام لوٹے گا۔ اُس کا دانشمند وزیر خواجہ حسن طوسی نظام الملک دو تین بار کہہ چکا تھا کہ قزل سارق کا کوئی پیغام نہیں آیا۔ کم از کم ایک پیغام تو آنا چاہیے تھا۔

"لومڑی کا شکار آسان نہیں ہوتا خواجہ!" ــــ سلطان ملک شاہ نے کہا تھا ــــ "کیا آپ نہیں جانتے کہ حسن بن صباح جنگجو دشمن نہیں؟ وہ لومڑی ہے۔ وہ دکھاتا تلوار ہے اور مارتا برچھی ہے۔ ہمارا سالار امیر ارسلان اس کے دھوکے میں مارا گیا ہے۔ وہ ان باطنیوں سے دُو بدُو لڑائی لڑا ہے۔ لیکن اُس پر وار پیٹھ پیچھے سے ہُوا تھا۔ قزل سارق دھوکے میں نہیں آئے گا۔ وہ وثوق سے کہہ گیا تھا کہ وہ واپس آئے گا تو حسن بن صباح زندہ یا مُردہ اُس کے ساتھ ہوگا' نہ ہُوا تو وہ خود بھی واپس نہیں آئے گا"۔

نظام الملک خاموش رہا تھا جیسے سلطان ملک شاہ کی اس بات کو وہ خوش فہمی سمجھا ہو اور اسے قزل سارق کی کامیابی مشکوک نظر آرہی ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ خواجہ حسن طوسی دانشمند اور دُور اندیش تھا۔ اُس کی نگاہیں اس حد سے آگے نکل جایا کرتی تھی جس حد تک ملک شاہ کی نگاہیں دیکھ سکتی تھیں۔ ملک شاہ اُس کی دُور اندیشی کا قائل تھا۔ یہ الفاظ سلطان ملک شاہ کے ہی ہیں کہ خواجہ حسن طوسی روح کی آنکھ سے دیکھتا اور روحانی طاقت سے مشکلات پر قابو پالیتا ہے۔

پھر ایک روز جب سورج ڈھل رہا تھا' سلطان ملک شاہ کے محل کے قریب ایک بڑی ہی بلند آواز اُٹھی ــــ "لشکر واپس آرہا ہے"۔

پھر دوڑتے قدموں کے ساتھ آوازوں کا طوفان آگیا۔

"سالار قزل سارق آرہا ہے"۔

"لشکر پورا معلوم ہوتا ہے"۔

"فاتح آرہے ہیں"۔

"سلطان عالی مقام!" ــــ دربان نے سلطان ملک شاہ کو اطلاع دی ــــ "سالار قزل سارق کا لشکر واپس آرہا ہے۔ شہر سے ابھی کچھ دور ہے"۔

"ہمارا اور نظام الملک کا گھوڑا فوراً تیار کرو" ــــ ملک شاہ نے کہا۔

نظام الملک باہر کی آوازیں سُن کر ملک شاہ کے پاس پہنچ گیا۔

"ہم قزل سارق کا استقبال شہر سے باہر کریں گے" ــــ سلطان ملک شاہ نے کہا۔

سلطان اور نظام الملک گھوڑوں پر سوار شہر سے نکل گئے۔ محافظ دستے کے چار سوار اُن کے آگے اور بارہ پیچھے جا رہے تھے۔ سالار قزل سارق اور اُس کے ایک ہزار سوار شہر سے تھوڑی ہی دُور رہ گئے تھے۔

"قزل سارق نے ہمیں دیکھ کر بھی اپنے گھوڑے کو ایڑ نہیں لگائی" ــــ ملک شاہ نے نظام الملک سے کہا ــــ "کیا یہ فتح کے نشے کا اظہار ہے؟"

"اس کا چہرہ اور اس کا انداز فتح والا نہیں لگتا" ــــ نظام الملک نے کہا ــــ "اگر یہ فتح کے نشے سے سرشار ہوتا تو ہمیں دیکھتے ہی گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہم تک پہنچ چکا ہوتا۔ یہ تو لگتا ہے بڑی مشکل سے گھوڑے پر بیٹھا ہُوا ہے"۔

"اور لشکر بھی خاموشی سے آرہا ہے" ــــ سلطان ملک شاہ نے کہا اور گھوڑے کو ہلکی سی ایڑ لگائی۔

قریب آکر قزل سارق نے اپنا گھوڑا لشکر کے آگے سے ایک طرف کر لیا اور ملک شاہ کے سامنے رُک گیا۔

○

"خوش آمدید سارق!" ــــ سلطان ملک شاہ نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ــــ "اگر تم حسن بن صباح کو زندہ یا مردہ اپنے ساتھ نہیں لا سکے تو یہ شرمساری کی معقول وجہ نہیں"۔

سلطان ملک شاہ نے دیکھا کہ اُس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور قزل سارق نے اپنا ہاتھ آگے نہیں کیا۔

"سالار قزل ساروق؟" — نظام الملک نے کہا — "سلطانِ محترم نے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے کر رکھا ہے۔ میرا خیال ہے سالار کا رتبہ اتنا اونچا نہیں کہ وہ سلطان کے ہاتھ کو یوں نظرانداز کر دے"۔

"ٹھیک فرمایا محترم وزیرِاعظم!" — قزل ساروق نے کہا — "لیکن آپ کا یہ سالار اس قابل نہیں رہا کہ سلطانِ عالی مقام کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے"۔

"کیوں؟" — سلطان ملک شاہ نے اپنا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے پوچھا — "کیا ہم غلط سمجھ رہے ہیں کہ تم فاتح لوٹے ہو؟...... سلجوق سالار شکست سے ناآشنا ہوتا ہے"۔

"سلطانِ محترم!" — سالار قزل ساروق نے کہا — "میری فتح یہی ہے کہ میں پورے دستے کو زندہ لے آیا ہوں۔ صرف دو سوار ضائع ہوئے ہیں لیکن یہ فتح حسن بن صباح کی ہے کہ ہم لڑے بغیر واپس آگئے ہیں۔ اگر وہ ہم پر حملہ کر دیتا تو ہم میں سے کوئی بھی زندہ واپس نہ آتا...... کیا سلطانِ محترم اجازت دیں گے کہ آرام سے بیٹھ کر پورا واقعہ سناؤں؟"

ایک ہزار سواروں کا لشکر جس میں سے صرف دو آدمی کم ہوئے تھے، اُن کے قریب سے گزرتا جا رہا تھا۔ سلطان ملک شاہ سواروں کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ ہر چہرہ سپاٹ تھا۔ ماتمی جلوس لگتا تھا۔

"ہمارے ساتھ آؤ" — سلطان ملک شاہ نے کہا۔

سلطان کے ہاں جاکر سالار قزل ساروق نے سلطان اور نظام الملک کو تمام واقعہ من و عن سنا دیا۔ کچھ بھی نہ چھپایا۔

"اُس قدیم قلعے کی دیوار سے دو تیر آئے" — سالار قزل ساروق نے کہا — "اور میرے دو سوار مارے گئے۔ میں بہت حیران ہوا کہ ان تیر اندازوں نے ان سواروں کو کیوں مار ڈالا ہے۔ دیوار پر ایک اور آدمی کھڑا تھا۔ وہ حسن بن صباح تھا لیکن اُس وقت وہ کوئی اور لگ رہا تھا۔ اُس نے پوچھا تم یہاں کیوں آئے ہو؟ میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ حسن بن صباح نے کہا یہاں سے چلے جاؤ......"

"اور تم واپس چلے آئے" — سلطان ملک شاہ نے کہا۔

"ہاں سلطانِ محترم!" — قزل ساروق نے کہا — "میں کچھ نہیں سمجھ سکا" — اُس کے آنسو بہہ نکلے۔

"کیا آپ کو یاد ہے وہاں اور کیا کچھ ہوا تھا؟" — نظام الملک نے پوچھا۔

"یاد ہے" — قزل ساروق نے رندھی ہوئی آواز میں کہا — "سب کچھ یاد ہے لیکن خواب کی طرح!"

"دوست ہارد ساروق!" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "ہم جانتے ہیں یہ کیا ہوا ہے۔ یہ بتاؤ کہ واپسی سفر کے دوران تم اپنے آپ میں آئے تو تم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ واپس جاکر قلعے پر حملہ کر دو؟"

"سوچا تھا سلطانِ عالی مقام!" — قزل ساروق نے جواب دیا — "اپنے ساتھی سالاروں کے ساتھ صلاح مشورہ کیا تو سب نے کہا کہ واپس جانا بیکار ہے۔ جس طرح باطنی تبریز میں سالار امیر ارسلان اور اس کے پانچ سو سواروں کو قتل کر کے آگے نکل گئے تھے، اسی طرح ان کھنڈروں سے نکل کر کہیں اور چلے گئے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے سلطانِ محترم! مجھے ایسا صدمہ ہوا کہ میں کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکا۔ میں نے جو لڑائیاں لڑی ہیں وہ آپ کو یاد ہوں گی۔ میں خود بھی نہیں گن سکتا کہ میرے جسم پر کتنے زخموں کے نشان ہیں۔ سلطنتِ سلجوقیہ کی بنیادوں میں میرا اتنا زیادہ خون رچا بسا ہوا ہے کہ آج آپ بھی اس کی بو سونگھ سکتے ہیں۔ کیا کوئی مان سکتا ہے کہ میں ڈر کر بغیر لڑے واپس آگیا ہوں؟"

"تم پر کوئی الزام نہیں ساروق!" — نظام الملک نے کہا — "تمہارے اور تمہارے لشکر کے ہوش و حواس اُن کھجوروں نے گم کئے تھے جو تم مکہ معظمہ کی سوغات کہہ کر کھا گئے تھے اور تم سب کی سوچنے کی صلاحیت اُس پانی نے سلب کی تھی جسے تم آبِ زمزم سمجھے تھے"۔

"خواجہ طوسی!" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "فوج کے لئے آج حکم جاری کر دو کہ باہر جاکر کوئی فوجی، وہ سالار ہے یا سپاہی، کسی اجنبی کے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں کھائے گا نہ کسی بھی قسم کا مشروب پئے گا نہ پانی...... قزل ساروق! تم دھچکے میں آگئے تھے۔ جاؤ، آرام کرو۔ اپنے تمام لشکر سے کہہ دینا کہ تم پر کوئی الزام نہیں...... اور تمام سواروں کو بتا دینا کہ تمہیں کھجوروں اور پانی میں کوئی ایسا نشہ پلایا گیا تھا جس نے تمہاری عقل اور جذبے کو سُلا دیا تھا۔ انہیں یہ بتانا اس لئے ضروری ہے کہ وہ اس وہم میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ حسن بن صباح کے پاس کوئی ایسی طاقت ہے جس سے وہ دشمن کی پوری

فوج کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیتا ہے"۔

"لشکر کے متعلق تو میں نے بتایا ہی نہیں" — قزل ساروق نے کہا — "میں نے اور میرے ماتحت کمانداروں نے سواروں کو یہ بتایا تھا لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ کئی ایک سوار اس وہم کو قبول کر چکے ہیں کہ حسن بن صباح کو خدا نے ایسی روحانی طاقت دی ہے کہ وہ اپنے جس دشمن کی طرف دیکھتا ہے وہ دشمن ہلاک ہو جاتا ہے یا ہماری طرح حسن بن صباح کی طرف پیٹھ کر کے وہاں سے غائب ہو جاتا ہے ..... یہ سب سوار میرے ساتھ آ گئے ہیں لیکن ان کے دلوں میں وہم موجود ہے"۔

"ہم اس کا انتظام بھی کر لیں گے" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "تم جاؤ"۔

"میں آپ کا ممنون ہوں سلطانِ عالی مقام!" — قزل ساروق نے کہا — "آپ نے میری خطا معاف کی لیکن میں اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتا۔ میں اس دھوکے کا انتقام لوں گا۔ میں گناہ کا کفارہ ادا کروں گا"۔

"میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں ساروق!" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "لیکن تم نے وہ دشمن دیکھ لیا ہے جس سے تم انتقام لینا چاہتے ہو۔ یہ آمنے سامنے آ کر لڑنے والا دشمن نہیں۔ اس کے لئے ہمیں کوئی اور طریقہ سوچنا پڑے گا۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ تم جو تجربہ کار سالار ہو' اپنے منتخب سواروں کے ساتھ زندہ واپس آ گئے ہو' امیر ارسلان کی طرح تمام سواروں کے ساتھ مارے نہیں گئے۔ اس دشمن کی سرکوبی میرا فرض ہے' اور اس فرض کی ادائیگی جہاد ہے۔ حسن بن صباح اور احمد بن عطاش نے اسلام کے نام پر ایک اور فرقہ بنا لیا ہے اور لوگ دھڑا دھڑ اس فرقے میں شامل ہو رہے ہیں"۔

سالار قزل ساروق وہاں سے چلا تو گیا لیکن اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ سلطان ملک شاہ اور اس کے وزیرِ اعظم نظام الملک کی باتوں سے مطمئن نہ ہوا ہو۔ اس کا سوار دستہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر گھوڑے کھول چکا تھا۔ ہر سوار کو آٹھ دس فوجیوں نے گھیر لیا اور ان سے سن رہے تھے کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں۔

○

"آپ نے کیا سوچا ہے خواجہ؟" — سلطان ملک شاہ نے نظام الملک سے پوچھا۔

"ہمارے پاس فوج ہے" — نظام الملک نے کہا — "باطنیوں کی کوئی فوج نہیں لیکن ہم نے ان پر دوبارہ حملہ کر کے کیا حاصل کیا ہے؟ ہمارے ایک سالار اور پانچ سو سواروں کو کس نے قتل کیا ہے؟ ..... ان لوگوں نے جن پر حسن بن صباح نے اپنی عقیدت مندی کا جنون طاری کر رکھا ہے۔ انہوں نے اپنی جانیں اس شخص کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ دوسرے حملے کا انجام دیکھ لیں۔ اس نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ یہ شخص جس کا نام حسن بن صباح ہے' اپنے مریدوں اور اندھی عقیدت رکھنے والے پیروکاروں سے ہماری فوج کو خون میں نہلا سکتا ہے جس طرح اس نے سالار قزل ساروق اور اس کے دستے کو بیکار کیا ہے"۔

"لیکن خواجہ!" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "میں آپ کا یہ مشورہ تو نہیں مانوں گا کہ حسن بن صباح کو ہم بھول جائیں"۔

"میں ایسا مشورہ دوں گا بھی نہیں عالی مقام!" — نظام الملک نے کہا — "میں نے عہد کر رکھا ہے کہ حسن بن صباح کو گرفتار کر کے اُسے جلاد کے حوالے کر دوں گا"۔

"گرفتار کیسے کریں گے؟"

"ابھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا" — نظام الملک نے جواب دیا — "ابھی یہی کہوں گا کہ ضروری نہیں حسن بن صباح کی سرکوبی کے لئے فوج ہی استعمال کی جائے گی۔ میں ادھر سے غافل نہیں عالی جاہ! میں نے جاسوس بھیج رکھے ہیں۔ اب تک مجھے جو اطلاعیں ملی ہیں' ان سے بڑی بھدی اور خطرناک تصویر سامنے آتی ہے۔ یہ آپ کو پہلے ہی معلوم ہے کہ حسن بن صباح ان علاقوں کا بے تاج بادشاہ بن چکا ہے اور وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے اور اس کی مقبولیت بڑی تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے"۔

"خواجہ حسن طوسی!" — سلطان ملک شاہ نے یوں کہا جیسے اچانک بیدار ہو گیا ہو — "ہم نے کوئی علاقہ اور کوئی ملک فتح نہیں کرنا۔ آپ کہتے ہیں کہ حسن بن صباح لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے۔ ہم نے لوگوں کے دلوں کو باطل اور ابلیسیت سے آزاد کرانا ہے' اور یہ مہم تبلیغ سے سر نہیں ہو گی۔ یہ مبلغوں کا نہیں یہ مجاہدین کا کام ہے ..... آپ کو ہماری سلطنت کی تاریخ تو معلوم ہی ہے خواجہ! آلِ سلجوق اسلام قبول کر کے یہ سلطنت قائم نہ کرتے تو اسلام کی بنیادیں ہل چکی ہوتیں اور اللہ کا یہ دین بڑا پرانا قصہ بن چکا ہوتا۔ پہلا فرض اپنے دین کا ہے اپنی سلطنت کا۔ دین قائم و دائم ہے تو ہم سب

قائم ہیں۔ جس کا دین اور ایمان ہی نہ رہے اُس کی نگاہوں میں آزادی اور غلامی میں کوئی فرق نہیں رہتا..... اسلام کو سامنے رکھو۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے' اسلام کی بیخ کنی کے لئے ہو رہا ہے"۔

"سلطانِ عالی مقام!" — نظام الملک نے کہا — "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی پوری ہو رہی ہے۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد میری اُمت فرقوں میں بٹ جائے گی..... اسلام کی بیخ کنی تو یہ فرقہ بندی کر رہی ہے"۔

"باتوں کا وقت نہیں رہا خواجہ!" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "اب ہمیں کچھ کرنا ہو گا"۔

"سلطانِ معظم!" — نظام الملک نے کہا — "صرف دو آدمیوں کو رُوئے زمین سے اٹھا دیا جائے تو یہ فتنہ اپنے آپ ہی ختم ہو جائے گا"۔

"حسن بن صباح اور احمد بن عطاش کو!" — ملک شاہ نے کہا — "یہ میں سوچ چکا ہوں۔ کرنا یہی پڑے گا"۔

"لیکن یہ کام آسان نہیں" — نظام الملک نے کہا — "پھر بھی میں اس کا انتظام کروں گا..... یہ انتظام کرنا پڑے گا"۔

○

سلجوقی سلطان ملک شاہ اور اُس کے وزیرِ اعظم خواجہ حسن طوسی کا جذبہ قابلِ قدر تھا۔ ملک شاہ تو انتقام کی آگ میں جلنے لگا تھا۔ اُس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو سلطانی یا بادشاہی کے نشے میں لاؤ لشکر لے کر چڑھ دوڑتا اور نقصان اٹھاتا۔ سلطان ملک شاہ دانشمند تھا اور ہر طرح کی صورتِ حال میں ہوش و حواس قائم رکھتا تھا۔ نظام الملک اس سے زیادہ دانشمند اور دُور اندیش تھا۔

نظام الملک نے کچھ عرصے سے ان علاقوں میں جاسوس بھیج رکھے تھے جن علاقوں میں لوگ حسن بن صباح کے مرید اور پیروکار ہو گئے تھے بلکہ بعض لوگوں نے اسے امام کی بجائے پیغمبر سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ان جاسوسوں میں سے کوئی نہ کوئی آتا اور اپنے مشاہدات بیان کر جاتا تھا۔ ان کا لُبِّ لباب یہی ہوتا تھا کہ باطنیوں کا ایک گروہ سارے علاقوں میں پھیلا ہوا حسن بن صباح کے معجزے اور کرامات بیان کرتا ہے۔

یہ رپورٹ تو ہر جاسوس دیتا تھا کہ یہ لوگ اسلام کے حوالے سے بات کرتے ہیں

اپنے آپ کو صحیح العقیدہ مسلمان کہتے ہیں۔

"تلبیس ابلیس" اور "آئینۂ تلبیس" میں بھی یہی آیا ہے کہ حسن بن صباح کے پیروکاروں کو شک تک نہ ہوتا تھا کہ جسے وہ امام اور نبی مانتے ہیں وہ باطنی ہے۔ اس کے مبلغ بڑے ہی دردناک انداز میں لوگوں کو اس قسم کی حکایتیں سناتے تھے کہ کفار نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا کیا ظلم کئے اور کیسے کیسے ستم ڈھائے اور صحابۂ کرام نے اور رسالتؐ کے دوسرے شیدائیوں نے کس طرح ناموسِ رسالتؐ پر جانیں قربان کی تھیں۔

مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ان علاقوں میں غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی اور یہ لوگ علم اور تعلیم سے بے بہرہ تھے اور اسلام کے معاملے میں بہت ہی جذباتی۔ انہیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہود و نصاریٰ کے ظلم و ستم اشتعال انگیز الفاظ اور دردناک لہجے میں سناتے تھے کہ لوگ بھڑک اٹھتے تھے۔ ظلم و ستم کی ان حکایتوں میں زیادہ تر من گھڑت ہوتی تھی۔

یوں لوگوں کو مشتعل کر کے انہیں بتایا جاتا کہ حسن بن صباح وہ اسلام لے کر آسمان سے اترا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے اور کفار نے سازش کے تحت اس کی روح بدل ڈالی اور چہرہ بگاڑ دیا ہے' اور اب حسن بن صباح پر کفار ہی نہیں بلکہ بگڑے ہوئے نظریات اور غلط عقیدوں کو صحیح ماننے والے مسلمان بھی حسن بن صباح اور اس کے معاون ساتھیوں پر ظلم و تشدد کر رہے ہیں۔

نظام الملک کے جاسوس اسی قسم کی خبریں دے کر پھر چلے جاتے تھے۔ تین چار جاسوس تو وہیں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ وہ معلومات اور خبریں اکٹھی کرتے رہتے' اپنے ساتھی جاسوسوں کو دیتے اور یہ جاسوس باری باری خبریں مرو پہنچاتے رہتے تھے۔

"میرے دوستو!" — ایک بار نظام الملک نے اُدھر سے آئے ہوئے دو جاسوسوں سے کہا تھا — "آج تک تم جتنی خبریں لائے ہو ان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں درپردہ کیا ہوتا ہے۔ میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ یہ نشے اور بڑی ہی خوبصورت اور چنچل لڑکیوں کے ذریعے بعض اہم افراد کو وہ اپنا مرید بنا لیتے ہیں۔ ہماری ضرورت یہ ہے کہ وہاں پردوں کے پیچھے بند کمروں میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ معلوم ہو جائے اور یہ بھی دیکھا جائے کہ حسن بن صباح اور اس کے اُستاد احمد بن عطاش کو قتل

کس طرح کیا جا سکتا ہے"۔

ابھی تک کوئی جاسوس حسن بن صباح کے اندرونی حلقے میں داخل نہیں ہو سکا تھا اس لئے یہ پتا لگانا ممکن نہیں تھا کہ پردوں کے پیچھے کیا ہوتا ہے۔

○

اب نظام الملک نے ایسے جاسوسوں کی تلاش شروع کر دی جو حسن بن صباح کے اتنی قریب پہنچ جائیں کہ اُس کے خاص مصاحبوں میں شامل ہو جائیں اور اندر کی خبریں لائیں۔

داستان گو موزوں سمجھتا ہے کہ اس داستان کو واپس قدیم قلعے کے اُن کھنڈرات میں لے جائے جہاں سے حسن بن صباح نے سلجوقی سالار قزل ساروق اور اُس کے سواروں کے لشکر کو کچھ پا کر واپس بھیج دیا تھا۔ پھر کیا حسن بن صباح انہی کھنڈرات میں بیٹھا رہا تھا؟

نہیں..... رات اُس کے پیروکاروں نے فتح کا جشن منایا اور اگلی صبح وہاں سے اُس سمت کو کوچ کر گیا تھا جس طرف مشہور تاریخی قلعہ الموت تھا۔ اُس کی اور اس کے پیر و مرشد کی نظریں اس قلعے پر لگی ہوئی تھیں۔ حسن بن صباح کی منزل یہی قلعہ تھا۔ اُسے اس نے اپنا مستقل اڈہ بنانا تھا' اور اسی قلعے کے اندر اور اس کے اردگرد اُس نے اپنی جنت بنانی تھی..... وہ جنت جس نے تاریخ کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔ یہ جنت ایسی حیران کن حقیقت تھی کہ آج کے دور کے کچھ لوگ اسے محض ایک افسانہ اور مبالغہ کہتے ہیں۔

قلعہ الموت کے کھنڈرات آج بھی ایک وسیع و عریض ٹیکری کی بلندی پر موجود ہیں۔ ایران کے اس علاقے کو طالقان کہتے ہیں۔ یہ بلند ٹیکری شہر قزوین اور دریائے خزر کے درمیان ہے۔ یہ قلعہ یوں تعمیر ہُوا تھا کہ کسی زمانے میں اس خوبصورت خطے میں دیلمی سلاطین کی حکمرانی تھی۔ ایک روز ایک سلطان اپنا عقاب ساتھ لے کر شکار کو گیا۔ اُس نے اُڑتے ہوئے ایک پرندے کے پیچھے عقاب چھوڑا۔ عقاب نے پرندے کو کچھ دُور جا کر پکڑ لیا لیکن پرندہ اس کے پنجوں سے نکل گیا۔ یہ اتنا زخمی تھا کہ زیادہ دُور تک اُڑ نہیں سکتا تھا۔ گرتے گرتے ٹیکری کی چوٹی پر جا گرا۔ یہ کوئی چھوٹا سا پرندہ نہیں ایک بڑا اور کمیاب نسل کا پرندہ تھا۔

عقاب نے اس پر ایک بار پھر جھپٹا مارا اور اُسے وہیں دبوچ لیا۔ سلطان جو گھوڑے پر سوار تھا گھوڑا دوڑاتا ٹیکری پر چڑھ گیا۔ اس کے ساتھ اُس کے محافظ اور کچھ مصاحب تھے۔ سلطان نے پرندہ عقاب سے لے لیا اور جب ٹیکری کی اس بلندی سے چار سو نظر دوڑائی تو اُس کی تو جیسے روح بھی مخمور ہو گئی ہو۔ یہ خطہ ہریالی کی بدولت بہت ہی خوبصورت تھا۔ ایک طرف دریا تھا جس کا اپنا ہی حسن تھا۔

ٹیکری دامن سے اوپر تک گھنے درختوں اور مخمل جیسی گھاس سے ڈھکی ہوئی تھی۔ بعض درخت پھولدار تھے جن کی بھینی بھینی خوشبو خمار سا طاری کرتی تھی۔ ٹیکری کے چاروں طرف دور دُور تک ایسا سبزہ زار تھا کہ اسے جنت نظیر ہی کہا جا سکتا تھا۔ دو جگہوں سے چشمے پھوٹتے تھے۔ دونوں جگہوں پر پچیس تیس گز چوڑی جھیلیں بنی ہوئی تھیں۔ ان کا اضافی پانی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی شکل میں بہتا' پتھروں اور کنکریوں پر جل ترنگ بجاتا دریا میں جا گرتا تھا۔ بعض جگہوں پر قریب قریب کھڑے تین تین چار چار درختوں کے تنوں کو پھولدار بیلوں نے کچھ اس طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا کہ کٹیاں سی بن گئی تھیں۔ دائیں' بائیں اور پیچھے ہرے پتوں اور پھولوں کی دیواریں اور اوپر چھتیں بنی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کٹیاں انسانوں نے بیلوں کو تراش کر بنائی ہوں لیکن یہ قدرت کی مناعی کا شاہکار تھا۔ ایک یورپی مؤرخ نے لکھا ہے کہ کوئی کہے کہ یہ خطہ بہشت کا حصہ تھا اور کسی وجہ سے زمین پر آن گرا تھا یا یہ کہے کہ آدم اور حوا کو خدا نے بہشت کے اس حصے میں رکھا تھا تو میں اسے سچ مان لوں گا۔

"سلطان کو اس خطے کے حُسن نے مسحُور تو کر ہی لیا تھا' اُس نے دیکھا کہ دفاعی لحاظ سے بھی یہ جگہ موزوں ہے۔ یہ ٹیکری اوپر سے نوکیلی یا گول نہیں بلکہ چپٹی تھی اور اس کا طول ایک میل سے ذرا ہی کم اور عرض بھی کچھ اتنا ہی تھا۔

"بلاشبہ میں نے اتنی دلفریب زمین آج ہی دیکھی ہے" — سلطان نے کہا — "کیا تم میں کوئی ہے جو مجھے یہ مشورہ نہ دینا چاہے کہ میں یہاں ایک ایسا قلعہ تعمیر کروں جو اس خطے جیسا دلنشیں اور چٹانوں جیسا مضبوط ہو؟"

"کوئی نہیں عالی جاہ!" — مصاحبوں کی ملی جُلی آوازیں اُٹھیں — "اس سے زیادہ دلفریب جگہ اور کہیں نہیں..... قلعہ جو یہاں بنے گا اس کی دیواروں اور اس کے دروازوں تک کوئی دشمن نہیں پہنچ سکے گا..... دشمن کا لشکر کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو' ٹیکری

پر چڑھتے ہمارے تیروں کی بوچھاڑوں سے لڑھکتا نیچے چلا جائے گا"۔

سلطان نے شکار سے واپس آکر پہلا کام یہ کیا کہ اس ٹیکری پر قلعے کی تعمیر کا حکم دیا۔ دُور دُور سے ماہر معمار بلوائے گئے۔ ان سے نقشے بنوائے گئے۔ ان میں ردّو بدل کیا گیا' نقشے کو بڑی محنت سے آخری شکل دی۔ اس دیلمی سلطان نے نقشے میں جو نئی چیزیں شامل کیں' انہوں نے تعمیرات کے ماہرین کو حیران کر دیا۔ قلعے کی تعمیر کوئی پیچیدہ کام نہیں ہوا کرتا تھا لیکن اس سلطان نے (جس کا تاریخ میں نام نہیں ملتا) جو نقشہ معماروں کو دیا وہ قلعہ بھی تھا' محل بھی اور رہائش جو کچھ تھا وہ پُراسرار تھا۔ اس میں تہہ خانہ بھی تھا جس میں بے شمار کمرے تھے۔ ان کے آگے' پیچھے اور دائیں بائیں گلیاں تھیں جو بھول بھلیاں تھیں۔ ان میں چھوٹے کمرے تھے' بڑے بڑے بھی اور بہت بڑے بھی اور تہہ خانے سے ایک سرنگ بھی نکالنی تھی۔ اسے اتنا کھلا اور اونچا رکھنا تھا کہ تین آدمی پہلو بہ پہلو اس میں سے گزر سکیں۔ سرنگ بھی بھول بھلیوں جیسی بنائی تھی۔

قلعے کی تعمیر شروع ہو گئی۔ ملک کے بے شمار معماروں کو اس کام پر لگا دیا گیا۔ ملک کی آدھی آبادی مزدوری کے لئے پہنچ گئی۔ اتنی زیادہ مخلوق چیونٹیوں کی طرح کام کرنے لگی۔

اس قلعے کا نام آلہ مُوت رکھا گیا۔ دیلمی زبان میں مُوت عقاب کو کہتے تھے اور آلہ کے معنی تربیت گاہ ہوتے تھے۔ سلطان عقاب کے پیچھے اس جگہ گیا تھا۔ اگر اس کے عقاب کا شکار اس ٹیکری پر نہ گرتا تو سلطان کبھی اس حسین ٹیکری کو نہ دیکھ سکتا نہ اسے ایسا قلعہ بنانے کا خیال آتا جو اُس دَور کا ایک عجوبہ تھا اور جو بعد میں حسن بن صباح کی جنت بنا۔

اس قلعے کا نام آلہ مُوت رکھا گیا تھا جو بگڑتے بگڑتے اَلمُوت بن گیا۔

○

حسن بن صباح کے زمانے میں یہ قلعہ اپنی اصل حالت میں تھا۔ اس علاقے کا حکمران امیر جعفری تھا۔ کسی بھی مؤرخ نے اس کا پورا نام نہیں لکھا۔ امیر جعفری نے اپنی حیثیت کے ایک سرکردہ فرد مہدی علوی کو قلعہ الموت کا حاکم مقرر کر رکھا تھا۔

حسن بن صباح الموت سے تھوڑی ہی دُور رُک گیا۔ اس کے ساتھ قدیم قلعے میں تین سو کے لگ بھگ آدمی تھے۔ ان سب نے اُس کے ساتھ جانا تھا لیکن ان میں سے

بہت سے آدمیوں کو پہلے ہی روانہ کر دیا گیا تھا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ الموت کے راستے میں آنے والی آبادیوں میں جاکر لوگوں کو حسن بن صباح کے یہ معجزے سناتے جائیں کہ ترز میں صرف ستر آدمی تھے جن پر سلجوقیوں کے پانچ سو سے زائد سواروں نے حملہ کر دیا۔ حسن بن صباح نے خدا سے مدد مانگی تو غیب سے سینکڑوں سوار آگئے اور تمام کے تمام سلجوقی سواروں کو قتل کر دیا۔ پھر قدیم قلعے میں تین سو آدمیوں پر ایک ہزار سے زائد سواروں نے حملہ کر دیا۔ حسن بن صباح نے قلعے کی دیوار پر کھڑے ہو کر اُس گھوڑ سوار لشکر کے سالار کی طرف دیکھا پھر کہا' واپس چلے جاؤ۔ لشکر نے محاصرہ اٹھا لیا اور واپس چلا گیا۔

ان تین سو آدمیوں میں صرف تین آدمی تھے جو حقیقت سے آگاہ تھے اور ایک عورت تھی جو حسن بن صباح کی رازدار تھی۔ ان تین آدمیوں میں ایک اسماعیل تھا اور یہ عورت خدیجہ تھی۔ ان دونوں نے حج سے آئے ہوئے میاں بیوی بن کر سالار قزل ساروق اور اس کے لشکر کو "آبِ زم زم" پلایا اور ذہنی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔

صرف یہ تین آدمی اور ایک عورت تھی جنہیں حسن بن صباح کے ان معجزوں کی حقیقت معلوم تھی' باقی سب نے ان "معجزوں" کو حقیقت تسلیم کر لیا تھا۔ انہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ان "معجزوں" کی تشہیر کریں۔ وہ تو انہوں نے کہے بغیر بھی کرنی تھی۔ یہ انسانی فطرت کا خاصا ہے اور یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ کوئی عجوبہ دیکھتا ہے یا کوئی پُراسرار واقعہ اس کے سامنے رُونما ہوتا ہے تو وہ اُس کی تہہ تک نہیں پہنچتا' اُس کا تجزیہ نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ پر ہیجانی کیفیت طاری کر کے یہ واقعہ ہر کسی کو سنسنی خیز لہجے میں سناتا ہے اور اس وہم میں مبتلا ہو کر کہ اس کی بات کو کچھ لوگ سچ نہیں مانیں گے' سنانے والا زیب داستان کا سہارا لیتا اور مبالغہ آرائی کرتا ہے۔

حسن بن صباح کو خدا نے ایسا دماغ دیا تھا کہ وہ انسان کی کمزوریوں کو سمجھتا اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا جانتا تھا۔ اُس نے اپنے تین سو میں سے دو سو سے زائد آدمیوں کو خود اپنی زبان سے نہیں بلکہ اپنے خاص مصاحبوں کی زبان سے کہلوایا کہ وہ آبادیوں میں امام کے معجزے سناتے جائیں۔

"یہ حکم امام کا نہیں"۔۔۔ مصاحبوں نے ان تین سو افراد سے کہا۔۔۔ "یہ ہمارا فرض ہے کہ ہر کسی کو معلوم ہو جائے کہ وہ امام جسے خدا نے ملت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو

صحیح راستہ دکھلانے کے لئے آسمان سے اتارا ہے۔ اس نے کیا معجزے دکھائے ہیں۔ لوگوں سے کہو کہ وہ امام کو خدا کا بھیجا ہوا امام مان لیں"۔

حسن بن صباح جب الموت سے تھوڑی دور رکا، اس وقت اس کے ساتھ تین سو کی بجائے تین ہزار سے زائد لوگ تھے۔ تاریخ میں یہ پتہ نہیں ملتا کہ پہاڑیوں کے اندر قدیم قلعے سے الموت تک کتنا فاصلہ تھا، البتہ یہ بات صاف ہے کہ حسن بن صباح کے آدمیوں نے اس علاقے کی آبادیوں میں "خدا کے بھیجے ہوئے امام" کے "معجزے" ایسے انداز سے سنائے کہ لوگ حسن بن صباح کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ حسن بن صباح نے ایک جگہ رک کر ڈیرے ڈال دیئے۔ اس کے لئے بڑے سائز کا شاہانہ خیمہ لگا دیا گیا تھا۔

تشہیر اور پروپیگنڈے کا کام صرف حسن بن صباح نے ہی نہیں کیا تھا، احمد بن غناش اس کام میں ہمہ تن مصروف رہتا تھا۔ اس نے مبلغوں کی جماعتیں بنا رکھی تھیں جس کے ارکان اسلام کے حوالے سے باطنی نظریئے کی تبلیغ کرتے تھے۔ بڑے مورخوں، خصوصاً "ابن خلدون، ابوالقاسم رفیق دلاوری، ابن اثیر" نے تو یوں لکھا ہے کہ وہ باطنی نظریئے کی تبلیغ کرتے تھے۔ تفصیلات لکھنے والے وقائع نگاروں اور مبصروں نے لکھا ہے کہ یہ تبلیغ دراصل تشہیر تھی حسن بن صباح کی اور لوگ جوق در جوق حسن بن صباح کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اکٹھے ہوتے جا رہے تھے لیکن حسن بن صباح کی جھلک انہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

حسن بن صباح کا خیمہ کپڑے کا ایک کمرہ تھا..... چوکور اور خاصا کشادہ..... چاروں طرف قناتیں تھیں اور ان پر مخمل کا شامیانہ تھا۔ لوگوں کو یہ بتایا جا رہا تھا کہ امام خیمے میں نہیں اور اس کے قریبی مصاحبوں کو بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں غائب ہو گیا ہے۔

"امام کو خدا کبھی کبھی اپنے پاس بلا لیتا ہے" — ایک مصاحب نے شوشہ چھوڑا — "وہ کسی بھی وقت واپس آسکتا ہے"۔

جس جگہ حسن بن صباح کا خیمہ تھا وہاں تک کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس سے ذرا پرے ہٹ کر ان کے اپنے آدمیوں کے خیمے تھے۔ لوگوں کو حسن بن صباح کے خیمے سے دور روک لیا جاتا تھا۔

○

حسن بن صباح یہاں پہنچا تھا تو تیسری رات خلجان سے اس کا پیر و مرشد احمد بن

غناش اس کے پاس آگیا تھا۔ ان کی ملاقات دو اڑھائی سال بعد ہو رہی تھی۔ احمد بن غناش نے حسن بن صباح کو مصر بھیجا تھا۔ اس کے بعد یہ دونوں پہلی بار مل رہے تھے۔ حسن بن صباح نے اپنے استاد کو اپنی کارگزاری سنائی اور استاد نے جب حسن بن صباح کو بتایا کہ اس نے قلعہ خلجان میں کیسے کیسے خفیہ انتظام کئے ہیں تو حسن بن صباح حیران رہ گیا۔

"اب قلعہ الموت پر قبضہ کرنا ہے" — احمد بن غناش نے کہا — "جو بظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔ امیر مہدی علوی کے پاس تین سو سواروں کا صرف ایک دستہ ہے۔ یہ اس کا محافظ دستہ ہے۔ اس کی فوج ہے ہی نہیں"۔

"پھر تو اس قلعے پر قبضہ کرلینا کوئی مشکل نہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "میرے پاس تین سو سے کچھ زائد تجربہ کار لڑنے والے آدمی ہیں..... اور یہ جو میری زیارت کے لئے ہجوم آگیا ہے، کئی سو اس میں لڑنے والے مل جائیں گے"۔

"نہیں حسن!" — احمد بن غناش نے کہا — "میں حیران ہوں کہ یہ بات تم کہہ رہے ہو۔ کیا ہم نے پہلے جو قلعے لئے ہیں وہ لڑ کر لئے ہیں؟..... خون کا ایک قطرہ نہیں بہے گا اور الموت ہمارا ہوگا..... سنو، ہم کیا کریں گے"۔

احمد بن غناش اور حسن بن صباح کی باتیں سرگوشیوں میں بدل گئیں۔ سرگوشیاں بھی ایسی جو خیمے کی کپڑے کی دیواریں بھی نہ سن سکیں۔ احمد بن غناش سحری کے وقت خیمے سے نکلا اور خلجان کو چلا گیا۔

تین چار راتیں گزر گئیں۔ "اللہ کے امام" اور اس کے "معجزوں" کے چرچے اتنے زیادہ اور ایسے انداز سے کئے جا رہے تھے کہ تجسس اور پسماندگی کے ہاتھوں مجبور ہو کر لوگ حسن بن صباح کی زیارت کے لئے چلے آرہے تھے۔ داستان گو سنا چکا ہے کہ پہلے بھی لوگوں نے سنا تھا کہ خدا کا ایلچی آسمان سے اترنے والا ہے تو لوگ اسی طرح اکٹھے ہو گئے تھے اور انہوں نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ لوگوں کی فطرت میں کوئی انقلاب تو نہیں آگیا تھا۔ ان میں فطری کمزوریاں جوں کی توں موجود تھیں۔ اب وہ اس جگہ ہجوم کر کے آ گئے تھے۔

یہاں اس حقیقت کا بیان بے محل نہ ہوگا کہ امت کے ہاتھوں سے اسلام کا دامن چھوٹ گیا تھا اور اسلامی عقائد کی شکست و ریخت ہو رہی تھی۔ خلفائے راشدین کے

دَور میں اُمتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی رسّی مضبوطی سے پکڑے رکھی اور فاتح اور کامران رہے' پھر قرآن کی نافرمانی کرتے ہوئے قیادت' اقتدار اور دوسروں پر برتری حاصل کرنے والے ہوس کار سرداروں اور دین کے نام نہاد عالموں نے اپنے اپنے نظریات اور اپنے اپنے عقیدے وضع کرنے شروع کر دیئے' آیاتِ قرآنی کی تفسیریں بدل ڈالیں اور اُمت کو فرقوں میں بانٹ دیا۔

حسن بن صباح کے ابتدائی دَور تک مسلمان چھ بڑے فرقوں میں بٹ چکے تھے اور ہر فرقے کی بارہ بارہ شاخیں بن چکی تھیں' یعنی ہر فرقہ فرقوں میں بٹ گیا تھا اور یوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق اُمت 72 فرقوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔

عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی راہِ مستقیم ہے' پھر آنحضورؐ نے اس لکیر کے دائیں بائیں اس طرح لکیریں کھینچیں جیسے درخت سے شاخیں نکلی ہیں اور فرمایا یہ سب راہیں ٹیڑھی ہیں اور ان میں کوئی ایک بھی راہ ایسی نہیں جس پر ایک شیطان موجود نہ ہو۔ یہ شیطان اپنی اپنی راہ پر بلاتے ہیں۔ پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی ــــ "بے شک یہی میری (اللہ کی) راہ سیدھی ہے۔ تم اس پر چلو' دوسری راہوں پر نہ چلنا ورنہ وہ (شیطان) تمہیں میری راہ سے ہٹا کر تم میں تفرقہ ڈال دے گا"۔

ابو داؤد نے معاویہؓ بن ابی سفیانؓ کے حوالے سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر فرمایا' خبردار ہو جاؤ' اہلِ کتاب جو تم سے پہلے تھے وہ 72 فرقوں میں بانٹے گئے تھے' اور میری اُمت عنقریب 73 فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ ان میں سے 72 جہنم میں جائیں گے اور صرف ایک جنت میں جائے گا۔

داستان گو نے فرقوں کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ جب مسلمان اللہ کی اُس سیدھی پر چلتے رہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھائی تھی تو وہ روحانی طور پر مطمئن اور مسرور رہے اور اللہ کی حکمرانی کرۂ ارض پر پھیلتی چلی گئی مگر جب فرقوں میں بٹ گئے تو وہ اپنی فطرت میں بے اطمینانی' تشنگی اور خلاء سا محسوس کرنے لگے۔ وہ صاف محسوس کرنے لگے کہ وہ بھٹک گئے ہیں۔ ان کی ذہنی کیفیت یہ تھی جیسے ــــ "یہ دَور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے" ــــ ان کے کانوں میں آواز پڑتی کہ فلاں جگہ ایک بزرگ آیا ہے جو

غیب کی باتیں سناتا ہے' یا یہ کہ فلاں جگہ ایک بزرگ کا ظہور ہُوا ہے اور یہ اُس کی کرامات ہیں تو لوگ کوسوں کی مسافت طے کر کے وہاں پہنچتے اور اُس بزرگ کے آگے سجدے کرتے تھے۔

یہ کیفیت مسلمان معاشرے میں شدت اختیار کرتی گئی جس نے آگے چل کر پیر پرستی' مزار پرستی اور خانقاہی نظام کی صورت اختیار کر لی۔ مملکتِ خداداد کے دیہی معاشرے کے بعض دُور افتادہ علاقوں میں یہ رواج مذہبی رنگ اختیار کئے ہوئے ہے کہ کوئی مشکل یا مصیبت آپڑے تو لوگ خدا سے مدد مانگنے کی بجائے اپنے اپنے پیر کے آستانوں کی دہلیزوں پر اور اُن کے مرے ہوئے باپوں کے مزاروں پر جا سجدے کرتے ہیں۔ ان کی زبان پر یااللہ کی بجائے یادستگیر کا وِرد ہوتا ہے۔

○

داستان گو کہہ رہا تھا کہ لوگوں نے حسن بن صباح کی زیارت کے لئے وہیں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ احمد بن عطاش حسن بن صباح سے مل کر اور کوئی نیا منصوبہ تیار کر کے چلا گیا۔ تاریخ میں ایک شہادت یہ بھی ملتی ہے کہ احمد بن عطاش گیا نہیں تھا' وہیں رُوپوش رہا تھا۔ اس منصوبے میں اُسے پسِ منظر میں رکھنا تھا۔

ایک رات آدھی گزر گئی تھی۔ رات کے سنّاٹے کو تین چار دھماکہ نما آوازوں نے تہہ و بالا کر ڈالا۔

"وہ دیکھو..... لوگو..... اُدھر دیکھو"۔

"زمین سے بادل اُٹھ رہے ہیں"۔

"لوگو' جاگو..... بادلوں کے رنگ دیکھو"۔

"یہ ضرور امام کا ظہور ہو رہا ہے"۔

پھر ایک ہڑبونگ تھی' ایک شور تھا' بھاگ دوڑ تھی' نفسا نفسی جیسی حالت تھی' لوگ دھکے دے رہے تھے' دھکے کھا رہے تھے اور اُس طرف دوڑے جا رہے تھے جدھر زمین سے بادل اُٹھ رہا تھا۔

وہ ہری سرسبز گھاس اور جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی ایک ٹیکری تھی جو زیادہ اونچی نہیں تھی۔ پندرہ نہیں تو سترہ ہاتھ اونچی ہو گی۔ اس کی لمبائی اڑھائی تین فرلانگ تھی۔ اُس کی ڈھلان پر اور اوپر بھی ایک دوسرے سے کچھ دُور دُور چھاتوں کی طرح پھیلے ہوئے

www.paksociety.com

اور لیمو کے بھی درخت تھے۔

اس ٹیکری کے پیچھے ایک اور ٹیکری تھی جو اگلی ٹیکری سے زیادہ بلند تھی۔ ان کے دامن آپس میں ملے ہوئے تھے۔

لوگوں نے زمین سے اٹھتا ہوا جو بادل دیکھا تھا بلکہ دیکھ رہے تھے، وہ آگے والی کم بلند ٹیکری کے عقب سے اٹھ رہا تھا۔ یہ آگ کے دھوئیں کا بادل نہیں تھا۔ یہ بادل بادلوں کے ان ٹکڑوں جیسا تھا جو برسات کے بعد سرسبز پہاڑیوں سے نیچے آجاتے اور وادیوں میں منڈلاتے رہتے ہیں۔

وہ رات تھی اور رات تاریک تھی لیکن بادل کا یہ دودھ جیسا سفید اور بہت بڑا ٹکڑا روشن تھا اور صاف نظر آ رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس میں سرخ، سبز، نیلی اور پیلی روشنیاں تیر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے قوس و قزح کے رنگ بکھر کر اٹکھیلیاں کرتے پھر رہے ہوں۔

بادل ٹیکری پر آگیا اور آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہونے لگا اور اس میں ایک آدمی کا ہیولا نظر آنے لگا۔ اس کے بازو دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔

"لوگو!" — بڑی ہی بلند آواز میں کسی نے اعلان کیا — "بسم اللہ پڑھو۔ کلمۂ طیبہ پڑھو اور سجدے میں چلے جاؤ۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے امام حسن بن صباح کو زمین پر اتار دیا ہے"۔

"جسے دشمن کے لشکر دیکھتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں اس کا ظہور ہو گیا ہے" — کسی اور نے اعلان کیا۔

لوگ سجدے میں چلے گئے تھے۔

حسن بن صباح کے تین سو آدمیوں کے جہاں خیمے لگے ہوئے تھے وہاں سے جلتی ہوئی دس بارہ مشعلیں نکلیں جو ٹیکری پر چڑھ گئیں۔ ہوا ذرا تیز چل رہی تھی اس لئے بادل کا یہ ٹکڑا ایک طرف ہٹتا گیا اور فضا میں تحلیل ہوتے ہوتے غائب ہو گیا اور اس جگہ ٹیکری پر حسن بن صباح رہ گیا جو بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ وہ سبز رنگ کے چمکدار چغے میں ملبوس تھا۔ سر پر پگڑی اور اس پر اتنا بڑا سبز رومال پڑا ہوا تھا جس نے کندھے بھی ڈھانپ رکھے تھے۔

"سجدے سے اٹھو لوگو!" — ایک اعلان ہوا — "اور ٹیکری کے قریب آجاؤ"۔

لوگ اٹھ دوڑے۔ انہیں تلواروں اور برچھیوں سے مسلح کچھ آدمیوں نے ٹیکری کے قریب روک کر بیٹھ جانے کو کہا۔ دس بارہ مشعلوں کی روشنی میں لوگوں کو حسن بن صباح کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"میں آگیا ہوں" — حسن بن صباح نے بلند آواز سے کہا — "اللہ سے یہ وعدہ لے کر آیا ہوں کہ ان مسلمانوں کو جو میرے دائرے میں آجائیں گے ، دنیا میں ہی جنت دکھا دی جائے گی۔ میں تم سب کے گناہ بخشوا آیا ہوں"۔

"اے اللہ کی طرف سے آنے والے!" — لوگوں میں سے ایک نے پوچھا — "ہم تجھے امام کہیں، نبی کہیں....."

"میں تم میں سے ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے جو کہنا چاہتے ہو کہہ لو، یہ سوچ لو کہ میرے راستے پر چلو گے تو رنج و آلام سے، مشکلات اور مصائب سے، تنگ دستی اور بیماری سے محفوظ رہو گے، شیطان سے اور جنات سے محفوظ رہو گے"۔

"ہم نے تجھے مان لیا" — ایک آدمی بولا — "امام بھی، نبی بھی، کوئی معجزہ دکھا"۔

لوگوں کے ہجوم پر ایسا سناٹا طاری تھا جیسے وہاں کوئی ایک بھی انسان نہ ہو۔ یہ تقدس اور عقیدت مندی کی انتہا تھی کہ لوگ جیسے اپنی سانسوں کو بھی روکنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ امام ناراض ہو جائے گا۔ ان کے کانوں میں جب کسی کی آواز پڑی کہ کوئی معجزہ دکھا تو سناٹا اور گہرا ہو گیا۔

"کیا یہ معجزہ نہیں جو تم نے دیکھا ہے؟" — حسن بن صباح نے کہا — "اللہ نے مجھے جنت کے بادلوں کے ایک ٹکڑے پر سوار کر کے زمین پر اتارا ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ یہ بادل قوس و قزح کے رنگوں سے سجا ہوا تھا؟..... مجھے زمین پر اتار کر جنت کا بادل واپس چلا گیا ہے"۔

"ہم نے دیکھا ہے" — بہت سی آوازیں اٹھیں۔

"بے شک ہم نے دیکھا ہے یا امام" — اور بھی آوازیں اٹھیں۔

حسن بن صباح کو مشعل بردار ٹیکری سے اتار کر اس خیمے میں لے گئے جو کپڑے کی دیواروں اور کپڑے کی چھت کا خوشنما کمرہ تھا۔ اسی خیمے میں احمد بن عطاش سے اس کی ملاقات ہوئی تھی، اور شاید احمد بن عطاش ابھی وہیں تھا۔

زیارت کے لئے آئے ہوئے ہجوم میں مختلف قبیلوں کے سردار اور دیگر سرکردہ

افراد بھی تھے۔ اگلی صبح ان لوگوں نے حسن بن صباح کی بیعت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

○

کیا حسن بن صباح واقعی بادل کے ٹکڑے پر سوار ہو کر آسمان سے زمین پر آیا تھا؟

اس سوال کا جواب پہلے ایک باب میں دیا جا چکا ہے۔ حسن بن صباح کا پہلے بھی ایک پہاڑی پر "ظہور" ہوا تھا۔ پہاڑی کے پیچھے ایک غار میں آگ جلا کر اُس کی چمک آئینوں پر ڈالی جاتی تھی۔ ان میں آئینے بھی تھے اور چمکتی ہوئی دھات کی چادریں اور ایسی چادریں بھی تھیں جن پر ابرق چپکایا گیا تھا۔ ایک آئینہ شاہ بلوط کے درخت میں رکھا گیا تھا۔ آئینے یا چمکدار دھات کی پلیٹ سے آگ کی چمک شاہ بلوط والے آئینے پر منعکس کی جاتی تو رات کو یوں لگتا تھا جیسے شاہ بلوط میں آسمان کا ستارہ چمک رہا ہو۔ سیدھے سادے پسماندہ لوگ اسے آسمان کے ستارے کی چمک سمجھتے رہے' اور ایک روز اس شاہ بلوط کے ستارے کی چمک میں سے حسن بن صباح کا ظہور ہوا۔

اب ایک ٹیکری سے بادل اٹھا اور ٹیکری پر آیا۔ اس میں رنگ تیر رہے تھے اور اس میں سے حسن بن صباح نکلا۔ یہ بھی آگ' چمکدار دھات یا ابرق کی چادروں اور آئینوں کا کرشمہ تھا۔ ٹیکری کے پیچھے دامن میں پندرہ بیس گز لمبائی میں دہکتے انگارے پھیلائے گئے تھے اور ان پر دھواں پیدا کرنے والا بارود یا کوئی اور کیمیائی مادہ پھینکا گیا تھا جو سفید بادل کی شکل کا دھواں بن کر اوپر اٹھا۔ تاریخ میں یہ سراغ نہیں ملتا کہ یہ بارود تھا یا سفوف یا سیال مادہ تھا۔ یہ تحریر ملتی ہے کہ اُس وقت تک مسلمانوں نے بارود سازی اور کیمیاگری میں یورپ والوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ترقی کر لی تھی۔

چونکہ وہ علاقہ جنگلاتی تھا' سبزہ زار تھا اور رات تھی اس لئے فضا میں نمی زیادہ تھی۔ نمی کی وجہ سے دھواں فوراً" اوپر نہیں اٹھا اور نہ جلدی بکھرا۔ اس میں جو رنگ تیر رہے تھے آئینوں یا دھات کی چمکدار چادروں سے اس طرح دھوئیں میں شامل کئے گئے تھے کہ ٹیکری کے پیچھے آگ جلا کر اُس کی چمک منعکس کی گئی اور آئینوں وغیرہ کے آگے باریک رنگ دار کپڑے رکھے گئے تھے۔ تاریخ میں اس سے زیادہ تشریح اور وضاحت نہیں ملتی۔ ٹیکری کے پیچھے کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

○

قلعہ الموت وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اُس بلندی پر جہاں قلعہ تھا' ایک شہر آباد

ہو گیا تھا۔ امیر الموت مہدی علوی کو اطلاعیں مل رہی تھیں کہ فلاں جگہ ایک قافلہ پڑاؤ کئے ہوئے ہے جس کا امیر کارواں ایک برگزیدہ شخصیت ہے۔ مہدی علوی کو اس بزرگ کے معجزے بھی سنائے گئے لیکن اس نے دھیان سے نہ سنے اور کوئی اہمیت نہ دی۔

مہدی علوی کو یہ تو پتہ ہی نہ چل سکا کہ حسن بن صباح کی تشہیر اور تبلیغ کی تیز رو تند ہوا چلی ہے جس کا گزر الموت سے بھی ہُوا ہے اور اس سے اس کا محافظ دستہ بھی متاثر ہُوا ہے۔ یہ انتظام احمد بن عطاش کا تھا۔ مہدی علوی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حسن بن صباح نے بادل کے ٹکڑے میں سے اپنے ظہور کا جو ڈھونگ رچایا ہے' یہ الموت کے کچھ لوگوں نے بھی دیکھا ہے اور انہوں نے اُسے برحق مانا ہے۔

"امیرِ عالی مقام!" ـــ مہدی علوی کو اس کے ایک مشیر نے پریشانی کے سے عالم میں کہا ـــ "ہم نے تو ادھر توجہ ہی نہیں دی تھی لیکن اپنے تمام لوگوں میں اور آپ کے محافظ دستے میں یہ عجیب و غریب خبر پھیل گئی ہے کہ امام حسن بن صباح بادل کے ایک ٹکڑے میں آسمان سے اُترا ہے اور لوگ دھڑا دھڑ اُس کی بیعت کر رہے ہیں"۔

"ہم یہی کر سکتے ہیں کہ اسے اپنے علاقے سے نکال دیں" ـــ مہدی علوی نے کہا ـــ "کسی مسلمان کو یقین نہیں کرنا چاہئے کہ کوئی امام یا کوئی نبی یا کوئی بزرگ آسمان سے اترا ہے۔ ہم نبوت پر یقین رکھنے والے مسلمان ہیں اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے"۔

"آپ نہ مانیں" ـــ مشیر نے کہا ـــ "میں بھی نہیں مانتا لیکن یہ صورتِ حال بڑی ہی خطرناک ہے کہ لوگوں نے بھی اسے سچ مان لیا ہے اور ہمارے سپاہیوں اور سواروں نے بھی ..... امیرِ محترم! میں نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی نیا فرقہ بن رہا ہے۔ اسے یہیں پر ختم کر دیا جائے تو اچھا ہے"۔

ان دونوں میں کچھ دیر تبادلۂ خیالات ہُوا' کچھ بحث مباحثہ ہُوا' آخر مہدی علوی نے اپنا حکم سنایا۔

"پچاس سواروں کا ایک دستہ لے جاؤ" ـــ اُس نے کہا ـــ "وہاں حسن بن صباح کے مرید اور معتقد بھی ہوں گے۔ تم ساتھ جاؤ۔ حسن بن صباح سے کہنا کہ وہ تمہارے ساتھ آ جائے۔ نہ آئے تو اُسے میرا حکم سنانا کہ تم زیرِ حراست ہو۔ ہو سکتا ہے اُس کے مرید اور معتقد مزاحمت کریں۔ کوشش کرنا کہ خون خرابہ نہ ہو۔ ہونے کو وہاں بہت کچھ ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کچھ بھی نہ ہو۔ اگر معاملہ بگڑتا نظر آئے تو ایک سوار کو

دوڑا دینا۔ میں اپنا تمام دستہ بھیج رہوں گا۔ میں حسن بن صباح کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں"۔

مہدی علوی کے حکم کی تعمیل فوری طور پر ہوئی۔ مشیر پچاس سواروں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ یہ دستہ دن کے پچھلے پہر چلا تھا' رات کو حسن بن صباح کی خیمہ گاہ میں پہنچ گیا۔ وہاں اب لوگوں کا اتنا ہجوم نہیں تھا۔ انہوں نے حسن بن صباح کی زیارت کر لی تھی اور وہ چلے گئے تھے۔ پیچھے حسن بن صباح کے اپنے آدمی رہ گئے تھے۔

سواروں نے خیمہ گاہ کو گھیرے میں لے لیا۔ حسن بن صباح اپنے مصاحبوں میں بیٹھا تھا۔ اس نے گھوڑوں کے ٹاپ سنے اور چونکا۔ اس کے مصاحبوں کے چہروں پر گھبراہٹ آگئی۔ پیشتر اس کے کہ حسن بن صباح کوئی حرکت کرتا یا کوئی حکم دیتا' مہدی علوی کا مشیر خیمے میں داخل ہوا اور جھک کر سلام کیا۔

"یا امام!" — مشیر عابد حبیبی نے حسن بن صباح سے مصافحہ کر کے اور اس کے سامنے دو زانو بیٹھ کر کہا — "امیر الموت مہدی علوی نے امام کے حضور سلام بھیجا ہے اور یہ عرض بھی کہ امام جنگل میں پڑے اچھے نہیں لگتے۔ اگر امام قلعے میں آجائیں اور کچھ دن یہاں رہ کر دیکھیں۔ اگر یہ جگہ پسند آجائے تو قلعے میں ہی رہیں"۔

"کیا دعوت نامہ رات کے اس وقت دیا جاتا ہے؟" — حسن بن صباح نے عابد حبیبی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا — "اور کیا تمہارے ہاں مہمان کو محاصرے میں لے کر اسے دعوت دی جاتی ہے؟"

"امیر شہر نے حکم دیا کہ ابھی روانہ ہو جاؤ" — عابد حبیبی نے کہا — "ہم ایسے وقت روانہ ہوئے کہ یہاں بے وقت پہنچے۔ اگر آپ کے خیمے میں روشنی نہ ہوتی تو میں کل صبح آپ کے حضور حاضر ہوتا..... اور یہ سوار؟ ..... یہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ مہمان کے لئے ہم گھوڑ سوار بھیجا کرتے ہیں۔ آپ کے لئے پچاس گھوڑ سوار لایا ہوں"۔

"امیرِ شہر کو میرا سلام کہنا" — حسن بن صباح نے کہا — "اور ان کا شکریہ ادا کرنا پھر کہنا کہ میں آؤں گا لیکن میں اپنے رواج کے مطابق آؤں گا۔ رواج یہ ہے کہ پہلے امیر شہر کم از کم ایک رات کے لئے مجھے میزبانی کا شرف عطا کریں گے' پھر میں ان کے ساتھ

جس نے اسماعیل کے ساتھ مل کر سالار قزل ساروق کو کامیاب دھوکہ دیا تھا۔ خدیجہ (جوان لڑکی نہیں جوان عورت تھی۔ خوبصورت تو تھی ہی' اس کی ٹریننگ ایسی ہوئی تھی کہ پتھروں کو بھی موم کر لیتی اور فرعونوں کو بھی اپنے قدموں میں جھکا لیتی تھی۔

احمد بن عطاش اس کے پاس دو اور لڑکیاں لے آیا تھا۔ انہیں قلعہ الموت پر قبضے کے لئے استعمال کرنا تھا۔ یہ بھی تربیت یافتہ اور آزمائی ہوئی لڑکیاں تھیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ کس صورت حال میں کیا کرنا ہے۔

تیسرے دن مہدی علوی آگیا۔ حسن بن صباح نے اس کا استقبال اس طرح کیا کہ اپنے آدمیوں کو مہدی علوی کے راستے میں دو رویہ کھڑا کیا۔ ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں جو اوپر کر کے ان کی نوکیں آمنے سامنے کے آدمیوں نے ملا رکھی تھیں۔ مہدی علوی ان تلواروں کے سائے میں گزر کر خیمے تک پہنچا۔ وہاں حسن بن صباح نے اس کا استقبال کیا اور جب مہمان خیمے میں داخل ہوا تو خدیجہ اور دوسری دو لڑکیوں نے اس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں۔ مہدی علوی بڑی خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گیا۔

"کیا وہ آپ ہی ہیں جو آسمان سے اترے ہیں؟" — کھانے کے بعد مہدی علوی نے حسن بن صباح سے پوچھا۔

"کیا آپ کو یقین نہیں آرہا؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"نہیں!" — مہدی علوی نے کہا — "کوئی مسلمان یقین نہیں کر سکتا کہ کوئی امام یا نبی آسمان سے اترا ہو"۔

"اور کوئی مسلمان آپ کی کوئی بات یقین سے نہیں سنے گا جب تک اسے یہ یقین نہ دلائیں کہ آپ آسمان سے اترے ہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "کیا آپ نہیں جانتے کہ نبیوں اور پیغمبروں کے ساتھ لوگوں نے کیا سلوک کیا تھا؟"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" — مہدی علوی نے پوچھا — "نبوت؟ ..... امامت؟"

"عبادت!" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "میں اللہ کی عبادت اور اس کے رسول کا عشق چاہتا ہوں ..... اور میں چاہتا ہوں کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں سکون ہو' الجھنیں نہ ہوں اور میں عبادت میں ڈوب جاؤں۔ میرے پیر و مرشد نے مجھے بتایا ہے کہ خلوت میں مجھے ایک اشارہ ملے گا جو ویسا ہی ہو گا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا تھا۔ اس اشارے میں میری راہ اور میری منزل کا تعین ہو گا"۔

ہی الموت چل پڑوں گا"۔

عابد جیبی کو مہدی علوی نے حکم دیا تھا کہ حسن بن صباح کو اپنے ساتھ لے آئے۔ اگر وہ نہ آئے تو اسے میرا حکم سنانا کہ تم حراست میں ہو۔ اگر اُس کے آدمی مزاحمت کریں تو جنگی کارروائی کرنا اور مدد کی ضرورت ہو تو مجھے اطلاع دینا۔ دراصل مہدی علوی کا حکم یہ تھا کہ حسن بن صباح کو گرفتار کر کے لے آنا۔

عابد جیبی نے پہلے دوستانہ انداز اختیار کیا تھا۔ اُس نے حسن بن صباح کو ایسے انداز سے امام کہا تھا جیسے اُس نے دل کی گہرائیوں سے اسے امام تسلیم کر لیا ہو لیکن حسن بن صباح نے اُس کے ساتھ جانے کی بجائے یہ کہہ دیا کہ پہلے امیرِ شہر اُس کے پاس آئے تو عابد جیبی نے یوں محسوس کیا جیسے امام نے اس کی اور اس کے امیرِ شہر کی عزت افزائی کی ہو۔

عابد جیبی کا ارادہ تو یہ تھا کہ حسن بن صباح نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کیا تو وہ اسے گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جائے گا لیکن وہ جان نہیں سکا تھا کہ حسن بن صباح نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں اور اسی میں سارا راز تھا۔ عابد جیبی اپنی آنکھوں کو حسن بن صباح کی آنکھوں سے آزاد نہیں کرا سکا تھا۔ حسن بن صباح نے اُسے ہپناٹائز کر لیا تھا۔ اس کا ذہن اب حسن بن صباح کے زیرِ اثر تھا۔ یہ تو ہر مؤرخ نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ سننے والے پر سحر کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور اُس کا استدلال غالطتا" فریب کاری پر مبنی ہوتا تھا لیکن اچھے خاصے دانشور بھی اس کے فریب میں آجاتے تھے۔

عابد جیبی سدھائے ہوئے جانور کی طرح اٹھا اور رُخصت ہو گیا۔

○

دو روز بعد الموت سے ایک گھوڑ سوار آیا۔ اُس نے حسن بن صباح کو پیغام دیا کہ امیرِ الموت مہدی علوی تیسرے دن آ رہا ہے۔ سوار یہ پیغام دے کر چلا گیا تو حسن بن صباح نے اُس کے استقبال کی اور اس کے لئے رہائش کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنا شاہانہ خیمہ مہدی علوی کے لئے چھوڑ دیا۔ اپنے آدمیوں سے کہا کہ مہدی علوی آئے تو شام کو خوشبودار پھولوں کے گلدستے خیمے میں سجا دیں۔

اُس کے پاس مہمان کے ہوش گم کرنے کا ایک ذریعہ اور بھی تھا۔ ایک تو خدیجہ تھی)

"لیکن آپ کا یہ شاہانہ خیمہ؟" — مہدی علوی نے کہا — "اور یہ حسین و جمیل لڑکیاں اور یہ انداز عبادت کرنے والوں کے تو نہیں ہوتے"۔

"اور یہ میرے لئے ہیں بھی نہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "میرے مریدوں اور معتقدوں میں آپ سے زیادہ اونچی حیثیت کے لوگ بھی ہیں۔ میرے لئے یہ شان و شوکت انہوں نے ہی بنائی ہے۔ میں تو چھوٹے سے ایک خیمے میں زمین پر بیٹھ کر اللہ کو یاد کرتا ہوں ..... آپ نے پوچھا ہے میں کیا چاہتا ہوں ..... میں چاہتا ہوں کہ مسلمان اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو جائیں اور اپنا وقار بحال کریں"۔

مہدی علوی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک انسان سے نہیں بلکہ ایک پُراسرار طاقت سے محوِ گفتگو ہے اور اُسے محسوس نہیں ہو رہا کہ مکڑی کے جالے کے تار اُس کے گرد لپٹے جا رہے ہیں۔

"آپ کے معجزوں کی حقیقت کیا ہے؟" — مہدی علوی نے پوچھا — "تبریز میں کیا ہوا تھا؟..... اور سلجوقیوں کے ایک ہزار سواروں کے لشکر کو آپ نے کس طرح پسپا کیا تھا؟"

"یہ آپ مجھ سے نہ سنیں" — حسن بن صباح نے کہا — "ہو سکتا ہے مجھ پر آپ مبالغہ آرائی کا شک کریں۔ یہ اُن سلجوقیوں سے پوچھیں جو میرے اتنا کہنے پر کہ واپس چلے جاؤ، وہ واپس چلے گئے تھے"۔

حسن بن صباح نے اسے اپنے یہ معجزے سنانے شروع کر دیئے۔ ایک ایک لفظ دروغ اور مبالغہ تھا لیکن سنانے کا انداز ایسا کہ مہدی علوی مسحور ہوتا چلا گیا۔ انسان کی خطرناک کمزوریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ جاننے کے لئے انسان ہاتھ پاؤں مارتا ہے کہ اس کا آنے والا وقت کیسا ہو گا اور اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے اور اسے بڑا رتبہ اور خزانہ کیسے مل سکتا ہے۔

کچھ ایسی ہی بات مہدی علوی حسن بن صباح سے کر بیٹھا۔ حسن بن صباح قلعہ الموت سے واقف تھا اور یہ علاقہ تو اُسے بہت ہی پسند تھا۔ اس قلعے پر اُس نے قبضہ کرنا تھا۔ مہدی علوی کی بات سن کر حسن بن صباح نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے اوپر مراقبے کی کیفیت طاری کر لی۔

"لو!" — حسن بن صباح نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور گھبرائے ہوئے

سے لہجے میں بولا —— ''بڑی ہی کالی گھٹا ہے جو الموٓت پر چھیتی چلی جارہی ہے۔ اس میں بجلیاں چھپی ہوئی ہیں'' —— اُس نے جھوٹ بولا —— ''میں نے آپ کا قلعہ کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے جو نظر آرہا ہے وہ تو بہت ہی مضبوط ہے۔ اس میں راہداریاں' تہہ خانے' راستے اور چور راستے ایسے ہیں کہ کوئی اجنبی ان میں چلا جائے تو انہی میں بھٹک بھٹک کر مر جائے لیکن اتنے قیمتی قلعے اور اتنے خوبصورت شہر کے تحفظ کے لئے مجھے کوئی فوج نظر نہیں آرہی..... کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں یا مجھے غلط نظر آرہا ہے؟''

مہدی علوی نے حسن بن صباح کی زبان سے اپنے قلعے کی تفصیلات سُنیں تو اس پر رعب طاری ہو گیا۔ اُس نے حسن بن صباح کو بتایا کہ اُس نے قلعے میں فوج رکھی ہی نہیں۔ صرف ایک محافظ دستہ ہے جس میں پانچ سو سوار ہیں۔

''فوج رکھیں'' —— حسن بن صباح نے کہا —— ''دشمن بڑھ رہا ہے۔ گھٹا گہری ہو رہی ہے۔ اگر آپ نے فوج رکھ لی تو یہ گھٹا جس میں بجلیاں چھپی ہوئی ہیں' اُڑ جائے گی اور آپ محفوظ رہیں گے۔ فوج تجربہ کار ہونی چاہئے۔ بغیر فوج کے آپ قلعہ گنوا بیٹھیں گے''۔

مہدی علوی' حسن بن صباح کے جال میں آگیا۔ اُس نے حسن بن صباح کے ساتھ اس مسئلے پر بات شروع کر دی کہ وہ اتنی زیادہ فوج نہیں رکھ سکتا کیونکہ وہ فوج کے اخراجات پورے کرنے کے قابل نہیں۔ حسن بن صباح اُسے ڈراتا رہا کہ اس نے فوج نہ رکھی تو کوئی نہ کوئی دشمن اپنی فوج لے آئے گا اور قلعے پر قبضہ کرلے گا۔

''حملہ آور سلجوقی بھی ہو سکتے ہیں'' —— حسن بن صباح نے کہا —— ''یہ گھٹا جو میں نے دیکھی ہے' یہ بڑا ہی خطرناک اشارہ ہے۔ میں آپ کی یہ مدد کر سکتا ہوں کہ میرے ساتھ جو آدمی ہیں' میں ان کی ایک فوج بنا سکتا ہوں۔ آپ انہیں دو وقت روٹی دے دیا کریں' ان کی تنخواہ اور دیگر اخراجات میں اپنے ذمے لے لوں گا۔ یہ میں جہاں سے بھی پورے کروں' یہ میری ذمہ داری ہو گی۔ آپ مجھے قلعے میں تھوڑی سی جگہ دے دیں جہاں میں عبادت کر سکوں اور جو لوگ میری زیارت کے لئے آئیں انہیں بٹھا کر ان کی راہنمائی کر سکوں۔ مجھے امید ہے کہ میں اپنے پیروکاروں کو مریدوں کو جو بھی حکم دوں گا وہ مانیں گے''۔

مہدی علوی حسن بن صباح کی باتوں میں آگیا اور اُس کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ تاریخ

میں اس معاہدے کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ البتہ یہ واضح ہے کہ وہ امیر الموٓت مہدی علوی جس نے حسن بن صباح کی گرفتاری کا حکم دیا تھا' خود اس کے فریب میں گرفتار ہو گیا اور اُس کی عقل پر ایسا پردہ پڑا کہ یہ بھی نہ سوچ سکا کہ وہ کتنا خطرناک معاہدہ کر بیٹھا ہے۔

○

اُدھر مرو میں سلطان ملک شاہ اور نظام الملک پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ سلطان ملک شاہ تو زیادہ فوج بھیج کر بہت بڑا حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن نظام الملک نے اُسے روک دیا اور کہا تھا کہ ایسے عقلمند اور غیر معمولی طور پر دلیر جاسوس بھیجے جائیں جو حسن بن صباح اور احمد بن عطاش کے خفیہ حلقے تک پہنچ کر اندر کی خبریں لائیں تاکہ ان کے مطابق کوئی کارروائی کی جائے۔

اصل پیچ و تاب تو سالار قزل ساروق کھا رہا تھا۔ وہ اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کو تڑپ رہا تھا۔ اُس نے سلطان ملک شاہ اور وزیرِ اعظم سے کئی بار کہا تھا کہ اسے جاسوسی کے لئے بھیجا جائے۔

''یہ کام سالار کا نہیں سارِوق!'' —— آخر ایک دن سلطان نے اُسے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا تھا —— ''حملے کی صورت میں ہم تمہیں ہی بھیجیں گے لیکن دو تجربوں کے بعد ہم تیسرا ناکام تجربہ نہیں کریں گے''۔

''میں حسن بن صباح کو اپنے ہاتھوں قتل کرنا چاہتا ہوں'' —— قزل سارِوق نے کہا تھا —— ''صرف یہ شخص قتل ہو جائے تو باطنیوں کا کھیل ختم ہو جائے گا''۔

''اس کی بجائے وہاں تم قتل ہو سکتے ہو'' —— نظام الملک نے کہا تھا —— ''اس صورت میں ہم سب کی بے عزتی ہو گی اور باطنی اور زیادہ شیر اور دلیر ہو جائیں گے''۔

مزمّل آفندی صحت یاب ہو چکا تھا۔ سالار قزل سارِوق جس طرح اپنے ایک ہزار سواروں کے ساتھ واپس آیا تھا' اس سے مزمّل آفندی بھی واقف تھا۔ اسے وہ ملا بھی تھا اور اس کی قہر آلود باتیں بھی سنی تھیں۔ قزل سارِوق نے اسے بھی بتایا تھا کہ وہ اکیلا حسن بن صباح کے قتل کے لئے جائے گا۔ مزمّل نے اُسے کہا تھا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ جائے گا۔ دونوں نے پلان تیار کر لیا تھا لیکن سلطان ملک شاہ نے قزل سارِوق کو روک دیا۔ مزمّل اکیلا نظام الملک سے ملا۔

"جس مقصد کے لئے آپ جاسوس بھیج رہے ہیں وہ مقصد صرف میں پورا کر سکتا ہوں" — مزمل آفندی نے کہا — "میں آپ سے صرف ایک گھوڑا یا ایک اونٹ مانگوں گا"۔

"نہیں مزمل!" — نظام الملک نے کہا تھا — "ہم تمہیں کسی خطرناک مہم پر نہیں بھیج سکتے کیونکہ تم ہمارے ملازم نہیں"۔

"ملا جلدا" — مزمل نے کہا تھا — "اس خطرناک مہم میں وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو ملازم نہیں ہو گا۔ یہ کام وہ شخص کرے گا جس میں جذبہ ہو گا۔ ملازم تو اپنے اہل و عیال کو روٹی کھلانے کے لئے زندہ رہنے کی کوشش کرے گا۔ میں حسن بن صباح کو اپنے دین اور اپنے عقیدے کے نام پر قتل کروں گا۔ اگر قتل نہ کر سکا تو ان کی پردوں کے پیچھے کی خبریں اور ان کے دلوں کے بھید لے کر آؤں گا...... یہ ایک قومی مسئلہ ہے، ہمارے دین کا مسئلہ ہے۔ جتنا آپ کا ہے اتنا ہی میرا ہے۔ میں آپ سے کوئی معاوضہ نہیں مانگ رہا۔ مجھے جلد اور شہادت کے راستے سے نہ ہٹائیں"۔

نظام الملک کو ایسے ہی ایک آدمی کی تلاش تھی۔ وہ مزمل آفندی کے دو کارنامے دیکھ چکا تھا۔ شمونہ کی ماں میمونہ کو حسن بن صباح کے قبضے سے آزاد کرا لایا تھا۔ داستان کو سنا چکا ہے کہ حسن بن صباح نے میمونہ کے خاوند کو ایسے طریقے سے قتل کروایا تھا کہ میمونہ کو ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا تھا۔ یہ مزمل آفندی کا جذبۂ ایثار تھا کہ وہ جان کی بازی لگا کر میمونہ کو حسن بن صباح کے بڑے ہی خطرناک اور ابلیسی فریب سے نکال لایا اور رے لا کر ابو مسلم رازی کے گھر پہنچا دیا تھا۔ معجزے جیسا اتفاق یہ ہوا کہ وہاں شمونہ کی بیٹی میمونہ مل گئی جو بچپن میں اغوا ہوئی تھی۔

مزمل آفندی کا دوسرا کارنامہ بھی کم قابلِ قدر نہ تھا۔ اس نے سلطان ملک شاہ کو بتایا تھا کہ حسن بن صباح ایک قافلے کے ساتھ اصفہان جا رہا ہے۔ سلطان ملک شاہ نے پانچ سو سوار بھیجے جن کی راہنمائی مزمل آفندی نے کی تھی، پھر تبریز کی لڑائی میں مزمل اس لڑائی میں اتنا زیادہ زخمی ہوا تھا کہ اس کا زندہ رہنا مشکوک تھا لیکن وہ اتنی دور سے اس حالت میں مرو سلطان ملک شاہ کے پاس پہنچا تھا کہ طبیب اور جراح دیکھ کر حیران رہ گئے تھے کہ یہ زندہ کیسے رہا۔

اب یہ مزمل آفندی ایک بار پھر اپنی جان کی بازی لگا رہا تھا۔ نظام الملک اُسے سلطان

لے گیا۔ سلطان نے اُسے اجازت دے دی۔

مزمل آفندی اس علاقے میں جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک شمونہ اُسے مل گئی۔ یہ دونوں رے میں ابو مسلم رازی کے ساتھ رہتی تھیں۔ جس روز اطلاع پہنچی تھی کہ مزمل شدید زخمی حالت میں مرو آیا ہے، اس روز شمونہ اس کے پاس پہنچنے کو تڑپ رہی تھی لیکن کسی مصلحت کی بنا پر اسے مزمل کے پاس نہیں جانے دیا جا رہا ہے۔ اب مزمل کی صحت یابی کی اطلاع ملی تو ابو مسلم رازی نے اونٹ پر پالکی بندھوا کر ماں بیٹی کو مرو بھیج دیا۔ محافظ دستے کے چند ایک سوار ساتھ بھیجے تھے۔

شمونہ پر مزمل کی محبت کا پاگل پن سوار تھا۔ وہ مزمل کو اتنی لمبی جدائی کے بعد دیکھ رہی تھی۔ اس کی جذباتی حالت اُس ماں جیسی تھی جسے اپنا گمشدہ بچہ خلافِ توقع مل گیا ہو۔ وہ اس کے زخموں کے نشان چوم رہی تھی۔

"میں پھر جا رہا ہوں شمونہ!" — مزمل نے کہا۔

"کہاں؟"

"تمہاری اور تمہاری ماں کی عصمت کا انتقام لینے!" — مزمل آفندی نے کہا اور بتایا کہ اُس کا مشن کیا ہے۔

"میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی" — شمونہ نے بے تکلفی سے کہا۔

"میرے لئے مشکل پیدا نہ کرو شمونہ!" — مزمل نے کہا — "تم حسن بن صباح کی دنیا سے بھاگی ہوئی ہو۔ وہاں فوراً پہچانی جاؤ گی"۔

"تم حسن بن صباح کی دنیا سے واقف نہیں مزمل!" — شمونہ نے کہا — "میں کوئی بھیس بدل لوں گی اور تمہاری راہنمائی کروں گی"۔

اس نے اتنی ضد کی کہ نظام الملک کو اطلاع دی گئی۔ اس نے شمونہ سے کہا کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان اپنی بیٹیوں کو نہ میدان میں اتارا کرتے ہیں نہ انہیں جاسوسی کے لئے استعمال کیا کرتے ہیں۔

"پھر ایک دو باتیں سن لو مزمل!" — شمونہ نے کہا — "کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔ باطنیوں کی نظریں انسان کے جسم کے اندر بھی چلی جایا کرتی ہیں۔ کسی پر اعتبار نہ کرنا۔ وہاں تمہیں مجھ جیسی کوئی لڑکی مل جائے اور تمہارے آگے روئے اور فریادیں

کرے کہ میں مظلوم ہوں' میری مدد کرو تو پتھر بن جانا۔ یہ بھی یاد رکھنا کہ وہاں پتھر بھی موم ہو جایا کرتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قتل کرنے سے پہلے خود قتل ہو جاؤ۔ ہم نے پارساؤں کو پانی بنا لیا ہے۔ وہ ابلیس کی ولایت ہے۔ وہاں اللہ والے راہ سے بے راہ ہو جاتے ہیں"۔

شمونہ نے اُسے اور بھی بہت سی ہدایات دیں' خطروں کی نشاندہی کی اور اُسے بتایا کہ وہ راتوں کو سوئے تو ایک آنکھ کھول کر سوئے۔

مزمل آفندی تین شب کے بعد مرو سے روانہ ہو گیا تھا۔ اُس نے داڑھی پہلے ہی بڑھا لی تھی۔ اس سے پہلے اس کی داڑھی سلیقے سے تراشی ہوئی ہوتی تھی جو اُس کے سفیدی مائل گندمی چہرے میں دلکشی پیدا کرتی تھی۔ اُس نے سر کے بال بھی بڑھا لئے اور کچھ دن پہلے ہی انہیں دھونا چھوڑ دیا تھا۔ سلطان کے تجربہ کار جاسوسوں نے اس کا بہروپ تیار کیا اور اُسے شتربان بنا دیا تھا جو اپنے اونٹ باربرداری اور سواری کے لئے کرائے پر دیتا تھا۔

○

وہ بڑی لمبی مسافت طے کر کے خلجان میں داخل ہوا۔ اُسے بتا دیا گیا تھا کہ خلجان جا کر کہاں جائے اور کس سے ملے۔ خلجان میں ایک آدمی تھا جو سلجوقیوں کے جاسوسوں کو اپنے پاس رکھتا تھا۔ وہ خود جاسوس نہیں تھا' جاسوسوں کی راہنمائی کرتا تھا۔ سلجوقی جاسوس اپنے دائیں ہاتھ کی درمیانی اور چھوٹی انگلی کے درمیان والی انگلی میں ایک خاص ساخت کی انگوٹھی ڈال کر رکھتے تھے۔ کسی جاسوس کو جب خفیہ طور پر پناہ دینے والا آدمی مل جاتا اور وہ جاسوس کو پہچان لیتا تو جاسوس انگوٹھی اتار کر چھپا لیتا تھا۔

مزمل آفندی خلجان میں داخل ہوا۔ حسن بن صباح مہدی علوی کے ساتھ الموت میں داخل ہوا۔

مہدی علوی کو حسن بن صباح نے رات اپنے ہاں مہمان رکھا تھا۔ خود اپنی سادگی اور درویشی کے دکھاوے کے لئے معمولی سے ایک خیمے میں چلا گیا تھا اور مہدی علوی کو اپنے شاہانہ خیمے میں ٹھہرایا اور اُس پر یہ ظاہر کیا تھا کہ یہ خیمہ اُس کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ خیمے میں پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ ان کی مہک خمار طاری کر رہی تھی۔

ان رنگا رنگ پھولوں میں ایک پھول اور بھی تھا جو چلتا پھرتا تھا' مسکراتا تھا' اس کا

عطر اور اُس کے رنگ پھولوں سے جُدا تھے۔ یہ تھی خدیجہ جسے حسن بن صباح نے ہدایات دے کر مہدی علوی کے ساتھ لگا دیا تھا۔ بظاہر خدیجہ کا کام یہ تھا کہ مہمان کی دیکھ بھال کرے۔ اُس کا بستر ٹھیک کر دے اور اُس کے پاس پانی رکھ دے اور اُس کے جسم کو اچھی طرح دبا کر باہر آ جائے پھر صبح اسے ناشتہ دے۔ لیکن خدیجہ کو کوئی اور ہی مقصد دیا گیا تھا۔

رات کھانے کے بعد حسن بن صباح مہدی علوی کو خیمے میں اکیلا چھوڑ کر اپنے خیمے میں چلا گیا تو خدیجہ مہدی علوی کے پاس آ گئی۔ اُس نے لباس ایسا پہن رکھا تھا جس میں اس کا جسم پوری طرح مستور نہیں تھا لیکن اس کی باتوں اور حرکات میں بے حیائی نہیں بلکہ شرم و حجاب تھا۔ مہدی علوی ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ بڑھاپے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس عمر میں آدمی بڑھاپے کو فریب دیا کرتا ہے کہ وہ ابھی جوان ہے۔ مہدی علوی تو ایک شہر کا امیر یعنی حاکم تھا' دولت میں کھیلتا تھا۔ اُس کی دو بیویاں تھیں لیکن حاکم شہر دو بیویوں سے مطمئن نہیں ہوا کرتے تھے۔ نت نئے غنچوں کے متلاشی رہتے تھے۔ داشتہ اُن کی زندگی کا لازمی جزو ہوتا تھا۔

خدیجہ کو دیکھ کر مہدی علوی نے اپنی جذباتی دنیا میں زلزلے کے جھٹکے محسوس کئے۔ خدیجہ کو معلوم تھا کہ مرد کو کوئی بات کئے بغیر کس طرح جال میں لایا جاتا ہے۔ وہ خیمے میں گلدستے اور دیگر اشیاء قرینے سے رکھ رہی تھی اور وہ جانتی تھی کہ مہدی علوی کی نظریں اس پر لگی ہوئی ہیں۔ وہ کوئی چیز اٹھا کر کہیں اور رکھنے کے لئے جھکتی تھی تو اُس کے جسم کا کوئی ذرا سا حصہ عریاں ہو جاتا تھا۔

"تم کون ہو؟" — مہدی علوی نے پوچھا۔

"خدیجہ!" — خدیجہ نے جھوٹ بولا — "بیوہ ہوں۔ خاوند تبریز کی لڑائی میں مارا گیا ہے..... میں امام کی خدمت کے لئے اس کے ساتھ رہتی ہوں"۔

"بیوی بن کر؟" — مہدی علوی نے پوچھا — "یا شادی کے بغیر ہی....."

"نہیں معزز مہمان!" — خدیجہ نے جواب دیا — "امام کسی عورت کے ساتھ ایسا تعلق نہیں رکھتا..... نہ بیوی نہ داشتہ..... امام تو آسمان کی مخلوق ہے۔ خوبصورت لڑکیوں کو ساتھ رکھتا ہے لیکن بالکل اس طرح جس طرح گلدانوں میں پھول رکھے ہوئے ہیں"۔

"تم بچہ ہو خدیجہ!" ــــ مہدی علوی نے کہا ــــ "جوان ہو اور اتنی حسین ہو کر میں نے تم جیسی خوبصورت لڑکی کم ہی کبھی دیکھی ہے۔ کیا تم مرد کے ساتھ کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں؟ تشنگی سی ..... اور میں کیا کہوں!"

خدیجہ نے شرمانے کی ایسی اداکاری کی جیسے زمین میں اُتر جانا چاہتی ہو۔ مہدی علوی نے اپنا سوال دہرایا تو خدیجہ نے سر کے ہلکے سے اشارے سے بتایا کہ مرد کے ساتھ کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔

"کیا میرا ساتھ پسند کرو گی؟" ــــ مہدی علوی نے کہا ــــ "تمہارے امام سے اجازت لے لوں گا۔ تمہیں بیوی نہیں ملکہ بناؤں گا..... میرے قریب آؤ۔ میرے پاس بیٹھو"۔

"میں آپ کو ایک خاص شربت پلاتی ہوں" ــــ خدیجہ نے کہا ــــ "یہ ہم اپنے بہت ہی خاص مہمانوں کو پلایا کرتے ہیں"۔

اُس نے ایک صراحی میں سے ایک پیالہ بھرا اور مہدی علوی کو پیش کیا۔ یہ شربت خاص طور پر خیمے میں رکھا گیا تھا۔ مہدی علوی نے شربت پی لیا اور خدیجہ کو اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے لیا۔ پھر جب شربت نے اپنا اثر دکھایا تو خدیجہ ایک طلسم بالکل بڑا ہی حسین آسیب بن کر مہدی علوی پر غالب آ گئی۔

خدیجہ جب آدھی رات سے کچھ پہلے خیمے سے نکلی تو اُس کا جسم ویسا ہی پاک نہ تھا جیسا اُس وقت تھا جس وقت وہ اُس خیمے میں داخل ہوئی تھی۔

صبح مہدی علوی کی آنکھ کھلی تو اُس نے سب سے پہلے خدیجہ کو پکارا..... اور اُسی روز وہ حسن بن صباح اور اس کے تمام آدمیوں کو اپنے ساتھ قلعہ الموت میں لے گیا۔ خدیجہ اور دوسری لڑکیاں بھی ساتھ تھیں۔

اِدھر مزمل آفندی خلجان میں داخل ہوا۔ اُسے بتا دیا گیا تھا کہ اُس آدمی کا گھر کہاں ہے جس کے ہاں اس نے قیام کرنا ہے۔ اُس کا نام احمد اوزال تھا۔ وہ سلجوقی تھا۔ مزمل نے تین چار آدمیوں سے اس کا گھر پوچھا۔ آخر اُس نے دو آدمیوں کو روکا اور اُن سے احمد اوزال کا گھر معلوم کیا۔ انہوں نے اسے صحیح راستے پر ڈال دیا۔ وہ چلا گیا تو ان دونوں میں سے ایک آدمی اُسے جاتے دیکھتا رہا۔

"شاید میں اس شخص کو جانتا ہوں" ــــ ایک نے کہا۔

"جانتے ہو گے" ــــ دوسرے نے کہا ــــ "مشتبہ ہے۔ کبھی تم نے اس کا ارنٹ استعمال کیا ہو گا"۔

"نہیں، یہ مشتبہ نہیں" ــــ پہلے آدمی نے کہا ــــ "اور اس نے جس کا گھر پوچھا ہے وہ بھی مشکوک آدمی ہے"۔

مزمل آفندی پہچانا گیا تھا اور وہ بے خبر تھا۔

رات کھانے کے بعد مزمل آفندی اور احمد اوزال الگ بیٹھ گئے۔

"اب بتاؤ مزمل!" — احمد اوزال نے پوچھا — "کیا تم کسی خاص مقصد کے لئے آئے ہو یا میری طرح جاسوسی کے لئے یہیں رہو گے؟"

"میں بہت بڑا مقصد لے کر آیا ہوں احمد بھائی!" — مزمل نے کہا — "حسن بن صباح کو قتل کرنا ہے یا اسے زندہ پکڑ کر سلطان ملک شاہ کے حوالے کرنا ہے"۔

"کیا تمہیں سلطان نے کہا ہے کہ یہ کام کرنا ہے؟" — احمد اوزال نے پوچھا۔

"ہاں احمد بھائی!" — مزمل نے جواب دیا — "سلطان نے کہا ہے اور وزیر نظام الملک نے بھی"۔

"نظام الملک نے بھی؟" — احمد اوزال نے حیرت سے کہا — "وہ دونوں اسے کوئی عام سا فریب کار اور شیطان فطرت انسان سمجھ رہے ہیں جسے وہ بڑی آسانی سے قتل کرا دیں گے"۔

"اسی لئے انہوں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے" — مزمل نے کہا — "مجھے بتاؤ کہ میں اسے کہاں اور کس طرح قتل کر سکتا ہوں۔ اگر تم اسے ناممکن سمجھتے ہو تو یہ بھی بتا دو۔ میں ناممکن کو ممکن کر کے دکھا دوں گا"۔

"تم جذبات کے غلبے میں بات کر رہے ہو مزمل!" — احمد اوزال نے کہا — "تم ناممکن کو ممکن نہیں بلکہ ممکن کو ناممکن بنا دو گے۔ سلطان اور نظام الملک حسن بن صباح کے ہاتھوں قتل ہو سکتے ہیں اسے قتل نہیں کروا سکتے.....

کچھ دن یہاں رہو' میں تمہیں الموت بھی لے جاؤں گا۔ خود ہی دیکھ لینا کہ تم کس طرح قتل کر سکتے ہو۔ ہم تین چار آدمی یہاں سے ہر چھوٹی بڑی خبر سلطان تک پہنچا رہے ہیں"۔

"ایک بات کہوں احمد؟" — مزمل نے کہا — "بُری لگے تو معاف کر دینا..... میرا خیال ہے تم سلطان کے تنخواہ دار ملازم ہو۔ تم اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ میں جذبہ لے کر آیا ہوں"۔

"اس میں بُری لگنے والی کوئی بات نہیں مزمل!" — احمد اوزال نے کہا — "بے شک ہم اس علاقے میں جو چند ایک آدمی جاسوسی کے لئے آئے ہیں' سب تنخواہ دار ملازم ہیں لیکن ہم رضاکارانہ طور پر آئے ہیں اور وہی جذبے لے کر آئے ہیں جس نے تمہیں یہاں آنے پر مجبور کیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمیں تجربہ کار استادوں نے جاسوسی کی تربیت دی تھی پھر ہمیں آزمائشوں میں ڈال کر پرکھا اور اُس وقت یہاں بھیجا جب انہوں نے اطمینان کر لیا کہ ہم اس کام کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ صرف جذبہ کچھ نہیں کر سکتا..... اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں مزمل! جس میں جذبہ نہیں وہ بھی کچھ نہیں کر سکتا"۔

"تم میری راہنمائی کرو گے احمد؟"

"کیوں نہیں کروں گا؟" — احمد اوزال نے کہا — "میں تمہیں الموت لے جاؤں گا۔ خود دیکھنا کہ حسن بن صباح تک قتل کے ارادے سے پہنچنا کس قدر دشوار اور خطرناک ہے۔ اس نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا لیکن لوگوں نے اسے نبی ماننا شروع کر دیا ہے۔ اس نے لوگوں سے کہا ہے کہ وہ انہیں دنیا میں جنت دکھا دے گا"۔

"یہ میں جانتا ہوں" — مزمل آفندی نے کہا — "اس نے اپنی شخصیت میں ابلیسی اوصاف پیدا کر لئے ہیں"۔

"ہاں!" — احمد اوزال نے کہا — "تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ انسانی فطرت کی کمزوریوں اور کبھی پوری نہ ہونے والی خواہشات کو اگر تسکین ملتی ہے تو وہ ابلیسی اوصاف سے ملتی ہے یا اُس انسان سے ملتی ہے جس نے اپنے آپ میں یہ اوصاف پیدا کر لئے ہوں۔ ابلیس کا بنیادی وصف ہے بندگانِ خدا کو خدا

اور رسولؐ کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹانا اور نفسانی لذت پرستی کا عادی بنا دینا"۔

"باتیں بہت ہو چکیں احمد بھائی!" — مزمل آفندی نے کہا — "اب کچھ کرنا ہے۔ اس ابلیس کا راستہ روکنا ہے۔ یہ صرف سلطان ملک شاہ کا مسئلہ نہیں' یہ ہر مسلمان کا مسئلہ ہے' یہ میرا اور تمہارا مسئلہ ہے' یہ دین اسلام کا مسئلہ ہے۔ میں حسن بن صباح پر دو وار کر چکا ہوں۔ اس کے قبضے سے ایک عورت کو آزاد کرایا تھا"۔

مزمل نے احمد اوزال کو سنایا کہ اس نے میمونہ کو کس طرح حسن بن صباح سے آزاد کرایا تھا۔ یہ بھی سنایا کہ اس نے کس طرح اس قافلے پر پانچ سو سواروں کا حملہ کروایا تھا جس قافلے کے ساتھ حسن بن صباح اصفہان جا رہا تھا۔

"میں اپنی جان کی قربانی دینے آیا ہوں احمد بھائی!" — مزمل نے کہا — "مجھے تمہارے پاس بھیجا گیا ہے۔ تم نے میری راہنمائی کرنی ہے۔ میں عہد کر کے آیا ہوں کہ زندہ اسی صورت میں واپس جاؤں گا کہ حسن بن صباح زندہ نہیں ہو گا۔ میں کامیاب لوٹنا چاہتا ہوں"۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں مزمل!" — احمد اوزال نے کہا — "میں تمہارا حوصلہ توڑ نہیں رہا' صرف خطروں سے آگاہ کر رہا ہوں۔ میں تمہیں چند دن اپنے پاس رکھ کر تمہاری تربیت کروں گا۔ جاسوسی اور تباہ کاری کے معاملے میں تم بالکل کورے ہو۔ تمہیں کچھ تو معلوم ہونا چاہیے۔ یہاں تمہیں اپنے دوستوں سے بھی ملوانا ہے ..... کل صبح باہر نکل جانا اور سارے شہر میں گھوم پھر کر یہاں کی گلیاں اور بازار بھی دیکھنا اور یہاں کے لوگوں کو بھی دیکھنا۔ یہ خیال رکھنا کہ کوئی تمہارے ساتھ علیک سلیک کرے تو اسے تپاک اور خندہ پیشانی سے ملنا ..... یہ بتاؤ کہ تم سے کوئی پوچھ لے کہاں سے آئے ہو اور کیوں آئے ہو تو کیا جواب دو گے؟"

"کہہ دوں گا بغداد سے آیا ہوں" — مزمل نے جواب دیا — "اصفہان کہہ دوں گا۔ میں نے بہت سفر کیا ہے اور بڑے بڑے شہروں سے واقف ہوں۔ یہاں

آنے کی وجہ سیر و سیاحت بتاؤں گا"۔

"یہ ٹھیک ہے" — احمد اوزال نے کہا — "تم عقل والے ہو۔ میں سوچتا تھا کہ تم مَرو' رے یا نیشاپور کہو گے۔ یہاں کسی کو پتہ نہ چلے کہ تمہارا سلطنتِ سلجوق کے ساتھ کوئی تعلق ہے ..... میرے متعلق دل میں کوئی غلط فہمی نہ رکھنا مزمل! میں مسلمان تو ہوں لیکن میں سلجوقی ہوں' ترک ہوں۔ اس سلطنت کی بنیادوں میں میرے آباؤ اجداد کا خون رچا بسا ہوا ہے۔ میں اس سلطنت کے ساتھ غداری نہیں کر سکتا۔ میں پہلے مسلمان ہوں پھر سلجوق ہوں۔ اس طرح اس سلطنت کے ساتھ میرے دو رشتے بنتے ہیں۔ مجھے تنخواہ دار ملازم نہ سمجھنا۔ میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گا تو بھی مجھے اپنے ساتھ سمجھنا ..... اور بہت ہی ضروری بات یہ ذہن میں رکھنا کہ اس شہر میں باطنیوں کے جاسوس بھی موجود ہیں۔ کہیں پکڑے نہ جانا"۔

○

اگلی صبح مزمل آفندی احمد اوزال کے گھر سے اس خیال سے نکلا کہ سارے شہر میں گھوم پھر کر شہر سے واقفیت حاصل کرے گا۔ گلی میں اسی کی عمر کا ایک آدمی ٹہل رہا تھا۔ مزمل نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ اسے صرف دیکھا اور ایک طرف نکل گیا۔ وہ اس شہر میں اجنبی تھا۔ گلیوں کے موڑ مڑتا گیا۔

ایک گلی سے مڑ کر ایک اور گلی میں داخل ہوا۔ ایک اور گلی اس گلی کے ساتھ ملتی تھی۔ مزمل نے اس آدمی کو جسے اس نے احمد اوزال کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا' اسے دوسری گلی میں آہستہ آہستہ چلتے دیکھا۔ اب کے مزمل نے اسے ذرا توجہ سے دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ کل اس نے اسی آدمی سے احمد اوزال کا گھر پوچھا تھا۔

مزمل بازار میں چلا گیا اور ایک دکان پر رک گیا۔ یہ خنجروں اور چھوٹی بڑی تلواروں کی دکان تھی۔ مزمل خنجر اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس نے دائیں طرف دیکھا۔ اگلی دکان پر وہی آدمی کھڑا مزمل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مزمل نے اسے دیکھا تو اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

اس کے بعد مزمل جدھر بھی گیا اس نے کچھ فاصلے پر اس آدمی کو دیکھا۔

دوپہر کے کھانے کے وقت مزمل واپس احمد اوزال کے گھر آیا اور اسے بتایا کہ ایک آدمی اس کا پیچھا کرتا رہا ہے۔

"میں نے اسی آدمی سے تمہارے گھر کا پتہ پوچھا تھا" — مزمل نے کہا۔

"یہ حسن بن صباح کا جاسوس ہے" — احمد اوزال نے کہا — "تم نے تین چار دن ابھی یہیں رہنا ہے۔ اس آدمی سے بچ کے رہنا۔ یہ تمہیں قتل نہیں کرے گا نہ تمہیں گرفتار کرے گا۔ یہ کسی وقت تمہیں ملے گا اور تمہیں دوست بنائے گا۔ اسے اچھی طرح ملنا لیکن ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے اسے شک ہو جائے۔ یہی بتانا کہ تم سفر پر ہو۔ میرے متعلق بتانا کہ میری تمہاری ملاقات حلب میں ہوئی تھی۔ تم گھومو پھرو۔ شہر سے باہر جنگل بھی دیکھنا۔ بہت خوبصورت علاقہ ہے۔ ایک ندی گذرتی ہے"۔

"ضرور جاؤں گا" — مزمل نے کہا — "قدرت کے حسن کا تو میں دلدادہ ہوں"۔

"نہیں مزمل!" — احمد اوزال نے کہا — "تم نے قدرت کے حسن میں کھو نہیں جانا بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ تمہیں اگر یہاں سے بھاگنا پڑے تو جنگل میں کہاں کہاں چھپتے ہوئے بھاگو گے...... یاد رکھو مزمل! جاسوس اور تباہ کار کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح رہنا ہوتا ہے"۔

احمد اوزال نے اسے اور بھی بہت سی ہدایات دیں۔ وہ مزمل کو باقاعدہ ٹریننگ دے رہا تھا۔

کھانے کے بعد مزمل پھر باہر نکل گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے توقع تھی کہ وہی آدمی پھر اسے نظر آئے گا لیکن وہ نظر نہ آیا۔ مزمل شہر سے نکل کر جنگل کی طرف ہو لیا۔ آگے اونچی نیچی ٹیکریاں تھیں جو سبز گھاس، خوبصورت جھاڑیوں اور درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ واقعی بہت خوبصورت علاقہ تھا۔

مزمل تنومند جوان آدمی تھا۔ ایسے روح افزا علاقے اسے بہت ہی اچھے لگتے تھے۔ وہ دو تین ٹیکریوں کے درمیان سے گزر کر آگے چلا گیا۔ اسے ندی نظر آئی۔ اس کے کناروں پر گھنے درخت تھے۔ ان کے پس منظر میں پہاڑی تھی۔ وہ بھی سبز پوش تھی۔ اس پر بادلوں کے سفید ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔

مزمل ندی کی طرف جا رہا تھا۔

○

اسے اپنے پیچھے ایسی سرسراہٹ سنائی دی جیسے کوئی خشک گھاس پر چل رہا ہو۔ اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسے یوں شک ہوا جیسے اس نے کسی جنگلی جانور یا کتے یا بلی کو ٹیکری کی اوٹ میں ہوتے دیکھا ہو۔ اسے وہم سمجھ کر وہ ندی تک پہنچ گیا اور کنارے پر ٹہلنے لگا۔ ندی کا جل ترنگ بجاتا ہوا شفاف پانی دلوں پر وجد طاری کر رہا تھا۔

مزمل کو یاد آیا کہ احمد اوزال نے اسے کہا تھا کہ قدرت کے حسن میں ہی نہ کھو جانا بلکہ وہاں چھپنے کی جگہیں دیکھنا...... اس نے ہر سو دیکھا۔ اسے جھاڑیوں کے اور اونچے اور گھنے پودوں کے جھرمٹ نظر آئے۔ بعض ٹیکریاں دیواروں جیسی تھیں۔ ان کے دامن میں ہاتھی گھاس بھی تھی اور ہرے سرکنڈے بھی۔ بعض گھنے درخت ایسے بھی تھے جن کے نیچے والے ٹہن زمین کے قریب آگئے تھے۔ مزمل کو خیال آیا کہ وہ ایسے کسی ٹہن پر چڑھ جائے گا اور چوڑے پتوں والی گھنی شاخیں اسے چھپا لیں گی۔

اسے ندی کے کنارے کے قریب تین چار درختوں کا جھنڈ دکھائی دیا۔ ان پر چوڑے پتوں والی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ یہ درختوں کے درمیان سے اٹھ رہی تھیں۔ ان بیلوں نے درختوں کے نیچے غار یا گف کی طرح کا کمرہ سا بنا رکھا تھا۔

مزمل ندی کے ساتھ ساتھ وہاں تک جانے کی بجائے چکر کاٹ کر عقب سے آگے گیا۔ اسے سامنے سے دیکھنے کو آگے ہوا تو وہ ٹھٹھک کر ایک قدم پیچھے ہو گیا۔ وہاں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ مزمل کو کسی آدمی سے کوئی ڈر اور خطرہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن یہ وہی آدمی تھا جو گلیوں اور بازار میں اس کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے مزمل نے اپنے پیچھے جو آہٹ اور سرسراہٹ سنی تھی وہ اسی آدمی کی تھی۔

اسے وہاں دیکھ کر مزمل فوراً سمجھ گیا کہ یہ شخص جنگل میں بھی اس کے پیچھے آگیا ہے۔ وہ غصے سے آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے اپنے کپڑوں کے اندر خنجر

اُڑس رکھا تھا۔ وہ آدمی اٹھ رہا تھا۔ مزمل نے بڑی تیزی سے خنجر نکال لیا۔ اس کے ذہن میں احمد اوزال کے الفاظ گونجے — "یہ حسن بن صباح کا جاسوس ہے" — مزمل کو یوں سنائی دیا جیسے اسے کسی نے کہا ہو — "یہ حسن بن صباح ہے"۔

وہ آدمی اٹھا ہی تھا کہ مزمل کا بایاں ہاتھ تیر کی طرح آگے ہُوا اور اس ہاتھ نے اس آدمی کی گردن دبوچ لی۔ مزمل کے دوسرے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اس کے خنجر کی نوک اس شخص کے دل کے مقام پر رکھ دی۔ بائیں ہاتھ کا پنجہ اتنی زور سے دبایا کہ اس آدمی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے مزمل کی بائیں کلائی پکڑ لی اور تڑپنے لگا۔ اس میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ مزمل کے پنجے سے اپنی گردن چھڑوا سکتا۔ اس نے دم گھٹنے سے مر جانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مزمل کے خنجر کی نوک اس کے دل کے مقام پر چبھ رہی تھی۔

مزمل اسے جان سے مار سکتا تھا لیکن اسے خیال آگیا کہ اس سے یہ تو پوچھ لے کہ وہ کون ہے اور چاہتا کیا ہے اور اگر وہ حسن بن صباح کے باطنی فرقے کا جاسوس ہے تو اس سے راز کی کچھ باتیں پوچھ لے..... یہ خیال آتے ہی اس نے اس شخص کی ٹانگوں کے پیچھے اپنی ایک ٹانگ کر کے بائیں ہاتھ سے ایسا دھکا دیا کہ وہ آدمی پیٹھ کے بل گرا۔ مزمل کود کر اس کے پیٹ پر بیٹھ گیا اور خنجر کی نوک اس کی شہ رگ پر رکھ دی۔

"کیا چاہتے ہو؟" — مزمل نے پوچھا — "میرے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہو؟"

"میں بتا نہیں سکتا" — اس نے کہا — "بتایا تو تم مجھے قتل کر دو گے"۔

"قتل تو میں تمہیں کر ہی دوں گا" — مزمل نے کہا — "سچ بول دو گے تو شاید میں تمہیں چھوڑ دوں"۔

"اس وقت میری جان تمہارے ہاتھ میں ہے" — اس نے کہا — "اس لئے میں تمہیں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وعدہ کرو تم کسی کو بتاؤ گے نہیں"۔

"سچ بولو گے تو جو وعدہ چاہو گے پورا کروں گا" — مزمل نے کہا۔

"میں نے تمہیں قتل کرنا تھا" — اس شخص نے کہا — "لیکن ایک بات کا یقین کرنا تھا"۔

"میرا قصور؟"

"تم باطنیوں کے جاسوس ہو" — اس آدمی نے کہا — "تم حسن بن صباح کے اُس گروہ کے آدمی ہو جو بڑے لوگوں کو قتل کرتے ہیں' اور میں حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے گھر سے نکلا ہوں..... تم نے کہا تھا سچ بولو۔ میں نے سچ بول دیا ہے۔ اب چاہو تو مجھے قتل کر دو"۔

"تمہیں کس نے بتایا ہے میں حسن بن صباح کے قاتل گروہ کا آدمی ہوں؟" — مزمل آفندی نے پوچھا۔

"کل تم نے مجھ سے احمد اوزال کا گھر پوچھا تھا" — اس نے جواب دیا — "میرے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ اس نے تمہارے متعلق کہا تھا کہ اسے شک ہے کہ تم باطنی ہو اور شاید تم قاتل گروہ کے آدمی ہو۔ میں یہی معلوم کرنے کے لئے تمہارے پیچھے پھر رہا تھا۔ شک صحیح ہونے کی صورت میں میں نے تمہیں قتل کرنا تھا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ حسن بن صباح کے پیشہ ور صرف ایک قاتل کو قتل کرنے کا اتنا ہی ثواب ملتا ہے جیسے تم نے حسن بن صباح کو قتل کر دیا..... بے شک اس وقت میری جان تمہارے قبضۂ اختیار میں ہے لیکن تم میں مردانگی ہے تو تم بھی سچ بتا دو کہ تم پر میرا جو شک ہے یہ صحیح ہے یا غلط؟"

"کم عقل انسان!" — مزمل نے کہا — "اگر تمہارا شک صحیح ہوتا تو اب تک میرا خنجر تمہاری شہ رگ کاٹ چکا ہوتا"۔

مزمل آفندی نے اس کی شہ رگ سے خنجر ہٹا لیا پھر اس کے پیٹ سے اُتر کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ آدمی اٹھ بیٹھا۔

"کون سے فرقے سے تعلق رکھتے ہو؟" — مزمل نے اس سے پوچھا — "نام کیا ہے تمہارا؟"

"اہل سنت ہوں" — اس نے جواب دیا — "عبید ابن عابد میرا نام ہے۔ سب مجھے بن عابد کہتے ہیں"۔

"حسن بن صباح قلعہ الموت میں ہے" ـــــ مزمل نے کہا ـــــ "اور تم یہاں قلجان میں اُسے کس طرح قتل کرو گے؟"

"دیکھو میرے دوست!" ـــــ بن عابد نے کہا ـــــ "میں نے تمہیں اپنا راز دے دیا ہے۔ اب اور زیادہ بھید لینے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارا خنجر میرے دل پر اور شہ رگ تمہارے پنجے میں آگئی تھی اور میں بے بس ہو گیا تھا۔ اب تمہارے ہاتھ میں خنجر ہے اور میں خالی ہاتھ ہوں۔ مجھ پر حملہ کر کے دیکھو۔ میں استادوں سے خالی ہاتھ لڑنے اور قتل کرنے کی تربیت لے کر آیا ہوں۔ میں کوئی گیا گزرا آدمی نہیں ہوں۔ میرے آباؤ اجداد ثقفی تھے۔ مجھے تم پر شک ہے کہ تم کسی اور فرقے کے آدمی ہو"۔

"میں اہلِ سُنت ہوں بن عابد!" ـــــ مزمل نے کہا ـــــ "میرے دادا اصفہان میں آباد ہو گئے تھے...... میں تم سے ایک خاص مقصد کے لئے پوچھ رہا ہوں کہ حسن بن صباح کو کس طرح قتل کرو گے!"

"یہ کام ایک آدمی کا نہیں" ـــــ بن عابد نے کہا ـــــ "مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ میں اسی مقصد کے لئے قلجان میں رکا ہُوا ہوں۔ میں حیران ہوں کہ ایک سے بڑھ کر ایک دلیر آدمی موجود ہے۔ جذبے والے بھی موجود ہیں۔ یہ وہ پکے مسلمان ہیں جو حسن بن صباح کا نام سنتے ہیں تو تھوک دیتے ہیں لیکن حسن بن صباح کے قتل کے لئے کوئی بھی تیار نہیں ہوتا"۔

"وجہ کیا ہے؟"

"بزدلی!" ـــــ بن عابد نے جواب دیا ـــــ "کہتے ہیں وہاں جا کر بندہ خود قتل ہو جاتا ہے۔ حسن بن صباح کو قتل نہیں کیا جا سکتا"۔

"تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟"

"میرے بھائی!" ـــــ بن عابد نے جواب دیا ـــــ "میرا اپنا کوئی خیال نہیں، مسلمان جو کچھ کرتا ہے اللہ کے حکم سے کرتا ہے، اس کا اپنا کوئی خیال نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وہ اللہ کی راہ میں جان قربان کر دیا کرتا ہے..... اگر دو دنوں تک مجھے کوئی ساتھی نہ ملا تو میں اکیلا قلعہ الموت چلا جاؤں گا پھر دیکھوں گا کون قتل ہوتا ہے..... میں یا حسن بن صباح؟"

کہتے بن عابد بولتا چلا گیا اور اس کا لہجہ پہلے سے زیادہ جذباتی ہو گیا۔ ایک جذبہ سا تھا جو مزمل آفندی پر طاری ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اسے ایک ایسا آدمی مل گیا تھا جو اس کا صرف ہم خیال ہی نہیں تھا بلکہ وہ بھی وہی عزم لے کر گھر سے نکلا تھا جو مزمل کو اتنی دور سے یہاں لے آیا تھا۔

"اگر میں کہوں کہ میں بھی اسی ارادے سے یہاں آیا ہوں" ـــــ مزمل نے کہا ـــــ "تو مان لو گے؟"

"نہیں!" ـــــ بن عابد نے کہا ـــــ "میں پچھتا رہا ہوں کہ تمہیں اپنا راز دے رہا ہے۔ مجھے تم پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے تھا"۔

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں بن عابد!" ـــــ مزمل نے کہا ـــــ "یوں سمجھو کہ تم جس ساتھی کی تلاش میں ہو وہ تمہیں مل گیا ہے"۔

مزمل اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ اس نے خنجر اپنے سامنے زمین پر رکھ دیا۔ وہ بن عابد کے سامنے بیٹھا ہُوا تھا۔ بن عابد نے بڑے آرام سے خنجر اٹھا لیا اور اسے دیکھنے لگا جیسے بچہ کوئی چیز اپنے ہاتھوں میں لے کر اشتیاق سے دیکھا کرتا ہے۔ بن عابد پہلے سے زیادہ جذباتی لہجے میں بول بھی رہا تھا۔

وہ بیٹھے بیٹھے اچانک اچھلا اور مزمل پر جا پڑا۔ مزمل اس اچانک حملے سے پیٹھ کے بل گرا۔ بن عابد اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور خنجر کی نوک اس کی شہ رگ پر رکھ دی۔

"اب بتا تو کون ہے باطنی مردود؟" ـــــ بن عابد نے کہا ـــــ "تو اُن باطنیوں کا جاسوس ہے۔ تو حسن بن صباح ابلیس کے خاص گروہ کا آدمی ہے۔ میں نے تجھے اپنا راز دے دیا ہے۔ تجھے میں زندہ کیسے رہنے دوں؟"

مزمل منت سماجت کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا؟ وہ قسمیں کھا کھا کر یقین دلا رہا تھا کہ وہ راسخ العقیدہ مسلمان ہے اور وہ حسن بن صباح کے قتل کے ارادے سے آیا ہے۔ بن عابد مان نہیں رہا تھا۔

"پھر یوں کرو" ـــــ بن عابد بڑی ہی مشکل سے مانا اور شرط یہ بتائی ـــــ "میرے ساتھ وہاں چلو جہاں میں رہتا ہوں"۔

بن عابد اس کے سینے سے ہٹ گیا اور مزمل اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میں اپنے دوست احمد اوزال کے ہاں ہی کیوں نہ رہوں؟" — مزمل نے کہا — "الموت تمہارے ساتھ چلوں گا"۔

"نہیں!" — بن عابد نے کہا — "میں تمہیں اس لئے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں کہ مجھے مکمل طور پر یقین کرنا ہے کہ تم قابلِ اعتماد ہو..... اور تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ احمد اوزال ٹھیک آدمی نہیں۔ میں جانتا ہوں وہ سلجوقی ہے اور شاید سلجوقی سلطان کے لئے جاسوسی بھی کرتا ہے۔ میرے یہاں کے دوستوں کو شک ہے کہ وہ باطنیوں کا بھی وفادار ہے..... دوغلا آدمی ہے..... تمہیں اس نے کیا کہا ہے؟"

"میں نے اسے بتا دیا ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں" — مزمل نے جواب دیا — "اس نے کہا ہے کہ وہ الموت تک میرے ساتھ چلے گا اور میری راہنمائی کرے گا"۔

"بچو میرے دوست!" — بن عابد نے کہا — "یہ تمہیں الموت لے جا کر مروائے گا..... تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا..... میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ ہمارے پاس رہنے کی تم پر پابندی نہیں۔ میرے دوستوں سے ملو گے اور ان کی باتیں سنو گے تو خود محسوس کرو گے کہ تمہیں ہمارے پاس ہی رہنا چاہئے۔ اس صورت میں ہم تمہارے دوست کو پتہ نہیں چلنے دیں گے"۔

مزمل آفندی پر خاموشی طاری ہو گئی۔ اس کا ذہن الجھ گیا۔ وہ بن عابد کے ساتھ چل پڑا۔ اسے چلتے چلتے خیال آیا کہ احمد اوزال کو تو وہ جانتا ہی نہیں تھا۔ اس کے پاس آئے ابھی ایک رات ہی گزری اور اگلا دن گزر رہا تھا۔

○

عبید ابن عابد اسے ایک گھر میں لے گیا جہاں دو آدمی موجود تھے۔ وہ اٹھ کر بڑے تپاک سے مزمل سے ملے۔ بن عابد نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ مزمل بھی اسی مشن پر آیا ہے جو مشن عابد کا ہے۔ ان دونوں آدمیوں نے مزمل کے ساتھ وہی باتیں کیں جو بن عابد نے کی تھیں۔ مزمل نے انہیں بھی یقین دلانے کی کوشش کی کہ باطنیوں کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔

"مزمل آفندی!" — ایک آدمی نے کہا — "تم قرآن ہاتھوں پر اٹھا کر

قسم کھا سکتے ہو۔ مسجد میں جا کر بھی قسم کھا سکتے ہو لیکن یہ کوئی ثبوت نہیں ہو گا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو یہ سچ ہے۔ میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو زندہ نہیں رہو گے۔ دنیا کے کسی بھی گوشے میں چلے جاؤ گے، تمہیں قتل کرنے کے لئے ہمارا ایک آدمی وہاں پہنچ جائے گا..... اگر تم اسلام کے ساتھ مخلص اور دیانتدار ہو تو ہمارے پاس رہو..... اب چونکہ ہم نے ایک دوسرے کو اپنا اپنا راز دے دیا ہے اس لئے یہ بھی بتا دو کہ تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟"

"سلطان ملک شاہ کے وزیر نظام الملک نے!" — مزمل نے صحیح بات بتا دی — "انہوں نے ہی کہا تھا کہ خلجان جا کر احمد اوزال کا گھر پوچھ لینا اور اسے بتانا کہ تمہیں ہم نے بھیجا ہے، پھر اسے بتانا کہ تم کیوں آئے ہو۔ وہ تمہارا ساتھ دے گا"۔

"ہمیں عابد نے تمہیں بتایا ہو گا" — اس آدمی نے کہا — "احمد اوزال قابلِ اعتماد آدمی نہیں۔ اگر یہ تمہیں پکڑوا دے گا تو ہم حیران نہیں ہوں گے۔ ہمیں بن عابد کے لئے ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ ہم تو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہماری مدد کی ہے کہ تمہیں بھیج دیا ہے، اور یہ بھی اللہ کی ہی مدد ہے کہ تم ہمیں مل گئے اور ہم نے تمہیں احمد اوزال سے بچا لیا"۔

"تم ایک بات ضرور سوچو گے" — دوسرے آدمی نے کہا — "تم پوچھ سکتے ہو کہ ہم میں سے کوئی بن عابد کے ساتھ کیوں نہیں گیا؟"

"یہ تو میں ضرور پوچھوں گا" — مزمل نے کہا۔

"جواب پر غور کرنا مزمل!" — اس آدمی نے کہا — "اگر ہم بن عابد کے ساتھ چلے گئے تو پیچھے ہمارے محاذ کو چلانے والا کوئی نہیں رہے گا۔ ہمارے محاذ میں کچھ آدمی اور بھی ہیں لیکن وہ اتنے بڑے خطرے میں جانے کے قابل نہیں اور وہ جانے سے ڈرتے بھی ہیں"۔

"میں ڈرنے والوں میں سے نہیں" — مزمل نے کہا — "لیکن میں یہ یقین کس طرح کروں کہ تم لوگ مجھے دھوکہ نہیں دے رہے؟"

"یہی سوال ہم تم سے پوچھنا چاہتے ہیں" — اس آدمی نے کہا — "ہم

کس طرح اعتبار کر سکتے ہیں کہ تم ہمیں دھوکہ نہیں دو گے؟"

اس مسئلے پر باتیں شروع ہوئیں تو مزمل آفندی کو یقین آگیا کہ یہ لوگ قابلِ اعتماد ہیں اور اس نے انہیں یقین دلا دیا کہ وہ بھی قابلِ اعتماد ہے۔ اس کا اس نے یہ ثبوت پیش کیا کہ اپنا فیصلہ سنا دیا کہ وہ احمد اوزال کے پاس نہیں جائے گا۔

اس جماعت کا جو سردار بنا ہوا تھا، اس نے فیصلہ کیا کہ آج ہی رات بن عابد اور مزمل قلعہ الموت کو روانہ ہو جائیں۔

"تمہارے دو آدمی وہاں بھی موجود ہیں مزمل!" — سردار نے کہا — "بن عابد کو معلوم ہے۔ وہ بڑی اچھی اور محفوظ پناہ ہے۔ تمہیں کسی بہروپ کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ خیال رکھنا کہ کوئی تم سے پوچھے کہ تم کون ہو تو کہنا، میں امام کا شیدائی ہوں۔ کسی کے ساتھ حسن بن صباح کے خلاف کوئی بات نہ کرنا"۔

"قتل کس طرح کریں گے؟" — مزمل نے پوچھا۔

"یہ تم نے وہاں جا کر دیکھنا ہے" — سردار نے کہا — "ویسے اس تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ وہ لوگوں کے سامنے آتا ہے لیکن لوگوں کے درمیان یعنی قریب نہیں آتا۔ تم دونوں یوں کرنا کہ اس کے محافظوں تک پہنچ جانا اور رو رو کر، تڑپ تڑپ کر منت سماجت کرنا کہ تم امام کے ہاتھ چومنے کے لئے اصفہان سے آئے ہو..... اگر تمہیں اجازت مل جائے تو خنجر تمہارے پاس ہوں گے۔ یہ سوچ لو کہ اسے تو قتل کر دو گے لیکن خود وہاں سے زندہ نہیں نکل سکو گے۔ دوسرا طریقہ تیر ہے۔ حسن بن صباح کبھی کبھی باہر نکلا کرتا ہے۔ یہ تم نے دیکھنا ہے کہ اس پر کمان سے تیر چلا سکتے ہو۔ اس صورت میں تمہیں بھاگ نکلنے کا موقع مل سکتا ہے"۔

"میرا مقصد اسے قتل کرنا ہے" — مزمل نے کہا — "بھاگ سکے تو بھاگ آئیں گے ورنہ بھاگنا میرا مقصد نہیں"۔

"یہ ہوئی ناں بات!" — بن عابد نے کہا — "ایسا ساتھی مجھے کہاں مل سکتا تھا!"

○

سورج غروب ہو گیا تو احمد اوزال مزمل کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا اور پریشان ہو گیا۔ اس نے مزمل سے کہا بھی تھا کہ غروب آفتاب سے پہلے واپس آجائے۔ وہ وہاں اجنبی تھا۔ کہیں گھر کا رستہ نہ بھول گیا ہو۔ احمد اوزال کو یہ خطرہ بھی نظر آرہا تھا کہ مزمل جاسوسی کی اونچ نیچ اور خطروں سے بالکل ہی واقف نہیں تھا، کسی باطنی کے جال میں نہ آگیا ہو۔

احمد اوزال گھر سے نکلا اور گلیوں میں گھومنے پھرنے لگا۔ بازار بھی چھان مارا۔ واپس گھر آیا۔ مزمل واپس نہیں آیا تھا۔ احمد اوزال اپنے ایک ساتھی کے گھر گیا اور اسے مزمل کے متعلق بتایا۔ یہ شخص بھی سلجوقیوں کا جاسوس تھا۔

"یہ تمہاری غلطی ہے احمد!" — اس کے ساتھی نے کہا — "تم نے یہ آدمی مجھے دکھایا ہی نہیں۔ میں اسے کہاں ڈھونڈ سکتا ہوں؟"۔

"کل شام ہی مرو سے آیا تھا" — احمد اوزال نے کہا — "میں نے آج رات اسے تمہارے پاس لانا تھا"۔

"وہ بچہ تو نہیں کہ رستہ بھول گیا ہو گا" — اس آدمی نے کہا — "تم جانتے ہو خلجان حسن بن صباح کے ان آدمیوں سے بھرا پڑا ہے جو مخالفوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ وہ اتنے ماہر ہیں کہ اجنبی کا چہرہ دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ یہ شخص مشکوک ہے یا بے ضرر ہے۔ مجھے تو یہی نظر آرہا ہے کہ ہمارا یہ مہمان اسی جال میں آگیا ہے۔ اصل خطرہ یہ ہے کہ وہ تمہاری نشاندہی کر دے گا"۔

"میں وزیراعظم نظام الملک کو کیا جواب دوں!" — احمد اوزال نے کہا — "انہوں نے اسے میرے پاس بھیجا تھا"۔

"صرف کل شام تک انتظار کرو" — احمد کے ساتھی نے کہا — "اگر وہ نہ آیا تو رات کو ہی نکل جانا۔ مرو جا کر سلطان کو بتانا کہ آپ کا بھیجا ہوا آدمی لاپتہ ہو گیا ہے"۔

"سلطان کیا کرے گا؟" — احمد اوزال نے کہا — "جاسوسی کا نظام وزیراعظم نظام الملک نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ اس شخص کو بھی اسی نے بھیجا ہے۔ یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ اس آدمی میں عقل کی باریکی بھی ہے یا نہیں۔

اس کی صرف جذباتی باتیں سنیں اور اسے بھیج دیا حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے"۔

"وزیرِاعظم کو یہی بتانا" — اس کے ساتھی نے کہا — "انہیں کہنا کہ اس قسم کے اناڑیوں کو نہ بھیجا کریں۔ یہ ہمیں بھی پکڑوائیں گے..... تمہیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ اس نے جذبات میں آکر غیر دانستہ طور پر تمہاری نشاندہی کر دی ہو"۔

احمد اوزال پھر بھاگم بھاگ اپنے گھر اس توقع پر گیا کہ مزمل شاید آگیا ہو لیکن مزمل نہیں آیا تھا۔ اب اس نے اس حقیقت کو قبول کر لیا کہ مزمل کا پتہ ہو گیا ہے۔ اسے اپنے ساتھی کا مشورہ دانشمندانہ لگا کہ اسے خلجان سے نکل جانا چاہئے۔

رات کے اُس وقت جب احمد اوزال مزمل آفندی کے لئے پریشان ہو رہا تھا اور جب اسے یہ خطرہ اور پریشان کر رہا تھا کہ مزمل نے بھولے پن میں اس کی نشاندہی کر دی ہو گی' اُس وقت دو گھوڑے شہر سے نکلے۔ ایک پر بن عابد اور دوسرے پر مزمل آفندی سوار تھا۔ شہر سے نکل کر انہوں نے قلعہ الموت کا رخ کر لیا۔

ان کے ساتھ بن عابد کے وہ دو ساتھی تھے جن کے ہاں بن عابد مزمل کو لے گیا تھا اور انہوں نے مزمل کو قائل کر لیا تھا کہ وہ احمد اوزال کے پاس نہ جائے.. ... یہ دونوں شہر کے باہر تک بن عابد اور مزمل کے ساتھ گئے تھے اور انہیں دعاؤں سے رخصت کیا تھا۔

"اللہ تمہیں امان میں رکھے" — ایک نے کہا تھا۔

"اللہ تمہیں کامیاب واپس لائے گا" — دوسرے نے کہا تھا۔

گھوڑے رات کی تاریکی میں تحلیل ہو گئے تو یہ دونوں واپس آگئے۔

"ایک تو ہاتھ آگیا" — ان میں سے ایک نے جو اس خفیہ جماعت کا سردار تھا' اپنے ساتھی سے کہا — "اب بتاؤ عمر! اُسے ابھی پکڑ لیں؟"

"احمد اوزال کو؟" — عمر نے پوچھا اور خود ہی جواب دیا — "اس کے متعلق کوئی شک تو رہا نہیں۔ یہ شخص مزمل سارے شک صحیح ثابت کر گیا ہے.. ایک بات بتاؤ شمس! کیا ہم دو آدمی اسے پکڑنے کے لئے کافی ہیں؟"

"کیوں نہیں؟" — شمس نے کہا — "وہ اکیلا رہتا ہے۔ ذرا عقل سے کام لو۔ وہ اپنے اس مہمان مزمل کے لئے پریشان ہو گا کہ وہ کہاں گیا۔ ہم یہ ذہن میں رکھ کر اس کے گھر میں داخل ہو سکیں گے"۔

"رات اسے اپنے گھر باندھ کر رکھیں گے" — عمر نے کہا۔

"اور کل رات اسے یہاں سے لے جائیں گے" — شمس نے کہا — "اور امام کے حوالے کر کے کہیں گے' لو' ایک اور سلجوقی جاسوس آگیا ہے.... کام الموت پہنچ گیا ہے"۔

○

احمد اوزال مزمل آفندی کے متعلق سوچتا' پریشانی کے عالم میں ابھی ابھی سویا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کی آنکھ پہلی دستک پر ہی کھل گئی۔ وہ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ذرا بلند آواز سے کہا — "اللہ کرے مزمل ہو" — اس نے دیا جلایا۔ دیا ہاتھ میں لے کر صحن میں نکلا اور دروازہ کھولا۔ دو آدمی اسے دھکیلتے ہوئے اندر آگئے۔ ایک شمس تھا اور دوسرا عمر۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے خنجر تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ احمد اوزال اکیلا رہتا ہے۔ انہیں شک تھا کہ یہ شخص سلجوقی ہے اور سلطنتِ سلجوق کا جاسوس ہے لیکن مزمل نے ان لوگوں کے شک کی تصدیق کر دی تھی۔

احمد اوزال کے دونوں پہلوؤں کے ساتھ خنجروں کی نوکیں لگی ہوئی تھیں جو اسے چبھ رہی تھیں۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑے سائز کا جلتا ہُوا دیا تھا۔ دیا آدھے سے کچھ زیادہ تیل سے بھرا ہُوا تھا۔

"تم چاہتے کیا ہو؟" — احمد اوزال نے پوچھا۔

"خاموشی سے اندر چلے چلو" — شمس نے کہا — "اندر چل کے بتائیں گے"۔

وہ اسے خنجر کی نوکوں سے دھکیلتے اندر لے گئے۔ شمس نے دروازہ بند کر دیا۔

"تمہارے پاس سونا ضرور ہو گا" — شمس نے کہا — "وہ اور نقدی

ہمارے حوالے کر دو"۔

"یوں کہو کہ تم ڈاکو ہو" — احمد اوزال نے کہا — "خنجر ہٹاؤ۔ میرے پاس سونے کے تین ٹکڑے اور کچھ نقدی ہے' وہ میں تمہیں دے رہا ہوں۔ وہ لو اور جاؤ"۔

"ہم تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے" — شمس نے کہا — "ہمیں دراصل ضرورت تو تمہاری ہے"۔

"مجھے ساتھ لے جا کر کیا کرو گے؟" — احمد اوزال نے پوچھا۔

"کیا فضول باتیں شروع کر دی ہیں شمس؟" — عمر نے کہا — "ختم کر اس سلجوقی جاسوس کو۔ اس کا مال اسباب ہمارا ہی ہے۔ لو ادھر سے تم خنجر کھاؤ ادھر سے میں لگاتا ہوں"۔

"اگر یہ بتا دے کہ خلجان میں اس کے کتنے ساتھی ہیں تو اسے زندہ رہنے دیں گے" — شمس نے کہا — "یہ بھی بتا دے وہ کہاں کہاں رہتے ہیں"۔

احمد اوزال سمجھ گیا کہ یہ حسن بن صباح کے آدمی ہیں اور انہیں پتہ چل گیا ہے کہ وہ جاسوس ہے۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ مزمل آفندی کسی طرح ان کے ہاتھ چڑھ گیا ہے اور اس نے بھانڈہ پھوڑ دیا ہے۔ اسے یہ تو معلوم ہی تھا کہ حسن بن صباح نے جانبازوں کے گروہ بنا رکھے ہیں جو درندوں سے بڑھ کر ہیں' کم نہیں اور ان کے اندر انسانی جذبات ہیں ہی نہیں۔ وہ ان دو آدمیوں سے رحم اور مفاہمت کی توقع رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ قتل کرنا ہی جانتے تھے لیکن ایسے رحم دل نہیں تھے کہ فوراً" مار ڈالتے' وہ بڑی ظالمانہ ایذارسانی سے جان نکالتے تھے۔

احمد بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔

"اس شہر میں تمہارے ساتھی کہاں کہاں رہتے ہیں؟" — عمر نے پوچھا — "ان کے نام اور گھر فوراً" بتا دو...... یہ دیا رکھ دو"۔

احمد اوزال نے دیا اوپر کی طرف سے شمس کے منہ پر مارا اور حیران کن پھرتی سے پہلو بدل کر لات اتنی زور سے عمر کے پیٹ میں ناف کے نیچے ماری کہ عمر کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا اور وہ ناف کے نیچے ہاتھ رکھ کر آگے کو جھک گیا۔

احمد اوزال نے بڑی تیزی سے خنجر اٹھا لیا اور جھکے ہوئے عمر کی پیٹھ میں اتنی زور سے گھونپ دیا کہ خنجر کا صرف دستہ باہر رہ گیا۔ احمد نے فوراً" خنجر باہر نکالا۔ دوسرا وار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ عمر گر پڑا تھا۔

احمد اوزال نے دیا شمس کے منہ پر مارا تھا۔ اس سے کمرے میں اندھیرا ہو جانا چاہئے تھا لیکن کمرہ پہلے سے زیادہ روشن ہو گیا تھا کیونکہ دیا خاصا بڑا تھا اور آدھے سے کچھ زیادہ تیل سے بھرا ہوا تھا اور اس کی بتی خاصی موٹی تھی۔ تیل شمس کی آنکھوں میں چلا گیا اور اس کے چہرے سے تیل اس کے کپڑوں پر گرا تھا۔ اس کی ڈیڑھ دو انچ لمبی داڑھی تھی۔ اتنے بڑے شعلے والی جلتی بتی نے اس کی داڑھی کو آگ لگا دی۔ وہاں سے آگ پلک جھپکتے کپڑوں کو لگی۔

شمس کے ہاتھ سے بھی خنجر گر پڑا اور وہ چیخنے لگا۔ احمد اوزال کے ہاتھ میں عمر کا خنجر تھا۔ اس نے شمس کے ایک پہلو میں خنجر گھونپا اور زور سے دوسرے پہلو کی طرف جھٹکا دیا۔ شمس کا پیٹ چاک ہو گیا اور انتڑیاں باہر آ گئیں۔ شمس گرا۔ اس کے کپڑوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔ پیٹ چاک ہوا تو اس کی چیخیں بند ہو گئیں۔ وہ بہت تڑپا اور ختم ہو گیا۔

یہ سارا عمل چند سیکنڈ میں ہو گیا۔

احمد اوزال نے بڑی تیزی سے اپنی قیمتی چیزیں ایک گٹھڑی میں باندھیں۔ تلوار کمر سے باندھی اور شمس کی لاش کو جلتا چھوڑ کر صحن میں نکلا۔ دروازہ بند کر دیا اور زین اٹھا کر اپنے گھوڑے پر کسی۔ گٹھڑی زین کے ساتھ باندھی اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے دوست کے گھر پہنچا۔ دستک دی۔ دوست باہر آیا تو احمد اوزال نے اسے سارا واقعہ سنایا۔

"میں فرار ہو رہا ہوں" — اس نے کہا۔

"فوراً" نکلو" — دوست نے کہا — "صبح تک بہت ہی دور نکل جانا"۔

"مزمل آفندی کا کچھ پتہ نہیں چلا" — احمد اوزال نے کہا — "وہ باطنیوں کے قبضے میں آ گیا ہے۔ میری نشاندہی اسی نے کی ہے"۔

"جس نے بھی کی ہے" — دوست نے کہا — "اور جو کچھ بھی ہوا ہے' تم یہاں سے نکلو۔ تم خوش قسمت ہو کہ حسن بن صباح کے دو آدمیوں کو

قتل کر کے جا رہے ہو۔ اس کے جانباز قتل کیا کرتے ہیں قتل ہُوا نہیں کرتے"۔

احمد اوزال خدا حافظ کہہ کر روانہ ہو گیا۔ شہر سے وہ آہستہ آہستہ نکلا۔ کچھ دور جا کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

○

امیرِ الموت مہدی علوی حسن بن صباح اور اس کے تمام آدمیوں کو الموت لے گیا۔ حسن بن صباح کو اس نے اپنے محل کے دو کمرے دیئے جن میں شاہانہ زندگی کی ہر آسائش موجود تھی۔ کمروں میں سجاوٹ ایسی جو صرف بادشاہوں کے ہاں ہی ہوا کرتی تھی۔ حسن بن صباح نے ان کمروں میں ٹھہرنے سے انکار کر دیا۔

"کسی ایک پیغمبر کا نام لو جس نے ایسی شاہانہ رہائش اختیار کی تھی" — حسن بن صباح نے کہا — "کیا ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بوریا نشین نہیں تھے؟ کیا ہمارے خلفاء راشدین کے بھی ایسے محل ہوتے تھے؟..... نہیں مہدی علوی! میں نبیوں اور پیغمبروں سے بہتر تو نہیں۔ مجھے کُٹیا دے دو"۔

"نہیں امام!" — مہدی علوی نے کہا — "آپ کو کُٹیا میں بٹھا کر میں خدا کے حضور کیا جواب دوں گا"۔

"میرے اور خدا کے درمیان جو باتیں ہوتی ہیں وہ آپ نہیں جانتے" — حسن بن صباح نے کہا — "میں خدا کے حکم کا پابند ہوں..... ہاں، ایک بات سوچی جا سکتی ہے۔ اگر آپ کو میرا کُٹیا میں رہنا پسند نہیں تو سادہ سا کوئی کمرہ دے دیں۔ میری ضرورت یہ ہے کہ سر پر چھت ہو، اور روحانی ضرورت یہ ہے کہ چھت آسمان ہو لیکن یہ آپ کو اچھا نہیں لگتا۔ میں نہیں چاہتا کسی کو میری طرف سے ذرا سی بھی پریشانی ہو"۔

مہدی علوی نے محل سے ہٹ کر ایک مکان حسن بن صباح کے لئے خالی کرا دیا تھا۔ یہ سادہ سا مکان تھا جس میں بہت سے کمرے تھے۔ ایک کمرہ حسن بن صباح کے لئے اور دوسرے کمرے اس کے خاص آدمیوں کے لئے تھے۔ باہر محافظ کھڑے رہتے تھے۔ کسی کو مکان کے قریب بھی جانے کی اجازت نہیں

تھی۔ مہدی علوی جو امیرِ شہر تھا اور حسن بن صباح کا میزبان بھی تھا، وہ بھی اس مکان تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

اس مکان کے اندر کیا ہوتا تھا، کسی کو معلوم نہیں تھا۔ باہر کے لوگ کہتے تھے کہ امام عبادت میں مگن رہتا ہے اور اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔ اس کے عقیدت مندوں کے ہجوم میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

تاریخ میں آیا ہے کہ احمد بن عطاش اپنے کام اور مطلب کے آدمیوں کو خلجان، شاہ در اور دوسرے شہروں اور علاقوں سے قلعہ الموت میں لا لا کر آباد کر رہا تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو پس منظر میں رکھا ہُوا تھا۔ مہدی علوی کو کبھی کبھار ملتا تھا لیکن خلجان اور شاہ در کے قلعہ دار اور امیرِ شہر کی حیثیت سے، یا حسن بن صباح کے مرید کی حیثیت سے۔

مہدی علوی کو تو پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ جس شہر کا وہ امیر ہے اس میں ہو کیا رہا ہے۔ حسن بن صباح نے اسے کہا تھا کہ اتنے خوبصورت شہر کے دفاع کا کوئی انتظام نہیں، اس کے لئے فوج کی ضرورت ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ سلجوقیوں کے پاس بڑی ہی مضبوط فوج ہے۔ وہ کسی بھی وقت حملہ کر کے یہ شہر لے لیں گے۔

حسن بن صباح نے مہدی علوی کو پہلی ملاقات میں ہی اپنے اوپر کشف اور مراقبے کی کیفیت طاری کر کے پیش گوئی کی تھی — "دشمن بڑھ رہا ہے۔ گھٹا گہری ہو رہی ہے۔ اگر آپ نے فوج رکھ لی تو یہ گھٹا جس میں بجلیاں چھپی ہوئی ہیں، اڑ جائے گی اور آپ محفوظ رہیں گے۔ فوج تجربہ کار ہونی چاہئے۔ بغیر فوج کے آپ قلعہ گنوا بیٹھیں گے"۔

مہدی علوی یہ پیش گوئی سن کر گھبرا گیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ اتنی زیادہ فوج رکھ نہیں سکتا کیونکہ فوج کے اخراجات پورے کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ حسن بن صباح نے اسے کہا تھا کہ وہ فوج کو صرف دو وقت روٹی دے دیا کرے۔ باقی اخراجات حسن بن صباح نے اپنے ذمے لے لئے اور مہدی علوی کے ساتھ تحریری معاہدہ کر لیا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے دو ہزار نفری کی فوج بن گئی۔ یہ تمام فوج حسن بن صباح

کے مریدوں کی تھی جو اس پر جانیں قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس فوج کے کمانڈر حسن بن صباح کے اپنے تربیت یافتہ آدمی تھے جو نہ کسی سے رحم مانگتے تھے نہ کسی پر رحم کرتے تھے۔

ایک روز حسن بن صباح نے مہدی علوی کو بلایا۔ مہدی علوی دوڑا آیا اور اس نے حسن بن صباح کے آگے باقاعدہ سجدہ کیا۔

"کیا آپ نے اپنی فوج دیکھ لی ہے؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"دیکھ لی ہے یا امام!"

"کیا آپ اپنے اندر کوئی تبدیلی محسوس کر رہے ہیں؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"کر رہا ہوں یا امام!" — مہدی علوی نے جواب دیا — "یہ فوج دیکھ کر میں اپنے آپ کو محفوظ ہی نہیں بلکہ طاقتور سمجھ رہا ہوں۔ کبھی یوں بھی محسوس کرتا ہوں کہ سلجوقی سلطانوں کو یا کسی اور قوم کو للکاروں کہ میرے مقابلے میں آئے"۔

"نہیں امیر شہر!" — حسن بن صباح نے کہا — "یہ رعونت ہے' تکبر ہے۔ ایسا نہ سوچیں..... میں نے آپ کو کچھ اور بتانے کے لئے بلایا ہے۔ گزشتہ رات مجھے اللہ کی طرف سے ایک اشارہ ملا ہے..... الموت میں جنت بنے گی۔ یہاں حوریں اتریں گی' فرشتے اتریں گے اور یہاں ہر لمحہ اللہ کی رحمت برستی رہے گی"۔

مہدی علوی کی باچھیں کھلتی جا رہی تھیں۔ وہ محسوس نہیں کر رہا تھا کہ حسن بن صباح اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بات کرتا ہے اور ایک لمحے کے لئے بھی آنکھیں اِدھر اُدھر نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ اس کے بولنے کا انداز اتنا پیارا اور اتنا اثر انگیز ہے کہ اس کے منہ سے نکلا ہُوا ایک ایک لفظ سننے والے کی روح میں اترتا جا رہا ہے۔

یہ تھا ایک ابلیسی وصف جو حسن بن صباح نے اپنے آپ میں پیدا کر لیا تھا۔ اس انداز میں ہپناٹائز کر لینے کی طاقت تھی۔ مہدی علوی ہپناٹائز ہو چکا تھا۔

"میں آپ کو ایک بات اور بتاتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "ابھی یہ بات بتانی تو نہیں چاہئے تھی لیکن یہ جگہ آپ کی ہے اور یہاں جو کچھ ہے آپ کا ہے..... یہ جو آپ کو بڑی ہی حسین لڑکیاں نظر آتی ہیں' یہ میرے ساتھ آئی ہیں' یہ دراصل حوریں ہیں۔ آسمان کی مخلوق ہیں جو زمین پر بسنے والی عورتوں کے روپ میں میرے پاس آگئی ہیں۔ اگر یہ اس دنیا کی لڑکیاں ہوتیں تو میں انہیں اپنے پاس نہ رکھتا"۔

"یہ خدیجہ اور دوسری لڑکیاں....."

"ہاں ہاں!" — حسن بن صباح نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا — "یہ آسمانی مخلوق ہے لیکن آپ انہیں زمین کی مخلوق سمجھیں۔ ان سے جو خدمت لینا چاہیں' لیں۔ ان کی روحیں میرے قبضے میں ہیں۔ انہیں اپنا سمجھیں"۔

حسن بن صباح کو معلوم تھا کہ اس کی بہت ہی حسین اور فریب کاری کی ماہر جواں سال عورت خدیجہ مہدی علوی پر چھا گئی ہے اور مہدی علوی اسے رات اپنے پاس رکھتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دو تین نوجوان لڑکیاں بھی مہدی علوی کے ہوش گم کئے رکھتی ہیں۔ خدیجہ مہدی علوی کو خاص قسم کا شربت بھی پلا رہی تھی اور اس پر دیوانگی طاری کر کے اس سے اپنا دامن بھی بچا رہی تھی۔

"یا امام!" — مہدی علوی نے التجا کے لہجے میں کہا — "ایک عرض ہے۔ اجازت ہو تو....."

"میرے ساتھ بات کرنے کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "اگر کوئی بات میرے خلاف بھی دل میں آئے تو بلا خوف کہو..... اب بتاؤ کیا بات ہے!"

"میں خدیجہ کی بات کرنا چاہتا ہوں" — مہدی علوی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"آپ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "انسان کے دل کی بات اس کے چہرے پر لکھی ہوتی ہے۔ پڑھنے والی آنکھ چاہئے..... دلوں کی تحریر روح کی آنکھ سے پڑھی جاتی ہے"۔

مہدی علوی جو اچھا خاصا دانشمند اور معزز ہُوا کرتا تھا' حسن بن صباح کی

اس بات پر حیران رہ گیا کہ اس نے اس کے دل کی بات پڑھ لی ہے، حالانکہ یہ بات قابلِ فہم تھی کہ خدیجہ حسن بن صباح کے ساتھ آئی تھی۔ مہدی علوی نے خدیجہ سے کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب وہ اتنی سی بات نہ سمجھ سکا کہ خدیجہ نے ہی حسن بن صباح کو یہ بات بتائی ہو گی لیکن مہدی علوی کی اتنی برین واشنگ ہو چکی تھی کہ عام فہم باتیں بھی سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

داستان گو اگلے باب میں مہدی علوی کی برین واشنگ کا عمل تفصیل سے سنائے گا۔

"ہاں امام!" — مہدی علوی نے کہا — "آپ نے میرے دل کی تحریر پڑھ لی ہے لیکن آپ فرماتے ہیں کہ یہ حوریں ہیں جو زمین کی عورتوں کے روپ میں آئی ہیں"۔

"پھر بھی اس کے ساتھ آپ کی شادی ہو سکتی ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "شرط یہ ہے کہ آپ کو انسانیت کی سطح سے اوپر اٹھنا پڑے گا، اور یہ کوئی مشکل کام نہیں"۔

"کیا مجھے کچھ کرنا پڑے گا؟" — مہدی علوی نے احمقوں کے انداز سے پوچھا۔

"ہاں!" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "روح کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرنا پڑے گا"۔

"وہ کیسے؟"

"مراقبہ..... چلّہ کشی!" — حسن بن صباح نے کہا — "ریاض..... آپ کو تنہائی میں دنیا سے لاتعلق ہو کر میری طرح اللہ کے حضور بیٹھنا پڑے گا..... آپ یہ کام کر لیں گے اور میرے والا مقام حاصل کر لیں گے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ لڑکیاں پروانوں کی طرح میرے اردگرد منڈلاتی رہتی اور میرے آگے بچھ بچھ جاتی ہیں"۔

"کیا آپ میری راہنمائی کریں گے؟" — مہدی علوی نے پوچھا۔

"آپ نے جس پیار اور عقیدت سے مجھے اپنے ہاں مہمان رکھا ہے میں

اس کا صلہ ضرور دوں گا" — حسن بن صباح نے کہا — "میری راہنمائی کے بغیر آپ یہ کام کر ہی نہیں سکتے۔ میں آپ کا ہاتھ تھاموں گا"۔

مہدی علوی ذہنی اور روحانی طور پر حسن بن صباح کی نظر نہ آنے والی زنجیروں میں جکڑا گیا۔ اسے ذرا سا بھی شک نہ ہوا کہ الموت جیسا مضبوط، قابلِ تسخیر اور خوبصورت قلعہ ہاتھ سے جا رہا ہے۔ اس کی تو اپنی شخصیت پر، اپنی ذات اور اپنے کردار پر گرفت نہیں رہی تھی، اتنے بڑے قلعے اور اتنے بڑے شہر کو وہ کیسے گرفت میں رکھ سکتا تھا۔

الموت پر حسن بن صباح نے ابھی باقاعدہ قبضہ تو نہیں کیا تھا، امیر شہر اس کے قبضے میں آ گیا تھا۔

○

احمد اوزال چوتھے دن مرو پہنچ گیا۔ نظام الملک سے ملا اور اسے سنایا کہ مزمل آفندی لاپتہ ہے۔

"اپنے جذباتی اور اناڑی آدمی کو اتنی خطرناک مہم پر بھیجنا ہی نہیں چاہیے تھا" — احمد اوزال نے کہا — "مجھے یقین ہے کہ وہ حسن بن صباح کے خفیہ گروہ کے ہاتھ چڑھ گیا ہے اور میری نشاندہی اسی نے کی تھی۔ یہ تو اللہ نے میری مدد کی اور میں دو آدمیوں کو مار کر نکل آیا ورنہ میں قتل ہو جاتا"۔

"مزمل کو انہوں نے قتل کر دیا ہو گا" — نظام الملک نے کہا — "تم آرام کرو۔ میں کچھ سوچ لوں"۔

"محترم!" — احمد اوزال نے کہا — "میں آپ کو صاف صاف بتا دوں۔ ہم ان باطنیوں کو جاسوسی اور تخریب کاری کے میدان میں شکست نہیں دے سکتے۔ آپ کے پاس فوج ہے۔ سلطان اوز الموت پر حملہ کرنا پڑے گا..... مزمل آفندی کو بھول جائیں۔ اسے وہ لوگ قتل کر چکے ہوں گے"۔

اُس وقت مزمل بن عابد کے ساتھ قلعہ الموت پہنچ گیا تھا۔ بن عابد اسے اُسی مکان میں لے گیا جس کے ایک کمرے میں حسن بن صباح رہتا تھا۔ مزمل کو ایک کمرے میں بٹھا کر بن عابد اُس کمانڈر سے ملا جس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص حسن بن صباح کے کمرے کے قریب سے بھی نہیں گزر سکتا تھا۔ بن عابد

کمانڈر کو بتایا کہ وہ سلجوقیوں کے بھیجے ہوئے ایک آدمی کو لایا ہے۔ یہ آدمی حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔

کمانڈر نے بن عابد سے پورا واقعہ سنا اور اسے حسن بن صباح کے پاس لے گیا۔ بن عابد نے ایک بار پھر پوری بات سنائی کہ اس نے مزمل کو کس طرح پکڑا اور کیا دھوکہ دے کر ساتھ لے آیا ہے۔

حسن بن صباح کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔ ان ہونٹوں سے یہی حکم نکلنا تھا — "سر کاٹ دو" — حسن بن صباح قتل سے کم سزا نہیں دیا کرتا تھا لیکن.....

"اسے بند کر دو" — حسن بن صباح نے کہا — "دو دن نہ کھانے کے لئے دو نہ پینے کے لئے' پھر مجھے اطلاع دیں میں اسی شخص کو نظام الملک کے قتل کے لئے تیار کروں گا۔ یہ شخص نظام الملک کو قتل کر کے خوشی محسوس کرے گا"۔

مزمل آفندی

کمرے میں بیٹھا اپنے نئے دوست بن عابد کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اسے اپنا ایک ہم خیال مل گیا تھا۔ بن عابد بھی اسی جذبے سے سرشار تھا جس جذبے نے مزمل آفندی کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اس کے دماغ پر خون سوار تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ حسن بن صباح کو وہ کس طرح قتل کرے گا۔ اس نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ وہ حسن بن صباح کا سر کاٹ کر اپنے ساتھ لے جائے گا اور سلطان ملک شاہ کو پیش کرے گا' پھر وہ اس سر کو برچھی کی انی میں اڑس کر مرو کے سارے شہر میں اس کی نمائش کرے گا۔

تھوڑی دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا۔ مزمل آفندی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ بن عابد کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ بن عابد نے اُسے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ یہ اسی شخص کا گھر ہے جسے وہ قتل کرنے آیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ کمرے میں داخل ہونے والا بن عابد نہیں تھا بلکہ وہ دو اجنبی تھے جنہیں مزمل نے پہلے دیکھا ہی نہیں تھا۔

"کیا تم بن عابد کے ساتھ آئے ہو؟" — ایک آدمی نے مزمل سے پوچھا۔

"ہاں" — مزمل نے جواب دیا — "میں ہی ہوں"۔

"ہمارے ساتھ آؤ" — اس آدمی نے کہا۔

مزمل اٹھا اور ان کی طرف بڑھا۔ دونوں آدمی اسے اپنے درمیان رکھ کر چل پڑے۔

"بن عابد کہاں ہے؟" — مزمل نے پوچھا۔

"وہ یہیں ہے" — مزمل کو جواب ملا — "ہم تمہیں اُسی کے پاس لے جا

رہے ہیں"۔

وہ چلتے گئے اور قصر کے ایک اور حصے میں جا پہنچے۔ یہ کہیں بھی نہ رُکے۔ قصر ختم ہو رہا تھا۔ مزمل آفندی نے سوچا کہ بن عابد اتنی جلدی کہاں چلا گیا ہے۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" — مزمل نے پوچھا — "کیا وہ اتنی جلدی اتنی دُور نکل آیا ہے؟"

"ہم جانتے ہیں میرے دوست!" — ایک آدمی نے کہا — "تم حسن بن صباح کا کام تمام کرنے آئے ہو نا!"

"ہاں بھائی!" — مزمل نے کہا۔

"تو پھر ہم سے کچھ بھی نہ پوچھو" — دوسرے آدمی نے کہا — "ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ تم وہ کام اکیلے نہیں کر سکتے جو کرنے آئے ہو۔ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلتے چلو"۔

وہ اب ایسے علاقے میں سے گزر رہے تھے جہاں بے آب و گیاہ چٹانیں تھیں۔ یہ خطہ سرسبز اور روح پرور تھا لیکن اس کا یہ تھوڑا سا حصہ بالکل خشک' بنجر اور ویران تھا۔ گھاس کی ایک پتی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اگر وہاں کوئی درخت تھا بھی تو وہ بالکل خشک تھا۔

وہ چٹانوں کے اندر چلے گئے۔ چند ایک موڑ کاٹ کر اور چٹانوں کے اندر ہی گھوم پھر کر وہ اس چٹانی سلسلے سے باہر نکلے۔ آگے دیکھا تو کچھ اور ہی منظر تھا۔ سامنے قلعے کی طرح ایک عمارت تھی۔ اس کی دیواریں پتھروں کی تھیں اور پتھر بدرنگ اور سیاہ تھے۔ یہ چھوٹا سا قلعہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ دیواریں بہت اونچی تھیں۔ دیواروں کے چاروں کونوں پر لکڑی کے جھونپڑے سے بنے ہوئے تھے۔ یہ برج معلوم ہوتے تھے۔ سامنے والی دیوار کے درمیان ایک بہت بڑا آہنی دروازہ تھا جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ دو آدمی برچھیاں اٹھائے اس دروازے کے باہر یوں کھڑے تھے جیسے پہرہ دے رہے ہوں۔ اس آہنی دروازے کے بالکل اوپر دیوار پر پتھروں کا ہی ایک گرد بنا ہوا تھا۔ پتھروں کا رنگ ایسا ہو گیا تھا جسے دیکھ کر اداسی کا تاثر پیدا ہوتا تھا۔ مزمل آفندی کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ اس نے ان دو آدمیوں سے پوچھا بھی نہیں کہ یہ کیا عمارت ہے۔ اس نے خود ہی سوچ لیا کہ یہ قلعے کے اندر ایک چھوٹا سا

قلعہ ہے۔ یہ شاہی خاندان کے لئے بنایا گیا ہو گا کہ جب کوئی دشمن قلعے کا محاصرہ کرے تو شاہی خاندان اس اندرونی قلعے میں منتقل ہو جاتا ہو گا۔

مزمل آفندی کو بتانے والا کوئی نہ تھا کہ یہ جگہ شاہی خاندان کے لئے نہیں بلکہ یہ الموت کا ہیبت ناک قید خانہ ہے جہاں نہ جانے اُس وقت تک کتنے ہزار لوگوں کے سر کٹ چکے تھے اور کتنے ہی ہزار لوگ اس قید خانے کی کال کوٹھڑیوں میں مر کر گل سڑ گئے تھے۔

وہ قید خانے کے سیاہ کالے آہنی دروازے پر پہنچ گئے۔ اس دروازے کے ایک کواڑ میں چھوٹا سا ایک اور دروازہ تھا۔ اندر سے ایک آدمی چابیوں کا گچھا اٹھائے ہوئے دوڑا آیا اور اندر سے تالا کھولنے لگا۔

"لے آئے ہو اسے!" — دروازہ کھولنے والے نے کہا — "ہمیں اطلاع مل چکی ہے"۔

دونوں آدمی مزمل آفندی کو چھوٹے دروازے میں سے اندر لے گئے۔ جب اس دروازے پر بڑا سارا تالا لگ گیا' اُس وقت مزمل ذرا سا چونکا اور اُس نے ان دو آدمیوں کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ان دونوں نے اس کا ایک ایک بازو پکڑ لیا اور اسے اندر لے گئے۔

"کون ہے یہ؟"

مزمل نے پیچھے دیکھا۔ وہ آدمی بھی پیچھے پیچھے آ رہا تھا جس نے چھوٹا دروازہ کھولا اور پھر تالا لگا دیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں چابیوں کا وہی گچھا تھا جو مزمل نے دروازے میں داخل ہوتے وقت دیکھا تھا۔ اسی نے پوچھا تھا کہ یہ کون ہے۔

"یہ امام کو قتل کرنے آیا ہے" — مزمل کو اندر لانے والے ایک آدمی نے جواب دیا۔

تینوں آدمیوں نے بڑی زور سے قہقہہ لگایا اور وہ کچھ دیر ہنستے ہی رہے۔ مزمل رک گیا۔

"بن عابد کہاں ہے؟" — مزمل نے پوچھا۔

ایک آدمی نے اُس کی گردن پر پیچھے سے ہاتھ رکھا اور اس قدر زور سے دھکا دیا کہ مزمل تین چار قدم آگے جا کر منہ کے بل گرا۔ وہ اٹھا تو دوسرے آدمی نے اسی

طرح اس کی گردن پر ہاتھ رکھا اور ویسا ہی دھکا دیا۔ مزمل ایک بار پھر منہ کے بل گرا۔ وہ اٹھا تو ایک آدمی نے اسے کندھوں سے پکڑ کر آہستہ آہستہ لٹو کی طرح گھمایا۔

"اچھی طرح دیکھ لو تم کہاں ہو" ۔۔۔ اس آدمی نے کہا۔

مزمل نے دیکھا۔ یہ ایک وسیع و عریض جگہ تھی جو بد رنگ پتھروں کی چار بہت ہی اونچی اونچی دیواروں میں گھری ہوئی تھی۔ ایک طرف پتھروں کی بارکیں سی کھڑی تھیں۔ بہت سا حصہ میدانی تھا۔ وہاں قیدی مختلف کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ ہر ایک قیدی کے پاؤں بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ پہریدار ہاتھوں میں ہنٹر اٹھائے ان کے درمیان گھوم پھر رہے تھے۔ کوئی قیدی ذرا سی بھی سستی کرتا تو پہریدار اُسے دو تین ہنٹر مار کر اُس کی چیخیں نکال دیتا تھا۔ قیدی پورے لباس میں نہیں تھے۔ ناف سے اوپر ان کے جسم ننگے تھے۔ ان کی پسلیاں گنی جا سکتی تھیں۔ ان کے چہرے سوکھ گئے تھے۔ چہروں پر کربناک تاثر تھا۔ ان قیدیوں کے دو ہی کام تھے۔ ایک جانوروں کی طرح مشقت کرنا اور دوسرا مار کھانا۔ مزمل کے قریب جو قیدی تھے' ان کی پیٹھوں پر لمبے لمبے لال سرخ نشان تھے۔ یہ ہنٹر اور بیدوں کے نشان تھے۔

مزمل آفندی پر ہول طاری ہو گیا۔ وہ اگر حسن بن صباح کو قتل کر کے اس قید خانے میں آتا تو اُسے ذرا سا بھی افسوس نہ ہوتا۔ وہ تو پہلے ہی پکڑا گیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کا ساتھی بن عابد بھی پکڑا گیا ہو گا اور اُسے بھی اس قید خانے میں لایا گیا ہو گا یا اُسے لے آئیں گے۔ اُسے تو وہم بھی نہیں ہوا تھا کہ جس پر اُس نے اعتماد کیا اور اُس کا ہم سفر بن کر الموت آیا تھا' اس کا نام بن عابد نہیں تھا۔ اس کا اصل نام کچھ اور تھا۔ بن عابد حسن بن صباح کے خاص گروہ کا آدمی تھا۔

آگے ایک اور اونچا دروازہ آ گیا۔ یہ لکڑی کا دروازہ تھا جس کے آگے تالا لگا ہوا تھا۔ یہ بھی ایک عمارت تھی جس کی دیواریں پتھروں کی بنی ہوئی تھیں۔ چابیوں والے سنتری نے آگے ہو کر دروازہ کھولا۔ مزمل کو دھکیلتے ہوئے اس کے اندر لے گئے۔ آگے سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں۔ وہ سیڑھیاں اتر گئے۔ یہ ایک راہداری تھی۔ نیچے جا کر چند قدم آگے گئے تو ایک دیوار آ گئی۔ وہ بائیں کو گھومے۔ کچھ اور آگے جا کر دائیں کو مڑے تو پھر پانچ چھ سیڑھیاں آ گئیں جو نیچے کو اترتی تھیں اور ایک ذرا

فراخ راہداری تھی جس میں یہ لوگ آگے چلے گئے۔ مزمل کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے زمین کی آخری تہہ تک لے جایا جا رہا ہو۔ اسے یاد ہی نہ رہا کہ وہ کتنی بار دائیں یا بائیں مڑ چکا ہے۔ آخر وہ جگہ آ گئی جس کے دونوں طرف آمنے سامنے کوٹھڑیاں تھیں۔

یہ قید خانے کا تاریک تہہ خانہ تھا جسے مشعلوں سے روشن کیا گیا تھا۔ وہاں ایسا تعفن تھا کہ صاف ستھری زندگی بسر کرنے والے مزمل جیسے آدمی کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ ایک تو دیواروں کے ساتھ اُڑسی ہوئی مشعلوں کے تیل کی بدبو تھی اور حبس تھا اور اس بدبو میں ایک تعفن ایسا تھا جیسے اس زمین دوز دنیا میں انسانی لاشیں یا جانوروں کے مردار پڑے گل سڑ رہے ہوں۔ مزمل کو چکر سا آیا اور اس کے قدم رکنے لگے۔ ایک آدمی نے پیچھے سے اس کی کمر میں اتنی زور سے لات ماری کہ وہ چند قدم آگے پتھروں کے فرش پر اوندھے منہ گرا۔ اُس سے تو جیسے اُٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اسے گھسیٹ کر اٹھایا گیا اور دھکیل لے گئے۔

وہ دو آدمی جو مزمل کو لائے تھے' قید خانے کے باہر انسانوں کی طرح بولتے اور چلتے تھے لیکن قید خانے میں داخل ہوتے ہی وہ درندے بن گئے۔ مزمل نے دائیں بائیں دیکھا۔ ہر کوٹھڑی کی سلاخوں کی اندر تین چار قیدیوں کو کھڑے دیکھا تو وہ حیران ہوا کہ لاشوں جیسے یہ انسان اپنے پاؤں پر کھڑے کس طرح ہیں۔

مزمل کو ایک اور طرف موڑ کر لے جایا گیا۔ چابیوں والے سنتری نے دوڑ کر ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھولا۔ مزمل کو اس کے سامنے کھڑا کر کے یہ نہ کہا گیا کہ اندر چلو بلکہ اسے اس کوٹھڑی میں داخل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ایک آدمی نے اس کا ایک بازو پکڑا اور دوسرے نے دوسرا بازو پکڑا اور ذرا آگے ہو کر ان دونوں نے اتنی زور سے مزمل کو اندر کی طرف جھٹکا دیا کہ وہ تنگ سی اس کال کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ جا لگا۔ وہ سر دیوار سے ٹکرانے کی وجہ سے چکرا گیا اور گر پڑا۔ جب ذرا سنبھل کر اور اپنے آپ میں آ کر اٹھا تو دروازہ بند ہو چکا تھا اور اسے کال کوٹھڑی میں پھینکنے والے جا چکے تھے۔

مزمل نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور دیکھا' اُس کا ہاتھ خون سے لال ہو گیا تھا۔ اُس نے کرتے کا دامن ماتھے پر رکھا۔ جب ہٹایا تو دامن خون سے تر ہو گیا تھا۔ اُس

کی مرہم پٹی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ حسن بن صباح نے کہا تھا کہ اسے دو دن بھوکا اور پیاسا رکھا جائے۔ مزمل کو اس حکم کا علم نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو وہ کیا کر لیتا۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ بہہ کر اس کی آنکھوں کے راستے اس کے گالوں پر آکر اس کے سامنے قطرہ قطرہ گرتا رہا۔

مزمل آفندی کا دماغ جو ماؤف ہو گیا تھا، آہستہ آہستہ بیدار ہو گیا اور مزمل سوچنے لگا کہ وہ اس کال کوٹھڑی تک کس طرح آن پہنچا ہے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ احمد اوزال نے اسے کہا بھی تھا کہ سلطان ملک شاہ اور نظام الملک حسن بن صباح کے ہاتھوں قتل ہو سکتے ہیں، اسے قتل کرا نہیں سکتے۔ احمد اوزال کی اس بات پر مزمل نے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ یہ سمجھتا رہا کہ حسن بن صباح کوئی عام سا فریب کار آدمی ہے جو ادھر ادھر گھومتا پھرتا بھی ہو گا اور اسے آسانی سے قتل کیا جا سکے گا۔ مزمل کے جذبے کا یہ عالم تھا کہ وہ حسن بن صباح کے قتل کے لئے اپنی جان قربان کر دینے کا عہد کر کے آیا تھا۔ مزمل جذبات میں الجھ کر جس طرح خلجان پہنچا تھا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان ملک شاہ اور اس کے وزیراعظم نظام الملک نے اسے نہیں روکا تھا اور اسے کسی نے بتایا تھا کہ حسن بن صباح کوئی معمولی سا آدمی نہیں بلکہ وہ اس علاقے کے لوگوں کے دلوں پر راج کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان اور وزیراعظم کو خود معلوم نہیں تھا کہ حسن بن صباح کیا طاقت حاصل کر چکا ہے۔ مزمل کے لئے اب ہر سوچ محض بیکار تھی۔ اسے بن علیہ یاد آیا تو اسے احساس ہوا کہ حسن بن صباح کے یہ لوگ کس قدر عقلمند اور تجربہ کار ہیں کہ بن علیہ نے اسے پتہ ہی نہیں چلنے دیا تھا کہ وہ حسن بن صباح کے ایک خاص گروہ کا آدمی ہے۔

مزمل آفندی کا خون بہتا رہا۔ اس کا دماغ سوچ سوچ کر تھک گیا اور وہ دروازے کی سلاخیں پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پیاس سے مرا جا رہا تھا مگر وہاں اسے پانی پلانے والا کوئی نہ تھا۔ کوئی ہوتا بھی تو اس نے مزمل کو پانی نہیں دینا تھا۔

○

رات کے کھانے کے بعد امیر الموت حسن بن صباح کے پاس گیا۔ اسے اس احترام سے بٹھایا گیا جس احترام کا وہ حقدار تھا اور اسے بتایا گیا کہ امام عبادت میں مصروف ہیں اور کچھ دیر بعد باہر آئیں گے۔ سعدی علوی اس کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

حسن بن صباح جس عبادت میں مصروف تھا، وہ یہ تھی کہ وہ شراب پی رہا تھا اور اس کے ساتھ اس کے زنانہ گروہ کی دو سب سے زیادہ حسین لڑکیاں تھیں۔ اسے اطلاع دے دی گئی کہ امیر الموت ملنے آیا ہے۔

خاصا انتظار کروا کر حسن بن صباح اس کمرے میں آیا جہاں سعدی علوی بیٹھا تھا۔ سعدی علوی اسے دیکھ کر اس طرح اٹھا کہ اس کے آگے رکوع میں چلا گیا اور اس کے گھٹنے چھو لئے۔

سعدی علوی کی اہمیت صرف یہ تھی کہ وہ الموت کا امیر تھا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ جنگجو بھی نہیں تھا اور اس نے کوئی لڑائی فتح نہیں کی تھی۔ وہ ولی اللہ بھی نہیں تھا اور زاہد و صوفی بھی نہیں تھا، عالم دین بھی نہیں تھا۔ وہ قلعے یا کسی بھی شہر کے امراء جیسا ایک امیر تھا۔ وہ عیش و عشرت کا دلدادہ تھا اور اسی کو وہ زندگی سمجھتا تھا۔ اس میں ہر وہ عیب تھا جو امراء میں ہوتا تھا۔ وہ حسین عورتوں کا شیدائی اور خزانے کا متمنی تھا۔ حسن بن صباح نے اس کی یہ خواہش معلوم کر لی تھی کہ وہ اس کے گروہ کی ایک بڑی ہی خوبصورت اور جوان عورت خدیجہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔

"یاامام!" ۔۔۔ سعدی علوی نے حسن بن صباح سے منت سماجت کے لہجے میں کہا ۔۔۔ "آپ نے کہا تھا کہ آپ مجھے چلہ کاٹنے کے سلسلے میں کچھ راہنمائی کریں گے۔"

"آپ اچھے وقت آگئے ہیں" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "مجھے گزشتہ رات اشارہ ملا ہے کہ آپ کہاں بیٹھ کر چلہ کریں گے۔ یہ سوچ لیں کہ چلہ چالیس دن کرنا پڑے گا۔ آپ ایک جگہ بیٹھے رہیں گے اور چالیس دن وہیں گزارنے ہوں گے۔"

"یاامام!" ۔۔۔ سعدی علوی نے کہا ۔۔۔ "آپ جو بتائیں گے وہ میں کروں گا۔"

"گزشتہ رات ہی مجھے صاف ایک تصویر نظر آئی ہے" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "کسی بھی وقت میں آپ کو بلاؤں گا۔ آپ نے اسی وقت جنگل کی طرف میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ وہاں اس جگہ کا اشارہ ملے گا جہاں آپ ایک دائرے میں بیٹھ کر چلہ کریں گے۔ میں آپ کو بتاؤں گا کہ آپ نے پڑھنا کیا ہے۔ یہ ایک ورد ہو گا

جو آپ چالیس دن کریں گے۔ دن نہیں بلکہ رات کہیں کیونکہ چلّہ رات کو ہو گا۔ دن کے وقت آپ سو سکتے ہیں اور آپ نے خیمے کے اندر ہی رہنا ہے"۔

حسن بن صباح نے مہدی علوی میں وہ تمام کمزوریاں بیدار کر کے انہیں اس کی عقل پر غالب کر دیا تھا جن انسانی کمزوریوں نے بادشاہیوں کے تختے الٹے ہیں۔ ان کمزوریوں میں ایک تو خوبصورت عورت ہے' دوسری ایسا خزانہ جو کبھی ختم نہ ہو اور تیسری کمزوری یہ کہ شب و روز عیش و عشرت میں گزریں۔ مہدی علوی اپنے گھر چلا گیا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت مہدی علوی کو حسن بن صباح نے یہ پیغام بھیجا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر فوراً" آجائے۔

حسن بن صباح تیار ہو کر باہر نکل آیا تھا۔ اس کا گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ اپنے چند ایک آدمی تھے۔

مہدی علوی تھوڑی سی دیر میں گھوڑے پر سوار ہوا اور وہ جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک جنگل تو وہ تھا جو بہت ہی خوشنما اور سرسبز تھا۔ لوگ وہاں سیر سپاٹے کے لئے جایا کرتے تھے۔ جنگل کا ایک حصہ ایسا تھا جہاں اونچی نیچی چٹانیں تھیں اور وہاں اتنی ہریالی نہیں تھی کہ اس علاقے کو دیکھنے کے قابل سمجھا جاتا۔ حسن بن صباح شہر سے بہت دور اس علاقے میں جا پہنچا۔

"جگہ یہی ہے" ——— حسن بن صباح نے کہا ——— "لیکن یہ اشارہ ابھی ملنا باقی ہے کہ آپ کا خیمہ کس جگہ لگایا جائے ...... یہ اشارہ ایک کبوتر دے گا۔ ایک کبوتر اڑتا آئے گا وہ درخت پر نہیں بلکہ زمین پر بیٹھے گا۔ جہاں کبوتر زمین پر اترے گا اس جگہ خیمہ لگنا ہے اور آپ وہاں چلّہ پورا کریں گے"۔

حسن بن صباح نے اوپر دیکھنا شروع کیا۔ وہ فضا میں ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ مہدی علوی اور دوسرے چند ایک جو آدمی تھے وہ بھی آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔

"بتا دے اللہ!" ——— حسن بن صباح نے آسمان کی طرف منہ کر کے کہا ——— "بتا دے اللہ' بتا دے"۔

بہت وقت گزر گیا۔ مہدی علوی تو بہت ہی بے چین تھا۔ اسے کوئی بھی پرندہ اڑتا نظر آتا تو وہ کہہ اٹھتا' وہ رہا کبوتر لیکن وہ کبوتر نہیں ہوتا تھا اور وہ جو پرندہ بھی

ہوتا' آگے نکل جاتا تھا۔

"وہ دیکھئے" ——— ایک آدمی نے بلند آواز میں کہا ——— "وہ بلاشک و شبہ کبوتر ہے"۔

سب نے دیکھا' وہ کبوتر تھا اور وہ دوسرے پرندوں کی طرح سیدھا نہیں اڑتا جا رہا تھا بلکہ زمین پر اترتا آ رہا تھا۔ آخر وہ ایک جگہ زمین پر اترا اور ایک طرف کو چل پڑا۔ حسن بن صباح گھوڑے سے کود کر اترا۔ مہدی علوی بھی گھوڑے سے اترا۔

حسن بن صباح نے اس جگہ پر جا پاؤں رکھا جہاں پر کبوتر اترا تھا۔

"یہاں خیمہ لگے گا" ——— حسن بن صباح نے مہدی علوی سے کہا ——— "ابھی اپنے آدمی بھیجو جو یہاں سپاہیوں والا خیمہ گاڑ دیں"۔

○

دو مؤرخوں نے دو مختلف حکایتیں لکھی ہیں کہ حسن بن صباح نے قلعہ الموت پر کس طرح قبضہ کیا تھا لیکن یہ دونوں حکایتیں قابلِ اعتبار نہیں لگتیں۔ داستان گو یہاں ان کا بیان موزوں نہیں سمجھتا۔ تین اور مؤرخوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے جو بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ دھوکا دہی اور فریب کاری میں حسن بن صباح کو غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ یہ تو پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حسن بن صباح اپنے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کو صرف متاثر ہی نہیں بلکہ بولنے کے انداز سے اور الفاظ کے انتخاب سے ہپناٹائز کر لیا کرتا تھا۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ مہدی علوی کے اندر نفسانی خواہشات ابھر آئی تھیں جو حسن بن صباح نے خاص طور پر ابھاری تھیں۔

قرآنِ پاک میں واضح الفاظ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو بھی مصیبت میرے بندوں پر آتی ہے وہ بندوں کے اپنے اعمال کی وجہ سے آتی ہے۔ مہدی علوی نے اپنے اعمال کو اور اپنی سوچوں کو اپنی نفسانی خواہشات کے تابع کر لیا تھا۔ اب یہ دیکھیں کہ حسن بن صباح نے الموت جیسا قلعہ بند شہر مہدی علوی سے کس طرح خون کا ایک قطرہ بھی بہائے بغیر لے لیا۔

آہستہ آہستہ یہ خبر شہر میں پھیل گئی کہ امیرِ الموت تارک الدنیا ہو گیا ہے اور اس نے جنگل کے ویران اور اجاڑ حصے میں جا خیمہ لگایا اور وہاں اللہ اللہ کرتا رہتا ہے۔ اس طرف کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ خیمے سے دور دور دو تین آدمی

گھومتے رہتے تھے جو کسی بھی آدمی کو اس طرف جانے نہیں دیتے تھے۔ خیمے کے اندر مہدی علوی کا بستر تھا جو فرش پر بچھایا گیا تھا۔ جہاں کبوتر زمین پر اُترا تھا اُس جگہ ایک مصلّٰی بچھا دیا گیا تھا۔ مہدی علوی سورج غروب ہونے کے کچھ دیر بعد قبلہ رو ہو کر بیٹھ جاتا اور ان الفاظ کا ورد شروع کر دیتا تھا جو اسے حسن بن صباح نے بتائے تھے۔ تاریخ میں وہ الفاظ یا وہ وظیفہ نہیں ملتا جو حسن بن صباح نے مہدی علوی کو بتایا تھا۔

حسن بن صباح نے اسے سختی سے کہا تھا کہ پہلے دو دن اور دو راتیں وہ صرف پانی پی سکتا ہے لیکن کچھ کھا نہیں سکتا۔ اس نے مہدی علوی کو کہا تھا کہ وہ اپنی ذات کو اور اپنی ضروریات کو بالکل بھول جائے' اور اگر وہ دو دن کچھ کھائے پیئے بغیر تکلیف کے گزار گیا تو جنگل کے درخت بھی اس کے آگے سجدہ کریں گے اور جنگل میں چلتے اگر شیر بھی اس کے سامنے آجائے گا تو اسے راستہ دے دے گا۔

"تیسرے روز میں خود یہاں آؤں گا" ــــ حسن بن صباح نے اسے کہا تھا ــــ "کچھ دیر اس مصلے پر بیٹھوں گا اور کشف کے ذریعے مراقبے میں جا کے بتاؤں گا کہ یہ چلّہ آپ کو کیا کچھ دے گا؟"۔

اسے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ ایک آدمی اس کے خیمے کے باہر حاضری میں موجود رہے گا جو اسے پانی پلاتا رہے گا۔

مہدی علوی کو بتانے والا کوئی نہ تھا کہ وہ کبوتر جو اُڑتا آیا اور زمین پر بیٹھ گیا تھا' وہ خود نہیں آیا تھا۔ اس جگہ کے قریب ہی ایک چٹان تھی۔ حسن بن صباح کا ایک آدمی کبوتر لے کر بہت پہلے اس چٹان کے پیچھے چلا گیا تھا۔ اس نے کبوتر کے پر کھینچ لئے اور اُسے ابھی اُڑان کے قابل چھوڑا ہی نہیں تھا۔ حسن بن صباح مہدی علوی کو ساتھ لے کر وہاں گیا تو ادھر سے اس آدمی کو ایک مخصوص اشارہ ملا۔ اُس نے چٹان کے پیچھے سے کبوتر کو زور سے اوپر پھینکا۔ کبوتر زیادہ اُڑنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ جتنا اُڑ سکا اڑا اور زمین کی طرف آنے لگا' حتیٰ کہ وہ اس جگہ زمین پر اُتر آیا۔ حسن بن صباح فوراً" اس جگہ پہنچا اور جہاں کبوتر اترا تھا وہاں پاؤں رکھ دیا۔ مہدی علوی کی توجہ حسن بن صباح کی طرف تھی۔ اس کی عقل پر حسن بن صباح نے پردہ ڈال دیا تھا۔ وہ دیکھ ہی نہ سکا کہ کبوتر کہاں چلا گیا ہے۔ کبوتر اُڑنے کی بجائے چل پڑا تھا اور چلتے چلتے دور نکل گیا تھا۔

مہدی علوی کے خیمے سے تھوڑے سے فاصلے پر ایک اور خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ اس میں ایک آدمی رہتا تھا۔ اس نے پانی کا ذخیرہ اپنے پاس رکھ لیا تھا اور اپنے کھانے پینے کا انتظام بھی اس نے وہیں کر لیا تھا۔ اس شخص نے مہدی علوی کی دیکھ بھال اور خدمت کرنی تھی۔

دن کے وقت جب بھی مہدی علوی اس سے پانی مانگتا وہ اسے پانی پلا دیتا۔ شام کے بعد جب مہدی علوی مصلے پر ورد شروع کرتا تو حسن بن صباح کا یہ آدمی اُسے پانی ضرور پلاتا تھا۔ اس پانی میں تھوڑی سی مقدار میں حشیش ڈال دی جاتی تھی۔ حسن بن صباح نے اپنے اس آدمی سے کہہ رکھا تھا کہ وہ دوسرے تیسرے روز حشیش کی مقدار میں اضافہ کرتا جائے۔

یہ تو ایک نشہ تھا جو مہدی علوی کو دھوکے میں آہستہ آہستہ پلایا جا رہا تھا۔ دوسرا نشہ حسن بن صباح نے اُس پر پہلے ہی طاری کر رکھا تھا۔ اس نشے میں بھی اس نے آہستہ آہستہ اضافہ کرتا تھا۔ دو دن گزر گئے تو حسن بن صباح نے اسے کہا تھا کہ اب وہ اونٹنی کا دودھ پی سکتا ہے لیکن کھا کچھ نہیں سکتا۔ مہدی علوی کو یہ اجازت تھی کہ دن کے وقت وہ قریبی ندی میں جا کر نہا سکتا ہے اور دیگر قدرتی حاجات سے فراغت حاصل کر سکتا ہے۔

چلّے کا ساتواں دن تھا۔ حسن بن صباح نے اسے پیغام بھیجا کہ آج رات تقریباً" نصف شب قریب سے اسے اُلّو کی آواز آئے گی۔ وہ اس آواز پر مصلے سے اٹھے اور مصلے کے نیچے عین درمیان سے زمین کھودے۔ حسن بن صباح نے پیغام میں کہا تھا کہ اسے معلوم نہیں کہ زمین میں سے کیا برآمد ہو گا۔ وہ اللہ کی طرف سے کوئی تحریری پیغام بھی ہو سکتا ہے اور کوئی اور چیز بھی ہو سکتی ہے۔ وہ جو کچھ بھی برآمد ہو نکال کر اس جگہ مٹی ڈال دے۔ یہ خیال رکھے کہ اِرد گرد زیادہ زمین نہ کھودے۔

رات آدھی گزر گئی تھی۔ مہدی علوی مصلّے پر بیٹھا چلّہ کر رہا تھا۔ اسے اُلّو کی آواز سنائی دی جو قریب ہی سے آئی تھی۔ مہدی علوی فوراً" اٹھا۔ اس کے لئے جو غلام چھوڑا گیا تھا وہ بھی الّو کی آواز سن کر دوڑا آیا۔ اسے بھی بتا دیا گیا تھا کہ آج رات کیا ہونے والا ہے۔ مہدی علوی نے فوراً" مصلّٰی ہٹایا۔ غلام نے آکر مصلے کے درمیان کی جگہ سے زمین تھوڑی سی کھودی اور ہاتھ ڈالا تو اُسے کوئی چیز محسوس

ہوئی۔ اُس نے مہدی علوی سے کہا کہ وہ خود یہ چیز نکالے' کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کا یعنی خادم کا ناپاک ہاتھ لگ جائے تو غیب سے آئی ہوئی یہ چیز غیب کو ہی واپس چلی جائے۔

مہدی علوی نے پھاوڑے سے اس گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو اُس کے ہاتھ ایک چیز آئی جو اس نے باہر نکال لی۔ مشعل کی روشنی میں یہ چیز چمکی تو مہدی علوی پر کوئی اور ہی تاثر طاری ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کیا ہے۔ یہ سونے کا ایک چوکور ٹکڑا تھا۔ مہدی علوی نے اس ٹکڑے کو ہتھیلی پر رکھ کر اس کے وزن کا اندازہ کیا۔ یہ ایک پاؤ سے کچھ زیادہ وزنی تھا۔ اس نے گڑھے میں پھر ہاتھ ڈالا تو ایسے ہی دو ٹکڑے اور نکلے۔ حسن بن صباح کی ہدایت کے مطابق گڑھا اس سے گہرا یا چوڑا نہیں کھودنا تھا۔
اُس زمانے میں ان ٹکڑوں کو سونے کی اینٹیں کہا جاتا تھا۔ حسن بن صباح کی ہدایت کے مطابق یہ گڑھا بھر دیا گیا اور اس پر پھر مہدی علوی نے مصلّٰی بچھا لیا اور خادم سے کہا کہ وہ علی الصبح یہ تینوں ٹکڑے امام کی خدمت میں پیش کر دے۔ مہدی علوی کی ذہنی حالت کچھ اور ہی ہو گئی تھی۔ وہ یوں مسرت و شادمانی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ اس حسین اور دلنشیں پگڈنڈی پر جا رہا ہو جو ذرا ہی آگے جا کر جنت میں جا نکلے گی اور اُسے اسی دنیا میں ابدی زندگی حاصل ہو جائے گی۔

فردوسِ بریں سے نکالے ہوئے آدم کو ابلیس جنتِ ارضی میں داخل کر رہا تھا۔ اس جنت کی کوئی حقیقت نہیں تھی' اگر کچھ حقیقت تھی تو وہ تصوراتی تھی۔ انسان جب نفسانی خواہشات کے چنگل میں آ جاتا ہے تو اس کے تصورات اس قدر دلفریب ہو جاتے ہیں کہ وہ حقیقی زندگی سے ناطہ توڑ کر تصوراتی دنیا کو حقیقی سمجھنے لگتا ہے۔ یہ کیفیت مہدی علوی پر طاری ہو چکی تھی۔ اسے یہ بتانے والا کوئی نہ تھا کہ رات کو جو اُلّو بولا تھا وہ اُلّو نہیں بلکہ اس کا خادم تھا جس نے خیمے سے ذرا پرے جا کر اُلّو کی آواز نکالی تھی اور یوں دوڑا آیا تھا جیسے اُلّو کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی ہو اور وہ مہدی علوی کے پاس پہنچ گیا ہو۔
اُس وقت اس علاقے میں کوئی اُلّو نہیں تھا اگر کوئی اُلّو تھا تو وہ مہدی علوی تھا۔ مہدی علوی کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سونے کے یہ ٹکڑے غیب سے نہیں آئے تھے بلکہ یہ حسن بن صباح کی طرف سے آئے تھے۔ صبح جب مہدی علوی ندی پر گیا

تھا' اُس وقت خادم نے مصلّے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھودا اور سونے کے یہ تین ٹکڑے رکھ کر اوپر مٹی ڈال دی تھی اور پھر اس پر مصلّٰی بچھا دیا تھا۔ خادم کو معلوم تھا کہ مہدی علوی کو یہ شک نہیں ہو گا کہ یہاں پہلے ہی گڑھا کھودا گیا تھا۔ خادم نے ہی اگر اس گڑھے کو کھودنا تھا۔ دھوکا دہی کا یہ کام مشکل نہ تھا۔

○

اگلی صبح مہدی علوی کا خادم جو حسن بن صباح کا خاص آدمی تھا' سونے کے ٹکڑے لے کر شہر آیا اور حسن بن صباح سے ملا۔
"لو امام!" ___ اس نے کہا ___ "یہ کام بھی ہو گیا ہے۔ یہ لیں اپنی سونے کی اینٹیں"۔
حسن بن صباح کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔
"اس شخص کا چلّہ کامیاب رہے گا" ___ حسن بن صباح نے ہلکی سی ہنسی سے کہا ___ "وہ چلّہ کشی ختم کرے گا تو اُس کا یہ شہر الموت ہمارا ہو گا...... تم جاؤ' اُس کے پاس چلے جاؤ اور کل سے اگلا عمل شروع کر دینا"۔
الموت شہر میں ایک بڑی مسجد تھی۔ شہر کے لوگ جمعہ اور عیدین کی نمازیں اس مسجد میں پڑھا کرتے تھے۔ اس مسجد کا خطیب ایک عالمِ دین امام شامی تھا۔ تاریخ میں اس کا پورا نام نہیں ملتا سوائے اس کے کہ وہ دُور دُور تک امام شامی کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ وہ کئی برسوں سے حج کے لئے گیا تھا پھر خانہ کعبہ کا ہی ہو کے رہ گیا۔ لوگ اسے بھول تو نہیں سکتے تھے لیکن وہ یہی سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ امام شامی جیسے عالمِ دین سے محروم ہو گئے ہیں۔ مسجد میں ایک اور خطیب موجود تھا لیکن اس میں وہ بات اور وہ عظمت نہیں تھی جو ضعیف العمر شامی میں تھی۔ جس رات مہدی علوی کو سونے کی تین اینٹیں مصلّے کے نیچے سے ملیں' اُس رات اچانک امام شامی آ گیا۔ لوگ فجر کی نماز کے لئے مسجد میں گئے تو امام شامی کو دیکھ کر انہیں خوشگوار دھچکا لگا۔ لوگ تو اُسے پیر و مرشد کی طرح مانتے تھے۔ لوگوں نے اُس کے ہاتھ چومے' اس کے آگے صرف سجدہ ریز نہ ہوئے' باقی کسر انہوں نے چھوڑی کوئی نہیں تھی۔ شہر بھر میں خوشی منائی گئی کہ شہر کا محبوب امام اور خطیب واپس آ گیا ہے۔
لوگ امام شامی کو دیکھ کر تو خوش ہو گئے لیکن امام شامی لوگوں کو دیکھ کر خوش نہ

ہوا۔ اُس نے پہلی بات یہ دیکھی فجر کی نماز کے وقت اُس تعداد کے آدھے نمازی بھی نہیں تھے جو پہلے ہُوا کرتے تھے۔ نماز کے بعد جب لوگ اسے مل رہے تھے' اُس نے شہر کے دو معمر بزرگوں سے پوچھا کہ نمازی کہاں کھو گئے؟ اسے جو جواب ملا اُس جواب نے اُسے پریشان کر دیا۔ ابھی اسے تفصیلات معلوم نہیں ہوئی تھیں۔ صرف یہ پتہ چلا کہ ایک اور امام شہر میں آگیا ہے جو مسجد میں تو کبھی نہیں آیا لیکن اپنے گھر میں' سنا ہے' ہر وقت عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ امام شافی کو یہ بھی بتایا گیا کہ لوگ اسے صرف امام یا ولی اللہ ہی نہیں بلکہ نبی تک تسلیم کرنے پر آگئے ہیں۔

امام شافی چپ رہا۔ اُس نے کسی سے کوئی سوال نہ کیا نہ کسی سے کوئی تفتیش کی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ امیرِ شہر مہدی علوی کے پاس جائے گا اور اس سے پوچھے گا کہ شہر میں کیا انقلاب آگیا ہے اور یہ کون سا امام ہے جو مسجد کی بجائے اپنے گھر اکیلا ہی عبادت کرتا ہے۔

مہدی علوی عبادت گزار یا زاہد اور پارسا تھا یا نہیں' یہ ایک الگ بات ہے' وہ امام شافی کا مرید تھا اور دل و جان سے اس کی قدر کرتا تھا۔ قدر بھی اس حد تک کہ انتظامی امور میں امام شافی سے مشورے لیا کرتا اور آخری بات امام شافی کی ہی چلتی تھی۔

نماز سے اور ملاقاتوں سے فارغ ہو کر امام شافی مہدی علوی کے گھر چلا گیا۔ مہدی علوی کی دو بیویاں تھیں' دو بیٹے اور تین چار بیٹیاں تھیں۔ یہ اولاد ابھی لڑکپن میں اور کچھ بچپن میں تھی' ان میں کوئی بھی جوان نہیں تھا۔ اس گھر میں امام شافی کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اُسے دیکھ کر مہدی علوی کی دونوں بیویاں دوڑی آئیں اور اُس کے آگے جھک کر سلام کیا۔ اُس نے پوچھا کہ امیرِ شہر کہاں ہے۔ جواب میں دونوں بیویاں خاموش رہیں اور ان کے چہروں پر اداسی کا تاثر آگیا۔

"کیوں؟" — امام شافی نے پوچھا — "کیا بات ہے؟"

بیویوں نے امام شافی کو اندر بٹھایا اور وہیں بیٹھ گئیں۔

"امیرِ شہر تارک الدنیا ہو کر جنگل میں چلہ کشی کر رہے ہیں" — بڑی بیوی نے کہا — "سات روز گزر گئے ہیں۔ سنا ہے چالیس روز پورے کرنے پڑیں گے"۔

"اس راستے پر اسے کس نے ڈالا ہے؟" — امام شافی نے پوچھا۔

"شہر میں ایک امام آیا بیٹھا ہے" — بڑی بیوی نے کہا — "لوگ اس کے مرید ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ چند ایک اتنی حسین اور نوجوان لڑکیاں ہیں جنہیں دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ اس زمین کی پیداوار ہیں' وہ جنت کی حوریں لگتی ہیں"۔

"اور محترم امام!" — چھوٹی بیوی نے کہا — "ہمارے امیرِ شہر بھی اس کے مرید بن گئے ہیں۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں کہ ان پر ان حوروں جیسی لڑکیوں کا جادو چل گیا ہے۔ گھر میں انہوں نے ایسی باتیں کی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تو خدا کو بھی بھول گئے ہیں اور اس نئے امام کو اپنا امام نہیں بلکہ پیغمبر تسلیم کر لیا ہے جس کا نام حسن بن صباح ہے۔ اسی امام نے امیرِ شہر کو چلہ کشی کے راستے پر ڈالا ہے"۔

"حسن بن صباح؟" — امام شافی نے چونک کر کہا — "وہ یہاں پہنچ گیا ہے؟ اس کی شہرت تو وہاں خلافہ بغداد تک پہنچ چکی ہے۔ اس شخص کا نام مدینہ میں سنا تھا لیکن سنانے والے نے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ شخص کوئی برگزیدہ شخصیت ہے' بلکہ اس نے کہا تھا کہ ابلیس ایک بار پھر دنیا میں انسان کے روپ میں آگیا ہے۔ ایک آدمی ایسا بھی ملا تھا جس نے حسن بن صباح کو برگزیدہ شخصیت کہا تھا۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ جس آدمی نے مہدی علوی جیسے دانشمند آدمی کو چلہ کشی پر لگا دیا ہے وہ اللہ کا برگزیدہ بندہ نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے عبادت کا حکم دیا ہے چلہ کشی کا نہیں۔ چلہ کشی دنیاوی مقاصد اور اپنی دنیاوی خواہشات کی تکمیل کے لئے کی جاتی ہے"۔

"امیرِ شہر عقلمند یا پرہیزگار تھے یا نہیں" — بڑی بیوی نے کہا — "حسن بن صباح نے انہیں چلہ کشی جیسی گمراہی میں ڈال دیا ہے"۔

"نہیں!" — امام شافی نے کہا — "انہیں حسن بن صباح نے نہیں بلکہ اپنے نفس نے اس گمراہی میں ڈالا ہے۔ انسان جب اپنی خواہشات کا غلام ہو جاتا ہے تو وہ ایسے ہی جھوٹے سہارے تلاش کرتا ہے ..... بہرحال میں وہاں جاؤں گا اور امیرِ شہر کو واپس لانے کی کوشش کروں گا"۔

"آپ وہاں نہ جائیں" — بڑی بیوی نے کہا — "وہاں پہرے لگے ہوئے ہیں۔ امیرِ شہر نے بھی حکم جاری کیا ہے کہ کوئی بھی اس علاقے کی طرف نہ جائے جہاں وہ چلہ کشی کر رہے ہیں۔ اس حکم میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ کوئی آدمی اُدھر جائے

دکھا گیا تو اسے دُور سے تیر مار دیا جائے گا"۔

"امیرِ شہر گھر میں ایک دو خوبصورت اور نوجوان لڑکیاں لانا چاہتے ہیں"۔۔۔ چھوٹی بیوی نے کہا ۔۔۔ "یہ تو کوئی معیوب بات نہیں۔ وہ دو بیویاں اور لا سکتے ہیں۔ ہم دونوں ان کا استقبال کریں گی لیکن امیرِ شہر اس نئے امام کے فریب میں آگئے ہیں۔ کیا امیرِ شہر کے لئے خوبصورت اور نوجوان لڑکیوں کی کمی ہے؟"

اُس دَور میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ امراء کے گھروں میں دو دو' تین تین اور بعض کے ہاں چار چار بیویاں بھی ہوتی تھیں۔ چونکہ یہ ایک رواج تھا اس لئے بیویاں آپس میں لڑتی نہیں تھیں نہ ان میں سوکنوں والی رقابت ہوتی تھی۔ یہاں تک بھی ہوتا تھا کہ کوئی بیوی اپنے طور پر اپنے خاوند کے لئے کوئی خوبصورت لڑکی لے آتی اور اسے اپنے خاوند کے ساتھ بیاہ دیتی تھی۔

"محترم امام!" ۔۔۔ بڑی بیوی نے کہا ۔۔۔ "ہمارے شوہر کو واپس لے آئیں۔ ہمیں خزانے نہیں چاہئیں۔ ہمیں اپنے شوہر کی ضرورت ہے"۔

"میں اس نئے امام حسن بن صباح سے ملوں گا" ۔۔۔ امام شامی نے کہا ۔۔۔ "پہلے تو یہ دیکھوں گا کہ یہ شخص ہے کیا اور یہ کر کیا رہا ہے۔ میں نے یہ دیکھنا ہے کہ اس شخص کے پاس کوئی علم ہے بھی یا نہیں"۔

مہدی علوی کے گھر سے اٹھ کر امام شامی حسن بن صباح کے ہاں چلا گیا۔ حسن بن صباح کے ایک آدمی نے اندر اطلاع دی کہ امام شامی آئے ہیں۔ یہ کہنے کی بجائے کہ امام شامی کو اندر بھیج دو' وہ اٹھا اور دوڑتا ہوا اُس کمرے میں گیا جہاں امام شامی کو بٹھایا گیا تھا۔ وہ امام شامی کے سامنے فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا' اُس کے پاؤں چھوئے پھر گھٹنے چھوئے پھر اپنا سر امام شامی کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ امام شامی نے اُس کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اوپر کیا اور اسے کہا کہ وہ ان کے پاس بیٹھ جائے۔

"نہیں امام!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ۔۔۔ "میں اس قابل نہیں کہ آپ جیسے عظیم امام اور خطیب کی برابری میں بیٹھوں۔ میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ آج آپ کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ میں نے آپ کی شہرت برسوں پہلے سنی تھی اور تب ہی سے چلا آرہا ہوں۔

یہاں آکر پتہ چلا کہ آپ تو کئی برسوں سے خانہ کعبہ میں بیٹھ کر عبادت کر رہے ہیں۔ میں علم کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ یہاں آیا تو کچھ لوگوں نے بتایا کہ امام شامی واپس آجائیں تو تم یوں سمجھو کہ علم و فضل کا چشمہ پھوٹ پڑا ہے۔ آپ مجھے اپنے قدموں میں بٹھالیں اور میری تشنگی کی تسکین کریں"۔

"میں نے تو کچھ اور سنا ہے" ۔۔۔ امام شامی نے کہا ۔۔۔ "میں نے سنا ہے کہ تم امام کہلاتے ہو اور کچھ لوگوں نے تمہیں نبی بھی کہنا شروع کر دیا ہے"۔

"یہ ان لوگوں کی سادگی ہے' بھول ہے" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "میں نے تو امامت کا بھی دعویٰ نہیں کیا' آپ کہہ رہے ہیں کہ کچھ لوگ مجھے نبی ماننے ہیں۔ میں ان لوگوں کو کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میں اگر دن رات عبادت میں لگا رہتا ہوں تو یہ میری اپنی ذات کے لئے ہے۔ میں کسی کی قسمت تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہ وہی بات ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کہ سزا اور جزا کا انحصار تمہارے اپنے اعمال پر ہے۔ ہر انسان دنیا سے ہی اپنی جنت اور اپنا جہنم لے کر جاتا ہے"۔

"یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو" ۔۔۔ امام شامی نے کہا ۔۔۔ "لیکن یہ چلّہ کشی دینِ اسلام میں تم کہاں سے لے آئے ہو؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا اشارہ امیرِ شہر مہدی علوی کی طرف ہے" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ وہ چلّہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں روکا تھا لیکن وہ اسے عبادت کے رنگ میں لیتے ہیں۔ میں نے انہیں بہت کچھ سمجھایا تھا لیکن حقیقت یہ ہے محترم امام! امیرِ شہر اپنے نفس کے غلام ہو گئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ انہیں چلّہ کرنے دوں لیکن میرے ذہن میں عبادت تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ چالیس روز جنگل میں جا بیٹھیں اور یوں عبادت کریں کہ اس دنیا سے تعلق توڑ دیں۔ اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ دنیا سے لاتعلق ہو کر جب یہ عبادت کریں گے تو چالیس دنوں بعد یہ دنیا کو بھولے ہوئے ہوں گے"۔

امام شامی عالمِ دین تھے اور معمر بھی تھے۔ ان کی عمر کا اندازہ اس سے ہوتا تھا کہ ان کے سر اور داڑھی کا کوئی ایک بھی بال سیاہ نہیں رہا تھا۔ ان کی آنکھوں کا نور بھی کم ہو چکا تھا پھر بھی اُن کی آنکھوں میں ایک چمک تھی جو علم و دانش اور روح کا نور

تھا۔ انہوں نے کتابیں بھی پڑھی تھیں، دنیا کے اچھے بڑے انسانوں کو بھی پڑھا تھا لیکن حسن بن صباح وہ انسان تھا جس کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ملتا تھا نہ انہوں نے ایسا انسان پہلے کبھی دیکھا تھا۔ وہ جب باتیں کر رہا تھا تو امام شافی نے صاف طور پر محسوس کیا کہ یہ شخص عام انسانوں کی سطح سے یا تو بالا ہے یا بہت ہی پست، بہرحال حسن بن صباح کو انہوں نے سمجھنے میں دشواری محسوس کی۔

"میں امیر شہر کے پاس جاؤں گا" ــــ امام شافی نے کہا ــــ "میں اُسے واپس حقیقی دنیا میں لے آؤں گا"۔

"چلو امام محترم!" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "اگر آپ انہیں لے آئیں تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے ان پر نہیں بلکہ مجھ پر احسان کیا ہے۔ جو بات میں انہیں سمجھانا چاہتا تھا' ہو سکتا ہے وہ آپ کی زبان سے سمجھ جائیں"۔

اگر حسن بن صباح امام شافی کے ساتھ اس مسئلے پر بحث میں الجھ جاتا تو امام شافی کا رویہ اور ان کا استدلال کچھ اور ہوتا لیکن حسن بن صباح نے ایسی فریب کاری کا انداز اختیار کر لیا تھا کہ امام شافی نے کچھ بھی کہنا مناسب نہ سمجھا تھا نہ وہ اس شخص کی اصل نیت کو سمجھ سکے۔ وہ اٹھے اور کچھ کہے بغیر وہاں سے آ گئے۔ ان کے باہر نکلتے ہی حسن بن صباح اپنے کمرے میں چلا گیا اور اس نے اپنے تین بڑے ہی خاص آدمیوں کو بلایا اور انہیں کچھ ہدایات دینے لگا۔

○

اُس روز ظہر کی نماز کے وقت مسجد میں نمازیوں کی تعداد بہت ہی زیادہ تھی کیونکہ سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کے محبوب امام اور خطیب امام شافی آ گئے ہیں۔ انہوں نے امام شافی کے پیچھے نماز پڑھی لیکن عصر کی نماز کے وقت امام مسجد میں نہ آیا۔ مغرب کی نماز کے وقت بھی امام شافی غیر حاضر تھے اور عشاء کی نماز کے وقت بھی لوگوں کا محبوب امام لاپتہ تھا۔ ان کے گھر سے پتہ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ عصر کی نماز کے بعد کہیں چلے گئے تھے۔ ایک معمہ تھا جو حل نہ ہو سکا۔ کوئی بھی نہ تھا جو یہ بتاتا امام شافی کہاں چلا گیا ہے۔ دو یا تین آدمیوں نے بتایا کہ امام کو شہر سے باہر جاتے دیکھا گیا تھا۔ رات کو انہیں کہاں تلاش کیا جاتا' لوگ صبح کا انتظار کرنے لگے۔

فجر کی نماز کے وقت بھی امام شافی نہ آئے لیکن نماز کا وقت گزر گیا تو شہر میں ایک سنسنی خیز خبر پھیل گئی جو یہ تھی کہ ایک آدمی شہر کے باہر سے آ رہا تھا تو اس نے ویرانے میں ایک درخت کے تنے کے ساتھ کسی کا کٹا ہوا سر لٹکتا دیکھا۔ اس نے اچھی طرح دیکھا تو اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ یہ سر امام شافی کا تھا جو بڑی صفائی سے جسم سے کاٹا گیا تھا۔ لوگ حیران اس پر ہوئے کہ امام شافی کے ساتھ کسی کی کیا دشمنی ہو سکتی تھی کہ انہیں اس بیدردی سے قتل کیا گیا ہے۔

یہ خبر حسن بن صباح کو پہنچائی گئی تو وہ دوڑتا باہر نکلا۔ لوگوں میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ حسن بن صباح نے گھوڑا منگوایا اور اس پر سوار ہو کر اُس طرف چل پڑا جدھر بتایا گیا تھا کہ امام شافی کا سر درخت کے ساتھ لٹکتا دیکھا گیا ہے۔ شہر کے لوگ ہجوم کر کے اس کے ساتھ دوڑے جا رہے تھے۔

حسن بن صباح اُس درخت تک پہنچا جہاں ابھی تک امام شافی کا سر لٹک رہا تھا۔ اُس نے سر دیکھا۔ یہ درخت کے ایک تنے کے ساتھ بالوں سے بندھا ہوا تھا۔ امام شافی کے بال شانوں تک لمبے تھے۔

"یہ دیکھو ایک بازو!" ــــ کسی آدمی کی بڑی ہی بلند اور گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

لوگ اُس طرف دیکھنے لگے اور پھر سب اُس طرف دوڑ پڑے۔ حسن بن صباح بھی اُس طرف گیا اور گھوڑے سے اُتر کر بازو دیکھا جو کندھے سے کاٹا گیا تھا۔

"سب لوگ اِدھر اُدھر پھیل جاؤ" ــــ حسن بن صباح نے اعلان کیا ــــ "امام کے جسم کے کچھ اور ٹکڑے ملیں گے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ ان کا قاتل کون ہے۔ وہ انسان نہیں' کسی اور دنیا کی مخلوق ہے جو یقیناً جنات میں سے ہو گی"۔

لوگ اِدھر اُدھر بکھر گئے اور تلاش کرنے لگے۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد آوازیں آنے لگیں ــــ "یہ ایک ٹانگ پڑی ہے" ــــ پھر کچھ دور سے آواز آئی ــــ "یہ ایک بازو پڑا ہے" ــــ اس طرح آوازیں آتی رہیں اور امام شافی کے کٹے ہوئے اعضاء مل گئے۔ بازو الگ اور ٹانگیں الگ پھینک دی گئی تھیں۔

معدی علوی رات بھر ٹیلے میں بیٹھا رہا تھا اور صبح طلوع ہوتے ہی وہ سو گیا تھا۔ اُس کا خیمہ وہاں سے کچھ دور تھا اور چٹانوں کی اوٹ میں تھا۔ اُسے پتہ ہی نہ چلا کہ

امام شاہی قتل ہو چکا ہے اور اس کے جسم کے کٹے ہوئے اعضا اکٹھے کئے جا چکے ہیں۔ لوگوں پر خوف و ہراس طاری ہو گیا تھا اور حسن بن صباح کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے اور اس سے پوچھنے لگے کہ یہ حادثہ کس طرح ہُوا ہے۔ حسن بن صباح پہلے جا چکا تھا کہ امام شاہی کے قاتل جنات ہیں۔ اب اس نے دیکھا کہ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے ہیں تو اس نے لوگوں کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

"لوگو! ہوش میں آؤ اور میری بات غور سے سنو" — حسن بن صباح نے گھوڑے پر سوار ہو کر بڑی ہی بلند آواز میں کہا — "تم سب جانتے ہو کہ امیرِ شہر یہاں سے تھوڑی دور آگے چلہ کشی کر رہے ہیں۔ تمام شہر میں یہ اعلان کرا دیا گیا تھا کہ کوئی شخص اس طرف نہ آئے۔ لوگوں کو روکنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ امیرِ شہر کی چلہ کشی میں خلل نہ پڑے اور اصل وجہ یہ تھی کہ وہ ایسا چلہ کر رہے ہیں کہ بہت سے جنات اس علاقے میں آ گئے ہیں۔ امیرِ شہر جو وظیفہ پڑھتے ہیں اس میں ایسا اثر ہے جو جنات کو متاثر کر لیتا ہے اور وہ وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی اس خیال سے اِدھر آئے کہ امیرِ شہر کو چلہ کشی کی حالت میں دیکھے تو جنات اسے روکتے ہیں، اور اگر وہ نہ رکے تو اس کا وہی حال کر دیتے ہیں جو تم لوگوں نے اپنے امام کا دیکھا ہے۔ اسی لئے میں نے انتظام کر دیا تھا کہ یہاں دور دور کچھ آدمی بٹھا دیے تھے جو کسی کو ادھر آنے نہیں دیتے تھے۔ میں تم سب کے سامنے ان آدمیوں سے پوچھتا ہوں کہ انہوں نے امام کو اس طرف آتے دیکھا ہو گا؟"

"یا امام!" — ہجوم میں سے ایک آدمی کی آواز سنائی دی — "میں نے کل شام سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے امام شاہی کو اس طرف آتے دیکھا تھا۔ میں ان کی طرف دوڑا اور انہیں روک دیا اور بتایا کہ وہ آگے نہ جائیں۔ انہیں وجہ بھی بتائی لیکن انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا اور کہا کہ وہ ضرور آگے جائیں گے۔ میں فیصلہ نہ کر سکا کہ میں امام حسن بن صباح کا حکم مانوں یا امام شاہی کا۔ امام شاہی کے سامنے میری حیثیت ہی کیا تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ اللہ کے برگزیدہ اور عظیم امام ہیں۔ جنات ان کے قریب آنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ میں ان کے راستے سے ہٹ گیا۔ وہ آگے چلے گئے اور پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے کیونکہ آگے ٹیلے بھی تھے اور چٹانیں بھی۔ یہ تو صبح میرے ایک ساتھی نے مجھے بتایا کہ امام شاہی کا سر ایک

درخت کے تنے کے ساتھ بالوں سے بندھا ہُوا ہے۔ اب تم سب نے دیکھ لیا ہے کہ ان کے جسم کو کاٹ کر جنات نے کس طرح بکھیر دیا ہے"۔

لوگوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ حسن بن صباح نے ہجوم پر نظر گھمائی۔ اس نے ہر کسی کے چہرے پر خوف کا تاثر دیکھا۔

"اتنا زیادہ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں" — حسن بن صباح نے لوگوں سے کہا — "تم لوگ اب احتیاط کرنا کہ کوئی بھی اس علاقے میں نہ آئے۔ میں اس قاتل جن کو حاضر کر کے زندہ جلا دوں گا"۔

لوگ آہستہ آہستہ شہر کی طرف چل پڑے۔ حسن بن صباح گھوڑے پر سوار کسی اور طرف چلا گیا۔

قتل کی یہ ہولناک واردات یوں ہوئی تھی کہ امام شاہی جب حسن بن صباح کے گھر سے نکلا تھا تو حسن بن صباح نے اپنے آدمیوں کو بلایا تھا۔ انہیں جو ہدایات دی تھیں وہ یہ تھیں کہ وہ امام شاہی پر نظر رکھیں۔ اگر وہ اُس طرف جاتا ہے جہاں مہدی علوی چلہ کشی کر رہا ہے تو اسے وہیں کہیں ختم کر دیں۔

"یا امام!" — حسن بن صباح کے ایک دستِ راست نے کہا — "یہ نہ کہیں کہ اگر وہ ادھر جائے تو اسے قتل کیا جائے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ امام شاہی کا اس شہر کے لوگوں پر اس قدر اثر و رسوخ ہے کہ لوگ اسے پیر اور مرشد مانتے ہیں۔ میں نے گھوم پھر کر دیکھا ہے پھر آپ سے یہ بات کر رہا ہوں۔ اگر یہ شخص الموت میں رہا تو کوئی بعید نہیں کہ یہ ہمارے خلاف محاذ بنا لے اور ہم نے اس شہر کے لوگوں میں جس طرح اثر پیدا کیا ہے وہ رائیگاں چلا جائے۔ اس آدمی کا اس شہر میں رہنا بلکہ اس دنیا میں رہنا خطرناک ہو گا۔

"تو اسے ختم کر دو" — حسن بن صباح نے کہا — "لیکن قتل اس طرح کرو کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ کسی انسان نے قتل کیا ہے۔ یہ مہدی علوی کے پاس ضرور جائے گا۔ اسے اس ویرانے میں قتل کرو اور اس کے بازو، ٹانگیں، سر کاٹ کر الگ الگ پھینک دو پھر میں آ کر لوگوں کو بتاؤں گا کہ اس کا قاتل کون ہے۔ پھر لوگ اسے بھول جائیں گے اور میرے اور زیادہ معتقد ہو جائیں گے"۔

امام شاہی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ وہ اُسی شام موت کی وادی کی طرف چل

پڑا اور حسن بن صباح کے آدمیوں نے اُسے اُسی طرح قتل کر دیا جس طرح حسن بن صباح نے بتایا تھا اور پھر اس ابلیس بنے لوگوں سے منوا لیا کہ یہ قتل جنات نے کیا ہے۔

○

سورج غروب ہونے کو تھا جب امام شافی کو قبر میں اتار دیا گیا۔ نماز جنازہ حسن بن صباح نے پڑھائی تھی اور اس کے بعد اُس نے امام شافی کی وفات پر ایسی نوحہ خوانی کی تھی کہ لوگوں کے آنسو ہی نہیں بلکہ سسکیاں اور ہچکیاں نکل آئی تھیں۔

اگلی صبح حسن بن صباح مہدی علوی سے ملنے چلا گیا۔ مہدی علوی خیمے میں زمین پر بچھے ہوئے بستر پر گہری نیند سویا ہوا تھا۔ یہ چلے کا آٹھواں یا نواں دن تھا۔ خادم نے اسے جگایا اور بتایا کہ امام حسن آئے ہیں۔ مہدی علوی ہڑبڑا کر اٹھا۔ حسن بن صباح خیمے میں آکر اس کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ اُس نے مہدی علوی کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ مہدی علوی پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں اور اس کی ذہنی حالت کیا ہے۔

"کیا آپ یہ چلہ جاری رکھ سکیں گے؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ہاں امام!" — مہدی علوی نے جواب دیا — "میں چلہ جاری رکھوں گا۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی بلکہ ایک عجیب سا سرور محسوس ہوتا ہے جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ تصورات بہت ہی حسین ذہن میں آتے ہیں اور یہ اپنے آپ ہی آجاتے ہیں"۔

"آپ کو تو سکون ملتا ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "لیکن آپ کے ارد گرد جو علاقہ ہے یہ بڑا ہی خطرناک ہو گیا ہے۔ میں نے آپ کو جو وظیفہ بتایا ہے اس کے اثرات پوری کائنات پر ہوتے ہیں۔ یہ دراصل سلیمان علیہ السلام کا وظیفہ ہے جو جنات پڑھا کرتے تھے۔ آپ کے خیمے کے ارد گرد جنات کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا ہے۔ یہ اس وظیفے کی کشش اور جنات کی عقیدت مندی ہے"۔

"تو کیا یہ جنات مجھے نقصان نہیں پہنچائیں گے؟" — مہدی علوی نے ذرا ڈرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں امیرالموت!" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "یہ تو آپ کی خوش

نصیبی کی نشانی ہے کہ آپ کا پڑھا ہوا وظیفہ کائنات پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ جنات انسانوں کے روپ میں آکر آپ کے آگے سجدہ ریز ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو آپ ڈریں بالکل نہیں۔ وہ خاموشی سے آپ کا ورد سنتے رہیں گے اور پھر چلے جائیں گے"۔

"مجھے یہ بتائیں کہ سونے کی یہ تین اینٹیں کس طرح برآمد ہوئی ہیں؟" مہدی علوی نے پوچھا — "کیا سلے کے نیچے سے مزید خزانہ برآمد ہو گا؟"

"میں گذشتہ رات سو نہیں سکا" — حسن بن صباح نے کہا — "سونے کی یہ تین اینٹیں ایک اشارہ ہے۔ میں رات بھر مراقبے میں رہا ہوں۔ معلوم یہ کرنا تھا کہ یہ کیسا اشارہ ہے۔ صبح کاذب کے وقت مجھے یہ راز معلوم ہوا ...... خزانہ برآمد ہو گا لیکن ابھی یہ پتہ نہیں چل رہا کہ وہ خزانہ کہاں سے برآمد ہو گا۔ مجھے امید ہے کہ پندرہ سولہ دنوں بعد یہ بھی پتہ چل جائے گا۔ سونے کے یہ تین ٹکڑے ایک بڑا واضح اشارہ ہیں کہ آپ کو تین اور شہر ملیں گے پھر الموت کو ملا کر ان چار شہروں کی ایک سلطنت بن جائے گی جس کے سلطان آپ ہوں گے۔ اس سلطنت کو حاصل کرنے کا طریقہ یہی ایک ہے کہ آپ اسی طرح صبر و تحمل اور پوری یکسوئی کے ساتھ پورے چالیس دن یہ وظیفہ پورا کر دیں"۔

مہدی علوی کو باقاعدہ حشیش پلائی جا رہی تھی۔ خادم حشیش کی مقدار میں اضافہ کرتا چلا جا رہا تھا۔ اسے اونٹنی کا دودھ پینے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ یہ دودھ ہر روز اس کے خیمے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ اس میں بھی ذرا سی حشیش ڈال دی جاتی تھی۔ کچھ تو اُس کی اپنی خواہشات کے تصور تھے جو اس کے ذہن میں نکھرتے ہی چلے آرہے تھے، کچھ حسن بن صباح کی باتوں کے اثرات تھے کہ مہدی علوی کے ذہن سے اترتا جا رہا تھا کہ وہ الموت کا امیر ہے اور اس کی حیثیت ایک بادشاہ جیسی ہے۔

"میں آپ کو ایک بُری خبر سنا رہا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "آپ کے محبوب امام شافی اچانک حجاز سے واپس آگئے تھے۔ انہیں پتہ چلا کہ آپ یہاں چلہ کشی میں بیٹھے ہیں تو وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ وہ آپ کو چلہ کشی سے روکیں گے۔ میرے دل میں امام شافی کا بے تحاشا احترام ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ آپ کی چلہ کشی میں مداخلت نہ کریں ورنہ اس میں آپ کی جان جانے کا خطرہ

ہے اور امیر الموت کے لئے بھی بہت بڑا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ان کی اور ہم سب کی بدقسمتی کہ وہ نہ مانے اور کل آپ کے پاس آنے کے لئے چل پڑے۔ ہمیں اطلاع ملی کہ ان کا سر دیرانے میں ایک درخت کے ساتھ بالوں سے لٹک رہا تھا۔ مجھے صاف پتہ چل گیا کہ انہیں جنات نے کاٹ کر پھینک دیا تھا کیونکہ وہ جنات کے پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام کے وظیفے کی توہین کر رہے تھے۔ یہ توہین تھی کہ وہ آپ کو اس وظیفے سے ہٹانے آ رہے تھے۔ کل میں نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی ہے اور انہیں سپردِ خاک کر دیا گیا ہے"۔

حسن بن صباح کو توقع تھی کہ مہدی علوی کا ردِّ عمل بڑا ہی شدید ہو گا اور وہ روئے گا کیونکہ وہ امام شافعی کا معتقد تھا بلکہ اس کا مرید تھا لیکن اس نے اپنے امام کی موت کی خبر سنی تو اس کا چہرہ بے تاثر رہا جیسے اس پر ذرا سا بھی اثر نہ ہوا ہو۔ اس کی آنکھیں خشک رہیں۔ اُس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ حسن بن صباح نے جب یہ دیکھا کہ مہدی علوی نے کوئی اثر لیا ہی نہیں تو وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ وہ مہدی علوی کی حسیّات مُردہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"میں یہ چلّہ پورا کروں گا اور امام محترم!" — مہدی علوی نے کہا — "یہ دیکھنا آپ کا کام ہے کہ میں اس میں کامیاب ہو جاؤں گا یا نہیں"۔

"وہ تو میں دیکھ چکا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "اور میں آپ کو بتا بھی چکا ہوں۔ سونے کی تین اینٹوں کا برآمد ہونا وظیفے کی کامیابی کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے..... اور امام شافعی کا جنات کے ہاتھوں قتل ایک اور ثبوت ہے۔ آپ دلجمعی سے چلّہ جاری رکھیں"۔

"کیا میں اونٹنی کا دودھ ہی پیتا رہوں؟" — مہدی علوی نے پوچھا۔

"ہاں!" — حسن بن صباح نے کہا — "آج کا دن ملا کر دو دن اور آپ اونٹنی کے دودھ پر ہی رہیں گے۔ اس کے بعد آپ اس دودھ کے ساتھ دن رات میں صرف ایک بار آدھی روٹی کھا سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں"۔

حسن بن صباح نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اتنے تندرست اور اتنے صحت مند جسم والا امیر شہر غذائیت کی کمی کی وجہ سے کچھ کمزور ہو گیا تھا۔ حسن بن صباح نے اسے اور زیادہ کمزور کرنا تھا۔

حسن بن صباح مہدی علوی کی اور زیادہ حوصلہ افزائی کر کے وہاں سے آ گیا۔ مہدی علوی نے حسن بن صباح کی جو پیش گوئیاں سنی تھیں انہوں نے اسے نہایت حسین اور دل پسند تصوروں میں دھکیل دیا۔

سات آٹھ دن اور گزر گئے۔ مہدی علوی اب ایسی ذہنی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا جس میں اس کے ذہن کے تصورات حقیقی زندگی کی صورت میں محسوس ہونے لگے اور حقیقی زندگی اس کے ذہن سے بہت حد تک نکل گئی۔

چودہ سولہ دن گزر گئے تو حسن بن صباح ایک بار پھر مہدی علوی کے خیمے میں گیا۔ اُس نے مہدی علوی کے چہرے کا اور ذہنی کیفیت کا اندازہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ بڑے اچھے نتائج حاصل کر رہا ہے۔ مہدی علوی بڑی جاندار آواز میں بولتا تھا لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کا ذہنی توازن صحیح نہیں رہا۔ یہ شخص اس طرح زندگی کی حقیقتوں سے کٹ گیا ہے جس طرح ہرے بھرے درخت کی ایک شاخ کٹ کر گر پڑتی ہے۔ اس شاخ کو سوکھ کر پتا پتا ہو جانا ہوتا ہے۔ یہی کیفیت مہدی علوی کی ہو رہی تھی۔

"کیا آپ کچھ اور بھی دیکھ رہے ہیں؟" — حسن بن صباح نے پوچھا — "کوئی اور چیز آپ کو نظر آئی ہو؟"

"ہاں محترم امام!" — مہدی علوی نے مخمور سی آواز میں کہا — "میں نے گزشتہ رات ایک عجیب چیز دیکھی ہے۔ میں وظیفے میں مصروف تھا کہ ایک انتہائی خوبصورت لڑکی اس طرح میرے سامنے سے گزر گئی جیسے وہ چل نہیں رہی تھی بلکہ بادلوں پر تیر رہی تھی۔ میں چونکہ وظیفے میں مصروف تھا اس لئے میں نے اس کی طرف زیادہ نہ دیکھا۔ اتنا ہی دیکھا کہ وہ میرے سامنے سے گزری اور غائب ہو گئی۔ میں تو کہوں گا کہ وہ آسمان سے اتری ہوئی حور تھی..... میں نے اپنی پوری کی پوری توجہ وظیفے پر مرکوز کر دی۔ ذرا ہی دیر بعد ایک اور لڑکی جو پہلی جیسی حسین اور دلکش تھی میرے سامنے سے گزر گئی۔ میں کچھ ذرا بھی اور گھبرایا بھی لیکن اپنے آپ کو یقین دلایا کہ یہ آسمان کی مخلوق ہے۔ پھر یہ خیال بھی آیا کہ یہ جنات ہی نہ ہوں جو آپ نے بھی کہا تھا کہ انسان کے روپ میں آ سکتے ہیں"۔

"ابھی کچھ اور چیزیں بھی آپ کو نظر آئیں گی" — حسن بن صباح نے کہا —

"آپ جو کچھ بھی خدا سے مانگ رہے ہیں وہ سب کچھ آپ کو مل جائے گا۔ یہ خدائی اشارے ہیں۔ سونے کے تین ٹکڑوں کا اشارہ آپ کو بتایا ہے۔ اب آپ نے دو لڑکیاں دیکھی ہیں۔ آپ خود ہی سمجھ لیں کہ آپ کی یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی جس طرح آپ چاہتے ہیں"۔

معدی علوی یہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ دو لڑکیاں حسن بن صباح کی بھیجی ہوئی ہو سکتی ہیں۔ کوئی اُسے بتاتا تو بھی وہ یقین نہ کرتا کیونکہ رات کے وقت شہر سے دور اس ویرانے میں کوئی لڑکی نہیں آ سکتی تھی۔ حقیقت یہ تھی جس سے وہ بے خبر تھا کہ یہ دونوں لڑکیاں شام کو ہی وہاں پہنچا دی گئی تھیں۔ معدی علوی مصلے پر بیٹھ چکا تھا۔ لڑکیاں خادم کے خیمے میں بیٹھی رہیں۔ انہیں ایسے لباس پہنائے گئے تھے جو عام طور پر لڑکیاں نہیں پہنا کرتی تھیں۔ وہ رنگ دار باریک ریشمی کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود وہ عریاں لگتی تھیں کیونکہ کپڑے بہت ہی باریک تھے۔ وہ جب معدی علوی کے آگے سے گزری تھیں تو ان کی چال عام چال نہیں تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ قدم اٹھا نہیں رہیں بلکہ زمین پر کھڑے کھڑے تیرتی جا رہی ہوں۔

○

آخر چالیسویں رات بھی گزر گئی۔ معدی علوی کو اچھلتے کودتے نعرے لگاتے خیمے سے باہر آنا چاہئے تھا لیکن وہ اس طرح سر جھکائے ہوئے باہر جا رہا تھا جیسے اُس نے منوں بوجھ اٹھا رکھا ہو۔ خیمے سے باہر آ کر اس نے دیکھا۔ اسے اس کے خادم کا خیمہ نظر نہ آیا۔ اُس نے خادم کو پکارا' بہت آوازیں دیں لیکن اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ آہستہ آہستہ شہر کی طرف چل پڑا۔ اسے تو جیسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ اس نے چالیس راتیں چلّہ کیا ہے' اور شاید وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس نے چلّہ کیوں کیا تھا۔ اس کا دماغ کسی وقت روشن ہو کر سوچنے کے قابل ہو جاتا لیکن فوراً ہی بعد دماغ پھر سو جاتا۔ اُس کے ذہن میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس کا ذہن ذرا سا اپنے آپ میں آتا تو اُسے یاد آتا کہ یہاں وہ اکیلا نہیں تھا پھر وہ پریشان ہو جاتا کہ وہ اکیلا کیوں ہے۔ اُس کا ذہن پھر خالی ہو جاتا اور اسی کیفیت میں وہ قدم گھسیٹ گھسیٹ کر چلا گیا۔ وہ لاشعوری طور پر چلا جا رہا تھا یا جیسے وہ خواب میں چل رہا ہو۔

سورج بہت اوپر آ گیا تھا جب حسن بن صباح کو اُس کے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ امیرالموت آ رہا ہے۔ حسن بن صباح اس کے انتظار میں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ معدی علوی کس حالت میں واپس آئے گا۔ حسن بن صباح باہر نکل آیا اور اس نے دیکھا کہ معدی علوی چلا آ رہا ہے۔ وہ قدم گھسیٹ رہا تھا۔ اُس کا حال' حلیہ اس قدر بدل گیا تھا کہ حسن بن صباح کو یہ نہ بتایا جاتا کہ امیرالموت آ رہا ہے تو وہ اُسے پہچان ہی نہ سکتا۔ اُس کی داڑھی سلیقے سے تراشی ہوئی ہوتی تھی لیکن چالیس دنوں میں داڑھی لمبی اور بے ترتیب ہو گئی تھی۔ اس کے سر کے بال بھی کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ حسن بن صباح اسے اپنے مکان کی طرف آتا دیکھتا رہا' حتیٰ کہ معدی علوی حسن بن صباح کے سامنے آ رکا۔

"آ گئے امیرالموت!" — حسن بن صباح نے بے رخی سے پوچھا — "اندر آ جائیں"۔

"پانی پلاؤ!" — معدی علوی نے نحیف سی آواز میں کہا — "بہت تھک گیا ہوں..... پانی پلاؤ"۔

حسن بن صباح اُسے اندر لے گیا اور اپنے کمرے میں بٹھایا۔ اُس نے ایک آدمی سے کہا کہ اسے سادہ پانی پلاؤ۔ معدی علوی کو سادہ پانی دیا گیا جو اس نے پی لیا۔

"مجھے پانی پلاؤ" — معدی علوی نے ذرا جاندار آواز میں کہا۔

"امیرالموت!" — حسن بن صباح نے کہا — "پانی تو آپ پی چکے ہیں"۔

"یہ پانی نہیں" — معدی علوی نے ذرا غصیلی آواز میں کہا — "جو وہاں مجھے خادم پلایا کرتا تھا"۔

حسن بن صباح سمجھتا تھا کہ یہ کون سے پانی کی طلب محسوس کر رہا ہے' پھر بھی اُس نے اسے شربت پلایا۔ معدی علوی نے شربت پی لیا۔

"میں وہ پانی مانگ رہا ہوں" — معدی علوی نے اب کے ذرا بلند آواز میں کہا۔

وہ دراصل اُس پانی کا عادی ہو گیا تھا جو اُسے چالیس روز خادم پلاتا رہا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اس پانی میں حشیش ملی ہوئی ہوتی تھی۔ وہ جو سرور محسوس کرتا تھا اسے وہ روحانی سکون سمجھتا تھا اور اس سکون کو وظیفے کی فضیلت کہتا تھا۔ گزشتہ شام

اُس نے حشیش والا پانی پیا تھا۔ وہ وظیفے کے دوران بھی رات کو یہ پانی پیا کرتا تھا۔ خادم اچھا خاصا پانی اس کے سیتے کے پاس رکھ دیا کرتا تھا۔ گزشتہ شام سے اگلے دن پہلے پہر تک اسے وہ پانی نہیں ملا تھا۔ وہ نشے سے ٹوٹا ہوا تھا۔

"آپ ہیں کون؟" ——— حسن بن صباح نے پوچھا۔

"میں امیرِ الموت ہوں" ——— مہدی علوی نے جواب دیا ——— "میرا نام مہدی علوی ہے"۔

اس کے بعد یوں ہوا کہ الموت کی گلیوں اور بازاروں میں ایک پاگل بلند آواز سے کہتا پھرتا تھا ——— "میں اس شہر کا امیر ہوں ...... میں مہدی علوی ہوں"۔ ——— بہت سے بچے اسے پتھر اور ڈھیلے مار رہے تھے اور وہ آگے آگے بھاگتا پھر رہا تھا۔ اس آدمی کا حلیہ یہ تھا کہ سر کے بال لمبے جو کندھوں پر آئے ہوئے تھے اور کچھ بال چہرے پر گرے ہوئے تھے۔ اس کی داڑھی لمبی تھی اور اس نے میلے کچیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔

"شہر میں آسمان سے حوریں اتریں گی" ——— یہ پاگل کہتا پھر رہا تھا ——— "میں آسمان سے خزانے لاؤں گا۔ مجھ پر آسمان سے خزانے اتریں گے۔ میں اس شہر کا امیر ہوں۔ حوریں آئیں گی، میں تمہارا امیر ہوں"۔

وہ اپنے گھر کی طرف گیا۔ یہ گھر مہدی علوی کا تھا۔ وہ جب گھر میں داخل ہونے لگا تو وہاں جو دو دربان کھڑے تھے، انہوں نے اسے دھکے دے دے کر باہر نکال دیا۔ اس کی اپنی دونوں بیویوں اور اولاد نے بھی اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ تین چار فوجی آ گئے۔ انہوں نے اس پاگل کو پکڑ لیا اور اسے گھڑ دوڑ کے میدان میں لے گئے۔ سارا شہر اُمڈ کر اس میدان میں اکٹھا ہو گیا۔ فوج کا ایک دستہ وہاں آ گیا۔ سپہ سالار اس کے ساتھ تھا۔ یہ پاگل مہدی علوی ہی تھا اور اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہی اس شہر کا امیر تھا لیکن وہ پاگل ہو چکا تھا اور لوگ مانتے ہی نہیں تھے کہ یہ مہدی علوی ہے۔ سپہ سالار اسے بازو سے پکڑ کر ایک ذرا بلند جگہ پر لے گیا جہاں لوگ اسے اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔

"الموت کے لوگو!" ——— سپہ سالار نے اعلان کیا ——— "یہ شخص پاگل ہے اور سارے شہر میں بدامنی پھیلا رہا ہے۔ کیا آپ اسے امیر شہر تسلیم کریں گے؟"

لوگوں کے ہجوم نے اسے امیر شہر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

"اگر یہ واقعی مہدی علوی ہے" ——— سپہ سالار نے کہا ——— "تو بھی اسے ہم امیر شہر نہیں مانیں گے کیونکہ یہ پاگل ہو چکا ہے"۔

"ہم کسی پاگل کو امیر شہر نہیں بنائیں گے" ——— ہجوم میں سے ایک آواز اٹھی۔

پھر ہجوم نے اس آواز کی تائید میں ایسا شور و غل بپا کیا کہ سوائے اس کے کچھ بھی سنائی نہیں دیتا تھا کہ شہر کے لوگ اس پاگل کو امیر شہر بنانے کی سخت مخالفت کر رہے تھے۔

تاریخوں میں آیا ہے کہ لوگ مخالفت کرتے یا حمایت، پوری کی پوری فوج نے اس پاگل کو امیر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ پوری کی پوری فوج حسن بن صباح کی بنائی ہوئی تھی اور اس میں اس نے اپنے مریدوں کو بھرتی کیا تھا اور انہیں ذہن نشین کرا دیا تھا کہ اس شہر پر قبضہ کرنا ہے۔

سپہ سالار نے لوگوں سے کہا کہ اس اتنے بڑے شہر کے دفاع کے لئے فوج تھی ہی نہیں۔ ہم نے لوگوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے فوج بنائی ہے اور اس کے اخراجات امام حسن بن صباح پورے کر رہے ہیں۔ سپہ سالار نے اعلان کیا کہ یہ فوج کا فیصلہ ہے کہ امام حسن بن صباح کو امیر شہر بنایا جائے۔

اُس وقت تک بے شمار لوگ حسن بن صباح کے مرید بن چکے تھے۔ انہوں نے بیک زبان کہا کہ امیر شہر حسن بن صباح کو بنایا جائے۔ اس طرح حسن بن صباح الموت کا امیر بن گیا۔ اس نے مہدی علوی کی دونوں بیویوں اور اس کی اولاد کا باقاعدہ وظیفہ مقرر کروا دیا۔

○

مہدی علوی کو خوش و خرم، فتح کے نشے سے سرشار خیمے سے نکلنا چاہئے تھا کہ اس نے چالیس راتوں کا چلہ کامیابی سے کاٹ لیا تھا۔ شہر میں آ کر وہ حسن بن صباح سے کہتا کہ اب مجھے اس چلے کے نتائج دکھاؤ لیکن وہ خیمے سے پاگل ہو کر نکلا۔

مزمل آفندی کو قید خانے میں بند کر دیا گیا تھا۔ اُسے چالیس دنوں کے بعد قید خانے سے رہا کر دیا گیا۔ اسے پاگل ہو کر نکلنا چاہئے تھا لیکن وہ جب قید خانے سے نکلا تو اُس کی گردن تنی ہوئی تھی اور اس کی چال ڈھال ایسی تھی جیسے اس شہر کا امیر

وہی ہو اور جو کوئی اس کے راستے میں آئے گا اُسے وہ قتل کر دے گا۔ وہ قید خانے سے نکل کر سیدھا حسن بن صباح کے پاس پہنچا۔ حسن بن صباح نے اُس کا پرتپاک استقبال کیا۔

"آگئے مزمل!" — حسن بن صباح نے اس سے دوستوں کی طرح پوچھا — "اب کیا کرو گے؟"

"میرے کرنے کا ایک ہی کام ہے" — مزمل آفندی نے بڑی دلیری اور جرأت مندی سے جواب دیا — "مرو جاؤں گا اور نظام الملک کو قتل کروں گا"۔

"کب جاؤ گے؟"

"جب آپ حکم دیں گے" — مزمل نے کہا — "کہیں تو میں آج ہی روانہ ہو جاتا ہوں۔ چند دنوں میں نظام الملک کا سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں لا رکھوں گا"۔

حسن بن صباح نے اُسے اپنے پاس بٹھائے رکھا اور اسے اپنے ہاتھوں سے شراب پیش کی۔ اُس رات مزمل نے کھانا بھی حسن بن صباح کے ساتھ کھایا۔

اگلی صبح اسے ایک نہایت اعلیٰ نسل کا گھوڑا دیا گیا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ حسن بن صباح نے باہر آکر اسے رخصت کیا۔ مزمل گھوڑے پر یوں تن کے بیٹھا ہوا تھا جیسے یہ سارا علاقہ دُور دُور تک اس کی سلطنت ہو اور وہ اس کا سلطان ہو۔ اُس کی کمر کے ساتھ ایک تلوار لٹک رہی تھی اور اُس کے پاس بڑا ہی خوبصورت خنجر بھی تھا۔ وہ سلجوقیوں کے دارالسلطنت مرو جا رہا تھا۔

اس عرصے میں سلطان ملک شاہ اور نظام الملک اگر مزمل آفندی کو بھول نہیں گئے تھے تو انہوں نے اسے یاد بھی نہیں رکھا تھا۔ انہیں احمد اوزال نے یقین دلا دیا تھا کہ مزمل قتل ہو چکا ہے اور اب اس کی واپسی کی امیدیں دل سے نکال دی جائیں۔ وہ اگر زندہ تھا تو شمونہ اور اُس کی ماں میمونہ کے دلوں میں زندہ تھا۔ داستان گو پہلے تفصیل سے سنا چکا ہے کہ شمونہ مزمل آفندی پر دل و جان سے قربان ہو رہی تھی۔ یہ محبت جذباتی تو تھی ہی لیکن دونوں کا جذبہ بھی مشترک تھا۔ دونوں حسن بن صباح کو قتل کرنے کا عزم لئے ہوئے تھے۔ شمونہ اور مزمل کی محبت میں رومان کی چاشنی تو تھی ہی لیکن عزم کی گرمی زیادہ تھی۔

مزمل حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ اب شمونہ کے کانوں میں ایک ہی آواز گونجتی تھی کہ مزمل باطنیوں کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔ مزمل کو گئے ڈیڑھ مہینہ گزر گیا تھا۔ جب احمد اوزال خلجان سے بھاگ کر مرو آیا تھا تو اس نے یہ خبر سنائی تھی کہ مزمل آفندی حسن بن صباح کے جال میں آگیا ہے اور اب تک وہ قتل ہو چکا ہو گا۔ سلطان ملک شاہ اور نظام الملک نے تو فوراً مان لیا تھا کہ احمد اوزال جو کچھ کہہ رہا ہے وہی ہُوا ہو گا لیکن شمونہ نہیں مانتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ مزمل زندہ ہے۔ وہ احمد اوزال کے پیچھے پڑ گئی تھی کہ وہ واپس جائے اور مزمل کو ڈھونڈ کر لائے۔ احمد اوزال جانتا تھا کہ یہ حسین لڑکی جذبات کی زد میں بہی جا رہی ہے اور یہ حقیقت کو قبول نہیں کر رہی۔ احمد اوزال نے اسے یقین دلانے کی بہت کوشش کر ڈالی تھی کہ مزمل اس دنیا سے اٹھ گیا ہے لیکن شمونہ چیخ چیخ کر کہتی تھی کہ مزمل مر نہیں سکتا، وہ حسن بن صباح کو مار کر مرے گا۔ یہ الفاظ اُس کی زبان پر چڑھ گئے تھے کہ حسن بن صباح زندہ ہے تو میرا مزمل بھی زندہ ہو گا۔

شمونہ اپنی ماں کو ساتھ لے کر سلطان ملک شاہ کے پاس گئی تھی اور رو رو کر اُس نے سلطان کی منتیں کی تھیں کہ وہ دو تین آدمیوں کو خلجان اور الموت بھیجے جو مزمل کو ڈھونڈ کر واپس لے آئیں۔ سلطان نے اسے بڑے پیار سے اور ہمدردی سے سمجھایا تھا کہ مزمل کے زندہ نکل آنے کی کوئی صورت ہے ہی نہیں۔ پھر وہ نظام الملک کے پاس گئی تھی۔ نظام الملک نے بھی اسے وہی جواب دیا تھا جو سلطان ملک شاہ دے چکا تھا۔

شمونہ احمد اوزال کے لئے مصیبت بن گئی تھی۔ احمد اوزال نے اسے ہر بار یہی کہا تھا کہ وہ خلجان اور الموت جانے سے نہیں ڈرتا لیکن وہاں اسے حسن بن صباح اور اس کے خفیہ آدمی بڑی اچھی طرح سے پہچانتے ہیں اور وہ اس خفیہ گروہ کے دو آدمی قتل کر کے بھاگا ہے۔ وہ فوراً پکڑا جائے گا اور فوراً ہی اسے قتل کر دیا جائے گا۔

"میں خود وہاں چلی جاؤں" — شمونہ نے کئی بار کہا تھا — "لیکن حسن بن صباح کے ساتھ میں رہی ہوں۔ بہت سارے لوگ وہاں مجھے پہچانتے ہیں۔ حسن بن صباح پہلے ہی مجھے قتل کرنے کا حکم دے چکا ہے۔ وہ تو مجھے دیکھتے ہی مار ڈالے گا۔ وہ

نہ دیکھ سکا تو اُس کا کوئی بھی آدمی مجھے پہچان لے گا اور مجھے پکڑ لے گا اور حسن بن صباح کے حوالے کر دے گا"۔

سلطان ملک شاہ نے شمونہ اور اس کی ماں کو مرو میں ایک بڑا اچھا مکان دے دیا تھا جس میں ماں بیٹی اکیلی رہتی تھیں۔ سلطان نے ان کے لئے وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ سلطان اور نظام الملک کے بعد احمد اوزال سے مایوس ہو کر شمونہ نے ماں کو پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ ماں نے کئی بار اسے ڈانٹ دیا اور کہا کہ وہ اپنے دماغ کو اپنے قابو میں رکھے ورنہ وہ پاگل ہو جائے گی۔ وہ مزمل کو بھولتی ہی نہیں تھی اور یہ مانتی ہی نہیں تھی کہ مزمل قتل ہو چکا ہے۔ اس کا یہ روز مرہ کا معمول بن گیا تھا کہ صبح چھت پر چلی جاتی اور اُس راستے کو دیکھتی رہتی تھی جو خلجان سے مرو آتا تھا۔ دن میں کئی بار وہ چھت پر اُس طرف سے آنے والی پگڈنڈی کو دیکھنا شروع کر دیتی۔ کئی بار ماں چھت پر جا کر اُسے گھسیٹتے ہوئے نیچے لائی اور اسے ڈانٹا لیکن شمونہ ایک ہی بات کہتی تھی کہ مزمل زندہ ہے اور وہ واپس آئے گا۔

وہ گھوڑ سواری کی شوقین تھی۔ کبھی کبھی وہ سلطان کے اصطبل سے گھوڑا منگوا لیتی اور شہر سے باہر نکل جایا کرتی تھی۔ گھوڑے کو کچھ دیر دوڑاتی اور گھر آجایا کرتی تھی۔ ایک روز اس نے ماں سے کہا کہ اسے گھوڑا منگوا دے وہ باہر جانا چاہتی ہے۔

"شمونہ!" ــــ ماں نے کہا ــــ "اب میں تمہیں باہر جانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ تمہارا دماغ دن بدن بیکار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ باہر جا کر خلجان کا رخ کر لو گی"۔

"نہیں ماں!" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "میں پہلے جا چکی ہوں کہ میں مزمل کی تلاش میں باطنیوں کے علاقوں میں نہیں جا سکتی۔ میں پہلے نہیں گئی تو اب بھی نہیں جاؤں گی۔ گھر میرا دم گھٹتا ہے۔ مجھے ذرا کھلی ہوا میں گھومنے پھرنے کے لئے جانے دیں"۔

ماں نے اسے گھوڑا منگوا دیا اور وہ گھوڑے پر سوار ہوئی اور باہر نکل گئی۔ اس کی ماں بھی چاہتی تھی کہ یہ لڑکی اسی طرح گھوم پھر کر دل بہلائے رکھے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ تو پاگل ہوتی جا رہی تھی مرو کے ارد گرد بہت ہی دلفریب مناظر تھے۔ ندی بھی قریب سے گزرتی تھی اور ایک جگہ سے چشمہ پھوٹتا تھا لوگ سیر و تفریح کے

لئے وہیں جایا کرتے تھے لیکن شمونہ کو سیر کے لئے وہی پگڈنڈی اچھی لگتی تھی جو خلجان سے آتی تھی۔ اُس روز بھی وہ گھوڑے پر سوار ہوئی، شہر سے نکلی اور گھوڑا اسی پگڈنڈی پر ڈال دیا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ اس پگڈنڈی پر جا کر وہ گھوڑے کو ایڑ لگاتی، گھوڑا سرپٹ دوڑتا اور شمونہ کوس ڈیڑھ کوس جا کر گھوڑا روک لیتی اور وہاں سے واپس آجاتی۔ اُس روز بھی وہ اسی پگڈنڈی پر چلی گئی۔ اُس نے اپنے معمول کے مطابق گھوڑا سرپٹ دوڑا دیا۔ سامنے سے ایک گھوڑ سوار چلا آرہا تھا۔ شمونہ اس کے قریب سے گزری تو اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اُس کا گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔

"شمونہ!" ــــ گھوڑے کے قدموں کے بے ہنگم شور اور ہوا کی شائیں شائیں میں ایک آواز سنائی دی۔ پکارنے والا کوئی آدمی تھا۔

شمونہ نے گھوڑا روک لیا اور پیچھے کو موڑا۔ وہ گھوڑ سوار جو اُس کے قریب سے گزرا تھا، اس نے بھی گھوڑا موڑ لیا اور اس کی طرف بڑی تیزی سے آرہا تھا۔ دونوں گھوڑے قریب آئے اور سواروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"مزمل!" ــــ شمونہ کے منہ سے تو جیسے چیخ نکل گئی ہو۔

شمونہ کود کر گھوڑے سے اُتری ــــ وہ مزمل آفندی ہی تھا۔ بلاشک و شبہ وہ مزمل ہی تھا ــــ نظر کا دھوکہ نہیں تھا اور یہ خواب بھی نہیں تھا۔ شمونہ بازو پھیلا کر مزمل کی طرف دوڑی اور مزمل اُسی کی طرح بازو پھیلا کر اس طرف آیا پھر دونوں ایک دوسرے کے بازوؤں میں جکڑے گئے جیسے دو جسم ایک ہو گئے ہوں۔

"میں ہر روز کہتی تھی کہ میرا مزمل زندہ ہے" ــــ شمونہ یہی الفاظ کہے جا رہی تھی۔

شمونہ کی جذباتی کیفیت اور بے تابی کا یہ عالم تھا جیسے ماں کو اس کا کھویا ہوا بچہ مل گیا ہو۔ وہ مزمل کو اپنے بازوؤں میں سے نکلنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ بچھڑے ہوئے دو دلوں کو اس بے تابی اور دیوانگی سے ملتا ہوا دیکھ کر سورج افق کے پیچھے چھپ گیا اور ان پر شام کا پردہ ڈال دیا۔

رات شمونہ مزمل کو اپنے گھر لے گئی۔ مزمل کو اسی گھر میں آنا تھا۔ شمونہ کی ماں میمونہ نے بھی مزمل کو دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

"میں ابھی وزیراعظم نظام الملک کو اطلاع دیتی ہوں" ــــ میمونہ نے کہا ــــ "وہ سن کر بہت خوش ہوں گے کہ مزمل واپس آگیا ہے۔ یہاں تو سب یقین کیے بیٹھے تھے کہ تم قتل ہو چکے ہو"۔

"نہیں!" ــــ مزمل نے کہا ــــ "اُسے کوئی اطلاع نہیں دے گا۔ میں خود اُس کے پاس جاؤں گا"۔

میمونہ نے مزمل اور شمونہ کو تنہا بیٹھنے کے لئے یوں کیا کہ نیند کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شمونہ یہی چاہتی تھی۔ وہ مزمل کو اپنے کمرے میں لے گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ وہ مزمل سے سننا چاہتی تھی کہ خلجان میں اُس پر کیا بیتی ہے۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ مزمل ذرا رک رک کر اور کچھ سوچ سوچ کر بات کرتا ہے۔

"سلطان اور وزیراعظم نظام الملک کہتے تھے کہ مزمل باطنیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "میں کہتی تھی کہ مزمل زندہ ہے اور وہ واپس آئے گا۔ یہ لوگ نہیں مانتے تھے۔ احمد اوزال بھی یہی کہتا تھا"۔

"نظام الملک چاہتا ہی یہی تھا کہ میں قتل ہو جاؤں" ــــ مزمل نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا ــــ "اب دیکھنا کون کس کے ہاتھوں قتل ہوگا"۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "میں محسوس کر رہی ہوں کہ وہاں تم پر بہت بُری گزری ہے جس کا تمہارے دماغ پر بہت بُرا اثر معلوم ہوتا ہے۔ کس کے قتل کی بات کر رہے ہو؟"

"بہت بُری نہیں شمونہ!" ــــ مزمل نے کہا ــــ "مجھ پر بہت اچھی گزری ہے۔ میری تو آنکھیں کھل گئی ہیں اور میرا دماغ روشن ہو گیا ہے۔ میں حسن بن صباح کو قتل کرنے گیا تھا۔ وہاں جا کر مجھ پر یہ راز کھلا کہ میں نے حسن بن صباح کو نہیں بلکہ کسی اور کو قتل کرنا ہے۔ میں نے بہت سوچا لیکن یہ راز مجھ پر نہیں کھل رہا تھا کہ وہ کون ہے جس نے میرے ہاتھوں قتل ہونا ہے۔ مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ میں نے کسی کو قتل ضرور کرنا ہے..... کچھ دنوں بعد یہ راز بھی کھل گیا..... وہ شخص آنکھوں کے سامنے آگیا تھا جس کا خون میرے ہاتھ پر لکھا ہوا ہے"۔

"کون ہے وہ؟" ــــ شمونہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"نظام الملک!" ــــ مزمل نے کہا۔

"مزمل؟" ــــ شمونہ نے اس کے گالوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر پوچھا ــــ "کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم نظام الملک کو قتل کرو گے؟"

"شمونہ!" ــــ مزمل نے شمونہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اور اُسے اپنے قریب کر کے کہا ــــ "اندازہ کرو کہ تمہاری محبت میرے دل اور روح میں کتنی گہری اُتری ہوئی ہے کہ میں تمہیں ایک ایسا راز بتانے لگا ہوں جو مجھے کسی کو بھی نہیں دینا چاہئے تھا۔ تمہارے بغیر میں ایک قدم چل نہیں سکتا۔ میں کسی اور ارادے سے خلجان گیا تھا لیکن اب میں کسی اور ارادے سے الموت سے یہاں آیا ہوں"۔

"کھل کر بات کرو مزمل!" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "میں نے اپنی جان تمہارے لئے وقف کر رکھی ہے..... یہ راز اپنے سینے میں چھپا کر رکھوں گی۔ میں تم سے یہ سننا چاہتی ہوں کہ تم پر وہاں کیا گزری ہے"۔

"وہاں مجھ پر جو گزری ہے وہ اچھی گزری ہے" ــــ مزمل نے بڑے سنجیدہ اور کچھ طنزیہ سے لہجے میں کہا ــــ "بلکہ بہت اچھی گزری ہے۔ وہاں تک تو میں اندھیرے میں پہنچا تھا۔ یہ مجھے وہاں جا کر پتہ چلا کہ میری روح اب تک بھٹکتی رہی ہے۔ وہاں میری روح کو روشنی ملی پھر مجھے پتہ چلا اور میں نے صاف دیکھا کہ دوست کون اور دشمن کون ہے۔ میرے خیالات اور میرے عقیدے بدل گئے۔ اگر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی تو وہ یہ تھی کہ مجھے شمونہ سے محبت ہے اور میرا دل اس تبدیلی کو بھی قبول نہیں کرے گا کہ میرا دل شمونہ کی محبت کو نکال دے"۔

شمونہ مزمل کی باتیں تو غور سے سن ہی رہی تھی مگر وہ زیادہ غور ان تاثرات پر کر رہی تھی جو مزمل کے چہرے پر آ اور جا رہے تھے۔ اس نے ایسے تاثرات مزمل کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھے تھے۔

"راز اپنے سینے میں چھپا کر رکھوں گی مزمل!" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "میرے جسم سے جان نکل سکتی ہے، یہ راز نہیں نکلے گا لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم نظام الملک جیسے عظیم آدمی کو کیوں قتل کرو گے؟"

"عظیم انسان!" ــــ مزمل نے کہا ــــ "عظیم نظام الملک نہیں، حسن بن صباح عظیم ہے۔ میں اُسے قتل کرنے چل پڑا تھا لیکن وہاں جا کر میں نے محسوس کیا کہ میں

خوش نصیب ہوں کہ مجھے اس عظیم شخصیت کے پاس آنے کا ایک بہانہ مل گیا"۔

شمونہ لرز کر رہ گئی لیکن اس نے اپنے ردِ عمل کا اظہار نہ کیا نہ مزمل کو پتہ چلنے دیا کہ اس کا ردِ عمل کس قدر شدید ہے جسے برداشت کرنا اس کے لئے محال ہے۔

"ایک بات بتاؤ مزمل!" — شمونہ نے پوچھا — "نظام الملک کو کب قتل کرو گے؟..... میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ تم جلد بازی نہ کر بیٹھو۔ تم نے مجھے کہا ہے کہ میں تمہارا ساتھ دوں۔ اگر تمہیں مجھ پر اعتماد ہے تو یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں موقع پیدا کروں گی اور تم اپنا کام کر گزرنا لیکن میں موقع ایسا پیدا کروں گی کہ تم اسے قتل بھی کر دو اور پکڑے بھی نہ جاؤ"۔

"ہاں شمونہ!" — مزمل نے کہا — "مجھے تم پر اعتماد ہے اور مجھے تم سے یہی امید تھی کہ تم میرے اس کام میں میری مدد کرو گی۔ تم موقع پیدا کرو"۔

مزمل آفندی بڑے لمبے سفر سے آیا تھا اس لئے تھکا ہوا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اُس کی آنکھ لگ گئی۔ شمونہ اٹھی، کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ اس نے اپنی ماں کو کچھ بھی نہ بتایا۔

شمونہ ساری رات سو نہ سکی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ مزمل کو باطنیوں نے پکڑ لیا تھا لیکن قتل کرنے کی بجائے انہوں نے یہ بہتر سمجھا کہ اسے قاتل ہی رہنے دیا جائے لیکن وہ قتل کسی اور کو کرے..... شمونہ حسن بن صباح کے ساتھ رہ چکی تھی۔ وہ حسن بن صباح کے منظورِ نظر داشتہ تھی۔ وہ قدرتی طور پر غیر معمولی ذہانت کی لڑکی تھی۔ اس نے حسن بن صباح سے کئی ایک راز لئے تھے اور حسن بن صباح اسے راز دے بھی دیتا تھا کیونکہ وہ شمونہ کے حسن و جوانی کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرتا تھا۔ خود شمونہ اپنے حسن کو بڑی خوبی اور کامیابی سے استعمال کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ حسن بن صباح کے پاس ایسے حربے اور طریقے ہیں کہ وہ پتھر کو بھی موم کر لیتے ہیں۔ وہ کسی بھی شخص کو ایک خاص عمل میں سے گزار کر اس کی سوچیں، اس کے ارادے اور اس کے عقیدے یکسر بدل دیتے ہیں۔ اس کے سامنے دو آدمیوں پر یہ عمل کیا گیا تھا۔ یہ کوئی جادو یا روحانی عمل نہیں تھا بلکہ یہ ایک نفسیاتی طریقۂ کار تھا۔ شمونہ جان گئی کہ مزمل کا جسم اور اس کا نام نہیں بدلا جا سکا، اس کے کردار کو اور اس کے عقیدے کو اور اُس کے ارادوں کو بالکل الٹ کر دیا گیا

ہے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ اس عمل کے لئے خاصا عرصہ تھا۔ اسے نظام الملک نے قتل کے لئے واپس بھیجا گیا ہے اور یہ شخص عزم لے کر آیا ہے کہ نظام الملک کو قتل کرنا ہے۔

○

اگلی صبح مزمل آفندی اٹھا۔ شمونہ خود ناشتہ لے کر اُس کے کمرے میں گئی اور دونوں نے اکٹھے ناشتہ کیا۔

"اب میری بات سنو مزمل!" — شمونہ نے کہا — "میں نے اپنی ماں کو یہ بات نہیں بتائی اور تم بھی نہ بتانا۔ نظام الملک سے ملے ہوئے مجھے کچھ دن گزر گئے ہیں۔ میں ابھی اس کے پاس جا رہی ہوں اور کچھ جذباتی سی باتیں کروں گی کہ میں اُسے صرف ملنے آئی ہوں۔ میں اُسے اسی طرح دو تین مرتبہ ملوں گی اور مجھے اُمید ہے کہ میں اسے اپنے جذبات میں الجھا لوں گی اور پھر میں ایک دن اسے باہر لے جاؤں گی۔ تمہیں پہلے بتا دوں گی۔ تم نے کوئی اوچھی اور الٹی سیدھی حرکت نہیں کرنی۔ میرے آخری اشارے کا انتظار کرنا"۔

مزمل آفندی کے چہرے پر سکون اور اطمینان کا تاثر آ گیا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی شمونہ!" — مزمل نے شمونہ کو اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے کر کہا — "تم تصور میں نہیں لا سکتیں کہ میں یہ کام کر چکا تو تمہیں کس جنت میں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ تم موقع پیدا کرو۔ میں تمہارے آخری اشارے کا انتظار کروں گا"۔

شمونہ کو بہت دکھ ہوا کہ مزمل جیسا پیارا اور جذبے والا آدمی اور دین اسلام پر اپنا آپ بھی قربان کرنے والا یہ خوبرو جوان کس طرح ضائع ہو گیا ہے۔ اس نے مزمل پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ اسے کتنا دکھ پہنچا ہے۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر بڑی ہی جانفزا مسکراہٹ قائم رکھی۔ وہ ناشتے کے بعد کمرے سے نکل آئی۔ ماں سے کہا کہ وہ برتن اٹھا لے اور وہ خود گھر سے نکل گئی۔ وہ نظام الملک سے ملنے جا رہی تھی۔

نظام الملک گھر ہی مل گیا۔ وہ ابھی ابھی ناشتے سے فارغ ہوا تھا۔ اسے اطلاع ملی کہ شمونہ آئی ہے تو اس نے اسے بلا لیا اور سوچا کہ یہ لڑکی آج پھر ضد کرنے آئی ہے کہ وہ تین آدمیوں کو طلبان اور الموت بھیجو جو مزمل کو ڈھونڈ لائیں۔ اس نے

شمونہ کو اس خیال سے ہٹا لیا تھا کہ اسے بہلائے پھسلائے گا اور اس کے دل سے مزمل کو نکالنے کی کوشش کرے گا۔

"آؤ شمونہ!" — نظام الملک نے کہا — "بیٹھو۔ آج شاید تمہیں پھر مزمل یاد آ رہا ہے یا خواب میں آیا ہو گا!"

"نہیں محترم!" — شمونہ نے کہا — "وہ خواب میں نہیں آیا بلکہ وہ حقیقت میں آ گیا ہے۔ کل شام زندہ و سلامت میرے پاس پہنچ گیا ہے"۔

"کیا تمہارا دماغ حاضر ہے شمونہ!" — نظام الملک نے اس طرح کہا جیسے اسے شک ہوا ہو کہ یہ لڑکی دماغی توازن کھو بیٹھی ہے — "وہ میرے پاس کیوں نہیں آیا؟..... کیا وہ کچھ بتاتا ہے کہ اس پر کیا بیتی ہے؟"

"محترم!" — شمونہ نے کہا — "میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ وہ میرے پاس آ گیا تھا۔ کہیں وہ سیدھا آپ کے پاس نہ پہنچ گیا ورنہ بات کچھ اور بن جاتی"۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" — نظام الملک نے پوچھا — "کیا بات بن جاتی؟ معلوم ہوتا ہے تم ذہنی طور پر بہت پریشان ہو"۔

"ہاں محترم!" — شمونہ نے کہا — "میں ساری رات سوئی نہیں۔ میں تمہید باندھے بغیر یہ بتانے آئی ہوں کہ آپ نے جس کو حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے بھیجا تھا وہ آپ کو قتل کرنے کے لئے واپس آیا ہے"۔

"مجھے حیران نہیں ہونا چاہیے" — نظام الملک نے کہا — "مجھے معلوم ہے کہ حسن بن صباح کے پاس ایسا جادو ہے جو مزمل جیسے جوانوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ مزمل پر بھی یہی جادو چل گیا ہو گا"۔

"محترم!" — شمونہ نے کہا — "آپ نے تو صرف سنا ہے کہ حسن بن صباح کے پاس کوئی ایسا جادو ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے یہ جادو چلتا دیکھا ہے۔ یہ میں آپ کو تفصیل سے بتاؤں گی لیکن فوری طور پر یہ سوچیں کہ مزمل کا کیا کیا جائے۔ اسے اس طرح آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ میں اسے محبت کی زنجیروں میں باندھ کر رکھ سکتی ہوں لیکن یہ زنجیریں کسی وقت کچی بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی بھی وقت وہ آپ پر قاتلانہ حملہ کر دے؟..... میں ڈرتی ہوں ایسا ہو جائے گا۔ آپ دانشمند ہیں۔ میں آپ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ ایک مشورہ

ہے اگر آپ کو اچھا لگے تو مزمل کو قید خانے میں بند کر دیں"۔

"نہیں شمونہ!" — نظام الملک جو عقل و دانش کے لئے مشہور تھا بولا — "میں اتنا خوبصورت جوان اور اتنا جذبے والا جوان ضائع نہیں کروں گا۔ اسے کچھ دنوں کے لئے آزاد رکھنا پڑے گا لیکن میں اس کے لئے ایک جواز پیدا کروں گا۔ جس طرح اسے حسن بن صباح نے اپنے مقاصد کے لئے حسب منشا آلۂ کار بنایا ہے اسی طرح میں اسے واپس لاؤں گا اور اسے ویسا ہی مرد مومن بناؤں گا جیسا یہ تھا۔ اندازہ کرو شمونہ! اس نے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو دل سے اتار دیا تھا اور یہ ایک عزم لئے ہوئے تھا کہ حسن بن صباح کو قتل کرے گا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ حسن بن صباح کو ایک انسان سمجھ کر قتل نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ ایک باطل نظریے اور ابلیسیت کا گلا کاٹنا چاہتا تھا..... میں اسے صراط مستقیم پر لے آؤں گا لیکن اس کے لئے ہمیں ایک کھیل کھیلنا پڑے گا۔ میں اپنے آپ کو خطرے میں ڈالوں گا"۔

"اگر اس کھیل میں میں نے کچھ کرنا ہے تو مجھے بتا دیں" — شمونہ نے کہا۔

"تمہارے ذمے ایک کام ہے" — نظام الملک نے کہا — "آج شام اسے میرے پاس بھیج دو۔ اسے کہنا کہ میں فلاں کمرے میں اکیلا ہوں گا۔ اسے یقین دلانا کہ نظام الملک کو قتل کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ قتل کرنے کا طریقہ یہ بتانا کہ نظام الملک پیٹھ پھیرے تو خنجر نظام الملک کی پیٹھ میں اتار دینا..... باقی میں سنبھال لوں گا"۔

"نہیں محترم وزیراعظم!" — شمونہ نے کہا — "میں ڈرتی ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ کھیل ہی کھیل میں خنجر آپ کے دل میں اتر جائے"۔

"تم اسے بھیج دینا" — نظام الملک نے کہا — "میں چوکنا رہوں گا..... تم جاؤ"۔

شمونہ واپس آئی اور اس نے مزمل کو ویسے ہی بتایا جیسے نظام الملک نے اسے بتایا تھا۔ شمونہ نے مزمل سے کہا کہ آج موقع ہے۔ یہ کام آج ہی کر گزرو۔

نظام الملک نے شمونہ کو وہ کمرہ دکھا دیا تھا۔ وہ کمرہ ایسا تھا جس کا تعلق اتنے بڑے مکان کے دوسرے کمروں کے ساتھ نہیں تھا۔ نظام الملک صرف اس وقت اس کمرے میں بیٹھا کرتا تھا جب اسے کسی پیچیدہ مسئلے پر غور کرنا ہوتا تھا۔ کوئی بھی

اس کے کام میں خلل نہیں ہو سکتا تھا۔

شام کو مزمل آفندی اپنے کپڑوں کے اندر خنجر چھپائے نظام الملک کے ہاں چلا گیا۔ دروازے پر کوئی دربان نہیں تھا۔ یہ بھی اس کھیل کا ایک حصہ تھا کہ دربان ہٹا دیئے گئے تھے۔ شمونہ نے مزمل کو وہ خاص کمرہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ مزمل اس گھر میں زخمی حالت میں رہ بھی چکا تھا پھر اس گھر میں وہ صحت یاب ہوا تھا اس لئے وہ اتنی بڑی حویلی سے واقف تھا۔ وہ اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا اور دستک دی۔ نظام الملک نے خود اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر مزمل کھڑا تھا۔ نظام الملک نے اُسے گلے لگا لیا اور خوشی کا اظہار کیا کہ وہ زندہ واپس آگیا ہے۔ اُسے کمرے میں لے جا کر اشارہ کیا کہ یہاں بیٹھ جاؤ۔

نظام الملک نے اس کی طرف پیٹھ کی اور دو تین قدم آگے کو چلا۔ اُسے معلوم تھا کہ اب کیا ہو گا۔ مزمل جو ابھی بیٹھ ہی رہا تھا' تیزی سے کھڑا ہو گیا' اور اسی تیزی سے کپڑوں کے اندر سے خنجر نکالا اور نظام الملک کی پیٹھ پر مارنے کے لئے اس نے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ جب اس کا ہاتھ خنجر مارنے کے لئے آگے ہوا تو اسی تیزی سے نظام الملک پیچھے کو مڑا اور اس نے خنجر والے ہاتھ کی کلائی اپنے ہاتھ پر روک لی اور اس کلائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کو اس نے زور سے جھٹکا دیا تو مزمل اس کے جسم کے ساتھ لگ گیا۔ نظام الملک نے نیچے سے اپنا گھٹنا اوپر کو مارا جو مزمل کے پیٹ میں لگا۔ مزمل درد کی شدت سے دوہرا ہو گیا۔ نظام الملک نے اس کی کلائی دونوں ہاتھوں سے مروڑی۔ مزمل اسی طرف گھوما۔ نظام الملک نے ایسا داؤ چلا کہ مزمل پیٹھ کے بل فرش پر گرا اور اس کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا۔ نظام الملک نے اپنا پاؤں گرے ہوئے مزمل کی شہ رگ پر رکھ کر پورے جسم کا زور ڈالا۔ مزمل تڑپنے لگا۔

نظام الملک نے ایک آواز کا اشارہ مقرر کر رکھا تھا جو اس نے دیا۔ اس کے دونوں دربان دوڑے آئے اور آگے یہ منظر دیکھا۔ خنجر فرش پر پڑا تھا اور مزمل نظام الملک کے پاؤں کے نیچے تھا۔ دربانوں نے مزمل کو پکڑ لیا۔

"لے جاؤ" — نظام الملک نے کہا — "قید خانے میں بند کر دو۔ میں اسے کل دیکھوں گا"۔

دربانوں نے رسیوں سے مزمل کے ہاتھ باندھ دیئے اور اُسے لے گئے۔

نظام الملک بوڑھا آدمی تھا۔ اس میں اگر طاقت تھی تو وہ عقل و دانش کی اور ایمان کی طاقت تھی۔ وہ مزمل جیسے گٹھے ہوئے جوان آدمی کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا لیکن اس کی روحانی قوتیں بیدار تھیں۔ پھر وہ صرف عالمِ دین ہی نہ تھا' وہ سالار بھی تھا۔ تیغ زنی اور تیر اندازی میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے اُسی روز سلطان ملک شاہ کو یہ واقعہ سنایا اور کہا کہ وہ مزمل کو واپس اپنی طرف لے آئے ہیں۔

"سلطانِ محترم!" — نظام الملک نے کہا — "اب ہمیں الموت پر فوج کشی کرنی پڑے گی۔ اس باطل کو فوجی طاقت سے ہی کچلا جا سکتا ہے۔ حملہ آور فوج کا سپہ سالار میں خود ہوں گا۔ آپ کی اجازت چاہئے"۔

"ہاں خواجہ!" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "آپ کو اجازت ہے"۔

مزمل آفندی کو جب گھسیٹتے دھکیلتے ہوئے قید خانے میں لے گئے اور اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا تو اس نے سلاخوں کو پکڑ کر زور زور سے ہلانا اور چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

"تم مجھے قبر میں دفن کر دو تو بھی اس شخص کو قتل کرنے کے لئے نکل آؤں گا" —— مزمل یہی الفاظ دہرائے چلا جا رہا تھا۔

نظام الملک نے جب حکم دیا تھا کہ مزمل آفندی کو قید خانے میں ڈال دو تو اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں اُسے کل دیکھوں گا۔ اگلے روز اس نے قید خانے میں جانے کا ارادہ کیا تو اُسے خیال آگیا کہ پہلے معلوم کر لیا جائے کہ مزمل کس حال میں ہے اور اُس کا ردِ عمل اور رویہ کیا ہے۔ نظام الملک نے قید خانے میں ایک آدمی کو یہ پیغام دے کے بھیجا کہ معلوم کر کے آئے کہ مزمل کس حال میں ہے۔

کچھ وقت بعد اُسے بتایا گیا کہ مزمل رات بھر جاگتا، چیختا اور چلاتا رہا ہے اور اب بھی وہ اسی کیفیت میں ہے۔

"کیا کہتا ہے؟" —— نظام الملک نے پوچھا۔

"کہتا ہے میں نظام الملک کو قتل کر کے مروں گا" —— قید خانے سے آنے والے آدمی نے جواب دیا۔

نظام الملک کو شمونہ نے تفصیل سے بتایا تھا کہ حسن بن صباح کے ہاں کس طرح لوگوں کے دماغوں اور دلوں پر قبضہ کر کے انہیں اپنے سانچے میں ڈھال لیا جاتا ہے اور کس طرح انہیں قاتل بنایا جاتا ہے۔ نظام الملک نے اپنے ایک خاص معتمد کو بلایا اور اُسے سرگوشیوں میں کچھ ہدایات دے کر بھیج دیا۔ اس شخص کے جانے کے بعد نظام الملک نے اپنے ملازم کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ طبیب نجم کو اپنے ساتھ لے آئے۔

جس طبیب کو نظام الملک نے بلایا تھا اُس کا پورا نام نجم بن انجم مدنی تھا۔ وہ ضعیف

العمر آدمی تھا۔ مرو میں ہی نہیں اور سلطنتِ سلجوقیہ میں ہی نہیں بلکہ دوسری بادشاہیوں اور دُور دُور کے علاقوں میں بھی اس کی شہرت تھی۔ اسے سلجوقی سلطان کچھ ایسے اچھے لگے کہ وہ یہیں کا ہو کے رہ گیا تھا۔ وہ اسلام کا اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شیدائی تھا۔ وہ اتنا ضعیف ہو چکا تھا کہ اب کم ہی کبھی باہر نکلتا تھا اور عام قسم کی بیماریوں کے مریضوں کو دیکھنے کا اس کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا اور نہ اس میں اتنی ہمت رہی تھی لیکن وہ آرام بھی نہیں کرتا تھا، کیمیاگری اور تجربات میں لگا رہتا تھا۔

اسے جونہی نظام الملک کا پیغام ملا، وہ سواری پر بیٹھا اور نظام الملک کے پاس پہنچ گیا۔ نظام الملک کو اطلاع ملی کہ طبیب نجم مدنی کی سواری آئی ہے تو وہ باہر کو دوڑ پڑا اور طبیب کا استقبال اس طرح کیا جس طرح اُس نے سلطان ملک شاہ کا کبھی نہیں کیا تھا۔

"محترم طبیب!" —— نظام الملک نے کہا —— "مجھے خود آپ کے پاس آنا چاہئے تھا، میں آپ کو زحمت نہ دیتا....."

"وزیرِ اعظم!" —— طبیب نجم مدنی نے اس کی بات کاٹ کر کہا —— "کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ آپ نے مجھے جس مقصد کے لئے بلایا ہے وہ بیان کر دیں؟"

نظام الملک نے طبیب کو مزمل آفندی کے متعلق بتانا شروع کر دیا۔ اس نے تفصیل سے بتایا کہ مزمل اس کے پاس کس جذبے سے اور کس طرح یہاں پہنچا تھا اور پھر اُس نے ایک جنگ میں کیا کارنامہ سرانجام دیا تھا اور پھر اس نے طبیب کو تفصیل سے بتایا کہ مزمل آفندی نے اپنے جینے کا یہی ایک مقصد بنا لیا تھا کہ وہ حسن بن صباح کو قتل کرے گا۔ پھر اس نے طبیب کو بتایا کہ مزمل آفندی حسن بن صباح کے قتل کے ارادے سے چلا گیا لیکن چالیس بیالیس روز بعد واپس آیا تو اس کی شکل و صورت اور چال ڈھال تو وہی تھی لیکن وہ بالکل ہی بدل گیا تھا۔

"اس نے آتے ہی مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا" —— نظام الملک نے کہا —— "یہ تو مجھے قبل از وقت معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مجھے قتل کرے گا اس لئے میں بچ گیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسے یہ موقع میں نے خود فراہم کیا تھا کہ وہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کرے"۔

نظام الملک نے شمونہ کا حوالہ دے کر طبیب کو تفصیل سے بتایا کہ اس لڑکی نے اُسے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ مزمل مجھ پر قاتلانہ حملہ کرے گا۔ نظام الملک نے طبیب کو شمونہ کے متعلق بھی سب کچھ بتایا اور اسے قاتلانہ حملے کا اور مزمل کی گرفتاری کا

www.paksociety.com

واقعہ سنایا۔

"کیا وہ اس لڑکی شمونہ کو چاہتا ہے؟" — طبیب نے چونک کر پوچھا۔

"چاہتا ہی نہیں محترم طبیب!" — نظام الملک نے جواب دیا — "وہ تو اس لڑکی کو عشق کی حد تک چاہتا ہے اور اگر کسی انسان کے آگے سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی تو مزمل اس لڑکی کے آگے سجدے کرتا رہتا"۔

"اس لڑکی کو یہیں بلا لو" — طبیب نے کہا — "آپ نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ آپ چاہتے کیا ہیں۔ کیا آپ اس شخص مزمل آفندی کی قسمت کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں اور مجھ سے مشورہ لے رہے ہیں؟"

"اس کی قسمت کا فیصلہ کرنا میرے لئے کوئی مشکل نہیں تھا" — نظام الملک نے کہا — "فیصلہ کرنا ہوتا تو مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اُسے اسی وقت اپنے محافظوں کو حکم دے کر قتل کروا دیتا اور کہتا کہ اس کی لاش کو دفن نہیں کرنا' باہر پھینک دو کہ اسے کتے اور گدھ کھا جائیں' لیکن محترم طبیب! میں مزمل آفندی جیسے قیمتی' جواں سال اور خوبرو آدمی کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں شاید آپ کو اچھی طرح بتا نہیں سکتا کہ اس جواں سال آدمی میں اسلام کی کس قدر شدید اور جذباتی محبت ہے۔ میرا ایک مقصد تو یہ ہے کہ میں اسے واپس اپنی اصلی حالت میں لے آؤں۔ دوسرا مقصد یہ ہے جو صرف آپ پورا کر سکتے ہیں' وہ یہ کہ اسے حسن بن صباح کے ہاں کسی ایسے عمل سے گزارا گیا ہے جس نے اس کے دل و دماغ کو اُلٹا دیا ہے۔ اُس کی نگاہ میں دوست دشمن بن گئے ہیں۔ میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اپنے تجربے کی روشنی میں دیکھیں کہ وہ باطنی کس طرح اچھے بھلے انسان کو اپنوں کا ہی قاتل بنا دیتے ہیں"۔

"میرے عزیز نظام الملک!" — طبیب نے کہا — "آپ نے یہ بات آج سوچی ہے' میں بڑے لمبے عرصے سے اس مسئلے پر کام کر رہا ہوں۔ ایک مدت گزری مجھے پتہ چلا ہے کہ باطنی لوگوں کی سوچوں پر اور خیالوں پر قابض ہو کر انہیں مکمل ابلیس اور مکمل انسان کش بلکہ آدم خور بنا رہے ہیں۔ میں نے اپنے آدمی وہاں بھیجے جنہوں نے مجھے کچھ ضروری باتیں بتائیں۔ یہ حشیش کا کمال ہے اور پھر یہ کمال ہے ان لوگوں کا یعنی ان باطنیوں کے اپنے دماغ کا کہ انہوں نے انسانی فطرت کی سب سے بڑی کمزوری کو استعمال کیا ہے"۔

"محترم طبیب!" — نظام الملک نے کہا — "یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی

جانتا ہوں کہ وہ کس طرح لوگوں کے دل و دماغ پر قبضہ کرتے اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کا کوئی توڑ ہے؟"

"جی ہاں!" — طبیب نے جواب دیا — "اس کا توڑ میں نے سال ہا سال کی محنت سے تیار کیا ہے..... لیکن میرے عزیز نظام الملک! ہم صرف اس شخص کو واپس اس کی اصلیت میں لا سکیں گے جو مزمل جیسا اِکا دُکا ہمارے پاس پہنچ جائے گا۔ حسن بن صباح اور اس کے ابلیسی گروہ نے اپنے زیرِ اثر علاقوں میں اجتماعی طور پر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ اس کا ہمارے پاس کوئی توڑ نہیں..... ہاں' آپ کے پاس اس کا ایک علاج موجود ہے۔ وہ کریں اور اس ابلیسی فتنے کو ختم کریں..... یہ ہے فوج کشی..... حملہ کریں' حسن بن صباح' احمد بن عطاش اور ان کے خاص گروہ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں اور اس کے بعد اسلام کی تبلیغ کریں"۔

"یہ تو ہم کر ہی رہے ہیں" — نظام الملک نے کہا — "میں نے سلطان ملک شاہ سے حملے کی اجازت لے لی ہے اور اس حملے کی قیادت میں خود کروں گا"۔

"لیکن آپ کو بہت کچھ سوچ کر قدم اٹھانا ہو گا" — طبیب نجم مدنی نے کہا — "میں نے کسی زمانے میں قلعہ الموت دیکھا تھا۔ اب تو سنا ہے کہ اس کے دفاعی انتظامات اور زیادہ مضبوط کر دیئے گئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ قلعہ بلندی پر ہے"۔

"ہاں محترم طبیب!" — نظام الملک نے کہا — "یہ فوجی اور جنگی مسئلے ہیں۔ یہ مجھ پر چھوڑیں۔ آپ اتنا کریں کہ مزمل آفندی کے دماغ کو اس کی اصلی حالت میں لے آئیں"۔

○

قید خانے کی ایک کوٹھڑی میں مزمل آفندی چیخ چلا کر تھک گیا تھا اور دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ دروازے کی سلاخوں کے باہر ایک آدمی آ کر رُک گیا۔

"مزمل!" — اس آدمی نے سرگوشی کی۔

مزمل نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔

"مزمل آفندی!" — اس آدمی نے اب ذرا بلند سرگوشی کی — "یہاں آؤ"

"مجھے کیوں بلا رہے ہو؟" — مزمل آفندی نے تڑخ کر کہا — "یہاں سے چلے

جاؤ ورنہ میں......"

"آہستہ بول احمق آدمی!" ــــ اس آدمی نے ذرا اور بلند سرگوشی میں کہا ــــ "میں تمہارا دوست ہوں۔ یہاں آؤ"۔

مزمل آفندی سلاخوں کے قریب آ کر اس آدمی کے سامنے بیٹھ گیا۔

"مجھے آج صبح پتہ چلا ہے کہ تمہیں قید کر دیا گیا ہے" ــــ اس آدمی نے کہا ــــ "میں تمہیں یہاں سے فرار کراؤں گا۔ خاموشی سے یہاں بیٹھے رہو۔ انہیں تنگ نہ کرو ورنہ یہ تمہیں اتنا ماریں پیٹیں گے کہ تم جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ میں جانتا ہوں کہ تم الموت سے کیوں یہاں آئے تھے۔ تمہیں جن لوگوں نے بھیجا ہے میں ان کا جاسوس ہوں اور مجھے ہر بات کا علم ہے۔ اس قید خانے میں میرا اثر و رسوخ چلتا ہے۔ میں بھی نظام الملک کو قتل کرنا چاہتا ہوں لیکن الموت سے امام حسن بن صباح کا پیغام ملا ہے کہ یہ کام مزمل آفندی کرے گا۔ مجھے یہ فرض سونپا گیا ہے کہ میں تمہاری مدد کروں اور تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ تو میں تمہیں اس میں سے نکالوں۔ تم آرام سے اور مکمل خاموشی سے یہاں بیٹھے رہو، تمہیں یہاں سے نکلوانا اور واپس الموت بھیج دینا میرا کام ہے"۔

"کیا میں نظام الملک کو قتل کر سکوں گا؟" ــــ مزمل نے پوچھا۔

"پہلا کام تمہیں یہاں سے فرار کرانا ہے" ــــ اس آدمی نے کہا ــــ "اس کے بعد دیکھنا ہے کہ نظام الملک کو قتل کرنے کا موقع مل سکتا ہے یا نہیں۔ اگر دو یا تین دن موقع نہ ملا تو تمہیں واپس الموت بھجوا دیں گے اور موقع پیدا کر کے تمہیں واپس لے آئیں گے"۔

"ایک کام کر سکتے ہو؟" ــــ مزمل آفندی نے کہا ــــ "شمونہ نام کی ایک لڑکی یہاں ہے......"

"ہاں مزمل!" ــــ اس آدمی نے کہا ــــ "میں اسے جانتا ہوں۔ یہ بھی کیا جاسوسی ہوئی کہ میں شمونہ کو جان نہ سکتا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس وقت وہ نظام الملک کے ہاں گئی ہوئی ہے"۔

"میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ٹھیک تو ہے" ــــ مزمل نے کہا ــــ "کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے بھی پریشان کیا جا رہا ہو"

"نہیں!" ــــ اس آدمی نے کہا ــــ "اسے کوئی پریشانی نہیں۔ اگر تمہارے ساتھ تعلقات کی وجہ سے اسے بھی مشکوک سمجھا گیا ہوتا تو اسے تمہارے ساتھ ہی قید خانے میں پھینک دیا گیا ہوتا...... تم چاہو گے تو اسے بھی یہاں سے نکلوا کر تمہارے ساتھ بھیج دیں گے"۔

مزمل آفندی یوں مطمئن ہو گیا جیسے دہکتے ہوئے انگاروں پر پانی پھینک دیا گیا ہو۔

"اب تمہارے کھانے پینے کا انتظام میرے ہاتھ میں ہو گا" ــــ اس آدمی نے کہا ــــ "میری کوشش یہ ہو گی کہ میں خود تمہیں کھانا دینے آیا کروں۔ اگر میں نہ آسکوں تو جو کوئی آدمی جو کچھ بھی کھانے پینے کے لئے لائے وہ آرام اور اطمینان سے لے کر کھا لینا...... یوں ظاہر کرو جیسے تم اندر سے مر گئے ہو اور اب تم کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرو گے...... مجھے اب یہاں سے چلے جانا چاہئے"۔

"ہاں بھائی میرے!" ــــ مزمل نے کہا ــــ "میں تم پر بھروسہ کروں گا۔ تم جاؤ لیکن میرے فرار کا انتظام جلدی کرو۔ میں کوشش یہ کروں گا کہ نظام الملک کو قتل کر کے واپس الموت جاؤں"۔

"ایسا ہی ہو گا مزمل!" ــــ اس شخص نے کہا اور وہ چلا گیا۔

○

شمونہ نظام الملک کے خاص کمرے میں بیٹھی طبیب نجم مدنی کو سنا رہی تھی کہ وہ جب حسن بن صباح کے ساتھ تھی تو کیا کیا طریقے استعمال کر کے اپنے مطلب کے لوگوں کو اپنا آلۂ کار بنایا جاتا تھا۔ شمونہ نے طبیب کو یہ بھی بتایا کہ اُسے اور اُس جیسی لڑکیوں کو تربیت دے کے استعمال کیا جاتا تھا۔

"محترم بزرگ!" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "حسن بن صباح کے پاس جادو بھی ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ جادو اُس نے احمد بن عطاش سے سیکھا ہے لیکن یہ جادو کم ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی بجائے ایک اور جادو استعمال کیا جاتا ہے جس سے کوئی نہیں بچ سکتا، وہ جادو میں ہوں۔ مجھے دیکھ لیں...... میں نے یہ جادو اپنے ہاتھوں اور اپنی زبان سے چلایا بھی ہے اور چلتا دیکھا بھی ہے"۔

"تو اب میری بات سنو شمونہ!" ــــ طبیب نجم نے کہا ــــ "اب تمہیں یہی جادو مزمل آفندی پر چلانا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارا جادو آسانی سے چل جائے گا کیونکہ مجھے

بتایا گیا ہے کہ وہ تم سے دِلی نہیں بلکہ روحانی محبت کرتا ہے"۔

"ہاں میرے بزرگ!" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "مزمل کو واپس اُسی مقام پر لانے کے لئے میں تو اپنی جان بھی قربان کردوں گی۔ آپ مجھے کہیں گے کہ اپنی جان دے دو تو مزمل اپنی اصلی حالت میں آجائے گا تو میں اس کے لئے تیار ہوں"۔

"ایسی ضرورت نہیں پڑے گی" ــــ طبیب نے کہا ــــ "میں تمہیں کچھ باتیں اور کچھ طریقے بتاؤں گا۔ تم نے اس کے مطابق عمل کرنا ہے"۔

اُس زمانے میں برین واشنگ کی اصطلاح سے کوئی واقف نہیں تھا لیکن برین واشنگ کا عمل موجود تھا اور حسن بن صباح برین واشنگ کا غیر معمولی طور پر ماہر تھا اور اُس نے جو طریقے وضع کئے تھے انہیں آج کے ماہرینِ نفسیات اور ڈاکٹر بھی مستند مانتے ہیں۔

"میرے عزیز نظام الملک!" ــــ طبیب نجم مدنی نے کہا ــــ "اللہ نے ہر جاندار کا جوڑا پیدا کیا ہے..... نر اور مادہ..... کیا آپ نے جانوروں کو دیکھا نہیں کہ ایک مادہ کی خاطر وہ ایک دوسرے کا خون بہا دیتے ہیں۔ انسان کو خدا نے عقل دی ہے' جذبات دیے ہیں اور کچھ حِسیں دی ہیں اس لئے انسانی نر اور مادہ ایک دوسرے کی محبت حاصل کرنے کے لئے ایسے ایسے طریقے سوچ لیتے ہیں کہ انسان خود بھی حیران رہ جاتا ہے۔ مرد کی فطرت میں عورت کی طلب بڑی شدید ہوتی ہے۔ مرد نے جب بھی دھوکا کھایا عورت کے ہاتھوں کھایا۔ اس لڑکی شمونہ جیسی عورت ایک دلکش نشہ بن کر اپنی پسند کے آدمی پر طاری ہو جاتی ہے۔ اگر عورت خود غرض ہے اور وہ اپنی پسند کے مرد سے کوئی دنیاوی فائدہ اٹھانا چاہتی ہے مثلاً" اس کے مال و اموال پر قبضہ کرنا چاہتی ہے تو وہ اپنی نسوانیت کے نشے کے ساتھ کوئی اور نشہ بھی شامل کر لیتی ہے جو وہ دھوکے سے اس شخص کو دیتی رہتی ہے۔ اُس کے ساتھ وہ پیار و محبت کی ایسی ایسی مصنوعی حرکتیں کرتی ہے کہ اُس کے چنگل میں آیا ہُوا مرد اس کے قدموں میں لُوٹ پُوٹ ہوتا رہتا ہے۔ حسن بن صباح یہی نسخہ استعمال کر رہا ہے۔ میں اس کی عقل کی تعریف کرتا ہوں کہ حشیش کو جس طرح اس نے استعمال کیا ہے وہ آج تک اور کسی کے دماغ میں نہیں آیا.....میں مزمل آفندی کے دماغ پر جو حشیش کے اثرات ہیں وہ اتار دوں گا"۔

"کیا آپ اسے کوئی دوا پلائیں گے یا کوئی اور طریقہ اختیار کرنا ہے؟" ــــ نظام الملک نے پوچھا۔

"ہاں!" — طبیب ہم نے جواب دیا — "اسے دوائی پلائی جائے گی لیکن آپ نے بتایا ہے کہ وہ قید خانے کی کوٹھڑی میں بہت زیادہ اودھم برپا کر رہا ہے۔ آپ اسے دوائی کس طرح پلائیں گے؟ یہ کام آپ کو کرنا ہو گا"۔

"ہاں محترم طبیب!" — نظام الملک نے کہا — "میں نے ایک انتظام تو کیا ہے کہ اس شخص پر قابو پایا جا سکے..... ذرا ٹھہرئیے..... میں معلوم کرتا ہوں کہ وہ آدمی واپس آیا ہے یا نہیں"۔

نظام الملک نے دربان کو بلا کر پوچھا کہ وہ آدمی آیا ہے کہ نہیں۔ دربان کو معلوم تھا کہ کس شخص کے متعلق پوچھا جا رہا ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ ابھی ابھی آیا ہے۔ نظام الملک نے اسے کہا کہ اسے "فوراً" اندر بھیج دو۔ دربان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد وہی آدمی جو قید خانے میں حسن بن صباح کا جاسوس بن کر مزمل آفندی کے پاس گیا اور اسے ٹھنڈا کر آیا تھا' اندر آیا۔

"کہو بھائی!" — نظام الملک نے اُس سے پوچھا — "کیا کر کے آئے ہو!"

"سب ٹھیک کر آیا ہوں" — اس شخص نے جواب دیا — "وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ میں نے اسے کہا ہے کہ آئندہ اس کے کھانے پینے کا انتظام میں کروں گا۔ اس نے بخوشی یہ صورت قبول کر لی ہے۔ اس نے مجھ پر مکمل اعتماد کیا ہے"۔

"آفرین!" — نظام الملک نے کہا پھر وہ طبیب سے مخاطب ہوا — "اب اُسے وہ دوائی آسانی سے پلائی جا سکے گی جو آپ اسے دینا چاہیں گے"۔

نظام الملک نے اس آدمی کو باہر بھیج دیا۔

"میں آپ کو خبردار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں" — طبیب نے کہا — "دوائی تو میرے پاس تیار ہے۔ یہ میرا پہلا تجربہ ہو گا۔ اس دوائی کا اثر یہ ہو گا کہ مزمل بے ہوش ہو جائے گا یا یوں کہہ لیں کہ سو جائے گا۔ ایسا ہونا تو نہیں چاہئے لیکن میں ڈرتا ہوں کہ دوائی کی مقدار ایک آدھا قطرہ بھی زیادہ ہو گئی تو اس شخص کی موت واقع ہو سکتی ہے"۔

"نہیں میرے بزرگ!" — شمونہ نے تڑپ کر کہا اور طبیب کے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر التجا کے لہجے میں بولی — "ایسا نہ کہیں۔ جان لینی ہے تو میری لے لیں۔ موت واقع ہو تو میری ہو۔ مجھے کوئی طریقہ بتائیں۔ اگر کہیں تو میں اس کی کال کوٹھڑی میں بند ہو جاتی ہوں۔ شب و روز اس کے ساتھ رہوں گی اور مجھے امید ہے کہ اسے

واپس اپنی اصلی ذہنی اور جذباتی حالت میں لے آؤں گی"۔

"شمونہ بیٹی!" ــــ نظام الملک نے کہا ــــ "ہم مزمل جیسے قیمتی آدمی کو زیادہ دیر تک ایسی حالت میں نہیں دیکھ سکتے۔ میں بھی تمہاری طرح مزمل کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں"۔

"گھبراؤ نہیں لڑکی!" ــــ طبیب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ــــ "میں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ ضرور ہی مر جائے گا' میں نے صرف اظہار کیا ہے ایک خطرے کا۔ ہمیں یہ خطرہ مول لینے دو۔ زیادہ تر کام تو تم نے کرنا ہے اور یہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم نے کیا کرنا ہے"۔

"محترم طبیب!" ــــ نظام الملک نے کہا ــــ "آپ وہ دوائی دے دیں۔ صرف یہ خیال رکھیں کہ اس کی مقدار کم رکھیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ جڑی بوٹیوں سے بنائی ہوئی دوائی کسی کی جان بھی لے سکتی ہے"۔

"میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ اس دوائی میں کیا کیا ڈالا گیا ہے" ــــ طبیب نے کہا ــــ "یہ نایاب جڑی بوٹیوں سے بنی ہے جو ہمارے علاقے میں شاید ہی کہیں نظر آئیں۔ اس میں صحرائی سانپ کے زہر کا کشتہ بھی شامل ہے۔ اس میں بچھوے کی چربی بھی ایک خاص عمل سے گزار کر شامل کی گئی ہے۔ یہ تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ صحرائی سانپ ملنا کتنا دشوار ہے۔ صحرا کہاں ہے' اور کون وہاں سانپ کے انتظار میں جیٹھا رہتا ہو گا۔ بہرحال میں نے یہ سانپ حاصل کیا اور اس کا زہر مار کر دوائی میں شامل کیا ہے"۔

طبیب نے شمونہ اور نظام الملک کو کچھ ہدایات دینی شروع کر دیں۔

○

سورج غروب ہو گیا۔ قید خانے کی راہداریوں کی مشعلیں جلا دی گئیں۔ کچھ دیر بعد قیدیوں میں کھانا تقسیم ہونے لگا۔

ایک سنتری نے مزمل آفندی کی کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور خود ایک طرف ہو گیا۔ کوٹھڑی میں وہ شخص داخل ہوا جو مزمل کو ٹھنڈا کر گیا تھا۔ اس نے کھانا اٹھا رکھا تھا۔ سالن اور روٹیوں کے علاوہ ایک پیالہ دودھ کا بھرا ہوا تھا۔ مزمل یہ کھانا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"تمہارے چہرے پر حیرت کیوں؟" ــــ اس آدمی نے کہا ــــ "میں نے تمہیں کہا تھا کہ آئندہ تمہارے کھانے کا انتظام میں کیا کروں گا۔ تمہیں اب یہی کھانا ملا کرے گا میں نے تمہارے فرار کا انتظام کر لیا ہے' تمہیں دو یا تین دن انتظار کرنا پڑے گا۔ آرام سے کھانا کھاؤ اور یہ دودھ پی لو۔ میں جا رہا ہوں"۔

اس شخص نے یہ بات مزمل کے کان میں اتنی دھیمی آواز میں کہی تھی کہ سنتری کو سنائی نہیں دیتی تھی..... کوٹھڑی کا دروازہ پھر بند ہو کر مقفل ہو گیا۔ سنتری اس راہداری میں جس میں مزمل آفندی کی کوٹھڑی تھی' آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا۔ یہ اس کی اور اس جیسے سنتریوں کی ہر رات کی ڈیوٹی تھی لیکن یہ سنتری جب مزمل کی کوٹھڑی کے آگے سے گزرتا تھا تو اس کے قدم رک جاتے اور مزمل کو وہ سلاخوں میں سے غور سے جھانکتا تھا۔ مزمل کھانا کھا رہا تھا۔ سنتری دوسرے چکر پر آیا تو دیکھا کہ مزمل نے دودھ کا پیالہ منہ سے لگا رکھا تھا۔

سنتری آگے نکل گیا اور کہیں رک گیا تھا۔ کچھ وقت گزار کر وہ پھر راہداری میں آیا اور حسب معمول مزمل کی کوٹھڑی کے سامنے آ کر بہت آہستہ ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ پیالہ فرش پر پڑا تھا۔ مزمل نے سارا دودھ پی لیا تھا اور دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا سر ڈول رہا تھا اور آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ سنتری دو چار قدم آگے گیا اور رک گیا۔ وہ پھر واپس آیا تو دیکھا کہ مزمل فرش پر پیٹھ کے بل پڑا تھا اور اس کے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ سنتری دوڑ پڑا اور راہداری سے نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہی شخص آیا جو مزمل کا دوست بن کر اسے کھانا اور دودھ دے گیا تھا۔ سنتری اس کے ساتھ تھا۔ اس کے اشارے پر سنتری نے دروازہ کھولا۔ وہ شخص اندر گیا اور مزمل کے پاس بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس نے مزمل کے سر پر ہاتھ رکھ کر ہلایا۔

مزمل بیدار نہ ہوا۔

دوسری بار اس آدمی نے مزمل کے سر کو ذرا زور سے ہلایا' پھر بھی مزمل کی آنکھ نہ کھلی۔ وہ آدمی اٹھا اور سنتری کو یہ کہہ کر تیزی سے نکل گیا کہ کوٹھڑی کو مقفل کر دو۔

وہ آدمی دوڑتا ہوا راہداری سے نکلا' دوڑتا ہوا ہی قید خانے سے نکلا' باہر اس کا گھوڑا کھڑا تھا' اس پر سوار ہو کر اس نے ایڑ لگا دی۔ قید خانہ شہر سے ذرا دور ویران اور بنجر سے علاقے میں تھا۔

اُس نے گھوڑا ملک شاہ کے دروازے پر جا روکا اور وہ کود کر گھوڑے سے اُترا۔ یہ دوڑتا ہوا اندر چلا گیا۔ دربان اور محافظ کھڑے تھے لیکن انہوں نے اُسے نہ روکا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ شخص آئے تو اسے روکنا نہیں۔

وہ ایک کمرے میں چلا گیا جہاں طبیب نجم مدنی' نظام الملک اور شمونہ موجود تھے۔

"کیا خبر ہے؟" — نظام الملک نے پوچھا۔

"بڑی اچھی خبر ہے" — اس آدمی نے جواب دیا — "وہی اثر ہوا ہے جو محترم طبیب نے بتایا تھا۔ وہ اتنی گہری نیند سو گیا ہے کہ میں نے اسے زور زور سے ہلایا' اُس کے سر کو جھنجوڑا لیکن اُس کے پوٹوں میں ذرا سی بھی حرکت نہیں ہوئی"۔

"کیا وہ زندہ ہے؟" — شمونہ نے تڑپ کر پوچھا۔

"ہاں' وہ زندہ ہے" — اس آدمی نے جواب دیا — "کیا میں اتنا احمق نظر آتا ہوں کہ مجھے سوئے ہوئے اور مرے ہوئے آدمی میں فرق معلوم نہ ہو؟"

"نظام الملک!" — طبیب نجم نے کہا — "اسے یہاں لے آؤ"۔

○

کچھ دیر بعد مزمل آفندی کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا۔ ایک چارپائی کوٹھڑی میں داخل ہوئی جس کے ساتھ چار آدمی تھے۔ چارپائی فرش پر رکھ کر ان آدمیوں نے فرش پر پڑے ہوئے مزمل کو اٹھایا اور چارپائی پر ڈال دیا۔ اس میں بیداری کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ان آدمیوں نے چارپائی اٹھائی اور کوٹھڑی سے نکل گئے پھر وہ قید خانے سے بھی نکل گئے۔

نظام الملک' طبیب اور شمونہ بیتابی سے انتظار کر[illegible]ن میں شمونہ بہت ہی بے چین اور بیتاب تھی۔ اس کے حسین چہرے پر گھبراہٹ اور دل میں دعائیں تھیں۔ وہ بار بار باہر دیکھتی تھی۔

آخر وہ لوگ مزمل کو اٹھائے ہوئے آ گئے اور چارپائی اسی کمرے میں لا رکھی۔ شمونہ نے لپک کر مزمل کی کلائی پکڑ لی اور اس کی نبض محسوس کی۔ اس کے چہرے پر سکون اور اطمینان کا تاثر آ گیا۔ مزمل آفندی زندہ تھا۔

مزمل کو اٹھا کر پلنگ پر ڈال دیا گیا اور وہ آدمی چارپائی اٹھا کر کمرے سے نکل گئے۔

"شمونہ!" — طبیب نے مزمل کی نبض پر انگلیاں رکھے ہوئے کہا — "خطرہ ٹل

گیا ہے۔ نبض بالکل ٹھیک چل رہی ہے۔ اگر دوائی کا اثر وہ ہوتا جو میں نے بتایا تھا کہ ہو سکتا ہے تو مزمل کی نبض اس وقت تک خاموش ہو چکی ہوتی..... ہم چلے جائیں گے۔ تم یہاں رہو گی اور اگر تمہیں ساری رات جاگنا پڑا تو جاگتی رہنا۔ میں نے تمہیں ساری بات بتا دی ہے اور اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ تم نے کیا کرنا ہے۔ دودھ دور رکھا ہے' یہ جاگ اٹھے تو پہلا کام یہ کرنا کہ اسے یہ دودھ پلا دینا اور جو کچھ تم نے کرنا ہے وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ یہ پھر سو جائے گا۔ اسے زبردستی بیدار کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم خود بھی سو جانا۔ یہ بہت دیر بعد' کل دن کو کسی وقت جاگے گا۔ آج رات کے پچھلے پہر اسے کچھ بیدار ہونا چاہئے"۔

"اور شمونہ!" — نظام الملک نے کہا — "دروازے کے باہر چار آدمی ہر وقت موجود رہیں گے۔ کوئی مشکل پیش آ جائے یا مزمل بیدار ہو کر پھر ہنگامہ برپا کرنے یا بھاگنے کی کوشش کرے تو یہ آدمی اسے سنبھال لیں گے"۔

"اب یہ سوچ لو شمونہ!" — طبیب نجم نے کہا — "اب تم پر منحصر ہے کہ اسے سنبھال لیتی ہو یا مزید بگاڑ دیتی ہو۔ تم خود عقل والی ہو اور مردوں کو لگام ڈالنا جانتی ہو۔ یہ تو پہلے ہی تمہاری محبت میں گرفتار ہے"۔

شمونہ نے انہیں تسلی دی کہ وہ مزمل کو سنبھال لے گی۔ وہ دونوں کمرے سے نکل گئے اور شمونہ اُس پلنگ پر بیٹھ گئی جس پر مزمل پیٹھ کے بل پڑا دھیمے دھیمے خراٹے لے رہا تھا۔

○

یہ کمرہ خاص طور پر مزمل آفندی کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ نظام الملک کے گھر کا کوئی کمرہ اسی طرح تیار کیا جا سکتا تھا لیکن طبیب نے وہ مناسب نہ سمجھا کیونکہ مزمل نظام الملک کی دشمنی لے کر آیا تھا۔ خطرہ تھا کہ بیداری کے بعد اسے پتہ چلتا کہ وہ نظام الملک کے گھر میں ہے تو وہ پھر بے قابو ہو سکتا تھا۔ نظام الملک نے سلطان ملک شاہ کو اس سارے واقعے سے باخبر رکھا ہوا تھا۔ طبیب نے سلطان سے کہا تھا کہ وہ اس کے محل کا ایک کمرہ استعمال کرنا چاہتا ہے۔ سلطان نے بخوشی اجازت دے دی تھی۔

اس کمرے کی زیب و زینت کا اہتمام طبیب نے اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق کیا تھا۔ بستر نہایت نرم ملائم اور آرام دہ تھا۔ کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں پر خاص

رنگ کے پردے لٹکائے گئے تھے۔ قالین بیش قیمت اور دلفریب تھا۔ کمرے میں خاص قسم کے پھولوں والے پودے جو گملوں میں لگے ہوئے تھے' رکھوائے گئے تھے۔ طبیب نے ایک خاص قسم کا عطر تیار کر رکھا تھا جو اس نے تھوڑا تھوڑا بستر پر اور پردوں پر مل دیا تھا۔

شمونہ کے لئے طبیب نے کچھ سوچ کر انتخاب کیا تھا کہ یہ کون سا لباس پہنے۔ اُس نے شمونہ سے کہا تھا کہ وہ بالوں کو گوندھ کر یا باندھ کر نہ رکھے بلکہ بال کھلے چھوڑ دے۔ اُسے قمیض ایسی پہنائی گئی تھی کہ اُس کے کندھے اور بازو ننگے رکھے گئے تھے۔ طبیب نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو کس طرح استعمال کرے گی۔ طبیب نے زور دے کر کہا تھا کہ اپنے جسم کو بچا کر رکھے اور اپنی روح کو پیار اور محبت کے ذریعے مزمل کی روح پر غالب کر دے۔ شمونہ نے طبیب سے کہا تھا کہ وہ اس کھیل کی مہارت اور تجربہ رکھتی ہے۔ مزمل کے معاملے میں سہولت یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے۔

شمونہ سوئے ہوئے مزمل کو دیکھتی رہی۔ وہ اس کے بیدار ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ کبھی وہ اٹھ کھڑی ہوتی اور کمرے میں ٹہلنے لگتی۔ کبھی وہ مزمل کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگتی۔ اس کا انداز ایک ماں جیسا تھا جس کا پیارا بچہ سویا ہوا ہو۔

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی۔ شمونہ کو غنودگی آنے لگی تھی۔ وہ سو ہی جانے کو تھی کہ مزمل کے جسم کو حرکت ہوئی۔ شمونہ بیدار ہو گئی اور مزمل کے پلنگ پر جا بیٹھی۔ مزمل نے کروٹ بدلی۔ شمونہ کو معلوم تھا کہ اب اس نے کیا کرنا ہے۔

مزمل نے کروٹ اس طرح بدلی تھی کہ اُس کا منہ شمونہ کی طرف تھا۔ شمونہ اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ مزمل کا ایک ہاتھ شمونہ کی گود میں آ گیا۔ شمونہ وہ ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے آہستہ آہستہ مسلنے لگی۔ پھر اس نے مزمل کے بالوں میں انگلیاں پھیرنی شروع کر دیں۔

مزمل کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔

"مزمل!" ۔۔۔ شمونہ نے اس پر جھک کر اپنے ہونٹ مزمل کے کان کے قریب کر کے کہا ۔۔۔ "تم میرے پاس آ گئے ہو۔ اب کوئی ہمیں جدا نہیں کر سکتا"۔

مزمل کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں اور وہ بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔ شمونہ اس پر اس طرح جھک گئی کہ اس کے ریشم جیسے کھلے بال مزمل کے گالوں اور گردن پر رینگنے لگے۔

"میں کہاں ہوں؟" ۔۔۔ مزمل نے خوابناک آواز میں پوچھا ۔۔۔ "تم کون ہو؟"

"تم میرے پاس ہو" ۔۔۔ شمونہ نے پیار بھری آواز میں کہا ۔۔۔ "تم اُس پیار کی جنت میں آ گئے ہو جہاں کوئی کسی کا خون نہیں بہا سکتا۔ میں ہوں تمہاری روح"۔

"میں قید خانے میں ہوں؟" ۔۔۔ مزمل نے یوں پوچھا جیسے نیند میں بول رہا ہو۔

"ہاں تم میرے دل کے قید خانے میں بند ہو" ۔۔۔ شمونہ نے پہلے سے زیادہ پیاری آواز میں کہا ۔۔۔ "تم میری محبت کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہو"۔

مزمل آفندی کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ اُس کے اور مزمل آفندی کے چہرے کے درمیان فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے آپ ہی شمونہ کے بالوں میں الجھ گیا۔ شمونہ کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ اُس نے آنکھیں مزمل کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ طبیب نے شمونہ کو جو ہدایات دی تھیں' ان کے مطابق اس نے مزمل کے ساتھ باتیں کیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مزمل ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ کمرے کو دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں سارے کمرے میں گھوم گئیں۔

"شمونہ!" ۔۔۔ مزمل نے وحشی سی اور حیرت زدہ سی آواز میں پوچھا ۔۔۔ "تم کب آئیں؟..... تم جھوٹ تو نہیں بولو گی..... میں کہاں سویا تھا؟..... میں نے..... میں نے شمونہ!..... میں نے شاید خواب دیکھا ہے" ۔۔۔ اس کے ماتھے پر شکنیں ظاہر ہوئیں جیسے وہ ذہن کے ویرانے میں کچھ ڈھونڈ رہا ہو لیکن اُسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

شمونہ نہیں چاہتی تھی کہ مزمل ایک بار پھر سو جائے۔ وہ اسے بیدار رکھنا چاہتی تھی اور اُسے واپس اسی ذہنی کیفیت میں لانا چاہ رہی تھی جس کیفیت میں وہ حسن بن صباح کو قتل کرنے کے ارادے سے روانہ ہوا تھا لیکن طبیب نجم مدنی نے اسے کہا تھا کہ یہ جاگ اٹھے تو اس کے ساتھ ایک دو باتیں کرنا اور یہ تمہیں پہچان لے کہ تم شمونہ ہو اور اس کے بعد اسے پھر دودھ کا پیالہ پلا دینا۔ شمونہ کو معلوم تھا کہ اس دودھ میں وہی دوائی شامل کی گئی ہے لیکن اس کی مقدار اب کم رکھی گئی ہے۔

"مزمل!" ۔۔۔ شمونہ نے اس کے گالوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا ۔۔۔ "تم بڑے لمبے اور بڑے کٹھن سفر سے واپس آئے ہو۔ میں تمہیں دودھ پلاؤں گی پھر

جاتا۔ تھکن دور ہو جائے گی تا تو میں تمہارے پاس بیٹھوں گی اور ہم پھر وہی پیار کی باتیں کریں گے"۔

شمونہ اٹھی اور دودھ کا پیالہ اٹھالائی۔ مزمل اسے حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شمونہ نے پیالہ اپنے ہاتھوں میں ہی رکھا اور اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ مزمل نے دو تین سانسوں میں دودھ پی لیا۔ دودھ میں اتنا شہد ملا گیا تھا جس سے دوائی کا ذائقہ دب گیا تھا۔

مزمل پھر غنودگی میں چلا گیا۔ شمونہ کو طبیب نے بتایا تھا کہ یہ پھر غنودگی میں جائے گا تو اس کے ساتھ کیا باتیں کرنی ہیں اور اس وقت تک یہ باتیں کرنی ہیں جب تک یقین نہ ہو جائے کہ یہ سو گیا ہے۔

شمونہ نے اب جو پیار کی باتیں شروع کیں تو اس کے اپنے آنسو نکل آئے۔ پیار کی ان باتوں میں ایک انسان کی دوسرے انسان سے محبت کی بات نہیں تھی بلکہ بنی نوع انسان کی محبت ان باتوں میں رچی بسی ہوئی تھی۔ طبیب کا دراصل مطلب یہ تھا کہ غنودگی کے عالم میں مزمل کے ذہن سے تخریب کاری اور قتل کے خیالات نکال کر اس میں پیار و محبت اور روحانیت کا نور بھرا جائے۔ شمونہ نے ایسے پُراثر طریقے سے یہ باتیں آہستہ آہستہ کیں کہ مزمل نے شمونہ کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہونٹوں سے لگایا اور اس کے ساتھ ہی وہ گہری نیند سو گیا۔ شمونہ کو ایسی بری نیند آئی تھی کہ وہ بھی وہیں لڑھک گئی اور سو گئی۔

○

صبح طلوع ہوئی تو طبیب اور نظام الملک یہ دیکھنے آئے کہ رات کس طرح گزری ہے۔ نظام الملک نے دروازے پر دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔ خاصی دیر گزر جانے کے بعد بھی اندر سے کوئی جواب نہ آیا نہ شمونہ باہر نکلی تو اُس نے ایک بار پھر دستک دی۔ پھر بھی کوئی جواب نہ آیا تو نظام الملک نے دروازہ کھولا اور طبیب کو ساتھ لے کر وہ اندر چلا گیا۔ دیکھا کہ شمونہ اس طرح گہری نیند سوئی ہوئی تھی کہ اس کا سر مزمل کے سینے پر تھا اور اس کی ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹک رہی تھیں۔ مزمل ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا طبیب نے وہ پیالہ دیکھا جس میں رات کو پلانے والا دودھ تھا۔ پیالہ خالی تھا۔

"آئیں نظام الملک!" ۔۔۔ طبیب نے کہا ۔۔۔ "شمونہ نے اسے رات کو دودھ پلا

دیا تھا۔ پیالہ خالی پڑا ہے۔ یہ دوپہر کے بعد جاگے گا۔ شمونہ شاید جلدی جاگ اٹھے۔ اس کی نیند جاتی رہی ہے کہ یہ رات بھر سو نہیں سکی"۔

دونوں کمرے سے نکل گئے۔

تین دن اور راتیں مسلسل مزمل کو یہ دوائی دودھ میں ملا کر پلائی جاتی رہی۔ ہر بار دوائی کی مقدار کم کرتے چلے گئے۔ وہ جب بیدار ہوتا تھا تو شمونہ اس کے ساتھ اس طرح کی باتیں کرتی تھی جس طرح اسے طبیب نجم مدنی نے بتائی تھیں۔ اس وقت مزمل کا ذہن نیم بیدار ہوتا تھا اور شمونہ جس پیارے انداز میں بات کرتی تھی وہ اس کے ذہن میں اترتی چلی جاتی تھی۔

یہ عمل طبیب کی نگرانی میں جاری رکھا گیا اور چوتھے دن اسے کوئی دوائی نہ دی گئی۔ جب وہ بیدار ہوا تو طبیب نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کی کنپٹیاں اپنے دونوں انگوٹھوں سے آہستہ آہستہ ملنی شروع کر دیں اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ باتیں کیں۔ یہ ایک قسم کا وہ عمل تھا جسے آج ہپناٹزم کہتے ہیں۔ یہ برین واشنگ جیسا ہی ایک عمل تھا جو سات آٹھ روز چلتا رہا اور کامیاب رہا۔ مزمل خاصی تیزی سے واپس اپنے آپ میں آ گیا۔ طبیب کو توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اصلی ذہنی کیفیت میں آ جائے گا۔ طبیب کی دوائی کا اپنا اثر تو تھا ہی خود طبیب نے کہا کہ اس دوائی کے اثر کو تیز اور کئی گنا زیادہ کرنے میں شمونہ کا ہاتھ تھا۔ ایک روز نظام الملک مزمل کے سامنے آیا۔ کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ مزمل کا ردِ عمل اور رویہ کیا ہو گا۔ طبیب نجم بھی وہاں موجود تھا اور شمونہ بھی تھی۔ کمرے کے دروازے کے ساتھ ہی باہر نظام الملک کے محافظ تیار کھڑے تھے۔

مزمل آفندی نے نظام الملک کو دیکھا اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔ نہایت آہستہ آہستہ اٹھا۔ نظام الملک بازو پھیلا کر اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے ہوئے اس کی طرف تیزی سے بڑھا۔

مزمل نے بھی بازو پھیلا دیئے اور دوسرے لمحے وہ ایک دوسرے کے بازوؤں میں تھے۔

"کیوں مزمل!" ۔۔۔ نظام الملک نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑے پیار سے پوچھا ۔۔۔ "کہاں چلے گئے تھے؟ ۔۔۔ میں تو سمجھا کہ تم چلے ہی گئے ہو"

"یہ تو میں بتا نہیں سکتا" ۔۔ مزمل نے کہا ۔۔ "آپ کو دیکھ کر کچھ یاد آتا ہے.... یہ بھی یاد آتا ہے کہ آپ نے مجھے جانے سے روکا تھا اور میں پھر بھی چلا گیا تھا"۔

"اور اب؟" ۔۔ نظام الملک نے بڑے پیارے لہجے میں پوچھا ۔۔ "اب تو نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں!" ۔۔ مزمل نے مسکرا کر جواب دیا ۔۔ "نہیں جاؤں گا..... اب کہیں نہیں جاؤں گا"۔

دو تین دن اور گزرے تو مزمل کو سب کچھ یاد آنے لگا۔ اب ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ اس کی حالت پھر بگڑ جائے گی۔ اس پر ایک اور ہی قسم کی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ پچھتاوے، شرمندگی اور حسن بن صباح سے انتقام لینے والی کیفیت تھی۔ نظام الملک اور شمونہ نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور ایک دو دن صرف کر کے اسے اس کیفیت سے نکال لیا۔

"مزمل آفندی!" ۔۔ ایک روز نظام الملک نے اسے کہا ۔۔ "جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ وہاں تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا۔ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ باطنی کس طرح تم جیسے جذبے والے آدمی پر بھی غالب آجاتے ہیں اور اسے اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں"۔

"میں بتا سکتا ہوں" ۔۔ مزمل آفندی نے کہا ۔۔ "مجھے وہاں گزارا ہوا ایک ایک لمحہ یاد آگیا ہے..... میں خود چاہتا ہوں کہ آپ کو وہ ساری روداد سناؤں۔ آپ کسی اور خیال سے مجھ سے وہ باتیں سننا چاہتے ہیں لیکن میں اس خیال سے آپ کو سنانا چاہتا ہوں کہ آپ کو پتہ چلے کہ میں کتنا مجبور ہو گیا تھا۔ میرا دماغ میرے قابو سے نکل گیا تھا"۔

"وہ بھول جاؤ" ۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔ "تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارے ذہن پر قبضہ کس طرح کیا گیا تھا؟"

"انہوں نے مجھے کال کوٹھڑی میں بند کر دیا" ۔۔ مزمل آفندی نے کہا ۔۔ "اس کوٹھڑی میں ایسی بدبو تھی جیسے وہاں مردار یا انسانی لاشیں گل سڑ رہی ہوں۔ مجھے تین دن نہ کچھ کھانے کے لئے دیا گیا اور نہ پینے کے لئے پانی کا گھونٹ دیا گیا۔ ایک طرف میرا خون کھولتا تھا، ابلتا تھا کہ میں دھوکے میں آگیا ہوں۔ اگر میں حسن بن صباح کو قتل کر چکا ہوتا تو پھر وہ مجھے کیسی ہی اذیتیں کیوں نہ دیتے، میں برداشت کر لیتا اور اس موت کو خندہ

پیشانی سے قبول کر لیتا جو آہستہ آہستہ اور مجھے اذیتیں دے دے کر مار تی۔ دوسری طرف جسم جواب دے رہا تھا۔ میں سات آٹھ دن بھوکا رہ سکتا تھا لیکن پانی کے بغیر ایک دن بھی گزارنا محال تھا.....

"اس کمرے میں جو بدبو تھی وہ میں بیان ہی نہیں کر سکتا کہ یہ کیسی تھی۔ اس بدبو نے میرا دماغ ماؤف کر کے رکھ دیا۔ پھر میں خود اپنا خون پی رہا تھا کہ میں جس مقصد کے لئے آیا تھا وہ پورا نہیں ہوا تھا۔ ایک طرف بھوک اور پیاس اور دوسری طرف یہ جلنا اور کڑھنا۔ تیسرے چوتھے دن مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میں بہت جلدی پاگل ہو جاؤں گا بلکہ پاگل پن شروع ہو چکا تھا۔ پھر ایک روز مجھے آدھی روٹی اس طرح دی گئی کہ دروازہ کھلا اور وہیں سے ایک آدمی نے میری طرف آدھی روٹی اس طرح پھینکی جیسے کتے کی طرف کوئی چیز پھینکی جاتی ہے۔ اس نے مٹی کا ایک غلیظ سا پیالہ دروازے کے قریب رکھ دیا اور چلا گیا۔ میں اپنی خودداری اور اپنے وقار کو بھول گیا تھا۔ میں کتوں کی طرح ہی روٹی کے آدھے ٹکڑے پر جھپٹ پڑا اور گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل اس چھوٹے سے پیالے تک گیا جو وہ آدمی دروازے کے اندر رکھ گیا تھا۔ وہ تھوڑا سا سالن تھا۔ میں نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ یہ کس چیز کا شوربہ تھا یا گدلا نمکین پانی تھا، میں لقمے اس میں ڈبو ڈبو کر حلق میں اتارتا گیا۔ آدھی روٹی ذرا سی دیر میں ختم ہو گئی اور اس سے میری بھوک اور تیز ہو گئی۔ میں اٹھا اور دروازے کی سلاخیں پکڑ کر چلانے لگا کہ مجھے اور روٹی دو، خدا کے لئے مجھے اور روٹی دو.....

"ایک سنتری آیا۔ میں دروازے کی سلاخیں پکڑے کھڑا تھا۔ اس نے سلاخوں کے درمیان سے میرے منہ پر اتنی زور سے گھونسہ مارا کہ میں پیچھے دیوار کے ساتھ جا لگا میرا پچھلا حصہ بڑی زور سے ٹکرایا تھا جس سے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر غشی میں پڑا رہا.....

"جب میں ہوش میں آیا تو میں کوٹھڑی میں نہیں تھا۔ وہ ذرا بستر اور صاف ستھرا کمرہ تھا۔ میں فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ ایک آدمی ہاتھ میں برچھی لئے میرے پاس کھڑا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ میری آنکھیں کھل گئی ہیں تو اس آدمی نے میرے پہلو میں پاؤں سے ٹھوکر لگا کر کہا، ہوش آگئی ہے؟ میں تو بول بھی نہیں سکتا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ آدمی باہر نکل گیا پھر وہ فوراً ہی واپس آگیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جس کی چال ڈھال،

ڈیل ڈول اور لباس ایسا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ شخص کوئی بڑا عہدیدار ہے"۔

مزمل آفندی نے آگے اپنی جو داستان سنائی وہ کچھ اس طرح تھی:۔ یہ معزز آدمی اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"مزمل آفندی!" — اس آدمی نے کہا — "تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

"پانی!" — مزمل کے منہ سے جیسے سسکی نکلی ہو — "پانی.... پانی....!"

"تم یہاں کیوں آئے تھے؟" — اس عہدیدار نے کہا — "میرے سوال کا جواب دو گے تو پانی مل جائے گا.... تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

"قتل ہونے کے لئے!" — مزمل نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ اپنے منہ سے باہر دھکیلے۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں" — عہدیدار نے کہا۔

مزمل آفندی کا منہ پیاس کی شدت سے کھل گیا تھا۔ وہ تو اب سرگوشی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بولنے کے قابل نہیں۔ اس کے ہونٹ ہلے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس نے دو مرتبہ پانی پانی کہا ہے۔

"نہیں!" — عہدیدار نے کہا — "پانی نہیں ملے گا"۔

مزمل کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ پیاس کی شدت نے اس پر غشی طاری کر دی تھی۔

مزمل آفندی ہوش میں آیا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ اب فرش پر نہیں ایک نرم سے بستر پر پڑا ہے۔ اس کے پاس ایک نوخیز دوشیزہ بیٹھی ہوئی تھی۔ مزمل نے آنکھیں کھولیں تو اسے سب سے پہلی جو چیز نظر آئی وہ اس لڑکی کی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ مزمل نے نظام الملک کو سنایا کہ وہ اسے خواب سمجھا۔

"اٹھو مزمل!" — لڑکی نے بڑے پیار سے کہا — "کھانا کھا لو"۔

"پانی!" — مزمل کے ہونٹوں سے سرگوشی پھسلی — "پانی!" — مزمل کا منہ کھلا رہا۔ اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور اس کی زبان اکڑ گئی تھی۔

"خالی پیٹ پانی نہیں دوں گی" — لڑکی نے کہا — "پہلے کھانا کھا لو.... تھوڑا سا کھا لو پھر پانی پینا"۔

مزمل اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ اس لڑکی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ مزمل نے دیکھا کہ یہ نہایت اچھا سجا سجایا کمرہ تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک گول میز رکھی ہوئی تھی اور اس میز پر کھانا پڑا ہوا تھا۔ تب مزمل کو پکے ہوئے گوشت اور روٹیوں کی بو محسوس ہوئی۔ وہ فوراً اٹھا اور میز کے قریب پڑے ہوئے سٹول پر بیٹھ گیا۔

وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سالن ایک قسم کا نہیں بلکہ تین چار قسم کے سالن تھے۔ یہ کسی شہزادے یا بہت بڑے حاکم کا کھانا تھا۔ مزمل آفندی ذرا جھینپ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کھانا اس کے لئے رکھا گیا ہے لیکن وہ اس قدر بھوکا تھا کہ اس نے نتائج سے بے پرواہ کھانا شروع کر دیا۔ وہ شائستہ اور معزز خاندان کا تہذیب یافتہ بیٹا تھا لیکن بھوک نے اور پیاس نے اس کا دماغ ایسا ناکارہ کر دیا تھا کہ وہ جانوروں کی طرح کھانا کھا رہا تھا۔ اسے یہ بھی خیال نہیں رہا تھا کہ سالن میز پر گر رہا ہے۔ وہ دسترخوان کے آداب بھول چکا تھا۔

بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے پیچھے چار ایک نوالے حلق سے اتار کر وہ صراحی پر لپکا جو میز پر پڑی ہوئی تھی۔ لڑکی بڑی تیزی سے آئی اور اس نے مزمل کے ہاتھ سے صراحی لے لی۔

"پانی میں پلاؤں گی" — لڑکی نے کہا — "بہت تھوڑا تھوڑا ایک ایک گھونٹ پلاؤں گی.... ایک ہی بار پانی نہیں پینا"۔

لڑکی نے ایک خوشنما پیالے میں تھوڑا سا پانی ڈال کر مزمل کو دیا۔ مزمل ایک ہی بار یہ پانی پی گیا اور پھر کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ تھوڑا سا کھا کر وہ پھر صراحی پر جھپٹا لیکن لڑکی نے پہلے کی طرح اس کے ہاتھ سے صراحی لے لی اور اب ذرا زیادہ پانی پیالے میں ڈال دیا۔ مزمل نے وہ پانی بھی ایک ہی سانس میں پی ڈالا۔

دیکھتے ہی دیکھتے مزمل تمام روٹیاں اور اتنے زیادہ سالن صاف کر گیا۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے سالن والے برتن دھلے ہوئے ہیں۔ مزمل نے ان میں لقمے پھیر پھیر کر ان برتنوں کو صاف کر دیا تھا۔ اب کے اس نے لڑکی سے پانی مانگا۔

"اب پانی نہیں" — لڑکی نے بڑی دلفریب مسکراہٹ سے کہا — "اب شربت پلاؤں گی"۔

لڑکی نے ایک اور صراحی اٹھائی اور اس میں سے شربت گلاس میں انڈیل دیا جو

مزمل نے اٹھا کر ایک ہی بار خالی کر دیا۔

مزمل آفندی لڑکی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اسے اتنی غلیظ کوٹھڑی سے نکال کر یہاں کیوں لایا گیا ہے اور ایسا امیرانہ کھانا اسے کیوں دیا گیا ہے لیکن وہ کچھ بھی نہ پوچھ سکا کیونکہ اس پر غنودگی طاری ہو گئی تھی اور وہ بستر کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ لڑکی نے اسے کہا کہ وہ سو جائے۔ وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھا تو حیرت زدہ نظروں سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک سوال تھا لیکن یہ سوال زبان پر آنے سے پہلے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور لڑکی نے اسے سہارا دے کر پلنگ پر لٹا دیا۔

○

صبح جب مزمل اس کمرے سے نکلا تو اس نے یوں محسوس کیا جیسے یہ دنیا ہی کوئی اور بدل گئی ہو۔ اس کے سامنے ایک وسیع باغ تھا جس میں ایسے ایسے پھول تھے جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ گھاس بہت ہی سرسبز تھی اور یہ گھاس اوپر سے اس طرح تراشی ہوئی تھی جیسے زمین پر سبز رنگ کا قالین بچھا ہوا ہو۔ مزمل آگے بڑھا تو کمرے سے لڑکی نکل آئی۔ وہ بھی اس کے ساتھ چل پڑی۔

”کیا تم مجھے کچھ بتا سکتی ہو؟“ — مزمل نے لڑکی سے پوچھا — ”مجھے اس غلیظ کوٹھڑی میں سے نکال کر اس امیرانہ کمرے میں کیوں لایا گیا؟ اور ایسا مرغن اور پرلطف اور لذیذ کھانا کیوں دیا گیا ہے؟“

”تمہیں امام کے حکم سے قید خانے سے نکالا گیا“ — لڑکی نے جواب دیا — ”اور یہ کھانا اسی کے حکم سے تمہیں کھلایا گیا ہے اور مجھے امام نے ہی تمہاری خدمت کے لیے بھیجا ہے“۔

”کون امام؟“ — مزمل نے حیران سا ہو کے پوچھا۔

”امام حسن بن صباح!“ — لڑکی نے جواب دیا۔ مزمل چلتے چلتے رک گیا اور اس نے حیرت زدگی کے عالم میں لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی مسکرا رہی تھی۔

”کیا میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟“ — مزمل نے کہا جیسے اپنے آپ سے بات کر رہا ہو۔

”میں سمجھتی ہوں تم کیا سوچ رہے ہو“ — لڑکی نے کہا — ”امام کو کل بتایا گیا ہے کہ تم اسے قتل کرنے کے لیے آئے تھے۔ اسے یہ بھی بتایا گیا کہ تمہیں قید خانے کی

انتہائی غلیظ کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا ہے۔ امام نے تمہیں قید خانے میں ڈالنے والوں کو بلایا اور حکم دیا کہ انہیں بیس بیس کوڑے لگائے جائیں کیونکہ انہوں نے اس کے حکم کے بغیر ایک مہمان کو قید خانے میں ڈال دیا تھا۔ اس طرح تمہاری رہائی کا حکم دیا گیا اور تم یہاں پہنچ گئے۔...... کیا تم واقعی حسن بن صباح کو قتل کرنے آئے تھے؟“

”ہاں!“ — مزمل نے یوں کہا جیسے اسے شرمندگی تھی کہ وہ حسن بن صباح کو قتل کرنے آیا ہے۔

”امام کسی وقت یہاں آئے گا“ — لڑکی نے کہا — ”یا وہ تمہیں اپنے پاس بلائے گا“۔

”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں نہ آئے؟“ — مزمل نے پوچھا — ”اور کیا یہ ممکن ہے کہ وہ مجھے اپنے پاس نہ بلائے؟“

”تم یہ کیوں سوچ رہے ہو؟“

”میں نے اگر اسے کہہ دیا کہ میں اسے قتل کرنے آیا تھا تو وہ پھر مجھے قید خانے میں پھینک دے گا“ — مزمل نے کہا — ”میں اس کے آگے جھوٹ نہیں بول سکوں گا“۔

”تم نہیں جانتے مزمل!“ — لڑکی نے کہا — ”امام حسن بن صباح ایک برگزیدہ اور اللہ کی بڑی پیاری شخصیت ہے۔ وہ صرف سچ سنتا ہے اور سچ بولتا ہے۔...... تم صاف کہہ دینا کہ میں آپ کے دشمنوں سے متاثر ہو کر آپ کو قتل کرنے چلا آیا تھا“۔

لڑکی مزمل کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے حسن بن صباح کی ایسی تصویر پیش کرتی رہی جو کسی فرشتے کی یا کسی پیغمبر کی ہی ہو سکتی تھی۔ باتیں کرتے کرتے وہ مزمل کو واپس کمرے میں لے آئی۔ مزمل نے کمرے میں پہنچتے ہی اسی شربت کی فرمائش کی جو لڑکی نے گزشتہ رات اسے پلایا تھا۔ صراحی کمرے میں ہی رکھی تھی۔ لڑکی نے اسے پیالہ بھر دیا جو مزمل نے پی لیا۔

مزمل کا جی چاہتا تھا کہ یہ لڑکی اس کے ساتھ باتیں کرتی رہے اور وہ خود بھی بولے اور بولتا ہی چلا جائے۔ اس غلیظ اور بدبودار کوٹھڑی کی قید نے بھوک اور پیاس نے اس کے دماغ پر ایسا اثر کیا تھا جیسے اس کی سوچنے کی صلاحیت سو گئی ہو یا آدمی سے زیادہ صلاحیت مر ہی گئی ہو۔ پھر اس کے دماغ پر یہ لڑکی اور اس کی باتیں غالب آ گئیں۔ بات دہی ہوئی کہ ایک تو یہ لڑکی نشہ بن کر اس پر طاری ہوئی اور دوسری یہ بات کہ اس لڑکی

نے اسے حشیش پلانی شروع کر دی تھی۔

O

مزمل کے ذہن پر اور ضمیر پر بھی اب کوئی بوجھ نہیں تھا۔ وہ ایسے احساس سے سرشار اور مخمور ہوا جا رہا تھا جیسے وہ ماضی سے آزاد ہو اور یہ احساس بھی کہ وہ مکمل طور پر ہوش میں ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ مزمل نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ لڑکی نے جا کر دروازہ کھولا۔

"امام تشریف لا رہے ہیں" ___ مزمل کو باہر سے آواز سنائی دی۔

لڑکی نے دروازے کے دونوں کواڑ کھول دیئے۔ حسن بن صباح کمرے میں داخل ہوا۔ مزمل اسے دیکھ کر اٹھا اور حیرت سے اسے دیکھتا ہی رہا۔

لڑکی دروازہ بند کر کے باہر ہی کھڑی ہو گئی۔ کمرے میں حسن بن صباح اور مزمل رہ گئے۔ حسن بن صباح کے چہرے پر سنجیدگی سی تھی۔ مزمل اسے خاموشی سے دیکھتا رہا اور حسن بن صباح آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کمرے میں سناٹا طاری تھا۔ یہی وہ حسن بن صباح تھا جسے قتل کرنے کو مزمل اس قدر بے تاب تھا کہ منع کرنے کے باوجود وہ اسے قتل کرنے یہاں پہنچ گیا تھا لیکن اب اس کی حالت یہ تھی کہ اس کے دماغ میں یہ بھی سوچ نہیں آ رہی تھی کہ وہ حسن بن صباح کا سامنا کس طرح کرے اور کیا کہے۔ اس کا دل اس جذبے سے خالی ہو چکا تھا جو جذبہ اسے یہاں لایا تھا۔

دہکتے ہوئے انگارے برف کے ٹکڑے بن گئے تھے۔

"مزمل آفندی!" ___ حسن بن صباح نے مزمل کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔ "مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ تم میرے قلعے میں مہمان بن کر آئے اور تمہیں ان بدبختوں نے قید خانے میں بند کر دیا..... تم مجھے قتل کرنے آئے ہو"۔

حسن بن صباح مزمل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہا تھا اور مزمل یوں محسوس کر رہا تھا جیسے یہ شخص اس کی روح میں اتر گیا ہو۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اس نے اتنا ہی محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن نہ دماغ اس کا ساتھ دے رہا ہے نہ زبان میں حرکت ہو رہی ہے۔

حسن بن صباح نے چغہ پہن رکھا تھا جو اس کے ٹخنوں تک لمبا تھا۔ اس نے چغے

کے اندر ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر نکلا تو اس ہاتھ میں تلوار تھی۔ مزمل نے جب حسن بن صباح کے ہاتھ میں تلوار دیکھی تو اسے موت نظر آنے لگی۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔

"یہ لو" ــــ حسن بن صباح نے تلوار اپنے دونوں ہاتھوں میں رکھ کر مزمل کو پیش کی اور بولا ــــ "تلوار لو اور مجھے قتل کرو"۔

مزمل تلوار کی طرف تو دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی نظریں حسن بن صباح کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ حسن بن صباح نے تلوار کا دستہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ مزمل نے تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ حسن بن صباح نے اس کی طرف پیٹھ کر لی۔

مزمل خاص طور پر محسوس کر رہا تھا کہ اس میں اتنی ہمت ہے ہی نہیں کہ وہ تلوار سے حسن بن صباح کی گردن اڑا دے۔ اسے تو جیسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ حسن بن صباح کو وہ اپنا نہیں بلکہ اسلام کا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔

حسن بن صباح کچھ دیر مزمل کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا رہا پھر وہ آہستہ آہستہ مڑا اور اس نے مزمل کا سامنا کیا۔

"اگر میں جھوٹا ہوتا تو اب تک میرا سر تمہارے ہاتھوں میرے جسم سے الگ ہو چکا ہوتا" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "تم ایسے لوگوں کی باتوں سے متاثر ہو کر یہاں آ گئے ہو جو میری صداقت سے واقف نہیں۔ سلطنت سلجوق کے سلطان نہیں چاہتے کہ کوئی ایسی طاقت ابھرے جو بنی نوع انسان کو ان سلطانوں اور بادشاہوں سے آزاد کرا دے۔ بادشاہی صرف اللہ کی ہے اور میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ اللہ کے حکم سے کر رہا ہوں ..... تم تلوار چلاؤ۔ تلوار میرے جسم کے قریب آ کر رک جائے گی کیونکہ اللہ نے ابھی میرے خلاف فیصلہ نہیں دیا"۔

مزمل کی برین واشنگ پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اگر کچھ کسر رہ گئی تھی تو وہ حسن بن صباح نے پوری کر دی۔ مزمل نے تلوار اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھائی اور حسن بن صباح کے آگے دو زانو ہو کر اس نے ہاتھ آگے کئے اور تلوار حسن بن صباح کو پیش کی۔ حسن بن صباح نے تلوار لے لی اور چغے کے اندر نیام میں ڈال لی۔

"مزمل آفندی!" ــــ حسن بن صباح نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا ــــ "تم میرے مہمان ہو..... میرے ساتھ آؤ"۔

○

مزمل آفندی حسن بن صباح کے ساتھ چلا گیا۔ حسن بن صباح نے غالباً دیکھ لیا تھا کہ مزمل دلیر اور خطرے مول لینے والا جوان ہے اور یہ بڑا ہی آسان شکار ہے اس لئے حسن بن صباح نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔

"محترم وزیر اعظم!" — مزمل نے نظام الملک کو اپنی یہ پُراسرار داستان سناتے ہوئے کہا — "حسن بن صباح مجھے جب اپنے ساتھ لے گیا تو میں ایک ایسی دنیا میں داخل ہو گیا جسے میں آج ایک بڑا ہی حسین اور طلسماتی خواب سمجھتا ہوں۔ اگر جنت کا وجود ہے تو میں نے وہ حسن بن صباح کی دنیا میں دیکھی ہے۔ آج جب میں اپنے ہوش و حواس میں آگیا ہوں' اس جنت کو خواب ہی سمجھتا ہوں۔ حسن بن صباح میرے ساتھ خاص طور پر شفقت کرتا تھا۔ میں اسے یوں مقدس اور متبرک شخصیت سمجھنے لگا تھا کہ آسمان پر خدا ہے تو زمین پر حسن بن صباح ہے۔ اس نے چند دنوں میں ہی مجھے اپنے راز دینے شروع کر دیئے تھے۔ اُس نے نہایت پُرکشش طریقے سے مجھے آپ کے خلاف کیا اور میرے دل میں آپ کی دشمنی بھر دی۔ میں تو بہت جلدی آپ کو قتل کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ حسن بن صباح کو مجھ پر ایسا اعتبار آیا کہ اس نے اپنے کچھ راز بھی مجھے دے دیئے"۔

"اب دوسری باتوں کو چھوڑو" — نظام الملک نے کہا — "میں راز کی باتیں سننا چاہتا ہوں"۔

مزمل آفندی نے راز کی جو باتیں سنائیں وہ ابوالقاسم رفیق دلاوری نے متعدد مؤرخوں کے حوالوں سے آئمہ تلبیس میں تفصیل سے بیان کی ہیں۔ وہ یوں ہیں کہ حسن بن صباح نے اپنے خاص مریدوں کو تین گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک گروہ دوسرے ملکوں میں تبلیغ کا کام کرتا تھا لیکن اس گروہ کے آدمی عام لوگوں کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ حاکموں اور سرداروں کی سطح کے لوگوں سے ملتے اور انہیں اپنے نظریات بتاتے اور ایسے طریقے اختیار کرتے کہ یہ سرکردہ لوگ ان کے ہمنوا ہو جاتے تھے۔ دوسرے گروہ کے آدمیوں کو رفیق کہا جاتا تھا۔ یہ حسن بن صباح کا ذاتی حلقہ تھا اور تمام رفیق اس کے اس حلقے میں شامل تھے۔

تیسرا گروہ فدائیوں کا تھا۔ یہ جانباز لوگ تھے جن میں سے وہ کسی کو حکم دیتا کہ اپنے آپ کو قتل کر دو تو وہ شخص تلوار اپنے دل میں اتار لیتا تھا۔ مزمل نے بتایا کہ اس تیسرے

گروہ میں جو لوگ شامل تھے اور جنہیں شامل کیا جا رہا تھا وہ تھے تو انسان ہی لیکن ان کی فطرت میں خونخواری اور مردم کُشی بھر دی گئی تھی۔ انہیں بِلّی کا گوشت کھلایا جاتا تھا۔ وہ اس لئے کہ بِلّی جب حملہ کرتی ہے تو بڑی غضبناک ہو کر حملہ کرتی ہے اور اپنے شکار کو مار کر ہی دم لیتی ہے۔

فدائیوں کو تو بِلّی کا گوشت کھلایا جاتا تھا لیکن رفیقوں کو یعنی دوسرے گروہ کے آدمیوں کو بادام' شہد اور کلونجی کھلائی جاتی تھی۔ یہ خوراک ان کے جسموں میں گرمی پیدا کرتی تھی اور جب یہ گرمی دماغ کو چڑھتی تھی تو انہیں جو بھی حکم دیا جاتا وہ اُسی وقت پورا کرتے تھے۔ رفیق آمنے سامنے کی لڑائی لڑتے تھے لیکن فدائی اپنے شکار کو دھوکے میں لا کر زمین دوز طریقوں سے ختم کرتے تھے۔ حسن بن صباح نے جتنی تاریخی شخصیتوں کو قتل کروایا ہے وہ ان ہی فدائیوں کے ہاتھوں کروایا ہے۔

داستان گو آگے چل کر حسن بن صباح کی جنت اور اس کی دنیا کے خفیہ گوشے تفصیل سے بیان کرے گا۔ یہاں بات صرف مزمل آفندی اور نظام الملک کی ہو گی۔ نظام الملک نے قلعہ الموُت پر حملے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کی فوج کو ٹریننگ دی جا رہی تھی۔

"اب بتاؤ مزمل" — نظام الملک نے پوچھا — "کیا اب بھی تم چاہتے ہو کہ اکیلے جا کر حسن بن صباح کو قتل کر دو؟"

"نہیں وزیر اعظم!" — مزمل نے جواب دیا — "مجھے الموُت جانے سے روکنے والے سچ کہتے تھے کہ انسان حسن بن صباح کے ہاتھوں قتل ہو سکتا ہے اسے دھوکے میں لا کر قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم حسن بن صباح کو زندہ رہنے کا حق دیئے رکھیں۔ اگر آپ میرے مشورے کو قبول کریں تو میں یہی کہوں گا کہ فوج کشی کے بغیر آپ باطنیوں کے پھیلتے ہوئے طوفان کو نہیں روک سکتے۔ میں کچھ دن اس دنیا میں گذار آیا ہوں۔ میں نے وہاں دیکھا ہے اور میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ آپ نے حسن بن صباح کا راستہ نہ روکا تو وہ دن جلدی آ جائے گا جب سلطنتِ سلجوق پر بھی حسن بن صباح کی بادشاہی ہو گی"۔

○

نظام الملک نے اپنی فوج کو قلعہ الموُت پر حملے کے لئے تیار کر لیا تھا۔ اس نے بہتر یہ سمجھا کہ خونریزی نہ ہی ہو تو اچھا ہے۔ اس نے سلطان ملک شاہ سے کہا کہ وہ حسن بن

صباح کی طرف اپنا ایک ایلچی بھیجنا چاہتا ہے سلطان نے اسے اجازت دے دی اور اسی روز ایک ایلچی اس پیغام کے ساتھ المُوت بھیج دیا گیا کہ حسن بن صباح اپنی یہ سرگرمیاں جو اسلام کے سراسر خلاف ہیں ختم کردے اور سلطان ملک شاہ کی اطاعت قبول کرلے۔

ایلچی چلا گیا اور المُوت پہنچ کر وہ حسن بن صباح سے ملا اور اسے سلطان ملک شاہ اور نظام الملک کا پیغام دیا۔

"اپنے سلطان کو اور نظام الملک کو میرا پیغام دینا" — حسن بن صباح نے کہا — "میں نے کبھی کسی کی اطاعت قبول نہیں کی۔ اے نظام الملک! ہم دونوں اکٹھے پڑھے ہیں اور ایک ہی استاد سے پڑھے ہیں۔ مجھے تم اُس زمانے سے جانتے ہو۔ میں تمہیں ایک مخلص دوست کی حیثیت سے مشورہ دیتا ہوں کہ المُوت کا کبھی رُخ نہ کرنا اور اے سلطنتِ سلجوق کے سلطان ملک شاہ! اپنی سلطنت کی حدود میں رہو، یہی تمہارے لئے بہتر ہے اور تمہارے لئے یہ بھی بہتر ہے کہ مجھے میری دنیا میں آزاد رہنے دو۔ اگر تمہیں میرا یہ مشورہ اچھا نہ لگے تو میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ تمہارا اور تمہاری فوج کا انجام بہت بُرا ہوگا"۔

ایلچی وہاں سے رخصت ہونے لگا تو حسن بن صباح نے اسے روک لیا۔

"ٹھہر جاؤ" — حسن بن صباح نے اسے کہا — "تم شاید سمجھے نہیں کہ میں نے کیا کہا ہے، یا شاید تم یہ سمجھے ہوگے کہ میں نے ویسے ہی بڑ ماری ہے۔ میں تمہیں اپنے الفاظ کو عملی شکل میں دکھاتا ہوں"۔

حسن بن صباح کے حکم سے سوڈیڑھ سو آدمی جو دراصل اس کے فدائین تھے وہاں ایک صف میں آکر کھڑے ہوگئے۔

"میرے دوستو!" — حسن بن صباح ان سے مخاطب ہُوا — "میں تم سے کسی ایک کو اللہ کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔ جو اللہ کے پاس جانا چاہتا ہے وہ آگے آجائے"۔

تمام آدمی ایک ہی بار آگے آگئے اور ہر ایک نے بلند آواز سے کہا کہ میں اللہ کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ حسن بن صباح نے ایک آدمی کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ آدمی دوڑتا ہُوا اس کے پاس پہنچ گیا۔

"اپنے آپ کو قتل کردو" — حسن بن صباح نے اسے کہا۔

جواں سال آدمی نے اپنے کمربند میں اُڑسا ہُوا خنجر نکالا، خنجر کی نیام الگ کر کے

پرے پھینکی اور خنجر پوری طاقت سے اپنے دل میں اتار دیا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہا پھر اس کے منہ سے بڑی زور کا نعرہ نکلا — "امام حسن بن صباح زندہ باد" — اور اس کے بعد وہ آدمی گر پڑا اور مر گیا۔

حسن بن صباح نے ایک اور ویسے ہی جواں سال آدمی کو بلایا۔ وہ سب آدمی جوان تھے یا نوجوان تھے۔ وہ آدمی دوڑتا ہُوا حسن بن صباح کے سامنے جا رکا۔

"دوڑ کر قلعے کی دیوار پر چڑھ جاؤ" — حسن بن صباح نے اسے کہا — "اور اپنے آپ کو سر کے بل نیچے گرا دو"۔

وہ نوجوان فوراً دوڑ پڑا اور تھوڑی دیر بعد وہ قلعے کی اتنی اونچی دیوار پر کھڑا نظر آیا۔ اس نے اپنے آپ کو اس طرح سر کے بل دیوار سے گرایا جس طرح تیراک بلندی سے پانی میں ڈائیو کیا کرتے ہیں۔

زیادہ تر مؤرخوں نے ان دو آدمیوں کا ہی ذکر کیا ہے، بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح نے اپنے ایک اور فدائی کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ ڈوب کر مرجائے۔ وہ فدائی اُسی وقت چلا گیا اور ڈوب کر مر گیا۔ اس تیسرے فدائی کی موت کے ساتھ یہ نہیں لکھا گیا کہ وہ دریا میں کودا تھا یا کوئی جھیل تھی یا کوئی گہرا حوض تھا، بہرحال یہ لکھا گیا ہے کہ وہ ڈوب کر مر گیا۔

"اپنے سلطان ملک شاہ کو یہ سب کچھ سنانا جو تم نے دیکھا ہے" — حسن بن صباح نے ایلچی سے کہا — "میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ میرے پاس اس قسم کے بیس ہزار فدائین ہیں۔ سلطان سے پوچھنا کہ تمہارے اتنے بڑے لشکر میں کوئی ایک بھی سپاہی ہے جو اس طرح تمہارے اشارے پر اپنی جان دے دے؟..... اور میرے دوست نظام الملک سے کہنا کہ میں آج بھی تمہارا احترام کرتا ہوں۔ لڑکپن کی دوستی کو قائم رکھو اور مجھ پر فوج کشی کا خیال دل سے نکال دو۔ اگر تمہیں میری بات سمجھ نہیں آئی تو بے شک آجاؤ اور جتنا بڑا لشکر اکٹھا کر سکتے ہو، لے آؤ"۔

ایلچی کے چہرے پر حیرت زدگی بلکہ کسی حد تک خوف زدگی کے تاثرات صاف نظر آرہے تھے۔ وہ چپ چاپ وہاں سے چل پڑا۔

○

ایلچی واپس مَرو پہنچا تو سلطان ملک شاہ اور نظام الملک نے بیتابی سے اس سے پوچھا

کہ حسن بن صباح نے کیا جواب دیا ہے۔ ایلچی نے جو سرفروشی اور جاں نثاری کے مظاہرے وہاں دیکھے تھے' وہ انہیں سنا دیئے اور حسن بن صباح نے جو جواب دیا تھا وہ بھی انہیں سنا دیا۔

سلطان ملک شاہ پر خاموشی طاری ہو گئی لیکن نظام الملک کو جیسے غصہ آگیا ہو۔ وہ اٹھ کر کمرے میں تیز تیز ٹہلنے لگا اور بار بار وہ اپنے ایک ہاتھ کا مُکا اپنے دوسرے ہاتھ پر مارتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو خواجہ!" ــــ سلطان ملک شاہ نے پوچھا۔ اس کا لب و لہجہ کچھ ٹھنڈا سا تھا۔

"میں اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں سوچ سکتا کہ فوراً کوچ کیا جائے" ــــ نظام الملک نے کہا ــــ "کیا یہ ابلیس یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس کی گیدڑ بھبکیوں سے ڈر جائیں گے؟..... سلطانِ محترم! میں کل صبح فجر کی نماز کے بعد کوچ کر جاؤں گا۔ اُمید ہے آپ مجھے روکیں گے نہیں"۔

"ہاں خواجہ!" ــــ سلطان ملک شاہ نے کہا ــــ "تم کل صبح لشکر لے کر نکل جاؤ' میری دعائیں تمہارے ساتھ جائیں گی"۔

اگلی صبح فجر کی نماز سے فارغ ہو کر خواجہ حسن طوسی نظام الملک نے اپنے لشکر سے خطاب کیا۔ اس نے گذشتہ روز تمام لشکر کو تیاری کا حکم دے دیا تھا۔ صبح لشکر کوچ کے لئے تیار تھا۔ نظام الملک نے مختصر الفاظ میں اپنے لشکر سے کہا کہ وہ کسی کا ملک فتح کرنے نہیں جا رہا ہے۔ اس نے حسن بن صباح اور باطنیوں کے متعلق کچھ باتیں کیں اور کہا کہ ہم سلطنتِ سلجوق کی توسیع کے لئے نہیں جا رہے بلکہ ایک ابلیسی قوت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے جا رہے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر ہم نے وقت ضائع کیا یا وہاں جا کر ہم نے جانیں قربان کرنے سے منہ پھیر لیا تو سمجھ لو کہ تمہارا دینِ اسلام چند دنوں کا مہمان ہے۔ پھر یہاں نہ کوئی اللہ کا اور نہ اللہ کے رسول کا نام لینے والا زندہ رہے گا۔

لشکر روانہ ہو گیا۔ عورتوں نے اپنے گھروں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر لشکر کو اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ کچھ لوگ لشکر کے ساتھ دور تک گئے اور لشکر کو خدا حافظ کہہ کر واپس آگئے۔

لشکر ابھی آدھے راستے میں ہی تھا کہ حسن بن صباح کو جاسوسوں نے اطلاع دی کہ

سلجوقیوں کا لشکر آ رہا ہے۔ انہوں نے لشکر کی صحیح تعداد بھی بتا دی۔ حسن بن صباح کے جاسوس ہر جگہ موجود تھے۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ کوئی بات ابھی سلطان تک نہیں پہنچتی تھی لیکن حسن بن صباح تک پہلے پہنچ جاتی تھی۔

مسلمان مؤرخوں کے علاوہ دو یورپی مؤرخوں نے بھی لکھا ہے کہ جب حسن بن صباح کو اطلاع ملی کہ نظام الملک لشکر لا رہا ہے تو حسن بن صباح کا ردِ عمل صرف اتنا سا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے ایسا نہیں کیا کہ اٹھ کر دوڑ پڑتا اور اپنے لشکر کو تیاری کا حکم دیتا یا لشکر کو اکٹھا کر کے کوئی اشتعال انگیز تقریر کرتا' وہ اطمینان اور آرام سے بیٹھا رہا۔ اس کے پاس تین چار خاص معتمد اور مشیر بیٹھے ہوئے تھے۔

"تم نے سن لیا ہے" ــــ حسن بن صباح نے انہیں کہا ــــ "نظام الملک کو راستے میں ہی قتل کر دو"۔

بس اتنی سی بات تھی جو حسن بن صباح کے منہ سے نکلی۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک اٹھا اور باہر نکل گیا۔

یہاں تاریخ نویسوں میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے جو کوئی اتنا اہم نہیں لیکن اس کا ذکر ضروری ہے۔ کچھ نے لکھا ہے کہ نظام الملک کو سلطان ملک شاہ نے مَرو سے ہی رخصت کر دیا تھا لیکن زیادہ تعداد تاریخ نویسوں کی ایسی ہے جنہوں نے لکھا ہے کہ سلطان ملک شاہ بغداد جا رہا تھا۔ وہ لشکر کے ساتھ چل پڑا اس کا ارادہ یہ تھا کہ راستے سے بغداد کی طرف چلا جائے گا۔ چونکہ مؤرخوں کی زیادہ تعداد نے یہی لکھا ہے کہ سلطان ملک شاہ لشکر کے ساتھ گیا تھا اور اس سے آگے کے جو حالات تاریخ میں نظر آتے ہیں' وہ بھی گواہی دیتے ہیں کہ سلطان ملک شاہ ساتھ گیا تھا اس لئے داستان گو یہی صحیح سمجھتا ہے۔

راستے میں جا کر سلطان ملک شاہ نے خواہش ظاہر کی کہ نہاوند کے مقام پر پڑاؤ کیا جائے۔ نہاوند بڑا مشہور قصبہ تھا جس کی جغرافیائی اور تاریخی اہمیت تھی۔ بیسویں ہجری میں یہ مقام حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں فتح ہوا تھا۔ اس لڑائی میں صحابہ کرام کی اچھی خاصی تعداد شہید ہوئی تھی۔

وہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ ان لوگوں نے نہاوند پہنچ کر روزہ افطار کیا۔ رات تراویح کی نماز سب نے پڑھی۔ نماز تراویح کے بعد نظام الملک اپنی قیام گاہ کی طرف چل

پڑا۔ تاریخ کے مطابق لشکر نے تو اپنے لئے خیمے گاڑ لئے تھے لیکن سلطان ملک شاہ اور نظام الملک کی رہائش کا انتظام قصبے میں ایک بڑے اچھے مکان میں کیا گیا تھا۔ اُس وقت سلطان ملک شاہ نظام الملک کے ساتھ نہیں تھا۔

نظام الملک جب اپنی قیام گاہ کے قریب پہنچا تو وہاں بہت سے لوگ اکٹھے دیکھے جو نظام الملک کو دیکھنے یا اسے ملنے آئے تھے۔ نظام الملک ان کے درمیان جا پہنچا اور جو کوئی بھی آگے آیا اس کے ساتھ اس نے ہاتھ ملایا۔

"کیا سلجوقیوں کا وزیرِاعظم ایک مظلوم کی فریاد سنے گا؟" ــــ ایک آواز سنائی دی ــــ "میں درخواست لکھ کر لایا ہوں"۔

نظام الملک عدل و انصاف کا پابند تھا اور ہر کسی سے انصاف کرنا وہ اپنا دینی فریضہ سمجھتا تھا۔ اس نے جب یہ فریاد سنی تو بلند آواز سے کہا کہ یہ شخص آگے آکر اپنی عرضی مجھے دے۔

ایک جواں سال آدمی آگے آیا اور اس نے احتجاج یا غصے کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ اس کے ہاتھ میں جو کاغذ تھا وہ نظام الملک کے ہاتھ میں دینے کی بجائے اس کے قدموں میں پھینک دیا اور غصے سے بولا "یہ لو میری فریاد اور مجھے انصاف دو۔

نظام الملک کاغذ اٹھانے کے لئے جھکا۔ کاغذ پھینکنے والے شخص نے بڑی تیزی سے اپنے کپڑوں کے اندر سے خنجر نکالا اور جھکے ہوئے نظام الملک کی پیٹھ میں اس قدر زور سے مارا کہ خنجر دل کو چیرتا ہُوا دوسری طرف نکل گیا۔

لوگوں نے قاتل کو وہیں پکڑ لیا۔ نظام الملک پیٹھ میں خنجر لئے ہوئے سیدھا ہُوا۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے ــــ "اسے میرے قصاص میں قتل نہ کرنا" ــــ لیکن لوگوں نے اس کی نہ سنی۔ کچھ نے نظام الملک کو اٹھا لیا اور زیادہ تر نے قاتل کے جسم کو قیمہ بنا ڈالا۔

اس قاتل کا نام ابو طاہر تھا وہ حسن بن صباح کے فدائین میں سے تھا۔

نظام الملک کو 1092ء میں قتل کیا گیا تھا۔

سلطان ملک شاہ کو اطلاع ملی تو وہ دوڑا آیا۔ نظام الملک فوت ہو چکا تھا اور قاتل کی لاش اس حالت میں باہر پڑی تھی کہ لوگوں نے اس کے اعضاء بھی کاٹ کر اِدھر اُدھر پھینک دیے تھے۔ سلطان نے الموت پر فوج کشی کا ارادہ ترک کر دیا اور وہیں سے واپس آگیا۔

خواجہ حسن طوسی نظام الملک کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ درباری قسم کا یا رسمی سا وزیرِاعظم بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں ہی ایک مدرسہ کھولا تھا جو آج بھی بغداد میں موجود ہے۔ نظام الملک نے اس مدرسے کا نام مدرسہ نظامیہ رکھا تھا۔ اس مدرسے نے بڑی نامور اور تاریخی شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ امام غزالیؒ اسی مدرسے سے پڑھے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسی مدرسے سے تعلیم حاصل کی تھی اور بہاؤالدین شدّاد جو ایک مشہور سکالر اور عالم تھا' سلطان صلاح الدین ایوبی کے ساتھ اس مدرسے میں پڑھا تھا۔ بہاؤالدین شدّاد تمام صلیبی جنگوں میں صلاح الدین ایوبی کے ساتھ پرسنل سیکرٹری کی حیثیت سے' ایلچی اور مشیر کی حیثیت سے رہا تھا۔ سلطان ایوبی کی وفات کے بعد بہاؤالدین شدّاد نے اس کی زندگی پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا حال ہی میں انگریزی میں ترجمہ ہُوا ہے۔

سلطان ملک شاہ کی فوج جب واپس آتے ہوئے مَرو سے کچھ دور تھی تو لوگ گھروں سے نکل آئے اور جو کوئی جس کام میں مصروف تھا وہ چھوڑ کر اُس راستے پر آکھڑا ہُوا جس پر فوج آرہی تھی۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ گئیں۔ لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ سمجھے فوج جو اتنی جلدی واپس آرہی ہے' وہ یقیناً "فتح یاب واپس آرہی ہے۔

لوگ دوڑ کر آگے چلے گئے تاکہ اپنی فاتح فوج کا استقبال جوش و خروش اور فتح کے نعروں سے کریں۔ انہوں نے دیکھا کہ فوج کے آگے آگے مجاہدین نے کسی کی لاش اٹھا رکھی تھی۔ پوچھا تو جواب ملا کہ وزیرِاعظم نظام الملک قتل ہو گئے ہیں۔ یہ بھی لوگوں کو بتا دیا گیا کہ قاتل باطنیوں کا فدائی تھا۔ لوگ واپس شہر کی طرف دوڑے اور نظام الملک کے

قتل کی خبر سارے شہر میں پھیلا دی۔

پورا شہر ماتم کدہ بن گیا۔ نظام الملک لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ وہ ہر کس و ناکس کا ہمدرد تھا۔ شہر میں کہرام بپا ہو گیا۔ عورتیں باہر آ کر بین کرنے لگیں۔

لوگوں نے حسن بن صباح اور باطنیوں کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

"ایک بھی باطنی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔

"حسن بن صباح کو یہاں لا کر درخت کے ساتھ لٹکا کر پھانسی دیں گے"۔

"انتقام..... خون کا بدلہ خون..... انتقام!"

"فوج کو پھر واپس لے جاؤ"۔

اور ایسی بے شمار آوازیں تھیں جو بگولے بن کر اٹھ رہی تھیں۔ مائیں بین کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ ہم اپنے جوان بیٹے قربان کر دیں گی۔ لڑکے اور نوجوان بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ وہ الگ لشکر بنا کر الموت پر حملہ کریں گے۔

نظام الملک کی میت اس کے گھر لائی گئی جہاں میت کو غسل دے کر اسے کفن پہنا دیا گیا پھر میت کو ایک خوشنما پلنگ پر رکھ کر سرسبز لان میں رکھ دیا گیا۔ شہر کے تمام لوگ ایک قطار میں میت کے قریب سے گزرنے اور اپنے محبوب وزیر اعظم کا آخری دیدار کرنے لگے۔ وہاں صرف یہ نہیں تھا کہ تمام آنکھیں اشکبار تھیں بلکہ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ بعض جوشیلے آدمی میت کے قریب کھڑے ہو کر انتقام اور خون کا بدلہ خون کے نعرے لگا کر آگے جاتے تھے۔ لوگ اس قدر مشتعل تھے کہ ماتم ایک بے قابو ہنگامے کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ کئی عورتیں سینہ کوبی کر رہی تھیں۔

سلطان ملک شاہ کی جذباتی حالت عام شہریوں جیسی ہی تھی۔ وہ تو ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ نظام الملک اس کا دستِ راست تھا۔ اُس کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔ نظام الملک صرف انتظامی امور کا ہی ماہر نہ تھا بلکہ جنگی امور اور سپہ سالاری میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ سلطان ملک شاہ نے دیکھا کہ لوگ انتقام کی آگ میں جلنے لگے ہیں اور ان پر قابو پانا ضروری ہے تو وہ نظام الملک کے گھر کے اندر چلا گیا۔ وہ بالائی منزل کی ایک کھڑکی میں جا کھڑا ہوا جو باہر کی طرف کھلتی تھی۔

"مرو کے لوگو!" ___ سلطان ملک شاہ نے بلند آواز سے کہا ___ "تھوڑی سی دیر

کے لئے خاموش ہو جاؤ"۔

کئی آوازیں سنائی دیں ___ "خاموش..... خاموش..... سلطان کی بات سنو..... خاموش"۔

"اپنے جذبات پر قابو پاؤ" ___ سلطان ملک شاہ نے کہا ___ "مت سوچو کہ میں نظام الملک کے خون کو بھول جاؤں گا۔ باطنیوں نے نظام الملک کی پیٹھ میں خنجر نہیں مارا بلکہ انہوں نے سلطنتِ سلجوقیہ کے دل میں خنجر اتار دیا ہے لیکن یہ سلطنت خداداد اس طرح نہیں گرے گی جس طرح حسن بن صباح اور اس کے باطنی سمجھتے ہیں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ نظام الملک کے خون کے ایک ایک قطرے کے بدلے بیس بیس باطنیوں کا خون بہایا جائے گا۔ یہ باطنی اسلام کا چہرہ مسخ کر رہے ہیں۔ ہم نے لشکر کشی سے کوئی ملک فتح نہیں کرنا۔ ہم نے اس باطل کو خاک و خون میں گم کر دینا ہے۔ میں اپنی فوج کو نہاوند سے ہی اس لئے واپس لے آیا ہوں کہ تمام فوج پر رنج و غم کے بادل چھا گئے تھے اور ہر مجاہد پر ماتم اور انتقام کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس جذباتی کیفیت میں لڑائیاں لڑی تو جا سکتی ہیں لیکن جیتی نہیں جا سکتیں۔ میں اپنے لشکر کی نفری میں اضافہ کروں گا اور ہم الموت پر ایسا حملہ کریں گے کہ باطنیوں کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا اور الموت کو ہم کھنڈر بنا کر واپس آئیں گے"۔

"ہم سب اس لشکر میں شامل ہوں گے" ___ پہلے ایک آواز آئی اور پھر بہت سی آوازیں گونجنے اور گرجنے لگیں ___ "لشکر فوراً بناؤ۔ ہم سب تیار ہیں۔ ہم کسی باطنی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔

عورتوں کا جوش و خروش الگ تھا۔ عورتوں کی طرف سے بار بار یہی للکار سنائی دے رہی تھی ___ "ہمارے بیٹوں کو لے جاؤ۔ انہیں اسلام کے نام پر قربان کر دو۔ نظام الملک کے خون کا انتقام لو"۔

○

اُدھر الموت میں حسن بن صباح کو خبر مل چکی تھی کہ نظام الملک کو نہاوند میں ابو طاہر نام کے ایک فدائی نے قتل کر دیا ہے۔ حسن بن صباح نے یہ خبر ملتے ہی اپنے خصوصی نائبین کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔

"ابو طاہر نے ایک آدمی کو ہی قتل نہیں کیا" ___ حسن بن صباح کہہ رہا تھا ___

"اس نے ایک فوج کو قتل کر دیا ہے..... کہاں ہے سلجوقیوں کی وہ فوج جو الموت کو محاصرے میں لینے آ رہی تھی؟..... وہ فوج واپس چلی گئی ہے۔ میں نے تمہیں کچھ عرصہ پہلے یہ بات کہی تھی کہ فوج کا آمنے سامنے آ کر لڑنا نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ حملہ آور فوج کو مارنے کی بجائے اُس حاکم کو مار ڈالو جس کے حکم سے فوج لڑتی ہے۔ اب تم نے عملی طور پر اس اصول کا مظاہرہ اور نتیجہ دیکھ لیا ہے۔ تم کسی دشمن بادشاہ کے لشکر کو کیوں مارنے یا شکست دینے کی کوشش کرتے ہو؟..... خود اس بادشاہ کو ہی مار ڈالو' اس کا لشکر خود ہی بھاگ جائے گا..... کیا مَرو تک ہمارا کوئی آدمی پہنچا ہے یا نہیں؟؟"

"ہاں امام!" ـــ ایک آدمی نے جواب دیا ـــ "وہ تو اُسی وقت بھیج دیا گیا تھا جس وقت یہ اطلاع پہنچی تھی کہ نظام الملک کو ہمارے ایک فدائی نے قتل کر دیا ہے"۔

"مجھے بہت جلدی معلوم ہو جانا چاہئے کہ مَرو کے لوگوں کا کیا ردِ عمل ہے" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "سب سے زیادہ ضروری بات تو یہ معلوم کرنی ہے کہ سلطان ملک شاہ اب کیا جوابی کارروائی کرے گا۔ وہ دبک کر تو نہیں بیٹھ جائے گا' اس نے انتقامی کارروائی ہر حال میں کرنی ہے لیکن میں وہاں کے لوگوں کے تاثرات معلوم کرنا چاہتا ہوں"۔

"ہاں امام!" ـــ وہی آدمی بولا ـــ "ہم نے یہ بندوبست بھی کر لیا ہے"۔

"مجھے ایک ایک لمحے کی اطلاع ملنی چاہئے کہ مَرو میں کیا ہو رہا ہے" ـــ "حسن بن صباح نے کہا ـــ "اگر سلطان ملک شاہ الموت پر حملے کی تیاری کر رہا ہو تو ہم اسے بھی نظام الملک کی طرح خدا کے پاس بھیج دیں گے"۔

سلطان ملک شاہ کے تین بیٹے تھے۔ بڑے کا نام برکیارق تھا اس سے چھوٹا محمد تھا اور اس کے بعد سنجر تھا۔ چھوٹے دونوں بھائی نوجوان تھے اور برکیارق اچھا خاصا بارعب جوان بن چکا تھا اور وہ عقلی طور پر اتنا بالغ ہو گیا تھا کہ باپ کو بڑے کار آمد مشورے دینے لگا تھا۔ ان کا ردِ عمل تو بہت ہی شدید تھا۔ مزمل آفندی بھی مَرو میں ہی رہتا تھا۔ اس کی سلطان ملک شاہ کے تینوں بیٹوں کے ساتھ گہری دوستی تھی۔ مزمل آفندی پر تو دیوانگی طاری ہو چکی تھی۔ وہ حسن بن صباح کو قتل کرنے گیا تھا لیکن وہاں اس کی ایسی برین واشنگ ہوئی کہ وہ نظام الملک کو قتل کرنے کے ارادے سے واپس آ گیا تھا۔ یہ تو شاہی

طبب شمونہ کا کمال تھا کہ ان دونوں نے مزمل آفندی پر قابو پالیا اور اسے بیدار کر لیا تھا۔ اس کے سینے میں تو حسن بن صباح کی نفرت ایسی شدید صورت اختیار کر گئی تھی جیسے اس کے وجود میں آگ لگی ہوئی ہو۔ اس کے ذہن میں ایک ہی سوچ تڑپتی رہتی تھی کہ وہ حسن بن صباح کو قتل کرے گا لیکن ہُوا یہ کہ اس کا پیر و مرشد نظام الملک حسن بن صباح کے ایک فدائی کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

نظام الملک کو دفن ہوئے بہت دن گزر گئے تھے۔ سلطان ملک شاہ نے حکم دے دیا تھا کہ لشکر کی نفری بڑھائی جائے اور لشکر کو تیار کیا جائے۔ شہر کے جوان دھڑا دھڑ لشکر میں شامل ہو رہے تھے اور ان کی ٹریننگ شروع کر دی گئی تھی۔ ان ہی دنوں مزمل آفندی سلطان ملک شاہ کے تینوں بیٹوں کے پاس گیا۔ ملک شاہ کے بیٹوں پر بھی جوش و خروش اور انتقام کا جذبہ غالب تھا۔

"میرے دوستو!" ـــ مزمل آفندی نے کہا ـــ "بہت بڑا لشکر تیار ہو رہا ہے۔ میں تمہیں آج ہی بتا دیتا ہوں کہ بڑے سے بڑا لشکر بھی الموت جا کر ناکام ہو جائے گا۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ ایک تو الموت کا قلعہ ایسا ہے کہ اسے محاصرے میں لیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ حسن بن صباح کے پاس جو جانباز ہیں ان جیسے جانباز ہمارے لشکر میں نہیں۔ حسن بن صباح کوئی ایسی چال چلے گا جس سے ہمارا لشکر بیکار ہو کر رہ جائے گا"۔

"پھر کیا کرنا چاہئے؟" ـــ سلطان ملک شاہ کے بڑے بیٹے برکیارق نے پوچھا ـــ "یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم خاموش ہو کر بیٹھ جائیں"۔

"یہی بات تو میں تم تینوں سے کرنے آیا ہوں" ـــ مزمل آفندی نے کہا ـــ "باطنیوں کو شکست دینے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ حسن بن صباح اور اس کے پیر و مرشد احمد بن عطاش کو قتل کر دیا جائے لیکن کام یہ بھی آسان نہیں۔ تم تینوں اچھی طرح جانتے ہو کہ میں حسن بن صباح کو قتل کرنے گیا تھا پھر مجھ پر جو بیتی وہ بھی تم جانتے ہو۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس قسم کے چند ایک جانباز تیار کرو جیسے حسن بن صباح نے تیار کر رکھے ہیں۔ میں ان کے ساتھ جاؤں گا اور ان کی راہنمائی کروں گا' لڑنا ہُوا تو لڑوں گا اور قتل کرنے کا موقعہ ملا تو جس جس کو قتل کرنا ہے کروں گا"۔

"میں آج ہی سالاروں کو بلا کر کہہ دوں گا" ـــ برکیارق نے کہا ـــ "مجھے امید

ہے کہ اپنی جانوں پر کھیلنے والے چند ایک آدمی تو ضرور ہی مل جائیں گے"۔

"لیکن برکیارق!" ——— مزمل آفندی نے کہا ——— "اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم کسی کو سونے چاندی کا لالچ دے کر تیار کر لو گے کہ وہ اپنی جان پر کھیل جائے گا تو تم بہت بڑی اور بڑی ہی خطرناک خوش فہمی میں اپنے آپ کو مبتلا کرو گے۔ حسن بن صباح نے اپنے جانبازوں پر مذہب اور عقیدے کا جنون طاری کر رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے جانبازوں کو حشیش پلا پلا کر ان کے دماغوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہاں تو یہ عالم ہے کہ سوچتا حسن بن صباح ہے اور عمل اس کے فدائی کرتے ہیں۔ کیا ہم اس طرح اور اس طریقے سے جانباز پیدا نہیں کر سکتے؟"

"کر سکتے ہیں" ——— برکیارق کے چھوٹے بھائی محمد نے کہا ——— "لیکن پہلے سالاروں کے ساتھ بات کر لی جائے"۔

یہاں جانبازوں کی باتیں تو ہو رہی تھیں اور ان لوگوں کو اُمید تھی کہ وہ اسی قسم کے جانباز تیار کر سکیں گے جیسے حسن بن صباح نے تیار کر رکھے تھے لیکن مؤرخ لکھتے ہیں کہ حسن بن صباح نے جس طرح فدائی تیار کئے تھے اس طرح بعد میں کوئی نہیں کر سکا۔ داستان گو پہلے تفصیل سے سنا چکا ہے کہ حسن بن صباح کے جانبازوں کو خوراک کیا کھلائی جاتی تھی، پلایا کیا جاتا تھا اور انہیں عیش و عشرت کے لئے کیسے کیسے سامان مہیا کئے جاتے تھے۔ باطنی جانبازوں کو تو حسن بن صباح نے درندے بنا ڈالا تھا جن کا کام چیرنے پھاڑنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ان کے ذہنوں میں یہ ڈالا گیا تھا کہ جان دے کر ایک اور زندگی شروع ہوتی ہے جس میں صرف عیش و عشرت ہے، اس کے سوا اور کوئی ذمہ داری اور کوئی کام نہیں۔

مرو میں شمونہ بھی تھی۔ اسے چھوٹی سی عمر میں حسن بن صباح کے ڈاکوؤں نے قافلے سے اغوا کیا تھا اور اس طرح اسے ماں باپ سے جدا کر دیا تھا پھر ان لوگوں نے اُس کے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ وہ مرو میں جس طرح آئی اور جس طرح نظام الملک کے سائے میں پہنچی وہ داستان گو سنا چکا ہے۔ وہ تو نظام الملک کو اپنا روحانی باپ سمجھتی تھی۔ اس باپ کو بھی حسن بن صباح کے ایک فدائی نے قتل کر دیا۔ وہ اس قدر روئی کہ اس کی ماں کو یہ خطرہ نظر آنے لگا تھا کہ یہ لڑکی روتے روتے مر جائے گی یا دماغی توازن کھو بیٹھے گی۔

ایک روز اچانک اس کا رونا بند ہو گیا اور اس کی آنکھیں خشک ہو گئیں۔ وہ ماں کے

پاس جا بیٹھی۔

"رات خواب میں نظام الملک سے ملاقات ہوئی ہے" ——— شمونہ نے ماں سے کہا ——— "اُنہوں نے گلہ کیا ہے کہ تم نے ابھی تک میرے قتل کا انتقام نہیں لیا"۔

اُس کی ماں نے یہ بات سنی اور جس انداز سے شمونہ نے یہ بات کی تھی، اس سے ماں کو یقین ہونے لگا کہ اس کی بیٹی کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے۔

"انہیں تم سے بہت پیار تھا" ——— ماں نے کہا ——— "بس یہ وجہ ہے کہ وہ تمہیں خواب میں نظر آئے ہیں"۔

"نہیں ماں!" ——— شمونہ نے کہا ——— "وہ مجھے کہنے آئے تھے کہ میرے خون کا انتقام صرف تم لے سکتی ہو اور تم انتقام لو..... میں اب انتقام لے کے ہی رہوں گی۔ نظام الملک میرے روحانی باپ تھے"۔

"انتقام لو گی کیسے؟" ——— ماں نے پوچھا ——— "کیا تم الموت جا کر حسن بن صباح کو قتل کر سکتی ہو؟" ——— ماں نے پوچھا اور کہا ——— "تم اس کے پاس رہ چکی ہو۔ وہ جونہی تمہیں دیکھے گا حکم دے دے گا کہ اس لڑکی کو قتل کر دیا جائے۔ اس کے کئی آدمی تمہیں پہچانتے ہوں گے"۔

"میری بات غور سے سنو ماں!" ——— شمونہ نے کہا ——— "میں نے زبان کے داؤ پیچ اور ہیر پھیر حسن بن صباح سے سیکھے ہیں۔ یہ اسی پر آزماؤں گی۔ میرے پاس خنجر ہو گا۔ میں اس کے پاس چلی جاؤں گی اور کہوں گی کہ تمہاری محبت مجھے تمہارے پاس کھینچ لائی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے جلاد کے حوالے کرے میں خنجر اس کے دل میں اتار چکی ہوں گی"۔

ماں نے اسے اس ارادے سے باز رکھنے کے لئے بہت دلیلیں دیں۔ اپنی محبت کا واسطہ بھی دیا اور یہ بھی کہا کہ تم نہ رہیں تو میرا اس دنیا میں اور کون ہو گا، میں اپنی جان خود ہی لے لوں گی لیکن شمونہ پر کسی بات کا ذرا سا بھی اثر نہ ہُوا۔ شمونہ اپنے ارادے پر ڈٹی رہی۔ وہ ماں کی کوئی بات سننے کے لئے تیار ہی نہ ہوتی تھی۔

ماں نے جا کر مزمل آفندی کو بتایا۔ مزمل آفندی ان کے گھر چلا گیا۔ اس نے شمونہ کو ایسی جذباتی اور ہیجانی کیفیت میں دیکھا جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ حسین و جمیل لڑکی اپنے آپ میں ہے ہی نہیں اور اس کا دماغی توازن مشکوک ہے۔ مزمل نے اس پر اپنی

محبت کا طلسم طاری کرنے کے لئے کچھ جذباتی باتیں کیں۔

"مجھے کچھ نہ کہو مزمل!" ـــ شمونہ نے کہا ـــ "محبت بعد کی بات ہے۔ اس وقت میری عقل اور میری روح پر نظام الملک کا خون سوار ہے۔ جب تک میں اس خون کا قرض چکا نہیں لیتی میں اس محبت کو ذہن میں لا ہی نہیں سکتی"۔

"یہ بھی سن لو شمونہ!" ـــ مزمل نے کہا ـــ "جب تک میں زندہ ہوں تم گھر سے باہر قدم نہیں رکھو گی۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ہم مرد مر گئے ہیں یا ہم اتنے بے حس اور بے غیرت ہو گئے ہیں کہ نظام الملک جیسے انسان کا خون ذہن سے اتار دیں گے؟..... میں جاؤں گا۔ ہم جانبازوں کا ایک گروہ تیار کر رہے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ دن جلدی طلوع ہو گا جس دن میں احمد بن غطاش اور حسن بن صباح کی لاشیں تمہارے قدموں میں لا کر رکھوں گا"۔

"تم تو پہلے بھی وہاں گئے تھے!" ـــ شمونہ نے کہا۔

"وہ تجربہ اب مجھے کام دے گا" ـــ مزمل نے کہا ـــ "اب میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ جانبازوں کا ایک گروہ لے کر جاؤں گا۔ کیا تم دیکھ نہیں رہی ہو کہ الموت پر حملے کے لئے اتنا بڑا لشکر تیار ہو رہا ہے؟"

"میں کچھ دن انتظار کر لوں گی" ـــ شمونہ نے کہا ـــ "اگر تم لوگ ناکام ہو گئے تو پھر یہ کام میں کر کے دکھا دوں گی"۔

وہاں اگر کوئی سب سے زیادہ اذیت میں مبتلا تھا تو وہ سلطان ملک شاہ تھا۔ اس سلطان کے آباؤ اجداد نے اسلام کے گرتے ہوئے پرچم کو سنبھالا اور سلطنتِ سلجوقیہ قائم کی تھی۔ تمام مؤرخ اس حقیقت پر متفق ہیں کہ سلطان ملک شاہ اُس دور میں اسلام کا محافظ اور پاسبان تھا۔ اُس وقت کا خلیفہ تو برائے نام خلیفہ تھا۔ سلطان ملک شاہ حالات کے ایسے بھنور میں آ گیا تھا جس میں سے اس کے لئے اکیلے نکلنا محال تھا۔ اس کے انتظامی اور دیگر امور اور مسائل میں نظام الملک کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے جسم میں دماغ ہوتا ہے، نظام الملک سلطان ملک شاہ کا بازو ہی نہیں بلکہ زورِ بازو بھی تھا۔ اسے اپنے تین بیٹوں میں سے کسی پر بھی اعتماد نہیں تھا۔ ان میں قومی اور دینی جذبہ تو تھا اور ان میں جوش و خروش بھی تھا لیکن ان میں وہ عقل اور فہم و فراست نہیں تھی جس کی ان حالات میں ضرورت تھی۔

جو مشکلات اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھیں، ان میں ایک یہ تھی کہ قلعہ الموت عام قلعوں جیسا نہیں تھا۔ پہلے اس قلعے کی ساخت اور محلِ وقوع بیان ہو چکا ہے۔ یہاں مختصراً ذکر ہو گا کہ یہ قلعہ کیسا تھا۔ یہ قلعہ پہاڑی کے اوپر تھا۔ اس کے ایک طرف دریا اور دوسری طرف دلدل اور جھیلیں تھیں۔ یہ خطہ تو بہت ہی خوبصورت اور خوشنما تھا۔ وہاں گھنے درخت تھے، رنگا رنگ پھولوں والے خود رو پودے تھے، رنگا رنگ پتوں والی خوشنما جھاڑیاں تھیں اور گھاس مخمل کے فرش کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ جس پہاڑی پر یہ قلعہ اور شہر تھا، وہ تو ہریالی اور خود رو پھولدار پودوں اور بڑے ہی خوشنما درختوں کی وجہ سے اس قدر خوبصورت تھی کہ یہ اس زمین کا حصہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس سارے خطے کو دیکھ کر بڑے ہی حسین خواب کا گماں ہوتا تھا لیکن قدرت کے اس حسن میں بڑے ہی خوفناک خطرے پوشیدہ تھے۔

یہ ایک قدیم قلعہ تھا جو سلطان ملک شاہ نے دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔ اس قلعے میں خطرہ یہ تھا کہ جتنا اوپر نظر آتا تھا اس سے تین گنا زیادہ نیچے پہاڑی کے اندر یعنی زمین دوز تھا۔ نیچے بڑی مضبوط چٹان تھی جو خاصی لمبی اور چوڑی تھی۔ کاریگروں نے اس چٹان کو نیچے سے کاٹ کاٹ کر راہداریوں، کمروں اور راستوں کی بھول بھلیاں بنا ڈالی تھیں۔ کوئی اجنبی وہاں جا نکلتا تو پھر اس کا وہاں سے نکل آنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ وہاں گھوڑے اور اونٹ غائب ہو جاتے تھے۔ سلطان ملک شاہ کو جو مسئلہ پریشان کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ اس قلعے کو محاصرے میں لینے کے لئے اور پھر اس پر حملہ کرنے کے لئے بہت ہی بڑے لشکر کی ضرورت تھی اور پھر اصل ضرورت یہ تھی کہ اس لشکر کو خاص قسم کی ٹریننگ دی جائے۔

سلطان ملک شاہ نے وہاں اور ارد گرد کے علاقے میں اپنے جاسوس پھیلا رکھے تھے۔ الموت کے اندر بھی جاسوس موجود تھے۔ وہ وقتاً فوقتاً مرو آ کر سلطان ملک شاہ کو وہاں کی خبریں اور اطلاعیں دیتے رہتے تھے لیکن اب وہاں سے جو اطلاعیں آ رہی تھیں وہ مشکلات میں اضافہ کر رہی تھیں مثلاً نظام الملک کے قتل کے ایک مہینے بعد دو جاسوسوں نے الموت سے آ کر سلطان ملک شاہ کو آ کر بتایا کہ باطنیوں کے حوصلے بلند ہو گئے ہیں اور انہوں نے تبلیغ کا کام تیز کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے ارد گرد کے بلکہ دور دور تک کے قلعوں پر لڑے بغیر قبضہ کرنے کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔ سب سے

زیادہ خطرناک خبر یہ تھی کہ ان تمام علاقوں پر باطنی اس طرح غالب آگئے تھے جیسے وہاں کے لوگ حسن بن صباح کو امام ہی نہیں بلکہ نبی تک ماننے لگے تھے۔ عام سی قسم کے لوگوں میں بھی حسن بن صباح کے حکم پر جانیں قربان کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔

ایک روز سلطان ملک شاہ نے اپنے تینوں بیٹوں کو بلایا۔

"میرے عزیز بیٹو!" ــــ سلطان ملک شاہ نے کہا ــــ "اسلام پر اتنا خطرناک وقت پہلے کبھی نہیں آیا تھا جتنا خطرناک اور خوفناک وقت اب آیا ہے۔ ہم نے اپنی سلطنت کا ہی دفاع نہیں کرنا بلکہ ہماری ذمہ داری اسلام کا تحفظ اور فروغ ہے۔ جس روز سلطنتِ سلجوقیہ ختم ہو گئی اُسی روز اسلام کا پرچم بھی گر پڑے گا۔ بادشاہ کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہوا کرتے لیکن میں اللہ کے حضور جوابدہ ہوں۔ یہ سلطنت میری نہیں، تمہاری نہیں اور تمہارے آباؤ اجداد کی بھی نہیں۔ یہ اللہ کی سلطنت ہے جس کا دفاع ہماری ذمہ داری ہے۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ میں کئی راتیں سویا بھی نہیں ہوں۔ میں ہمہ وقت پریشان رہتا ہوں۔ میں اپنے سر میں گرانی محسوس کرنے لگا ہوں۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں"۔

"پدرِ محترم!" ــــ بڑے بیٹے برکیارق نے کہا ــــ "ہم تین بھائیوں کی موجودگی میں آپ کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ آپ اکیلے رہ گئے ہیں۔ میں ایک بات کہوں گا۔ نظام الملک شہید کو ہم اپنا روحانی باپ سمجھتے تھے۔ اللہ نے جو عقل و دانش انہیں عطا کی تھی وہ ہر کسی کو عطا نہیں ہُوا کرتی۔ یہ میں بھی محسوس کیا کرتا ہوں کہ نظام الملک کے اٹھ جانے سے ہم کمزور ہو گئے ہیں لیکن ہم نے یہ کمزوری اپنے آپ میں اُن کی زندگی میں ہی پیدا کر لی تھی۔ آپ کے سامنے کوئی مسئلہ آیا تو آپ نے خود سوچنے اور فیصلہ کرنے کی بجائے وہ مسئلہ نظام الملک کے سپرد کر دیا۔ یہ وجہ ہے کہ آج آپ اپنے آپ کو تنہا اور کمزور سمجھ رہے ہیں۔ بہت بڑا لشکر تیار ہو رہا ہے اور اس لشکر میں آگ جیسا جذبہ موجود ہے۔ یہ لشکر جب حملہ کرے گا تو باطنیوں کے لئے یہ خاک و خون کا طوفان ثابت ہو گا"۔

"نہیں بیٹے!" ــــ سلطان ملک شاہ نے کہا ــــ "یہی تو اس مسئلے کا وہ پہلو ہے جسے تم سمجھ نہیں رہے۔ الموُت کو لشکر کے زور پر فتح نہیں کیا جا سکتا۔ میں تو سوچ سوچ کر پریشان ہو گیا ہوں۔ تم مجھے سوچنے میں مدد دو۔ ہمیں کوئی اور طریقہ اختیار کرنا پڑے

گا"۔

"ہمیں موقع دیں پدرِ محترم!" ــــ اس کے بیٹے محمد نے کہا ــــ "آپ اتنے زیادہ بھی پریشان نہ ہو جائیں۔ ہم خود بھی ایک اور طریقہ اختیار کر رہے ہیں۔ ہم جانبازوں کا ایک گروہ تیار کر رہے ہیں"۔

سلطان ملک شاہ نے اپنے بیٹوں کو اپنی جو ذہنی اور جذباتی حالت بتائی تھی وہ بہت ہی کم بتائی تھی۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ اُس وقت سلطان ملک شاہ اعصابی تکلیف میں مبتلا ہو چکا تھا۔ مسائل تو الگ تھے، صرف نظام الملک کے غم نے ہی اسے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ عیش و عشرت کا دلدادہ سلطان نہیں تھا۔ بنی نوع انسان کی محبت دل میں رکھنے والا سادہ طبیعت انسان تھا۔ اس کی عمر بھی کچھ زیادہ ہو گئی تھی جس سے جسم میں قوتِ مدافعت کم ہو گئی تھی۔ غم اور مسائل نے اس کے اعصاب پر اتنا زیادہ بوجھ ڈال دیا تھا جو اس کے اعصاب برداشت نہ کر سکے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ تنہائی میں اسے روتے بھی دیکھا گیا تھا۔ اس کی چال ڈھال میں پہلے والی شان و شوکت نہیں رہی تھی۔ اُس نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر اللہ کی عبادت شروع کر دی تھی۔ شب بیداریوں کا اثر الگ تھا۔

○

جس طرح الموُت کی خبریں اور اطلاعیں سلطان ملک شاہ کے جاسوس مَروْ تک پہنچا رہے تھے اسی طرح حسن بن صباح کے جاسوس مَروْ کی خبریں حسن بن صباح تک لے جا رہے تھے۔

دونوں اطراف میں فرق یہ تھا کہ سلطان ملک شاہ کو جب الموُت کے بارے میں راز کی کوئی بات معلوم ہوتی تھی تو وہ پریشان ہو جاتا تھا لیکن جب حسن بن صباح کو اس کا کوئی جاسوس مَروْ سے جا کر یہ بتاتا تھا کہ مَروْ میں بہت بڑا لشکر تیار ہو رہا ہے اور اس لشکر کو جنگی تربیت دی جا رہی ہے اور اس لشکر میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے تو حسن بن صباح کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہونے کی بجائے اس کے ہونٹوں پر لطیف سا تبسّم آجاتا تھا۔ اسے یہاں تک معلوم ہو گیا تھا کہ سلطان ملک شاہ پہلے والا تندرست و توانا اور چاق و چوبند سلطان نہیں رہا۔ جاسوسوں نے حسن بن صباح کو یہ بھی بتایا تھا کہ سلطان ملک شاہ کی چال ڈھال اور بولنے کے انداز میں بھی نقاہت آگئی ہے۔

ایک روز مزمل آفندی گھڑ دوڑ کے میدان کے باہر تماشائیوں میں کھڑا سواروں کی

ٹریننگ دیکھ رہا تھا۔ اسے کوئی جواں سال آدمی ملتا تو وہ اسے سب سے پہلے یہ بات کہتا تھا کہ وہ لشکر میں کیوں شامل نہیں ہُوا۔ اُس روز وہ گھوڑ سواروں کی ٹریننگ اتنی دلچسپی سے نہیں دیکھ رہا تھا جتنی توجہ سے وہ تماشائیوں کو دیکھتا پھرتا تھا۔ وہ تین چار نوجوانوں سے کہہ چکا تھا کہ وہ تماشا دیکھنے کی بجائے لشکر میں شامل ہو جائیں تو انہیں شہسوار بنا دیا جائے گا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ لشکر میں اضافہ ہوتا چلا جائے اور زیادہ نوجوان لشکر میں بھرتی ہوں۔

وہ تماشائیوں میں گھوم پھر رہا تھا کہ اسے اپنی عمر کا یعنی جواں سال ایک آدمی نظر آیا۔ یہ چہرہ اسے کچھ مانوس سا معلوم ہُوا۔ وہ سوچنے لگا کہ اسے اس نے پہلے کہاں دیکھا ہے۔ اتنا تو وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس شہر کی آبادی بھی کچھ کم نہیں۔ چلتے پھرتے' کہیں نہ کہیں یہ شخص سامنے آگیا ہو گا لیکن مزمل یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے کہیں اور دیکھا تھا اور کسی خاص موقعہ پر اور کسی خاص صورتِ حال میں دیکھا تھا۔ اس نے اس آدمی کے چہرے کو اور زیادہ غور سے دیکھا۔

مزمل کو دراصل اس آدمی کی دائیں آنکھ کے ذرا نیچے گال کی ہڈی پر ایک تل نظر آرہا تھا جو مٹر کے دانے جتنا تھا اور یہ کالا تل اُبھرا ہُوا تھا۔ مزمل اس تل یا موکے کو نظرانداز نہ کر سکا۔ اس آدمی نے مزمل کی طرف دیکھا تو اس شخص کے چہرے کا تاثر بدل گیا اور وہ وہاں سے کھسکنے لگا۔ اس سے مزمل کو کچھ شک ہُوا۔

"ذرا رُکنا بھائی!" — مزمل نے اُس کے پیچھے جاتے ہوئے کہا۔

وہ آدمی یوں چلتا چلا گیا جیسے اس نے مزمل کی آواز سنی نہ ہو۔ مزمل تیز تیز چلا اس کے پاس جا پہنچا۔

"ہم اس سے پہلے کہاں ملے تھے؟" — مزمل نے پوچھا اور اس کا چہرہ اور زیادہ غور سے دیکھتے ہوئے بولا — "آپ کو میں نے یہاں اس شہر میں نہیں دیکھا' ہم کہیں اور ملے تھے"۔

"ضرور ملے ہوں گے بھائی!" — اس آدمی نے کہا — "میں تمہارے اخلاق کی تعریف کروں گا کہ تم نے مجھے یاد رکھا اور اتنی محبت سے مجھے بلایا۔ مجھے بالکل یاد نہیں کہ ہم کہیں ملے بھی تھے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے ہم کسی قافلے میں ہمسفر رہے ہوں یا کسی سرائے میں تم نے مجھے دیکھا ہو۔ میں تجارت پیشہ آدمی ہوں۔ شہر شہر' قصبہ قصبہ گھومتا

رہتا ہوں۔ میں یہاں کا رہنے والا نہیں!"

"مجھے تمہارا یہ موٹا تل یاد ہے" — مزمل نے کہا۔

اس آدمی نے زوردار قہقہہ لگایا اور مزمل کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر زور سے دبایا۔

"اس تِل کی وجہ سے ہی جو مجھے ایک بار دیکھ لیتا ہے وہ ہمیشہ یاد رکھتا ہے" — اس آدمی نے بڑے ہی شگفتہ لہجے میں کہا اور پوچھا — "کیا تم یہیں کے رہنے والے ہو؟"

"ہاں بھائی!" — مزمل آفندی نے جواب دیا — "میں یہیں کا رہنے والا ہوں"۔

"اچھا دوست!" — اس آدمی نے مزمل سے ہاتھ ملایا اور کہا — "میں تمہاری محبت کو یاد رکھوں گا"۔

وہ آدمی چلا گیا اور مزمل کھڑا سوچتا رہا۔ اسے اتنا ہی یاد آرہا تھا کہ یہ شخص اسے کسی خاص صورتِ حال اور کسی خاص جگہ ملا تھا اور اس کے ساتھ اس کی اچھی خاصی باتیں بھی ہوئی تھیں۔ کچھ دن اور گزر گئے۔ مزمل سلطان ملک شاہ کے بیٹوں سے ملتا ملاتا ہی رہتا تھا۔ ان میں بڑا بیٹا برکیارق چونکہ عمر میں ذرا بڑا تھا اس لئے فہم و فراست رکھتا تھا اس لئے ہوش مندی کی بات کر بھی لیتا تھا اور سمجھتا بھی تھا۔ مزمل آفندی زیادہ تر اسی کے ساتھ رابطہ رکھتا تھا۔ دوستی کے علاوہ ان کا ایک تعلق یہ بھی تھا کہ دونوں ایک جانباز گروہ تیار کر رہے تھے۔ ایک صبح مزمل برکیارق کے ہاں گیا۔ دونوں اکٹھے وہاں جایا کرتے تھے جہاں فوجیوں کو تیغ زنی' تیر اندازی اور برچھی بازی سکھائی جاتی تھی۔ مزمل نے اُس روز برکیارق کو پریشان سا دیکھا۔ مزمل نے اس سے پوچھا کہ آج کوئی خاص بات ہو گئی ہے کہ وہ اتنا پریشان نظر آرہا ہے؟

"ہاں بھائی!" — برکیارق نے بتایا — "سلطان تو صاحب فراش ہی ہو گئے ہیں"۔

"کوئی خاص تکلیف ہو گئی ہے؟" — مزمل نے پوچھا۔

"کسی خاص مرض کا نام نہیں لیا جا سکتا" — برکیارق نے جواب دیا — "کہتے ہیں کہ سر میں گرانی ہے اور کسی وقت سارے جسم میں ایسی بے چینی شروع ہو جاتی ہے جو ان کی برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔ کمزوری اتنی محسوس کرنے لگے ہیں کہ ان کی ٹانگیں جسم کا بوجھ سہارنے کے قابل نہیں رہیں"۔

"طبیب نے دیکھا ہوگا؟"

"طبیب تو تین چار دنوں سے باقاعدہ آرہا ہے" — برکیارق نے جواب دیا — "طبیب نے کہا ہے کہ سلطان کو ذہنی سکون کی شدید ضرورت ہے۔ وہ مسکّن اور مقوّی دوائیاں دے رہا ہے لیکن کوئی افاقہ نظر نہیں آتا بلکہ حالت کبھی تو زیادہ ہی بگڑ جاتی ہے"۔

"انہیں نظام الملک کا غم لے بیٹھا ہے" — مزمل نے کہا — "پھر ان کے ذہن اور دل پر یہ بوجھ آپڑا ہے کہ وہ باطنیوں کو شکست نہیں دے سکیں گے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ انہیں یقین دلائیں کہ ہم باطنیوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیں گے..... کیا یہ مناسب ہوگا کہ مجھے سلطان کے پاس لے چلو؟ مجھے امید ہے کہ میں انہیں اٹھالوں گا۔ میرے ساتھ ان کا اچھا خاصا پیار ہے"۔

"نہیں مزمل بھائی!" — برکیارق نے کہا — "طبیب نے سختی کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ باہر کا کوئی آدمی سلطان کے پاس نہ آئے۔ جب تک سلطان خود کسی کو نہ بلائیں' گھر کا بھی کوئی فردان کے پاس نہ جائے"۔

اس کے بعد مزمل اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ اس کا اب یہی ایک عزم تھا کہ جانبازوں کا ایک گروہ تیار کرنا ہے اور انہیں اسی طرح بنانا ہے جس طرح سلطان کا ایک ایلچی المؤت جاکر حسن بن صباح کے فدائیوں کو دیکھ آیا تھا۔ مزمل چاہتا تھا کہ خواہ بیس ہی جانباز تیار ہو جائیں لیکن وہ اس طرح تیار ہوں کہ اگر کسی سے کہا جائے کہ وہ اپنے پیٹ میں تلوار اتار لے تو وہ بلاحیل و حجت اپنے پیٹ میں تلوار اتار لے۔ مزمل کا یہ عزم تو تھا لیکن اسے ایسا کوئی تجربہ حاصل نہیں تھا کہ اس طرح کے جانباز کیسے تیار کئے جاتے ہیں۔ بہرحال اسے دس بارہ نوجوان مل گئے تھے جنہیں ایک سالار ہتھیاروں کے استعمال کی تربیت دے رہا تھا۔ اس کے بعد انہیں حسن بن صباح کے فدائیوں کی طرح جانبازی کے لئے تیار کرنا تھا۔ مزمل زیادہ تر وقت ان کے ساتھ صرف کر رہا تھا اور ان کے دلوں میں وہ باطنیوں کی نفرت کی آگ جلانے کی کوششیں کر رہا تھا۔

○

ایک روز برکیارق اپنے گھر سے نکلا تو اسے باہر والے دروازے پر ایک درویش صورت آدمی کھڑا نظر آیا۔ دربان اس آدمی کو اندر جانے سے روک رہے تھے۔ اس

درویش نے برکیارق کو دیکھا تو دور سے ہی ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔ برکیارق اُس تک جا پہنچا۔ دربانوں نے اسے بتایا کہ یہ درویش اندر جانے اور سلطان کو دیکھنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔

درویش کے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے ہاتھ میں عصا تھا۔ اس نے سر پر سفید پگڑی لپیٹ رکھی تھی اور اس پر ایک چوڑا سبز رنگ کا کپڑا ڈال رکھا تھا جو اس کے کندھوں تک آیا ہُوا تھا۔ اُس نے سبز رنگ کا چغہ پہن رکھا تھا جو اُس کے ٹخنوں تک لمبا تھا۔ اس نے گلے میں موٹے موتیوں کی ایک مالا ڈال رکھی تھی۔ اس کی داڑھی خشخشی تھی اور اس داڑھی اور چہرے سے وہ چالیس سال کے لگ بھگ عمر کا لگتا تھا۔ بہرحال وہ ہر پہلو سے درویش معلوم ہوتا تھا۔

"آپ سلطان سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" — برکیارق نے پوچھا اور اسے بتایا — "آپ کو شاید معلوم نہیں کہ سلطان بیمار پڑے ہیں اور طبیب نے ان کی ملاقاتیں بند کر دی ہیں۔ آپ مجھے بتائیں میں آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ یہاں جو بھی آتا ہے وہ مایوس واپس نہیں جایا کرتا۔ میں نے آپ کو مجبوری بتا دی ہے ورنہ سلطان فوراً آپ کو ملاقات کے لئے بلاتے"۔

"میں جانتا ہوں" — درویش نے کہا — "میں یہی سن کر آیا ہوں کہ سلطان بیمار پڑے ہیں۔ میں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ سلطان کو کیا مرض لاحق ہوگیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ سلطان کو طبیب نے ایسی دوائیاں دی ہیں جن کے زیرِ اثر سلطان سوئے رہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ طبیب کا علاج روک دیا جائے۔ وہ علاج جاری رکھا جائے۔ میں روحانی عامل ہوں۔ مجھے شک ہے کہ سلطان پر کوئی سفلی عمل کیا گیا ہے اور میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہ سفلی عمل باطنیوں نے کروایا ہے۔ مجھے صرف ایک بار سلطان سے ملنے دیں' میں صرف انہیں دیکھوں گا"۔

"میں سلطان سے پوچھ کر آپ کو کچھ بتا سکوں گا" — برکیارق نے کہا — "اس وقت تو وہ سوئے ہوئے ہیں"۔

"انہیں بے آرام نہیں کرنا" — درویش نے کہا — "میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ آپ کو مجھ پر اتنی جلدی اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ میں آپ کے لئے اجنبی ہوں۔ اپنے متعلق یہ بتا دوں کہ میں آگے جا رہا ہوں' یہاں کچھ دنوں کے لئے رکا ہوں اور

سرائے میں ٹھہرا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو سرائے میں آجائیں اور میری کچھ باتیں سنیں اور کچھ باتیں میں آپ سے پوچھوں گا۔ پھر آپ مجھ پر اعتماد کر لیں گے۔ مجھے کوئی لالچ نہیں۔ آپ میرے پاس آئیں"۔

"میں ابھی نہ چلا چلوں؟" ___ برکیارق نے پوچھا۔

"یہ تو اور زیادہ اچھا رہے گا" ___ درویش نے کہا ___ "آیئے!"

راستے میں درویش باتیں کرتا گیا۔ برکیارق کو بولنے کا موقع نہ ملا لیکن درویش کی باتوں سے وہ متاثر ہو گیا تھا۔

چلتے چلتے وہ سرائے میں جا پہنچے۔ درویش برکیارق کو بالائی منزل پر لے گیا۔ اس کا کمرہ اوپر تھا۔

وہ جب کمرے میں داخل ہوئے تو ایک نوجوان لڑکی نے ان کا استقبال کیا۔

"یہ سلطان مکرم کے بڑے فرزند برکیارق ہیں" ___ درویش نے لڑکی سے کہا ___ "سلطان سوئے ہوئے تھے۔ ان سے ملاقات ہو گئی اور یہ میرے ساتھ ہی آگئے ہیں"۔

"خوش آمدید!" ___ لڑکی نے ذرا جھک کر کہا ___ "سلطان کی بیماری نے ہمارے دلوں پر بہت اثر کیا ہے۔ میں ان کے لئے دعا کرتی رہتی ہوں۔ اگر یہ ممکن ہو تو میں اپنی زندگی سلطان کو دے دوں۔ سلطان ملک شاہ ہی ہیں جو اسلام کے ایک بڑے ہی مضبوط ستون ہیں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے"۔

"یہ میری چھوٹی بہن روزینہ ہے" ___ درویش نے کہا ___ "فرزندِ سلطان! یہ میرے کندھوں پر بہت بڑی اور بڑی ہی نازک ذمہ داری ہے۔ میں اس ذمہ داری سے فارغ ہونا چاہتا ہوں لیکن کوئی موزوں آدمی نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی آدمی ٹھیک ملتا بھی ہے تو اس کا خاندانی پس منظر ٹھیک نہیں ہوتا۔ نظریات اور عقیدوں کا فرق بھی ہوتا ہے۔ میں اس بہن کو پھینکنا یا ضائع نہیں کرنا چاہتا"۔

برکیارق سلطان زادہ تھا، حکمران خاندان کا چشم و چراغ تھا اور وہ جوان بھی تھا۔ وہ تھا تو پکا مسلمان لیکن اپنے باپ کی طرح مومن نہ تھا۔ وہ عیش پرست اور مے نوش تو نہ تھا لیکن اتنی نوجوان اور حسین لڑکی کو دیکھ کر متاثر نہ ہونا اس کی فطرت میں نہیں تھا۔ کچھ دیر کے لئے تو وہ یہ بھول ہی گیا کہ لڑکی کا بڑا بھائی درویش کمرے میں موجود ہے۔ برکیارق کی نظریں اس لڑکی کی زلفوں میں الجھ کے رہ گئیں۔ برکیارق کی نظروں سے ایک

سے بڑھ ایک لڑکی گزری تھی۔ بعض کو تو وہ کچھ دیر بعد بھول جاتا تھا، کچھ اسے ایک دو دن یاد رہتی تھیں اور کبھی کوئی لڑکی اسے اپنے حسن و جوانی کی وجہ سے کئی کئی دن یاد رہتی تھی۔ وہ شہزادوں کی طرح لڑکیوں میں دلچسپی رکھنے والا آدمی نہیں تھا۔ اس پر اپنے باپ کا کم از کم یہ اثر ضرور تھا کہ وہ لڑکیوں کا شیدائی نہیں تھا لیکن آخر وہ جواں سال آدمی تھا۔ اس لڑکی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ روزینہ حسین تو تھی ہی لیکن برکیارق نے اس میں کوئی ایسی کشش، ایسی جاذبیت یا کوئی ایسا طلسماتی تاثر دیکھا کہ اس کے جی میں یہی آتی تھی کہ کچھ وقت اس کمرے میں اس لڑکی کے ساتھ گزارے۔ لڑکی کے چہرے کے نقش و نگار کوئی غیر معمولی طور پر پُرکشش نہیں تھے، لڑکی کا انداز کچھ ایسا تھا جس کے اثر سے برکیارق اپنے آپ کو بچا نہ سکا۔ برکیارق لڑکی کی طرف دیکھتا تو وہ نظریں جھکا لیتی تھی۔ جب برکیارق درویش کی طرف متوجہ ہوتا تو لڑکی برکیارق کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتی تھی۔

"میں حج کے لئے جا رہا ہوں" ___ درویش نے کہا ___ "لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس سال بھی میں حج نہیں کر سکوں گا۔ میں حج پر اُس وقت جاؤں گا جب روزینہ کا ہاتھ کسی معزز انسان کے ہاتھ میں دے دوں گا۔ یہ میرے مرحوم ماں باپ کی امانت ہے۔ اسے بچا بچا کر اور سینے سے لگا کر رکھ رہا ہوں"۔

برکیارق نے ابھی شادی نہیں کی تھی۔ وہ یہ تو بھول ہی گیا کہ وہ اس درویش کے ساتھ کیوں آیا تھا، وہ اس سوچ میں گم ہو گیا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہے تو کیا سلطان ملک شاہ اسے اس کی اجازت دے دے گا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شادی کرے گا تو اس لڑکی کے ساتھ کرے گا۔ مشکل یہ تھی کہ سلطان ملک شاہ اعصاب زدگی میں پڑا تھا۔ اس حالت میں برکیارق اس سے یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے، کیا اسے اجازت مل سکتی ہے یا نہیں۔

"میں سلطان ملک شاہ کا معتقد اور مرید ہوں" ___ درویش نے کہا ___ "یہاں آکر پتہ چلا کہ وہ تو بیمار پڑے ہیں۔ میں نے ان کے مرض کی علامات اِدھر اُدھر سے معلوم کیں۔ میرا باپ علمِ روحانیت میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے دو تین کرامات مجھے ورثے میں دی تھیں۔ مجھے جب سلطان کی علامات معلوم ہوئیں تو میرا دھیان حسن بن صباح اور اس کے باطنی فتنے کی طرف چلا گیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کے پدرِ محترم

نے اس فتنے کی سرکوبی کے لئے کیا کیا جتن کئے ہیں۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ حسن بن صباح اور اس کا استاد سفلی علم کے ماہر ہیں۔ نظام الملک تو قتل ہو گئے ہیں لیکن سلطان کو یہ باطل پرست سفلی علم سے مفلوج کر دینا چاہتے ہیں یا اُنہیں ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں گذشتہ رات نفل پڑھ کر مراقبے میں گیا' مجھے جو صورت حال نظر آئی اس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سلطان پر کوئی دوائی اثر نہیں کرے گی لیکن دوائی روکنی بھی نہیں کیونکہ یہ دوائی انہیں سلا دیتی ہے اور ان کے لئے سوئے رہنا ہی اچھا ہے۔ میں ان کا روحانی علاج کرنا چاہتا ہوں اور اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں جو انہیں سفلی اثرات سے نجات دلا دے۔"

اُس کے بعد درویش نے ایسی طلسماتی اور پُراسرار سی باتیں کیں کہ برکیارق نے شدت سے محسوس کیا کہ ابھی اس درویش کو اپنے باپ کے پاس لے جائے اور انہیں کہے کہ وہ اس درویش کا علاج فوراً" شروع کر دیں۔

"ایک بات بتائیں" — برکیارق نے درویش سے پوچھا — "کیا سفلی عمل سے کوئی ہماری پوری سلطنت کو تباہ کر سکتا ہے؟"

"نہیں!" — درویش نے جواب دیا — "ایسا نہیں ہو سکتا۔ ذرا تصور میں لائیں کہ ایک گھر کے ذمہ دار افراد کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیا جائے یا ان پر اعصابی مرض طاری کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟..... وہ گھر تباہ حال ہو جائے گا۔ یہی مثال ایک سلطنت کی ہوتی ہے۔ سلطان ملک شاہ کو دماغی اور جسمانی لحاظ سے معذور کر دیا گیا ہے۔ اگر آپ ان کے جانشین ہوں گے تو آپ کا بھی یہی انجام ہو گا' پھر سلطنت نے تو تباہ ہونا ہی ہے"۔

"آپ کا طریقۂ علاج کیا ہو گا" — برکیارق نے پوچھا — "کیا آپ ان کے لئے دعا کریں گے یا کوئی اور طریقہ اختیار کریں گے؟"

"میں دعا بھی کروں گا" — درویش نے کہا — "اور میں کلام اللہ کے تعویذ لکھ کر بھی دوں گا لیکن میرا طریقۂ علاج اُس وقت کامیاب ہو گا جب میں سلطان کو دیکھ لوں گا..... آپ مجھے ان سے جلدی ملوا دیں۔ میں اپنے پیر و مرشد کو اُس روحانی اذیت میں پڑا ہوا نہیں دیکھ سکتا"۔

"میں خود بھی تو انہیں اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا" — برکیارق نے کہا —

"وہ آپ کے پیر و مرشد ہیں اور میرے باپ ہیں۔ میں جانتا ہوں۔ وہ جونہی جاگے میں یہاں آجاؤں گا اور آپ کو ساتھ لے جاؤں گا..... کیا آپ سارا دن یہیں ہوں گے؟"

"ہاں!" — درویش نے جواب دیا — "میں جب تک سلطان کو دیکھ نہ لوں یہیں رہوں گا"۔

"بھائی جان!" — روزینہ نے درویش سے کہا — "آپ وہ کام کر آئیں لیکن ذرا جلدی آجانا"۔

"ہاں!" — درویش نے کہا — "تم نے یاد دلا دیا ہے۔ میں وہ کام کر آتا ہوں۔ اتنی دیر فرزندِ سلطان تمہارے ساتھ رہیں گے" — درویش نے برکیارق سے کہا — "یہ اکیلے ڈرتی ہے۔ میرا چھوٹا سا ایک کام ہے۔ آپ اس کے پاس بیٹھیں' میں ابھی آتا ہوں"۔

درویش باہر نکل گیا۔

"آپ تو شادی شدہ ہوں گے؟" — روزینہ نے برکیارق سے کہا۔

"نہیں روزینہ!" — برکیارق نے کہا — "ہمارے خاندان کا یہ دستور ہے کہ اولاد کی شادی اُس وقت کرتے ہیں جب وہ ذہنی طور پر پوری طرح بالغ ہو جاتی ہے۔ میں نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا کہ میں کس کے ساتھ شادی کروں گا"۔

"کیا آپ کسی خاص لڑکی کو چاہتے ہیں؟" — روزینہ نے شرماتے ہوئے پوچھا۔

"لڑکیاں بہت دیکھی ہیں" — برکیارق نے کہا — "ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی دیکھی ہے لیکن میرے دل نے کسی ایک کو بھی پسند نہیں کیا"۔

"کیا آپ لڑکی میں کوئی خاص وصف دیکھنا چاہتے ہیں؟" — روزینہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں!" — برکیارق نے جواب دیا — "میں خاص وصف ہی ڈھونڈ رہا ہوں"۔

"کیا وہ کسی ایک بھی لڑکی میں نظر نہیں آیا؟" — روزینہ نے پوچھا۔

"آج نظر آگیا ہے" — برکیارق نے کہا — "وہ وصف تم میں نظر آیا ہے"۔

"لیکن میں شاہی خاندان کے قابل تو نہیں" — روزینہ نے کہا — "میں اپنی حیثیت کو اچھی طرح پہچانتی ہوں"۔

"دیکھو روزینہ!" — برکیارق نے کہا — "تھوڑی سی دیر کے لئے بھول جاؤ کہ

میں سلطان زادہ ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ کا ایک آدمی سمجھو اور دیانتداری سے بتاؤ کہ میں تمہیں اچھا لگتا ہوں یا نہیں؟"

"آپ نے بڑا ہی مشکل سوال کیا ہے" — روزینہ نے کہا — "اگر میں نے کہا کہ آپ مجھے بہت ہی اچھے لگتے ہیں تو آپ کہیں گے کہ آپ شاہی خاندان کے فرد ہیں اس لئے مجھے اچھے لگتے ہیں۔ اگر میں نے کہا کہ میں نے آپ میں اچھا لگنے والا کوئی وصف نہیں دیکھا تو آپ ناراض ہو جائیں گے۔ دانشمند کہتے ہیں کہ بادشاہوں سے دُور رہو۔ خوش ہوتے ہیں تو اشرفیوں سے جھولی بھر دیتے ہیں۔ ناراض ہو جائیں تو سُولی پر کھڑا کر دیتے ہیں"۔

"میں تم میں ایک اور وصف دیکھنا چاہتا ہوں" — برکیارق نے کہا — "میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم میں جرأت بھی ہے یا نہیں۔ میں ایسی لڑکی کی تلاش میں ہوں جو اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے"۔

"یہ وصف بھی مجھ میں ہے" — روزینہ نے کہا — "میں سچی بات کہہ چکی ہوں۔ وہ ایک بار پھر کہہ دیتی ہوں۔ اگر میں نے کہا کہ آپ میرے دل کو بہت ہی اچھے لگتے ہیں تو آپ کے دماغ میں سلطانی بیدار ہو جائے گی اور آپ شک کریں گے کہ مجھے آپ کے ساتھ نہیں آپ کے رتبے کے ساتھ محبت ہے۔ آپ نے بہت سی لڑکیاں دیکھی ہیں اور کسی ایک کو بھی اپنے قابل نہیں پایا۔ میں نے بھی بہت لڑکے دیکھے ہیں نوجوان بھی اور پکی عمر کے جوان بھی۔ آپ کی طرح مجھے بھی کسی میں وہ وصف نظر نہیں آیا جو آپ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں"۔

"کیا وہ وصف مجھ میں نہیں؟" — برکیارق نے پوچھا — "اب میں توقع رکھوں گا کہ تم جرأت سے سچ بولو گی"۔

"ہاں، آپ میں مجھے وہ خوبی نظر آ گئی ہے"۔

"کیا ہے وہ خوبی؟" — برکیارق نے پوچھا۔

"آپ سلطان کے بیٹے ہیں" — روزینہ نے جواب دیا — "لیکن میں نے آپ کے انداز میں سلطانی نہیں دیکھی۔ آپ نے میرے درویش بھائی سے کہا تھا کہ آپ نے لڑکیوں میں کبھی دلچسپی نہیں رکھی۔ اگر آپ نے سچ بولا تھا تو آپ وہ آدمی ہیں جسے میں اپنے خاوند کی حیثیت سے پسند کروں گی لیکن میں اتنی کمتر ہوں کہ آپ سے یہ

درخواست کروں گی ہی نہیں کہ آپ مجھے قبول کر لیں اور میرا بھائی میرے فرض سے فارغ ہو کر حج کے لئے چلا جائے"۔

تاریخ گواہی دیتی ہے کہ برکیارق لڑکیوں کا شیدائی نہیں تھا جس طرح کہ شہزادے ہُوا کرتے ہیں۔ یہ پہلی لڑکی تھی جو اس کے دل میں اُتر گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں روزینہ اس کے دل پر ہی نہیں بلکہ دماغ پر بھی غالب آ گئی۔ اس نے روزینہ کو اپنا فیصلہ سنا دیا لیکن روزینہ نے پھر بھی یہ کہا کہ وہ ڈرتی ہے کہ برکیارق کے دماغ میں سلطانی بیدار ہو گئی تو وہ روزینہ کو اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔

"نہیں..... نہیں!" — روزینہ نے کہا — "یہ شادی نہیں ہو سکے گی۔ سلطان ملک شاہ آپ کو اجازت نہیں دیں گے کہ آپ ایک ایسی لڑکی سے شادی کر لیں جس کا نہ کوئی گھر گھاٹ ہے اور نہ اس کا کوئی ٹھکانہ ہے"۔

برکیارق نے اسے قسمیں کھا کھا کر یقین دلانا شروع کر دیا کہ اسے اگر سلطان نے شادی کی اجازت نہ دی تو وہ روزینہ کو ساتھ لے کر یہاں سے چلا ہی جائے گا۔

"میں تمہاری محبت پر سلطنت کی جانشینی اور وراثت قربان کر دوں گا" — برکیارق نے کہا — "اللہ گواہ ہے کہ تم پہلی لڑکی ہو جسے میں یہ الفاظ کہہ رہا ہوں"۔

"آپ میری محبت پر سلطنت کی وراثت قربان کر رہے ہیں" — روزینہ نے کہا — "اور میں آپ کی سلطانی پر اپنی محبت قربان کرتی ہوں..... آپ سلطان کے بڑے بیٹے ہیں۔ ان کے بعد آپ سلطان بنیں گے۔ میں آپ کو سلطان کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے زیادہ مجبور نہ کریں"۔

"تمہارے بھائی جان آ رہے ہوں گے" — برکیارق نے کہا اور اس سے پوچھا — "اگر میں تمہیں تنہائی میں ملنا چاہوں تو کیسے مل سکتا ہوں؟"

"میں آپ کو تنہائی میں بھی مل سکتی ہوں" — روزینہ نے کہا — "لیکن میں آپ کو یہ بتا دیتی ہوں کہ آپ سلطان کے بیٹے کی حیثیت سے مجھے ملنے آئے تو وہ ہماری آخری ملاقات ہو گی۔ میرے پاس کوئی دولت نہیں۔ میرا بھائی درویش ہے۔ اس کے پاس اتنی سی پونجی ہوتی ہے کہ ہم دو وقت عزت کی روٹی کھا لیتے ہیں اور سفر کے اخراجات ادا کر سکتے ہیں لیکن میرے پاس جو دولت ہے وہ میری آبرو، میری عصمت ہے۔ میں جان دے دوں گی، اس دولت سے دست بردار نہیں ہوں گی۔ آپ میرے

قدموں میں اشرفیوں کا انبار لگا دیں۔ آپ مجھے خرید نہیں سکیں گے"۔

"کیا تم میری محبت کو بھی قبول نہیں کرو گی؟" ـــ برکیارق نے پوچھا ـــ "کیا تم اس روحانی محبت کو نہیں پہچان سکو گی جس کا تعلق جسموں کے ساتھ نہیں ہوتا؟"

"میں اسی محبت کی جستجو میں ہوں" ـــ روزینہ نے کہا ـــ "لیکن سنا ہے شاہی خاندانوں میں ایسی محبت نہیں ملا کرتی جس کا تعلق روح کے ساتھ ہوتا ہے جسموں کے ساتھ نہیں"۔

"میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں" ـــ برکیارق نے کہا ـــ "تم یہ بتاؤ کہ تنہائی میں کہاں اور کس وقت مل سکو گی؟"

"رات کو میرا بھائی بڑی ہی گہری نیند سویا کرتا ہے" ـــ روزینہ نے کہا ـــ "اس کے سر پر ڈھول بجتے رہیں' اس کی آنکھ نہیں کھلتی۔ سرائے کے پچھواڑے بڑا خوبصورت باغ ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا درخت بے شمار ہیں۔ آپ آدھی رات کے وقت یہاں آ جائیں۔ میں آپ کے ساتھ باغ تک چلی چلوں گی"۔

"میں آج رات باغ میں آ جاؤں گا" ـــ برکیارق نے کہا ـــ "آدھی رات کے وقت آؤں گا اور تمہارا انتظار کروں گا"۔

برکیارق تو جیسے بھول ہی گیا تھا کہ وہ اتنی بڑی سلطنت کے سلطان کا بیٹا ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ روزینہ صرف خوبصورت ہی نہیں' اس میں خود اعتمادی اور جرأت بھی ہے۔ ان اوصاف نے روزینہ کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ کچھ دیر پہلے برکیارق اس سے محبت کی بھیک مانگ رہا تھا۔ یہ لڑکی اس پر طلسم ہوشربا بن کر غالب آ گئی تھی اور برکیارق یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اس پر کوئی نشہ طاری ہو گیا ہو۔

درویش آ گیا۔ وہ خاصا وقت لگا کر آیا تھا لیکن برکیارق نے یوں محسوس کیا جیسے وہ صرف ایک لحہ باہر رہا ہو۔ اس نے برکیارق کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی غیر حاضری میں وہ اس کی بہن کے پاس بیٹھا رہا تھا۔

برکیارق وہاں سے اٹھنا ہی نہ چاہتا تھا لیکن اسے اٹھنا پڑا۔ وہ اٹھا اور قدم گھسیٹنے کے انداز سے چلتا کمرے سے باہر نکل آیا۔

○

اُس روز برکیارق دن بھر کے کام کاج بھول گیا تھا۔ وہ سرائے سے سیدھا اپنے گھر

گیا۔ اس نے باپ کو جا کر دیکھا۔ باپ جاگ اٹھا تھا۔ وہ باپ کے پاس بیٹھ گیا۔

"برکیارق بیٹا!" ـــ سلطان ملک شاہ نے بڑی ہی نحیف آواز میں کہا ـــ "میری زندگی کا اب کوئی بھروسہ نہیں۔ اس حقیقت کو قبول کر لو کہ میں دو چار دنوں کا ہی مہمان ہوں۔ سلطنت کی ساری ذمہ داریاں تمہارے کندھوں پر آ رہی ہیں۔ تم نے صرف اتنی بڑی اسلامی سلطنت کو ہی نہیں سنبھالنا بلکہ اسلام کی پاسبانی بھی کرنی ہے اور اولیت دینِ اسلام کو دینا....."

"اتنی مایوسی؟" ـــ برکیارق نے سلطان ملک شاہ سے کہا ـــ "ابھی تو اللہ نے آپ سے بہت کام لینے ہیں۔ خدا کے لئے اس مایوسی کو اپنے ذہن سے جھٹک ڈالیں۔ میں نے طبیب سے پوچھا ہے۔ وہ کہتا ہے سلطان کو کوئی جسمانی مرض لاحق نہیں۔ انہوں نے اپنے ذہن اور دل پر خود ہی بوجھ ڈال لیا ہے.....اب آپ میری ایک بات غور سے سنیں۔ میں آپ کا روحانی علاج کرانا چاہتا ہوں"۔

"میں خود روحانیت کا قائل ہوں" ـــ سلطان ملک شاہ نے کہا ـــ "لیکن مجھے کوئی علمِ روحانیت کا عالم نظر نہیں آتا"۔

"مجھے ایک عالم اور روحانی علاج کا ماہر نظر آ گیا ہے" ـــ برکیارق نے کہا ـــ "اس نے بھی بتایا ہے کہ آپ کو کوئی جسمانی عارضہ لاحق نہیں۔ آپ پر کوئی عمل کیا گیا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ یہ عمل کس نے کیا ہو گا..... حسن بن صباح کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا.....اس عالم نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے بڑی لمبی عمر پائی ہے"۔

برکیارق نے سلطان ملک شاہ کو وہ ساری باتیں سنائیں جو درویش نے اس کے ساتھ کی تھیں۔ جوں جوں وہ درویش کی باتیں سنتا جا رہا تھا' اس کے مُرجھائے ہوئے چہرے پر رونق عود کرتی آ رہی تھی۔ طبیب نے اسے کئی بار بتایا تھا کہ وہ ذہنی طور پر بیدار ہو جائے اور یقین کر لے کہ وہ کسی جسمانی مرض میں مبتلا نہیں۔ طبیب نے اسے الگ الگ کر کے بتایا تھا کہ اس کے ذہن پر کون کون سی باتیں اثر انداز ہو رہی ہیں اور اس کا علاج یہ نہیں کہ انسان ہتھیار ڈال کر لیٹ ہی جائے اور اپنے آپ کو مُردہ سمجھ لے لیکن سلطان ملک شاہ طبیب کی کسی بات کو قبول نہیں کرتا تھا۔ وہ اس کی صرف دوائیاں قبول کر رہا تھا۔ اس کے اپنے بڑے بیٹے برکیارق نے اس درویش کا تفصیلی ذکر کیا تو وہ فوراً مان گیا اور اس نے بیٹے سے کہا کہ وہ اس درویش کو ساتھ لے آئے۔

برکیارق اٹھ دوڑا۔ اسے اپنے باپ کی صحت کے ساتھ تو دلچسپی تھی ہی، لیکن اس سے زیادہ دلچسپی روزینہ کے ساتھ تھی۔ وہ یہ سوچ کر سرائے کی طرف جا رہا تھا کہ درویش سے کہے گا کہ روزینہ کو کمرے میں اکیلی نہ چھوڑے اور اسے اپنے ساتھ لے چلے۔

ایسے ہی ہُوا جیسا اس نے سوچا تھا۔ وہ درویش کو شاہی بگھی میں بٹھا کر لے آیا۔ روزینہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ اپنے محل جیسے گھر میں آکر برکیارق نے روزینہ کو اپنی ماں اور بہنوں کے پاس بھیج دیا اور درویش کو اپنے باپ کے پاس لے گیا۔

درویش نے سلطان ملک شاہ کو اپنے سامنے بٹھا لیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور مراقبے میں چلا گیا۔ اس دوران تسبیح جو اس کے ہاتھ میں تھی اس کے دانے وہ انگلیوں سے آگے چلاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور تسبیح کے دانوں کو دیکھنے لگا پھر اس نے تسبیح الگ رکھ دی اور سلطان ملک شاہ کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔

"قابلِ صد احترام سلطان!" — درویش نے کہا — "بات وہی نکلی ہے جو میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ دشمن نے گھر بیٹھے وار کیا ہے۔ اس محل کے احاطے کے اندر کہیں نہ کہیں کالی بلی کا سر دفن ہوگا۔ میں ابھی یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ سر کہاں دفن کیا گیا ہے۔ یہ بعد کی بات ہے۔ میں وہ سر نکال کر آپ کو دکھا دوں گا۔ فوری طور پر کرنے والا کام یہ ہے کہ آپ پر اس سفلی عمل کے جو اثرات ہیں وہ اُتر جائیں اور آپ کا دماغ پہلے کی طرح کام کرنے لگے"۔

"آپ یہ علاج کس طرح کریں گے؟" — سلطان ملک شاہ نے پوچھا — "کیا مجھے بھی کچھ کرنا پڑے گا؟"

"میں آپ سے نماز پڑھواؤں گا" — درویش نے کہا — "ایک وظیفہ بتاؤں گا جو آپ نے ہر نماز کے بعد کرنا ہوگا۔ باقی سارا کام میں خود کروں گا۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ مجھے کیا عمل کرنا ہے۔ آپ سات دنوں بعد پہلے کی طرح ترو تازہ ہو جائیں گے"۔

"ایک اور بات بتائیں" — سلطان ملک شاہ نے پوچھا — "کیا آپ کے پاس کوئی ایسا عمل یا وظیفہ ہے جو کیا جائے تو طاقتور دشمن بھی زیر ہو جائے؟"

"بہت کچھ ہو سکتا ہے" — درویش نے کہا — "لیکن ایک سے زیادہ کام ایک

ہی بار شروع نہیں ہوں گے۔ سب سے پہلے تو آپ کو زندگی کے راستے پر رواں کرنا ہے جیسا کہ آپ پہلے ہُوا کرتے تھے۔ اس کے بعد اگلا کام ہوگا"۔

داستان گو جس دَور کی داستان سنا رہا ہے اُس دور میں انسانی فطرت کی کمزوریاں عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔ یوں کہیں تو زیادہ صحیح ہوگا کہ انسان کی فطرت میں کمزوریاں تو ہر وقت رہی ہیں لیکن حسن بن صباح کی ابلیسی فطرت نے ان کمزوریوں کو اس طرح ابھارا اور لوگوں کو یقین دلا دیا کہ یہی کمزوریاں ان کی خوبیاں ہیں جنہیں اللہ زیادہ پسند کرتا ہے۔ اِدھر حسن بن صباح تھا اور اُدھر سُلطان ملک شاہ کو ایک روحانی عامل مل گیا۔ اُس سلطان کی اپنی فطری کمزوریاں تھیں۔ یہی وہ شخص تھا جو جنگی قوت سے یا کسی بھی طریقے سے ابلیسیت کے اس طوفان کو اور اس سیلاب کو روک سکتا تھا اور روکنے کی پوری کوشش کر بھی رہا تھا۔ اس کی فطرت کی کمزوریاں ابھریں تو اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے شخص کے حوالے کر دیا جو یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ پردوں کے پیچھے کی باتیں بتا سکتا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ سلطان پہلے یہ دیکھتا کہ یہ شخص ہے کون اور کیا اس میں اتنی بڑی طاقت ہے بھی یا نہیں کہ یہ غیب کی باتیں بتا سکے۔

ادھر اس کے بڑے بیٹے برکیارق میں ایک فطری کمزوری ایک حسین اور نوجوان لڑکی نے ابھار دی۔ وہ جو کہتا تھا کہ اس نے لڑکیوں میں کبھی دلچسپی نہیں لی، اس نے اس لڑکی کو اپنے اعصاب بلکہ اپنی عقل پر غالب کر لیا۔ یہ ذمہ داری برکیارق کی تھی کہ وہ پہلے دیکھ لیتا کہ اس درویش کے پاس کوئی علم یا کسی عمل کی کوئی طاقت ہے بھی یا نہیں یا یہ سلطان کو خوش کر کے انعام و اکرام حاصل کرنے کے چکر میں ہے۔

اُس وقت ضرورت یہ تھی کہ سُلطان ملک شاہ کو بیدار کیا جاتا اور اُس کی جو ذمہ داریاں تھیں وہ اس کے آگے رکھی جاتیں اور اسے کہا جاتا کہ ان ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے تیار ہو جاؤ اور میدانِ عمل میں کود پڑو۔

یہاں تک تو بات بالکل ٹھیک تھی کہ اس درویش نے اسے کہا تھا کہ وہ نماز باقاعدگی سے پڑھے اور ایک وظیفہ بھی کرے۔ سلطان ملک شاہ ویسے بھی عبادت کا قائل تھا اور صوم و صلوٰۃ کا پابند بھی تھا لیکن درویش نے اسے یہ جو کہا تھا کہ باقی عمل وہ خود کرے گا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ سلطان کے ہاتھ میں روحانیت کی لاٹھی دے دی گئی تھی کہ وہ اس کے سہارے چلے گا۔ یہ درویش بھی مخلص ہو سکتا تھا اور اس کی بہن روزینہ بھی سچے دل

سے برکیارق کے ساتھ محبت کر سکتی تھی لیکن اس وقت کی صورتِ حال ایسی تھی کہ سلطان کو خود بھی اور اس کے بیٹوں کو بھی بیدار اور ذہنی طور پر چوکس رہنا تھا اور ہر وقت اللہ سے مدد مانگنی تھی۔

"سلطانِ عالی مقام!" — درویش نے کہا — "میں نے غیب کے پردے اٹھا کر دیکھ لیا ہے۔ حسن بن صباح نے جو سِفلی عمل آپ پر کروایا ہے وہ اُلٹا ہو کر اُسی پر جا پڑے گا۔ اس کی وہی حالت ہو جائے گی جو آپ کی ہو رہی تھی۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ جب کسی کا کیا ہُوا عمل اُلٹا ہو کر اس پر جاتا ہے تو بہت ہی زیادہ نقصان کرتا ہے۔ میں ابھی یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن دھندلی سی ایک بات ہے جو میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ امکان موجود ہے کہ حسن بن صباح اس اثر کو برداشت ہی نہ کر سکے اور مر جائے۔ وہ مر گیا تو اس نے جو فتنہ کھڑا کیا اور اسے پھیلایا ہے' وہ خود ہی ختم ہو جائے گا۔ میں آپ کو باداموں کی سات گریاں اور سات ہی چھوہارے دوں گا۔ آپ نے یوں کرنا ہے کہ بادام کی ایک گری ہر صبح نہار منہ کھا لینی ہے اور رات سونے سے پہلے ایک چھوہارا کھانا ہے۔ یہ خیال رکھیں کہ بادام کی گری اور چھوہارا بہت دیر چباتے رہنا ہے اور جب یہ لعاب کی صورت اختیار کر لے تو نگل لینا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان سات دنوں میں آپ یوں محسوس کریں جیسے آپ کی تکلیف بڑھ گئی ہے تو پریشان نہیں ہونا۔ آٹھویں روز آپ اچھل کر پلنگ سے اٹھیں گے اور زندگی کے اُس راستے پر چل پڑیں گے جو خدا نے آپ کو دکھایا ہے"۔

درویش نے اپنے تھیلے میں سے باداموں کی سات گریاں اور سات چھوہارے نکالے اور سلطان ملک شاہ کے ہاتھ میں دے دیے۔

"یہ الگ رکھ دیں" — درویش نے کہا — "میں نے ان پر اپنا عمل کر دیا ہے۔ اس عمل کے لئے میں گذشتہ رات سویا بھی نہیں۔ یہ رات بھر کا عمل تھا"۔

درویش نے اپنے مخصوص انداز سے باتیں شروع کر دیں۔ ان باتوں میں امید کی چمکتی ہوئی کرنیں تھیں اور یہ کرنیں دلفریب رنگوں والی تھیں جن میں سلطان ملک شاہ کو مستقبل دُرخشاں نظر آ رہا تھا۔ درویش کی باتیں جو تھیں وہ اپنی جگہ پُر اثر تھیں لیکن درویش کے بولنے کا جو انداز تھا' اصل اثر تو اس کا تھا۔ یہ اثر ایسا تھا جیسے کسی کو ہپناٹائز کیا جا رہا ہو۔ یہ اثرات سلطان ملک شاہ کے چہرے پر صاف نظر آنے لگے تھے۔ اس کی

آنکھوں میں چمک آتی جا رہی تھی اور اس کا چہرہ جو زردی مائل ہو گیا تھا' اپنے قدرتی رنگ میں نظر آنے لگا تھا۔

سلطان مکمل طور پر بلکہ کچھ غیر قدرتی طور پر بیدار ہو گیا اور اس نے درویش سے اس کے متعلق کچھ ذاتی سوالات پوچھنے شروع کر دیے۔ درویش نے سلطان کو وہی باتیں بتائیں جو وہ برکیارق کو بتا چکا تھا۔

"سلطانِ عالی مقام!" — درویش نے کہا — "میرے سر پر صرف ایک ذمہ داری ہے جس سے میں فارغ ہو گیا تو باقی عمر خانۂ کعبہ میں اللہ اللہ کرتے گزار دوں گا...... میرے ساتھ میری چھوٹی بہن ہے۔ میں اس کی شادی کسی ایسے آدمی کے ساتھ کرانا چاہتا ہوں جو مخلص اور دردمند ہو اور صحیح معنوں میں مسلمان ہی نہ ہو بلکہ مردِ مومن ہو"۔

"تمہاری بہن کہاں ہے؟" — سلطان نے پوچھا۔

"میرے ساتھ ہے" — درویش نے جواب دیا — "اسے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ میں اسے اکیلی نہیں چھوڑتا"۔

"پدرِ محترم!" — برکیارق بولا — "میں نے ان کی بہن کو دیکھا ہے۔ اتفاق ایسا ہُوا کہ مجھے اس کے پاس کچھ دیر بیٹھنا پڑا۔ میں نے اس کے ساتھ باتیں کیں تو میں نے محسوس کیا کہ ان کی بہن صرف خوبصورت ہی نہیں بلکہ ان میں عقل بھی ہے اور فہم و فراست بھی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں گے تو میں ان کی بہن کے ساتھ شادی کر لوں گا"۔

"لڑکی کو یہاں لاؤ" — سلطان ملک شاہ نے کہا۔

لڑکی آ گئی۔ اس کے ساتھ برکیارق کی ماں بھی تھی۔ سلطان ملک شاہ پر درویش نے ایسا تاثر پیدا کر دیا تھا کہ اس نے کچھ زیادہ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ اس نے لڑکی کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا' ایک دو رسمی سی باتیں کیں۔ لڑکی نے ان باتوں کے معقول جواب دیے۔

"برکیارق!" — سلطان ملک شاہ نے ایسے لہجے میں کہا جیسے کوئی فرمان جاری کر رہا ہو — "تم اس لڑکی کے ساتھ شادی کرو گے"۔

برکیارق کی ماں بھی اس لڑکی سے متاثر ہو گئی تھی۔ اس نے خندہ پیشانی سے اپنے

خاوند کے فرمان کی تائید کر دی۔

"نہیں سلطانِ عالی مقام!" ــــ درویش نے ہاتھ جوڑ کر کہا ــــ "میں اس قابل نہیں ہوں کہ اتنی اونچی پرواز کی توقع رکھوں۔ فیصلہ سوچ سمجھ کر کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس محل میں میری بہن کو یہ طعنے ملنے شروع ہو جائیں کہ تُو ایک بے گھر اور بے ٹھکانہ درویش کی بہن ہے"۔

"میں نے فیصلہ دے دیا ہے" ــــ سلطان نے کہا ــــ "یہ اسلام کے شیدائیوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقوں کا خاندان ہے۔ یہاں لڑکی کو سر آنکھوں پر بٹھایا جائے گا۔ جو خدشہ تم نے ظاہر کیا ہے وہ ان دیواروں کے اندر ایک گناہِ کبیرہ سمجھا جاتا ہے"۔

"سلطان!" ــــ برکیارق کی ماں نے کہا ــــ "آپ پہلے صحت یاب ہو لیں۔ جونہی آپ اٹھ کر باہر نکلیں گے، برکیارق کی شادی اس لڑکی کے ساتھ کر دی جائے گی"۔

برکیارق کی ماں تو بہت ہی خوش تھی کیونکہ وہ سلطان کے چہرے پر تندرستی اور بشاشت کے آثار دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی درویش سے متاثر ہوئی اور اس نے انعام واکرام کا اشارہ کیا لیکن درویش نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ وہ کسی انعام کے لالچ میں سلطان کو زندگی کی گہما گہمی میں واپس نہیں لا رہا بلکہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔

کچھ دیر بعد درویش روزینہ کو ساتھ لے کر رخصت ہو گیا۔

○

سلطان ملک شاہ کا معمول بن گیا کہ صبح جاگتا تو پہلا کام یہ کرتا کہ درویش کی دی ہوئی بادام کی ایک گری منہ میں ڈال کر چبانے لگتا۔ اس کے بعد وہ نہا کر نماز پڑھتا اور پھر درویش کا بتایا ہوا وظیفہ کرنے لگتا۔ عشاء کی نماز کے بعد بھی وہ وظیفہ کرتا اور اس کے بعد ایک چھوہارا منہ میں ڈال کر چبانے لگتا۔

برکیارق ہر روز روزینہ سے ملنے چلا جاتا تھا۔ روزینہ نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے سرائے کے پچھواڑے والے باغ میں آدھی رات کے وقت ملا کرے گا لیکن اب اس احتیاط اور خفیہ ملاقات کی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ چند دنوں بعد برکیارق اور روزینہ نے میاں بیوی بن جانا تھا۔ برکیارق سرائے میں درویش کے کمرے میں چلا جاتا

اور درویش کسی نہ کسی بہانے سے باہر نکل جاتا۔ روزینہ اس پر ایک بڑے ہی حسین طلسم کی طرح طاری ہو جاتی اور برکیارق خود فراموشی کی کیفیت میں گم ہو جاتا۔

درویش ہر روز کچھ دیر کے لئے سلطان کے پاس جا بیٹھتا' اس کی آنکھوں میں جھانکتا اور پھر آنکھوں میں پھونکیں مار کر کچھ باتیں کرتا اور وہاں سے چلا آتا۔

پانچواں یا چھٹا روز تھا کہ سلطان نے اپنے سینے میں بے چینی سی محسوس کرنی شروع کر دی۔ اس نے کہا کہ درویش کو فوراً بلایا جائے۔ کچھ دیر بعد درویش آ گیا۔ اس کے آنے تک سلطان ملک شاہ کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ سینے کی بے چینی بڑھ گئی اور ایسی ہی بے چینی کھوپڑی کے اندر دماغ میں بھی شروع ہو گئی تھی۔

"ایسا ہونا تھا" ــــ درویش نے کہا ــــ "یہ تکلیف برداشت کریں۔ کل اس وقت تک یہ تکلیف کم ہونے لگے گی اور اس کے بعد آپ بالکل قدرتی حالت میں آ جائیں گے"۔

وہ دن اور وہ رات سلطان ملک شاہ سو بھی نہ سکا۔ اگلی صبح اس نے اپنی سانسیں رُکتی ہوئی محسوس کیں۔ اس نے ایک بار پھر درویش کو بلایا۔ درویش نے آ کر پھر کل جیسی تسلیاں دیں اور مسرت کا اظہار کیا کہ جو عمل سلطان پر کیا گیا تھا وہ نکل رہا ہے اور یہ اس کے اثرات ہیں۔

اگلے روز سلطان نے صبح اٹھ کر بادام کی آخری گری کھائی۔ سارا دن تڑپتے گزرا اور سورج غروب ہو گیا۔ سلطان نے کہا کہ درویش کو بلاؤ اور اسے کہو کہ آج کی رات وہ اُس کے ساتھ گزارے۔ تکلیف اُس کی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔

مزمل آفندی بہت دنوں سے سلطان کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ اسے یہی بتایا جاتا رہا کہ طبیب نے اور اب درویش نے سختی سے کہا ہے کہ سلطان کے پاس کوئی ملاقاتی نہ آئے۔ اس شام جب سلطان کی تکلیف بہت ہی بڑھ گئی تھی' مزمل بیتاب سا ہو گیا اور سلطان کو دیکھنے چلا گیا۔ برکیارق سے تو اس کی ملاقات ہر روز ہی ہوتی تھی اور برکیارق اسے بتاتا رہتا تھا کہ درویش نے کیا کہا ہے اور سلطان کی حالت کیا ہے لیکن اُس شام وہ اس قدر بے چین ہُوا کہ وہ سلطان کے محل میں چلا گیا۔ اسے برکیارق ملا۔ مزمل نے برکیارق سے کہا کہ وہ سلطان کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اس نے ایسی بیتابی کا اظہار کیا کہ برکیارق اسے سلطان کے کمرے میں لے ہی گیا۔

وہ سلطان کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ سلطان پلنگ پر لیٹا ہوا اپنے سینے پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ لاش کی طرح سفید تھا۔ مزمل تو سلطان ملک شاہ کا مرید تھا اور سلطان کو بھی مزمل سے بہت پیار تھا۔ مزمل کی نظر درویش کے چہرے پر پڑی جو قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی مزمل کو دھچکا سا لگا جیسے اس کے پاؤں فرش سے اکھڑ رہے ہوں..... مزمل نے درویش کی آنکھ کے قریب گال کی ابھری ہوئی ہڈی پر کالا تل دیکھا جو مٹر کے دانے کے برابر تھا۔

ایسے تل والا آدمی اسے گھوڑ دوڑ کے میدان میں ملا تھا اور مزمل نے اسے پہچاننے کی کوشش کی تھی اور اسے کہا بھی تھا کہ وہ کہیں مل چکے ہیں۔ مزمل کو یاد آیا کہ اس تل والے آدمی کی داڑھی بڑے سلیقے سے تراشی ہوئی اور چھوٹی چھوٹی تھی اور وہ جوان تھا لیکن اس درویش کی داڑھی لمبی اور خشخشی تھی اور اس کی عمر کا اندازہ چالیس سال کے لگ بھگ تھا۔ اچانک مزمل کو یاد آگیا کہ اس نے اس تل والا آدمی خلجان میں دیکھا تھا اور یہ آدمی اس کے ساتھ الموت تک گیا تھا۔ اب اسے خیال آیا کہ یہ تو حسن بن صباح کا آدمی ہے۔

مزمل کی کھوپڑی کے اندر جیسے دھماکہ ہوا ہو۔ اس نے کچھ سوچے بغیر لپک کر بلکہ جھپٹ کر اپنا ہاتھ درویش کی لمبی داڑھی پر رکھا اور زور سے جھٹکا دیا۔ لمبی داڑھی مزمل کے ہاتھ میں آگئی اور درویش کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی کالی داڑھی رہ گئی۔ یہ وہ آدمی تھا جو اسے خلجان میں ملا تھا اور الموت تک اس کے ساتھ گیا تھا اور یہی آدمی اسے گھوڑ دوڑ کے میدان میں ملا تھا۔ مزمل نے اس کی پگڑی اتار دی۔ دیکھا کہ اس کے لمبے بال جو اس کے کندھوں تک پہنچتے تھے مصنوعی تھے۔ سلطان چونک کر اٹھ بیٹھا۔ برکیارق کھڑا ہو گیا۔

"سلطانِ محترم!" ــــ مزمل آفندی نے کہا ــــ "اس شخص نے آپ کو باداموں کی گریوں اور چھوہاروں میں زہر کھلا دیا ہے..... فوراً طبیب کو بلائیں"۔

سلطان کی تلوار دیوار کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ مزمل نے لپک کر وہ تلوار نیام سے نکالی اور اس کی نوک درویش کی شہ رگ پر رکھ دی۔

"سچ بتاؤ تم کون ہو؟" ــــ مزمل نے پوچھا ــــ "اور تمہارے ساتھ جو لڑکی ہے وہ کون ہے؟..... وہ تمہاری بہن نہیں..... اور تم حسن بن صباح کے بھیجے ہوئے آدمی

ہو"۔

"میرے دوست!" ــــ درویش نے مسکرا کر کہا ــــ "تم مجھے قتل کر سکتے ہو۔ میں نے اپنا کام کر دیا ہے۔ یہ لڑکی جو میرے ساتھ ہے' اسے مشکوک یا مجرم نہ سمجھنا۔ یہ میری بہن ہے۔ یہ میری خفیہ زندگی سے لاعلم ہے۔ میں سلطان کا قاتل ہوں اس لئے میں اس حق سے محروم ہو گیا ہوں کہ سلطان سے درخواست کروں کہ میری بہن کو پناہ دی جائے اور میرے جرم کی سزا اسے نہ دی جائے"۔

سلطان ملک شاہ نے سنا کہ اس شخص نے درویش کے بہروپ میں اسے زہر دے دیا ہے تو اسے موت سر پر کھڑی نظر آنے لگی۔

"او ظالم انسان!" ــــ سلطان نے اس جعلی درویش سے کہا ــــ "اگر تُو اس زہر کا اثر اتار دے تو میں تیرا یہ جرم معاف کر کے عزت سے رخصت کروں گا اور تیری بہن کی شادی اپنے بیٹے کے ساتھ کر دوں گا..... اور جو انعام مانگو گے دوں گا"۔

"نہیں بدنصیب سلطان!" ــــ اس شخص نے کہا ــــ "اس زہر کا کوئی تریاق نہیں جو میں نے باداموں اور چھوہاروں میں ملا کر آپ کو دیا ہے۔ مجھے مرنے کا ذرا سا بھی غم نہیں۔ مجھے انعام نہیں چاہئے۔ میں امام حسن بن صباح کا فدائی ہوں۔ میرے لئے یہی انعام کافی ہے کہ میں نے امام کی خوشنودی حاصل کر لی ہے اور میں سیدھا جنت میں جا رہا ہوں۔ امام نے مجھے جس کام کے لئے بھیجا تھا' وہ میں نے کر دیا ہے"۔

طبیب آگیا تھا۔ اُس نے سلطان کی نبض دیکھی' ایک دوائی بھی دی لیکن اُس کے چہرے پر مایوسی کا جو تاثر آگیا تھا اسے وہ چھپا نہ سکا۔

برکیارق کی ماں اور روزینہ بھی سلطان کے کمرے میں آگئی تھیں۔ ماں نے تو رونا اور چلّانا شروع کر دیا تھا۔ برکیارق کے دونوں بھائی' محمد اور سنجر' بھی وہاں موجود تھے۔

"سلطان محترم!" ــــ مزمل آفندی نے کہا ــــ "اس شخص کو میرے حوالے کر دیا جائے۔ اسے میں اپنے ہاتھوں قتل کروں گا"۔

"اسے لے جاؤ" ــــ سلطان نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ــــ "اسے کمر تک زمین میں گاڑ کر اس پر خونخوار کتے چھوڑ دو..... اور ایک قبر کھود کر اس کی بہن کو زندہ دفن کر دو"۔

روزینہ نے خوفزدہ نظروں سے برکیارق کو دیکھا۔ برکیارق روزینہ کے آگے جا کھڑا

ہُوا۔

"نہیں!" — اُس نے کہا — "بے گناہ کو سزا نہیں ملے گی"۔

"بیوقوف نہ بنو برکیارق!" — مزمل نے کہا — "یہ ناگن ہے جسے تم اپنی پناہ میں لے رہے ہو"۔

"خبردار!" — برکیارق نے کہا — "اس لڑکی کے قریب نہ آنا' اور سب یہ بھی سوچ لو کہ سلطان زندہ نہ رہے تو میں ان کا جانشین ہوں۔ میں سلطان ہوں۔ اب میرا حکم چلے گا" — اس نے حسن بن صباح کے فدائی کی طرف اشارہ کر کے کہا — "اسے اسی طرح ہلاک کیا جائے جس طرح سلطانِ معظم نے حکم دیا ہے"۔

یہ ہنگامہ جاری ہی تھا کہ سلطان ملک شاہ نے آخری ہچکی لی اور فوت ہو گیا۔

جعلی درویش کو قید خانے میں بھیج دیا گیا۔ اسے اگلے روز کتوں سے مروانا تھا۔

اب برکیارق سلطنتِ سلجوقیہ کا سلطان تھا۔

یہ دوسری بڑی شخصیت تھی جسے حسن بن صباح نے نظام الملک کے بعد قتل کروایا۔

فردوسِ ابلیس

دوسرا اور آخری حصہ

حسن بن صباح اور اُس کی بہشت کی پُراسرار داستان

عنایت اللہ

خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اُردو بازار لاہور ۷۲۳۶۹۹۰

پیش لفظ

"فردوسِ ابلیس" کا پہلا حصہ آپ نے پڑھ لیا ہے۔ اب دوسرا حصہ ملاحظہ فرمایئے جو آخری ہے۔ اس میں یہ داستانِ ابلیس ختم ہو جاتی ہے۔

پہلے حصے میں آپ نے پڑھ لیا ہے کہ حسن بن صباح اصل میں کیا تھا' وہ کس طرح ابھرا اور کیسے کیسے دلچسپ اور سنسنی خیز ہتھکنڈوں اور کیسی کیسی فریب کاریوں سے مخلوقِ خدا کے دلوں پر اور ان کے سوچنے کی صلاحیتوں پر غالب آ گیا۔ تاریخ میں چند اور شخصیتوں نے فریب کاری اور قتل و غارت میں شہرت پائی اور ان کے نام تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں لیکن حسن بن صباح کی ابلیسیت کے سامنے یہ تاریخی شخصیتیں ایسی ہیں جیسے سورج کے سامنے چراغ رکھ دیئے جائیں۔

حسن بن صباح نے سب سے بڑا اور انتہائی گھناؤنا فراڈ اللہ کے عظیم دین اسلام کے ساتھ کھیلا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اہلِ سُنّت ظاہر کرتا تھا۔ یہ اس لئے کہ اس کا دائرۂ عمل سلطنتِ اسلامیہ کے اندر تھا اور حکومت اہلِ سُنّت کی تھی۔

اس نے اپنی ابلیسیت کی تبلیغ میں ہمیشہ اسلام کا نام لیا' اسلام کے حوالے سے بات کی اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام لیتا تو اس پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی لیکن باطنی طور پر وہ اللہ کا بھی منکر اور اللہ کے رسولؐ کا بھی منکر تھا۔ لوگ اسلام اور رسالتؐ کے معاملے میں بہت ہی جذباتی تھے لیکن علم سے بے بہرہ تھے۔ اس کے نتیجے میں وہ حسن بن صباح کے جال میں آتے گئے۔

اس کے ساتھ ہی حسن بن صباح کو یہ سہولت مل گئی کہ آج کل کے برادری سسٹم کی طرح اُس دَور میں لوگوں کے الگ الگ قبیلے تھے۔ ہر قبیلہ اپنے سردار کا حکم مانتا تھا۔ اکثر سردار عیش و عشرت کے دلدادہ تھے۔ حسن بن صباح نے لوگوں کے مذہبی جذبات کو دُکھتی رگ کی طرح مٹھی میں لیا اور ان کے سرداروں کی عیش پرستی کو پیشِ

نظر رکھا۔ یہ ان سرداروں کی دُکھتی رگ تھی۔ حسن بن صباح نے انہیں اپنی تربیت یافتہ لڑکیوں کے ذریعے شیشے میں اُتار لیا۔

لوگ جب دل و جان سے اس ابلیس کے مرید ہو جاتے تو وہ انہیں اسلام کے احکامات اور پابندیوں سے آزاد کر دیتا تھا۔ کہتا تھا کہ اسلام انسان پر کوئی جبر نہیں کرتا۔ جو جی میں آئے کرو۔

''فردوسِ ابلیس'' میں آپ کو یہ ساری تفصیلات واقعات کی صورت میں ملیں گی۔ کچھ بھولے بھالے اور بعض بڑے ہی چالاک اور ہوشیار کردار جن میں حسن بن صباح کے خون کے پیاسے بھی تھے' اس کے جال میں آتے اور پھر اسی کے گن گاتے یوں دیکھیں گے جیسے سکرین پر فلم چلتی دیکھ رہے ہوں۔

ایک اور وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ ہمارے ملک میں ''تاریخی ناول'' وبا کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ طرزِ تحریر بے حد جذباتی ہوتا ہے۔ فلمی قسم کا رومان لازمی سمجھا جاتا ہے۔ ان ہی دو اجزاء سے ناول میں ایسی چاشنی پیدا ہو جاتی ہے جو پڑھنے والوں کو نشے جیسا لطف دیتی ہے' اسی لئے ''تاریخی ناول'' ہمارے ہاں بہت مقبول ہوئے ہیں لیکن ان میں تاریخی حقائق برائے نام اور ناول یعنی افسانہ زیادہ ہوتا ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ ان نام نہاد تاریخی ناولوں کے مصنفین نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہی نہیں۔

''فردوسِ ابلیس'' کو بھی قارئین کرام تاریخی ناول ہی کہتے ہیں لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ میری یہ کاوش ناول کم اور تاریخ زیادہ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے صحیح' مستند اور مکمل تاریخ پیش کی ہے' مؤرخوں اور بعد کے تاریخ نویسوں کے حوالے بھی ساتھ ساتھ دیئے ہیں' البتہ اس تاریخی داستان کو تاریخ کے مضمون کی طرح خشک' بے مزہ اور بور نہیں رہنے دیا۔ اسے ایک دلچسپ ناول کے انداز سے لکھا ہے اور ایک حقیقت کو افسانے سے زیادہ پُرلطف بنا دیا ہے۔

کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ پڑھئے اور دیکھئے کہ میرا دعویٰ کہاں تک صحیح ہے۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ ''حکایت'' لاہور

تاریخوں میں آیا ہے کہ برکیارق نے سلطان بنتے ہی تین حکم دیئے۔ ایک یہ کہ سلطان ملک شاہ کو زہر دینے والے باطنی کو اُسی طرح سزائے موت دی جائے جس طرح سلطان نے وفات سے پہلے حکم دیا تھا۔ دوسرا یہ کہ اُس باطنی کی بہن روزینہ کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔ وہ اُس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا اور اس نے تیسرا حکم یہ دیا کہ یہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ سلطان کو ایک باطنی نے زہر دے کر مارا ہے۔ ہر کسی کو یہ بتایا جائے کہ سلطان طویل علالت کے بعد فوت ہوئے ہیں۔

اس تیسرے حکم کی تعمیل تو کی گئی لیکن موت کا اصل باعث پوشیدہ نہ رکھا جا سکا۔ سلطان ملک شاہ کی موت کوئی معمولی واقعہ نہ تھا نہ وہ کوئی عام آدمی تھا کہ لوگ سنتے اور رسمی سا افسوس کر کے بھول جاتے۔ ملک شاہ کوئی روایتی سلطان یا بادشاہ بھی نہیں تھا کہ رعایا کو افسوس نہ ہوتا۔ لوگ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے کہ آج ایک مر گیا ہے تو کل دوسرا بادشاہ آجائے گا۔ سلطان ملک شاہ کی موت تو یوں تھی جیسے سلطنتِ اسلامیہ کا سب سے زیادہ مضبوط ستون گر پڑا ہو۔

باطنی ابلیسیت کے طوفان کو روکنے والا یہی ایک شخص ہی تو تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ابھی تک وہ اس طوفان کو نہیں روک سکا تھا اور ابلیسیت پھیلتی ہی چلی جا رہی تھی لیکن سلطان ملک شاہ نے اپنی پوری توجہ اور اپنے پورے ذرائع اور اپنی پوری جنگی طاقت اسی کے خلاف مرکوز کر رکھی تھی۔ وہ اسلام کا پاسبان تھا۔ اسلام کے اصل نظریے اور روح کی آبیاری کرنے والا ملک شاہ ہی تھا۔ وہ صرف اپنے خاندان کو ہی عزیز نہ تھا

بلکہ رعایا کا بچہ بچہ اُس کا نام احترام اور محبت سے لیتا تھا۔

وہ جب فوت ہُوا تو اس کے گھر میں جو کہرام بپا ہُوا وہ جنگل کی آگ کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے سارے شہر میں پھیل گیا۔ ایک ہجوم تھا جو اس کے گھر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ دربان کسی کو اندر جانے سے روک نہ سکے تھے۔ خود دربان دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ان سب کے سامنے اس باطنی جعلی درویش کو پکڑ کر باہر لائے اور اُسے زدو کوب کیا جا رہا تھا۔ گھر کی عورتیں چیخ چلّا رہی تھیں کہ اس کافر نے سلطان کو زہر دے دیا ہے۔ اس قسم کی صورتِ حال میں سلطان کی موت کا اصل باعث پوشیدہ نہ رکھا جا سکا۔

ایک تو سارے شہر میں برکیارق نے اعلان کروا دیا کہ سلطان ملک شاہ فوت ہو گئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہر طرف قاصد دوڑا دیے گئے کہ تمام سلطنت میں یہ اطلاع پہنچ جائے۔ اس اعلان کے ساتھ دوسرا اعلان یہ بھی کروا دیا کہ کل نمازِ جنازہ کے بعد تمام لوگ گھوڑ دوڑ کے میدان میں اکٹھے ہو جائیں' ایک باطنی کو سزائے موت دی جائے گی۔

اس اعلان سے قدرتی طور پر ہر کسی کے ذہن میں یہ سوال اُبھرا کہ اس باطنی کو سزائے موت کیوں دی جائے گی۔

سلطان ملک شاہ کا سرکاری عملہ' گھر کے ملازمین اور دیگر شاہی خاندان سے کوئی نہ کوئی تعلق رکھنے والے افراد کچھ کم تعداد میں نہ تھے۔ جذبات کی گرما گرمی میں ہر فرد جو اس راز سے واقف تھا' یہ سوال پوچھنے والوں کو صحیح جواب دیتا اور غصے کا اظہار یوں کرتا تھا کہ کل اس کافر کو کتوں سے پھڑوایا جائے گا۔

○

اگلے روز ظہر کی نماز کے بعد جنازہ اُٹھا اس وقت تک جہاں جہاں تک اطلاع پہنچ سکتی تھی وہاں وہاں سے لوگ سیلاب کی طرح اُمنڈ کر مَرو میں آ گئے تھے۔ نمازِ جنازہ گھوڑ دوڑ کے میدان میں پڑھائی گئی۔ اس کے بعد سلطان ملک شاہ کو قبر میں اتار گیا اور جب قبر میں مٹی ڈال دی گئی تو اُس باطنی کو میدان میں لایا گیا جس نے سلطان مرحوم کو زہر دیا تھا۔ اس کی سزا کے لئے گڑھا پہلے سے تیار تھا اسے گڑھے میں کھڑا کر دیا گیا جو اس کے گھٹنوں سے ذرا اوپر تک گہرا تھا۔

گڑھے میں مٹی ڈال کر مٹی کو اچھی طرح کُوٹ کُوٹ کر دبا دیا گیا اس شخص کے بازو کھول دیے گئے۔ ایک طرف سے چار خونخوار شکاری کتّے لائے گئے۔ اس شخص کے

قریب لا کر کتے کھول دیے گئے۔ اس باطنی کے جسم پر کوئی بُو مَل دی گئی تھی جس پر کتے ٹوٹ پڑے۔ تماشائیوں کا ہجوم دُور کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اُس باطنی کی چیخیں زمین و آسمان کو ہلا رہی تھیں آخر اس نے بڑی ہی بلند آواز میں نعرہ لگایا —— "امام حسن بن صباح زندہ باد" —— یہ اس کی آخری آواز تھی۔ اس وقت تک کتے اس کی کھال اُدھیڑ چکے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں کتوں نے اس کا ایک ایک عضو الگ الگ کر دیا۔ اس کا سر دُور جا پڑا اور پھر کتے اس کے جسم کے ٹکڑے اٹھا کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔

لوگوں کو یہ نہ بتایا گیا کہ اس شخص کو یہ سزا کیوں دی گئی ہے لیکن لوگوں میں یہ خبر پھیل گئی تھی کہ اس نے سلطان ملک شاہ کو زہر دیا ہے۔ ایسی غصیلی آوازیں اور ایسی للکار بھی سنائی دی کہ اس شخص کے خاندان کے بچے بچے کو یہاں لا کر کتوں سے پھڑوا دو۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ اس کے گھر کو آگ لگا دو۔ یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا تھا۔

اس سوال کا صحیح جواب صرف روزینہ دے سکتی تھی جو اس باطنی کی بہن تھی۔ اُس وقت روزینہ سلطان کے محل کے ایک کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اُسے ابھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی قسمت کا کیا فیصلہ ہو گا۔

سلطان ملک شاہ سپردِ خاک ہو گیا اور اُس کا قاتل اپنے انجام کو پہنچ گیا اور سلطان کے گھر میں روزینہ ایک مسئلہ بن گئی۔ اس خاندان کی کوئی عورت روزینہ کو قبول نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ سلطان کے قاتل کی بہن تھی۔ یہ شک بے جا نہ تھا کہ وہ بھی قتل کی اس سازش میں شریک تھی۔ سب دیکھ رہے تھے کہ اُس نے سلطان کے بڑے بیٹے برکیارق کو دامِ محبت میں گرفتار کر لیا تھا اور برکیارق نے اعلان کر دیا تھا کہ کوئی بھی روزینہ سے باز پُرس کی جرأت نہ کرے اور وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرے گا۔

برکیارق نے تو یہ اعلان کر دیا تھا لیکن برکیارق کی ماں کے لئے یہ شادی قابلِ قبول نہیں تھی۔ وہ شام کے وقت کسی کو بتائے بغیر اُس کمرے میں چلی گئی جہاں روزینہ اکیلی بیٹھی تھی۔ تصور میں لایا جا سکتا ہے کہ سلطان ملک شاہ مرحوم کی بیوی کس قدر غمگین اور اداس ہو گی۔ روزینہ نے اسے دیکھا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھ جاؤ لڑکی!" —— سلطان مرحوم کی بیوہ نے ایک طرف بیٹھتے ہوئے کہا —— میں تمہارے ساتھ کچھ باتیں کرنے آئی ہوں۔ تمہیں صرف میرے بیٹے نے ہی پسند

نہیں کیا تھا بلکہ مرحوم سلطان نے اور میں نے بھی تمہیں دل سے پسند کیا اور فیصلہ کر دیا تھا کہ برکیارق تمہارے ساتھ شادی کر لے لیکن جو ہُوا وہ تمہارے سامنے ہے۔ میں کیسے برداشت کر سکتی ہوں کہ اُس شخص کی بہن کو اپنی بہو بنا کر ایک سلطان کے خاندان کی فرد بنا لوں جس نے صرف مجھے ہی بیوہ نہیں کیا بلکہ مرحوم کی دو اور بیویاں بھی بیوہ ہوئی ہیں اور لوگوں سے پوچھنا کہ وہ یوں کہہ رہے ہیں کہ سلطنتِ سلجوقیہ بیوہ ہو گئی ہے۔ میں تمہیں کوئی سزا سنانے نہیں آئی۔ میں تمہارے ساتھ ایک نیکی کرنا چاہتی ہوں۔ یہ بتاؤ کے تمہیں کہاں جانا ہے۔ میں دو چار محافظوں کے ساتھ باعزت طریقے سے تمہیں وہاں تک پہنچانے کا انتظام کر دوں گی"۔

"محترم خاتون!" — روزینہ نے غم سے بوجھل آواز میں کہا — "یہ تو بعد کا حادثہ ہے کہ سلطان میرے بھائی کے ہاتھوں اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور اس صورت میں یہی ہونا چاہئے کہ آپ سب مجھے دھتکار دیں میں اس سے پہلے کی بات آپ کو سناتی ہوں۔ برکیارق نے جب مجھے کہا تھا کے وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے تو میں نے انکار کر دیا تھا اور میں نے کہا تھا کے میں شاہی خاندان کے قابل نہیں۔ ہم آپ کے مقابلے میں بہت چھوٹے لوگ ہیں خاتون محترم! برکیارق نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اُس کے ساتھ یہاں آؤں اور سلطان مرحوم اور آپ مجھے دیکھیں۔ میں نہیں آ رہی تھی۔ آئی اس لئے کہ میرے بھائی نے یہاں آنا تھا اور وہ مجھے اکیلا سرائے میں نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ اُس کی یعنی میرے بھائی کی نیّت کیا تھی۔ میں یہاں آ گئی سلطان مرحوم نے مجھے دیکھا....."

"وہ باتیں مجھے کیوں سناتی ہو!" — سلطان مرحوم کی بیوہ نے کہا — "میں نے تمہیں کوئی سزا نہیں دینی میں کہہ چکی ہوں کہ تمہیں باعزت طریقے سے رخصت کروں گی"۔

"میری عرض ہے کہ میں جو کہنا چاہتی ہوں وہ آپ سن لیں" — روزینہ نے کہا — "میں یہ بتا رہی ہوں کہ میں برکیارق کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر چکی تھی۔ برکیارق نہیں مان رہا تھا۔ سلطان مرحوم نے اور آپ نے بھی مجھے قبول کر لیا تو میں خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد جو خوفناک اور انتہائی غم ناک صورت پیدا ہوئی، اس کے پیشِ نظر میں اپنے آپ کو اس احترام اور عزت کی حق دار نہیں سمجھتی جو آپ مجھے دے

رہی ہیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ جس طرح آپ نے میرے بھائی کو سزائے موت دی ہے۔ اسی طرح مجھے بھی سزائے موت دیں۔ میں سلطان مرحوم کے قاتل کی بہن ہوں۔ میں رحم کی طلب گار نہیں"۔

"کیا تمہیں معلوم تھا کہ تمہارا بھائی سلطان کو زہر دینا چاہتا ہے؟" — بیوہ نے پوچھا۔

"نہیں!" — روزینہ نے بڑی زور سے سر ہلا کر کہا — "اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں برکیارق کو یتیم نہ ہونے دیتی اور اسے دھوکہ نہ دیتی۔ میں کوئی بات چھپا نہیں رہی۔ سچ بول رہی ہوں۔ سچ یہ ہے کہ برکیارق پہلا آدمی ہے جسے میں نے دل و جان سے چاہا ہے اور برکیارق مجھے اس سے بھی زیادہ چاہتا ہے۔ میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں کہ میں اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کر سکوں۔ میں اب برکیارق کی بیوی نہیں بنوں گی۔ مجھے اپنے بھائی کی نیت کا علم تھا یا نہیں، یہ الگ بات ہے لیکن یہ حقیقت بدل نہیں سکتی کہ میں سلطان کے قاتل کی بہن ہوں۔ مجھے سزائے موت ملنی چاہئے"۔

"تم لوگ آخر آئے کہاں سے تھے؟" — سلطان کی بیوہ نے پوچھا — "کیا تمہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تمہارا بھائی باطنی ہے؟..... یہ میں کیسے مان سکتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ حسن بن صباح کے فدائین میں سے تھا"۔

"محترم خاتون!" — روزینہ نے کہا — "ہمارا کوئی ایک ٹھکانہ ہوتا تو میں آپ کو بتاتی کہ ہم کہاں سے آئے ہیں۔ بھائی نے بتایا تھا کہ ہم اصفہان کے رہنے والے تھے۔ بچپن میں میرے ماں باپ مر گئے تھے اور اس بھائی نے مجھے پالا پوسا تھا۔ میں نے اسے خانہ بدوش ہی دیکھا۔ چھوٹا موٹا کاروبار کرتا تھا جس سے ہمیں دو وقت کی روٹی اور سفر کے اخراجات مل جاتے تھے۔ ہم کئی ایک شہروں اور قصبوں میں ایک ایک سال اور دو دو سال بھی رہے ہیں۔ بھائی مجھے ہمیشہ چار دیواری میں بند رکھتا تھا اس لئے میں نہیں بتا سکتی کہ باہر اس کی سرگرمیاں اور دلچسپیاں کیا تھیں اور وہ کن لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔ میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ وہ ہر سال حج کا ارادہ کرتا تھا جو پورا نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ میرے فرض سے فارغ ہو کر حج کا فریضہ ادا کرنے کا عزم کئے ہوئے تھا"۔

اس گفتگو کے دوران روزینہ روتی رہی، آنسو پونچھتی رہی اور کبھی تو وہ سسکنے لگتی تھی۔

"میرے بیٹے نے فیصلہ سنا دیا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ہی شادی کرے گا"۔۔۔ سلطان کی بیوہ نے کہا ۔۔۔ "وہ میری نہیں مانے گا اور وہ کسی کی بھی نہیں مانے گا۔ کیا تم اس کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر سکتی ہو؟"۔

"انکار ہی تو کر رہی ہوں" ۔۔۔ روزینہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ۔۔۔ "میں یہ جو کہتی ہوں کہ مجھے بھی سزائے موت دے دیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں قاتل کی بہن ہوں اور اس کے ساتھ تھی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں' کوئی گھر اور میرا کوئی وارث نہیں' میرے لئے ایک ہی پناہ ہے اور وہ قبر ہے۔ میں آپ سے عرض کرتی ہوں کہ مجھے قبر میں اتار دیں۔ میں آپ کو فیصلہ سنا چکی ہوں کہ آپ کے خاندان کی فرد نہیں بنوں گی نہ اپنے آپ کو اس کا حق دار سمجھتی ہوں"۔

برکیارق کی ماں روزینہ کے رونے سے' اس کے بولنے کے انداز سے اور اس کے بار بار یہ کہنے سے کہ اسے سزائے موت دی جائے' اتنی متاثر ہوئی کہ اس سوچ میں پڑ گئی کہ اس لڑکی کو بھٹکنے کے لئے یا کسی غلط آدمی کے ہاتھ چڑھ جانے کے لئے تنہا نہ چھوڑے۔ یہ تو برکیارق کی ماں کا فیصلہ تھا کہ اس کا بیٹا اس لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کرے گا لیکن وہ کشمکش میں پڑ گئی کہ لڑکی کو کہاں بھیجے۔ ویسے بھی وہ سلطان مرحوم کی طرح رحم دل عورت تھی۔

"میں تمہیں اپنے گھر سے نکالنا نہیں چاہتی روزینہ!" ۔۔۔ سلطان کی بیوہ نے کہا ۔۔۔ "اگر میں تمہاری شادی کسی اور آدمی سے کروا دوں تو تم قبول کر لو گی؟"۔

"میں بلا سوچے کوئی جواب نہیں دے سکتی" ۔۔۔ روزینہ نے کہا ۔۔۔ "خدا کی قسم' ابھی تو میرے دل اور دماغ پر اس قدر بوجھ ہے کہ میں یہی ایک فیصلہ کئے ہوئے ہوں کہ مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں"۔

"میں تمہیں زندہ رہنے کا حق دیتی ہوں" ۔۔۔ سلطان کی بیوہ نے کہا ۔۔۔ "تم سوچ لو پھر مجھے بتا دینا' میں تمہارا کوئی بہتر بندوبست کر دوں گی"۔

"محترم خاتون!" ۔۔۔ روزینہ نے کہا ۔۔۔ "آپ یہ کام کریں کہ برکیارق کے دل سے مجھے نکال دیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اسے قائل کریں کہ میرا خیال چھوڑ دے۔ بیشک وہ سلطان ہو گیا ہے اور اس نے سلطان کی حیثیت سے حکم دیا ہے کہ وہ میرے ساتھ ہی شادی کرے گا لیکن اس کا یہ حکم مجھے اچھا نہیں لگا۔ بیٹے ماؤں کو حکم دیتے اچھے

نہیں لگتے بلکہ یہ گناہ ہے۔ میں اس گناہ میں شریک نہیں ہونا چاہتی"۔

سلطان کی بیوہ نے سر جھکا لیا جیسے اسے کوئی اور سوچ آگئی ہو۔ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ماں نے اور روزینہ نے دیکھا' دروازے میں برکیارق کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے ماں کا اس کمرے میں آنا اچھا نہیں لگا۔

○

"آپ کا احترام مجھ پر فرض ہے ماں!" ۔۔۔ برکیارق نے اپنی ماں سے کہا ۔۔۔ "لیکن یہ پوچھنا میرا حق ہے کہ آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟..... میرا خیال ہے کہ آپ اسے یہ کہنے آئی ہیں کہ یہ قاتل کی بہن ہے اس لئے اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا"۔

برکیارق روزینہ کے بہتے آنسو دیکھ رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی ماں اسے کیا کہہ رہی ہو گی۔

"برکیارق!" ۔۔۔ روزینہ نے کہا اور ذرا رک کر بولی ۔۔۔ "معاف رکھنا مجھے برکیارق نہیں بلکہ مجھے سلطانِ محترم کہنا چاہئے..... آپ کی والدہ نے جو کچھ کہا اور جو کچھ میں نے انہیں کہا ہے وہ میں لفظ بہ لفظ سنا دیتی ہوں"۔

روزینہ نے وہ تمام باتیں جو اس کے اور برکیارق کی والدہ کے درمیان ہوئی تھیں' سنا دیں۔

"تمہیں اس فیصلے پر عمل کرنا ہو گا جو میں سنا چکا ہوں" ۔۔۔ برکیارق نے کہا ۔۔۔ "میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں تمہیں حکم دے کر اپنی بیوی بناؤں گا۔ یہ میرے دل کی آواز اور میری روح کا مطالبہ ہے"۔

"روح کی آواز روح ہی سن سکتی ہے سلطانِ محترم!" ۔۔۔ روزینہ نے کہا ۔۔۔ "میری روح مر گئی ہے۔ میرے بھائی نے سلطان کو ہی زہر نہیں دیا بلکہ میری روح کو بھی زہر دے کر مار ڈالا ہے۔ میرے ضمیر پر بڑے ہی گھناؤنے جرم کا بوجھ ہے۔ میں یہاں سے بھاگ جاؤں گی اور میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ مجھے بھاگ جانے دیں"۔

"میرے عزیز بیٹے!" ۔۔۔ برکیارق کی ماں بول پڑی ۔۔۔ "تم ابھی نوجوان ہو۔ میری عمر دیکھو۔ میں نے دنیا دیکھی ہے اور انسانوں کو پڑھا ہے۔ میں تمہیں اس شادی کی اجازت دے سکتی ہوں لیکن آگے جو کچھ ہو گا وہ میں جانتی ہوں"۔

"یہ بتاؤ روزینہ!" ——— برکیارق نے پوچھا ——— "تم نے میری ماں سے کہا ہے کہ تمہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ تمہارے بھائی کی باہر سرگرمیاں کیا تھیں اور وہ کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا' وہ باطنی کیسے بنا؟..... اُس نے مرنے سے پہلے امام حسن بن صباح کا نعرہ لگایا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ حسن بن صباح کے فدائین میں سے تھا.. ..وہ فدائی کیسے بنا تھا؟ تم جانتی ہو گی؟"

"میں کچھ بھی نہیں جانتی" ——— روزینہ نے جواب دیا ——— "وہ مجھے اَلمُوت لے گیا تھا۔ وہاں ہم سات آٹھ مہینے رہے تھے۔ میں نے آپ کی والدہ محترمہ کو بتایا ہے کہ مجھے وہ چار دیواری میں بند رکھتا تھا اور مجھے کچھ بھی نہیں بتاتا تھا کہ وہ باہر کیا کرتا ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ وہ باطنیوں سے جاملا تھا اور جیسے کہ آپ کہہ رہے ہیں وہ فدائی بن گیا ہو گا۔ میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ روزینہ' اللہ کرے تمہیں کسی نیک آدمی کے پلّے باندھ دوں تو میں حج کا فریضہ ادا کرلوں"۔

"ہاں!" ——— برکیارق نے کہا ——— "آج ہی تو ہم نے اپنے عظیم باپ کو دفن کیا ہے۔ غم اور دکھ ابھی تازہ ہے۔ کچھ دن گزر جانے دیں۔ اس لڑکی کو یہیں رہنے دیں۔ میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا' کچھ دن انتظار کرلیں"۔

"سلطانِ محترم!" ——— روزینہ نے کہا ——— "آپ کو یاد ہو گا کہ آپ نے مجھے کہا تھا کہ آپ کو میری یہ خوبی پسند آئی ہے کہ میں وہی بات کرتی ہوں جو میرے دل میں ہوتی ہے..... میں سچ بولتی اور سچ سنتی ہوں خواہ وہ کتنا ہی تلخ ہو۔ میرے ذہن میں گناہ کا تصور ہی نہیں آیا۔ اس لئے مجھ میں اخلاقی جرأت بھی ہے۔ میں آپ کو آپ کا باپ واپس نہیں دے سکتی۔ میں چاہتی ہوں کہ اپنی جان دے دوں شاید اس سے آپ کے اور آپ کی والدہ محترمہ اور خاندان کے دوسرے افراد کی تسکین ہو جائے۔ یہ میری روح کی آواز ہے کہ مجھے بھی سزائے موت ملنی چاہئے۔ میں آپ کی والدہ محترمہ کو بتا چکی ہوں کہ میں زندہ رہوں گی بھی تو کس کے لئے؟"

"میرے لئے!" ——— برکیارق نے کہا ——— "میں جو فیصلہ کر چکا ہوں' اس پر قائم رہوں گا لیکن اپنی ماں سے اجازت لینے کے لئے میں کچھ دن انتظار کروں گا"۔

یہ حسین و جمیل لڑکی برکیارق کے اعصاب پر تو پہلے ہی غالب آ چکی تھی لیکن اب اس نے جو باتیں کیں اور جس انداز سے کیں اس سے وہ اور زیادہ متاثر ہوا۔ اس کی ماں

بھی شش و پنج میں پڑ گئی اور ماں بیٹے نے فیصلہ کیا کہ روزینہ کو کچھ دن یہیں رکھا جائے اور پھر کچھ فیصلہ کیا جائے۔

○

مَرو پر غم و غصے کی جو گھٹا چھا گئی تھی وہ سلطان کی موت کی خبر کے ساتھ ساتھ تمام تر سلطنتِ سلجوقیہ پر چھا گئی۔ ساری سلطنت ماتم کدہ بن گئی۔

اَلمُوت میں خوشیوں کا ہنگامہ تھا۔ وہاں سلطان ملک شاہ کی موت کی خبر پہنچی تو باطنی گھروں سے نکل آئے اور خوشی سے ناچنے کودنے لگے۔ جشن کا سا سماں بندھ گیا۔ مَرو چونکہ دارالسلطنت تھا اس لئے اس شہر میں باطنیوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ جوں ہی سلطان مرحوم کے قاتل کو کتّوں نے چیر پھاڑ دیا ایک جاسوس اَلمُوت کی طرف چل پڑا تھا۔

"یا امام!" ——— اس جاسوس نے حسن بن صباح سے کہا تھا ——— "سب سے بڑا دشمن مارا گیا ہے۔ دفن بھی ہو گیا ہے اور اُس کی گدّی پر اُس کا بڑا بیٹا برکیارق بیٹھ گیا ہے"۔

"اور قاتل کا کیا بنا؟" ——— حسن بن صباح نے پوچھا۔

"اسے آدھا زمین میں گاڑ کر کتّوں سے مروایا گیا ہے" ——— جاسوس نے بتایا تھا۔

"اُس کے ساتھ ایک لڑکی تھی" ——— حسن بن صباح نے پوچھا تھا ——— "کچھ معلوم ہے وہ کہاں ہے؟"

"سلطان کے گھر میں ہے" ——— جاسوس نے جواب دیا تھا ——— "اس نے سلطان کو پہلے ہی اپنے جال میں لے لیا تھا"۔

"کیا وہ اکیلی کچھ کر سکے گی؟" ——— حسن بن صباح نے پوچھا ——— "اس سوال کا جواب دو تین دنوں بعد آجائے گا" ——— جاسوس نے کہا تھا ——— "میں سلطان ملک شاہ کے دفن ہونے کے بعد اپنے آدمی کی سزائے موت دیکھ کر چل پڑا تھا"۔

حسن بن صباح نے اپنے جاسوس کو فارغ کر دیا اور اپنے مصاحبوں اور نائبین کو بلایا۔ وہ فوراً "سلطان ملک شاہ کی موت کی خبر سن کر خوشی اور فتح کا واویلا بپا کرنے لگے۔

"دیکھ لیا تم نے!" ——— حسن بن صباح نے کہا ——— "میں نے کچھ عرصہ پہلے تم لوگوں کو ایک اصول بتایا تھا کہ کسی خاندان کو تباہ کرنا ہو تو ضروری نہیں کہ اُس کے ہر فرد کو قتل کر دیا جائے بلکہ اتنا ہی کیا جائے کہ اس خاندان کے سربراہ کا دماغ خراب کر دو۔ اسے عیش و عشرت میں ڈال دو اور اسے یہ یقین دلا دو کہ تم آدمی دنیا کے بادشاہ ہو اور تم

جیسا کوئی نہیں۔ اس پر کوئی نشہ طاری کر دو۔ ایک خوبصورت اور چالاک عورت سے بڑھ کر کوئی ایسا نشہ نہیں جو کسی زاہد اور پارسا کی توبہ اور قسمیں نہ توڑ سکے۔ کسی خاندان کو تباہ کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس خاندان پر ایک شیطان عورت آسیب کی طرح غالب کر دو۔ تم نے ایسے خاندان دیکھے ہوں گے جو عورت اور دولت پر تباہ ہوئے ہیں"۔

"یا امام!" ـــ ایک مصاحب نے کہا ـــ "ہم نے دیکھ لیا ہے"۔

"کسی سلطنت کو تباہ کرنا ہو تو" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "اُس کے حکمران کو عظمت کے راستے سے ہٹا دو اور اُس کے دل سے رعایا کی محبت نکال دو پھر بھی کام نہ بنے تو اسے قتل کر دو"۔

"یا امام!" ـــ ایک مصاحب نے پوچھا ـــ "یہ کام تو ہو گیا۔ اب بتائیں کہ اس سے آگے کیا کرنا ہو گا"۔

"یہ کام وہ لڑکی کرے گی" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ لڑکی بڑی تیز ہے اور اپنا کام کرنے کے لئے ہر ڈھنگ کھیل سکتی ہے۔ اس لڑکی کا انتخاب میں نے خود کیا تھا۔ اب یہ کرنا ہے کہ کوئی ایسا عقل مند آدمی مرؔو جائے جو روزینہ کے ساتھ رابطہ رکھے..... مجھے کون بتا سکتا ہے کہ یہ لڑکی قابلِ اعتماد ہے اور جو کام اس کے سپرد کیا گیا ہے وہ کرلے گی"۔

"میں بتا سکتا ہوں یا امام!" ـــ ایک آدمی بولا ـــ "اس کی تربیت میری نگرانی میں ہوئی ہے۔ مرؔو میں اس کے ساتھ ایک تجربہ کار آدمی اور دو بڑی خرانٹ عورتیں موجود ہیں"۔

"تم جانتے ہو ہم نے مرؔو میں کیا کرنا ہے" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "ہمارے اس فدائی نے وہاں زمین ہموار کر دی ہے۔ اس نے سلطنتِ سلجوقیہ کا سر کاٹ دیا ہے۔ اب اس کا باقی جسم دو حصوں میں کاٹنا ہے"۔

"ہاں امام!" ـــ ایک آدمی نے کہا ـــ "سلطنتِ سلجوقیہ کے دارالسلطنت میں خانہ جنگی کرانی ہے۔ یہ کام روزینہ کرا لے گی"۔

"ملک شاہ کا بڑا بیٹا برکیارق جوان آدمی ہے" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی میں اس کی فطرت اور خصلت کے متعلق تمام معلومات حاصل

کر چکا ہوں۔ وہ تو یوں سمجھو جیسے موم ہے۔ اگر روزینہ ثابت قدم رہی تو وہ اس موم کو پگھلا کر اپنے سانچے میں ڈھال لے گی۔ روزینہ بہت ہی حسین لڑکی ہے۔ میں اسے ذاتی طور پر جانتا ہوں"۔

"یا امام!" ـــ اُس کے ایک مصاحب نے کہا ـــ "آپ یہ بات کیوں دُہراتے ہیں ایک بار آپ نے ہم سب کو بتا دیا ہے کہ ملک شاہ کے قتل کے بعد کیا کرنا ہے۔ یہ ہم پر چھوڑیں کہ آپ کے حکم کی تعمیل ہوتی ہے یا نہیں"۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "کہ میرے حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو ان سب کا کیا انجام ہو گا جنہیں یہ حکم دیا گیا تھا"۔

○

یہ داستان اُس دَور میں داخل ہو گئی تھی جو بلاشک و شبہ حسن بن صباح کا دَور تھا۔ ابلیسیت نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اس سے مرؔو اور رے جیسے شہر بھی محفوظ نہیں رہے تھے۔

داستان گو پہلے سنا چکا ہے کہ حسن بن صباح نے ایک جنت بنائی تھی۔ اس جنت میں جو داخل ہوتا تھا وہ وہاں سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے کچھ عرصے کے لئے وہاں سے نکال لیا جاتا تو وہ واپس اسی جنت میں جانے کو تڑپتا تھا۔ اسے کہا جاتا کہ وہ فلاں فلاں بڑی شخصیت کو قتل کر آئے تو وہ ہمیشہ اسی جنت میں رہے گا۔ اس طرح وہ آدمی جا کر دو تین بتائے ہوئے آدمیوں کو قتل کر دیتا اور بعد میں اسے بھی قتل کر دیا جاتا تھا۔ اس جنت کی حقیقت اس سے کچھ مختلف تھی جو تاریخ نے بیان کی ہے۔

بیشتر مؤرخوں نے حسن بن صباح کی جنت کو جس طرح بیان کیا ہے اس کی تفصیل "آئینہ تلبیس" میں ان الفاظ میں ملتی ہے: "حسن بن صباح نے جانبازوں کی ایک جماعت تیار کی اور اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے ان کی لوحِ دل پر یہ بات ثبت کرا دی کہ شیخ الجبل یعنی حسن بن صباح تمام دنیا کا مالک اور اس دنیا میں بڑا قادر ہے۔ اس تعلیم و تلقین کے علاوہ اس نے ایک ایسی تدبیر کی جس کی وجہ سے اس جماعت کو جاں سپاری پر آمادہ کرنا بالکل چٹکی بجانے کا کام تھا.....

"اس نے قلعہ الموت کے ارد گرد نظر فریب مرغزاروں اور جاں بخش نزہت گاہوں میں نہایت خوبصورت محل، بُرج اور کوشکیں تعمیر کروائیں۔ عالیشان محلات کی

دلآویزی اور خوشنمائی' باغوں اور مرغزاروں کی نزہت اور تروتازگی دیکھنے والے کے دل پر جادو کا اثر کرتی تھی۔ ان کے بیچوں بیچ جنّت کے نام سے ایک نہایت خوش نما باغ بنوایا جس میں وہ تمام سامان مہیا کئے جو انسان کے لئے موجب تفریح ہو سکتے ہیں' مثلاً اشیائے تعیش' ہر قسم کے میوہ دار درخت' پھول' چینی کے خوبصورت ظروف' بلوری طلائی اور نقرئی سامان' بیش قیمت فرش' یونان کے اسبابِ تعیشات' پُرتکلف سامان خورد و نوش' نغمہ و سرور' جنّت کی دیواروں پر نقش و نگار کا نہایت نازک کام بنوایا.....

"نلوں کے ذریعے سے محلات میں پانی' دودھ' شراب اور شہد جاتا تھا۔ ان سب لذائذ کے علاوہ دل بہلانے کے لئے پری تمثال کمسن نازنینیں موجود تھیں۔ ان ماہوشوں اچھوتیوں کی سادگی وضع اور ان کے حسن و جمال کی دلربائی وہاں دیکھنے والوں کو یہ یقین دلاتی تھی کہ یہ عالم سفلی کے سوا کسی اور ہی عالم کی پیکر ہیں۔ کوشش کی گئی تھی کہ اس جنت میں داخلے کے بعد زائر کے دل پر فرحت کا ایسا شیریں اثر پیدا کیا جائے کہ وہ اس فرحت اور مسرت کو دنیاوی نہیں بلکہ اخروی یقین کرے.....

"یہاں کے حور و غلمان کا تمام کاروبار بالکل رازداری سے انجام پاتا تھا۔ جو چیز جس کی باہر سے مہیا کرنے کی ضرورت ہوتی تھی' اس حسنِ اسلوب سے فراہم کی جاتی تھی کہ کسی کو کبھی سراغ نہ لگ سکتا تھا.....

"حسن بن صباح علاقہ طالقان اور رودبار وغیرہ کے خوبصورت' تندرست اور قوی ہیکل نوجوان جو سادہ لوح ہوتے اور ان میں ہر بیان باور کرنے اور ایمان لانے کی صلاحیت نظر آتی' فدائین کی جماعت میں بھرتی کر لیتا۔ یہ وہ لوگ تھے جو حسن بن صباح کے ہر ایک حکم کی بلاعذر آنکھیں بند کر کے تعمیل کرتے تھے.....

"بھنگ جسے عربی میں حشیش کہتے ہیں' شاید ان ایام میں ایک غیر معلوم اور غیر معمولی چیز تھی اور غالباً" حسن بن صباح ہی پہلا شخص ہے جس نے اپنی دانشمندی سے وہ کام لیا جو اس سے پہلے شاید کسی نے نہ لیا ہو گا۔ جب فدائی امیدواری کا دور ختم کر لیتا تو حسن بن صباح اسے بھنگ کے اثر سے بے ہوش کر کے جنت میں بھجوا دیتا جہاں وہ جاں پرور حوروں کی گود میں آنکھ کھولتا اور اپنے آپ کو ایسے عالم میں پاتا جہاں کی خوشیاں اور مسرتیں شاید بڑے بڑے شاہانِ عالم کو بھی نصیب نہیں تھیں.....

"یہاں وہ انواع و اقسام کی نزہت گاہوں کی سیر کرتا' حوروں کے حسن سے

آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا' ان کی صحبت اس کی جاں ستانی کرتی اور ان مہوشوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر مئے ارغوانی کے جام اڑاتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ غذائیں اور بہترین قسم کے میوے کھاتا اور ہر طرح کے تعیشات میں محو رہتا۔ ہفتہ عشرہ کے بعد جب ان محبت شعار حوروں کی محبت کا نقش اس کے دل پر اتنا گہرا پڑ جاتا کہ پھر مدت العمر مٹ نہ سکے' تب وہی حوریں بھنگ کا ایک جام پلا کر اسے شیخ الجبل یعنی حسن بن صباح کے پاس بھجوا دیتیں۔ جہاں آنکھ کھول کر وہ اپنے تئیں شیخ کے قدموں میں پاتا اور جنت کے چند روزہ قیام کی خوشگوار یاد اس کو سخت بے چین کر دیتی.....

"حسن بن صباح اس کو جنّت میں بھیجے جانے کی پھر امید دلاتا اور کہتا کہ جنّت کے دائمی قیام کی لازمی شرط جاں ستانی اور جاں سپاری ہے۔ وہ شخص جس کے دل پر گزشتہ لذات اور عیش و عشرت کا اثر اتنا مضبوط پڑ چکا تھا اور حوروں کی ہم نشینی کی تصویر ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتی رہتی تھی' وہ حسن بن صباح کے احکام کی تعمیل میں کس طرح کوتاہی کر سکتا تھا!.....

"چنانچہ جب حسن بن صباح کو کسی دشمن کا قتل کرانا منظور ہوتا تھا تو ایک فدائی نوجوان کو حکم دیتا کہ جا فلاں شخص کو قتل کر کے قتل ہو جا' مرنے کے بعد فرشتے تجھے جنت میں پہنچا دیں گے.....

"یہ فدائی اپنے حوصلے سے بڑھ کر مستعدی دکھاتا تاکہ کس طرح جلد جنت میں پہنچ کر وہاں مسرتوں سے ہمکنار ہو۔ یہی وہ خطرناک لوگ تھے جن سے خون آشامی کا کام لیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کو جس کے قتل کا بھی اشارہ دیا جاتا وہ وہاں کوئی روپ بھر کر جاتے' رسائی اور آشنائی پیدا کرتے' اس کے معتمد بنتے اور موقع پاتے ہی اس کا کام تمام کر دیتے تھے"۔

تاریخ کی یہ تحریری شہادت مصدقہ تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ اُس دور میں محلات کی تعمیر چند دنوں یا چند مہینوں میں ناممکن تھی۔ جس قسم کے محلات مؤرخوں نے بیان کئے ہیں ان کی تعمیر کیلئے پچیس تیس سال درکار تھے۔ پھر پھل دار درختوں کا جو ذکر آتا ہے' وہ اس لئے مشکوک ہے کہ درخت اتنی جلدی تناور نہیں ہو سکتا کہ وہ پھل اور میوہ جات دینے لگتا۔ مؤرخوں اور ان کے بعد آنے والے تاریخ نویسوں نے ایک دوسرے کی تحریروں میں زیب داستان اور مبالغہ آرائی کے ذریعے اضافے کئے اور ہمارے سامنے

اس جنّت کا نقشہ آگیا جو اللہ کی بنائی ہوئی جنّت سے بھی زیادہ خوشنما اور دل فریب لگتا ہے۔ دودھ شہد اور شراب کے نلکوں کو تو شاید تصوّر میں لایا جا سکے اور لایا بھی جا رہا ہے لیکن ان کا وجود بھی مشکوک ہے۔

پھر یہ سب کیا تھا؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ حسن بن صباح نے جنت بنائی تھی۔ اس کے قاتل فدائین نے اسی جنت میں جنم لیا تھا۔ ان قاتلوں کی اگلی نسلیں حسن بن صباح کی موت کے بعد بھی قاتل ہی کہلاتی رہیں اور ان نسلوں نے کرائے کے قتل کی وارداتوں میں نام حاصل کیا تھا۔

داستان گو قبل از مسیح کے دور میں کچھ دیر کیلئے جاتا ہے۔ ایسی ایک جنت کا ذکر یونان کی دیو مالائی داستانوں میں ملتا ہے۔ یہ اُس دور کی بات ہے جب یونان والوں نے پوجا کرنے کیلئے کئی دیوتا اور دیویاں تخلیق کر لی تھیں۔ یہ معبود آسمانوں پر بھی رہتے تھے اور زمین پر بھی۔ ایک داستان میں اس جنت کا ذکر ملتا ہے جس کی خوشنمائی اور دلکشی کی تفصیلات پڑھو یا سنو تو حسن بن صباح کی جنت سامنے آ جاتی ہے لیکن وہ یونانی داستان لکھنے والے تھے جنہوں نے اس جنت کی حقیقت بھی بیان کر دی تھی۔ اس جنت کا تجزیہ آج کے سائنسی دور میں جب دیگر علوم بھی نقطہ عروج پر ہیں، کرو تو یقین آ جاتا ہے کے وہ جنت ہی تھی لیکن اس کی حقیقت کیا تھی؟

حقیقت یہ تھی کہ یونان میں ایک پہاڑ تھا۔ اس پہاڑ میں ایک غار تھا جو دور اندر تک چلا گیا تھا لیکن سیدھا نہیں بلکہ بھول بھلیوں کی صورت میں۔ اُس وقت کے بادشاہ نے اس غار کے اندر کوئی ایسی جڑی بوٹیاں رکھ دی تھیں جن کی بُو اس سارے غار میں پھیل گئی تھی۔ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد یہ جڑی بوٹی ترو تازہ پھر وہاں بکھیر آتے تھے۔

بادشاہ اپنے کسی مخالف کو یا کسی اور وجہ سے کسی آدمی کو کوئی لالچ دے کر اس غار میں بھیج دیتا تھا۔ وہ شخص اس غار میں دور اندر تک جاتا تو اسے اندر حوریں نظر آنے لگتی تھیں اور اسے یوں نظر آتا جیسے وہ اس کے استقبال کیلئے بے تاب ہوں وہ ان حوروں کے ساتھ عیش و عشرت کرتا اور پھر اسے یہ حوریں ایسے ایسے کھانے پیش کرتیں جو زمین پر رہنے والے انسانوں نے کبھی دیکھے اور کبھی سنے نہیں تھے۔ یہ تجربہ بھی کیا گیا کہ اندر

جانے والے اور کچھ دن اندر رہنے والے شخص کو باہر لائے تو وہ مرنے مارنے پر اُتر آیا اور دوڑ کر پھر غار میں چلا گیا۔ وہ اس جنت میں سے کسی قیمت پر نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ پھر اندر چلا جاتا اور چند دنوں میں ہی مر جاتا اور تھوڑے عرصے بعد اس کی ہڈیاں رہ جاتیں۔

حقیقت یہ تھی کہ اس غار کے اندر چھوٹی چھوٹی چٹانیں ستونوں کی طرح ابھری ہوئی تھیں اِن چٹانوں کو وہ حور و غلمان سمجھ لیتا تھا اور یہ چٹانیں اسے حور و غلمان ہی کی شکل میں نظر آتی تھیں۔ وہ جو مرغن اور عجیب و غریب کھانے کھاتا تھا وہ کنکریاں اور مٹی ہوتی تھی۔

یہ اس بُو کا اثر تھا جو جڑی بوٹیوں سے اٹھتی اور غار کی اندرونی فضا میں پھیلی رہتی تھی۔ اس بُو میں نشے کا ایسا اثر تھا جو ذہن کو انتہائی خوبصورت اور دل فریب تصور دیتا تھا۔ یہ دیو مالائی داستان بہت ہی طویل ہے جس میں تخیلاتی اور ان ہونے واقعات بھی شامل کئے گئے ہیں لیکن داستان لکھنے والے نے دانشمندی کا یہ ثبوت دیا ہے کہ اس جنت کی اصل حقیقت پوری طرح بیان کر دی ہے۔

داستان گو ضروری سمجھتا ہے کہ یونان کی اس دیو مالائی داستان کا ایک باب مختصراً بیان کر دے۔ اس میں وہ عقل و دانش کا راز نظر آتا ہے جو ہر انسان کے لئے سمجھنا ضروری ہے۔ یہ داستان لکھنے والا لکھتا ہے کہ ایک شہزادے کے دل میں یہ خواہش ابھری کے وہ اس غار میں جائے اور اس جنت میں دو تین دن گزار کر واپس آ جائے۔ اس نے اپنے بوڑھے اتالیق سے اپنی اس خواہش کا ذکر کیا تو بزرگ اتالیق نے اسے سمجھایا کے اس جنت کی حقیقت کیا ہے۔ شہزادہ چونکہ شہزادہ تھا اس لیے وہ اپنی ضد پر قائم رہا اور اس نے اتالیق کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ اس غار تک چلے۔

اتالیق نے دھاگے کا ایک گولا اٹھایا اور شہزادے کو ساتھ لے کر اس پُراسرار غار تک چلا گیا اس نے دھاگے کا ایک سرا شہزادے کی ایک کلائی سے باندھ کر کہا کہ تم غار کے اندر چلے جاؤ۔ اندر بھول بھلیاں ہیں جن میں تم گم ہو جاؤ گے۔ ان میں سے تم نکل نہیں سکو گے۔ تمہیں یاد ہی نہیں رہے گا کہ تم کس راستے سے اندر آئے تھے۔ یہ دھاگہ ٹوٹنے نہ دینا۔ میں باہر بیٹھ جاؤں گا اور دھاگہ کھولتا جاؤں گا۔ جہاں تمہیں حوریں اور ایسی ہی چیزیں نظر آنے لگیں وہیں سے اس دھاگے کو پکڑ کر واپس آ جانا۔ یہ دھاگہ تمہاری راہنمائی کرے گا۔

شہزادہ غار میں داخل ہو گیا اور بزرگ اتالیق دھاگہ ڈھیلا کرتا گیا کرتا گیا حتیٰ کہ بڑا ہی لمبا دھاگہ شہزادے کے ساتھ غار کے اندر چلا گیا۔ دن گزر گیا مگر شہزادہ باہر نہ آیا۔ یہاں کئی اور واقعات بیان کئے گئے ہیں لیکن داستان گو اس کا صرف ایک حصہ پیش کرتا ہے۔

بزرگ اتالیق نے جب دیکھا کہ شہزادہ ابھی تک باہر نہیں آیا وہ دھاگے کا باقی گولا باہر رکھ کر دھاگے کو پکڑ پکڑ کر غار کی بھول بھلیوں میں جاتے شہزادے تک پہنچ گیا۔ خود اس معمر اور دانشمند اتالیق کو حسین و جمیل چیزیں نظر آنے لگیں مگر اس نے اپنی ناک پر کپڑا باندھ لیا اور شہزادے تک جا پہنچا۔ شہزادہ مٹی کھا رہا تھا اور قہقہے لگا رہا تھا اور بازو پھیلا کر یوں اپنے سینے پر سمیٹ لیتا تھا جیسے اس نے اپنے بازوؤں میں کوئی چیز دبوچ لی ہو۔ اتالیق شہزادے کو گھسیٹ کر باہر لایا۔ اگر دھاگہ ٹوٹ جاتا تو دونوں باہر نہ نکل سکتے۔

باہر آکر شہزادہ اپنے اتالیق سے الجھ پڑا اور پھر غار کی طرف دوڑا۔ اتالیق نے اسے پکڑ لیا لیکن اتالیق بوڑھا اور شہزادہ نوجوان تھا۔ شہزادے کو بے بس کرنے کیلئے اس کے سر کے پچھلے حصے پر پتھر کی ضرب لگائی۔ شہزادہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ شہزادہ جب ہوش میں آیا تو اُس نے اٹھ کر فوراً" اِدھر اُدھر دیکھا لیکن اسے غار کا دہانہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اتالیق سے پوچھا۔ اتالیق نے اسے اپنے پاس بیٹھا لیا اور کہا کہ اپنے منہ میں انگلیاں ڈالو اور انگلیاں دیکھو۔ شہزادے نے اپنے منہ میں ایک انگلی پھیری تو اسے کچھ مٹی نظر آئی جو اس کی انگلی کے ساتھ لگ گئی تھی۔ اس وقت اس نے محسوس کیا کہ اس کے دانتوں کے درمیان ریت اور مٹی موجود ہے۔ اس نے تھوکا تو تھوک مٹیالے رنگ کا تھا۔ شہزادے نے اپنے دانشمند اتالیق کی طرف حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھا۔

"میرے عزیز شہزادے!" ـــ اتالیق نے کہا ـــ "میں آج تمہیں ایک ایسا سبق دوں گا جو مرتے دم تک تمہیں فریب کاروں اور بے وفا لوگوں کے دھوکوں سے بچائے رکھے گا۔ اس غار کے اندر کوئی جنت نہیں نہ کوئی حور ہے اور نہ حوروں جیسے لڑکے اور نہ ہی وہاں آسمان سے اترے ہوئے کھانے ہیں اور نہ ہی وہاں کوئی ایسی شراب ہے جسے تم سمجھتے ہو زمین پر نہیں ملتی۔ یہ جنت ہر انسان کے اپنے ذہن میں موجود ہے۔ ہر انسان

زندگی کے حقائق سے بھاگ کر اپنے ذہن کی جنت میں چلا جانا چاہتا ہے لیکن اس کے ہوش و حواس اس حد تک بیدار رہتے ہیں کہ وہ تصور کو تصور ہی سمجھتے ہیں۔ اس غار میں ایک خاص بوٹی کی بُو چھوڑی گئی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کے ذہن سے یہ حقیقی زندگی نکل جاتی ہے اور جو حسین تصور انسانی ذہن نے تخلیق کئے ہوتے ہیں وہ حقیقت بن کر سامنے آ جاتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ انسان کی بیداری والی حس سو جاتی ہے اور تصورات بیدار ہو جاتے ہیں.....

"تمہارے پھیپھڑوں میں یہ بُو گئی اور تمہارے دماغ پر قابض ہو گئی پھر تم حقیقت سے کٹ گئے اور تمہارے ذہن نے جو خوبصورت تصورات تخلیق کر رکھے تھے وہ باہر تمہارے سامنے حوروں اور جنت نظیر ماحول کی صورت میں سامنے آ گئے۔ انسان بڑی کمزور چیز ہے۔ انسان ذہن کا غلام ہوتا ہے۔ تخریبی قوتوں کا حملہ ذہن پر ہوتا ہے۔ ان ہی تخریبی اور سفلی قوتوں کو شیطان کہا گیا ہے..... میں نے تمہاری کلائی کے ساتھ دھاگہ باندھ دیا تھا اور اس کا دوسرا سرا میں نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ غور کرو شہزادے! میں حقیقی زندگی میں بیٹھا ہُوا تھا اور تم تصورات میں گم ہو گئے تھے لیکن یہ دھاگہ حقیقت اور تصور کے درمیان ایک رشتہ تھا۔ یہ دھاگہ ٹوٹ جاتا تو تم ہمیشہ کیلئے حقیقی زندگی سے کٹ جاتے۔ یاد رکھو حسین تصورات اور حقیقی زندگی کے درمیان صرف ایک کچا دھاگہ حائل ہے۔ جس نے اس دھاگے کو توڑ ڈالا وہ اپنی موت خود مرا اور جس نے اس دھاگے کو ٹوٹنے نہ دیا وہ بھٹک بھٹک کر بھی تو واپس حقیقت میں آ ہی گیا.....

"یہ ایک نشہ ہے جو کسی جابر بادشاہ پر بھی طاری ہو جائے تو وہ حسین تصوروں میں جا پڑتا ہے اور تھوڑے ہی عرصے بعد گم ہو جاتا ہے۔ بادشاہ اپنے دشمن کو قتل کروا دیتے ہیں۔ دشمن کو مارنے کا بہترین اور بڑا ہی حسین طریقہ یہ ہے جو ہمارے بادشاہ نے اختیار کیا ہے۔ دشمن کو کسی نشے میں مبتلا کر کے اس میں یہ غلط احساس پیدا کر دو کہ تم تو ساری دنیا کے بادشاہ ہو اور اتنے خُوب رُو ہو کہ کسی بھی دیس کی شہزادیاں تم پر مرمٹیں گی۔ اس کی زندہ مثال تم اس غار کے اندر دیکھ آئے ہو۔ تمہارے لئے سبق یہ ہے کہ اپنے ذہن کو اپنے قابو میں رکھو' اپنے ہوش و حواس کو اپنے ذہن کے حوالے کبھی نہ کرو اور بچو اس نشے سے جو نیک و بد کا احساس ہی مٹا دے لیکن انسان کی فطرت اتنی کمزور ہے کہ وہ لذت اور حشیش کو فوراً" قبول کر لیتی ہے اور انسان کا حلیہ ہی بگاڑ دیتی اور اسے تباہی کی

گہری کھائی میں پھینک دیتی ہے۔"

○

آج کی سائنس نے قدیم زمانے کے اسرار کو بے نقاب کر دیا ہے۔ کوئی انسان غصے سے باؤلا ہو جائے' درندہ بن جائے اور مرنے مارنے پر اتر آئے تو چھوٹی سے ایک گولی یا ذرا سا ایک انجکشن اسکے ذہن کو سُلا دیتا ہے اور وہ کمزور سا ایک انسان بن جاتا ہے۔ اب تو ایسے ملزموں کو جو اپنے جرم کا اقبال نہیں کرتے' دھوکے میں کھانے یا پینے کی اشیاء میں ذرا سی دوائی ملا کر دی جاتی ہے اور پھر اس کے ساتھ ایسی باتیں کی جاتی ہیں جیسے وہ بہت بڑی شخصیت ہو اور حسین ترین لڑکیاں اس پر جان نثار کرتی ہوں' اور اسے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ وہ اس قدر بہادر' دلیر اور دانشمند ہے کہ اس نے وہ جرم کیا ہے جو اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اس طرح دو چار مرتبہ اسے یہ دوائی کھانے پینے میں دی جاتی ہے اور وہ بڑے فخر سے اپنے جرم کا اقبال ہی نہیں کرتا بلکہ ہر ایک تفصیل سنا دیتا ہے اور اپنے ساتھیوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

حسن بن صباح کی جنت کا زیادہ تر تعلق انسانی ذہن ہی سے تھا۔ تاریخوں میں جو تفصیلات آئی ہیں' ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اختلاف ہے بھی لیکن یہ ایک مصدّقہ امر ہے کہ حسن بن صباح اپنے فدائین کو حشیش پلاتا تھا۔ حشیش کے جو اثرات ذہن پر مرتب ہوتے ہیں وہ اُن تمام نشی اشیاء کے اثرات سے مختلف ہیں جو انسان استعمال کرتے ہیں۔

حشیش پی کر انسان نے اگر ہنسنا شروع کیا تو وہ نشہ اترنے تک ہنستا ہی چلا جائے گا اور اگر وہ رونے پر آیا تو گھنٹوں روتا ہی رہے گا۔ کسی انسان کو آہستہ آہستہ حشیش پلاتے رہیں اور ساتھ ساتھ کوئی بڑا ہی حسین منظر الفاظ میں بیان کرتے رہیں تو وہ شخص ایسے ہی منظر میں چلا جائے گا خواہ اس منظر کی کوئی حقیقت ہی نہ ہو۔

تاریخ میں یہ بالکل صحیح لکھا گیا ہے کہ جس دانشمندی سے حسن بن صباح نے حشیش کو استعمال کیا ہے اس طرح اُس وقت تک اور کوئی نہیں کر سکا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسن بن صباح غیر معمولی طور پر دانشمند آدمی تھا۔

یونان کی دیو مالائی داستان کی جنت اور حسن بن صباح کی جنت میں فرق یہ تھا کہ اس یونانی داستان میں ایک غار تھا جس میں چھوٹی چھوٹی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں اور وہاں

کنکریاں اور مٹی تھی لیکن حسن بن صباح نے جس علاقے میں جنت بنائی تھی' وہ بڑا ہی حسین اور روح افزا جنگل تھا۔ اس جنگل میں پھل دار درخت بھی تھے اور پھول دار خودرَو پودے بھی تھے۔ ایسے اور بھی بہت سے پودے وہاں اگائے گئے تھے اور اس خطے کو کانٹ چھانٹ کر مزید خوبصورت بنا دیا گیا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ قلعہ اَلمُوت بلندی پر تھا اور اس کا اپنا ایک حسُن تھا۔ یہ قلعہ بنانے والوں نے اس کی خوبصورتی کا خاص طور پر خیال رکھا تھا۔

حسن بن صباح کے ہاں نوجوان اور بڑی ہی حسین لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ اس کا ایک گروہ دن رات قافلے لوٹنے میں لگا رہتا تھا۔ یہ گروہ قافلوں سے سونے چاندی کے علاوہ نقد رقمیں لُوٹ لیتا تھا اور اس کے ساتھ ہی کمسن بچیوں کو بھی اٹھا لاتا تھا۔ ان بچیوں کو خاص طور پر ٹریننگ دی جاتی تھی لیکن ان پر ذرا سا بھی ظلم اور تشدد نہیں کیا جاتا تھا۔ انہیں بڑی خوبصورت زندگی مہیا کی جاتی تھی اور اس کے ساتھ انہیں مردوں کے دلوں پر قبضہ کرنے کی خصوصی تربیت دی جاتی تھی۔ ان لڑکیوں کے ہاتھوں فدائین کو تیار کرنے کے لئے حشیش پلائی جاتی تھی۔ حشیش پلا کر یہ لڑکیاں ان کے ساتھ ایسی باتیں کرتی تھیں جن سے انہیں یہ تاثر ملتا تھا کہ وہ اتنے بہادر ہیں کہ جسے چاہے قتل کر دیں اور چاہیں تو ساری دنیا کو فتح کر لیں۔

مختصر یہ کہ حسین اور نوجوان لڑکیوں اور حشیش کے ذریعے ان آدمیوں کے ذہنوں پر قبضہ کر لیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ وہاں کا قدرتی ماحول اپنا ایک اثر رکھتا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس شخص کو اس ماحول' ان لڑکیوں اور حشیش سے محروم کر کے قلعے کے تہہ خانے میں پہنچا دیا جاتا تھا وہ شخص تڑپتا اور کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ اس کیفیت میں اسے حسن بن صباح کے سامنے لے جایا جاتا اور تاثر یہ دیا جاتا کہ حسن بن صباح ساری دنیا کا بادشاہ ہے اور وہ جسے چاہے جنت عطا کر دیتا ہے اور جسے چاہے جہنم میں پھینک دیتا ہے۔

اس شخص کی اس ذہنی اور جذباتی حالت میں حسن بن صباح اپنا جادو چلاتا تھا۔ وہ اسے قتل کرنے اور قتل ہو جانے پر آمادہ کر لیتا تھا۔ بات وہیں پر آتی ہے کہ یہ ان انسانوں کے ذہن تھے جن پر حسن بن صباح قابض ہو جاتا اور انہیں اُس مقام تک لے جاتا تھا جہاں وہ لوگ اس کے اشارے پر جانیں قربان کر دیتے تھے۔

انسان کی سب سے بڑی کمزوری تعیش پرستی ہے۔ اللہ کے بندوں کی یہی وہ دُکھتی

رنگ ہے جسے ابلیس اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اسی لئے حسن بن صباح کی جنت کو فردوسِ ابلیس کہا گیا ہے۔

پھر حقائق سے فرار انسان کی دوسری بڑی کمزوری ہے۔ کوئی انسان جب عورت کو فرار کا ذریعہ بناتا ہے تو اس کے ذہن میں فردوسِ ابلیس وجود میں آجاتی ہے پھر اس انسان کو دنیا کی کوئی طاقت تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ ایسا انسان اللہ کے اس فرمان کو بھی نظرانداز کر دیتا ہے جس میں اللہ نے انسان کو یہ وارننگ دی ہے کہ تم پر جو بھی مصیبت نازل ہوتی ہے وہ تمہارے اپنے ہی اعمالِ بد کا نتیجہ ہوتی ہے۔

○

حسن بن صباح کا باطنی عقیدہ بڑی تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا اور بے شمار علاقہ اس کی زد میں آچکا تھا۔ اس عقیدے نے تیزی سے ہی پھیلنا تھا۔ انسان فطری طور پر خود سر اور سرکش واقع ہُوا ہے۔ یہ بھی ایک فطری کمزوری ہے۔ اگر کوئی مخلص قائد مل جائے اور وہ کچھ انسانوں کی خودسری اور سرکشی کو منظم طریقے سے کسی نصب العین کے لئے استعمال کرے تو یہ ایک قوت بن جاتی ہے لیکن انہی خودسری اور سرکشی کو انسان جب اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے استعمال کرتا ہے تو یہ اوصاف اس کی تباہی کا باعث بن جاتے ہیں۔ انسان پابندیاں قبول نہیں کیا کرتا۔ حسن بن صباح نے لوگوں کو جو عقیدہ دیا تھا اس کا نام اسلام ہی رہنے دیا تھا لیکن اس میں ترمیم یہ کی تھی کہ انسان کے باطن میں جو کچھ ہے وہی مذہب ہے۔ اس نے شریعت کو اسلام میں سے نکال دیا تھا۔

وہ پسماندگی کا دور تھا۔ تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان علاقوں کے لوگ مسلمان تھے۔ حسن بن صباح نے ان کو مسلمان ہی رہنے دیا اور کمال یہ کر دکھایا کہ انہیں تمام مذہبی اور اخلاقی پابندیوں سے آزاد کر دیا۔

اس کا باطنی عقیدہ تیزی سے پھیل رہا تھا پھر بھی سلطان ملک شاہ اس کے راستے میں ایک رکاوٹ بنا ہُوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ سلطان اس کے خلاف بہت بڑی فوج تیار کر رہا ہے۔ حسن بن صباح نے اپنے ایک فدائی کے ہاتھوں سلطان ملک شاہ کا پتّہ ہی کاٹ دیا تو یہ رکاوٹ راستے سے ہٹ گئی۔ اسے برکیارق کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے مصاحبوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ جوان آدمی ہے جس کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔ اُسے ذہنی طور پر بیکار کرنے کے لئے روزینہ کو بھیج دیا تھا جس کے حُسن

و جمال اور انداز میں طلسماتی اثرات چھپے ہوئے تھے۔

اس علاقے میں ابھی کچھ اور قلعے ایسے تھے جو حسن بن صباح کے قبضے میں نہیں آئے تھے۔ وہ اس خیال سے ان قلعوں کی طرف نہیں بڑھتا تھا کہ سلطان ملک شاہ فوج لے کر آجائے گا۔

ان قلعوں میں ایک اہم قلعہ قلعہ ملاذ خان تھا جو فارس اور خوزستان کے درمیان واقع تھا۔ کسی وقت یہ قلعہ ڈاکوؤں اور راہزنوں کے قبضے میں تھا۔ وہ قافلوں کو لوٹتے اور مال اس قلعے میں لا کر جمع کر دیتے تھے۔ قافلوں میں سے انہیں کمسن بچیاں اور نوجوان لڑکیاں ملتی تھیں تو انہیں بھی اس قلعے میں لے آتے تھے۔

ان ڈاکوؤں کے ڈر سے قافلوں کی آمد و رفت بند ہو گئی اور اس کا اثر تجارت پر بھی پڑا۔ لوگ سلطان ملک شاہ کے ہاں گئے اور فریاد کی کہ ان کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ ان دنوں سلطان ملک شاہ جوان تھا اور نیا نیا سلطان بنا تھا۔ اس نے اپنے ایک سالار کو حکم دیا کہ وہ اس قلعے پر قبضہ کرے اور ان ڈاکوؤں کا قلع قمع کر دے۔ اس سالار کا نام عضدالدولہ بن بویا تھا۔ سلجوقیوں کی تاریخ کا یہ ایک نامور سالار تھا۔ اس نے ایک روز طوفان کی طرح جا کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ ڈاکو آخر ڈاکو تھے' وہ کوئی جنگجو نہیں تھے۔ سالار بویا نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ کمندیں پھینک کر قلعے کی دیواروں پر چڑھیں اور اپنی جانیں قربان کر دیں۔

وہ مجاہدین تھے جنہیں بتایا گیا تھا کہ ان ڈاکوؤں نے کتنے ہی قافلے لُوٹے ہیں اور سینکڑوں کمسن لڑکیوں کو اغوا کیا ہے اور سینکڑوں نہیں ہزاروں گھروں میں صفِ ماتم بچھا دی ہے۔ ان مجاہدین نے جانوں کی بازی لگا دی اور قلعے میں دیواریں پھاند کر داخل ہو گئے۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں طوفان کی طرح قلعے میں داخل ہوئے تھے۔ ان کا جذبہ ایسا تھا کہ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اللہ کے حکم سے اس قلعے پر حملہ آور ہوئے ہوں۔

ایک بھی ڈاکو قلعے میں سے زندہ نہ نکل سکا۔ سب کو کاٹ دیا گیا۔ صرف عورتوں اور بچوں کو زندہ رہنے دیا گیا جنہیں سلطان ملک شاہ کے حکم سے دارالسلطنت میں بھیج دیا گیا تھا اور ان سب کو لوگوں کے گھروں میں آباد کر دیا گیا تھا۔

سلطان ملک شاہ نے یہ قلعہ اپنے ایک رئیس میرانز کو بطور جاگیر دے دیا۔ اس کے

تھوڑا ہی عرصہ بعد حسن بن صباح نے اپنا ایک وفد اس رئیس کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ وہ یہ قلعہ خریدنا چاہتا ہے۔ رئیس قلعہ نے صاف انکار کر دیا اور پیغام کا جواب یہ دیا کہ آئندہ کوئی باطنی اس قلعے میں داخل ہونے کی جرأت نہ کرے۔

قلعے محفوظ ہو گئے اور اس وسیع قلعے میں لوگ آ آ کر آباد ہونے لگے، حتیٰ کہ یہ ایک شہر کی صورت اختیار کر گیا۔ حسن بن صباح کی نظر ہمیشہ اس قلعے پر لگی رہی لیکن اس نے ظاہر یہ کیا کہ اسے اس قلعے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔

سلطان ملک شاہ قتل ہو گیا تو حسن بن صباح نے اپنے خاص مصاحبوں سے کہا کہ اب قلعہ ملاذ خان اپنے قبضے میں آ جانا چاہئے۔

○

رئیس قلعہ بن یویا شام کے وقت اپنے مصاحبوں میں بیٹھا ہوا تھا جب اُسے اطلاع ملی کہ ایک سفید ریش بزرگ اسے ملنے آئے ہیں۔ بن یویا بااخلاق اور صاحب کردار رئیس تھا۔ وہ اس بزرگ کو اندر بلانے کی بجائے خود اس کے استقبال کے لئے چلا گیا۔ اسے بڑے تپاک اور احترام سے ملا اور اندر لے آیا۔

"رئیس قلعہ!" — بزرگ نے بن یویا کے کان میں سرگوشی کی — "میں علیحدگی میں ایک بات کرنا چاہتا ہوں"۔

بن یویا اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔

"رئیسِ قلعہ!" — بزرگ نے بات شروع کی — "میں آپ کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں باطنی ہوں..... آپ نے اس قلعے میں باطنیوں کا داخلہ بند کر رکھا ہے"۔

"پھر آپ اس قلعے میں کس طرح داخل ہوئے؟" — بن یویا نے ذرا تحکمانہ لہجے میں کہا — "کیا دروازے پر آپ سے کسی نے پوچھا نہیں تھا کہ آپ کون ہیں؟"

"پوچھا تھا!" — بزرگ نے جواب دیا — "میں نے جھوٹ بولا تھا کہ میں اہلِ سُنّت ہوں..... اب آپ پوچھیں گے کہ میں نے جھوٹ کیوں بولا؟..... میرا عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، میں تارک الدنیا ہوں اور میرے دل میں بنی نوع انسان کی محبت ہے۔ خداوند تعالیٰ نے مجھے کشف کی طاقت دی ہے۔ میں اس قلعے میں آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا نہ میرا یہاں کوئی کام تھا۔ میں اس قلعے کی دیوار کے ساتھ جاتے ہوئے راستے پر

جا رہا تھا کہ مجھے ایک اشارہ سا ملا اور میں نے گھوڑا روک لیا۔ کوئی طاقت جو کشف کی طاقت ہی ہو سکتی ہے، مجھے قلعے کی دیوار کے قریب لے آئی۔ مجھے صاف اور واضح اشارہ ملا کہ قلعے کے اندر خزانہ دفن ہے۔ میں نے فوراً" تسلیم کر لیا کہ یہاں خزانہ دفن ہونا چاہئے تھا اور یقیناً" ہے کیونکہ یہ قلعہ صدیوں سے ڈاکوؤں کے قبضے میں تھا۔ جہاں ڈاکو ہوتے ہیں وہاں کی زمین میں خزانے کا مدفون ہونا لازمی ہوتا ہے"۔

"کیا آپ مجھے اس خزانے کی خوشخبری سنانے آئے ہیں؟" — بن یویا نے کہا — "اس کے بعد آپ یہ کہیں گے کہ میں آدھا خزانہ آپ کو دینے کا وعدہ کروں تو آپ خزانے کی نشاندہی کریں گے"۔

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں تارک الدنیا ہوں" — بزرگ نے کہا — "میں نے خزانہ حاصل کر کے کیا کرنا ہے۔ میں خزانے کی نشاندہی کر دوں گا لیکن شرط یہ نہیں ہو گی کہ آدھا خزانہ مجھے دیں بلکہ شرط یہ ہو گی کہ اس خزانے میں لوگوں کا لوٹا ہوا مال ہے۔ اس خزانے کے لئے ڈاکوؤں نے نہ جانے کتنے سو یا کتنے ہزار آدمی مار ڈالے ہوں گے۔ یہ خزانہ نہ میرا ہے نہ آپ کا۔ میں اس کی نشاندہی کروں گا لیکن اس شرط پر کہ اس خزانے کا صرف چالیسواں حصہ آپ لیں گے باقی سب غریبوں میں تقسیم کر دیں گے"۔

"ہاں بزرگوارِ محترم!" — بن یویا نے کہا — "میں خزانہ غریبوں میں تقسیم کر دوں گا..... کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ خزانہ کتنا کچھ ہے؟"

"نہیں!" — بزرگ نے جواب دیا — "یہ بتانا مشکل ہے لیکن یہ بتایا جا سکتا ہے کہ خزانہ خاصا زیادہ ہے..... ایک بات اور بھی ہے جو ذرا تحمل سے سنیں۔ آپ ہم باطنیوں کو کافر کہتے ہیں۔ میں کبھی خود بھی شک میں پڑ گیا تھا لیکن جب مجھے کشف ہونے لگا تو یہ خیال آیا کہ میں کافر ہوتا تو اللہ کی ذات مجھے کشف کی طاقت نہ عطا کرتی۔ آج مجھے اس خزانے کا اشارہ ملا تو میں نے پہلے یہ سوچا کہ خزانہ ہے تو پڑا رہے، مجھے اس سے کیا! خیال آ گیا کہ نہیں یہ خزانہ اللہ کے بندوں کے کام آنا چاہئے۔ اس پر مجھے اشارہ ملا کہ یہ غریبوں میں تقسیم ہو۔ میں بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک بار ہمیں موقع دیں کہ ہم آپ کے ساتھ باطنی عقیدے پر بات کر سکیں۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ ہمارے عقیدے میں آ جائیں، البتہ میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آپ ہمیں اپنا دشمن سمجھنا چھوڑ

دیں"۔

"کیا آپ ہم سے مناظرہ کرنا چاہتے ہیں؟" — رئیس قلعہ بن بویا نے پوچھا — "اگر ایسی بات ہے تو مناظرہ آپ کریں گے یا کوئی اور آئے گا؟"

"میں مناظرے کی بات نہیں کر رہا" — بزرگ نے کہا — "مناظرے کا مطلب ہو گا کہ ہم آپ کو جھٹلانے کی کوشش کریں گے..... نہیں رئیس قلعہ!..... میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں نہ میں آپ کی توہین کرنے کا خواہشمند ہوں۔ میں اپنا مطلب پھر واضح کر دیتا ہوں کہ ہمیں بات کرنے کا موقع دیں تاکہ ہم آپ کا دل صاف کر سکیں"۔

"کیا آپ خزانے کی بات ان کے بعد کریں گے؟" — بن بویا نے پوچھا — "یا آپ یہ کوشش کریں گے کہ میں آپ کے عقیدے کو قبول کرلوں؟"

"نہیں رئیس قلعہ!" — بزرگ نے جواب دیا — "خزانے کی بات الگ ہے۔ میں وہ بھی کروں گا۔ میں آپ کے ساتھ ہو کر خزانے کی نشاندہی کروں گا۔ عقیدوں کی میں نے جو بات کی ہے وہ تو میں نے آپ سے اجازت مانگی ہے۔ آپ اس قلعے کے مالک ہیں' اجازت نہ دیں گے تو میں آپ کا کیا بگاڑ لوں گا' میرے دل میں اللہ کے ہر بندے کی محبت ہے"۔

بن بویا ایک تو اس بزرگ کی باتوں سے متاثر ہوا اور خزانے کی موجودگی نے تو اس کا دماغ ہی پھیر دیا۔ خزانہ انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ یہ اس دور کا واقعہ ہے جب مدفون خزانہ کوئی عجوبہ نہیں ہوتا تھا۔ اس دور میں قدیم بادشاہ بھی اپنے خزانے کا کچھ حصہ کسی خفیہ جگہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ چونکہ یہ قلعہ ڈاکوؤں اور راہزنوں کا تھا اس لئے رئیس قلعہ بن بویا نے فوراً تسلیم کر لیا کہ یہاں خزانہ دفن ہے۔ مدفون خزانوں کے متعلق دو روایات مشہور تھیں جو آج بھی سنی سنائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ جہاں خزانہ دفن ہوتا ہے وہاں ایک بڑا ہی زہریلا سانپ ہوتا ہے جو خزانے کے قریب آنے والے کو ڈس لیتا ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ خزانہ زمین کے اندر پسارتا رہتا ہے اور اصل جگہ سے دور پہنچ جاتا ہے۔ ایک عقیدہ ہے کہ خزانے کی سراغرسانی کوئی ایسا شخص کر سکتا ہے جس کے پاس کشف کی طاقت ہوتی ہے۔

"مجھے یہ بتائیں بزرگوارم!" — رئیس قلعہ بن بویا نے پوچھا — "آپ کتنے آدمیوں کو اپنے ساتھ لائیں گے؟"

"رئیس قلعہ!" — بزرگ نے کہا — "میرے ساتھ کوئی عام قسم کے آدمی نہیں ہوں گے۔ وہ چند ایک علماء ہیں اور کچھ ان کے شاگرد ہوں گے۔ ان سب کی دلچسپی صرف مذہبی عقیدوں کے ساتھ ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے ساتھ کم و بیش چالیس علماء اور ان کے شاگردوں کو لے آؤں..... میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ وہ یہاں آکر آپ کے لوگوں میں گھومیں پھریں' سلام و دعا کریں اور اس طرح ہم میں بھائی چارے کی فضا پیدا ہو جائے"۔

"یہ اجازت دے دوں گا" — بن بویا نے کہا — "لیکن میں یہ اجازت نہیں دوں گا کہ آپ کے آدمی یہاں تبلیغ شروع کر دیں"۔

"نہیں کریں گے!" — بزرگ نے کہا — "اگر میرے ساتھ آنے والا کوئی بھی آدمی اپنے عقیدے کی تبلیغ کرتا ہوا پکڑا گیا تو میں آپ سے کہوں گا کہ اسے جو بھی سزا دینا چاہتے ہیں دے دیں"۔

"اور خزانے کی بات اُسی روز ہو گی؟" — بن بویا نے پوچھا۔

"نہیں!" — بزرگ نے کہا — "میں ان لوگوں کے ساتھ واپس چلا جاؤں گا اور دو چار دنوں کے بعد آپ کے پاس واپس آجاؤں گا۔ پھر میں آپ کو ساتھ لے کر خزانے کا سراغ لگاؤں گا اور اپنی موجودگی میں کھدائی کرواؤں گا"۔

رئیس قلعہ بن بویا نے اس بزرگ کے ساتھ ایک دن طے کر لیا کہ وہ اپنے علماء کے ساتھ آجائے۔ اس کے دماغ پر خزانہ سوار ہو گیا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اس لئے بن بویا نے اس بزرگ کو رات بھر کے لئے اپنے ہاں مہمان رکھا اور اگلی صبح رخصت کر دیا۔

اگلی صبح بزرگ کو رخصت کر کے بن بویا نے شہر کی بڑی مسجد کے خطیب کو بلایا اور اسے بتایا کہ فلاں دن باطنیوں کے علماء آئیں گے اور خطیب انہیں جھٹلانے کے لئے تیاری کر لے۔

○

مقررہ روز یہ بزرگ دوپہر کے وقت کم و بیش چالیس آدمیوں کو ساتھ لئے پہنچ گیا۔ تمام آدمیوں نے لمبے چغے پہن رکھے تھے۔ ان کی پگڑیاں عالموں جیسی تھیں۔ پگڑیوں کے اوپر بڑے سائز کے رومال ڈالے ہوئے تھے جو ان کے کندھوں سے بھی نیچے

آئے ہوئے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں تسبیحیں تھیں۔ ان کا لباس' ان کی چال ڈھال اور ان کے بولنے کا انداز بتاتا تھا کہ ان لوگوں کو مذہب کے سوا کسی اور چیز میں کوئی دلچسپی نہیں۔ رئیسِ قلعہ بن بویا نے ان کا استقبال بڑے احترام سے کیا اور ان کی خاطر تواضع کی۔

بزرگ تین چار علماء کو ساتھ لے کر رئیسِ قلعہ کو الگ کمرے میں لے گیا۔ اس نے رئیسِ قلعہ سے کہا تھا کہ وہ الگ بیٹھ کر بات کریں گے۔

"رئیسِ قلعہ!" — بزرگ نے بن بویا سے کہا — "ہم آپ کے ساتھ باتیں کریں گے اور آپ کی باتیں سنیں گے۔ آپ نے اچھا کیا ہے کہ اپنے خطیب کو بھی یہاں بلا لیا ہے۔ جتنی دیر ہم آپس میں بات چیت کرتے ہیں اتنی دیر میں ہمارے ساتھ آئے ہوئے آدمی شہر میں گھوم پھر لیں گے۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔ یہ بے ضرر آدمی ہیں"۔

بن بویا مسکرا دیا اور اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ اُس کے اپنے حکم کے مطابق کسی باطنی کا اس قلعہ بند شہر میں داخل ہونا ممنوع تھا لیکن خزانے کی خاطر وہ اس باطنی بزرگ کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے رہا تھا۔ وہ ان باطنی علماء کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا اور باقی باطنی شہر میں نکل گئے۔ ان کا انداز یہ تھا کہ ہر آدمی کو جو ان کے قریب سے گزرتا تھا' السلام علیکم کہتے تھے' اور جو سلام پر رک جاتا اس سے وہ بغلگیر ہو کر ملتے تھے۔ لوگوں کو تو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ باطنی ہیں اور انہیں رئیسِ قلعہ نے قلعے میں آنے کی اجازت دی ہے۔ لوگ انہیں مذہبی پیشوا یا کسی دوسرے شہر کے دینی مدرسے کے استاد سمجھ رہے تھے۔

یہ باطنی کچھ آگے جا کر تین چار ٹولیوں میں بٹ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں تسبیحیں تھیں اور ان کے ہونٹ ہل رہے تھے جیسے کوئی وظیفہ پڑھ رہے ہوں۔ لوگ انہیں دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

ان میں سے آٹھ نو آدمی قلعے کے بڑے دروازے تک چلے گئے۔ دروازے کے ساتھ اندر کی طرف ایک کمرہ تھا جس میں دروازے کے پانچ چھ محافظ بیٹھے ہوئے تھے۔ دو محافظ دروازے پر کھڑے تھے۔ یہ باطنی ان دونوں محافظوں کے ساتھ بغلگیر ہو کر ملے اور باتوں باتوں میں انہیں اپنے ساتھ محافظوں کے کمرے میں لے گئے۔

کمرے میں جو پانچ چھ محافظ بیٹھے ہوئے تھے' ان باطنیوں کو عالم سمجھ کر بڑے احترام سے ملے۔ ایک باطنی نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ تمام باطنیوں نے اپنے چغوں کے اندر ہاتھ ڈالے اور جب ان کے ہاتھ باہر آئے تو ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک چھوٹی تلوار تھی۔ محافظ نہتے تھے۔ ان کی تلواریں اور برچھیاں الگ رکھی تھیں۔ انہیں اپنے ہتھیاروں تک پہنچنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ باطنیوں نے انہیں دبوچ لیا۔ بعض نے اپنے ہاتھ آئے ہوئے محافظوں کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور دوسروں نے تلواروں سے ان کے پیٹ چاک کر دیئے۔ ان محافظوں میں کلید بردار بھی تھا یعنی وہ محافظ جو محافظوں کا کمانڈر جس کے پاس قلعے کی چابیاں تھیں۔ ان باطنیوں نے اس کی لاش سے چابیاں اپنے قبضے میں لے لیں۔

باقی باطنی بھی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر ادھر اُدھر ہو گئے۔ شہر کے کچھ لوگ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ یہ بھی باطنی تھے جو پہلے ہی اس قلعے میں موجود تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ حسن بن صباح چالیس فدائی بھیج رہا ہے جو علماء کے بھیس میں آئیں گے۔ اس قلعے میں فوج تو تھی لیکن اس کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ قلعے میں کسی نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ قلعے پر حملہ بھی ہو سکتا ہے۔ حملہ ہوا بھی تو ایسا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ رئیسِ قلعہ باطنیوں کے علماء کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ باطنی فدائین نے اس تھوڑی سی فوج کی ساری نفری کو مار ڈالا یا بیکار کر دیا۔

ایک باطنی اُس کمرے میں داخل ہوا جس میں رئیسِ قلعہ بن بویا باطنیوں کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔ اس باطنی نے السلام علیکم کہا۔ یہ ایک اشارہ تھا کہ باہر کام مکمل ہو گیا ہے۔ ایک باطنی جو دوسروں کی طرح علماء کے بھیس میں تھا اُٹھا اور اس نے بن بویا کو دبوچ لیا۔ ایک اور باطنی نے خطیب کو دبوچ لیا اور انہوں نے دونوں کو قتل کر دیا۔ اس طرح یہ قلعہ باطنیوں کے قبضے میں چلا گیا۔

حسن بن صباح کو اطلاع دی گئی۔ اس نے ایک آدمی کو امیرِ قلعہ بنا کر بھیج دیا۔

○

قلعہ ملاذ خان سے کچھ دُور ایک اور قلعہ تھا جس کا نام تمستان تھا۔ کسی بھی تاریخ میں اس قلعے کے حاکم کا نام نہیں ملتا۔ اس کے نام کی بجائے تقریباً ہر مورخ نے لکھا ہے کہ وہ فاسق اور بدکار تھا۔ اسے سلجوقیوں نے یہ قلعہ دیا تھا۔ تمام مستند تاریخوں میں

اس قلعے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

اس قلعے میں بھی ایک شہر آباد تھا۔ اس شہر کا ایک رئیس تھا جس کا نام منوّر الدولہ تھا۔ اس کے متعلق تاریخوں میں آیا ہے کہ صحیح العقیدہ اور جذبے والا مسلمان تھا۔ اس قلعے پر بھی باطنیوں کی نظر تھی۔ قلعے کے دفاع کے لئے کوئی خاص فوج نہیں تھی۔ چند سو محافظ قلعے میں موجود رہتے تھے۔ چونکہ امیر قلعہ اپنی عیش و عشرت میں مگن رہتا تھا اس لئے باطنی اس قلعے میں کھلے بندوں آتے جاتے رہتے تھے۔

رئیس منوّر الدولہ کو کسی نے بتایا کہ یہاں ایک مکان میں پانچ چھ باطنی رہتے ہیں جو یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے کہ وہ باطنی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو پکا مومن ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں مشکوک سی تھیں۔

دو چار آدمیوں نے رئیس منوّر کو بتایا کہ یہ لوگ خطرناک معلوم ہوتے ہیں' ان کی موجودگی کی اطلاع امیر قلعہ تک پہنچنی چاہئے تاکہ وہ ان پر جاسوس اور مخبر مقرر کرے۔ امیر قلعہ تک کوئی رئیس ہی پہنچ سکتا تھا۔ ایک روز منوّر امیر کے ہاں چلا گیا اور اسے ان باطنیوں کے متعلق بتایا۔ رئیس منوّر امیر قلعہ کے ہاں آتا جاتا رہتا تھا۔

"ہمارے لوگ وہمی ہیں منوّر!" ــــ امیر قلعہ نے بے نیازی اور بے پرواہی سے کہا ــــ "کہو تمہاری بہن کا کہیں رشتہ ہوا ہے یا نہیں"۔

منوّر کو اس پر طیش آئی کہ وہ بات کتنی اہم کرنے آیا تھا اور امیر قلعہ اس کی بہن کے رشتے کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ منور کی ایک چھوٹی بہن تھی جو جوانی کی عمر کو پہنچ گئی تھی۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ وہ بہت ہی حسین اور شوخ لڑکی تھی۔ اس کے حسن کی شہرت سارے شہر میں پھیلی ہوئی تھی۔ امیر قلعہ نے اس لڑکی کے رشتے کے متعلق پوچھا تو منوّر نے بات کو ٹال دیا اور کہا کہ وہ جس کام کے لئے آیا ہے اس کام کی طرف توجہ دینا بہت ہی ضروری ہے۔

"میں دیکھوں گا" ــــ امیر قلعہ نے کہا ــــ "میں ان پر اپنے جاسوس مقرر کر دوں گا"۔

چونکہ منوّر صحیح معنوں میں مسلمان تھا اس لئے وہ باطنیوں کا جانی دشمن بنا ہوا تھا۔

تین چار دنوں بعد وہ پھر امیر قلعہ کے پاس گیا اور اسے کہا کہ اس نے ابھی تک ان مشکوک باطنیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔

"تمہیں میرے قلعے کا اتنا فکر کیوں لگا ہوا ہے؟" ــــ امیر قلعہ نے بڑے خوشگوار لہجے میں کہا ــــ "یہ پانچ سات باطنی میرا کیا بگاڑ لیں گے؟"

"امیر محترم!" ــــ منوّر نے کہا ــــ "کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ یہ باطنی کس طرح چھاتے چلے جا رہے ہیں۔ سلطان ملک شاہ کو انہوں نے قتل کیا ہے۔ اس سے پہلے سلطان مرحوم کے وزیر اعظم خواجہ حسن طوسی نظام الملک کو بھی ان ہی باطنیوں نے قتل کیا تھا۔ اگر آپ بیدار نہ ہوئے تو اس قلعے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ کیا آپ نے سنا نہیں کہ انہوں نے قلعہ ملاذ خان پر قبضہ کر لیا ہے"۔

"کیا بات کرتے ہو منوّر!" ــــ امیر قلعہ نے ہنس کر کہا ــــ "باطنی میرے قلعے پر قبضہ کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ یہاں آ بھی گئے تو یوں سمجھو کہ انہیں موت یہاں لے آئی ہے"۔

یہ قلعہ اتنا اہم تو نہ تھا کہ اسے تاریخ میں اتنا زیادہ بیان کیا جاتا لیکن اس کے ساتھ جو واقعہ وابستہ ہے' اس کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ اسی وجہ سے مؤرخوں نے یہ واقعہ تاریخ میں شامل کیا ہے۔

منوّر الدولہ کے جذبے کا یہ عالم کہ وہ قلعے کی سلامتی کے متعلق پریشان تھا اور وہ ان پانچ چھ آدمیوں کے متعلق بھی فکرمند تھا جن کے متعلق بتایا جا رہا تھا کہ مشکوک ہیں اور باطنی معلوم ہوتے ہیں لیکن امیر قلعہ کی ذہنی حالت یہ تھی کہ جس روز رئیس منوّر اسے ملا' اس سے دو روز بعد امیر قلعہ نے اپنے دو خاص آدمیوں کے ہاتھ منوّر کی طرف بیش قیمت تحفے بھیجے اور ساتھ یہ پیغام کہ منور اپنی بہن کو اس کی بیوی بنا دے۔

"کیا امیر قلعہ کا دماغ ٹھیک کام کرتا ہے؟" ــــ منوّر نے تحفے دیکھ کر اور اس کا پیغام سن کر کہا ــــ "یہ تحفے واپس لے جاؤ اور اسے کہنا کہ میں اپنی نوجوان بہن کو ایک ایسے بوڑھے کے حوالے نہیں کروں گا جو شرابی بھی ہے' بدکار بھی ہے اور جس کی پہلے ہی نہ جانے کتنی بیویاں ہیں"۔

"اس کی یہ جرأت!" ــــ امیر قلعہ نے اپنے تحفے واپس آتے دیکھ کر اور رئیس منوّر کا انکار سن کر کہا ــــ "میں اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دوں گا۔ میں اس کے ساتھ دوستی قائم رکھوں گا اور تم دیکھنا کہ بہت جلد اس کی بہن میرے پاس ہو گی"۔

منوّر اپنے آپ میں یوں تڑپنے لگا جیسے امیر قلعہ نے اسے بڑی شدید ضرب لگائی

ہو۔ منّور کو قلعے کا غم کھائے جا رہا تھا اور امیرِ قلعہ کی نظر اس کی بہن پر لگی ہوئی تھی۔
منّور کی ایک ہی بیوی اور دو بچے تھے اور اس کے گھر کی ایک فرد اس کی یہ بہن تھی۔ منور نے بڑے غصے کی حالت میں اپنی بیوی اور بہن کے ساتھ یہ بات تفصیل سے کر دی۔

"میں ان پانچ چھ باطنیوں کو پکڑنا چاہتا ہوں" ۔۔۔۔ منّور نے کہا ۔۔۔۔ "اگر یہ پکڑے گئے اور یقین ہو گیا کہ یہ باطنی جاسوس اور تخریب کار ہیں تو میں اپنے ہاتھوں انہیں قتل کروں گا"۔

تاریخی واقعات کے ایک انگریزی مجموعے میں یہ واقعہ اس طرح آیا ہے کہ منور کی بہن کا قومی جذبہ بھی منور جیسا ہی تھا۔ اس نے جب اپنے بھائی کی زبان سے سنا کہ وہ ان باطنیوں کو پکڑنا چاہتا ہے اور یہ بھی کہ بھائی نے اسے امیرِ قلعہ سے بیاہنے سے انکار کر دیا ہے تو اس لڑکی کے دل میں بھائی کی عظمت اور قومی جذبہ اور زیادہ شدت سے ابھر آیا۔

"میرے عزیز اور عظیم بھائی!" ۔۔۔۔ بہن نے منّور سے کہا ۔۔۔۔ "میں آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے بتائیں کہ میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں آپ کے خلوص، آپ کی محبت اور آپ کے جذبے کو دیکھ کر اپنا ایک راز آپ کو دے رہی ہوں۔ یہ جو پانچ چھ جوان سال آدمی ہیں اور جن پر آپ کو شبہ ہے، ان میں سے ایک مجھے چاہتا ہے اور میں اسے پسند کرتی ہوں۔ میں بلا جھجک آپ کو بتا رہی ہوں کہ میں اس آدمی سے تین چار مرتبہ تنہائی میں مل چکی ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا ہوا ہے۔ وہ بھی میرے ساتھ پاک محبت کرتا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں اس آدمی کو جذبات میں الجھا کر معلوم کر سکتی ہوں کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے"۔

"آفرین!" ۔۔۔۔ منّور نے کہا ۔۔۔۔ "کوئی بھائی اپنی نوجوان بہن کو اس طرح استعمال نہیں کیا کرتا لیکن تمہارا ان لوگوں میں سے ایک کے ساتھ رابطہ ہو گیا ہے تو اس تعلق کو استعمال کرو۔ اگر تمہیں کہیں بھی خطرہ محسوس ہو تو فوراً مجھے بتا دینا۔ تم اس کے ساتھ حسن بن صباح کی بات چھیڑ دینا اور اس طرح باتیں کرنا جیسے تم حسن بن صباح کو اچھا سمجھتی ہو اور اس کے پاس جانا چاہتی ہو"۔

منّور کی بہن خوبصورت تو تھی لیکن شوخ اور ذہین بھی تھی۔ اس نے منّور سے کہا کہ وہ ان لوگوں کی اصلیت معلوم کر لے گی۔

امیرِ قلعہ نے منّور کو اپنے ہاں بلایا۔ منّور نے جانے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کے

جواب میں امیرِ قلعہ نے اپنی محفل میں اس قسم کے الفاظ کہے کہ وہ منّور کو اڑا دے گا اور اس کی بہن کو اپنے ہاں لے آئے گا۔ اس کی یہ دھمکی منور کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اس کا اس پر بہت ہی برا اثر ہوا اور وہ ایک کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ کشمکش یہ تھی کہ وہ اپنے جذبے کو قائم رکھے یا امیرِ قلعہ کے رویے سے متاثر ہو کر اپنے جذبے سے دستبردار ہو جائے۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ امیرِ قلعہ کو اپنے قلعے کا کچھ خیال نہیں تو اسے کیا پڑی ہے کہ وہ جاسوسیاں کرتا پھرے۔ جذبے مرا تو نہیں کرتے، اس کے خیالوں پر قومی جذبہ غالب آ گیا۔

○

تین چار دنوں بعد ہی منور کو اس کی بہن نے بتایا کہ یہ لوگ باطنی ہیں اور یہاں جاسوسی اور تخریب کاری کے لئے آئے ہیں لیکن ابھی اپنے باطنی عقیدے کی در پردہ تبلیغ کر رہے ہیں۔

"تم نے کیسے معلوم کیا ہے؟" ۔۔۔۔ منور نے بہن سے پوچھا۔

"مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی" ۔۔۔۔ بہن نے کہا ۔۔۔۔ "جس طرح آپ نے کہا تھا، میں نے اسی طرح کیا۔ میں نے حسن بن صباح کی باتیں ایسے الفاظ میں کیں جیسے میں اسے نبی سمجھتی ہوں اور اسے دیکھنے کو بے قرار ہوں۔ اس نے پہلے تو یہ ظاہر کیا کہ وہ حسن بن صباح کو کافر سمجھتا ہے لیکن میں اسے جذبات میں لے آئی اور اپنی بات پر قائم رہی۔ دوسرے دن وہ میری بات پر آ گیا اور اس نے کہا کہ وہ مجھے حسن بن صباح کے پاس لے جائے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ امام حسن بن صباح تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہو گا"۔

مختصر یہ کہ اس لڑکی نے پانچ چھ آدمیوں کے اس گروہ کی اصلیت معلوم کر لی۔ وہ جس آدمی سے محبت کرتی تھی، اس آدمی نے وہ دن بھی مقرر کر دیا تھا جب اس آدمی نے اس لڑکی کو اس شہر سے لے جانا تھا۔ وہ دن گزر گئے۔ منّور کی بہن باہر نکلی اور پھر واپس نہ آئی۔ سورج غروب ہو گیا، رات گہری ہو گئی، لڑکی واپس نہ آئی۔ تب منّور کو اپنی اس غلطی کا احساس ہوا کہ اس نے بہن کو خطرناک آدمی کے ساتھ دوستی بنائے رکھنے پر اکسایا تھا۔ اس میں کوئی شک تھا ہی نہیں کہ اس کی بہن اس باطنی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ منّور کو معلوم تھا کہ حسن بن صباح کے پاس اس قسم کی سینکڑوں حسین اور تیز طرار لڑکیاں

ہیں جنہیں وہ اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ یہ سوچ کر منّور کا غصہ بڑھتا ہی گیا اور وہ پیچ و تاب کھانے لگا کہ وہ کیا کرے۔ اسے امیرِ قلعہ کا خیال آیا کہ اسے جا کر بتائے اور وہ ان مشکوک آدمیوں کو پکڑ کر معلوم کرے کہ لڑکی ان کے قبضے میں ہے یا نہیں لیکن اس نے جب سوچا کہ امیر قلعہ نے اسے دشمن سمجھ لیا ہے تو اس نے امیرِ قلعہ کو ذہن سے اتار دیا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔

"میرے دماغ میں ایک بات آئی ہے" —— منّور کو اس کی بیوی نے کہا۔ —"آپ امیرِ قلعہ کے پاس جائیں اور اسے بتائیں کہ اس کی بہن کو ان مشکوک آدمیوں میں سے ایک آدمی نے محبت کا جھانسہ دے کر غائب کر دیا ہے۔ پھر امیرِ قلعہ سے کہیں کہ اگر آپ میری بہن کو ان سے آزاد کروا دیں تو میں اپنی بہن کو آپ کے ساتھ بیاہ دوں گا"۔

"یہ تو میں کسی قیمت پر نہیں کروں گا" —— منّور نے کہا —"بہن مجھے نظر آ گئی تو میں اسے قتل کر دوں گا' اسے اس امیرِ قلعہ کی زوجیت میں نہیں دوں گا"۔

"میں آپ سے یہ تو نہیں کہہ رہی کہ اپنی بہن ضرور ہی اسے دینی ہے" —— منّور کی بیوی نے کہا —"پہلے اپنی بہن کا سراغ تو لگائیں۔ وہ مل گئی تو امیر قلعہ کو صاف کہہ دینا کہ میں تمہیں اپنی بہن نہیں دوں گا۔ آپ ڈریں نہیں۔ میرے تین بھائی ہیں۔ میں ان کے ہاتھوں اس امیر قلعہ کو قتل کروا سکتی ہوں"۔

منّور اُسی وقت امیرِ قلعہ کے ہاں چلا گیا۔ امیر قلعہ شراب پی رہا تھا اور اس وقت اس کے ساتھ ایک نوخیز لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے منور کو اندر بلا لیا اور لڑکی کو وہاں سے اٹھا دیا۔

"کہو رئیس!" —— امیرِ قلعہ نے طنزیہ سے لہجے میں پوچھا —"کیسے آنا ہُوا؟"

"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت آپڑی ہے" —— منّور نے کہا —"میری بہن لاپتہ ہو گئی ہے۔ مجھے ان ہی پانچ چھ آدمیوں پر شک ہے جن کے متعلق میں آپ کے ساتھ بات کر چکا ہوں۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ ان میں سے ایک آدمی نے میری بہن کو محبت کا جھانسہ دیا تھا۔ مجھے شک ہے کہ میری بہن کو وہی لے گیا ہے اور میں جس مسئلے پر پریشان ہو رہا ہوں وہ یہ ہے کہ میری بہن کو حسن بن صباح تک پہنچا دیا جائے گا"۔

"وہ کہیں نہیں گئی" —— امیرِ قلعہ نے ایسے لہجے میں کہا جس میں شراب کا اثر

نمایاں تھا —"وہ یہیں ہے اور میرے پاس ہے..... پریشان مت ہو رئیس!..... اگر تم اجازت دے دو تو یہ شادی دھوم دھام سے ہو گی اور اگر تم اجازت نہیں دو گے تو بھی یہ شادی ہو کے رہے گی اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ گے..... کہو کیا کہتے ہو؟ کیا تم بھول گئے تھے کہ میرے ہاتھ میں کتنی طاقت ہے؟"

"شراب کی طاقت کوئی طاقت نہیں ہوتی" —— منّور نے اٹھتے ہوئے کہا —"میں تمہیں صرف ایک بار شرافت اور دوستی سے کہوں گا کہ میری بہن ابھی میرے حوالے کر دو۔ دوسری بار نہیں کہوں گا"۔

اس وقت امیرِ قلعہ نشے میں بدمست تھا۔ شراب کا نشہ تو کوئی نشہ نہیں تھا' اصل نشہ تو یہ تھا کہ وہ قلعے کا اور اس شہر کا حاکم تھا۔ یہ تھا اصل نشہ۔

"رئیس منّور!" —— امیرِ قلعہ نے کہا —"تم چلے جاؤ۔ سوچ کر کل مجھے جواب دینا۔ اگر اس وقت دھمکیوں کی زبان میں بات کرو گے تو میں اپنے نوکروں کو بلا کر تمہیں دھکے دلوا کر گھر سے نکالوں گا اور اپنے دو شکاری کتے تم پر چھوڑ دوں گا"۔

منّور وہاں سے نکل آیا۔

⊙

منّور اپنے گھر پہنچا تو منور وہ منور نہیں تھا جو قومی جذبے سے سرشار رہتا تھا۔ اس کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے اور اس کی ذات میں آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ بیوی نے اس سے پوچھا تو وہ چپ رہا۔ بیوی کو ایک طرف کر دیا اور تلوار لے کر پھر باہر نکل گیا۔ اس کی بیوی اس کے پیچھے دوڑی اور باہر تک آ گئی۔ منّور نے رک کر پیچھے دیکھا۔

"تم واپس چلی جاؤ" —— اس نے بیوی سے کہا —"میں کسی کو قتل کرنے نہیں جا رہا۔ میں انشاءاللہ زندہ واپس آؤں گا"۔

بیوی واپس اپنے گھر آ گئی لیکن وہ بہت ہی پریشان تھی۔ منّور نے اس حویلی کے دروازے پر جا دستک دی جس میں پانچ چھ مشکوک آدمی رہتے تھے۔ دروازہ کھلا تو منور نے دیکھا کہ دروازہ کھولنے والا وہی آدمی تھا جسے اس کی بہن چاہتی تھی اور جو اس کی بہن کو چاہتا تھا۔ منّور اسے اور وہ منّور کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ منّور کو اندر لے گیا۔ سارے آدمی منور کے پاس بیٹھ گئے۔

"میرے دوستو!" —— منّور نے کہا —"میں قتل کرنے نہیں آیا نہ قتل ہونے کا

ارادہ ہے۔ میری بہن لاپتہ ہو گئی ہے اور مجھے پتہ چل گیا ہے کہ وہ امیرِ قلعہ کے پاس ہے۔ وہ بدبخت کبھی کا میری بہن کے پیچھے پڑا ہُوا تھا اور میں اسے صاف الفاظ میں کہہ چکا تھا کہ میں اپنی بہن اس کی زوجیت میں نہیں دوں گا"۔

"آپ ہمارے پاس کیوں آئے ہیں؟" —— اس آدمی نے پوچھا جس کے ساتھ منوّر کی بہن کی محبت تھی —— "ہم آپ کی جو مدد کر سکتے ہیں وہ بتائیں"۔

"میرے دوستو!" —— منوّر نے کہا —— "میں جانتا ہوں کہ تم سب باطنی ہو اور حسن بن صباح کے بھیجے ہوئے یہاں آئے ہو۔ میں تمہیں کسی بھی وقت پکڑوا کر قتل کروا سکتا تھا لیکن میری یہ بات اب غور سے سنو کہ اب میں تمہارا ساتھی ہوں۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ صبح ہوتے ہی تم میں سے کوئی ایک آدمی حسن بن صباح کے پاس جائے اور اسے کہے کہ اپنے آدمی بھیجے جس طرح تم نے قلعہ ملاذ خان میں بھیجے تھے۔ یہ قلعہ بھی لے لو"۔

اس سلسلے میں ان کے درمیان کچھ اور باتیں ہوئیں اور ایک آدمی حسن بن صباح کے پاس جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ منوّر کی حالت ایسی تھی جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ اس کو بہن سے بہت ہی پیار تھا۔ اس بہن کو امیرِ قلعہ لے اڑا تھا۔ وہ پاگل نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا۔ وہ بھول ہی گیا کہ وہ باطنیوں کا دشمن ہے اور باطنی اسلام کے لئے بہت بڑا خطرہ ہیں۔

دو یا تین دن گزرے ہوں گے کہ جو آدمی حسن بن صباح کے پاس گیا تھا وہ واپس آ گیا اور اسی روز شہر میں تاجروں کا ایک قافلہ آیا۔ ان کے ساتھ اونٹ تھے جن پر اناج اور مختلف قسم کا سامان لدا ہُوا تھا۔ ان تاجروں کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی۔ یہ سرائے میں ٹھہرے۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ امیرِ قلعہ حسبِ معمول شراب پی رہا تھا۔ اس نے منوّر کی بہن کو اپنے پاس بٹھا رکھا تھا اور شراب پینے پر مجبور کر رہا تھا۔ لڑکی رو رو کر انکار کر رہی تھی اور امیرِ قلعہ قہقہے لگا رہا تھا۔ عین اس وقت دربان نے اندر جا کر اسے بتایا کہ رئیسِ شہر منوّر الدولہ آئے ہیں۔ امیرِ قلعہ نے قہقہہ لگا کر کہا کہ اسے اندر بھیج دو۔

جب منور اندر گیا تو وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے پیچھے آٹھ نو آدمی تھے۔ امیرِ قلعہ نے حیرت زدہ سا ہو کر ان سب کو دیکھا لیکن اسے یہ پوچھنے کی مہلت نہ ملی کہ وہ کون ہیں اور

کیوں آئے ہیں۔ انہوں نے امیرِ قلعہ کو پکڑ لیا اور اُن میں سے ایک نے خنجر امیرِ قلعہ کے دل میں اتار دیا۔ ایک ہی وار کافی تھا۔

یہ جو تاجر آئے تھے، یہ سب حسن بن صباح کے فدائین تھے۔ وہ ٹولیوں میں بٹ گئے تھے اور جب امیرِ قلعہ کو قتل کیا گیا اُس وقت وہ اُن چند سَو محافظوں پر قابو پا چکے تھے جو مختلف جگہوں پر سوئے ہوئے تھے۔

اگلی صبح اعلان ہُوا کہ اب امیرِ قلعہ کوئی اور ہے۔ اس طرح یہ قلعہ بھی حسن بن صباح کے قبضے میں چلا گیا۔

منور کو توقع تھی کہ باطنی اسے کوئی اعزاز دیں گے۔ تاریخی حوالوں کے مطابق، اس کی خواہش یہ تھی کہ اسے اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنی بیوی کو، بہن اور بچوں کو ساتھ لے کر مرو یا رے چلا جائے لیکن اس کا انجام بہت بُرا ہُوا۔ منوّر پُراسرار طریقے سے قتل ہو گیا اور اس کی بہن کو حسن بن صباح کی جنّت میں بھیج دیا گیا۔ اس کے بیوی بچوں کا تاریخ میں ذکر نہیں ملتا۔

منوّر الدولہ

قتل ہو گیا۔ اس کے بیوی بچوں کا کچھ پتہ ہی نہ چلا وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں یا غائب کر دیئے گئے ہیں اور اس کی بہن کو باطنی لے اُڑے۔ منوّر الدولہ نے اسی بہن کی خاطر قلعہ قستان پر باطنیوں کا قبضہ کروا دیا تھا۔ وہ تو پکا مومن تھا لیکن بہن کی عزت اور عصمت پر اُس نے اپنا ایمان بھی قربان کر دیا تھا۔ منور الدولہ کے خاندان کا تو نام و نشان ہی مٹ گیا تھا لیکن یہ کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔

اس کی بہن کا نام حمیرا تھا۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ وہ بڑی ہی حسین لڑکی تھی۔ وہ جتنی حسین تھی اتنی ہی اپنے دین و ایمان کی پکی تھی۔ اس میں اپنے بھائی منوّر الدولہ جیسا جذبہ تھا۔ اس کے دل میں بھی حسن بن صباح اور اس کے باطنی فرقے کی نفرت موجزن تھی لیکن اسے محبت ہوئی تو ایک باطنی سے ہوئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ خوبرو اور جواں سال آدمی حسن بن صباح کا بھیجا ہُوا تخریب کار اور جاسوس ہے۔

پچھلے باب میں آ چکا ہے کہ اس شہر کے ایک مکان میں پانچ چھ آدمی رہتے تھے جو بظاہر دین دار اور زاہد تھے لیکن یہ ان کا بہروپ تھا۔ وہ پانچوں وقت مسجد میں جا کر نماز ادا کرتے اور وہ اتنے ملنسار، ہر کسی کے ہمدرد اور اتنے ہنس مکھ تھے کہ ہر کوئی انہیں محبت اور احترام سے ملتا اور ہر محفل میں انہیں تعظیم دی جاتی تھی۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے کہ ان کی سرگرمیاں کتنی پُراسرار اور مشکوک سی تھیں کہ کچھ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ لوگ باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور ہیں۔ شہر کے بیشتر لوگ ان پر کسی قسم کا کوئی شک نہیں کرتے تھے۔ منوّر الدولہ کو تو آخر میں آ کر یقین ہو گیا تھا کہ یہ پانچ

چھ مذہبی قسم کے آدمی باطنی ہیں اور کسی بھی وقت کوئی تباہ کاری کر سکتے ہیں لیکن قلعے کا حاکم منوّر الدولہ کی اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دے رہا تھا۔

منوّر الدولہ اس شہر کا رئیس تھا لیکن اس میں وہ تکبّر اور غرور نہیں تھا جو اُس وقت رئیسوں میں ہُوا کرتا تھا۔ وہ صاف ستھرا مسلمان تھا۔ صوم و صلوٰۃ اور حقوق العباد کا پابند تھا۔ عبادت کے ساتھ ساتھ وہ عسکریت پسند بھی تھا۔ اسے اپنی بہن حمیرا کے ساتھ بہت ہی پیار تھا۔ اسی پیار کا کرشمہ تھا کہ حمیرا بھی خیالات اور کردار کے لحاظ سے اپنے بھائی کے نقش قدم پر چل رہی تھی۔ اسے گھوڑ سواری کا بہت شوق تھا۔ منوّر نے اسے شہسوار بنا دیا تھا۔ اسے تیغ اور خنجر زنی، نیزہ بازی اور تیر اندازی بھی سکھا دی تھی۔ وہ آخر شہر کے رئیس کی بہن تھی اس لئے اس میں خود اعتمادی اور جرأت تھی۔ وہ دوسرے تیسرے دن شام کے وقت گھوڑے پر سوار ہوتی اور شہر سے نکل جاتی تھی۔ گھوڑا دوڑاتی اور جدھر چاہتی اُدھر ہو آتی تھی۔

ایسی ہی ایک شام وہ شہر سے کچھ دور گھوڑا دوڑا رہی تھی، ایک بڑا ہی خوبرو گھوڑ سوار گھوڑا دوڑاتا پھر رہا تھا۔ حمیرا نے اپنا گھوڑا اس کے قریب سے گزارا تو اس سوار نے اسے غور سے دیکھا اور فوراً ہی گھوڑا اس کے پیچھے دوڑا دیا۔ دونوں گھوڑے جب پہلو بہ پہلو ہوئے تو حمیرا نے اس سوار کو غصیلی نگاہوں سے دیکھا اور پوچھا کہ وہ کس نیّت سے اس کے پاس چلا آیا ہے۔

"گھوڑا فوراً روک لیں" ___ اس سوار نے کہا ___ "آپ کی زین کسی ہوئی نہیں ڈھیلی ہے اور آپ گر پڑیں گی"۔

حمیرا نے گھوڑا روک لیا اور اُتر آئی۔ وہ آدمی بھی گھوڑے سے اترا اور حمیرا کے گھوڑے کی زین دیکھی۔ واقعی زین کسی ہوئی نہیں تھی۔ اس نے زین اچھی طرح کس دی۔

"اب جائیں" ___ اس سوار نے کہا ___ "بس مجھے آپ سے اتنی ہی دلچسپی تھی"۔

حمیرا کو یہ شخص شکل و صورت اور جسم کے لحاظ سے بھی اچھا لگا اور بول چال کے انداز سے بھی۔ وہ کوئی چھوٹی سی حیثیت کا آدمی نہیں لگتا تھا۔

"آپ کون ہیں؟" ___ حمیرا نے پوچھا ___ "کیا آپ یہیں کے رہنے والے

ہیں؟"

"میرا نام جابر بن حاجب ہے" ـــــ اس سوار نے جواب دیا ـــــ "پردیسی ہوں۔ بغداد سے یہاں علم کی تلاش میں آیا ہوں۔ اپنے جیسے چار پانچ آدمی مل گئے ہیں۔ ان کے ساتھ رہتا ہوں"۔

"لیکن آپ تو شہسوار معلوم ہوتے ہیں" ـــــ حمیرا نے کہا ـــــ "اس زین پر میں سوار تھی اور مجھے پتہ نہ چلا کہ یہ پوری طرح کسی ہوئی نہیں۔ آپ کو اتنا تجربہ ہے کہ آپ نے دُور سے دیکھ لیا اور مجھے گرنے سے بچالیا"۔

"کیا علم کی جستجو میں مارے مارے پھرنے والے شہسوار نہیں ہوسکتے؟" ـــــ جابر بن حاجب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہوتا تو یہی ہے" ـــــ حمیرا نے کہا ـــــ "عالم عموماً تارک الدنیا سے ہو جاتے ہیں"۔

"میں ان عالموں میں سے نہیں" ـــــ جابر نے کہا ـــــ "دنیا سے تعلق توڑ لینا علم کی خلاف ورزی ہے بلکہ میں اسے علم کی توہین سمجھتا ہوں۔ میں مسلمان ہوں...... وہ مسلمان ہی کیا جو شہسوار نہ ہو اور جس کا ہاتھ تلوار، برچھی اور کمان پر صاف نہ ہو۔ میں ایک زندہ قسم کا عالم بننا چاہتا ہوں۔ اُس عالم کو میں نامکمل انسان سمجھتا ہوں جو عمل سے کتراتا ہو"۔

دونوں اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور گھوڑے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ جابر کی زبان میں اور بولنے کے انداز میں کوئی ایسا تاثر تھا کہ حمیرا کو جیسے یہ بھی یاد نہ رہا ہو کہ اسے واپس گھر بھی جانا ہے۔ گھوڑے آگے ہی آگے چلے جا رہے تھے۔ آگے دریا تھا جہاں گھوڑے رک گئے۔

وہ علاقہ بڑا ہی سرسبز تھا جس میں پیڑ پودوں کی افراط تھی۔ اس ماحول کی اپنی ایک رومانیت تھی جو حمیرا پر اثرانداز ہونے لگی۔ جابر نے حمیرا کو یاد دلایا کہ شام گہری ہو گئی ہے اس لئے اسے واپس گھر جانا چاہئے۔ حمیرا وہاں سے چل تو پڑی لیکن وہ محسوس کرنے لگی کہ اس کا دل وہیں دریا کے کنارے رہ گیا ہے۔ اس نے گھوم گھوم کے پیچھے دیکھا۔ آخر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

یہ حمیرا اور جابر کی پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد حمیرا گھوڑسواری کے لئے ہر شام

باہر آنے لگی۔ اس کی نظریں جابر کو ڈھونڈتی تھیں لیکن جابر ہر روز باہر نہیں جاتا تھا۔ تیسرے چوتھے روز اسے جابر مل جاتا اور دونوں دریا کے کنارے اُس جگہ چلے جاتے جہاں انہیں کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ نہ جابر نے کوئی ایسی بات کی تھی نہ حمیرا نے کوئی ایسا اشارہ دیا تھا کہ ان کی محبت کا تعلق جسموں کے ساتھ ہے۔ یہ دو روحوں کی محبت تھی اور ان کی روحوں کا جسمانی آسودگی اور نفسانی خواہش کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ گھوڑوں سے اتر کر ایک دوسرے میں گم ہو جایا کرتے تھے۔

انہوں نے شادی کے عہد و پیمان کر لئے۔ حمیرا نے جابر کو بتا دیا تھا کہ اس کا بھائی شہر کا رئیس ہے اس لئے وہ اس کی شادی کسی رئیس زادے سے ہی کرے گا۔

"اگر تم بھائی سے کہو کہ تم میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہو تو کیا وہ انکار کر دے گا؟" ـــــ جابر نے پوچھا۔

"ہاں!" ـــــ حمیرا نے جواب دیا ـــــ "میں اُس سے اجازت تو ضرور لوں گی۔ اُسے میرے ساتھ اتنا پیار ہے جو اُسے اپنے بچوں کے ساتھ بھی نہیں لیکن اُس نے انکار کر دیا تو میں تمہارے ساتھ جہاں کہو گے چلی چلوں گی۔ میرا دل کسی رئیس زادے یا کسی امیر زادے کو قبول نہیں کرے گا۔ یہ لوگ عیش پرست ہوتے ہیں۔ میں کسی کے حرم کی قیدی نہیں بنوں گی، میں ایک انسان کی رفیقۂ حیات بنوں گی"۔

○

حمیرا کسی وقت بھی محسوس نہ کر سکی کہ یہ شخص باطنی ہے اور علم و فضل کے ساتھ اس کا دُور کا بھی تعلق نہیں اور یہ حسن بن صباح جیسے ابلیس کا پیروکار ہے۔ پھر وہ دن آیا جس دن منوّر الدولہ نے حمیرا کو بتایا کہ فلاں مکان میں جو پانچ چھ آدمی رہتے ہیں وہ حسن بن صباح کے بھیجے ہوئے بڑے ہی خطرناک آدمی ہیں۔

"باطنیوں کو تم جانتی ہو نا حمیرا!" ـــــ منوّر نے کہا ـــــ "اسلام کا نام لے کر یہ فرقہ اسلام کا چہرہ مسخ کر رہا ہے اور اگر انہیں یہیں پر روکا نہ گیا تو اس اسلام کا نام و نشان مٹ جائے گا جو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا"۔

حمیرا نے وہ مکان دیکھا تھا جس میں جابر بن حاجب رہتا تھا اور اس نے جابر کے ساتھی بھی دیکھے تھے۔ اپنے بھائی کی یہ بات سن کر اسے افسوس ہُوا کہ جابر بھی باطنی ہے اور اس نے جھوٹ بولا ہے کہ وہ بغداد سے علم کی تلاش میں آیا ہے۔

"میرے عظیم بھائی!" حمیرا نے پوچھا "کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ لوگ باطنی ہیں؟"

"ابھی یقین نہ کہو" — منوّر نے جواب دیا — "شک پکّا ہے۔ کچھ لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ یہ پانچ چھ آدمی مشکوک ہیں"۔

داستان گو سنا چکا ہے کہ منوّر امیرِ شہر کے پاس گیا اور اسے بتایا تھا کہ یہ پانچ چھ آدمی ٹھیک معلوم نہیں ہوتے اور انہیں پکڑنا چاہئے لیکن امیرِ شہر نے ذرا سی بھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ منوّر مومن اور مجاہد قسم کا مسلمان تھا۔ اس نے حمیرا سے کہا کہ یہ اس کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے دشمنوں کا قلع قمع کرے لیکن یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ یہ لوگ واقعی باطنی ہیں اور تخریب کاری کی نیت سے یہاں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔

حمیرا نے بھائی سے کہا کہ اگر سوال اسلام کی سربلندی اور باطنیوں کی سرکوبی کا ہے تو وہ یہ راز نکال لائے گی۔ پہلے سنایا جا چکا ہے کہ وہ ان پانچ چھ آدمیوں کی اصل حقیقت معلوم کر لائی۔ اس نے یہ راز جابر بن حاجب سے لیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جابر کو حمیرا سے اتنی زیادہ محبت تھی کہ اُس نے حمیرا کو اپنا راز دے دیا۔ حمیرا کے دل میں بھی جابر کی بے پناہ محبت تھی لیکن اُسے جو محبت اپنے بھائی سے اور اسلام سے تھی، اس پر اُس نے اپنی محبت قربان کر دی۔ اس راز سے اس قلعہ بند شہر کے زمین و آسمان ہی تہ و بالا ہو گئے۔

قلعے میں خونریز ہنگامہ شروع ہُوا تو جابر حمیرا کے گھر جا پہنچا۔ اس وقت منوّر گھر نہیں تھا۔ وہ امیرِ شہر کے گھر میں تھا جہاں کچھ باطنی اس کے ساتھ تھے اور پھر امیرِ شہر کو قتل کر دیا گیا تھا۔ جابر نے حمیرا کو ساتھ لیا اور شہر سے نکل گیا۔

○

حمیرا اس توقع پر جا رہی تھی کہ جابر اسے بغداد اپنے گھر لے جا رہا ہے لیکن شام کے بعد جب وہ ایک جگہ رُکے تو حمیرا پر یہ انکشاف ہُوا کہ اسے بغداد نہیں بلکہ اَلَموت لے جایا جا رہا ہے۔

یہ اسے اس طرح پتہ چلا کہ وہ جب اپنے شہر سے نکلی تھی تو جابر اس کے ساتھ اکیلا تھا۔ دونوں گھوڑوں پر جا رہے تھے۔ جابر بہت ہی آہستہ رفتار پر جا رہا تھا۔ حمیرا نے اسے کہا کہ تیز چلنا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ اس کا بھائی تعاقب میں آ جائے۔ جابر نے اسے بتایا کہ

وہ اپنے ساتھیوں کے انتظار میں ہے۔ وہ بھی شہر سے نکل آئے ہوں گے۔ کچھ دیر بعد جابر کے پانچ ساتھی اس سے آ ملے۔ قلعے پر قبضہ کرنے کے لئے دوسرے باطنی پہنچ گئے تھے۔ جابر اور اس کے ساتھیوں کا کام ختم ہو گیا تھا۔ جابر نے قلعہ سر کرنے کے علاوہ ایک بڑا خوبصورت شکار بھی مار لیا تھا۔ حسن بن صباح جن لڑکیوں کو اپنے ابلیسی مقاصد کے لئے استعمال کرتا تھا، حمیرا اگر ان سے کچھ درجے زیادہ حسین نہیں تھی تو کسی سے کم بھی نہیں تھی۔ حمیرا کو الموت پہنچ کر کچھ ٹریننگ دینی تھی اور پھر اُسے حسن بن صباح کی جنّت میں حُور بنا کر داخل کرنا تھا۔

سورج غروب ہو گیا اور یہ چھوٹا سا قافلہ چلتا گیا اور جب رات زیادہ گہری ہو گئی تو یہ لوگ رک گئے۔ وہ کھانا اپنے ساتھ لے آئے تھے جو انہوں نے خود بھی کھایا اور حمیرا کو بھی کھلایا۔

انہوں نے حمیرا کی موجودگی میں ایسی باتیں کیں جن سے حمیرا کو یقین ہو گیا کہ اسے بغداد لے جایا جا رہا ہے جہاں جابر اس کے ساتھ شادی کر لے گا۔ کھانا کھا چکے تو انہوں نے سونے کا بندوبست اس طرح کیا کہ حمیرا کے لئے الگ چادر بچھا دی اور باقی آدمی اس سے ذرا پرے ہٹ کر لیٹ گئے۔ حمیرا پختہ کردار اور ایمان والی لڑکی تھی لیکن محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ گھر سے بھاگ آئی تھی۔ اس کی جذباتی کیفیت کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ وہ اپنے آپ میں بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ کبھی تو اس کو خیال آتا کہ اس نے گھر سے نکل کر کوئی غلط کام نہیں کیا۔ وہ فخر سے کہہ سکتی تھی وہ باعصمت لڑکی ہے اور محبت میں مبتلا ہو کر بھی اس نے اپنی عصمت کو داغ دار نہیں ہونے دیا۔ وہ اس خیال سے بھی خوش تھی کہ اس نے اپنے بھائی کو ناراض نہیں کیا اور اس کے آگے جھوٹ نہیں بولا لیکن فوراً ہی اس کا ضمیر لعنت ملامت کرنے لگا کہ ایک طرف تو وہ اسلام کی محبت کو دل میں لئے ہوئے ہے اور دوسری طرف اس نے ایک شہر باطنیوں کے حوالے کر دا دیا ہے۔ بیشک اس کے بھائی نے امیرِ شہر سے انتقام لیا تھا لیکن ایک شہر اور اس مسلمان شہر کی آبادی باطنیوں کے حوالے کر دینا ایک گناہ تھا۔

حمیرا کی ذات میں ایسی کشمکش پیدا ہو گئی کہ وہ بے چین ہی ہوتی چلی گئی اس کیفیت میں اسے نیند کیسے آتی!..... وہ دل ہی دل میں اللہ سے معافیاں مانگنے لگی۔ اپنے دل کی تسلّی کے لئے اپنے آپ کو سبز باغ بھی دکھائے۔ اس نے تصوّر میں دیکھا کہ وہ جابر کی

بیوی بن گئی ہے اور زندگی بڑی ہی پُرسکون ہو گئی ہے۔ جابر نے اُسے یہ تو بتا دیا تھا کہ اس کے ساتھی باطنی ہیں لیکن اپنے متعلق یہ بتایا تھا کہ وہ باطنی نہیں اور وہ ان آدمیوں کے ساتھ اس لئے رہتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے عقیدے اور نظریے معلوم کرنا چاہتا ہے اور جب اسے یہ سب کچھ معلوم ہو جائے گا تو پھر وہ حسن بن صباح کے عقیدوں کے خلاف تبلیغ کا فریضہ انجام دے گا۔

جابر حمیرا کے پاس آیا اور جھک کر اسے دیکھا۔ حمیرا نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ سوئی ہوئی ہے، آنکھیں بند کر لیں۔ جابر چلا گیا۔ وہ یہی دیکھنے آیا تھا کہ حمیرا سو گئی ہے یا نہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کے پاس جا بیٹھا۔ وہ حمیرا سے کوئی زیادہ دور نہیں تھے۔ یہی کوئی آٹھ دس قدموں کا فاصلہ ہو گا۔

"سو گئی ہے" ـــــ یہ جابر کی آواز تھی جو حمیرا کو سنائی دی۔

حمیرا پہلے ہی بیدار تھی، اس نے جابر کی یہ بات سنی تو وہ بالکل ہی بیدار ہو گئی اور اُس نے کان ان لوگوں کی طرف لگا دیے۔ اسے شک اس لئے ہُوا کہ جابر نے یہ بات کچھ اور ہی انداز سے کی تھی۔

"اسے شک تو نہیں ہُوا کہ ہم اسے کہیں اور لے جا رہے ہیں؟" ـــــ جابر کے ایک ساتھی نے پوچھا۔

"نہیں!" ـــــ جابر نے جواب دیا ـــــ "میں نے اسے شک نہیں ہونے دیا"۔

"خدا کی قسم!" ـــــ ایک نے کہا ـــــ "امام اسے دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔ اگر یہ چل پڑی تو ہو سکتا ہے امام اسے باہر بھیج دیں"۔

"میں تمہیں ایک بات بتا دوں دوستو!" ـــــ جابر نے کہا ـــــ "یہ تو تم جانتے ہو کہ میں اسے کس کام کے لئے لے جا رہا ہوں لیکن میں نے اس کے ساتھ جو محبت کی ہے اس میں کوئی دھوکہ اور فریب نہیں۔ میں اسے اپنی روح میں بٹھا چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے اپنے لئے کتنی بڑی دشواری پیدا کر لی ہے"۔

"اگر ایسی بات ہے تو شیخ الجبل کو پتہ نہ چلنے دینا" ـــــ ایک اور ساتھی بولا ـــــ "شیخ الجبل کو پتہ چل گیا کہ تم اس لڑکی کے معاملے میں جذباتی ہو تو تم جانتے ہو کہ تمہیں کیا سزا ملے گی"۔

"ہاں، جانتا ہوں" ـــــ جابر نے کہا ـــــ "امام اپنا خنجر دے کر مجھے کہے گا کہ یہ اپنے

دل میں اتار لو۔ میں محتاط رہوں گا کہ امام کو اپنی جذباتی حالت نہ بتاؤں"۔

حسن بن صباح کو اس کے پیروکار امام کہا کرتے تھے اور تاریخوں میں اسے شیخ الجبل کہا گیا ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں نے حمیرا کو سویا ہُوا سمجھ کر ایسی باتیں کیں جن سے حمیرا کے ذہن میں کوئی شک و شبہ نہ رہا کہ اسے دھوکے میں اَلموُت لے جایا جا رہا ہے۔ وہاں وہ اسی ابلیسیت کا ایک کل پرزہ بن جائے گی جس کے خلاف اُس کے دل میں نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ پہلے ہی بے چینی میں مبتلا تھی اب وہ یوں محسوس کرنے لگی جیسے اس کے اندر آگ بھڑک اٹھی ہو۔ اس نے پہلے تو یہ سوچا کہ ان لوگوں کے پاس چلی جائے اور کہے کہ وہ یہاں سے آگے نہیں جائے گی لیکن عقل نے اس کی راہنمائی کی۔ اس نے سوچا کہ یہ چھ آدمی ہیں اور یہ ان چھ آدمیوں سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ اس نے ان کے ہاتھوں مر جانے کا بھی فیصلہ کر لیا لیکن اس فیصلے پر قائم نہ رہ سکی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ جب یہ سب سو جائیں تو اٹھے اور دبے پاؤں ایک گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلے۔ اس پر اس نے غور کیا اور یہی فیصلہ کر لیا کہ یہ سو جائیں تو وہ بھاگ جائے گی۔

○

آدھی رات ہونے کو آئی تھی جب یہ چھ آدمی سونے لگے۔ جابر ایک بار پھر حمیرا کے قریب آیا اور جھک کر اسے دیکھا۔ حمیرا نے آنکھیں بند کر لیں۔ جابر یہ یقین کر کے کہ لڑکی سو گئی ہے اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔ پھر وہ سب سو گئے۔

حمیرا تو پوری طرح بیدار اور تیار ہو چکی تھی۔ اب اسے انتظار تھا کہ یہ اور زیادہ گہری نیند میں چلے جائیں تو وہ یہاں سے اٹھے اور نکلے۔ گھوڑے پندرہ بیس قدم دور بندھے ہوئے تھے۔ زینیں ان آدمیوں نے اپنے قریب رکھی ہوئی تھیں۔

حمیرا کو ان کے خراٹے سنائی دینے لگے۔ اس نے کچھ دیر اور انتظار کیا۔ آخر وہ اٹھی اور دبے پاؤں زینوں تک پہنچی۔ اس نے ایک زین اٹھا لی لیکن زین وزنی تھی۔ وہ زین اٹھا کر چلی تو زمین پر پڑی ہوئی ایک زین سے اس کا پاؤں ٹکرا گیا اور وہ گر پڑی۔ لوہے کی رکابیں آپس میں ٹکرائیں تو بڑی زور کی آواز اٹھی۔ رات کے سناٹے میں یہ آواز زیادہ ہی زوردار سنائی دی۔ جابر کی آنکھ کھل گئی۔ باقی ساتھی سوئے رہے۔ ادھر حمیرا اٹھی اُدھر جابر اٹھا اور حمیرا تک پہنچا۔

"کیا کر رہی ہو؟" ــــ جابر نے سرگوشی میں پوچھا تاکہ اس کے ساتھی نہ جاگ پڑیں ــــ "کیا تم گر پڑی تھیں؟"

"ہاں!" ــــ حمیرا نے کہا ــــ "میرے ساتھ آؤ"۔

حمیرا نے جابر کا بازو پکڑا اور اسے اس کے ساتھیوں سے دور لے گئی اور دونوں وہاں بیٹھ گئے۔

"مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" ــــ حمیرا نے پوچھا۔

"قلعہ اَلمُوت!" ــــ جابر نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

"اَلمُوت؟" ــــ حمیرا نے پوچھا ــــ "کیا ہم بغداد نہیں جا رہے؟"

"سُنو حمیرا!" ــــ جابر نے کہا ــــ "میں باطنی ہوں....."

"اور تم مجھے اس ابلیس حسن بن صباح کے حضور پیش کرو گے" ــــ حمیرا نے کہا ــــ "اور وہ مجھے اپنی بہشت کی حُور بنا دے گا..... جابر! میں نے رات تم سب کی باتیں سنی ہیں اور میں جانتی ہوں کہ باطنیوں کو مجھ جیسی خوبصورت لڑکیوں کی ضرورت ہوتی ہے"۔

"مجھے معلوم ہے تم سب کچھ جانتی ہو" ــــ جابر نے کہا ــــ "لیکن تم مجھے پوری طرح نہیں جان سکی۔ میں اپنے امام حسن بن صباح کے اُس گروہ کا آدمی ہوں جو کسی لڑکی کو یا کسی آدمی کو پھانسنے کے لئے ایسی جذباتی اور پُراثر باتیں کرتے ہیں کہ ان کا شکار ان کا گرویدہ ہو کر ان کے قدموں میں آگرتا ہے لیکن ان میں جذبات ہوتے ہی نہیں۔ کسی دوسرے کی جان لے لینا اور اپنی جان دے دینا میرے گروہ کے لئے ایک کھیل ہوتا ہے۔ ان لوگوں میں اپنی بہنوں اور اپنی ماؤں کے لئے بھی کوئی جذبات نہیں ہوتے لیکن حمیرا! تم پہلی لڑکی اور شاید آخری بھی ہو جس نے میرے دل کو اپنی مٹھی میں لے لیا ہے۔ اب کوئی ایسی ضرورت نہیں کہ میں تمہیں فریب اور جھانسے دیتا چلا جاؤں۔ اب تم پوری طرح ہمارے قبضے میں ہو۔ یہاں سے بھاگو گی تو کتنی دور تک پہنچ جاؤ گی؟..... اور پھر جاؤ گی کہاں؟..... اگر تم ہمارے قابو میں آؤ گی تو ہم تمہارے اس حسین جسم سے پورا پورا لطف اٹھا کر تمہیں قتل کر دیں گے"۔

"اور میں یہی صورت قبول کروں گی کہ اپنے آپ کو پہلے ہی ختم کر لوں" ــــ حمیرا نے کہا ــــ "میں مسلمان کی بیٹی ہوں۔ اپنا آپ کسی کے حوالے نہیں کروں گی"۔

"کیا تم میری پوری بات نہیں سنو گی؟" ــــ جابر نے کہا ــــ "میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اب میں تمہارے ساتھ محبت کی جو بات کر رہا ہوں یہ فریب نہیں۔ محبت میرے لئے ہمیشہ ایک سراب بنی رہی ہے اور میں اس سراب کے پیچھے دوڑتا اور بھٹکتا اور گرتا ہی رہا ہوں۔ میں گر گر کر اٹھا اور اٹھ اٹھ کر محبت کے سراب کے پیچھے دوڑتا رہا ہوں حتیٰ کہ میں اَلمُوت پہنچ گیا۔ میں کوئی لمبی چوڑی، کوئی میٹھی کڑوی باتیں نہیں کروں گا۔ مجھے محبت تم سے ملی ہے۔ میرے سوئے ہوئے اور فریب خوردہ جذبات کو تم نے جگایا ہے۔ تم اتنا کرو کہ خاموشی سے اور اطمینان سے میرے ساتھ چلی چلو۔ ہمارا طریقہ یہ ہے کہ لڑکی کو پھانس کر لاتے ہیں اور اَلمُوت کی جنّت میں داخل کر دیتے ہیں۔ ایسی لڑکیوں کو سنبھالنے اور اپنے راستے پر چلانے والے وہاں موجود ہیں۔ وہ دو تین دنوں ہی میں اس کے ذہن پر اور دل پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ پھر کوئی لڑکی وہاں سے بھاگنے کے متعلق سوچتی ہی نہیں لیکن حمیرا! میں ایسے نہیں کروں گا۔ میں اپنی روحانی محبت کا جو تم سے ہے، پورا پورا ثبوت پیش کروں گا..... دیکھ حمیرا! ہر انسان اُس عقیدے کو اور اُس مذہب کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے جو اسے باپ سے ورثے میں ملا ہے۔ عقیدے غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ انسان جب سے پیدا ہُوا ہے عقیدوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا چلا آیا ہے۔ میں تمہیں اسلام کے راستے سے نہیں ہٹا رہا۔ ہمارا امام حسن بن صباح اسلام کا شیدائی ہے۔ تم چل کے دیکھو۔ اگر یہ عقیدہ تمہارے دل نے قبول کر لیا تو وہاں رہنا، ورنہ مجھے اپنا قائل کر لینا اور میں تمہارے ساتھ بغداد چلا چلوں گا۔ میں تم سے محبت کے نام پر وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اَلمُوت میں کسی کے حوالے نہیں کروں گا، اپنے پاس رکھوں گا"۔

خنک اور خاموش رات گزرتی جا رہی تھی اور جابر اپنی زبان کا جادو جگا رہا تھا۔ اس کے دل میں حمیرا کی محبت تو تھی ہی لیکن اس دل میں حسن بن صباح بھی موجود تھا۔ حمیرا پر غنودگی اور خاموشی طاری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اتنا تو تسلیم کرتی تھی کہ وہ تنہائیوں میں جابر سے ملتی رہی تھی لیکن جابر نے کبھی اشارتاً بھی ایسی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا کہ اس کی ساری دلچسپیاں اور چاہتیں حمیرا کے جسم کے ساتھ ہیں۔ اب آبادیوں سے دور جنگل میں جہاں حمیرا کو اس شخص سے بچانے والا کوئی بھی نہ تھا، جابر نے نفسانی خواہش کا ذرا جتنا بھی اظہار نہیں کیا تھا۔ حمیرا جابر کو ہی اپنا ہمسفر اور محافظ سمجھ رہی تھی

اور اُس نے اس شرط پر جابر کی ہمسفر رہنا قبول کر لیا کہ وہ الموُت جا کر دیکھے گی کہ وہاں کیا ہے اور اس کا دل کیا کہتا ہے۔

اگلی صبح یہ قافلہ اپنی منزل کو روانہ ہو گیا۔

○

سلجوقی سلطان ملک شاہ کو دفن ہوئے دو مہینے اور کچھ دن گزر گئے تھے۔ یہی ایک طاقت تھی جو حسن بن صباح کی ابلیسیت کے سیلاب کو روک سکتی تھی۔ گو اس طاقت کو اب تک ناکامی کا ہی منہ دیکھنا پڑا تھا لیکن یہ طاقت ہاری نہیں تھی اور نئی تیاریوں میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس کا مقصد اور نصب العین صرف یہ تھا کہ حسن بن صباح کی جنت کو اس کے لئے اور اس کے فدائین کے لئے جہنم بنا دیا جائے لیکن ملک شاہ ایک فدائی کا شکار ہو گیا۔ اگر اس کا بڑا بیٹا برکیارق جو اس کی جگہ اس عظیم سلطنت کا سربراہ بنا تھا' اپنے باپ جیسا ہوتا تو یہ طاقت فردوسِ ابلیس پر بجلی بن کر گرتی لیکن برکیارق اُسی قاتل کی بہن کی زلفوں کا اسیر ہو گیا تھا جس نے صرف اسے ہی نہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ کو بھی یتیم کر دیا تھا۔

یہ لڑکی جس کا نام روزینہ تھا' اس قاتل کی بہن نہیں تھی۔ وہ تو حسن بن صباح کی بھیجی ہوئی لڑکی تھی جس نے مرؔو میں خانہ جنگی کا بیج بونا تھا۔ قاتل نے اپنا کام کر دیا تھا اور روزینہ مقتول کے جانشین کو اپنے طلسماتی حسن میں گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ یہ بھی اس کی کامیابی تھی کہ اس نے برکیارق کی ماں اور اس کے خاندان کے دیگر اہم افراد سے منوا لیا تھا کہ وہ اس قاتل کی بہن ہے۔ داستان گو پہلے تفصیل سے سنا چکا ہے کہ روزینہ نے کیسی حیران کن مہارت سے پورے خاندان کی ہمدردیاں حاصل کر لی تھیں۔

وہ لوگ اس خاندان کے خون کے رشتہ دار نہیں تھے جو کہتے تھے کہ یہ لڑکی مشکوک ہے اور خطرناک بھی لیکن برکیارق کسی کی سنتا ہی نہیں تھا۔ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرے گا۔ سلطان ملک شاہ کا چہلم ہو چکا تھا۔ کئی دن گزر گئے تھے۔ اب کسی بھی دن برکیارق نے روزینہ کے ساتھ شادی کر لینی تھی۔

مزمّل آفندی اور شمونہ کی محبت کا پہلے ذکر آ چکا ہے۔ ان کی محبت صرف اس لئے نہیں تھی کہ دونوں جوان تھے اور خوبصورت بھی تھے اور پہلی نظر میں ہی ایک دوسرے

کے ہو گئے تھے بلکہ ان کی محبت کی ایک بنیاد تھی اور اس کے پس منظر میں ایک مقصد تھا جو ان دونوں میں مشترک تھا۔ یہ تھی حسن بن صباح کی نفرت اور یہ ارادہ کہ اس ابلیس کو قتل کرنا ہے۔

شمونہ حسن بن صباح کی داشتہ اور آلۂ کار رہ چکی تھی۔ اس نے حسن بن صباح کے لئے کچھ کام بڑی کامیابی سے کئے تھے لیکن اللہ نے اسے روشنی دکھائی اور وہ پھر واپس اسلام کی گود میں آ گری۔ ابو مسلم رازی نے جو سلطنتِ سلجوقیہ کے دوسرے بڑے شہر کا امیر تھا' شمونہ کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔ اس حسین و جمیل لڑکی کے دل میں انتقام کے شعلے اٹھ رہے تھے۔

مزمّل آفندی حسن بن صباح کو قتل کرنے گیا تھا مگر خواجہ حسن طوسی کو قتل کرنے واپس آ گیا تھا۔ یہ تو شمونہ کی محبت اور شاہی طبیب نجم مدنی کا کمال تھا کہ انہوں نے مزمّل آفندی کے ذہن سے حسن بن صباح کے اثراتِ بد نکال دیئے تھے اور وہ اپنی اصلیت میں واپس آ گیا تھا۔ مزمّل بھی انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔

مزمّل اور شمونہ ملتے اور گھنٹوں اکٹھے بیٹھے رہتے تھے۔ شمونہ اور اس کی ماں کو جس کا نام میمونہ تھا' سلطان ملک شاہ نے ایک مکان دے دیا اور ان کا وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ مزمل اپنے کاروبار میں لگ گیا تھا لیکن وہ اور شمونہ اپنے مشترک مشن کی تکمیل کے لئے تڑپتے رہتے تھے۔ ایک روز مزمل شمونہ کے گھر میں آیا بیٹھا تھا۔ شمونہ کی ماں نے انہیں کہا کہ وہ شادی کر لیں۔ اس نے وجہ یہ بتائی کہ وہ دونوں جوان ہیں اور اکٹھے بیٹھتے اٹھتے ہیں اور اس سے لوگ شک کرتے ہیں اور ہو سکتا ہے لوگ انہیں بدنام کر دیں اور سلطان برکیارق کے کان بھرنے شروع کر دیں جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا..... میمونہ نے دوسری دلیل یہ دی کہ وہ دونوں جوان ہیں اور ایک دوسرے کو روحوں کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جذبات سے مغلوب اور اندھے ہو کر وہ گناہ کر بیٹھیں جس کی بخشش ذرا مشکل سے ہی نہیں بلکہ ہوتی ہی نہیں۔

مزمّل نے کوئی بات نہ کی۔ اس نے شمونہ کی طرف دیکھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اپنی ماں کو شمونہ خود ہی کوئی جواب دے۔

"میری ایک بات یقین سے سنو ماں!" ــــ شمونہ کہا ــــ "اگر میری اور مزمّل کی محبت جسمانی ہوتی تو اب تک ہم میاں بیوی بن چکے ہوتے' اگر یہ نہ ہوتا تو ہم وہ گناہ کر

چکے ہوتے جس کا تمہیں ڈر ہے..... ہماری محبت روحوں کا عشق ہے' ہمارا نصب العین ایک اور راستہ ایک ہے۔ ہمارے سروں پر اللہ کا ہاتھ ہے اور ہم دونوں کا اللہ حامی اور ناصر ہے۔ مجھے جس روز یہ اشارہ ملا کہ مزمّل کو میرے حسن اور میرے جسم کے ساتھ محبت ہے تو اُسی روز میرے اور اس کے راستے الگ ہو جائیں گے"۔

"شمونہ بیٹی!" ــــ میمونہ نے کہا ــــ "میں نے دنیا دیکھی ہے۔ حسن اور جوانی میں وہ طاقت....."

"مجھے اپنے حسن اور اپنی جوانی سے نفرت ہے ماں!" ــــ شمونہ نے جھنجھلا کر کہا ــــ "اس حسن اور جوانی نے مجھے اس ذلیل انسان کے قدموں میں جا پھینکا تھا۔ مجھے اپنے اس جسم سے نفرت ہوتی جا رہی ہے جسے لوگ اتنا زیادہ پسند کرتے ہیں..... میرے پاس روح رہ گئی ہے۔ اس کا مالک مزمّل ہے۔ میں جو کچھ بھی ہوں' پاک ہوں' پلید ہوں' مزمّل کی ہوں لیکن شادی ہمارا نصب العین نہیں۔ میں لوگوں کے لئے بڑا ہی حسین دھوکہ بنی رہی تھی۔ میں نے اللہ کو ناراض کیا۔ اللہ نے مجھے ایمان کی روشنی بخشی۔ اس کے شکرانے کے لئے یہ میرا فرض ہے کہ اللہ کو راضی کروں اور اپنی روح کو پاک کروں پھر میں اپنا آپ ایک بیوی کے طور پر مزمّل کو پیش کروں گی۔ کیوں مزمل کیا تمہیں میری اس بات سے اختلاف ہے؟"

"نہیں شمونہ!" مزمل نے جواب دیا ــــ "میں بولتا تو میں بھی یہی کہتا جو تم نے کہا ہے۔ ہم نے سب سے پہلے اپنا مقصد پورا کرنا ہے..... تم نے ماں کو یہ جواب دے کر میرے ایمان' میرے کردار اور میرے عزم کو نئی تازگی دی ہے..... حسن بن صباح کو قتل کرنا ہماری زندگی کا مقصد ہے"۔

"یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں کہہ ہی دیتی ہوں" ــــ شمونہ نے مزمل سے کہا ــــ "میں اپنی ذات کو اور اپنے وجود کو مزمل کے بغیر نامکمل سمجھتی ہوں"۔

دونوں نے میمونہ کو یقین دلا دیا کہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں کہتے رہیں لیکن وہ اس گناہ کا تصور بھی اپنے ذہن میں نہیں لائیں گے جس کی طرف میمونہ نے اشارہ کیا تھا۔

"ایک بات بتاؤ مزمّل" ــــ شمونہ نے پوچھا ــــ "تم نے پھر برکیارق کو نہیں کہا کہ یہ لڑکی مشکوک ہے؟"

"ایک ہی بار کہہ کر دیکھ لیا تھا" ــــ مزمّل نے کہا ــــ "اس نے مجھے ڈانٹ کر

چپ کرا دیا تھا۔ میں تو ابھی تک اسے دوست سمجھ رہا تھا لیکن وہ جس لہجے میں بولا اس سے مجھے یاد آ گیا کہ یہ شخص اب دوست نہیں بلکہ سلطان بن گیا ہے"۔

"تم رے کیوں نہیں چلے جاتے!" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "تم ابو مسلم رازی سے بات کر کے دیکھو۔ وہ اتنے بڑے شہر اور اتنے وسیع علاقے کا حاکم ہے۔ سلطان ملک شاہ مرحوم کا وہ خاص معتمد اور مشیر تھا۔ ہو سکتا ہے وہ برکیارق کو سمجھا بجھا کر اس لڑکی سے شادی کرنے سے روک دے"۔

"ابو مسلم رازی سلطان ملک شاہ مرحوم کا معتمد اور مشیر تھا" ــــ مزمّل نے کہا ــــ "برکیارق اس کی بھی نہیں مانے گا۔ تم شاید نہیں جانتیں کہ برکیارق روزینہ کے لئے پاگل ہوا جا رہا ہے..... ابو مسلم رازی برکیارق کی شادی پر آ رہا ہے۔ اس سے پہلے اسے ملنا بیکار ہے۔ شادی تو ہونی ہی ہے۔ میں ابو مسلم رازی سے کہوں گا کہ روزینہ کو کسی طرح غائب کیا جائے۔ ابھی تو کوئی بھی نہیں بتا سکتا کہ روزینہ کیا کر گزرے گی مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے ہاتھ دکھائے گی ضرور پھر برکیارق زندہ رہا تو باقی عمر پچھتاتا رہے گا"۔

"شادی ہو جانے دو" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "میں روزینہ کے ساتھ دوستی لگانے کی کوشش کروں گی۔ اگر میں کامیاب ہو گئی تو اسے زہر پلا دوں گی"۔

سلطان ملک شاہ مرحوم تو حسن بن صباح اور اس کے باطنی فرقے کا دشمن تھا ہی لیکن ابو مسلم رازی کی تو زندگی کا جیسے مقصد ہی یہی تھا کہ اس فرقے کا نام و نشان ہی مٹا دیا جائے۔ وہ تو صاف الفاظ میں کہا کرتا تھا کہ یہ کام تبلیغ سے نہیں ہو گا' یہ کام صرف تلوار سے ہو سکتا ہے۔ اس داستان کے آغاز میں سنایا جا چکا ہے کہ جب حسن بن صباح کو اتنی شہرت نہیں ملی تھی اور وہ ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ ابو مسلم رازی نے اس کی گرفتاری کا حکم دے دیا تھا لیکن کسی طرح حسن بن صباح کو قبل از وقت پتہ چل گیا اور وہ رے سے غائب ہو گیا تھا۔

برکیارق اور روزینہ کی شادی کا دن آ گیا۔ بارات نے تو کہیں جانا نہیں تھا' دلہن سلطان کے محل میں موجود تھی۔ سلطان برکیارق کے حکم سے سارے شہر میں رات کو چراغاں کی گئی اور اس شادی پر جو ضیافت دی گئی اس کے چرچے تاریخ تک پہنچے اور آج تک سنائی دے رہے ہیں۔ ایک دعوتِ عام تھی۔ امراء اور وزراء اور دیگر رُتبوں والے

افراد کے لئے الگ انتظام تھا اور شہریوں کے لئے باہر کھلے میدان میں کھانا رکھا گیا تھا۔ دور دور سے ناچنے گانے والے آئے تھے۔ ناچنے والیوں نے بھی آ کر اپنے فن کے مظاہرے کئے اور سب نے سلطان سے انعام وصول کئے۔

یہ ہنگامہ خیز شادی جس پر خزانے کا منہ کھول دیا گیا تھا' یہ انداز اس خاندان کی روایت کے منافی تھے۔ سلطان ملک شاہ مرحوم ہردلعزیز سلطان تھا۔ اسے فوت ہوئے ابھی دو مہینے اور کچھ دن گزرے تھے۔ لوگ اس کے غم میں نڈھال ہوئے جا رہے تھے لیکن برکیارق کی شادی کے دن لوگ سلطان مرحوم کا غم جیسے بھول ہی گئے تھے۔ برکیارق کا مقصد ہی یہی تھا۔

جب اندر نکاح وغیرہ ہو رہا تھا' اُس وقت مزمّل آفندی رے کے امیر ابو مُسلم رازی کے پاس جا بیٹھا۔ برکیارق کے دونوں چھوٹے بھائی' محمد اور سنجر' بھی ان کے پاس آ بیٹھے۔ یہ دونوں بھائی خاصے مغموم تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ ایک تو انہیں اپنا باپ یاد آ رہا ہے اور دوسرے' یہ کہ یہ اپنے بھائی کی شادی پر خوش نہیں۔

"امیرِ محترم!" ـــ مزمّل نے ابو مسلم رازی سے کہا ـــ "آپ جب سلطان مرحوم کی وفات پر یہاں آئے تھے تو مجھے آپ کے ساتھ بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب میں نے موقع نکالا ہے۔ کیا آپ کو کسی نے پہلے بتایا ہے کہ ہمارے نئے سلطان کی دلہن باطنی ہے اور یہ اپنے آپ کو سلطان مرحوم کے قاتل کی بہن ظاہر کرتی ہے؟"

"ہاں مزمّل آفندی!" ـــ ابو مسلم رازی نے جواب دیا ـــ "میرے مخبری کے ذرائع ایسے ہیں کہ زمین کے نیچے کی ہوئی بات بھی میرے کانوں تک پہنچ جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے"۔

"سلطان برکیارق کی دلہن سلطان مرحوم کے قاتل کی بہن نہیں" ـــ مزمّل نے کہا ـــ "یہ اس کے ساتھ اَلموُت سے آئی تھی۔ کیا آپ اس کے متعلق کچھ سوچ رہے ہیں؟"

"میں سب کچھ سوچ چکا ہوں" ـــ ابو مسلم رازی نے کہا ـــ "اور سوچ بھی رہا ہوں۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟"

"امیرِ محترم!" ـــ مزمّل نے جواب دیا ـــ "میں یہی سوچ رہا ہوں کہ یہ لڑکی نہ جانے کیا گل کھلائے گی۔ آپ سے میں نے صرف یہ کہنا ہے کہ جہاں کہیں آپ کو میری

ضرورت پڑے مجھے فوراً بلائیں۔ آپ اس لڑکی کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں جس کا نام شمونہ ہے۔ وہ آگ بگولہ بنی بیٹھی ہے۔ آپ اسے بھی استعمال کر سکتے ہیں"۔

"تم کسی بھی دن رے آ جاؤ" ـــ ابو مُسلم رازی نے کہا ـــ "اطمینان سے بیٹھیں گے اور کچھ سوچ لیں گے"۔

"کیا یہ لڑکی ہمارے بھائی کو مار ڈالے گی؟" ـــ برکیارق کے بھائی محمد نے پوچھا۔

"شاید نہیں!" ـــ ابو مسلم رازی نے کہا ـــ "یہ لڑکی سلطان برکیارق کو اپنے قبضے میں رکھے گی اور اس کی توجہ حسن بن صباح سے ہٹا دے گی۔ مجھے اطلاعیں مل رہی ہیں۔ سلطان مرحوم کی وفات کے بعد باطنیوں کی تبلیغ بہت تیز ہو گئی ہے اور ان کے اثرات دور دور تک پھیلنے شروع ہو گئے ہیں۔ میں صرف یہ دیکھ رہا ہوں کہ سلطان برکیارق کیا کرتے ہیں"۔

"ہمارا بھائی برکیارق کچھ بھی نہیں کرے گا" ـــ محمد نے کہا ـــ "ہم اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ ہم دونوں بھائی دیکھ رہے ہیں کہ برکیارق کا رویّہ ہمارے ساتھ بالکل ہی بدل گیا ہے جیسے ہم اس گھر میں مہمان آئے ہوئے ہوں اور دو چار دنوں بعد رخصت ہو جائیں گے"۔

"ایک خیال کرنا محمد!" ـــ ابو مسلم رازی نے کہا ـــ "اور تم بھی سنجر! اگر برکیارق یا اس کی بیوی کوئی بدتمیزی یا تمہارے ساتھ بُرا رویّہ اختیار کرے تو خاموش رہنا۔ میں ابھی ایک بات زبان پر نہیں لانا چاہتا تھا مگر تم لوگوں کو ذرا سا اشارہ دے ہی دوں تو بہتر ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ اس لڑکی کے ذریعے حسن بن صباح ہماری سلطنت میں خانہ جنگی کرانا چاہتا ہے۔ خانہ جنگی کیسے ہو گی؟ اس پر ابھی نہ سوچو' میں موجود ہوں۔ تم دونوں بھائی چوکنّے رہنا..... اور تم مزمّل! اِدھر اُدھر دھیان رکھنا۔ جونہی کوئی بات معلوم ہو میرے پاس آ جانا"۔

○

اگلے روز دعوتِ ولیمہ دی گئی جو شادی کی ضیافت جیسی ہی تھی۔ امراء' وزراء اور دیگر اعلیٰ سرکاری رتبوں والے افراد فرداً فرداً سلطان برکیارق کو مبارکباد کہنے گئے۔ برکیارق نے ہر ایک سے کہا کہ یہ لوگ تین چار دن یہیں رہیں کیونکہ وہ ان سے خطاب کرے گا۔

یہ لوگ رُکے رہے۔ پانچویں روز برکیارق نے ان سب کو اکٹھا کر کے خطاب کیا۔ یہ ایک تاریخی اہمیت کا خطاب تھا۔ تاریخی اہمیت کی وجہ یہ تھی کہ نئے سلطان نے سلطنتِ سلجوقیہ کی گاڑی اُلٹے رُخ چلا دی تھی۔ تاریخوں میں آیا ہے کہ اس نے اس خطاب میں جو نئے اعلان کئے وہ کچھ اس طرح تھے:

نیا وزیرِ اعظم عبدالرحمٰن سمیری ہو گا۔

انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں گی۔

حسن بن صباح کا مقابلہ تبلیغ سے کیا جائے گا کیونکہ وہ ایک مذہبی فرقہ ہے جسے فوجی طاقت سے نہیں دبایا جا سکتا۔ سلطان برکیارق نے زور دے کر کہا کہ پہلے بہت زیادہ جانی نقصان کرایا جا چکا ہے جو اب ختم کیا جا رہا ہے۔

محصولات زیادہ کئے جائیں گے۔

وہاں جتنے بھی امراء' وزراء اور سالار وغیرہ بیٹھے تھے وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ سب نے نمایاں طور پر محسوس کیا کہ سلطان نشے کی حالت میں بول رہا ہے۔ یہ نشہ سلطانی کا بھی تھا اور روزینہ کے حسن و جوانی کا بھی۔

"سلطانِ محترم!" — ابو مسلم رازی بے قابو ہو کر بول پڑا — "حسن بن صباح ایک خطرناک فتنہ ہے اور اسلام کا بدترین دشمن..... نظام الملک اور سلطان ملک شاہ کا قاتل حسن بن صباح ہے"۔

سلطان برکیارق نے ابو مسلم رازی جیسے عالم' مجاہد اور بزرگ کو آگے بولنے نہ دیا۔

"اب کوئی قتل نہیں ہو گا" — سلطان برکیارق نے کہا — "یہ سوچنا میرا کام ہے..... آپ کا نہیں..... آپ رہے میں امن و امان قائم رکھیں"۔

سلطان برکیارق کی اس نئی حکمتِ عملی سے سب کو اختلاف تھا لیکن جس طرح اس نے ابو مسلم رازی کو ٹوک کر اپنا حکم چلایا اس سے سب خاموش رہے۔ سب نے جان لیا کہ یہاں بولنا بے کار ہے۔ یہ سب چھوٹے بڑے حاکم سلطان برکیارق کے باپ کے وقتوں کے تھے اور سب کی عمریں اس کے باپ جتنی تھیں لیکن برکیارق نے کسی ایک کا بھی احترام نہ کیا اور کسی کو وہ تعظیم بھی نہ دی جو سرکاری طور پر ان کا حق تھا۔ وہ اپنا خطاب ختم کر کے وہاں سے چلا گیا۔

باہر آ کر سب نے آپس میں کھسر پھسر کی مگر اونچا کوئی بھی نہ بولا۔ بعض پر تو حیرت

کی خاموشی چھا گئی تھی۔ ابو مسلم رازی برکیارق کی ماں کے پاس چلا گیا۔ اس گھر میں اس کی اتنی قدر و منزلت ہوتی تھی جیسے وہ اسی خاندان کا ایک فرد ہو۔ برکیارق کی ماں اسے دیکھ کر رونے لگی۔

"مجھے غم تھا کہ میں بیوہ ہو گئی ہوں" — ماں نے کہا — "لیکن ایک اور غم یہ آ پڑا ہے جیسے میرا بیٹا برکیارق بھی مر گیا ہو۔ روزینہ اس پر نشے کی طرح طاری ہو گئی ہے۔ ولیمے کے بعد میرا بیٹا باہر نکلا ہی نہیں۔ کیا دن کیا رات' وہ دلہن کے ساتھ کمرے میں بند رہا۔ کل شام دونوں کبھی پر باہر نکلے تو میں ان کی خواب گاہ میں چلی گئی۔ خادمہ برتن اٹھا رہی تھی۔ دو چاندی کے پیالے پڑے تھے۔ پاس ایک صراحی رکھی تھی۔ میں نے پیالے سونگھے تو عجیب سی بُو آئی۔ یہ اگر شراب نہیں تھی تو کوئی اور مشروب نہیں بلکہ یہ کوئی اور نشہ تھا"۔

"آپ اتنے بھی پریشان نہ ہو جائیں" — ابو مسلم رازی نے برکیارق کی ماں کو جھوٹی تسلی دیتے ہوئے کہا — "یہ آپ کے بیٹے کا نہیں یہ جوانی کا قصور ہے۔ کچھ دنوں بعد نشہ اُتر جائے گا اور مجھے امید ہے کہ لڑکا اپنے خاندان کے راستے پر آ جائے گا"۔

"میں نے دنیا دیکھی ہے" — برکیارق کی ماں نے کہا — "میں اپنے آپ کو یہ دھوکہ کس طرح دوں کہ یہ بیٹا اپنے باپ کے راستے پر واپس آ جائے گا۔ ہم نے بھی جوانی دیکھی ہے۔ سلطان مرحوم کے ساتھ میری شادی ہوئی تھی تو میں اس لڑکی جیسی خوبصورت تھی اور کمسن بھی تھی۔ سلطان مرحوم کبھی میرے ساتھ کمرے میں بند نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک نشہ نہیں بنایا بلکہ ایک خوبصورت بیوی سمجھ کر اس حیثیت میں رکھا جو بیوی کو اسلام نے دی ہے..... خوبصورت عورت بجائے خود ایک نشہ ہوتی ہے۔ اللہ نے مرد میں کمزوری رکھ دی ہے کہ وہ حسین عورت کے ہاتھوں میں کھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ چالاک اور مطلب پرست عورت جس مرد پر بدنیتی سے یا اپنے مطلب کے لئے قبضہ کرنا چاہتی ہے اس کے دل میں بلکہ روح میں اترتی چلی جاتی ہے' حتیٰ کہ وہ شخص اس عورت کا زر خرید غلام ہو جاتا ہے۔ ایسی بدفطرت عورت مرد کو اس مقام تک پہنچا دیتی ہے جہاں سے اس کی واپسی ناممکن ہو جاتی ہے۔ اُس مقام پر جا کر اسے سُود و زیاں کا احساس ہی نہیں رہتا۔ وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور اس احساس سے بیگانہ ہو جاتا ہے کہ اس کی تباہی کی ذمہ داری یہ عورت ہے اور وہ اس عورت کا پجاری

بن جاتا ہے..... عورت کے ہاتھوں بادشاہیاں لُٹ گئی ہیں"۔

ابو مسلم رازی جانتا تھا کہ سلطان ملک شاہ مرحوم کی بیوہ جو کہہ رہی ہے ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ مشاہدے کی باتیں تھیں لیکن اب تو یہ سوچنا تھا کہ بر یارق کو کس طرح اس لڑکی کے نشے سے نکالا جائے۔ ابو مسلم نے اس خاتون کو جھوٹی سچی تسلیاں دیں اور کہا کہ وہ نظر رکھے گا اور کوشش کرے گا کہ سلطنت کا وقار قائم رہے۔

○

اس سے کچھ عرصہ پہلے حمیرا جابر کے ساتھ قلعہ الموت پہنچ گئی تھی۔ ان لوگوں کا طریقہ کار یہ تھا کہ کوئی آدمی کسی لڑکی کو ورغلا کر الموت لاتا تو اس لڑکی کو لڑکیوں کے گروہ کے نگران کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی لڑکی اکھڑپن پر اتر آتی اور ان لوگوں کی بات پر آنے سے انکار کر دیتی تو ان کے پاس اس کا بھی علاج موجود تھا۔ ایک علاج تو تشدد اور زبردستی تھی لیکن یہ علاج کم سے کم استعمال کیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کے پاس بڑے ہی پیارے اور دل کو لبھانے والے طریقے تھے جو بڑی اکھڑ لڑکیوں کو بھی موم کر لیتے تھے۔

جابر کو یہی کرنا چاہئے تھا کہ وہ حمیرا کو متعلقہ گروہ کے نگران کے حوالے کر دیتا۔ اس کا کام ہو گیا تھا لیکن جابر نے اس مروجہ طریقہ کار سے انحراف کیا اور حمیرا کو اپنے ایک دوست کے گھر لے گیا۔

اس کا یہ دوست تھا تو باطنی لیکن وہ فدائین میں سے نہیں تھا نہ کبھی اسے ذمہ داری کا کوئی کام سونپا گیا تھا۔ اس دوست نے جابر سے کہا کہ وہ کیوں اس لڑکی کو ساتھ لئے اور چھپائے پھرتا ہے۔ اسے ان کے حوالے کیوں نہیں کر دیتا جو نئی آنے والی لڑکیوں کو اپنے ابلیسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں!

"نہیں بھائی!" ــــ جابر نے اپنے دوست سے کہا ــــ "اس لڑکی کے ساتھ میرا کچھ جذباتی سا تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ اسے آخر اسی جگہ بھیجنا ہے جس جگہ کے لئے میں اسے ساتھ لایا ہوں لیکن اس سے مجھے ایسی محبت ہو گئی ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میں اسے کسی اور کے حوالے کروں۔ میں اسے خود تیار کروں گا"۔

دراصل جابر کو حمیرا سے محبت ہی اتنی زیادہ تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ اسے باطنیوں کے مقاصد کے لئے تیار بھی کر لے اور یہ لڑکی اس سے متنفر بھی نہ ہو۔ دوست نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ حمیرا کو ایک بار حسن بن صباح کے سامنے لے جائے اور اس سے

درخواست کرے کہ وہ اس لڑکی کو خود تیار کرنا چاہتا ہے۔ دوست نے اسے یہ مشورہ اس لئے دیا تھا کہ وہ کبھی اس لڑکی کے ساتھ پکڑا گیا یا کسی کو پتہ چل گیا کہ جابر نے ایک لڑکی کو اپنے قبضے میں رکھا ہوا ہے تو اسے موت سے کم سزا نہیں ملے گی۔

جابر نے اس مشورے کو بڑا قیمتی مشورہ جانا اور ایک روز حمیرا کو حسن بن صباح کے پاس لے گیا۔ حمیرا جانا تو نہیں چاہتی تھی لیکن اس نے سوچا کہ اس انسان کو ایک بار دیکھ تو لے جس نے ایک باطل عقیدے کو اتنی جلدی اور اتنی دور دور تک پھیلا دیا ہے۔ حمیرا نے یہ بھی سنا تھا کہ حسن بن صباح اپنے کسی فدائی سے کہتا ہے کہ اپنی جان لے لو تو وہ فدائی اپنے آپ کو مار دینے میں ذرا سی بھی ہچکچاہٹ نہیں دکھاتا اور وہ فوراً" خنجر اپنے سینے میں اتار لیتا ہے۔ حمیرا نے سوچا دیکھوں تو سہی کہ وہ انسان کیسا ہے۔

جابر اسے سیدھا حسن بن صباح کے پاس نہ لے گیا بلکہ اسے ایک جگہ چھوڑ کر پہلے خود حسن بن صباح کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ وہ اس لڑکی کو لایا ہے جس کے بھائی نے انہیں قستان جیسا اہم قلعہ دلایا ہے۔ حسن بن صباح کو معلوم تھا کہ یہ قلعہ بند شہر کس طرح اس کے قبضے میں آیا ہے۔ جابر نے حسن بن صباح کو پوری تفصیل سنائی۔

"تم اب چاہتے کیا ہو؟" ــــ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"یا شیخ الجبل!" ــــ جابر نے کہا ــــ "میں اس لڑکی کو کچھ انعام دینے کی درخواست کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں اسے خود تیار کروں۔ اس پر تشدد نہ ہو یا اسے حشیش نہ پلائی جائے اور اسے دھوکے میں بھی نہ رکھا جائے۔ اگر میں اسے بقائمی ہوش و حواس تیار کر لوں تو یہ لڑکی پہاڑوں کو آپ کے قدموں میں جھکا دے گی"۔

"میرا خیال ہے کہ تم خود انعام لینا چاہتے ہو" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی سے بڑھ کر اور انعام کیا ہو سکتا ہے..... کیا تم انعام کے طور پر اس لڑکی کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہو؟"

"یا شیخ الجبل!" ــــ جابر نے سر جھکا کر کہا ــــ "جس روز میرے دل میں یہ آئی کہ میں اپنے امام کو دھوکہ دوں اُس روز میں اپنے خنجر سے اپنے آپ کو ختم کر لوں گا..... میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ لایا ہوں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ کے پاس تھوڑی سی دیر بیٹھی تو اس کا اکھڑپن ختم ہو جائے گا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس لڑکی کے دل میں آپ کی اور ہم سب کی نفرت بھری ہوئی ہے۔ میں یہ بھی عرض کر دیتا ہوں کہ اس کے

دل میں میری محبت موجزن ہے۔ آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں"۔

حسن بن صباح کے اشارے پر جابر اٹھا اور باہر جا کر حمیرا کو اپنے ساتھ لے آیا۔ حمیرا حسن بن صباح کے سامنے بیٹھ گئی۔ حسن بن صباح کے ہونٹوں پر تبسّم تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اس شخص کی آنکھیں بھی مسکرا رہی ہوں۔ ان مسکراتی آنکھوں نے حمیرا کو جیسے جکڑ لیا ہو اور حمیرا کی آنکھوں میں پلک جھپکنے کی بھی سکت نہ رہی ہو۔ حمیرا نے محسوس کیا کہ جیسے حسن بن صباح کی آنکھوں سے غیر مرئی اور بڑے پیارے رنگوں والی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں اور شعاعیں حمیرا کی آنکھوں کے ذریعے اس کے جسم میں داخل ہو رہی ہوں۔ حمیرا اپنی ذات میں تبدیلی سی محسوس کرنے لگی۔ اس کے اندر ایسا احساس بیدار ہونے لگا جیسے حسن بن صباح اتنا قابلِ نفرت نہیں ہے جتنا وہ سمجھتی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ حسن بن صباح نے یہ پُراسرار طاقت بڑی محنت سے اور استادوں کے قدموں میں سجدے کر کر کے حاصل کی ہے۔

"ایک بات بتاؤ لڑکی!" — حسن بن صباح نے مسکراتے ہوئے پوچھا — "تمہارے دل میں کسی کی محبت تو ضرور ہوگی!"

"ہاں!" — حمیرا نے کہا — "میرے دل میں اپنے اللہ کی محبت ہے"۔

"اس کے بعد کون؟"

"اللہ کے آخری رسولؐ!" — حمیرا نے جواب دیا۔

"اس کے بعد؟"

"اپنے بھائی منورالدولہ کی محبت میرے دل میں رچی بسی ہوئی ہے" — حمیرا نے جواب دیا۔

"اور اس کے بعد؟"

حمیرا نے جابر کی طرف دیکھا اور زبان سے کچھ بھی نہ کہا۔

"ایک بات بتا لڑکی" — حسن بن صباح نے کہا — "جس دل میں محبت کا سمندر موجزن ہے اس میں نفرت کہاں سے آگئی؟"

حمیرا نے چونک کر حسن بن صباح کی طرف دیکھا لیکن کہہ کچھ بھی نہ سکی۔

"جاؤ لڑکی!" — حسن بن صباح نے کہا — "تم قدرت کے حسن کا شاہکار ہو۔ تم پھول ہو جو خوشبو دیا کرتے ہیں۔ اپنے پھول جیسے حسن میں نفرت کی بدبو نہ بھرو..... جاؤ۔ جابر کے ساتھ رہو۔ جب تمہارے دل سے نفرت نکل جائے گی اور ضرور نکلے گی، پھر تمہارا دل تمہیں کہے گا کہ چلو اسی شخص کے پاس..... پھر تم خود میرے پاس آؤ گی"۔

حمیرا آنکھیں حسن بن صباح کی آنکھوں سے آزاد نہ کر سکی۔ اسے اٹھنا تھا لیکن نہ اٹھی اس پر کچھ اور ہی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور وہ اپنی ذات میں کوئی ایسا تاثر محسوس کر رہی تھی جیسے وہ یہاں سے اٹھنا نہیں چاہتی۔ اگر جابر اس کا بازو پکڑ کر نہ اٹھاتا وہ تو وہیں بیٹھی رہتی۔ جابر حمیرا کو ساتھ لے کر وہاں سے نکل آیا۔

○

جابر کے دوست کے گھر پہنچنے تک حمیرا نے کوئی بات نہ کی۔ وہ اپنے آپ میں کوئی تبدیلی محسوس کر رہی تھی جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ انسان اور ابلیس کے اس پہلو سے ناواقف تھی کہ جب کوئی انسان اپنے آپ میں ابلیسی اوصاف پیدا کر لیتا ہے تو اس میں ایسی کشش پیدا ہو جاتی ہے کہ خام کردار والے لوگ اس کی طرف کھنچے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اگر وہ بدصورت ہو تو بھی دیکھنے والوں کو خوبصورت لگتا ہے۔ اس کی زبان میں ایسا طلسماتی تاثر پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ جب بات کرتا ہے تو سننے والوں کے دلوں میں اس کا ایک ایک لفظ اترتا چلا جاتا ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ جو انسان میرے راستے سے ہٹ کر ابلیس کا گرویدہ ہو جاتا ہے اس پر میں ایک ابلیس مسلط کر دیا کرتا ہوں۔

حمیرا اس لئے بھی حسن بن صباح کا اچھا تاثر لے کر آئی تھی کہ وہ تو اپنی دنیا کا بادشاہ تھا۔ اس کے پیروکار اسے نبی بھی مانتے تھے۔ وہ جسے چاہتا ایک اشارے پر قتل کروا دیا کرتا تھا۔ یہ شخص کہہ سکتا تھا جابر تم جاؤ اور اس لڑکی کو میرے پاس رہنے دو لیکن حسن بن صباح نے جیسے حمیرا کے حسن و جوانی کی طرف توجہ دی ہی نہیں تھی۔ اس لحاظ سے وہ جابر کے کردار کی بھی قائل ہو گئی تھی۔ اتنے دن اور اتنی راتیں جابر کے ساتھ رہ کر اس نے دیکھا کہ جابر نے کبھی اس سے پیار اور محبت کی باتوں کے سوا کوئی بیہودہ بات یا حرکت نہیں کی تھی۔

حمیرا کو اپنا بھائی، ماں اور چھوٹے بہن بھائی یاد آتے تھے۔ اسے اپنے بھائی کی بیوی اور اس کے بچے بھی یاد آتے تھے لیکن وہ گھر سے کبھی واپس نہ جانے کے لئے نکلی تھی۔ وہ اس کوشش میں لگی رہتی تھی کہ ان سب کو دل سے اتار دے۔

ایک دو دنوں بعد جابر نے حمیرا سے کہا کہ آؤ تمہیں یہاں کا قدرتی حسن دکھاؤں۔ تم کہہ اٹھو گی کہ اگلے جہان کی جنّت اس سے خوبصورت کیا ہو گی..... وہ دونوں شہر سے باہر نکل گئے۔ قلعہ اور یہ شہر پہاڑی کے اوپر تھے۔ دور جا کر وہ اس پہاڑی سے اترے۔ آگے دریا تھا' دریا اور پہاڑی کے درمیان ذرا کشادہ میدان تھا جس میں بڑے خوبصورت اور دلنشین پودے تھے' درخت تھے اور گھاس تھی۔ حمیرا کو یہ جگہ بہت ہی اچھی لگی۔ اس کے دل پر جو بوجھ سا اور گرفت سی رہتی تھی وہ کم ہونے لگی۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ یہاں سے واپس نہیں جا سکے گی۔ جابر اسے دریا کے کنارے لے گیا۔ یہ کنارہ بہت ہی اونچا تھا۔ دریا بہت نیچے بہتا چلا جا رہا تھا۔ وہاں دریا کا پاٹ تنگ تھا۔ سامنے والا کنارا بھی اونچا تھا۔ وہاں سے دریا مڑتا بھی تھا اس لئے وہاں پانی کا جوش بڑا ہی زیادہ تھا اور بھنور بھی پیدا ہو رہا تھا۔ یہ دراصل پہاڑی تھی جسے کاٹ کر دریا گزر رہا تھا۔

جابر اور حمیرا اس کنارے پر کھڑے ہو کر نیچے دیکھنے لگے۔

"یہاں سے دریا میں کوئی گر پڑے تو کیا وہ بچ کے نکل آئے گا؟" — حمیرا نے پوچھا۔

"ناممکن!" — جابر نے جواب دیا — "کوئی تیراک بھی نہیں نکل سکے گا کیونکہ پاٹ تنگ ہے اور پانی زیادہ اور تیز بھی ہے اور دریا یہاں سے مڑتا بھی ہے..... یہ دریا یہاں سے کھڑے ہو کر دیکھو تو ہی اچھا لگتا ہے"۔

"اپنے امام کے پاس پھر کبھی لے چلو گے؟" — حمیرا نے پوچھا۔

"کیا تم اُس کے پاس جانا چاہو گی؟" — جابر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں محسوس کرتی ہوں کہ مجھے اس کے پاس ایک بار پھر جانا چاہئے" — حمیرا نے کہا اور پھر آہ بھر کر بولی — "اپنے بھائی کو' ماں کو اور بھائی کے بچوں کو دل سے اتارنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن وہ سب بہت یاد آ رہے ہیں"۔

"میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں!" — جابر نے کہا اور کچھ توقف کے بعد بولا — "تم ان سب کو بھول ہی جاؤ تو بہتر ہے..... تمہارا بھائی اس دنیا میں نہیں رہا....."

"کیا کہا؟" — حمیرا نے تڑپ کر پوچھا — "وہ اس دنیا میں نہیں رہا؟ کیا ہُوا اسے؟"

"اُسے قتل کر دیا گیا تھا" — جابر نے کہا — "اُس کے بیوی بچوں کا اور تمہاری

ماں اور بہن بھائیوں کا بھی یہی انجام ہُوا"۔

"میرے بھائی کو کس نے قتل کیا تھا؟"

"میرے ساتھیوں نے!" — جابر نے جواب دیا۔

"تمہارے ساتھیوں نے!" — حمیرا نے چلّا کر کہا اور جابر پر جھپٹ پڑی۔

اُس وقت جابر دریا کے کنارے پر کھڑا تھا۔ حمیرا نے اُس کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر پوری طاقت سے دھکا دیا۔ پیچھے ہٹنے کو جگہ تھی ہی نہیں۔ پیچھے دریا تھا۔ جابر اتنے اونچے کنارے سے گرا۔ اس کی چیخیں سنائی دیں اور جب وہ دریا میں گرا تو اس کی چیخیں گرنے کی آواز میں دب گئیں۔ حمیرا نے اوپر سے دیکھا جابر ہاتھ مار رہا تھا۔ دریا اسے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا لیکن موڑ پر بھنور تھا۔ جابر اس بھنور میں آ گیا اور ایک ہی جگہ لٹو کی طرح گھومنے لگا۔ حمیرا نے دائیں بائیں دیکھا۔ ایک بڑا ہی وزنی پتھر پڑا تھا۔ حمیرا نے پتھر اٹھایا جو اُس سے ذرا مشکل سے ہی اٹھا۔ جابر اس کے بالکل نیچے پھنسا ہُوا تھا۔ حمیرا نے اوپر سے پتھر پھینکا جو جابر کے سر پر گرا۔ اس کے بعد جابر پانی سے اُبھر نہ سکا۔

جابر ڈوب گیا تو حمیرا نے توجہ اپنی طرف کی۔ اس حقیقت نے اُس کے دل کو مٹھی میں لے لیا کہ وہ اکیلی رہ گئی ہے۔ اب وہ واپس جابر کے دوست کے پاس نہیں جا سکتی تھی۔ اسے اب وہاں سے فرار ہونا تھا۔ اس کی خوش نصیبی تھی کہ سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ آگے کو چل پڑی۔ اس نے رو رو کر اللہ کو یاد کیا اور تیز ہی تیز چلتی چلی گئی اور جب سورج غروب ہو گیا تو وہ گھنے جنگل میں پہنچ چکی تھی۔

وہ اس خیال سے دوڑ پڑی کہ رات ہی رات وہ اتنی دور نکل جائے کہ کوئی اس کے تعاقب میں نہ آ سکے۔ رات تاریک ہوتی چلی گئی۔ حمیرا کو راستے کا کچھ اندازہ تھا۔ وہ اس راستے پر ہو لی۔

الموت کا قلعہ اور شہر اندھیرے میں چھپ گئے تھے۔ حمیرا نے اللہ کا نام لے کر اپنے حوصلے مضبوط کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ چلتی چلی گئی۔ رات کی تاریکی اسے دنیا سے چھپائے ہوئے تھی۔ وہ بہت دور نکل گئی اور اسے یوں سنائی دیا جیسے کوئی گھوڑا آ رہا ہو۔ وہ راستے سے ذرا ہٹ کر ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئی۔ اندھیرے میں ذرا ذرا نظر کام کرتی تھی۔

گھوڑا قریب آ گیا۔ اس پر ایک آدمی سوار تھا۔ حمیرا ڈرپوک لڑکی نہیں تھی۔ اس

کے دماغ نے ایک ترکیب سوچ لی۔ جوں ہی گھوڑا قریب آیا' حمیرا تیزی سے گھوڑے کے راستے میں جا کھڑی ہوئی۔ اس نے بازو پھیلا دیئے اور بڑی زور سے چیخیں مارنے لگی۔ یہ چیخیں اس طرح کی نہیں تھیں جو خوف یا تکلیف کی حالت میں منہ سے نکلا کرتی ہیں۔ حمیرا نے چڑیلوں کے قصے سنے تھے۔ وہ چڑیلوں کی طرح چیخ رہی تھی اور بڑی بھدی سی آواز میں بولی ــــ "مسافر گھوڑے سے اترا اور پیدل چل نہیں تو کلیجہ نکال لوں گی"۔

لوگ چڑیلوں کے وجود کو مانتے تھے۔ سوار اسے چڑیل نہ سمجھتا تو اور کیا سمجھتا..... رات کو اس ویرانے میں کوئی عورت اور وہ بھی اکیلی جا ہی نہیں سکتی تھی۔ حمیرا ایسے خوفناک طریقے سے چیختی تھی کہ گھوڑا بھی بدک گیا تھا۔ سوار کود کر گھوڑے سے اترا اور حمیرا کے آگے گھٹنے زمین پر ٹیک کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ وہ چڑیل سے اپنی جان کی بخشش مانگ رہا تھا۔ حمیرا اسے نظرانداز کر کے گھوڑے کے پاس گئی۔ رکاب میں پاؤں رکھا اور گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اس نے گھوڑا موڑا اور ایڑ لگا دی وہ شہسوار تھی اور مضبوط دل والی لڑکی تھی۔

اچھی نسل کا گھوڑا دوڑا تو بہت تیز لیکن حمیرا کو خیال آ گیا کہ وہ جائے گی کہاں؟..... اس کا بھائی قتل ہو چکا تھا اور گھر کے باقی افراد کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ بیچارے کس انجام کو پہنچے۔ وہ گھوڑا دوڑاتی گئی اور سوار پیدل بھاگ اٹھا۔

ایسے شدید اور تیز و تند بھنور میں آیا ہُوا جابر بن حاجب اس میں سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا وہ اس میں سے نکل نہیں سکتا تھا لیکن حمیرا نے اوپر سے اُس کے سر پر بڑا وزنی پتھر گرایا تو وہ پانی کے نیچے چلا گیا اور بے ہوش ہو گیا۔ سر پر اتنا وزنی پتھر گرنے سے وہ بڑی جلدی مر گیا ہو گا۔ حمیرا وہاں سے بھاگ گئی تھی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ پیچھے کیا ہُوا ہے۔

جابر جب دریا کے نیچے سے اُبھرا تو بھنور نے اُسے دور پھینک دیا یا اُگل دیا۔ وہ مر چکا تھا۔ وہاں سے کوئی ایک میل آگے دریا کا پاٹ بہت چوڑا ہو جاتا تھا۔ وہاں کنارے پر پکی گھاٹ بنی ہوئی تھی۔ دریا میں تیراکی کے شوقین آ کر تیرتے اور نہایا کرتے تھے۔ سورج غروب ہو رہا تھا اس لئے وہاں چار پانچ ہی آدمی تھے جو گھاٹ سے دریا میں کُود کُود کر ہنس کھیل رہے تھے۔ یہ سب حسن بن صباح کے فدائین تھے۔ ان میں سے ایک نے ڈبکی لگائی اور جب وہ پانی میں سے اُبھرا تو اس کا سر ایک انسانی جسم کے ساتھ ٹکرایا جسے وہ اپنے کسی ساتھی کا جسم سمجھا۔ اس نے پھر ڈبکی لگائی اور ذرا ایک طرف ہو کر پانی سے اُبھرا۔ تب اُس کے کانوں میں اپنے ساتھیوں کی آوازیں سنائی دیں ــــ "لاش ہے..... ڈوب کر مرا ہو گا..... اسے پکڑو اور باہر گھسیٹ لو" ــــ اس فدائی نے دیکھا تو اسے پتہ چلا کہ اس کا سر اسی لاش کے ساتھ ٹکرایا تھا۔

"یہ تو جابر بن حاجب ہے" ــــ ایک فدائی نے لاش کو پہچانتے ہوئے کہا ــــ "یہ کیسے ڈوب گیا ہے؟"

ان میں سے دو فدائین جابر کو اچھی طرح جانتے تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ

جابر ایک نئی لڑکی کو ساتھ لایا تھا اور حسن بن صباح نے اس کی درخواست پر اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ تھوڑا عرصہ اس لڑکی کو اپنے پاس رکھے اور خود اسے اصل کام کے لئے تیار کرے۔

یہ فدائین اپنا شغل میلہ بھول گئے اور وہ جابر کی لاش اٹھا کر قلعے میں لے گئے۔

"شیخ الجبل کو اطلاع کر دینی چاہیے" ——— ایک نے کہا۔

"لاش وہیں اٹھا لے چلو" ——— دوسرے نے کہا۔

وہ لاش اٹھا کر حسن بن صباح کی رہائش گاہ میں لے گئے اور لاش برآمدے میں رکھ کر اندر اطلاع بھجوائی۔ حسن بن صباح جسے لوگ امام بھی کہتے تھے اور شیخ الجبل بھی، خود باہر آگیا اور اُس نے جابر کی لاش دیکھی۔

"یہ ایک لڑکی کو ساتھ لایا تھا" ——— حسن بن صباح نے کہا ——— "یہ جہاں رہتا تھا وہاں جاؤ اور اُس لڑکی کو ساتھ لے آؤ"۔

ایک فدائی دوڑا گیا اور کچھ دیر بعد دوڑا ہوا ہی آیا اور اُس نے بتایا کہ لڑکی وہاں نہیں ہے۔

"وہ بھی اس کے ساتھ ڈوب گئی ہوگی" ——— حسن بن صباح نے کہا ——— "اُس کی لاش دریا کے تیز بہاؤ میں چلی گئی ہوگی"۔

جابر کی لاش دریا کے کنارے کنارے بہی جا رہی تھی جہاں پانی کا بہاؤ تیز نہیں تھا۔ یہ تو کسی کے ذہن میں آئی ہی نہیں اور آسکتی بھی نہیں تھی کہ حمیرا نے جابر کو اونچے کنارے سے دھکا دے کر دریا میں پھینکا تھا۔ رات گہری ہو گئی تھی اس لئے یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا تھا کہ حمیرا کہاں غائب ہو گئی ہے یا یہی یقین کر لیا جاتا کہ وہ بھی ڈوب کر مر گئی ہے۔

"اسے لے جاؤ" ——— حسن بن صباح نے کہا ——— "اس کے کفن دفن کا انتظام کرو اور منادی کرا دو کہ اس کا جنازہ کل دوپہر کے وقت ہوگا اور جنازہ میں پڑھاؤں گا..... لڑکی کا سراغ لگانے کی بھی کوشش کی جائے"۔

○

صبح قلعہ اَلَموُت میں یہ منادی کرا دی گئی کہ جابر بن حاجب دریا میں ڈوب کر مر گیا ہے اور اس کا جنازہ دوپہر کے وقت اٹھے گا۔

جابر کو جاننے والے اور اس کے دوست دوڑے آئے اور جابر کا آخری دیدار کیا۔ لوگ وہاں اکٹھے ہوتے گئے اور خاصا ہجوم ہو گیا۔ لوگ آپس میں طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ ایک سوال ہر کسی کی زبان پر تھا کہ جابر ڈوبا کیسے؟

"میں نے اسے ایک لڑکی کے ساتھ دریا کی طرف جاتے دیکھا تھا" ——— ایک فدائی نے کہا ——— "میں اُس وقت قلعے کی دیوار پر ویسے ہی ٹہل رہا تھا۔ دونوں قلعے کی پہاڑی سے اُتر کر خاصی دُور چلے گئے تھے، پھر میں نے دونوں کو دریا کے اُس کنارے کی طرف جاتے دیکھا جو بہت اونچا ہے۔ وہاں ایک ٹیکری ہے جس نے ان دونوں کو میری نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ میں اُدھر ہی دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے لڑکی کو وہاں سے واپس آتے دیکھا۔ وہ سامنے آئی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر ایک طرف کو دوڑ پڑی۔ اب جابر اس کے ساتھ نہیں تھا۔ میں نے جابر کو وہاں سے واپس آتے نہیں دیکھا تھا۔ لڑکی وہاں سے غائب ہو گئی تھی۔ میں بہت دیر وہاں کھڑا رہا۔ مجھے جابر نظر نہ آیا، پھر سورج غروب ہو گیا اور میں نے دوسری طرف دیکھا جدھر گھاٹ ہے لیکن میری نظروں کو اُن چٹانوں نے روک لیا تھا جو وہاں سے دور آگے تک دریا کے کنارے کھڑی ہیں"۔

پھر لوگوں میں ایک اور خبر پھیل گئی جو یوں تھی کہ آج علی الصبح ایک آدمی سرائے میں آیا اور اس نے بتایا ہے کہ راستے میں گذشتہ رات اسے ایک چڑیل نے روک لیا تھا اور اسے گھوڑے سے اتار کر اس پر خود سوار ہوئی اور گھوڑا لے کر غائب ہو گئی..... یہ خبر حسن بن صباح کے اُس گروہ کے ایک دو آدمیوں تک پہنچی جو جاسوسی اور سراغ رسانی میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے اس آدمی کو ڈھونڈ نکالا اور اس سے پوچھا کہ وہ چڑیل کیسی تھی اور کس روپ میں اس کے سامنے آئی تھی۔

"چاندنی دھوپ جیسی شفاف تھی" ——— اس شخص نے کہا ——— "چڑیل بڑی ہی حسین اور نوجوان لڑکی کے روپ میں تھی۔ وہ اچانک میرے راستے میں نمودار ہوئی اور اس قدر زور سے اس نے چیخ ماری کہ میرا گھوڑا بدک گیا۔ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ میرا دل اس کی مٹھی میں آگیا ہے۔ اُس نے کہا، اے مسافر، گھوڑے سے اتر اور پیدل چل نہیں تو کلیجہ نکال لوں گی..... میں ڈرتا کانپتا گھوڑے سے اُترا اور اس کے قریب جا کر گھٹنوں کے بل ہو گیا اور ہاتھ جوڑ کر جان کی امان مانگی۔ اُس نے اور کچھ بھی نہ کہا۔ میرے گھوڑے کی طرف گئی اور پلک جھپکتے گھوڑے پر سوار ہو کر گھوڑے کو

پیچھے موڑا اور گھوڑا سرپٹ دوڑ پڑا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ گھوڑا آگیا ہے میری جان ہی نہیں چلی گئی۔ میں اَلموُت کی طرف دوڑ پڑا۔ صبح یہاں پہنچا اور سرائے میں ٹھہرا۔ وہاں جو چند ایک آدمی تھے انہیں یہ بات سنائی"۔

اس سے پوچھا گیا کہ لڑکی یا چڑیل نے کپڑے کیسے پہنے ہوئے تھے اور اُس کے چہرے کے نقش و نگار کیسے تھے..... اُس نے حمیرا کے کپڑوں کا رنگ' بناوٹ وغیرہ اور چہرے کا حلیہ بتایا۔

حسن بن صباح جب جنازے کے لئے آیا تو اُس کے جاسوسوں نے اسے بتایا کہ انہیں کیا کیا سراغ ملے ہیں۔ ایک تو اس آدمی کو حسن بن صباح کے سامنے لایا گیا جس نے جابر اور حمیرا کو دریا کے اونچے کنارے کی طرف جاتے دیکھا تھا پھر اُس آدمی کو حسن بن صباح کے آگے کھڑا کیا گیا جس نے کہا تھا کہ رات ایک چڑیل اُس سے گھوڑا چھین کر لے گئی ہے۔

حسن بن صباح نے دونوں کے بیان سن کر ان پر جرح کی اور اُس کا دُور رس دماغ اس یقین پر پہنچ گیا کہ لڑکی اُس کے فدائی جابر بن حاجب کو دریا میں ڈبو کر بھاگ گئی ہے۔ اگر جابر خود ہی پھسل کر گرا ہوتا تو حمیرا بھاگ نہ جاتی بلکہ وہیں شور شرابا کرتی کہ کوئی مدد کو پہنچ جائے یا واپس قلعے میں آجاتی۔

"دو آدمی ابھی قستان چلے جائیں" ـــ حسن بن صباح نے حکم دیا ـــ "وہ وہیں گئی ہوگی..... یہ لڑکی مل گئی تو اسے کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ ہمیں ایسی ہی لڑکیوں کی ضرورت ہے..... اسے ہر جگہ اور ہر طرف تلاش کیا جائے۔ ہو سکتا ہے وہ مَرو یا رے چلی گئی ہو"۔

حسن بن صباح کے حکم کے مطابق اُسی وقت آدمی روانہ ہو گئے۔

○

جس وقت وہ آدمی قلعہ اَلموُت کی ایک سرائے میں اپنی آپ بیتی سنا رہا تھا کہ رات اُسے ایک چڑیل نے روک لیا تھا' اُس وقت حمیرا چند گھروں کی ایک بستی میں جا پہنچی تھی اور سوچ رہی تھی کہ بستی کے اندر جاؤں یا آگے نکل جاؤں۔ ابھی پو پھٹ رہی تھی۔ صبح کا اُجالا ابھی دُھندلا تھا۔ رات نے اسے اس طرح چھپائے رکھا تھا جس طرح ماں اپنے بچے کو آغوش میں چھپا لیا کرتی ہے۔ اسے ذرا سا بھی خوف محسوس نہیں ہُوا تھا۔ وہ

فاتحانہ مسرت سے سرشار تھی کہ شیطانوں کے چنگل سے نکل آئی تھی۔ اُسے جب اپنا بھائی منوّر الدولہ یاد آتا تو اس کا دل بیٹھ جاتا اور آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ ایسے میں اُس کے وجود میں انتقام کے شعلے بھڑک اٹھتے تھے۔ اَلموُت سے بچ کر نکل آنے کی خوشی اس کے غمگین دل کو سہلا دیتی تھی۔ وہ اسی رنگ بدلتی کیفیت میں گھوڑے پر سوار سفر طے کرتی گئی لیکن رات نے اپنے پردے سمیٹے اور رخصت ہو گئی۔

صبح کی پہلی دھندلی کرنیں نمودار ہوئیں تو حمیرا کا دل یک لخت ایک خوف کی گرفت میں آگیا۔ وہ اگر مرد ہوتی تو کوئی ڈرنے والی یا خطرے والی بات نہیں تھی۔ خطرہ یہ تھا کہ وہ نوجوان تھی اور بہت ہی حسین اور نظروں کو گرفتار کر لینے والی لڑکی تھی۔ کوئی بھی اُسے دیکھ لیتا تو کبھی نظرانداز نہ کرتا۔ وہ اُس ویران علاقے میں تھی جہاں ابلیس کا قانون چلتا تھا۔ اُسے اپنے سامنے چند گھروں کی ایک بستی نظر آرہی تھی۔

اُس نے گھوڑے کی رفتار کم اور سوچنے کی رفتار تیز کر دی۔ اُس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ رُکے یا آگے نکل جائے لیکن اس کی مجبوری یہ تھی کہ اُس نے یہ بھی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ وہ جائے کہاں۔ اُسے جابر نے بتایا تھا کہ اُس کا بھائی مارا جا چکا ہے اور گھر کے باقی افراد کا کچھ پتہ نہیں' شاید وہ بھی قتل کر دیئے گئے تھے۔ یہ تو حمیرا کو معلوم تھا کہ قستان میں اب اُس کا کوئی نہیں رہا اور وہاں اب باطنیوں کا قبضہ ہے۔

وہ تذبذب کے عالم میں آہستہ آہستہ بڑھتی گئی اور بستی کے قریب رک گئی۔ یہ چند ایک مکان تھے جو معمولی سے لوگوں کے معلوم ہوتے تھے۔ ایک مکان باقی سب سے بہت مختلف تھا۔ وہ کسی امیر آدمی کا مکان معلوم ہوتا تھا۔ اس کا دروازہ بڑا خوبصورت اور اونچا تھا۔ حمیرا اس دروازے سے پندرہ بیس قدم دور گھوڑا روکے کھڑی تھی۔

دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک سفید ریش بزرگ باہر آیا۔ اُس نے لمبا سفید چغہ پہن رکھا تھا جو اُس کے ٹخنوں تک چلا گیا تھا۔ اُس کے سر پر کپڑے کی ٹوپی تھی اور ہاتھ میں چھوٹے سے فرائی پین کی شکل کا ایک برتن تھا جس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس نے حمیرا کو دیکھا تو آہستہ آہستہ چلتا اُس کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ اس بزرگ کی داڑھی دودھ جیسی سفید تھی اور اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر نورانی سی رونق تھی۔ وہ حمیرا کے سامنے کھڑا اُس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ حمیرا نے اپنا چہرہ اس طرح چھپا لیا تھا کہ اس کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ اپنا چہرہ اس نے اس خیال سے ڈھانپ لیا تھا کہ

کوئی اس کی عمر کا اندازہ نہ کر سکے اور کوئی یہ نہ دیکھ سکے کہ یہ تو بہت ہی خوبصورت ہے۔

"آؤ خاتون!" ــــ بزرگ نے کہا ــــ "مسافر ہو تو رکو اور ذرا سستا لو' راستہ بھول گئی ہو تو اپنی منزل بتاؤ' کوئی اور مشکل آ پڑی ہے تو زبان پر لاؤ..... یہ ہمارا مندر ہے جہاں ہم اُس کی عبادت کرتے ہیں جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے"۔

"آپ یقیناً" راہب ہیں"..... حمیرا نے کہا ــــ "لیکن میں کیسے یقین کرلوں کہ میں آپ کے مندر میں محفوظ رہوں گی!"

سفید ریش راہب نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہُوا دھونی دان آگے کیا اور اُسے ذرا سا ایک دائرے میں گھمایا۔ اس میں سے اٹھتا ہُوا دھوآں حمیرا کے گھوڑے کے منہ کو چھونے لگا پھر یہ دھوآں حمیرا تک پہنچا۔ حمیرا نے دھوئیں میں بڑی پیاری خوشبو سونگھی۔

"تم شاید مسلمان ہو" ــــ راہب نے کہا ــــ "آؤ..... ہمارے مندر میں تم وہی روحانی سکون پاؤ گی جو تم اپنے خدا کے حضور جھک کر پایا کرتی ہو۔ گھوڑے سے اُترو اور مجھے امتحان میں نہ ڈالو"۔

"صرف ایک بات بتادو مقدس راہب!" ــــ حمیرا نے کہا ــــ "کیا انسان اندر سے بھی ویسا ہی ہوتا ہے جیسا وہ چہرے سے نظر آتا ہے؟..... میرا تجربہ کچھ اور ہے"۔

راہب نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آگے بڑھا اور گھوڑے کے پہلو میں رک کر اپنا ایک ہاتھ حمیرا کی طرف بڑھایا کہ وہ اُس کا ہاتھ تھام کر گھوڑے سے اُتر آئے۔ حمیرا اس کی خاموشی سے کچھ ایسی متاثر ہوئی کہ وہ راہب کا ہاتھ تھامے بغیر گھوڑے سے اُتر آئی۔ راہب نے اسے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔

"میرا گھوڑا ایسی جگہ باندھ دیں جہاں کوئی دیکھ نہ سکے" ــــ حمیرا نے کہا ــــ "وہ میرے تعاقب میں آرہے ہوں گے"۔

"کون؟"

"باطنی!" ــــ حمیرا نے جواب دیا ــــ "تعاقب سے یہ نہ سمجھنا کہ میں کوئی جرم کر کے بھاگی ہوں' میں اپنی سب سے زیادہ قیمتی متاع لے کر ان ظالموں کے جال سے نکلی اور یہاں تک پہنچی ہوں۔ میری متاع میری عصمت ہے اور میرا دینی عقیدہ!"

اتنے میں ایک اور آدمی مندر سے باہر آیا۔ راہب نے اُسے کہا کہ وہ گھوڑا لے جائے اور ایسی جگہ باندھے جہاں کسی کو نظر نہ آسکے۔ راہب حمیرا کو مندر میں لے گیا اور دائیں کو مڑا' ایک دروازہ کھولا۔ یہ ایک کمرہ تھا جو عبادت گاہ نہیں تھی بلکہ رہائشی کمرہ تھا۔ راہب نے حمیرا کو پلنگ پر بٹھا دیا اور پوچھا کہ وہ کچھ کھانا پینا چاہتی ہو گی!

"میں بھوکی نہیں!" ــــ حمیرا نے کہا ــــ "اور میں پیاسی بھی نہیں۔ گھوڑے کے ساتھ پانی بھی تھا اور ایک تھیلی میں کھانے کا سامان بھی تھا۔ تھوڑی ہی دیر پہلے میں نے پیٹ بھر لیا تھا"۔

حمیرا نے اپنا چہرہ بے نقاب کر دیا۔ راہب نے اُس کا چہرہ دیکھا تو یوں چونک پڑا جیسے حمیرا نے اسے قتل کرنے کے لئے خنجر نکال لیا ہو۔ راہب کچھ دیر حمیرا کے چہرے کو دیکھتا ہی رہا۔

"تم یقین کرنا چاہتی ہو کہ یہاں محفوظ رہو گی یا نہیں" ــــ راہب نے کہا ــــ "لیکن اب میں شک میں پڑ گیا ہوں کہ میری ذات اور یہ مندر تم سے محفوظ رہے گا یا نہیں!"

"کیا میرے چہرے پر بدی کا کوئی تاثر نظر آتا ہے؟" ــــ حمیرا نے پوچھا۔

"باطنیوں کے امام شیخ الجبل حسن بن صباح کے پاس تم جیسی بے شمار لڑکیاں موجود ہیں" ــــ راہب نے کہا ــــ "میں ان میں سے آج پہلی لڑکی دیکھ رہا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ ان باطنیوں کا امام کسی کو اپنے جال میں پھانسنے کا ارادہ کرلیتا ہے تو وہ تم جیسی لڑکی کو بھیجتا ہے اور وہ لڑکی تمہاری طرح مظلوم بن کر اپنی مظلومیت کی کوئی کہانی سناتی ہے....."

حمیرا اسے بڑی غور سے دیکھ رہی تھی۔

"مقدس راہب!" ــــ حمیرا نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ــــ "مجھے ایسی ہی لڑکی بنانے کے لئے دھوکے سے قلعہ الَموت لے جایا گیا تھا لیکن میں آپ کو سناؤں گی کہ میں وہاں سے کس طرح نکل بھاگی۔ پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میں قستان کے رئیس منوّر الدولہ کی بہن ہوں۔ امیر قستان کو باطنیوں نے قتل کر دیا اور میرے بھائی کو بھی قتل کر دیا گیا....."

"ہاں' میں سن چکا ہوں" ــــ راہب نے کہا ــــ "قستان پر باطنی قابض ہو چکے

ہیں اور منور الدولہ ان کے ہاتھوں دھوکے سے قتل ہُوا ہے۔ وہاں کا امیرِ شہر بڑا ہی بد طینت انسان تھا..... اب تم سناؤ تم پر کیا بیتی ہے"۔

حمیرا نے اسے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ یہ بھی بتایا کہ وہ ایسے شخص سے محبت کر بیٹھی تھی جو درپردہ باطنی تھا ورنہ وہ کبھی الموت تک نہ پہنچتی۔ اس نے یہ بھی سنایا کہ اس شخص کو اس نے کس طرح دریا میں پھینکا اور خود بھاگ آئی اور پھر یہ گھوڑا اسے کس طرح ملا۔

اس دوران مندر کا ایک آدمی ان کے آگے ناشتہ رکھ گیا تھا۔

"تم اب یقیناً" قستان جانے کی نہیں سوچو گی" ——— راہب نے کہا ——— "قستان کو اب دل سے اُتار دو"۔

"پھر میں کہاں جاؤں؟" ——— حمیرا نے پوچھا۔

"سلجوقی سلطان کے پاس!" ——— راہب نے جواب دیا ——— "وہی ایک ٹھکانہ ہے جہاں تم جاسکتی ہو اور جہاں تمہیں پناہ مل سکتی ہے..... مرُو یا رے..... میں یہ نہیں بتا سکتا کہ نیا سلجوقی سلطان کیسا آدمی ہے۔ وہ جو نیک آدمی تھا اور جس نے باطنیوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا عزم کر رکھا تھا' وہ مرچکا ہے۔ اس کا نام سلطان ملک شاہ تھا۔ اب اس کا بیٹا برکیارق سلطان ہے..... بہتر یہ ہو گا کہ تم رے چلی جاؤ۔ وہاں کا حاکم ابو مسلم رازی بڑا ہی نیک' بزرگ اور عالمِ دین ہے۔ اس کے پاس چلی جاؤ تو نہ صرف یہ کہ محفوظ رہو گی بلکہ وہ تمہیں اُسی حیثیت سے اپنے پاس رکھے گا جو تمہیں قستان میں حاصل تھی"۔

"کیا میں وہاں تک اکیلی جاؤں گی؟" ——— حمیرا نے پوچھا اور کہا ——— "اگر اکیلی جانا ہے تو پھر مجھے رات کو سفر کرنا چاہئے"۔

"تم اس وقت میری نگاہ میں اس مندر کی طرح مقدس ہو۔ میں تمہیں اکیلا بھیج کر اپنے دیوتاؤں کو ناراض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا..... میرے دو آدمی تمہارے ساتھ جائیں گے اور تمہیں کسی اور بھیس میں بھیجا جائے گا"۔

حمیرا نے ایسا سکون محسوس کیا جیسے اُس پر کسی نے پہاڑ جیسا بوجھ ڈال دیا تھا اور یہ بوجھ یک لخت ہٹا دیا گیا ہو۔

"مقدس راہب!" ——— حمیرا نے پوچھا ——— "میرا مستقبل کیا ہو گا؟..... کیا وہ

اجنبی لوگ مجھے کسی اور دھوکے میں نہیں ڈال دیں گے؟"

"تم کون ہو؟..... کچھ بھی نہیں!" ——— راہب نے کہا ——— "میں کیا ہوں؟..... کچھ بھی نہیں..... تم یہ پوچھو کہ اسلام کا مستقبل کیا ہو گا..... اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میرے مذہب کا مستقبل کیا ہو گا..... تمہیں اور مجھے اُس اللہ نے دنیا میں بھیجا ہے جسے ہم خدا کہتے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ خدا نے جس مقصد کے لئے ہمیں پیدا کیا ہے ہم پورا کر رہے ہیں یا نہیں..... وہ مقصد کیا ہے؟..... بنی نوع انسان کی محبت!"

"اسلام کا مستقبل آپ کو کیا نظر آتا ہے؟" ——— حمیرا نے پوچھا۔

"کچھ اچھا نظر نہیں آتا" ——— راہب نے جواب دیا ——— "اس وقت سب سے بڑا مذہب اسلام ہے لیکن اس کی جو بڑائی ہے وہ چھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔ باطنی اسلام کے لئے بہت بڑا خطرہ بن گئے ہیں۔ جھوٹ موٹ کا یہ عقیدہ بڑی ہی تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے۔ حسن بن صباح نے ابلیسیت کو جائز قرار دے کر رائج کر دیا ہے۔ انسان لذّت پرستی کی طرف مائل ہوتا جا رہا ہے۔ عورت اور شراب میں اسے جو لذت ملتی ہے وہ خدا پرستی میں نہیں مل سکتی..... تم نے مستقبل کی بات کی ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ حسن بن صباح دنیا میں نہیں ہو گا اور اس کا عقیدہ آہستہ آہستہ مٹ جائے گا لیکن لوگ عیش و عشرت کو نہیں مٹنے دیں گے۔ حسن بن صباح کسی نہ کسی روپ میں زندہ رہے گا۔ لذت پرستی کا یہ رجحان مسلمانوں کو دیمک کی طرح چاٹتا رہے گا اور ایک وقت آئے گا کہ مسلمان برائے نام مسلمان رہ جائیں گے۔ ان میں وہ طاقت نہیں رہے گی جو ہُوا کرتی تھی"۔

"مجھے آپ کس وقت یہاں سے روانہ کریں گے؟" ——— حمیرا نے پوچھا۔

"سورج غروب ہونے کے بعد!" ——— راہب نے جواب دیا۔

○

سلطان برکیارق کا وزیرِ اعظم عبدالرحمٰن سمیری برکیارق کی ماں کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ ماں کے آنسو بہہ رہے تھے۔

"کیا اپنے بیٹے برکیارق پر آپ کا کچھ اثر نہیں رہا؟" ——— عبدالرحمٰن سمیری نے پوچھا۔

"تم اثر کی بات کرتے ہو!" ——— برکیارق کی ماں نے جواب دیا ——— "وہ تو یہ بھی

بھول گیا ہے کہ میں اس کی ماں ہوں۔ کئی دنوں سے میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ البتہ اس کی ملکہ روزینہ کبھی نظر آتی ہے تو وہ میرے ساتھ کوئی بات نہیں کرتی۔ اگر کوئی بات کرتی بھی ہے تو وہ حکم کے لہجے میں کرتی ہے۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ برکیارق کا سلوک اور برتاؤ دن بدن خراب ہوتا جارہا ہے۔ میں ڈرتی ہوں کہ بھائی ہی کہیں آپس میں نہ ٹکرا جائیں"۔

"میں آپ کے ساتھ یہی بات کرنے آیا ہوں" ــــ عبدالرحمن سمیری نے کہا ــــ "سلطان برکیارق کاروبارِ سلطنت میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے..... فوج کو ابھی تک تنخواہ نہیں ملی۔ سلطان ملک شاہ مرحوم کے دورِ حکومت میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ فوج برکیارق سے بیزار ہوتی جارہی ہے۔ ادھر باطنی پھیلتے اور غالب آتے چلے جارہے ہیں۔ اگر ہم نے فوج میں بیزاری اور مایوسی پیدا کردی تو سلجوقی سلطنت کا اللہ ہی حافظ ہے"۔

"کیا تم نے اسے یہ بات بتائی ہے؟" ــــ ماں نے پوچھا۔

"نہیں!" ــــ عبدالرحمن سمیری نے جواب دیا ــــ "بات کہاں کروں، وہ تو باہر نکلتے ہی نہیں"۔

"تم یہیں بیٹھو" ــــ ماں نے اٹھتے ہوئے کہا ــــ "میں اسے باہر نکالتی ہوں۔ میں آخر ماں ہوں"۔

"نہیں!" ــــ عبدالرحمن سمیری نے اٹھ کر برکیارق کی ماں کو روکتے ہوئے کہا۔ "آپ اس کے پاس نہ جائیں وہ بدتمیزی پر اتر سکتا ہے۔ اگر اس نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی تو میں بتا نہیں سکتا کہ میں کیا کر گزروں گا"۔

برکیارق کی ماں نے اس کی نہ سنی اور ہاتھ سے اسے ایک طرف کرکے باہر نکل گئی۔ اس نے برکیارق کی خواب گاہ کے بند دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور روزینہ باہر آئی۔

"کیا بات ہے؟" ــــ روزینہ نے پوچھا۔

ماں اسے کوئی جواب دینے کی بجائے کواڑ دھکیل کر اندر چلی گئی۔ برکیارق پلنگ پر نیم دراز تھا۔

"کیا ہوگیا ہے ماں؟" ــــ برکیارق نے غنودگی کے سے عالم میں پوچھا۔

"کیا باہر نکل کر یہ دیکھنا تمہارا کام نہیں کہ کیا ہو رہا ہے؟" ــــ ماں نے غصیلے لہجے

میں کہا ــــ "کیا باپ کو تم نے اس وقت کبھی اپنی خواب گاہ میں دیکھا تھا؟ تم خارش کے مارے ہوئے کتے کی طرح اس وقت بھی خواب گاہ میں پڑے ہوئے ہو!"۔

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں" ــــ روزینہ نے کہا ــــ "آپ یہاں سے چلی جائیں اور وزیراعظم سے کہیں کہ وہ اپنا کام کرے"۔

"میں تم سے مخاطب ہوں برکیارق!" ــــ ماں نے اپنا لرزتا کانپتا ہاتھ برکیارق کی طرف بڑھا کر کہا ــــ "سلطان تم ہو، تمہاری یہ چہیتی بیگم نہیں..... تمہارے باپ نے یہ فوج باطنیوں کو ختم کرنے کے لئے تیار کی تھی اور آج تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اس فوج کو اس مہینے کی تنخواہ بھی نہیں دی گئی"۔

"تو پھر کیا قیامت آگئی ہے!" ــــ برکیارق نے خفگی اور بے رخی سے کہا ــــ "میں اتنی زیادہ فوج رکھوں گا ہی نہیں۔ میں سالاروں کو بلا کر کہہ رہا ہوں کہ آدھی فوج کو چھٹی دے دیں"۔

"پھر اپنی ملکہ کو ساتھ لے کر تیار ہو جاؤ" ــــ ماں نے کہا ــــ "تم فوج کی چھٹی کرواؤ اور کچھ ہی دنوں بعد باطنی آکر تمہاری چھٹی کرا دیں گے..... ہوش میں آ برکیارق، ہوش میں آ..... اپنے باپ کی قبر کی یوں توہین نہ کر۔ یاد کر یہ سلطنت کیسی کیسی قربانیاں دے کر قائم کی گئی تھی۔ اپنے آباؤ اجداد کی روحوں کو یوں اذیت نہ دے۔ یہ جوانی چند دنوں کا میلہ ہے۔ ہمیشہ قائم و دائم رہنے والا صرف اللہ ہے"۔

"آپ انہیں اتنا پریشان تو نہ کریں ماں!" ــــ روزینہ نے بیزاری کے سے لہجے میں کہا۔

"تو خاموش رہ لڑکی!" ــــ ماں نے روزینہ سے کہا ــــ "اور مجھے ماں نہ کہہ..... میں اس کی ماں ہوں اور میں ماں ہوں اس سلطنت کی جو ہمارے بڑے بزرگوں نے اسلام کا پرچم اونچا رکھنے کے لئے بنائی تھی۔ تجھے اس کے ساتھ روحانی دلچسپی ہوتی تو اسے یوں مدہوش کرکے کمرے میں قید نہ رکھتی"۔

"اچھا ماں اچھا!" ــــ برکیارق نے اٹھتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ تھکن سے چور تھا ــــ "تم جاؤ، میں تیار ہو کر باہر نکلتا ہوں"۔

"میں تمہیں ابھی باہر نکلتا دیکھنا چاہتی ہوں" ــــ ماں نے کہا ــــ "ابھی اٹھ!"

برکیارق آہستہ آہستہ اٹھنے لگا اور ماں کمرے سے نکل آئی۔ روزینہ نے بڑے غصے

سے دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی اور برکیارق کے پاس گئی۔

"کچھ دیر اور لیٹے رہیں" ـــــ روزینہ نے برکیارق کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے ذرا سا دھکیلا اور لٹا کر بولی ـــــ "ماں قابلِ احترام ہی سہی لیکن ماں کو یہ بھی تو دیکھنا چاہئے کہ بیٹا کس حال میں ہے۔ ان لوگوں کو آپ کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں۔ آپ کی ماں کو اور دونوں بھائیوں کو صرف سلطنت کا غم کھا رہا ہے۔ معلوم نہیں انہیں یہ خطرہ کیوں نظر آنے لگا ہے کہ ان سے یہ سلطنت چھن جائے گی۔ یہ لوگ بادشاہی چاہتے ہیں"۔

روزینہ ابھی تک شب خوابی کے لباس میں تھی۔ اس کے ریشم جیسے نرم و ملائم بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بلاشک و شبہ بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی لیکن اس کے جو انداز تھے ان میں طلسماتی سا تاثر تھا اور یہ برکیارق کو مدہوش کر دیا کرتے تھے۔ گھروں میں بند بعض بیویاں روزینہ سے بھی زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں لیکن ان میں چونکہ روزینہ والے ناز و انداز مکاری اور عیاری نہیں ہوتی اس لئے خاوندوں کو وہ اتنی خوبصورت نظر نہیں آتیں جتنی کوئی پیشہ ور عورت دل پر غالب آ جاتی ہے۔ روزینہ تربیت یافتہ لڑکی تھی۔ اسے ذہن نشین کرایا گیا تھا کہ مرد کی کون کون سی رگ کمزور ہوتی ہے۔ ایسی لڑکیاں ان رگوں کو مٹھی میں لے لیتی ہیں۔

روزینہ نے برکیارق کو لٹا کر اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنی شروع کر دیں اور اُس پر اس طرح جھکی کہ اُس کے بکھرے ہوئے نرم و گداز بال اس کے چہرے کو چھونے لگے پھر اس نے برکیارق کے عریاں سینے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا اور دو تین بار اپنے گال اس کے سینے سے لگائے پھر اس کی ٹانگیں دبانی شروع کر دیں۔

برکیارق جو ماں کی باتوں سے بیدار ہو گیا تھا پھر مدہوش ہو گیا۔ روزینہ اٹھی اور صراحی میں سے ایک مشروب پیالے میں ڈال کر برکیارق کو پلا دیا۔ ان سارے عمل کے دوران وہ بڑے ہی اداس اور پُراثر لہجے میں برکیارق کو یقین دلاتی رہی کہ وہ مظلوم اور تنہا ہے اور اس کے خاندان کا ہر فرد اسے انسان سمجھتا ہی نہیں۔ روزینہ کا ایک تو خداداد حسن تھا اور پھر اس حسن کو ایک نشے اور ایک طلسم کی طرح استعمال کرنے کا سلیقہ تھا اور اس کے ساتھ برکیارق کو وہ جو مشروب پلا رہی تھی اس کا اثر الگ تھا۔ برکیارق بھول ہی گیا کہ اس کی ماں اس کے کمرے میں آئی تھی اور کچھ کہہ کر چلی گئی تھی۔

یہ وہی داستان تھی جو حضرتِ آدم اور حوّا سے شروع ہوئی تھی۔ اُس پہلے آدمی نے عورت کی بات مانی اور جنت سے نکالا گیا تھا۔ یہ کہانی ہر دور میں اور ہر جگہ دُہرائی جاتی رہی ہے اور دُہرائی جا رہی ہے اور دہرائی جاتی رہے گی۔ برکیارق تو بڑا ہی کمزور آدمی تھا۔ اگر وہ کمزور نہیں تھا تو روزینہ کا جادو بہت تیز تھا۔

○

دن کے پچھلے پہر برکیارق اُس کمرے میں بیٹھا تھا جہاں وہ وزیرِ اعظم اور دیگر اہلکاروں سے امورِ سلطنت کی باتیں سنتا اور حکم جاری کیا کرتا تھا۔ وہاں جاتے ہی اس نے اپنے وزیرِ اعظم عبدالرحمٰن سمیری کو بلا لیا تھا۔

"آپ میرے بزرگ ہیں اور میں آپ کا احترام کرتا ہوں" ـــــ اس نے وزیرِ اعظم سے کہا ـــــ "آپ کو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ایسی کوئی بات نہ ہو کہ میرے دل میں آپ کا احترام کم ہو جائے۔ فوج کو تنخواہ میری ماں نے نہیں بلکہ میں نے دینی ہے۔ آپ کو یہ بات میرے ساتھ کرنی چاہئے تھی۔ آپ نے میری ماں کو بلاوجہ پریشان کیا اور انہوں نے غصے میں آ کر میری بیوی کے سامنے میری بے عزتی کر دی..... میں آپ سے توقع رکھوں گا کہ آئندہ آپ کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے"۔

"میں معافی کا خواستگار ہوں سلطانِ محترم!" ـــــ وزیرِ اعظم نے کہا ـــــ "میں دو مرتبہ آپ سے درخواست کر چکا ہوں کہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ فوج کو بروقت تنخواہ نہ ملی ہو۔ میں ادائیگی کی اس تاخیر سے ڈرتا ہوں کہ فوج میں ذرا سی بھی مایوسی اور بیزاری پیدا نہیں ہونی چاہئے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ سلطان ملک شاہ مرحوم نے یہ فوج کس مقصد کے لئے تیار کی تھی۔ زندگی نے وفا نہ کی۔ اگر وہ زندہ رہتے تو قلعہ الموت پر حملہ کر کے حسن بن صباح کی ابلیسیت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتے۔ مجھے جاسوس اور مخبر روز بروز اطلاعیں دے رہے ہیں کہ باطنی عقیدے بڑی تیزی سے پھیلتے چلے جا رہے ہیں اور یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ ہمارے شہر میں اور دوسرے شہروں میں بھی باطنی آ کر آباد ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ اپنے عقیدے مسلمانوں میں پھیلا رہے ہیں"۔

"آپ میرے وہ احکام غالباً بھول گئے ہیں جو میں پہلے دے چکا ہوں" ـــــ سلطان برکیارق نے کہا ـــــ "مرحوم سلطان نے فوج تو تیار کی تھی لیکن یہ نہ سوچا کہ اس فوج

کو ہم کب تک پالتے رہیں گے۔ محصولات کا زیادہ تر حصہ یہ فوج کھا رہی ہے۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں حسن بن صباح کی طرف ایک وفد بھیجوں گا اور اُس کے ساتھ امن اور دوستی کا معاہدہ کروں گا۔ وہ میری یہ شرط مان لے گا کہ وہ اپنے علاقے میں محدود رہے اور ہمیں اپنے علاقے میں محدود رہنے دے..... اس بار تو آپ فوج کو تنخواہ دے دیں لیکن فوج کی آدھی نفری کو سبکدوش کر دیں۔ جو گھوڑے فالتو ہو جائیں وہ فروخت کر کے رقم سرکاری خزانے میں جمع کرا دیں۔ میں اپنے سپہ سالار اور دوسرے سالاروں کو حکم دے رہا ہوں کہ وہ فوج کی چھانٹی کر کے نصف فوج کو ختم کر دیں"۔

"سلطانِ عالی مقام!" ـــ وزیرِ اعظم نے کہا ـــ "آپ کے والدِ مرحوم نے وفد بھیجا تھا جس کا حسن بن صباح نے مذاق اڑایا تھا اور کہا تھا کہ تمہارے پاس وہ طاقت نہیں جو میرے پاس ہے۔ اس نے ہمارے وفد کے سامنے اپنے تین آدمیوں کو باری باری حکم دیا تھا کہ اپنے آپ کو قتل کر دیں۔ ان آدمیوں نے فوراً اپنے خنجروں سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ حسن بن صباح نے ہمارے وفد سے کہا تھا کہ تمہاری فوج میں ایک بھی آدمی ایسا نہیں ملے گا جو اس طرح اپنی جان قربان کر دے"۔

"مجھے وہ باتیں یاد نہ دلائیں" ـــ سلطان برکیارق نے کہا ـــ "وہ میرے والد مرحوم کے دور کی باتیں ہیں۔ میں اپنا راستہ خود بنا رہا ہوں۔ میں حکم دے رہا ہوں کہ فوج کی آدھی نفری کو گھر بھیج دیا جائے"۔

جس وقت سلطان برکیارق اپنے وزیرِ اعظم کو یہ احکام دے رہا تھا' اُس وقت اس کی بیوی روزینہ کے پاس ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی ہوئی تھی اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ یہ عورت روزینہ کی خاص ملازمہ تھی۔ اس عورت کو روزینہ نے قابلِ اعتماد کنیز کا درجہ دے رکھا تھا۔

"..... اور اُسے یہ کہنا" ـــ روزینہ اس کنیز سے کہہ رہی تھی ـــ "امام تک یہ خبر جلدی پہنچا دے کہ میں نے بہت کامیابیاں حاصل کر لی ہیں۔ سب سے زیادہ اہم فیصلہ یہ کروا لیا ہے کہ فوج کی نفری آدھی کر دی جائے گی۔ سلطان برکیارق نے اپنے وزیرِ اعظم کو یہ حکم دے دیا ہے اور سالاروں کو بلا کر کہہ دے گا کہ آدھی فوج کی چھانٹی کر دو.....
پھر امام تک یہ خبر پہنچا دینا کہ سلطان پوری طرح میری مٹھی میں آ گیا ہے۔ اس کی ماں' وزیرِ اعظم اور اس کا بھائی محمد اسے مجھ سے دور رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن

میں اسے ان سب سے متنفر کر دوں گی۔ یہاں فوج میں بیزاری اور مایوسی پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ فوج کو ابھی تک تنخواہ نہیں ملی۔ تنخواہ میں اس تاخیر کے پیچھے بھی میرا ہی ہاتھ ہے..... امام سے کہنا کہ اب اپنے آدمی بھیج دے کیونکہ فوج میں چھانٹی ہو گی تو جنہیں نکالا جائے گا انہیں بھڑکانا اور سلطان کے خلاف مشتعل کرنا ضروری ہو گا.....
پیغام میں یہ بھی کہنا کہ ابھی میں رے کے حاکم ابو مسلم رازی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اتنا ہی بتا سکتی ہوں کہ وہ سلطان برکیارق کے فیصلوں کے خلاف ہے لیکن یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ اس سلسلے میں وہ کیا عملی کارروائی کرے گا..... تم ابھی چلی جاؤ اور یہ پیغام ان لوگوں کو اچھی طرح سنا دینا اور انہیں کہنا کہ آج ہی ایک آدمی اَلموت روانہ ہو جائے"۔

یہ حسن بن صباح کا زمین دوز انتظام تھا جس کے تحت سلطنتِ سلجوقیہ کی بنیادوں میں بارود بھرا جا رہا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد اس بارود میں ذرا سی چنگاری پھینک دینی تھی..... قومیں اور ملک حکمرانوں کے ہاتھوں ہی تباہ ہوتے چلے آئے ہیں۔ حکمران جب اپنی سوچنے کی صلاحیتیں اور اپنا وقار کسی دوسرے کے حوالے کر دیں تو اس کا نتیجہ سوائے تباہی کے کچھ نہیں ہوتا۔ روزینہ سلطان برکیارق کی سلطنت میں تاریخ کو دُہرا رہی تھی۔ برکیارق کے ذہن میں وہ یہ بات نقش کر رہی تھی کہ اس سلطنت کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ سلطنت برکیارق کی ذاتی ملکیت ہے۔ تباہی کے عمل کو تیز کرنے کے لئے روزینہ سلطنتِ سلجوقیہ کو اس تلوار سے محروم کر رہی تھی جسے فوج کہتے ہیں۔

سلطان برکیارق نے وزیرِ اعظم عبدالرحمٰن سمیری کو احکام دے کر فارغ کر دیا اور اپنے سپہ سالار ابو جعفر حجازی اور اُس کے نائب سالار اوریزی کو بلایا۔ وہ فوراً پہنچ گئے۔

"فوج کو ابھی تک تنخواہ نہیں ملی" ـــ سلطان برکیارق نے کہا ـــ "کل خزانے سے رقم نکلوا کر فوج میں تقسیم کر دیں..... اب میرے اس فیصلے پر عمل شروع کر دیں کہ فوج کی آدھی نفری کو فوج سے نکال دیں۔ میں اب اتنی زیادہ فوج کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ آپ دونوں نے خود فیصلہ کرنا ہے کہ کسے فوج میں رکھنا اور کسے نکالنا ہے"۔

"ہاں سلطانِ محترم!" ـــ سپہ سالار ابو جعفر حجازی نے کہا ـــ "فوج آدھی ہو جانی چاہئے۔ ہم آپ کے حکم کی تعمیل بہت جلد کر دیں گے"۔

"سلطانِ محترم!" — سالار اوریزی نے کہا — "بصد معذرت عرض کرتا ہوں کہ فوج میں کمی نہیں ہونی چاہئے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ مرحوم سلطان نے یہ فوج کیوں تیار کی تھی....."

"مجھے اور بھی بہت کچھ معلوم ہے" — سلطان برکیارق نے سالار اوریزی کی بات کاٹ کر کہا — "یہ صرف مجھے معلوم ہے کہ اتنی زیادہ فوج کو تنخواہ کس طرح دی جاتی ہے.. ...میں جو کہہ رہا ہوں سوچ اور سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ اس پر عمل درآمد ہونا چاہئے"۔

"سلطان ٹھیک فرما رہے ہیں اوریزی!" — سپہ سالار ابو جعفر حجازی نے کہا — "اتنی زیادہ تنخواہ پوری کرنا بہت مشکل ہے اور خزانے پر بلاوجہ بوجھ پڑا ہوا ہے۔ ہمیں سلطانِ محترم کے حکم پر فوراً" عمل کرنا چاہئے"۔

"حکم کی تعمیل ہمارا فرض ہے" — سالار اوریزی نے کہا — "لیکن میں یہ نہیں بھول سکتا کہ یہ ملک ہمارا اپنا ہے اور یہ اسلامی سلطنت ہے۔ یہ فوج اسلام کی بقاء اور فروغ کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اس سے ہم نے باطل کی قوتوں کو اُسی طرح ختم کرنا ہے جس طرح آتش پرستوں اور رومیوں کی جنگی طاقتوں کو ختم کیا گیا تھا۔ اگر ہم نے حسن بن صباح کو ختم نہ کیا....."

"میں اس نام سے تنگ آ گیا ہوں" — سلطان برکیارق نے کہا — "حسن بن صباح کا نام سنتے سنتے میرے کان پک گئے ہیں۔ میں نے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ ہم باطنیوں کے خلاف فوج استعمال نہیں کریں گے"۔

"یہ بھی سوچ لیں سلطانِ عالی مقام!" — سالار اوریزی نے کہا — "اگر آپ نے فوج میں سے آدھی نفری نکال دی تو فوج میں' اور قوم میں بھی' آپ کے خلاف بداعتمادی پیدا ہو جائے گی۔ اس کے نتائج کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں۔ میں ابھی کوئی اور بات نہیں کہنا چاہتا سوائے اس کے کہ یہ نتائج بڑے ہی خطرناک بھی ہو سکتے ہیں"۔

"ہم آپ کو نہیں نکال رہے سالار اوریزی!" — سپہ سالار نے کہا — "آپ ہمارے ساتھ ہی رہیں گے"۔

"میں سب سے پہلے فوج سے نکلوں گا" — سالار اوریزی نے کہا — "میں مجاہد ہوں اور اسلام کے دشمنوں کے خلاف جہاد کے لئے فوج میں شامل ہُوا تھا' سلطان کی خوشامد کے لئے نہیں جیسا آپ کر رہے ہیں"۔

"آپ میری توہین کر رہے ہیں اوریزی!" — سپہ سالار نے کہا — "میں بھی مجاہد ہوں خوشامدی نہیں!"

"دونوں خاموش ہو جاؤ" — سلطان برکیارق نے کہا — "میں نے تمہیں آپس میں لڑنے کے لئے نہیں بلایا"۔

"سلطانِ عالی مقام!" — سالار اوریزی نے کہا — "آپ میری صاف گوئی برداشت کریں یا نہ کریں' مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں' میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں وہ اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ آپ کی سلطنت کی سلامتی کے لئے کہہ رہا ہوں..... یہ سلطنت آپ کی ہی نہیں..... یہ میری بھی ہے..... یہ اللہ کی سلطنت ہے۔ اگر آپ فوج کے متعلق غلط فیصلے کریں گے تو اس کا نتیجہ یہی ہو گا کہ جو سالار ان فیصلوں کو غلط سمجھے گا وہ ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہو گا اور ہمارے سپہ سالار ابو جعفر حجازی کا حکم نہیں مانے گا۔ سپہ سالار حجازی آپ کو خوش کرنا چاہتے ہیں لیکن میں اپنے اللہ کو خوش کر رہا ہوں اور یہی میرا فرض ہے"۔

تقریباً" تمام مستند تاریخوں میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ سپہ سالار ابو جعفر حجازی سلطان کا خوشامدی تھا اور سلطان ابلیسی اثرات کے تحت فیصلے کر رہا تھا۔ ایک بیدار مغز اور دیانت دار سالار نے ان کی مخالفت کی تو آگے چل کر یہی اختلاف خانہ جنگی کا بنیادی پتھر بن گیا۔ سلطان برکیارق نے جب ان دونوں سالاروں کو فارغ کیا تو باہر آ کر سپہ سالار ابو جعفر حجازی نے سالار اوریزی کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی کہ وہ جانتا ہے کہ سلطان کا یہ حکم سلطنت کے لئے اچھا نہیں لیکن ہمیں کیا' ہمیں سلطان کے ہر حکم کی تعمیل کرنی ہے لیکن سالار اوریزی اس قدر بگڑ گیا تھا کہ اُس نے سپہ سالار کے ساتھ بحث بے معنی سمجھی۔

○

ایک روز رے میں امیر شہر ابو مسلم رازی اپنے دفتر میں امور سلطنت میں اُلجھا ہُوا تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ دو آدمی آئے ہیں اور اُن کے ساتھ ایک لڑکی ہے۔ ابو مسلم رازی نے انہیں فوراً" اندر بلا لیا۔

"ہم اس لڑکی کو آپ کے حوالے کرنے آئے ہیں" — دونوں میں سے ایک آدمی نے کہا — "ہم مسلمان نہیں' یہ لڑکی مسلمان ہے"۔

"کون ہے یہ لڑکی؟" ــــ ابو مسلم رازی نے پوچھا ــــ "اسے کہاں سے لائے ہو؟ ..... میرے حوالے کرنے کا مقصد کیا ہے؟"

"میرا نام حمیرا ہے" ــــ لڑکی بولی ــــ "میں قستان کے ایک رئیس منور الدولہ کی بہن ہوں"۔

"قستان پر تو باطنی قابض ہو گئے ہیں" ــــ ابو مسلم رازی نے کہا اور پوچھا ــــ "تم کس طرح بچ نکلی ہو؟"

"اگر آپ اجازت دیں گے تو میں اپنی داستان سناؤں گی" ــــ حمیرا نے کہا ــــ "سب سے پہلے تو میں ان دونوں کی تعریف کروں گی کہ یہ مسلمان نہیں اور یہ مجھے یہاں تک لے آئے ہیں"۔

ابو مسلم رازی کے کہنے پر حمیرا نے وہ سب کہہ سنائی جو اُس پر بیتی تھی۔ اُس نے اپنی محبت کی بات بھی نہ چھپائی اور سفید ریش راہب کے مندر تک پہنچنے کی ایک ایک تفصیل سنائی۔

"میں کس طرح یقین کر سکتا ہوں کہ تم نے جو بات سنائی ہے وہ بالکل سچ ہے؟" ــــ ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"آپ کا شک بجا ہے" ــــ حمیرا نے کہا ــــ "ان کے بزرگ راہب نے بھی یہی شک کیا تھا..... میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں کہ میں ثابت کر سکوں کہ میں نے جو بات کہی ہے یہ سچ ہے"۔

"ہمارے راہب نے اس لڑکی کو اپنی ذمہ داری میں لے لیا تھا" ــــ ایک آدمی نے کہا ــــ "اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم غلط بیانی کر رہے ہیں اور یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے تو آپ ہم دونوں کو قید خانے میں بند کر دیں اور جب آپ کو یقین آ جائے گا تو ہمیں رہا کر دیں"۔

ابو مسلم رازی نے ان دونوں آدمیوں اور حمیرا کو کھانا کھلایا اور مشروبات پلائے اور پھر ان کے ساتھ بہت سی باتیں ہوئیں۔

"میں تمہیں اپنی پناہ میں رکھوں گا حمیرا!" ــــ ابو مسلم رازی نے کہا ــــ "تمہارا کوئی اور ٹھکانا ہوتا تو میں تمہیں وہاں بھیج دیتا"۔

"میری ایک بات ذہن میں رکھ لیں محترم!" ــــ حمیرا نے کہا ــــ "میں یہاں آپ

کی پناہ میں محتاجوں کی طرح بیٹھی نہیں رہوں گی۔ میں نے ان باطنیوں سے اپنے گھر کے ایک ایک فرد کے خون کا انتقام لینا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ باطنیوں کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ آپ مجھے اس جہاد میں جس طرح بھی استعمال کریں گے میں اپنی جان بھی پیش کر دوں گی"۔

ابو مسلم رازی نے حمیرا کے ساتھ آئے ہوئے دونوں آدمیوں کا شکریہ ادا کیا! انہیں کچھ تحفے دیئے اور رخصت کر دیا۔

رے سلطنتِ سلجوقیہ کا ایک بڑا شہر تھا اور یہ دونوں آدمی دیہاتی علاقے میں سے آئے تھے۔ دونوں جب بازار سے گزرے تو گھوڑوں سے اُتر آئے۔ انہیں اس شہر کی دکانیں بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔ وہ ایک دکان کے سامنے رک گئے۔ دکان میں سجا ہُوا سامان انہیں اچھا لگ رہا تھا۔

"تم اجنبی معلوم ہوتے ہو" ــــ انہیں ایک آواز سنائی دی۔ انہوں نے دیکھا ایک آدمی جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی' ان سے مخاطب تھا ــــ "معلوم ہوتا ہے بڑے لمبے سفر سے آئے ہو" ــــ اس آدمی نے کہا۔

"ہاں بھائی!" ــــ ایک نے کہا ــــ "ہم بہت دور سے آئے ہیں اور اب واپس جا رہے ہیں"۔

"اس دکان سے کچھ خریدنا چاہتے ہو؟" ــــ اس آدمی نے پوچھا۔

"ویسے ہی یہ چیزیں اچھی لگ رہی ہیں" ــــ ان دونوں میں سے ایک نے کہا ــــ "ہم جنگلوں میں رہنے والوں نے کیا خریدنا ہے!"

"تمہیں کوئی چیز اچھی لگے تو بتاؤ" ــــ اس شخص نے کہا ــــ "تم پردیسی ہو۔ میں تمہیں کوئی تحفہ دینا چاہتا ہوں"۔

"کیوں؟" ــــ ایک مسافر نے پوچھا ــــ "تم ہمیں تحفہ کیوں دینا چاہتے ہو؟"

"میں نے تم سے کیا لینا ہے!" ــــ اس شخص نے کہا ــــ "یہ میری عادت ہے کہ کسی سیدھے سادے اجنبی کو دیکھتا ہوں تو اُس سے ضرور پوچھتا ہوں کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ پوچھنے سے میرا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے اسے کسی چیز کی' کھانے پینے کی یا کسی طرح کی بھی مدد کی ضرورت ہو اور یہ بے چارہ کسی سے کچھ کہتا نہ ہو"۔

"ہمیں کچھ نہیں چاہئے دوست!" — ایک نے کہا — "یہی کافی ہے کہ تم نے ہمارے ساتھ پیار اور محبت سے بات کی ہے"۔

"پھر میری خوشی کی خاطر میرے ساتھ آؤ" — اس شخص نے کہا — "میں تمہیں اس شہر کا ایک خاص شربت پلا کر رخصت کرنا چاہتا ہوں"۔

اس شخص نے ایسی اپنائیت کا اظہار کیا کہ وہ دونوں اس کے ساتھ چل پڑے۔ ذرا ہی آگے مشروبات کی ایک دکان تھی جس میں بیٹھنے کا بڑا ہی اچھا انتظام تھا۔ یہ شخص دونوں کو اندر لے گیا اور ان کے لئے شربت منگولیا۔ وہ ایسی باتیں کرتا رہا جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے دنیا کی کسی اور چیز کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں سوائے اس کے کہ دوسروں کی خدمت کرے۔

"تمہارے ساتھ ایک لڑکی تھی" — اس شخص نے پوچھا — "اور تم امیر شہر کے ہاں گئے تھے۔ وہ لڑکی شاید شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے"۔

سفید ریش راہب نے اپنے ان دو آدمیوں کو حمیرا کے ساتھ بھیجا اور صرف یہ کہا تھا کہ اسے رے کے امیر شہر ابو مسلم رازی کے حوالے کر کے واپس آجائیں۔ انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ کوئی اور پوچھ بیٹھے کہ یہ لڑکی کون ہے، تو اسے لڑکی کی اصلیت نہ بتائیں۔ یہ دونوں آدمی حمیرا کی پوری داستان سن چکے تھے۔ انہوں نے حمیرا کے ساتھ اتنا لمبا سفر کیا تھا۔ حمیرا نے خود بھی انہیں سنائی تھی کہ اس پر کیا بیتی ہے اور وہ کس طرح اَلمُوت سے نکلی ہے۔

اب رے سے رخصت ہوتے وقت ان دونوں کو یہ اجنبی میزبان مل گیا تو اس کی باتوں میں آگئے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ یہ لڑکی کون ہے جسے وہ امیر شہر کے ہاں چھوڑ چلے ہیں۔ ان دونوں نے بڑے فخر اور خوشی سے حمیرا کی ساری داستان اس آدمی کو سنا ڈالی۔ اس آدمی نے حمیرا کے اس کارنامے پر دل کھول کر واہ واہ کی اور پھر ان دونوں آدمیوں کے خلوص اور دیانت داری اور پھر ان کے کردار کی بے پناہ تعریف کی۔ اس کے بعد دونوں رخصت ہوگئے۔

ان کے جانے کے بعد یہ شخص بہت ہی تیز چلتا ایک مکان میں چلا گیا۔ وہاں تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔

"لو بھائیو!" — اُس نے کہا — "وہ مل گئی ہے"۔

"کون؟"

"حمیرا!" — اس نے جواب دیا — "اس شہر کے حاکم ابو مسلم رازی کے گھر پہنچ گئی ہے۔ ابھی ابھی دو آدمی اُسے اپنے ساتھ لائے تھے اور وہاں چھوڑ کر چلے گئے ہیں"۔

اُس نے اپنے ساتھیوں کو سنایا کہ کس طرح اُس نے ان دونوں آدمیوں کو گھیرا اور ان سے یہ راز لیا ہے۔ یہ سب باطنی تھے اور حسن بن صباح کے جاسوس تھے جو کچھ عرصے سے رے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہیں دو ہی روز پہلے اَلمُوت سے اطلاع ملی تھی کہ حمیرا نام کی ایک لڑکی اَلمُوت سے لاپتہ ہوگئی ہے۔ اسے تلاش کیا جائے۔

"اَلمُوت کون جائے گا!" — ان میں سے ایک نے پوچھا اور کہا — "اگر آج ہی کوئی روانہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ امام خوش ہو جائے گا"۔

"وہ صرف اتنی سی بات پر خوش نہیں ہوگا کہ لڑکی کا سراغ مل گیا ہے" — ان میں سے ایک نے کہا — "اب یہ حکم آئے گا کہ لڑکی کو اغوا کر کے اَلمُوت پہنچاؤ"۔

ایک آدمی اٹھا اور سفر کی تیاری کرنے لگا۔

○

چند دن گزرے تھے کہ ایک روز سلطان برکیارق کا چھوٹا بھائی محمد رے آگیا اور ابو مسلم رازی کے ہاں پہنچا۔ ابو مسلم اسے اس طرح شفقت اور پیار سے ملا جیسے باپ اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے سے ملتا ہے۔ محمد بڑا خوبصورت اور قد آور جوان نکلا تھا۔ اس میں اپنے باپ ملک شاہ والا جذبہ تھا۔

"کہو محمد!" — ابو مسلم رازی نے اُس سے پوچھا — "مرو کے حالات کیسے ہیں اور تم کیسے آئے؟"

"بہت بُرے!" — محمد نے جواب دیا — "آپ کے پاس مجھے ماں نے اور وزیرِ اعظم عبدالرحمٰن سمیری نے بھیجا ہے۔ میں بھائی برکیارق کو بتائے بغیر آیا ہوں..... برکیارق پوری طرح اپنی بیوی کے قبضے میں آچکا ہے۔ وہ اُس کے دماغ میں جو کچھ بھی ڈالتی ہے وہ سلطنت کے لئے حکم بن جاتا ہے۔ مجھے اور سنجر کو برکیارق نے بھائی سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے کہتا ہے کہ میں تمہیں کسی اچھے عہدے پر لگا دوں گا لیکن کسی بھی وقت میرے راستے میں نہ آنا..... یہ تو ہماری گھریلو باتیں ہیں۔ اُس نے ایک بڑا ہی خطرناک حکم دے دیا ہے جس کے تحت فوج کی آدھی نفری کو گھر بھیجا جا رہا ہے..... فوج

آدھی رہ جائے گی"۔

"کیا کہا؟" ___ ابو مسلم نے چونک کر کہا ___ "کیا وہ اتنی خطرناک حماقت پر اُتر آیا ہے کہ فوج آدھی کر کے سلطنت کو خطرے میں ڈال رہا ہے؟..... کیا وزیرِاعظم اور تمہاری ماں نے اسے روکا نہیں؟"

"سب نے روکا ہے" ___ محمد نے جواب دیا ___ "وہ کسی کی سنتا ہی نہیں۔ اصل خطرہ جو سامنے آگیا ہے اس سے وہ بے خبر ہے لیکن میں آپ کو خبردار کرنے آیا ہوں اور میرے آنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ ہمیں کچھ مشورہ دیں"۔

"ہاں محمد!" ___ ابو مسلم نے کہا ___ "یہ تو تم نے بڑی تشویشناک خبر سنائی ہے"۔

"وہاں تو خانہ جنگی کی صورت پیدا ہوتی جا رہی ہے" ___ محمد نے کہا ___ "فوج میں سے اُن آدمیوں کو الگ کیا جا رہا ہے جنہیں فوج سے نکالنا ہے۔ ان لوگوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ انہیں اس کی کوئی پروا نہیں کہ وہ بے روزگار ہو جائیں گے بلکہ وہ سلطنت اور سلامتی کی باطنیوں کو ختم کرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں یہ بتا کر فوج میں شامل کیا گیا تھا کہ باطنیوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر کے اسلام کے فروغ کے راستے کھولنے ہیں..... پھر خطرہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ نائب سالار اوریزی بگڑ گیا ہے۔ اس نے وزیرِاعظم سے کہا ہے کہ وہ سپہ سالار ابو جعفر حجازی کے خلاف باقاعدہ لڑائی لڑے گا اور فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لے گا"۔

"میں سپہ سالار حجازی کو اچھی طرح جانتا ہوں" ___ ابو مسلم رازی نے کہا ___ "خوشامدی آدمی ہے۔ معلوم نہیں سلطان ملک شاہ مرحوم نے اسے سپہ سالار کیسے بنا دیا تھا۔ وہ سوائے خوشامد کے کچھ بھی نہیں جانتا"۔

"وہ ہمارے بھائی برکیارق کا ہر غلط حکم بسر و چشم مانتا ہے..... اور دوسروں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی یہ حکم مانیں..... اس میں اور سالار اوریزی میں باقاعدہ دشمنی پیدا ہو گئی ہے"۔

"اوریزی صحیح معنوں میں مجاہد آدمی ہے" ___ ابو مسلم رازی نے کہا ___ "اس نے جو کہا ہے وہ کر کے بھی دکھا دے گا لیکن یہ صورتِ حال خطرناک ہو سکتی ہے"۔

"وہ خطرہ سامنے آگیا ہے" ___ محمد نے کہا ___ "وزیرِاعظم عبدالرحمٰن سمیری کے مخبروں نے انہیں بتایا ہے کہ باطنی تخریب کار دونوں طرف کے فوجیوں کو ایک دوسرے

کے خلاف مشتعل کر رہے ہیں۔ نظر یہی آ رہا ہے کہ وہ فوجی جنہیں نکالا جا رہا ہے' ان فوجیوں سے ٹکرا جائیں گے جنہیں فوج میں رکھا جا رہا ہے۔ شہری بھی دو مخالف گروہوں میں بٹتے جا رہے ہیں۔ اس میں کسی شک شبے کی گنجائش نہیں رہی کہ باطنی شہریوں میں شامل ہو کر انہیں بھڑکا رہے ہیں۔ کسی بھی روز یہ آتش فشاں پھٹ پڑے گا"۔

"مجھے سوچنے دو" ___ ابو مسلم نے کہا ___ "یہ صورتِ حال ایسی نہیں کہ میں فوراً" ہی کوئی مشورہ دے دوں۔ اس وقت میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ تمہیں یقین دلا دوں کہ میں ہر طرح تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں اُس نفری کو جسے نکالا جا رہا ہے یہاں بلا لوں گا اور فوج تیار کر کے سلطان برکیارق کا تختہ اُلٹ دوں گا۔ بہرحال صورتِ حال بہت ہی خطرناک ہے۔ تم کچھ دن یہیں ٹھہرو' میں کچھ نہ کچھ سوچ لوں گا"۔

وہ اس مسئلے اور اس صورتِ حال پر باتیں کرتے رہے اور حسن بن صباح کا ذکر آگیا۔ اس ذکر کے ساتھ ابو مسلم رازی نے حمیرا کا نام لیا اور مختصراً" محمد کو سنایا کہ یہ لڑکی کس طرح اس کے پاس پہنچی ہے اور حسن بن صباح سے انتقام لینے کے لئے بے تاب ہے۔

ابو مسلم رازی نے حمیرا کو بلا لیا۔ وہ آئی تو اس کا تعارف محمد سے کرایا اور اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"حمیرا!" ___ ابو مسلم نے کہا ___ "محمد کچھ دن یہاں رہے گا۔ اس میں وہی جذبہ اور وہی خیالات ہیں جو تمہارے ہیں۔ اس کی میزبانی تم نے کرنی ہے۔ اسے اس کے کمرے میں لے جاؤ اور اس کا خیال رکھنا"۔

محمد اور حمیرا اٹھے اور کمرے سے نکل گئے۔ دونوں کو معلوم نہ تھا کہ وہ کیسی سنسنی خیز کہانی کے کردار بنتے جا رہے ہیں۔

ابو مسلم رازی نے محمد اور حمیرا کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا اور خود گہری سوچ میں کھو گیا۔ محمد محسوس نہ کر سکا تھا کہ اُس نے ابو مسلم رازی کو مَرو کی جو خبر سنائی ہے' اس خبر نے اس جہاندیدہ امیر اور حاکم کی ذات میں کیسا تیز و تند طوفان بپا کر دیا ہے۔ ابو مسلم رازی اس قدر بے چین اور پریشان ہو گیا تھا کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ رکتا اور ایک ہاتھ کا گھونسہ دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتا اور پھر ٹہلنے لگتا۔ وہ سلطان ملک شاہ کا دستِ راست تھا۔ دونوں کا جذبہ ایک اور ایمان ایک تھا۔ دونوں باطنیوں کے معاملے میں اتنے حساس تھے کہ حسن بن صباح کا نام آ جاتا تو دونوں کا خون کھولنے لگتا تھا...... سلطان ملک شاہ دنیا سے اٹھ گیا تو اُس کے بیٹے نے اُس کی گدّی پر بیٹھ کر اسی حسن بن صباح اور اس کے فرقے کے ساتھ اپنا رویّہ دوستانہ کر لیا تھا۔

ابو مسلم رازی نے دروازے پر کھڑے دربان کو بلایا اور اُسے کہا کہ مجید فاضل صاحب کو اپنے ساتھ لے آؤ۔

مجید فاضل ایک بہت بڑا عالمِ دین شخص تھا جو دین کے علاوہ سیاست اور امورِ سلطنت کو بھی خوب سمجھتا اور ان سے متعلق مسائل اور مشکلات کا حل اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں نکال لیا کرتا تھا۔ اُس کا پورا نام جو تاریخوں میں آیا ہے' وہ ابوالمظفر مجید فاضل اصفہانی تھا۔ اُس نے علم' دانش اور تجربے کی تلاش میں کئی ملکوں کا سفر کیا تھا اور اب وہ رے میں رہتا تھا۔ ابو مسلم رازی خود بھی بڑھاپے کی عمر میں پہنچ گیا تھا اور اپنے علم و فضل سے اس نے بڑا اونچا مقام حاصل کر لیا تھا لیکن مجید فاضل کو اپنا استاد اور بہترین مشیر سمجھتا تھا۔ کوئی مسئلہ پیش آ جاتا تو اُسے بلا لیتا یا خود اُس کے ہاں چلا جاتا تھا۔

اُس نے دربان سے اتنا ہی کہا تھا کہ مجید فاضل کو اپنے ساتھ لے آؤ۔ دربان جانتا تھا کہ اس شخصیت کے لئے بگھی لے کر جاتا ہے اور انہیں اس سواری پر لاتا ہے۔

کچھ دیر بعد بگھی مجید فاضل کو لے آئی۔ ابو مسلم رازی اُن کے استقبال کے لئے باہر نکلا اور اُسے بڑے احترام اور تعظیم سے اندر لے آیا۔

"کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہے ہو!" ۔۔۔ مجید فاضل نے اندر آ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا ۔۔۔ "کوئی پیچیدہ مسئلہ آن پڑا ہے؟"

"پیچیدہ نہ ہوتا تو میں آپ کو زحمت نہ دیتا" ۔۔۔ ابو مسلم رازی نے کہا ۔۔۔ "وہ خطرہ جس کے متعلق ہم کئی بار بات کر چکے ہیں' ایک سیاہ کالی گھٹا کی طرح سلطنتِ سلجوقیہ پر چھا گیا ہے۔ اس گھٹا کے اندر بجلیاں چھپی ہوئی ہیں' وہ آپ خود جانتے ہیں کہ اب یہ گھٹا خون کا مینہ برسائے گی"۔

"کوئی اور اطلاع آئی ہے؟" ۔۔۔ مجید فاضل نے پوچھا۔

ابو مسلم رازی نے وہ ساری صورتِ حال بیان کر دی جو کچھ دیر پہلے محمد نے اُسے سنائی تھی۔

"کیا برکیارق کچھ بھی نہیں سمجھ رہا؟" ۔۔۔ مجید فاضل نے پوچھا۔

"نہیں!" ۔۔۔ ابو مسلم رازی نے جواب دیا ۔۔۔ "میں خود اُس کے ساتھ بات کر چکا ہوں محترم! جس نے اپنی عظیم ماں کی بات نہیں سنی اور اپنی بیوی کو بزرگ سمجھا ہے' اُس پر میری باتوں کا کیا اثر ہو سکتا ہے!..... یہ تو وہی باتیں ہیں جو ہم کئی بار کر چکے ہیں۔ اب برکیارق فوج کی آدھی نفری نکال رہا ہے۔ کچھ دنوں بعد باقی فوج میں سے آدھی نفری کو بھی گھر بھیج دے گا۔ محمد بتاتا ہے کہ ان لوگوں میں جنہیں فوج سے نکالا جا رہا ہے اور شہریوں میں بھی غم و غصہ پھیلتا چلا جا رہا ہے اور ایسے حالات پیدا ہو رہے ہیں جو قوم کو خانہ جنگی کی طرف گھسیٹ لیں گے"۔

"تم نے کیا سوچا ہے؟" ۔۔۔ مجید فاضل نے پوچھا۔

"یہی میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں" ۔۔۔ ابو مسلم رازی نے کہا ۔۔۔ "آپ کو زحمت دینے سے میرا مطلب یہی تھا کہ میں غلط سوچ رہا ہوں تو مجھے روکیں اور اگر میں صحیح بات تک پہنچ رہا ہوں تو میری حوصلہ افزائی کریں یا مجھے کوئی راستہ دکھائیں"۔

"کیا سوچا ہے؟"

"خانہ جنگی!" ـــــ ابو مسلم رازی نے کہا ـــــ "میں نے محمد سے کہا ہے کہ جن افراد کو فوج سے نکالا جا رہا ہے اگر انہوں نے کسی شدید ردِ عمل کا مظاہرہ کیا اور انہیں طاقت اور تشدد سے دبانے کی کوشش کی گئی تو میں ان نکالے جانے والوں کو یہاں لے آؤں گا اور ان کی ایک فوج بنالوں گا پھر میں برکیارق کی فوج کے مقابلے میں جاؤں گا"۔

"میں تمہاری سوچ کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں" ـــــ مجید فاضل نے کہا ـــــ "لیکن میں تمہیں پہل کرنے سے روکوں گا۔ یہ دیکھیں گے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ اگر وہ تشدد اور فوجی کارروائی پر اُتر آتے ہیں تو پھر تم اپنا فرض اس طرح ادا کرنا کہ اس سرکاری فوج کا خاتمہ نہ ہو۔ تمہارا مقصد صرف یہ ہو کہ برکیارق کو معزول کر کے محمد کو باپ کی گدّی پر بٹھایا جائے"۔

"میرا مقصد یہی ہے محترم!" ـــــ ابو مسلم رازی نے کہا ـــــ "میں یہ تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایک بیٹے کو معزول کر کے اس گدّی پر خود بیٹھ جاؤں گا اور دوسرے بیٹوں کو ان کے حق سے محروم کر دوں گا۔ محمد اور اس کا بھائی سنجر بڑے ہی عظیم باپ کے بیٹے ہیں۔ سلطان ملک شاہ اور میں ایک ہی منزل کے مسافر تھے"۔

ابو مسلم رازی کی آواز رقّت میں دب گئی اور اس کے آنسو پھوٹ آئے۔

"خانہ جنگی ہو کر رہے گی" ـــــ مجید فاضل نے کہا ـــــ "مجھے خبریں مل رہی ہیں۔ میرے شاگرد میرے جاسوس ہیں۔ مَرو سے مجھے خبریں ملتی رہتی ہیں۔ حسن بن صباح کے دہشت گرد باطنی شہروں میں بھرتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ تو یقینی امر ہے کہ سلطان برکیارق کی بیوی روزینہ حسن بن صباح کی بھیجی ہوئی ہے۔ اتنی لمبی عمر کا تجربہ مجھے بتاتا ہے کہ دنیا میں جتنی تباہی عورت لائی ہے، اتنی تباہی ایک دوسرے کے ملکوں پر حملے کرنے والے بادشاہ بھی نہیں لا سکے۔ میں ہر عورت کی بات نہیں کر رہا۔ عورت وفادار بیوی بھی ہوتی ہے اور عورت عظیم ماں بھی ہوتی ہے اور اپنے دودھ کی دھاروں میں اپنی عظمت اپنے بچوں کی روح میں ڈال دیتی ہے۔ عورت بہن بھی ہوتی ہے جو اپنے بھائیوں کو جہاد پر رخصت کر دیتی ہے۔ میں اُس عورت کی بات کر رہا ہوں جسے تربیت ہی یہ ملتی ہے کہ جس کے پاس دھن دولت ہے، تخت و تاج ہے اُسے پھانس لو اور کنگال کر کے باہر پھینک دو۔ حسن بن صباح اپنی تربیت یافتہ لڑکیوں کو اسی طرح استعمال کرتا ہے۔ یہ تو تم خود جانتے ہو کہ حسین و جمیل نوجوان لڑکی بجائے خود جادو کا اثر رکھتی ہے۔ میں

نئی بات نہیں کہہ رہا۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ برکیارق کو اس لڑکی کے جال سے نہیں نکالا جا سکتا"۔

"ایک بات اور ذہن میں آتی ہے" ـــــ ابو مسلم رازی نے کہا ـــــ "اگر اس لڑکی روزینہ کو قتل کروا دیا جائے تو آپ کیا مشورہ دیں گے؟"

"برکیارق کا ردِ عمل وحشیوں اور درندوں جیسا ہو گا" ـــــ مجید فاضل نے کہا ـــــ "وہ پاگل ہو جائے گا۔ اپنی ماں تک کو قتل کروا دے گا۔ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کو قید خانے میں پھینک دے گا۔ اسے معلوم ہے کہ آپ بھی اس لڑکی کے خلاف ہیں۔ وہ آپ کو اس رتبے سے معزول کر کے قتل کروا دے گا یا قید خانے میں ڈال دے گا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اس کی گمراہی کے نتائج سامنے آنے دیں۔ خون بہے گا، بہنے دیں تاکہ وہ دیکھے کہ اس نے کیا گل کھلائے ہیں اور یہ جو خون بے گناہوں کا بہہ گیا ہے یہ اُس کے کرتوت کا نتیجہ ہے اور وہ اپنے خاندان اور پوری سلطنت کی تباہی کا اکیلا ذمہ دار ہے، اس کی بیوی نہیں۔ بیوی تو آئی ہی اسی مقصد کے لئے تھی"۔

"میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ لڑکی جو اس سلطنت کی ملکہ بن بیٹھی ہے خزانہ خالی کر رہی ہے" ـــــ ابو مسلم رازی نے کہا ـــــ "اور یہ خزانہ قلعہ اَلمُوت میں جا رہا ہے۔ ہمیں بہت جلدی کوئی کارروائی کرنی پڑے گی"۔

"آپ یہ لعنت اپنے سر نہ لیں" ـــــ مجید فاضل نے کہا ـــــ "حسن بن صباح زیادہ جلدی میں ہے۔ وہ جو چال ایک لڑکی کے ذریعے چل رہا ہے وہ بہرحال کامیاب ہو گی۔ اسے کامیاب ہونے دیں۔ اس کے بعد آپ اپنی چال چلیں۔ یہ ہو گی خانہ جنگی ہی۔ باطنی خانہ جنگی کے لئے زمین ہموار کر چکے ہیں۔ آدھی فوج کو نکلوا دینا ان کی پہلی چال ہے۔ نائب سپہ سالار اوریزی جو سوچ رہا ہے اور کر رہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ آپ تیار رہیں۔ جونہی کوئی اس قسم کی صورتِ حال پیدا ہو جائے تو دیکھ لیں کہ آپ یہاں کچھ کر سکتے ہیں یا آپ کو وہاں پہنچنا چاہئے۔ خانہ جنگی سے نہ ڈرو۔ یہ میں بتا چکا ہوں کہ خانہ جنگی ہو کر رہے گی۔ آپ اسے روکنے کی کوشش کریں گے تو اس کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا کہ آپ اپنی توانائی اور اپنے وسائل ضائع کریں گے اور آپ دشمنوں کی نظر میں آ جائیں گے اور ایک روز یہ خبر ملے گی کہ رے کا امیر ابو مسلم رازی قتل ہو گیا ہے۔ محمد یہاں آیا ہے۔ اسے جلدی واپس بھیج دیں اور اسے یہ کہہ دیں کہ مَرو میں کسی کو پتہ

نہ چلنے دینے کہ وہ یہاں آیا تھا"۔

"ہم اسلام کی سربلندی اور فروغ میں مصروف تھے" ــــ ابو مسلم رازی نے کہا ــــ "لیکن حالات نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ اس سلطنت کو شکست و ریخت سے بچانا ایک مسئلہ بن گیا ہے"۔

"یہ سارا فتنہ اسلام کی تباہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے" ــــ مجید فاضل نے کہا ــــ "اسلام ایک مکمل دین ہے اور یہ اللہ کا اپنا دین ہے اور یہ ہمیشہ قائم رہے گا اور باطل کی قوتیں اسے کمزور کرتی رہیں گی۔ یہ نہ سمجھو کہ حسن بن صباح کے پاس جو تربیت یافتہ لڑکیاں ہیں وہ صرف اغوا کی ہوئی ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی کم سن اور انتہائی خوبصورت بچیاں حسن بن صباح کے حوالے کر رکھی ہیں۔ وہ اس باطنی ابلیس کی یہ ضرورت پوری کرتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کو تم ہر دور میں اسلام کی بیخ کنی کے لئے سرگرم دیکھو گے۔ خطرہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ خود مسلمان اسلام کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ ان کے دماغوں میں حکمرانی کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ حکمرانی اور اقتدار اعلیٰ کی ہوس ایسی خطرناک چیز ہے جو کسی میں داخل ہو جائے تو وہ اس کی خاطر اپنے دشمن کے ساتھ بھی دوستی کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ خلافت اسلام کی مرکزیت کی نشانی تھی لیکن کہاں ہے ہمارا خلیفہ؟..... برائے نام ایک آدمی خلافت کی گدی پر بیٹھا ہے اور وہ ایسے حالات پیدا کر لیتا ہے کہ وہ مر جائے تو یہ گدی اس کے خاندان میں ہی رہے۔ شریعت ختم ہو چکی ہے۔ یہی ایک پابندی تھی۔ حسن بن صباح نے یہی کمال کیا ہے کہ شرعی پابندیوں کو ختم کر کے یہ کہا ہے کہ یہ ہے اصل اسلام۔ انسان کی فطرت کسی پابندی کو قبول نہیں کرتی۔ یہ ابلیسی طرز فکر ہے جو انسان کو اچھا لگتا ہے کیونکہ اس میں لذت ہے نشہ ہے اور اس میں کوئی روک نہیں کوئی ٹوک نہیں..... بہرحال آپ مرو کے حالات پر نظر رکھیں اور تیار رہیں۔ میں آپ کے ساتھ رابطہ رکھوں گا اور مجھے ہر حال میں اور ہر وقت اپنے ساتھ سمجھیں"۔

جب ابوالمظفر مجید فاضل اصفہانی ابو مسلم رازی کے پاس بیٹھا ہوا تھا اس وقت سلطان ملک شاہ مرحوم کا بیٹا' سلطان کا برکیارق کا چھوٹا بھائی محمد حمیرا کے ساتھ دوسرے کمرے میں بیٹھا باتیں کر بھی رہا تھا اور سن بھی رہا تھا۔ محمد خوبرو جوان اور خوش گفتار تھا اور وہ سلطان کا بیٹا اور موجودہ سلطان کا چھوٹا بھائی تھا۔ حمیرا جب اس کے ساتھ اس

کمرے میں آئی تھی تو اُس پر مرعوبیت طاری تھی اور وہ جھینپی ہوئی تھی۔ وہ خاص طور پر حسین اور دلکش لڑکی تھی لیکن اسے باطنیوں کی تربیت حاصل نہیں تھی کہ وہ محمد کو مرعوب کرتی۔

"محترم رازی نے تمہارے متعلق بہت ہی مختصر بات کی ہے" ــــ محمد نے حمیرا سے کہا ــــ "میں ساری بات تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں"۔

حمیرا پر جو بیتی تھی وہ اُس نے ہر ایک تفصیل کے ساتھ سنا دی۔ اُس کے آنسو بھی نکلے اُس نے آہیں بھی بھریں اور جب اس پر انتقام کے جذبے کا غلبہ ہوا تو اُس کے چہرے پر سرخی آ گئی اور اس کے دانت پسنے لگے۔

"اسلام کو تم جیسی بیٹیوں کی ضرورت ہے" ــــ محمد نے کہا ــــ "اگر انتقام لینا چاہتی ہو تو مردوں کی طرح حوصلہ مضبوط کرو عورتوں کی طرح روؤ نہیں"۔

"لیکن میں اکیلی کیا کر سکتی ہوں؟" ــــ حمیرا نے کہا۔

"بہت کچھ کر سکتی ہو" ــــ محمد نے کہا ــــ "تم میں مردوں والی ہمت ہے لیکن ہم مرد جب تک زندہ و بیدار ہیں تو کسی عورت کو خطرے میں نہیں ڈالیں گے۔ تم نے میری باتیں سنی ہیں جو میں محترم رازی کو سنانے آیا تھا۔ تم نے محسوس کیا ہو گا کہ میرا اور تمہارا جذبہ ایک ہے۔ اسلام کو اور اس سلطنت کو میرا بڑا بھائی نقصان پہنچا رہا ہے۔ اسی لئے میں اپنے سگے بھائی کو دشمن کہہ رہا ہوں۔ ہم اس سلطنت کو اسلام کا قلعہ بنا چکے تھے۔ میرے والد مرحوم کا مقصد ہی یہی تھا مگر ان کی وفات کے بعد حالات نے کچھ اور ہی پلٹا کھایا ہے..... میری عمر ابھی اتنی نہیں ہوئی کہ میں دانشوروں اور عالموں کی طرح بات کر سکوں۔ میں تمہیں صرف یہ کہوں گا کہ جس طرح تم نے خوف کو قبول نہیں کیا اسی طرح اپنے آپ کو ہمیشہ بے خوف اور نڈر رکھنا۔ اگر تم پر خوف کا غلبہ ہوتا تو الموت سے تم کبھی نہ نکل سکتیں۔ تم اُس باطنی کو دریا میں پھینک کر ہلاک نہ کر سکتیں اور پھر تنہا سفر کا تو تمہارے ذہن میں خیال بھی نہ آتا لیکن تم نے خوف کو قبول نہیں کیا تھا اس لئے تمہارے دماغ نے تمہاری راہنمائی کی اور تم ایک آدمی سے گھوڑا لے کر یہاں تک پہنچ گئیں"۔

"کیا یہ سلطنت باطنیوں کو ختم کر سکے گی؟" ــــ حمیرا نے پوچھا۔

"کر سکتی تھی" ــــ محمد نے جواب دیا ــــ "میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میرے والد

www.paksociety.com

مرحوم کی زندگی کا مقصد ہی یہی تھا..... باطنیوں کا خاتمہ..... مگر میرا بڑا بھائی باپ کی گدّی پر بیٹھا تو اُس نے باطنیوں کے خاتمے کی بجائے اپنے باپ کے مقصد کا خاتمہ کر دیا"۔

"وہ کیسے؟"

"وہ اس طرح" ـــــ محمد نے جواب دیا ـــــ "کہ وہ باطنیوں کی گود میں جا گرا ہے۔ اُس نے سب کی مخالفت کے باوجود ایک باطنی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی ہے..... اُس کی بیوی کا نام روزینہ ہے..... وہ تم سے زیادہ خوبصورت نہیں لیکن اُس کے ہاتھ میں جو جادو ہے اس کو اسے چلانے کی تربیت ملی ہوئی ہے"۔

"کیا ہم اس لڑکی کو ختم نہیں کر سکتے؟" ـــــ حمیرا نے کہا۔ "اگر کوئی اور نہ کر سکے تو یہ کام میرے سپرد کریں..... میں جب تک چند ایک باطنیوں کا خون اپنے ہاتھوں بہا نہ لوں گی مجھے چین نہیں آئے گا۔ میں نے اپنے بڑے بھائی، ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کے خون کا انتقام لینا ہے"۔

"اور میں نے اپنے باپ کے خون کا انتقام لینا ہے" ـــــ محمد نے کہا ـــــ "میرے باپ کو باطنیوں نے دھوکے میں زہر پلا کر مار ڈالا ہے۔ میں بھی تمہاری طرح سوچا کرتا ہوں لیکن ایک دو آدمیوں کو قتل کر دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کسی کو قتل کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ روزینہ کو میں خود قتل کر سکتا ہوں، کروا بھی سکتا ہوں مگر ہم نے اس کے نتائج دیکھنے ہیں۔ میرا بھائی برکیارق ہمیں قتل کروا دے گا۔ وہ اپنے آپ میں ہے ہی نہیں"۔

"میں سوچ رہی تھی کہ روزینہ کی کنیز بن جاتی ہوں" ـــــ حمیرا نے کہا ـــــ "میں ایک غریب لڑکی بن کر اُس کے پاس جاؤں اور اُس سے کہوں کہ وہ مجھے اپنی کنیز بنا لے تو میرا خیال ہے کہ میری بات مان جائے گی۔ پھر میں اُسے آسانی سے زہر دے سکتی ہوں لیکن آپ نے جو بات کہی ہے وہ میں سمجھ گئی ہوں"۔

"تم یہیں انتظار کرو" ـــــ محمد نے کہا ـــــ "اپنا خون نہ جلاؤ۔ ہمیں جہاں کہیں تمہاری ضرورت محسوس ہوئی تمہیں بلا لیں گے"۔

"میں یہاں کب تک پڑی رہوں گی!" ـــــ حمیرا نے کہا ـــــ "اچھا نہیں لگتا کہ امیرِ شہر کے ہاں مہمان ہی بنی رہوں، آخر ایک دن یہ مجھ سے تنگ آ جائیں گے۔ میرا تو کوئی گھر ہے ہی نہیں، نہ کوئی ٹھکانہ نہ کوئی پناہ!"

"ایسا نہ سوچو" ـــــ محمد نے کہا ـــــ "یہاں عموماً تم جیسی لڑکیاں اور مظلوم آدمی آتے ہی رہتے ہیں۔ تمہیں یہاں سے کوئی نکال نہیں دے گا"۔

"جذباتی سہارا تو مجھے کوئی نہیں دے سکتا" ـــــ حمیرا نے کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ـــــ "میرا بھائی شہر کا رئیس تھا۔ میں نے اچھے خاندان میں پرورش پائی اور اچھی زندگی دیکھی تھی"۔

"تمہیں اس سے زیادہ اچھی زندگی ملے گی انشاء اللہ!" ـــــ محمد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ـــــ "اپنی ذات کے متعلق تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہئے"۔

"میری عمر دیکھیں" ـــــ حمیرا نے کہا ـــــ "میں تو کہوں گی کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی اچھی شکل و صورت دے کر مجھ پر کوئی کرم نہیں کیا۔ مجھ جیسی بے آسرا لڑکیوں کے لئے خوبصورتی مصیبت بھی بن جایا کرتی ہے۔ آپ یقیناً شادی شدہ ہیں....."

"نہیں حمیرا!" ـــــ محمد نے مسکراتے ہوئے کہا ـــــ "میں نے ابھی شادی کی سوچی بھی نہیں۔ ماں کو میرا فکر لگا رہتا ہے لیکن سلطنت کے بگڑتے ہوئے حالات نے میری توجہ اُدھر سے ہٹا رکھی ہے"۔

حمیرا فوراً کچھ بھی نہ بولی۔ اس کی نظریں محمد کے چہرے پر جم کر رہ گئیں اور پھر اس کی نظریں جھک گئیں۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کہنے کی جرأت نہیں رکھتی۔

"ایک بات پوچھوں حمیرا!" ـــــ محمد نے کہا ـــــ "کیا اپنی پسند کا کوئی آدمی تمہاری زندگی میں آیا ہے؟"

"یہی تو غلطی کر بیٹھی تھی" ـــــ حمیرا نے کہا ـــــ "آپ کو سنایا ہے کہ ایک آدمی کو دل میں بٹھایا تھا اور اسی آدمی کو اپنے ہاتھوں دریا میں دھکیل کر اور ڈبو کر مار ڈالا ہے..... اُس کا نام جابر بن حاجب تھا..... اب تو میں محبت کے نام سے بھی ڈرتی ہوں۔ آنکھیں انسان کو باہر سے دیکھتی ہیں اندر سے نہیں دیکھ سکتیں۔ میری آنکھوں نے اور میرے دل نے مجھے دھوکا دیا"۔

"میری آنکھیں مجھے دھوکہ نہیں دے رہیں" ـــــ محمد نے بڑے ہی خوشگوار لہجے میں کہا ـــــ "میری آنکھیں تمہارا ضمیر اور تمہاری روح بھی دیکھ رہی ہیں۔ میں نہیں بتا سکتا کہ میں تمہارے اس ظاہری حسن اور پرکشش جسم سے متاثر ہوا ہوں یا اس

کارنامے سے جو تم نے کر دکھایا ہے یا اس جذبے سے جو تمہیں بے چین اور بے قرار کئے ہوئے ہے یا ان ساری چیزوں نے مل ملا کر ایسا اثر کیا ہے کہ میں تمہیں یہاں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا"۔

"آپ کی یہ بات سن کر میری روح کو تسکین ہوئی ہے" —— حمیرا نے سر جھکا کر کہا —— "اگر آپ نے مجھے دلی طور پر قبول کر لیا ہے تو میں اپنے آپ کو یقین دلا سکتی ہوں کہ میری زندگی کے خلا کو صرف آپ کی محبت پُر کر سکتی ہے"۔

دونوں کے ہاتھ آگے بڑھے اور ان ہاتھوں نے ایک دوسرے کو پکڑ لیا اور پھر ان ہاتھوں نے محمد اور حمیرا کو اتنا قریب کر دیا کہ ان کے درمیان سے ہوا کا گزر بھی ممکن نہ رہا۔

"محترم ابو مسلم رازی دانشمند اور دور اندیش ہیں" —— محمد نے مسکراتے ہوئے کہا —— "انہوں نے مجھے تمہارے ساتھ اس کمرے میں بلا مقصد نہیں بھیجا تھا۔ میری ماں نے انہیں دو تین مرتبہ کہا تھا کہ میرے اس بیٹے کے لئے ہمارے خاندان کے مطابق موزوں دلہن تلاش کریں..... لیکن حمیرا محبت اپنی جگہ' اُس جذبے اور مقصد کو جو ہم دونوں میں مشترک ہے اولیت حاصل ہونی چاہیے"۔

"اس مقصد پر تو میں اپنی محبت بھی قربان کر دوں گی" —— حمیرا نے کہا۔

وہ ایک دوسرے میں گم ہو گئے تھے کہ انہیں دربان کی آواز سنائی دی —— "امیر محترم یاد فرما رہے ہیں!"

محمد فوراً اٹھا اور ابو مسلم رازی کے کمرے میں چلا گیا۔

"محمد بیٹا!" —— ابو مسلم رازی نے کہا —— "تم کل علی الصبح مرو کے لئے روانہ ہو جاؤ۔ مجھے وہاں کی خبریں بھیجتے رہنا' خود آنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اپنے آپ کو تنہا نہ سمجھنا میں پہنچوں گا..... اور نائب سپہ سالار اوریزی کے ساتھ رابطہ رکھنا..... اب یہ بتاؤ کہ اس لڑکی حمیرا کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"انتقام کا جذبہ اسے پریشان کر رہا ہے" —— محمد نے جواب دیا —— "اچھی لڑکی ہے لیکن تنہائی محسوس کرتی ہے"۔

"وہ تو میں نے دیکھ لیا ہے کہ لڑکی بڑے کام کی ہے" —— ابو مسلم رازی نے ذرا تبسم سے کہا —— "جہاں تک اس کی تنہائی کا تعلق ہے اس کا علاج تمہارے پاس ہے۔

تم ابھی جاؤ اور یہ ذہن میں رکھنا کہ میں اس لڑکی کو ضائع نہیں ہونے دوں گا"۔

○

جس وقت محمد اور حمیرا کی ملاقات ہوئی تھی اس سے بہت پہلے حسن بن صباح کو یہ اطلاع پہنچا دی گئی تھی کہ ایک فدائی جابر بن حاجب کی قاتل حمیرا رے کے امیر ابو مسلم رازی کی پناہ میں پہنچ گئی ہے۔ حسن بن صباح نے بڑا سخت حکم دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس لڑکی کو اغوا کر کے الموت لایا جائے اور پھر اسے گھٹنوں سے اوپر تک زمین میں گاڑ کر اس کے جسم پر اور منہ پر شہد مل دیا جائے۔

یہ بڑی ہی ظالمانہ سزا تھی جو حسن بن صباح نے سنائی تھی۔ شہد مل دینے سے چھوٹی بڑی چیونٹیوں اور کیڑے مکوڑوں نے اور دیگر حشرات الارض نے حمیرا کے جسم کا گوشت آہستہ آہستہ کھا جانا تھا۔ اس نے آخر مرنا ہی تھا لیکن ایسی اذیت میں مرنا تھا جو پانچ چھ دن اسے ملتی رہتی۔ حسن بن صباح نے کہا تھا کہ اُس کی جنت کی تمام لڑکیوں کو یہ منظر اور حمیرا کا حشر دکھایا جائے تاکہ کوئی لڑکی فرار کی یا کسی غلط حرکت کی جرأت نہ کرے۔

حسن بن صباح کو روزینہ کی رپورٹ بھی مل گئی تھی کہ اُس نے سلطان برکیارق کو پوری طرح مٹھی میں لے لیا ہے اور اس سے یہ فیصلہ کروا لیا ہے کہ فوج کی نفری آدھی کر دی جائے۔ روزینہ نے اپنی اس رپورٹ میں کہا تھا کہ اب آدمی بھیجے جائیں جو اس نفری میں اشتعال پیدا کریں جسے فوج میں سے نکالا جا رہا ہے۔ حسن بن صباح کو اس قسم کی رپورٹیں اور اطلاعیں دینے والی ایک روزینہ ہی نہیں تھی' یہ تو اُس کا ایک مکمل نظام تھا جو سلطنتِ سلجوقیہ میں پھیلا ہوا تھا اور اس سلطنت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہا تھا۔

مرو میں سپہ سالار ابو جعفر حجازی اپنے سلطان برکیارق کے حکم کے مطابق فوج کی چھانٹی کر رہا تھا۔ یہ وہ فوج تھی جسے سلطان ملک شاہ مرحوم نے باطنیوں کی سرکوبی کے لئے تیار کیا تھا اور اس فوج میں وہ اضافہ کر رہا تھا۔

سپہ سالار حجازی جس نفری کو فارغ کر رہا تھا اسے بارکوں میں سے نکال کر الگ کرتا جا رہا تھا۔ اس نفری کے لئے خیمے لگا دیئے گئے تھے۔ اسے فوری طور پر فارغ نہیں کیا جا رہا تھا کیونکہ ان کا حساب کتاب بھی کرنا تھا اور آخر میں یہ ساری نفری سلطان برکیارق کو دکھانی تھی تاکہ اُس کا آخری حکم لیا جا سکے۔ اس طرح ایک وسیع میدان میں خیموں کا

ایک شہر آباد ہو گیا تھا۔ فارغ کی جانے والی نفری کی تعداد پندرہ ہزار سے تجاوز کر گئی تھی۔ اس نفری سے گھوڑے اور ہتھیار لے لئے گئے تھے۔

فوج کی ملازمت بیشتر لوگوں کا ذریعۂ معاش بن گیا تھا۔ اُس وقت کے فوجیوں کو یہ فائدہ بھی نظر آتا تھا کہ مفتوحہ علاقے سے مالِ غنیمت بھی ملتا تھا۔ اب ان پندرہ سولہ ہزار آدمیوں سے ذریعۂ معاش چھن رہا تھا۔ قدرتی طور پر ان میں مایوسی اور بے زاری پیدا ہو گئی تھی۔ اس بے زاری میں غصے کا عنصر بھی موجود تھا۔ وہ جب آپس میں بیٹھ کر باتیں کرتے تھے تو ہر فوجی یہ ضرور کہتا تھا کہ ہمیں کیوں نکالا گیا ہے' ہماری جگہ دوسروں کو کیوں نہیں نکالا گیا۔ انہیں اپنے آپ میں کوئی خامی یا کوئی نقص نظر نہیں آتا تھا اور نہ ہی ان میں کوئی خوبی نظر آتی تھی جنہیں فوج میں ہی رکھا جا رہا تھا۔ ان آدمیوں کی جذباتی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتے تھے۔ غصے اور احتجاج سے وہ بارُود کی مانند ہوتے جا رہے تھے۔

"ہمیں تو کہتے تھے کہ باطنیوں کو ختم کرنا ہے"۔

"اب ہمیں ہی ختم کیا جا رہا ہے"۔

"نئے سلطان کی بیوی باطنی ہے"۔

"نئے سلطان نے حسن بن صباح کا عقیدہ قبول کر لیا ہے"۔

اور ایسی ہی باتیں تھیں جو خیموں کی اس بستی میں سنی اور سنائی جاتی تھیں چونکہ یہ سب فوجی تھے اس لئے کئی باتیں اخلاق سے گری ہوئی بھی کہتے تھے۔ فارغ کئے جانے والے ان پندرہ سولہ ہزار فوجیوں میں سالار بھی تھے اور عہدے داروں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی' باقی سب سپاہی تھے۔ مرو میں جو صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی' اس کے متعلق زیادہ تر یورپی مؤرخوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ ہزاروں فوجی سراپا احتجاج بن گئے تھے۔ ایک وجہ تو سب کو نظر آ رہی تھی۔ وہ یہ کہ ان کی چھانٹی کی جا رہی تھی لیکن ایک وجہ اور بھی تھی کہ وہ آتش بگولہ ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے پاس ان کے رشتہ دار' دوست اور دوسرے شہری بھی ازراہِ ہمدردی آتے رہتے تھے۔ ان میں حسن بن صباح کے تخریب کار بھی شامل ہوتے تھے جن کی اصل حقیقت سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ ان فوجیوں کو خوب بھڑکاتے اور ان میں طرح طرح کی افواہیں پھیلاتے تھے۔

ان ہی خفیہ تخریب کاروں نے فارغ کئے جانے والے فوجیوں میں یہ افواہ پھیلا دی کہ جن فوجیوں کو فوج میں ہی رکھا جا رہا ہے' وہ کہتے پھرتے ہیں کہ جنہیں نکالا گیا ہے وہ بزدل اور بد اخلاق ہیں اور ان میں ایسے آدمی بھی ہیں جو چھٹی پر جاتے ہیں تو راہزنی اور ڈکیتی کی وارداتیں کرتے ہیں۔ یہ افواہ خیموں کی ساری بستی میں پھیل گئی اور یہ تمام فوجی اتنے مشتعل ہوئے کہ ان کے پاس ہتھیار ہوتے تو فوج پر حملہ کر دیتے۔

سپہ سالار ابو جعفر حجازی تو بلاشک و شبہ خوشامدی آدمی تھا اور وہ سلطان کا ہر ناجائز حکم بھی ماننے کو تیار رہتا تھا۔ نکالے جانے والے فوجیوں کا کوئی ہمدرد تھا تو وہ نائب سپہ سالار اوریزی تھا۔ اُس نے سلطان برکیارق کو برملا کہہ دیا تھا کہ وہ فوج کی چھانٹی کے حق میں نہیں ہے۔ اس کا رویہ اب یہ ہو گیا تھا کہ سپہ سالار حجازی کی بات سن لیتا لیکن اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ اوریزی خیموں میں گیا تو وہاں رہنے والے سابق فوجی اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ غصے اور عتاب سے وہ پھٹے جا رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ایک تو انہیں بے گناہ اور بلاوجہ فوج سے نکالا جا رہا ہے اور دوسرے یہ کہ سارے شہر میں مشہور کر دیا گیا ہے کہ انہیں اس لئے نکالا جا رہا ہے کہ یہ بزدل اور بدمعاش ہیں۔ اوریزی نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ لوگ بہت ہی مشتعل تھے۔ اوریزی نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ سپہ سالار حجازی کے ساتھ بات کرے گا اور ابھی وہ ٹھنڈے رہیں۔

اس نے وہیں سے جا کر سپہ سالار حجازی کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

"اوریزی بھائی!" ـــ سپہ سالار حجازی نے اصل بات سمجھنے کی بجائے یوں کہا ـــ "میں جانتا ہوں کہ تم اس کے حق میں نہیں کہ فوج کم کی جائے۔ تمہاری موجودگی میں سلطان نے حکم دیا تھا کہ فوج کی نفری آدھی کر دو۔ میں حیران ہوں کہ تم مجھ پر اور اس نفری پر جسے ہم فوج میں ہی رکھ رہے ہیں ایسے بے بنیاد الزام کیوں عائد کر رہے ہو"۔

"محترم سپہ سالار!" ـــ نائب سپہ سالار اوریزی نے کہا ـــ "آپ سلطان کو ضرور خوش کریں لیکن اپنی عقل پر ایسا پردہ بھی نہ ڈالیں کہ کسی اچھی بُری بات پر آپ غور بھی نہ کر سکیں۔ میں الزام عائد نہیں کر رہا۔ میں آپ کو خبردار کرنے آیا ہوں کہ ہمارے دشمن خیموں میں بھیجے جانے والے فوجیوں میں افواہیں پھیلا رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ جنہیں آپ فوج میں رکھ رہے ہیں انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی۔ میں اس

فوج کا سالار ہوں اور میرے ذاتی خفیہ ذرائع بھی ہیں۔ ان سے مجھے سب کچھ معلوم ہوتا رہتا ہے۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ باطنی تخریب کار ہیں جو فوج کے ان دونوں دھڑوں کو آپس میں لڑانے کے لئے وجوہات پیدا کر رہے ہیں"۔

"تو پھر یہ کام تم خود کیوں نہیں کرتے!" ـــــ سپہ سالار حجازی نے کہا ـــــ "انہیں جتاؤ کہ یہ افواہ ہے اس پر یقین نہ کریں لیکن اوریزی بھائی! یہ کوئی افواہ نہیں۔ یہ خود اپنے پاس سے باتیں گھڑ رہے ہیں کیونکہ انہیں فوج سے نکالا جا رہا ہے۔ اب میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ یہ لوگ جنہیں میں نے فوج سے الگ کر دیا ہے' جوابی کارروائی کی دھمکی دے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ ان لوگوں کو بھی فوج میں رہنے کے قابل نہیں چھوڑیں گے جنہیں رکھا جا رہا ہے"۔

نائب سپہ سالار اوریزی نے سپہ سالار حجازی کو سمجھانے کی بہت ہی کوشش کی کہ یہ افواہ بھی دشمن کی اڑائی ہوئی ہے۔ حقیقتاً" خیموں میں رہنے والوں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ سپہ سالار حجازی نے اپنے نائب اوریزی کی بات سمجھنے کی بجائے اس پر طنز کی اور اس پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ یہ ساری باتیں خود گھڑ رہا ہے۔

حسن بن صباح کے باطنیوں کا پروپیگنڈا اور افواہ بازی پورا پورا کام کر رہی تھی۔ یہی افواہیں شہریوں میں بھی پھیلائی جا رہی تھیں جس کا نتیجہ یا اثرات یوں سامنے آنے لگے کہ شہری بھی دو حصوں میں بٹنے لگے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب حکمران طوائف الملوکی شروع کر دیتے ہیں تو خوشامد کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ انتظامی امور خوشامد پرستی اور مفاد پرستی کی نظر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں دشمن بلا خوف و خطر اپنی تخریبی کارروائیاں کرتا ہے۔ یہ فضا سلطنتِ سلجوقیہ کے دارالحکومت میں پیدا ہو گئی تھی جو باطنیوں نے پیدا کی تھی۔

○

ایک دو دنوں بعد ایک حادثہ ہو گیا۔ ایک رات ایک فوجی عہدے دار اپنے رہائشی کمرے میں قتل ہو گیا۔ وہ اُس فوج میں شامل تھا جسے رکھا جا رہا تھا۔ صبح اسے دیکھا گیا۔ اس کی لاش فرش پر پڑی تھی۔ اس کے پیٹ میں اور سینے میں خنجر مارے گئے تھے۔ اس کے بستر پر بھی خون تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے سوتے میں خنجر مارے گئے اور وہ تڑپتے ہوئے فرش پر گرا اور اس کے بعد اس کی موت واقع ہوئی۔

تمام فوج میں یہ خبر پھیل گئی کہ فلاں عہدے دار کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس خبر کے ساتھ یہ افواہ بھی پھیلتی گئی کہ اسے اُن فوجیوں میں سے کسی نے قتل کیا ہے جنہیں فوج میں سے نکالا جا رہا ہے۔ یہ افواہ بھی پھیلائی گئی کہ نکالے جانے والے فوجی کہتے ہیں کہ وہ اب اسی طرح قتل کی وارداتیں کرتے رہیں گے۔ ان افواہوں میں تاثر یہ پیدا کیا گیا تھا کہ نکالے جانے والے فوجیوں کو رکھے جانے والے فوجیوں نے بُزدل اور بداخلاق کہا ہے اسی لئے نکالے گئے فوجیوں نے اپنی توہین کا انتقام لیا ہے۔ اس طرح فوج میں اچھی خاصی کشیدگی پیدا ہو گئی۔ بعض فوجیوں نے یہ بھی کہا کہ وہ نکالے جانے والوں کے ساتھ یہی سلوک کریں گے اور ان کی لاشیں ان کے گھروں تک پہنچیں گی۔

کسی فوجی کا یوں قتل ہو جانا بڑا ہی عجیب واقعہ تھا۔ ایسا واقعہ پہلے کبھی نہیں ہُوا تھا۔ سپہ سالار ابو جعفر حجازی اپنے نائب سپہ سالار اوریزی کو ساتھ لے کر سلطان برکیارق کے ہاں چلا گیا۔ برکیارق اسی وقت جاگا تھا۔ روزینہ اُسے اتنی جلدی بستر سے نہیں نکلنے دیتی تھی جتنا جلدی سلطان ملک شاہ انہیں اٹھا دیا کرتا تھا۔

برکیارق کو اطلاع دی گئی کہ دونوں سپہ سالار آئے ہیں تو روزینہ باہر آئی اور ان سے پوچھا کہ وہ اتنی جلدی کیوں آئے ہیں؟

"ہم اتنی جلدی آنے کی معافی چاہتے ہیں" ـــــ سپہ سالار حجازی نے غلاموں کے سے لہجے میں کہا ـــــ "ایک عہدے دار قتل ہو گیا ہے۔ اس کی اطلاع سلطان محترم کو دینی ضروری ہے اور ان سے حکم لینا ہے"۔

روزینہ اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی اور دونوں سپہ سالاروں کو اندر سونے کے کمرے میں ہی لے گئی۔ سلطان برکیارق ابھی پلنگ پر ہی نیم دراز تھا۔

"کون بدبخت قتل ہو گیا ہے؟" ـــــ برکیارق نے مخمور سی آواز میں پوچھا۔

"ہمارا ایک عہدے دار تھا سلطانِ محترم!" ـــــ سپہ سالار حجازی نے جواب دیا اور بیان کیا کہ وہ کس طرح مردہ پایا گیا' لاش کس حالت میں تھی اور لاش فرش پر پڑی تھی۔

"تو پھر قاتل کو ڈھونڈو" ـــــ سلطان برکیارق نے کہا ـــــ "وہ مل جائے تو اس کا سر اُڑا دو"۔

"سلطانِ عالی مقام!" ـــــ سپہ سالار حجازی نے کہا ـــــ "قاتل اُن خیموں میں ہے جن میں نکالے جانے والے فوجیوں کو رکھا گیا ہے"۔

"سلطان محترم!" ——— نائب سالار اوریزی بولا "یہ باطنیوں کی دہشت گردی ہے اور اگر مجھے اجازت دیں تو میں بیان کروں کہ اس وقت دونوں دھڑوں کے فوجیوں کے درمیان کس قسم کی کشیدگی پیدا کر دی گئی ہے اور اسی طرح شہر کے لوگ بھی دو دھڑوں میں بٹتے جا رہے ہیں"۔

سپہ سالار حجازی نے اوریزی کی مخالفت شروع کر دی۔ سلطان برکیارق کے چہرے پر اکتاہٹ کے تاثرات نمایاں ہوئے جا رہے تھے۔ وہ تو جیسے کوئی بات بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ نائب سپہ سالار اوریزی نے سپہ سالار حجازی کو ٹوک کر اپنی بات شروع کر دی۔ روزینہ پاس بیٹھی سن رہی تھی۔

اس باطنی حسینہ نے سلطان برکیارق کو ذہنی طور پر اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی اہلیت سے ہی محروم ہو گیا تھا۔ یہ اثرات تھے اُس نشے کے جو وہ اُسے پلاتی رہتی تھی اور وہ خود بھی اس کے لئے ایک نشہ بن گئی تھی۔ اس کا ذہن مکمل طور پر روزینہ کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ سوچتی روزینہ تھی اور بولتا سلطان برکیارق تھا۔

"سلطان!" ——— روزینہ نے کہا ——— "ان دونوں کی باتیں آپ کو کسی فیصلے تک نہیں پہنچنے دیں گی۔ دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ قاتل کو پکڑیں جو ممکن نظر نہیں آتا۔ دوسرا اور بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُن فوجیوں میں سے جنہیں نکالا جا رہا ہے کوئی دو آدمی پکڑ لئے جائیں اور فوج کے دونوں دھڑوں کو آمنے سامنے کھڑا کر کے ان کے درمیان ان دونوں آدمیوں کے سر اڑا دیئے جائیں۔ اعلان کیا جائے کہ ان دونوں نے اس عہدے دار کو قتل کیا ہے۔ اس سے یہ ہو گا کہ آئندہ کوئی اتنی سنگین واردات کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اگر واقعی اس فوج کے ان دھڑوں میں کشیدگی اور دشمنی پیدا ہو گئی ہے تو وہ اسی طرح ختم کی جا سکتی ہے۔ اگر خیموں میں رہنے والا کوئی فوجی قتل ہو جائے تو دو فوجی اُدھر سے پکڑ کر انہیں سب کے سامنے جلاد سے قتل کروا دیا جائے"۔

"سن لیا تم دونوں نے!" ——— سلطان برکیارق نے کہا ——— "جاؤ اور اس حکم پر عمل کرو!"۔

"بہت اچھا فیصلہ ہے سلطانِ محترم!" ——— سپہ سالار حجازی نے کہا ——— "میں آج دو آدمی پکڑ کر قید خانے میں بند کر دوں گا اور کل صبح دونوں کو قتل کروا دیا جائے گا"۔

نائب سپہ سالار اوریزی نے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں کوئی اس کی سننے

والا نہیں اور تباہی سلطنتِ سلجوقیہ کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔

دونوں سپہ سالار وہاں سے آ گئے۔

○

اگلے روز سپہ سالار ابو جعفر حجازی خیموں کی طرف گیا۔ کچھ سپاہی جنہیں فوج سے نکالا جا رہا تھا باہر بیٹھے تھے۔ سپہ سالار حجازی کے ساتھ بارہ چودہ فوجی تھے جو برچھیوں اور تلواروں سے مسلح تھے۔ سپہ سالار حجازی نے دو آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"انہیں پکڑ کر لے چلو" ——— اُس نے حکم دیا ——— "یہی ہیں اس کے قاتل!"

مسلح فوجی ان دو آدمیوں پر ٹوٹ پڑے اور انہیں گھسیٹتے دھکیلتے اپنے ساتھ لے گئے۔

یہ خبر خیموں کی ساری بستی میں پھیل گئی۔ پندرہ سولہ ہزار سابق فوجیوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ سب جانتے تھے کہ جنہیں پکڑ کر لے گئے ہیں' وہ بڑے ہی خوش اخلاق اور شریف سپاہی تھے۔ وہ سب اکٹھے ہو گئے اور شور شرابا کرنے لگے لیکن ان کی سننے والا سوائے نائب سالار اوریزی کے اور کوئی نہ تھا۔

سپہ سالار حجازی کے حکم سے ان دونوں آدمیوں کو قید خانے میں بند کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ ان پندرہ سولہ ہزار فوجیوں میں دو سالار بھی تھے جنہیں فوج سے نکالا جا رہا تھا۔ وہ دو تین عہدے داروں کو ساتھ لے کر نائب سپہ سالار اوریزی کے ہاں چلے گئے۔ اسے بتایا کہ سپہ سالار نے دو آدمیوں کو یہ کہہ کر پکڑ لیا ہے کہ مقتول عہدے دار کو انہوں نے قتل کیا ہے۔ اوریزی نے یہ خبر سنی تو وہ بھڑک اٹھا۔ وہ اُسی وقت سپہ سالار حجازی کے پاس چلا گیا۔

"میں جانتا ہوں تم کیوں آئے ہو" ——— سپہ سالار حجازی نے بڑے ہلکے پھلکے انداز میں کہا ——— "تم کہو گے کہ دو بے گناہوں کو کیوں پکڑ لیا ہے۔ اوریزی بھائی! تمہارے سامنے سلطان نے حکم دیا تھا"۔

"اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو ایسا ظالمانہ حکم کبھی نہ مانتا" ——— نائب سالار اوریزی نے کہا ——— "محترم حجازی! آپ کس کے غلام بن گئے ہیں؟ آپ کیوں نہیں سمجھتے کہ طاقت آپ کے ہاتھ میں ہے؟ سلطان کی طاقت کو ہم احتراماً مانتے ہیں۔ یہ اسلام کا حکم ہے کہ اپنے امیر کی اطاعت کرو اور اسلام کا حکم یہ بھی ہے کہ امیر کوئی غلط حکم خصوصاً

اس قسم کا ظالمانہ حکم دیتا ہے تو وہ حکم نہ مانو"۔

"خدا کے لئے اوریزی بھائی!" — سپہ سالار حجازی نے بے تکلف دوستوں جیسے لہجے میں کہا — "اگر ہم ان دو ادنیٰ سے سپاہیوں کے سر نہیں کاٹیں گے تو ہم دونوں کے سر کٹ جائیں گے"۔

"میں ان ادنیٰ سپاہیوں کی خاطر اپنا سر کٹوانے کے لئے تیار ہوں" — اوریزی نے کہا — "میرا خیال ہے کہ میں آپ کے پاس آکر جھک مار رہا ہوں۔ مجھے یہ بتادیں کہ آپ واقعی ان دو بے گناہ سپاہیوں کے سر کاٹ دیں گے؟"

"تو اور کس لئے انہیں قید خانے میں بھیجا ہے؟" — سپہ سالار حجازی نے جواب دیا — "کل سب کے سامنے ان کی گردنوں پر تلواریں چل جائیں گی"۔

"میں آپ کو ایک مشورہ دیتا ہوں" — نائب سپہ سالار اوریزی نے کہا — "یہ آخری بات ہوگی جو میں آپ سے کروں گا۔ اس کے بعد میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ حالات کیا کروٹ بدلیں گے۔ آپ یوں کریں کہ کل ان دونوں سپاہیوں کو قید خانے سے نکال کر ادھر سے ہی انہیں گھروں کو بھیج دیں۔ فوج سے تو وہ نکال ہی دیئے گئے ہیں۔ پھر میں آپ کے ساتھ سلطان تک چلوں گا اور کہوں گا کہ ہم دونوں کی موجودگی میں قید خانے میں ان کے سر کاٹ دیئے گئے ہیں اور انہیں دفن بھی کر دیا گیا ہے"۔

"پھر جانتے ہو سلطان کیا کہے گا؟" — سپہ سالار حجازی نے کہا — "وہ کہے گا کہ میرے حکم کے مطابق ان کی گردنیں سرِعام فوج کے دونوں دھڑوں کے سامنے کیوں نہیں کاٹی گئیں؟"

"اس کا جواب میں دوں گا" — نائب سپہ سالار اوریزی نے کہا — "میں کہوں گا کہ سب کے سامنے انہیں قتل کیا جاتا تو فوج کے دونوں دھڑوں میں فساد کا خطرہ تھا کیونکہ سب جانتے تھے کہ یہ دونوں سپاہی بے گناہ ہیں"۔

"اوریزی بھائی!" — سپہ سالار حجازی نے کہا — "حکم سلطان کا نہیں، سلطان کی بیگم کا ہے۔ وہ قید خانے سے معلوم کروالے گی کہ اس کے حکم کی واقعی تعمیل ہوئی ہے یا نہیں۔ تم خاموش ہی رہو تو ہم دونوں کے لئے بہتر ہے"۔

اوریزی خاموش رہا اور سر جھکا کر گہری سوچ میں کھو گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ ایک پتھر سے ہمکلام ہے۔

"انہیں کل کس وقت اور کہاں سزائے موت دی جائے گی؟" — نائب سپہ سالار اوریزی نے بدلے ہوئے سے لہجے میں پوچھا اور ذرا سوچ کر کہا — "مجھے آپ کا ساتھ دینا پڑے گا ورنہ آپ مارے جائیں گے!"

"زندہ باد اوریزی!" — سپہ سالار حجازی نے خوش ہوتے ہوئے اوریزی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا — "مجھے تم سے یہی توقع تھی۔ میں تمہارے اس تعاون کے لئے ساری عمر ممنون رہوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے ہاتھوں کیا گناہ کروایا جارہا ہے"۔

"اللہ بخشنے والا مہربان ہے" — اوریزی نے کہا — "آپ مجبور ہیں۔ اللہ آپ کو معاف کردے گا..... انہیں کون سی جگہ یہ سزا دی جائے؟"

"وقت اور جگہ تم خود مقرر کرلو" — سپہ سالار حجازی نے اوریزی کو خوش کرنے کے لئے کہا — "تم جو جگہ مقرر کروگے میں اسی کو مان لوں گا"۔

اوریزی اٹھا، سپہ سالار حجازی سے ہاتھ ملایا اور وہاں سے آگیا۔

○

اگلے روز کے سورج نے طلوع ہوتے ہی یہ ظالمانہ منظر دیکھا کہ ایک طرف نکالی جانے فوج کے پندرہ سولہ ہزار آدمی کھڑے تھے۔ ان کے سامنے خاصے فاصلے پر وہ فوج کھڑی تھی جسے رکھا جارہا تھا۔ ان کے درمیان دو سپاہی کھڑے تھے جن کے ہاتھ پیٹھوں کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ دونوں کے قریب ایک ایک آدمی چوڑے پھل والی تلواریں لئے کھڑے تھے۔ اس جگہ درختوں کی بہتات تھی۔ بالکل قریب بڑ کی قسم کے دو گھنے درخت تھے۔ منظر خاصا خوبصورت تھا لیکن خوبصورتی میں موت کی سانسیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ان دو سپاہیوں میں جنہیں کچھ دیر بعد سزائے موت دینی تھی، ایک نوجوان تھا اور دوسرا ادھیڑ عمر۔ یہ بدنصیب اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ کچھ دور شہر کے لوگ کھڑے تھے۔ یہ خبر اُن تک بھی پہنچ گئی تھی۔ ان لوگوں میں اس ادھیڑ عمر سپاہی کی بیوی اور چھوٹے چھوٹے دو بچے بھی کھڑے تھے۔ بیوی بھی رو رہی تھی اور بچے بھی۔ بیوی نے ایک بار سپہ سالار حجازی تک رحم کے لئے پہنچنے کی کوشش کی تھی لیکن فوجیوں نے اُسے دھکے دے کر پیچھے کر دیا تھا۔ شہریوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔

سپہ سالار حجازی گھوڑے پر سوار وہاں آیا اور دونوں بے گناہ سپاہیوں کے پاس گھوڑا

روک کر اعلان کیا کہ فوج کا جو عہدیدار قتل ہُوا ہے، اُس کے قاتل یہ دونوں ہیں اور مصدقہ شہادت ملی ہے کہ قاتل یہی ہیں۔

"یہ سپہ سالار جھوٹ بول رہا ہے"۔۔۔ ادھیڑ عمر سپاہی نے چلا کر کہا۔۔۔ "اس سے پوچھو یہ کون سے قاضی کا فیصلہ ہے"۔

ایک جلاد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش کر دیا۔

سپہ سالار حجازی نے اپنا اعلان یہ کہہ کر مکمل کیا کہ ان دونوں کو تم سب کے سامنے سزائے موت دی جا رہی ہے۔

سپہ سالار ایک طرف چلا گیا۔ دونوں جلادوں نے دونوں فوجیوں کو دو زانو بٹھا دیا اور ان کے سروں پر ہاتھ رکھ کر سر نیچے کر دیئے۔ پھر دونوں نے اپنی تلواریں اوپر اٹھائیں۔ دو بے گناہوں کی زندگی اور موت کے درمیان صرف دو یا تین لمحے رہ گئے تھے۔ تلواروں کا ایک ایک وار ہی کافی تھا۔

تلواریں اور اوپر اٹھیں تو تماشائیوں کے اتنے بڑے ہجوم پر سناٹا طاری ہو گیا جیسے وہاں کوئی انسان موجود ہی نہ ہو۔ تلواریں اور اوپر اٹھیں۔ اب انہیں زناٹے سے نیچے آنا تھا۔ زناٹے تو سنائی دیئے لیکن وہ تلواروں کے نہیں بلکہ دو تیروں کے تھے۔ ایک تیر ایک جلاد کے سینے میں اور دوسرا دوسرے جلاد کے سینے میں اتر گیا تھا..... دو بیگناہوں کی جانیں لینے والے اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔

"یہ تیر کس نے چلائے ہیں؟"۔۔۔ سپہ سالار حجازی نے ایسی آواز میں کہا جس میں گھبراہٹ بھی تھی غصہ بھی۔۔۔ "فوراً" پکڑو انہیں!"

فوج میں کچھ حرکت ہوئی۔ نائب سپہ سالار اوریزی گھوڑا دوڑاتا آیا اور بیگناہ سپاہیوں اور مرے ہوئے جلادوں کے پاس آ رکا۔

"خبردار!"۔۔۔ اوریزی نے بلند آواز سے کہا۔۔۔ "کوئی حرکت نہ ہو۔ اللہ نے انصاف کر دیا ہے۔ یہ دونوں بیگناہ ہیں۔ سپہ سالار سے پوچھو انہیں کون سے قاضی نے سزائے موت دی ہے اور کس کس کی شہادت پر سزا دی ہے؟..... کیا تم مسلمان ہو؟ کیا اسلام اجازت دیتا ہے کہ جسے چاہو پکڑ کر اس پر قتل کا الزام لگا دو اور اس کی گردن مار دو؟ کیا تم سب کافر ہو کر مرنا چاہتے ہو؟"

ہر طرف خاموشی طاری رہی۔ اوریزی نے اُن فوجیوں کی طرف دیکھا جنہیں فوج

سے نکالا جا رہا تھا۔

"کچھ آدمی آگے آؤ"۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "اپنے ساتھیوں کو لے جاؤ"۔

چار آدمی دوڑے آئے اور وہ اپنے بیگناہ ساتھیوں کے ہاتھ کھول کر انہیں ساتھ لے گئے۔ اُدھر سے اُدھیڑ عمر سپاہی کی بیوی اپنے دو بچوں کے ساتھ دوڑتی آئی۔ باپ نے اپنے دونوں بچوں کو اٹھا لیا اور انہیں پیار کرنے لگا۔

فوج میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ سپہ سالار ابو جعفر حجازی وہاں سے چلا گیا۔ وہ سلطان برکیارق کو بتانے جا رہا تھا کہ اس کے حکم کی تعمیل نہیں ہو سکی اور اس کا ذمہ دار اوریزی ہے۔

سپہ سالار حجازی کو تو معلوم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ دو تیر کہاں سے آئے تھے۔ یہ اوریزی کا انتظام تھا۔ ان بیگناہ سپاہیوں کو سزا دینے کی جگہ کا اُسی نے انتخاب کیا تھا۔ وہاں قریب ہی بڑ جیسے دو گھنے درخت تھے۔ ان کے چوڑے پتّوں میں بیٹھا ہُوا آدمی کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔ اوریزی نے رات کو دو تجربہ کار تیر انداز تیار کر دیئے تھے اور انہیں یہاں لا کر اچھی طرح بتا دیا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ دونوں تیر انداز صبح طلوع ہونے سے کچھ دیر پہلے ایک درخت پر اور دوسرا دوسرے درخت پر چڑھ کر بیٹھ گئے تھے۔

سپہ سالار حجازی جا چکا تھا۔ فوج حکم کی منتظر کھڑی تھی۔ نائب سالار اوریزی نے فوج کو بارکوں میں چلے جانے کا حکم دیا اور خود اس انتظار میں اپنے ٹھکانے پر چلا گیا کہ ابھی سلطان کا بلاوا آئے گا۔

سالار اوریزی کی یہ کارروائی بڑا ہی سنگین جرم تھا۔ سلطان نے دو سپاہیوں کو سزائے موت دی تھی لیکن سالار اوریزی نے جلّادوں کو مروا دیا اور سپاہیوں کو رہا کرا لیا۔ اس نے دوسرا جرم یہ کیا کہ سپہ سالار ابو جعفر حجازی نے یہ حکم دیا ان تیر اندازوں کو ڈھونڈو اور پکڑو لیکن سالار اوریزی نے اس کے قریب آ کر للکارا اور کہا' خبردار کوئی آگے آنے کی جرأت نہ کرے۔۔۔ یہ حکم عدولی نہیں بلکہ غدّاری تھی۔

یہ الگ بات ہے کہ سپہ سالار حجازی کو سالار اوریزی کی یہ باغیانہ کارروائی اچھی لگی تھی یا بُری لگی تھی' اسے دراصل خوشی اس بات پر ہوئی تھی کہ اسے سلطان برکیارق کے پاس جانے کا ایک بڑا ہی معقول بہانہ مل گیا تھا اور اس کے ساتھ سالار اوریزی کو سالاری سے معزول کرانے کا موقع بھی مل گیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ سلطان سالار اوریزی کو صرف معزول نہیں کرے گا بلکہ اسے کوئی اور سزا بھی دے گا..... پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سپہ سالار حجازی سلطان برکیارق کا خوشامدی تھا اور وہ سلطان کے آگے زر خرید غلاموں کی طرح حرکتیں کر کے بہت خوش ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں سالار اوریزی خوددار اور باوقار سالار تھا جس کی اپنی ایک آزاد شخصیت تھی۔ وہ سلطان کا ہر حکم صرف اس لئے نہیں مانتا تھا کہ یہ سلطان کا حکم ہے بلکہ وہ دیکھتا تھا فوجی نقطۂ نگاہ سے یہ حکم سلطنت کے لئے نقصان دہ تو نہیں! یہ سالار اوریزی کا ایمان تھا لیکن سپہ سالار حجازی اسے اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتا تھا۔

سپہ سالار حجازی وہاں سے سلطان برکیارق کے ہاں گیا اور اپنے آنے کی اطلاع دی۔ سلطان نے اسے اُسی وقت اندر بلا لیا۔ وہ اندر گیا اور رکوع میں جا کر سلطان کو سلام

کیا۔

"کام کر آئے حجازی؟" ـــــ سلطان برکیارق نے پوچھا ـــــ "دیکھنے والوں پر دہشت تو طاری ہو گئی ہو گی..... اب کوئی کسی کو قتل نہیں کرے گا"۔

"گستاخی مُعاف سلطانِ محترم!" ـــــ سپہ سالار حجازی نے سلطان کے اشارے پر بیٹھتے ہوئے کہا ـــــ "آپ کے حکم کی تعمیل نہیں ہو سکی"۔

"کیوں؟" ـــــ سلطان نے بدک کر پوچھا ـــــ "حکم کی تعمیل کیوں نہیں ہو سکی؟"

"دونوں جلّاد تیروں سے مارے گئے ہیں" ـــــ سپہ سالار حجازی نے کہا۔

"کس نے مارے ہیں؟" ـــــ سلطان برکیارق نے پوچھا ـــــ "کون تھے وہ تیر انداز؟ کیا انہیں آپ نے پکڑ لیا ہے؟"

سپہ سالار حجازی نے سلطان کو پورا واقعہ تفصیل سے سنا دیا اور سالار اوریزی کے خلاف بغاوت کا جرم ثابت کرنے کے لئے اور بھی بہت کچھ کہا۔

"سلطانِ عالی مقام!" ـــــ حجازی نے کہا ـــــ "وہ تو کبھی کا میرے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ میں سلطان کا یہ حکم نہ مانوں کہ فوج کی آدھی نفری کو گھر بھیج دیا جائے۔ یہ دونوں تیر انداز اسی کے تھے"۔

"یہ جرأت؟" ـــــ سلطان برکیارق نے لال پیلا ہوتے ہوئے کہا ـــــ "یہ مجال؟ ... اسے قید خانے کے تہہ خانے کی اُس کوٹھڑی میں بند کر دو جس میں سب سے زیادہ کیڑے مکوڑے ہوتے ہیں"۔

"اس نے سلطان کی توہین کی ہے" ـــــ روزینہ نے کہا ـــــ "اسے عبرت کا نشان بنا دو..... ہم یہاں بلا کر اسے سزا دلائیں گے۔ اسے زنجیروں میں باندھ کر یہاں سے بھیجیں گے۔ آپ اسے بازار میں سے گزارنا اور کسی چوک میں کھڑا کر کے لوگوں کو اکٹھا کر لینا اور اعلان کرنا کہ یہ سلطان کا باغی اور غدار ہے۔ اسے ابھی بلایا جائے"۔

"ہاں' اسے ابھی بلایا جائے" ـــــ سلطان برکیارق نے اپنی بیوی کا حکم دہرایا۔

○

جس وقت سپہ سالار حجازی سلطان برکیارق کی طرف چلا تھا اُس وقت نائب سپہ سالار اوریزی اپنے ٹھکانے کی طرف چلا گیا تھا۔ اس نے فوج کو واپس بارکوں میں بھیج دیا تھا۔ وہ جب وہاں سے چلا تو اس کے ساتھ چار پانچ آدمی اُس نفری میں سے تھے جسے فوج

میں سے نکل جانے کا حکم ملا تھا اور وہ ابھی تک خیموں میں رہتے تھے۔

"میرے رفیقو!" —— سالار اوریزی نے ان چار پانچ آدمیوں سے کہا —— "توقع تو یہ ہے کہ مجھے جلاد کے حوالے کیا جائے گا یا عمر بھر کے لئے قید خانے میں پھینک دیا جائے گا۔ دونوں صورتوں میں مجھے پہلے قید خانے میں لے جائیں گے۔ میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ تم نے کیا کرنا ہے۔ میں تمہیں یہ بھی بتاؤں گا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گا تو تم نے ان سابق فوجیوں کو اور شہر کے ہم خیال لوگوں کو اپنے ساتھ کس طرح ملانا ہے۔ ہم بہت سا کام تو کر ہی چکے ہیں لیکن میں ڈرتا ہوں کہ تم میری قیادت سے محروم ہو جاؤ گے تو حوصلہ ہی نہ ہار بیٹھو"۔

"ہم آپ کی قیادت سے محروم نہیں رہیں گے" —— ایک ادھیڑ عمر فوجی نے کہا —— "ہمیں پوری امید ہے کہ ہم آپ کو جلاد تک پہنچنے ہی نہیں دیں گے"۔

سالار اوریزی نے انہیں کچھ ہدایات دینی شروع کر دیں۔

"میں راز کی ایک بات تمہیں آج بتا دیتا ہوں" —— سالار اوریزی نے کہا —— "سلطان ملک شاہ مرحوم کا دوسرا بیٹا محمد اور اس سے چھوٹا سنجر ہمارے ساتھ ہیں۔ اب میری گرفتاری کے بعد جو کچھ بھی ہو گا اس کی اطلاع محمد رے کے امیر ابو مسلم رازی تک پہنچائے گا۔ میں نہ ہُوا تو ابو مسلم رازی تمہارا سالار اور قائد ہو گا"۔

سالار اوریزی اپنی ہدایات مکمل کر چکا تھا کہ اطلاع ملی کہ سلطان کا بلاوا آیا ہے۔

"میں جاتا ہوں" —— سالار اوریزی نے اپنے آدمیوں سے کہا —— "گھوڑے تیار کرو اور دو آدمی میرے محافظ بن کر میرے ساتھ چلو۔ سالار اپنے محافظ ساتھ لے جا سکتا ہے۔ مجھے اب سزا سنائی جائے گی جس کا دونوں محافظوں کو وہیں پتہ چل جائے گا۔ وہ وہاں سے کھسک آئیں گے اور یہاں بتائیں گے کہ مجھے کیا سزا سنائی گئی ہے، پھر تم لوگوں نے اپنی کارروائی کرنی ہے..... میں جا رہا ہوں، اللہ تمہارا مددگار ہے"۔

سالار اوریزی اپنے ان آدمیوں سے ہاتھ ملا کر باہر نکلا۔ دو محافظ تیار ہو چکے تھے۔ سالار اوریزی گھوڑے پر سوار ہُوا۔ جب وہ حویلی کے بڑے دروازے کے سامنے سے گزرنے لگا تو اس کی بیوی اور ایک جوان بیٹی اس کے راستے میں آ گئیں۔ بیٹی نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔

"نہ جائیں!" —— بیٹی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا —— "ہمیں پتہ چل چکا ہے کہ

آپ کیا کر آئے ہیں۔ سلطان آپ کی جان بخشی نہیں کرے گا۔ یہیں سے کسی طرف بھاگ جائیں۔ ہم آپ کے پیچھے پہنچ جائیں گی"۔

"میں آپ کو یہاں سے نکلوا دیتی ہوں" —— بیوی نے کہا —— "سلطان کے سامنے نہ جائیں۔ وہ آپ کی وفا کی کوئی قیمت نہیں دے گا۔ وہ آپ کی گردن کٹوا دے گا"۔

بیٹی رو رو کر اسے روک رہی تھی لیکن اوریزی مسکرا رہا تھا۔

"پریشان نہ ہو بیٹی!" —— سالار اوریزی نے بڑے پیار سے کہا —— "میں جو کچھ کر رہا ہوں، مجھے کرنے دو" —— وہ اپنی بیوی سے مخاطب ہُوا —— "میں جانتا ہوں تم بڑے ہی حوصلے اور جرأت والی عورت ہو۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں، سوچ سمجھ کر اور اللہ پر بھروسہ رکھ کر کر رہا ہوں۔ اندر جاؤ اور میرے لئے دعا کرو"۔

ماں بیٹی روتی رہیں، اسے روکتی رہیں لیکن سالار اوریزی انہیں خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ دو محافظ اس کے پیچھے پیچھے گھوڑوں پر سوار جا رہے تھے۔ بیٹی اور اس کی ماں نے ہاتھ پھیلا کر اور آسمان کی طرف دیکھ کر اس کی سلامتی کی دعائیں مانگیں۔ ان کی آہوں اور ان کے آنسوؤں میں بھی دعائیں تھیں۔

وہ سلطان کے محل میں جا پہنچا اور اندر اطلاع پہنچائی۔ اسے فوراً بلا لیا گیا۔

○

سالار اوریزی جب سلطان برکیارق کے سامنے گیا تو جھکا نہیں بلکہ مسلمانوں کی طرح السلام علیکم کہا اور پوچھا کہ اس کے لئے کیا حکم ہے۔

سلطان نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا اور اسے بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ تم نے دونوں جلادوں کو تیر اندازوں سے مروا دیا ہے؟" —— سلطان نے اس سے پوچھا۔

"ہاں سلطانِ محترم!" —— سالار اوریزی نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا —— "جلادوں کو میں نے مروایا ہے"۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ ان دو سپاہیوں کو میرے حکم سے سزائے موت دی جا رہی تھی؟" —— سلطان برکیارق نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

"معلوم تھا سلطانِ محترم!" —— سالار اوریزی نے جواب دیا۔

"پھر تم نے میرے حکم کی تعمیل میں یہ رکاوٹ کیوں ڈالی؟" —— سلطان نے گرج

"اس لئے کہ کسی کو سزائے موت دینے کا جو حکم اللہ نے دیا ہے' آپ نے اس حکم کے تقاضے پورے نہیں کئے تھے"..... سالار اوریزی نے کہا — "آپ ان دو معصوم اور بے گناہ سپاہیوں کو نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کو قتل کروا رہے تھے"۔

"یہاں میرا حکم چلتا ہے" — سلطان برکیارق نے اپنی ران پر بڑے زور سے ہاتھ مار کر کہا۔

"اور میں بحیثیت ایک مسلمان صرف اللہ کا حکم مانتا ہوں .... یہ سلطنت آپ کی نہیں' یہ اللہ کی دی ہوئی سلطنت ہے۔ اسلامی سلطنت میں صرف اسلامی قانون چلے گا۔ آپ مجھے حکم دیں کہ اپنے پیٹ میں تلوار گھونپ دو کہ اس سے سلطنت کو فائدہ پہنچے گا تو میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا"۔

"تم زبان دراز ہو" — روزینہ بولی — "اس سلطنت میں کوئی زبان دراز نہیں رہ سکتا۔ تم سالاری کے قابل نہیں"۔

"محترمہ!" — سالار اوریزی نے کہا — "یہ الموت نہیں' یہ مرو ہے۔ یہ باطنیوں کی نہیں مسلمانوں کی سلطنت ہے۔ یہاں حسن بن صباح کا حکم نہیں چلے گا"۔

"خاموش بدتمیز!" — سلطان برکیارق اور زور سے گرجا..... "میں تمہیں اس گستاخی کی ایسی سزا دوں گا کہ دیکھنے والے عبرت حاصل کریں گے"۔

"کان کھول کر سن لو سلطان!" — سالار اوریزی نے کہا — "میں جانتا ہوں کہ آج کا دن میری زندگی کا آخری دن ہے۔ میں صرف اللہ سے ڈرتا ہوں۔ تمہارے جلّاد کے ہاتھوں سر کٹواؤں گا تو اللہ کے حضور سرخرو ہو جاؤں گا۔ میں صرف اللہ کے آگے جوابدہ ہوں"۔

"اس گستاخ' زبان دراز کو سالاری سے معزول کر دیں" — روزینہ نے کہا۔

"نہیں روزینہ!" — سلطان برکیارق نے کہا — "میں اسے صرف معزول نہیں کروں گا اسے اور بھی سزا دینی ہے"۔

"مجھے سالاری تم نے نہیں' تمہارے باپ نے دی تھی" — سالار اوریزی نے کہا — "تم مجھ سے سالاری چھین لو گے تو بھی میں اپنی قوم کا سالار ہی رہوں گا اور اس سلطنت کی عظمت اور بقا کے لئے اپنے فرائض پورے کرتا رہوں گا..... میں ان شہیدوں کی روحوں کے آگے جوابدہ ہوں جن کا خون اس سلطنت کی بنیادوں میں ابھی تک تازہ ہے"۔

"میں اپنی اس سے زیادہ توہین برداشت نہیں کر سکتا" — سلطان برکیارق نے قہر آلود آواز میں کہا — "اور سن لو اوریزی!....."

"یہ عورت" — سالار اوریزی نے روزینہ کی طرف اشارہ کر کے کہا — "یہ عورت سلطان کی سراپا توہین ہے۔ یہ آستین کا سانپ ہے" — پھر اس نے سپہ سالار حجازی کی طرف اشارہ کر کے کہا — "اور سلطان کی آستین میں دوسرا سانپ یہ شخص ہے۔ یہ تمہیں آنے والا وقت بتائے گا"۔

"سلطانِ عالی مقام!" — سپہ سالار حجازی تڑپ کر بولا — "اسے آپ مزید توہین کی اجازت نہ دیں اور اسے سزا سنا دیں"۔

"ہاں سلطان!" — روزینہ نے کہا — "اسے سزائے موت نہ دیں۔ عمر بھر کے لئے قید خانے میں ڈال دیں جہاں یہ گل سڑ کر مرے گا۔ مرنے سے پہلے اسے وقتاً فوقتاً باہر نکالیں اور بیڑیاں ڈال کر شہر کے لوگوں کے سامنے کھڑا کریں اور لوگوں کو بتایا جائے کہ یہ ہے سزا باغی اور غداری کی"۔

سلطان برکیارق نے سالار اوریزی کو یہی سزا سنا دی اور کہا کہ اس کی تلوار اس سے لے لی جائے۔

سالار اوریزی نے اپنی تلوار اور نیام اتار کر سلطان کی طرف پھینک دی۔

"یہ لو تلوار سلطان!" — سالار اوریزی نے کہا — "میں اس وقت جہاد کے میدان میں اترا تھا جب تم ابھی ماں کا دودھ پی رہے تھے" — اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر کے کہا — "یہ ہاتھ تلوار سے کبھی خالی نہیں رہیں گے۔ جذبہ اور ایمان زندہ رہتا چاہئے۔ ان ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ خود تلوار دے گا"۔

سلطان برکیارق نے قہقہہ لگایا اور روزینہ کی طرف دیکھا۔ روزینہ بھی ہنس پڑی۔

"اس شخص کا دماغ اس کے قابو سے نکل گیا ہے" — سلطان برکیارق نے کہا — "میں اسے اس کال کوٹھڑی میں بھجوا رہا ہوں جہاں یہ ایک سال بھی زندہ نہیں رہے گا اور یہ کہتا ہے کہ اللہ اس کے ہاتھ میں تلوار دے گا..... او بدقسمت انسان! تلوار اگر کبھی تمہارے پاس آئی بھی تو وہ تمہارے ہاتھ میں نہیں بلکہ جلّاد کے ہاتھ میں ہو گی اور تمہارا

سر جھکا ہُوا ہو گا..... لے جاؤ اسے"۔

"ٹھہر جاؤ" —— روزینہ نے کہا —— "ہمارے سامنے اس کے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ دو اور باہر لے جا کر اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دو۔ پھر اسے گھوڑے کی پیٹھ پر نہیں بلکہ پیدل لے کر جاؤ اور اتنا آہستہ چلنا کہ لوگوں کا ہجوم تمہارے پیچھے اکٹھا ہو جائے اور پھر اسے چوک میں کھڑا کر کے لوگوں کو بتانا کہ غداری اور بغاوت کی سزا یہ ہے اور پھر اسے چوک سے فوراً آگے نہ لے جانا۔ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے دیکھیں"۔

سپہ سالار حجازی دوڑتا باہر نکلا۔ واپس آیا تو اس کے ساتھ سلطان کے دو محافظ تھے انہوں نے زنجیریں اور بیڑیاں اٹھا رکھی تھیں جو اوریزی کو ڈال دی گئیں۔

"لے جاؤ اسے" —— سلطان برکیارق نے کہا۔

"سلطان!" —— سالار اوریزی نے مسکرا کر کہا —— "میں واپس آؤں گا..... اِنشاءاللہ..... اُس وقت تم سلطان نہیں ہو گے"۔

○

سالار اوریزی کو جب باہر لایا گیا تو اس کے دونوں گھوڑ سوار محافظ ذرا دور کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اپنے سالار کو زنجیروں اور بیڑیوں میں بندھا دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ اسے قید خانے میں لے جایا جا رہا ہے۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور وہاں سے چلے گئے۔

زنجیر کا ایک سرا سپہ سالار حجازی کے ہاتھ میں تھا جو اس نے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ دیا۔ اس نے بارہ گھوڑ سوار محافظ اپنے ساتھ لے لئے اور وہاں سے چل پڑا۔ آگے آگے وہ جا رہا تھا۔ اس کے گھوڑے کے ساتھ بندھا سالار اوریزی پیدل چلا جا رہا تھا اور پیچھے بارہ محافظ چل رہے تھے۔ سلطان کے محل سے نکل کر سپہ سالار حجازی اُس راستے پر ہو گیا جس راستے میں شہر کی آبادی زیادہ تھی۔ شہر کے کئی لوگ سالار اوریزی کو جانتے اور پہچانتے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ اوریزی کو زنجیروں میں بندھا لے جایا جا رہا ہے تو لوگ پہلے تو حیران ہوئے پھر پیچھے پیچھے چل پڑے۔ وہ محافظوں سے پوچھتے تھے کہ سالار اوریزی نے کیا جرم کیا ہے۔ محافظ لوگوں کو صرف یہی ایک جواب دیتے تھے کہ سالار اوریزی نے بغاوت اور غداری کی ہے۔

قید خانہ شہر سے باہر اور کچھ دُور تھا۔ اس کے اِرد گِرد گھنا جنگل تھا اور راستے میں تھوڑا سا علاقہ چٹانی بھی تھا۔ قید خانے تک باہر باہر سے جایا جا سکتا تھا لیکن سپہ سالار

حجازی اوریزی کو شہر میں لے گیا اور ایک ایسے چوک میں جا رکا جہاں چار بازار ملتے تھے۔ کچھ تو راستے میں لوگ پیچھے پیچھے چل پڑے تھے اور زیادہ تر بازار میں آنے والے لوگ وہاں اکٹھے ہو گئے۔ سپہ سالار حجازی نے لوگوں سے کہا کہ اسے لمبی میز کی ضرورت ہے۔ ذرا سے وقت میں ایک لمبی اور مضبوط میز آ گئی۔ یہ میز چوک میں رکھ کر سالار اوریزی کو اس پر کھڑا کر دیا گیا اور حجازی خود گھوڑے سے اتر کر میز پر اوریزی کے پاس جا کھڑا ہُوا۔ اوریزی کی زنجیر اُس کے ہاتھ میں تھی۔ گھوڑ سوار محافظوں نے اپنی ترتیب اس طرح کر لی کہ دائرے میں ذرا دُور دُور کھڑے ہو گئے تاکہ لوگ آگے نہ جا سکیں۔

اگر اوریزی چور' ڈاکو یا قاتل ہوتا تو لوگ اُسے دیکھ کر ہنستے اور اس پر لعن طعن کرتے لیکن لوگ جانتے تھے کہ یہ سالار اوریزی ہے اس لئے وہ حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے اور وہ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ اس سالار سے کیا جرم سرزد ہو گیا ہے۔

اسی صبح جب دو سابق فوجیوں کو سزائے موت دی جانے لگی تھی' شہر کے لوگوں کو پتہ چلا تو ایک ہجوم یہ تماشا دیکھنے پہنچ گیا تھا۔ وہ تو کوئی اور تماشا دیکھنے آئے تھے لیکن وہاں کوئی اور ہی تماشا ہو گیا۔ وہاں جلاد ہی مارے گئے اور لوگوں نے سالار اوریزی کو دیکھا کہ وہ گھوڑا دوڑاتا مڑے ہوئے جلادوں کے پاس جا پہنچا اور اس نے مارے جانے والے دونوں آدمیوں کو آزاد کر دیا تھا۔ لوگ سمجھ نہ سکے تھے کہ یہ کیا ہُوا ہے۔ اب جس وقت وہ سالار اوریزی کو زنجیروں اور بیڑیوں میں بندھا دیکھ رہے تھے' اُس وقت تک بیشتر لوگوں کو پتہ لگ چکا تھا کہ یہ دونوں آدمی بے گناہ تھے جنہیں سالار اوریزی نے رہا کروایا تھا۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں سالار اوریزی کا احترام پیدا ہو گیا تھا۔

سپہ سالار حجازی نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ لوگ خاموش ہو گئے۔

"اس شخص کو اچھی طرح پہچانو یہ کون ہے" —— سپہ سالار حجازی نے سالار اوریزی کی طرف اشارہ کر کے کہا —— "اسے سلطانِ محترم نے عمر قید کی سزا دی ہے..... جانتے ہو کیوں؟..... یہ سلطان کا باغی اور غدار ہے..... یہ شخص قاتلوں کا ساتھی ہے۔ اس نے دو قاتلوں کو سزائے موت سے چھڑوانے کے لئے دو جلادوں کو قتل کروایا ہے۔ یہ فوج میں بغاوت پیدا کر رہا تھا"۔

"اور میرے ساتھ اس سپہ سالار کو بھی پہچان لو" —— اوریزی نے ہنستے ہوئے کہا

—— "یہ عیاش سلطان برکیارق کا پجاری ہے۔ مجھے سلطان نے غدار نہیں کہا بلکہ اس کی باطنی بیوی نے کہا ہے..... یہ سپہ سالار ابو جعفر حجازی سلطان کی اس باطنی بیوی کے آگے سجدے کرتا ہے"۔

"خاموش رہ غدار!" —— حجازی نے اوریزی کو ڈانٹ کر کہا —— "اپنے گناہوں پر جھوٹ کا پردہ مت ڈال ورنہ یہیں زبان کھینچ لوں گا"۔

"بولنے دو اسے!" —— ہجوم میں سے کچھ آوازیں سنائی دیں —— "اسے بولنے دو.... ہمیں پتہ چلنے دو ہُوا کیا ہے"۔

سپہ سالار حجازی نے دیکھا کہ لوگوں کا ردِّعمل اور رویّہ کچھ اور ہے تو وہ ذرا دبک گیا۔ ہجوم اب شور شرابہ کرنے لگا تھا کہ اوریزی کو بولنے دیا جائے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ لوگوں کی ہمدردیاں اوریزی کے ساتھ ہیں۔

"میں نے آج صبح دو بے گناہوں کو جلادوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچایا ہے" —— اوریزی نے بلند آواز میں کہا —— "انہیں ایک فوجی عہدیدار کا قاتل نہ ملا تو سلطان نے بلکہ سلطان کی بیوی نے یہ فیصلہ سنایا کہ سابق فوجیوں میں سے کوئی دو فوجی پکڑ لئے جائیں اور ان کی گردنیں کاٹ دی جائیں اور لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ یہ دو آدمی قاتل تھے"۔

"اے لوگو!" —— سپہ سالار حجازی نے کہا —— "اس کی مت سنو' یہ تو دھتکارا ہُوا مجرم ہے"۔

لوگ شور بپا کئے جا رہے تھے۔ سپہ سالار حجازی کے لئے حکم تھا کہ اوریزی کو زیادہ سے زیادہ دیر چوک میں کھڑا رکھا جائے۔ مقصد اس کی تذلیل تھا۔ خود حجازی بھی یہی چاہتا تھا کہ اوریزی کو خوب ذلیل و خوار کیا جائے لیکن اب لوگوں نے کچھ اور ہی انداز سے واویلا بپا کر دیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اوریزی کو فوراً قید خانے تک پہنچا دیا جائے لیکن وہ روزینہ سے ڈرتا تھا کہ اسے پتہ چل گیا کہ اوریزی کو زیادہ دیر چوک میں کھڑا نہیں رکھا گیا تو وہ ناراض ہوگی۔

"اے اہلِ اسلام!" —— سالار اوریزی نے بڑی بلند آواز میں کہا —— "اس اسلامی سلطنت کی حفاظت کے لئے بیدار اور چوکس ہو جاؤ۔ حسن بن صباح آ رہا ہے۔ اس شہر میں باطنی چلے آ رہے ہیں۔ وہ تخریب کاری کے لئے آئے ہیں اور آ رہے ہیں۔ سلطنت

کی اصل حکمران ایک باطنی عورت ہے اور سلطان برکیارق برائے نام سلطان ہے۔ اس سلطنت سے عدل و انصاف اٹھ گیا ہے"۔

○

اُس وقت جب سالار اوریزی کو چوک میں کھڑا کر کے ذلیل و رسوا کیا جا رہا تھا اس سے کچھ دیر پہلے سلطان برکیارق کی ماں اور اس کے دوسرے دونوں بیٹوں محمد اور سنجر کو پتہ چلا کہ سالار اوریزی کو یہ سزا دی گئی ہے اور اس کا اصل جرم کیا ہے۔ محمد اور سنجر تو خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے لیکن ان کی ماں سے نہ رہا گیا۔ وہ غصے سے اٹھی اور باہر نکلی۔ ایک خادم آ رہا تھا۔ اس نے برکیارق کی ماں کو دیکھا تو رک گیا۔

"مادرِ سلطان!" —— اس خادم نے کہا —— "میں بازار سے آ رہا ہوں۔ سالار اوریزی کو سپہ سالار حجازی نے چوک میں کھڑا کر رکھا ہے اور وہاں لوگ تماشا دیکھ رہے ہیں"۔

"تو اس بیچارے کو ذلیل بھی کیا جا رہا ہے؟" —— ماں نے حیرت سے کہا۔

وہ اپنے بیٹے سلطان برکیارق کے کمرے کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتی چل پڑی۔

"ہے کہاں میرا بے غیرت بیٹا!" —— ماں کہتی چلی جا رہی تھی —— "میں نے تو حلال کا جنا تھا۔ اس کے باپ کو دھوکا نہیں دیا تھا۔ میں نے اپنی اولاد کے خون میں ملاوٹ نہیں کی تھی" —— اس کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی اور کہہ رہی تھی —— "کیا اس نے اوریزی کو گرفتار کر لیا ہے؟..... یہ اس باطنی چڑیل کا کام ہے"۔

روزینہ اپنے کمرے میں تھی۔ اسے برکیارق کی ماں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ اسے برکیارق کی ماں آتی نظر آئی۔ روزینہ نے بڑی تیزی سے ایک طرف جا کر دربان کو بلایا۔

"اسے روک لو" —— روزینہ نے دربان سے کہا —— "کہنا سلطان سو رہے ہیں.... اسے اندر نہ آنے دینا"۔

دربان برکیارق کی ماں کے راستے میں کھڑا ہو گیا اور اسے روک دیا۔ یہ بھی کہا کہ سلطان کی طبیعت ٹھیک نہیں اور وہ سو رہے ہیں لیکن ماں نے اسے دونوں ہاتھوں سے دھکا دیا اور آگے کو چل پڑی۔

روزینہ بہت ہی چالاک لڑکی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ماں رک نہیں رہی تو وہ دوڑتی

باہر نکلی اور برکیارق کی ماں کے آگے جا کھڑی ہوئی اور بڑے پیار سے اس سے پوچھا کہ وہ کیوں اتنے غصے میں ہیں؟

"کیا تمہارے دربان مجھے روک لیں گے؟" ——— ماں نے غصے کے عالم میں کہا۔

روزینہ نے دربان کو ڈانٹ کر کہا کہ اس نے انہیں کیوں روکا ہے؟ کیا وہ بھول گیا ہے کہ یہ عظیم خاتون کون ہیں؟..... دربان خاموش کھڑا روزینہ کا منہ دیکھتا رہا۔

"کیا برکیارق سویا ہوا ہے؟" ——— ماں نے روزینہ سے پوچھا۔

"اگر وہ سوئے ہوئے ہیں تو بھی آپ کے لئے جاگ اٹھیں گے" ——— روزینہ نے احترام کی اداکاری کرتے ہوئے کہا ——— "آپ میرے کمرے میں آ کر بیٹھیں' میں انہیں اٹھا کر یہیں لے آؤں گی"۔

ماں روزینہ کی باتوں میں آ گئی اور اس کے ساتھ اس کے کمرے میں جا بیٹھی۔ روزینہ کمرے سے نکل گئی اور سلطان برکیارق کے پاس چلی گئی۔ اسے بتایا کہ اس کی ماں واہی تباہی بکتی آئی ہے اور اس نے ماں کو دوسرے کمرے میں ذرا ٹھنڈا کر کے بٹھالیا ہے۔

"تو میں اس کا کیا علاج کروں؟" ——— برکیارق نے پوچھا۔

"وہ ماں ہے" ——— روزینہ نے کہا ——— "اس کا احترام ہم پر فرض ہے لیکن وہ ایک باغی اور غدار سالار کا ساتھ دے رہی ہے۔ آپ سلطنت کے مفاد کو دیکھیں گے یا ماں کے احترام کو؟"

"میں تو سلطنت کے مفاد کو پہلے دیکھوں گا" ——— برکیارق نے کہا ——— "تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں ماں کے سامنے جاؤں یا نہ جاؤں"۔

"آپ یہاں سے ادھر اُدھر ہو جائیں تو اچھا ہے" ——— روزینہ نے کہا۔

اُدھر محمد اور سنجر کو پتہ چلا کہ ان کی ماں بڑے غصے میں برکیارق کی طرف گئی ہے تو انہیں فکر ہوا کہ برکیارق اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرے گا۔ دونوں ماں کے پیچھے دوڑ پڑے۔ وہاں انہیں بتایا گیا کہ ان کی ماں فلاں کمرے میں ہے۔ وہ دونوں اُس کمرے میں گئے تو ماں کو بڑے غصے میں ٹہلتے دیکھا۔

"چھوٹی ماں!" ——— محمد نے اسے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا ——— "یہاں آپ کیا لینے آئی ہیں؟ آپ کے اس بیٹے کا دماغ ٹھکانے نہیں رہا"۔

"میں اس کا دماغ ٹھیک کرنے آئی ہوں" ——— ماں نے کہا..... "میں نہیں کروں گی تو اور کون کرے گا؟"

"ہم دونوں بھائی کریں گے" ——— محمد نے کہا ——— "ہم نے انتظام کر دیا ہے۔ آپ یہاں سے چلیں"۔

ماں جانے پر راضی نہیں ہو رہی تھی۔ محمد اور سنجر کی بہت سی باتوں اور منت سماجت کے بعد وہ اس پر راضی ہوئی کہ وہ اسی کمرے میں بیٹھی رہے گی اور دونوں بھائی برکیارق کے پاس جائیں گے۔

"میں اس کے پاس کیوں نہ جاؤں؟" ——— ماں نے پوچھا۔

"میں بتاتا ہوں آپ کیوں نہ جائیں" ——— سنجر بولا ——— "اگر ہمارے اس بڑے بھائی برکیارق نے ہمارے سامنے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی تو میں اسے یہیں ختم کر دوں گا۔ کیا آپ اپنے ایک بیٹے کو دوسرے بیٹے کے ہاتھوں مروانا پسند کریں گی؟"

وہ آخر ماں تھی۔ اس پر سنجر کی اس بات کا ایسا اثر ہوا کہ اس کا منہ ذرا سا کھل گیا اور آنکھیں ٹھہر گئیں۔ وہ آہستہ سے بیٹھ گئی اور اس نے سر سے اشارہ کیا کہ تم جاؤ میں یہیں بیٹھوں گی۔

محمد اور سنجر برکیارق سے ملنے کمرے سے نکل گئے۔ ماں اپنا سر ہاتھوں میں تھام کر رونے لگی۔ اس نے آہ لے کر کہا' یہ وقت بھی دیکھنا تھا۔

"آؤ..... بیٹھو" ——— برکیارق نے اپنے بھائیوں سے کہا اور پوچھا ——— "ماں کو کیا ہو گیا ہے؟..... سنا ہے وہ چیختی چلاتی یہاں آئی ہے۔ وہ پاگل تو نہیں ہو گئی؟"

"ابھی ہوئی تو نہیں بھائی جان!" ——— محمد نے کہا ——— "ہو جائے گی"۔

"جلدی پاگل ہو جائے گی" ——— سنجر نے کہا۔

"ابھی تو وہ مجھے پاگل سمجھتی ہے" ——— برکیارق نے کہا ——— "اب وہ کیا کہنے آئی ہیں؟"

"وہ سلطنت کی تباہی کو برداشت نہیں کر سکتی" ——— محمد نے بڑے اعتماد اور دوٹوک لہجے میں کہا ——— "سالار اوریزی کو آپ نے یہ سزا دے کر اچھا نہیں کیا"۔

"کیوں روزینہ!" ——— برکیارق نے روزینہ کی طرف دیکھ کر کہا ——— "انہیں بتاؤ کہ اوریزی نے کیا جرم کیا ہے"۔

"ہم آپ کے ساتھ بات کرنے آئے ہیں بھائی جان!" ــــ سنجر نے کہا۔

"تم ابھی بہت چھوٹے ہو سنجر!" ــــ برکیارق نے کہا ــــ "سلطنت کے کاموں کو ابھی تم نہیں سمجھ سکتے"۔

"لیکن میں ایک بات سمجھ سکتا ہوں" ــــ سنجر نے کہا ــــ "جو مرد اپنی بیوی کا غلام ہو کر اپنے گھر کے سارے معاملات اور فیصلے اُس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے' اُس کے گھر میں تباہی' ذلت اور خواری کے سوا کچھ نہیں رہتا لیکن آپ نے گھر کے نہیں بلکہ اتنی بڑی سلطنت کے معاملات اور فیصلے اپنی بیوی کے ہاتھ میں دے دیئے ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ایک قابل' تجربہ کار اور جذبے والا سالار ذلیل و رسوا کیا جا رہا ہے اور اسے عمر قید دے دی گئی ہے"۔

"تم دونوں بھائی میری ایک بات غور سے سن لو" ــــ برکیارق نے کہا ــــ "روزینہ میرا دماغ ہے۔ میرے کان اور میری آنکھیں بھی روزینہ ہے....."

"سلطان محترم!" ــــ محمد نے کہا ــــ "یہ بات آپ فخر سے نہ کہیں۔ یوں کہیں کہ اللہ نے آپ کے دماغ پر مہر لگا دی ہے اور ایک مشکوک لڑکی کے ہاتھوں آپ کی سوچنے کی طاقت ختم کر ڈالی ہے۔ آپ کی آنکھوں پر پٹی بندھ چکی ہے"۔

"کیا بک رہے ہو محمد!" ــــ برکیارق نے ڈانٹ کر کہا۔

"میں بک نہیں رہا" ــــ محمد نے کہا ــــ "میں وہ بات کہہ رہا ہوں جو اللہ نے قرآن میں کہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اُن گنہگار لوگوں پر جو اپنے گناہوں پر فخر کرتے ہیں اللہ نے یہ لعنت نازل کی ہے کہ ان کے دماغوں' کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے..... آپ نے اپنے اوپر شیطان کو مسلط کر لیا ہے"۔

"آپ کی آنکھیں اُس وقت کھلیں گی جب سلطنتِ سلجوقیہ پر باطنیوں کا قبضہ ہو چکا ہو گا" ــــ سنجر نے کہا۔

"آپ کی جگہ حسن بن صباح بیٹھا ہُوا ہو گا" ــــ محمد نے کہا ــــ "اور آپ کی لاش بھی نہیں ملے گی اور یہاں آپ کی اس بیگم کی حکمرانی ہو گی۔ اپنی آنکھوں سے پٹی کھولیں بھائی جان!"

"میں یہاں سے چلی جاتی ہوں" ــــ روزینہ نے منہ بسور کر کہا ــــ "ان لوگوں کو میرا وجود اچھا نہیں لگتا"۔

روزینہ دروازے کی طرف چل پڑی۔ سلطان برکیارق اُس کے پیچھے دوڑا لیکن وہ دروازے سے نکل گئی اور اپنے کمرے میں پلنگ پر اوندھے منہ گر کر رونے لگی۔ برکیارق بے تاب ہو کر اسے منانے بیٹھ گیا لیکن روزینہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ آخر برکیارق نے اسے اٹھالیا۔

"میری وجہ سے آپ کی ماں آپ کے خلاف ہو گئی ہے" ــــ روزینہ نے کہا ــــ "آپ کے بھائی آپ کے دشمن ہو گئے ہیں۔ مجھے آپ کی اور اس سلطنت کی سلامتی چاہئے۔ میں تارک الدنیا ہو کر کسی غار میں جا بیٹھوں گی اور آپ کے لئے اور آپ کی سلطنت کے لئے دعا کرتی رہا کروں گی"۔

برکیارق اتنی بڑی سلطنت کا سلطان تو بن گیا تھا لیکن وہ نہ سمجھ سکا کہ چالاک اور عیار عورت جب چاہے اپنے آنسو نکال سکتی ہے۔ یہ تو قلعہ الَموت کی تربیت یافتہ لڑکی تھی۔

"تم بتاؤ میں کیا کروں" ــــ برکیارق نے کہا ــــ "جو فیصلہ تم کرو گی میں اپنی ماں اور اپنے بھائیوں کو سنا دوں گا"۔

"میری اپنی کوئی خواہش نہیں" ــــ روزینہ نے کہا ــــ "میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ سلطنت کے معاملات میں پوری دلچسپی لیں اور اسی طرح فیصلے کرتے رہیں جس طرح آپ نے اس سالار کو سزا سنائی ہے۔ میں تو آپ کو روحانی سکون دے رہی ہوں مگر آپ کی ماں اور بھائی یہ سکون تباہ کر رہے ہیں۔ یہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا"۔

"پھر تم چپ رہو" ــــ برکیارق نے کہا ــــ "اگر میری ماں کا منہ بند نہ ہُوا تو میں اسے نظربند کر دوں گا"۔

روزینہ کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا اور برکیارق کی جان میں جان آئی۔

"اپنے بھائیوں کو چلتا کریں" ــــ روزینہ نے کہا ــــ "انہیں کہیں کہ وہ ایک باغی اور غدار سالار کی حمایت نہ کریں ورنہ تمہیں بھی وہیں پہنچا دیا جائے گا جہاں اسے پہنچا دیا گیا ہے"۔

سلطان برکیارق لمبے لمبے قدم اٹھاتا اس کمرے میں گیا جہاں وہ اپنے دونوں بھائیوں کو بیٹھا چھوڑ گیا تھا۔ بھائی وہاں نہیں تھے۔ وہ اُس کمرے میں گیا جہاں اُس کی ماں بیٹھی تھی۔ ماں بھی جا چکی تھی۔

○

سالار اوریزی کو ابھی تک چوک میں کھڑا رکھا ہُوا تھا۔ سپہ سالار ابو جعفری حجازی نے اسے رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔

"سپہ سالار حجازی جھوٹ کہہ رہا ہے" —— ایک آواز اٹھی۔

"سپہ سالار خود غدار ہے" —— ایک اور آواز۔

"ہم انصاف چاہتے ہیں" —— دو تین آوازیں اٹھیں۔

اور ہجوم میں ایک بار پھر شور و غوغا شروع ہو گیا۔ حجازی کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار آ گئے اور وہ اِدھر اُدھر' آگے اور پیچھے دیکھنے لگا۔ اس کے محافظوں نے برچھیاں تان لی تھیں اور وہ لوگوں کو پیچھے ہٹا رہے تھے۔

ایک گھوڑا سرپٹ دوڑتا آ رہا تھا۔ لوگوں نے اُدھر دیکھا۔ گھوڑے پر کوئی عورت سوار تھی اور اس کے ہاتھ میں سلطنتِ سلجوقیہ کا پرچم تھا جس پر چاند اور ستارے کا نشان تھا۔ گھوڑا اسی رفتار سے چلا آ رہا تھا۔ ہجوم نے اسے راستہ دے دیا۔ گھوڑا دونوں سالاروں کے پاس جا رکا۔ سوار عورت بڑی تیزی سے گھوڑے سے اتری اور اُس میز پر چڑھ گئی جس پر دونوں سالار کھڑے تھے۔ عورت نے اپنا نقاب اٹھا دیا..... وہ سلطان برکیارق کی ماں تھی۔

"میرے عزیز لوگو!" —— برکیارق کی ماں نے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر کہا —— "اس پرچم کو دیکھو۔ یہ پرچم تمہارے ایمان اور دین کی علامت ہے۔ یہ پرچم تمہاری ماؤں' بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتوں کا نشان ہے۔ یہ پرچم اس اسلامی سلطنت کی عصمت ہے۔ آج حسن بن صباح کے باطنی اس پرچم کو پامال کرنے کے لئے تمہارے درمیان آ گئے ہیں۔ انہیں پہچانو۔ اچھے اور بُرے کو پہچانو..... مجھے پہچانو..... میں تمہاری ماں ہوں..... سلطان ملک شاہ کو یاد کرو۔ اُس کے ایمان اور جذبے کو یاد کرو۔ بھول جاؤ کہ میرا بیٹا سلطان ہے۔ میں اس ناخلف انسان کو اپنا بیٹا کہنے سے شرماتی ہوں۔ میرے بیٹے تم ہو۔ میرا بیٹا ایک باطنی چڑیل کے قبضے میں آ گیا ہے۔ اسلام کو حسن بن صباح کی گِدّھوں اور چیلوں نے نوچنا شروع کر دیا ہے..... سلطنت سلجوقیہ کی جس فوجی طاقت پر ہم سب کو اور تم سب کو ناز تھا' اس فوجی طاقت کو توڑا جا رہا ہے۔ تمہارے سالار اوریزی کو اس

جرم میں قید میں ڈالا جا رہا ہے کہ یہ اس فوجی طاقت کو نہ صرف قائم رکھنا چاہتا ہے بلکہ اس میں اضافہ کر رہا تھا۔ قید میں اس سپہ سالار حجازی کو ڈالنا چاہیے....."

"محترم ماں!" —— سپہ سالار حجازی نے برکیارق کی ماں کو بازو سے پکڑ کر کہا —— "سلطان برکیارق کا حکم بڑا ہی سخت ہے۔ آپ خاموش....."

"چھوڑ دے میرا بازو خوشامدی غلام!" —— برکیارق کی ماں نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا —— "میرے عزیز لوگو! میری بات غور سے سن لو..... تمہارے درمیان افواہیں پھیلائی جا رہی ہیں۔ حسن بن صباح قلعہ اَلموت میں بیٹھا تمہیں آپس میں لڑا رہا ہے..... اگر تم نے آنکھیں نہ کھولیں اور اپنی عقل استعمال نہ کی تو یہاں بھائی بھائی کی گردن کاٹے گا۔ بھول جاؤ کہ سلطان میرا بیٹا ہے میں کہہ چکی ہوں کہ میں اس سلطنت کی ماں ہوں' میں تمہاری ماں ہوں..... اوریزی ابھی تک سالار ہے' یہ مجرم نہیں....."

اس کے بعد برکیارق کی ماں بولتی رہی لیکن اس کی آواز ہجوم کے شور و غل میں دب گئی۔ ہجوم بھڑک اٹھا تھا۔ لوگ ایسے جوش میں آ گئے تھے کہ سپہ سالار حجازی کو اپنا انجام کچھ اور ہی نظر آنے لگا۔

اس شور و غل میں سپہ سالار حجازی نے اپنے قریب کھڑے محافظ سے کچھ کہا۔ محافظ نے پیچھے سے اوریزی کو کمر سے دبوچا اور اسے اٹھا کر قریب کھڑے ایک گھوڑے پر بٹھا دیا پھر خود اس گھوڑے پر اوریزی کے پیچھے سوار ہُوا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ سپہ سالار حجازی میز سے کود کر اترا اور ایک محافظ کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس نے محافظوں کو کوئی حکم دیا۔

تمام محافظوں نے گھوڑے دوڑا دیئے اور برچھیاں آگے کر لیں۔ تمام لوگ گھوڑوں اور برچھیوں سے ڈر گئے اور ایک طرف ہو گئے اور اس طرح سپہ سالار حجازی اور اس کے محافظ سالار اوریزی کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔

○

پہلے تو محافظوں نے ہجوم کو پیچھے روک رکھا تھا' جب محافظ وہاں سے نکل بھاگے تو ہجوم برکیارق کی ماں کے قریب آ گیا۔ اس خاتون نے ایسا تاثر پیدا کر دیا تھا کہ ہر کوئی سالار اوریزی کا حامی ہو گیا تھا۔

محمد اور سنجر کو کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ ان کی ماں باہر کہیں چلی گئی ہے۔ وہ اسے

ڈھونڈنے لگے تو اصطبل سے پتہ چلا کہ ان کی ماں ایک گھوڑا نکلوا کر اور پرچم ہاتھ میں لے کر کہیں چلی گئی ہے۔ سب کا خیال یہی تھا کہ وہ اُس چوک میں ہی گئی ہو گی جہاں سالار اوریزی کو تذلیل کے لئے کھڑا کیا گیا ہو گا۔

محمد اور سنجر نے گھوڑے لئے' ان پر سوار ہوئے اور چوک کی طرف گھوڑے دوڑا دیئے۔ ان کی ماں وہیں تھی اور ہجوم نعرے لگا رہا تھا۔ دونوں بھائی اُس میز پر چڑھ گئے جس پر ان کی ماں کھڑی تھی۔ انہوں نے ماں سے کہا کہ وہ واپس چلے۔

"اے ایمان والو!" ——— ماں نے اپنے ایک پہلو میں محمد کو اور دوسرے پہلو میں سنجر کو کھڑا کر کے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور بلند آواز سے کہا ——— "میں اپنے یہ دونوں بیٹے اس اسلامی سلطنت پر قربان کر دوں گی"۔

محمد نے لوگوں سے کہا کہ وہ اپنے اس جوش و خروش کو قابو میں رکھیں اور ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ اس نے کہا کہ ہم حسن بن صباح کو ختم کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے لیکن صورتِ حال یہ پیدا ہو گئی ہے کہ حسن بن صباح ہمیں ختم کرنے کا بندوبست کر چکا ہے۔

یہ کہہ دینا تو آسان تھا کہ باطنی شہر میں پھیلتے جا رہے ہیں لیکن یہ معلوم کرنا بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن تھا کہ شہر کے لوگوں میں باطنی کون کون ہیں۔ بہرحال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مرو کا شہر حسن بن صباح کی گرفت میں آ گیا تھا اور اس شہر میں خون خرابہ "تقریباً" شروع ہو گیا تھا۔ محمد اور سنجر اپنی ماں کو ساتھ لے کر چلے گئے۔

سپہ سالار ابو جعفر حجازی سالار اوریزی کو اپنے محافظوں کے ساتھ لے کر سرپٹ دوڑتے گھوڑوں پر شہر سے نکل گیا۔ اس نے پیچھے دیکھا۔ تعاقب میں کوئی بھی نہیں آ رہا تھا۔ اسے تعاقب کا کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ اس کے محافظ تلواروں اور برچھیوں سے مسلح تھے۔ شہری تعاقب کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھی اس کے دل پر یہ اندیشہ سوار ہو گیا تھا کہ شہری بھڑک اٹھے تھے اور اس کے خلاف ہو گئے تھے۔

اس نے محافظوں کو گھوڑے آہستہ کرنے کا حکم دیا۔ قید خانہ ابھی دور تھا۔ وہ جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔ اوریزی زنجیروں میں بندھا ایک محافظ کے آگے بیٹھا بالکل خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر افسوس اور تذبذب کا ہلکا سا بھی تاثر نہیں تھا۔ آگے علاقہ چٹانی آ گیا۔ راستہ ان چٹانوں کے درمیان سے بل کھاتا گزرتا تھا۔ یہ قافلہ اس راستے پر

چلا چٹانوں کے اندر گیا تو اچانک دائیں بائیں سے بہت سے آدمی جو تلواروں اور برچھیوں سے مسلح تھے' ان پر ٹوٹ پڑے۔ حملہ آوروں نے دو تین محافظوں کو تو پہلے حملے میں ہی گھائل کر کے گھوڑے سے گرا دیا۔ جن پر حملہ ہوا تھا وہ کوئی اناڑی نہیں تھے' وہ تجربہ کار محافظ تھے جنہیں جانیں قربان کرنے کی تربیت دی گئی تھی۔ وہ فوج سے منتخب کئے گئے تھے۔

وہاں لڑنے کے لئے جگہ تنگ تھی۔ محافظوں کے لئے مشکل یہ تھی کہ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اور پینترے بدلنے کے لئے گھوڑوں کو تیزی سے موڑنا اور آگے پیچھے کرنا مشکل تھا۔ حملہ آور پیادہ تھے۔ محافظوں نے جم کر لڑنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ گھوڑوں سے اتر آئے۔

سپہ سالار حجازی نے بلند آواز سے حکم دیا کہ اوریزی کو حفاظت میں لئے رکھو' اسے بھاگنے نہ دینا..... وہ تو زنجیروں اور بیڑیوں میں بندھا ہوا تھا۔ وہ بھاگ نہیں سکتا تھا لیکن حجازی یہ سمجھ گیا تھا کہ یہ حملہ اوریزی کو آزاد کرانے کے لئے ہوا ہے۔ چار پانچ محافظوں نے سالار اوریزی کو گھوڑے سے اتار کر ایک جگہ گرا دیا اور وہ سب اس کے اردگرد کھڑے ہو کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے لگے۔ حملہ آوروں کی تعداد محافظوں سے خاصی زیادہ تھی لیکن کسی ایک محافظ نے بھی پیٹھ دکھانے کی نہ سوچی۔

"میرے شیرو!" ——— "سپہ سالار حجازی کی آواز گرجی ——— "قیدی کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ اسے قید خانے تک پہنچا دو گے تو تمہیں جھولیاں بھر کر انعام دلواؤں گا"۔

محافظوں کے لئے سالار اوریزی بڑی ہی قیمتی چیز بن گیا تھا۔ وہ اسی کے قریب رہنے کی کوشش کرتے اور لڑ رہے تھے۔ اوریزی کو انہوں نے ایک چٹان کے دامن میں بٹھا دیا تھا۔ دو تین حملہ آور اس چٹان پر چڑھ گئے۔ چٹان اونچی نہیں تھی۔ حملہ آوروں نے اوپر سے محافظوں کو برچھیاں ماریں لیکن چٹان کے پہلوؤں کی طرف سے محافظوں نے اوپر جا کر حملہ آوروں کو گرا لیا۔

"لڑتے ہوئے مر جاؤ" ——— سپہ سالار حجازی کی آواز ایک بار پھر گرجی ——— "اگر قیدی تمہارے ہاتھ سے نکل گیا تو سلطان تم سب کو سزائے موت دے گا"۔

حملہ آور پیچھے ہٹ گئے اور کچھ دیر کے لئے یہ خونریز لڑائی تھم گئی۔ پتہ نہیں چلا تھا کہ حملہ آور بھاگ گئے ہیں یا چٹانوں میں چھپ گئے ہیں۔ حجازی نے محافظوں کو اکٹھا

کرلیا۔ وہ ابھی نکل نہیں سکتا تھا۔ اس نے محافظوں کو گنا تو پانچ محافظ کم ہو گئے تھے۔ وہ شدید زخمی ہوئے یا مارے گئے تھے۔ حملہ آوروں میں سے بھی کچھ کم ہو گئے تھے۔

حملہ آور چٹانوں کے پیچھے چھپ گئے تھے۔ محافظ اپنے گھوڑوں کو پکڑ کر لے آئے اور چلنے کی تیاری کرنے لگے۔ اچانک ایک طرف سے پانچ چھ حملہ آور دوڑتے ہوئے آئے۔ محافظوں نے گھوڑوں کو چھوڑا اور حملہ آوروں کے مقابلے کو آگے بڑھے۔ حملہ آور لڑتے ہوئے اس طرح پیچھے ہٹنے لگے جیسے وہ محافظوں کی تلواروں اور برچھیوں اور ان کے جوش و خروش کا مقابلہ نہ کر سکتے ہوں۔

پیچھے ہٹتے ہٹتے آدھے حملہ آور ایک چٹان سے ایک طرف مڑ گئے اور باقی ذرا پیچھے جا کر دوسری طرف مڑ گئے اور بھاگنے لگے۔ محافظ ان کے پیچھے دوڑے۔

ادھر جہاں اوریزی کو بٹھایا گیا تھا' وہاں ایک سپہ سالار حجازی تھا اور اس کے ساتھ صرف ایک محافظ تھا۔

"اس قیدی کو میں ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا" —— سپہ سالار حجازی نے محافظ سے کہا —— "اگر ان لوگوں نے ہمارا پیچھا نہ چھوڑا تو میں اسے یہیں قتل کر دوں گا۔ سلطان یقیناً خوش ہو گا"۔

سالار اوریزی حجازی کی یہ بات سن رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر خوف کا نام و نشان نہ تھا بلکہ وہ مسکرا رہا تھا۔ حجازی نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں اوریزی!" —— حجازی نے طنزیہ لہجے میں کہا —— "مسکراتے ہوئے جان دے دو تو بڑا ہی اچھا ہے"۔

سالار اوریزی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا اور مسکراتا رہا منہ سے کچھ نہ بولا۔

اچانک قریب سے ہی چار پانچ حملہ آور نکلے اور انہوں نے ہلہ بول دیا۔ حجازی کے ہاتھ میں تلوار تھی اور وہ کچھ لڑا بھی تھا لیکن اب وہ بھاگ اٹھا اور قریب کھڑے گھوڑے پر سوار ہو کر اس نے ایڑ لگا دی۔ پیچھے جو محافظ رہ گیا تھا اسے وہیں کاٹ دیا گیا۔

حملہ آوروں نے اوریزی کو اٹھایا اور ایک گھوڑے پر ڈال دیا۔ اس کے پیچھے ایک حملہ آور سوار ہو گیا اور اس نے گھوڑا دوڑا دیا۔

حملہ آوروں نے بڑی اچھی چال چلی تھی۔ وہ ایک طرف سے آئے اور محافظوں سے لڑتے ہوئے پیچھے ہٹتے ہٹتے محافظوں کو اپنے ساتھ چٹانوں کے اندر لے گئے۔ پیچھے میدان صاف تھا۔ حملہ کرنے اور اوریزی کو اڑا لے جانے کے لئے آدمی موجود تھے۔ ان کی یہ چال کامیاب رہی۔

دو یا تین محافظ بچ کر نکلے ہوں گے۔ وہ پیدل بھاگے تھے۔ باقی شدید زخمی ہوئے اور مارے بھی گئے تھے۔ ان کے گھوڑے پیچھے رہ گئے تھے۔

○

سلطان برکیارق کو دربان نے اطلاع دی کہ سپہ سالار حجازی آیا ہے۔ سلطان نے حکم دیا کہ اسے فوراً اندر بھیجا جائے۔

حجازی جب سلطان برکیارق کے سامنے گیا تو شکست اور شرمساری اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"آپ اتنے بوڑھے تو نہیں ہو گئے!" —— برکیارق نے مسکراتے ہوئے کہا —— "لیکن تھکن آپ کے چہرے سے ظاہر ہو رہی ہے۔ کیا ایک قیدی کو قید خانے تک پہنچانا لڑائی سے زیادہ بڑی مشقت ہے؟"

"سلطان عالی مقام!" —— سپہ سالار حجازی نے تھکی تھکی اور ہاری ہوئی آواز میں کہا —— "میں لڑائی میں سے ہی نکل کر آیا ہوں"۔

"کیسی لڑائی؟" —— برکیارق نے پوچھا —— "کیا قید خانے کے عملے کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی..... کیا وہ قیدی کو وصول نہیں کر رہے تھے؟..... کس سے لڑائی لڑی ہے؟"

"ہم قید خانے کے قریب پہنچ گئے تھے" —— حجازی نے کہا —— "ہم جب چٹانوں میں سے گزر رہے تھے تو ہم پر آگے سے' پیچھے اور دائیں بائیں سے حملہ ہو گیا۔ حملہ آور تعداد میں زیادہ تھے۔ ان کے پاس تلواریں اور برچھیاں تھیں اور....."

"مجھے صرف ایک بات بتاؤ" —— سلطان برکیارق نے پوچھا —— "کیا اوریزی کو اس کوٹھڑی میں بند کر آئے ہو یا نہیں؟"

حجازی کی زبان ہل نہ سکی۔ اس نے اپنا سر نفی میں ہلایا اور سر جھکا لیا۔

"پھر کہاں ہے اوریزی؟" —— روزینہ جو اس وقت تک خاموش تھی' بولی —— "کیا اسے جنگل میں پھینک آئے ہو؟"

"نہیں!" —— سپہ سالار حجازی نے کہا —— "اسے حملہ آور لے گئے ہیں"

"پھر تم زندہ میرے پاس کیوں آئے ہو؟" ۔۔۔ سلطان برکیارق نے گرج کر کہا اور پوچھا ۔۔۔ "باقی محافظ کہاں ہیں؟"

"صرف ایک میرے ساتھ آیا ہے" ۔۔۔ سپہ سالار حجازی نے کہا ۔۔۔ "باقی شاید زندہ نہیں"۔

"حملہ آور کون تھے؟" ۔۔۔ سلطان برکیارق نے پوچھا ۔۔۔ "کیا تم نے کسی کو پہچانا نہیں؟"

"میں صرف شک میں بات کر سکتا ہوں سلطانِ محترم!" ۔۔۔ سپہ سالار حجازی نے جواب دیا ۔۔۔ "مجھے شک ہے کہ حملہ آور اُن فوجیوں میں سے تھے جنہیں فوج سے نکال کر ابھی خیموں میں رکھا ہوا ہے..... میرے ساتھ جو محافظ آیا ہے' وہ کچھ وثوق کے ساتھ بات کرتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے اندر بلالوں"۔

سلطان برکیارق کے اشارے پر حجازی باہر گیا اور اس محافظ کو ساتھ لے آیا۔

"کیا تم نے حملہ آوروں کو پہچانا تھا؟" ۔۔۔ سلطان برکیارق نے محافظ سے پوچھا۔

"ہاں عالی جاہ!" ۔۔۔ محافظ نے جواب دیا ۔۔۔ "وہ ہمارے اُن ساتھیوں میں سے تھے جنہیں فوج میں سے نکالا جا رہا ہے..... میں نے تین کو تو پہچان لیا تھا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ باقی بھی وہی ہوں گے جو فوج سے نکالے گئے ہیں"۔

سپہ سالار حجازی نے سلطان برکیارق سے اجازت لے کر اس محافظ کو باہر بھیج دیا۔

"سلطانِ عالی مقام!" ۔۔۔ سپہ سالار حجازی نے کہا ۔۔۔ "پیشتر اس کے کہ آپ مجھے سزا دیں یا کوئی اور حکم دیں' میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں لیکن کہنے سے اس لئے ڈرتا ہوں کہ میری بات کا تعلق آپ کی محترمہ والدہ اور بھائیوں کے ساتھ ہے"۔

"جو کہنا ہے صاف صاف کہو" ۔۔۔ سلطان برکیارق نے کہا ۔۔۔ "میں سنوں گا۔ مجھے صرف سلطنت کے مفاد کا خیال ہے۔ میری ماں ہے یا بھائی' ان کا درجہ سلطنت کے بعد ہے۔ ان کے متعلق انتہائی بُری اور توہین آمیز بات کرو گے تو میں وہ بھی سنوں گا۔ مجھے صحیح صورتِ حال معلوم ہونی چاہئے"۔

"محترم سلطان! آپ کا اقبال اور زیادہ بلند ہو" ۔۔۔ حجازی نے کہا ۔۔۔ "کسی نے ہم پر حملے کی جرأت نہیں کرنی تھی۔ یہ حملہ آپ کی محترمہ والدہ اور آپ کے بھائی محمد نے کرایا ہے۔ وہ اس طرح کہ میں آپ کے حکم کے مطابق اوریزی کو چوک میں کھڑا کر

کے اس کا جرم لوگوں کو بتا رہا تھا۔ اوریزی اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ بول رہا تھا۔ ہجوم بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ اتنے میں آپ کی والدہ محترمہ گھوڑے پر سوار وہاں آ پہنچیں۔ ان کے ہاتھ میں سلطنت کا پرچم تھا۔ وہ گھوڑے سے اتر کر ہمارے پاس آ کھڑی ہوئیں اور انہوں نے لوگوں کو آپ کے خلاف اور میرے خلاف اتنا زیادہ بھڑکایا کہ لوگ ہمارے خلاف اور اوریزی کے حق میں مشتعل ہو گئے۔ پھر آپ کا بھائی محمد چھوٹے بھائی سنجر کے ساتھ آ گیا۔ محمد نے اتنی اشتعال انگیز باتیں تو نہ کیں لیکن جو کچھ بھی اس نے کہا تھا وہ اوریزی کے حق میں جاتا تھا۔ لوگوں کا ہجوم اتنا زیادہ مشتعل ہو گیا کہ لوگ ہم پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھنے لگے۔ وہ محافظوں کی برچھیوں سے بھی نہ ڈرے۔ یہ تو میرا کمال تھا کہ میں نے اوریزی کو ایک گھوڑے پر پھینکا اور محافظوں سے کہا کہ یہاں سے نکلیں اور ان کی برچھیوں اور گھوڑوں کی زد میں کوئی بھی آتا ہے' پرواہ نہ کریں..... سلطانِ عالی مقام! میں خوش تھا کہ قیدی کو مشتعل ہجوم میں سے نکال لایا ہوں لیکن آگے جا کر ہم پر حملہ ہوا تو میں سمجھ گیا کہ سابق فوجی بھی ہجوم میں موجود تھے۔ وہ کسی اور راستے سے ہم سے پہلے آگے جا کر گھات میں بیٹھ گئے۔ یہ ہے ہم پر حملے کی اصل وجہ"۔

سلطان برکیارق کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اس نے روزینہ کی طرف دیکھا۔ روزینہ دانت پیس رہی تھی۔ یہ اس کے غصے کی انتہا تھی۔

"اگر وہ میری ماں ہوتی" ۔۔۔ روزینہ نے کہا ۔۔۔ "تو معلوم نہیں میں کیا کر گزرتی۔ وہ آپ کی ماں ہے اس لئے میں کچھ کہہ نہیں سکتی..... ماں کو اتنا بھی خیال نہیں کہ وہ سلطنت کو خانہ جنگی کی بھٹی میں جھونک رہی ہے..... اور آپ کا بھائی محمد..... ایک احمق آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ وہ آپ کا تختہ الٹنا چاہتا ہے اور اس کے دل میں سلطانی کے سوا کچھ بھی نہیں"۔

"میں تمہیں کوئی سزا نہیں دوں گا حجازی!" ۔۔۔ سلطان برکیارق نے کہا ۔۔۔ "اس کی بجائے میں تمہیں مہلت اور موقع دیتا ہوں کہ ان حملہ آوروں کو پکڑو' پھر دیکھنا کہ میں انہیں کیا سزا دیتا ہوں"۔

"گستاخی معاف سلطانِ عالی مقام!" ۔۔۔ حجازی نے کہا ۔۔۔ "میں تو ان غداروں اور باغیوں کو پکڑنے کے لئے دن رات ایک کر دوں گا لیکن آپ کی والدہ محترمہ اور بھائی

میرے لئے بہت بڑی رکاوٹ بن جائیں گے۔ میں ان کے محاذ کو ایک کاری ضرب سے توڑ سکتا ہوں۔ ان کے سر آپ کے قدموں میں پیش کر سکتا ہوں لیکن وہ آپ کی ماں اور آپ کے بھائی ہیں جن پر میں ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ انہیں اگر آپ پابند کر لیں تو.....“

”ماں کو نظر بند کر دیں“ —— روزینہ نے برکیارق سے کہا —— ”ماں کو قید خانے میں پھینکنا بہت ہی معیوب ہے۔ انہیں ان کے کمرے میں پابند کر دیں کہ وہ باہر نہ نکلیں۔ پہرہ کھڑا کر دیں۔ بھائیوں کو سمجھانے کی کوشش کریں کہ وہ آپ کے حکم کے خلاف لوگوں کو نہ بھڑکائیں۔ انہیں ذہن نشین کرائیں کہ حسن بن صباح سیاہ گھٹا کی طرح افق سے اٹھتا چلا آ رہا ہے اور اگر یہاں بھائیوں میں ہی اختلاف پیدا ہو گیا تو یہ گھٹا سلطنتِ سلجوقیہ کو تاریک کر ڈالے گی“۔

اس باطنی لڑکی روزینہ کی ایسی ہی باتیں تھیں جو سلطان برکیارق کو متاثر کرتی تھیں۔ اسے کوئی کہتا تھا کہ یہ حسن بن صباح کے گھونسلے سے نکلی ہوئی لڑکی ہے تو برکیارق کا خون کھول اٹھتا اور ایسی بات کہنے والے پر وہ برس اٹھتا تھا۔

”اب سنو حجازی!“ —— سلطان برکیارق نے دو ٹوک لہجے میں کہا —— ”دو راتوں بعد جب تیسری رات آدھی گزر جائے تو اپنی پوری فوج کو بیدار کرو اور ان فوجیوں کے خیموں کو محاصرے میں لے لو جنہیں ہم نے فوج سے سبکدوش کر کے خیموں میں عارضی طور پر رکھا ہُوا ہے۔ اپنی فوج کو پہلے ہی بتا دینا کہ وہ تیاری کی حالت میں رہیں اور باہر کسی کو پتہ نہ چل سکے کہ فوج تیاری کی حالت میں ہے۔ آدھی رات کو صرف ایک اشارے پر فوج خاموشی سے اٹھے اور وہیں سے محاصرے کی ترتیب میں ہو کر خیموں کو اپنے نرغے میں لے لے۔ رات کے وقت کوئی کارروائی نہیں کرنی۔ صبح جب وہ لوگ اٹھیں تو انہیں پکڑ پکڑ کر الگ کھڑا کرتے جانا۔ پھر ہر خیمے کے اندر دیکھنا کہ کوئی چھپا ہُوا تو نہیں رہ گیا۔ اپنے اس محافظ کو ساتھ لے لینا اور یہ ان میں سے اُن تین آدمیوں کو پہچانے گا جو حملے میں شریک تھے۔ حملے میں تمہارے محافظوں نے کچھ حملہ آوروں کو زخمی بھی کیا تھا۔ ان میں جو زخمی نظر آئے اسے بھی الگ کر لینا۔ سختی کرنی پڑے تو تمہیں اجازت ہے کہ کسی کو جان سے مار ڈالو۔ تم خود عقل رکھتے ہو۔ میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔ مجھے یہ حملہ آور چاہئیں۔ ابھی دو دن اور دو راتیں تم یوں دیکھ کر رہو جیسے کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی اور تم ڈر گئے ہو۔ اپنی ماں اور بھائیوں کا انتظام میں خود کر لوں گا۔“

سلطان برکیارق نے سر سے اشارہ کیا تو سپہ سالار حجازی رکوع میں چلا گیا اور اسی حالت میں پیچھے ہٹتے ہٹتے دروازے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد سلطان برکیارق اٹھا اور کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ وہ کبھی رک جاتا‘ اوپر دیکھتا پھر سر جھکا کر چل پڑتا۔ کبھی رک کر اپنے ماتھے کو زور زور سے ملتا۔ روزینہ پہلے تو اسے دیکھتی رہی پھر اس نے برکیارق کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور بٹھا کر اس پر اس طرح جھکی کہ اس کے ریشمی بالوں نے برکیارق پر سایہ کر دیا۔

”آپ کو یہ لوگ جینے نہیں دیں گے“ —— روزینہ نے اس کے ساتھ اس طرح پیار کر کے کہا جس طرح ماں اپنے معصوم بچے کے ساتھ کرتی ہے‘ وہ کہنے لگی —— ”ذرا سر میرے ساتھ لگا لیں۔ آپ کی ذہنی حالت تو ان لوگوں نے بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ کوئی غیر ہوتا تو اور بات تھی‘ اپنی سگی ماں اور سگے بھائی آپ کو جہنم میں پھینک رہے ہیں“۔

سلطان برکیارق پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے اپنے آپ کو روزینہ کے حوالے کر دیا اور دو سال کا بچہ بن گیا۔ کچھ دیر بعد روزینہ اٹھی اور صراحی میں سے ایک مشروب پیالے میں ڈال کر برکیارق کو پلایا۔

سلطان برکیارق محسوس نہ کر سکا کہ اس کے آباؤ اجداد کی سلطنت اس پیالے میں ڈوبی جا رہی ہے۔

○

سلطان برکیارق کے ذہن اور دل پر اپنا قبضہ مکمل کر کے روزینہ اٹھی۔

”کیا میں ماں کو بلا کر اسے کہوں“ —— سلطان برکیارق نے کہا —— ”لیکن وہ تو میری جان کو آ جائے گی“۔

”محمد اور سنجر کو بلائیں“ —— روزینہ نے کہا —— ”انہیں بتائیں کہ ماں کو ان کے کمرے میں نظر بند کیا جا رہا ہے اور انہیں اچھی طرح سمجھا دیا جائے کہ وہ کوئی غیر ذمہ دارانہ حرکت نہ کریں“۔

اب وہی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی جو روزینہ نے یہاں آتے ہی پیدا کر دی تھی یعنی سوچتی وہ تھی اور عمل برکیارق کرتا تھا۔ برکیارق کا اپنا دماغ روزینہ کی حسین گود میں بے ہوشی کی نیند سو گیا تھا۔

اس کیفیت میں برکیارق نے اپنے دونوں بھائیوں کو بلایا اور بھائی اطلاع ملتے ہی آ

w w w . p a k s o c i e t y . c o m

گئے۔

"میرے عزیز بھائیو!" — برکیارق نے کہا — "تصور میں لاؤ کہ میری جگہ تم ہو اور تم کوئی حکم دیتے ہو اور کچھ لوگ تمہارے حکم کی تعمیل کے راستے میں اس طرح رکاوٹ بنتے ہیں جس طرح میرے محافظوں پر حملہ ہُوا، صاف اور سچے دل سے بتاؤ کہ تم کیا محسوس کرو گے اور کیا کارروائی کرو گے؟ یہ نہ کہنا کہ میرا حکم غلط تھا اور اسلام کے منافی تھا۔ سلطان انسان ہے اور غلطی بھی کر سکتا ہے لیکن کوئی سلطان بغاوت اور غداری برداشت نہیں کر سکتا۔ تم نے محمد! اپنی ماں کے ساتھ مل کر میرے خلاف زہر اگلا اور یہی وجہ تھی کہ جو محافظ دستہ اوریزی کو قید خانے میں لے جا رہا تھا اس پر حملہ ہُوا، قیدی کو وہ ساتھ لے گئے اور محافظوں کو قتل کر گئے..... تم بتاؤ کہ میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے!"

"ہم حملہ آوروں کو گرفتار کرتے" — محمد نے کہا — "اور انہیں سزا دیتے"۔

"اگر میں یہ کہوں کہ یہ حملہ تم نے اور ہماری ماں نے کروایا ہے تو تم کیا کہو گے؟" — سلطان برکیارق نے پوچھا۔

"یہ الزام بے بنیاد ہے" — محمد نے کہا — "یہ صحیح ہے کہ ماں وہاں چلی گئی تھی اور اس نے لوگوں سے جو باتیں کیں وہ سلطنت سلجوقیہ اور سالار اوریزی کے حق میں جاتی تھیں۔ انہوں نے بار بار کہا کہ میں اپنے بیٹے اس سلطنت پر قربان کر دوں گی لیکن اس پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دوں گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ پرچم اس اسلامی سلطنت کی عصمت ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ شہر حسن بن صباح کے بھیجے ہوئے تجربہ کار باطنی تخریب کاروں سے بھرتا جا رہا ہے"۔

"ماں نے جو کچھ بھی کہا" — سلطان برکیارق نے کہا — "وہ ہماری سلطنت اور اوریزی کے حق میں تو جاتا ہے لیکن ماں اور تم یہ نہ دیکھ سکے کہ لوگ مشتعل ہو رہے ہیں اور ان کے جوش و خروش میں انتقام کی آگ سلگتی جا رہی ہے۔ وہاں سابق فوجی بھی موجود تھے۔ ان میں چونکہ لڑنے کا جذبہ ہے اس لئے انہوں نے یہ فوجی کارروائی جس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ اب تم بتاؤ کہ میں کیا کروں؟"

اس طرح بھائیوں میں بحث مباحثہ چلتا رہا جو تلخ کلامی کی صورت اختیار کر گیا اور روزینہ برکیارق کے حق میں بول پڑی۔

"تم خاموش رہو لڑکی!" — محمد نے کہا — "سلطان ہمارا بھائی ہے اور تمہاری حیثیت صرف ایک بیوی کی ہے۔ میرے ساتھ کوئی بات نہ کرنا"۔

"اب میرا فیصلہ سنو محمد اور سنجر!" — سلطان برکیارق نے کہا — "میں اپنی ماں کو ان کے کمرے میں نظر بند کر رہا ہوں۔ تم دونوں میرا یہ حکم ان تک پہنچا دو۔ وہ کمرے سے باہر نہ نکلیں۔ باہر دو سنتری بٹھا دیئے جائیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ میرا یہ فیصلہ نہ تمہیں اچھا لگا ہے نہ ماں اسے پسند کرے گی بلکہ وہ چیخے گی چلائے گی لیکن مجھے اپنی سلطنت کو بھی دیکھنا ہے اور یہ بھی کہ ماں یوں ماری ماری نہ پھرے۔ اس کا ہر جگہ پہنچ جانا اور جو منہ میں آیا کہتے جانا اس کے اپنے وقار کے منافی ہے۔ مجھے یہ خطرہ بھی نظر آ رہا ہے کہ جس طرح وہ خود کہتی ہے کہ اس شہر میں باطنی اکٹھے ہوتے جا رہے ہیں، کوئی بدبخت باطنی اسے قتل ہی نہ کر دے"۔

"باطنی ہی ہماری ماں کو نظر بند کروا رہے ہیں" — محمد نے اٹھتے ہوئے کہا — "ہم آپ کا حکم ماں تک پہنچا دیں گے۔ وہ چیخے گی نہ چلائے گی، کچھ بھی نہیں کہے گی لیکن میں آپ کو آخری بار بتا رہا ہوں کہ جن باطنیوں کے متعلق آپ نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ وہ ہماری ماں کو قتل کر دیں گے، وہی باطنی اس سلطنت پر حکومت کر رہے ہیں۔ اپنی ماں کو نظربند کرنے کا حکم آپ نے نہیں حسن بن صباح نے دیا ہے۔ کسی باطنی میں اتنی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ ہماری ماں کو قتل کر دے۔ ہمارے بڑے بھائی کا دین، ایمان اور کردار باطنیوں کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔ آپ جو ہمارے سامنے چلتے پھرتے، بولتے اور حکم دیتے نظر آتے ہیں یہ آپ کا صرف جسم ہے۔ سوچتا کوئی اور ہے اور اس پر عمل آپ کا جسم کرتا ہے۔ آج کے بعد آپ ہمیں اپنے سامنے نہیں دیکھیں گے"۔

"اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں بھائی جان!" — سنجر نے کہا — "آئندہ آپ کا کوئی حکم ہم تک نہ پہنچے ورنہ ہم وہاں تک پہنچ جائیں گے جہاں آپ کے فرشتے بھی نہیں پہنچ پائیں گے..... ہم بھاگ نہیں جائیں گے، مر نہیں جائیں گے، اپنے آباؤ اجداد کی اور اپنے عظیم باپ کی اس سلطنت کو زندہ و پائندہ رکھنے کی پوری جدوجہد کریں گے خواہ ہماری جانیں چلی جائیں"۔

دونوں بھائی کمرے سے نکل گئے اور سلطان برکیارق احمقوں کی طرح منہ کھولے اُس دروازے کو دیکھتا رہا جس دروازے سے اس کے بھائی نکل گئے تھے۔ وہ اُس وقت

بیدار ہُوا جب روزینہ کا ایک رخسار اس کے گال کے ساتھ لگا۔

○

سالار اوریزی کو محافظوں سے چھین کر وہ اسے شہر میں نہیں لائے تھے بلکہ اسے شہر سے دور ایک ویران علاقے میں لے گئے تھے۔ اپنی رہائی کا یہ انتظام اوریزی نے خود ہی کیا تھا۔ اسے جب سلطان برکیارق کا بلاوا آیا تھا تو اسے معلوم تھا کہ سلطان اسے بخش نہیں دے گا۔ اسے معلوم تھا کہ سپہ سالار حجازی اسے انتہائی سزا دلوائے گا اسی لئے اس نے اپنے ساتھ دو محافظ لے لئے تھے اور انہیں سلطان کے محل سے ذرا دور کھڑا کر دیا تھا اور انہیں بتا دیا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔

سالار اوریزی کو جب سلطان برکیارق نے زنجیروں اور بیڑیوں میں باندھ کر باہر بھیجا تو اوریزی کے محافظوں نے دور سے دیکھ لیا۔ انہوں نے وہاں سے گھوڑے دوڑا دیئے اور ان لوگوں کے پاس جا پہنچے جنہوں نے اوریزی کو رہا کرانا تھا۔ وہ اسی اطلاع کی انتظار میں تھے۔ جونہی انہیں اطلاع ملی وہ کسی اور راستے سے چٹانی علاقے میں جا پہنچے اور گھات میں بیٹھ گئے۔ وہ گھوڑے نہیں لے گئے تھے کیونکہ گھات میں گھوڑے ہنہنا کر راز فاش کر دیتے ہیں۔

انہیں بہت انتظار کرنا پڑا کیونکہ اوریزی کو چوک میں نمائش کے لئے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ آخر انہیں سپہ سالار حجازی اپنے محافظوں کے ساتھ نظر آیا۔ وہ تیار ہو گئے اور جونہی یہ محافظ دستہ ان کی گھات میں آیا، انہوں نے حملہ کر دیا اور اوریزی کو اپنے ساتھ لے گئے۔

اوریزی نے ہی انہیں ایک جگہ بتائی تھی جہاں چھپنے کا محفوظ مقام تھا۔ وہ ویرانے میں ایک پہاڑی سی تھی جس میں ایک غار تھا۔ غار کا دہانہ گھنی جھاڑیوں میں چھپا ہُوا تھا اور اس کے آگے مٹی کا ایک چھوٹا سا ٹیلہ بھی تھا۔ اوریزی کو اس غار میں لے گئے۔ وہاں اس کی زنجیریں اور بیڑیاں کاٹنے کا انتظام تھا۔

اوریزی کو جب بتایا گیا کہ اپنے کچھ آدمی مارے گئے ہیں تو اس نے کہا کہ فوراً وہاں جاؤ اور لاشوں کو اٹھا کر لے آؤ اور یہاں دفن کر دو۔ ہو سکتا ہے وہاں کچھ زخمی بھی پڑے ہوں۔

اوریزی کے آدمی محافظوں کے گھوڑے بھی پکڑ لائے تھے۔ بچے ہوئے آدمی

گھوڑوں پر سوار ہوئے اور واپس اُس جگہ چلے گئے جہاں انہوں نے گھات لگائی تھی۔ وہ بہت جلدی میں تھے کیونکہ خطرہ تھا کہ سرکاری فوج پہنچ جائے گی۔ اتفاق سے سلطان برکیارق نے بھی نہ سوچا نہ سپہ سالار حجازی نے کہ جا کر حملہ آوروں کی لاشیں دیکھتے اور ایسے زخمیوں کو اٹھا کر لے آتے جو بھاگنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ان سے پتہ چل جاتا کہ حملہ آور کون تھے۔ حملہ آور لاشیں اور زخمی اٹھانے آئے تھے اور اٹھا کر لے گئے۔

سالار اوریزی نے صرف چار آدمی اپنے ساتھ رکھے اور دوسروں سے کہا کہ وہ چلے جائیں اور پوری جاسوسی اور مخبری کرتے رہیں اور ذرا ذرا اطلاع اس تک اس غار میں پہنچاتے رہیں۔ اس کا خیال یہ تھا کہ چند دن دبکے رہیں۔

"سابق فوجیوں کو بتا دینا کہ اب تیار رہیں" —— اوریزی نے کہا —— "انہیں یہ بھی بتا دینا کہ انہیں ہتھیار جلدی مل جائیں گے اور اب ہمارا تصادم سرکاری فوج کے ساتھ ہو گا اور اب ہمارا مقصد برکیارق کو ہٹا کر اس کی جگہ محمد کو سلطان بنانا ہے اور اس کے بعد فوج تیار کر کے حسن بن صباح کے خلاف محاذ کھولنا ہے..... لیکن میرے دوستو! ہمیں خون کے دریا میں سے گزرنا پڑے گا۔ ہم کوشش کریں گے کہ بھائی بھائی سے نہ لڑے لیکن یہ ممکن نظر نہیں آتا۔ خانہ جنگی ہو کر رہے گی..... باقی جو کچھ کرنا ہے وہ پانچ سات دنوں بعد بتاؤں گا۔ ابھی ہمیں زمین کے نیچے رہنا ہے"۔

چار پانچ مہینے گزرے باہر سے ایک طبیب آیا تھا جس نے مَرو میں اپنا مطب کھولا تھا۔ وہ جراح بھی تھا۔ اس کے ہاتھ میں خدا نے ایسی شفا دی تھی کہ مایوس اور بڑے پرانے مریض صحت یاب ہو گئے تھے۔ لوگ اس کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ اوریزی کے فرار کے دو تین روز بعد رات کا وقت تھا۔ طبیب مریضوں سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس نے مکان کا باہر والا دروازہ بند کر دیا تھا اور چار آدمی اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

"یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے حق میں ہو رہا ہے" —— طبیب نے ان آدمیوں سے کہا —— "اوریزی کا فرار بھی ہمارے حق میں جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ اسے فرار کرانے والے سابق فوجی ہیں۔ مجھے روزینہ نے محل سے اطلاع بھیج دی ہے کہ سلطان نے اپنی ماں کو نظر بند کر دیا ہے اور سپہ سالار حجازی سے کہا ہے کہ وہ حملہ آوروں کو تلاش کرے اور پکڑے۔ میں نے اپنے آدمی اس سارے کھیل میں شامل کر دیئے ہیں۔ اوریزی کا فرار ہی سابق اور حاضر فوجیوں کے درمیان لڑائی کا باعث بن جائے گا.....

"الموت سے امام حسن بن صباح کا حکم آیا ہے کہ مرو شہر کو خون میں ڈبو دو۔ یہ بھی کہ اپنے آدمیوں کو استعمال کرنا لیکن اس طرح کہ اپنے زیادہ تر آدمی محفوظ رہیں۔ بھائی کو بھائی سے لڑاؤ۔ سلطان کی فوج کو دو حصوں میں کاٹ دو اور انہیں آپس میں لڑاؤ۔ امام نے یہ حکم بھی بھیجا ہے کہ تین چار آدمی ہر روز اس شہر میں مرنے چاہئیں..... ہمیں امام کے اس حکم پر فوراً" عمل کرنا ہے۔ تم لوگ دو یا تین دنوں بعد خیموں میں رہنے والے تین چار سابق فوجیوں کو رات کے وقت قتل کر دو اور افواہ پھیلا دو کہ انہیں سرکاری فوجیوں نے اپنے محافظوں کے خون کے انتقام میں قتل کیا ہے۔ پھر ایک دو دنوں کا وقفہ دے کر فوج کے دو چار آدمی قتل کر دینا۔ تم خود تجربہ کار ہو' قتل کرنا جانتے ہو اور افواہیں پھیلانا بھی جانتے ہو۔ جاؤ اور یہ بندوبست کرو"۔

گیارہویں صدی عیسوی تھی جب اسلام اپنی تاریخ کے بہت بڑے خطرے میں گھر گیا تھا۔ مؤرخوں نے اسے تاریخ اسلام کا سب سے بڑا خطرہ کہا ہے۔ یہ ویسا ہی خطرہ تھا جیسا آج داستان گو دیکھ رہا ہے۔ دنیائے کفر اسلام کو گھیرے میں لے کر حملہ آور ہو چکی ہے۔ بالکل ایسے ہی حالات حسن بن صباح نے گیارہویں صدی عیسوی میں پیدا کر دیئے تھے۔ یہود و نصاریٰ اس کے ساتھ مل گئے تھے اور اس کی پوری پوری پشت پناہی کر رہے تھے۔ اسے جس قسم کی مدد درکار ہوتی تھی' وہ پیش کرتے تھے۔

سلطنتِ سلجوقیہ کے نیچے لاوا ابل رہا تھا بلکہ پک چکا تھا' اور اب اس آتش فشاں کو پھٹنا تھا..... سلطنتِ سلجوقیہ دراصل اسلامی سلطنت تھی اور یہ اسلام کا مرکز بن گئی تھی۔ جس طرح آج دوست اور دشمن کا' غدار اور وفادار کا کچھ پتہ نہیں چلتا' ایسے ہی اُس دور میں چہروں پر ایسے پردے پڑ گئے تھے کہ نیک و بد کی تمیز ختم ہو گئی تھی۔ سلطنت کا حکمران تو برکیارق تھا لیکن حکومت اس کی بیوی روزینہ کر رہی تھی۔

برکیارق نے اپنی ماں کو اس کے گھر میں نظربند کر دیا تو برکیارق کے دونوں بھائی' محمد اور سنجر' ماں کے پاس گئے اور اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو پہریدار تلواروں اور برچھیوں سے مسلح آ گئے اور دروازے کے باہر کھڑے ہو گئے۔

"یہ کیوں آئے ہیں؟" ——ماں نے پہریداروں کے متعلق بیٹوں سے پوچھا۔

"آپ کے سلطان بیٹے نے آپ کو اس گھر میں نظربند کر دیا ہے" ——محمد نے کہا ——"اور ہمیں کہا ہے کہ ہم اس کا یہ حکم آپ تک پہنچا دیں"۔

ماں پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ اس کے ہونٹ کانپے مگر زبان سے کوئی لفظ نہ

نکلا۔ پھر اُس کی آنکھوں میں آنسو آئے جو اُس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

"آپ اتنی زیادہ پریشان کیوں ہو گئی ہیں؟" —— ہم بڑے بھائی کے غلام تو نہیں.. .. لیکن مقدس ماں!..... ہمیں اپنی آزادی اور غلامی کے ساتھ کوئی غرض نہیں۔ ہم اس سلطنت کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ سلطنت حسن بن صباح کے قبضے میں آچکی ہے۔ حکومت روزینہ کر رہی ہے۔ ہم دونوں بھائیوں کو سلطنت کی حکمرانی نہیں چاہئے بلکہ ہمیں اسلام کی حکمرانی کی ضرورت ہے۔ آپ بالکل خاموش رہیں۔ اب برکیارق کے پاس نہیں جانا۔ ہم یہ سمجھ چکے ہیں کہ ہم نے اپنا بڑا بھائی اس سلطنت کی عظمت پر قربان کر دیا ہے۔ اب ہمیں اجازت دیں کہ کفر کی اس یلغار کے سامنے سینہ سپر ہو جائیں"۔

"اور مادرِ محترم!" —— سنجر نے کہا —— "آپ ہمارے لئے صرف دعا کریں۔ آپ کی دعا ہمارے لئے ایک بڑی ہی مضبوط ڈھال ہو گی۔ ہمیں لڑنا ہے اور آج کے بعد سلطنت سلجوقیہ کی تاریخ خون سے لکھی جائے گی"۔

"میرے مجاہد بچو!" —— ماں نے کہا —— "میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تم جیسے میرے بیس بچے ہوتے تو میں اسلام کی اس سلطنت پر قربان کر دیتی۔ لڑنا ہے تو طریقے سے، عقل سے لڑنا۔ ابو مسلم رازی کو اطلاع دے دو۔ وہ بہت ہی دانشمند آدمی ہے۔ مشورے بھی اچھے دے گا اور ہر طرح کی مدد بھی کرے گا"۔

"اب آپ نے برکیارق کے سامنے نہیں جانا" —— محمد نے کہا —— "اپنے آپ پر غصے کو بھی غالب نہیں آنے دینا۔ اب جو بھی کرنا ہو گا وہ ہم کریں گے"۔

"مزمّل آفندی آئے ہیں" —— پہریدار نے اندر آکر کہا —— "وہ یہاں اندر نہیں آسکتے کیونکہ ہمیں بڑا سخت حکم ملا ہے۔ محترم محمد اور محترم سنجر ان سے مل سکتے ہیں لیکن کسی دوسرے کمرے میں..... میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"تمہارے لئے حکم یہ ہے کہ فوراً اس کمرے میں سے نکل جاؤ" —— محمد اور سنجر کی ماں بولی —— "اور کتوں کی طرح باہر کھڑے رہو"۔

پہریدار کھسیانا سا ہو کر محمد کی طرف دیکھنے لگا۔

"مزمّل آفندی کو دوسرے کمرے میں بٹھاؤ" —— محمد نے کہا —— "ہم آتے ہیں"۔

"مادرِ محترم!" —— پہریدار نے محمد کی ماں کے آگے جھک کر کہا —— "ہم حکم کے

بندے ہیں۔ ہمیں آپ کے خلاف حکم دیا جا سکتا ہے لیکن ہمارے دلوں سے آپ کا احترام نہیں نکالا جا سکتا"۔

ماں نے سر جھکا لیا۔ پہریدار آداب بجالا کر باہر نکل گیا۔ محمد اور سنجر اسی مکان کے ایک اور کمرے میں چلے گئے۔ مزمل آفندی اس کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

○

برکیارق اور روزینہ کے پاس سلطنت کا وزیرِ اعظم عبدالرحمان سمیری بیٹھا ہُوا تھا۔ کچھ دیر پہلے برکیارق نے سپہ سالار ابو جعفر حجازی کو کچھ حکم دیئے تھے اور پھر اپنی ماں کی نظربندی کا حکم بھی دیا تھا تو روزینہ نے کہا تھا کہ وہ اپنے وزیرِ اعظم کو بلا کر یہ سارے احکام لکھوا دے اور اسے کہے کہ ان کی تعمیل کی نگرانی وہ کرے۔

"آپ ہر مسئلہ اپنے سر لے لیتے ہیں" —— روزینہ نے کہا تھا —— "آپ آخر ایک انسان ہیں۔ ساری سلطنت کا درد اپنے دل میں بھر کر آپ کو سکون اور چین کیسے مل سکتا ہے۔ آپ کا روحانی سکون تو آپ کی ماں نے اور بھائیوں نے مل کر تباہ کر دیا ہے۔ میں تو انہیں کہنا چاہتی تھی کہ آؤ تم سلطانی کی گدی پر بیٹھ جاؤ اور ذرا سلطنت کا کاروبار چلا کر دکھاؤ۔ یہ آپ کی ہی دیانتداری اور خلوص ہے کہ آپ ان پہاڑوں سے ٹکرا رہے ہیں..... اتنا پریشان نہ ہوں میں اپنا خون آپ کی رگوں میں ڈال دوں گی"۔

برکیارق نے ایک بازو لمبا کر کے روزینہ کی کمر میں ڈالا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

تھوڑی دیر بعد روزینہ نے ہی دربان کو بلا کر کہا تھا کہ وزیرِ اعظم کو فوراً بلا لاؤ۔

وزیرِ اعظم عبدالرحمان سمیری فوراً پہنچ گیا۔ برکیارق نے اسے بتایا کہ آج کیا ہُوا ہے اور اس نے کیا احکام جاری کئے ہیں۔

"ان امور اور مسائل کی نگرانی آپ نے کرنی ہے" —— برکیارق نے کہا —— "ان احکام کی تعمیل میں یہ نہیں دیکھنا کہ یہ خاتون میری ماں ہے یا وہ لڑکے میرے بھائی ہیں۔ کسی کی حیثیت کا خیال نہیں رکھنا"۔

"سلطانِ محترم!" —— وزیرِ اعظم سمیری نے کہا —— "میں صرف آپ کو جانتا ہوں۔ اگر آپ مجھے حکم دیں گے کہ اپنے ایک بیٹے کا سر کاٹ کر پیش کرو تو میں آپ کا یہ حکم بلا حیل و حجت پورا کروں گا"۔

"آپ دیکھ رہے ہیں کہ سلطان کس قدر تھکے تھکے لگتے ہیں" —— روزینہ نے کہا

—"ان کا چہرہ کس طرح اتر گیا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ اور بولیں۔ میں آپ کو بتاتی ہوں کہ انہوں نے آج کیا احکام جاری کئے ہیں۔ یہ تو آپ کو پتہ چل گیا ہو گا کہ سالار اوریزی کو قید خانے میں بند کرنے کے لئے لے جایا جا رہا تھا تو راستے میں محافظوں پر حملہ ہو گیا اور حملہ آور محافظوں کو قتل کر کے سالار اوریزی کو چھڑا کر لے گئے ہیں"۔

"یہ خبر مجھ تک پہنچ چکی ہے" — وزیر اعظم سیمری نے کہا — "میں نہیں جانتا کہ سلطان محترم نے کیا فیصلہ صادر فرمایا ہے' اگر ان کی جگہ میں ہوتا تو اوریزی اور اس کے حامیوں کو فوری طور پر سزائے موت دیتا۔ یہ غداری ہے"۔

"سلطانِ نے یہ حکم دیا ہے" — روزینہ نے کہا — "آج سے تیسری رات ان خیموں کو محاصرے میں لے لیا جائے جن میں ہر طرف کئے جانے والے فوجی رہتے ہیں پھر ایک ایک خیمے میں جا کر انہیں بیدار کیا جائے گا اور ایک جگہ اکٹھا کر کے شناخت کی جائے گی کہ حملہ آور کون کون تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ اوریزی کو انہی میں سے چند ایک آدمیوں نے رہا کروایا ہے۔ اس کارروائی کا باقاعدہ منصوبہ تیار کر لیں۔ اس میں ناکامی نہیں ہونی چاہئے...... اس کے ساتھ ہی اوریزی کو ڈھونڈنا ہے۔ آپ کے پاس جاسوس ہیں اور مخبر بھی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ مفرور اور روپوش مجرم کو کس طرح ڈھونڈا جاتا ہے"۔

"یہ آپ مجھ پر چھوڑیں سلطانِ عالی مقام!" — وزیر اعظم سیمری نے کہا — "میں اس غدار کو زمین کی ساتویں تہہ میں سے بھی نکال لاؤں گا۔ آپ آگے فرمائیں"۔

"میں نے اپنی ماں کو اس کے گھر میں نظر بند کر دیا ہے" — برکیارق نے کہا — "دراصل میری ماں نے ہی لوگوں کو بھڑکایا تھا کہ اوریزی کو ناحق قید کیا جا رہا ہے۔ وہ میری ماں نہ ہوتی تو میں اُسی وقت اسے جلّاد کے حوالے کر دیتا۔ آپ نے یہ نگرانی کرنی ہے کہ میری ماں تک میرے دونوں بھائیوں کے سوا کوئی نہ جائے"۔

"یہ آپ کے کردار کی بلندی ہے سلطانِ محترم!" — وزیر اعظم سیمری نے کہا — "یہ آپ کے ایمان کی پختگی ہے کہ آپ اس قسم کی ماں کا اتنا احترام کر رہے ہیں۔ گستاخی نہ ہو اور آپ معاف کر دیں تو کہوں کہ آپ کی ماں میں وہ جذبہ اور وہ عظمت نہیں جو آپ کے والد مرحوم سلطان ملک شاہ میں تھی۔ آپ اپنے والد مرحوم کے صحیح جانشین ہیں"

"آپ دانشمند ہیں" — برکیارق نے وزیر اعظم سے کہا — "مجھے معلوم ہے کہ میری ماں آپ کا بہت احترام کرتی ہے۔ آپ اس کے پاس جائیں اور اسے اور دونوں بھائیوں کو کچھ پند و نصیحت کریں کہ وہ میرے لئے مشکلات پیدا نہ کریں اور میرے ساتھ تعاون کریں۔ وہ میری نہیں مانتے"۔

"بات کچھ اور ہے" — روزینہ نے کہا — "سلطان برکیارق نے مجھے بے سہارا اور یتیم سمجھ کر میرے ساتھ شادی کر لی ہے۔ ان کی ماں کو ان کا یہ فیصلہ اچھا نہیں لگا۔ وہ یہ تو سمجھ ہی نہیں رہیں کہ میں سلطان کی بیوی کم' لونڈی زیادہ ہوں۔ میں تو ان کی خدمت کے لئے اور ان کو سکون دینے کے لئے اپنی زندگی وقف کر چکی ہوں"۔

"میں سب سمجھتا ہوں" — وزیر اعظم سیمری نے کہا — "آپ سلطان کے لئے بہت ایثار کر رہی ہیں۔ سلطانِ محترم! آپ نے جو احکام آج صادر فرمائے ہیں' میں انہیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ میں آپ کی والدہ اور بھائیوں کے پاس جا رہا ہوں۔ میں جاتا ہوں اور برملا کہوں گا کہ آپ کی والدہ کا دماغ چل گیا ہے۔ میں سلطنت کی بقا اور سلامتی کا واسطہ دے کر انہیں اور آپ کے بھائیوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ میری بات سن لیں گے"۔

سلطان برکیارق نے وزیر اعظم کو جانے کی اجازت دے دی۔ وزیر اعظم جانے لگا تو اس نے برکیارق کی نظر بچا کر روزینہ کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ وہ باہر نکلا تو روزینہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ کچھ آگے جا کر دونوں ایک کمرے میں چلے گئے۔

"کوئی خاص بات ہے؟" — روزینہ نے وزیر اعظم سے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"سلطان بہت ہی پریشان ہیں" — وزیر اعظم نے کہا — "میں جانتا ہوں کہ آپ ان کا بہت زیادہ اور ہر وقت خیال رکھتی ہیں لیکن انہیں مزید سکون اور اطمینان کی ضرورت ہے۔ میں آپ کے جذبۂ ایثار کی تعریف کر ہی نہیں سکتا' پھر بھی میں آپ سے کہتا ہوں کہ سلطان کو اور زیادہ سکون اور سہارے کی ضرورت ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ماں اور بھائیوں نے ان کی پریشانیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ میں یہی کچھ کر سکتا ہوں کہ سلطان کی ذمہ داریاں خود سنبھال لوں لیکن گھر میں آپ نے ان کا خیال رکھنا ہے جو آپ رکھ ہی رہی ہیں...... میں نے بس اتنی سی بات کہنی تھی"۔

"مجھے آپ کے ہی تعاون کی ضرورت ہے" — روزینہ نے کہا اور وزیرِاعظم سمیری کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر چوم لیا۔

وزیرِاعظم عبدالرحمان سمیری نے مشفق باپ کی طرح روزینہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور چلا گیا۔

○

جس وقت وزیرِاعظم سمیری سلطان برکیارق سے اس کے احکام اور روزینہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا' اُسی وقت مزمل آفندی محمد اور سنجر کے پاس بیٹھا انہی مسائل پر باتیں کر اور سن رہا تھا۔ اسے خبر ملی تھی کہ سالار اوریزی کو کچھ حملہ آوروں نے رہا کرا لیا ہے تو اُسی وقت محمد اور سنجر کے پاس آ گیا تھا۔ محمد نے اسے بتایا کہ برکیارق نے ماں کو نظربند کر دیا ہے۔

"برکیارق نہ کہو" — مزمل آفندی نے کہا — "روزینہ کہو..... سلطان برکیارق کی حیثیت اتنی ہے کہ وہ سلطان ہے۔ فیصلے روزینہ کرتی ہے..... یہ بات کوئی نئی نہیں' میں بات کرنے آیا ہوں کہ سالار اوریزی کی رہائی ہمارے لئے بہت ہی خوشگوار بات ہے۔ اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ ہمارا محاذ مضبوط ہے۔ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ آگے کیا کرنا ہے۔ مجھے پتہ چل جائے کہ سالار اوریزی کہاں روپوش ہے تو میں اُس کے پاس چلا جاؤں گا اور اس سے پوچھوں گا کہ ادھر ہم کیا کریں"۔

وہ خاصی باتیں کر چکے تھے اور اب یہ سوچ رہے تھے کہ کیا کیا جائے کہ وزیرِاعظم عبدالرحمان سمیری کمرے میں داخل ہُوا۔ اسے دیکھ کر مزمل' محمد اور سنجر تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ وزیرِاعظم نے تینوں سے ہاتھ ملایا اور سب بیٹھ گئے۔

"کہو لڑکو!" — وزیرِاعظم سمیری نے پوچھا — "کیا باتیں ہو رہی ہیں..... مزمل! تمہیں بڑے عرصے بعد دیکھا ہے"۔

"آپ تو جانتے ہیں کہ ہم کیا باتیں کر رہے ہوں گے" — محمد نے کہا — "سالار اوریزی کی رہائی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مزمل اس سلسلے میں آیا ہے۔ اچھا ہُوا آپ بھی آ گئے۔ نہ آتے تو میں آپ کے پاس آ جاتا"۔

"سلطان نے طلب فرمایا تھا" — وزیرِاعظم نے کہا — "انہوں نے اپنے وہ احکام اور فیصلے مجھے سنائے ہیں جو انہوں نے آج صادر فرمائے ہیں۔ آپ کی والدہ محترمہ

کو نظربند کر دیا گیا ہے۔ یہ تو کہنے والی بات ہی نہیں نہ کہنے کی مزید ضرورت ہے کہ روزینہ نے تو سلطان کو بولنے ہی نہیں دیا..... ایک حکم مجھے اور ملا ہے۔ وہ یہ کہ میں تم دونوں اور آپ کی والدہ کو سمجھاؤں کہ آپ سب سلطان سے تعاون کریں اور ان کے لئے مزید پریشانیاں پیدا نہ کریں"۔

"آج اپنی ماں کو نظربند کیا ہے" — مزمل نے کہا — "کچھ دنوں بعد دونوں بھائیوں کو سزائے موت دے دے گا"۔

"وہاں تک نوبت نہیں پہنچنے دی جائے گی" — وزیرِاعظم نے کہا — "میں زندہ اور سلامت موجود ہوں۔ میں سلطان اور سلطانہ کی جڑوں میں بیٹھا ہُوا ہوں۔ اگر تم لوگ مجھے ان کے ساتھ باتیں کرتے اور ان کی باتیں سنتے دیکھو اور میں وہاں جو غلامانہ حرکتیں کرتا ہوں' تم دیکھ لو تو میرے ساتھ بات کرنا بھی گوارہ نہ کرو۔ تم کہو گے کہ یہ تو کوئی خاندانی غلام ہے لیکن میں نے دونوں کو اپنی مُٹھی میں لے رکھا ہے۔ روزینہ تو میری مرید بن گئی ہے۔ اب یہ سوچنا ہے کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔ اوریزی کی رہائی ہمارے محاذ کی بہت بڑی کامیابی ہے"۔

"میں صرف ایک بات جاننا چاہتا ہوں" — مزمل نے کہا — "اوریزی کہاں روپوش ہے؟ میں اُس تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ اُس سے ہدایات لینی ہیں کہ میں کیا کروں"۔

"آج رات کو نہیں تو کل تک مجھے یہ پتہ چل جائے گا" — "وزیرِاعظم سمیری نے کہا — "تم نے اُس سے کوئی ہدایت نہیں لینی نہ اُس کے پاس جانا ہے۔ سلطنت کے سرکاری مخبر اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کے پیچھے پیچھے وہاں تک پہنچ جائیں۔ تم لوگوں کو اب جو ہدایات ملیں گی وہ مجھ سے ملیں گی"۔

"بات یہ ہے محترم!" — محمد نے کہا — "مزمل بہت ہی بیتاب ہو رہا ہے کہ باطنیوں کے خلاف کسی جارحانہ کارروائی میں شامل ہو"۔

"بیتاب نہیں ہونا مزمل!" — وزیرِاعظم نے کہا — "اپنے آپ کو ٹھنڈا رکھنا ہے اور جذبات کو قابو میں رکھنے کی شدید ضرورت ہے..... میری ایک بات غور سے سن لو۔ تم ابھی اُن جنگوں کو ذہن میں لئے لئے پھرتے ہو جو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑی تھیں اور پھر حضرت خالدؓ بن ولید' سعدؓ بن ابی وقاص اور ان جیسے سپہ سالاروں

نے لڑی تھیں۔ ہمارے دلوں میں وہ عسکری روایات تو زندہ موجود ہیں لیکن اب جس جنگ کا ہمیں سامنا ہے وہ ان غزوات اور بعد کی لڑائیوں سے بالکل ہی مختلف ہے۔ ہماری روایت تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے کفار کا مقابلہ میدانوں میں کیا ہے۔ ایک ہزار کو تین سو تیرہ نے اور سوا لاکھ کے لشکر کو صرف چالیس ہزار کے لشکر نے شکستیں دی تھیں۔ انہوں نے رومیوں اور فارسیوں کو ہر میدان میں شکست دی۔ وہ آمنے سامنے کی لڑائیاں تھیں لیکن اب ہمارا پالا جس دشمن کے ساتھ پڑا ہے وہ میدان میں نہیں آ رہا بلکہ زمین کے نیچے سے وار کر رہا ہے۔ مسلمان اس قسم کی جنگ سے واقف نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج یہ سلطنت ایک بھیانک خطرے میں پڑ گئی ہے۔ شاید تم جانتے ہو گے کہ اس شہر میں بے شمار باطنی پہنچ چکے ہیں اور ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان میں حسن بن صباح کے فدائی بھی ہیں جو صرف یہ جانتے ہیں کہ قتل کر کے قتل ہو جانا ہے۔ ہمیں اب زمین کے اوپر بھی لڑنا ہے اور زمین کے نیچے بھی"۔

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں" —— مزمل نے کہا —— "جس طرح حسن بن صباح نے روزینہ کو بڑی ہی حسین اور زہریلی ناگن بنا کر سلطنت کی بالائی سطح پر پہنچا دیا ہے اسی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ ایسی ہی ایک ناگن وہاں بھیجی جائے جو روزینہ کا زہر مار ڈالے"۔

"ایسی ناگن کہاں سے لاؤ گے؟" —— وزیراعظم نے پوچھا۔

"وہ میرے پاس ہے" —— مزمل نے جواب دیا —— "اس کا نام شمونہ ہے۔ محمد اور سنجر اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ بڑا اچھا اتفاق ہے کہ برکیارق نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ حسن بن صباح کی تربیت یافتہ لڑکی ہے اور اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ حسن بن صباح اور باطنیوں کے خلاف دل میں انتقام کی آگ لئے پھرتی ہے"۔

"میں اسے جانتا ہوں" —— وزیراعظم نے کہا —— "اسے دیکھا بھی ہے۔ شکل و صورت اور جسم کی کشش کے لحاظ سے وہ موزوں لڑکی ہے لیکن ایسی کارروائیاں کرنے سے پہلے ہمیں بہت کچھ سوچنا پڑے گا"۔

"آپ نے اسے صرف دیکھا ہے" —— مزمل نے کہا —— "اس کے انتقامی جذبے کا اندازہ اس سے کریں کہ اُس کے دل میں میری محبت موجزن ہے اور وہ فیصلہ کر چکی ہے کہ شادی میرے ساتھ ہی کرے گی۔ اُس کی ماں بھی ہمارے ساتھ ہے لیکن شمونہ

کہتی ہے کہ میں جب تک حسن بن صباح پر انتقامی وار نہ کر لوں، شادی نہیں کروں گی۔ اگر آپ کہیں تو وہ بڑے آرام سے روزینہ کو زہر دے کر یا ویسے کسی ہتھیار سے اسے قتل بھی کر آئے گی"۔

"میں پھر یہی کہوں گا کہ اسے استعمال کریں گے لیکن سوچ سمجھ کر" —— وزیراعظم نے کہا —— "ابھی میں نے ایک خفیہ کارروائی کرنی ہے۔ وہ تم تینوں اچھی طرح سن لو۔ آج سے تیسری رات اُن خیموں کو فوج محاصرے میں لے گی جن میں برطرف کئے جانے والے فوجی رہتے ہیں۔ سلطان نے مجھے بتایا ہے کہ ان خیموں کی بستی کو محاصرے میں لے کر تمام سابق فوجیوں کو جگایا اور اکٹھا کیا جائے گا۔ اوریزی کو قید خانے لے جانے والے محافظوں میں سے جو ایک بچ گیا ہے وہ ان آدمیوں میں سے حملہ آوروں کو شناخت کرے گا۔ بعض کو سپہ سالار حجازی شناخت کرے گا۔ صاف ظاہر ہے جو پکڑے جائیں گے، انہیں اگلے ہی روز سزائے موت دے دی جائے گی۔ میں نے یہ بندوبست کرنا ہے کہ ایسا کوئی آدمی نہ پکڑا جائے"۔

"اس کارروائی میں ایک خطرہ اور بھی ہے" —— محمد نے کہا —— "سپہ سالار حجازی اتنا بدطینت آدمی ہے کہ وہ ویسے ہی پندرہ بیس آدمیوں کو الگ کر کے کہہ دے گا کہ یہ تھے وہ حملہ آور اور اگلے روز ان کے سر کٹوا دے گا..... ہمارے پاس ان لوگوں کو بچانے کا کوئی انتظام نہیں"۔

"میں کچھ نہ کچھ بندوبست کر لوں گا" —— وزیراعظم نے کہا —— "اگر میرا انتظام ناکام رہا تو میں ایسی خفیہ کارروائی کراؤں گا کہ جب ان لوگوں کو سزائے موت کے لئے لے جائیں گے تو انہیں رہا کرا لیا جائے..... اصل بات یہ ہے کہ اب خون خرابہ ہو کر رہے گا۔ میرے آدمی فوج میں بھی موجود ہیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ جاسوسی اور مخبری کا میں نے اپنا ایک ذاتی نظام بھی قائم کر رکھا ہے"۔

"ان حالات اور واقعات کی پوری اطلاع رے پہنچنی چاہئے" —— محمد نے کہا —— "ابو مسلم رازی نے مجھے خاص طور پر کہا تھا کہ حالات میں کوئی ذرا سی بھی اچھی یا بُری تبدیلی آئے، انہیں فوراً اطلاع ملنی چاہئے"۔

"ہاں، یہ بہت ہی ضروری ہے" —— وزیراعظم نے کہا —— "کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ مزمل ابھی روانہ ہو جائے؟ میں اپنا آدمی اتنی دور نہیں بھیجوں گا۔ میرے خاص اور خفیہ

آدمی دوسرے کاموں میں لگے ہوئے ہیں"۔

"میں ابھی روانہ ہو جاتا ہوں" ——— مزمّل نے کہا ——— "حالات اور واقعات مجھے معلوم ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہاں اور کیا بات کرنی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ فوجی نہتے ہیں جنہیں فوج سے برطرف کیا جا رہا ہے۔ ان کے لئے ہتھیاروں اور گھوڑوں کا انتظام کرنا ہے۔ ہماری یہ ضرورت ابو مسلم رازی ہی پوری کر سکتے ہیں"۔

"وہ تو ہر طرح کی مدد دینے کا وعدہ کر چکے ہیں" ——— محمد نے کہا ——— "انہوں نے تو یہاں تک کہا تھا کہ وہ اپنی پوری فوج یہاں بھیج دیں گے"۔

"پھر میں چلتا ہوں!" ——— مزمّل نے کہا ——— "آپ شمونہ پر غور کریں۔ وہ کسی طرح سلطان اور روزینہ تک پہنچ جائے تو اور کوئی شدید کارروائی کرے نہ کرے، جاسوسی اور مخبری تو کرے گی ہی، یہ بھی تو ہماری ضرورت ہے"۔

"تم واپس آ جاؤ تو یہ بات بھی کر لیں گے" ——— وزیرِ اعظم سمیری نے کہا ——— "یہ کام کرنا ہی پڑے گا..... تم جاؤ تیار ہو کر روانہ ہو جاؤ..... خالی ہاتھ نہ چل پڑنا۔ تمہارے پاس دو یا تین ہتھیار ہونے چاہئیں اور گھوڑا کمزور نہ ہو"۔

○

اُسی رات کا واقعہ ہے، برطرف کئے جانے والے فوجیوں کے خیموں سے ذرا ہی پرے تین آدمی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک آدمی اٹھا اور خراماں خراماں کچھ دُور تک چلا گیا۔ وہ ایک جگہ رکا، پھر واپس ہوا اور اپنے ساتھیوں میں جا بیٹھا۔

اس کیمپ میں خیموں کی تعداد کچھ کم نہیں تھی۔ بارہ چودہ ہزار آدمی رہتے تھے۔ ہر خیمے میں پانچ چھ آدمیوں کی رہائش تھی۔

آدھی رات کے کچھ وقت بعد کسی خیمے میں سے ایک آدمی اٹھا اور خیموں کی بستی میں سے باہر نکل گیا۔ وہ پیشاب کرنے گیا تھا۔ وہ ایک جگہ رکا ہی تھا کہ اچانک پیچھے سے ایک آدمی نے جھپٹ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور پیشتر اس کے کہ اسے پتہ چلتا کہ یہ کون ہے کہ ایک خنجر اُس کے سینے میں اُس جگہ اُتر گیا جہاں دل ہوتا ہے۔ یہ خنجر وہاں سے نکلا اور ایک بار پھر اس کے سینے میں داخل ہو گیا۔ اُس کے منہ پر ہاتھ رکھا گیا تھا اس لئے اس کی آواز نہیں نکلی تھی۔ وہ گرا اور مر گیا۔

وہ تینوں آدمی اس کی لاش وہیں چھوڑ کر ایک اور طرف چلے گئے اور ایک جگہ

چھپ کر بیٹھ گئے۔

"آج رات کم از کم تین آدمی مارنے ہیں" ——— "ان تینوں میں سے ایک نے کہا۔

"انہیں خاصی دیر انتظار کرنا پڑا۔ پھر ایک اور آدمی خیمے میں سے باہر نکلتا نظر آیا۔ یہ تینوں قاتل دبے پاؤں سرکتے، جھکے ہوئے اور نہایت آہستہ آہستہ چلتے اس آدمی کے عقب میں پہنچ گئے۔ اس آدمی کو بھی انہوں نے اسی طرح قتل کیا اور اس کی لاش وہیں پھینک کر دوسری طرف جھاڑیوں کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے۔ کسی اوٹ میں بیٹھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ رات تاریک تھی۔

اس طرح صبح کاذب تک انہوں نے تیسرے آدمی کو بھی قتل کیا اور وہاں سے چلے گئے۔ انہوں نے آبادی میں جا کر ایک دروازے پر دستک دی۔ اندر سے بلّی کی میاؤں کی آواز آئی۔ باہر کھڑے تین میں سے ایک آدمی نے اسی طرح بلّی کی آواز میں میاؤں کیا اور دروازہ کھل گیا۔ تینوں اندر گئے اور دروازہ پھر بند ہو گیا۔ دروازہ کھولنے والا انہیں ایک کمرے میں لے گیا اور دیا جلایا۔

"تمہارے کپڑے بتا رہے ہیں کہ تم کام کر آئے ہو" ——— اس آدمی نے کہا اور پوچھا ——— "کتنے؟"

"تین!" ——— ایک نے جواب دیا ——— "آج رات اتنے ہی کافی ہیں"۔

"ہاں، امام کے نام پر آج کی رات اتنے ہی کافی ہیں" ——— اس آدمی نے کہا ——— "باقی قتل و غارت وہ خود ہی آپس میں کر لیں گے..... اب تم سو جاؤ۔ اگلا کام کرنے والے جلدی اٹھ جائیں گے۔ انہیں میں اطلاع دے دوں گا"۔

یہ اُس طبیب کا گھر تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس کے ہاتھ میں شفا ہے۔ اسی نے اپنے آدمیوں کو یہ حکم سنایا تھا کہ الموت سے امام کا حکم آیا ہے کہ مرتد کو خون میں ڈبو دو۔ ہر روز تین چار آدمی قتل ہونے چاہئیں۔

○

اگلی صبح خیموں کی اس بستی میں جب یہ خبر پہنچی کہ ان کے تین ساتھی باہر مرے پڑے ہیں اور انہیں خنجر لگے ہیں تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہزارہا سابق فوجی اکٹھے ہو گئے۔ راہ جاتے لوگ بھی وہیں رک گئے۔ شہر میں خبر پہنچی تو لوگ اُدھر ہی کو اُٹھ دوڑے۔

ایک آواز اٹھی کہ فوجیوں نے یعنی اُن فوجیوں نے جنہیں فوج میں رکھا جا رہا تھا،

اپنے عہدے دار کے خون کا بدلہ لیا ہے۔ یہ آواز ہوا کے تیز جھونکے کی طرح ہر طرف پھیل گئی اور ذرا سی دیر میں یہی بات ہر کسی کی زبان پر تھی کہ حاضر فوجیوں نے سابق فوجیوں کے تین بندے مار ڈالے ہیں۔

داستان گو پہلے سنا چکا ہے کہ فوج میں رہنے والے ایک عہدے دار کی لاش ملی تھی اور یہ یقین کر لیا گیا تھا کہ فوج میں سے نکالے جانے والے دو آدمیوں نے اسے قتل کیا ہے۔ سپہ سالار حجازی نے ویسے ہی کسی ثبوت اور شہادت کے بغیر سابق فوجیوں کے دو آدمی پکڑ جلاّدوں کے حوالے کر دیئے تھے۔ اس سے ایسا فساد اٹھا جو خانہ جنگی کی صورت اختیار کر گیا۔

سپہ سالار ابو جعفر حجازی کو اطلاع ملی تو وہ اپنے محافظوں کو ساتھ لئے گھوڑا دوڑاتا پہنچا۔ خیموں میں رہنے والے سابق فوجیوں نے اسے گھیر لیا۔ اس قدر شور و غل اور احتجاج کا ایسا ہنگامہ کہ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ سپہ سالار حجازی نے بڑی مشکل سے سب کو خاموش کروایا اور کہا کہ کوئی ایک ذمہ دار آدمی بات کرے۔

"میں بات کرتا ہوں" — ایک نائب سالار سب کی نمائندگی میں بولنے لگا۔ اسے بھی فوج سے برطرف کیا جا رہا تھا اور وہ ان ہی خیموں میں رہتا تھا۔ اس نے کہا — "حاضر نوکری کا ایک عہدے دار قتل ہو گیا تو ہمارے دو آدمیوں کو ویسے ہی پکڑ لیا گیا تھا۔ اب ہمارے تین آدمی قتل ہو گئے ہیں، حاضر فوجیوں کے چھ آدمی پکڑ کر ہمارے سامنے جلاّدوں کے حوالے کیے جائیں"۔

سپہ سالار حجازی نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ وہ سلطان کے پاس جا رہا ہے اور وہاں سے حکم لے کر واپس آئے گا۔

حجازی سلطان برکیارق کے پاس جانے کی بجائے وزیرِ اعظم عبدالرحمٰن سمیری کے پاس چلا گیا اور اُسے بتایا کہ پہلے اُدھر سے ایک آدمی قتل ہُوا تھا اور اب اِدھر سے خیموں میں رہنے والے تین آدمی قتل ہو گئے ہیں۔ وزیرِ اعظم نے سپہ سالار حجازی کو ساتھ لیا اور دونوں سلطان برکیارق کے پاس چلے گئے۔ اسے نئی واردات سنائی۔

"سلطانِ عالی مقام!" — سپہ سالار حجازی نے کہا — "میں تو یہ سمجھا ہوں کہ حاضر اور برطرف فوجیوں میں دشمنی پیدا ہو گئی ہے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ برطرف شدہ فوجیوں کو فارغ کر کے گھروں کو بھیج دیا جائے"۔

"ایسا ہرگز نہ کرنا" — وزیرِ اعظم نے کہا — "یہاں وہ نہتے پڑے ہیں انہیں فارغ کیا گیا تو یہ ہتھیار اٹھا لیں گے اور بڑا ہنگامہ ہو گا"۔

وزیرِ اعظم سمیری نے یہ جو مشورہ دیا تھا' اس سے اس کا مقصد کچھ اور تھا۔ اس کا جو منصوبہ تھا' اس کے مطابق وہ ان سابق فوجیوں کو یہیں رکھنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی خفیہ فوج تھی جسے اس نے خانہ جنگی کی صورت میں سلطان کی فوج کے خلاف استعمال کرنا تھا۔ اس نے سلطان برکیارق سے منوالیا کہ انہیں ابھی یہاں سے جانے نہیں دیا جائے گا۔

اُدھر خیموں میں رہنے والے سابق فوجی للکار رہے تھے کہ وہ اپنے مقتولوں کا بدلہ لیں گے۔ شہر میں بھی یہی افواہ گردش کر رہی تھی کہ حاضر فوجیوں نے سابق فوجیوں کے تین آدمی قتل کر دیئے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ یہ غلط ہے۔ بعض جگہوں پر شہری ایک دوسرے سے الجھ بھی پڑے۔

ابھی کسی کے ذہن میں شک تک نہیں آیا تھا کہ یہ آگ لگانے والے باہر کے لوگ ہیں اور وہ ایسی صورتِ حال پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ہو چکی ہے۔ یہ افواہیں حسن بن صباح کے آدمی پھیلا رہے تھے۔

سپہ سالار حجازی کے ساتھ وزیرِ اعظم بھی خیموں کی بستی میں گیا اور اس نے بڑی مشکل سے ان لوگوں کو ٹھنڈا کیا اور کہا کہ قاتل بچ کر نہیں جائیں گے۔

○

حسن بن صباح کا ڈنکا دُور دُور تک بجنے لگا تھا۔ اس کی مقبولیت بڑی تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی۔ اس تبلیغ کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ وہ کسی قبیلے کے سردار کو حُوروں جیسی حسین لڑکیوں اور حشیش کے ذریعے اپنے دامِ کفر میں پھانس لیتا تھا۔ پھر اسے یہ تاثر دیتا کہ اسے اسلام سے خارج نہیں کرایا جا رہا بلکہ اسلام کے دائرے میں لایا جا رہا ہے۔ حسن بن صباح نے جو دائرہ بنا رکھا تھا' اسے وہ اسلام ہی کہتا تھا لیکن اس میں ہر گناہ کی کھلی اجازت تھی۔ قبیلے کے اس سردار کو وہ ذہنی اور رُوحانی طور پر اپنی بڑی ہی خوبصورت اور چمکتی ہوئی زنجیروں میں جکڑ لیتا اور پھر اس سے اس قبیلے کو حکم دلواتا کہ وہ سب باطنی عقیدے کے قائل ہو جائیں اور حسن بن صباح کو اپنا امام یا نبی مان لیں۔

اگر کسی قبیلے کے سردار نے اس کی مخالفت کرنے کی کوشش کی تو اسے حسن بن صباح نے اپنے فدائین کے ہاتھوں قتل کروا ڈالا۔ پھر اس قبیلے کو ایسے شعبدے دکھائے

کہ لوگوں نے اس کی امامت کو تسلیم کر لیا۔ اس کے ابلیسی عقائد کے فروغ اور مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا راستہ روکنے والا کوئی نہ تھا۔ اسے صرف سلطنتِ سلجوقیہ کی طرف سے خطرہ تھا لیکن اس کے ابلیسی دماغ نے ایسی زمین دوز چالیں چلیں کہ اس سلطنت کے حکمران طبقے کو آپس میں ہی ٹکرا دیا اور وہاں خانہ جنگی کا بیج بو ڈالا جو پھوٹ کر باہر نکلا اور ہرا بھرا ہو کر پھیل رہا تھا۔ اصفہان تو باطنیوں کا ہی شہر بنتا جا رہا تھا۔

پھر وہ رات آئی جس رات فوج نے ہر طرف کیے ہوئے فوجیوں کے خیموں کو محاصرے میں لینا اور خیموں میں سوئے ہوئے آدمیوں کو جگا کر ایک جگہ کھڑا کرنا تھا۔ آدھی رات کا وقت ہو گا جب وزیرِ اعظم عبدالرحمٰن سمیری اور سپہ سالار ابو جعفر حجازی فوجیوں کی بارکوں میں پہنچ گئے۔ فوج کو بتا دیا گیا تھا کہ رات کو خیموں کے پورے علاقے کو محاصرے میں لینا ہے۔ فوجیوں کو بڑی سختی سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ باہر کے کسی بھی شخص کو نہ بتائیں کہ آج رات کیا ہونے والا ہے۔

فوج تیار ہو کر باہر ایک ترتیب میں کھڑی تھی۔ پہلے وزیرِ اعظم سمیری نے ان فوجیوں سے خطاب کیا۔ اس نے کہا کہ عہدے دار کے قاتل اور اوریزی کو محافظوں سے رہائی دلانے والے انہی آدمیوں میں سے ہیں۔ انہیں شناخت کرنا ہو گا پھر سپہ سالار حجازی نے فوجیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے چند ایک باتیں کیں۔

فوج چل پڑی۔ اس فوج کے پاس تلواریں بھی تھیں اور برچھیاں بھی۔ بعض سپاہیوں کے پاس مشعلیں بھی تھیں جنہیں حکم ملنے پر جلانا تھا۔ ان فوجیوں کو یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ یہ کوئی حملہ نہیں بلکہ اس محاصرے کا مطلب کچھ اور ہے اس لئے کسی پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے اور کسی کو قتل نہ کیا جائے۔ فوجی خود بھی جانتے تھے کہ جنہیں وہ محاصرے میں لینے جا رہے ہیں وہ نہتے ہیں اور برچھیوں اور تلواروں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں۔

یہ فوجی پیدل جا رہے تھے۔ ان کی بارکیں شہر کے ایک طرف تھیں اور خیمے شہر کے دوسری طرف اور شہر سے ہٹ کر تھے۔ فوجیوں نے مکمل خاموشی اختیار کر کے جانا تھا تاکہ جنہیں "محاصرے میں لینا تھا" وہ بیدار نہ ہو جائیں۔ سپہ سالار حجازی ان کے ساتھ تھا۔ وزیرِ اعظم پیچھے رک گیا تھا۔ اس نے اس کارروائی کی نگرانی کرنی تھی۔

فوج خیمہ گاہ سے کچھ دُور ہی محاصرے کی ترتیب میں ہو گئی اور پھر اس نے خیمہ گاہ

کی طرف پیش قدمی شروع کی خیمہ گاہ کے قریب پہنچ کر جس طرح انہیں پہلے بتا دیا گیا تھا فوج رک گئی۔

صرف ایک مشعل بردار سپاہی کو کہا گیا کہ وہ مشعل جلا لے، یہ سپاہی سپہ سالار حجازی کے ساتھ تھا۔ حجازی نے ہی اسے مشعل جلانے کو کہا تھا۔ یہ ایک اشارہ تھا کہ جس جس سپاہی کے پاس مشعل ہے وہ جلا لیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں مشعلیں جل اُٹھیں اور رات دن میں تبدیل ہو گئی۔ خیموں میں سابق فوجی اتنی گہری نیند سوئے ہوئے تھے کہ کسی ایک کی بھی آنکھ نہ کھلی۔ اگلا اشارہ ملا تو فوجی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ انہیں تلواریں نیاموں سے نکالنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی نہ ہی برچھیاں لڑائی کے انداز میں تان کر آگے بڑھنا تھا کیونکہ یہ حملہ نہیں تھا۔

پہلے خیمے کے پردے اٹھائے گئے اور مشعل کی روشنی میں اندر دیکھا گیا تو وہاں کوئی ایک بھی آدمی نہیں تھا جس خیمے کو بھی دیکھا گیا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

اچانک عقب سے دوڑتے قدموں کی آوازیں اس طرح سنائی دیں جیسے طوفان آ رہا ہو اور اس کے آگے نہ جانے کیا کیا اُڑتا اور بہتا آ رہا ہو۔ پیشتر اس کے کہ فوجی سمجھ پاتے کہ یہ کیا آ رہا ہے، ان پر حملہ ہو گیا۔

حملہ اس نوعیت کا تھا کہ ایک ایک فوجی کو ایک ایک دو دو آدمیوں نے پیچھے سے پکڑ لیا۔ کسی نے کسی فوجی کی تلوار نکال لی اور کسی نے مشعل بردار سپاہی سے مشعل چھین لی۔ یہ بڑی مشعلیں تھیں جو ڈنڈوں کے اوپر کپڑے باندھ کر اور اس پر تیل ڈال کر جلائی گئی تھیں۔ فوجی جو ذرا سنبھل گئے یا بروقت چوکنے ہو گئے تھے، انہوں نے تلواریں نکال لیں اور جن کی تلواریں چھینی گئی تھیں انہوں نے لڑائی کے انداز میں برچھیاں تان لیں۔ اس کے بعد بڑی ہی خونریز جھڑپ ہوئی۔ بعض فوجیوں کو ان سے چھینی ہوئی مشعلوں سے ہی جلا دیا گیا۔ ان کے کپڑوں کو آگ لگی تو وہ اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگے اور جل کر گرتے رہے۔

سپہ سالار حجازی حیران اور پریشان ہو گیا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ اس کے لئے اس صورتِ حال پر قابو پانا ناممکن تھا وہ بارکوں کی طرف بھاگا۔ اس کے دو محافظ اس کے ساتھ تھے۔ دوڑتے دوڑتے وہ بارکوں میں پہنچا اور حکم دیا کہ فوج تیار ہو کر فوراً خیمہ گاہ میں پہنچے۔

یہ حکم دے کر وہ اس جگہ پہنچا جہاں وزیرِ اعظم نے اسے کہا تھا کہ وہ موجود رہے گا۔ اس نے وزیرِ اعظم کو بتایا کہ وہاں تو کچھ اور ہی ہو گیا ہے۔ خیمے خالی تھے اور فوج پر پیچھے سے حملہ ہو گیا۔ حجازی نے یہ بھی بتایا کہ وہ مزید فوج بھیج رہا ہے۔

"میں جان گیا ہوں" ——— وزیرِ اعظم سمیری نے کہا ——— "تمہاری یہ کارروائی راز میں نہیں رہ سکی۔ کسی مخبر نے قبل از وقت خیمہ گاہ میں یہ راز پہنچا دیا ہو گا۔"

وزیرِ اعظم سپہ سالار حجازی کے ساتھ خیمہ گاہ کی طرف چلا گیا۔ خیمہ گاہ سے شعلے اٹھ رہے تھے جن کی روشنی شہر میں آ رہی تھی۔ بعض شہری جاگ اٹھے اور چھتوں پر جا کر دیکھنے لگے کہ یہ آگ کہاں لگی ہوئی ہے۔ سپہ سالار حجازی اور وزیرِ اعظم نے دور سے ہی خیمہ گاہ دیکھ لی۔ وہاں تو باقاعدہ میدانِ جنگ جیسی لڑائی ہو رہی تھی اور شعلے جو اٹھ رہے تھے یہ جلتے ہوئے خیموں کے تھے۔ مشعلیں بھی لڑائی میں ہتھیاروں کے طور پر استعمال ہو رہی تھیں۔ بعض سپاہیوں کے ہاتھوں سے مشعلیں خیموں کے اوپر یا اندر گریں تو چند ایک خیمے جلنے لگے۔

اُدھر سے مزید فوج برچھیوں اور تلواروں سے مسلح سرپٹ دوڑتی آ رہی تھی۔ جب یہ فوج میدانِ جنگ میں پہنچی تو وہاں لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ صرف یہ نظر آیا کہ کچھ آدمی جنگل کی طرف دوڑے جا رہے تھے اور ذرا آگے جا کر غائب ہو گئے۔ کسی فوجی نے ان کا تعاقب نہ کیا۔

سپہ سالار حجازی اور وزیرِ اعظم نے خیمہ گاہ میں جا کر دیکھا۔ وہاں فوج کے زخمی تڑپ رہے تھے اور ان کے ساتھ لاشیں بھی پڑی تھیں۔ یہ لاشیں فوجیوں کی بھی تھیں اور ان کی بھی جو فوجی نہیں تھے۔ کچھ دیر بعد یہ راز کھلا کہ یہ وہ فوجی تھے جنہیں فوج سے نکالا جا رہا تھا اور وہ ان خیموں میں رہتے تھے۔

تاریخ کے مطابق، یہ راز صرف وزیرِ اعظم سمیری کو معلوم تھا کہ یہ ہُوا کیا تھا۔ حملہ تو فوج کرنے گئی تھی لیکن حملہ اُس پر ہو گیا۔ اس لڑائی کے پیچھے وزیرِ اعظم کا اپنا ہاتھ تھا۔

جن مؤرخوں نے یہ واقعہ لکھا ہے وہ اُس دور کے دستاویزی حوالے دے کر لکھتے ہیں کہ برطرف کئے جانے والے فوجیوں میں اوریزی کے علاوہ ایک اور سالار اور ایک نائب سالار اور چند ایک تجربہ کار عہدے دار تھے۔ وزیرِ اعظم سمیری نے انہیں وقت سے خاصا پہلے اپنے مخبروں کے ذریعے بتا دیا تھا کہ آج رات آدھی رات کے وقت انہیں محاصرے

لے کر جگایا جائے گا اور ان میں سے ان آدمیوں کو شناخت کیا جائے گا جنہوں نے اوریزی کو رہا کرایا تھا۔

وزیرِ اعظم سمیری نے انہیں یہ طریقہ بتایا تھا کہ جب سارا شہر سو جائے تو یہ تمام برطرف شدہ فوجی ایک ایک دو دو کر کے خیمہ گاہ سے نکل جائیں اور قریب ہی کہیں جا کر چھپ جائیں۔ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اتنے تھوڑے سے وقت میں پندرہ سولہ ہزار تلواریں فراہم نہیں کی جا سکتی تھیں۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ فوج اپنی تلواریں نیاموں میں رکھے گی اور فوج کا ارادہ لڑائی کا نہیں ہو گا۔ سابق فوجیوں کو یہ کہا گیا کہ وہ اُس وقت خالی ہاتھ ان فوجیوں پر حملہ کریں جب وہ خیموں میں رہنے والوں کو جگانے جائیں اور ان کی نیاموں سے تلواریں کھینچ لیں اور مشعلیں بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیں اور پھر یہ نہ دیکھیں کہ فوج کا ارادہ لڑنے کا تھا یا نہیں۔ انہیں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ وہ لڑائی کے بعد خیمہ گاہ میں نہ آئیں۔ دور پیچھے جنگلوں میں اور پہاڑی علاقے میں چلے جائیں۔ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ انہیں اکٹھا کر لیا جائے گا اور پھر بتایا جائے گا کہ وہ کیا کریں گے۔

وزیرِ اعظم کا یہ منصوبہ توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ جب فوج کی کمک پہنچی تو وہاں زخمیوں اور لاشوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا یا جلتے ہوئے خیمے تھے۔

○

فوج کی کمک جو لڑنے کے لئے آئی تھی، وہ لاشوں اور زخمیوں کو اٹھانے میں مصروف ہو گئی۔ سپہ سالار حجازی بار بار وزیرِ اعظم سمیری سے پوچھتا تھا کہ آخر یہ ہُوا کیسے؟ وزیرِ اعظم ہر بار گردن کو ذرا سا خم دے کر سر کے اشارے سے یہ تاثر دیتا کہ وہ حیران ہے۔

صبح سویرے سپہ سالار حجازی اور وزیرِ اعظم سمیری سلطان برکیارق کے محل کے باہر اس کے جاگنے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بہت دیر بعد انہیں اندر بلایا گیا۔

وہ جب اندر گئے تو سلطان برکیارق ابھی تک بستر میں تھا۔

"رات کا کام ٹھیک ہو گیا؟" ——— سلطان نے پوچھا ——— "کچھ آدمی پہچانے گئے یا نہیں؟"

"وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور بن گیا ہے سلطانِ محترم!" ——— وزیرِ اعظم سمیری نے کہا

—— "فوج گئی تو تمام خیمے خالی تھے۔ فوج خیموں کو دیکھ ہی رہی تھی کہ ہر طرف سے فوج پر حملہ ہو گیا"۔

سلطان برکیارق جو غنودگی کی کیفیت میں بول رہا تھا' بڑی تیزی سے اٹھ بیٹھا اور آنکھیں پھاڑے ہوئے سپہ سالار حجازی اور وزیراعظم کو دیکھنے لگا —— "کیا کہہ رہے ہو تم؟" —— سلطان برکیارق نے حیرت زدہ سرگوشی سے پوچھا —— "یا شاید میں ابھی تک نیند میں ہوں اور تمہاری بات سمجھا نہیں!"

"نہیں سلطانِ محترم!" —— وزیراعظم نے کہا —— "آپ ٹھیک سن رہے ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو خیمہ گاہ میں چل کر دیکھیں وہاں آپ کو خون اور جلے ہوئے خیموں کی راکھ نظر آئے گی۔ زخمیوں کی مرہم پٹی ابھی تک ہو رہی ہے"۔

"لیکن یہ سب ہُوا کیسے؟" —— سلطان برکیارق نے کہا —— "میرے اس حکم سے آپ دونوں واقف تھے۔ میں یہ سمجھا ہوں کہ خیموں میں رہنے والوں کو قبل از وقت پتہ چل گیا تھا کہ میں نے کیا حکم دیا ہے۔ انہوں نے یہ جوابی وار کیا کہ محاصرے سے پہلے ہی وہاں سے نکل گئے اور فوج پر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ مجھے یہ بتائیں کہ انہیں یہ اطلاع کس نے دی تھی؟"

"سلطانِ محترم!" —— وزیراعظم نے کہا —— "ایک انسان اور ہے جسے آپ کے اس حکم کا علم تھا..... آپ کی بیگم محترمہ..... لیکن میں ان پر شک کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا"۔

"اور نہ ہی اس پر شک کیا جا سکتا ہے" —— سلطان برکیارق نے کہا۔

"یہ کارستانی اوریزی کی معلوم ہوتی ہے" —— سپہ سالار حجازی نے کہا۔

"لیکن اس تک یہ خبر کس طرح قبل از وقت پہنچی؟" —— سلطان برکیارق نے غصے سے کہا —— "مجھے اس سوال کا جواب چاہئے"۔

اس سوال کا جواب ملنا ناممکن تھا۔ روزینہ بھی وہاں موجود تھی۔ وہ سلطان برکیارق کی نسبت زیادہ پریشانی کا اظہار کر رہی تھی لیکن دلی طور پر وہ خوش اور مطمئن تھی کہ جو صورتِ حال حسن بن صباح پیدا کروانا چاہتا تھا وہ پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے سلطان سے کہا کہ اب یہ معلوم کرنا کہ اس کے حکم کی بھنک کس طرح خیمہ گاہ میں پہنچ گئی تھی' بے کار ہے اور وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اب کرنے والا کام یہ ہے کہ فوج کو باہر نکال کر ان لوگوں

کے تعاقب اور تلاش میں بھیجا جائے۔ وہ لوگ جہاں کہیں بھی ہوں ان پر زوردار حملہ کر کے ان کو بالکل ہی ختم کر دیا جائے۔

"ہمیں یہی کارروائی کرنی چاہئے" —— سپہ سالار حجازی نے کہا —— "اگر ہم یہاں سوچتے رہے اور باتیں کرتے رہے تو وہ لوگ بکھر کر اِدھر اُدھر ہو جائیں گے اور اپنے اپنے گھروں کو جا پہنچیں گے۔ پھر ہم انہیں کہاں کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔ انہیں فوراً پکڑ کر سزا دینی چاہئے"۔

"ہاں' ہمیں یہی کرنا چاہئے" —— سلطان برکیارق نے کہا —— "حجازی! تم فوراً جاؤ اور یہ کارروائی شروع کر دو"۔

○

شہر میں بھی خبر پھیل گئی تھی کہ رات سابق فوجیوں کی خیمہ گاہ میں بڑی خونریز لڑائی ہوئی ہے۔ طبیب نے جو حسن بن صباح کے اس مشن کو چلا رہا تھا' اپنے آدمیوں کو پہلے ہدایات دے دی تھیں۔ ان کے مطابق ان باطنیوں نے شہر میں یہ افواہ پھیلا دی کہ رات فوج نے نہتے لوگوں پر اُس وقت حملہ کیا ہے جب وہ سوئے ہوئے تھے۔ اس افواہ نے پورا پورا کام کیا اور لوگوں میں سلطان کی فوج کے خلاف نفرت پیدا ہونے لگی اور ہر کوئی سلطان کو اور فوج کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔

لوگ خیمہ گاہ تک پہنچے تو انہیں وہاں جلے ہوئے خیمے نظر آئے اور ہر طرف خون بکھرا اور جما ہُوا دیکھا۔ زخمیوں اور لاشوں کو اٹھا کر لے گئے تھے۔

وزیراعظم عبدالرحمٰن سمیری کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ شہر میں جو افواہیں پھیل گئی ہیں وہ حسن بن صباح کی طرف سے پھیلائی گئی ہیں۔ وزیراعظم نے اپنے خفیہ آدمیوں کے ذریعے بھی شہریوں کو فوج اور سلطان کے خلاف کرنے کے لئے ایسی ہی افواہیں پھیلا دیں۔ ان سے باطنیوں کے محاذ کو تقویت ملی۔ وزیراعظم جو کچھ زیرِ زمین ہو کر رہا تھا وہ اسلام اور سلطان کے مفاد کے لئے ضروری تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ سلطان برکیارق سلطانی چھوڑ دے اور اس کی جگہ محمد کو سلطان بنایا جائے تاکہ روزینہ کی صورت میں سلطنت پر جو آسیب طاری ہو گیا ہے وہ اتر جائے۔ وزیراعظم کو اتنا ہی معلوم تھا کہ سلطان برکیارق پر صرف روزینہ غالب ہے۔ یہ حسن بن صباح کی ٹریننگ کا کمال تھا کہ اس کے فدائی اور دیگر پیروکار کسی کو اپنی موجودگی اور تخریبی سرگرمیوں کا پتہ ہی نہیں

چلنے دیتے تھے۔

مزمل رے کے حاکم ابو مسلم رازی کے پاس پہنچ گیا تھا اور اسے مرو کے حالات بتا دیئے تھے۔

"میں پوری طرح تیار ہوں" ___ ابو مسلم رازی نے کہا ___ "ایک تو میرے پاس اپنی کچھ فوج ہے جو کافی تو نہیں لیکن تجربہ کار اور جذبے والی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے شہریوں کو تیار کر رکھا ہے۔ جونہی ضرورت محسوس ہوئی یہاں سے اچھا خاصا لشکر روانہ کر دوں گا اور اگر میری ضرورت محسوس ہوئی تو میں بھی آ جاؤں گا"۔

انہیں ابھی معلوم نہیں ہوا تھا کہ پیچھے مرو میں کیسا خونریز واقعہ ہو گیا ہے۔ مزمل اسی روز وہاں سے واپس چل پڑا۔ ابو مسلم رازی نے اسے محمد اور وزیر اعظم سمیری کے لئے ایک پیغام اور کچھ ہدایات دی تھیں۔

مزمل جب واپس آ رہا تھا تو تقریباً" نصف راستے میں اسے ایک اور آدمی ملا جس کے ساتھ اس کے دوستانہ مراسم تھے۔ اس نے مزمل کو بتایا کہ وہ ابو مسلم رازی کے لئے ایک اور پیغام لے جا رہا ہے۔ اس نے مزمل کو تفصیل سے سنایا کہ فوج نے خیمہ گاہ پر حملہ کیا ہے اور بڑی خونریز لڑائی ہوئی ہے اور اب فوج ان بر طرف شدہ فوجیوں کی تلاش میں جا رہی ہے۔

مزمل اس آدمی کے ساتھ واپس رے کی طرف چل پڑا۔ وہ ابو مسلم رازی سے اس نئی صورت حال کے سلسلے میں ہدایات لینا چاہتا تھا۔

فاصلہ خاصا زیادہ تھا۔ یہ دونوں رات کے وقت ابو مسلم رازی کے ہاں پہنچ گئے۔ رازی کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو انہیں فوراً" اندر بلا لیا گیا۔ قاصد نے اسے مرو کی نئی صورت حال سنائی۔ اس قاصد کو وزیر اعظم سمیری نے بھیجا تھا۔

یہ ایک بڑا ہی اہم اور تاریخی واقعہ تھا جس نے اسلام اور سلطنت سلجوقیہ کو بڑے خطرناک دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ مؤرخوں نے اس واقعہ کی زیادہ تفصیلات نہیں لکھیں البتہ ابن اثیر اور ایک یورپی مؤرخ نے کچھ حالات بیان کئے ہیں۔ ان سے یہ صورت سامنے آتی ہے کہ ابو مسلم رازی نے اپنی فوج اور شہریوں کو ایک میدان میں اکٹھا کیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر اس اجتماع سے خطاب کیا۔

"اسلام کے شیدائیو! شمع رسالت کے پروانو!" ___ ابو مسلم رازی نے انتہائی بلند

آواز میں کہا ___ "تمہاری آزمائش کا اور ایثار کا وقت آ پہنچا ہے۔ مرو میں نہتے لوگوں پر سلطان کی فوج نے حملہ کر کے قتل عام کیا ہے۔ اس خونریزی کے پیچھے حسن بن صباح کے باطنیوں کا ہاتھ ہے۔ سلطان برکیارق کی بیوی باطنی ہے اور وہ حسن بن صباح کی بھیجی ہوئی ہے۔ اس نے سلطان کو نشہ پلا پلا کر اور اس پر اپنے حسن کا نشہ طاری کر کے دماغی طور پر بے کار کر دیا ہے۔ سلطان کے ایوان سے جو حکم جاری ہو رہے ہیں وہ سلطان کی بیوی سلطان کی زبان سے جاری کرتی ہے۔ وہاں بھائی کو بھائی سے لڑوایا جا رہا ہے اور شہر میں اتنے زیادہ باطنی آ چکے ہیں کہ ہمارے اس دارالسلطنت پر باطنی قابض ہو گئے ہیں۔ یہاں سوال صرف سلطنت کا نہیں بلکہ تمہارے دین اور ایمان کا سوال ہے۔ اسلام کے نور کو ہمیشہ کے لئے بجھایا جا رہا ہے۔ اگر تمہیں اپنا دین اور اپنا ایمان عزیز ہے تو اللہ کا نام لے کر اٹھو اور باطل کی اس قوت کو اسی طرح کچل کر رکھ دو جس طرح ہمارے آباؤ اجداد نے روم اور فارس کی ہیبت ناک قوتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ اس سلطنت پر حسن بن صباح کا قبضہ ہو گیا تو تمہاری بیٹیاں اور بہنیں اٹھا لی جائیں گی اور تم جانتے ہو کہ انہیں کس طرح اور کہاں کہاں استعمال کیا جائے گا۔ اگر تم میں غیرت ہے تو مسلح ہو کر باہر آ جاؤ اور اپنے سروں پر کفن باندھ لو۔ اپنے دین کو اور اپنی عزت کو شیطانی فرقے سے بچاؤ۔ تم پر ایک شیطانی قوت قابض ہونا چاہتی ہے۔ میں ایک لشکر مرو روانہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو فوج ہے لیکن یہ کافی نہیں۔ جو غیر فوجی اس لشکر کے ساتھ جانا چاہتے ہیں وہ ایک طرف ہو کر کھڑے ہو جائیں۔ انہیں ہتھیار ملیں گے اور ساری سہولتیں ملیں گی' البتہ گھوڑے خود لائیں گے جو ان کی اپنی ملکیت میں رہیں گے"۔

ابو مسلم رازی کے بولنے کے انداز میں جہاں جوش و خروش اور دین اسلام کی تپش تھی وہاں اس کا انداز بار بار جذباتی ہو جاتا تھا اور دو تین مرتبہ اس پر رقت بھی طاری ہو گئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے آدھے شہری ایک طرف ہو گئے۔ وہ حسن بن صباح اور اس کے باطنی فرقے کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ ہر طرف سے جہاد جہاد کی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ اردگرد کے مکانوں کی چھتوں پر عورتیں کھڑی تھیں انہوں نے بھی ابو مسلم رازی کا خطاب سنا تھا۔ انہوں نے بھی نعروں کی زبان میں اپنے مردوں کی حوصلہ افزائی

شروع کر دی۔

"امیر شہر رازی!" ــــ ایک چھت سے ایک عورت کی بڑی بلند آواز آئی ــــ "اگر معاملہ لڑائی کا ہے تو وہاں عورتوں کی بھی ضرورت ہو گی۔ زخمیوں کو اٹھانا' ان کی مرہم پٹی اور پانی پلانا عورتوں کا کام ہے۔ ہمیں بھی اس لشکر کے ساتھ بھیج دیں"۔

"اگر نفری کم ہے تو ہم بھی لڑ سکتی ہیں" ــــ دوسری عورت کی آواز آئی۔

"نہیں' ابھی نہیں!" ــــ ابو مسلم رازی اپنا گھوڑا اس چھت کے قریب دوڑاتا لے گیا اور رک کر بلند آواز سے کہا ــــ "جب تک مرد زندہ ہیں' عورتوں کو باہر نہیں نکالا جائے گا۔ تم مستورات صرف یہ کام کرو کہ اپنے بچوں کو بتاؤ کہ اسلام کیا ہے اور اسلام کے دشمن کون ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ میری بیٹیوں اور بہنوں میں جہاد کا جذبہ جوش مار رہا ہے۔ تم گھروں میں رہ کر اپنے ان مجاہدوں کے لئے دعا کرتی رہنا"۔

ابو مسلم رازی کو شاید معلوم ہی ہو گا کہ جن شہریوں کو اکٹھا کر کے وہ جوش دلا رہا تھا ان میں حسن بن صباح کے فدائین' جاسوس اور دیگر پیروکار بھی موجود تھے۔ ابو مسلم رازی نے اپنے علاقے میں مسجدوں کے اماموں کے ذریعے حسن بن صباح اور اس کے ابلیسی عقیدے کے خلاف نفرت پیدا کر دی تھی۔ اس نے جامع مسجد کے خطیب اور دوسری مسجدوں کے اماموں کو حکم دے رکھا تھا کہ حسن بن صباح کے خلاف بولتے رہا کریں اور لوگوں کے دلوں پر نقش کر دیں کہ حسن بن صباح سراپا ابلیس ہے اور وہ اسلام کا بدترین دشمن ہے۔

○

دو تین دنوں بعد رے سے اور شہریوں کی کچھ نفری کا ایک لشکر چلا لیکن اسے مرو نہیں پہنچنا تھا بلکہ مرو کے قریب ایک پہاڑی علاقے میں چھپ کر رہنا تھا۔ مزمل اور دوسرا قاصد اس لشکر کے ساتھ تھا۔ یہ لشکر اگلے روز اس مقام تک پہنچا جہاں اسے پہنچنا تھا۔ فوج میں دو تجربہ کار سالار تھے جن کا جذبہ ان کے تجربے سے زیادہ تیز تھا۔

مزمل مرو پہنچا اور سیدھا محمد کے پاس گیا۔ وزیر اعظم سمیری کے پاس براہ راست جانا مناسب نہیں تھا۔ اس نے محمد کو بتایا کہ ابو مسلم رازی نے ایک لشکر دیا ہے جو فلاں مقام تک پہنچ گیا ہے اور اسے اگلے حکم کا انتظار ہے۔

"وزیر اعظم نے تمام انتظامات اتنی خوبی سے خفیہ طور پر مکمل کر دیئے ہیں کہ اس لشکر تک یہ ہدایات پہنچ جائیں گی کہ انہیں کیا کرنا ہے" ــــ محمد نے کہا ــــ "میں اسی انتظار میں تھا کہ ابو مسلم رازی کوئی لشکر بھیج دیں۔ معلوم نہیں انہوں نے ہتھیاروں کا الگ ذخیرہ بھیجا ہے یا نہیں"۔

"بھیجا ہے" ــــ مزمل نے جواب دیا ــــ "بے شمار اونٹوں پر تلواریں' برچھیاں' کمانیں اور تیر لدے ہوئے آئے ہیں"۔

"ہمیں ان ہتھیاروں کی ضرورت تھی" ــــ محمد نے کہا ــــ "برطرف کئے ہوئے فوجیوں کو یہ ہتھیار پہنچانے ہیں۔ یہ انتظام موجود ہے کہ ہتھیار ان تک کس طرح پہنچائے جائیں"۔

اتنے دنوں سے سلطان کی فوج شہر سے دور جنگلوں اور پہاڑیوں کے اندر برطرف فوجیوں کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی' برطرف کئے ہوئے فوجی بھی آخر عسکری تجربہ رکھتے تھے انہوں نے سرکاری فوج کو نقصان پہنچانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب سرکاری فوج کا کوئی دستہ پہاڑیوں کے اندر گشت کرتا آگے نکل جاتا تو اس کے پچھلے حصے پر برطرف فوجی حملہ کر دیتے اور چند ایک فوجیوں کو مار کر پہاڑیوں کے اندر ہی ادھر اُدھر ہو جاتے۔

ان فوجیوں کی کمان اوریزی کے ہاتھ میں تھی۔ اوریزی کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ سرکاری فوج برطرف فوجیوں کی خیمہ گاہ کا محاصرہ کر کے تلاشی لے گی اور کچھ آدمیوں کو گرفتار کیا جائے گا۔ یہ چال اوریزی کے دماغ کی اختراع تھی کہ خیمہ گاہ شام کے بعد خاموشی سے خالی کر دی جائے اور فوجیوں پر عقب سے حملہ کیا جائے۔

اس کی یہ سکیم کامیاب ہو گئی تو اس نے برطرف فوجیوں کے سالار کو اور دو تین عہدے داروں کو اپنے ساتھ رکھ لیا اور خبر رسانی کا انتظام بھی کر لیا اور سابقہ فوجیوں کو پہاڑیوں کے اندر اور جنگلوں میں بکھیر دیا۔ اوریزی تک ہر خبر بروقت پہنچ رہی تھی۔ یہ طریقہ جنگ اسی نے بتایا تھا کہ سرکاری دستوں کے پچھلے حصے پر چھاپہ مارو اور چند ایک آدمیوں کو گھائل کر کے غائب ہو جاؤ۔

سپہ سالار حجازی کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ سلطان برکیارق اُسے ہر روز بلاتا اور پوچھتا تھا کہ برطرف فوجیوں کا کچھ سراغ ملا یا نہیں۔ سپہ سالار حجازی منہ لٹکا کر غلاموں کی طرح یہی ایک جواب دیتا تھا کہ ان کا سراغ تو نہیں ملا لیکن وہ ہر روز ہمارے کسی نہ کسی دستے

کے چند ایک آدمی مار کر غائب ہو جاتے ہیں۔ ایک روز تو اس نے یہ بھی بتایا کہ گذشتہ رات ان باغیوں نے فوج پر شب خون مارا ہے اور بہت سا جانی نقصان کر کے غائب ہو گئے ہیں۔

ایک روز محمد کو ابو مسلم رازی کا ایک زبانی پیغام ملا وہ یہ تھا کہ اسے یہ دیکھ کر بہت ہی دکھ ہو رہا ہے کہ ہم لوگ جو سلطنت کو نہیں بلکہ اسلام کو فروغ دے رہے تھے' اب اپنا ہی خون بہا رہے ہیں۔ رازی نے محمد سے کہا تھا کہ وہ اپنے بڑے بھائی کے پاس جائے لیکن یہ خیال رکھے کہ اس کی باطنی بیگم اس کے ساتھ نہ ہو۔ محمد اسے اسلام اور سلطنت کا واسطہ دے کر کہے کہ وہ ہوش میں آئے اور اگر اسلام کے ساتھ اس کی دلچسپی ختم ہو گئی ہے تو اپنی سلطنت کو ہی بچا لے۔

ابو مسلم رازی کے قاصد نے محمد سے یہ بھی کہا کہ برکیارق نہ مانے تو اسے بتا دیا جائے کہ وہ سلطانی سے دستبردار ہو جائے یا اپنی باطنی بیوی کو چھوڑ دے۔ اسی سے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے اور پھر وہی باہمی پیار پیدا ہو جائے گا جو اس لڑکی کے آنے سے پہلے ہُوا کرتا تھا۔

ابو مسلم رازی نے یہ بھی کہا تھا کہ برکیارق نہ مانے تو اسے کہہ دینا کہ وہ نتائج کے لئے تیار رہے اور یہ بھی کہ یہ نتائج اُس کے لئے اور اُس کی باطنی بیوی کے لئے بڑے ہی بھیانک ہوں گے۔

محمد اُسی وقت وزیرِ اعظم عبدالرحمٰن سمیری کے پاس گیا اور اسے ابو مسلم رازی کا یہ زبانی پیغام سنایا۔

"مجھے توقع تھی کہ وہ ایسا پیغام ضرور بھیجے گا" ——— وزیرِ اعظم نے کہا ——— "اپنے بھائی تک یہ پیغام تم ہی لے جا سکتے ہو۔ میں تو بظاہر اسی کا اور اس کی بیگم کا آدمی ہوں۔ تم سلطان سے ملو اور اس کے ساتھ یہ بات کرو..... میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ وہ ذرا سا بھی اثر قبول نہیں کرے گا بلکہ الٹا تمہیں دھمکیاں دے گا..... بہرحال ہمیں اپنا یہ فرض بھی ادا کر دینا چاہیے کہ ہم نے اسے پہلے خبردار نہیں کر دیا تھا"۔

محمد اسی وقت برکیارق کے پاس چلا گیا۔ اتفاق سے وہ اسے اکیلا مل گیا۔

"دیکھا محمد!" ——— برکیارق نے کہا ——— "یہاں کیا خون خرابہ ہو رہا ہے؟..... اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہماری ماں اگر لوگوں کو نہ بھڑکاتی تو وہ اور یزی کو آزاد نہ کراتے۔ یہ

سارا خونریز فساد وہیں سے شروع ہُوا ہے"۔

"میرے سلطان بھائی!" ——— محمد نے کہا ——— "میں آپ کے ساتھ آج آخری بات کرنے آیا ہوں..... ہوش میں آئیں اور دیکھیں یہاں کیا ہو رہا ہے..... خانہ جنگی شروع ہو گئی ہے۔ یہ رک سکتی ہے۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ خون خرابہ رکے یا بہتا رہے اور اس میں اضافہ ہوتا چلا جائے"۔

"تم فکر نہ کرو محمد!" ——— سلطان برکیارق نے کہا ——— "میں نے فوج بھیج دی ہے اور دو تین دنوں تک باغی پکڑے جائیں گے یا فوج انہیں وہیں ختم کر دے گی"۔

"سلطانِ عالی مقام!" ——— محمد نے پُراعتماد لہجے میں کہا ——— "آپ کی فوج کسی ایک باغی کو بھی نہیں پکڑ سکتی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہر روز ہماری فوج کے پندرہ بیس آدمی مارے جا رہے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ صاف بات کرتا ہوں۔ اگر آپ سچے دل سے چاہتے ہیں کہ آپس کی قتل و غارت بند ہو جائے اور اسلام کا جھنڈا بلند ہو اور یہ سلطنت قائم رہے تو سلطانی کی گدی سے اُٹھ کر الگ ہو جائیں یا اس باطنی لڑکی روزینہ کو چھوڑ دیں۔ کون نہیں جانتا کہ حکم آپ کی یہ بیگم دیتی ہے لیکن یہ حکم آپ کی زبان سے نکلتا ہے۔ آپ کے لئے اب کوئی اور راستہ نہیں رہا۔ سلطانی چھوڑ دیں یا اس بیوی کو چھوڑ دیں"۔

"ہوش میں آ محمد!" ——— سلطان برکیارق نے سلطانوں کے سے لہجے میں کہا ——— "پہلے میں نے اپنی ماں کو نظربند کیا ہے۔ اب ایسا نہ ہو کہ میں اپنے بھائی کو قید خانے میں ڈال دوں۔ میں تمہیں اور سنجر کو چھوڑ دوں گا' اپنی اس بیوی کو نہیں چھوڑوں گا..... اور رہا سوال سلطانی کا' تو یہ میں جانتا ہوں کہ ہماری ماں تمہیں اس گدی پر بٹھانا چاہتی ہے"۔

"ٹھیک ہے سلطانِ محترم!" ——— محمد نے کہا ——— "آپ کا دماغ آپ کے ہاتھ میں نہیں رہنے دیا گیا۔ اب میں آپ کو آخری بات کہتا ہوں کہ مجھے آپ قید خانے میں ڈال دیں' جلاد کے حوالے کر دیں لیکن اس سے حالات سُدھریں گے نہیں اور زیادہ بگڑیں گے اور اس کے جو نتائج ہوں گے وہ آپ کے لئے اور آپ کی اس باطنی بیوی کے لئے بڑے ہی بھیانک ہوں گے"۔

محمد اُٹھ کھڑا ہُوا اور وہاں سے نکل آیا۔ واپس آ کر اس نے اپنے چھوٹے بھائی سنجر کو

ساتھ لیا اور دونوں اپنی ماں کے پاس گئے۔ ان کی ماں نظر بند تھی لیکن اس کے یہ دونوں بیٹے اسے مل سکتے تھے۔ محمد نے اپنی ماں کو بتایا کہ ابو مسلم رازی کا کیا پیغام آیا ہے۔ پھر اسے بتایا کہ وہ برکیارق کے ساتھ بات کر کے آ رہا ہے لیکن برکیارق نے اسے قید میں ڈالنے کی اور سزائے موت دینے کی دھمکی دی ہے۔

"مقدس ماں!" ---- محمد نے کہا ---- "میں آپ سے اجازت لینے آیا ہوں۔ اب مجھے جہاد پکار رہا ہے۔ آپ اور سنجر یہیں رہیں گے۔ آپ نے ہماری کامیابی کے لئے دعا کرنی ہے اور اس کے سوا کسی اور کے ساتھ کوئی بات نہیں کرنی نہ کسی کے ساتھ جھگڑا مول لینا ہے۔ صرف ایک عورت نے بھائی کو بھائی کا دشمن بنا ڈالا ہے اور ایک مجاہد قوم کو دو حصوں میں کاٹ کر انہیں آپس میں ٹکرا دیا ہے۔ ان حالات میں مجھے یہاں نہیں رہنا چاہئے۔ وزیر اعظم عبدالرحمٰن سمیری سے میری بات ہو چکی ہے۔ سالار اوریزی بھی میرا انتظار کر رہا ہے..... میں آج رات غائب ہو جاؤں گا"۔

"تم جہاں بھی جاؤ گے میری دعائیں تمہارے ساتھ ہوں گی" ---- ماں نے کہا ---- "مسلمان مائیں اپنے بیٹوں کو قربان کرتی چلی آئی ہیں' میں اس روایت کو زندہ رکھوں گی۔ تمہارا باپ تمہاری ہی طرح دین دار اور مجاہد تھا۔ اس نے اپنی زندگی اسلام کی سربلندی کے لئے وقف کر رکھی تھی اور اس نے اپنی جان اس راستے پر دے دی..... جا بیٹے! اللہ تیرے ساتھ ہے"۔

○

پانچ سات دن ہی گزرے ہوں گے کہ ایک رات شہر کے کسی کونے سے آواز آئی کہ شہر کو ایک لشکر نے محاصرے میں لے لیا ہے۔ یہ آواز ذرا سی دیر میں سارے شہر میں پھیل گئی اور لوگ جاگ اٹھے۔

ایک زمانہ گزر گیا تھا کہ یہ شہر محاصرے میں نہیں آیا تھا نہ کوئی ایسا خطرہ تھا اس لئے شہر کے تمام دروازے رات کو کھلے رہتے تھے۔ صرف یہ احتیاط کی جاتی تھی کہ ہر دروازے کے ساتھ ایک دو کمرے تھے جن میں فوجی رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ رات کو کون اندر آیا ہے اور کون نکل گیا۔ اس رات جب شہر محاصرے میں آ گیا تو ان فوجیوں نے پہلا کام یہ کیا کہ شہر کے تمام دروازے بند کر دیئے اور اپنے سپہ سالار ابو جعفر حجازی کو اطلاع دی۔ حجازی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اس نے محاصرے کا لفظ ہی سنا تو ہڑبڑا کر

اٹھا اور شب خوابی کے لباس میں ہی دوڑ پڑا اور شہر پناہ کے ایک برج میں جا کھڑا ہوا۔

"شہر کے دروازے کھول دو" ---- باہر سے للکار سنائی دی ---- "نہیں کھولو گے تو ہم دروازے توڑ کر اندر آ جائیں گے پھر ہم کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔

فوج کے متعدد دستے شہر سے دور سابق فوجیوں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے اور کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ اس وقت کہاں تھے۔ باقی جو فوج تھی اسے اسی وقت جگا کر شہر پناہ پر چڑھا دیا گیا۔

شہر پناہ برائے نام تھی' یہ کوئی مضبوط قلعہ نہیں تھا۔ فوجیوں نے تیر پھینکنے شروع کر دیئے۔ محاصرہ کرنے والی فوج کی طرف سے ایک بار پھر للکار اٹھی کہ مقابلہ کرنے کی کوشش نہ کی جائے ورنہ شہریوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑے گا لیکن سپہ سالار حجازی نے تیر اندازی جاری رکھنے کا حکم دیا۔ حجازی نے للکار کر یہ بھی پوچھا کہ تم کون لوگ ہو اور کس ملک سے آئے ہو۔ اس کا جواب نہ آیا۔ سلطان برکیارق کو اطلاع دی گئی تو وہ اٹھ کر آ گیا اور سپہ سالار حجازی کے ساتھ ایک برج میں جا کھڑا ہوا۔

رات ایسے ہی ایک دوسرے کو للکارتے گزر گئی۔ صبح ہوئی تو پتہ چلا کہ یہ اپنے ہی لوگ ہیں اور ان میں بر طرف کئے ہوئے فوجی بھی شامل ہیں چونکہ شہر کی فوج بہت تھوڑی تھی اس لئے سلطان کے حکم سے شہریوں کو مقابلے کے لئے تیار کیا جانے لگا۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ یہ فوج یا لشکر رے سے آیا ہے اور یہ وہاں کے امیر شہر ابو مسلم رازی کا بھیجا ہوا ہے۔ شہریوں کو یہ خبر ملی تو ان میں سے بہت سے لوگوں نے مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا۔ شہری یہ شور کرنے لگے کہ اپنی فوج نے اپنے ہی شہر کو کیوں محاصرے میں لے لیا ہے' اس کی کوئی اور وجہ ہو گی۔

حسن بن صباح کا ایجنٹ طبیب بہت خوش تھا کہ اس کی زمین دوز کوششیں کامیاب ہو گئی ہیں اور باقاعدہ خانہ جنگی شروع ہو گئی ہے۔ وہ اس پر تو اور ہی زیادہ خوش تھا کہ شہری بھی مقابلے کے لئے تیار ہو گئے ہیں لیکن اس نے دیکھا کہ شہری مقابلے سے انکار کر رہے ہیں کیونکہ انہیں پتہ چل گیا ہے کہ یہ اپنی ہی سلطنت کی فوج ہے۔ طبیب نے دوسری چال چلی' وہ یہ کہ اپنے آدمیوں سے کہا کہ شہر میں یہ افواہ پھیلا دیں کہ رے کا حاکم ابو مسلم رازی باغی ہو گیا ہے اور اس نے امام حسن بن صباح کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے اور اس کی مدد سے اس شہر کو فتح کرنے آیا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد یہی افواہ ایک سچی اطلاع اور خبر کی صورت میں سارے شہر میں پھیل گئی۔ شہری ایک بار پھر جوش و خروش سے مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ شہر پناہ پر ایک انسانی دیوار کھڑی ہو گئی شہر سے تیروں کا مینہ برسنے لگا۔

محاصرہ کرنے والے نہتے تو نہیں آئے تھے' ان کے پاس بھی کمانیں اور تیروں کا ذخیرہ تھا اور ان کے پاس بڑے ماہر تیر انداز بھی تھے۔ انہوں نے جوابی تیر اندازی شروع کی تو دیوار پر لوگ تیر کھا کھا کر گرنے لگے۔ نقصان دونوں طرف سے ہو رہا تھا۔

وزیرِ اعظم عبدالرحمٰن سمیری نے دیکھا کہ ایک غلط افواہ پھیلا کر شہریوں کو بھڑکایا گیا ہے تو اس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ شہریوں تک یہ خبر پہنچائیں کہ ابو مسلم رازی نے حسن بن صباح کی بیعت نہیں کی بلکہ ہمارا اپنا سلطان اپنی بیوی کے ذریعے حسن بن صباح کا مرید ہو گیا ہے اور اس شہر میں بے شمار باطنی آگئے ہیں۔

وزیرِ اعظم کے آدمی بھی خاصے تجربہ کار تھے۔ انہوں نے یہ خبر اپنے طریقے سے پہنچانی شروع کر دی اور اس کے اثرات بھی دیکھنے میں آنے لگے۔ وہ اس طرح کہ کچھ شہری شہر کے دفاع سے منہ موڑ کر نیچے اتر آئے۔

ہُوا یہ کہ کسی طرح سلطان کی اس فوج کو پتہ چل گیا کہ شہر محاصرے میں ہے جو فوج ہر طرف فوجیوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم پھر رہی تھی ان دستوں کا کماندار کوئی عقلمند آدمی تھا۔ اس نے اپنے دستے اکٹھے کیئے اور انہیں واپس لے آیا۔ اس نے دلیری کا یہ مظاہرہ کیا کہ عقب سے محاصرہ کرنے والوں پر حملہ کر دیا۔ سپہ سالار حجازی نے یہ منظر دیکھا تو اس نے یہ حکم دے دیا کہ شہر کے دروازے کھول دیئے جائیں اور اندر کی فوج اور شہری باہر نکل کر محاصرہ کرنے والوں پر ٹوٹ پڑیں۔

بڑی خونریز لڑائی لڑی گئی اور سورج غروب ہو گیا۔ اندر سے گئی ہوئی فوج اور شہری واپس آگئے۔ وہ دیکھ نہ سکے کہ ان کے ساتھ ہی حملہ آور فوج یعنی جس لشکر نے شہر کو محاصرے میں لیا تھا وہ بھی شہر میں آگئے۔ انہوں نے شہر کے تمام دروازوں پر تیل پھینک کر آگ لگا دی۔ اس طرح تمام دروازے جل گئے۔

رات کو شہر میں لڑائی ہی ہوتی رہی اس کے ساتھ ہی حملہ آور لشکر کی طرف سے یہ اعلان ہوتے رہے کہ ہم تمہارے بھائی ہیں' ہمارے خلاف نہ لڑو' ہم باطنیوں کو یہاں سے نکالنے آئے ہیں لیکن لڑائی جاری رہی اور شہری دو حصّوں میں تقسیم ہوتے گئے۔

بعض طبیب کی افواہ کو سچ مانتے تھے اور دوسرے دوسری قسم کی افواہ کے قائل ہو گئے لیکن شہر کی گلیوں میں خون بہتا رہا۔

○

پھر دن اور ہفتے گزرتے چلے گئے اور یہ خون بہتا ہی رہا۔

یہ خانہ جنگی تھی جس میں حسن بن صباح کے پیروکار اور تخریب کار تیل ڈالتے رہے اور سلطنتِ سلجوقیہ میں بھائی بھائی کا خون بہاتا رہا۔ تاریخ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ سلطانی کی گدّی کی یعنی اقتدار کی خانہ جنگی تھی لیکن مستند اور حقائق پر نظر رکھنے والے مؤرخوں نے لکھا ہے کہ یہ آگ حسن بن صباح نے لگائی تھی جس کا ثبوت یہ ہے کہ سلطان برکیارق مسلسل اپنی بیوی روزینہ کے زیرِ اثر چلا آرہا تھا۔ احکام روزینہ کے دماغ کی اختراع ہوتے تھے جس کا خفیہ رابطہ ایک عورت کے ذریعے طبیب کے ساتھ تھا اور اسے حسن بن صباح کے احکام اور ہدایات اسی طبیب کی طرف سے اس عورت کی وساطت سے ملتی تھیں۔

سلطان برکیارق کے محل کے اردگرد حفاظتی انتظامات بڑے ہی سخت کر دیئے گئے تھے۔ یہ تو فوراً ہی واضح ہو گیا تھا کہ دو بھائی ایک طرف ہیں اور بڑا بھائی دوسری طرف۔ وزیرِ اعظم عبدالرحمٰن سمیری کا کردار ڈھکا چھپا رہا۔ وہ بظاہر برکیارق اور روزینہ کا زر خرید غلام بنا رہا لیکن درپردہ وہ محمد اور ابو مسلم رازی کے ساتھ تھا۔ سلطان کے ہاں جو نیا منصوبہ بنتا یا کوئی حکم ملتا' وہ وزیرِ اعظم ابو مسلم رازی اور محمد تک پہنچا دیا کرتا تھا۔ ان لوگوں کو اور ان کی حامی فوج کو باغی کہا گیا تھا۔ ان باغیوں کا سپہ سالار اوریزی تھا جو بڑا ہی قابل اور قومی جذبے سے سرشار آدمی تھا۔

ایک روز عبدالرحمٰن سمیری نے مزّمل کے ساتھ درپردہ رابطہ کر کے کہا کہ اب وہ شمونہ کو استعمال کرے کیونکہ روزینہ کو قتل کرانا یا اس کا آسیب برکیارق سے اتارنا ممکن نظر نہیں آتا۔ شمونہ فریب کاری اور اداکاری کی ماہر تھی اور جب سے خانہ جنگی شروع ہوئی تھی وہ تڑپتی تھی کہ وہ بھی اس میدان میں کچھ کر کے دکھائے۔ اس کے اندر حسن بن صباح کے خلاف جو انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا تھا وہ وقت گزرنے کے ساتھ ٹھنڈا نہیں ہُوا بلکہ اور زیادہ بھڑک اٹھا تھا۔ وہ عقل و دانش والی لڑکی تھی۔ وہ جب دیکھتی تھی کہ باطنیوں نے بھائی کو بھائی کا دشمن بنا دیا ہے اور خون بہتا ہی چلا جا رہا ہے تو وہ پنجرے میں

بند پنچھی کی طرح پھڑپھڑاتی اور پنجرہ توڑنے کی ناکام کوشش کرتی تھی۔ آخر مزمل نے اسے بتایا کہ اب وزیرِاعظم سمیری نے اس کے لئے موقع پیدا کر لیا ہے۔

خانہ جنگی کو چھ سات مہینے گزر گئے تھے یہ بھی واضح ہو گیا تھا کہ ابو مسلم رازی سلطان برکیارق کے خلاف اپنی فوج اور اپنے تمام تر وسائل استعمال کر رہا ہے۔ ایک روز وزیرِاعظم سمیری روزینہ کے پاس گیا اور اسے معمول کے مطابق بتایا کہ خانہ جنگی کی صورتِ حال کیا ہے۔

"آج ایک درخواست لے کر آیا ہوں" ——— وزیرِاعظم نے کہا ——— "نیکی کا ایک کام کرنا ہے اور یہ آپ کے اختیار میں ہے"۔

"آپ بتائیں کیا کام ہے؟" ——— روزینہ نے پوچھا ——— "میں آپ کی خدمت نہیں کروں گی تو اور کس کی کروں گی؟"

"اس خانہ جنگی نے تو ملک کا بیڑہ غرق کر دیا ہے" ——— وزیرِاعظم نے کہا ——— "میں ابو مسلم رازی' محمد اور سنجر کو قتل کروانے کا انتظام کر رہا ہوں..... لیکن اس وقت آپ سے ایک اور عرض کرنا چاہتا ہوں' میرا ایک بڑا ہی معزز اور پیارا دوست تھا وہ بیچارہ مارا گیا ہے۔ وہ گھر سے نکلا ہی تھا کہ ایک برچھی جو کسی نے دوسرے کو ماری تھی وہ اسے لگ گئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے دو جوان بیٹے تھے۔ دونوں خانہ جنگی میں مارے گئے ہیں۔ اس کی صرف بیوی اور ایک جوان بیٹی بچ گئی ہیں لیکن ان کے گھر میں کھانے کے لئے ایک دانہ بھی نہیں۔ لڑکی جوان ہے اور کچھ زیادہ ہی خوبصورت ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں باغیوں کے ہاتھ چڑھ گئی تو بیچاری کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ میں نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا کہ آپ کے ہاں نوکروں اور نوکرانیوں کی تو کوئی کمی نہیں لیکن ایک سلجھی ہوئی اور سلیقہ شعار اور خوبصورت کنیز آپ کے پاس ضرور ہونی چاہئے۔ اگر اب میری یہ عرض مان لیں تو میں یہ لڑکی آپ کے حوالے کر دوں۔ اس سے ایک تو آپ کی ضرورت پوری ہو جائے گی اور سب سے بڑی نیکی تو یہ ہو گی کہ ایک پردہ دار یتیم لڑکی کو سہارا اور پردہ مل جائے گا۔ میں اس لڑکی کی ہر طرح ضمانت دینے کو تیار ہوں"۔

"آپ کو اتنی لمبی بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی" ——— روزینہ نے کہا ——— "اس لڑکی کو ساتھ لے آتے اور میں اسے اپنے پاس رکھ لیتی..... آپ اسے لے آئیں۔ اگر اس کی ماں بھی آنا چاہتی ہے تو آ جائے میں اسے رہائش کے لئے جگہ دے دوں

گی"۔

"نہیں بیگم محترمہ!" ——— وزیرِاعظم نے کہا ——— "اس کی ماں اپنے گھر میں ہی رہنا چاہتی ہے۔ آپ اس کی بیٹی کو رکھ لیں اور کبھی کبھی اسے اپنے گھر جانے کی اجازت دے دیا کریں"۔

اس طرح شمونہ روزینہ کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے روزینہ کو اپنا نام نگینہ بتایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ رو پڑی اور اپنے باپ اور بھائیوں کو یاد کر کر کے گھر کی باتیں سنانے لگی۔ شمونہ نے ایسی اداکاری کی جیسے وہ بالکل ہی سیدھی سادی اور پردہ نشین لڑکی ہو اور اسے دنیا کی ہوا ہی نہ لگی ہو۔

"آپ مجھے سمجھاتی رہیں کہ میں نے یہاں کیا کرنا ہے" ——— شمونہ نے کہا ——— "میں آپ کی پسند اور مرضی پر پوری اترنے کی کوشش کروں گی۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو یہ سمجھ کر معاف کر دینا کہ میں غریب اور پس ماندہ سے گھرانے کی لڑکی ہوں۔ ایسا شاہانہ گھر تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا"۔

روزینہ کو شمونہ بہت ہی اچھی لگی۔ شمونہ میں اس نے جو سادگی اور بے ساختہ پن دیکھا' وہ تو اسے بڑا ہی پیارا لگا۔ شمونہ کی عمر تو جوانی کی تھی لیکن اس نے شادی نہیں کی تھی اور اپنی صحت کو برقرار رکھا تھا اس لئے وہ اپنی عمر سے کم اور نوجوان لگتی تھی۔ شمونہ کو معلوم تھا کہ روزینہ حسن بن صباح کی تربیت یافتہ لڑکی ہے۔ شمونہ اس تربیت سے بہت اچھی طرح واقف تھی اور اس تربیت کو اس نے عملی زندگی میں بھی استعمال کیا تھا۔ اب وہ اسی تربیت اور تجربے کو روزینہ کو نیچا دکھانے کے لئے استعمال کرنے لگی۔

چند دنوں میں ہی شمونہ نے شاہی طور طریقے سیکھ لئے۔ یہ طور طریقے تو وہ پہلے ہی سے جانتی تھی۔ روزینہ کے دل میں اس نے اپنی جگہ پیدا کر لی۔ ابھی سلطان برکیارق نے شمونہ کو نہیں دیکھا تھا۔ روزینہ نے جب دیکھا کہ شمونہ نے بڑی تیزی سے سارے کام اور انداز وغیرہ سیکھ لئے تو ایک روز اس نے شمونہ کو سلطان برکیارق کے سامنے کیا اور کہا کہ یہ ایک تحفہ ہے جو وہ اسے دے رہی ہے۔

"یہ میری اور آپ کی کنیز ہے" ——— روزینہ نے کہا ——— "اس کا نام نگینہ ہے اور یہ ہے بھی نگینہ"۔

"وہ تو میں نے دیکھ لیا ہے" ——— سلطان برکیارق نے اپنا بازو شمونہ کی طرف پھیلا

کر کہا — "یہاں آؤ..... ہاں اِدھر بیٹھ جاؤ"۔

"نہیں!" — شمونہ نے جھجکنے اور شرمانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا — "میری جگہ آپ کے پلنگ پر نہیں، یہ محترمہ بیگم کی جگہ ہے۔ اگر بیگم اجازت دیں گی تو میں آپ کے پاس بیٹھ جاؤں گی"۔

"میں تمہیں بیگم کی جگہ اپنے پاس نہیں بٹھا رہا" — سلطان برکیارق نے ہنستے ہوئے کہا — "اگر میں تمہیں ایک پھول پیش کروں تو تم اسے ایک بار سونگھو گی تو ضرور"۔

شمونہ نے روزینہ کی طرف دیکھا۔ روزینہ نے مسکرا کر اسے سر سے ہلکا سا اشارہ کیا تو شمونہ پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گئی تو سلطان برکیارق نے بازو اس کی کمر میں ڈال کر اپنے قریب کر لیا۔

"آپ نے پھول سُونگھ لیا ہے" — شمونہ نے برکیارق کے بازو سے نکل کر اٹھتے ہُوئے کہا — "اب پھول اُسی کے پاس جا رہا ہے جس کی ملکیت ہے"۔

روزینہ اور برکیارق نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ شمونہ کا جادو کام کر گیا تھا۔

ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ شمونہ کی حیثیت روزینہ کی نگاہوں میں ایسی ہو گئی جیسے وہ اس کی کنیز نہیں بلکہ ہمراز سہیلی ہو۔ ایک روز شمونہ نے روزینہ سے بڑی سادگی سے پوچھا کہ یہ امام حسن بن صباح کون ہے اور باطنی کسے کہتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں نے سنا ہے کہ حسن بن صباح امام بھی ہے اور نبی بھی۔ شمونہ نے یہ بھی کہا کہ میں اس کی باتیں سن سن کر دل سے اس کی مرید ہو گئی ہوں۔

روزینہ نے حسن بن صباح کی باتیں شروع کر دیں اور ثابت کر دیا کہ وہ زمین پر امام ہے اور آسمانوں میں نبی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ الموت میں خداوند تعالیٰ نے اسے جنت بنا دی ہے۔ اس طرح روزینہ نے شمونہ کو حسن بن صباح کی ایسی باتیں سنائیں کہ شمونہ جھوم اٹھی۔

"میری یہ خواہش ہے" — شمونہ نے کہا — "ایک بار صرف ایک بار اللہ کے اس مقدس انسان کو دیکھوں..... میں نے پہلے بھی اس کے متعلق ایسی ہی باتیں سنی ہیں۔ کیا آپ مجھے اس کی زیارت نہیں کرا سکتیں؟"

"کیوں نہیں شمونہ!" — روزینہ نے کہا — "کسی وقت تمہاری یہ خواہش بھی

پوری کر دوں گی"۔

اُس روز کے بعد شمونہ اکثر حسن بن صباح کا ذکر چھیڑ دیتی اور اس طرح باتیں کرتی جیسے وہ حسن بن صباح کی عبادت کر رہی ہو۔ اس دوران شمونہ نے وہ عورت دیکھ لی جس کے ذریعے روزینہ طبیب کے ساتھ رابطہ رکھتی اور پیغام دیتی تھی۔ شمونہ وزیرِاعظم سمیری سے چوری چھپے ملنے کا موقعہ پیدا کر لیا کرتی تھی۔

اب وہ وزیرِاعظم سے ملی تو اسے کہا کہ شاہی طبیب سے کہیں کہ وہ سفوف مجھے دے دیں۔ یہ بھی کہا کہ سفوف تھوڑا نہ ہو، اچھی خاصی مقدار میں ہونا چاہئے اور طبیب یہ بھی بتا دے کہ ایک وقت میں یہ کتنا استعمال کیا جائے کہ اس کے ذائقے اور بُو کا پتہ نہ چلے۔

قارئین کو یاد ہو گا کہ مزمّل آفندی حسن بن صباح کو قتل کرنے گیا تھا لیکن وہاں سے یہ ارادہ لے کر واپس آیا کہ وہ سلطان ملک شاہ کو قتل کرے گا۔ یہ حسن بن صباح کے ذاتی طلسم کا اور حشیش کا اثر تھا کہ اس کا دماغ ہی ان لوگوں نے الٹا کر دیا تھا۔ سلطان کے طبیب نے اسے کچھ دوائیاں پلا پلا کر ٹھیک کیا تھا اور اس کا دماغ واپس اپنی اصلی حالت میں آ گیا تھا۔ اب شمونہ اس طبیب سے وہی دوائی منگوا رہی تھی۔

وزیرِاعظم نے اگلے ہی روز شمونہ کو وہ دوائی دے دی جو سفید رنگ کا ایک سفوف تھا۔ وزیرِاعظم نے یہ بھی بتایا کہ ایک صراحی میں اس کی کتنی مقدار ڈالنی ہے۔

شمونہ دیکھ رہی تھی کہ روزینہ ہر صبح ایک بڑی خوبصورت اور سنہری صراحی میں مشروب ڈالتی تھی اور اس میں کچھ ملاتی تھی۔ شمونہ جانتی تھی کہ یہ صراحی میں کیا ملا رہی ہے۔ روزینہ کو شمونہ پر مکمل طور پر اعتبار آ گیا تھا اس لئے وہ اپنی بیشتر حرکتیں شمونہ سے چھپاتی نہیں تھی۔ اس نے شمونہ سے کہہ رکھا تھا کہ سلطان جب اپنے کام سے واپس آئیں اور وہ موجود نہ ہو تو سلطان کو ایک پیالہ اس مشروب کا پلانا ہے۔

روزینہ اکثر شمونہ کے ساتھ حسن بن صباح اور اس کی جنت کی باتیں کیا کرتی تھی اور شمونہ اس کی یہ باتیں ایسے اشتیاق سے سنا کرتی جیسے اس پر مدہوشی طاری ہوئی جا رہی ہو۔ کبھی شمونہ یہ بھی کہہ دیتی کہ آپ کتنی خوش نصیب ہیں کہ ایسے نبی کی زیارت کر چکی ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لئے اس سرزمین پر اتارا ہے۔ ایک روز روزینہ نے حسبِ معمول صراحی میں مشروب ڈالا اور شمونہ سے کہا کہ یہ سلطان کے

کمرے میں رکھ دے۔ شمونہ صراحی لے گئی اور سلطان کے کمرے میں بھی چلی گئی لیکن اس نے صراحی وہاں رکھنے کی بجائے غسل خانے میں لے جا کر نالی میں بہادی۔

شمونہ نے روزینہ کا روزمرّہ کا معمول دیکھ لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت روزینہ کون سے کمرے میں ہوگی اور وہ کتنی دیر وہاں رہے گی۔ شمونہ نے بڑی تیزی سے ویسا ہی مشروب صراحی میں ڈالا اور شاہی طبیب کا دیا ہُوا سفوف نکال کر ذرا سا صراحی میں ملا دیا اور اسے اچھی طرح ہلایا۔

سلطان برکیارق جب اپنے روزمرّہ امورِ سلطنت سے واپس آیا تو روزینہ دوڑی آئی۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اس مشروب کا پیالہ برکیارق کو پلا دیا۔

اُس روز رات سونے تک سلطان برکیارق کو یہی مشروب پلایا جاتا رہا۔ شمونہ دو تین مرتبہ سلطان برکیارق کے کمرے میں گئی۔ ایک بار تو برکیارق نے اسے بلایا تھا اور باقی دو مرتبہ وہ کسی نہ کسی بہانے چلی گئی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ سلطان برکیارق کے روّیے میں یا بولنے کے انداز میں کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں۔ وہ کچھ نہ کچھ تبدیلی دیکھ رہی تھی۔ ایک یہ کہ برکیارق دن کے وقت بھی سویا کرتا تھا۔ اُس روز وہ کروٹیں بدلتا رہا اور سو نہ سکا۔

صبح جب شمونہ اپنے روزمرّہ کے کام کاج کے لئے روزینہ کے کمرے میں گئی تو روزینہ نے اسے پہلی بات یہ سنائی کہ سلطان ساری رات بہت بے چین رہے ہیں اور اچھی طرح سو نہیں سکے۔

"بے چین نہ رہیں تو اور کیا کریں" — شمونہ نے کہا — "جس سلطان کی سلطنت میں آپس کی قتل و غارت ہو رہی ہو اور خانہ جنگی روز بروز خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہو، وہ سلطان کیسے سکون سے سو سکتا ہے"۔

○

شمونہ نے اپنا یہ کام جاری رکھا۔ روزینہ مشروب میں نشہ ملا دیتی اور شمونہ وہ صراحی انڈیل کر اور مشروب ڈالتی اور اس میں اپنا سفوف ڈال دیتی۔ وہ سلطان برکیارق میں نمایاں تبدیلی دیکھنے لگی۔

شمونہ نے موقع پیدا کر کے وزیرِ اعظم سمیری کے ساتھ مختصر سی ملاقات کی اور اسے بتایا کہ وہ اپنا کام کر رہی ہے اور سلطان میں تبدیلی آ رہی ہے۔ تبدیلی یہ کہ وہ اب کسی

کسی وقت گہری سوچ میں کھو جاتا اور بات سنجیدگی سے کرتا تھا۔ وزیرِ اعظم نے اسے یہ نئی بات بتائی کہ طبیب نے کہا ہے کہ جس مشروب میں کوئی نشہ خواہ وہ حشیش ہی ہو، ملا ہُوا ہو، اس میں یہ سفوف معمول کی دوگنی مقدار سے ڈال دو تو بھی نشہ اثر نہیں کرتا۔

طبیب کی یہ ہدایت شمونہ کے لئے بڑی آسان تھی۔ روزانہ مشروب غسل خانے کی نالی میں گرانا خطرناک تھا۔ وہ کسی بھی وقت پکڑی جا سکتی تھی۔ اس نے اب یہ طریقہ اختیار کیا کہ روزینہ نشے والا مشروب صراحی میں ڈالتی تو شمونہ اس میں اپنا سفوف زیادہ مقدار میں ملا دیتی۔

خانہ جنگی دُور دُور تک پھیل گئی تھی۔ سرکاری فوج لڑ تو رہی تھی لیکن اس کی طاقت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اس فوج کو باطنیوں نے مسلمانوں کے روپ میں پورا کیا اور اس میں شامل ہو گئے تاکہ یہ آگ جلتی رہے۔ امن و امان تباہ ہو گیا تھا۔ لوگوں کو کھانے کے لئے اناج بھی نہیں ملتا تھا۔ جو لوگ نہ سرکاری فوج کے ساتھ تھے نہ باغیوں کے ساتھ تھے، وہ تو ڈر کے مارے باہر ہی نہیں نکلتے تھے۔ باطنی شہر میں بھرتے چلے جا رہے تھے اور صاف نظر آنے لگا تھا کہ کسی بھی دن حسن بن صباح یہاں آن دھمکے گا اور سلطان کی گدّی پر بیٹھ کر سلطان برکیارق کو قتل کر دے گا۔

ایک روز شمونہ وزیرِ اعظم سے ملی اور اسے کہا کہ وہ طبیب سے کوئی ایسا زہر لا دے جو جسم میں جاتے ہی جسم کو بے جان کر دے..... وزیرِ اعظم نے اُسی روز ایک زہر شمونہ کو دے دیا جو شمونہ نے اپنے پاس چھپا کر رکھ لیا۔

○

ایک روز سلطان برکیارق نے اپنے آرام والے کمرے میں ہی وزیرِ اعظم سمیری کو بلایا۔ وزیرِ اعظم فوراً پہنچا۔

"کیا آپ نے خانہ جنگی کو روکنے کا کوئی طریقہ نہیں سوچا؟" — سلطان برکیارق نے عجیب سی بے بسی کے لہجے میں پوچھا اور آہ بھر کر بولا — "محترم سمیری! آپ میرے باپ ہیں۔ کوئی حل نکالیں۔ یہ خون میرے دماغ کو چڑھ رہا ہے"۔

عبدالرحمان سمیری سلطان برکیارق کی یہ بات سن کر حیران تو ہُوا ہی تھا لیکن اسے حیرت اس کے لہجے سے ہوئی۔ وہ تو غنودگی کی حالت میں بولا کرتا تھا یا اس کے لہجے میں رعونت ہوتی تھی۔ پھر وزیرِ اعظم یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ روزینہ کمرے میں داخل ہوئی

تو سلطان برکیارق نے اسے کہا کہ تم ذرا باہر ٹھہرو۔ روزینہ نے آنکھیں پھاڑ کر سلطان برکیارق کی طرف دیکھا اور اندر آگئی۔ وہ جب بھی دیکھتی کہ سپہ سالار حجازی یا وزیرِ اعظم آیا ہے تو دوڑ کر سلطان کے پاس آ بیٹھتی اور یوں باتیں کرتی تھی جیسے سلطنت کی حکمرانی اس کے ہاتھ میں ہو اور حکم اسی کا چل رہا ہو۔

"باہر کی صورتِ حال کیا ہے؟" ــــ روزینہ نے وزیرِ اعظم سے پوچھا۔

"روزینہ!" ــــ سلطان برکیارق نے بڑی جاندار آواز میں کہا ــــ "میں موجود ہوں تو تمہیں بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ باہر ٹھہرو"۔

روزینہ آہستہ آہستہ اٹھی اور قدم گھسیٹتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"میں آپ سے کچھ کہہ رہا تھا" ــــ سلطان برکیارق نے وزیرِ اعظم سے کہا ــــ "کہ کوئی طریقہ سوچیں کہ یہ خانہ جنگی رک جائے"۔

"میں تو سوچتا ہی رہتا ہوں" ــــ وزیرِ اعظم نے کہا ــــ "آپ سے بات کرتے جھجکتا ہوں۔ بات آپ کے ساتھ کرتا ہوں تو جواب محترمہ بیگم صاحبہ سے ملتا ہے..... سلطانِ محترم! خون جو بہہ رہا ہے یہ میری اور آپ کی گردن پر ہو گا۔ اس کی سزا صاف نظر آرہی ہے۔ نہ یہ سلطنت رہے گی نہ اس کا کوئی سلطان رہے گا نہ کوئی وزیرِ اعظم ہو گا۔ ہم ہوں گے لیکن غلام' زنجیروں سے بندھے ہوئے۔ ہمارے سر تن سے جدا کر دیئے جائیں گے..... اگر آپ اجازت دیں تو صلح سمجھوتہ کیا جا سکتا ہے"۔

"آپ کسی حل پر پہنچیں اور مجھے بتائیں" ــــ سلطان برکیارق نے کہا۔

شمونہ نے پہلی بار روزینہ کو خفگی یا مایوسی کی حالت میں دیکھا۔ شمونہ نے اس سے پوچھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک ہے یا وہ کوئی گڑبڑ محسوس کر رہی ہے۔ روزینہ نے اکھڑی ہوئی سی آواز میں جواب دیا۔ اُس وقت روزینہ پیالے میں کوئی مشروب ڈال رہی تھی۔

"میری طبیعت تو ٹھیک ہے" ــــ روزینہ نے کہا ــــ "سلطان کی طبیعت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔ ان کے لئے یہ خاص شربت تیار کر رہی ہوں۔ سلطنت کے غم نے ان کے دماغ پر بہت بُرا اثر کیا ہے۔ کبھی کبھی ان کی یہ حالت ہو جایا کرتی ہے تو میں انہیں یہ شربت پلایا کرتی ہوں۔ وزیرِ اعظم اٹھ کر جائیں گے تو انہیں یہ شربت پلا کر سُلا دوں گی پھر وہ ٹھیک ہو جائیں گے"۔

شمونہ سمجھ گئی کہ اس شربت میں یا تو حشیش کی زیادہ مقدار ملائی گئی ہے یا کوئی تیز

نشہ ملایا گیا ہے۔ شمونہ کو شک ہُوا کہ سلطان برکیارق نے اسے کوئی سخت بات کہہ دی ہے جس کی شمونہ کو توقع ہی تھی۔ شمونہ سلطان برکیارق کو اتنا زیادہ سفوف پلا چکی تھی کہ اب تک سلطان کو صحیح ذہنی حالت میں آجانا چاہئے تھا۔

روزینہ نے شربت وہیں پڑا رہنے دیا اور وہاں سے نکل گئی۔ وہ شاید یہ دیکھنے گئی تھی کہ وزیرِ اعظم چلا گیا ہے یا نہیں۔ شمونہ نے طبیب کا دیا ہُوا زہر اپنے کپڑوں میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے وہ پڑیا نکالی اور شربت میں ڈال کر حل کر دی۔

اس کے بعد فوراً" روزینہ آگئی اور کہنے لگی کہ وزیرِ اعظم نے لمبی ہی باتیں شروع کر دی ہیں' بہتر ہے کہ یہ شربت انہیں ابھی پلا دوں..... روزینہ نے پیالہ اٹھایا اور سلطان برکیارق کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ شمونہ اس کے پیچھے پیچھے گئی۔

روزینہ سلطان کے کمرے میں داخل ہوئی' شمونہ دروازے کے ساتھ باہر کھڑی رہی۔ اُسے روزینہ کی آواز سنائی دی ــــ "سلطانِ محترم! یہ شربت پی لیں آپ بہت تھکے ہوئے ہیں" ــــ یہ کہہ کر روزینہ کمرے سے نکلنے لگی۔ شمونہ آگے ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ سلطان برکیارق نے پیالہ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور وہ وزیرِ اعظم کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ بات ختم کرتے ہی اس نے یہ شربت پی لینا تھا جس میں شمونہ نے بڑا ہی تیز زہر ملا دیا تھا۔

سلطان برکیارق پیالہ اپنے منہ کی طرف لے جانے لگا تو شمونہ تیر کی طرح دروازے سے اس تک پہنچی اور بڑی گھبراہٹ میں کہا ــــ "مت پینا یہ شربت سلطان!" ــــ اس نے لپک کر وہ پیالہ سلطان کے ہاتھ سے لے کر تپائی پر رکھ دیا۔ روزینہ کمرے سے نکل چکی تھی' شمونہ کی اس حرکت سے واپس آگئی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے شمونہ!" ــــ روزینہ نے غصیلی آواز میں کہا ــــ "سلطان کے ہاتھ سے پیالہ کیوں چھین لیا ہے؟"

"سلطانِ محترم!" ــــ شمونہ نے روزینہ کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا ــــ "ابھی کسی کو بلا کر کہیں کہ ایک بلّی یا کتا یا کوئی اور جانور یہاں لے آئے اور پھر یہ شربت اسے پلا کر دیکھیں..... اس میں آپ کی بیگم نے زہر ملایا ہُوا ہے۔ اگر میں جھوٹی ثابت ہوئی تو اپنا سر پیش کر دوں گی"۔

روزینہ نے تو واہی تباہی بکنی شروع کر دی اور سلطان برکیارق حیرت سے کبھی

روزینہ کو اور کبھی شمونہ کو دیکھتا تھا۔ وزیرِاعظم سمیری کو معلوم تھا کہ شمونہ نے اس سے زہر منگوایا تھا۔ وہ دانشمند آدمی تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ شمونہ نے کوئی چال چلی ہے۔ سلطان کے حکم کے بغیر وزیرِاعظم باہر گیا اور ایک خادم سے کہا کہ ایک بلّی یا کتا فوراً پکڑ کر لائے۔

روزینہ وہیں کھڑی رہی اور شمونہ کو دھمکیاں دیتی رہی۔ وہ تو سچّی تھی کیونکہ اس نے شربت میں زہر نہیں ملایا تھا۔ اسے صرف یہ ڈر تھا کہ اس شربت میں اس نے ذرا تیز نشہ ملایا تھا۔ بلّی یا کتے کو پلانے کی صورت میں یہ ہونا تھا کہ اس جانور نے تھوڑی دیر بعد گر کر سو جانا تھا۔

سلطان کا حکم تھا اس لیے ایک کتا فوراً حاضر کیا گیا۔ سلطان نے کتا لانے والے سے کہا کہ اس پیالے میں جو شربت ہے یہ کتے کے منہ میں انڈیل دو۔ خادم نے کتے کا منہ کھولا اور شمونہ نے آدھا پیالہ شربت کتے کے حلق سے نیچے اتار دیا۔ سلطان نے کہا اس کتے کو چھوڑ دو۔ کتے کو چھوڑ دیا گیا۔

کتا کمرے سے باہر کو چل پڑا۔ دہلیز سے بھی آگے چلا گیا لیکن اس سے آگے اس کے قدم لڑکھڑائے اور وہ رک گیا۔ اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلیں اور وہ گر پڑا۔ ذرا سی دیر اس کی ٹانگیں کانپیں اور پھر ٹانگیں ساکت ہو گئیں۔ کتا مر گیا تھا۔

سلطان برکیارق فوراً اٹھا اور اس نے قہر بھری نظروں سے روزینہ کو دیکھا۔ اس نے اس کمرے میں داخل ہوتے ہی روزمرّہ کی طرح کمربند سے لمبا خنجر نکال کر قریب ہی تپائی پر رکھ دیا تھا۔ سلطان نے کچھ بھی نہ کہا۔ لپک کر خنجر اٹھایا' اس کی نیام کھینچ کر پرے پھینکی اور روزینہ کی طرف بڑھا۔ روزینہ اس سے دو ہی قدم پرے کھڑی حیرت کا مجسمہ بنی ہوئی تھی۔

"نہیں سلطان!" —— وزیرِاعظم سمیری نے برکیارق کی طرف لپکتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا —— "یہ کام آپ کا نہیں' جلّاد کا ہے"۔

وزیرِاعظم کا آخری لفظ اس کی زبان پر ہی تھا کہ سلطان برکیارق کا خنجر روزینہ کے پیٹ میں اتر چکا تھا۔ اس نے خنجر کھینچا اور کہا —— "لوگ سچ کہتے تھے کہ یہ باطنی ہے اور اس ابلیس حسن بن صباح کی بھیجی ہوئی ہے" —— سلطان نے روزینہ کے گرنے سے پہلے ایک بار پھر خنجر روزینہ کی پسلیوں میں اتار دیا۔ روزینہ گری' سلطان نے خنجر کھینچ لیا

اور فرش پر پھینک دیا۔

سلطان نے کچھ دیر آخری سانس لیتی ہوئی روزینہ کو دیکھا اور اس کے بہتے ہوئے خون کو دیکھا۔ شمونہ اور وزیرِاعظم بھی روزینہ کو مرتا ہُوا دیکھ رہے تھے۔

"محترم سمیری!" —— سلطان برکیارق نے غم سے بوجھل آواز میں کہا —— "اسے یہاں سے اٹھوا دیں۔ لاش اٹھانے والوں سے کہہ دیں کہ اسے کفن نہیں پہنایا جائے گا نہ ہی اس کا جنازہ پڑھا جائے گا۔ کتے کو بھی اٹھوا دیں اور کہیں ویرانے میں گڑھا کھود کر کتے کو بھی اس کے ساتھ دفن کر دیں"۔

سلطان کا سر ڈولنے لگا جیسے وہ چکرا کر گر پڑے گا۔ وزیرِاعظم نے لپک کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

"مجھے میری ماں کے پاس لے چلو" —— سلطان برکیارق نے کہا۔

"آپ چل سکیں گے؟" —— وزیرِاعظم سمیری نے پوچھا۔

"ہاں!" —— سلطان برکیارق نے کہا —— "چل کر جاؤں گا"۔

وہ وزیرِاعظم کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ ماں جس کمرے میں نظربند تھی' وہ قریب ہی تھا۔ برکیارق اپنے سہارے چلتا وہاں پہنچا۔ وزیرِاعظم ساتھ تھا اور شمونہ پیچھے کھڑی دیکھ رہی تھی۔

برکیارق وزیرِاعظم کے ساتھ ماں کے کمرے میں داخل ہُوا۔ ماں غم کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ برکیارق کو دیکھ کر اس کے چہرے پر غصے کی سرخی آ گئی۔ برکیارق اس کو دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھا اور ماں کے قدموں میں گر پڑا پھر سر اس کی گود میں رکھ دیا۔

"مجھے بخش دو ماں!" —— سلطان برکیارق نے روتے ہوئے کہا —— "آپ کا بھٹکا ہُوا بیٹا آپ کی آغوش میں واپس آ گیا ہے"۔

"سلطان نے روزینہ کو قتل کر دیا ہے" —— وزیرِاعظم نے کہا —— "اور اب سلطان اپنی خواہش کا اظہار کر کے آپ کے قدموں میں آ گرے ہیں"۔

ماں نے برکیارق کو اٹھا کر اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اس کا منہ چومنے لگی۔

باہر خون بہہ رہا تھا۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا تھا اور باطنی جلتی پر تیل ڈال رہے تھے۔

جس وقت ماں برکیارق کو اپنے قدموں سے اٹھا کر اور بازوؤں میں لے کر اُس کا منہ چوم رہی تھی' اُس وقت چار پانچ شاہی ملازم روزینہ کی لاش اٹھا رہے تھے۔ وہ سب حیران تھے کہ یہ ہوا کیا اور یہ کیسے ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ سلطنتِ سلجوقیہ کا سلطان برکیارق ہی ہے لیکن حکم روزینہ کا چلتا تھا اور اس سلطنت کی تو وہ ملکہ تھی۔ شمونہ شاہی خاندان کی فرد نہیں تھی' وہ تو ایک کنیز تھی..... ایک خادمہ!..... ملازم اُس سے پوچھ سکتے تھے کہ اسے کس نے قتل کیا ہے۔

"یہ قتل ہو گئی ہے" — شمونہ نے بڑے شگفتہ لہجے میں جواب دیا — "اسے سلطان نے اپنے ہاتھوں قتل کیا ہے"۔

"اس سے کیا جرم سرزد ہو گیا تھا؟"

"کیا آپ نہیں جانتے تھے کہ یہ باطنی تھی؟" — شمونہ نے کہا — "یہ اُس شیطان حسن بن صباح کی بھیجی ہوئی تھی"۔

"اچھا ہوا سلطان کو پتہ چل گیا!" — عہدیدار نے دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا اور بولا — "اللہ تیرا شکر..... سب تعریفیں تیری ذات کے لئے ہیں..... سلطان کہاں ہیں؟"

"اپنی والدہ محترمہ کے پاس!" — شمونہ نے کہا — "اللہ نے اس سلطنت پر بڑا ہی کرم کیا ہے۔ اب آپس کا خون خرابہ بند ہو جائے گا"۔

"میرے دو بھائی تھے" — عہدیدار نے کہا — "وہ فوج میں عہدیدار تھے۔ دونوں اس خانہ جنگی میں مارے گئے ہیں۔ میرا گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے"۔

"شکر ادا کرو اللہ کا!" — شمونہ نے کہا — "اللہ تبارک و تعالیٰ نے سلطنت کو بچا لیا ہے..... یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی' مجھے آپ کے بھائیوں کا بہت افسوس ہے۔ یہ سب اسی کے ہاتھوں کرایا گیا ہے جس کی لاش آپ دیکھ رہے ہیں۔ سلطان حکم دے گئے ہیں کہ اس کی لاش اور مرا ہوا یہ کتا بوری میں ڈال کر کسی جگہ گڑھا کھود کر دبا دو۔ انہوں نے کہا ہے کہ اسے قبرستان میں دفن نہیں کرنا' نہ اسے کفن پہنانا ہے نہ اس کا جنازہ پڑھنا ہے..... اور یہ احتیاط بھی کرنا کہ کسی کو پتہ نہ چل سکے کہ سلطان نے اپنی بیگم کو قتل کر دیا ہے..... لاش اٹھوائیں اور فرش اچھی طرح صاف کروا دیں"۔

ایک بوری لائی گئی جس میں روزینہ کی لاش اور مرے ہوئے کُتے کو ڈالا گیا اور بوری کا منہ بند کر کے ملازم اٹھا لے گئے۔ دوسرے ملازم فرش دھونے لگے۔ شمونہ نکل کر برآمدے میں کھڑی ہو گئی۔ روزینہ کی لاش باہر والے دروازے سے بھی نکل گئی تھی۔ شمونہ گہری سوچ میں کھو گئی۔

"یہ ہے انسان کی اصل حقیقت!" — شمونہ کے ہونٹوں سے ذرا بلند سرگوشی نکل گئی۔

"کیا کہا شمونہ بی بی؟" — شمونہ کو ایک خادمہ کی آواز سنائی دی جو اُس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی لیکن شمونہ اسے دیکھ نہیں سکی تھی۔ خادمہ سمجھی کہ شمونہ نے اُسے کچھ کہا ہے۔ شمونہ نے اس کی طرف دیکھا اور چونکی۔

"میں کہہ رہی تھی کہ انسان اپنی حقیقت اور اصلیت کو بھول جاتا ہے" — شمونہ نے کہا — "یہ بدنصیب یوں سمجھ بیٹھی تھی جیسے یہ ہمیشہ اس سلطنت کی ملکہ بنی رہے گی۔ یہ اللہ کو بھول گئی تھی اور شیطان کی پجارن بن گئی تھی۔ حکمرانی کے نشے اپنا تختہ اپنے ہاتھوں اُلٹ دیا کرتے ہیں"۔

"عبرت تو کوئی حاصل نہیں کرتا" — خادمہ نے کہا — "جس کے سر پر سلطانی کا تاج رکھ دیا جاتا ہے وہ سب سے پہلے یہ بھولتا ہے کہ سدا بادشاہی اللہ کی ہے..... اس ملکہ کا انجام دیکھ لو۔ ایک کتے کے ساتھ دفن ہو رہی ہے"۔

"اور اس کی قبر بھی نہیں بنے گی" — شمونہ نے کہا — "کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکے گا کہ یہاں وہ عورت دفن ہے جس نے کچھ عرصہ اس سلطنت پر حکومت کی تھی اور سلطان کو بھی اپنا غلام بنا لیا تھا"۔

شمونہ اپنے خیالوں میں کھو گئی تھی۔ روزینہ کی لاش دُور نکل گئی تھی۔ محل کے باہر والے دروازے میں ایک عورت آن کھڑی ہوئی۔ دربان نے اُسے دیکھا اور سر سے اشارہ کیا۔ عورت اندر آ گئی۔

"شیطان کی دوسری پجارن آ گئی ہے" ــــ خادمہ نے کہا۔

"غور سے سُن لو" ــــ شمونہ نے خادمہ سے کہا ــــ "اسے یہ پتہ نہ چلے کہ روزینہ ماری جا چکی ہے۔ تم دیکھ رہی ہو کہ باہر والے دربان کو بھی معلوم نہیں کہ یہ جو بوری گھوڑا گاڑی میں محل سے نکالی گئی ہے' اس میں روزینہ کی لاش تھی..... تم یہاں سے چلی جاؤ اور سامنے نہ آنا"۔

یہ تھی وہ عورت جو روزینہ کے پاس آتی اور اس سے پیغام لے کر اُس طبیب تک پہنچاتی تھی جو حسن بن صباح کا بھیجا ہُوا خاص آدمی تھا اور جس نے زمین دوز طریقوں سے خانہ جنگی شروع کرائی تھی۔ یہ عورت پیغام لایا بھی کرتی تھی۔ اس کی عمر 35 سال کے لگ بھگ تھی اور وہ خوبصورت عورت تھی۔ ایسا لباس پہنتی تھی کہ کسی شاہی خاندان کی عورت معلوم ہوتی تھی۔ روزینہ نے اسے شمونہ کے متعلق بتا دیا تھا کہ یہ اس کی ہمراز کنیز ہے اور حسن بن صباح کی غائبانہ معتقد اور مرید ہے۔ اس کی وجہ سے یہ عورت شمونہ کے ساتھ بھی کچھ بے تکلف ہو گئی تھی۔ شمونہ کسی کو اپنے ساتھ بے تکلف کرنے کے فن میں مہارت رکھتی تھی۔ اس عورت کے ساتھ شمونہ کی اچھی خاصی دوستی پیدا ہو گئی تھی۔

یہ عورت ذرا قریب آئی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ شمونہ بھی کھُل کر مسکرائی اور اس کے استقبال کو آگے بڑھی۔

"کون سے کمرے میں ہیں؟" ــــ اس عورت نے روزینہ کے متعلق پوچھا۔

شمونہ کو کہنا تو یہ چاہئے تھا کہ اب وہ کسی بھی کمرے میں نہیں بلکہ ایک کُتے کے ساتھ بوری میں بند ہے اور شاید اب تک زمین میں بھی دبائی جا چکی ہو گی لیکن شمونہ نے یوں نہ کہا نہ ہی اسے ایسا کہنا چاہئے تھا۔

"آپ آئیں تو سہی!" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "آج آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ سلطان کے پاس ہیں اور شاید انہیں معلوم تھا کہ آپ آ رہی ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ آئیں گی تو میں آپ کو کمرے میں بٹھاؤں..... آ جائیں"۔

شمونہ اُسے اُس کمرے میں لے گئی جہاں وہ روزینہ کے ساتھ کانا پھُوسی کیا کرتی تھی۔ اسے احترام سے بٹھایا اور کہا کہ میں آپ کے لئے کچھ لاتی ہوں۔ روزینہ اس عورت کی بہت خاطر تواضع کیا کرتی تھی۔ شمونہ بھی یہی اشارہ دے کر کمرے سے نکل گئی کہ وہ اُس کی خاطر تواضع کرے گی۔

تھوڑی ہی دیر بعد شمونہ جب اس کمرے میں واپس آئی تو اُس کے ساتھ محل کے دو محافظ تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بڑی لمبی رسّی تھی۔

"اس کے ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ دو اور اس کے پاؤں بھی باندھ دو" ــــ شمونہ نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

محافظ آگے بڑھے تو وہ عورت حیرت زدگی کے عالم میں شمونہ کی طرف دیکھنے لگی۔ دونوں محافظوں نے اسے گرا کر اس کے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ دیئے اور پھر اسی رسّی کے ساتھ پاؤں بھی باندھ دیئے۔ اس دوران وہ چیختی اور چلّاتی رہی اور شمونہ سے پوچھتی رہی کہ یہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔

"اسے فرش پر پھینک دو" ــــ شمونہ نے محافظوں سے کہا ــــ "اور دروازہ باہر سے بند کر دو"۔

شمونہ محافظوں کے ساتھ باہر نکل آئی اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ شمونہ وہیں کھڑی کچھ سوچنے لگی۔

"تم دونوں یہیں ٹھہرو" ــــ شمونہ نے محافظوں سے کہا ــــ "میں سلطان کو اطلاع دینے جا رہی ہوں"۔

○

سلطان برکیارق اپنی ماں کے سامنے بیٹھا تھا۔ ماں کے چہرے پر ایک مدت بعد رونق آئی تھی۔ برکیارق کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ وزیراعظم عبدالرحمٰن سمیری اُس کی ماں کو سنا چکا تھا کہ روزینہ کو برکیارق نے کیوں اور کس طرح قتل کیا ہے۔ ماں نے جب یہ سنا کہ روزینہ اس کے بڑے بیٹے کو زہر پلا رہی تھی تو ماں تڑپ اٹھی اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر آسمان کی طرف کئے اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کا بیٹا بچ گیا۔

دربان کمرے میں داخل ہُوا۔ سب نے اس کی طرف دیکھا۔

"سلطان محترم کی کنیز آئی ہے" ــــ دربان نے کہا ــــ "اندر آنے کی اجازت

چاہتی ہے"۔

"اسے فوراً اندر بھیج دو" ـــــ برکیارق کی ماں نے کہا ـــــ "یہ تو اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ ہے جس نے میرے بیٹے کی جان بچائی ہے اور سلجوقی سلطنت کو بہت بڑے خطرے سے محفوظ کر دیا ہے"۔

شمونہ کمرے میں داخل ہوئی۔ برکیارق کی ماں اٹھی اور لپک کر شمونہ کو گلے لگا لیا۔ وہ شمونہ کو چومتی اور اس کا شکر ادا کرتی تھی۔

"میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے" ـــــ شمونہ نے کہا ـــــ "میں اسی مقصد کے تحت روزینہ کی کنیز بنی تھی...... یہ باتیں بعد میں کریں گے۔ میں سلطان عالی مقام کو یہ اطلاع دینے آئی ہوں کہ روزینہ کی لاش کتّے کے ساتھ بوری میں بند کر کے لے گئے ہیں اور دوسری اطلاع اس سے زیادہ ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اتفاق سے ایک عورت آ گئی ہے جسے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ روزینہ کو پیغام دینے اور اس کے پیغام لے جانے آیا کرتی تھی۔ یہ پیغام حسن بن صباح کی طرف سے آتے تھے۔ میں نے روزینہ کے ساتھ بھی بے تکلفی پیدا کر لی تھی اور اس عورت کے ساتھ بھی۔ ابھی ابھی تو میں نے اسے یہ کہہ کر کمرے میں بٹھا دیا کہ روزینہ کو اطلاع دیتی ہوں۔ میں محافظ دستے کے دو آدمی ساتھ لے گئی اور ایک رسّی بھی۔ میرے کہنے پر انہوں نے اس عورت کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے ہیں اور اسے ایک کمرے میں بند کر دیا ہے۔ یہ ہے وہ عورت جس سے آپ کو بڑے ہی قیمتی اور چونکا دینے والے راز ملیں گے تب آپ کو پتہ چلے گا کہ اس سلطنت پر کتنا بڑا خطرہ منڈلا رہا تھا اور مجھے امید ہے کہ آپ نے بروقت کارروائی کی تو یہ خطرہ ٹل جائے گا اور آپ کو پتہ چلے گا کہ اس شہر میں کتنے زیادہ باطنی اکٹھے ہو گئے ہیں"۔

سلطان برکیارق کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ شمونہ کون ہے اور اس نے اس مقصد کو اپنا فرض کیوں بنایا تھا۔ وہ تو اسے ایک کنیز سمجھتا تھا جو کسی مجبوری کے تحت نوکری کی تلاش میں آئی تھی۔ اصل حقیقت تو عبدالرحمٰن سمیری جانتا تھا۔

"تم یہ ساری باتیں کس طرح جانتی ہو؟" ـــــ سلطان برکیارق نے شمونہ سے پوچھا۔

"اس سوال کا جواب بعد میں دوں گی" ـــــ شمونہ نے جواب دیا ـــــ "ہو سکتا ہے اس کا جواب سلطان کو کوئی اور دے"۔

"تم وہیں چلو" ـــــ برکیارق نے شمونہ سے کہا ـــــ "اس عورت کو کمرے میں بند رہنے دو"۔

سلطان برکیارق اپنے وزیرِ اعظم سمیری سے کہہ چکا تھا کہ خانہ جنگی "فوراً" بند کر دی جائے لیکن مشکل یہ تھی کہ کچھ پتہ نہیں تھا کہ لڑائی کہاں کہاں ہو رہی ہے۔ سرکاری فوج تک تو حکم پہنچایا جا سکتا تھا لیکن باغی فوج تک حکم پہنچانا محال ہو رہا تھا کیونکہ یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے سالار وغیرہ کہاں ہیں۔ سالار اوریزی روپوش تھا اور اس باغی فوج کی کمان برکیارق کے چھوٹے بھائی محمد کے ہاتھ میں تھی اور سلطان تک یہ اطلاع بھی پہنچ گئی تھی کہ رے سے امیرِ شہر ابو مسلم رازی نے بھی اپنی فوج بلکہ ایک بڑا لشکر تیار کر کے محمد اور سالار اوریزی کی مدد کے لئے بھیجا ہے۔ اب یہ پتہ چلانا تھا کہ محمد اور سالار اوریزی کہاں ہیں۔

وزیرِ اعظم عبدالرحمٰن سمیری نے تین چار قاصد بلوائے۔ ایک کو تو سرکاری فوج کے سپہ سالار ابو جعفر حجازی کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا گیا کہ اپنی فوج کو اکٹھا کر کے شہر میں لے آئے اور جنگ بند کر دے۔ باقی قاصدوں کو یہ کام دیا کہ وہ کسی طرح یہ معلوم کریں کہ سالار اوریزی اور محمد کہاں ہیں اور انہیں یہ پیغام دیں کہ سلطان برکیارق نے اپنی والدہ محترمہ کے حکم سے جنگ بند کرنے کا اعلان کر دیا ہے اور وہ دونوں ہمارے پاس پہنچ جائیں۔

خانہ جنگی بند کرانا کوئی آسان کام نہیں تھا کیونکہ خانہ جنگی کی صورت یہ نہیں تھی کہ دونوں طرفوں کی فوجیں ایک میدان میں لڑ رہی ہوں۔ لڑائی کی صورت یہ پیدا ہو گئی تھی کہ سرکاری اور باغی فوجیں چھوٹے بڑے دستوں میں بٹ گئی تھیں اور یہ جنگ شہر سے نکل کر مضافات میں اور اس سے بھی دُور دُور جنگلوں میں پھیل گئی تھی۔ ایک دوسرے پر شب خون مارے جاتے تھے اور کہیں دستے آپس میں جم کر لڑتے تھے۔ دونوں طرف زخمی اور ہلاک ہو رہے تھے۔ بعض کی لاشیں ان کے گھروں تک پہنچ جاتی تھیں اور اکثر لاشیں وہیں گھوڑوں تلے روندی کچلی جاتی تھیں۔

یوں بھی ہوتا تھا کہ سرکاری یا باغی فوج کا کوئی آدمی مارا جاتا اور اس کی لاش گھر آ جاتی تو اس کا کوئی بھائی یا باپ یا چچا وغیرہ اسے ذاتی یا خاندانی قتل سمجھ کر انتقام کے لئے خانہ جنگی میں شامل ہو جاتا۔ باطنیوں نے لوگوں کا یہ ردِّ عمل اور انداز دیکھا تو انہوں نے

طبیب کو بتایا۔ طبیب تخریب کاری کا ماہر تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو ایک خصوصی ہدایت نامہ جاری کیا۔ جس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہو گیا کہ کسی آدمی کی لاش شہر میں آتی تو اس کے گھر والوں کو بتایا جاتا کہ اسے فلاں آدمی نے لڑائی میں قتل کیا ہے۔ مقتول کے گھر کے آدمی اس آدمی کے گھر پر ٹوٹ پڑتے اور ان کے ایک دو آدمیوں کو قتل کر دیتے۔ یہ سلسلہ یوں آگے چلایا گیا اور باطنی تخریب کار کسی گھر میں آکر یہ اطلاع دیتے کہ تمہارا جو آدمی لڑنے گیا تھا وہ آدمی مارا گیا ہے اور اُس کی لاش کو گھوڑوں تلے کچل اور مسل دیا گیا ہے اور اسے فلاں آدمی نے قتل کیا ہے۔ اس اطلاع کا ردِّعمل بھی یہی ہوتا کہ مقتول کے وارث اُس گھر کے کسی آدمی کو قتل کر دیتے۔ اس طرح اس خانہ جنگی میں یہ نیا پہلو پیدا ہو گیا جس نے لوگوں کے درمیان ذاتی دشمنی پیدا کر دی۔ شہر کے لوگ اپنے گھروں کے دروازے اندر سے مقفل رکھتے تھے۔

بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ یہ خانہ جنگی دو سال جاری رہی تھی لیکن مستند مؤرخ کچھ حوالے دے کر لکھتے ہیں کہ خانہ جنگی ایک سال اور ایک یا دو مہینے لڑی گئی تھی اور اس نے سلطنت اور لوگوں کو بھی بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان پہنچایا تھا۔ سب سے بڑا نقصان تو یہ تھا کہ سلطنت کا انتظام تہ و بالا ہو گیا تھا اور اس سے بھی بڑا نقصان یہ ہوا کہ حسن بن صباح نے بڑے وسیع و عریض علاقے پر قبضہ کر لیا یا یوں کہئے کہ ان علاقوں کو اس نے زیرِ اثر لے لیا۔ سلطنتِ سلجوقیہ کو خانہ جنگی میں الجھا کر اس نے اپنا مقصد بڑی آسانی سے پا لیا تھا۔ اسے صرف سلطنت کی فوج روک سکتی تھی لیکن اس سلطنت کو اس نے خاک و خون کے بڑے ہی خوفناک کھیل میں الجھا دیا۔ سرکاری فوج کا سپہ سالار ابو جعفر حجازی چونکہ شہر میں ہی تھا اور یہیں سے لڑائی کو کنٹرول کر رہا تھا اس لئے وزیراعظم عبدالرحمٰن سمیری کے قاصد کے پہنچتے ہی وہ آ گیا۔ اُس نے سلطان برکیارق کو اپنی ماں کے پاس بیٹھا دیکھا تو وہ کچھ پریشان بھی ہُوا اور حیران بھی۔

"حجازی!" — سلطان برکیارق نے کہا — "جنگ فوراً بند کر دو اور اپنی فوج کو اس شہر میں بلا لو"۔

"سلطانِ عالی مقام!" — حجازی نے کہا — "سلطان کے حکم کی تعمیل فوراً ہو گی لیکن دستے کچھ ایسے بکھر گئے ہیں کہ انہیں لڑائی سے ہٹانا اور شہر میں لانا بڑا ہی دشوار اور وقت طلب کام ہے"۔

"کوشش کرو یہ کام ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر شروع ہو جائے" — سلطان برکیارق نے کہا — "اور یہ بھی سن لو کہ ہم نے سالار اوریزی کو معاف کر دیا ہے۔ کسی اور کو بھی گرفتار یا ہلاک یا زخمی نہیں کرنا۔ تلواریں نیاموں میں ڈال لو"۔

سپہ سالار حجازی فوراً روانہ ہو گیا۔

○

"سلطانِ محترم!" — وزیراعظم سمیری نے کہا — "خانہ جنگی کو روکنے اور دونوں اطراف فوجوں کو الگ الگ کر کے شہر میں لانے کے لئے کچھ دن تو چاہئیں، کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ہم اس عورت سے کچھ پوچھ گچھ کر لیں جسے کنیز نے پکڑا ہے۔ راز کی باتیں تو اس سے معلوم ہوں گی لیکن میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ حسن بن صباح کی تربیت یافتہ عورتیں یا آدمی اپنی جانیں دے دیتے ہیں راز نہیں دیا کرتے"۔

"ہاں!" — سلطان برکیارق نے کہا — "یہ خطرہ تو ہے لیکن ہم کوشش کرتے ہیں، شاید اس عورت کی زبان سے کچھ اگلوا سکیں۔ ہمیں ناکامی ہوئی تو زندہ یہ بھی نہیں رہے گی..... میں اپنی اس کنیز نگینہ کا احسان ساری عمر نہیں بھول سکوں گا۔ اگر ماں نے مجھے اجازت دے دی تو میں اس کے ساتھ شادی کر لوں گا"۔

شمونہ نے روزینہ اور سلطان برکیارق کو اپنا نام نگینہ بتایا تھا اس لئے برکیارق اسے نگینہ ہی سمجھ رہا تھا۔ اس کا نام عبدالرحمٰن سمیری کو معلوم تھا لیکن اس نے سلطان کو ابھی اصل نام نہ بتایا۔

"میرے بیٹے!" — ماں نے برکیارق سے کہا — "یہ خون خرابہ رک جائے اور سلطنت پر خطروں کی گھٹائیں منڈلا رہی ہیں، یہ اُڑ جائیں تو میں تمہیں شادی کی اجازت بھی دے دوں گی اور میرا خیال ہے کہ اس سے بہتر اچھی لڑکی کوئی اور نہیں ہو گی"۔

وزیراعظم سمیری نے جب یہ سنا کہ سلطان شمونہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے اور سلطان کی ماں بھی اسی لڑکی کو پسند کر رہی ہے تو اسے پریشانی سی ہوئی کیونکہ شمونہ مزمّل آفندی کی محبت میں گرفتار تھی اور اس نے مزمّل کے ساتھ ہی شادی کرنی تھی۔ سمیری کو پریشانی یہ تھی کہ جب یہ صورت پیدا ہو گی کہ سلطان شمونہ سے شادی کا فیصلہ کرے گا تو اسے کس طرح قائل کیا جا سکے گا کہ شمونہ سے ہاتھ اٹھا دے اور اسے دل سے نکال دے کیونکہ یہ مزمّل کے ساتھ منسوب ہے۔

دونوں اُس کمرے میں گئے جہاں وہ عورت اوندھے منہ فرش پر پڑی تھی اور اُس کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ سلطان برکیارق نے محافظ دستے کے کماندار کو بلایا اور اسے کہا کہ اس عورت کے ہاتھ پاؤں کھول دے۔

ذرا سی دیر میں عورت کے ہاتھ پاؤں کھل گئے اور وہ واہی تباہی بکنے لگی کہ سلطان کی ایک ادنیٰ سی کنیز نے اس کے ہاتھ پاؤں بندھوا دیئے تھے۔

"تم ہو کون؟" — سلطان برکیارق نے پوچھا — "اور یہاں کیا لینے آئی تھیں؟"

"میں سلطانِ عالی مقام کی بیگم کی سہیلی ہوں" — عورت نے جواب دیا — "میں ان کے پاس آتی رہتی ہوں۔ آج آئی تو آپ کی کنیز نے....."

"تمہیں رسّیوں سے بندھوا دیا" — سلطان برکیارق نے اس کی بات کاٹ کر کہا — "اور تمہیں میری بیگم دیکھنے نہیں آئی..... تم کس کی بیٹی ہو؟ تم کس کی بیوی ہو؟ تمہارا گھر کہاں ہے؟ مجھے ٹھیک جواب دو اور میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر چلوں گا"۔

"میرا نام رابعہ ہے" — عورت نے جواب دیا — "میں شاہ در کی رہنے والی ہوں اور یہاں اپنے خاوند کے ساتھ رہتی ہوں لیکن میں آپ سے یہ عرض کروں گی کہ میرے گھر نہ آئیں کیونکہ میرا شوہر بڑا ہی ظالم آدمی ہے اور وہ وہمی بھی ہے۔ اگر آپ یا کوئی اور میرے گھر آیا تو میرا خاوند مجھ پر نہ جانے کیسے کیسے الزام تھوپ دے اور میری پٹائی شروع کر دے۔ میں شاہ در کے ایک قبیلے کے سردار کی بیٹی ہوں"۔

"تمہارا نام رابعہ نہیں ہے" — وزیرِ اعظم عبدالرحمٰن سمیری نے کہا — "تمہارا باپ کسی بھی قبیلے کا سردار نہیں نہ تمہارا کوئی خاوند ہے..... میری ایک بات غور سے سن لو۔ اپنی اصلیت فوراً بتا دو۔ اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ اگر تمہارا یہ ارادہ ہے کہ تم کوئی راز اگلنے سے پہلے اپنے آپ کو ہلاک کر لو گی تو یہ خیال دل سے نکال دو"۔

سمیری نے محافظ دستے کے کماندار سے کہا — "اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر پیچھے کر لو"۔

رابعہ فوراً اٹھی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی ناف پر رکھ لئے۔ کماندار طاقتور آدمی تھا۔ اس نے پیچھے ہو کر عورت کے دونوں بازو پکڑے اور بڑی زور سے جھٹکا دے کر بازو اس کی پیٹھ کے پیچھے کر لئے۔ سمیری آگے بڑھا اور اس کی قمیض اوپر کر دی۔ اس نے سلطان برکیارق سے کہا کہ یہ دیکھ لے۔ عورت نے نیفے میں ایک خنجر اُڑسا ہُوا تھا۔

سمیری نے یہ خنجر اس کے نیفے سے نکال لیا۔

"سلطانِ محترم!" — سمیری نے برکیارق سے کہا — "اس خنجر کی نوک یقیناً زہر میں بجھی ہوئی ہے۔ کسی جانور کو مار کر دیکھ لیں"۔

وزیرِ اعظم سمیری نے اس عورت کے بال مٹھی میں پکڑ کر بڑی زور سے جھٹکا دیا۔ عورت کے دانت بج اٹھے۔ دوسرا جھٹکا دے کر سمیری نے اس کا سر پیچھے کر دیا۔

"ہم تمہیں مرنے نہیں دیں گے" — سمیری نے کہا — "ایسی اذیتیں دیں گے کہ مرو گی بھی نہیں اور زندہ بھی نہیں رہو گی۔ حسن بن صباح تمہیں ہم سے چھڑا نہیں سکے گا..... کہو، سچ بولتی ہو؟"

"کیا سچ بولوں؟" — رابعہ نے کہا — "کیا آپ لوگوں میں اتنی بھی تہذیب نہیں کہ میں اتنے بڑے باپ کی بیٹی....."

وزیرِ اعظم سمیری نے اس کی بات پوری نہ ہونے دی اور بڑی زور سے جھٹکا دیا جس سے وہ پیچھے دیوار کے ساتھ ٹکرائی۔ محافظوں کا کماندار آگے بڑھا۔

"مجھے اجازت دیں کہ میں اس کی زبان کھولوں" — کماندار نے کہا۔

سلطان برکیارق کے اشارے پر کماندار رابعہ کی طرف بڑھا اور اُس کی گردن اور اُس کے کندھے کے درمیان میں کوئی رگ اپنی مٹھی میں لے کر دبائی۔ رابعہ تڑپنے لگی اور اس کا منہ کھل گیا۔ یہ عورت اتنے طاقتور کماندار کی مٹھی میں ایسے ہی تھی جیسے شیر نے ایک خرگوش کو اپنے منہ میں لے رکھا ہو۔

"کہو میں باطنی ہوں" — کماندار نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی کماندار نے مٹھی اور زور سے دبائی تو عورت کا چہرہ لال سرخ ہو گیا اور وہ اور زیادہ تڑپنے لگی۔ کماندار نے ایک بار پھر کہا کہ وہ کہے کہ میں باطنی ہوں۔

رابعہ نے اپنا سر زور زور سے ہلایا جیسے وہ اقرار کر رہی ہو۔ کماندار نے اس کی رگ چھوڑ دی۔ وہ فرش پر گری اور ایک ہاتھ سے وہ رگ دبانے لگی۔ اس کا چہرہ بتاتا تھا وہ ابھی تک تکلیف میں ہے۔

"بولو" — کماندار نے اسے پاؤں کی ٹھوکر خاصے زور سے لگا کر کہا۔

"مجھے قتل کر دو" — رابعہ نے روتے ہوئے کہا — "اگر میں اپنا سینہ کھول کر راز آپ کے آگے انڈیل دیتی ہوں تو بھی مجھے قتل کر دیا جائے گا۔ وہ یوں قتل نہیں

کریں گے کہ میری گردن کاٹ دیں گے بلکہ بڑی ہی اذیت ناک موت ماریں گے۔ میرے تمام کپڑے اتار کر میرے جسم پر شہد مَل دیں گے پھر میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر باہر جنگل میں پھینک دیں گے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ کیڑے مکوڑے اور مکھیاں کس طرح مجھے کھائیں گی۔ بچھو اور دوسرے زہریلے کیڑے بھی میری کھال کو کاٹتے رہیں گے۔ میں نے اس طرح ایک عورت کو مرتے دیکھا ہے۔ وہ پورے دس دن تڑپتی رہی تھی اور حشرات الارض آہستہ آہستہ اس کی کھال کو کھاتے رہے تھے۔ میں اس موت سے ڈرتی ہوں"۔

"مت ڈرو" ـــ سلطان برکیارق نے کہا ـــ "میں تمہیں ساری عمر یہیں اسی محل میں رکھوں گا۔ چاہو گی تو کسی اچھے آدمی کے ساتھ تمہاری شادی کرا دوں گا۔ یہاں آرام سے عمر گزارو گی اور بڑے ہی عیش و عشرت میں رہو گی"۔

"اگر جھوٹ بولو گی تو سُن لو" ـــ وزیراعظم سمیری نے کہا ـــ "تمہیں قید خانے میں بڑی ہی بدبودار کوٹھڑی میں پھینک دیا جائے گا جس میں چوہے اور زہریلے کیڑے رہتے ہیں۔ دن کے وقت تمہیں الٹا لٹکا کر نیچے دہکتے انگارے رکھ دیئے جایا کریں گے اور ان پر ایک آدمی مرچیں پھینکتا رہے گا۔ تصور میں لاؤ کہ مرچوں کا دھواں تمہاری ناک اور منہ کے راستے تمہارے اندر جائے گا تو تمہاری کیا حالت ہو گی۔ رات کو تمہیں اس کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے گا..... بہتر ہے کہ تم اپنی اصلیت بتا دو اور تمہارا رابطہ حسن بن صباح کے جن لوگوں کے ساتھ ہے وہ بتا دو کہاں کہاں رہتے ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں چلنے دیا جائے گا کہ ہمیں یہ راز تم نے دیا ہے"۔

مسلمان مؤرخوں نے اور یورپی مؤرخوں نے بھی متفقہ طور پر لکھا ہے کہ حسن بن صباح کے فدائیوں کو ایسی تربیت دی جاتی تھی کہ ان کی فطرت ہی بدل جاتی تھی۔ ان کے لئے زندگی اور موت کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ زندہ رہتے تھے تو صرف حسن بن صباح کے احکام کی تعمیل کے لئے زندہ رہتے تھے اور جب اپنی جانیں لینے پر آتے تھے تو بڑے فخر اور اطمینان سے اپنی جانیں دے دیتے تھے۔ ہر فدائی کے پاس، وہ عورت ہوتی یا مرد، ایک خنجر ہوتا تھا جس کی نوک زہر میں بجھی ہوتی تھی۔ ان میں سے کوئی پکڑا جاتا اور وہ دیکھتا کہ فرار کا کوئی راستہ نہیں اور راز اگلنا ہی پڑے گا تو وہ خنجر نکال کر اپنے دل میں اتار لیتا تھا۔ رابعہ نے بھی اپنے پاس ایک خنجر اسی مقصد کے لئے رکھا ہوا تھا لیکن

وزیراعظم عبدالرحمٰن سمیری جانتا تھا کہ ہر فدائی کے پاس خنجر ہوتا ہے۔ اس نے اس عورت کے لباس سے خنجر نکال لیا۔ اس خنجر کی موجودگی ہی یہ پکا ثبوت تھا کہ وہ حسن بن صباح کی تربیت یافتہ عورت ہے۔ سلطان برکیارق کے ذہن میں اگر ابھی تک کوئی شک باقی تھا تو وہ بھی نکل گیا۔

"میں اپنے دو بچوں کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہوں" ـــ رابعہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا ـــ "دونوں ابھی چھوٹے ہیں"۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا خاوند بھی ہے" ـــ عبدالرحمٰن سمیری نے کہا ـــ "وہ بھی یقیناً فدائی ہو گا"۔

"میرا کوئی خاوند نہیں" ـــ رابعہ نے کہا ـــ "میں کبھی کسی کی بیوی نہیں رہی۔ ایک بچے کا باپ کوئی اور ہے اور دوسرے کا کوئی اور۔ میں نے اپنی زندگی شیخ الجبل حسن بن صباح کے نام وقف کر دی تھی۔ میری ساری عمر فریب کاری میں گزری ہے"۔

"وہ ہم جانتے ہیں" ـــ عبدالرحمٰن سمیری نے کہا ـــ "ہم جانتے ہیں کہ فدائی عورتیں کیا کچھ کرتی ہیں۔ ہمیں یہ بتاؤ کہ یہاں جو فدائی ہیں وہ کہاں کہاں رہتے ہیں"۔

"اس شہر کی ایک چوتھائی آبادی باطنیوں کی ہے" ـــ رابعہ نے کہا ـــ "کوئی ایک بھی اس شہر کا باشندہ نہیں۔ سب باہر سے آئے ہیں۔ میں اتنے زیادہ لوگوں کے گھر تو بتا نہیں سکتی، صرف ایک جگہ بتاتی ہوں۔ وہاں رات کو چھاپہ ماریں تو آپ کو فدائیوں کا ایک مرکز مل جائے گا۔ وہاں جو آدمی ہوں گے، ان کے متعلق میں اتنا ہی کہوں گی کہ ہر آدمی حسن بن صباح کا فدائی ہے"۔

اس نے طبیب کے گھر کا پتہ بتا دیا۔ پھر اس نے چند اور اہم آدمیوں کے نام اور ٹھکانے بتائے۔

"آپ کی سلطنت میں خانہ جنگی حسن بن صباح نے شروع کرائی تھی" ـــ رابعہ نے بتایا ـــ "سلطان کو مٹھی میں لینے اور انہیں کٹھ پتلی کی طرح استعمال کرنے کے لئے روزینہ کو بھیجا گیا تھا۔ روزینہ سلطان کو صبح شام ایک خاص قسم کی حشیش پلاتی رہتی تھی اور پھر اس کیفیت میں وہ اپنے حسن و جوانی کا طلسم استعمال کرتی تھی۔ سلطان تو جوان ہیں اور ان کے جذبات بھی جوان ہیں، روزینہ اور اُس جیسی لڑکیاں پتھروں کو بھی موم کر دیا کرتی ہیں۔ میں روزینہ اور طبیب کے درمیان ایک رابطہ ہوں۔ اگر روزینہ انکار کرتی

ہے اور کہتی ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں تو اسے میرے سامنے لائیں۔ میں آپ کو اس محل میں وہ جگہ دکھاؤں گی جہاں اس نے حشیش رکھی ہوئی ہے''۔

''کیا روزینہ مجھے قتل کرنا چاہتی تھی؟'' ـــ سلطان برکیارق نے پوچھا۔

''نہیں!'' ـــ رابعہ نے جواب دیا ـــ ''آپ پوری طرح اس کی مٹھی میں تھے۔ آپ کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ قتل صرف اُس صورت میں آپ کو کیا جاتا کہ آپ بیدار ہو کر اُس کی مٹھی سے نکل آتے..... ہاں، آپ کے دونوں بھائیوں کو، آپ کی ماں کو اور آپ کے وزیراعظم کو قتل کرنا تھا لیکن کچھ دیر بعد..... ایک بات اور بتاتی ہوں لیکن میں شک میں ہوں۔ آپ کی یہ جو کنیز ہے اس نے اپنا نام نگینہ بتایا ہے۔ مجھے کچھ ایسا شک ہوتا ہے کہ اس کا نام نگینہ نہیں کچھ اور ہے۔ میں لڑکپن میں حسن بن صباح کے پاس گئی تھی۔ مجھے دھوکے میں لے جایا گیا تھا۔ مجھے کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ یہ کنیز اُس وقت وہیں تھی۔ یہاں میں نے اسے دیکھا تو کچھ یقین بھی آنے لگا کیونکہ یہ روزینہ کے ساتھ پوری طرح بے تکلف تھی اور اس کی رازدار بھی تھی۔ کبھی کبھی حسن بن صباح کی باتیں بھی کرتی تھی اور روزینہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی یہ کنیز فطری طور پر باطنی ہے اور غائبانہ طور پر حسن بن صباح کی مرید ہے''۔

سلطان برکیارق نے اپنے وزیراعظم عبدالرحمٰن سمیری کی طرف دیکھا۔ وزیراعظم نے سلطان کو آنکھ کا ہلکا سا اشارہ کیا۔

''کیا تم اپنے بچوں کو یہاں لانا چاہو گی؟'' ـــ وزیراعظم سمیری نے رابعہ سے پوچھا۔

''کیا آپ مجھے جانے کی اجازت نہیں دیں گے؟'' ـــ رابعہ نے پوچھا۔

''نہیں!'' ـــ وزیراعظم سمیری نے کہا ـــ ''تم کہتی ہو کہ اپنے بچوں کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہو۔ اب تم صرف اس صورت میں زندہ رہو گی کہ یہیں رہو۔ تمہارے بچے یہاں آ جائیں گے۔ ہمیں بتاؤ کہ وہ کہاں ہیں''۔

''بچے ہی تو نہیں'' ـــ رابعہ نے کہا ـــ ''میرا اتنا قیمتی سامان بھی وہاں پڑا ہے''۔

''سب کچھ آ جائے گا'' ـــ سلطان برکیارق نے کہا ـــ ''تم صرف جگہ بتا دو''۔

رابعہ نے اپنا گھر اچھی طرح سمجھا دیا۔

''بچوں کو ابھی لے آئیں گے'' ـــ رابعہ نے کہا ـــ ''سامان رات کو اس طرح

لائیں کہ کسی کو پتہ نہ چلے ورنہ میں ماری جاؤں گی اور میرے بچے بھی محفوظ نہیں رہیں گے..... لیکن ایک بات تو میں نے سوچی ہی نہیں تھی'' وہ اب دماغ میں آئی ہے۔ اگر روزینہ یہاں ہے تو میں یہاں کس طرح رہ سکتی ہوں؟ وہ تو کسی وقت بھی مجھے قتل کروا دے گی یا دھوکے میں زہر پلا دے گی۔ اگر اس نے مجھے قتل نہ کیا تو میرے بچوں کو مروا ڈالے گی یا اغوا کرا دے گی۔ اس کے پاس ایک ایسا زہر ہے، جس کا کوئی ذائقہ ہی نہیں''۔

وزیراعظم عبدالرحمٰن سمیری اور محافظ دستے کے کماندار نے سلطان برکیارق کی طرف دیکھا۔ اس بات کا جواب سلطان ہی دے سکتا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ سلطان روزینہ کے قتل کو ابھی پردے میں رکھنا چاہتا ہے یا نہ جانے اس کا کیا خیال ہے۔

''تم روزینہ کو یہاں نہیں دیکھ سکو گی'' ـــ سلطان برکیارق نے کہا ـــ ''وہ دفن ہو چکی ہے۔ اس سارے محل میں گھوم پھر کر دیکھ لو۔ وہ زندہ نہیں''۔

''دفن ہو چکی ہے؟'' ـــ رابعہ نے حیرت سے پوچھا ـــ ''کیوں؟ کیا وہ بیمار ہو کر مر گئی ہے یا.....''

''ہم پر اس کی اصلیت بے نقاب ہو گئی تھی'' ـــ سلطان برکیارق نے جواب دیا ـــ ''میں نہیں جانتا کہ تمہیں حسن بن صباح سے کیا ملتا تھا۔ اگر یہ بتا دو تو یہاں سے تمہیں دگنا انعام اور معاوضہ ملے گا۔ اب تم وہی کام ہمارے لئے کرو جو تم حسن بن صباح کے لئے کرتی رہی ہو۔ پہلے تم آوارہ پھرتی رہی ہو، اب تم اس محل کی ایک قابلِ عزت فرد بنا دی جاؤ گی..... سوچ لو، اب تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی''۔

داستان گو پہلے بیان کر چکا ہے کہ حسن بن صباح کے کسی فدائی سے راز لینا ایسا ہی ناممکن تھا جیسے ایک پتھر سے دودھ کی دھاریں نکالی جائیں۔ یہ ایک معجزہ تھا کہ ایک فدائی عورت نے سارے ہی راز دے دیئے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ سلطان برکیارق، اس کے بھائی، اس کی ماں اور وزیراعظم اسلام کے تحفظ، بقا اور فروغ کے لئے لڑ رہے تھے اور ان کا ایمان تھا کہ اللہ ان کے ساتھ ہے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ رابعہ نے اپنی جوانی حسن بن صباح کے باطل عقیدے کو سینے سے لگائے گزار دی تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ حسن بن صباح نے اس کی فطرت ہی بدل ڈالی ہے لیکن ماں کا ایسا جذبہ ہے جو ماں کا دین و ایمان بھی ہلا ڈالتا ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے دو بچوں نے اسے راز اگلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بہرحال یہ ایک معجزہ تھا کہ رابعہ نے تمام راز دے دیئے اور بہت

سے آدمیوں کی نشاندہی بھی کی۔

○

سلطان برکیارق نے رابعہ کی رہائش کا انتظام کرنے کا حکم دے دیا اور یہ بھی کہ اس کے بچوں کو بھی یہاں لے آئیں..... وزیر اعظم عبدالرحمٰن سمیری نے کہا کہ اس عورت کی رہائش پر پہرہ ضرور ہونا چاہئے اور پہرہ ایسا ہو کہ اسے پتہ نہ چلے۔ دو تین ملازموں کو یہ فرض سونپ دیا جائے کہ وہ ہر وقت اس پر نظر رکھیں..... سلطان برکیارق نے اس مشورے کے مطابق حکم جاری کر دیا۔

اس کے بعد سلطان برکیارق نے باہر آ کر وزیر اعظم سے کہا کہ جنگ بند کرانا اس کا کام ہے اور وہ جس قدر جلدی ہو سکے یہ قتل و غارت رکوا دے۔

سمیری چلا گیا اور سلطان برکیارق نے اپنے دربان سے کہا کہ وہ کنیز نگینہ کو میرے کمرے میں بھیج دے۔ اس نے جا کر دیکھا اس کے کمرے کے فرش سے روزینہ کا خون دھو دیا گیا تھا اور دروازے کے باہر جو خون گرا تھا وہ بھی صاف کر دیا گیا تھا۔ کمرے میں پھر قالین ویسے ہی بچھ گیا تھا جیسے پہلے ہُوا کرتا تھا جیسے وہاں کچھ ہُوا ہی نہ ہو۔ برکیارق پلنگ پر بیٹھا اور پھر لیٹ گیا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ شمونہ کمرے میں داخل ہوئی اور کنیزوں کی طرح آداب بجا لائی۔ سلطان برکیارق نے اشارہ کیا کہ بیٹھ جاؤ۔ شمونہ قالین پر بیٹھ گئی۔

"نگینہ!" — سلطان برکیارق نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا — "اب تم کنیز نہیں ہو۔ میرے دل میں تم نے اپنا درجہ خاصا بلند کر لیا ہے۔ اوپر بیٹھو یا میرے پاس پلنگ پر بیٹھ جاؤ"۔

شمونہ قالین سے اٹھی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے" — برکیارق نے کہا — "تم نے سلجوقی سلطنت کو مزید خون خرابے سے بچا لیا ہے..... میں تمہیں اس کا انعام دینا چاہتا ہوں..... بولو کیا چاہئے!"

"سلطان عالی مقام!" — شمونہ نے کہا — "میں نے آپ کی والدہ محترمہ سے بھی کہا تھا اور آپ سے بھی کہتی ہوں کہ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے..... نئی زندگی یا موت دینے والا صرف اللہ ہے۔ اللہ نے اگر مجھے اس کا سبب بنایا ہے تو یہ میرا کمال نہیں۔ میں کوئی انعام نہیں چاہتی"۔

"لیکن میں تمہیں انعام دینا چاہتا ہوں" — سلطان برکیارق نے کہا — "تم نے میری صرف جان ہی نہیں بچائی بلکہ میری ذات اور میری شخصیت کو ایک تباہی سے بچا لیا ہے۔ میں ایک شیطان کے قبضے میں آ گیا تھا۔ اس نے مجھ سے میری ماں کی توہین کرائی۔ یہ ایک کبیرہ گناہ ہے جو معلوم نہیں اللہ تعالیٰ بھی معاف کرے گا یا نہیں اور اس شیطان نے مجھے میرے بھائیوں کا دشمن بنایا اور یہ جو قتل و غارت میری سلطنت میں شروع ہو گئی ہے، یہ بھی میرے حساب میں لکھی جائے گی۔ تم آ گئی تو میں راہ راست پر آ گیا ہوں۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ اور مجھ پر معمولی احسان نہیں"۔

"میں نے انعام حاصل کر لیا ہے سلطان محترم!" — شمونہ نے کہا — "میں یہ کام کرنا چاہتی تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میں کامیاب ہو جاؤں گی لیکن اللہ نے میری دعائیں قبول کیں اور میں کامیاب ہو گئی۔ یہ انعام کچھ کم نہیں کہ میں نے جو کرنا چاہا وہ ہو گیا"۔

"میں تمہیں ایک انعام دینا چاہتا ہوں" — سلطان برکیارق نے کہا — "تم اب روزینہ کی جگہ لو گی..... آج سے تم کنیز نہیں ہو۔ میں اس خانہ جنگی کا خاتمہ کر کے حالات کو معمول پر لے آؤں تو تمہارے ساتھ شادی کر لوں گا۔ مجھے ایسی امید نہیں رکھنی چاہئے کہ تم انکار کرو گی"۔

"سلطان محترم!" — شمونہ نے مسکراتے ہوئے کہا — "آپ یہی امید رکھیں کہ میں انکار ہی کروں گی۔ اس انکار کا ایک جواز ہے اور اس کا پس منظر بھی ہے..... آپ پس منظر سن لیں پھر شادی کر لیں گے"۔

"مطلب یہ کہ تم شادی شدہ ہو" — سلطان برکیارق نے کہا۔

"میں شادی شدہ نہیں ہوں" — شمونہ نے کہا — "لیکن میں مرد کی فطرت کی کمزوریوں سے اور مرد کے وجود سے اور مرد کی عیش پرستی اور لذت پرستی سے ناواقف نہیں ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ سلطان عالی مقام! میرا نام نگینہ نہیں شمونہ ہے۔ میں نے یہاں اپنا صحیح نام اپنے مقصد کی تکمیل کی خاطر نہیں بتایا تھا۔ میں بچپن میں ایک قافلے سے اغوا کی گئی تھی اور میری پرورش حسن بن صباح کی جنت میں ہوئی تھی۔ جوان ہوئی تو میں حسن بن صباح کے زیر سایہ رہی۔ میرے اندر ابلیسیت سمو دی گئی تھی اور پھر

مجھے اس طرف بھیج دیا گیا۔ میں آپ کو کوئی لمبی داستان نہیں سناؤں گی۔ میں نے بڑے بڑے سرداروں' عہدیداروں اور کمانداروں کو حسن بن صباح کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ پھر جس طرح آپ راہِ راست پر آ گئے ہیں اسی طرح اللہ نے مجھے روشنی دکھائی اور میں بھی اللہ کی راہ پر آ گئی.....

"اللہ نے مجھے یہ انعام دیا کہ مجھے میری ماں مل گئی جس کی آغوش سے مجھے برسوں پہلے نوچا گیا تھا۔ پھر مجھے ایک اور انسان مل گیا جس نے مجھے دلی اور روحانی محبت سے آشنا ہی نہیں بلکہ سرشار کیا۔ اس آدمی نے حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے اتنی زیادہ قربانی دی کہ اپنے خاندان سے الگ ہو کر یہیں کا ہو کے رہ گیا ہے۔ وہ اصفہان کا رہنے والا ہے اور اس کا نام مزمّل آفندی ہے۔ وہ حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے گیا تھا لیکن ان کے جال میں آ گیا۔ انہوں نے اپنے خصوصی طریقوں سے اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا اور اسے سلطان ملک شاہ مرحوم کے قتل کے لئے تیار کر کے یہاں بھیج دیا.....

"یہ سلطان مرحوم کی خوش نصیبی تھی اور یہ مزمّل کی بھی خوش نصیبی تھی کہ اس نے میرے ساتھ اس ارادے کا ذکر کر دیا۔ میں نے سلطان مرحوم کو بتا دیا۔ سلطان مرحوم نے طبیب کو بلایا اور طبیب نے اسے دوائیاں وغیرہ دے کر اس کے دل و دماغ سے باطنیوں کے اثرات نکال دیئے۔ اسے واپس اپنی اصلی حالت میں لانے میں میرا عمل دخل بھی ہے۔ ہم دونوں کی محبت ایک دوسرے کی روح میں اتری ہوئی ہے"۔

"پھر تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟" ——— سلطان برکیارق نے پوچھا۔

"ہم دونوں کا مقصد اور عہد ایک ہے" ——— شمونہ نے کہا ——— "ہم نے حسن بن صباح کو قتل کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ یہ عہد پورا کر کے ہم شادی کریں گے لیکن ہمارے سامنے مشکل یہ رہی ہے کہ مجھے بھی اور مزمّل کو بھی قلعہ الموت میں بہت سے لوگ جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ہم وہاں گئے تو جاتے ہی پکڑے جائیں گے۔ ہم حسن بن صباح کے خلاف کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن کوئی موقعہ نہیں مل رہا تھا۔ آپ کی شادی روزینہ سے ہوئی تو مجھے بتایا گیا کہ روزینہ حسن بن صباح کی جنت سے آئی ہے۔ پھر میں اور مزمّل سنتے رہے کہ اس لڑکی نے آپ کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے اور پھر یہ بھی پتہ چلا کہ یہ خانہ جنگی باطنیوں نے ہی شروع کرائی ہے۔ میں تڑپتی رہی کہ روزینہ کو کس طرح قتل کروں لیکن کوئی راستہ اور کوئی ذریعہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آخر مجھے وزیرِاعظم

عبدالرحمٰن سمیری سے ملوایا گیا اور انہوں نے مجھے یہاں کنیز رکھوایا"۔

شمونہ نے سلطان برکیارق کو تفصیلاً سنایا کہ اس نے روزینہ کے دل میں اپنا اعتماد کس طرح پیدا کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ جو تربیت روزینہ کو ملی تھی وہی تربیت اسے دے دی گئی تھی۔ شمونہ نے بتایا کہ اس نے وہی تربیت اور وہی تجربہ روزینہ پر استعمال کیا اور اس کے دل میں اتر گئی۔

شمونہ نے سلطان برکیارق کو یہ نہ بتایا کہ روزینہ نے شربت میں زہر نہیں ملایا تھا بلکہ زہر شمونہ نے اپنے ہاتھوں سے ملایا اور یہ منصوبہ جو اس نے سوچا تھا' کامیاب رہا۔ شمونہ نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اس نے اگر برکیارق کو بتا دیا کہ روزینہ نے شربت میں زہر نہیں ملایا تھا تو ہو سکتا ہے کہ برکیارق کو افسوس ہو کہ اس نے بلاوجہ روزینہ کو قتل کیا۔

شمونہ نے برکیارق کو یہ بھی بتایا کہ روزینہ شربت میں خاص قسم کی حشیش ملایا کرتی تھی اور شمونہ نظر بچا کر یہ شربت غسل خانے میں انڈیل دیتی اور دوسرا شربت ڈال کر اس میں وہ دوائی ملا دیتی تھی جو طبیب نے مزمّل کو دی تھی۔ مختصر یہ کہ شمونہ نے برکیارق کو لمحہ بہ لمحہ اپنے کارنامے کی تفصیلات سنائیں۔ برکیارق اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔

"سلطانِ عالی مقام!" ——— شمونہ نے کہا ——— "اگر آپ نے میرے ساتھ شادی کی یا جذباتی طور پر مجھے مجبور کیا تو یہ انعام نہیں ہو گا بلکہ میرا جو انعام ہے' اس سے آپ مجھے محروم کریں گے۔ آپ کی سلطنت میں ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی موجود ہے۔ مجھے آزاد رہنے دیں۔ میرا عہد ابھی پورا نہیں ہُوا۔ میرے سینے میں حسن بن صباح کے خلاف نفرت اور انتقام کا طوفان اٹھتا ہے جسے میں بڑی مشکل سے دباتی ہوں۔ میں اس شیطان تک تو نہیں پہنچ سکتی لیکن جہاں پتہ چلے گا کہ اس کا کوئی فدائی مرد یا عورت فلاں جگہ موجود ہے' میں اسے اپنے ہاتھوں زہر پلاؤں گی"۔

"میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا" ——— سلطان برکیارق نے کہا اور پوچھا ——— "مزمّل آفندی کہاں ہے؟"

"وہ سالار اوریزی کے ساتھ ہے" ——— شمونہ نے جواب دیا ——— "اس کا رابطہ آپ کے دونوں بھائیوں محمد اور سنجر کے ساتھ رہتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ باطنی دونوں طرفوں کی فوجوں اور شہر میں بھی موجود ہیں اور وہی جلتی پر تیل ڈال رہے ہیں۔ مزمّل ان

باطنیوں کے قتل کے لئے دیوانہ ہُوا جاتا ہے۔ میں اسے آپ سے ملواؤں گی"۔

سلطان برکیارق پلنگ پر نیم دراز تھا ۔ وہ یکلخت اٹھ بیٹھا اور لپک کر شمونہ کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آنکھوں سے لگایا اور پھر اُس ہاتھ کو چوما اور پھر بڑے احترام سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"اگر ایک عورت اتنا بڑا کام کر سکتی ہے تو میں تو سلطان ہوتے ہوئے اور زیادہ بڑے کام کر سکتا ہوں" ــــ سلطان برکیارق نے بڑے جوشیلے اور پُرعزم لہجے میں کہا ــــ "زندگی میں صرف شادی ہی تو ایک مسئلہ نہیں ہوتی۔ مجھے بہت کچھ کرنا ہے اور میں کروں گا"۔

"اب میرے لئے کیا حکم ہے؟" ــــ شمونہ نے برکیارق سے پوچھا اور کہا ــ "میں اپنا فرض ادا کر چکی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی ماں کے پاس چلی جاؤں..... میں اپنے تجربے کی بنا پر کہتی ہوں کہ مجھے یہاں سے چلے ہی جانا چاہئے۔ میں آپ کے سامنے نہ ہی رہوں تو اچھا ہے ورنہ آپ کے ارادے متزلزل رہیں گے اور جب بھی آپ مجھے دیکھیں گے تو آپ کے دل میں یہ خواہش تڑپے گی کہ میں روزینہ کی جگہ لے لوں۔ مجھے آپ جب بھی یاد کریں گے 'فوراً' پہنچوں گی"۔

"ہاں شمونہ!" ــــ سلطان برکیارق نے کہا ــــ "تم نے مجھے بیدار کر دیا ہے اور تم نے میرے اندر ایک عزم پیدا کیا ہے..... تم نے جو کہا ٹھیک کہا ہے۔ تم اپنی ماں کے پاس چلی جاؤ' کہیں ایسا نہ ہو کہ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہیں بھی مجبور کر دوں کہ میرے ساتھ شادی کر لو۔ اب میں ہمہ وقت سلطنت کے کاموں میں مصروف ہو جاؤں گا"۔

شمونہ اٹھی اور آداب بجالا کر برکیارق کے کمرے سے نکل آئی۔

○

شمونہ اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔

سلطان برکیارق نے وزیرِ اعظم سمیری کو بلایا۔ تھوڑی دیر بعد سمیری آ گیا۔

"اُس طبیب کے گھر آج رات ہی چھاپہ مارنے کا انتظام کریں" ــــ سلطان برکیارق نے کہا ــــ "چھاپہ آدھی رات کے کچھ دیر بعد مارا جائے' بہرحال یہ انتظام آپ نے کرنا ہے"۔

"انتظام ہو جائے گا" ــــ وزیرِ اعظم سمیری نے کہا ــــ "لیکن میں سلطانِ محترم کو بتا دوں کہ ان لوگوں کو زندہ پکڑنا آسان نہیں ہو گا۔ میں اجازت چاہتا ہوں کہ وہ لوگ مقابلہ کریں تو ہم یہ کوشش نہ کریں کہ انہیں زندہ پکڑا جائے۔ البتہ یہ کوشش ضرور ہو گی کہ ایک دو آدمی زندہ ضرور پکڑے جائیں"۔

"یہ سب کچھ سوچنا آپ کا کام ہے" ــــ سلطان برکیارق نے کہا ــــ "صبح تک مجھے یہ لوگ زندہ یا مُردہ دیکھنے ہیں"۔

اُس زمانے میں وزیرِ اعظم سپہ سالاری کا اور فنِ حرب و ضرب کا پورا پورا تجربہ رکھتے تھے۔ ضرورت کے وقت وزیرِ اعظم فوج کی کمان بھی لے لیا کرتا تھا۔ وزیرِ اعظم سمیری نے جا کر چھاپے کے لئے آدمی منتخب کر لئے۔ اس چھاپہ مار جماعت کا جو کمانڈر تھا اسے بھیجا گیا کہ وہ طبیب کا گھر دیکھ آئے۔ طبیب کا گھر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ پورے شہر میں مشہور ہو گیا تھا۔ بہرحال کمانڈر چلا گیا اور وہ گھر اس نظر سے دیکھ آیا کہ رات اس گھر پر چھاپہ مارنا ہے۔

اس رات طبیب کے گھر میں کچھ زیادہ ہی آدمی اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ خانہ جنگی بند کرنے کا حکم مل گیا ہے۔ پتہ اس طرح چلا کہ سلطان برکیارق نے سپہ سالار ابو جعفر حجازی کو حکم دیا تھا کہ سرکاری فوج کو لڑنے سے روک دیا جائے۔ سپہ سالار حجازی نے ہر طرف قاصد دوڑا دیئے تھے اور جس طرف زیادہ دستے تھے اُس طرف وہ خود چلا گیا تھا۔ اس طرح سلطان کا حکم کوئی راز نہیں رہا تھا۔ یہ 'فوراً' باطنیوں تک پہنچ گیا تھا۔ ان باطنیوں میں جو لیڈر قسم کے افراد تھے وہ طبیب کے ہاں اکٹھے ہو گئے تھے اور وہ اس صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ انہیں اب یہ سوچنا تھا کہ خانہ جنگی کس طرح جاری رکھی جائے اور اس صورتِ حال میں کس قسم کی تخریب کاری کی جا سکتی ہے۔

اس حویلی میں کم و بیش بیس آدمی اکٹھے ہو گئے تھے۔ رات گزرتی جا رہی تھی اور یہ لوگ اس طرح تبادلۂ خیالات اور بحث مباحثہ کر رہے تھے جیسے ان کا سونے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ طبیب بار بار کہتا تھا کہ خانہ جنگی بند ہو گئی تو وہ شیخ الجبل (حسن بن صباح) کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔

"غور اس پر کریں کہ سلطان نے یہ حکم دیا ہی کیوں ہے" ــــ طبیب کے ایک

دستِ راست نے کہا ــــ "اس کا مطلب تو یہ ہو گا کہ روزینہ ناکام ہو گئی ہے"۔

"میں نے یہی سوچ کر رابعہ کو بلوایا تھا" ــــ طبیب نے کہا ــــ "اور اسے روزینہ کے پاس جانے کو کہا تھا لیکن رابعہ ابھی تک واپس نہیں آئی۔ اس کے گھر آدمی بھیجا تو پتہ چلا کہ اس کے بچے بھی گھر میں نہیں ہیں۔ گھر خالی پڑا ہے"۔

"پھر وہ پکڑی گئی ہے" ــــ ایک آدمی نے کہا ــــ "کہیں ایسا تو نہیں کہ سلطان برکیارق کو بھائیوں نے قتل ہی کر دیا ہو؟..... خانہ جنگی بند کرنے کا حکم محمد نے ہی دیا ہو گا"۔

اس گروہ کو ابھی پتہ نہیں چلا تھا کہ ہو کیا ہے۔ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے اور رات آدھی گزر گئی تھی..... یہ ایک بڑی حویلی تھی جس کی ساخت ایک قلعے جیسی تھی۔ اس کی چھت ساتھ والے مکانوں کی چھتوں سے ملتی تھی۔ ان آدمیوں میں سے کسی ایک نے کہا کہ چھت پر کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ سب خاموش ہو گئے۔ قدموں کی آہٹیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ان میں سے کچھ آدمی دوڑ کر صحن میں آئے اور اوپر دیکھنے لگے۔

عبدالرحمٰن سمیری کی بھیجی ہوئی چھاپہ مار جماعت کسی قریبی مکان میں داخل ہو کر اوپر گئی اور چھتوں کے ذریعے طبیب کی چھت تک پہنچی۔ نیچے سے باطنیوں نے دیکھ لیا اور کوئی زور سے پکارا ــــ "تیار ہو جاؤ بھائیو!" ــــ حویلی کے برآمدے میں دو دیئے جل رہے تھے۔ ان کی روشنی صحن میں بھی جا رہی تھی۔

صحن میں جو باطنی نکلے تھے' ان میں سے کچھ برآمدے کی طرف دوڑے اور دو دروازے کی طرف گئے اور دروازے کی زنجیر اتارنے لگے۔ منڈیر سے ایک چھاپہ مار نے ان پر برچھی پھینکی جو ایک چھاپہ مار کی پیٹھ میں اتر گئی۔ دوسرے نے ایسی دلیری کا مظاہرہ کیا کہ باہر بھاگنے کی بجائے اس نے اپنے ساتھی کی پیٹھ میں سے برچھی نکال لی اور چھاپہ ماروں سے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ چھاپہ مار دوڑتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف آئے اور بڑی ہی تیزی سے نیچے اترنے لگے۔

کمرے میں سے تمام باطنی تلواریں اور برچھیاں لے کر نکل آئے۔ چھاپہ ماروں کی تعداد پچیس یا تیس تھی۔ باطنی بیس تھے۔ حویلی کے صحن میں بڑا ہی خونریز معرکہ لڑا گیا۔ دو چھاپہ مار دروازے کے قریب کھڑے ہو گئے تھے تاکہ کوئی بھاگ نہ سکے۔ چھاپہ

ماروں کا کمانڈر بار بار چلا رہا تھا کہ ان میں سے دو تین کو زندہ پکڑو لیکن باطنی زندگی کا آخری معرکہ لڑنے کے انداز سے دلیری سے لڑ رہے تھے۔

چھاپہ مار تجربہ کار تھے۔ ان کے چند ایک آدمی زخمی ہو چکے تھے اور وہ گر پڑے تھے لیکن زیادہ نقصان باطنیوں کا ہو رہا تھا۔ دیکھا گیا کہ ایک باطنی نے جب دیکھا کہ اس کے باطنی مارے گئے ہیں اور چھاپہ مار غالب آ گئے ہیں تو وہ دوڑ کر ایک طرف ہو گیا۔ دو تین چھاپہ مار اسے پکڑنے کے لئے آگے بڑھے لیکن باطنی نے اپنی تلوار اپنے پیٹ میں گھونپ لی۔ ایک باطنی جو کسی کمرے میں چھپ گیا تھا' نکلا اور دروازے کی طرف دوڑا۔ اس وقت کوئی چھاپہ مار دروازے کے قریب نہیں تھا۔ باطنی دروازہ کھول رہا تھا کہ دو چھاپہ ماروں نے اس پر وار کرنے کی بجائے اسے ایسا جکڑا کہ وہ لڑنے کے قابل نہ رہا۔ اسے زندہ پکڑ لیا گیا۔

طبیب بھی مارا گیا اور اس کے گروہ کا کوئی ایک بھی آدمی پاؤں پر کھڑا نہ رہا۔ صرف ایک کو زندہ پکڑا گیا۔ چھاپہ ماروں کا کمانڈر زخمی باطنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ان میں کوئی معمولی زخمی ہو گا تو اسے اٹھا کر لے جائیں گے۔ اس نے ایک زخمی کو دیکھا جو پیٹھ کے بل پڑا تھا۔ اس نے اپنی تلوار جو اس کے قریب ہی پڑی تھی' اٹھائی اور اوپر کر کے اپنے پیٹ میں مار لی۔ پانچ چھ چھاپہ مار مارے جا چکے تھے اور زخمی تقریباً" سب ہی ہوئے تھے لیکن وہ چل پھر سکتے تھے۔ چھاپہ ماروں نے اپنے زخمیوں کو کندھوں پر اٹھا لیا اور زندہ باطنی کو ساتھ لے کر وہاں سے نکل آئے۔

وزیرِاعظم عبدالرحمٰن سمیری چھاپہ ماروں کی واپسی کے انتظار میں بے تاب ہو رہا تھا۔ آخر چھاپہ مار پہنچ گئے۔ سب کے کپڑے خون سے لال تھے۔ انہوں نے زندہ باطنی وزیرِاعظم کے حوالے کیا اور اسے بتایا کہ باقی سب مارے گئے ہیں۔ یہ بھی بتایا کہ باطنیوں نے کس بے خوفی سے مقابلہ کیا تھا۔

"اسے اُس کمرے میں لے جاؤ" ــــ وزیرِاعظم سمیری نے کہا۔

وہ ایک خاص کمرہ تھا جو محل کے ایک دور کے حصے میں تھا۔ کہاں محل کا حُسن اور رونق اور کہاں یہ کمرہ کہ اس میں جو داخل ہوتا وہ ناک پر کپڑا رکھ لیتا تھا کیونکہ یہ کمرہ ایسی بدبُو سے بھرا رہتا تھا جو ناقابلِ برداشت تھی۔ یہاں ملزموں اور مشتبوں سے تفتیش کی جاتی تھی۔ تفتیش کا مطلب پوچھ گچھ نہیں بلکہ ایسی غیر انسانی اذیتیں دی جاتی تھیں

کہ آدمی مر مر کر جیتا تھا۔ بعض مر ہی جاتے تھے۔ ان کی لاشیں کچھ دن وہیں پڑی رہنے دی جاتی تھیں اور وہ دوسرے ملزموں کو دکھا کر کہا جاتا تھا کہ سچ بولو ورنہ تمہاری لاش بھی ان لاشوں کے ساتھ پڑی ہو گی۔

○

اس باطنی کو اس کمرے میں لے جایا گیا اور کچھ دیر بعد وزیرِ اعظم ہمیری اپنے دو خاص آدمیوں کے ساتھ وہاں گیا۔ باطنی سے کہا کہ وہ اگر سچ بولے گا تو اس کی جان بخشی کر دی جائے گی اور انعام بھی دیا جائے گا ورنہ اس کا حشر بہت بُرا ہو گا۔

"میں شیخ الجبل کو دھوکا نہیں دوں گا" — باطنی نے کہا — "میرے جسم کو پاؤں سے کاٹنا شروع کر دو۔ میری زبان سلامت رہنے دو تو بھی میری زبان پر وہ سچ نہیں آئے گا جو تم لوگ سننا چاہتے ہو"۔

اس کے ساتھ دوستانہ رویّہ اختیار کیا گیا' بہلانے اور ورغلانے کا ہر حربہ آزمایا گیا اور لالچ دیئے گئے لیکن وہ شخص مسکراتا رہا۔ اس کے چہرے پر سکون اور اطمینان تھا۔ وزیرِ اعظم ہمیری نے اپنے آدمیوں کو سر سے ہلکا سا اشارہ کیا اور خود باہر نکل آیا۔ ان آدمیوں نے دروازہ بند کر دیا۔

صبح طلوع ہوئی اور سورج کچھ اوپر اٹھا تو وزیرِ اعظم ہمیری اپنے گھر سے نکلا۔ وہ اپنے دفتر میں جانے کی بجائے اُسی کمرے میں چلا گیا جس میں باطنی کو رکھا گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس باطنی کو اس کے آدمیوں نے اُلٹا لٹکایا ہُوا تھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کے ساتھ دس دس سیر وزنی پتھر بندھے ہوئے تھے۔ وزیرِ اعظم کو بتایا گیا کہ اس نے کچھ بھی نہیں بتایا بلکہ یہ بولتا ہی نہیں۔ وزیرِ اعظم نے انہیں کہا کہ اپنا عمل جاری رکھو اور اگر یہ مرتا ہے تو مر جانے دو لیکن کوشش کرو کہ یہ کچھ اُگل دے۔

چار پانچ گھنٹے گزر گئے تو وزیرِ اعظم ہمیری ایک بار پھر اس کمرے میں گیا۔ باطنی ابھی تک اُلٹا لٹکا ہُوا تھا۔ ہمیری حیران ہو رہا تھا کہ یہ شخص انسان ہے یا پتھر کا مجسمہ ہے۔ اس نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔

کمرے کا دروازہ بڑی زور سے کھلا۔ وزیرِ اعظم ہمیری اور اس کے دونوں آدمیوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ ایک عورت تھی جس کے بال کھلے اور بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے غریبانہ سے کپڑے پہن رکھے تھے اور وہ پریشان حال نظر

آتی تھی۔ وہ اُلٹا لٹکے ہوئے باطنی کے ساتھ لپٹ گئی اور رونے اور چیخنے لگی۔ باطنی کو چھوڑ کر وہ وزیرِ اعظم ہمیری کے قدموں میں جا گری اور اس کے قدموں میں ماتھا رگڑنے لگی۔

"اللہ تمہیں اس سے بڑا عہدہ دے" — اس عورت نے روتے ہوئے فریاد کی — "یہ میرا بھائی ہے..... ایک ہی ایک بھائی ہے' اس پر کوئی شک نہ کرو۔ اسے باطنی نہ سمجھو۔ اس کا اس گروہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں..... اللہ کے نام پر اسے چھوڑ دو ورنہ میرے بچے بھوکے مر جائیں گے"۔

دونوں آدمی اس عورت کو اٹھا کر باہر کو دھکیلنے لگے لیکن وزیرِ اعظم ہمیری نے انہیں روک دیا اور اس عورت سے پوچھا کہ وہ اندر کس طرح آ گئی ہے۔

"میں دربانوں کے آگے روئی اور فریادیں کی تھیں" — عورت نے کہا — "انہوں نے مجھے روک لیا تھا لیکن ان کے دلوں میں رحم آ گیا اور انہوں نے یہ بھی بتا دیا کہ تمہارا بھائی فلاں کمرے میں بند ہے"۔

"آرام سے بات کرو" — وزیرِ اعظم ہمیری نے اسے کہا — "ہم کسی پر بلاوجہ ظلم نہیں کرتے۔ تمہارا یہ بھائی ہم نے اُس طبیب کے گھر سے پکڑا ہے جو حسن بن صباح کا بھیجا ہُوا خاص آدمی ہے۔ ان لوگوں نے ہمارے چھاپہ ماروں کا مقابلہ کیا تھا اور سب مارے گئے ہیں۔ تمہارا یہ بھائی زندہ پکڑا گیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ یہ وہاں کیا کر رہا تھا؟"

"میں جانتی ہوں یہ وہاں کیوں گیا تھا" — عورت نے کہا — "یہ اس طبیب کے پاس گیا تھا۔ اسے پیٹ کی کوئی بیماری لگی ہوئی ہے۔ طبیب اسے اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا اور اس سے اپنے گھر کے اور دوائی خانے کے چھوٹے موٹے کام کرواتا تھا اور اس کی اسے اُجرت دیتا تھا"۔

"لیکن یہ تو اپنے منہ سے کہتا ہے کہ میں باطنی ہوں" — وزیرِ اعظم ہمیری نے کہا — "اس نے کہا ہے کہ میں شیخ الجبل کو دھوکا نہیں دوں گا اور سچ نہیں بولوں گا"۔

"اس سے پوچھیں کہ یہ جانتا ہے کہ شیخ الجبل کون ہے؟" — عورت نے کہا — "اسے ان شیطانوں نے یہ بتایا ہو گا کہ شیخ الجبل اللہ کا بھیجا ہُوا کوئی نبی یا ولی یا امام ہے۔ اس سے پوچھو کہ حسن بن صباح کون ہے تو یہ نفرت سے تھوک دے گا"۔

یہ عورت بار بار وزیرِ اعظم کے آگے ہاتھ جوڑتی اور جھک کر اس کے پاؤں پکڑتی

www.paksociety.com

اور یہی فریاد کرتی تھی کہ میرے بھائی کو چھوڑ دو' یہ بے گناہ ہے اور میرا اور میرے بچوں کا واحد سہارا ہے۔ اس عورت کا تڑپنا' رونا اور بے حال ہو ہو جانا کچھ اثر کر گیا۔ وزیرِاعظم سمیری سوچ میں پڑ گیا۔ آخر اس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اسے اتار کر لٹا دو اور اسے پانی پلاؤ۔

"اب میری ایک بات سنو" —— وزیرِاعظم سمیری نے اس بدحال عورت سے کہا —— "میں تمہیں اس بھائی کے ساتھ اکیلا چھوڑ دوں گا اگر یہ حسن بن صباح کا چیلا ہے تو بتا دے۔ اگر نہیں تو تم مجھ سے تسلیم کروالو کہ اس کا اس گروہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میری تسلی ہو گئی تو میں اسے چھوڑ دوں گا"۔

اس باطنی کو اتارا گیا' پانی پلایا گیا اور پھر وزیرِاعظم کے کہنے پر اسے کچھ کھلایا گیا اور اس عورت کے ساتھ اسے کمرے میں تنہا چھوڑ دیا گیا۔ وزیرِاعظم سمیری وہاں سے جا چکا تھا۔

"بے وقوف!" —— اس عورت نے باطنی کے ساتھ لپٹتے ہوئے کہا —— "تم زندہ کس طرح پکڑے گئے تھے؟ بھاگ جاتے' مر جاتے!"

"میں تو دروازے سے نکل رہا تھا کہ انہوں نے پکڑ لیا" —— باطنی نے کراہتے ہوئے کہا —— "تم نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔ کیا مجھے یہاں سے نکلوا سکو گی؟"

"میں نے کوئی بھی کام ہاتھ میں لیا ہے تو کر کے ہی چھوڑا ہے" —— عورت نے کہا —— "مجھے امید ہے کہ تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں گی۔ اگر انہوں نے نہ چھوڑا تو مجھے یہ تو پتہ چل گیا ہے کہ تم یہاں ہو' میں تمہیں کسی نہ کسی طرح فرار کروالوں گی..... مجھے یہ بتاؤ کہ میں کسے اطلاع دوں کہ تم یہاں ہو۔ میں تو اپنے گروہ کو جانتی ہوں لیکن ہر کسی کو نہیں"۔

باطنی نے اسے بتانا شروع کر دیا۔

○

دن کے پچھلے پہر وزیرِاعظم عبدالرحمٰن سمیری سلطان برکیارق کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور وہ خانہ جنگی بند کرانے اور حالات کو معمول پر لانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ سلطان برکیارق ذہنی طور پر اس قدر ٹھیک ہو گیا تھا کہ وہ اپنے مرحوم باپ سلطان ملک شاہ کی طرح باتیں کرنے لگا تھا۔ اس نے یہاں تک کہا کہ خانہ جنگی رک جائے تو دونوں طرف

کے لشکروں کو اکٹھا کر کے میں ایسی طاقتور فوج بناؤں گا جو ایک ہی حملے میں حسن بن صباح کا صفایا کر دے گی۔

دربان کمرے میں داخل ہوا۔

"سلطانِ عالی مقام!" —— دربان نے جھک کر کہا —— "ایک عورت آئی ہے۔ ملاقات کی اجازت چاہتی ہے"۔

سلطان برکیارق کے چہرے پر خفگی کے تاثرات آ گئے اور اس نے وزیرِاعظم سمیری کی طرف دیکھا۔ اس وقت سلطان کسی عام آدمی سے ملنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"میں جانتا ہوں وہ کون ہے" —— وزیرِاعظم سمیری نے کہا —— "اسے آنے دیں سلطانِ محترم!"

وزیرِاعظم نے دربان سے کہا کہ اسے اندر بھیج دو۔

رابعہ کمرے میں داخل ہوئی۔ سلطان برکیارق نے اسے اس حالت میں دیکھا تو کچھ پریشان سا ہو کر بولا کہ یہ تجھے کیا ہو گیا ہے رابعہ؟ میرے محل میں تم اس حالت کو کس طرح پہنچی ہو؟..... رابعہ ہنس پڑی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور کپڑے میلے اور بوسیدہ تھے اور وہ بھکارن لگتی تھی۔

"یہ میں آپ کو بتاؤں گا سلطانِ محترم!" —— وزیرِاعظم سمیری نے کہا —— "پہلے میں اس سے وہ بات سن لوں جس کے لئے میں نے اسے بلایا تھا"۔

"کام کر آئی ہوں" —— رابعہ نے بیٹھتے ہوئے کہا —— "یہ بھی بھلا کوئی کام تھا۔ میں نے اس سے وہ سب کچھ اگلوا لیا ہے جو آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے جسم کے آپ ٹکڑے کر دیتے' وہ نہ بولتا"۔

وہ عورت جو تفتیش والے کمرے میں داخل ہوئی تھی اور اس باطنی سے لپٹ گئی تھی اور وزیرِاعظم سمیری کے قدموں میں ماتھا رگڑ رگڑ کر فریادیں کرتی تھی' وہ اس باطنی کی بہن نہیں تھی نہ اس کی کچھ لگتی تھی۔ وہ رابعہ تھی۔ رابعہ حسن بن صباح کی تربیت یافتہ تھی۔ داستان گو سنا چکا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی خاطر سلطان برکیارق کے آگے جھک گئی اور اس نے راز اگل دیئے تھے اور اب عبدالرحمٰن سمیری نے اسے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس نے رابعہ کو صبح اپنے پاس بٹھا کر بتایا تھا کہ رات ہم نے طبیب کے گھر چھاپہ مارا

ہے اور اس کا صرف ایک آدمی زندہ پکڑا گیا ہے لیکن وہ بولتا نہیں۔

"بولے گا!" ___ رابعہ نے پُراعتماد انداز سے کہا ___ "میں وہاں آؤں گی لیکن آپ کا وہاں ہونا لازمی ہے"۔

وزیرِاعظم سمیری اور رابعہ نے ایک سکیم بنالی اور رابعہ اٹھ کر چلی گئی۔ جو وقت مقرر کیا گیا تھا اُس وقت وزیرِاعظم اس کمرے میں پہنچ گیا اور رابعہ ایک غریب' مفلوک الحال اور پریشان حال عورت کے بہروپ میں اس کمرے میں جا پہنچی اور وہ اداکاری کی جو پہلے سنائی جا چکی ہے۔ وزیرِاعظم اپنے دونوں آدمیوں کو ساتھ لے کر وہاں سے آ گیا اور رابعہ نے اس باطنی کو رام کر لیا۔ یہ باطنی رابعہ کو جانتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ رابعہ اس قدر عیار اور تجربہ کار ہے کہ جنگل میں نکل جائے تو درندوں کو بھی اپنا مرید بنا لے۔ اس باطنی نے رابعہ کو وہ باتیں بھی بتا دیں جو رابعہ کو بھی معلوم نہیں تھیں۔ یہ باطنیوں کے کچھ اور ٹھکانے تھے اور باطنیوں کی تخریب کاری کی تفصیلات تھیں۔

یہ کام اور یہ کامیاب اداکاری رابعہ ہی کر سکتی تھی ورنہ یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی غریب سی عورت محل کے احاطے میں داخل بھی ہو سکتی' اور پھر وہ اس کمرے تک پہنچ جاتی جہاں کوئی غیر متعلق سرکاری کارندہ بھی نہیں جا سکتا تھا۔

"تم بہت بڑے انعام کی حقدار ہو رابعہ!" ___ سلطان برکیارق نے کہا ___ "میں تمہارے لئے اس محل میں رہائش کا خصوصی انتظام کروا رہا ہوں۔ تمہارے بچّوں کی تعلیم و تربیت ہمارے ذمّے ہوگی..... اب تم جاؤ' اپنا حُلیہ صحیح کرو' میں تمہیں پھر بلاؤں گا"۔

رابعہ فاتحانہ چال چلتی وہاں سے چلی گئی..... وزیرِاعظم سمیری نے سلطان برکیارق سے کہا کہ اب ہمیں اس باطنی کو زندہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اسے قید میں ڈالنے کی بجائے ختم ہی کر دیا جائے۔

دربان کو بلایا گیا اور اسے کہا گیا کہ فلاں آدمی کو بلائے۔ وہ آدمی آیا تو سلطان برکیارق نے اسے کہا کہ اس باطنی کو قتل کر کے اس کی لاش کہیں دبا دو لیکن قبرستان میں نہیں۔

وزیرِاعظم عبدالرحمٰن سمیری نے سلطان سے ایک ایسا حکم جاری کروا لیا جس نے تاریخ کا رخ ہی پھیر دیا۔ وزیرِاعظم نے سلطان کو مشورہ دیا کہ جن باطنیوں کی نشاندہی ہو گئی ہے' انھیں پکڑ لیا جائے' کسی سے کچھ بھی نہ پوچھا جائے نہ انھیں سزائے قید دی جائے بلکہ قتل کر دیا جائے۔ سلطان برکیارق پہلے ہی شرمسار تھا کہ وہ ایک باطنی لڑکی کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا اور سلطنت کو خانہ جنگی میں جھونک دیا۔ وہ اپنے اندر ایک تلخی محسوس کرتا تھا جو کبھی کم ہوتی اور کبھی اتنی زیادہ کہ اس کی برداشت سے باہر ہو جاتی اور وہ غصے میں آ جاتا تھا۔ اسی کیفیت میں اس نے وزیرِاعظم کی بات مان لی اور کہا اس کی روحانی تسکین اسی طرح ہوگی کہ اس کے سامنے ان باطنیوں کے سر اُڑا دیئے جائیں۔

تاریخ نویس ابوالقاسم رفیق دلاوری نے مشہور مؤرخوں' ابنِ اثیر' ابنِ خلدون اور ابنِ جوزی کے حوالوں سے لکھا ہے کہ باطنیوں کے جن ٹھکانوں کی نشاندہی ہو گئی تھی' وہاں چھاپے مارے گئے اور یہ چھاپے اس انداز سے مارے گئے کہ زیادہ سے زیادہ باطنی زندہ پکڑے گئے جن میں چند ایسے باطنی تھے جو طبیب کی طرح سرداری درجے کے تھے۔ وہ احکام اور ہدایات جاری کرتے تھے اور تخریب کاری کو خوش اسلوبی اور کامیابی سے چلائے رکھنا ان کی ذمہ داری تھی۔ ان تمام سرداروں کو لا کر کچھ بھی نہ کہا گیا' صرف یہ کیا گیا کہ تین چار جلّاد بلائے گئے جو ان کی گردنیں کاٹتے گئے۔ ان کی لاشیں ایک ہی گڑھے میں پھینک کر اوپر مٹی ڈال دی جاتی تھی۔

یہ سلسلہ چار پانچ دن چلتا رہا اور سلطان کو یہ اطلاع ملی کہ خانہ جنگی رک گئی ہے اور تمام سالاروں اور کمانڈروں کے ساتھ رابطہ ہو گیا ہے۔ اس اطلاع کے فوراً بعد سپہ سالار ابو جعفر حجازی' نائب سپہ سالار اوریزی جو باغی ہو گیا تھا' محمد' اور سنجر سلطان کے پاس آ گئے۔ سلطان یہ دیکھ کر حیران ہُوا کہ ابو مسلم رازی بھی ان کے ساتھ تھا۔

○

سلطان برکیارق دوسروں کے لئے تو نہ اٹھا لیکن ان کے پیچھے ابو مسلم رازی کو دیکھا تو وہ اس کے احترام میں اٹھ کھڑا ہُوا اور آگے بڑھ کر اور جھک کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور پھر سب کو بٹھا کر ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنے کا حکم دیا۔

"محترم رازی!" ___ سلطان برکیارق نے ابو مسلم رازی سے کہا ___ "آپ کو دیکھ کر مجھے اپنے والد مرحوم یاد آ گئے ہیں لیکن آپ یہاں کیسے؟ کیا میری حیرت بے معنی ہے؟"

ابو مسلم رازی بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ وہ سلطان ملک شاہ مرحوم کا دستِ راست اور

بڑا ہی گہرا دوست تھا۔ ملک شاہ نے بھی سوچا ہی نہیں تھا کہ ابو مسلم رازی صرف ایک شہر اور اس کے مضافاتی علاقے کا امیر ہے۔ دونوں اسلام کے شیدائی اور حسن بن صباح کے دشمن تھے۔ سلطان برکیارق تو یوں تھا جیسے ابو مسلم رازی کے ہاتھوں پیدا ہوا ہو۔

"نہیں بیٹے!" ۔۔۔ ابو مسلم رازی نے سلطان برکیارق سے کہا ۔۔۔ "تمہاری حیرت بے معنی نہیں۔ تمہیں معلوم نہیں کہ میں اپنے لشکر کے ساتھ تمہارے دارالسلطنت سے تھوڑی ہی دور موجود رہا ہوں۔ میں نے تم سے یہ سلطنت چھیننی نہیں تھی بلکہ اس سلطنت کو حسن بن صباح سے محفوظ رکھنا تھا مگر تم ایک باطنی لڑکی کے چکّر میں ایسے آئے کہ تمہیں نیک و بد کی تمیز سے ہی اُس نے محروم کر دیا اور تم میں سُود و زیاں کا احساس ہی نہ رہا۔ اب قاصد نے یہ خبر دی کہ تم نے خانہ جنگی روکنے کا حکم دیا ہے تو یہ لڑکے نادان ہی نہیں رہے تھے لیکن میرے عزیز بیٹے! میں نے زمانہ دیکھا ہے۔ میں نے انہیں کہا چلو چلتے ہیں، شاید بات چیت سے یہ مسئلہ حل ہو جائے"۔

"یہ مسئلہ حل ہو گیا ہے" ۔۔۔ سلطان برکیارق نے کہا ۔۔۔ "اس باطنی لڑکی کو میں نے اپنے ہاتھوں قتل کر دیا ہے اور میں سب سے پہلے عظیم ماں کے قدموں میں جا گرا اور اس سے اپنے گناہ بخشوائے۔ پھر میں نے اور وزیرِاعظم عبدالرحمٰن سمیری نے آپس میں صلاح مشورے کر کے جو کارروائیاں کی ہیں، آپ کے گوش گذار کرتا ہوں"۔

سلطان برکیارق نے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح باطنیوں کے ٹھکانوں کا سراغ لیا گیا ہے اور کس طرح چھاپے مار کر انہیں پکڑا جا رہا ہے اور ان سب کو قتل کیا جا رہا ہے۔

ان سب کو پہلے معلوم نہیں تھا کہ دارالسلطنت میں اور سلطان کے محل میں انقلاب آ رہا ہے۔ سب حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ وہ جب یہاں آئے تھے تو ان کے چہروں پر تناؤ تھا اور ان سب کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ سلطان کو شک اور شبے کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ سلطان برکیارق کی باتیں سن کر ان کے چہروں پر رونق آ گئی۔

"اب میں چاہتا ہوں" ۔۔۔ سلطان برکیارق نے کہا ۔۔۔ "کہ دونوں طرفوں کے لشکر اکٹھے کر کے ایک لشکر بنا دیا جائے اور پھر اس لشکر کو کچھ دن تربیت دے کر قلعہ اَلموُت پر حملہ کیا جائے۔ چند ایک باطنیوں کو قتل کر دینے سے حسن بن صباح کے باطل عقیدے کے طوفان کو روکا نہیں جا سکتا۔ مجھے اطلاعیں مل رہی ہیں کہ اس شیطان نے

بڑے ہی وسیع اور عریض علاقے کو اپنے زیرِ اثر کر لیا ہے۔۔۔۔ زیرِ اثر بھی ایسا کہ ہمارا لشکر قلعہ الموت کی طرف پیش قدمی کرے گا تو ان علاقوں کے لوگ ہمارے لشکر کا اگر مقابلہ نہیں کریں گے تو لشکر راستے میں رکاوٹیں ضرور پیدا کریں گے"۔

ابو مسلم رازی کے کہنے پر سلطان برکیارق کی ماں کو وہاں بلا لیا گیا۔ ماں آئی تو اپنے تینوں بیٹوں کو اور ان سب کو اکٹھا بیٹھے دیکھ کر رو پڑی اور ہاتھ آسمان کی طرف کر کے ان کے اتحاد اور پیار کی دعائیں مانگنے لگی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ آج اس کے بیٹے اور بیٹوں کے سالار اور ابو مسلم رازی جیسا عالم اور فاضل یہ سب ایک جگہ بیٹھے ہوئے ہیں۔

اور جن مؤرخوں کے حوالے دیئے گئے ہیں، انہوں نے اور مسیحی مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ابو مسلم رازی عالم، اور فاضل تھا، دور اندیش اور دانشمند تھا۔ اس نے اس اجتماع میں ایک نئی تجویز رکھی اور زور دیا کہ اس پر فوری طور پر عمل کیا جائے۔ تجویز یہ تھی کہ تینوں بھائی ایک ہی دارالسلطنت میں اکٹھے نہ رہیں کیونکہ انسان بڑی کمزور چیز ہے اور انسان کی سب سے بڑی کمزوری اقتدار پرستی ہے۔ اس سلطنت کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک حصّے کا حکمران سلطان برکیارق ہو اور دوسرے کا محمد اور سنجر لیکن مرکز سلطان برکیارق کے تحت رہے تاکہ سلطنت کی مرکزیت بھی قائم رہے اور اتحاد بھی۔ ابو مسلم رازی نے یہ بھی کہا کہ سلطنت کو بانٹا نہ گیا تو امورِ سلطنت اور دیگر مسائل کا سارا بوجھ صرف ایک سلطان کے سر پر پڑا رہے گا جو اس کے لئے کسی وقت بھی ناقابلِ برداشت ہو سکتا ہے۔

وزیرِاعظم عبدالرحمٰن سمیری برائے نام وزیرِاعظم نہیں تھا۔ وہ بھی عمر رسیدہ اور جہاندیدہ آدمی تھا۔ اس نے ابو مسلم رازی کی اس تجویز کی پُرزور تائید کی اور کہا کہ یہ تقسیم ابھی ہو جانی چاہئے، اسے التوا میں نہ رکھا جائے۔

سلطان برکیارق کی ماں نے بھی اس تجویز کو پسند کیا اور دونوں سالاروں ابو جعفر حجازی اور اوریزی نے بھی کہا کہ یہ قابلِ داد اور قابلِ عمل ہے۔ چنانچہ اسی وقت نقشے سامنے رکھے گئے اور سلطنت کو دو حصّوں میں بانٹ دیا گیا لیکن اس پر عمل صرف اس لئے ملتوی کیا گیا کہ سرکاری فوج اور باغی فوج کے دستے شہر میں آ جائیں اور اس شہر کو باطنیوں سے صاف کر دیا جائے تو پھر اطمینان سے تقسیم پر عمل کیا جائے گا۔

اس تقسیم پر تینوں بھائی رضامند ہو گئے اور ماں نے بھی اس کی منظوری دے دی۔ تاریخ کے مطابق جو حصے محمد اور سنجر کو دیئے گئے ان میں شام‘ عراق‘ موصل‘ آذربائیجان اور آرمینیا قابلِ ذکر ہیں۔ باقی تمام حصہ برکیارق کو ملا لیکن یہ بھی طے پایا کہ بالادستی اور برتری برکیارق کو حاصل ہو گی۔

○

بکھرے ہوئے دستے اکٹھے کئے جا رہے تھے اور وہ شہر میں آ رہے تھے۔ سلطان برکیارق نے حکم دے دیا کہ جہاں کہیں کوئی باطنی نظر آئے اسے قتل کر دیا جائے۔ اس حکم میں یہ بھی کہا گیا کہ کسی نے کسی غیر باطنی کو ذاتی رنجش یا دشمنی کی بنا پر قتل کیا اور جواز یہ پیش کیا کہ یہ باطنی تھا‘ اس کے قاتل کو فوراً قتل کر دیا جائے گا اور اس کے پسماندگان سے تاوان وصول کر کے مقتول کے پسماندگان کو دیا جائے گا۔ سرکاری طور پر انتظام کیا گیا کہ کوئی مشکوک آدمی شہر میں نظر آئے تو پوری چھان بین کی جائے کہ وہ کہاں رہتا ہے اور کیا وہ اس شہر کا باشندہ ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اسے کسی حکم کے بغیر قتل کر دیا جائے۔

شہر میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو جانتے تھے کہ یہ خانہ جنگی باطنیوں نے زمین دوز تخریب کاری کے ذریعے شروع کرائی ہے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ کون باطنی اور کون مسلمان ہے اور اس شہر کا قدیم باشندہ ہے۔ ان تک جب باطنیوں کے قتل کا حکم پہنچا تو انہوں نے باطنیوں کو چُن چُن کر قتل کرنا شروع کر دیا۔

شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔ حکم یہ تھا کہ شہر میں سے کسی ایک کو بھی باہر نہ جانے دیا جائے اور شہر کے اندر صرف اُن فوجیوں کو آنے دیا جائے جو شہر سے باہر بکھر کر لڑ رہے تھے۔ اس حکم کا یہ اثر ہُوا کہ شہر سے نکلنے کی کوشش کرنے والے باطنی پکڑے گئے اور قتل کر دیئے گئے۔

سلطان برکیارق نے باطنیوں کے قتلِ عام کا حکم دے دیا اور باطنی قتل ہونے لگے۔ کچھ باطنی تو ایسے تھے کہ جن کے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں تھا اور بعض ایسے بھی تھے جن پر شک تھا کہ یہ باطنی ہیں۔ شہر کے مسلمانوں نے انہیں بھی قتل کر دیا لیکن سلطان برکیارق‘ اس کے وزیرِ اعظم عبدالرحمٰن سمیری اور ابو مسلم رازی کو اگر یہ یقین تھا کہ مَرو میں باطنیوں کو قتل کر دینے سے یہ مسئلہ حل ہو جائے گا تو یہ ان کی بھول تھی۔ اتنا تو وہ جانتے ہی ہوں گے کہ باطنیوں کے اس قتلِ عام کی اطلاع حسن بن صباح تک ضرور ہی پہنچے گی اور وہ جوابی وار ضرور کرے گا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ اس ابلیس کا ہر وار زمین دوز ہوتا ہے اور بڑا ہی کاری ہوتا ہے لیکن تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ باطنیوں کے متعلق خوش فہمی میں مبتلا تھے۔ انہیں پوری طرح اندازہ نہیں تھا کہ حسن بن صباح کا انتقامی وار کس قدر خطرناک ہو گا اور وہ مسلمانوں کے خون کے دریا بہا دے گا۔

ابو مسلم رازی‘ عبدالرحمٰن سمیری اور سلطان برکیارق کی ماں نے سلطنت کو بھائیوں میں تقسیم بھی کر دیا لیکن باطنیوں کے قتلِ عام کا فیصلہ اور سلطنت کی تقسیم کا فیصلہ بھڑکے ہوئے جذبات کے زیرِ اثر کیا گیا تھا۔ حسن بن صباح جس قدر بدترین اور خطرناک دشمن تھا اتنا ہی اس کا فرقہ منظم تھا۔ اس کے تخریب کار فدائی اور جاسوس قلعہ اَلموت سے جتنی بھی دُور ہوتے تسبیح کے دانوں کی طرح ایک تنظیم میں پروئے ہوئے ہوتے تھے‘ مثلاً” مَرو میں طبیب تھا جو اس علاقے کے فدائین کو ایک بے عیب تنظیم اور بڑے سخت ڈسپلن کے تحت اپنے کنٹرول میں رکھتا تھا اور سوچ سمجھ کر تخریبی کارروائیاں کرواتا تھا۔ خانہ جنگی اُسی نے شروع کرائی تھی۔ ہر علاقے میں طبیب جیسے

آدمی موجود تھے اور ان سب کا رابطہ قلعہ اَلمُوت کے ساتھ جاسوسوں اور قاصدوں کے ذریعے تھا۔ ہر روز ایک قاصد تیز رفتار گھوڑے پر مَرو سے قلعہ اَلمُوت کو روانہ ہوتا تھا اور وہ جس قدر جلدی ممکن ہو سکتا تھا' حسن بن صباح کے پاس پہنچتا اور اسے خبریں دیتا تھا۔

حسن بن صباح کے جاسوس سلطنتِ سلجوقیہ کے بڑے شہروں اور قصبوں میں اور دُور دراز کے دیہاتی علاقوں میں اس قدر زیادہ آ گئے تھے جیسے ایک پتھر اٹھاؤ تو اس کے نیچے سے ایک باطنی جاسوس یا فدائی برآمد ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں سلطنتِ سلجوقیہ کے حکمران' وزیر اور مشیر لشکر کی زبان میں سوچتے اور ایک دوسرے کو مشورے دیتے تھے۔ حسن بن صباح جیسے دشمن کو فوج اور لشکر سے مارنا آسان نہیں تھا۔

مَرو شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی تاکہ کوئی باطنی شہر سے نکل نہ سکے نہ ہی کوئی باطنی باہر سے آ سکے۔ یہ ناکہ بندی دو تین دنوں میں ختم کر دی گئی تھی کیونکہ شہر کے لوگ باہر جا کر اپنے عزیزوں کی لاشیں ڈھونڈنا اور شہر میں لانا چاہتے تھے تاکہ ان کے باقاعدہ جنازے پڑھے جائیں اور صحیح طریقے سے تجہیز و تکفین کی جائے۔ ان لوگوں کے لئے شہر کے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔

دو دن تو باطنیوں کو چن چن کر قتل کیا جاتا رہا' اس کے بعد یہ سلسلہ ذرا تھم گیا اور اِکا دُکا باطنی قتل ہونے لگے۔ ایسے واقعات بھی تاریخ میں ملتے ہیں کہ کسی نے کسی مسلمان کی طرف اشارہ کر کے کہہ دیا کہ یہ باطنی ہے تو مسلمانوں نے اُسے قتل کر دیا۔ ہر باطنی کو پہچاننا ممکن نہیں تھا۔ یہ باطنی ہی تھے جو مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو ہی قتل کروا رہے تھے۔

○

شہر میں امن بحال ہوتا جا رہا تھا۔ سرکاری فوج اور اس کے خلاف لڑنے والے لشکر کے بکھرے ہوئے دستوں کو شہر میں واپس لایا جا چکا تھا۔ ایک روز سلطان برکیارق نے ان سب کو گھوڑ دوڑ کے میدان میں اکٹھا کیا۔ وہ خود گھوڑے پر سوار تھا۔ اُس کے پیچھے گھوڑوں پر عبدالرحمٰن سمیری' ابو مسلم رازی' محمد اور سنجر اور سپہ سالار ابو جعفر حجازی اور سالار اوریزنی گھوڑوں پر ایک صف میں کھڑے تھے۔ سلطان برکیارق نے اپنے سامنے اتنے بڑے لشکر کو فوجی ترتیب میں کھڑے دیکھا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا

کر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ یہ لشکر جو اس کے سامنے کھڑا تھا' دو متحارب حصوں میں بٹ گیا تھا اور دو چار دن پہلے تک یہ دونوں حصے ایک دوسرے کے خونی دشمن بن گئے تھے اور اب اللہ کا یہ خاص فضل و کرم تھا کہ دونوں حصے ایک ہو گئے تھے اور ان میں پہلے والا بھائی چارہ پیدا ہو گیا تھا۔

"میرے عزیز ہم وطنو!" ——— سلطان برکیارق نے بڑی بلند اور پُراعتماد آواز میں لشکر سے مخاطب ہو کر کہا ——— "تم اللہ کے سپاہی ہو اور اسلام کا تحفظ تمہارا ایمان ہے۔ مجھے بہت ہی دُکھ ہے کہ شیطان ہم پر غالب آ گیا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کی چالیں نہ سمجھ سکا اور ہم ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ بھائیوں نے اپنے ہی بھائیوں کا خون بہانا شروع کر دیا.....

"میں اللہ کے حضور اور تم سب کے آگے شرمسار ہوں کہ یہ خون میری گردن پر ہے۔ اسے میری کوتاہی کہہ لو' چشم پوشی کہہ لو' کچھ کہہ لو' میں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کہ یہ خون ریزی میرا گناہ ہے۔ اب میں اس گناہ کا کفارہ دوں گا۔ یہ حسن بن صباح کا پیدا کیا ہوا فتنہ تھا۔ اس کے پیروکار ہماری صفوں میں ہمارے ہمدرد بن کر گھس آئے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی انہیں پہچان نہ سکا.....

"یہود و نصاریٰ اسلام کے ہمیشہ دشمن رہے ہیں اور دشمن ہی رہیں گے لیکن حسن بن صباح اور اس کا فرقہ اسلام کے انتہائی خطرناک دشمن ہیں کیونکہ یہ ابلیس جس نے اپنے آپ کو امام اور شیخ الجبل کا نام دے رکھا ہے' اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ اب ہماری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کی ذاتِ باری نے ہمیں روشنی دکھائی اور ایسے ذرائع پیدا کئے کہ ہم شیطان کے اثر سے نکل آئے اور صراطِ مستقیم پر چل پڑے ہیں۔ میں تم سب کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں سلطان تو ہوں لیکن تمہیں اپنی رعایا نہیں سمجھتا۔ اللہ کی طرف سے مجھ پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہی تم سب کی ذمہ داریاں ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہمارا ایمان ہے.....

"تم نے آپس میں قتل و غارت کی ہے۔ اب ایک دوسرے کو عزیزوں کا خون بخش دو۔ اسلام اتحاد کا سبق دیتا ہے۔ اتحاد میں ہی برکت ہے اور اتحاد ایک ایسی طاقت ہے جسے کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ دیکھ لو' ہم آپس میں اُلجھ پڑے تو اس کا فائدہ ہمارے دشمن کو پہنچا۔ ہم ایک دشمن کے فریب میں آ کر ایک دوسرے کا خون بہانے

گئے تو اس دشمن نے ہماری بہت سی زمین پر قبضہ کر لیا۔ اب ہم نے نئی زندگی کا آغاز کرنا ہے۔ یاد رکھو، حسن بن صباح اسلام کا اور تمہاری سلطنت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ہم نے اس کے مقابلے میں ایک لشکر تیار کرنا ہے.....

"تم میں سے جو شہری سرکاری فوج میں یا دوسرے لشکر میں شامل ہوئے تھے، اگر فوج میں رہنا چاہتے ہیں اور باطنیوں کو ختم کرنے میں یقین رکھتے ہیں تو بتا دیں، انہیں فوج میں رکھا جائے گا اور جو فوج میں شامل نہیں ہونا چاہتے، وہ اپنے گھروں کو چلے جائیں لیکن یہ نہ بھولنا کہ کوئی فوجی ہے یا شہری، اسے اسلام کی بقا کی جنگ لڑنی ہے جو صرف فوجیوں کا ہی فرض نہیں، اس جنگ کے لئے جو جہاد ہے، ہر شہری کو تیار رہنا چاہئے۔ یہ جنگ اللہ کے نام پر لڑی جائے گی۔ اللہ ہر وقت اور ہر حال میں تمہارے ساتھ ہو گا۔ اب تمہیں اپنے دین اور ایمان کو اور اپنے عسکری جذبے کو مضبوط رکھنا ہو گا..... اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو گا"۔

صرف یہ تقریر کر دینے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو گیا تھا، کرنے والے کام ابھی پڑے تھے جن میں ایک یہ تھا کہ سلطنت کے دونوں حصوں کے لئے فوج کو بھی دو حصوں میں تقسیم کرنا تھا لیکن یہ سوچنا بھی ضروری تھا کہ ان حالات میں فوج کو الگ الگ دو حصوں میں تقسیم کیا جائے یا ابھی کچھ انتظار کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ مسائل تھے۔

○

شمونہ اور اس کی ماں میمونہ بہت ہی پریشان تھیں۔ پریشانی یہ تھی کہ جو سرکاری اور باغی دستے لڑنے کے لئے شہر سے باہر چلے گئے تھے، وہ سب واپس آ گئے تھے لیکن مزمل ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ زخمیوں کو بھی اٹھا کر لے آئے تھے اور بہت سے آدمیوں کی لاشیں بھی آ گئی تھیں لیکن مزمل کا کچھ پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ شمونہ اور میمونہ کا خیال تھا کہ وہ واپس آ گیا ہوتا تو سب سے پہلے گھر واپس آتا۔

شمونہ اور اس کی ماں میمونہ کے لئے ایک مسئلہ بڑا ہی ٹیڑھا تھا جو یہ تھا کہ وہ کھلے بندوں باہر نہیں نکل سکتی تھیں۔ اس کی وجہ پہلے اس داستان میں بیان کی جا چکی ہے کہ میمونہ بھی حسن بن صباح کے پاس رہ چکی تھی اور شمونہ تو حسن بن صباح کی منظورِ نظر اور بڑی ہی قیمتی لڑکی تھی۔ دونوں فرار ہو کر ابو مسلم رازی کے پاس پہنچ گئی تھیں۔ ابو

مسلم رازی نے انہیں الگ ایک مکان دے دیا تھا اور کچھ وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ مزمل آفندی بھی ان کے ساتھ رہتا تھا اور اس نے تجارتی کاروبار شروع کر دیا تھا۔

شمونہ روزینہ کو سلطان برکیارق کے ہاتھوں قتل کروا کے واپس اپنی ماں کے پاس آ گئی تھی اور اب وہ مرو میں رہتی تھی۔ مزمل آفندی بھی رے سے مرو آ گیا تھا..... اب ماں بیٹی دیکھ رہی تھیں کہ جنہوں نے واپس آنا تھا وہ سب آ گئے ہیں اور فوج کی تقسیم کا بھی فیصلہ ہو چکا ہے تو انہیں بہت زیادہ پریشانی ہونے لگی۔ ایک روز دونوں سلطان برکیارق کے چھوٹے بھائی محمد کے پاس چلی گئیں اور اس سے پوچھا کہ مزمل کے متعلق کیا خبر ہے۔

"تمہیں میں کچھ نہیں بتا سکوں گا!" ––– محمد نے کہا ––– "وہ میرے ساتھ رہا تھا۔ تم تو جانتی ہو کہ وہ باطنیوں کے خلاف کس قدر جوشیلا اور بھڑکا ہوا انسان ہے۔ اس نے اپنا ایک الگ گروہ بنا لیا تھا جس میں دس یا بارہ اس کے اپنے چنے ہوئے جنگجو اور غیر معمولی طور پر دلیر آدمی تھے۔ اس نے سرکاری فوج کے دستوں پر شب خون اور دن کے وقت چھاپے مارنے شروع کر دیئے تھے۔ وہ سرکاری فوج کے دستوں کے لئے ایک بلائے ناگہانی یا آسمان سے گرنے والی بجلی بن گیا تھا۔ اس کے متعلق مجھے جو آخری اطلاع ملی تھی وہ بھی ایک شب خون کی کارروائی تھی۔ میں تمہیں وہ جگہ بتا دیتا ہوں اور راستہ بھی سمجھا دیتا ہوں۔ اگر تم کسی آدمی کو وہاں بھیجو تو شاید وہ....." ––– محمد خاموش ہو گیا۔

اس کی خاموشی نے شمونہ کو بنیادوں تک ہلا ڈالا۔ وہ سمجھ گئی کہ محمد یہ کہنا چاہتا تھا کہ شاید تمہیں مزمل کی لاش مل جائے۔

"آپ ہمیں وہ جگہ بتا دیں" ––– شمونہ نے کہا ––– "میں اور میری ماں خود وہاں جائیں گی"۔

"تمہارا جانا ٹھیک نہیں" ––– محمد نے کہا ––– "اگر اس جنگل بیابان میں تمہیں اور کسی نے پہچان لیا تو پھر ہم تمہیں ڈھونڈتے پھریں گے..... اپنا انجام سوچ لو"۔

اتنی ہی بات ہوئی تھی کہ سلطان برکیارق کا دربان آ گیا اور اس نے محمد سے کہا کہ اسے سلطان بلاتے ہیں۔ وہ وقت ایسا تھا کہ حکمران بہت ہی مصروف تھے ورنہ محمد ان کے ساتھ ایک دو آدمی بھیج دیتا۔ اس وقت وہ اتنا ہی کر سکتا تھا جو اس نے کیا کہ انہیں وہ جگہ بتا دی اور وہاں تک کا راستہ سمجھا دیا اور یہ بھی کہا وہ اگر سالار اوریزی سے مل لیں تو ہو سکتا

ہے کہ اس سے کوئی اور خبر یا اطلاع مل جائے۔ محمد نے انہیں بتایا کہ مزمل کا رابطہ سالار اوریزی کے ساتھ رہتا تھا۔

شمونہ اور میمونہ وہاں سے سالار اوریزی کے ہاں چلی گئیں۔ اب سالار اوریزی باغی اور مجرم نہیں تھا۔ اس کی سالاری بحال کر دی گئی تھی۔ اتفاق سے وہ شمونہ اور میمونہ کو مل گیا۔ اس سے مزمل کے متعلق پوچھا۔

"مجھے امید نہیں کہ وہ زندہ ہو" —— سالار اوریزی نے کہا —— "مجھے وہ جگہ معلوم ہے جہاں مزمل نے اپنے آٹھ مجاہدوں کے ساتھ سرکاری فوج کے ایک دستے کی خیمہ گاہ پر رات کے وقت شب خون مارا تھا۔ بڑا ہی خونریز معرکہ لڑا گیا تھا۔ ان آٹھ آدمیوں میں سے کوئی ایک بھی واپس نہ آیا تھا۔ میں نے اگلے روز وہاں جا کر دیکھنا تھا کہ مزمل اور اس کے ساتھیوں کا کیا بنا تھا لیکن سلطان کا بلاوا آ گیا کہ لڑائی بند کر دی جائے اور جو کوئی جہاں بھی ہے' وہاں سے واپس شہر میں آ جائے۔ میرے لئے یہ حکم تھا کہ میں اپنے دستوں کو فوراً" اکٹھا کر کے اس حکم کی تعمیل کروں۔ یہ ایسی وجہ تھی کہ میں مجبور ہو گیا اور مزمل اور اس کی جانباز جماعت کو دیکھنے جا ہی نہ سکا...... اگر مزمل زندہ ہوتا تو خود میرے پاس پہنچ جاتا"۔

سالار اوریزی نے ماں بیٹی کو وہ جگہ بتائی۔ یہی جگہ محمد نے بھی بتائی تھی۔

شمونہ کی جذباتی کیفیت بگڑنے لگی اور اس نے رونا شروع کر دیا لیکن وہ مزمل کی لاش دیکھے بغیر تسلیم نہیں کرنا چاہتی تھی کہ مزمل مارا جا چکا ہے۔

"بیٹی!" —— میمونہ نے کہا —— "اس تلخ حقیقت کو قبول کر لو کہ مزمل اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ اگر تم اکیلی یا ہم دونوں گئیں تو پہچانی جا سکتی ہیں۔ سوچ لو کیا ہو گا؟"

"جو کچھ بھی ہو گا ہو جائے" —— شمونہ نے پُرعزم آواز میں کہا —— "اگر مزمل مر چکا ہے تو میں اس کی لاش لاؤں گی اور اسے باقاعدہ دفن کروں گی...... اور اگر ماں! تم ڈرتی ہو تو نہ جاؤ' میں اکیلی چلی جاؤں گی"۔

ماں نے شمونہ کو بہت سمجھایا اور اسے نتائج سے ڈرایا لیکن شمونہ کے دل میں مزمل کی جو محبت تھی' اس محبت نے شمونہ پر دیوانگی طاری کر دی تھی۔ اس کے لئے مزمل صرف اس لئے اہم نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کو عشق کی حد تک چاہتے تھے بلکہ اس لئے کہ مزمل ایک جنگجو مجاہد تھا جس نے اپنے خاندان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور وہ

حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے چلا گیا تھا۔

اُس رات شمونہ نے اپنی ماں کو سونے نہ دیا اور نہ خود سوئی۔ رات بھر تڑپتی رہی اور ماں کے ساتھ مزمل کی ہی باتیں کرتی رہی۔ ماں نے سوچا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ شمونہ کے ساتھ نہ جائے تو شمونہ اکیلی ہی اسے بتائے بغیر چلی جائے۔ اس نے شمونہ سے کہا صبح ہوتے ہی اس جگہ روانہ ہو جائیں گی۔

○

اگلی صبح سورج ابھی طلوع نہیں ہُوا تھا کہ شمونہ اپنی ماں کے ساتھ گھر سے نکلی۔ دونوں گھوڑوں پر سوار تھیں۔ وہ گھوڑوں کا اور گھوڑ سواری کا زمانہ تھا۔ حسن بن صباح کے ہاں جو لڑکیاں تخریب کاری کے لئے تیار کی جاتی تھیں' انہیں شہسوار بنا دیا جاتا تھا اور انہیں خنجر زنی' تیغ زنی اور تیر اندازی کی خاص طور پر ٹریننگ دی جاتی تھی اور مشق بھی کرائی جاتی تھی۔ اپنے شکار کو زہر کھلانے یا پلانے کے طریقے بھی بتلائے جاتے تھے۔ لڑکیوں کا دل اور حوصلہ مضبوط کرنے کے لئے ہر لڑکی سے چار چار پانچ پانچ زندہ آدمی خنجروں یا تلواروں سے مروائے جاتے تھے۔ یہ بدقسمت آدمی جنہیں ان لڑکیوں کو ٹریننگ دینے کے لئے مروایا جاتا تھا' وہ قید خانے میں بند قیدی ہوتے تھے یا کسی بھی آدمی کو پکڑ کر ایک لڑکی کے حوالے کر دیا جاتا اور اسے کہا جاتا کہ خنجر اس کے دل کے مقام پر مارو۔ دل میں اُترا ہُوا خنجر شکار کو زندہ نہیں رہنے دیتا اور دوسرے وار کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ایسے ہی لڑکی کے ہاتھ میں تلوار دے کر ایک آدمی کو اس کے سامنے جھکا دیا جاتا کہ لڑکی ایک ہی وار میں اس کی گردن صاف کاٹ دے۔

شمونہ نے بھی یہ ٹریننگ حاصل کی تھی۔ اس کی ماں میمونہ بھی خنجر زنی اور تیغ زنی کی سُوجھ بُوجھ رکھتی تھی۔

ان دونوں کے جسم سر سے ٹخنوں تک سیاہ لبادے میں ڈھکے ہوئے تھے اور دونوں کے چہروں پر اس طرح نقاب تھے کہ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ انہیں جس جگہ جانا تھا وہ شہر سے کم و بیش دس میل دُور تھی۔ وہ علاقہ بڑا خوبصورت سبزہ زار تھا۔ درخت بے شمار تھے اور خود رُو پودے اور جھاڑیاں بھی تھیں' ہرے بھرے فصل بھی کھڑے تھے اور ہری گھاس بھی تھی۔ کچھ علاقہ ہموار اور میدانی تھا جس میں پگڈنڈی گزرتی تھی۔ آگے علاقہ چٹانی شروع ہو جاتا تھا جس میں ہری بھری اور اونچی نیچی ٹیکریاں بھی

تھیں اور ننگی چٹانیں بھی۔ شفاف پانی کی ایک چھوٹی سی ندی بھی اس علاقے میں سے گزرتی تھی۔ اس علاقے میں تو بیل بوٹوں کی مہک ہوا کرتی تھی لیکن اب وہاں بدبو تھی اور تعفن تھا۔ اس فضا میں جس میں یہ روح افزا مہک ہوتی تھی' اب مردار خور گدھ منڈلا رہے تھے۔ یہ گدھ نیچے اترتے اور اڑ جاتے تھے۔ گدھ چند ایک نہیں تھے بلکہ فضا میں جدھر بھی نظر جاتی گدھ ہی اڑتے نظر آتے تھے۔ درختوں پر بھی گدھ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ گدھ ان انسانوں کا گوشت نوچ رہے تھے جو خانہ جنگی میں مارے گئے تھے۔

شمونہ اور میمونہ اس علاقے میں داخل ہو گئی تھیں جو کچھ پہلے تک خونریز لڑائی کا میدان جنگ بنا رہا تھا۔ چلتے چلتے شمونہ کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اسے ایک بھیڑیا نظر آیا جس کے منہ میں کسی آدمی کا بازو تھا۔ وہ ایک طرف سے آیا اور بڑی بے نیازی سے شمونہ اور میمونہ کا راستہ کاٹتا ہوا آگے نکل گیا۔ وہ آدھے سے کچھ زیادہ سفر طے کر چکی تھیں۔ جب وہ چٹانی علاقے میں داخل ہو گئیں تو انہیں جگہ جگہ انسانی پنجر نظر آنے لگے۔ کھوپڑیاں ادھر ادھر پڑی نظر آتی تھیں۔ بعض کھوپڑیوں پر تھوڑا سا گوشت تھا اور بعض کو درندوں نے بالکل ننگا کر دیا تھا۔ کچھ کھوپڑیاں ایسی بھی تھیں جن کی آنکھیں سلامت تھیں اور کھلی ہوئی بھی تھیں۔ لاشوں کو گیدڑ' بھیڑیئے' اودھ بلاؤ اور گدھ کھا رہے تھے۔ کھانے کے لئے اتنی زیادہ لاشیں تھیں کہ یہ درندے جن میں آوارہ کتے تھے' آپس میں ذرا سا بھی لڑ نہیں رہے تھے۔

ان ہڈیوں میں تھوڑی دور کچھ آدمی ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے اور وہ ہڈیوں کے ہر ڈھانچے کو جھک کر دیکھتے تھے اور کھوپڑیوں کو تو وہ خاص طور پر بیٹھ کر اور پہچاننے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ اپنے عزیزوں کی لاشیں ڈھونڈ رہے تھے لیکن اب کسی کو پہچاننا ممکن نہیں رہا تھا۔

ماں بیٹی دو چٹانوں کے درمیان سے نکلیں تو آگے پھر علاقہ کھلا اور ہموار آ گیا۔ وہ تو کھوپڑیوں اور ہڈیوں کا دیس معلوم ہوتا تھا۔ جونہی گھوڑے آگے نکلے دونوں گھوڑے یک لخت رک گئے اور کانپنے لگے۔ گھوڑوں کی یہ بے چینی صاف نظر آ رہی تھی۔ دونوں گھوڑے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ شمونہ اور میمونہ نے دیکھا کہ ایک دھاری دھار شیر جو بہت بڑا بھی نہیں تھا اور بچہ بھی نہیں تھا' منہ میں انسانی جسم کا کچھ حصہ پکڑے آ رہا تھا۔ اس انسانی جسم کے حصے کی کھوپڑی تھی اور ایک طرف کا کندھا اور آدھا

بازو تھا۔ شیر اسے منہ میں لئے آہستہ آہستہ چلتا آیا اور گھوڑوں سے تھوڑی ہی دور ایک طرف کو مڑا اور جھاڑیوں میں اور پھر ایک ٹیکری کے پیچھے غائب ہو گیا۔ اس شیر کو گھوڑوں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا اور ڈر کر کانپنے لگے تھے۔

"نہیں..... نہیں!" ——— شمونہ نے تڑپ کر کہا ——— "مزمل زندہ ہو گا..... اس کے جسم کو کوئی درندہ کاٹ نہیں سکتا"۔

شمونہ بچوں کی طرح رو پڑی اور اس کی ہچکی بندھ گئی۔

"شمونہ بیٹی!" ——— میمونہ نے شمونہ سے کہا ——— "میری مانو اور یہیں سے واپس چلی چلو۔ مزمل اگر تمہیں مل بھی گیا تو اسی حالت میں ملے گا جو حالت تم ان انسانوں کی دیکھ رہی ہو جو یہاں لڑے تھے۔ مزمل کی کھوپڑی دیکھ کر اگر تم نے پہچان لی تو تم اپنا دماغی توازن کھو بیٹھو گی"۔

"نہیں!" ——— شمونہ نے دبی دبی لیکن پرعزم آواز میں کہا ——— "میرا دل گواہی دیتا ہے کہ مزمل مجھے زندہ مل جائے گا۔ میں اسے دیکھے بغیر واپس نہیں جاؤں گی۔ اگر اس کی کھوپڑی ہی نظر آ گئی تو یہ تسکین تو ہو جائے گی کہ وہ مارا جا چکا ہے اور اب اس سے ملاقات اگلے جہان میں ہو گی"۔

شیر کے غائب ہو جانے کے بعد گھوڑے آگے چل پڑے۔

ایک ہری بھری ٹیکری سے گھوم کر شمونہ اور میمونہ آگے نکلیں تو انہیں ایک بڑے ہی شفاف پانی کی ندی نظر آئی۔ محمد اور سالار اوریزی نے انہیں بتایا تھا کہ راستے میں ایک ندی آئے گی جس میں سے گزر کر آگے جانا ہے اور ذرا ہی آگے ایک قبرستان ہو گا ..... وہ ندی میں سے گھوڑے نکال کر لے گئیں۔ آگے قبرستان بھی آ گیا۔ قبرستان کے قریب ہی ایک گاؤں تھا جو اتنا زیادہ آباد نہیں لگتا تھا۔ ماں بیٹی کو اس قبرستان میں سے گزرنا تھا۔ وہ قبرستان میں داخل ہو گئیں۔ انہیں بہت سی تازہ قبریں نظر آئیں جن کی مٹی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی۔

اس قبرستان میں ایک قبر کے قریب ایک ضعیف العمر سفید ریش آدمی کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں لمبی لاٹھی تھی اور وہ اس لاٹھی کے سہارے کچھ جھکا ہوا تھا۔ شمونہ اور میمونہ اس کے قریب جا کر رک گئیں۔

"کیا یہ آپ کے کسی عزیز کی قبر ہے؟" ——— شمونہ نے اس سفید ریش بزرگ سے

پوچھا۔

"صرف یہی نہیں!" —— بزرگ نے پاؤں پر کھڑے کھڑے ہاتھ پھیلائے اور گھوم کر سارے قبرستان کی طرف اشارہ کر کے کہا —— "یہ سب میرے عزیز ہیں..... صرف عزیز ہی نہیں، میری تو پوری قوم مر گئی ہے..... یہ سب نئی قبریں جو تم دیکھ رہی ہو، میرے ہی عزیزوں کی ہیں اور تم نے راستے میں دیکھا ہو گا کہ جن لاشوں کو بھیڑیئے، گیدڑ، کتے اور گدھ کھا رہے ہیں، وہ بھی میرے عزیز ہیں۔ جس قوم میں پھوٹ اس طرح پڑ جائے کہ وہ قوم اپنا ہی خون بہانے پر اتر آئے، اس کی لاش کو کتے اور درندے ہی کھایا کرتے ہیں۔ جن دلوں کے دروازے بند کر دیئے جائیں تو لوگ کہتے ہیں کہ اب دشمن اندر نہیں آ سکتا لیکن دلوں کے دروازے اس طرح کھول دیئے جائیں کہ کفار کا طلسم اس میں داخل ہوتا رہے اور کافر حسینائیں بھی اس میں داخل ہوتی رہیں، حکمرانی اور زر و جواہرات کی ہوس دل کے دروازوں کو کبھی بند نہ ہونے دے تو قلعے اونچی اور چوڑی دیواروں اور لوہے جیسے مضبوط اور بند دروازوں کے باوجود ریت کے گھروندے بن جایا کرتے ہیں۔ عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں پھر اپنا سگا بھائی بھی دشمن نظر آنے لگتا ہے..... ہماری قوم سے اور ہمارے سلطان سے یہی گناہ سرزد ہوا اور دیکھو اس کی سزا کے مل رہی ہے۔ ماؤں کے سجیلے بیٹوں کو کتے اور گدھ نوچ رہے ہیں اور ان کی کھوپڑیاں ہر طرف بکھر گئی ہیں۔ یہ تو خوش قسمت تھے جن کی سالم لاشیں ان کے عزیز اٹھا لائے اور ان کے جنازے پڑھ کر انہیں دفن کیا گیا۔ انہیں دیکھو جن کے نصیب میں نہ کفن تھا نہ جنازہ نہ قبر میں دفن ہوئے..... تم کہاں سے آئی ہو اور کدھر جا رہی ہو؟"

"یہ میری بیٹی ہے" —— میمونہ نے شمونہ کی طرف اشارہ کر کے کہا —— "ہم اپنے ایک عزیز کی لاش کی تلاش میں نکلی ہیں۔ میں اسے بار بار کہہ رہی ہوں کہ واپس چلی چلو، میں جانتی ہوں کہ اس کی لاش مل بھی گئی تو برے حال میں ہو گی لیکن یہ نہیں مانتی"۔

"اسے ڈھونڈ لینے دو" —— سفید ریش بزرگ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا —— "ورنہ یہ خلش اسے ساری عمر تڑپاتی رہے گی..... میرے دو جوان بیٹے اس لڑائی میں ضائع ہو گئے ہیں۔ ان کے ساتھیوں نے مجھے بتا دیا ہے کہ وہ مارے گئے تھے لیکن ان کی لاشیں نہیں ملیں۔ میں یہاں قبرستان میں آ کر فاتحہ پڑھتا ہوں اور اپنے آپ کو یہ یقین دلا رکھا ہے کہ ان سب تازہ قبروں میں جو دفن ہیں وہ میرے ہی بیٹے ہیں"۔

○

ماں بیٹی بوجھل دل سے وہاں سے چل پڑیں اور تازہ قبروں کو دیکھتی ہوئی قبرستان سے نکل گئیں۔ آگے علاقہ پھر غیر ہموار سا آ گیا لیکن تھا وہ بھی بڑا دلکش اور خوبصورت علاقہ۔ کہیں بے آب و گیاہ چٹانیں بھی تھیں اور درختوں اور گھاس سے لدی ہوئی ٹیکریاں بھی۔ وہ چلتی چلی گئیں اور کچھ دور گئیں تو انہیں ایک چٹان کے دامن میں چشمہ نظر آیا۔ سات آٹھ گز کی گولائی میں پانی جمع تھا اور چشمہ چٹان میں سے نکل رہا تھا۔ پانی اتنا شفاف کہ تہہ میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں اور ذرا ذرا جتنی مچھلیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

شمونہ نے ماں سے کہا کہ وہ پانی پینا چاہتی ہے۔ ماں بیٹی گھوڑوں سے اتریں۔ دونوں نے نقاب ہٹا دیئے کیونکہ انہوں نے ہاتھوں سے پانی پینا تھا۔ دونوں چشمے کے کنارے بیٹھ گئیں اور چلو سے پانی پینے لگیں۔

شمونہ نے ہاتھ پانی میں ڈبو لئے اور چلو سے پانی نکالنے لگی تو اسے دائیں طرف گھوڑوں کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے اور میمونہ نے دائیں طرف دیکھا۔ دو گھوڑے رکے کھڑے تھے اور ان پر دو آدمی سوار تھے۔ ایک ادھیڑ عمر تھا اور دوسرا اس سے کم عمر۔ شمونہ کے چہرے سے نقاب ہٹا ہوا تھا۔

ادھیڑ عمر گھوڑ سوار کو دیکھ کر شمونہ کے ہاتھ رک گئے اور اس کے ہاتھوں سے پانی نکل گیا۔ شمونہ کے چہرے پر گھبراہٹ کا تاثر آ گیا۔ گھوڑ سوار کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ گھوڑے سے اتر آیا۔ اس کا ساتھی بھی گھوڑے سے اترا۔ شمونہ نے اپنی ماں سے کہا کہ اٹھو، چلیں۔

"کیوں؟..... کیا ہوا؟" —— ماں نے شمونہ کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار دیکھ کر سرگوشی میں پوچھا۔

"اس شخص نے مجھے پہچان لیا ہے" —— شمونہ نے اپنے گھوڑے کی طرف جاتے ہوئے دھیمی آواز میں جواب دیا —— "جلدی آ جاؤ ماں!..... یہ ابن البلیر، حسن بن صباح کا خاص آدمی ہے"۔

شمونہ اور میمونہ نے اپنے گھوڑوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا اس لئے وہ چند قدم دور چلے گئے اور گھاس کھا رہے تھے۔ گھوڑے قریب ہوتے تو وہ دونوں فوراً ان پر سوار ہو جاتیں اور ایڑ لگا دیتیں لیکن شمونہ ابھی اپنے گھوڑے تک نہیں پہنچی تھی کہ وہ ادھیڑ عمر

شخص اس تک پہنچ گیا اور اس کے راستے میں آن کھڑا ہوا۔ اب اس کی مسکراہٹ اور زیادہ پھیل گئی تھی۔

"بچھڑے ہوئے راہی زندگی میں کسی نہ کسی موڑ پر مل جایا کرتے ہیں" ۔۔۔ اس آدمی نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا ۔۔۔ "امام حسن بن صباح کا کوئی ہیرا گم ہو جائے تو کچھ عرصے بعد ہیرا خود ہی امام کے پاس پہنچ جاتا ہے"۔

"کون ہو تم؟" ۔۔۔ شمونہ نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال کر ذرا غصیلی آواز میں کہا ۔۔۔ "تم ڈاکو یا رہزن معلوم ہوتے ہو۔ اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ ہم عورتیں ہیں اور تم ہم پر قابو پا لو گے"۔

"کیا تم بھول گئی ہو میں کون ہوں؟" ۔۔۔ اس شخص نے کہا ۔۔۔ "امام آج بھی تمہارے لئے چشم براہ ہے..... آؤ چلیں"۔

"مجھے سوچ سمجھ کر ہاتھ لگانا" ۔۔۔ شمونہ نے کہا ۔۔۔ "بہت برے انجام تک پہنچو گے"۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" ۔۔۔ میمونہ نے اس آدمی کے آگے ہو کر پوچھا ۔۔۔ "میری بیٹی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟"

"شمونہ!" ۔۔۔ اس شخص نے میمونہ کو نظرانداز کرتے ہوئے شمونہ سے کہا ۔۔۔ "میں اتفاق سے اِدھر آ نکلا تھا۔ یہاں امام کا گمشدہ ہیرا نظر آ گیا۔ میں اس ہیرے کو کیسے چھوڑ کر جا سکتا ہوں..... تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا"۔

وہ شخص میمونہ کو ہاتھ سے ایک طرف کر کے شمونہ کی طرف بڑھا۔ شمونہ کے لئے پیچھے ہٹنے کو جگہ نہیں تھی کیونکہ پیچھے چشمے کا پانی تھا اور وہ بالکل کنارے پر کھڑی تھی۔ اس شخص نے شمونہ کے قریب جا کر اس کے نقاب پر ہاتھ رکھا۔ وہ اس کا چہرہ بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ شمونہ نے بڑی تیزی سے اپنے کپڑوں کے اندر ہاتھ ڈالا۔ وہ شخص سمجھ نہ سکا کہ شمونہ کیا کر رہی ہے۔ شمونہ نے اسی تیزی سے ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں لمبا خنجر تھا جو وہ گھر سے اپنے نیفے میں اُڑس کر لائی تھی۔ اُس نے بجلی کی سُرعت سے خنجر اس آدمی کے دل میں اتار دیا۔ خنجر کھینچا اور ایک بار پھر خنجر اسی مقام پر مارا۔

وہ آدمی سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹا۔ اب وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ شمونہ جانتی تھی کہ یہ شخص اب چند لمحوں کا مہمان ہے۔ اس شخص نے اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھا اور تلوار نیام میں سے کھینچی لیکن تلوار ابھی آدھی ہی باہر آئی تھی کہ وہ لڑکھڑایا اور ایک پہلو پر گر پڑا۔

اس دوران اس کا ساتھی جو اس کی نسبت جوان تھا بڑا تیز دوڑتا ادھر آیا۔ میمونہ بھی تیزی سے دوڑی اور سامنے سے اس آدمی کو اپنے ایک کندھے کی ٹکر اتنی زور سے ماری کہ وہ آدمی سنبھلتے سنبھلتے چشمے میں جا گرا۔ وہ تھا ہی چشمے کے کنارے پر۔

میمونہ کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ چشمہ اتنا گہرا نہیں تھا کہ وہ آدمی ڈوب جاتا۔ وہ پانی میں گرا اور ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ شمونہ نے جھپٹ کر اس پر جست لگائی اور خنجر اس کی پیٹھ میں اتار دیا۔ وہ چشمے میں گری اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس آدمی کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی تھی۔ شمونہ اٹھ کر سنبھلی اور ایک بار پھر خنجر اس آدمی کے پہلو میں اتار دیا۔ وہ پانی میں سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ پانی بمشکل کمر تک گہرا تھا۔

وہ چل نہیں سکتا تھا۔ وہ پانی میں ہی گر پڑا اور پھر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ شمونہ نے آگے بڑھ کر اسے اوپر سے دبایا اور اسے ڈبو دیا۔ وہ ذرا سا تڑپا اور ختم ہو گیا۔

شمونہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر چشمے میں سے نکلی۔ دوسرا آدمی باہر مرا پڑا تھا۔ چشمے کا پانی خون سے لال ہونے لگا۔ یہاں سے پانی ایک نالی کی صورت میں باہر کو بہتا تھا اور آگے جا کر ندی میں مل جاتا تھا۔

"چلو ماں!" ۔۔۔ شمونہ نے کہا ۔۔۔ "کتّوں اور گِدھوں کو اب تازہ گوشت مل جائے گا"۔

شمونہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اس کی ماں نے باہر پڑے آدمی کی لاش سے تلوار کھول لی۔ پھر وہ چشمے میں اتری تو اس آدمی کی تلوار بھی اٹھا لی۔ نیام اس کی کمر سے بندھی ہوئی تھی جو اس نے کھول لی۔ میمونہ نے دونوں کے گھوڑے بھی پکڑ لئے۔ ایک گھوڑے کی زین کے ساتھ چمڑے کا تھیلا بندھا ہوا تھا۔ میمونہ نے وہ تھیلا کھولا تو اس میں کچھ درہم پڑے ہوئے تھے اور باقی سب سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے۔ تھیلا انہی سے بھرا ہوا تھا۔ ماں نے یہ تھیلا کھول کر شمونہ کو دکھایا۔

"یہ لوگوں کو خریدنے کے لئے ساتھ لایا تھا" ۔۔۔ شمونہ نے کہا ۔۔۔ "اگر یہ شخص شہر میں زندہ پہنچ جاتا تو کوئی نیا ہی طوفان کھڑا کر دیتا"۔

"اب میرا حوصلہ پوری طرح مضبوط ہو گیا ہے" ۔۔۔ میمونہ نے کہا ۔۔۔ "مجھے

یقین ہو گیا ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے ورنہ ایک لڑکی اتنے تنومند آدمی کو یوں آسانی سے قتل نہ کرتی' اور جس طرح اس کا ساتھی تمہارے ہاتھوں مارا گیا ہے' یہ بھی ایک ثبوت ہے کہ ہم صحیح راستے پر جا رہی ہیں اور اللہ نے ہمارا ہاتھ پکڑ رکھا ہے"۔

انہوں نے ان دونوں آدمیوں کے گھوڑوں کی باگیں اپنے گھوڑوں کے پیچھے باندھ لیں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر چل پڑیں۔

"اب سنو ماں! مزے کی ایک بات سناتی ہوں" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "میں جب حسن بن صباح کے پاس تھی تو اس شخص نے مجھے خنجر زنی اور تیغ زنی اور گھوڑ سواری سکھائی تھی۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ دل کہاں ہوتا ہے اور اس میں خنجر کس طرح مارا جاتا ہے۔ یہ شخص میری سکھلائی اس طرح کرتا تھا کہ عام خنجر جتنا لمبا لکڑی کا ایک ٹکڑا میرے ہاتھ میں دے کر سامنے کھڑا ہو جاتا اور کہتا کہ میرے دل کے مقام پر مارو۔ میں اس کی سکھلائی کے مطابق لکڑی کا یہ ٹکڑا اس کے دل کے مقام پر آہستہ سے مارتی تھی۔ پھر یہ مجھے سکھلاتا تھا کہ خنجر کس طرح تیزی سے نکالا جاتا ہے اور دشمن کسی بھی زاویے پر کھڑا ہو' اُسے کس طرح مارا جاتا ہے۔ میں نے آج اسی کا سکھلایا ہُوا داؤ اسی پر استعمال کیا ہے۔ مرتے وقت اسے یہ خیال ضرور آیا ہو گا کہ میں اس کے سکھلائے ہوئے طریقے بھولی نہیں۔ اس نے مجھے یہ بھی مشق کرائی تھی کہ پیٹھ کی طرف سے دل میں خنجر کس طرح اتارا جاتا ہے۔ میں نے چشمے میں اس کے ساتھی کی پیٹھ میں جو خنجر مارا تھا' وہ یقیناً" اس کے دل میں اُتر گیا تھا ورنہ وہ اتنی جلدی نہ گرتا"۔

"میں تو اللہ کا ہی شکر ادا کرتی ہوں بیٹی!" ــــ میمونہ نے کہا ــــ "اللہ کی مدد کے بغیر کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا"۔

"کچھ عرصہ یہ میرا محافظ بھی بنا رہا ہے" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "حسن بن صباح نے جب مجھے پہلے شکار پر بھیجا تھا تو یہ شخص میرا محافظ بن کر میرے ساتھ آیا تھا۔ میں نے پہلا شکار بڑی کامیابی سے پھانس لیا تھا اور جب اس شخص کو یقین ہو گیا کہ میں اپنے کام میں ماہر ہو گئی ہوں اور قابلِ اعتماد بھی ہوں تو یہ چلا گیا تھا..... میں نے صرف اس لئے قتل نہیں کیا کہ یہ مجھے اپنے ساتھ پھر حسن بن صباح کے پاس جانے کی کوشش کر رہا تھا بلکہ اسے دیکھ کر دل میں نفرت کا طوفان اٹھ آیا تھا۔ یہ جب میرے ساتھ میرا محافظ بن کر آیا تھا تو اس نے مجھے اپنی چھوٹی بہن تو نہیں سمجھا تھا۔ یہ شیطان میری عصمت کے ساتھ کھیلتا رہا تھا' حالانکہ حسن بن صباح کا حکم یہ تھا کہ مجھ جیسی لڑکیوں کے ساتھ ہوس کاری کا کھیل نہ کھیلا جائے تاکہ یہ خاصی عمر تک تندرست اور پھرتیلی رہیں۔ اُس وقت تو میں نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا نہ اسے گناہ سمجھا تھا کیونکہ حسن بن صباح کے ہاں عصمت اور آبرو نام کی کوئی چیز نہیں۔ یہ احساس کہ میں آبرو باختہ ہوں' اُس وقت میرے اندر یہ احساس پیدا ہُوا تھا جب میں یہاں آ گئی اور مجھے تم ملیں اور پھر میرے دل میں مزمل کی محبت پیدا ہوئی۔ آج اس شخص کو دیکھا تو میرے وجود میں آگ لگ گئی اور میں نے عہد کر لیا کہ اپنی عصمت کا انتقام لوں گی۔ وہ میں نے لے لیا ہے اور اب یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری روح ہلکی پھلکی ہو گئی ہے..... میری پیاری ماں! دعا کرو ہمیں مزمل مل جائے"۔

"ایک بات سن لو بیٹی!" ــــ میمونہ نے کہا ــــ "دل سے یہ یقین نکال دو کہ مزمل تمہیں زندہ مل جائے گا ورنہ تمہیں بہت زیادہ صدمہ ہو گا۔ اس کی بجائے دل میں یہ رکھو کہ مزمل زندہ نہیں ملے گا۔ میں تو کہتی ہوں کہ ہمیں یہ حقیقت قبول کر لینی چاہئے کہ مزمل زندہ نہیں۔ اگر وہ زندہ مل گیا تو تم دیکھنا تمہیں کتنی خوشی حاصل ہو گی"۔

محمد اور سالار اوریزی نے انہیں جو راستہ بتایا تھا' اس کی ایک نمایاں نشانی یہ چشمہ تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ اس چشمے سے پانی بہہ کر ایک ندی کی صورت میں آگے جاتا ہے' اس کے ساتھ ساتھ چلی جانا اور تھوڑی دُور آگے وہ جگہ ہے جہاں مزمل نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ سرکاری فوج کے ایک دستے کے پڑاؤ پر شب خون مارا تھا..... وہ چشمہ آ گیا تھا اور اب ماں بیٹی اس کے ساتھ ساتھ جا رہی تھیں۔

○

وہ بے آب و گیاہ چٹانوں اور ہری بھری ٹیکریوں کا علاقہ تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پانی کی یہ ندی مڑتی تھی۔ ماں بیٹی اس کے ساتھ ساتھ دائیں بائیں مُڑتی آگے بڑھتی گئیں۔ ایک اور موڑ مڑیں تو دیکھا یہ پانی خاصی دُور تک بہتا تھا۔

"وہ جگہ تو یہی ہے" ــــ میمونہ نے کہا ــــ "وہ دیکھو لمبوتری چٹان کھڑی ہے..... لیکن شمونہ بیٹی! تم کو تو عقل نہیں' ذرا سوچو مزمل کوئی بے جان چیز تو نہیں کہ کسی نے ہمیں بتایا ہو کہ ایک لمبوتری چٹان آئے گی اور وہ چیز جس کا نام مزمل ہے وہاں پڑی ہوئی مل جائے گی۔ بتانے والوں نے تو ہمیں وہ علاقہ بتایا ہے جہاں مزمل نے شب خون مارا

تھا۔ ضروری نہیں کہ وہ اُس رات سے اب تک یہیں ہو' کسی اور طرف نکل گیا ہو گا"۔

"میرے دل کی آواز سنو ماں!" —— شمونہ نے ایسے لہجے میں کہا جو اس کا قدرتی لہجہ نہیں تھا —— "میرے دل کی' میری روح کی آواز سنو..... اسے میرا وہم ہی سمجھ لو لیکن کوئی جذبہ یا کوئی غیبی طاقت مجھے کہہ رہی ہے کہ چلی چلو' تمہیں منزل مل جائے گا"۔

میمونہ نے شمونہ کا یہ لب و لہجہ دیکھا تو اس کے آنسو نکل آئے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ شمونہ کا دماغی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ میمونہ کچھ دیر شمونہ کو دیکھتی رہی۔ شمونہ کا گھوڑا پانی کی نالی سے بائیں طرف اور میمونہ کا گھوڑا دائیں طرف پہلو بہ پہلو چلے جا رہے تھے۔ شمونہ سامنے دیکھ رہی تھی اور میمونہ کی نظریں شمونہ کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ میمونہ کو بہت دکھ ہو رہا تھا کہ اس کی بیٹی کی جذباتی کیفیت اس کے قابو سے باہر ہو رہی تھی۔

"وہ دیکھو ماں!" —— شمونہ نے چونک کر سامنے اشارہ کیا اور بے تابی سے کہا —— "وہ دیکھو' کوئی آدمی ہے"۔

میمونہ نے سامنے دیکھا۔ اسے کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ وہاں درخت زیادہ تھے' جھاڑیاں بھی تھیں اور گھاس ذرا اونچی تھی۔ میمونہ کو کوئی آدمی نظر نہ آیا تو اسے بہت ہی دکھ ہُوا کہ اس کی بیٹی کو اب اسی طرح کے واہمے نظر آنے لگے ہیں جیسے ریگستان میں جاتے ہوئے مسافر کو سراب نظر آنے لگتے ہیں۔ اب تو میمونہ کو یقین ہونے لگا کہ اس کی بیٹی کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔

"ہوش میں آ شمونہ بیٹی!" —— میمونہ نے دکھے ہوئے سے لہجے میں کہا —— "مجھے تو کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا"۔

"وہ چلتے چلتے بیٹھ گیا ہے" —— شمونہ نے کہا —— "وہ دیکھو"۔

اب میمونہ نے اُدھر دیکھا تو اسے ایک آدمی نظر آیا جو ایک درخت کے تنے پر ہاتھ رکھے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس سے تیس پینتیس قدم دور ہو گا۔ اس کے کپڑے سرخ رنگ کے تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہُوا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔

صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس نے تنے کو دونوں بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے تنے کو چھوڑا اور آگے کو قدم اٹھایا۔ وہ بمشکل دو یا تین قدم چلا ہو گا کہ اس کے گھٹنے زمین پر جا لگے اور پھر اس نے دونوں ہاتھ

ئمن پر ٹیک دیئے۔ پانی کی نالی اس سے پانچ چھ قدم دور تھی۔ اب اُس آدمی نے اٹھنے کی بجائے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل پانی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ میمونہ اور شمونہ نے اپنے گھوڑے ذرا تیز کر دیئے۔

گھوڑے اُس سے دس بارہ قدم دور رہ گئے تو اُس آدمی نے اُدھر دیکھا۔ اُس وقت میمونہ اور شمونہ نے دیکھا کہ اس شخص کے کپڑے جو دُور سے سرخ نظر آتے تھے' دراصل خون سے سرخ ہو گئے تھے۔ اس آدمی نے ماں بیٹی کو دیکھا تو اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن گر پڑا۔ اس کے قریب چھوٹا سا ایک درخت تھا' اس نے اس طرف ہو کر درخت کا سہارا لیا اور اٹھ کھڑا ہُوا۔ پیٹھ درخت کے ساتھ لگالی اور نیام سے تلوار کھینچ لی۔ ماں بیٹی اس کے بالکل قریب پہنچ گئیں اور گھوڑے روک لئے۔

"میرے قریب نہ آنا" —— اس آدمی نے کہا —— "تم باطنی ہو' میرے قریب آؤ گی تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مرتے مرتے تم دونوں کو مار کر مروں گا"۔

ماں بیٹی گھوڑوں سے اُتریں۔ وہ آدمی بہت ہی زخمی تھا۔ اس کے سر پر کپڑا لپٹا ہُوا تھا۔ دونوں اس کے پاس جا رکیں اور اس آدمی نے تلوار تان لی۔

"تم مسلمان لگتے ہو" —— میمونہ نے کہا —— "ہم باطنی نہیں۔ ہم اپنے ایک عزیز کو ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔ تمہیں اس حالت میں یہاں چھوڑ کر نہیں جائیں گی۔ دیکھو ہمارے پاس دو فالتو گھوڑے ہیں۔ جہاں کہو گے تمہیں ایک گھوڑے پر ڈال کر پہنچا دیں گی۔ ہم سے نہ ڈرو۔ میرا خیال ہے کہ شہر میں اردگرد کے علاقے میں کوئی باطنی زندہ نہیں"۔

"پھر ڈھونڈ لو اپنے عزیز کو!" —— اس زخمی آدمی نے مری مری سی آواز میں کہا —— "یہاں اب تمہیں لاشیں ہی ملیں گی۔ اگر تمہارے عزیز کا چہرہ سلامت ہُوا تو پہچان لینا"۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" —— شمونہ نے پوچھا اور کہا —— "اور بتاؤ کہ ہم تمہیں کہاں لے چلیں"۔

"میں پانی پینے آیا ہوں" —— اس آدمی نے کہا —— "یہ دیکھو چھاگل' یہ بھر کر اپنے ایک ساتھی کے لئے لے جاؤں گا وہ مجھ سے زیادہ زخمی ہے"۔

وہ آدمی جو جواں سال تھا' پاؤں پر زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا۔ شمونہ نے آگے بڑھ کر

اُس کے ہاتھ سے چھاگل لے لی۔ یہ چمڑے کا چھوٹا سا ایک مشکیزہ تھا جو اُس دور میں مسافر پانی کے لئے استعمال کیا کرتے تھے۔ شمونہ نے اس کا یہ ذرا جتنا مشکیزہ پانی سے بھر لیا اور اسی سے اسے پانی پلایا اور پھر مشکیزے کا منہ بند کر دیا۔ زخمی آدمی نے پانی پی کر لمبا سانس چھوڑا۔

"یہاں قریب ہی ایک غار ہے" — اس آدمی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا — "میرا ایک ساتھی مجھ سے زیادہ زخمی حالت میں وہاں پڑا ہے۔ میں نے اُسے جا کر پانی پلانا ہے۔ وہ شاید زندہ نہ رہ سکے۔ وہ نہ رہا تو شاید میں بھی نہ رہوں"۔

"ہم تم دونوں کو ساتھ لے جائیں گی" — میمونہ نے کہا — "چلو ہم تمہیں سہارا دے کر لے چلتی ہیں"۔

ماں بیٹی نے اُسے دائیں بائیں ہو کر اٹھایا اور اسے پہلوؤں سے سہارا دے کر آگے کو چل پڑیں۔ زخمی کو اتنا ہی سہارا چاہئے تھا۔

"صرف ایک دُکھ ہے" — زخمی آدمی نے کہا — "میرے ہاتھوں میرے بھائی قتل ہوئے ہیں۔ میں سرکاری فوج کے خلاف لڑا تھا۔ اس فوج میں میرے بھائی بھی تھے' وہ کوئی غیر تو نہیں تھے۔ دیر بعد پتہ چلا یہ فتنہ باطنیوں نے کھڑا کیا تھا۔ زندہ رہنے کی خواہش صرف اس لئے ہے کہ میں حسن بن صباح کو قتل کروں گا"۔

یہ جواں سال آدمی اس قدر زخمی تھا کہ میمونہ اور شمونہ اسے جہاں بھی ہاتھ رکھتی تھیں' وہ کہتا تھا کہ ہاتھ ذرا نیچے یا اوپر رکھنا' یہاں زخم ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ دونوں ساتھی بُری طرح زخمی ہیں اور اگر انہوں نے مرنا ہوتا تو دو چار دن پہلے ہی مر چکے ہوتے۔ اُس نے پر عزم لہجے میں کہا کہ وہ ابھی تک شاید اس لئے زندہ ہیں کہ اللہ نے ان سے کوئی اور کام کروانا ہے۔ ایسے ہی باتیں کرتے کرتے زخمی ماں بیٹی کے سہارے ایک چٹان کے پہلو کی طرف گیا اور وہاں ایک کشادہ غار دیکھا جو زیادہ لمبا نہیں تھا۔ ایک آدمی جس کے کپڑے خون سے لال سرخ تھے' لیٹا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا جسم جگہ جگہ سے کٹا ہوا ہو۔ وہ پہلو کے بل لیٹا ہوا تھا اور باہر کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔

"مزمل بھائی!" — زخمی جوان نے اسے پکارا اور کہا — "یہ لوگ تمہارے لئے پانی لے آئے ہیں اور دیکھو' اللہ نے ہمارے لئے گھوڑے بھی بھیج دیئے ہیں"۔

میمونہ اور شمونہ نے مزمل کا نام سنا تو چونک اٹھیں۔ اُدھر غار میں زمین پر پڑے

ہوئے زخمی نے کروٹ بدلی تو اس کا چہرہ سامنے آگیا۔ وہ مزمل آفندی تھا۔ اس کے سر پر بھی کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ شمونہ اُس پر اس طرح جھپٹی جس طرح شیر شکار پر جھپٹتا ہے۔ وہ اس پر جا پڑی اور پھر "مزمل' مزمل" کہتی ہوئی اسے اٹھانے لگی۔ یہ ایک معجزہ تھا کہ مزمل ہوش میں تھا اور اس نے شمونہ اور میمونہ کو پہچان لیا۔ وہ بیٹھ گیا اور شمونہ نے پانی کی چھاگل کا منہ کھولا اور چھاگل اس کے منہ کے ساتھ لگا دی۔

مزمل نے پانی پی لیا تو اس نے بولنے کی کوشش کی لیکن بول نہ سکا۔ وہ بہت ہی کمزور ہو گیا تھا اور اس کے جسم میں خون کے چند ہی قطرے رہ گئے تھے۔ شمونہ اسے بازوؤں میں لے کر دیوانوں جیسی حرکتیں کر رہی تھی جیسے ماں کو اپنا وہ گمشدہ بچہ مل گیا ہو جس کے ملنے کی امید دم توڑ گئی تھی۔

میمونہ اور شمونہ نے ایک گھوڑے پر مزمل کو اور دوسرے پر اس کے ساتھی کو اٹھا کر بٹھایا اور یہ قافلہ شہر کی طرف چل پڑا۔

○

مزمل کے ساتھی کا نام رحیم ابن یونس تھا اور وہ بن یونس کے نام سے مشہور تھا۔

میمونہ اور شمونہ نے دیکھ لیا تھا کہ ان دونوں کے جسموں سے کافی خون نکل گیا ہے اور یہ صرف پانی پیتے رہے ہیں اور کھانے کو انہیں کچھ نہیں ملا۔ ان کی حالت بتاتی تھی کہ مرو تک مشکل سے ہی پہنچیں گے۔

"شمونہ بیٹی!" — میمونہ نے شمونہ کے قریب ہو کر آہستہ سے کہا — "ان کا علاج معالجہ شاہی طبیب اور جراح ہی کر سکتے ہیں۔ کوئی عام طبیب ان کے جسموں میں جان نہیں ڈال سکے گا"۔

"میں انہیں سلطان کے محل میں لے جاؤں گی" — شمونہ نے کہا — "ان کی مرہم پٹی اور علاج سلطان کا طبیب کرے گا"۔

سورج غروب ہونے میں کچھ دیر باقی تھی جب چار گھوڑے سلطان کے محل کے باہر والے دروازے میں داخل ہوئے۔ دربان شمونہ اور اس کی ماں میمونہ کو جانتے تھے اس لئے انہیں روکا نہ گیا۔ نہ روکنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ دو گھوڑوں پر دو زخمی اس حال میں سوار تھے کہ وہ زینوں پر بیٹھے ہوئے نہیں بلکہ آگے کو پیٹ کے بل ہو گئے تھے اور غالباً وہ ہوش میں بھی نہیں تھے۔

شمونہ گھوڑے سے کود کر اتری اور محل میں داخل ہو گئی۔ وہ سلطان برکیارق کا پوچھ رہی تھی لیکن اسے بتایا گیا کہ سلطان بھی نہیں' وزیر اعظم سمیری بھی نہیں اور محمد اور سنجر بھی نہیں ہیں۔ یہ پتہ چلا کہ برکیارق کی ماں اپنے کمرے میں ہے۔ شمونہ دوڑتی ہوئی اس کمرے میں پہنچی۔ شمونہ نے روزینہ کو سلطان برکیارق کے ہاتھوں قتل کرا کے محل میں بڑا اونچا مقام حاصل کر لیا تھا۔ برکیارق کی ماں نے شمونہ کو دیکھا تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور بازو پھیلا کر شمونہ کو گلے لگا لیا۔

"مادرِ محترم!" ——— شمونہ نے سلطان کی ماں کے بازوؤں سے نکلتے ہوئے اور روتے ہوئے کہا ——— "مزمل آفندی مر رہا ہے..... اللہ کی راہ میں اسے بچالیں..... اس کا ایک ساتھی بھی ہے..... دونوں اتنے زخمی ہیں کہ ان کے جسموں میں خون رہا ہی نہیں۔ اپنے طبیب کو بلائیں"۔

سلطان کی ماں شمونہ کے ساتھ باہر کو دوڑی۔ اس نے دیکھا کہ وہ زخمی گھوڑوں پر بے ہوش پڑے ہیں۔ ماں نے حکم دیا کہ طبیب اور جراح کو فوراً لایا جائے۔

سلطان کی ماں کے کہنے پر کئی آدمی دوڑے آئے اور وہ دونوں زخمیوں کو گھوڑوں سے اتار کر اور اٹھا کر ایک کمرے میں لے گئے۔ طبیب اور جراح بھی آ گئے اور انہوں نے زخمیوں کی مرہم پٹی شروع کر دی..... سلطان برکیارق کی ماں میمونہ اور شمونہ کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ میمونہ نے اسے سنایا کہ شمونہ نے کس طرح دو باطنیوں کو چشمے پر قتل کیا ہے۔

○

جس وقت ان زخمیوں کی مرہم پٹی ہو رہی تھی' اس وقت قلعہ الموت میں حسن بن صباح اپنے اُس خصوصی باغیچے میں ٹہل رہا تھا جو اس نے اپنے لئے تیار کروایا تھا۔ اب حسن بن صباح کوئی جادوگر یا شعبدہ باز نہیں تھا نہ وہ اپنے آپ کو سلجوقیوں سے بھاگا ہوا مجرم سمجھتا تھا نہ اس کے دل پر کسی کا خوف یا ڈر سوار تھا' وہ تو اب خدا سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ اپنے پیرو مرشد اور استاد احمد بن عطاش سے بھی نظریں پھیر لیا کرتا تھا۔ اب وہ ایک طاقت بن گیا تھا۔ وہ سُلطانوں اور بادشاہوں جیسی حکمرانی نہیں کر رہا بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کا حکمران تھا۔ سلطان اور بادشاہ لوگوں کے جسموں کو غلام بناتے ہیں لیکن جن علاقوں پر حسن بن صباح قابض ہو گیا تھا ان علاقوں کے لوگ اسے ولی اور روحانی طور پر

مانتے تھے۔ وہ اسے امام بھی کہتے تھے اور شیخ الجبل بھی اور ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو اسے نبی مانتے تھے۔

وہ جب اپنے اس خاص باغیچے میں ٹہل رہا تھا' اس کے ساتھ اس کے دو مصاحب اور مشیر بھی تھے۔

"مرو سے آج بھی کوئی خبر نہیں آئی" ——— حسن بن صباح نے اپنے مصاحبوں سے کہا ——— "وہاں کی خانہ جنگی اب تک اور زیادہ پھیل جانی چاہئے۔ مرو تو خون میں ڈوب ہی رہا ہے' میں چاہتا ہوں کہ ابو مسلم رازی کے شہر رے کی گلیاں بھی خون کی ندیاں بن جائیں..... لیکن کیا بات ہے کہ اُدھر سے کوئی خبر نہیں آ رہی"۔

"آ جائے گی شیخ الجبل!" ——— ایک مصاحب نے کہا ——— "سلطنتِ سلجوقیہ کی بنیادیں ہل رہی ہیں۔ مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ ہمارے گھوڑے سلجوقیوں کی لاشوں کو روندتے' کچلتے اور مسلتے ہوئے مرو میں فاتحانہ چال چلتے ہوئے داخل ہوں گے"۔

سورج غروب ہو رہا تھا جب ایک گھوڑے کے ٹاپ سنائی دینے لگے۔ ٹاپوں کی آواز قریب آ رہی تھی۔ حسن بن صباح اس طرف دیکھنے لگا۔ ذرا ہی دیر بعد گھوڑا اور اس کا سوار نظر آئے۔ سوار قریب آ کر گھوڑے سے کود کر اترا اور تیزی سے چلتا حسن بن صباح کے پاس آیا۔

"مرو سے آئے ہو؟" ——— حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ہاں شیخ الجبل!" ——— سوار نے کہا ——— "مرو سے آیا ہوں"۔

قریب سنگ مرمر کا بنا ہوا ایک تخت سا تھا۔ حسن بن صباح اس پر بیٹھ گیا اور قاصد کو اشارہ کیا کہ وہ اس کے سامنے بیٹھ جائے۔ قاصد اور دونوں مصاحب حسن بن صباح کے سامنے بیٹھ گئے۔

"کیا مرو والے ابھی تک ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں؟" ——— حسن بن صباح نے شگفتہ سی آواز میں پوچھا۔

"یا شیخ الجبل!" ——— قاصد نے کہا ——— "میں کوئی اچھی خبر نہیں لایا..... خانہ جنگی اچانک رک گئی تھی اور یہ سلطان برکیارق کے حکم سے روکی گئی تھی۔ اس کے فوراً بعد حکم ملا کہ جہاں جہاں کوئی باطنی نظر آتا ہے اسے قتل کر دیا جائے۔ سب سے پہلے ہمارا طبیب اور اس کے ساتھی اپنے گھر میں قتل ہوئے۔ ان کے گھر پر چھاپہ پڑا تھا۔ ہمارے

آدمیوں کو بھاگنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ جس کے متعلق ذرا سا بھی شک ہُوا کہ یہ ہمارے فرقے کا آدمی ہے' اسے قتل کر دیا گیا"۔

"یہ ہُوا کیسے؟" — حسن بن صباح نے بڑی زور سے اپنا ایک پاؤں زمین پر مار کر پوچھا — "کیا وہ لڑکی روزینہ دھوکا دے گئی ہے یا مر گئی ہے؟"

"اسے سلطان برکیارق نے اپنے ہاتھوں قتل کر دیا تھا" — قاصد نے جواب دیا۔

"اگر تم سب کچھ جانتے ہو تو پوری بات سناؤ" — حسن بن صباح نے کہا۔

قاصد نے خانہ جنگی کی تفصیلات سنانی شروع کر دیں اور بتایا کہ دونوں طرفوں کے لشکر لڑتے لڑتے شہر سے کتنی دور چلے گئے تھے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ رے کا امیر ابو مسلم رازی اپنا لشکر لے کر مَرو پہنچ گیا تھا اور وہ سرکاری فوج کے خلاف لڑا تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ کس طرح خانہ جنگی اچانک رک گئی اور باطنیوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔

"یا شیخ الجبل!" — قاصد نے کہا — "میں خانہ جنگی رکتے ہی وہاں سے چل پڑا لیکن میں نے کچھ راز لینے تھے۔ یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ خانہ جنگی کس طرح رکی اور سلطان برکیارق نے یہ حکم کس کے کہنے پر یا کس کے دباؤ پر دیا تھا۔ بڑی مشکل سے راز حاصل کیے.....

"یہ تو بتا چکا ہوں کہ ہماری لڑکی روزینہ کو سلطان برکیارق نے اپنے ہاتھوں قتل کیا تھا۔ طبیب نے سلطان کے محل کے دو ملازم اپنے ہاتھ میں لے لئے اور انہیں مخبر بنا لیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ روزینہ کو ہماری ہی ایک مفرور لڑکی شمونہ نے قتل کروایا ہے۔ شمونہ روزینہ کی کنیز بن کر محل میں داخل ہوئی تھی۔ ان ملازموں کو یہ پتہ نہیں چل سکا کہ شمونہ نے کس طرح سلطان برکیارق کو اپنے اثر میں لے لیا اور روزینہ کو قتل کروا دیا تھا۔ البتہ یہ خبر ملی ہے کہ اس کارروائی میں سلطان کا وزیراعظم عبدالرحمان سمیری بھی شامل تھا"۔

"یہ لڑکی شمونہ اب کہاں ہے؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"وہ مَرو میں ہی ہے" — قاصد نے جواب دیا — "اس کی ماں جس کا نام میمونہ ہے' وہ بھی اس کے ساتھ ہے"۔

"شمونہ ابھی تک وہاں سے اٹھائی کیوں نہیں گئی؟" — حسن بن صباح نے غصیلی آواز میں کہا — "میں کبھی کا حکم دے چکا ہوں کہ اس لڑکی کو زندہ میرے سامنے لایا

جائے۔ کیا میرے فدائی میرا یہ حکم بھول گئے ہیں یا ان میں اتنی ہمت ہی نہیں رہی!؟"

"صرف شمونہ ہی نہیں یا شیخ الجبل!؟" — قاصد نے کہا — "ہماری ایک اور عورت جس کا نام رابعہ ہے' وہ بھی سلطان کے محل میں چلی گئی تھی۔ اس نے ایسے لوگوں کے نام اور پتے بتائے جو ہمارے خاص آدمی تھے۔ ان سب کو سلطان نے قتل کروا دیا ہے..... مجھے معلوم ہُوا ہے کہ ہمارے کچھ اور آدمیوں کو سلطان کی فوج نے پکڑ لیا تھا اور ان پر اتنا زیادہ تشدد کیا گیا کہ انہوں نے اپنے ساتھیوں کی نشاندہی کر دی۔ اس طرح ہمارے آدمی مارے گئے.....

"اور یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ ہمارے فرقے کے قتلِ عام کا حکم ابو مُسلم رازی نے دلوایا ہے اور وزیراعظم عبدالرحمان سمیری بھی اس کے ساتھ ہے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ سلطان برکیارق ان دونوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہُوا ہے..... پھر ایک خبر یہ بھی ہے کہ عبدالرحمان سمیری' ابو مسلم رازی اور سلطان برکیارق کی ماں نے سلطنتِ سلجوقیہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک حصے کا سلطان برکیارق ہو گا اور دوسرا حصہ برکیارق کے چھوٹے بھائیوں' محمد اور سنجر' کو دے دیا گیا ہے لیکن برتری اور مرکزیت سلطان برکیارق کو حاصل ہو گی تاکہ دونوں حصوں کا اور ان کی فوجوں کا اتحاد قائم رہے"۔

"ابو مسلم رازی اور عبدالرحمان سمیری کو اب تک زندہ نہیں رہنا چاہئے تھا" — حسن بن صباح نے کہا — "رے میں ایک مشہور عالم ابو المظفر مجید فاضل اصفہانی ہے۔ مجھے پہلے اطلاعیں مل چکی ہیں کہ یہ عالم ابو مُسلم رازی کا پیر و مرشد بنا ہُوا ہے اور رازی اس کے مشوروں اور تجویزوں پر عمل کرتا ہے۔ اس عالم کو بھی ان دونوں کے ساتھ ختم کرنا ہے..... میں کیسے بھول سکتا ہوں کہ میں رے میں گیا تو ابو مسلم رازی نے میری گرفتاری کا حکم دے دیا تھا۔ یہ تو مجھے بروقت پتہ چل گیا اور میں وہاں سے بھاگ کر مصر چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو بھی رازی نے میری گرفتاری کا حکم دے دیا۔ اس کا بھی مجھے پہلے ہی پتہ چل گیا اور میں وہاں سے ایک بہروپ دھار کر بھاگ نکلا..... یہ شخص اسلام کا شیدائی اور سلجوقیوں کی سلطنت کا خیر خواہ بنا ہُوا ہے۔ اب اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ سب سے پہلے میں اس کا پتا کاٹوں گا۔ اس کے پیر و مرشد ابوالمظفر مجید فاضل اصفہانی کو بھی صاف کرا دوں گا"۔

سورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا۔ حسن بن صباح وہیں بیٹھنا چاہتا تھا اس لئے فانوس وہیں لائے گئے اور رات کو دن بنا دیا گیا۔ حسن بن صباح کے حکم سے شراب کی صراحی اور پیالے وہیں آ گئے۔ شراب پلانے کے لئے تین چار انتہائی خوبصورت اور نوجوان لڑکیاں آ گئیں۔ ان کے نیم برہنہ جسموں کی خوبصورتی کو صرف جنّت کی حُوروں سے ہی تشبیہ دی جا سکتی تھی۔

حسن بن صباح نے چار پانچ آدمیوں کے نام لے کر کہا کہ انہیں فوراً بلایا جائے.....

زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ یہ سب آدمی دوڑے آئے۔ حسن بن صباح نے انہیں بتایا کہ مَرو میں کیا ہُوا ہے اور اس کے جواب میں انہیں کیا کرنا ہے۔ یہ آدمی تمام علاقوں میں پھیلے ہوئے باطنی تخریب کاروں، فدائیوں اور جاسوسوں کو سرگرم رکھتے اور ان سے اطلاعیں وصول کیا کرتے تھے۔

"ایک ایک باطنی کے بدلے دس دس مسلمانوں کو قتل کرنا ہے" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "لیکن سب سے پہلے ان کے سربراہوں اور قائدین کو ختم کرو..... تین نام یاد کر لو..... رے کا حاکم ابو مسلم رازی، سلطان برکیارق کا وزیرِ اعظم عبدالرحمان سمیری رے کا ایک عالم ابوالمظفر مجید فاضل اصفہانی..... سب سے پہلے ان تینوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دو۔ اس کے بعد بتاؤں گا کہ کس کی باری ہے"۔

مشہور تاریخ نویسوں ابن جوزی اور ابن اثیر نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح صرف مَرو یا رے کے مسلمانوں سے باطنیوں کے قتلِ عام کا انتقام نہیں لینا چاہتا تھا بلکہ اس کی نظریں اصفہان پر لگی ہوئی تھیں۔ دوسرے مؤرخوں نے بھی لکھا ہے کہ وہ اصفہان کو اپنا مرکز بنانا چاہتا تھا۔ اس نے اصفہان میں بھی اپنا جال بچھا رکھا تھا۔ مؤرخوں کے مطابق اس نے اسی محفل میں ایک پلان بنا کر اپنے خاص کارندوں کو دے دیا تھا کہ اصفہان میں مسلمانوں کو ایسے خفیہ طریقوں سے قتل کیا جائے کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ انہیں کون قتل کر رہا ہے۔

تاریخوں سے ایک شہادت یہ بھی ملتی ہے کہ حسن بن صباح نے یہ حکم دیا تھا کہ اصفہان میں مسلمانوں کو قتل کر کے غائب کر دیا جائے۔ یہ پتہ ہی نہ چلے کہ جو آدمی غائب ہو گئے ہیں وہ زندہ ہیں یا مارے گئے ہیں۔

اس کی جنت دُور دُور تک مشہور ہو گئی تھی اور نوجوان اس جنّت کو دیکھنے کے

لئے بڑی دُور کا سفر کر کے قلعہ الموت جاتے تھے۔ وہاں حسن بن صباح کے تجربہ کار کارندے ان نوجوانوں پر نظر رکھتے اور ان میں سے اپنے مطلب کے لڑکے منتخب کر لیتے اور انہیں اس جنت میں داخل کر دیتے تھے۔

یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جو کوئی ایک بار اس جنّت میں چلا جاتا تھا وہ دنیا کو بھول جاتا بلکہ اپنی اصلیت اور اپنی ذات بھی اسے یاد نہیں رہتی تھی۔ پہلے کسی باب میں بیان ہو چکا ہے کہ اس جنّت میں حشیش تھی اور حوریں تھیں۔ قدرت نے اس خطّے کو ایسا حسن دیا تھا کہ حشیش اور حسین لڑکیوں کے بغیر بھی وہ خطّہ جنّت نظیر تھا۔ اب تو اس جنّت میں چشمے بھی پھوٹ پڑے تھے جن میں رنگین مچھلیاں چھوڑ دی گئی تھیں۔ اس جنّت میں سے وہ فدائی تیار ہو کر نکل رہے تھے جو حسن بن صباح کے حکم سے دوسروں کو تو قتل کر ہی دیتے تھے، اپنے آپ کو بھی قتل کر دینے میں وہ فخر محسوس کرتے تھے۔ ان فدائیوں کو مسلمانوں کے علاقوں میں پھیلایا جا رہا تھا۔

حسن بن صباح کے ہاں تبلیغ بہت کم اور زیادہ تر قتل و غارت گری تھی۔ اس کا اصول اور طریقۂ کار یہ تھا کہ علماء اور دیگر قائدین کو قتل کر دیا جائے اور عوام کو بھیڑ بکریوں کا ریوڑ بنا کر انہیں ہانک کر اپنے زیرِ اثر لے لیا جائے۔

○

مَرو میں امن قائم ہو چکا تھا۔ امن کا مطلب یہ ہے کہ اب وہاں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں تھا لیکن جن گھروں کے جوان بیٹے اس لڑائی میں مارے گئے تھے، ان گھروں میں ابھی تک ماتم ہو رہا تھا۔ اگر انہوں نے کفار کی کسی فوج سے لڑائی لڑی ہوتی تو وہ لوگ فخر سے بتاتے کہ ان کا بیٹا حق و باطل کے اس معرکے میں شہید ہُوا ہے لیکن وہاں تو بھائیوں نے بھائیوں کا خون بہا دیا تھا البتہ حسن بن صباح اور اس کے باطنی فرقے کے خلاف نفرت کا ایک طوفان اٹھ آیا تھا۔ ہر کسی کو معلوم تھا اور ہر کسی کو بتایا گیا تھا کہ یہ سارا فتنہ باطنیوں نے زمین دوز طریقوں سے شروع کیا تھا۔

ابو مسلم رازی ابھی مَرو میں ہی تھا۔ اس نے اپنا لشکر اپنے شہر رے کو بھیج دیا تھا۔ وہ خود اس لئے رک گیا تھا کہ مَرو میں تینوں بھائیوں، سلطان برکیارق، محمد اور سنجر ـــــ میں سلطنت کی تقسیم کے متعلق امور طے کرنے تھے۔ اس نے دو چار دنوں بعد وہاں سے رے کو روانہ ہونا تھا۔

مزمّل آفندی اور اس کا ساتھی بن یونس موت کے شکنجے سے نکل آئے تھے۔ انہیں دودھ اور شہد پلایا جا رہا تھا اور ایسی غذا دی جا رہی تھی کہ ان کا جو خون ضائع ہو گیا تھا وہ پورا ہونا شروع ہو گیا۔ زخم بھی ٹھیک ہو رہے تھے اور اب وہ دونوں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے تھے اور بڑی آسانی سے باتیں بھی کر لیتے تھے۔

سلطان برکیارق اور ابو مسلم رازی کو جب پتہ چلا تھا کہ مزمّل آفندی زخمی ہو کر آیا ہے تو دونوں بڑی تیزی سے محل میں آئے اور اسے دیکھا تھا۔ انہوں نے طبیب اور جراح سے کہا تھا کہ یہ بہت ہی قیمتی آدمی ہے اسے ہر قیمت پر زندہ رکھنا ہے اور پھر اس میں وہی روحانی اور جسمانی توانائی پیدا کرنی ہے جو زخمی ہونے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔

"امیر محترم!" — مزمّل نے ابو مسلم رازی سے کہا — "میں آج ہی آپ کو بتا دیتا ہوں کہ پوری طرح صحت یاب ہو کر میں اپنے اس ساتھی بن یونس کے ساتھ قلعہ الموت جاؤں گا اور حسن بن صباح کو قتل کر کے ہی واپس آؤں گا ورنہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی واپس نہیں آئے گا"۔

"پہلے صحت یاب ہو لو" — ابو مسلم رازی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا — "یہ تو ہم سب نے دیکھ لیا ہے کہ حسن بن صباح اور اس کے باطل فرقے کو ختم کرنے کے لئے ہمیں اپنی جانوں کی قربانیاں دینی پڑیں گی..... ابھی اپنے خون کو اتنا جوش نہ دو، پہلے تندرست ہو جاؤ"۔

دو تین دنوں بعد ابو مسلم رازی مرو سے رے کو روانہ ہونے لگا۔ سلطان برکیارق، اس کے بھائیوں اور اس کی ماں نے ابو مسلم رازی کو شاہانہ طریقے سے بڑے تپاک سے رخصت کیا۔ اس کی مزید تعظیم اس طرح کی گئی کہ وزیر اعظم عبدالرحمان سمیری اسے الوداع کہنے کے لئے شہر سے باہر تک اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ وہ دونوں پہلو بہ پہلو گھوڑوں پر سوار چل پڑے۔ ان کے پیچھے آٹھ دس محافظوں کا دستہ تھا۔ اس کے پیچھے اونٹوں اور ایک خچر گاڑی پر سامان وغیرہ جا رہا تھا۔

"سمیری بھائی!" — چلتے چلتے ابو مسلم رازی نے سلطان کے وزیر اعظم سے کہا — "ان لڑکوں پر نظر رکھنا اور انہیں قابو میں رکھنا آپ کا کام ہے۔ بیشک برکیارق راستے پر آگیا ہے لیکن جوان آدمی ہے، کہیں بھٹک نہ جائے اور دوسرے بھائی اس سے چھوٹے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ عقل کی بجائے ذاتی جذبات سے سوچنا اور عمل کرنا شروع

کر دیں۔ حسن بن صباح کا قلع قمع اتنا آسان نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ انہیں کھلی جنگ اور حیلے سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ میں الموت کی بات کر رہا ہوں۔ ہمیں کچھ اور طریقے سوچنے پڑیں گے، بہرحال میں آپ سے آخری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ فرض آپ کا ہے "ان لڑکوں پر بھروسہ نہ کرنا"۔

"آپ نے دیکھ لیا ہے کہ میں نے زمین کے نیچے نیچے کیسی کیسی کارروائیاں کی ہیں" — عبدالرحمان سمیری نے کہا — "میں آپ کا ہم خیال ہوں۔ آپ کے ساتھ رابطہ رکھوں گا۔ آپ نے بجا فرمایا ہے کہ یہ کام ہم جیسے تجربہ کار اور گہری سوچ و فکر والے آدمیوں کے کرنے کا ہے..... اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے....."

عبدالرحمان سمیری کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ ایک غریب سا ادھیڑ عمر آدمی ان کے راستے میں سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی خشخشی داڑھی تھی اور وہ بوسیدہ سا چغہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پر اداسیوں کی گہری پرچھائیاں تھیں اور تاثر ایسا جیسے وہ مظلوم ہو اور التجا کرنا چاہتا ہو۔ ابو مسلم رازی بڑا ہی رحم دل آدمی تھا۔ عبدالرحمان سمیری بھی رحمدلی میں کم نہ تھا۔ دونوں نے گھوڑے روک لئے۔

"یا امیر!" — اس آدمی نے ہاتھ جوڑ کر ذرا آگے آتے ہوئے کہا — "ذرا رک جا اور ایک مظلوم باپ کی فریاد سنتا جا"۔

"کہو میرے بھائی!" — ابو مسلم رازی نے کہا — "کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں تمہاری پوری مدد کروں گا پھر یہاں سے آگے قدم اٹھاؤں گا"۔

"یا امیر!" — اس مفلوک الحال آدمی نے زمین پر گھٹنے ٹیک دیئے اور ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے کہا — "لڑائی تو امیروں اور بادشاہوں کی تھی لیکن میرا ایک ہی جوان بیٹا اس لڑائی میں مارا گیا ہے..... اگر میرا بیٹا کفار کے مقابلے میں لڑتا ہوا جان دے دیتا تو آج میری یہ حالت نہ ہوتی بلکہ میں فخر سے اپنا سر اونچا کر کے کہتا کہ میں نے اپنا اکلوتا بیٹا اللہ کی راہ میں قربان کر دیا ہے لیکن یہ کیسی لڑائی تھی!..... جس میں بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا اور....."

"تم اپنی فریاد سناؤ میرے بھائی!" — ابو مسلم رازی نے کہا — "وہ تو میں جانتا ہوں کہ یہ کیا ہوا تھا۔ تم جو چاہتے ہو وہ بتاؤ تاکہ میں تمہاری مدد کروں"۔

"اے رحمدل امیر!" — اس آدمی نے کہا — "تیرے متعلق جو سنا تھا تو ویسا ہی

نکلا۔ اللہ نے تیرے دل میں رحم ڈالا ہے۔ کچھ رحم مجھ پر بھی کر دے" ــــ یہ آدمی جس نے گھٹنے پہلے ہی زمین پر ٹیکے ہوئے تھے سجدے میں چلا گیا اور سجدے میں بولا ــــ "میں جانتا ہوں کہ سجدہ صرف خدا کے آگے کیا جاتا ہے لیکن میں تیرے آگے سجدہ کرتا ہوں"۔

"کھڑے ہو کر بات کرو بھائی!" ــــ ابو مسلم رازی نے کہا ــــ "مجھے گناہگار نہ کرو ..... کہو کیا بات ہے!"

اس آدمی نے سجدے سے سر اٹھایا اور پھر ہاتھ جوڑ کر بولا ــــ "مجھے بتا اے امیر! میں کہاں جاؤں ..... میری فریاد کون سُنے گا ..... تو گھوڑے پر سوار ہے اور میں خاک نشین ہوں ..... میری آواز تیرے کانوں تک نہیں پہنچ پائے گی"۔

ابو مسلم رازی کی رحمدلی اور انسان دوستی کا یہ عالم تھا کہ وہ گھوڑے سے اتر آیا۔ وہ پہلے ہی یہ صدمہ دل پر لئے ہوئے تھا کہ اس آدمی کے بیٹے جیسے نہ جانے کتنے بیٹے خانہ جنگی میں مارے گئے ہیں۔ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ ایک غریب آدمی جس کا اکلوتا بیٹا مارا گیا ہے' اس کے آگے سجدہ کر رہا ہے۔

ابو مسلم رازی اس کے قریب پہنچا تو وہ آدمی ایک بار پھر سجدے میں چلا گیا۔ رازی نے دیکھ لیا تھا کہ اس آدمی کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔ اس نے اس مظلوم آدمی کے اوپر جھک کر اس کی دونوں بغلوں میں ہاتھ رکھے اور اسے اٹھنے کو کہا اور اسے اٹھانے بھی لگا۔ اُس وقت ابو مسلم رازی رکوع کی حالت میں اس آدمی کے اوپر جھکا ہوا تھا اور وہ آدمی اس کے نیچے تھا۔

اس آدمی نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھتے اٹھتے اپنے بوسیدہ چغے کے اندر کیا اور پھر بڑی تیزی سے ہاتھ باہر نکالا۔ پیشتر اس کے کہ ابو مسلم رازی یا کوئی اور دیکھ سکتا کہ اس آدمی کے ہاتھ میں خنجر ہے' خنجر ابو مسلم رازی کے سینے میں اتر چکا تھا۔ اس آدمی نے نیچے سے خنجر کا وار کیا تھا۔ ابو مسلم رازی تیزی سے سیدھا ہوا تو اس آدمی نے اٹھ کر دو بار پھر اس کے سینے میں خنجر مارے۔ ابو مسلم رازی تیورا کر گرا اور اس کے جسم سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے۔

محافظ گھوڑوں سے کود کر اترے اور ابو مسلم رازی کی طرف دوڑے۔ عبدالرحمان سمیری بھی گھوڑے سے اتر آیا اور اس نے ابو مسلم رازی کو سہارا دیا لیکن ابو مسلم رازی

کے گھٹنے زمین سے لگ چکے تھے۔

قاتل کو وہیں پکڑنا تھا لیکن قاتل نے چند قدم پیچھے ہٹ کر اپنے خنجر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور اپنے سر کے اوپر کر کے نعرہ لگایا ــــ "یا شیخ الجبل' تیرے نام پر اپنی جان قربان کر رہا ہوں..... تیرے حکم کی تعمیل کر دی ہے" ــــ اس نے خنجر زور سے نیچے کو کھینچا اور اپنے دل میں اتار لیا۔ ذرا سی دیر وہ پاؤں پر کھڑا رہا پھر گر کر ایک طرف کو لڑھک گیا۔ محافظوں نے اسے اٹھانا چاہا لیکن وہ مر چکا تھا۔

چونکہ وزیراعظم اور رے کا امیر جا رہے تھے اس لئے لوگ راستے کے دونوں طرف اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ایک آدمی نے امیرِ رے کو قتل کر دیا ہے تو وہ قاتل پر ٹوٹ پڑے۔ اسے تلواروں اور خنجروں سے قیمہ کر دیا اور جس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا اس نے پتھر اٹھا اٹھا کر اسے مارے اور ذرا سی دیر میں قاتل کے جسم کے چیتھڑے کر دیئے۔

ابو مسلم رازی کی لاش گھوڑے پر ڈال کر واپس سلطان برکیارق کے محل میں لے جائی گئی۔ وہاں تو کہرام بپا ہو گیا۔

○

ابو مسلم رازی کی میّت کو مَرو میں ہی آخری غسل دے کر کفن پہنا دیا گیا تھا۔ ایک قاصد کو رے کی طرف دوڑا دیا گیا تھا کہ وہ ابو مسلم رازی کے خاندان کو اس حادثے کی اطلاع دے دے اور یہ بھی بتائے کہ اس کی میّت لائی جا رہی ہے۔

ابو مسلم رازی ایک تاریخ ساز شخصیت تھی۔ حسن بن صباح نے اسے قتل کروا کر ایسا خلا پیدا کر دیا تھا جسے اب کوئی اور پورا نہیں کر سکتا تھا۔

جب ابو مسلم رازی کی میّت رے پہنچی تو سارا شہر ہی ٹوٹ پڑا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی اور ہر کوئی جانتا تھا کہ اسے باطنیوں نے قتل کیا ہے۔ لوگ بلند آواز سے حلف اٹھا رہے تھے اور یہ عہد کر رہے تھے کہ وہ اپنے امیر کے خون کا انتقام لیں گے۔

اس قتل کی اطلاع شہر سے باہر دُور دُور تک پہنچ گئی تھی اور لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ جب جنازہ اٹھا تو رے کی فضا میں صرف آہ و بکا اور عورتوں کے بَین سنائی دے رہے تھے۔ جنازہ گھڑ دوڑ کے میدان میں پڑھا گیا۔ عورتیں چھتوں پر کھڑی رو رہی تھیں اور بچے بھی جنازے میں شامل ہو گئے تھے۔ لوگوں کا اتنا بڑا ہجوم کبھی کم ہی دیکھنے

میں آیا تھا۔

جنازہ ابو المظفر مجید فاضل اصفہانی نے پڑھایا۔ جنازے کے بعد اس نے لوگوں کو بیٹھ جانے کو کہا۔ پھر اس نے بڑی بلند آواز میں لوگوں کو مختصر سا خطاب کیا۔

"اے لوگو!" ۔۔۔ ابو المظفر مجید فاضل اصفہانی نے کہا ۔۔۔ "ہوش میں آؤ اور اپنے دین و ایمان کو اور زیادہ مضبوط کرو..... ابو مسلم رازی کو اس ابلیس حسن بن صباح نے قتل کرایا ہے۔ اس سے ہماری قوم کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی صرف ابو مسلم رازی ہی کر سکتا ہے لیکن عہد کر لو کہ ہمیں ایک اور ابو مسلم رازی پیدا کرنا ہے۔ پروانے جل جل کر مرتے رہتے ہیں اور شمع جلتی رہتی ہے۔ ہمیں اسلام کی شمع کو جلتا رکھنا ہے اور اس پر اسی طرح جل جل کر مرنا ہے۔ انسان مرتے جاتے ہیں لیکن دین اور ایمان زندہ رہتے ہیں۔ کچھ اور انسان آتے ہیں جو پہلے انسانوں کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اب ہر آدمی اس عزم کو اپنے ایمان میں شامل کر لے کہ حسن بن صباح کو قتل کرنا ہے اور اس کے فرقے کا نام و نشان مٹا دینا ہے..... لیکن سوچنا عقل سے، جذبات کی شدت اور جوش سے نہیں"۔

لوگوں میں اس قدر جوش و خروش اور ایسا غم و غصہ تھا کہ انہوں نے اس عالم کی آگے کوئی بات نہ سنی اور نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ اگر انہیں اشارہ بھی دے دیا جاتا کہ ابھی قلعہ الموت پر حملہ کرنا ہے تو سب اسی حالت میں چل پڑتے اور کچھ بھی نہ سوچتے..... فاضل اصفہانی نے ہاتھ کھڑے کر کے لوگوں کو خاموش کیا اور دعا پڑھنے لگا۔

لوگوں میں سے ایک آدمی اٹھا اور ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا مجید فاضل اصفہانی کے پاس جا کھڑا ہوا اور اس نے لوگوں کی طرف منہ کر لیا۔ وہ اس عالم کے پہلو کے ساتھ کھڑا تھا۔

"اے لوگو!" ۔۔۔ اس آدمی نے کہا ۔۔۔ "تم جوش میں آکر نعرے لگا رہے ہو۔ تم نہیں جانتے کہ حسن بن صباح کو قتل کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ اس کے لئے صرف دو تین آدمیوں کی ضرورت ہے۔ میں اس کے لئے اپنے آپ کو اور اپنی جان کو پیش کرتا ہوں..... مجھے دو آدمیوں کی ضرورت ہے"۔

"تم ابھی بیٹھ جاؤ میرے عزیز!" ۔۔۔ ابو المظفر مجید فاضل اصفہانی نے اس آدمی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔۔۔ "یہ معاملہ ایسا نہیں جو یہاں جذبات کے جوش میں طے کر

لیا جائے، اس پر بعد میں غور کیا جائے گا"۔

"میں نے غور کر لیا ہے" ۔۔۔ اس آدمی نے کہا اور بڑی تیزی سے اپنے کپڑوں کے اندر سے خنجر نکالا، ہوا میں لہرایا اور اس کا یہ خنجر ابو المظفر مجید فاضل اصفہانی کے سینے پر اس جگہ اُتر گیا جہاں دل ہوتا ہے۔ اس شخص نے دو وار اور کئے اور پیشتر اس کے کہ لوگ اٹھ کر اسے پکڑ لیتے اس نے اپنا خنجر ہوا میں بلند کر کے نعرہ لگایا ۔۔۔ "شیخ الجبل کے نام پر!" ۔۔۔ اور خنجر اپنے دل میں اتار لیا۔ وہ گرا اور مر گیا۔ یہ ایک اور تاریخی شخصیت تھی جسے حسن بن صباح نے قتل کرایا تھا۔ مجید فاضل اصفہانی صرف عالم ہی نہیں تھا بلکہ وہ عمل کے میدان کا سپاہی تھا، حقیقت پسند اور کچھ کر کے دکھا دینے والا..... ابو مسلم رازی اور مجید فاضل اصفہانی کے قاتل دو تین دن پہلے قلعہ الموت سے آئے تھے۔

ابو مسلم رازی کو دفن کر دیا گیا اور اس کے پیرو استاد مجید فاضل اصفہانی کی میت کو اٹھا کر اس کے گھر لے گئے۔ اگلے روز اسی بے پناہ اور بے قابو ہجوم نے اپنے اس عالم ابو المظفر مجید فاضل اصفہانی کا جنازہ پڑھا۔ بے قابو اس لئے کہ ہر کوئی غم و غصے سے پھٹا جا رہا تھا لیکن یہ لوگ اب قیادت سے محروم ہو گئے تھے۔ سلطان برکیارق اور اس کا وزیر اعظم عبدالرحمان سمیری وہیں رکے رہے تھے۔ جنازے کے بعد عبدالرحمان سمیری نے لوگوں سے خطاب کیا اور کہا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو رکھیں اور اپنی عقل پر پردہ نہ پڑنے دیں، انشاء اللہ ان عظیم شخصیتوں کے خون کا بدلہ لیا جائے گا۔

○

سلطان برکیارق، محمد، سنجر، ان کی ماں اور ان کا وزیر اعظم عبدالرحمان سمیری مرو چلے گئے۔ تاریخ میں ایسا کوئی حوالہ نہیں ملتا کہ رے کا شہر اور علاقہ ابو مسلم رازی کے بعد کس امیر کو دیا گیا تھا۔ ایک اشارہ ملتا ہے کہ سلطان برکیارق نے اس علاقے کو اپنی عملداری اور نگرانی میں رکھ لیا تھا۔

ان لوگوں کے دلوں پر بہت ہی بوجھ تھا۔ ایک تو صدمہ تھا اور دوسرے یہ سوچ اور فکر کہ حسن بن صباح کا ہاتھ کس طرح روکا جائے..... مرو پہنچتے ہی ان لوگوں نے اپنے سالاروں کو بلایا اور باقاعدہ اجلاس میں غور کیا گیا کہ باطنیوں کا قلع قمع کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

اس اجلاس میں کئی ایک طریقے سوچے گئے اور منصوبے بھی بنائے گئے اور اجلاس

برخواست ہو گیا۔ ایک فیصلہ یہ ہُوا کہ سلطنت کو تو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے لیکن فوج کو ابھی تقسیم نہ کیا جائے ورنہ ہمارا دشمن اتنا شعبدہ باز اور چالاک ہے کہ وہ ان دونوں حصّوں کو الگ الگ الجھا کر نقصان پہنچائے گا۔

جب اجلاس برخواست ہُوا تو سلطان برکیارق اور عبدالرحمان سمیری کو دربان نے اطلاع دی کہ تین آدمی بڑی دور سے آئے ہیں اور وہ انہیں ملنا چاہتے ہیں۔

"پہلے ان کی تلاشی لو" ——— سلطان برکیارق نے کہا ——— "تلاشی بڑی سختی سے لی جائے۔ ان کے پاس چھوٹا سا چاقو بھی نہیں ہونا چاہئے"۔

کچھ دیر بعد یہ تین آدمی کمرے میں لائے گئے اور بتایا گیا کہ یہ بالکل نہتے ہیں اور بہت دور سے آئے ہیں..... انہوں نے کہا کہ وہ ایک شہر ابہر کے رہنے والے ہیں اور تجارت پیشہ ہیں۔ وہ جو مسئلہ لے کر آئے تھے' وہ یوں تھا کہ اس شہر کے قریب ایک قلعہ وسم کوہ پر تھا۔ وسم کوہ ایک پہاڑی تھی جس پر یہ قلعہ بنا ہُوا تھا۔ ان آدمیوں نے بتایا کہ اس قلعے پر باطنی فدائی قابض ہو گئے ہیں اور وہاں انہوں نے کسی مسلمان کو زندہ نہیں رہنے دیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس قلعے کے قریب سے چھوٹے بڑے قافلے اور اکے دُکے آدمی یا پورے پورے خاندان گزرتے رہتے ہیں۔ یہ باطنی فدائی انہیں لُوٹ لیتے ہیں اور سارا مال قلعے میں لے آتے ہیں اور یہاں سے یہ مال قلعہ الموُت جاتا ہے۔

یہ آدمی عقلمند معلوم ہوتے تھے اور جنگی امور سے بھی کچھ واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان فدائیوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں اور وہ باقاعدہ فوجی بھی نہیں۔ ان میں صرف یہ طاقت تھی کہ اپنی جان پر کھیل جاتے تھے لیکن عسکری طریقوں سے بالکل ناواقف تھے۔

"اگر آپ فوج لے کر آئیں تو آپ کو وہاں کے لوگوں کی مدد بھی مل سکتی ہے" ——— اس وفد کے ایک آدمی نے کہا ——— "وہاں سے قلعہ الموُت بہت دُور ہے۔ ان قلعہ بند باطنیوں کو کہیں سے مدد یا کمک نہیں مل سکتی..... اگر اس قلعے پر قبضہ کر لیا جائے تو اتنے زیادہ باطنی ہاتھ آئیں گے جنہیں قتل کیا جائے اور مال و متاع اور زر و جواہرات کا تو کوئی حساب ہی نہیں"۔

کچھ بحث و تمحیص کے بعد سالار اوریزی نے کہا کہ وہ اس قلعے کا محاصرہ کرے گا اور انشاء اللہ کامیاب بھی ہو گا..... قلعہ کچھ دور تھا۔ سلطان برکیارق اور عبدالرحمان سمیری

نے اسے اجازت دے دی اور محاصرے کا منصوبہ تیار ہونے لگا۔

دو ہی دنوں بعد سالار اوریزی نے مطلوبہ فوج تیار کر لی اور رخصت ہونے لگا۔ وزیرِاعظم عبدالرحمان سمیری نے اس فوج کو رخصت کرنا تھا جیسا کہ اُس زمانے میں رواج تھا۔ سمیری گھر سے نکلا اور اُس جگہ کی طرف چل پڑا جہاں فوج تیار کھڑی تھی۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس عورت زمین پر بیٹھی تڑپ رہی ہے اور زمین پر ماتھا مار رہی ہے۔ وہ روتی اور بَین کرتی تھی۔

ایک آدمی اس کے پاس بیٹھ کر اسے بہلانے لگا لیکن عورت ایک ہی رٹ لگائے جا رہی تھی ——— "میرا بچّہ..... میرا بچّہ مجھے واپس لا دو..... سلطان مر گیا ہے جو میرے بچے کو واپس نہیں لاتا"۔

عبدالرحمان سمیری نے گھوڑا روک لیا اور اس آدمی سے پوچھا کہ عورت کی یہ حالت کیوں ہو رہی ہے۔

"اس بیچاری کا ایک کم سن بچہ باطنی اُٹھا کر لے گئے ہیں" ——— اس آدمی نے بتایا ——— "یہ کہتی ہے کہ اُن لوگوں کو جانتی ہے اور وہ ابھی شہر میں ہی ہیں لیکن اس کی فریاد کوئی نہیں سنتا"۔

عبدالرحمان سمیری سے اس عورت کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ وہ گھوڑے سے اترا' وہ اس عورت کو تسلّی دلاسہ دینا چاہتا تھا کہ اس کے بچے کو برآمد کرا لیا جائے گا۔ سمیری اس عورت کے قریب گیا اور اس پر جھکا۔ اس عورت کے پاس جو آدمی بیٹھا ہُوا تھا اس نے بڑی تیزی سے خنجر نکالا اور عبدالرحمان سمیری کی پیٹھ میں اتار دیا' پھر اسے سیدھا نہ ہونے دیا اور دو تین وار اور کئے۔ وزیرِاعظم سمیری وہیں گر پڑا۔

لوگ قاتل کو پکڑنے کے لئے دوڑے لیکن قاتل نے بھاگنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کی۔ اس نے دو بار خنجر پوری طاقت سے اس عورت کی پیٹھ میں مارا اور پھر خنجر اپنے دل کے مقام پر اتنی زور سے مارا کہ آدھے سے زیادہ خنجر اس کے سینے میں چلا گیا۔ ظاہر ہے کہ عورت اس قاتل کی ساتھی تھی اور اسے عبدالرحمان سمیری کو جال میں لانے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ اگر یہ باطنی اس عورت کو قتل نہ کرتا تو اس سے کچھ راز مل سکتے تھے۔

یہ ایک اور تاریخی شخصیت تھی جسے حسن بن صباح کے حکم سے ایک فدائی نے

قتل کر دیا..... پانچویں ہجری ختم ہونے میں پانچ سال باقی تھے۔

سالار اوریزی نے اپنی پیش قدمی ملتوی نہ کی۔ وہ قلعہ وسم کوہ کی طرف کوچ کر گیا۔ یہاں سے قتل و غارت کا ایک اور دَور شروع ہو گیا جس نے تاریخ پر لرزہ طاری کر رکھا تھا۔

سالار اوریزی نے یہ فوج اندھا دھند تیار نہیں کی تھی اور اُس نے کوچ کا جو حکم دیا تھا' وہ بھی کوئی رسمی سا حکم نہیں تھا۔ اس نے اس فوج کی تیاری کے دوران دانشمندانہ کارروائیاں کی تھیں۔

پہلی کارروائی یہ تھی کہ اس نے اس فوج میں منتخب لڑاکے اور جانباز شامل کئے تھے۔ اُس نے اپنے جو نائب کمانڈار ساتھ لئے تھے' وہ بھی چُنے ہوئے تھے اور لڑائیوں کا تجربہ بھی رکھتے تھے اور ان میں حسن بن صباح اور اُس کے فرقے کی نفرت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ سالار اوریزی نے ایک احتیاطی تدبیر اختیار کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ حسن بن صباح تک یہ خبر نہ پہنچ جائے کہ وہ قلعہ وسم کوہ پر فوج کشی کے لئے جا رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ گلی گلی' کوچہ کوچہ حسن بن صباح کے جاسوس موجود ہیں اور وہ روز بروز قلعہ اَلمُوت تک خبریں پہنچا رہے ہیں۔

سالار اوریزی نے اپنی اصل مہم پر پردہ ڈالے رکھنے کا یہ انتظام کیا تھا کہ وہ جب اپنی فوج تیار کر رہا تھا' اُس نے چند آدمی شہر پھیلا دیئے تھے جو یہ خبر مشہور کر رہے تھے کہ سالار اوریزی قلعہ ملاذخان پر حملہ کرنے جا رہا ہے.... قلعہ ملاذخان فارس اور خوزستان کے درمیان واقعہ تھا۔ چند سال پہلے باطنیوں نے یہ قلعہ دھوکے میں اپنے قبضے میں لے لیا تھا.... قلعہ وسم کوہ قلعہ ملاذخان سے کم و بیش ایک سو میل دور کسی اور ہی طرف تھا۔

حسن بن صباح کو یہ اطلاع دی گئی کہ سالار اوریزی اتنی نفری کی فوج سے قلعہ ملاذخان پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔ یہ سن کر حسن بن صباح نے قہقہہ لگایا۔

"پگلے سلجوقی" —— حسن بن صباح نے کہا —— "اگر وہ قلعہ ملاذخان لے بھی لیں

گے تو کیا کر لیں گے؟.... وہ ابھی تک نہیں سمجھے کہ ان کی قسمت اور ان کی جانیں میری مٹھی میں ہیں۔ میں یہاں تصوّر میں جس کا گلا دباؤں گا وہ مَرو میں یا رے میں یا وہ جہاں کہیں بھی ہُوا' مارا جائے گا.... جب اوریزی مَرو سے کوچ کرے اُسی وقت ایک آدمی وہاں سے میرے پاس پہنچ جائے اور بتائے کہ اس کے ساتھ کتنی پیدل اور کتنی سوار نفری ہے اور اُس نے کس وقت کُوچ کیا ہے"۔

حسن بن صباح نے دو تین آدمیوں کے نام لے کر کہا کہ انہیں فوراً" بلایا جائے۔ وہ آدمی فوراً" پہنچے۔ یہ اُس کے جنگی مشیر تھے۔ اُس نے انہیں قلعہ ملاذخان کے دفاع کے متعلق ہدایات دینی شروع کر دیں اور ساتھ یہ بھی کہا کہ مَرو سے ملاذخان تک جگہ جگہ اوریزی کے لشکر پر شب خون مارے جائیں اور گھات لگا کر بھی انہیں نقصان پہنچایا جائے۔ اس نے کہا کہ کہیں بھی جم کر نہیں لڑنا' ضرب لگا کر وہاں سے نکل آئیں۔

"وہ راستے سے ہی واپس چلے جائیں گے" —— حسن بن صباح نے کہا —— "اگر وہ واپس نہ گئے اور ملاذخان تک پہنچ بھی گئے تو ان کی نفری آدھی رہ چکی ہو گی اور وہ ایسی حالت میں ہوں گے کہ محاصرہ بھی مکمل نہیں کر سکیں گے۔ ملاذخان میں ہماری نفری تھوڑی ہے۔ وہاں آج ہی جاں بازوں کی خاصی نفری بھیج دو۔ انہیں یہ بتا دینا کہ جونہی وہ سلجوقیوں کے لشکر کو آتا دیکھیں تو قلعے سے نکل کر اور دور کا چکر کاٹ کر پہلوؤں سے اُس پر ٹوٹ پڑیں اور سپاہی سے لے کر سالار تک کوئی ایک بھی بندہ زندہ واپس نہ جائے"۔

سالار اوریزی رے میں ابو مسلم رازی اور ابوالمظفر مجید فاضل اصفہانی کے جنازے پڑھ کر آیا تھا۔ اب اُس کا لشکر کوچ کے لئے تیار تھا اور وہ عبدالرحمٰن سمیری کے انتظار میں تھا کہ اس نے آ کر انہیں الوداع کہنا تھا لیکن اسے اطلاع ملی کہ سمیری کو ایک باطنی نے قتل کر کے خودکُشی کر لی ہے۔ اس خبر سے سالار اوریزی کو بھڑک اٹھنا چاہئے تھا اور اس پر جذبات کا غلبہ ہونا ایک قدرتی بات تھی لیکن اس نے اپنے آپ کو ذہنی اور جذباتی لحاظ سے قابو میں رکھا اور ٹھنڈے دل سے سوچا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ اگر وہ دوڑا ہُوا وہاں جا پہنچتا جہاں عبدالرحمٰن سمیری کو قتل کیا گیا تھا تو وہ ماتم کرنے رک جاتا اور اُس کی فوج جو کوچ کے لئے تیار تھی' انتظار میں کھڑی رہتی یا اسے واپس بلا لیا جاتا۔

"سلطنتِ اسلامیہ کے پاسبانو!" —— سالار اوریزی نے اپنی فوج سے یوں خطاب کیا —— "باطنی ایک اور وار کر گئے ہیں۔ ابھی ابھی قاصد اطلاع دے گیا ہے کہ ہمارے

وزیرِاعظم عبدالرحمٰن حمیری کو ایک باطنی نے اسی طرح دھوکے سے قتل کر دیا ہے جس طرح امیر ابو مسلم رازی اور ہمارے پیرو مُرشد اور عالم ابوالمظفر مجید فاضل اصفہانی کو قتل کیا تھا۔ ہم اب کسی کے جنازے کے لئے نہیں رکیں گے۔ اب ہم ان مقتولوں کے خون کے ایک ایک قطرے کا انتقام لیں گے۔ اب ہمیں پیچھے نہیں دیکھنا بلکہ آگے بڑھنا ہے۔ اب دل میں عہد کر لو کہ حسن بن صباح اور اُس کے اس باطل فرقے کو ختم کرنا ہے یا خود ختم ہو جانا ہے۔ لعنت ہے اس زندگی پر جس میں ابلیس ہمارے عمائدین کا خون بہاتے پھریں۔ اللہ اکبر کا نعرہ لگاؤ اور آگے بڑھو اور اس جذبے سے آگے بڑھو کہ ہم نے اب واپس اپنے گھروں کو نہیں آنا"۔

لشکر نے جب اللہ اکبر کا نعرہ لگایا تو یوں لگا جیسے آسمان کا سینہ پھٹ گیا ہو اور زمین ہل گئی ہو۔ اس نعرے میں ایمان کی گرج تھی۔

سالار اوریزی گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ لشکر کے آگے آگے نہ چلا بلکہ وہیں کھڑا رہا۔ راستے سے ذرا ہٹ کر زمین کا تھوڑا سا اُبھار تھا۔ اوریزی اپنا گھوڑا اس اُبھار پر لے گیا اور اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے لشکر کو دیکھنے لگا۔ لشکر کلمہ طیّبہ کا بلند وِرد کرتا ہُوا جا رہا تھا.... تاریخ میں ایسے اعداد و شمار نہیں ملتے کہ اس لشکر کی نفری کتنی تھی اور اس میں پیادے کتنے اور سوار کتنے تھے۔ بہرحال یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ اس لشکر میں وہی جوش و خروش تھا جس کی اُس صورتِ حال میں ضرورت تھی۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سالار اوریزی نے چُن چُن کر جذبے والے مجاہد اس لشکر میں رکھے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں اسلام کے مجاہدین تھے۔ انہیں تنخواہوں کے ساتھ بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی اور مالِ غنیمت کا بھی ان کے ذہنوں میں کوئی خیال نہ تھا۔ ان میں انتقام کا جذبہ تھا۔ تھوڑے سے عرصے کی خانہ جنگی نے کئی گھر اجاڑ دیئے تھے اور بھائیوں نے بھائیوں کو قتل کر دیا تھا۔ ان نوجوانوں کو جب پتہ چلا تھا کہ اس خانہ جنگی کے پیچھے باطنیوں کا ہاتھ تھا تو وہ نفرت اور انتقام کے جذبے سے اتنے بھر گئے تھے کہ بارود کے چلتے پھرتے پتلے بن گئے تھے۔ وہ اُس سے کئی گنا زیادہ باطنیوں کو قتل کرنا چاہتے تھے جتنے خانہ جنگی میں اپنے آدمی مارے گئے تھے۔

سالار اوریزی کے پیچھے بارہ چودہ گھوڑ سوار محافظ کھڑے تھے۔ اب سالاروں اور دیگر سربراہوں کی حفاظت کے انتظام پہلے سے زیادہ سخت کر دیئے گئے تھے۔ لشکر گزر تا جا

رہا تھا۔ اور سالار اوریزی اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک محافظ نے دیکھا کہ ایک درویش سا آدمی ایک طرف سے چلا آ رہا ہے اور اُس کا رخ سالار اوریزی کی طرف ہے۔ اس محافظ نے اپنے گھوڑے کی باگ کو جھٹکا دیا اور ہلکی سی ایڑ لگائی۔ گھوڑا اس درویش کے سامنے جا رُکا۔

اس شخص کا صاف ستھرا لباس، پُراثر چہرہ اور انداز بتاتا تھا کہ یہ کوئی عالم ہے اور درویش بھی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں قرآن پاک تھا اور دوسرے ہاتھ میں عصا۔ اس کی داڑھی خاصی لمبی تھی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ نہیں بلکہ خوداعتمادی تھی۔

"میرے راستے میں مت آ اے سوار!" — درویش نے محافظ سے کہا — "میں اُس راستے پر جا رہا ہوں جو اللہ کی اس مقدس کتاب نے مجھے دکھایا ہے" — اُس نے قرآن پاک اوپر کرکے کہا — "یہ قرآن مجید ہے۔ گھوڑے سے اتر اور اس کی توہین نہ کر۔ مجھے سپہ سالار کے پاس جانے دے"۔

"آپ کا احترام دل و جان سے کروں گا اے عالم!" — محافظ نے گھوڑے سے اُتر کر کہا — "لیکن آپ کی جامہ تلاشی لئے بغیر آگے نہیں جانے دوں گا۔ کیا آپ نے سنا نہیں کہ یکے بعد دیگرے تین شخصیتوں کو باطنیوں نے ایسے ہی دھوکے سے قتل کر دیا ہے۔ عالم اور درویش کا بہروپ تو کوئی بھی دھار سکتا ہے"۔

"میں تجھے فرائض سے کوتاہی نہیں کرنے دوں گا" — درویش نے کہا — "میری جامہ تلاشی لے لے۔ پھر بھی تجھے شک ہے کہ میں سپہ سالار کو قتل کر دوں گا تو میرے ہاتھ زنجیروں میں میری پیٹھ کے پیچھے باندھ دے۔ میں نے سپہ سالار کو اللہ کا نور دکھانا ہے۔ وہ ابلیس کو تہس نہس کرنے جا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس سپہ سالار کے پاس جسم کی طاقت بھی ہے اور دماغ کی طاقت بھی لیکن میں اس کی روح کو تقویت دینا چاہتا ہوں.... جا، پہلے اس سے پوچھ کہ مجھے اپنے پاس آنے دے گا بھی یا نہیں!"

سالار اوریزی نے اس وقت تک اس درویش کو اور اپنے محافظ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ عالم ہے یا درویش، جو کوئی بھی ہے اُسے ملنا چاہتا ہے۔

"انہیں آنے دو" — سالار اوریزی نے اپنے محافظ سے کہا — "اپنا فرض پورا کر لو"۔

فرض سے مراد یہ تھی کہ اس کی جامہ تلاشی لے لو کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہ

محافظ نے درویش کے کپڑوں کے اندر اچھی طرح دیکھ لیا اور اسے سالار اوریزی کی طرف بھیج دیا لیکن خود اس کے ساتھ رہا۔ دو اور محافظ گھوڑوں سے اتر آئے اور سالار اوریزی کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ محافظ اس طرح کھڑے تھے کہ ایک درویش کے بالکل پیچھے، دوسرا اُس کے ایک پہلو کی طرف اور تیسرا دوسرے پہلو کی طرف تھا۔

"میرے ہاتھ میں قرآن مجید ہے" — درویش نے قرآن، سالار اوریزی کی طرف بلند کرکے کہا — "اگر سالار گھوڑے سے اُتر آئے تو میں بھی قرآن مجید کی بے ادبی کے گناہ سے بچ جاؤں گا۔ قرآن مجید صرف تمہارے لئے لایا ہوں"۔

سالار اوریزی گھوڑے سے اتر آیا۔ یقیناً اُسے اور اُس کے محافظوں کو یہی توقع ہو گی کہ یہ درویش یا عالم اچھی نیت سے نہیں آیا۔ باطنیوں نے پہلے تین عمائدین کو اسی طرح قتل کیا تھا اور اب یہ سالار اوریزی کو قتل کرنے آیا ہے۔ جب اوریزی گھوڑے سے اُتر کر اُس کے سامنے کھڑا ہُوا تو تینوں محافظ درویش کے اور زیادہ قریب ہو گئے اور ان کی نظریں اس کے ہاتھوں پر جم گئیں۔

"میرے لئے کیا حکم ہے اے عالم؟" — سالار اوریزی نے پوچھا۔

"حکم دینے والی ذات صرف اللہ کی ہے" — درویش نے کہا — "مجھے کچھ نظر آیا تھا، وہ تجھے دکھانے آ گیا۔ تیری جسمانی اور تیری دماغی قوت پر مجھے کوئی شک نہیں لیکن تیری روح کو تقویت کے لئے کچھ دینا ہے، میں تجھے قتل کرنے نہیں آیا۔ دیکھ لے میرے ہاتھ میں قرآن مجید ہے اور دوسرے ہاتھ میں عصا۔ اگر میں سپاہی ہوتا تو آج تیرے ساتھ جاتا لیکن میری زندگی کا راستہ کوئی اور ہے۔ میں نے تیری فتح کے لئے رات بھر چلّہ کاٹا ہے۔ اللہ نے کرم کیا اور مجھے روشنی کی ایک کرن دکھا دی ہے۔ وہ تیری روح میں ڈالنے آیا ہوں.... تیرا پورا نام کیا ہے؟"

"ابن ہاشم اوریزی!" — سالار اوریزی نے جواب دیا۔

"اور تو جا کہاں رہا ہے؟" — درویش نے پوچھا۔

"قلعہ ملاذ خان!" — سالار اوریزی نے جھوٹ بولا۔

درویش زمین پر بیٹھ گیا۔ وہاں زمین دھول والی تھی۔ اُس نے سالار اوریزی کو بھی اشارہ کرکے بٹھا لیا۔ پھر زمین پر دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے خاصا بڑا ستارہ بنایا۔ ایک خانے میں اوریزی کا پورا نام لکھا اور اس کے بالمقابل خانے میں ملاذ خان لکھا۔ اس

کے بعد اُس نے قرآن مجید کھولا اور تھوڑی سی ورق گردانی کر کے ایک آیت پر انگلی رکھی اور وہ آیت بلند آواز سے پڑھی۔ قرآن مجید بند کیا' آسمان کی طرف دیکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا اور نیچے ستارے کو دیکھا۔ اس کے تمام خانوں میں کچھ نشان سے لگائے اور پھر سالار اوریزی کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"تیرے لشکر نے پہلے دو جگہوں پر شکست کا سامنا کیا ہے" ــــ درویش نے کہا۔

"اب تو فتح یاب لوٹے گا" ــــ درویش نے قرآن اُسی جگہ سے کھولا جہاں سے پہلے کھولا تھا اور قرآن مجید اوریزی کے ہاتھوں میں دے کر ایک آیت پر انگلی رکھی اور کہا ــــ "یہ پڑھ اور اسے زبانی یاد کر لے"۔

سالار اوریزی نے وہ آیت پڑھی اور پھر چند مرتبہ پڑھ کر کہا کہ یہ اُسے یاد ہو گئی ہے۔

"اللہ بڑا یا ابلیس؟" ــــ درویش نے پوچھا۔

"اللہ!" ــــ سالار اوریزی نے جواب دیا۔

"جا.... اللہ تیرے ساتھ ہے" ــــ درویش نے اٹھتے ہوئے کہا ــــ "تو نے کہا ہے کہ تو قلعہ ملاذخان جا رہا ہے۔ اب یہ خیال رکھنا کہ راستے میں کسی اور طرف کا رخ نہ کر لینا۔ قلعہ ملاذخان کو ہی محاصرے میں لینا اور اس قلعے کے دروازے تیرے لئے کھل جائیں گے.... یہ خیال رکھنا کوئی ایک بھی آدمی زندہ نہ رہے"۔

"ایسا نہیں ہو گا اے عالم!" ــــ سالار اوریزی نے کہا ــــ "میں نے قلعہ ملاذخان کا قصد کیا ہے اور وہی میری منزل ہے"۔

درویش نے قرآن مجید سالار اوریزی کے سر سے ذرا اوپر ایک چکر میں گھمایا۔

"گھوڑا تیرا منتظر ہے" ــــ درویش نے کہا ــــ "یہی گھوڑا تجھے فتح یاب واپس لائے گا.... میں تجھے اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ اُسی کی ذات تیری حامی و ناصر ہے"۔

سپہ سالار اوریزی گھوڑے پر سوار ہوا۔ گھوڑا لشکر کی طرف مڑا۔ لشکر آگے نکل گیا تھا۔ اب اس کے سامنے سے وہ گھوڑا گاڑیاں' بیل گاڑیاں اور اونٹ گزر رہے تھے جن پر لشکر کا سامان وغیرہ لدا ہوا تھا۔ اوریزی نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا بڑی اچھی چال دوڑنے لگا۔ اس کے محافظ اس کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ ان محافظوں کا کمانڈر اپنے گھوڑے کو سالار اوریزی کے گھوڑے کے پہلو میں لے گیا۔

"سالار محترم!" ــــ کمانڈر نے پوچھا ــــ "کیا ہم واقعی قلعہ ملاذخان جا رہے ہیں؟ آپ نے ہمیں قلعہ وسم کوہ کے متعلق بتایا تھا اور یہی بتاتے رہے ہیں کہ وسم کوہ کے قلعے کی ساخت کیا ہے اور اس کے ارد گرد کیا ہے' اس کے دروازے کیسے ہیں اور ہم اس قلعے کو کس طرح سر کریں گے۔ قلعہ ملاذخان سے تو ہمارا لشکر واقف ہی نہیں"۔

"جہاں تک اس درویش کا تعلق ہے ہم قلعہ ملاذخان ہی جا رہے ہیں" ــــ سالار اوریزی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ــــ "اور جہاں تک میرا تعلق ہے' میں قلعہ وسم کوہ جا رہا ہوں"۔

محافظوں کا کمانڈر کچھ اس طرح اپنا گھوڑا پیچھے لے آیا جیسے وہ اپنے سپہ سالار کی بات سمجھ ہی نہ سکا ہو اور سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

درویش سالار اوریزی کو خدا حافظ کہہ کر واپس چلا گیا اور اُس نے اپنی چال میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ وہ شہر میں داخل ہوا اور پھر ایک گلی میں گیا اور ایک مکان کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اندر چار پانچ جواں سال آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔

"وہ آ گیا" ــــ ایک آدمی نے کہا پھر درویش سے پوچھا ــــ "کیا خبر لائے؟"

"ملاذخان ہی جا رہا ہے" ــــ درویش نے بیٹھتے ہوئے کہا ــــ "تصدیق کر آیا ہوں۔ اب ایک آدمی فوراً" چل پڑے اور جس قدر جلدی ہو سکے قلعہ الموت پہنچے اور شیخ الجبل کو بتائے کہ سالار اوریزی اپنے لشکر کے ساتھ قلعہ ملاذخان کو ہی کوچ کر گیا ہے۔ شیخ الجبل نے حکم دیا تھا کہ آخری اطلاع اسے بہت جلدی ملنی چاہئے"۔

"میں تیار ہوں" ــــ ایک جواں سال آدمی نے اٹھ کر کہا ــــ "گھوڑا بھی تیار ہے' میں تمہارے انتظار میں تھا.... کوئی اور اطلاع؟"

"اور کچھ نہیں!" ــــ درویش نے کہا۔

وہ جواں سال آدمی بڑی تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔ اس کا گھوڑا تیار تھا۔ وہ کود کر گھوڑے پر سوار ہوا اور نکل گیا۔

اُس وقت عام خیال یہ تھا کہ اس شہر میں کسی باطنی کو زندہ نہیں رہنے دیا گیا لیکن حسن بن صباح کا بھیجا ہوا یہ گروہ زندہ و سلامت تھا اور پوری طرح سرگرم تھا۔ انہوں نے اپنے اوپر ایسا دبیز پردہ ڈال رکھا تھا کہ ان پر کسی کو شک ہوتا ہی نہیں تھا۔ یہ سالار اوریزی کی گہری نظر تھی جس نے اس درویش کی اصلیت بھانپ لی تھی ورنہ وہ کون

مسلمان ہے جو قرآن سے متاثر نہیں ہوتا۔ سالار اوریزی نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ یہ درویش اُس کے پاس آگیا تھا۔ شکر اس لئے ادا کیا کہ حسن بن صباح کو مصدقہ اطلاع مل جائے گی کہ یہ لشکر قلعہ ملاذخان کو ہی جا رہا ہے۔

"راستے میں صرف ایک پڑاؤ ہو گا" —— سالار اوریزی نے اپنے نائبین کو حکم دیا —— "یہ پڑاؤ بھی ایک آدھ گھڑی کے لئے ہو گا' پوری رات کے لئے نہیں۔ باقی رات کوچ میں گزرے گی اور ہمیں بہت ہی جلدی وسم کوہ پہنچنا ہے"۔

○

مزمّل آفندی اور بن یونس زخمی حالت میں سلطان کے محل کے ایک کمرے میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کی جانیں تو بچ گئی تھیں لیکن زخم زیادہ تھے اور خون اتنا بہہ گیا تھا کہ ان کا زندہ رہنا ایک معجزہ تھا۔ گو خطرہ ٹل گیا تھا لیکن ابھی تک دونوں بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں ہوئے تھے۔ اچانک شمونہ بڑی ہی تیزی سے دوڑتی ہوئی ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"مزمّل!" —— شمونہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا —— "وزیرِاعظم عبدالرحمان سمیری بھی قتل ہو گئے ہیں.... لاش لائی جا رہی ہے"۔

مزمّل اور بن یونس ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھے اور اس کے ساتھ ہی دونوں کی کربناک آہیں نکل گئیں اور وہ پھر لیٹ گئے۔ اس خبر پر تو وہ اٹھ کر باہر نکل جانا چاہتے تھے لیکن زخموں نے انہیں بیٹھنے بھی نہ دیا اور وہ یوں لیٹ گئے جیسے گھائل ہو کر گر پڑے ہوں۔ ان دونوں نے شمونہ سے پوچھنا شروع کر دیا کہ سمیری کہاں قتل ہُوا ہے؟ کس طرح قتل ہُوا ہے؟ کس نے قتل کیا ہے؟.... شمونہ نے انہیں تفصیل سنائی۔

"اب میں اس شہر میں نہیں رہوں گی" —— شمونہ نے غصے اور جذبات کی شدت سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا —— "میں قلعہ اَلمُوت جاؤں گی اور حسن بن صباح کو اپنے ہاتھوں قتل کروں گی۔ تم دونوں کو اب گھروں میں بیٹھی ہوئی عورتوں کی طرح رونا نہیں چاہئے" —— شمونہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا —— "اب ہمیں کچھ کرنا پڑے گا۔ سالار اوریزی ایک لشکر لے کر قلعہ وسم کوہ کا محاصرہ کرنے چلے گئے ہیں لیکن میں کہتی ہوں کہ ایک قلعہ سر کر لینے سے کیا حاصل ہو گا؟ ہو سکتا ہے یہ قلعہ سر نہ ہی ہو سکے۔ پہلے ہمارے لشکر شکست کھا کر آ چکے ہیں"۔

"ہم سمیری کی شہادت پر آنسو نہیں بہا رہے شمونہ!" —— مزمّل نے کہا —— "اپنی اس حالت پر رو رہے ہیں کہ جب ہمیں میدان میں ہونا چاہئے تھا ہم یہاں اس قابل بھی نہیں کہ اپنا وزن بھی سہار سکیں.... اور تم اتنی زیادہ جذباتی نہ ہو جاؤ کہ عقل سے کام لینا بھی چھوڑ دو۔ کیا میں نے تمہارے ساتھ عہد نہیں کر رکھا کہ ہم نے حسن بن صباح کو قتل کرنا ہے"۔

"ہمیں اتنا سا ٹھیک ہونے دو کہ چل پھر سکیں" —— بن یونس نے کہا —— "حسن بن صباح ہمارے ہاتھوں مرے گا"۔

شمونہ ان کے پاس بیٹھ گئی اور وہ بہت دیر یہی منصوبے بناتے رہے کہ حسن بن صباح کو کس طرح قتل کیا جا سکتا ہے۔

"تم دونوں نے دیکھ لیا ہے" —— شمونہ نے کہا —— "باطنی اور حسن بن صباح کے فدائی زمین کے اوپر نہیں زمین کے نیچے ملتے ہیں۔ وہ میدان میں لڑنے والے لوگ نہیں بلکہ دوسروں کو میدان میں لا کر ایک دوسرے سے لڑا سکتے ہیں اور انہوں نے یہ کام کر دکھایا۔ میں حسن بن صباح کے پاس رہی ہوں۔ مزمّل بھی ان کے ہاں رہ چکا ہے لیکن جو میں جانتی ہوں وہ مزمّل' تم بھی نہیں جانتے۔ ہمیں زمین کے نیچے نیچے سے حسن بن صباح تک پہنچنا ہے"۔

یہ باتیں تھیں' ان باتوں میں ایک عزم تھا' عہد تھا اور یہ اُن کا ایمان تھا لیکن اس وقت حقیقت یہ تھی کہ حسن بن صباح کا فرقہ آکاس بیل کی طرح پھیلتا ہی چلا جا رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اسلام کا ہرا بھرا شجر سُوکھ جائے گا اور اس کی نشوونما رُک جائے گی۔ سلطان کے محل کی سرگوشیاں بھی قلعہ اَلمُوت میں حسن بن صباح کو سنائی دیتی تھیں۔

حسن بن صباح کو جب یہ مصدقہ اطلاع ملی کہ سالار اوریزی اپنے لشکر کو قلعہ ملاذخان کے محاصرے کے لئے لے گیا ہے اُس وقت سالار اوریزی قلعہ وسم کوہ کو محاصرے میں لے چکا تھا۔ حسن بن صباح اس اطلاع پر ذرا سا بھی پریشان نہیں ہُوا تھا۔ اُس نے قلعہ ملاذخان کے دفاع کا انتظام پہلے ہی اتنا مضبوط کر دیا تھا کہ سالار اوریزی جتنا لشکر اپنے ساتھ لے گیا تھا اس سے دُگنا لشکر بھی قلعہ ملاذخان کو فتح نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے وہاں اپنے ایک ہزار جانباز بھیج دیئے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے قلعہ ملاذخان سے کچھ دور دو تین جگہوں پر گھات کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔

سالار اوریزی کو توقع تھی کہ وہ قلعہ وسم کوہ کو بڑی آسانی سے لے لے گا لیکن اس نے جب محاصرہ کیا تو قلعے کی دیواروں پر ہزاروں انسانوں کا ہجوم نظر آنے لگا۔ اس ہجوم نے تیروں کا مینہ برسا دیا۔ سالار اوریزی اپنے لشکر کو پیچھے ہٹانے پر مجبور ہو گیا اور قلعہ توڑنے کے منصوبے سوچنے لگا۔ وہ اتنا جان گیا کہ یہ قلعہ آسانی سے نہیں لیا جا سکے گا اور محاصرہ طول کھینچے گا۔

مستند تاریخوں میں آیا ہے کہ حسن بن صباح کا انداز ایسا تھا جیسے اسے کوئی غم نہیں کہ کوئی قلعہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اُس نے اپنے خاص آدمیوں سے کہا کہ اپنے دشمن کے مذہبی اور معاشرتی سربراہوں کو ختم کر دو۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ اسے یہ توقع ذرا کم ہی تھی کہ اس کے فدائی ابُو مسلم رازی اور وزیرِ اعظم عبدالرحمان سمیری جیسے اہم ترین سربراہوں کو اتنی آسانی سے قتل کر دیں گے۔ فدائیوں نے یہ کارنامہ کر دکھایا تو حسن بن صباح نے حکم دیا کہ یہی کام جاری رکھو اور دشمن کے کسی بھی حکمران کو اور کسی عالمِ دین کو زندہ نہ رہنے دو..... حسن بن صباح اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا لیکن وہ جب دشمن کا لفظ استعمال کرتا تھا تو اس سے اس کی مُراد مسلمان ہی ہوتی تھی۔ وہ کسی کے قتل کا حکم دیتا تو اس انداز سے بولتا تھا جیسے اس کی زبان سے خدا بول رہا ہو۔ اس کے پیروکار مان گئے تھے کہ اُس پر وحی نازل ہوتی ہے اور اُسے ہر حکم خدا کی طرف سے ملتا ہے۔

ابو مسلم رازی، ابوالمظفر مجید فاضل اصفہانی اور عبدالرحمان سمیری کے قتل کے فوراً بعد جو اہم ترین شخصیتیں باطنیوں کے ہاتھوں قتل ہوئیں اگر داستان گو ہر قتل کو تفصیل سے بیان کرنے لگے تو یوں نظر آئے گا کہ جیسے ایک ہی واردات ایک ہی جیسے الفاظ میں دوہرائی جا رہی ہے۔ باطنیوں کا طریقۂ قتل ایک ہی جیسا تھا۔ یہ وہی طریقہ تھا جس سے ابو مسلم رازی اور دوسرے سربراہوں کو قتل کیا گیا تھا۔ مشہور و معروف تاریخ نویس ابنِ جوزی نے لکھا کہ چند دنوں میں ہی حسن بن صباح کے فدائیوں نے حاکمِ دیارِ بقر اتابک مودُود کو قتل کیا اور اس کے فوراً بعد ابو جعفر، شاطبی رازی، ابو عبید مستوفی، ابوالقاسم کرخی اور ابوالفرح قراتکین کو قتل کیا۔ کچھ دِنوں کا وقفہ آیا اور پھر ابلیس کے فدائیوں نے قاضی کرمان، امیر بلکابک سرامر اصفہانی اور قاضی عبداللہ اصفہانی کو قتل کیا۔ قتل کی ہر واردات میں طریقۂ قتل ایک ہی استعمال کیا گیا۔ وہ اس طرح کہ فدائی بھیس بدل کر کسی بہانے مقتول تک رسائی حاصل کرتا اور اچانک خنجر نکال کر اسے قتل کر دیتا۔

پیشتر اس کے کہ اُسے پکڑا جاتا وہ خودکشی کر لیتا۔

اس کے بعد باطنی فدائیوں نے ایک طریقہ اور اختیار کیا۔ دو مؤرخوں نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح کے فدائیوں نے سلجوقی فوج کے سالاروں اور نائب سالاروں کو یوں وارننگ دی کہ ان کے گھروں میں رُقعے پھینک دیئے جن پر تحریر تھا کہ شیخ الجبل امام حسن بن صباح کی اطاعت قبول کر کے اُس کے ہاتھ پر بیعت کر لو ورنہ تمہارا حشر وہی ہو گا جو پہلے کچھ حاکموں، امیروں اور علماء دین کا کیا جا چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی سالار یا ماتحت کماندار نے حسن بن صباح کی اطاعت قبول نہیں کرنی تھی۔ ان سب نے یہ تحریریں جو ان کے گھروں میں پھینکی گئی تھیں، سلطان برکیارق کو دکھائیں۔

"ان ابلیسوں کی دھمکیوں کو کھوکھلے الفاظ نہ سمجھنا" ——— سلطان برکیارق نے سالاروں سے کہا ——— "ایک احتیاط یہ کرو کہ کوئی سالار اکیلا کہیں بھی نہ جائے، اُس کے ساتھ تین چار محافظ ہونے چاہئیں۔ رات کو اپنے گھروں کے گرد پہرے کھڑے کر دو۔ اپنے آپ کو کسی بھی وقت غیر مسلح نہ رکھو.... دوسرا طریقہ یہ ہے [illegible] نے اختیار کیا ہے۔ وہ یہ کہ ہم ان کے قلعوں پر قبضہ کریں گے۔ تم جانتے ہو کہ سالار او[illegible] وسم کوہ گیا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے باطنیوں کا جو قتلِ عام کروایا ہے، وہ کافی نہیں یہ تحریریں جو تم سب تک پہنچائی گئی ہیں، ثبوت ہیں کہ باطنی یہاں موجود ہیں اور زمین کے نیچے نیچے پوری طرح سرگرم ہیں۔ میرے مخبر اپنا کام کر رہے ہیں، تم اپنے مخبروں کو سرگرم کر دو"۔

تاریخوں میں واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ تمام سالاروں، ان کے نائبین اور اہم قسم کے ماتحت کمانداروں نے اپنے آپ کو رات کے وقت بھی مسلح رکھنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنے گھروں پر پہریدار مقرر کر دیئے جو رات بھر مکانوں کے اِردگِرد گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ سالاروں نے اپنے مخبر سارے شہر میں پھیلا دیئے تھے۔

پچھلے کسی باب میں ایک سپہ سالار ابو جعفر حجازی کا تفصیلی ذکر آیا ہے۔ مقتولین کی مندرجہ بالا فہرست میں بھی ایک ابو جعفر کا نام شامل ہے۔ یہ ابو جعفر کوئی عالمِ دین تھا اور حسن بن صباح کے خلاف عملی طور پر سرگرم رہتا تھا۔ ایک فدائی نے اس کا مرید بن کر اسے قتل کر دیا تھا۔ اب داستان گو جس ابو جعفر حجازی کا ذکر کر رہا ہے، یہ سلطان کی فوج کا یعنی سلطنتِ سلجوقیہ کے لشکر کا سپہ سالار تھا۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ وہ سلطان برکیارق

کا خوشامدی تھا اور اس کا ہر غلط حکم بھی بسرو چشم مانتا اور اس کی تعمیل کرتا تھا۔ سالار اوریزی کے ساتھ تو اس کی خاص دشمنی تھی اور اوریزی کو اُس نے گرفتار تک کرلیا تھا۔ یہ ساری تفصیل پہلے ابواب میں بیان ہو چکی ہے۔

سلطان برکیارق کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے روشنی دکھائی اور وہ راہ راست پر آگیا تو اس نے وہ اہمیت جو وہ کبھی سپہ سالار حجازی کو دیا کرتا تھا' سالار اوریزی کو دینی شروع کر دی تھی۔

"سلطانِ محترم!" ـــــ ایک روز خانہ جنگی کے کچھ دن بعد سپہ سالار حجازی سلطان برکیارق کے ہاں گیا اور کہا ـــــ "گستاخی کی معافی پہلے ہی مانگ لیتا ہوں' ایک بات جو دل میں کھٹک رہی ہے' وہ ضرور کہوں گا.... ایک وقت تھا کہ آپ چھوٹی سے چھوٹی بات سے لے کر سلطنت کے بڑے سے بڑے مسئلے کے بارے میں میرے ساتھ بات کرتے اور میرے مشورے طلب کیا کرتے تھے مگر میں اب وہ وقت دیکھ رہا ہوں کہ آپ نے مجھے بالکل ہی نظرانداز کر دیا ہے اور یوں پتہ چلتا ہے کہ سالار اوریزی نہ ہُوا تو سلطنتِ سلجوقیہ کی بنیادیں ہل جائیں گی"۔

"محترم ابو جعفر!" ـــــ سلطان برکیارق نے کہا ـــــ "آپ میرے والد مرحوم کے وقتوں کے سالار ہیں۔ میرے دل میں آپ کا درجہ روحانی باپ جیسا ہے۔ آپ کا شکوہ بجا ہے کہ میں اب آپ کو وہ قدر و منزلت نہیں دیتا جو کسی وقت دیا کرتا تھا۔ آپ نے دل کی بات کہی ہے اور صاف صاف کہی ہے اور یہ بات مجھے پسند ہے۔ ایسے ہی میں دل کی گہرائیوں سے بات نکالوں گا اور آپ سے کروں گا.... آپ جس وقت کی بات کرتے ہیں' اُس وقت میں گمراہ ہو گیا تھا یا گمراہ کر دیا گیا تھا۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ ایک حسین و جمیل اور پُرکشش لڑکی نے مجھ پر اپنے حسن و جوانی کا جادو اور حشیش کا نشہ طاری کر دیا تھا۔ اُس وقت آپ نے مجھے جھنجھوڑا نہیں' بیدار نہیں کیا بلکہ میری خوشامد کی اور میرا ہر وہ حکم بھی بسرو چشم مانا جو سلطنت کے مفاد کے خلاف تھا۔ اللہ نے مجھے اور میری روحانی قوتوں کو بیدار کر دیا تو مجھے پتہ چلا کہ یہ سیاہ اور وہ سفید ہے' یہ غلط اور وہ صحیح ہے اور اُس وقت مجھے پتہ چلا کہ مجھے گمراہ کئے رکھنے میں آپ کا بھی ہاتھ ہے۔ میرے دل میں اگر آپ کا احترام نہ ہوتا تو میں کبھی کا آپ کو جلاد کے حوالے کر چکا ہوتا۔ میں آپ سے توقع رکھوں گا کہ میرے دل میں آپ اپنا یہ احترام قائم رکھنے کی کوشش کریں گے۔ میں آپ

کو صرف ایک بات سمجھانا چاہتا ہوں جو آپ فوراً سمجھ جائیں گے۔ وہ یہ ہے کہ دل میں خوشنودی اللہ کی رکھیں' اپنے حاکم کی یا اپنے سلطان کی نہیں۔ کیا آپ نے یہ حدیث مبارکہ نہیں سنی کہ بہترین جہاد جابر سلطان کے منہ پر کلمۂ حق کہنا ہے' مگر آپ نے جابر سلطان کو خوش رکھنے کے جتن کئے اور اللہ کی ذاتِ باری کو نظرانداز کئے رکھا.... یہ گناہ تھا میرے بزرگوار!"

"کیا آپ میرے بدلے ہوئے کردار کو قبول کریں گے؟" ـــــ سپہ سالار ابو جعفر حجازی نے کہا ـــــ "میں آپ کا یہ الزام تسلیم کرتا ہوں کہ میں دیکھ رہا تھا کہ آپ پر کوئی ساجادو چلایا جا رہا تھا لیکن یہ میری لغزش تھی یا گناہ تھا کہ میں نے آنکھیں بند کئے رکھیں اور آپ کی خوشامد میں لگا رہا' لیکن سلطانِ محترم! اس خانہ جنگی نے اور خون کے اس دریا نے جو ہم لوگوں نے ایک دوسرے کا بہایا ہے' میری روح کو اسی طرح بیدار کر دیا ہے جس طرح آپ کی روح بیدار ہوئی ہے۔ مجھے موقع دیں' میں اب آپ کو نہیں اللہ کی ذاتِ باری کو راضی کروں گا"۔

اس کے بعد سپہ سالار حجازی نے جیسے عہد کر لیا ہو کہ وہ کسی باطنی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ باطنیوں کا جو قتلِ عام کیا گیا تھا' اس میں سپہ سالار حجازی کا خاصا ہاتھ تھا۔ اس میں قومی جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔

○

ابو جعفر حجازی سپہ سالار تھا اور وہ جس مکان میں رہتا تھا وہ چھوٹا سا ایک محل تھا۔ وہاں دو تین نوکر تھے' ایک ملازمہ تھی اور دو یا تین سائیس تھے۔ حجازی نے بھی اپنی حفاظت کے انتظامات بڑے سخت کر دیئے تھے اور رات کے وقت دو چوکیدار اس کے مکان کے اردگرد گشت کرتے رہتے تھے۔ اُس نے فوج کے تربیت یافتہ مخبروں کو سارے شہر میں پھیلا رکھا تھا اور انہیں سختی سے کہہ رکھا تھا کہ زمین کے نیچے سے بھی باطنیوں کو نکال کر لاؤ اور میرے سامنے کھڑے کر دو۔ اُس نے کئی ایک باطنیوں کو اپنے سامنے قتل کرایا تھا لیکن باطنی جو بچ گئے وہ زمین کے نیچے چلے گئے تھے۔ حجازی اب انہیں زمین کے نیچے سے نکالنے کے لئے سرگرم ہو گیا تھا۔

ایک روز اُس کا ایک مخبر اس کے پاس آیا اور بتایا کہ اس کے سائیسوں میں ایک سائیس مشکوک ہے۔ اس مخبر کو تین آدمیوں نے بتایا تھا کہ یہ سائیس باطنی معلوم ہوتا

ہے۔ ان آدمیوں نے اس کے متعلق کچھ اور باتیں بھی بتائی تھیں۔ وہاں یہ عالم تھا کہ زیادہ گہرائی سے تحقیقات کی ہی نہیں جاتی تھیں۔ بہت سے آدمی تو محض شک میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ سپہ سالار حجازی نے اپنے اس مخبر سے کہا کہ اس سائیس کے متعلق کچھ اور شہادت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے ساتھ ہی حجازی نے اپنے ذاتی اصطبل کے دو سائیسوں کو بلا کر کہا کہ وہ اس سائیس پر نظر رکھیں اور دیکھیں کہ وہ جب گھر جاتا ہے تو اس کے گھر کے اندر کیا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بھی معلوم کیا جائے کہ اس کے گھر کا ماحول کیسا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا سارا کنبہ باطنی ہو۔ یہ سائیس حجازی کا ذاتی سائیس تھا۔ اُس کے اصطبل میں چھ سات گھوڑے تھے جن میں ایک گھوڑا اسے بہت ہی پسند تھا اور وہ عموماً اس پر ہی سواری کیا کرتا تھا۔ وہ سائیس اس گھوڑے پر مقرر تھا اور اس پر حجازی کو پورا پورا بھروسہ تھا۔ وہ تجربہ کار سائیس تھا۔ اس سائیس کا باطنی ہونا کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ وہاں تو کوئی بھی شخص باطنی ہو سکتا تھا۔ حسن بن صباح کا طلسم دُور دُور تک اور کونوں کھدروں تک بھی پہنچ گیا تھا۔

حجازی اصطبل میں اتنا زیادہ نہیں جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی جا نکلتا اور گھوڑوں کو دیکھ کر واپس آ جاتا تھا۔ اُس نے اپنی حفاظت کا اتنا سخت انتظام کر رکھا تھا کہ وہ اصطبل تک جاتا تو بھی اُس کے ساتھ دو محافظ ہوتے تھے۔ باہر نکلتا تو کئی محافظ اس کے آگے پیچھے، دائیں اور بائیں اس کے ساتھ چلتے تھے۔ کوئی اجنبی اس کے قریب نہیں آ سکتا تھا۔ اسے قتل کرنا بظاہر ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ ان حالات میں جب اسے یہ اطلاع دی گئی کہ اس کا ذاتی سائیس باطنی ہے اور وہ کسی بھی وقت وار کر سکتا ہے، وہ چوکس ہو گیا۔ اس نے اپنی حفاظت کے جو انتظامات کئے تھے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ گھر کا کوئی ملازم اور سائیس اپنے پاس کوئی ہتھیار نہیں رکھ سکتا بلکہ چھوٹا سا ایک چاقو بھی رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔

سائیس جب صبح اصطبل میں آتے تھے تو پہنے ہوئے کپڑے اتار کر کام والے کپڑے پہن لیا کرتے تھے۔ ایک روز سپہ سالار حجازی تیار ہو کر باہر نکلا ہی تھا کہ ایک آدمی دوڑا آیا۔ وہ اس کے گھر کا ہی ایک خاص ملازم تھا بلکہ معتمد خاص تھا۔ اس نے حجازی کو بتایا کہ ان کا ذاتی سائیس آج پکڑا گیا ہے۔ بتایا یہ گیا کہ وہ اپنے کپڑے اتار کر الگ رکھ رہا تھا تو ایک سائیس نے اس کے کپڑوں میں خنجر دیکھ لیا۔

"محترم سپہ سالار!" — اس معتمد ملازم نے کہا — "اسے ابھی پتہ نہیں چلنے دیا گیا کہ اس کا خنجر دیکھ لیا گیا ہے۔ آپ خود چل کر دیکھیں"۔

سپہ سالار ابو جعفر حجازی اُسی وقت ملازم کے ساتھ چل پڑا۔ اصطبل میں جا کر اس نے اپنے سائیس کو بلایا اور اسے کہا کہ اپنا خنجر اس کے حوالے کر دے۔

"خنجر؟" — سائیس نے حیرت زدگی کی کیفیت میں پوچھا — "محترم سپہ سالار! کون سا خنجر؟ کیسا خنجر؟"

"وہ خنجر جو تم نے اپنے کپڑوں میں چھپا رکھا ہے" — حجازی نے کہا — "خود ہی وہ خنجر لے آؤ"۔

"میں آپ کا بڑا ہی پرانا خادم ہوں سپہ سالار!" — سائیس نے کہا — "آپ کا حکم ہے کہ کوئی سائیس یا دوسرا ملازم اپنے پاس کوئی ہتھیار نہیں رکھ سکتا۔ مجھے اپنے پاس خنجر رکھنے کی کیا ضرورت تھی.... اگر آپ کو شک ہے تو میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ میرے کپڑے کہاں رکھے ہیں، خود چل کر دیکھ لیں"۔

سپہ سالار حجازی اُس کے ساتھ چل پڑا۔ سائیس نے اپنے کپڑے اُس کمرے میں رکھے ہوئے تھے جہاں باقی سائیس اپنے کپڑے اتار کر رکھتے اور کام والے کپڑے پہنتے تھے۔ سائیس نے اپنے کپڑوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ اس کے کپڑے پڑے ہیں، دیکھ لئے جائیں۔

حجازی خود گیا اور اس کے کپڑے اٹھائے تو ان میں سے ایک خنجر نکلا۔ حجازی نے خنجر نیام سے نکال کر دیکھا۔ اُس نے حسن بن صباح کے فدائین کے خنجر دیکھے تھے۔ غالباً ان پر کوئی نشان ہوتا ہو گا جو حجازی نے دیکھ لیا۔ اس سے اسے یقین ہو گیا کہ اُس کا سائیس باطنی ہے اور آج وہ اسے قتل کرنے کے لئے خنجر لایا تھا۔

سائیس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا کہ یہ خنجر اس کا نہیں نہ وہ اسے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ کسی دشمن نے یہ خنجر اس کے کپڑوں میں رکھ دیا ہے۔

"یہاں تمہارا دشمن کون ہو سکتا ہے؟" — حجازی کے ایک محافظ نے اس سے پوچھا — "کیا تم اپنا کوئی دشمن دکھا سکتے ہو؟"

سائیس نے اب رونا شروع کر دیا تھا اور وہ حجازی کے قدموں میں گر پڑا اور اُس

کے پیروں پر ماتھا رگڑنے لگا۔ وہ رو رو کر کہتا تھا کہ یہ خنجر اُس کا نہیں لیکن حجازی اسے بخشنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔

حجازی نے خنجر اپنے ایک محافظ کو دیا اور اشارہ کیا۔ محافظ اشارہ سمجھ گیا۔ وہ سائیس کی طرف بڑھا۔ سائیس کے چہرے پر خوف و ہراس کے تاثرات نمودار ہوئے اور اُس کی آنکھیں اور زیادہ کھل گئیں۔ محافظ نے دو تین قدم تیزی سے اٹھائے اور یکے بعد دیگرے سائیس کے سینے میں خنجر کے دو وار کئے۔ سائیس گرا اور ذرا سی دیر بعد اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ حجازی نے کہا کہ اس کی لاش شہر سے دور جنگل میں پھینک دی جائے۔

دو دن گزرے ہوں گے کہ سپہ سالار حجازی کو اطلاع دی گئی کہ ایک آدمی اسے ملنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ تجربہ کار سائیس ہے اور کچھ عرصہ فوج میں گھوڑ سوار کی حیثیت سے ملازمت بھی کر چکا ہے۔ حجازی کو ایک سائیس کی ضرورت تھی اس لئے اُس نے اس آدمی کو بلا لیا۔ محافظوں نے اس آدمی کی جامہ تلاشی اچھی طرح کی اور حجازی کے پاس لے گئے۔ حجازی نے اُس سے پوچھا کہ وہ کتنا کچھ تجربہ رکھتا ہے۔

اس شخص نے حجازی کو بتایا کہ وہ فوج میں گھوڑ سوار کی حیثیت سے ملازمت کر چکا ہے اور اُس نے دو لڑائیاں بھی لڑی تھیں۔ اُس نے اپنے جسم پر تلواروں کے زخموں کے دو نشان دکھائے اور کہا کہ ان زخموں کی وجہ سے وہ فوج کے قابل نہیں رہا تھا لیکن سائیس کا کام خوش اسلوبی سے کر سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ اُس شخص نے حجازی کو قائل اور متاثر کر لیا اور حجازی نے حکم دے دیا کہ اسے اصطبل میں رکھ لیا جائے۔

اس نئے سائیس نے اتنا اچھا رویّہ اختیار کیا کہ اصطبل کے دوسرے سائیس اس کی تعریفیں کرنے لگے۔ وہ خوش طبع، خوش اخلاق اور حلیم قسم کا آدمی تھا۔ ہر کسی کے ساتھ پیار سے بات کرتا تھا اور اپنے کام میں تو وہ بہت ہی ماہر تھا۔

دو تین دنوں بعد سپہ سالار حجازی اصطبل میں گھوڑے دیکھنے کے لئے گیا۔ اُس نے اپنا وہ گھوڑا دیکھا جو اس کا منظورِ نظر تھا۔ سائیس نے اس گھوڑے کی دیکھ بھال بڑی محنت سے کی تھی۔ حجازی نے اس گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ نیا سائیس اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور اس گھوڑے کی صفات بیان کرنے لگا۔ اچانک سائیس نے اپنے کپڑوں کے اندر سے خنجر نکالا اور پیشتر اس کے کہ حجازی کے دونوں محافظ اُس تک پہنچتے اُس کا

خنجر حجازی کے دل میں اُتر چکا تھا۔

سائیس محافظوں سے بچنے کے لئے دوڑ کر گھوڑے کی دوسری طرف ہو گیا اور خون آلود خنجر اپنے دل میں اتار لیا۔ تب پتہ چلا کہ یہ تو باطنی تھا۔

مرو شہر کا وہی مکان تھا جس میں وہ درویش داخل ہوا تھا جس نے سالار اوریزی کو قرآن مجید کھول کر ایک آیت پڑھائی اور کہا تھا کہ یہ یاد رکھنا اور اس کا وِرد کرتے ہوئے جانا، فتح تمہاری ہو گی۔ اس مکان کے اندر وہی درویش اپنے تین چار ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ باہر والا دروازہ بڑی زور سے کھلا اور اُن کا ایک ساتھی دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

"لو بھائیو!" ــــ اس آدمی نے کہا ــــ "کام ہو گیا ہے۔ ہمارے فدائی نے سپہ سالار ابو جعفر حجازی کو قتل کر کے اپنے آپ کو بھی مار لیا ہے"۔

پہلے سائیس کو مروانے والے باطنی ہی تھے۔ اس سائیس کے کپڑوں میں خنجر باطنیوں نے ہی رکھوایا تھا اور پھر دوسرا سائیس صرف باطنی ہی نہیں بلکہ فدائی تھا۔

یہ ایک ہی واقعہ نہیں بلکہ تاریخوں میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں۔ مرو کے معاشرے میں کئی سرکردہ افراد تھے جو باطنیوں کے خلاف سرگرم ہو گئے تھے۔ انہیں قتل کرنا ضروری تھا لیکن ان سب نے اپنی حفاظت کے انتظامات کر لئے تھے اور وہ جہاں بھی جاتے ان کے ساتھ محافظ ہوتے تھے۔ اس صورتِ حال میں انہیں قتل کرنا آسان نہیں تھا۔ ان کے قتل کا یہی طریقہ اختیار کیا گیا جو حجازی کو قتل کرنے کے لئے آزمایا گیا تھا۔ کوئی فدائی کسی سرکردہ آدمی کے ہاں مظلوم اور غریب بن کر ملازمت حاصل کر لیتا اور موقع پا کر اپنے شکار کو قتل کر دیتا تھا۔ دیہی علاقوں میں قبیلوں کے سردار تھے جو حسن بن صباح کی اطاعت قبول نہیں کرتے تھے نہ اپنے قبیلے کے کسی شخص کو ایسی اجازت دیتے تھے۔ کسی پر شک ہو جاتا کہ اس کا ذہنی رجحان باطنیوں کی طرف ہو رہا ہے تو قبیلے کا سردار اسے قتل کروا دیتا تھا۔ ان سرداروں نے بھی اپنے ساتھ محافظ رکھے لئے تھے۔ انہیں قتل کرنے کا بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔

○

پہلے ذکر آ چکا ہے کہ حسن بن صباح اصفہان کو اپنا مرکز بنانا چاہتا تھا۔ تاریخوں کے مطابق، اس نے اپنے بے شمار فدائی اور دیگر پیروکار اصفہان بھیج دیئے تھے۔ حسن بن

صباح نے اصفہان میں مسلمانوں کو قتل کرنے کا ایک اور طریقہ اپنے فدائین کو بتایا۔ بڑ ...ین اُس نے دیکھ لیا تھا کہ ایک مسلمان قتل ہوتا تھا تو اس کے بدلے تین باطنیوں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ حسن بن صباح نے اپنے فدائین کو یوں سمجھایا کہ وہ ایک ایک ...لا مسلمانوں کو ایسے قتل کریں کہ ان کی لاشیں نہ ملیں اور پتہ ہی نہ چلے کہ وہ قتل ہو گئے ہیں۔

اصفہان کے ایک حصے میں مکان بہت ہی پرانے تھے جن میں کافی لوگ رہتے تھے گلیاں تنگ تھیں اور مکانوں کی دیواریں اور چھتیں بوسیدہ ہو گئی تھیں۔ ایک گلی کے سرے پر ایک اندھا کھڑا نظر آنے لگا۔ وہ اپنے قریب سے گزرتے کسی آدمی کی آہٹ پا سنتا تو اُسے روک لیتا اور کہتا کہ اللہ کے نام پر اسے اس گلی میں ایک جگہ تک پہنچا دے۔ وہ آدمی اسے اندھا سمجھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیتا اور آگے آگے چل پڑتا۔ اندھا اسے کہتا کہ آگے ایک گلی دائیں کو مڑتی ہے' اسے اس گلی کے ایک مکان تک پہنچا دیں۔

یوں وہ شخص اس اندھے کا ہاتھ پکڑے ہوئے اس گلی کے وسط تک جاتا' ایک مکان سے دو تین آدمی نکلتے اور اس آدمی کو پکڑ کر مکان کے اندر لے جاتے اور اس کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر ڈالتے۔ وہ شخص اندھا نہیں ہوتا تھا۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے آدمیوں کو دیکھ سکتا تھا اور پہچان لیتا کہ یہ باطنی نہیں مسلمان ہے۔ اس طرح ایک آدمی کو مروا کر وہ کہیں اور چلا جاتا اور اسی طرح کسی اور آدمی کو اپنا ہاتھ پکڑوا کر اس کے پیچھے چل پڑتا۔ اس کے بعد وہ آدمی کسی کو نظر نہ آتا۔

ایک مہینے میں بے شمار مسلمان لاپتہ ہو گئے اور شہر بھر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ کسی گھر کا کوئی آدمی شام تک واپس گھر نہیں پہنچتا تھا تو وہاں صفِ ماتم بچھ جاتی تھی۔ اس کے گھر والے یہ سمجھ لیتے کہ وہ غائب ہو گیا ہے لیکن اس سوال کا جواب کہیں سے نہیں مل رہا تھا کہ یہ اتنے زیادہ آدمی کہاں لاپتہ ہو گئے ہیں۔ اُس زمانے میں بھی روحانی عامل' قیافہ شناس اور نجومی موجود تھے۔ لوگ ان سے پوچھتے تھے کہ وہ اپنے علم کے ذریعے معلوم کریں کہ کیا ان لوگوں کو جنّات اٹھا کر لے گئے ہیں یا وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ روحانی عاملوں کو کچھ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ صرف ایک عامل نے بتایا کہ جتنے آدمی لاپتہ ہو چکے ہیں' ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں لیکن وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکا کہ وہ آدمی موت تک کس طرح پہنچے اور موت کی آغوش میں انہیں کون لے گیا تھا۔

ایک روز ایک اندھا ایسے ہی ایک آدمی کو روک کر اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ آدمی بھی اس دھوکے میں آ گیا تھا کہ یہ اندھا بے چارہ مجبور ہے اس لئے اسے اس کے ٹھکانے تک پہنچانا کارِ ثواب ہے۔ اس کے بعد یہ آدمی کسی کو نظر نہیں آیا لیکن ایک بات یوں ہوئی کہ ایک آدمی نے اسے اس اندھے کا ہاتھ پکڑے ہوئے ایک گلی کے اندر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُس نے کئی لوگوں کو بتایا کہ گم ہونے والے شخص کو ایک اندھا اپنی راہنمائی کے لئے ایک گلی کے اندر لے گیا تھا۔

اُسی روز یا اگلے روز اس آدمی نے جس نے اُس بدقسمت آدمی کو اندھے کے ساتھ دیکھا تھا' تین چار آدمیوں کو اپنے ساتھ لیا اور انہیں ایک جگہ چھپا کر اکیلا آگے گیا اور اندھے کے قریب سے گزرا۔ اندھے نے اسے روک لیا اور کہا کہ وہ اس گلی میں جانا چاہتا ہے لیکن وہ خود راستہ نہیں دیکھ سکتا' اللہ کے نام پر اسے اس کے گھر تک پہنچا دیا جائے۔ اس شخص نے اس کا بازو پکڑ لیا اور گلی میں داخل ہو گیا۔ اُس کے جو ساتھی پیچھے چھپے ہوئے تھے' وہ دیکھ رہے تھے۔ جب اندھا اس آدمی کے ساتھ گلی کے اندر چلا گیا تو یہ سب آدمی اس گلی تک آ گئے اور گلی میں اُس وقت داخل ہوئے جب اندھا اس آدمی کو یہ کہہ رہا تھا کہ دائیں طرف والی گلی میں جانا ہے۔ وہ شخص اُسے اس گلی میں لے گیا۔

اس شخص کے ساتھی دبے پاؤں وہاں تک پہنچ گئے جہاں سے گلی دائیں کو مُڑتی تھی۔ جب اندھا اس مکان تک پہنچا تو رک گیا۔ اندر سے تین آدمی نکلے اور اس شخص کو پکڑ لیا۔ اس کے چھپے ہوئے ساتھی تلواریں نکال کر دوڑتے ہوئے پہنچے اور ان آدمیوں کو تلواروں پر رکھ لیا۔ وہ سب اندر کو بھاگ رہے تھے لیکن وہ تینوں اور اندھا بھی تلواروں سے کٹ مرے۔ مکان کے اندر گئے تو صحن میں ایک جگہ لکڑی کے تختے رکھے ہوئے تھے اور ان پر کچھ سامان پڑا ہُوا تھا۔

وہ بہت ہی پرانے زمانے کا مکان تھا۔ اندر اس قدر بدبُو تھی کہ ٹھہرا نہیں جا سکتا تھا لیکن یہ بدبُو بتا رہی تھی کہ اس مکان میں مُردار گل سڑ رہے ہیں یا انسانوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ مکان بالکل خالی تھا۔ کمروں میں دیکھا گیا لیکن کچھ سراغ نہ ملا۔ ایک آدمی کے کہنے پر لکڑی کے تختے ہٹائے گئے تو دیکھا کہ ان کے نیچے ایک گہرا گڑھا کھدا ہُوا تھا جس میں بے انداز لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اوپر والی لاشیں تازہ لگتی تھیں اور بدبُو سے پتہ چلتا تھا

کہ ان کے نیچے لاشیں گل سڑ رہی ہیں اور مکان میں ان کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

ایک تو یہ طریقہ تھا کہ اس سے نہ جانے کتنے مسلمانوں کو غائب کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے کچھ کی لاشیں اس گڑھے سے ملیں اور کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ کتنے مکانوں میں ایسے اور گڑھے ہوں گے جن میں لاپتہ ہونے والے مسلمانوں کی لاشیں پڑی ہوں گی۔

مسلمانوں کے غائب ہونے کا سلسلہ رُکا نہیں بلکہ چلتا رہا۔ کچھ سراغ نہیں ملتا تھا کہ وہ کہاں غائب کیے جا رہے ہیں۔ مسلمان اتنے بھڑکے ہوئے تھے کہ شہر میں انہیں کوئی نابینا نظر آتا تھا تو اسے قتل کر دیتے تھے۔ پھر بھی مسلمان غائب ہوتے رہے۔ ایک اور طریقہ بھی اختیار کیا گیا جس کا سراغ مل گیا۔ سراغ یوں ملا کہ ایک آدمی علی الصبح فجر کی اذان سن کر مسجد کو جا رہا تھا تو اسے یوں نظر آیا جیسے دو تین آدمی کسی آدمی کو گھسیٹ کر ایک مکان کے اندر لے جا رہے ہوں۔ وہ نہتّہ تھا اس لئے اس نے اس آدمی کو چھڑانے کی کوشش نہ کی، اس کی بجائے اس نے یہ کارروائی کی کہ مسجد میں جب نمازی اکٹھے ہوئے تو اس نے نمازیوں کو بتایا کہ ایک مکان پر اسے شک ہے اور اُس نے جو دیکھا تھا انہیں بتایا۔ نماز کے بعد یہ خبر مسلمانوں کے محلوں میں پھیل گئی اور ایک ہجوم اس مکان کے سامنے اکٹھا ہو گیا۔

اس ہجوم میں زیادہ تر آدمی تلواروں سے مسلح تھے۔ دروازے پر دستک دی گئی لیکن اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ آخر یہ لوگ اندر چلے گئے۔ یہ قدیم وقتوں کی حویلی تھی جو غیر آباد نظر آتی تھی۔ اس کے تمام کمروں میں جا کر دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا اور یوں لگتا تھا جیسے یہ مکان ایک مدت سے غیر آباد ہے۔ وہاں بھی بدبُو تھی جو صاف پتہ چلتا تھا کہ انسانی لاش یا لاشوں کی ہے۔

"ادھر آؤ" ــــ ایک آدمی نے بلند آواز سے کہا ــــ "اس کنوئیں میں دیکھو"۔

حویلی کا صحن خاصا کشادہ تھا اور اس کے ایک کونے میں کنُواں تھا۔ کنوئیں میں جھک کر دیکھا تو آدھا کنُواں لاشوں سے بھرا پڑا تھا۔ اوپر سے دو تین لاشیں نکالی گئیں۔ یہ ابھی خراب نہیں ہوئی تھیں۔ ان میں ایک لاش کا خون بالکل تازہ تھا۔ یہ وہی آدمی ہو گا جسے اس شخص نے دیکھا تھا کہ گھسیٹ کر اندر لے جا رہے ہیں۔ ان چند ایک لاشوں کے بعد کوئی اور لاش نہ نکالی گئی کیونکہ دانشمند بزرگوں نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ نیچے لاشوں کی حالت بہت ہی بُری معلوم ہوتی ہے، نہ ہی نکالی جائیں تو بہتر ہے ورنہ ان کے پسماندگان

کے دلوں کو بہت ہی صدمہ پہنچے گا۔ چنانچہ اس کنوئیں کو مٹی سے بھر دیا گیا۔ یہ تو بتایا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ اس کنوئیں میں کتنے سو لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔

○

اس دوران باطنیوں نے جن اہم شخصیتوں کو قتل کیا ان کے نام یہ ہیں ــــ امیر اسد ملک شاہی، امیر بخش اور امیر سیاہ پوش۔ یہ تینوں مختلف علاقوں کے امیر تھے اور انہوں نے حسن بن صباح کے خلاف اپنا محاذ قائم کر رکھا تھا۔ امیر سیاہ پوش ہمیشہ کالے رنگ کے کپڑے پہنتا اور دن رات کا زیادہ تر وقت عبادت اور تلاوتِ قرآن میں گذارتا تھا۔ باطنیوں کو قتل تو کیا جا رہا تھا لیکن امیر سیاہ پوش پہلا امیر اور عالم دین تھا جس نے باقاعدہ فتویٰ دیا تھا کہ حسن بن صباح اور اس کے پیروکاروں کا قتل گناہ نہیں بلکہ کارِ ثواب ہے۔

اس کے بعد حسن بن صباح کے حکم سے چند اور شخصیتوں کو قتل کیا گیا۔ ان میں امیر یوسف کے معتمد خاص طغرل بک، امیر ارغش اور ہادی علی گیلانی خاص طور پر شامل ہیں۔ پھر انہوں نے سنترقہ والی دہستان اور سکندر صوفی قروینی کو بھی قتل کر دیا۔

مندرجہ بالا مقتولین میں ایک خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ وہ سلطان ملک شاہ مرحوم کا غلام ہُوا کرتا تھا۔ ملک شاہ نے جب حسن بن صباح اور اس کے فرقے کے خلاف انسدادی مہم شروع کی تھی تو اس غلام نے کسی کے حکم کے بغیر ہی اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بہت سے باطنیوں کو قتل کیا تھا اور ایسے طریقے وضع کئے کہ باطنیوں کے لئے کم از کم مرو میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا۔ سلطان ملک شاہ مرحوم نے دیکھا کہ اس شخص کو اس نے غلام بنا رکھا ہے لیکن اس میں عقل و دانش خصوصی طور پر قابلِ تعریف ہے۔ ملک شاہ نے اسے چھوٹے سے ایک علاقے کا امیر بنا دیا۔ اس نے اپنے علاقے میں کسی باطنی کو زندہ نہ چھوڑا اور اپنا سارا علاقہ ان ابلیسوں سے پاک کر دیا لیکن حسن بن صباح نے اس کے قتل کا خصوصی حکم دیا اور ایک فدائی نے اسے ایک مسجد میں دھوکے میں قتل کر دیا اور خود کشی کر لی۔

اصفہان میں ایک مشہور و معروف عالم دین تھے جن کا نام شیخ مسعود بن محمد خجندی فقیر شافعی تھا۔ اس کے پیروکاروں کا حلقہ بہت دُور دُور تک پھیلا ہُوا تھا۔ اس کا وعظ اور خطبہ سننے کے لئے لوگ اکثر دور دور کا سفر کر کے آیا کرتے تھے۔ اس عالم دین اور فقیر نے جب دیکھا کہ باطنی علماء کو قتل کر رہے ہیں تو اس نے ایک خطبے میں انتقامی وار کا اعلان کر

دیا۔ یہ دوسرا عالم دین تھا جس نے خطبے میں یہ فتویٰ دیا کہ حسن بن صباح اور اس کے پیروکاروں کا قتل ہر مسلمان پر فرض ہے اور اگر کوئی مسلمان اس فرض کی ادائیگی میں پس و پیش کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ابلیس کی جان کا محافظ ہے۔ یہ گناہِ کبیرا ہے۔

اس عالم دین نے یہ انتقامی کارروائی کی کہ شہر کے باہر چار پانچ جگہوں پر کشادہ اور گہرے گڑھے کھدوائے۔ ان سب میں لکڑیاں پھینک کر آگ لگا دی اور یہ آگ ہر وقت جلتی رہتی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں شیخ مسعود نجندی کا احترام بلکہ عقیدت اس قدر زیادہ تھی کہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو لوگ برحق سمجھتے اور اس کے کہے ہوئے ہر لفظ کو حکم کا درجہ دیتے تھے۔ لوگوں نے اپنے کام کاج چھوڑ کر یہ گڑھے کھودے اور لکڑیاں کاٹ کاٹ کر لائے اور ان گڑھوں میں پھینکیں اور آگ لگائی۔

اگلا کام یہ تھا کہ شہر میں مخبر اور جاسوس پھیلا دیئے گئے جو باطنیوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ اصفہان میں باطنی کوئی تھوڑی تعداد میں نہیں تھے۔ ایک مؤرخ نے تو لکھا ہے کہ اصفہان کی "تقریباً" آدھی آبادی باطنیوں کی تھی۔ مسلمانوں کو جہاں پتہ چلتا کہ یہاں باطنی رہتا ہے، وہاں جا ہلّہ بولتے اور باطنی ایک ہاتھ آ جائے، دو آ جائیں یا اس سے زیادہ پکڑے جائیں، ان سب کو گھسیٹتے دھکیلتے آگ کے کسی قریبی گڑھے تک لے جاتے اور انہیں زندہ آگ میں پھینک دیتے۔ شیخ مسعود نجندی نے شہر کا قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس کے حکم سے شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی کیونکہ باطنی بھاگ رہے تھے۔ مسلمانوں نے کسی باطنی کو بھاگنے نہ دیا۔ کوئی بھی بھاگنے کی کوشش کرتا اُسے پکڑ کر آگ میں پھینک دیتے تھے۔ اُس کا بھاگنا ہی ایک ثبوت ہوتا تھا کہ وہ باطنی ہے۔

شیخ مسعود نجندی کو کوئی سرکاری حیثیت حاصل نہیں تھی اس لئے اسے سرکاری طور پر محافظ نہیں دیئے گئے تھے لیکن مرید از خود ہی اس کے محافظ بن گئے تھے۔ مسجد میں جب وہ وعظ کر رہا ہوتا یا امامت، اس کے پیچھے چھ سات آدمی محافظ ہوتے تھے۔

حسن بن صباح نے جب دیکھا کہ اصفہان میں اس کے فرقے اور فدائیوں کا صفایا ہو رہا ہے تو اُس نے حکم دیا کہ عراق کی طرف توجہ دی جائے اور عراق کے دارالخلافہ بغداد کو اپنا مرکز بنانے کی پوری کوشش کی جائے۔ اس حکم میں یہ خاص طور پر شامل تھا کہ وہاں بھی سب سے پہلے علمائے دین کو قتل کیا جائے۔

بغداد میں بھی ایک مشہور عالمِ دین تھا جسے روحانی پیشوا کا درجہ حاصل تھا۔ اس کا نام

امام شیخ الشافعیہ ابُوالفرج رازی رویانیؒ تھا۔ اسے صاحب البحر کا خطاب دیا گیا تھا۔ وہ اپنے نام کے ساتھ صاحب البحر لکھنے کی بجائے اہلِ سنت لکھا کرتا تھا۔ اسے شہرت اور مقبولیت میں شیخ مسعود بن محمد نجندی سے زیادہ اونچی حیثیت حاصل تھی۔ اس کی مریدی اور عقیدتمندی کا حلقہ بھی بہت ہی وسیع تھا۔

اصفہان کی طرح عراق میں بھی مسلمان اس طرح قتل ہونے لگے کہ قاتل کا سراغ نہیں ملتا تھا نہ قتل کی وجہ معلوم ہوتی تھی۔ یہ قتلِ عام نہیں تھا بلکہ اکا دکا مسلمان قتل ہو جاتا یا لاپتہ ہو جاتا تھا۔ یہ خبریں بغداد تک پہنچیں تو فوج کے کچھ دستوں کو مختلف علاقوں میں بھیج دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی سرکاری مخبروں اور جاسوسوں کو حکم دیا گیا کہ وہ قتل کی ان وارداتوں کا سراغ لگائیں۔ اصفہان میں باطنیوں نے جو خون خرابہ کیا تھا، اس کی خبریں بغداد میں بھی پہنچی تھیں۔ آخر وہاں کے حکمران کو یقین کرنا پڑا کہ یہ باطنی ہیں جو مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں۔ یہ خبر بغداد کے مسلمانوں کے گھروں تک پہنچ گئی اور اس طرح لوگ چوکنے ہو گئے۔

امام شیخ الشافعیہ نے جامع مسجد میں اپنے ایک خطبے میں لوگوں سے کہا کہ صرف چوکس اور چوکنا ہو جانا کافی نہیں۔ ان باطنیوں کا سراغ لگاؤ اور جہاں کہیں کوئی باطنی نظر آتا ہے اُسے کسی حکم کے بغیر اور قانون سے ڈرے بغیر قتل کر دو۔ لوگوں کے لئے اپنے امام کے یہ الفاظ ایسے تھے جیسے یہ اللہ کا حکم اُترا ہو۔ انہوں نے باطنیوں کا سراغ لگا کر انہیں قتل کرنا شروع کر دیا۔ امام شیخ الشافعیہ کے چند ایک معتقد اُس کے محافظ بن گئے اور وہ جدھر بھی جاتا، یہ محافظ اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ مسجد میں جب وہ امامت کے لئے کھڑا ہوتا تو اس کے پیچھے اس کے سات آٹھ محافظ کھڑے ہوتے اور پہلی صف کے دوسرے نمازی ان محافظوں کے دائیں بائیں کھڑے ہوتے تھے۔ کسی اور کو اجازت نہیں تھی کہ وہ پہلی صف میں امام کے پیچھے کھڑا ہو کر نماز پڑھے۔

جمعہ کا مبارک دن تھا۔ امام شیخ الشافعیہ نے خطبہ شروع کیا۔ باہر مسجد کے دروازے پر کسی نمازی نے بڑی ہی بلند اور پُرجوش آواز میں اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ تمام نمازیوں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور امام شیخ الشافعیہ نے اپنا خطبہ روک لیا۔ سب نے دیکھا کہ ایک آدمی مسجد میں نعرہ لگا کر داخل ہُوا ہے اور اس کے کپڑوں پر خون لگا ہُوا ہے۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔

"میں امام شیخ الشافیعہ" کے حکم سے ابھی ابھی تین ابلیسوں کو قتل کر کے آرہا ہوں۔" —— وہ نمازیوں کے اوپر سے گزرتا اگلی صف کی طرف بڑھا جا رہا تھا اور کہہ رہا تھا —— "یا امام! گواہ رہنا میں نے آج بہت بڑا ثواب کمایا ہے"۔

"میرے لائقِ عزت بھائیو!" —— اُس نے خنجر والا ہاتھ بلند کر کے نمازیوں سے مخاطب ہو کر کہا —— "میں نے اپنے اللہ کی خوشنودی کے لئے اپنے امام کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ میں تم سب کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرے پانچ چھوٹے بچے ہیں اور ان کی ماں ہے۔ میری زندگی دو چار دن کی رہ گئی ہے کیونکہ باطنی اپنے ساتھیوں کے خون کا بدلہ ضرور لیں گے اور مجھے قتل کر دیں گے۔ میں اپنی بیوی اور اپنے بچوں کو تم سب کے سپرد کرتا ہوں۔ ان کی روزی اور باعزت زندگی کی ذمہ داری تمہیں سونپتا ہوں"۔

نمازیوں نے جزاک اللہ جزاک اللہ کا بڑا ہی بلند وِرد شروع کر دیا اور اس شخص کو خراجِ تحسین پیش کرنے لگے۔ کئی آوازیں اٹھیں کہ تمہارے بچوں کی روزی کے ذمہ دار ہم ہیں۔ امام شیخ الشافیعہ منبر سے اتر آیا اور اس آدمی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔

"ہر ذی روح کی روزی کا ذمہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے" —— امام نے بلند آواز سے کہا —— "یہ ضروری نہیں کہ تم قتل ہو جاؤ گے' اگر ایسا ہو بھی گیا تو اللہ تعالیٰ تمہارے بچوں اور تمہاری بیوی کو اس کا پورا پورا اجر دیں گے.... یہ کپڑے تبدیل کر کے اور غسل کر کے آؤ۔ یہ باطنیوں کا خون ہے جو خنزیر کے خون کی طرح نجس اور ناپاک ہے"۔

ابھی امام شیخ الشافیعہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ اس شخص نے اس کی طرف گھوم کر خنجر امام کے سینے میں اتار دیا اور بڑی تیزی سے دو مرتبہ خنجر امام کے سینے میں مارا۔ امام کے محافظ جو اگلی صف میں بیٹھے تھے بڑی تیزی سے اٹھے۔ امام گر پڑا۔ محافظ اسے سنبھالنے لگے تو قاتل منبر کے اوپر جا کھڑا ہوا اور اپنا خنجر ہوا میں بلند کر کے زور سے نیچے کو کھینچا اور اپنے دل میں اُتار لیا۔

"یا امام شیخ الجبل!" —— اس نے خنجر اپنے سینے سے نکال کر کہا —— "تیرے حکم کی تعمیل کر کے تیری جنت سے اللہ کی جنت میں جا رہا ہوں" —— اُس نے ایک بار پھر خنجر اپنے سینے میں دل کے مقام پر مارا پھر خنجر وہیں رہنے دیا اور ہاتھ آسمان کی طرف کر دیئے۔ وہ منبر سے گرا اور فرش پر آن پڑا۔

امام شیخ الشافیعہ مر چکا تھا کیونکہ خنجر اُس کے دل میں اُتر گیا تھا۔ محافظوں نے خنجروں اور تلواروں سے قاتل کے جسم کا قیمہ کر دیا لیکن وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ اُس کے کپڑوں پر اور خنجر پر کسی انسان کا خون نہیں تھا بلکہ یہ گہرا لال رنگ تھا۔ اس نے ایسا دھوکہ دیا تھا جسے کوئی بھی قبل از وقت سمجھ نہ سکا۔

اصفہان کے حاکم اور لوگ مطمئن ہو گئے تھے کہ انہوں نے اپنے شہر کو باطنیوں سے پاک کر دیا ہے لیکن ایک روز وہاں کے ایک اور عالم دین قاضی ابوالعلاء صاعد بن ابو محمد نیشاپوری جامعہ مسجد میں امامت کرانے کے لئے گئے۔ وہ بھی جمعہ کا مبارک دن تھا اور قاضی ابوالعلاء خطبے کے لئے منبر پر کھڑے ہوئے بالکل ایسے ہی جیسے بغداد میں ہُوا تھا' ایک آدمی نے مسجد میں داخل ہو کر نعرہ لگایا اور کہا کہ وہ چار باطنیوں کو قتل کر کے آیا ہے۔ اُس کے بھی کپڑوں پر خون تھا اور اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔ اُس نے بالکل ویسا ہی ناٹک کھیلا اور قاضی ابوالعلاء تک پہنچ گیا اور نمازیوں سے مخاطب ہو کر ویسے ہی الفاظ کہے جو امام شیخ الشافیعہ کے قاتل نے کہے تھے اور اس کے فوراً بعد قاضی العلاء کے سینے میں خنجر کے تین وار کئے۔ قاتل منبر پر چڑھ گیا اور اس نے خنجر سے خودکُشی کر لی۔

ان تاریخی واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ باطنی تعداد میں بہت ہی زیادہ ہو گئے تھے لیکن بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ان کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی کہ وہ یوں اہم دینی اور معاشرتی شخصیتوں کو قتل کرتے پھرتے' وجہ یہ تھی کہ ان میں حسن بن صباح نے ایسا سفاکانہ جذبہ بھر دیا تھا کہ اس کا ایک فدائی ایک ہجوم میں داخل ہو کر اپنے مطلوبہ شکار کو قتل کر دیتا تھا اور پھر اپنے آپ کو بھی مار لیتا تھا۔

یہ حسن بن صباح کی اُس جنت کا کمال تھا جو اس نے قلعہ اَلموُت میں بنائی تھی۔ پہلے اس جنت کی پوری تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ اس جنت سے جسے نکال کر کسی کے قتل کے لئے بھیجا جاتا اسے یقین دلایا جاتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے جنت میں رہے گا۔ اسے یہ بھی بتا دیا جاتا تھا کہ وہ قتل کر کے اپنے آپ کو قتل کر دے گا لیکن اسے یہ یقین بھی دلایا جاتا تھا کہ وہ اس دنیا کی جنّت سے نکل کر اللہ کی جنّت میں چلا جائے گا جو اس سے کہیں زیادہ حسین ہو گی اور وہاں اُسے جو حُوریں ملیں گی وہ اس جنّت کی حوروں سے بہت زیادہ خوبصورت ہوں گی۔

www.paksociety.com

آج کے سائنسی دور میں اس عمل کو برین واشنگ کہتے ہیں لیکن آج کی سائنس دل و دماغ پر وہ اثرات پیدا نہیں کر سکتی جو حسن بن صباح نے اُس دور میں پیدا کئے تھے۔ یہ ساری کرشمہ سازی حشیش کی تھی۔

پہلے تو تمام امراء اور علماء نے اپنے ساتھ محافظ رکھنے شروع کئے تھے لیکن جب باطنیوں کی قتل و غارت گری بڑھی تو امراء، وزراء اور سالاروں وغیرہ نے کپڑوں کے اندر زرہ پہننی شروع کر دی۔ یہ حفاظتی اقدام ایک ضرورت بن گیا اور پھر اس نے ایک رواج کی صورت اختیار کر لی۔ عام لوگ بھی کپڑوں کے نیچے زرہیں پہننے لگے تاکہ خنجر یا تیر جسم تک نہ پہنچ سکے۔ ہزارہا باطنی قتل کئے جا چکے تھے لیکن مسلمان پہلے کی طرح قتل ہو رہے تھے۔

رے کا شہر بچا ہُوا تھا۔ ایک روز حجاج کا ایک قافلہ رے میں داخل ہُوا۔ وہ لوگ حج کا فریضہ ادا کر کے واپس آ رہے تھے۔ اس میں کئی ملکوں کے حجاج تھے۔ اس قافلے میں ہندوستان کے مسلمان بھی تھے۔ یہ قافلہ یوں لگتا تھا جیسے ماتمی جلوس ہو۔ ان میں بیشتر لوگ آہ و فریاد کر رہے تھے اور بہت سے ایسے تھے جن کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔ اُنہوں نے بتایا کہ رے سے تھوڑی ہی دُور ان کا قافلہ لُوٹ لیا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہُوا کہ قافلے پر حملہ کرنے اور لوٹنے والے باطنی تھے۔ امیر شہر نے اُسی وقت اپنی فوج اُس طرف روانہ کر دی جس طرف سے یہ قافلہ آ رہا تھا لیکن سات آٹھ دنوں بعد فوج واپس آ گئی اور پتہ چلا کہ ڈاکوؤں کا کہیں بھی سراغ نہیں ملا اور جس جگہ قافلے کو لُوٹا گیا تھا وہاں بے شمار لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور ان لاشوں کو جنگل کے درندے اور گِدھ کھا رہے تھے۔

ڈیڑھ دو مہینے گزرے تو ایک اور قافلہ رے میں داخل ہُوا اور پتہ چلا کہ اس قافلے کو بھی باطنیوں نے لُوٹ لیا ہے۔ اس قافلے میں تاجروں کی تعداد زیادہ تھی اور چند ایک کنبے بھی اس قافلے کے ساتھ جا رہے تھے جن میں کم عمر اور جوان لڑکیاں بھی تھیں۔ باطنی انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے...... مسئلہ یہ پیدا ہو جاتا تھا کہ قافلے کے لُٹنے کی اطلاع شہر میں اُس وقت پہنچتی تھی جب لٹیرے اپنا کام کر کے اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتے تھے۔ وہ سب گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے۔

امیرِ شہر نے ان رہزنوں کو پکڑنے کا ایک بندوبست کیا۔ تقریباً ایک مہینے بعد رے

سے خاصی دُور ایک قافلہ جا رہا تھا۔ اس قافلے میں پیدل چلنے والے لوگ بھی تھے اور اونٹوں پر سوار بھی اور گھوڑوں پر بھی کئی لوگ سوار تھے۔ قافلے کے ساتھ گھوڑا گاڑیاں اور بیل گاڑیاں بھی بے شمار تھیں جن پر سامان لدا ہُوا تھا اور اس سامان کے اُوپر ترپال ڈالے ہوئے تھے۔ یہ گاڑیاں خاصی زیادہ تعداد میں تھیں جنہیں دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ یہ تاجروں کا قافلہ ہے اور بے انداز سامان جا رہا ہے۔ یہ تو ایک خزانہ تھا جو جس منڈی میں لے جایا جاتا وہاں سے سونے اور چاندی کے سکّے تھیلیاں بھر بھر کر حاصل کئے جا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اس قافلے میں نوجوان لڑکیاں بھی تھیں جو اونٹوں پر سوار تھیں۔ لٹیروں کے لئے یہ بڑا ہی موٹا شکار تھا۔

قافلے والوں نے چلنے سے پہلے کوئی احتیاط نہیں کی تھی۔ سب سے بڑی احتیاط یہ کی جاتی تھی کہ پتہ ہی نہیں چلنے دیا جاتا تھا کہ قافلہ اگر کسی شہر میں رکا ہے تو وہاں سے کب چلے گا لیکن اس قافلے میں کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے اجنبیوں کو بھی بتا دیا کہ وہ فلاں دن اور فلاں وقت روانہ ہوں گے۔ قافلہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا کچھ اور تاجر اس میں شامل ہوتے گئے اور ان کی بیل گاڑیاں بھی تھیں جو سامان سے لدی ہوئی تھیں۔

قافلہ رے سے سولہ سترہ میل دُور پہنچا۔ وہ اُس علاقے میں داخل ہو گیا تھا جو لٹیروں اور راہزنوں کے لئے نہایت ہی موزوں تھا۔ اس علاقے میں چٹانیں اور کچھ کم بلند پہاڑیاں تھیں جن کے درمیان کشادہ جگہیں تھیں اور اس علاقے میں درختوں کی بہتات تھی۔ قافلے عموماً پہاڑیوں کے درمیان اس خیال سے پڑاؤ کیا کرتے تھے کہ ایسی جگہ محفوظ ہوتی ہے لیکن یہ ان کی کم فہمی تھی۔ قافلے لوٹنے والے ایسی ہی جگہوں کو پسند کیا کرتے تھے۔ وہ دو پہاڑیوں کے درمیان رُکے ہوئے قافلے کو آگے اور پیچھے سے روک لیتے تھے۔ قافلے میں سے کوئی شخص اِدھر اُدھر بھاگ نہیں سکتا تھا پھر ہر ایک آدمی کی تلاشی لے سکتے تھے۔

یہ قافلہ جو تعداد کے لحاظ سے بھی بڑا تھا اور مال و اسباب کے لحاظ سے بھی قیمتی اور پھر اس میں اونٹ اور گھوڑے بھی زیادہ تھے، اس لئے بھی یہ قافلہ قیمتی تھا یہ کیوں نہ لُوٹا جاتا۔ قافلہ جب اس علاقے میں داخل ہوا جو لٹیروں کے لئے موزوں تھا، اُس وقت آدھا دن گزر گیا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ قافلے رات کو اُس وقت لُوٹے جاتے ہیں جب یہ کسی پڑاؤ میں ہوتے ہیں لیکن اس قافلے کے ساتھ یوں ہُوا کہ اچانک سامنے سے بھی اور پیچھے

سے بھی بے انداز گھوڑ سوار نمودار ہوئے اور انہوں نے قافلے کو گھیر لیا۔

لٹیرے جانتے تھے کہ قافلے والے اپنے دفاع میں کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر قافلے کے ہر فرد کے پاس ہتھیار ہوتے تو بھی وہ لوگ لڑنے سے گھبراتے تھے کیونکہ لڑنے کی صورت میں لٹیرے انہیں قتل کر دیتے تھے۔ جان بڑی عزیز ہوتی ہے۔ ہر فرد کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنا سب کچھ لٹیروں کے حوالے کر دے اور اپنی اور اپنے بچوں کی جانیں اور اپنی عورتوں کی عزتیں بچا لے۔

"اگر اپنی جانیں بچانا چاہتے ہو تو غور سے سن لو" —— لٹیروں کی طرف سے اعلان ہوا —— "اپنے مال و اسباب کو اور اپنے جانوروں کو چھوڑ کر تمام لوگ ایک طرف ہٹ جاؤ اور تم لوگوں کے پاس جتنی رقم، سونا اور چاندی ہے، وہ ایک جگہ ڈھیر کر دو۔ اگر ہماری بات نہیں مانو گے تو تمہاری لاشیں یہاں پڑی ہوئی ہوں گی"۔

قافلے والوں نے اس حکم کی تعمیل کی اور وہ دو حصوں میں تقسیم ہو کر الگ الگ کھڑے ہو گئے۔ لٹیروں نے انہیں اور پیچھے ہٹا دیا۔ وہ اتنے پیچھے ہٹ گئے کہ پہاڑیوں کے دامن میں جا پہنچے.... آدھے اِدھر اور آدھے اُدھر۔ لٹیرے جو سب کے سب گھوڑ سوار تھے مال و اسباب اکٹھا کرنے کے لئے آگے آ گئے۔ ان کی تعداد قافلے کی تعداد کے تقریباً" نصف تھی۔

لٹیرے گھوڑوں سے اترے اور بیل گاڑیوں اور گھوڑا گاڑیوں کے اوپر سے ترپال اتار کر دیکھنے لگے کہ یہ کیا مال ہے۔ ان میں سے چند ایک اُس طرف چل پڑے جہاں قافلے کی نوجوان لڑکیاں سکتے کے عالم میں کھڑی تھیں اور وہ اپنے آدمیوں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

جوں ہی لٹیروں نے ترپال اٹھانے شروع کئے، ترپالوں کے نیچے سے بہت سے آدمی نکلے اور وہ لٹیروں پر ٹوٹ پڑے۔ لٹیروں نے اپنی تلواریں اور خنجر وغیرہ نہیں نکالے تھے۔ وہ تو بہت خوش تھے کہ تلواروں کے بغیر ہی اتنا قیمتی مال انہیں مل گیا تھا لیکن جو آدمی ترپالوں کے نیچے سے نکلے وہ تلواروں اور برچھیوں سے مسلح تھے۔ انہوں نے لیٹروں کا قتلِ عام شروع کر دیا اور انہیں ہتھیار نکالنے کی مہلت ہی نہ دی۔

قافلے کے گرد لوگوں کو الگ کھڑا کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے بھی تلواریں نکال لیں اور لٹیروں پر حملہ کر دیا۔ لٹیروں کے لئے اب فرار کے سوا کوئی راستہ نہ تھا لیکن قافلے والے انہیں اس راستے پر جانے ہی نہیں دے رہے تھے۔

قافلہ لوٹنے والوں کو معلوم نہ تھا کہ یہ کوئی قافلہ نہیں تھا بلکہ یہ رے کی فوج ہے اور اس کے ساتھ کوئی سامان نہیں۔ قافلے میں لڑکیاں تو لٹیروں کے لئے کشش پیدا کرنے کی خاطر شامل کی گئی تھیں۔ یہ قافلہ جہاں سے چلا تھا وہاں اسی مقصد کے لئے ہر کسی کو بتایا گیا تھا کہ قافلہ فلاں وقت یہاں سے چلے گا اور پڑاؤ فلاں جگہ ہو گا۔ یہ دراصل لٹیروں تک پیغام پہنچانے کا طریقہ تھا۔

تھوڑی سی دیر میں رے کے ان فوجیوں نے جو مختلف لباسوں میں آئے تھے، لٹیروں کو کاٹ کر پھینک دیا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہ نکل سکا۔ فوجیوں نے ان کے گھوڑے پکڑ لئے اور ساتھ لے آئے۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ یہ لٹیرے تمام کے تمام باطنی تھے۔ پتہ اس طرح چلا کہ ان میں جو زخمی تھے ان میں بہت سے ایسے نکلے جو موت سے ڈر گئے تھے۔ وہ منتیں کرتے تھے کہ انہیں جان سے مار دیا جائے یا اٹھا کر اپنے ساتھ لے جائیں اور ان کے زخموں کی مرہم پٹی کریں اور وہ آئندہ اس کام سے توبہ کر لیں گے۔ فوجیوں نے ان زخمیوں سے کہا کہ وہ اتنا بتا دیں کہ وہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ انہوں نے بتا دیا کہ وہ باطنی ہیں اور حسن بن صباح کے حکم سے قافلے لوٹتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ قافلوں سے جو مال اور جو رقم وغیرہ لوٹی جاتی ہے وہ سب قلعہ الموت پہنچا دی جاتی ہے۔

حاکم رے نے حکم دیا تھا کہ ان لٹیروں میں سے دو تین زخمیوں کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ ان سے وہ حسن بن صباح کے کچھ راز معلوم کرنا چاہتا تھا۔ ان فوجیوں نے تین زخمیوں کی عارضی مرہم پٹی کر دی اور ایک گھوڑا گاڑی میں ڈال کر انہیں رے لے گئے۔ انہیں ایک کمرے میں لٹا دیا گیا اور طبیب کو بلایا گیا۔ امیرِ رے بھی وہاں پہنچ گیا۔

"اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہمیں ہر بات سچ سچ بتا دو" —— امیرِ رے نے ان زخمیوں سے کہا —— "اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز نہیں تو میں تمہیں بہت ہی بُری موت ماروں گا۔ تمہارے زخموں پر نمک چھڑکا جائے گا اور تم تڑپ تڑپ کر مرو گے"۔

تینوں نے کہا کہ وہ سب کچھ بتا دیں گے، ان کے زخموں کا کچھ علاج کیا جائے..... وہ بہت بُری طرح زخمی تھے اور نیم غشی کی حالت میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں دو نوجوان تھے اور ایک ادھیڑ عمر تھا۔ حاکمِ رے نے طبیب سے کہا کہ ان کی مرہم پٹی ایسی

طرح کی جائے کہ جیسے یہ شاہی خاندان کے افراد ہوں۔ طبیب نے اُسی وقت مرہم پٹی شروع کر دی۔

"اے امیرِ شہر!" ——— ادھیڑ عمر آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا ——— "میں آپ کو سارے راز دے دوں گا۔ میں جانتا ہوں ہمیں زندہ نہیں چھوڑا جائے گا لیکن میں پھر بھی ہر بات صحیح اور سچ بتاؤں گا۔ ہمیں موت سے نہ ڈرا اے امیر اور زندگی کا لالچ نہ دے۔ میں ہر بات بتاؤں گا اور اس سے پہلے میں یہ بتا دیتا ہوں کہ جو طوفان قلعہ اَلموت سے اٹھا ہے اسے آپ کی فوج اور اسے سلطان کی فوج اور اسے سلطنتِ سلجوقیہ کی ساری فوج نہیں روک سکتی"۔

امیرِ رے نے دیکھا کہ یہ زخمی بے ہوش نہیں اور اتنا زیادہ زخمی ہونے کے باوجود ٹھیک ٹھاک بول رہا ہے تو اس نے سوچا کہ اس سے ابھی پوچھ لیا جائے جو پوچھنا ہے۔ طبیب نے اپنے دو تین شاگردوں کو بھی بلوا لیا اور وہ جب آئے تو انہیں کہا گیا کہ وہ ان نوجوان زخمیوں کے زخم صاف کر کے مرہم پٹی کر دیں۔ امیرِ رے کے اشارے پر ادھیڑ عمر آدمی کو ایک اور کمرے میں لے گئے اور طبیب نے اس کے تمام کپڑے اتروا کر مرہم پٹی شروع کر دی۔ امیرِ رے بھی ان کے ساتھ تھا۔ امیرِ رے نے اسے کہا کہ حسن بن صباح کی یہ تنظیم کس طرح چلتی ہے کہ اتنے دور بیٹھا ہوا وہ اتنے بڑے علاقے میں باطنیوں کو اپنی مرضی کے مطابق حرکت میں لا رہا ہے اور فدائی اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔

"امیرِ شہر!" ——— ادھیڑ عمر زخمی باطنی نے کہا ——— "آپ خدا سے ڈرتے ہیں لیکن حکم ابلیس کا مانتے ہیں۔ میں آپ کی بات نہیں کر رہا۔ میں ہر انسان کی بات کر رہا ہوں۔ آپ زاہد اور پارسا ہو سکتے ہیں لیکن ہر انسان ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ نہیں سمجھ سکتے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟.... صرف اس لئے کہ خدا میں عام لوگ وہ کشش نہیں دیکھتے جو ابلیس میں ہے۔ آپ مجھے ابلیس کا پجاری کہہ لیں۔ شیخ الجبل حسن بن صباح کہتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کو وعدوں پر ٹالتا ہے۔ وہ جنت کا وعدہ کرتا ہے لیکن اس کے لئے مرنا ضروری ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ساری عمر نیکیوں اور ثواب کے کاموں میں گزارو گے تو جنت ملے گی لیکن ہمارا شیخ الجبل حسن بن صباح کہتا ہے کہ وہ ہے جنت، جاؤ اس میں داخل ہو جاؤ۔ میں اس جنت میں رہ چکا ہوں۔ شیخ الجبل وعدے نہیں کرتا، وہ دیتا ہے۔ اُسے آپ ابلیس کہتے ہیں، ہم اُسے امام کہتے ہیں"۔

اس باطنی نے پُراعتماد لہجے میں حسن بن صباح اور اس کی تنظیم اور اس کے طریقہ کار کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ قلعہ اَلموت کے اندر کیا ہے، کتنی فوج ہے اور اس کے حفاظتی انتظامات کیا ہیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ قافلوں کو لوٹنے والے باطنی الگ ہیں جن کا صرف یہی کام ہے۔ وہ جو کچھ لوٹتے ہیں قلعہ اَلموت چلا جاتا ہے۔ اس طرح اس شخص نے ہر ایک بات بتا دی۔

"اور میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں امیرِ شہر!" ——— اُس نے کہا ——— "میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ آپ شیخ الجبل کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ سلطان برکیارق کے ایک سالار اوریزی نے قلعہ وسم کوہ کو محاصرے میں لے رکھا ہے۔ چھ مہینے ہو چکے ہیں۔ ابھی تک وہ قلعے کی دیواروں تک نہیں پہنچ سکا۔ اُس نے پہنچنے کی کوشش کی تو اپنے بہت سے سپاہیوں کو مروا کر پیچھے ہٹ آیا۔ اس کا محاصرہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ اگر ہو بھی گیا تو شیخ الجبل کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا"۔

"کیا شیخ الجبل نے وسم کوہ کا محاصرہ توڑنے اور پسپا کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا؟" ——— امیرِ رے نے پوچھا۔

"میں صحیح جواب نہیں دے سکوں گا" ——— باطنی نے کہا ——— "اگر چھ مہینے گزر جانے کے باوجود شیخ الجبل نے قلعہ وسم کوہ کو بچانے کے لئے کوئی انتظام نہیں کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے معلوم ہے کہ سلجوقی سالار یہ قلعہ نہیں لے سکے گا۔ میں اپنے امام شیخ الجبل کے ساتھ رہا ہوں۔ میں اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اس نے قلعہ وسم کوہ کو نظرانداز نہیں کیا بلکہ اسے پوری امید ہے کہ سلجوقی سالار اپنا ہر ایک سپاہی مروا کر خود ہی وہاں سے مایوس اور ناکام ہو کر واپس آ جائے گا"۔

طبیب اس باطنی کی مرہم پٹی کرتا رہا، وہ بولتا رہا اور امیرِ رے سنتا رہا۔ مرہم پٹی ہو چکی تو امیرِ رے اور طبیب باہر نکل آئے۔ کچھ دور آ کر امیرِ رے رک گیا اور طبیب سے پوچھا کہ اس باطنی نے جو باتیں کی ہیں، ان کے متعلق اس کا کیا خیال ہے؟

"امیرِ محترم!" ——— بوڑھے طبیب نے جواب دیا ——— "عمر گزر گئی ہے مریضوں اور زخمیوں کا علاج کرتے۔ آپ اس کی باتوں کے متعلق میری رائے پوچھ رہے ہیں اور آپ نے سنا، اس پر بھی حیران ہو رہے ہیں کہ اس نے اس قسم کی باتیں کس قدر پُراعتماد اور بے تکلف لہجے میں کی ہیں لیکن میں حیران ہو رہا ہوں کہ اتنا زیادہ خون نکل چکا ہے کہ

...ہیں زندہ نہیں رہنا چاہئے تھا لیکن یہ زندہ ہے اور اس کا دماغ اس کے جسم سے زیادہ زندہ ہے.... اسے کہتے ہیں جذبہ اور عقیدہ۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا جذبہ بھی ابلیسی اور عقیدہ بھی ابلیسی ہے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ ہے حسن بن صباح کی اصل قوت۔ اس شخص کو موت کا کوئی غم نہیں اور زندہ رہنے کا لالچ بھی نہیں ہے۔ یہ مرے گا تو حسن بن صباح زندہ باد کا نعرہ لگا کر مرے گا۔ اس وقت ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں بھی ایسا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو حسن بن صباح کا یہ فرقہ بھی ختم ہو سکتا ہے۔ دینِ اسلام کو اسی جذبے سے اور ایسے ہی عقیدے کی شدت سے زندہ رکھا جا سکتا ہے"۔

امیرِ شہر نے طبیب کو رخصت کر دیا اور اپنے محافظ دستے کے کماندار کو بلا کر کہا کہ ان تینوں باطنیوں کو قتل کر کے ان کی لاشیں دُور لے جا کر ایک ہی گڑھے میں دفن کر دی جائیں۔

○

سالار اوریزی کو قلعہ وسم کوہ کا محاصرہ کئے چھ مہینے گزر گئے تھے۔ قلعے کا دفاع اتنا مضبوط تھا کہ قلعہ سر ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ سالار اوریزی اپنے ساتھ غیر معمولی طور پر دلیر جانبازوں کا لشکر لے کر گیا تھا۔ ان جانبازوں کا ایک گروہ قلعے کا دروازہ توڑنے کے لئے دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ انہوں نے ہتھوڑوں اور کلہاڑوں سے دروازے پر ضربیں لگائیں لیکن اوپر سے باطنیوں نے ان پر جلتی ہوئی لکڑیاں اور انگارے پھینکے۔ چند ایک جانبازوں کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ وہ پیچھے کو بھاگے۔ اوپر سے باطنیوں نے ان پر تیروں کا مینہ برسا دیا اور شاید ہی اس گروہ میں سے کوئی جانباز زندہ واپس آیا ہو گا۔

ایسی قربانی ایک بار نہیں متعدد بار دی گئی۔ جانباز کسی اور دروازے تک پہنچے لیکن زندہ واپس نہ آ سکے۔ سالار اوریزی نے سرنگ کھودنے کی بھی سوچی لیکن یہ کام آسان نہیں تھا۔ پھر بھی اُس نے سرنگ کھدوانی شروع کر دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سرنگ دیوار کے نیچے سے قلعے کے اندر تک چلی بھی گئی تو سارے کا سارا لشکر ایک ہی بار اس سرنگ کے ذریعے قلعے تک نہیں پہنچایا جا سکے گا۔ تین، تین چار چار جانباز سرنگ میں سے اندر جائیں گے اور باطنی جس جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے ہیں، انہیں ختم کرتے چلے جائیں گے لیکن سالار اوریزی کا خیال تھا کہ یہ قربانی تو دینی ہی پڑے گی۔

سالار اوریزی کو اب خطرہ اور بھی نظر آ رہا تھا۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مَرو سے روانگی سے پہلے یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ سالار اوریزی اپنے لشکر کو قلعہ ملاذ خان پر قبضہ کرنے کے لئے لے جا رہا ہے۔ اُسے توقع یہ تھی کہ حسن بن صباح قلعہ ملاذ خان کے دفاع کو مضبوط کرنے میں لگ جائے گا اور اتنی دیر میں وہ قلعہ وسم کوہ کو سر کر لے گا لیکن وہاں تو آدھا سال گزر گیا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ حسن بن صباح کو پتہ چلے گا کہ اسے دھوکا دیا گیا ہے اور اصل میں قلعہ وسم کوہ کو محاصرے میں لیا گیا ہے تو وہ اپنا ایک لشکر محاصرے پر حملہ کرنے کے لئے بھیج دے گا۔ اس خطرے کے پیشِ نظر سالار اوریزی کی نظر پیچھے بھی رہتی تھی۔ اُسے ہر روز یہ توقع ہوتی تھی کہ آج باطنیوں کا لشکر عقب سے ضرور ہی نمودار ہو کر ہلہ بول دے گا لیکن ہر روز کا سورج غروب ہو جاتا تھا اور سالار اوریزی اور زیادہ پریشان ہو جاتا کہ رات کو حملہ آئے گا۔ اسی میں چھ مہینے گزر گئے تھے۔

حسن بن صباح کو ایک مہینے کے اندر اندر پتہ چل گیا تھا کہ اسے دھوکا دیا گیا ہے۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اسے پتہ ہی نہ چلتا، اس کے جاسوس ہر طرف اور ہر جگہ موجود تھے لیکن حسن بن صباح کو جب یہ اطلاع دی گئی کہ یہ مشہور کر کے کہ قلعہ ملاذ خان کو محاصرے میں لینے کی بجائے سالار اوریزی کا لشکر قلعہ وسم کوہ کو محاصرے میں لے چکا ہے تو حسن بن صباح کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"ان سلجوقیوں کی عقل جواب دے گئی ہے" —— حسن بن صباح نے کہا تھا —— "انہوں نے ہمیں یہ دھوکا اس امید پر دیا ہو گا کہ وہ قلعہ وسم کوہ پر چند دنوں میں قبضہ کر لیں گے۔ قلعہ وسم کوہ کو محاصرے میں لیا جا سکتا ہے لیکن سلجوقی لشکر کا کوئی ایک سپاہی بھی اس قلعے کے اندر داخل نہیں ہو سکے گا.... انہیں زور آزمائی کرنے دو"۔

"یا امام!" —— اس کے جنگی مشیر نے کہا تھا —— "کیا ہم یوں نہ کریں کہ ان کے محاصرے پر حملہ کر دیں؟"

"ابھی نہیں" —— حسن بن صباح نے کہا تھا —— "انہیں اپنی طاقت وہیں زائل کر لینے دو۔ ہم جب دیکھیں گے کہ اب ان کا دم خم ٹوٹ گیا ہے اور ان کا آدھا لشکر وسم کوہ کے تیر اندازوں کا نشانہ بن چکا ہے تو ہم حملے کی سوچیں گے۔ انہیں اپنا دل خوش کر لینے دو"۔

الموت بھیج دیتے ہیں۔ ظاہری طور پر تو میں ان لوگوں کو سزا دینے کے لئے آیا ہوں لیکن میرا اپنا ایک منصوبہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ قلعہ میرے ہاتھ آجائے تو میں اسے اپنا ایک مضبوط اڈہ یا ٹھکانہ بنالوں گا۔ یہاں سے میں باطنیوں کے خلاف مہم شروع کروں گا لیکن اس قلعے کے اندر قافلے لوٹنے والے ڈاکو ہیں جو لڑنا اور مرنا جانتے ہیں۔ ان کے پاس تیروں کا ذخیرہ ختم ہی نہیں ہو رہا اور ان کے پاس پھینکنے والی برچھیاں بھی ہیں جو شاید کچھ اور عرصہ ختم نہیں ہوں گی۔ میں تقریباً" آدھا لشکر مروا چکا ہوں لیکن قلعہ ہاتھ آتا نظر نہیں آتا۔ مجھے خطرہ یہ نظر آ رہا ہے کہ کسی بھی روز میرے اس محاصرے پر عقب سے حملہ ہو جائے گا۔ میں پورا مقابلہ کروں گا لیکن میرا اور میرے لشکر کا بچ نکلنا ممکن نظر نہیں آتا"۔

"پیچھے سے حملہ ہو جائے گا؟" —— مزمّل آفندی نے پوچھا۔

"ہاں مزمّل بھائی!" —— سالار اوریزی نے جواب دیا —— "میں حیران ہوں کہ اب تک حسن بن صباح نے یہ کارروائی کیوں نہیں کی۔ اگر میں اُس کی جگہ ہوتا تو فوراً" محاصرے کو مزید فوج بھیج کر محاصرے میں لے لیتا۔ محاصرہ کرنے والے لشکر کو محاصرے میں لے لیا جائے تو اس لشکر کا بچ نکلنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے"۔

مزمل آفندی گہری سوچ میں کھو گیا تھا۔ اُس نے سالار اوریزی کے ساتھ کچھ باتیں کیں اور بن یونس کو ساتھ لے کر واپس چل پڑا۔

○

ایک برطانوی تاریخ نویس کے مطابق' پندرہ سولہ دن گزرے ہوں گے کہ سالار اوریزی نے گھوڑوں کے ٹاپ سنے۔ اُس نے پیچھے دیکھا تو ایک گھوڑ سوار لشکر سرپٹ چلا آ رہا تھا۔ سالار اوریزی جو خطرہ محسوس کر رہا تھا وہ آگیا تھا۔ اُس نے فوری طور پر اپنے لشکر کو جو قلعے کا محاصرہ کئے ہوئے تھا' محاصرے سے ہٹا کر ایک جگہ اکٹھا کر لیا اور پھر اسے ایک جنگی ترتیب دے لی۔ عقب سے یا باہر سے حملے کی صورت میں اپنے لشکر کو اس طرح اکٹھا کرنا ضروری تھا ورنہ محاصرے میں لشکر بندہ بندہ ہو کر بکھرا رہتا۔

جب گھوڑ سوار لشکر قریب آیا تو دیکھا کہ آگے آگے دو سواروں کے ہاتھوں میں حسن بن صباح کے پرچم تھے۔ سوار نعرے بھی باطنی فرقے کے لگا رہے تھے۔ سالار اوریزی نے اپنے لشکر کو قلعے سے اور پیچھے ہٹا لیا اور دیکھنے لگا کہ لڑنے کے لئے زمین کون

کا موڑنا ہے۔ وہ قلعے سے زیادہ دُور نہیں ہٹا۔ بڑی پھرتی سے اس نے اپنے بچے کھچے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا۔ دو کو آگے رکھا اور ایک حصے کو ان دونوں کے پیچھے بھیج دیا۔ اب اس کا لشکر مقابلے کے لئے تیار تھا۔

گھوڑ سوار لشکر قلعے کے ایک اور پہلو کی طرف چلا گیا اور رُک کر بڑی پھرتی سے جنگی ترتیب میں آگیا۔ اس لشکر سے اعلان ہونے لگے کہ قلعے کے تمام لوگ باہر آجائیں اور ان مسلمانوں کو گھیرے میں لے کر کاٹ دیں۔

باہر سے آنے والا سوار لشکر حرکت میں آیا اور سالار اوریزی کے ایک پہلو میں اس انداز سے آگیا جیسے سالار اوریزی کے لشکر کو گھیرے میں لینا چاہتا ہو۔ گھوڑ سواروں نے برچھیاں بلند کر لی تھیں اور پھر انہوں نے برچھیوں کی انیاں آگے کر لیں اور اب انہوں نے ہلّہ بولنا تھا۔

قلعے کے دروازے کھل گئے اور اندر کا لشکر اس طرح باہر آنے لگا جیسے سیلابی دریا نے بند توڑ ڈالا ہو۔ وہ لشکر سالار اوریزی کے لشکر کے دوسرے پہلو کی طرف چلا گیا۔ اب کوئی شک نہ رہا کہ سالار اوریزی کے لشکر کو باطنیوں نے گھیرے میں لے لیا تھا۔

سالار اوریزی نے ایک حکم دیا۔ یہ حکم سنتے ہی اس کا لشکر آگے کو دوڑ پڑا اور اس کا ایک حصہ قلعے کے کھلے ہوئے دروازوں کے اندر چلا گیا اور اندر سے دروازے بند کر لئے۔ باقی دو حصے اس لشکر کی طرف آئے جو اندر سے نکلا تھا۔ باہر سے جو گھوڑ سوار لشکر آیا تھا اُس نے یہ حرکت کی کہ قلعے کے اندر سے آنے والے لشکر پر ہلّہ بول دیا۔ دوسرے پہلو سے سالار اوریزی نے ہلّہ بولا۔

اب یہ صورت بن گئی کہ اندر سے نکلنے والا باطنی لشکر گھوڑ سواروں اور سالار اوریزی کے لشکروں کے نرغے میں آگیا تھا۔ اندر سے آنے والے لشکری حیران و پریشان تھے کہ یہ کیا بنی۔ وہ تو سمجھ رہے تھے کہ حسن بن صباح نے ان کے لئے مدد بھیجی ہے اور اب محاصرہ کرنے والوں میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہیں رہے گا مگر ہُوا یہ کہ وہ خود کٹنے لگے اور گھوڑوں کے قدموں تلے روندے جانے لگے۔

سالار اوریزی کے لشکر کا جو حصہ قلعے کے اندر چلا گیا تھا' اس نے قلعے کے اندر والے لوگوں کا قتلِ عام شروع کر دیا تھا۔ پھر دروازے کھل گئے اور سالار اوریزی کے لشکر کے باقی دونوں حصے اور باہر سے آنے والے گھوڑ سوار جنہوں نے حسن بن صباح

کے پرچم اٹھا رکھے تھے قلعے کے اندر چلے گئے اور اللہ اکبر کے نعرے بلند ہونے لگے۔ گھوڑ سواروں نے اندر جا کر حسن بن صباح کے پرچم پھاڑے اور پھر جلا ڈالے۔ قلعہ وسم کوہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا تھا۔

یہ کامیابی ایک دھوکے سے حاصل کی گئی تھی۔ دھوکا یہ تھا کہ مزمّل آفندی نے سالار اوریزی سے پوچھا تھا" کیا پیچھے سے حملہ آسکتا ہے اور اوریزی نے کہا تھا کہ کسی دن بھی پیچھے سے حملہ ہو جائے گا۔ مزمل آفندی کے دماغ میں ایک منصوبہ آگیا تھا۔ اس نے سالار اوریزی کے ساتھ بات کی اور یہ منصوبہ طے ہو گیا۔

مزمّل آفندی بن یونس کو ساتھ لے کر مرو چلا گیا تھا۔ وہاں اس نے سلطان برکیارق کے ساتھ بات کی اور اسے دو ہزار گھوڑ سوار دے دیئے گئے اور ان کا کمانڈر ایک سالار بھی ساتھ دیا۔ اسی رات اس گھوڑ لشکر نے مرو سے کوچ کیا اور بڑی ہی تیزی رفتاری سے جا کر اگلی رات تک قلعہ وسم کوہ کے قریب پہنچ گئے۔ وہ وہیں رُکے اور رات وہیں گذاری۔

صبح طلوع ہوئی تو مرو کے ان دو ہزار سواروں نے قلعہ وسم کوہ کا رخ کیا اور اس انداز سے پیشقدمی کی جیسے وہ پیچھے سے محاصرے پر حملہ کریں گے۔ انہوں نے حسن بن صباح کے پرچم خود ہی تیار کر لئے تھے۔ قلعے کے اندر کے لشکر نے جب دیوار کے اوپر سے دیکھا تو انہوں نے حسن بن صباح کے نعرے لگائے۔ قدرتی طور پر وہ سمجھے کہ حسن بن صباح نے یہ گھوڑ سوار لشکر بھیجا ہے۔ پھر گھوڑ سوار لشکر سے اعلان ہوئے کہ اندر کے لوگ باہر آجائیں اور مسلمانوں کو کچل دیں۔

جونہی یہ اعلان ہُوا اندر کے تمام لوگ جو لڑنے والے تھے باہر آگئے۔ سالار اوریزی نے اپنے لشکر کا ایک حصہ قلعے کے اندر بھیج دیا اور پھر بیان ہو چکا ہے کہ گھوڑ سواروں نے اور سالار اوریزی کے لشکر نے اندر کے لشکر کو کس طرح گھیرے میں لیا اور اس کے کسی ایک آدمی کو بھی زندہ نہ رہنے دیا۔

"سالارِ محترم!" — فتح کی پہلی رات مزمّل آفندی نے سالار اوریزی سے کہا — "اگر حسن بن صباح کو شکست دینی ہے تو دھوکے سے ہی دی جا سکتی ہے.... وہ شخص سراپا دھوکا اور فریب ہے۔ اس کے لئے ہمیں بھی فریب کار بننا پڑے گا.... اللہ آپ کو فتح مبارک کرے"۔

○

سالار اوریزی کو یہ فتح بہت مہنگی پڑی تھی۔ تمام مؤرخ متفقہ طور پر لکھتے ہیں کہ وسم کوہ کا محاصرہ آٹھ مہینے اور کچھ دن رہا تھا۔ اس عرصے میں سالار اوریزی کا آدھا لشکر کٹ گیا تھا۔ اگر محاصرین کو دھوکے میں نہ مارا جاتا تو محاصرہ ابھی اور طول پکڑ سکتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قلعے کے اندر خوراک اور دیگر ضروریات کا ذخیرہ اتنا زیادہ تھا کہ قلعے کے اندر کے لوگ محاصرے سے ذرا بھی پریشان نہیں ہوئے تھے۔

داستان گو یہ نہیں بتا رہا کہ فلاں اور فلاں واقعہ کے درمیان کتنا لمبا وقفہ تھا۔ حسن بن صباح کا دورِ مقبولیت اور اس کی ابلیسیت کی تاریخ کہیں کہیں تاریکی میں چلی جاتی ہے جیسے ریل گاڑی چلتے چلتے کسی تاریک سرنگ میں داخل ہو جاتی ہے اور جب یہ تاریخ روشنی میں آتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ بے شمار سال گزر گئے ہیں۔ وسم کوہ کا قلعہ جس وقت فتح ہوا' اس وقت حسن بن صباح بڑھاپے میں داخل ہو چکا تھا۔ اسے جنہوں نے دیکھا تھا اور اس کے متعلق سینہ بہ سینہ جو باتیں سامنے آئیں' ان سے پتہ چلتا ہے کہ حسن بن صباح خاصا بوڑھا ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنی صحت کو ایسا برقرار رکھا تھا کہ لگتا نہیں تھا کہ اس شخص کی جوانی کو گزرے ایک مدت گزر گئی ہے۔

اوریزی نے اپنے لشکر کو قتل عام کا جو حکم دیا تھا وہ اُن شہریوں کے لئے نہیں تھا جو لڑنے میں شامل نہیں تھے۔ قلعے کے اندر سالار اوریزی کے لشکر کا جم کر مقابلہ کرنے والے شہریوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی۔ مسلمان لشکر کو یہ اجازت نہیں تھی کہ اندھا دھند قتل کرتے چلے جائیں۔ لوگ گھروں میں دبک گئے تھے اور لڑنے والے شہری بھی گھروں میں جا چھپے تھے۔ انہیں پکڑنا ضروری تھا لیکن ان کے لئے یہ طریقہ اختیار نہ کیا گیا کہ ہر کسی کو گھسیٹ کر باہر لے آتے اور اس کی گردن مار دیتے۔ سالار اوریزی نے وہ روایت برقرار رکھی جو مسلمانوں کا طرۂ امتیاز چلا آرہا تھا۔ وہ روایت تھی مفتوح علاقے کے لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا اور ان کی عزت اور جان و مال کا تحفظ کرنا اور پھر عملاً انہیں یہ یقین دلانا کہ انہیں غلام نہیں بنایا جائے گا۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ وسم کوہ کے اندر تمام لوگ حسن بن صباح کے پیروکار تھے۔ دوسرے شہروں میں مسلمانوں نے باطنیوں کا قتل عام کیا تھا لیکن اس قلعے کی صورت مختلف تھی۔ وہ یوں کہ ان لوگوں کو بڑے لمبے مقابلے کے بعد شکست دی گئی تھی اور وہ مفتوحین کہلاتے تھے۔ وہ اب فاتح لشکر کے رحم و کرم پر تھے

قلعے کے دروازوں پر اپنے سنتری کھڑے کر دیئے گئے اور انہیں کہا گیا کہ کسی کو باہر نہ جانے دیں اور جو کوئی اندر آتا ہے اسے آنے دیں۔ سالار اوریزی نے رات گزرنے کا انتظار نہ کیا اور حکم دیا کہ گھر گھر کی تلاشی لی جائے اور تمام مردوں کو باہر لایا جائے لیکن کسی عورت پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ اس حکم پر سالار اوریزی کے لشکری گھروں میں داخل ہو گئے اور کونوں کھدروں کی تلاشی لے کر مردوں کو باہر لانے لگے۔ چودہ پندرہ سال کے بچے سے لے کر بوڑھوں تک کو باہر لایا جا رہا تھا۔ مشعلیں اتنی زیادہ جلائی گئی تھیں کہ قلعے میں جیسے رات آئی ہی نہیں تھی۔ ان تمام آدمیوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ عورتوں کی چیخ و پکار اور آہ و بکا اور ان کا واویلا اتنا بلند اور اتنا زیادہ تھا کہ آسمان کے پردے چاک ہو رہے تھے۔ لشکری کسی آدمی کو اس کے گھر سے باہر لاتے تو عورتیں اس لشکری کے قدموں میں گر پڑتیں یا اسے پکڑ لیتیں اور رو رو کر اسے کہتیں کہ ان کا آدمی بے قصور ہے اور وہ نہیں لڑا۔ ان عورتوں کو یہ ڈر تھا کہ آدمیوں کو باہر لے جا کر قتل کر دیا جائے گا۔ لشکری ان عورتوں کو تسلیاں دیتے تھے کہ ان آدمیوں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ ان آدمیوں میں ایسے بھی تھے جن کے کپڑوں پر خون لگا ہوا تھا اور ان کی تلواریں بھی خون آلود تھیں۔ یہ ثبوت تھا کہ وہ لڑنے کے بعد گھروں میں چھپ گئے تھے۔ ایسے آدمیوں کو الگ کھڑا کیا جا رہا تھا۔

قلعے کے اندر کا ماحول بڑا ہی بھیانک اور ہولناک تھا۔ لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور خون اتنا کہ چلنا محال تھا۔ خون سے پاؤں پھسلتے تھے۔ ان لاشوں میں ایسے زخمی بھی تھے جو اٹھنے کے قابل نہیں تھے۔ وہ بڑا ہی کربناک واویلا بپا کر رہے تھے اور پانی پانی کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ سالار اوریزی نے اپنے لشکر کے ایک حصے کو اس کام پر لگا دیا تھا کہ اپنے زخمیوں کو اٹھا کر اس جگہ پہنچائیں جہاں مرہم پٹی کا انتظام تھا اور اپنے شہیدوں کی لاشیں ایک جگہ رکھ دیں۔ سالار اوریزی نے یہ بھی کہا تھا کہ کسی باطنی زخمی کو پانی نہیں پلانا۔ قلعے کے اندر سب ہی باطنی تھے اور ان کا قصور صرف یہ نہ تھا کہ انہوں نے سالار اوریزی کے لشکر کا مقابلہ کیا تھا بلکہ ان کا اصل جرم یہ تھا کہ وہ ایک لمبے عرصے سے قافلوں کو لوٹ رہے تھے، کوئی قافلے والا مزاحمت کرتا تو اسے یہ لوگ قتل کر دیتے تھے اور ان کی جوان بیٹیوں کو اپنے ساتھ لے آتے تھے۔ انہیں جینے کا حق نہیں دیا جا سکتا تھا۔

جب ان لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جا رہا تھا تو عورتیں چیختی چلاتی اور بعض سینہ کوبی کرتی وہاں پہنچ گئیں اور سالار اوریزی کو گھیر لیا۔ وہ سب یہی کہہ رہی تھیں کہ ان کے آدمی بے گناہ ہیں۔ سالار اوریزی نے آگے ہو کر ان آدمیوں سے کہا کہ ان میں جو لٹیرے اور ڈاکو ہیں اور جنہوں نے قافلے لوٹے ہیں، وہ خود ہی آگے آ جائیں۔ ان میں ایسے آدمی تو صاف پہچانے جا رہے تھے جن کی تلواریں خون آلود اور جن کے کپڑوں پر بھی خون کے چھینٹے تھے۔ انہیں آگے کر لیا گیا اور چند ایک اور آدمی آگے آ گئے۔ سالار اوریزی نے ایک بار پھر کہا کہ خود ہی آگے آ جاؤ ورنہ جب انہیں شناخت کرایا جائے گا تو ان کی جان بخشی نہیں کی جائے گی۔

عورتوں نے جب سالار اوریزی کا یہ حکم سنا اور دیکھا کہ کئی ڈاکو اور راہزن آگے نہیں آ رہے تو وہ ان لوگوں کے درمیان چلی گئیں اور ایک ایک کو پکڑ کر آگے دھکیلنے لگیں۔ وہ تو جانتی تھیں کہ ان میں اصل مجرم کون کون ہیں۔ ان کا لشکر اور ان کے دوسرے ساتھی قلعے کے باہر کاٹ دیئے گئے تھے۔ ان میں سے اگر کچھ نکل بھاگے ہوں گے تو ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہوگی۔

بعض باطنیوں کو قلعے کے بُرجوں میں سے نکال نکال کر لایا جا رہا تھا۔ وہ وہاں چھپے ہوئے تھے۔

مزمل آفندی اور بن یونس بھی سالار اوریزی کے ساتھ تھے۔ وہ دونوں تو بہت ہی مسرور تھے۔ ان کی چال سو فیصد کامیاب رہی تھی۔

"میرے بھائیو!" —— سالار اوریزی نے انہیں کہا —— "میں قلعہ اَلمُوت سے آنے والی ہواؤں میں یہ خطرہ اب بھی سونگھ رہا ہوں کہ حسن بن صباح ہم پر حملہ ضرور کرے گا۔ اسے یہ اطلاع تو مل ہی جائے گی کہ قلعہ وسم کوہ اس کے ہاتھ سے نکل کر ہمارے ہاتھ میں آ گیا ہے"۔

"اس کی پیش بندی کر لینی چاہیئے" —— مزمل نے کہا —— "اگر آپ چاہیں تو میں صبح ہی مرو کو روانہ ہو جاؤں گا اور وہاں سے کمک لے آؤں گا"۔

"میں مرو سے مزید فوج نہیں منگوانا چاہتا" —— سالار اوریزی نے کہا —— "مرو میں فوج کم ہوئی تو وہ شہر بھی خطرے میں آ سکتا ہے۔ ہم یوں کریں گے کہ صبح اپنے سوار لشکر کو قلعے کے باہر مقیم کر دیں گے تاکہ اچانک حملہ آ جائے تو وہ محاصرے تک نوبت ہی

نہ آنے دے"۔

○

قلعہ وسم کوہ وسیع و عریض تھا۔ اس میں غیرفوجی آبادی بھی خاصی زیادہ تھی۔ ایک کشادہ میدان تھا جس میں لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لایا جا رہا تھا اور ان کی شناخت ہو رہی تھی۔ سالار اوریزی کی فوج کا ایک عہدیدار تھا جس کا نام شمیر ابلک تھا۔ تاریخ میں اس کا یہ نام تو آیا ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا تھا۔ نام سے ظاہر ہے کہ وہ سلجوقی یعنی تُرک نسل سے تھا۔ اُس کا دادا اُن سلجوقیوں میں سے تھا جنہوں نے سلطنت سلجوقیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کے ساتھ چار سپاہی تھے اور وہ دیوار پر جا کر قلعے کے بُرجوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو سپاہیوں کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ وہ دو بُرجوں میں سے تین چار باطنیوں کو پکڑ کر نیچے بھیج چکا تھا۔

قلعے کے بڑے دروازے کے اوپر ایک اور کمرہ نما بُرج بنا ہوا تھا جو اونچا بھی تھا اور لمبا چوڑا بھی۔ شمیر ابلک اپنے سپاہیوں کے ساتھ اس بُرج میں داخل ہُوا تو اس نے دیکھا کہ اس کے اندر سیڑھیاں تھیں جو اس بُرج کی اوپر والی منزل کو جاتی تھیں۔ وہ جب سیڑھیاں چڑھنے لگا تو اس کے ایک سپاہی نے سیڑھیوں کے پیچھے دیکھا۔ وہاں کچھ سامان اور بستر وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ اس سپاہی کو یوں شک ہُوا تھا جیسے اُس نے ان اشیاء کے انبار کے پیچھے دو چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھی ہوں۔ سپاہی سیڑھیوں پر جانے کی بجائے سیڑھیوں کے پیچھے جھک کر دیکھنے لگا۔ وہاں واقعی ایک آدمی تھا جو چھپا ہُوا تھا۔ سپاہی کے کہنے پر وہ باہر نکل آیا۔ اُس کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے تھے لیکن اس کے ہاتھ میں تلوار نہیں تھی۔ سپاہی نے اسے کہا کہ اپنی تلوار لے کر آؤ ورنہ اسے زندہ جلا دیا جائے گا۔ وہ پھر سیڑھیوں کے پیچھے گیا اور اشیاء کے انبار کے نیچے سے تلوار اٹھا کر لے آیا۔ تلوار خون آلود تھی۔ اُس نے تلوار فرش پر پھینک دی۔

شمیر ابلک آدھی سیڑھی چڑھ چکا تھا۔ وہ وہیں سے نیچے اُتر آیا۔ یہ آدمی شمیر ابلک کی ہی عمر کا تھا اور بڑا صحت مند تھا۔ اس کے چہرے پر کرخت سے تاثرات تھے اور یوں لگتا تھا جیسے وہ جلّاد ہو۔

"تم بے گناہ نہیں ہو سکتے" — شمیر ابلک نے اسے کہا — "تمہارا چہرہ بتا رہا ہے

کہ تم ڈاکو اور راہزن ہو اور نہ جانے کتنے لوگوں کو اب تک قتل کر چکے ہو گے.... تمہاری تلوار بتا رہی ہے کہ تم آج ہمارے خلاف لڑتے تھے.... چلو نیچے!"

"ہاں، میں ڈاکو ہوں" — اُس نے کہا — "اور میں حسن بن صباح کا پیروکار بھی ہوں۔ میں لڑا بھی ہوں اور تمہارے تین آدمی قتل کئے ہیں.... انتقام لے لو۔ میں قتل ہونے کے لئے تیار ہوں۔ میں جانتا تھا کہ میرا انجام یہی ہو گا لیکن ایک بات سُن لو، مجھے قتل کرو گے تو اپنا نقصان کرو گے اور اگر زندہ رہنے دو گے تو تمہیں اتنا خزانہ ملے گا کہ ایک قلعہ خرید سکو گے"۔

"زندہ رہنے کی اب کوئی ترکیب کامیاب نہیں ہو گی اے باطنی!" — شمیر ابلک نے کہا — "حسن بن صباح تمہیں چھڑانے نہیں آئے گا۔ تم جس خزانے کی بات کر رہے ہو، وہ ہمیں مل گیا ہے۔ اُس تہہ خانے کی نشاندہی ہو چکی ہے جس میں اس قلعے کا خزانہ رکھا ہُوا ہے"۔

"میں جانتا ہوں میرا امام شیخ الجبل مجھے چھڑانے نہیں آئے گا" — اُس نے کہا — "مجھے یقین ہے کہ میں تمہارے ہاتھوں قتل ہوں گا لیکن ایک بات سن لو۔ میں اُس خزانے کی بات نہیں کر رہا جو یہاں تہہ خانے میں پڑا ہے۔ وہ خزانہ جو میں بتا رہا ہوں، یہاں سے دُور پڑا ہے اور میرے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تم لے لو.... کیا تم ان سپاہیوں سے ذرا الگ ہو کر میری بات سننا پسند کرو گے؟.... اچھی طرح دیکھ لو، میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں نہ میں تمہیں کوئی دھوکا دوں گا اور میں دھوکا دے ہی کیا سکتا ہوں۔ تم پانچ مسلح آدمی ہو اور میں اکیلا اور نہتّہ ہوں"۔

معلوم ہوتا ہے اس شخص کی زبان میں کوئی خاص تاثر تھا یا اس سلجوقی عہدیدار کی شخصیت کمزور تھی کہ اس نے اس ڈاکو کا اثر قبول کر لیا اور اس کی بات سننے پر رضامند ہو گیا۔ اُس نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ وہ بُرج سے نکل کر دروازے کے ساتھ ہی کھڑے رہیں۔ سپاہی نکل گئے تو سلجوقی نے اس ڈاکو کو اپنے پاس بٹھا لیا لیکن بٹھانے سے پہلے اس نے اس ڈاکو کی جامہ تلاشی لے لی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ باطنی کس طرح قاتلانہ وار کیا کرتے ہیں۔

"میں شاہی ہوں" — ڈاکو نے کہا — "میرا نام ابو جندل ہے۔ میں اپنے ساتھ ایک ذمہ داری لئے پھرتا ہوں۔ وہ میری دو یتیم بھتیجیاں ہیں۔ دونوں جوان ہیں اور بہت

ہی خوبصورت۔ مجھے میرے ساتھیوں نے مشورے دیئے تھے اور اب بھی کہتے رہتے ہیں کہ میں ان دونوں کو اپنے امام حسن بن صباح کو پیش کر دوں تو وہ مجھے اپنے ہاں بڑا اونچا رُتبہ دے دے گا.... میرے سلجوقی دوست! میں نے دوسروں کی بیٹیاں اغوا کر کے امام کو بھیجی ہیں لیکن جب اپنی ان بھتیجیوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنا مرا ہُوا بھائی یاد آ جاتا ہے۔ میں انہیں چُھپا چُھپا کر رکھتا ہوں"۔

"میں مسلمان ہوں" — شمیر ابلک نے کہا — "میں خوبصورت لڑکیوں کے لالچ میں نہیں آؤں گا نہ ہمیں اجازت ہے کہ کسی عورت کو اپنی مرضی سے اپنے پاس رکھ لیں"۔

"یہ میں جانتا ہوں" — ابو جندل نے کہا — "مجھے معلوم ہے کہ تم ان لڑکیوں کو اپنے سالار کے حوالے کر دو گے اور وہ چاہے گا تو خود ان کے ساتھ نکاح پڑھا لے گا یا اپنے دو لشکریوں کے ساتھ ان کی شادیاں کر دے گا لیکن کیا یہ اچھا نہیں ہو گا کہ ان دونوں کو تم اپنے پاس رکھ لو؟ ایک کو بیوی اور دوسری کو داشتہ بنا لو۔ میں نے جس خزانے کا اشارہ دیا تھا وہ انہی لڑکیوں کی خاطر ہے۔ مجھے تو قتل ہونا ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ ان لڑکیوں کو خالی ہاتھ اس دنیا میں چھوڑ جاؤں"۔

"کیا تم میری بات نہیں سمجھے؟" — شمیر ابلک نے کہا — "میں اپنی مرضی سے کسی عورت کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ اگر تم ان دونوں لڑکیوں کو میرے حوالے کرو گے تو مجھے یہ لڑکیاں چھوڑنی پڑیں گی یا اپنی فوج چھوڑنی پڑے گی"۔

"کیا ملتا ہے تمہیں اس فوج میں؟" — ابو جندل نے کہا — "اور کیا ملا ہے تمہیں مسلمان ہو کر!.... تم سمجھتے ہو کہ تم نے اپنی عاقبت سنوار لی ہے لیکن میں تمہاری دنیا بھی سنوار دوں گا.... پہلے میری پوری بات سن لو پھر انکار یا اقرار کرنا"۔

"وہ خزانہ تم خود کیوں نہیں لے لیتے؟" — شمیر ابلک نے پوچھا۔

"یہ میری زندگی کی آخری رات ہے" — ابو جندل نے جواب دیا — "صبح تک میں قتل ہو چکا ہوں گا۔ اگر تم مجھے قتل ہونے سے بچا لو گے تو بھی میں اکیلا اس خزانے تک نہیں پہنچ سکوں گا۔ میرے تمام ساتھی مارے جا چکے ہیں۔ مجھے کم از کم چار آدمیوں کی ضرورت ہے۔ وہ خزانہ یہاں قلعے کے کہیں قریب نہیں ہے۔ تم میرا ساتھ دو گے اور چار پانچ سپاہی رازداری سے ساتھ لے آؤ گے تو ہم اس خزانے تک پہنچ کر وہاں سے

نکال لیں گے"۔

"اور وہاں لے جا کر تم مجھے اور میرے سپاہیوں کو بڑی آسانی سے قتل کر سکو گے" — شمیر ابلک نے کہا — "اور اگر میں وہ خزانہ تمہارے ساتھ مل کر نکال بھی لوں تو کیا میں واپس اپنی فوج میں آ سکوں گا؟"

"پھر فوج میں واپس آنا ہی نہیں" — ابو جندل نے پُراعتماد لہجے میں کہا — "ہم دونوں ملک ہندوستان یا دیارِ حجاز یا مصر کو چلے جائیں گے اور وہاں شاہانہ زندگی بسر کریں گے.... پہلے میرے گھر چلو اور میری بھتیجیوں کو دیکھ لو۔ مجھ سے ڈرو نہیں، میں تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔ مجھے باطنی اور ڈاکو سمجھ کر قتل کر دو۔ قتل سے پہلے میں تمہیں اُس جگہ کا راستہ اور نقشہ اچھی طرح سمجھا دوں گا لیکن تم میرے بغیر وہاں تک پہنچ نہیں سکو گے"۔

"وہ خزانہ آیا کہاں سے ہے؟" — شمیر ابلک نے پوچھا — "اور وہ اُس جگہ کیوں رکھا ہے جہاں تم بتا رہے ہو؟"

"آج میں ہر بات سچی اور کھری کر رہا ہوں" — ابو جندل نے کہا — "میں پیشہ ور ڈاکو اور راہزن ہوں۔ یہ میرا آبائی پیشہ ہے۔ میرے باپ کا بھی یہی کام تھا اور دادا کا بھی اور شاید دادے کا دادا بھی یہی کام کرتا ہو گا۔ اس علاقے میں حسن بن صباح کا عقیدہ پھیل گیا اور اس کے اپنے ڈاکو قافلوں کو لوٹنے لگے تو میں مجبور ہو کر اس کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ اب ہم لوگ الگ تھلگ قافلوں کو نہیں لُوٹ سکتے تھے۔ ہمیں حسن بن صباح کی پشت پناہی اور مدد حاصل ہے۔ میں نے حسن بن صباح کے پاس جا کر اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اُس کا مُرید ہو گیا لیکن آج تک مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ ہم جتنا مال لُوٹتے تھے وہ سارے کا سارا قلعہ اَلمُوت بھیجنا ہوتا تھا۔ اس میں سے ہمیں تھوڑا سا حصہ مل جاتا تھا۔ میں نے اپنے پرانے گروہ کے آدمیوں سے کہا کہ لُوٹ مار ہم کریں اور خطرے میں ہم اپنے آپ کو ڈالیں اور مال سارا دوسرے لے جائیں تو کیوں نہ ہم یہ کام ہی چھوڑ دیں یا اپنے امام کو دھوکا دیں اور آدھے سے زیادہ مال خود رکھا کریں....

"میرا پرانا گروہ بھی امام کے گروہ کے ساتھ مل گیا تھا۔ میں نے اپنے ان پرانے ساتھیوں کے ساتھ یہ بات کی تو انہیں میری بات اچھی لگی۔ ہم نے یوں کرنا شروع کر دیا کہ کسی قافلے کو لُوٹتے تھے تو لُوٹ مار کے دوران میرے گروہ کے دو تین آدمی سونا

چاندی اور نقدی اپنے پاس چھپا کر وہاں سے کھسک جاتے اور بہت دُور نکل جاتے تھے۔ یہ مال وہ کہیں زمین میں دبا دیتے تھے۔ کچھ دنوں میں اپنے کچھ آدمیوں کو ساتھ لے کر وہاں جاتا اور مال نکال کر اُس جگہ پر پہنچا دیتا تھا جو میں نے تمہیں بتائی ہے۔ ہم لوگ ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دیا کرتے۔ آج تک میرے کسی آدمی نے یوں نہیں کیا کہ یہاں سے غائب ہو جاتا اور اُس جگہ سے خزانہ نکال لے جاتا۔ یہ ہے حقیقت اس خزانے کی"۔

"یہ تو مان لیا" —— شمیر ابلک نے کہا —— "لیکن میں تم پر اعتبار کس طرح کروں؟ .... تم باطنی ہو اور باطنی پر بھروسہ کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ انسان قتل ہو جاتا ہے"۔

"میرے بھائی!" —— ابو جندل نے کہا —— "میرا کوئی مذہب نہیں نہ کوئی عقیدہ ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ حسن بن صباح ہماری پشت پناہی کرتا تھا اور پناہ بھی دیتا تھا.... اب ایک کھری سی بات سن لو۔ تم مسلمان ہو اور اس امید پر کوئی بُرا کام نہیں کرنا چاہتے کہ مر جاؤ گے تو خدا تمہیں جنّت میں داخل کر دے گا۔ خدا نے آسمانوں میں جنّت بنائی ہے لیکن ساری عمر نیک پاک رہو گے تو تم اس جنت کے حقدار بن سکو گے۔ اس کا کیا اعتبار کہ خدا کی جنّت کا وجود ہے کہ نہیں۔ تم یہ دعویٰ کر ہی نہیں سکتے کہ تم نے کبھی گناہ نہیں کیا۔ انسان نادانستہ طور پر بھی گناہ کر گزرتا ہے۔ حسن بن صباح نے زمین پر جنّت بنا دی ہے۔ میں نے یہ جنّت دیکھی ہے لیکن اس میں جانے کی کبھی خواہش نہیں کی۔ کیوں نہ ہم اپنی جنّت خود بنا لیں۔ ہم بنا بھی سکتے ہیں۔ وہ خزانہ ایسا ہے جو ہماری تین نسلیں عیش کرتی رہیں تو بھی ختم نہ ہوگا"۔

شمیر ابلک کو چُپ سی لگ گئی اور اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف پتہ لگتا تھا کہ وہ قائل ہو گیا ہے اور گہری سوچ میں چلا گیا ہے۔

"میرے سلجوقی دوست!" —— ابو جندل نے کہا —— "میں تمہیں ایک اور بات بھی بتا دیتا ہوں۔ خوش نہ ہو کہ تم نے قلعہ فتح کر لیا ہے۔ امام شیخ الجبل کا لشکر آ ہی رہا ہوگا۔ اس لشکر میں وہ فدائی ضرور ہوں گے جو شیخ الجبل کے نام پر جانیں قربان کرنے پر فخر کیا کرتے ہیں۔ تمہارے لشکر میں کوئی ایک آدمی بھی زندہ نہیں رہے گا۔ اس قلعے میں خزانہ بھرا ہوا ہے جو تمہیں معلوم ہو گیا ہے کہ تہ خانے میں ہے لیکن تمہیں یہاں

سوائے موت کے کچھ نہیں ملے گا۔ یہ سارا خزانہ اگر یہاں سے مرو چلا بھی گیا تو تمہیں کیا ملے گا؟.... کچھ بھی نہیں.... یہ سلطان کی ملکیّت ہو گا۔ میرے گھر چلو، تم دیکھو گے کہ میری دو بھتیجیوں کے سوا وہاں کوئی بھی نہیں۔ ویسے بھی ہمیں گھر جانا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری بھتیجیوں کو تمہارے دوسرے لشکری لے جائیں اور سالار کے حوالے کر دیں۔ تم جب ان لڑکیوں کو اپنے سالار کی ملکیّت میں دیکھو گے تو پچھتاؤ گے کہ تم نے پہلے انہیں کیوں نہ دیکھ لیا اور کیوں نہ انہیں غائب کر دیا"۔

"ہاں!" —— شمیر ابلک نے کہا —— "ہمیں چلنا چاہئے۔ میرے سپاہی یہ نہ سوچیں کہ معلوم نہیں ہم آپس میں کیا ساز باز کر رہے ہیں۔ تم یہیں بیٹھو، میں ان کے ساتھ بات کر لوں"۔

شمیر ابلک ابو جندل کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر باہر نکلا اور اس نے اپنے چاروں سپاہیوں کے ساتھ یہ ساری بات کی جو اس کے ساتھ ابو جندل نے کی تھی۔ وہ خود ذمہ دار عہدیدار تھا لیکن قائل ہو گیا تھا، یہ تو سپاہی تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کا عہدیدار خزانے اور دو لڑکیوں کے چکر میں آ گیا ہے تو اس کا ساتھ دینا ہی بہتر ہے۔

"کیا آپ نے یقین کر لیا ہے کہ یہ شخص ہمیں دھوکا نہیں دے گا؟" —— ایک سپاہی نے پوچھا۔

"یہ اکیلا ہے اور ہم پانچ ہیں" —— شمیر ابلک نے کہا —— "اور ہم نے اسے نہتّہ کر دیا ہے.... میرا ساتھ دو اور اس بات کو راز میں رکھنا"۔

شمیر ابلک بُرج میں گیا اور ابو جندل کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ شمیر ابلک نے اسے کہا کہ وہ ایسے راستے سے اپنے گھر کو چلے کہ انہیں کوئی دیکھ نہ سکے۔ ابو جندل اس قلعے کی بھول بھلیّوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ انہیں قلعے کی دیوار کے ایسے حصے میں لے گیا جہاں کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ ابو جندل انہیں ادھر سے اُتار کر ایک اندھیرے راستے سے اپنے گھر لے گیا۔

اُس نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے بار بار دستک دی تو بھی اندر خاموشی رہی۔ وہ سمجھ گیا کہ لڑکیاں ڈر کے مارے دروازہ نہیں کھول رہیں۔ آخر اس نے بلند آواز سے لڑکیوں کو پکارا تب دروازہ کھلا۔

ابو جندل نے اندر جاتے ہی کہا کہ گھبرائیں نہیں' یہ اپنے دوست ہیں۔

شمیر ابلک نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ وہ صحن میں ہی رہیں اور خود وہ ابو جندل کے ساتھ ایک کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں فانوس جل رہا تھا۔ ابو جندل نے دونوں لڑکیوں کو بلایا۔ شمیر ابلک نے لڑکیوں کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ تو بالکل جوان اور بہت ہی خوبصورت لڑکیاں تھیں۔

"دیکھو لڑکیو!" ——— ابو جندل نے لڑکیوں سے کہا ——— "یہ مسلمان فوج کے کماندار ہیں۔ انہوں نے میری جان بخشی کر دی ہے اور تمہاری ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی ہے"۔

دونوں لڑکیاں شمیر ابلک کی طرف لپکیں اور اپنے بازو اس کے گلے میں ڈال دیئے اور ایک اس کے ایک طرف اور دوسری دوسری طرف بیٹھ گئی اور اپنے گال اس کے گالوں سے ملنے لگیں جیسے وہ ان کے خون کے رشتے کا کوئی عزیز ہو۔ ان لڑکیوں نے ایسے والہانہ پن کا عملی طور پر اظہار کیا کہ شمیر ابلک تو جیسے چپ تا ئز ہو گیا ہو۔

باہر کا دروازہ بڑی زور سے کھلا اور کسی کی آواز آئی ——— "کہاں ہے ابو جندل.... باہر آ جاؤ باطنی ڈاکو" ——— دو آدمی بڑی تیز تیز چلتے اس کمرے میں آ گئے جہاں شمیر ابلک ابو جندل کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ ان آدمیوں کے آنے سے پہلے ہی شمیر ابلک اٹھ کھڑا ہوا تھا اور لڑکیاں دوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ ان آدمیوں نے شمیر ابلک کو دیکھا تو ٹھٹھک کر پیچھے ہٹ گئے۔ وہ اس کے اپنے لشکر کے دو لشکری تھے۔

"میں اس گھر کی تلاشی لے چکا ہوں" ——— شمیر ابلک نے کہا ——— "میرے ساتھ چار لشکری ہیں۔ یہاں کوئی باطنی نہیں نہ کوئی ڈاکو ہے۔ یہ شخص تاجر ہے اور چند دنوں بعد یہاں سے چلا جائے گا.... تم لوگ جاؤ۔ میں ذرا اور تسلی کر کے آؤں گا"۔

لشکریوں نے دیکھا کہ ان کا ایک عہدیدار پہلے ہی یہاں موجود ہے تو وہ اس کو سلام کر کے چلے گئے۔

"اب بتاؤ ابو جندل!" ——— شمیر ابلک نے پوچھا ——— "وہ جگہ کہاں ہے؟"

ابو جندل نے اسے بتانا شروع کر دیا کہ وہ جگہ کتنی دور ہے اور وہاں تک ہم کس طرح پہنچیں گے اور وہ علاقہ کیسا ہے وغیرہ وغیرہ۔

"یہ دونوں لڑکیاں ہمارے ساتھ ہوں گی" ——— ابو جندل نے کہا ——— "ہم سب

گھوڑوں پر سوار ہوں گے۔ دو گھوڑے فالتو ساتھ ہونے چاہئیں۔ دو بڑے وزنی بکس ہیں ایک ایک ان گھوڑوں پر لاد لیں گے اور کچھ سامان ہم اپنے اپنے گھوڑوں پر رکھ لیں گے"۔

"ہمیں ایک دو دنوں میں ہی نکل جانا چاہئے" ——— شمیر ابلک نے کہا ——— "دو تین دن اور باہر سے لاشیں اٹھانے اور انہیں ٹھکانے لگانے کا کام ہوتا رہے گا۔ یہاں سے نکل جانے کے لئے یہ موقع اچھا ہے"۔

ابو جندل نے کہا کہ دو فالتو گھوڑوں کا انتظام وہ کر لے گا اور راستے کی خوراک کا بندوبست بھی وہی کرے گا۔ اس کے پاس گھوڑوں کی کمی نہیں تھی۔ شمیر ابلک اپنے چاروں سپاہیوں کو ساتھ لے کر وہاں سے چلا گیا۔ اس نے سپاہیوں کو بھی تیار کر لیا تھا۔ انہوں نے تیار تو ہونا ہی تھا کیونکہ شمیر ابلک نے انہیں اچھا خاصا حصہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔

○

سلطنت سلجوقیہ کے دارالحکومت مرو میں سالار اوریزی کی کامیابی کی دعائیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں لیکن سلطان کے محل میں مایوسی بھی پیدا ہونے لگی تھی۔ محاصرے کو آٹھ مہینے گزر چلے تھے اور وسم کوہ سے اموات کی جو اطلاعیں آ رہی تھیں' وہ حوصلہ شکن تھیں۔ آخر مزمل اور بن یونس دو ہزار گھوڑ سوار لے کر ایک خاص منصوبے کے تحت گئے تو مایوسی میں کمی آنے لگی لیکن ابھی تک وسم کوہ سے کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ سلطان برکیارق اور اس کے دونوں بھائی محمد اور سنجر صبح اٹھتے تو سب سے پہلے یہ پوچھتے کہ وسم کوہ سے کوئی قاصد آیا ہے یا نہیں۔ آخر ایک روز قاصد آ گیا اور وہ بازو لہرا لہرا کر اعلان کرتا چلا آ رہا تھا کہ وسم کوہ کا قلعہ فتح کر لیا گیا ہے اور باطنیوں کا نام و نشان مٹ گیا ہے۔

سلطان تک خبر نہیں پہنچی تھی کہ یہ جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ شہر میں جشن کا سا سماں پیدا ہو گیا اور جب یہ خبر سلطان کے محل میں پہنچی تو وہاں بھی خوشیاں ناچنے لگیں۔ شمونہ اور اس کی ماں میمونہ بھی دوڑی دوڑی سلطان برکیارق تک گئیں۔ سلطان کے محل میں شمونہ کو خصوصی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

"میں وہاں خود جاؤں گا" ——— سلطان برکیارق نے کہا ——— "ان مجاہدین کو خراج

تحسین پیش کرنے کے لئے میں خود وہاں جاؤں گا۔ یہ فتح کوئی معمولی فتح نہیں"۔

"میں بھی ساتھ جاؤں گی سلطان محترم!" ——— شمونہ جو پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی' بولی ——— "میں حسن بن صباح کے پیروکاروں کی لاشیں اور ان کی ہڈیاں دیکھنا چاہتی ہوں"۔

شمونہ دراصل مزمل آفندی کے لئے پریشان تھی۔ مزمل اور شمونہ نے عہد کر رکھا تھا کہ پہلے حسن بن صباح کا بیڑہ غرق کریں گے اور اس کے بعد شادی کریں گے۔ مزمل نے ایک فتح حاصل کرلی تھی۔ سلطان برکیارق نے شمونہ کو اجازت دے دی کہ وہ اس کے ساتھ جاسکتی ہے۔

جس وقت سالار اوریزی کا لشکر اور وہ گھوڑ سوار لشکر جسے مزمل آفندی لے کر گیا تھا' وسم کوہ کے باہر باطنیوں کو گھیرے میں لے چکے تو ایسی گھمسان کی لڑائی ہوئی کہ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا' اس قیامت خیزی میں تین باطنی لڑائی سے نکل گئے۔ تینوں زخمی تھے۔ انہوں نے قلعہ اَلمُوت کا رخ کرلیا۔ وہ حسن بن صباح کو بتانا چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ کیا ہُوا ہے۔

حسن بن صباح تو جیسے قلعہ وسم کوہ کو بھول ہی گیا تھا۔ وہ کبھی پوچھ لیتا تھا کہ وسم کوہ کا محاصرہ ٹوٹا کہ نہیں۔ اُسے ہر بار اچھی خبر سنائی جاتی تھی کہ محاصرہ ٹوٹا بھی نہیں اور کامیاب بھی نہیں ہُوا اور مسلمانوں کے لشکر کا جانی نقصان مسلسل ہوتا چلا جا رہا ہے۔

"یہ محاصرہ کامیاب نہیں ہو گا" ——— حسن بن صباح ہر بار یہی کہتا تھا۔

ایک دن یہ تینوں زخمی قلعہ المُوت پہنچ گئے اور انہیں فوراً" حسن بن صباح کے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ انہوں نے کہا' یا امام! ہم دھوکے میں مارے گئے ہیں۔ انہوں نے تفصیل سے سنایا کہ ان کے ساتھ کیا دھوکا ہُوا ہے اور وہ سلجوقی فوج کی گھوڑ سوار کمک کو اپنی فوج سمجھ بیٹھے تھے اور سلجوقیوں کی باتوں میں آ گئے۔

"یا شیخ الجبل!" ——— ایک مشیر نے کہا ——— "اگر ہم پہلے ہی محاصرے پر حملہ کر دیتے تو آج یہ خبر نہ سننا پڑتی۔ اب بھی کچھ نہیں گیا' ہمیں اسی وقت کوچ کر جانا چاہئے اور ہم قلعہ چھڑوالیں گے"۔

"میں اپنی طاقت ضائع نہیں کروں گا" ——— حسن بن صباح نے مسکراتے ہوئے کہا ——— "ہمارے پاس ایسی فوج ہے ہی نہیں جس سے ہم حملہ کریں۔ نہ میں ایسی فوج بناؤں گا۔ ہمارا ہر آدمی لڑ سکتا ہے لیکن ہم فوج کی طرح نہیں لڑیں گے۔ ہمارے ہر

فدائی کے پاس ایک خنجر یا ایک چُھری ہونی چاہئے۔ اس سے زیادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس ابھی چودہ قلعے ہیں۔ یہ کافی ہیں۔ سلجوقی سالار نے مجھے بھی دھوکا دیا تھا کہ وہ قلعہ ملاذ خان کی طرف پیشقدمی کر رہا ہے لیکن میں نے توجہ نہیں دی اور نہ کبھی توجہ دوں گا"۔

"تو کیا ہم اس نقصان کو برداشت کرلیں یا امام؟" ——— ایک اور مشیر نے پوچھا۔

"ضروری نہیں کہ ہم ایک قلعے کے بدلے قلعہ ہی لیں گے" ——— حسن بن صباح نے کہا ——— "ہم اس قلعے کی پوری قیمت سلجوقیوں سے وصول کرلیں گے اور وسم کوہ میں ہمارا جو مال و دولت گیا ہے' وہ بھی ہم پورا کرلیں گے.... اب میری بات غور سے سن لو اور اسی وقت اس پر عمل شروع ہو جائے.... اب اپنے گروہ رے اور شاہ در والی شاہراہ پر بھیج دو۔ وسم کوہ کی قیمت مسلمان قافلوں سے وصول کرو اور وہ جس خزانے پر قابض ہو گئے ہیں اس سے دگنا خزانہ ان سے پورا کرو۔ ان شہروں کے اندر کسی امیر کبیر تاجر یا جاگیردار کے گھر ڈاکہ ڈالنا پڑے تو یہ کام بھی کر گزرو۔ مسلمانوں کی قتل و غارت اور تیز کر دو"۔

حسن بن صباح کے دماغ کو اس کے وہ مشیر اور مصاحب بھی نہیں سمجھ سکتے تھے جو ہر وقت اُس کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ بڑ نہیں ہانکا کرتا تھا اور کوئی بات غصے کی حالت میں بلاسوچے سمجھے زبان پر نہیں لاتا تھا۔ اس کی فطرت میں سوائے ابلیسیت کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے صحیح فیصلے پر پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ اس کی فطرت اس کے دماغ کی رہنمائی کرتی تھی۔

اس نے رے اور شاہ در کے اردگرد کے علاقوں کو رہزنی' لُوٹ مار اور قتل و غارت کے لئے اس لئے منتخب کیا تھا کہ رے تو مسلمانوں کی اکثریت کا شہر تھا اور اس شہر کا الگ حاکم یا امیر تھا۔ شاہ در کی اہمیت یہ تھی کہ اس شہر میں تقریباً" آدھی آبادی مسلمانوں کی تھی اور یہ مسلمان باطنیوں سے باہم متصادم رہتے تھے۔ اس کے علاوہ شاہ در میں اس کا استاد احمد بن غطاش رہتا تھا اور حسن بن صباح نے سفلی عمل اور ابلیسیت کی تربیت یہیں سے حاصل کی تھی اور اس کی امامت کا سفر یہیں سے شروع ہُوا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سلجوقی سلطان کی نظر شاہ در پر لگی رہتی ہے اور کسی بھی روز شاہ در پر سلجوقی حملہ کر دیں گے۔

ابو جندل پیشہ ور ڈاکو تھا اور اس کا اثر و رسوخ چلتا تھا۔ اس کے گروہ کا کوئی ایک بھی آدمی زندہ نہیں رہا تھا لیکن وہ پھر بھی انتظامات کر لیتا تھا۔ وسم کوہ کی جو صورتِ حال بنی ہوئی تھی' اس میں انتظامات کر لینا کوئی مشکل نہیں تھا۔ وہاں اندر اور باہر لاشیں ہی لاشیں تھیں اور ان لاشوں میں ابھی تک زخمی بے ہوش پڑے تھے جنہیں مرا ہُوا سمجھا جا رہا تھا۔ شہر کی عورتیں اور بچے ان لاشوں کو پہچانتے پھر رہے تھے۔ سلجوقی فوج کے آدمی بھی اپنے سالار کے حکم کے مطابق ان لاشوں میں مسلمانوں کی لاشیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لا رہے تھے۔

سورج غروب ہونے ہی والا تھا جب شمیر ابلک ایک گھوڑے پر سوار ان بکھری ہوئی لاشوں کے اردگرد یوں پھر رہا تھا جیسے نگرانی کر رہا ہو۔ اس نے گھوڑے کا رخ ایک طرف کیا اور آہستہ آہستہ گھوڑے کو چلاتا کچھ آگے ایک ٹیکری کی اوٹ میں ہو گیا۔ وہاں اس نے گھوڑے کو ہلکی سی ایڑ لگائی اور گھوڑا دوڑا دیا۔

اُس کے چاروں سپاہی ایک ایک کر کے مختلف سمتوں سے نکلے اور اسی طرح دُور جا کر گھوڑے دوڑائے اور اُس جگہ پہنچ گئے جہاں ابو جندل پہلے موجود تھا۔ اُس کی دونوں بھتیجیاں اُس کے ساتھ تھیں اور اُس کے ساتھ دو کی بجائے تین فالتو گھوڑے تھے۔ وہاں گھوڑوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ لڑائی میں جو گھوڑ سوار تھے مارے گئے تھے' ان کے گھوڑے میدانِ جنگ سے بھاگ کر اِردگرد کے جنگل میں چلے گئے تھے۔ سالار اوریزی کے نوجوان گھوڑوں کو پکڑ پکڑ کر لا رہے تھے لیکن ابو جندل نے اس سے پہلے ہی تین گھوڑے پکڑ لئے اور اُس جگہ لے گیا تھا جو جگہ ان سب نے مقرر کی تھی۔

ابو جندل نے شمیر ابلک سے کہا تھا کہ دو کمانیں اور تیروں کے چار پانچ ترکش بھرے ہوئے ہونے چاہئیں۔ یہ چاروں سپاہی تجربہ کار تیرانداز تھے۔ وہ دو کمانیں اور پانچ سات ترکش ساتھ لے گئے تھے۔ ان کے پاس تلواریں تھیں اور برچھیاں بھی۔ ایک گھوڑے پر کھانے پینے کا سامان لدا ہُوا تھا جو بہت دنوں کے لئے کافی تھا۔ وہاں پانی کی کمی نہیں تھی۔

وہ جونہی اکٹھے ہوئے' اپنی منزل کو چل پڑے۔ انہوں نے گھوڑوں کی رفتار خاصی تیز رکھی۔ وہ اس کوشش میں تھے کہ صبح ہونے تک اتنی دُور نکل جائیں کہ تعاقب کا

خطرہ نہ رہے۔ تعاقب کا خطرہ بہت ہی کم تھا کیونکہ یہ سب جس طرح ایک ایک کر کے وسم کوہ سے نکلے تھے' انہیں کسی نے دیکھا نہیں تھا۔ وہ جب اکٹھے ہوئے تھے تو ان پر شام نے اپنا دُھندلا پردہ ڈال دیا تھا جو بڑی تیزی سے رات کی تاریکی جیسا سیاہ ہو گیا تھا۔ ان کے پاس تین چار مشعلیں بھی تھیں جو انہوں نے جلائی نہیں کیونکہ مشعلوں کے شعلے دور سے ان کی نشاندہی کر سکتے تھے۔ ان مشعلوں کی ضرورت منزل پر پیش آنی تھی۔

"شمیر ابلک!" — راستے میں ابو جندل نے کہا — "اگر تمہیں میری نیت پر شک ہے تو میری تلوار اپنے پاس رکھ لو۔ یہ دل میں بٹھا لو کہ ہم اب ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔ ہمارا انجام اچھا ہو گا یا بُرا' وہ ہم سے کسی ایک کے لئے نہیں بلکہ سب کے لئے ہو گا"۔

"نہیں میرے ہم سفر!" — شمیر ابلک نے کہا — "ہم مسلمان ہیں۔ اگر ہم ایک دوسرے کے خلاف دل میں ذرا سا بھی شک وشُبہ یا کدورت رکھیں گے تو ہم اپنی منزل تک پہنچ ہی نہیں سکیں گے اور اگر پہنچ گئے تو اس مہم میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے"۔

"ایک بات اور کہوں گا شمیر!" — ابو جندل نے کہا — "جس طرح تم نے دل سے شک وشُبہ اور کدورت نکال دی ہے اسی طرح دل سے یہ بھی نکال دو کہ تم مسلمان ہو اور میرا مذہب یا عقیدہ کچھ اور ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں کسی مجبوری کے تحت حسن بن صباح کا پیروکار بنا تھا۔ میں اُسے دھوکا دیتا رہا ہوں۔ تم بھی مذہب کی اس لکیر کو مٹا ڈالو۔ اگر یہ تمہارے لئے مناسب نہیں تو مجھے بھی مسلمان سمجھ لو"۔

"ہاں ابو جندل!" — شمیر ابلک نے کہا — "یہ میرے لئے مشکل ہے کہ مذہب کی لکیر کو مٹا ڈالوں۔ اس سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ میں تمہیں مسلمان سمجھوں اور تم بھی اپنے آپ کو دلی طور پر مسلمان سمجھتے رہو"۔

"اپنے آپ کو فریب نہ دو شمیر!" — ابو جندل نے کہا — "تم نے شاید ابھی محسوس نہیں کیا کہ تم اب نام کے مسلمان رہ گئے ہو۔ دل پر جب زر وجواہرات کا اور خوبصورت عورت کا قبضہ ہو جاتا ہے تو دل میں مذہب پرانے زخم کے نشان کی طرح باقی رہ جاتا ہے۔ اب اپنے آپ کو یہ دھوکہ نہ دو کہ تم وہ مسلمان رہ گئے ہو جو وسم کوہ کی روانگی سے پہلے ہُوا کرتے تھے۔ میں نے تمہیں اُس رات کو بھی کہا تھا جب ہم پہلے ملے تھے کہ حسن بن صباح نے جو جنت بنائی ہے وہ عارضی ہے۔ یہ شخص مر جائے گا تو آہستہ

آہستہ اس کی جنت بھی اُجڑ جائے گی اور وہ جنت جس کا وعدہ تمہیں خدا نے دیا ہے، وہ آسمانوں میں ہے اور معلوم نہیں کہ ہے بھی یا نہیں۔ جنت وہی ہوتی ہے جو انسان اپنے ہاتھوں بناتا ہے۔ میں تمہاری زندگی کو جنت کا نمونہ بنا دوں گا"۔

شمیر ابلک لشکری تھا یا اسے مجاہد کہہ لیں، عالمِ دین نہیں تھا کہ یہ فلسفہ سمجھ سکتا کہ انسان مال اور مذہب میں سے ایک ہی چیز کا پجاری ہو سکتا ہے۔ مسلمان کے لئے مالدار ہونا گناہ نہیں لیکن دل میں مال و دولت کا لالچ رکھنا ایسی گمراہی ہے کہ انسان صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتا ہے۔ وہ اپنے مذہب کو بھی دل میں زندہ رکھنا چاہتا تھا لیکن یہ حقیقت قبول نہیں کر رہا تھا کہ دل میں جب زر و جواہرات کی چمک آ جاتی ہے تو اس دل میں دین کی شمع بجھ جایا کرتی ہے۔ شمیر ابلک مسرور اور مطمئن چلا جا رہا تھا۔ فاصلے کم ہو رہے تھے اور رات گزرتی جا رہی تھی۔

صبح طلوع ہوئی تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ ہرا بھرا جنگل اور سرسبز ٹیکریاں دور پیچھے رہ گئی تھیں اور وہ ایسے علاقے میں داخل ہو گئے تھے جہاں دیواروں کی طرح چھوٹی بڑی پہاڑیاں اور چٹانیں کھڑی تھیں۔ ان کا رنگ کہیں سلیٹی، کہیں مٹیالا اور کہیں سیاہی مائل تھا۔ ان کی شکلیں بھی عجیب و غریب تھیں۔ ابو جندل اس علاقے سے واقف تھا اور اس میں سے گزرنے کا راستہ بھی جانتا تھا۔ شمیر ابلک اور اس کے سپاہیوں کے لئے یہ علاقہ اور اس کے خدوخال ڈراؤنے سے تھے۔ کہیں کہیں ایک آدھ درخت کھڑا نظر آتا تھا ورنہ وہاں گھاس کی پتی بھی نظر نہیں آتی تھی۔

"یہ تو جنات اور بدروحوں کا دیس معلوم ہوتا ہے" ——— شمیر ابلک نے ابو جندل سے کہا ——— "میں نے ایسا بھدا اور ڈراؤنا علاقہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا"۔

"ہاں شمیر!" ——— ابو جندل نے کہا ——— "لوگوں میں یہی مشہور ہے کہ اس علاقے میں بدروحیں اور چڑیلیں اور جنات رہتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ کہاں تک سچ ہے لیکن اس کے اندر زہریلی چیزیں رہتی ہیں..... اب ہمیں کچھ دیر آرام کر لینا چاہئے۔ تعاقب کا خطرہ ختم ہو گیا ہے"۔

○

یہ سارا علاقہ پتھریلا تھا۔ اس کے اندر جا کر ابو جندل نے ایک جگہ دیکھی جو ذرا ہموار تھی اور وہاں پتھر بھی کم تھے۔ وہاں دو درخت بھی تھے جن کی صرف شاخیں تھیں، پتا

ایک بھی نہیں تھا۔ انہوں نے گھوڑے ان دو درختوں کے ساتھ باندھ دیئے اور الگ ہٹ کر بیٹھ گئے۔

رات بھر کے جاگے ہوئے مسافر زمین پر لیٹ گئے اور کچھ ہی دیر بعد گہری نیند سو گئے۔

اچانک ایک گھوڑا بڑی زور سے ہنہنایا اور فوراً بعد تمام گھوڑے اس طرح ہنہنانے لگے جیسے کوئی بہت بڑا خطرہ آ پڑا ہو۔ ان کے سوار جاگ اٹھے اور دیکھا کہ گھوڑے رسیاں تڑانے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کی اچھل کود سے پتہ چلتا تھا کہ انہوں نے کچھ دیکھ لیا ہے۔ وہ سب دوڑ کر گئے اور دیکھا۔ دس بارہ قدم دور ایک سیاہ کالا ناگ آہستہ آہستہ رینگتا جا رہا تھا۔

سانپ کو دیکھ کر ہر جانور اسی طرح ڈر جاتا اور بھاگ اٹھتا ہے۔ بعض گھوڑے تو سانپ کو دیکھ کر چلتے چلتے رک جاتے اور اس طرح کانپنے لگتے ہیں کہ ابھی گر پڑیں گے..
.. ابو جندل نے ایک کمان اٹھائی اور اس میں تیر ڈالا۔ سانپ پر تیر چلایا لیکن تیر اس کے قریب لگا۔

سانپ کو بھاگ جانا چاہئے تھا لیکن وہ رک گیا اور اس نے پھن پھیلا دیا اور پھنکارنے لگا۔ اس سے اس کے غصے کا اظہار ہوتا تھا۔ ایک سپاہی نے ابو جندل کے ہاتھ سے کمان لے لی اور اس میں تیر ڈال کر چلایا تو سانپ کے پھن کے پار ہو گیا۔ سانپ کچھ دیر لوٹ پوٹ ہوتا رہا اور پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔

آسمان پر گہرے بادل تو پہلے ہی منڈلا رہے تھے لیکن ان مسافروں کو معلوم نہ تھا کہ جس بے آب و گیاہ پہاڑی کے دامن میں انہوں نے پڑاؤ کیا ہے اس کے پیچھے سے سیاہ کالی گھٹا اٹھتی آ رہی ہے۔ اُدھر سانپ مرا اِدھر بڑی زور کی گرج سنائی دی اور پھر بجلی اور اس کے ساتھ ہی اس کی ایسی کڑک سنائی دی جیسے چٹان ٹوٹ پھوٹ گئی ہو۔ سب کے دل دہل گئے۔ گھوڑے جو سکون میں آ گئے تھے، پھر بدکنے لگے۔

بجلی رہ رہ کر چمکتی اور کڑکتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بجلیوں کو اس کالے ناگ کی موت پر غصہ آ گیا ہو۔ آسمان بڑی تیزی سے تاریک ہونے لگا اور گھٹا دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کے خوبصورت بادلوں کے ٹکڑوں کو نگلتی آگے ہی آگے بڑھتی گئی اور جب بارش شروع ہوئی تو لگتا تھا گھٹا کا سینہ پھٹ گیا ہو۔ ایسی موسلا دھار بارش کہ ایک ہاتھ دور کچھ

نظر نہیں آتا تھا اور جل تھل ہو گیا۔

وہاں بارش سے بچنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ ابو جندل نے انہیں بتایا کہ پہلے غار ہیں لیکن خاصا آگے ہیں جہاں تک ہم اتنی جلدی نہیں پہنچ سکیں گے' اتنی دیر میں یہ گھٹا آگے نکل جائے گی..... وہ وہیں کھڑے رہے اور بارش کے قطرے ان پر اس طرح پڑتے رہے جیسے کوئی کنکریاں مار رہا ہو۔

"یہ سانپ کسی کی بد روح معلوم ہوتی ہے" — ایک سپاہی نے کہا — "ایسے تو لگا ہی تھا کہ ہم پر یہ طوفان ٹوٹ پڑا"۔

"کسی وہم میں نہ پڑو میرے دوستو!" — ابو جندل نے کہا — "میں اس علاقے میں سے اتنی بار گزرا ہوں کہ مجھے یاد ہی نہیں رہا اور یوں لگتا ہے جیسے یہ میری زندگی کا راستہ ہے۔ ڈرو نہیں بارش ختم جائے گی"۔

"میں نے اتنی تیز بارش پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی" — شمیر ابلک نے کہا

"شمیرِ بھائی!" — ابو جندل نے اسے بڑی ہی دھیمی آواز میں کہا جیسے وہ راز کی کوئی بات کہہ رہا ہو — "میں ڈرانا نہیں چاہتا لیکن یہ سن لو کہ یہ کالا سانپ اور یہ کالی گھٹا اور یوں کڑکتی ہوئی بجلیاں اچھا شگون نہیں۔ خدا کرے ہماری مہم کامیاب ہو جائے لیکن سفر کی ابتدا اچھی نہیں ہوئی"۔

"میں دعا کروں گا" — شمیر ابلک نے کہا — "خدا ہمیشہ میری دعا سن لیا کرتا ہے"۔

"تم پہلے کی باتیں کرتے ہو" — ابو جندل نے کہا — "اب خدا تمہاری نہیں سنے گا۔ اب کوئی مصیبت آ پڑے تو مجھے بتاؤ یا خود اس کا مقابلہ کرو۔ تم خدا کے راستے سے ہٹ گئے ہو۔ اب میری طرح زندگی گزارو"۔

ڈیڑھ دو گھنٹوں بعد بارش تھمنے لگی اور گھٹا کچھ تو بکھر گئی اور باقی جو تھی وہ آگے نکل گئی۔ کم ہوتے ہوتے بارش رک گئی اور ان لوگوں نے چلنے کا ارادہ کیا لیکن وہاں پانی ہی پانی جمع ہو گیا تھا۔ یہ جگہ کشادہ تو تھی لیکن دو چٹانوں کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے دریا بن گئی تھی۔ سب گھوڑوں پر سوار ہوئے اور چل پڑے۔

آگے گئے تو جگہ تنگ ہوتی چلی گئی کیونکہ دونوں طرف ہی چٹانیں ایک دوسری کے قریب آ گئی تھیں۔ وہاں پانی اس طرح آ رہا تھا جیسے سیلابی دریا ہو۔ پانی کا بہاؤ بڑا ہی تیز تھا۔ ابو جندل نے کہا کہ یہ پانی گہرا نہیں ہے کہ اس میں کوئی ڈوب جائے لیکن گھوڑوں کے لئے اس میں چلنا خاصا مشکل ہو گا۔

گھوڑے یوں تو آگے بڑھتے جا رہے تھے' پانی کا زور زیادہ ہی ہوتا جا رہا تھا اور نظر ایسے ہی آتا تھا کہ گھوڑے آگے نہیں جا سکیں گے لیکن پانی کم ہونے لگا اور آگے جگہ بھی ذرا کھلی سی آ گئی جس سے پانی پھیل گیا اور گھوڑے نکل گئے۔

○

یہ پتھریلا اور چٹانی علاقہ ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ چٹانوں کے درمیان چلتے چلتے آدھا دن گزر گیا اور آگے جا کر ان دو چٹانی پہاڑیوں میں جن کے درمیان وہ جا رہے تھے' راستہ ہی نہ رہا کیونکہ دونوں پہاڑیاں آگے جا کر مل گئی تھیں۔ ابو جندل اس راستے سے واقف تھا۔ وہ آگے آگے جا رہا تھا۔ اس نے اپنا گھوڑا دائیں طرف کر لیا اور پہاڑی کے دامن میں چلا گیا۔ وہاں کوئی راستہ نہیں تھا لیکن گھوڑے پہاڑی چڑھ سکتے تھے۔ ابو جندل کا گھوڑا پہاڑی چڑھنے لگا لیکن سیدھا اوپر جانے کی بجائے پہلو کے ساتھ ساتھ چڑھ رہا تھا۔ باقی گھوڑے اس کے پیچھے پیچھے قطار میں جا رہے تھے۔

شمیر ابلک اور اس کے سپاہیوں کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ فوج کے آدمی تھے اور فوجی گھوڑ سواری کی مہارت رکھتے تھے لیکن ایسی گھوڑ سواری انہوں نے کم ہی کبھی کی تھی۔ پہاڑی پتھریلی تھی اور گھوڑوں کے پاؤں پھسلتے تھے۔ اوپر جاتے جاتے وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں گھوڑا بمشکل پاؤں رکھ سکتا تھا۔ یہ اس پہاڑی کا ایک حصہ تھا جو اس کے سامنے تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت اونچی دیوار ہے اور گھوڑے اس دیوار پر جا رہے ہوں یا اس طرح جیسے بازی گر رسے یا تار پر چلا کرتے ہیں۔ کسی گھوڑے کا پاؤں ذرا سا پھسل جاتا تو دائیں یا بائیں سوار سمیت لڑھکتا ہوا دور نیچے جا پہنچتا اور سوار کی ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ زیادہ مشکل دونوں لڑکیوں کو پیش آ رہی تھی۔ انہوں نے گھوڑ سواری تو کئی بار کی تھی لیکن وہ اتنی ماہر نہیں تھیں۔

"دائیں بائیں مت دیکھو" — ابو جندل نے آگے چلتے ہوئے بلند آواز سے کہا — "یہ سمجھو کہ گھوڑے میدان میں چلے جا رہے ہیں ورنہ ڈر سے کانپتے کانپتے گھوڑے سے گر پڑو گے"۔

یوں لگتا تھا جیسے سوار نہیں بلکہ گھوڑے ڈر رہے ہوں۔ وہ تو پھونک پھونک کر قدم

رکھتے تھے اور ان کے جسموں کی حرکت بتا رہی تھی کہ گرنے سے ڈر رہے ہیں اور شاید آگے جانے سے انکار ہی کر دیں۔

"کسی کا گھوڑا رک جائے تو لگام کو جھٹکا نہ دینا" —— ابو جندل نے ایک اور اعلان کیا —— "ایسا نہ ہو کہ گھوڑا بدک کر پاؤں دائیں یا بائیں رکھ دے"۔

آخر اس پہاڑی کی یہ چوٹی ذرا چوڑی ہونے لگی لیکن اب بھی ہموار نہیں تھی اس لئے گھوڑوں کے پاؤں پھسلتے تھے۔ آگے جا کر یہ چوٹی زیادہ چوڑی ہو گئی اور اب گھوڑے دوسری پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ خطرناک حصہ ختم ہو گیا تھا اور اب جہاں گھوڑے چل رہے تھے یہ خاصی چوڑی جگہ تھی اور یہ پچھلا پہاڑ تھا جس کے اوپر جا کر آگے نیچے اترنا تھا۔

یہ قافلہ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گیا اور ابو جندل نے گھوڑا روک لیا۔ وہاں اوپر اتنی لمبی اور چوڑی جگہ تھی کہ سبھی گھوڑے پہلو بہ پہلو کھڑے ہو گئے۔ نیچے دیکھا تو بڑا ہی خوبصورت منظر نظر آیا۔ ہرا بھرا جنگل تھا' درختوں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں اور اودے اودے بادل منڈلا رہے تھے۔ مغرب کی طرف سورج کچھ نیچے چلا گیا تھا اور اس کی کرنیں درختوں پر پڑتی تھیں تو بارش کے قطرے چمکتے تھے۔ کسی آبادی کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ اس خوبصورت منظر کے دائیں بائیں ذرا اونچی پہاڑیاں تھیں لیکن بہت ہی دور دور۔ ان پر بھی سبزہ اور درخت تھے۔

"سبحان اللہ!" —— شمیر ابلک نے بے ساختہ کہا —— "یہ تو جنت کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اللہ نے اس خطے کو کیسا حسن بخشا ہے!"

"اللہ کا دیا ہوا یہ حسن بڑا ہی خطرناک ہے شمیر بھائی!" —— ابو جندل نے کہا —— "یہاں سے دیکھنے سے تو یہ جنت کا ٹکڑا ہی لگتا ہے اور یہ کوسوں دور تک پھیلا ہوا ہے لیکن اس میں وہ شیر پایا جاتا ہے جس پر لمبی لمبی دھاریاں ہوتی ہیں۔ اس میں بھیڑیئے بھی ہوتے ہیں جو اکیلے دکیلے نہیں بلکہ آٹھ آٹھ دس دس کے گروہ میں حملہ کرتے ہیں۔ یہاں اپنی برچھیاں اور تلواریں تیار رکھنا۔ اس خطے کے اندر کوئی آبادی نہیں۔ آبادیاں بہت دور ہیں۔ یہاں کبھی کوئی شکاری بھی نہیں آیا اس لئے شیروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے کم نہیں ہوتی"۔

○

پہاڑی سے اترنا چڑھنے سے زیادہ خطرناک لگتا تھا۔ گھوڑے آخر اتر گئے اور اس خوبصورت خطے میں داخل ہو گئے۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ سورج غروب ہونے کے لئے افق تک پہنچنے ہی والا تھا اور ان لوگوں نے دن بھر کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ وہاں کوئی خشک جگہ نظر آتی نہیں تھی لیکن ابو جندل ان علاقوں سے واقف تھا اس لئے وہ ذرا سا بھی پریشان نہیں لگتا تھا۔ اس نے اپنے قافلے سے کہا کہ اب دن اور رات کا کھانا ایک ہی بار کھائیں گے اور ایک جگہ مجھے معلوم ہے جہاں ہم رات آرام بھی کریں گے۔

وہ چلتے چلے گئے۔ جنگل کچھ کم گھنا ہوتا جا رہا تھا اور اب جو زمین آ گئی تھی اس میں اونچے نیچے ٹیلے تھے اور گھاٹیاں بھی تھیں۔ کئی نشیبی جگہوں پر پانی بھرا ہوا تھا۔ ایک جگہ بائیں طرف ایک ٹیلہ تھا جو دیوار کی طرح اونچا چلا گیا تھا اور اس کی شکل نیم دائرے جیسی تھی۔ اس کے وسط میں ایک غار صاف نظر آ رہا تھا جس کے آگے مٹی کا ڈھیر جم گیا تھا۔ اس کے سامنے پانی جمع تھا جو زیادہ لمبائی چوڑائی میں نہیں تھا۔

"وہ غار دیکھتے ہو؟" —— ابو جندل نے آگے آگے جاتے پیچھے مڑ کر اپنے ساتھیوں سے کہا —— "وہاں شیر رہتے ہیں اور اسے کچھار کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس وقت شیر اندر موجود ہو۔ وہ ایک بھی ہو سکتا ہے اور ایک سے زیادہ بھی"۔

"کیا شیر ہم اتنے آدمیوں پر حملہ کرے گا؟" —— شمیر ابلک نے پوچھا۔

"اگر بھوکا ہوا تو!" —— ابو جندل نے کہا —— "شیر کا پیٹ بھرا ہوا تو اس کے قریب سے گزر جاؤ تو بھی وہ کچھ نہیں کہے گا"۔

اس وقت یہ سب اس ترتیب میں جا رہے تھے کہ ابو جندل سب سے آگے تھا اس کے پیچھے دونوں لڑکیوں کے گھوڑے تھے پھر شمیر ابلک کا گھوڑا تھا اور اس کے پیچھے سپاہی تھے۔ تین گھوڑوں کی زینوں کے ساتھ تین فالتو گھوڑوں کی رسیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ ابو جندل ابھی انہیں بتا ہی رہا تھا کہ شیر بھوکا نہ ہو تو وہ حملہ نہیں کرتا کہ پیچھے سے زبردست آوازیں سنائی دیں جن میں ایک یہ تھی کہ ایک گھوڑا بہت ہی بری طرح ہنہنایا اور اس کے ساتھ ہی غراہٹ سنائی دی تھی۔ سب نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بڑا ہی خوفناک منظر نظر آیا۔ ایک دھاری دار شیر نے آخری خالی گھوڑے پر حملہ کر دیا تھا اور شیر کی پوزیشن یہ تھی کہ اس نے اوپر سے گھوڑے کی گردن اپنے منہ میں لے رکھی تھی اور اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ یہ گھوڑا ایک سپاہی کے گھوڑے کے پیچھے

بندھا ہُوا تھا۔ سپاہی کا گھوڑا ڈر کر دوڑ پڑا لیکن شیر نے اس کے ساتھ بندھے ہوئے گھوڑے کو بڑی مضبوطی سے دانتوں میں جکڑ رکھا تھا۔

شمیر ابلک نے نہایت پھرتی سے اپنا گھوڑا پیچھے موڑا اور ایڑ لگا دی سپاہیوں کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں۔ شمیر ابلک نے سپاہی کے ہاتھ سے برچھی چھین لی اور شیر کے قریب سے گزرتے برچھی پوری طاقت سے ماری جو شیر کی پیٹھ میں اتر گئی۔ گھوڑے کی گردن سے شیر کے دانت اُکھڑ گئے اور شیر پیٹھ کے بل گرا۔

شمیر ابلک نے آگے جا کر گھوڑا روکا اور پیچھے کو مُڑا۔ شیر ایک ہی برچھی کے وار سے نہیں مرا کرتا۔ زخمی ہو کر وہ آخری وار کیا کرتا ہے۔ شیر برچھی کا زخم کھا کر پیٹھ کے بل گرا اور تیزی سے اٹھا۔ شمیر ابلک نے برچھی اس کی پیٹھ سے نکال لی تھی۔ شیر زخمی حالت میں بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ شیر نے شمیر ابلک کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اس پر جھپٹنے کے لئے دوڑا لیکن اپنے گھوڑے کو موڑ کر اس کے قریب پہنچ چکا تھا اس نے شیر کو برچھی ماری جو اس کی گردن میں اتر گئی۔ اُدھر سے شمیر ابلک نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور شیر کے قریب سے گزرتے اسے برچھی ماری۔ اُس وقت شیر پہلو کے بل ہو گیا تھا۔ شمیر ابلک کی برچھی اس کے پہلو میں داخل ہو گئی۔ شمیر ابلک نے برچھی کھینچ لی اور آگے جا کر گھوڑا پھر موڑا لیکن اتنے میں دوسرے سپاہیوں نے برچھیوں سے شیر کو بے بس کر دیا اور شیر اٹھ نہ سکا۔

جس گھوڑے پر شیر نے حملہ کیا تھا وہ ٹھیک حالت میں معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ زخمی بھی ہو گیا تھا اور خوفزدہ اتنا کہ بھاگنے کے لئے رسّی تڑوانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابُو جندل نے آ کر اس کی رسّی کھول دی۔ گھوڑا اتنا ڈرا ہُوا تھا کہ ایک طرف سرپٹ دوڑ پڑا۔

"گھوڑوں کے متعلق تو تم سب کچھ ضرور جانتے ہو گے" —— ابُو جندل نے کہا —

"لیکن تم شاید دیکھ ہی نہیں سکے تھے کہ یہ گھوڑا اب ہمارے کام کا نہیں رہا۔ اس کی گردن کی ہڈی اگر ٹوٹی نہیں تھی تو ہل ضرور گئی تھی۔ تم نے دیکھا نہیں گھوڑا گردن اوپر نہیں اٹھا رہا تھا اور پھر یہ اتنا ڈر گیا تھا کہ ہم اسے ساتھ رکھتے تو ہمارے لئے مصیبت بنا رہتا۔ جانے دو اسے!"

گھوڑا تھا تو خوف زدہ ہی لیکن خوفزدگی کی سب سے زیادہ شکار دو لڑکیاں ہوئی تھیں جو تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ شمیر ابلک اور اس کے سپاہی فوجی تھے، وہ موت سے ڈرنے

والے نہیں تھے اور ابو جندل ایسا مرد تھا جو ان جنگلوں میں سے اکثر گزرا تھا اور وہ ڈاکو تھا جو زندگی اور موت کا کھیل نہ جانے کب سے کھیل رہا تھا۔ ابو جندل انہیں کچھ اور آگے لے گیا اور ایسی جگہ جا کر رُکا جہاں ایسا ہی ایک ٹیلہ تھا اور ٹیلے کے اندر کسی نے کھدائی کر کے چوکور سا کمرہ بنا رکھا تھا اور یہ مسافروں کے رکنے اور قیام کرنے کے کام آتا تھا۔ ابو جندل نے انہیں بتایا کہ اس علاقے میں سے کبھی کوئی مسافر نہیں گزرا۔ قافلوں کے راستے بہت دُور تھے۔ ان علاقوں میں قافلوں کو لُوٹنے والے ہی آیا کرتے تھے۔

وہ اُس جگہ رُک گئے اور کھانا کھانے لگے۔ سورج غروب ہو گیا اور شام کا دھندلکا رات کے اندھیرے میں تبدیل ہو گیا تو انہوں نے مشعلیں جلا کر اس غار کے سامنے زمین میں گاڑ دیں۔ یہ مشعلیں روشنی کے لئے نہیں بلکہ درندوں کو ڈرانے اور انہیں دُور رکھنے کے لئے باہر گاڑی گئی تھیں۔

"ایک بات بتاؤ ابو جندل!" —— شمیر ابلک نے پوچھا —— "تم نے اپنا خزانہ ایسی جگہ کیوں رکھا ہُوا ہے جہاں تک پہنچنے کے لئے موت کے منہ میں داخل ہونا پڑتا ہے؟"

"خزانے ایسی ہی جگہوں پر رکھے جاتے ہیں" —— ابو جندل نے جواب دیا —— "اگر اتنے زیادہ زر و جواہرات اور اتنی زیادہ رقمیں گھروں میں رکھی جائیں یا آبادیوں کے قریب کہیں زمین کے اندر چھپا دی جائیں تو ڈاکو اس سے واقف ہو جاتے ہیں اور پھر خزانے کے مالک کی زندگی دو چار دن ہی رہ جاتی ہے۔ اسے قتل کر دیا جاتا ہے اور اس کا خزانہ قاتل لے اُڑتے ہیں"۔

پرانے زمانے کی کئی کہانیوں میں بادشاہوں اور ڈاکوؤں کے متعلق یہ ضرور پڑھا یا سنا جاتا ہے کہ فلاں بادشاہ یا فلاں ڈاکو نے فلاں جگہ اپنا خزانہ دبا کر رکھ دیا تھا۔ ان کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ خزانے ایسی جگہوں پر لے جا کر چھپائے جاتے تھے جہاں تک پہنچنا بعض اوقات ناممکن ہو جاتا تھا۔ بحری قزاق تو اپنے خزانے اور بھی زیادہ دشوار گزار علاقوں میں لے جا کر کہیں چھپایا کرتے تھے کیونکہ ان کی زندگی سمندر میں گزرتی تھی۔ لُوٹ مار کر کے کبھی کبھی خشکی پر آیا کرتے تھے۔

خزانوں کے مالک اکثر اُس جگہ تک راستے کا نقشہ بنا کر اپنے پاس رکھتے تھے جس جگہ وہ خزانہ دباتے تھے۔ بعض اوقات مالک مر جاتا اور نقشہ کسی اور کے ہاتھ چڑھ جاتا تو وہ اس خزانے تک پہنچنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایسے مدفون خزانوں کے متعلق پُراسرار

کہانیاں بھی سنائی جاتی ہیں جو غلط معلوم نہیں ہوتیں۔ عام طور پر کہانیوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مالک خود یا اس کے بعد کوئی اور خزانہ نکالنے گئے تو وہاں ان پر ایسی مصیبت نازل ہوئی کہ وہ مارے گئے یا آپس میں لڑ پڑے اور انہوں نے ایک دوسرے کو ختم کر دیا۔

ان کہانیوں کو فرضی اور افسانوی سمجھا جاتا رہا ہے اور ان میں اکثر افسانوی ہی ہوا کرتی ہیں لیکن ابو جندل اور شمیر ابلک کی کہانی کو تاریخ میں جو مقام ملا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم یہ ایک سچی کہانی ہے۔ اسے حسن بن صباح کے دور کی ایک اہم واردات بنا کر غالباً اس لئے تاریخ میں شامل کیا ہے کہ لوگ سمجھ سکیں کہ مال و دولت اور عورت کی چکا چوند اچھے بھلے مرد مومن کو کن رفعتوں سے گرا کر پستیوں میں غائب کر دیتی ہے۔

○

رات وہاں گذار کر صبح وہ چل پڑے اور آدھا دن گزر جانے کے بعد ایک سیلابی ندی نے ان کا راستہ روک لیا۔ ابو جندل نے انہیں بتایا کہ وہ ایسے وقت یہاں پہنچے ہیں جب ندی میں سیلاب آیا ہوا ہے، ورنہ یہ ندی تو بڑی خوبصورت اور پیاری ہے، اس کا پانی شفاف اور کم گہرا ہوتا ہے جس میں سے گھوڑے تو کیا آدمی بھی آسانی سے گزر جاتے ہیں۔ یہ کہہ کر ابو جندل نے اپنا گھوڑا ندی میں ڈال دیا۔ یہ فوج کا گھوڑا تھا جو سیلاب سے لڑتا جھگڑتا پار چلا گیا۔ اس کے پیچھے باقی گھوڑوں نے بھی ندی پار کر لی۔ ندی اتنی گہری ہو گئی تھی کہ چند قدم گھوڑوں کو اس میں تیرنا پڑا تھا۔ پار جا کر شمیر ابلک نے اپنا گھوڑا ابو جندل کے ساتھ کر لیا۔

"شمیر بھائی!" ـــ ابو جندل نے کہا ـــ "مجھے ان جنگلوں میں گھومنے پھرنے اور ان میں سے راستہ بنانے کا اور پھر قافلے لوٹ کر انہی جنگلوں میں غائب ہو جانے کا اتنا زیادہ تجربہ ہے کہ میں ہوا میں خطرے کی بو سونگھ لیا کرتا ہوں۔ میں ان ہی جنگلوں میں سے نہ جانے کتنی بار گزرا ہوں۔ ان خطروں میں سے ہمیشہ آگاہ رہا ہوں لیکن یوں نہیں ہوا جیسے اب ہو رہا ہے۔ نہ کبھی کسی بدروح نے میرا راستہ روکا تھا نہ کبھی شیر نے حملہ کیا تھا۔ میں یہاں ناگ بھی دیکھتا رہا ہوں اور شیر بھی اور بھیڑیئے بھی لیکن میں یہاں سے ہر بار زندہ گزر گیا ہوں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ سفر کی ابتدا ہی ایک بہت برے شگون سے ہوئی ہے۔ پھر ایک شیر نے ہم پر حملہ کیا اور پھر معصوم سی ندی نے ہمارا راستہ روکنے کی

کوشش کی"۔

"تو پھر کیا کرنا چاہئے؟" ـــ "کیا ہمیں واپس چلے جانا چاہئے یا ان خطروں میں بڑھتے ہی چلے جائیں؟"

"میں نے تمہیں پہلے بتایا ہے کہ میں پیشہ ور قزاق ہوں" ـــ ابو جندل نے کہا ـــ "پیشہ ور قزاقوں کے اپنے عقیدے اور اپنے وہم ہوتے ہیں۔ ہم پر جب خطرے منڈلاتے ہیں اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ خطرے ہمیں دبوچ کر ہمیں ختم کر دیں گے تو ہم ایک کنواری لڑکی کی جان کی قربانی دیا کرتے ہیں لیکن یہاں میں ایسی قربانی نہیں دے سکتا۔ اگر یہ دو لڑکیاں میرے مرے بھائی کی بیٹیاں نہ ہوتیں تو میں ان میں سے ایک کی قربانی دے دیتا۔ میں اس سے بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ منزل تک پہنچ جاؤں اور ضرورت پڑے تو اپنی جان کی قربانی دے دوں.... میں اس لئے خبردار کر رہا ہوں کہ ہر وقت چوکس اور چوکنے رہنا۔ معلوم نہیں کس وقت کیا ہو جائے۔ اس جنگل کے حسن کو ہی نہ دیکھتے رہنا۔ تم نے جس طرح شیر مار لیا تھا اسی طرح ہر خطرے پر قابو پا لو گے۔ رات سو کر بھی اس طرح جیسے تمہاری ایک آنکھ کھلی ہوئی ہو۔ رات کو مجھ پر بھروسہ نہ کرنا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں رات حشیش پی کر سوتا ہوں اور مجھے اس دنیا کی کوئی ہوش نہیں رہتی"۔

اُس رات اس قافلے نے ایسی جگہ پڑاؤ کیا کہ ان پر چند ایک درختوں کا چھاتہ اور اوپر آسمان تھا۔ وہ الگ الگ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سوئے۔ آدھی رات سے کچھ پہلے شمیر ابلک کو ایک لڑکی نے جگایا وہ ہڑبڑا کر اٹھا جیسے کوئی خطرہ آ گیا ہو۔ لڑکی نے کہا کہ گھبرانے والی کوئی بات نہیں اور وہ اس کے ساتھ تھوڑی دور تک چلے۔ وہ اٹھا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ چند قدم دور اس لڑکی کی دوسری بہن ایک درخت کے تنے کی اوٹ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ دونوں بھی اس کے قریب بیٹھ گئے۔ اس کا ایک ہاتھ ایک لڑکی نے اور دوسرا دوسری لڑکی نے پکڑ لیا۔ دونوں لڑکیوں نے اُس کے ہاتھ چومے۔

"ہمارے چچا سے نہ ڈرو" ـــ ایک لڑکی نے کہا ـــ "وہ حشیش پی کر سوتا ہے اور صبح ہوش میں آتا ہے۔ ہم دونوں صرف یہ بتانا چاہتی ہیں کہ ہم باقی عمر تمہارے ساتھ گزاریں گی۔ ہمیں لونڈیاں بنا کر رکھ لو چاہے شادی کر لو اور اگر تم ہمیں داشتہ بنا کر رکھو گے تو بھی ہمیں منظور ہے۔ ہم اپنے چچا کو اپنی ذمہ داری سے آزاد کرنا چاہتی ہیں اور

حقیقت یہ ہے کہ تم نے ہمارے دل جیت لئے ہیں"۔

"تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں تم دونوں کی خاطر تمہارے چچا کے ساتھ آیا ہوں" ——— شمیر ابلک نے کہا ——— "ورنہ اس شخص پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے تھا"۔

"لیکن ہمیں ایک ڈر ہے" ——— دوسری لڑکی نے کہا ——— "تمہیں جب خزانہ مل جائے گا تو تم ہمیں بھول جاؤ گے"۔

"ایسا نہیں ہوگا" ——— شمیر ابلک نے کہا ——— "میں ڈرتا ہوں کہیں تم مجھے دھوکہ نہ دے جاؤ"۔

دونوں لڑکیوں نے بڑے ہی والہانہ انداز سے محبت کا اظہار کیا۔ ان کا رویہ ایسا تھا جیسے دونوں نے اپنا آپ اس کے حوالے کر دیا ہو۔ شمیر ابلک کی ایک ہی بیوی تھی جس سے اس کے تین بچے تھے اور اس کی عمر چالیس برس ہو چکی تھی۔ اس پر تو دونوں لڑکیوں نے خود فراموشی کی کیفیت طاری کر دی۔ ابو جندل تو حشیش کے نشے میں گہری نیند سویا ہوا تھا' شمیر ابلک پر ان لڑکیوں کے حسن کا اور ان کی جوانی کا نشہ طاری ہو گیا۔ اُس نے چاہا کہ باقی رات یہ لڑکیاں اسی طرح اس کے پاس بیٹھی رہیں اور وہ ان کے نشے میں بدمست ہوتا چلا جائے۔ اُس کے ذہن میں اگر ابو جندل کے خلاف کچھ تھوڑا سا شک رہ گیا تھا تو وہ ان دونوں لڑکیوں نے صاف کر دیا۔

لڑکیاں چلی گئیں اور شمیر ابلک کچھ دیر وہیں بیٹھا ان لڑکیوں کے طلسماتی خیال میں کھویا رہا۔ اس سے پہلے سفر کے دوران یہ لڑکیاں اسے دیکھ دیکھ کر اس طرح مسکراتی رہی تھیں جیسے وہ اسے بہت پسند کرتی ہوں اور اس کے ساتھ الگ تنہائی میں بیٹھنا چاہتی ہوں۔ ان کا یہی انداز شمیر ابلک کو دیوانہ بنائے ہوئے تھا مگر اب لڑکیاں رات کی تاریک تنہائی میں اس کے پاس آ بیٹھیں اور اس کے اتنا قریب ہو گئیں کہ وہ ان کے جسموں کی بُو سُونگھ سکتا تھا تو وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا۔

کہیں قریب سے ہی اسے بھیڑیوں کی لمبی ہُو کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں اچانک اٹھی تھیں اور تمام بھیڑیئے ایک ہی بار بولنے لگے تھے۔ شمیر ابلک بیداری کے خواب سے یک لخت ہڑبڑا کر بالکل ہی بیدار ہو گیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا اس جگہ پہنچا جہاں وہ سویا ہوا تھا۔ وہاں لیٹا اور اس نے باقی رات جاگتے گزار دی۔

○

صبح ابھی دھندلی تھی جب یہ قافلہ جاگا اور بڑی تیزی سے سامان سمیٹ کر اور گھوڑوں پر زینیں ڈال کر چل پڑا۔ جوں جوں صبح کا اُجالا نکھرتا آ رہا تھا زمین کے خدوخال بدلتے جا رہے تھے۔ درخت بہت کم ہو گئے تھے اور گھاس بھی کم ہوتی جا رہی تھی اور تھوڑی ہی دور آگے زمین ایسی آ گئی جیسے نہ جانے کتنی مدت سے پانی کی بوند کو ترس رہی ہو۔ درخت تو کہیں کہیں نظر آتے تھے اور یہ درخت بالکل خشک تھے جن کے تنے تو تھے لیکن ٹہنیاں نہیں تھیں۔ جھاڑیاں بالکل خشک اور خاردار تھیں۔ زمین کٹی پھٹی تھی۔ کہیں زمین اُبھری ہوئی تھی اور کہیں نشیب میں چلی جاتی تھی اور کہیں ٹیلے یوں کھڑے تھے جیسے زمین پر گاڑے ہوئے منحنی اور بھدے اور بدصورت سے ستون ہوں۔ زمین پر کسی گھوڑے یا اونٹ یا کسی انسان کا تازہ یا پرانا نقشِ پا نہ تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ اِدھر سے کبھی کوئی نہیں گزرا اور یہ پہلے انسان ہیں جو اس طرف آ نکلے ہیں۔

جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے مٹی ریت میں تبدیل ہوتی گئی اور دو تین میل آگے گئے تو لق و دق صحرا شروع ہو گیا۔ وہاں بھر بھرے سے ٹیلے بھی تھے اور دو منزلہ مکان جتنے اونچے ریت کے ڈھیر بھی تھے اور یوں لگتا تھا جیسے قدرت نے یہ گول گول ڈھیر بڑی محنت سے یہاں لگائے ہوں۔

"یہ ہے صحرا کا اصل خطرہ!" ——— ابو جندل نے اپنے ساتھیوں کو بتایا ——— "ناواقف مسافر ان ڈھیروں میں داخل ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ ان میں سے نکل جائے گا لیکن ان کے اندر ایسی بھول بھلیاں ہیں کہ بعض مسافر ان ڈھیروں میں سے دو تین کے اردگرد ہی گھومتے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انہوں نے بہت فاصلہ طے کر لیا ہے لیکن وہ وہیں کے وہیں ہوتے ہیں حتیٰ کہ پیاس اور پھر بھوک انہیں وہیں گرا لیتی ہے اور ریت ان کے جسموں سے زندگی کا رس چُوس لیتی ہے.... میں ان سے واقف ہوں اس لئے میں جب بھی اِدھر آیا ہوں' دور کا چکر لگا کر گیا ہوں"۔

ابو جندل انہیں ایک طرف لے گیا۔ اس طرف زمین اوپر ہی اوپر اٹھتی جا رہی تھی۔ نظر تو یوں آتا تھا جیسے یہ زمین پکی ہے اور پاؤں کے نیچے مٹی ہے لیکن جب پاؤں رکھتے تھے تو ریت میں دھنس جاتا تھا۔ بلندی پر جا کر ریت کی ان ڈھیریوں کو دیکھا تو وہ میلوں وسعت میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ابو جندل اپنے قافلے کو دور دور سے نکال کر آگے لے گیا۔

سورج سر پر آگیا تو آگے یوں نظر آتا تھا جیسے زمین جل رہی ہو اور اس سے شعلے اٹھ رہے ہوں۔ ان میں سے آگے کچھ نظر نہیں آتا تھا کیونکہ یہ شفاف سے شعلے جھلمل کرتے تھے۔ قافلہ جوں جوں آگے بڑھتا جاتا تھا' یہ جھلملاتے ہوئے شفاف شعلے آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

پیاس ایک قدرتی امر تھا۔ ابو جندل نے پچھلے پڑاؤ سے روانگی سے پہلے ہی پانی کا ذخیرہ چھوٹے چھوٹے مشکیزوں میں بھر لیا تھا۔ ہر گھوڑے کے ساتھ ایک مشکیزہ بندھا ہوا تھا۔ سب نے پانی پیا اور چلتے چلے گئے۔

ابو جندل نے انہیں بتایا کہ یہ ریگستانی خطہ شام سے بہت پہلے ختم ہو جائے گا اور کچھ ہی دور آگے ایک نخلستان آئے گا جہاں رک کر کھانا کھائیں گے اور تھوڑا سا آرام کر کے آگے چلے جائیں گے۔

سورج جب مغرب کی طرف چلا گیا تو دور سے کھجور کے درخت نظر آنے لگے۔ گھوڑے پیاس سے بے چین ہوئے جا رہے تھے اور تھک بھی گئے تھے کیونکہ ان کے قدم ریت میں دھنس رہے تھے..... آخر نخلستان آ ہی گیا۔ وہاں پانی کا چھوٹا سا تالاب تھا اور کھجور کے درختوں کی اتنی افراط کہ سایہ ہی سایہ تھا حالانکہ کھجور کے درخت کا سایہ بے کار ہوتا ہے۔ گھوڑے سواروں کے اترتے ہی پانی کی طرف دوڑ پڑے اور پانی پینے لگے۔

قافلے نے کھانا کھایا' پانی پیا اور تھوڑا سا آرام کر لیا۔ گھوڑے پانی پی چکے تھے۔ یہ لوگ اٹھے اور گھوڑوں پر سوار ہو کر چل پڑے۔ گھوڑے تو تھکے ہوئے لگتے ہی تھے لیکن ان کے سواروں کے چہروں سے پتہ چلتا تھا کہ خزانے کا لالچ نہ ہوتا تو وہ وہیں تھکن سے گر پڑتے اور گہری نیند سو جاتے۔ ان کے جسم تو جیسے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ زیادہ بری حالت لڑکیوں کی تھی۔ ابو جندل انہیں اچھی اچھی اور پرامید باتیں سناتا جا رہا تھا تاکہ یہ لوگ ذہنی طور پر بیدار اور مستعد رہیں۔

آگے پھر ویسا ہی صحرا تھا لیکن کچھ آگے جا کر ریت مٹی میں تبدیل ہونے لگی تھی اور دو اڑھائی میل دور ہرے بھرے درخت نظر آنے لگے تھے۔ ابو جندل آگے آگے جا رہا تھا۔ اس نے اچانک لگام کھینچ کر گھوڑا روک لیا اور ایک ہاتھ بلند کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ سب رک جائیں۔ وہ گھوڑے سے کود کر اترا اور چند قدم آگے جا کر زمین پر جھک

ابلک بھی گھوڑے سے اترا اور اس تک پہنچا۔

"یہ دیکھو شمیر!" ـــ ابو جندل نے زمین کی طرف اشارہ کر کے کہا ـــ "کیا تم کہہ سکتے ہو کہ یہ گھوڑوں کے نشان نہیں؟"

"ہاں ابو جندل!" ـــ شمیر ابلک نے کہا ـــ "یہ بلاشک و شبہ گھوڑوں کے قدموں کے نشان ہیں..... اور یہ نشان پرانے نہیں ایک دو روز پہلے کے لگتے ہیں"۔

ابو جندل اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اس طرف کچھ دور تک چلا گیا جدھر سے یہ گھوڑے آ رہے تھے۔ کھروں کے نشان صاف دکھائی دے رہے تھے کہ گھوڑے کدھر سے آئے ہیں اور کدھر گئے ہیں۔ ابو جندل رک گیا۔ شمیر ابلک بھی گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے پیچھے چلا گیا تھا۔

"ادھر سے عام لوگ نہیں گزرا کرتے" ـــ ابو جندل نے کہا ـــ "ادھر کسی فوج کے گھوڑ سوار نہیں آ سکتے۔ یہ خطہ سلطانوں اور بادشاہوں اور اماموں کی دنیا سے بہت دور ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اس خطے پر خدا کا قہر برستا رہتا ہے۔ ادھر سے کوئی مجھ جیسا رہزن اور ڈاکو ہی گزر سکتا ہے۔ ہمیں اب زیادہ ہوشیار ہو کر آگے جانا پڑے گا"۔

وہ قافلے کے باقی افراد کو لے کر آگے چل پڑے اور سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا کہ وہ ہرے بھرے خطے میں داخل ہو گئے۔ ابو جندل اور شمیر ابلک راستے میں زمین دیکھتے آئے تھے کہ قدموں کے اور نشان بھی ملیں گے۔ نشان ملے تھے لیکن وہ دوسری طرف چلے گئے تھے۔

انہوں نے اس سرسبز جگہ پر رات کو پڑاؤ کیا۔ زمین خشک تھی اور گھاس بڑی ملائم اور نرم تھی۔ ابو جندل نے سپاہیوں سے کہا کہ وہ چاروں رات کو اس طرح پہرہ دیں کہ ایک آدمی پہرے پر کھڑا رہے اور دوسرے باری باری پہرہ دیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جو بھی پہرے پر کھڑا ہو اس کے پاس کمان اور ترکش ضرور ہونے چاہئیں۔ ابو جندل خطرہ محسوس کر رہا تھا جس کی نشاندہی گھوڑوں کے ان قدموں کے نشانوں نے کی تھی جو اس نے دیکھے تھے۔

کھانے کے بعد وہ کچھ دیر باتیں کرتے رہے اور جب سونے لگے تو ایک سپاہی پہرے پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک جگہ کھڑا ہی نہیں رہنا تھا۔ انہوں نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں آمنے سامنے دو ہری بھری ٹیکریاں تھیں اور ایک ٹیکری آگے تھی۔

پہرے والے سپاہی کو بتایا گیا تھا کہ وہ اپنے پہرے کے دوران ان ٹیکریوں کے پیچھے بھی جائے اور اوپر جاکر بھی دیکھے اور پوری طرح بیدار رہے۔

○

چاروں سپاہیوں نے باری باری رات بھر گھوم پھر کر پہرہ دیا اور صبح کا اُجالا آہستہ آہستہ نکھرنے لگا۔ آخری سپاہی جو پہرے پر تھا' وہ ایک ٹیکری کے پیچھے تھا۔ اسے غالباً معلوم تھا کہ اس کے ساتھی دیر سے جاگیں گے اس لئے اس نے پہرے پر ہی رہنا بہتر سمجھا اُسے ٹیکری کے اُس طرف جدھر اس کے ساتھی سوئے ہوئے تھے' کچھ آوازیں اور آہٹیں سی سنائی دیں۔ وہ سمجھا کہ اس کے ساتھی جاگ اٹھے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ٹیکری کے اُس سرے پر آیا جہاں ٹیکری ختم ہوتی تھی۔ وہاں دو چوڑے تنوں والے درخت تھے۔ اس نے جب اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا تو وہاں کوئی اور ہی منظر نظر آیا۔ آٹھ آدمی تھے جنہوں نے منہ اور سر سیاہ پگڑیوں میں لپیٹ رکھے تھے۔ انہوں نے لمبے چُغے پہن رکھے تھے جو ان کے گھٹنوں تک گئے ہوئے تھے۔ آٹھ گھوڑے کچھ دور کھڑے گھاس کھا رہے تھے۔

دو آدمیوں نے دونوں لڑکیوں کو پکڑ رکھا تھا اور باقی آدمیوں نے تلواریں ہاتھوں میں لے رکھی تھیں اور ہر ایک نے تلوار کی نوک ایک ایک آدمی کی شہ رگ پر رکھی ہوئی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ کوئی ڈاکو تھے جنہوں نے اس قافلے کو نیند میں دبوچ لیا تھا اور انہیں ہتھیار اٹھانے کی مہلت نہیں دی تھی۔ وہ لڑکیوں کو لے جانا چاہتے تھے جس میں کوئی شک ہی نہیں تھا۔ وہ ابو جندل اور شمیر ابلک سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ لڑکیاں ان دونوں آدمیوں کی گرفت میں تڑپ رہی تھیں۔

پہرے والے سپاہی نے اپنی کمان میں ایک تیر ڈالا۔ فاصلہ بیس بائیس گز ہو گا۔ اس نے تیر کھینچ کر جو چھوڑا تو وہ ایک آدمی کی گردن میں اتر گیا۔ اُس آدمی نے ایک لڑکی کو پکڑ رکھا تھا۔ اس نے فوراً لڑکی کو چھوڑا اور اپنی گردن پر دونوں ہاتھ رکھے۔

سپاہی نے بڑی تیزی سے کمان میں دوسرا تیر ڈالا اور جس آدمی نے دوسری لڑکی کو پکڑا ہوا تھا' اس کو شست میں لے کر تیر چھوڑ دیا۔ اس کا نشانہ بے خطا تھا۔ تیر اپنے شکار کے گال کے ایک طرف لگا اور دوسری طرف باہر ہو گیا۔ اس نے بھی لڑکی کو چھوڑا اور اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لئے۔

سپاہی نے اسی تیزی سے تیسرا اور چوتھا تیر چلایا اور اس کا ایک تیر بھی خالی نہ گیا۔ ڈاکوؤں میں ہڑبونگ بپا ہو گئی۔ انہیں یہ تو پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ تیر کس طرف سے آ رہے ہیں۔ ان کی ہڑبونگ سے قافلے والوں کو ہتھیار اٹھانے کا موقع مل گیا۔ ادھر سے سپاہی تیر اندازی کر رہا تھا۔ اس نے پانچ آدمیوں کو مار لیا۔

تین ڈاکو بچ گئے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ابو جندل' شمیر ابلک اور باقی تین سپاہیوں نے تلواریں اور برچھیاں اٹھالی ہیں تو وہ تینوں بہت تیزی سے دوڑ پڑے۔ ان کا تعاقب کیا گیا لیکن وہ کود کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور ایڑ لگا دی۔ گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ اس طرح ڈاکو اپنے پانچ ساتھیوں کی لاشیں اور پانچ گھوڑے چھوڑ کر بھاگ گئے۔

"میرے دوستو!" ـــــ ابو جندل نے کہا ـــــ "ہم اپنی منزل کے قریب پہنچ گئے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور بھی ہماری منزل کے قریب آگیا ہے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اب کیا ہو گا لیکن ڈرنے کی بھی ضرورت نہیں' البتہ پوری طرح ہوشیار اور بیدار رہنے کی ضرورت ہے۔ ہر وقت ہتھیار پاس ہونا چاہئے اور ایک ہاتھ اپنے ہتھیار پر رکھو تاکہ خطرے کی صورت میں بچ سکو گے .... اور تم دونوں لڑکیاں سن لو.... تم کسی سلطان شہزادے کے حرم کی لڑکیاں نہیں ہو جن کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنے آقا کو خوش رکھیں۔ تم میری بھتیجیاں ہو۔ اپنے باپ کو یاد کرو۔ وہ بڑا جری اور جابر مرد تھا۔ تم جانتی ہو۔ اگر کوئی خطرہ آ پڑا تو مردوں کی طرح لڑنا ہے' عورتوں کی طرح ڈرنا نہیں"۔

"یہ تو ہم نیند میں پکڑی گئی تھیں" ـــــ ایک لڑکی نے کہا ـــــ "میں نیند سے ہڑبڑا کر اٹھی تو ایک آدمی نے میرے بازو پیٹھ پیچھے جکڑ دیئے تھے۔ اگر ہم دونوں بیدار ہوتیں اور ہم پر ڈاکو حملہ کرتے تو پھر تم دیکھتے کہ ہم کیا کر سکتی ہیں"۔

ابو جندل نے انہیں کہا کہ فوراً کوچ کرو تاکہ ہم شام سے پہلے پہلے منزل پر پہنچ جائیں۔

○

سورج غروب ہونے میں ابھی دو اڑھائی گھنٹے باقی تھے جب وہ اُس خطے میں پہنچ گئے جو ان کی منزل تھی۔

وہ بھی بے آب و گیاہ خطہ تھا۔ وہ ویسا ہی تھا جیسا یہ لوگ پہلے ایک جگہ دیکھ آئے تھے۔ سلوں والی گہری سلیٹی رنگ کی چٹانیں تھیں اور کچھ اونچی پہاڑیاں بھی تھیں۔ پتھریلی ٹیکریاں بھی تھیں لیکن وہاں گھاس کی ایک پتی بھی نظر نہیں آتی تھی یوں لگتا تھا جیسے ان چٹانوں اور پہاڑیوں سے آگ کی طرح سورج کی تپش خارج ہو رہی ہو۔ ہوا بہت ہی تیز چل رہی تھی جو تیز ہی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ یہ جب سلوں والی چٹانوں سے ٹکرا کر گزرتی تھی تو ہلکی ہلکی چیخیں سنائی دیتی تھیں جو انسانی چیخوں جیسی تھیں۔ کبھی تو یوں لگتا تھا جیسے عورتیں اور بچے ان پہاڑیوں کے اندر کہیں کسی مصیبت میں پڑے ہوئے ہیں اور چیخ چلا رہے ہیں۔

یہ خطہ بھی بدروحوں کا مسکن لگتا تھا۔ یہ سارا ماحول دل پر گھبراہٹ اور خوف کا تاثر پیدا کرتا تھا لیکن ابو جندل کا چہرہ پُرسکون تھا اور اس کا انداز ایسا جیسے وہ یہاں ذرا سی بھی اجنبیت محسوس نہ کر رہا ہو۔

"اب ذرا ہوشیار رہنا شمیر ابلک!" ـــ ابو جندل نے کہا ـــ "ہمیں اِدھر اُدھر گھوم پھر کر اور اچھی طرح دیکھ بھال کر کے اندر جانا چاہئے تھا لیکن اتنا وقت نہیں۔ رات آ گئی تو مشعلوں کے باوجود ہمارا کام مشکل ہو جائے گا۔ میں تم سب کو سیدھا اندر لے جا رہا ہوں۔ اب جو ہوتا ہے ہوتا رہے، مقابلہ کریں گے"۔

"بات ذرا صاف کرو ابو جندل!" ـــ شمیر ابلک نے کہا ـــ "وہ خطرہ ہے کیا جو تم محسوس کر رہے ہو؟ مجھے الفاظ میں بتا دو تاکہ میں اس کے مطابق خود بھی تیار رہوں اور اپنے ان سپاہی ساتھیوں کو بھی تیار رکھوں"۔

"آسمان سے کوئی آفت نہیں گرے گی" ـــ ابو جندل نے کہا ـــ "یہ خطرہ انسانوں کا ہی ہو گا۔ وہ جو تین آدمی زندہ نکل گئے تھے، وہ کہیں دور نہیں چلے گئے، یہیں کہیں ہوں گے اور وہ یہاں آ سکتے ہیں"۔

"آنے دو" ـــ شمیر ابلک نے کہا ـــ "آنے دو انہیں.... اب ہم سوئے ہوئے نہیں ہوں گے.... چلو آگے!"

ابو جندل آگے آگے تھا۔ وہ چٹانوں کی بھول بھلیوں میں داخل ہو گیا۔ باقی سب پیچھے ایک قطار میں جا رہے تھے۔ اب ان کے پاس فالتو گھوڑے سات تھے۔ وہ ڈاکوؤں کے گھوڑے بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

ابو جندل کبھی دائیں مڑتا کبھی بائیں مڑتا اور یہ لوگ بھول ہی گئے کہ وہ کدھر سے آئے ہیں اور کتنے موڑ مڑ چکے ہیں۔ صرف ابو جندل راستے سے واقف تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ واپس کس طرح آنا ہے۔ وہاں اندر چھوٹی بڑی بے شمار چٹانیں تھیں۔ ان کے ساتھ اونچی پہاڑی تھی۔ ہوا کی چیخیں اور بلند ہو گئی تھیں۔

آخر جگہ ایسی آ گئی کہ دائیں طرف اونچی پہاڑی تھی اور اس کے دامن میں ذرا ہٹ کر لمبی چٹان تھی اور ان کے درمیان گھوڑے گزارنے کے لئے کچھ جگہ تھی۔ پچاس ساٹھ گز آگے یہ چٹان پہاڑی کے دامن سے مل جاتی تھی اور وہاں ایک بڑی بلند چٹان نے راستہ روک لیا تھا۔ ابو جندل آگے ہی آگے بڑھتا گیا اور وہاں تک پہنچ گیا جہاں راستہ بند ہو جاتا تھا۔

وہ گھوڑے سے اُترا اور سب کو اُترنے کے لئے کہا اور یہ بھی کہ گھوڑے یہیں چھوڑ دیں۔ آگے دیکھا کہ یہ راستہ اس طرح نیچے کو چلا گیا تھا جس طرح کسی عمارت کے تہہ خانے میں سیڑھیاں اترتی ہیں۔ ابو جندل نے سپاہیوں سے کہا کہ وہ مشعلیں جلا کر نیچے آ جائیں۔ وہ، شمیر ابلک اور لڑکیاں نیچے اتر گئیں اور سپاہیوں نے مشعلیں جلائیں اور ان کے پیچھے پیچھے نیچے چلے گئے۔

وہ آٹھ دس گز نیچے چلے گئے۔ یہ تہہ خانے کی طرح بنا ہُوا ایک غار تھا جس کی چھت بیس پچیس گز اونچی تھی اور یہ غار بہت ہی کشادہ تھا۔

غار کی چھت سے چٹانوں کے لمبوترے اور عجیب و غریب ٹکڑے لٹک رہے تھے۔ جونہی مشعلیں اندر داخل ہوئیں، بڑی ہی زور سے ایسی آواز آئی جیسے طوفان آ گیا ہو اور اس کے ساتھ چڑ چڑ کی آوازیں آئیں جو ایک شور و غل کی طرح بلند ہوتی چلی گئیں۔ یہ چمگادڑ تھے جو غار کے اندر سے اُڑ کر باہر نکل گئے تھے۔ یہ چند ایک نہیں بلکہ سینکڑوں تھے۔ ابو جندل نے بلند آواز سے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ چمگادڑ ہیں، ان سے ڈریں نہیں۔

اس غار کے فرش پر بھی چٹانیں تھیں جن کی اونچائی دو گز یا تین گز تھی۔ مشعلوں کی روشنی میں ایک طرف ایک اور غار کا دہانہ سا نظر آیا۔ ابو جندل اس میں داخل ہو گیا۔ یہ دہانہ تو اتنا کشادہ نہیں تھا لیکن اندر جا کر دیکھا، غار خاصا کشادہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ مشعلوں کی روشنی خاصی زیادہ تھی اور اندر کنکریاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

پچیس تیس قدم گئے ہوں گے کہ آگے ایک اور دہانہ نظر آیا۔ ابو جندل اس میں داخل ہو گیا اور اب یہ لوگ ایک اور غار میں چلے گئے تھے۔ ابو جندل نے کہا کہ مشعلیں آگے لاؤ۔ مشعلیں آگے گئیں تو سب نے دیکھا کہ وہاں تین بکس رکھے ہوئے تھے جو لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور ان پر لوہے کی مضبوط پتریاں چڑھی ہوئی تھیں۔

"یہ لو شمیر بھائی!" — ابو جندل نے کہا — "یہ ہے میرے باپ کی اور میری کمائی۔ یہ خزانہ اب صرف میرا نہیں، ہم سب کا ہے" — اس نے سپاہیوں سے کہا — "مشعلیں لڑکیوں کو دے دیں اور یہ بکس اٹھائیں"۔

سپاہی آگے بڑھ کر ایک بکس کو اٹھانے لگے تو شمیر ابلک نے کان کھڑے کر لئے اور ابو جندل سے کہا کہ اسے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی ہے۔ ابو جندل نے اسے کہا کہ اس کے کان بج رہے ہیں۔ یہاں اور کوئی نہیں آ سکتا۔

ابو جندل ابھی یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ غار میں آواز آئی — "ان صندوقوں سے پیچھے ہٹ جاؤ"۔

سب نے چونک کر اُدھر دیکھا۔ ایک آدمی جس نے منہ اور چہرہ کالے رنگ کی پگڑی میں لپیٹ رکھا تھا، ہاتھ میں تلوار لئے کھڑا تھا۔ سب نے تلواریں نکال لیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے غار میں دس بارہ آدمی آ گئے۔ ان سب کے سر اور چہرے کالی پگڑیوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔

"سب پیچھے کھڑے رہو دوستو!" — ابو جندل نے آگے بڑھ کر ان ڈاکوؤں سے کہا — "تم زندہ ان صندوقوں تک نہیں پہنچ سکو گے اور جب تک ہم زندہ ہیں ان صندوقوں کو ہاتھ تک نہیں لگا سکو گے"۔

"ابو جندل!" — کالی پگڑی والے ایک آدمی نے کہا — "تم بھی ہم میں سے ہو اور ہم تمہیں جانتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم ہمارے ہاتھوں مرو۔ یہ صندوق اور دونوں لڑکیاں یہیں چھوڑ جاؤ اور خود کو اور اپنے ساتھیوں کو زندہ لے جاؤ"۔

"اوہ، یہ تم ہو" — ابو جندل نے اس آدمی کو پہچانتے ہوئے کہا — "میرا خیال تھا کہ تم سب مارے گئے ہو یا کسی اور طرف نکل گئے ہو.... نہ تم ہمارے ہاتھوں مرو نہ ہم تمہارے ہاتھوں مرنا چاہتے ہیں۔ ان صندوقوں میں جو کچھ ہے، آؤ برابر برابر بانٹ لیتے ہیں"۔

"یہ مال اُس کا ہے جس کے پاس طاقت ہے" — کالی پگڑی والے نے کہا — "ہم تمہیں باتوں کا وقت نہیں دیں گے۔ ہم سارا مال لے جانے آئے ہیں"۔

ابو جندل نے شمیر ابلک کو اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں نے اور چاروں سپاہیوں نے اور لڑکیوں نے بھی ڈاکوؤں پر حملہ کر دیا۔ ڈاکو تیار تھے۔ وہ تو لڑنے اور مرنے کے لئے آئے تھے۔

پھر اس غار میں تلواریں ٹکرانے کی آوازیں آتی رہیں، زخمی گرتے رہے، خون بہتا رہا۔ مشعلیں زمین پر پڑی جل رہی تھیں۔ دو تین زخمی جلتی مشعلوں پر گرے اور ان کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ وہ اٹھ کر اِدھر اُدھر دوڑے اور آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگے لیکن ناکام رہے۔ وہ پہلے ہی زخمی تھے، پھر کپڑے جل کر ان کے جسموں کو جلانے لگے تو وہ جلدی ہی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اتنے میں تین چار اور زخمی مشعلوں پر گرے اور اسی انجام کو پہنچے۔ لڑنے والے لڑتے لڑتے مشعلوں پر آئے تو ان کے کپڑوں کو بھی آگ لگ گئی۔

غار میں اگر کسی کو فتح حاصل ہوئی تو وہ آگ کو ہوئی۔ اندر آگ کے شعلے تھے اور غار دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ کچھ تو تلواروں کے زخموں سے مر گئے اور جو زخموں سے نہ مرے انہیں مشعلوں کی آگ نے مار ڈالا اور تھوڑی ہی دیر بعد غار میں صرف شعلوں کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔

قاتلوں سے لوٹا ہوا خزانہ موت کے ہاتھ آیا۔

جب غار میں قتل و غارت ہو رہی تھی‘ مشعلوں کے شعلے لڑنے‘ مرنے اور زخمی ہو کر گرنے والوں کو چاٹ رہے تھے‘‘ اُس وقت سورج اونچی چٹانوں کی اوٹ میں چلا گیا پھر غار کے ہولناک راز کو اپنے جلتے ہوئے سینے میں چُھپائے اُفق میں اتر گیا۔ بھول بھلّیوں جیسی بد رنگ اور بدشکل چٹانوں نے شام کے دھندلکے کو تھوڑی سی دیر میں گہرا کر دیا۔ ان میں بعض چٹانیں ستونوں کی طرح اوپر کو اُٹھی ہوئی تھیں اور کچھ میناروں کی طرح اوپر سے نوکیلی تھیں۔ شام کے تیزی سے گہرے ہوتے دھندلکے میں یہ چٹانیں بھوتوں جیسی لگتی تھیں۔ ان میں پُراسراریت اور خوف کا نمایاں تاثر تھا۔

غار کے اندر جو آگ لگی ہوئی تھی‘ اس کی ہلکی سی‘ بڑی ہی مدھم سی روشنی غار کے دہانے تک آتی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے یہ روشنی رات کی بڑھتی ہوئی تاریکی کے ڈر سے باہر نہیں آ رہی.... ایک سایہ سا حرکت کر رہا تھا۔ اس سائے کو غار نے اُگل کر باہر پھینک دیا تھا یا جیسے موت نے اسے قبول نہ کیا اور اگل دیا تھا۔ یہ سایہ غار کے دہانے سے نکلا تھا اور غار کے اندر کسی مرنے والے کی بدروح جیسا لگتا تھا۔

چٹانوں کے درمیان بس اتنی سی ہی جگہ تھی کہ ایک انسان چل سکتا تھا۔ یہ سایہ اس تنگ و تاریک راستے پر سرکتا رینگتا جا رہا تھا۔ یہ کوئی سیدھا راستہ نہیں تھا یا ایسا بھی نہیں تھا کہ کچھ دُور جا کر اِدھر یا اُدھر مڑتا ہو۔ یہ تو ہر دس پندرہ قدموں پر مُڑتا تھا اور کہیں دو اطراف کو مڑتا تھا اور کہیں یہ چورستہ بن جاتا تھا۔ چلنے والا جان ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ کدھر کو مُڑے تو ان بھول بھلّیوں سے نکل جائے گا۔

یہ سایہ سا سرکتے رینگتے دیکھتا کہ آگے سے ایک اور چٹان نے راستہ روک رکھا ہے

تو وہ ذرا رُکتا‘ دائیں بائیں دیکھتا اور کسی بھی طرف مُڑ جاتا۔ ایسے کئی موڑ مُڑ کر اس نے اپنے آپ کو چٹانوں کے نرغے میں ہی پایا۔ کچھ آگے جا کر ایک جگہ ایسی آگئی کہ راستے دونوں بلکہ تین اطراف کو جاتے تھے۔ سایہ رُک گیا اور اُس کے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھے۔ ایک انسانی آواز بلند ہوئی — ’’یااللہ ‘تُو نے زندگی عطا کی ہے تو وہ راستہ بھی دکھا دے جو زندہ انسانوں کی دنیا کی طرف جاتا ہے۔ میرا چچا باطنی ابلیس کا پجاری تھا تو اس کی سزا مجھے نہ دے جس نے آج تک اپنی عصمت کو بے داغ رکھا ہے۔ گناہگار چچا کی یتیم بھتیجی نے اپنے دامن کو گناہوں سے پاک رکھا ہے.... یااللہ.... یااللہ‘‘ — اور اس کی آواز رندھیا کر رات کی خاموشی میں تحلیل ہو گئی۔

وہ ابو جندل کی بڑی بھتیجی شافعیہ تھی۔ اُس کی عمر پچیس چھبیس سال تھی۔ اُس کی چھوٹی بہن جس کی عمر بیس اکیس سال تھی‘ غار کے اندر ماری گئی تھی۔ جب غار میں ڈاکو اور لٹیرے آگئے اور کشت و خون شروع ہو گیا تھا‘ اُس وقت شافعیہ غار کے اندر ہی ذرا بلند ایک چٹان کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ غار خاصا کشادہ تھا۔ اس کے اندر چھوٹی چھوٹی نوکیلی چٹانیں اُبھری ہوئی تھیں اور کہیں گڑھے سے بھی بنے ہوئے تھے۔ شافعیہ اتنی الگ ہٹ کر چُھپی تھی کہ جب مشعلوں نے لڑنے والوں اور گرنے والوں کے کپڑوں کو آگ لگا دی اور غار روشن ہو گیا تو بھی وہ کسی کو نظر نہیں آسکتی تھی۔ وہ یہ خونچکاں منظر دیکھتی رہی تھی لیکن جس چیز کو وہ زیادہ دیکھ رہی تھی وہ نکل بھاگنے کا راستہ تھا۔ راستہ ایک ہی تھا اور وہ غار کا دہانہ تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس دہانے سے لڑنے والے ذرا ایک طرف ہوں تو وہ چُھپ کر نکل بھاگے۔ اُس نے اپنی چھوٹی بہن کو مرتے دیکھا تھا۔

شافعیہ چٹان کے پیچھے سے اپنی حسین و جمیل اور نوجوان بہن کو دیکھ رہی تھی کہ وہ نکل بھاگنے کے لئے اِدھر اُدھر دوڑ رہی ہے اور کہیں چُھپنے کی کوشش نہیں کر رہی۔ روشنی اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ غار میں کنکر بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک ڈاکو نے شافعیہ کی چھوٹی بہن کا بازو پکڑ لیا۔ ایک اور ڈاکو نے اُس کا دوسرا بازو پکڑ لیا اور دونوں اُسے اپنی اپنی طرف کھینچنے لگے۔ لڑکی چیخنے چلّانے لگی لیکن اُسے ان لٹیروں سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ سب ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے۔ اُس وقت تک ابو جندل مارا جا چکا تھا۔ شافعیہ نے اپنے چچا کو بُری طرح زخمی ہو کر گرتے دیکھا تھا۔

ایک لٹیرے نے دیکھا کہ اُس کے دو ساتھی ایک لڑکی کو اپنی اپنی طرف کھینچ رہے

ہیں اور آخر ہو گا یہ کہ دونوں اس لڑکی کی ملکیت پر ایک دوسرے کا خون بہا دیں گے۔ اُس نے آگے بڑھ کر اپنی تلوار سیدھی لڑکی کے پیٹ میں اتار دی اور اتاری بھی اتنی زور سے کہ اس کی نوک پیٹھ کی طرف سے باہر آ گئی۔

"بدبختو!" ـــــ اُس نے لڑکی کے پیٹ سے تلوار نکال کر کہا ـــــ "ایک لڑکی کے پیچھے ایک دوسرے کے دشمن نہ بنو۔ پہلے یہ خزانہ باہر نکالو پھر تمہارے لئے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں رہے گی"۔

تھوڑی ہی دیر بعد یہ تینوں بھی تلواروں اور برچھیوں سے کٹ کر گر پڑے اور ان کے کپڑوں کو بھی آگ لگ گئی۔ شافعیہ کو نہ کوئی دیکھ سکا نہ کوئی اُس تک پہنچا۔ اُس نے جب دیکھا کہ صرف دو آدمی ایک دوسرے کا خون بہانے کے لئے رہ گئے ہیں تو وہ جھکی جھکی سی اور کچھ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل وہاں سے نکلی اور غار کے دہانے سے باہر آ گئی۔

○

شافعیہ چٹانوں کی جن بھول بھلیوں میں پھنس گئی تھی ان سے اُس کا صرف چچا ابو جندل واقف تھا جو سب کو بڑی آسانی سے غار تک لے گیا تھا لیکن وہ چچا غار میں ہی رہ گیا تھا اور وہ زندہ نہیں تھا۔ شافعیہ کو تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ کدھر سے اندر آئے تھے۔ اگر دن کی روشنی ہوتی یا چاند پوری طرح روشن ہوتا تو شاید اسے یہاں سے نکلنے میں اتنی دشواری نہ ہوتی لیکن رات بڑی ہی تاریک تھی۔ وہ اب سوائے اللہ کے کسی سے بھی مدد نہیں مانگ سکتی تھی۔ اللہ ہی تھا جو اُسے راستے پر ڈال سکتا تھا۔ اُس کا یہ کمنا صحیح تھا کہ گناہگار چچا کے پاس رہتے ہوئے اُس نے اپنا دامن گناہوں سے پاک رکھا تھا۔ داستان گو پہلے سنا چکا ہے کہ ابو جندل نے شمیر ایلک کو بتایا تھا کہ یہ دونوں لڑکیاں اُس کی اپنی بیٹیاں ہوتیں تو وہ انہیں حسن بن صباح کی جھولی میں ڈال دیتا لیکن یہ دونوں اُس کے مرے ہوئے بھائی کی بیٹیاں تھیں اور انہیں وہ امانت سمجھتا تھا۔ شافعیہ کی چھوٹی بہن کے انداز کچھ اور تھے لیکن گمراہ ہونے سے پہلے ہی وہ تلوار کے ایک ہی وار سے مر گئی تھی۔ شافعیہ نے اپنے ایمان کو اور اپنی عصمت کو اللہ کی امانت سمجھ کر محفوظ رکھا تھا۔ اب وہ اللہ سے ہی رہنمائی اور روشنی مانگ رہی تھی۔

اُسے چلتے سرکتے خاصی دیر گزر گئی تھی۔ اُسے اچانک ایک گھوڑے کے ہنہنانے

کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک کر رُک گئی اور فوراً بعد تین چار گھوڑے اکٹھے ہنہنائے۔ شافعیہ نے ان آوازوں سے سمت کا اندازہ کیا اور اُسے یہ اندازہ ہُوا کہ گھوڑے زیادہ دور نہیں اور ہیں کس طرف۔ ان گھوڑوں میں اس کے اپنے گھوڑے بھی تھے جن پر یہ پارٹی یہاں آئی تھی۔ ان میں اُن ڈاکوؤں کے گھوڑے بھی تھے جو بعد میں غار تک پہنچے تھے۔ نہ جانے کیا وجہ تھی کہ گھوڑے اندر نہیں لے جائے جاتے تھے۔

تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک دو گھوڑے ہنہناتے تھے۔ اس سے شافعیہ کو اندازہ ہو جاتا تھا کہ کس سمت کو جا رہی ہے اور کس سمت کو جانا چاہیے۔ اس کے مطابق وہ مُڑتی اور آگے بڑھتی رہی اور آخر وہ ان بھول بھلیوں سے نکل گئی۔ باہر اگر کچھ روشنی تھی تو وہ ستاروں کی تھی۔ اُسے گھوڑے نظر آ گئے۔ تاریکی میں اپنا گھوڑا پہچاننا آسان نہ تھا۔ پہچاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ تمام گھوڑے تنومند اور اچھی نسل کے تھے۔

شافعیہ نے دو گھوڑے پکڑے ایک کی باگ دوسرے گھوڑے کی زین کے پیچھے باندھ لی پھر تین چار گھوڑوں سے کھانے پینے کی اشیاء کے تھیلے اتارے اور پانی کے دو مشکیزے بھی اتار لئے۔ ان تھیلوں اور مشکیزوں کو اُس نے پیچھے بندھے ہوئے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ دیا اور اگلے گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اُس کے پاس دو ہتھیار تھے۔ ایک تلوار اور دوسرا خنجر۔ گھوڑسواری کی وہ بڑی اچھی سوجھ بوجھ رکھتی تھی۔ اُس زمانے میں بچہ جب بھاگنے دوڑنے کے قابل ہو جاتا تھا تو اُسے جو کام سب سے پہلے سکھایا جاتا وہ گھوڑسواری تھی۔

شافعیہ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی لیکن ایسی نہیں کہ گھوڑا سرپٹ دوڑ پڑتا۔ وہ یہ خطرہ محسوس کر رہی تھی کہ غار میں سے کوئی ڈاکو زندہ نکل آیا ہو گا۔ وہ اگر دوڑتے گھوڑے کے ٹاپ سنتا تو اُس کے تعاقب میں آ جاتا۔ شافعیہ نے گھوڑے کو عام چال پر رکھا۔ ذہن پر زور دے کر اسے یاد کرنا پڑا کہ وہ اپنے چچا کے ساتھ کس طرف سے اِدھر آئی تھی۔ اُسے صحیح طور پر سمت یاد نہیں رہی تھی۔ اُس نے بہت سوچا اور بہت یاد کیا' آخر ایک طرف چل پڑی اور اپنے آپ کو یہ یقین دلا لیا کہ اِدھر سے ہی آئی تھی۔ وہ اگر مرد ہوتی تو کوئی خوف نہ ہوتا۔ اُس کے پاس تلوار تھی' خنجر تھا اور اس کے پاس دو گھوڑے بھی تھے۔ وہ خنجر اور تلوار چلانا جانتی تھی لیکن اُس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ بڑی ہی حسین اور

جوان لڑکی تھی۔ حسین بھی ایسی کہ کوئی اچھے کردار کا آدمی بھی اُسے دیکھتا تو نظرانداز نہ کر سکتا اور اُسے روک لیتا۔

وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ ریگستان میں چلی جا رہی ہے۔ کوئی ایک بھی درخت نظر نہیں آتا تھا۔ اُس کے دل پر خوف و ہراس تھا جس نے اُس کی نیند غائب کر دی تھی۔ یہ بھی اچھا تھا کہ وہ غنودگی میں نہ گئی اور بیدار رہی۔ وہ کان کھڑے کر کے سننے کی کوشش کر رہی تھی کہ اُس کے تعاقب میں کوئی آ تو نہیں رہا۔ زمین خاموش تھی' آسمان خاموش تھا اور رات پر ایسا سکوت طاری تھا کہ وہ اپنے دل کی دھڑکن بھی سن رہی تھی۔ اُس نے گھوڑے کو دوڑایا نہیں تاکہ گھوڑا تھک نہ جائے۔

صبح طلوع ہونے لگی اور شافعیہ کو زمین و آسمان نظر آنے لگے۔ وہ صحرا میں جا رہی تھی جہاں افق تک ریت ہی ریت تھی۔ صرف ایک طرف اسے افق پر یوں نظر آیا جیسے عمارتیں کھڑی ہوں۔ وہ اُسی طرف جا رہی تھی۔ سورج اوپر آتا چلا گیا اور تپش میں اضافہ ہوتا گیا۔ سورج جب سر پر آ گیا تو اُس نے گھوڑا روک لیا اور نیچے اُتری۔ دوسرے گھوڑے کے ساتھ باندھے ہوئے تھیلے میں سے کھانے کو کچھ نکالا اور مشکیزہ کھول کر پانی پیا اور پھر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ وہ چلتے گھوڑے پر کھاتی رہی۔ وہ زیادہ رکنا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے صرف یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ گھوڑوں نے نہ جانے کب سے پانی پیا ہُوا ہے اور یہ پیاس محسوس کریں گے جو صحرا میں ایک خطرہ بن سکتا ہے۔ اصل خطرہ تو وہ محسوس کرنے ہی لگی تھی۔ وہ یہ تھا کہ وہ جب اپنی پارٹی کے ساتھ اِدھر آئی تھی تو ایک صحرا راستے میں آیا تو تھا لیکن وہ یہ نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ غلط راستے پر چل نکلی تھی۔ وہ جدھر دیکھتی' اُسے صحرا نظر آتا اور جب پیچھے دیکھتی تو اُسے وہ پہاڑیاں اور چٹانیں نظر آتی تھیں جن میں وہ غار تھا اور جہاں سے وہ آ رہی تھی۔ وہ رات بھر سوئی نہیں تھی اور اُس پر خوف بھی طاری تھا اور پھر اُس نے جو کُشت و خون دیکھا تھا' وہ یاد آتا تو وہ اندر باہر سے کانپنے لگتی تھی۔ ہُوا یہ کہ اُس کا دماغ سوچنے کے قابل رہا ہی نہیں تھا۔

وہ اللہ کو یاد کرتی جا رہی تھی۔ اُس میں تبدیلی صرف یہ آئی تھی کہ پہلے وہ اللہ سے مدد مانگتی تو رو پڑتی لیکن اب اس نے اپنا حوصلہ اتنا مضبوط کر لیا کہ رونا چھوڑ دیا اور اپنے آپ میں دلیری پیدا کر لی۔ اب وہ اللہ سے یہی کہتی تھی کہ صرف اُس کی ذات اُسے راستہ دکھا سکتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتی کہ اللہ' مجھے ہمت و استقلال دے کہ میں ہر مصیبت کا

سامنا کر سکوں۔

سورج غروب ہو رہا تھا جب وہ اُس جگہ پر پہنچ گئی جو اس نے دیکھی اور اُسے عمارتیں سی نظر آئی تھیں۔ یہ صحرا کے اندر ٹیلے تھے جن کی ساخت دو منزلہ اور سہ منزلہ عمارتوں جیسی تھی۔ ان میں سے بعض ٹیلے ایسی شکل کے تھے جیسے کسی اونچی عمارت کا سامنے والا حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہو۔ یہ جگہ نشیبی علاقے میں تھی اور وہاں ریت کم اور مٹی زیادہ تھی۔ کہیں کہیں چھوٹے بڑے پتھر بھی نظر آتے تھے۔ ان بڑے ٹیلوں میں چھوٹے ٹیلے بھی تھے جن کی شکلیں عجیب و غریب تھیں۔ یہ سارا ماحول بڑا ہی ڈراؤنا تھا۔ گھاس کی ایک پتّی نظر نہیں آتی تھی۔ جوں جوں شام کا دھندلکا گہرا ہوتا جا رہا تھا' ان چھوٹے ٹیلوں کی شکلیں یوں لگتا تھا تبدیل ہوتی جا رہی ہوں۔ ان میں کوئی انسانی شکل کا اور کوئی ہاتھیوں جیسا تھا۔

شافعیہ کا گھوڑا اپنے آپ ہی تیز ہو گیا۔ تیز ہوتے ہوتے گھوڑا دوڑنے لگا اور آگے جا کر ایک ٹیلے سے بائیں کو گھوم گیا۔ وہاں ٹیلہ ختم ہوتا تھا۔ کچھ دُور ہی جا کر ایسی جگہ آ گئی جس کے اردگرد ایسے ہی ٹیلے کھڑے تھے اور درمیان میں کچھ ہرے پودے تھے۔ شافعیہ سمجھ گئی کہ گھوڑے نے پانی کی مُشک پائی ہے۔ صحراؤں میں چلنے والے گھوڑے پانی کی بُو پا لیا کرتے ہیں۔ شافعیہ نے لگام ڈھیلی چھوڑ دی اور گھوڑا دوڑتا ہُوا پانی پر جا کھڑا ہُوا۔ یہ تھوڑا سا پانی جمع تھا اور اس کے اِردگِرد ہری جھاڑیاں تھیں۔ پانی میں آسمان کا عکس نظر آ رہا تھا۔ شافعیہ گھوڑے سے اُتر آئی اور اس گھوڑے کی زین سے اُس نے دوسرے گھوڑے کو بھی کھول دیا تاکہ دونوں گھوڑے پانی پی لیں۔

گھوڑے پانی پی رہے تھے اور شافعیہ سوچ رہی تھی کہ اُسے رات یہیں گذارنی چاہئے لیکن پانی کے قریب نہیں کیونکہ اتنا وہ جانتی تھی کہ صحرائی درندے رات کو پانی پینے آتے ہیں اور وہ اُس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔

شافعیہ نے گھوڑے سے ایک تھیلا کھولا اور پانی کا مشکیزہ بھی اتارا اور ایک طرف بیٹھ کر کھانے لگی۔ اُس نے پانی پیا اور دیکھا کہ گھوڑے بھی پانی پی چکے تھے اور جھاڑیاں کھا رہے تھے۔ اُس نے گھوڑوں کو آزاد ہی رہنے دیا تاکہ وہ پیٹ بھر لیں۔

رات پوری طرح تاریک ہو گئی تھی۔ شافعیہ اُٹھی اور گھوڑوں کو پکڑ کر ایک طرف چل پڑی۔ وہ پانی سے دُور رہنا چاہتی تھی۔ اُس نے رات وہیں بسر کرنی تھی اور گھوڑوں

کو کہیں باندھنا تھا لیکن وہاں کوئی درخت نہیں تھا نہ کوئی اتنا بڑا پتھر تھا جس کے ساتھ وہ گھوڑے باندھ دیتی۔ اُس نے سوچا گھوڑوں کو اللہ کے سپرد کر کے سو جائے گی۔ ایک جگہ جا کر وہ لیٹ گئی اور گھوڑوں کو چھوڑ دیا۔ وہ اس قدر تھکی ہوئی تھی کہ لیٹتے ہی اُس کی آنکھ لگ گئی۔

کوئی گھوڑا ذرا سا بھی ہلتا تھا تو شافعیہ کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی اور اندھیرے میں ہر طرف دیکھتی۔ گھوڑے جہاں اُس نے چھوڑے تھے وہیں کھڑے تھے۔ اس طرح چار پانچ مرتبہ اُس کی آنکھ کھلی اور اُس نے بیٹھ کر ہر طرف دیکھا اور جب دیکھا کہ گھوڑے وہیں کھڑے ہیں تو پھر لیٹ گئی۔

○

آخری بار اُس کی آنکھ اُس وقت کھلی جب سورج کی پہلی کرنیں ٹیلوں کے اس خطّے میں داخل ہو چکی تھیں اور یہ خطّہ اللہ کے نور سے منّور ہو گیا تھا۔ شافعیہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ دیکھا' دونوں گھوڑے غائب تھے۔ وہ اُس طرف دوڑ پڑی جدھر پانی تھا اور گھنی جھاڑیاں بھی تھیں۔ دونوں گھوڑے جھاڑیاں کھا رہے تھے۔ اُس کے پاس کھانے کا سامان کافی تھا۔ اس نے گھوڑے کی زین سے ایک تھیلا کھولا اور اس میں سے کھانے کی اشیاء نکال کر ایک طرف بیٹھ گئی اور اطمینان سے کھانے لگی۔ پھر پانی پیا اور ایک گھوڑے کو دوسرے کے پیچھے باندھ کر سوار ہوئی اور چل پڑی۔ وہ اب اللہ کے بھروسے جا رہی تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہیں نہ کہیں تو جا ہی نکلے گی۔

زمین کو دیکھا تو اُسے کچھ اطمینان ہونے لگا۔ وہ اس لئے کہ زمین اب پہلے کی طرح ریتلی نہیں رہی تھی بلکہ مٹی بڑھتی جا رہی تھی اور گھوڑے کے سُموں سے دُھول اُڑتی تھی۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ زمین پر کسی انسان کے نقش پا نہیں تھے نہ کسی جانور کے پاؤں کے نشان نظر آتے تھے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس راستے سے کبھی کوئی نہیں گزرا یا عرصے سے اِدھر سے کسی مسافر کا گزر نہیں ہوا۔ زمین اوپر کو جا رہی تھی اور ٹیلے کم ہوتے جا رہے تھے۔

کچھ اور آگے گئی تو اُسے سورج نظر آیا جو اُفق سے کچھ اور اوپر اُٹھ آیا تھا۔ اُس نے گھوڑا روک لیا اور اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اُس نے ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے اور آسمان کی طرف دیکھا۔

"رات کی سیاہ کالی تاریکیوں سے اتنا روشن سورج طلوع کرنے والے اللہ!" ـــ اُس نے بلند آواز سے اللہ کو پکارا ـــ "میری زندگی کو اتنا تاریک نہ ہونے دینا اور مجھے جو تاریکیاں نظر آ رہی ہیں ان میں سے اپنے نُور کی صرف ایک کرن عطا کر دینا۔ میری آبرو کی حفاظت کرنا' جان جاتی ہے تو چلی جائے"۔

دعا سے اُسے روحانی تسکین سی محسوس ہوئی اور اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اُس کا حوصلہ جو دم توڑتا جا رہا تھا' پھر سے مضبوط ہو گیا ہے اور ایک غیبی ہاتھ ہے جو اُس کی حفاظت کر رہا ہے.... اُس کے نیچے گھوڑا عام چال سے چلا جا رہا تھا۔ شافعیہ نے یہ نہ سوچا کہ گھوڑے کو دوڑائے اور جہاں کہیں بھی پہنچنا ہے جلدی پہنچ جائے۔ اس نے دماغ حاضر رکھا۔ وہ جانتی تھی گھوڑا دوڑایا تو راستے میں ہی جواب دے جائے گا۔ اُس نے دوسرا گھوڑا اس لئے ساتھ لے لیا تھا کہ ایک تھک جائے تو دوسرے پر سوار ہو جائے۔

اب اس جگہ سے چلی تو دوسرے گھوڑے پر سوار ہوئی تھی۔ اب تو اسے امید کی ایک کرن نظر آنے لگی جو یہ کہ زمین ذرا ذرا اوپر جا رہی تھی اور کہیں کہیں ہری ہری گھاس بھی نظر آنے لگی تھی۔ اسی طرح اِکا دُکا درخت بھی دکھائی دینے لگا لیکن ان درختوں کی شکل و صورت ویسی نہیں تھی جیسی جنگلات کے درختوں کی ہوتی ہے۔ تنے تھے اور کچھ ٹہنیاں تھیں لیکن پتے بہت ہی تھوڑے۔

آخر ٹیلوں کا خطّہ ختم ہو گیا اور وہ جب بلندی پر پہنچی تو اس کے سامنے ایسی زمین تھی جس پر درخت بھی تھے اور ہریالی بھی نظر آ رہی تھی۔ اُس نے رُک کر پیچھے دیکھا تو اُسے ایسا لگا جیسے جہنم سے نکل آئی ہو اور آگے اس کے لئے جنّت ہی جنّت ہے۔ وہاں اونچی نیچی ٹیکریاں بھی تھیں اور زمین ہموار تو نہیں تھی لیکن اس کی جیسی بھی شکل تھی' اچھی لگتی تھی کیونکہ اس میں ہریالی تھی۔ وہ ناک کی سیدھ میں چلتی چلی گئی۔

سورج اوپر آ کر مغرب کی طرف چل پڑا تھا اور اُس وقت شافعیہ ایک جنگل میں داخل ہو چکی تھی۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ اب گھوڑوں کے بھوکا اور پیاسا رہنے کا کوئی خطرہ نہیں رہا تھا البتہ یہ خطرہ بڑھ گیا تھا کہ وہ حسین اور جوان لڑکی ہے اور اس جنگل میں اُسے ضرور کوئی نہ کوئی آدمی ملے گا۔ اُس نے اپنے آپ کو ایسے خطرے کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر دیا۔ اُس نے یہ بھی سوچا کہ خزانے والی پہاڑیوں تک پہنچنے سے پہلے ایک ایسی پہاڑی آئی تھی جس پر وہ سب چڑھے تھے اور اس کی پُل صراط جیسی چوٹی

پر کچھ دُور تک گئے تھے جہاں ذرا سا پاؤں پھسل جاتا تو گھوڑا اپنے سوار سمیت دور نیچے تک لڑھکتا چلا جاتا۔ یہ پہاڑی ایک روز پہلے آجانی چاہئے تھی لیکن اس کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ یہ تو شافعیہ نے پہلے ہی قبول کر لیا تھا کہ وہ بھٹک گئی ہے لیکن اس پہاڑی کو نہ دیکھ کر اُسے یقین ہو گیا کہ وہ راستے سے بہت دُور چلی آئی ہے اور اب نہ جانے کہاں جا نکلے یا کس انجام کو پہنچے۔

اُسے آسمان پر برسات کے بادلوں کے ٹکڑے منڈلاتے نظر آنے لگے۔ اُس نے دل ہی دل میں دعا کی کہ مینہ نہ برس پڑے۔ خزانے والے غار کی طرف جاتے ہوئے موسلادھار مینہ برسا تھا اور اُس کی پارٹی کو بڑی ہی سخت دشواری بھی پیش آئی تھی۔ اب وہ اکیلی تھی اور ڈرتی تھی کہ آگے سیلابی ندی آگئی تو اس کے لئے ایسی مشکل پیش آئے گی جو اس کے بس سے باہر ہو گی۔

وہ ایک بڑی اچھی جگہ رک گئی۔ گھوڑے سے کھانا کھول کر کھانے بیٹھ گئی اور گھوڑوں کو کھلا چھوڑ دیا کہ وہ بھی اپنا پیٹ بھر لیں۔ وہاں تو لب گھاس ہی گھاس تھی اور جھاڑیوں کی بھی بہتات تھی۔ اُسے غنودگی آنے لگی لیکن دن کے وقت وہ سونے سے گریز کر رہی تھی.... یہ خطرہ تو اُس کے ذہن میں ہر وقت موجود رہا کہ اُس کے تعاقب میں کوئی آرہا ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی اُس کے ذہن سے اٹھا کہ اس غار میں کوئی ڈاکو لٹیرا زندہ بھی رہا تھا یا نہیں؟ اُسے اس سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ وہ ڈرتی اس لئے تھی کہ تعاقب میں اگر کوئی آرہا ہے تو گھوڑوں کے قدموں کے نشان دیکھتا اس طرف پہنچ جائے گا۔ پھر وہ اپنے آپ کو یوں تسلی دیتی کہ کوئی ایک بھی زندہ نہیں بچا تھا۔

گھنٹہ ڈیڑھ آرام کر کے وہ پھر گھوڑے پر سوار ہوئی اور چل پڑی۔ شام تک اسے دو ندیوں میں سے گزرنا پڑا۔ دونوں کی گہرائی گھوڑوں کے گھٹنوں تک ہی تھی۔ اُسے وہ ندی یاد آئی جس میں سے گزر کر وہ گئی تھی۔ وہ سیلابی تھی اور خاصی گہری تھی۔ یہ دو ندیاں جو اب دیکھ رہی تھی، جاتے وقت یہ دو ندیاں راستے میں نہیں آئی تھیں۔ جنگل خوبصورت ہوتا جا رہا تھا۔

سورج غروب ہو گیا اور جنگل کے حُسن پر رات کا سیاہ پردہ پڑتا چلا گیا۔ اب اُس کے دل میں یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ رات کو سوئی تو درندے آجائیں گے۔ وہ جانتی تھی کہ ایسے جنگلوں میں شیر اور بھیڑیے ہوتے ہیں۔ خزانے کی طرف جاتے ہوئے ان کا تصادم ایک

شیر کے ساتھ ہُوا تھا اور پھر انہوں نے بڑا زہریلا اور بڑا ناگ بھی دیکھا تھا۔ انہوں نے مل جل کر ناگ کو مار لیا تھا اور شیر کو بھی لیکن ایک گھوڑا ضائع ہو گیا تھا۔ اُس نے سوچا کوئی ایسا درخت نظر آجائے جس کا تنہ خاصا چوڑا ہو اور وہ اس پر چڑھ کر سو جائے لیکن یہ خیال اس خطرے سے ذہن سے نکال دیا کہ سوتے سوتے اوپر سے گر پڑے گی اور ہو سکتا ہے اتنی چوٹ لگے کہ وہ سفر کے قابل ہی نہ رہے۔

اللہ توکل وہ ایک ٹیکری کے دامن میں رُک گئی اور دونوں گھوڑے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیئے۔ وہ جہاں بیٹھی تھی وہاں ٹیکری تھوڑی سی عمودی تھی۔ اس نے وہیں ٹیکری کے اس حصے کے ساتھ پیٹھ لگالی اور ارادہ کیا کہ جتنی دیر جاگ سکتی ہے جاگے گی۔ اس نے تلوار نیام سے نکال کر اپنے پاس رکھ لی.... اس نے جاگنے کا ارادہ کیا تھا لیکن جوانی کی عمر تھی اور تھکان بھی تھی، بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھ لگ گئی۔

○

گھوڑے بڑی زور سے ہنہنائے اور بدکے۔ شافعیہ ہڑبڑا کر جاگ اُٹھی اور اُس کا ہاتھ تلوار کے دستے پر گیا اور بڑی تیزی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ گھوڑے رسّیاں تڑوا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی شافعیہ نے دوڑتے قدموں کی آوازیں اور ایسی آوازیں سُنیں جیسے کُتے غرّا اور بھونک رہے ہوں۔ چاند اوپر آگیا تھا۔ اُن دنوں چاند آدھی رات کے بعد اوپر آتا تھا۔ اس چاندنی میں اُسے ایک ہرن نظر آیا جو بھاگا جا رہا تھا اور اس کے پیچھے چار پانچ بھیڑیئے لگے ہوئے تھے۔

ہرن اور بھیڑیئے گھوڑوں کے قریب سے گزرے تھے۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہوئی کہ ہرن گر پڑا۔ ابھی وہ اٹھ ہی رہا تھا کہ بھیڑیئے اُس پر جا پڑے اور پھر اُسے بھاگنے نہ دیا۔ شافعیہ مطمئن ہو گئی کہ بھیڑیوں کو پیٹ بھرنے کے لئے شکار مل گیا ہے۔ ورنہ درندہ بھوکا ہو تو بہت بڑا خطرہ بن جاتا ہے۔ اس لحاظ سے بھیڑیوں والا خطرہ ٹل گیا تھا لیکن گھوڑے بُری طرح بدکے تھے۔ شافعیہ گھوڑوں تک گئی اور ان کے درمیان کھڑے ہو کر دونوں کی گردنوں کو تھپتھپانے لگی اور باری باری ان کے منہ کے ساتھ منہ لگایا جس سے گھوڑے کچھ سکون میں آگئے۔ اچانک شافعیہ کو خیال آیا کہ جہاں بھیڑیئے ہیں وہاں شیر بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ ڈرنے لگی کہ شیر آگیا تو وہ بھیڑیوں سے ان کا شکار چھیننے گا اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شیر جب دیکھے کہ وہ شکار تو بھیڑیوں نے مار لیا ہے تو وہ گھوڑوں کی طرف آ

جائے گا۔

اس خیال نے اسے خاصا ڈرا دیا لیکن اس کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں تھا سوائے اس کے کہ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی اور اس نے گھوڑوں پر پہرا دینا شروع کر دیا۔ اُس نے دوسرے ہاتھ میں خنجر لے لیا۔ اُسے چاند سے اندازہ ہُوا کہ رات آدھی سے کچھ زیادہ گزر گئی ہے۔ اس نے اللہ کو یاد کرنا شروع کر دیا اور اپنے دل میں سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔ جب ٹہلتے ٹہلتے تھک گئی تو بیٹھ گئی اور پیٹھ اسی درخت کے ساتھ لگالی جس کے ساتھ گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ اُس نے نیند پر قابو پانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی اور بیٹھے بیٹھے اُس کی آنکھ لگ گئی۔

بہت دیر گزر گئی تو گھوڑے ایک بار پھر بدکے اور ہنہنائے۔ شافعیہ بڑی تیزی سے اٹھی اور تلوار اور خنجر آگے کر لئے۔ اُس نے دیکھا' پندرہ بیس قدم دُور بھیڑیئے بڑے آرام سے واپس جا رہے تھے۔ انہیں اب کسی اور شکار کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے پیٹ بھر گئے تھے۔ شافعیہ نے چاند کو دیکھا جو خاصا آگے نکل گیا تھا۔ وہ پھر درخت کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور ایک بار پھر نیند نے اُسے خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو اس دن کا سورج افق سے اٹھ آیا تھا۔ شافعیہ اٹھی اور اُس نے گھوڑوں کی رسّیاں کھول دیں تاکہ یہ چر چگ لیں۔ اُسے اب آگے جانا تھا۔ معلوم نہیں یہ کون سا خطہ تھا کہ اسے کوئی آبادی' کوئی چھوٹی سی بستی اور ایک بھی انسان نظر نہیں آیا تھا نہ کسی انسان کے قدموں کے نشان نظر آتے تھے۔

گھوڑے گھاس چر رہے تھے اور شافعیہ ایک تھیلا کھول کر اپنا پیٹ بھرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھی اور پہلے کی طرح ایک گھوڑے کو دوسرے کے پیچھے باندھ کر سوار ہو گئی اور اللہ کا نام لے کر چل پڑی۔

جنگل ویسا ہی تھا جیسا وہ دیکھتی چلی آرہی تھی' اب یہ تبدیلی آئی تھی کہ ٹیکریاں ذرا بڑی ہو گئی تھیں اور ان ٹیکریوں پر بھی گھاس تھی' جھاڑیاں تھیں اور درخت بھی تھے۔ وہ چلتی چلی گئی اور تقریباً" آدھا دن گزر گیا۔ وہ کچھ دیر کے لئے رکنے کی سوچ رہی تھی کہ اُسے دوڑتے گھوڑے کے ٹاپ سنائی دینے لگے۔ پہلے تو اُس نے اپنے آپ کو یہ دھوکا دیا کہ اُس کے کان بج رہے ہیں لیکن دوڑتے گھوڑے کے قدموں کی دھمک بلند ہوتی جا رہی تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ گھوڑا اسی طرف آرہا ہے۔

شافعیہ نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ چھپنے کی کوئی جگہ نظر آجائے لیکن دو گھوڑوں کو چھپانا ناممکن تھا۔ وہ اکیلی ہوتی تو کسی گھنی جھاڑی کے پیچھے چھپ سکتی تھی۔ شافعیہ کو اس گھوڑ سوار کا سامنا کرنا ہی تھا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ جس ٹیکری کے ساتھ لگ کر وہ بیٹھی تھی' اسی کی اوٹ میں یعنی پچھلی طرف چلی جائے۔ وہ یہ ارادہ اس امید پر باندھ رہی تھی کہ گھوڑ سوار اس طرف سے آگے نکل جائے گا لیکن اب چھپنے کو وقت گزر گیا تھا۔ ایک ہرن اپنی پوری رفتار سے دوڑا آرہا تھا اور یہ ہرن اُس کے قریب سے گزر گیا۔ شافعیہ نے دیکھا کہ ہرن کی دم کے ساتھ پیٹھ پر تیر اترا ہُوا تھا۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ جو گھوڑ سوار اس کے تعاقب میں آرہا ہے' تیر اسی نے اس پر چلایا ہو گا اور وہ کوئی شکاری ہو گا۔

وہ سوچ ہی رہی تھی کہ کھڑی رہے یا وہاں سے ہٹ جائے کہ اتنے میں ایک گھوڑ سوار ایک ٹیکری کے عقب سے سامنے آیا جس کا گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے شافعیہ کے قریب آگیا اور شافعیہ کو دیکھ کر اُس نے باگ کھینچی۔ گھوڑا دو چار قدم پاؤں جماتے جماتے آگے نکلا اور رُک گیا۔ گھوڑ سوار سیاہ فام تھا۔ اُس کے پیچھے دو اور گھوڑ سوار آگئے۔ وہ بھی سیاہ فام تھے۔ آگے والے گھوڑ سوار کا لباس ظاہر کرتا تھا کہ وہ کسی قبیلے کا سربراہ یا سردار ہے اور جو گھوڑ سوار اس کے پیچھے آرہے تھے' وہ اس کے نوکر یا غلام لگتے تھے۔

شافعیہ کو یاد آیا کہ اُسے کسی نے بتایا تھا کہ جنگلوں میں کچھ قبیلے ہیں جو تہذیب و تمدن سے دور رہتے ہیں اور یہ قبیلے خاصے وحشی ہیں۔ اُسے یہ بھی معلوم ہُوا تھا کہ ان قبیلوں کا اپنا ہی تہذیب و تمدن اور اپنا ہی مذہب ہے۔ کبھی یہ بُت پرست ہُوا کرتے تھے لیکن انہوں نے اسلام کا اتنا سا ہی اثر قبول کیا کہ بُت پرستی چھوڑ دی لیکن اپنے اپنے عقیدوں اور مذہبی رسم و رواج کو نہ چھوڑا۔

وہ گھوڑ سوار وحشی تھا یا تہذیب یافتہ' اس سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ شافعیہ کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جس میں حیرت بھی تھی اور ہوس کاری کا تاثر بھی تھا۔ شافعیہ اُسے چپ چاپ دیکھے جا رہی تھی۔ اُس نے خوف و ہراس جھٹک ڈالا اور چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہ آنے دیا جس سے پتہ چلتا کہ وہ اس سیاہ فام سے خوف و ہراس محسوس کر رہی ہے۔ یہ سوار گھوڑے سے اُتر آیا اور آہستہ آہستہ شافعیہ کے قریب آگیا۔ اُس کے دونوں نوکر گھوڑوں سے اُترے اور اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے آقا ابھی انہیں کوئی حکم

دے گا۔ آقا نے اپنی زبان میں شافعیہ کے ساتھ بات کی۔ شافعیہ نے سر ہلایا جس کا مطلب تھا کہ وہ اُس کی زبان نہیں سمجھتی۔ وہ مسکرایا۔

"کیا تم انسان ہو؟" — گھوڑ سوار نے اب اس خطّے کی زبان میں پوچھا — "یقین نہیں آتا"۔

"ہاں، میں انسان ہوں" — شافعیہ نے جواب دیا۔

شافعیہ کے لب و لہجے اور انداز میں ذرا سا بھی خوف و ہراس نہیں تھا۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ ذرا سے بھی خوف کا اظہار کیا یا اس پر اپنی مجبوری اور بے بسی ظاہر کی تو یہ شخص شیر ہو جائے گا۔

"کون ہو تم؟" — سوار نے جو یقیناً "اپنے قبیلے کا سردار تھا" پوچھا — "اور اس جنگل میں اکیلی کیا کر رہی ہو؟..... معلوم ہوتا ہے تمہارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں"۔

"ہوں تو انسان لیکن روح سمجھ لو" — شافعیہ نے کہا — "حسن بن صباح کا نام تو تم نے سنا ہی ہو گا!"

"شیخ الجبل..... امام!" — سردار نے کہا — "میں نے اُس کے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔ وہ آسمان سے آگ کی آغوش میں زمین پر اُترا تھا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے اور ٹھیک سنا ہے کہ وہ آسمانی جنّت کو زمین پر لے آیا ہے"۔

"میں اس جنّت کی حُور ہوں" — شافعیہ نے کہا اور اس سے پوچھا — "کیا تم نے امام کی بیعت نہیں کی؟"

"نہیں!" — سردار نے جواب دیا — "ہمارا اپنا مذہب ہے۔ ہمارا یہ رواج ہے کہ جو قبیلے کا سردار ہوتا ہے وہ مذہبی پیشوا بھی ہوتا ہے۔ میں اپنے قبیلے کا سردار اور مذہبی پیشوا ہوں..... تم اکیلی کیوں ہو؟"

"شکار کے لئے آئی تھی" — شافعیہ نے کہا — "ایک ہرن کے تعاقب میں یہاں تک آ نکلی۔ میں دانستہ چھپ گئی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ میرے ساتھ جو آدمی شکار کھیلنے آئے تھے، وہ مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مایوس ہو جائیں اور واپس چلے جائیں۔ میں دراصل آزاد گھومنا پھرنا چاہتی تھی۔ اب واپس جا رہی ہوں لیکن راستہ یاد نہیں رہا"۔

شافعیہ نے کچھ اور ایسے ہی جھوٹ بولے اور اپنا دماغ حاضر رکھا۔

"میں نے اس جنگل میں کسی اور آدمی کو نہیں دیکھا" — سردار نے کہا — "کیا لوگ تمہیں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے ہوں گے؟"

"چلے گئے ہوں گے!" — شافعیہ نے جواب دیا — "میں اکیلے جانا چاہتی ہوں لیکن ابھی میں واپس نہیں جاؤں گی کیونکہ میں ایک اور جگہ جانا چاہتی ہوں۔ میں بھٹک نہ جاتی تو اب تک یہاں سے نکل گئی ہوتی۔ مجھے کچھ خیال نہیں رہا ہم کس طرف سے آئے تھے"۔

"کہاں جانا چاہتی ہو؟" — سردار نے پوچھا۔

"قلعہ وسم کوہ!" — شافعیہ نے جواب دیا — "کیا تم مجھے وہاں تک کا راستہ بتا سکتے ہو؟..... میں نہیں جانتی میں کس سمت کو جا رہی ہوں"۔

"کیا شیخ الجبل میں اتنی روحانی طاقت نہیں؟" — سردار نے پوچھا اور کہا — "اسے تو گھر بیٹھے معلوم ہو جانا چاہئے کہ تم کہاں ہو۔ میں نے تو سنا ہے کہ اُس میں ایسی روحانی قوت ہے کہ زمین کی ساتویں تہہ تک کے راز پا لیتا ہے"۔

"اُسے کوئی بتائے گا تو وہ میرا پتہ چلائے گا" — شافعیہ نے کہا — "اُسے کوئی بھی نہیں بتائے گا کہ میں جنگل میں اکیلی رہ گئی ہوں..... کیا تم مجھے راستہ بتا سکتے ہو؟"

"بتا سکتا ہوں" — سردار نے جواب دیا — "لیکن یہاں نہیں بتاؤں گا۔ تم میرے علاقے میں ہو اور میں تمہارا میزبان ہوں۔ میں تمہیں اپنی بستی میں نہیں لے جاؤں گا، بستی بہت دُور ہے۔ یہاں میں ایک جگہ خیمہ زن ہوں، تمہیں وہاں لے جاؤں گا اور وہاں تمہیں راستہ سمجھاؤں گا"۔

"اگر میں تمہارے خیمے میں نہ جاؤں تو؟" — شافعیہ نے پوچھا۔

"تو پھر اس جنگل میں بھٹکتی رہو" — سردار نے مسکراتے ہوئے کہا — "اس جنگل سے نکلنا آسان کام نہیں اور یہاں خطرہ یہ ہے کہ یہاں بھیڑیئے بھی ہیں، شیر بھی ہیں اور ایک سیاہ رنگ کا شیر بھی دیکھنے میں آیا ہے جو بہت خطرناک درندہ ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری تلاش میں آنے والوں سے پہلے ان درندوں میں سے کوئی تم تک پہنچ جائے..... تمہیں خیمے میں اس لئے لے جا رہا ہوں کہ تم زبانی وسم کوہ تک کا راستہ نہیں سمجھ سکو گی۔ میں سفید کپڑے پر راستہ بنا کر تمہیں دوں گا اور جو نمایاں نشانیاں راستے میں آئیں گی وہ نشان لگا کر تمہیں بتاؤں گا۔ بہتر ہے میرے ساتھ چلی چلو"۔

شافعیہ نے کچھ دیر سوچا اور بہتر یہی سمجھا کہ یہ خطرہ مول لے لیا جائے اور اس
شخص سے راستہ سمجھ لیا جائے۔ اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا۔ اُس نے اس
فارم سردار کے ساتھ جانے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔

○

شافعیہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئی اور اُس کے ساتھ چل پڑی۔ اُس کا سیاہ فام
میزبان اپنے شکار کو بھول گیا اور واپس اپنے خیمے کی طرف چل پڑا۔ وہ بولتا کم تھا اور
شافعیہ کو اوپر سے نیچے تک بار بار دیکھتا اور حیران بھی ہوتا اور خوش بھی۔ اُس کا چہرہ بتا رہا
تھا کہ اس ہرن کے ساتھ اُسے کوئی دلچسپی نہیں رہی جس کی پیٹھ میں اس کا تیر اُترا ہوا
تھا۔ اُسے بڑا ہی خوبصورت شکار مل گیا تھا۔ شافعیہ شاید اس کی نظروں کو سمجھ رہی تھی۔
"میرا نام زرتوش ہے" ـــــ راستے میں سردار نے شافعیہ کو بتایا ـــــ "میں ابھی تین
چار دن اسی جنگل میں رہوں گا۔ جب واپس جاؤں گا تو میرے ساتھ دو تین ہرن ہوں
گے اور شاید ایک شیر بھی ہو"۔
شافعیہ کو اُس کے شکار کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس سے صرف راستہ
سمجھنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے پوچھ رہی تھی کہ وہ اس جنگل سے خیریت سے نکل بھی
جائے گی یا نہیں!
"میں اپنے آدمی تمہارے ساتھ بھیج دوں گا" ـــــ زرتوش نے کہا ـــــ "وہ تمہیں
خطرناک علاقے سے نکال کر واپس آئیں گے"۔
زرتوش کی خیمہ گاہ وہاں سے بہت دُور تھی۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ دو گھنٹے گزر
گئے تھے۔ وہاں چار پانچ خیمے لگے ہوئے تھے اور ان کے باہر پانچ سات آدمی کوئی نہ کوئی
کام کر رہے تھے۔ زرتوش نے شافعیہ کو بتایا کہ وہ سب اس کے نوکر چاکر ہیں اور ان میں
باورچی بھی ہے۔... ایک خیمہ جو دوسروں سے بڑا اور شکل و صورت میں مختلف تھا الگ
تھلگ نظر آ رہا تھا۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی، یہ زرتوش کا خیمہ تھا۔ زرتوش اور
شافعیہ گھوڑوں سے اترے اور نوکر دوڑے آئے اور گھوڑے انہوں نے پکڑ لئے۔
زرتوش شافعیہ کو اپنے خیمے میں لے گیا۔
فرش پر ایک بستر بچھا ہوا تھا۔ نیچے روئی کے گدّے تھے اور ان پر بڑی خوبصورت
اور قیمتی چادر بچھی ہوئی تھی۔ خیمے میں کچھ اور چیزیں بڑے قرینے سے اور سلیقے سے

رکھی ہوئی تھیں۔ زرتوش نے شافعیہ کو بستر پر بٹھایا اور ایک خادم کو بلا کر کہا کہ وہ کھانا
لے آئے۔
کھانا آیا تو شافعیہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یہ بھنے ہوئے مختلف پرندے تھے۔ یہ اتنے
زیادہ تھے کہ دس بارہ آدمی کھا سکتے تھے۔ ان کے ساتھ روٹی نہیں تھی۔
"شکار پر آ کر میں صرف شکار کھایا کرتا ہوں" ـــــ زرتوش نے کہا ـــــ "تم بھی یہ
پرندے کھاؤ گی، روٹی نہیں ملے گی نہ تمہیں روٹی کی ضرورت محسوس ہو گی"۔
خادم پھر آیا اور ایک صراحی اور دو پیالے رکھ کر چلا گیا۔ زرتوش نے صراحی سے
دونوں پیالے بھرے اور ایک پیالہ شافعیہ کے آگے کر دیا۔ شافعیہ بُو سے سمجھ گئی کہ یہ
شراب ہے۔ اُس نے شراب پینے سے انکار کر دیا۔
"کیوں؟" ـــــ زرتوش نے حیرت سے کہا ـــــ "شیخ الجبل حسن بن صباح کی حُور ہو
کر تم شراب پینے سے انکار کرتی ہو؟... کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"
"ہاں، اس کی ایک وجہ ہے" ـــــ شافعیہ نے کہا ـــــ "مجھے ایک بزرگ نے بتایا تھا
کہ شراب چہرے کی رونق ختم کر دیتی ہے۔ میں بڑھاپے میں بھی جوانوں جیسی رہنا
چاہتی ہوں"۔
شافعیہ محتاط تھی کہ اُس کے منہ سے یہ نہ نکل جائے کہ وہ مسلمان ہے۔
وہ کھانا کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ زرتوش نے بہت اصرار کیا کہ وہ
تھوڑی سی شراب پی لے لیکن اُس نے نہ پی۔ کھانے سے فارغ ہوئے اور نوکر برتن اُٹھا
کر لے گیا تو شافعیہ نے زرتوش سے کہا کہ اب وہ اُسے راستہ سمجھا دے۔
"کیا جلدی ہے؟" ـــــ زرتوش نے کہا ـــــ "تم اسی وقت تو روانہ نہیں ہو
سکتیں!"
"میں اسی وقت روانہ ہونا چاہتی ہوں" ـــــ شافعیہ نے کہا ـــــ "صبح تک میں اپنی
منزل کے کچھ اور قریب ہو جاؤں گی۔ میں رات ضائع نہیں ہونے دوں گی"۔
"میری میزبانی کا تقاضہ کچھ اور ہے" ـــــ زرتوش نے کہا ـــــ "میں اپنے قبیلے کے
رسم و رواج کا پابند ہوں۔ میرے خادم سارے قبیلے میں مشہور کر دیں گے کہ میں نے
مہمان کو رات کو رخصت کر دیا تھا۔ مجھ پر لعنت ہے کہ میں مہمان کو اور وہ بھی ایک
عورت کو رات کو ہی رخصت کر دوں"۔

"تو پھر مجھے راستہ بتا کر دکھائیں" —— شافعیہ نے کہا۔

سورج غروب ہو گیا تھا اور خیمے میں مٹی کے دو دیئے جلا کر رکھ دیئے گئے تھے۔ زرتوش نے ایک نوکر کو بلایا اور اُسے کہا کہ وہ گز بھر سفید کپڑا لے آئے اور جل ہوئی لکڑیوں کے دو تین کوئلے بھی لیتا آئے۔

کپڑا آگیا جو ایک چادر سے پھاڑا گیا تھا۔ نوکر تین چار کوئلے بھی رکھ کر خیمے سے نکل گیا۔ زرتوش نے یہ کپڑا لکڑی کی اُس چوکی پر رکھا جس پر کچھ دیر پہلے انہوں نے کھانا کھایا تھا۔ کپڑے کو ہر طرف سے کھینچ کر زرتوش اس پر کوئلے سے لکیریں ڈالنے لگا۔ اس دوران اس نے شافعیہ کو کچھ بھی نہ بتایا سوائے اس کے کہ جہاں سے اس کی لکیر شروع ہوئی تھی' وہ بتایا کہ تم اس وقت یہاں ہو۔ پھر وہ لکیر ڈالتا ہی چلا گیا۔ یہ سیدھی لکیر نہیں تھی بلکہ ٹیڑھی میڑھی سی تھی اور زرتوش اس پر کچھ نشان سے بھی لگاتا جا رہا تھا۔

بہت دیر بعد کپڑے پر کئی ایک لکیریں اس طرح بن گئیں جس طرح نقشے پر دریا دکھلائے جاتے ہیں۔ اُس نے یہ کپڑا شافعیہ کو دکھایا اور کہا کہ یہ کپڑا وہ اپنے ساتھ لے جائے گی اور اس کے بغیر وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکے گی۔ زرتوش نے اُسے بتانا شروع کر دیا کہ اس راستے پر اس سمت کو جائے گی تو اتنی دور ایک چشمہ ملے گا۔ اس طرح وہ اُسے تفصیلات بتاتا رہا اور پھر یہ بھی بتایا کہ اس مقام پر آ کر کوہستانی علاقہ شروع ہو گا اور اس میں فلاں فلاں نشانیاں دیکھ کر راستہ دیکھنا ہو گا۔

شافعیہ نے محسوس کیا کہ راستہ زبانی یاد نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ کپڑا ساتھ ہونا لازمی تھا۔ اُسے امید یہی تھی کہ اس کا میزبان اُسے کہے گا کہ یہ کپڑا اپنے پاس رکھنا اور دیکھ دیکھ کر چلنا لیکن میزبان نے کپڑا تہہ کر کے اپنے چغے کی اندر والی جیب میں رکھ لیا۔

"کیا یہ کپڑا مجھے نہیں دو گے؟" —— شافعیہ نے پوچھا۔

"تمہارے لئے ہی تو یہ ٹیڑھی سیدھی لکیریں ڈالی ہیں" —— زرتوش نے جواب دیا —— "لیکن ایک شرط ہے جو پوری کر دو گی تو یہ کپڑا تمہارے حوالے کر دوں گا اور اپنے دو آدمی تمہارے ساتھ محافظوں کے طور پر بھیجوں گا۔ کھانے پینے کا ایسا سامان ساتھ دوں گا جو تم نے حسن بن صباح کی جنت میں بھی کبھی نہیں کھایا ہو گا"۔

شافعیہ نے صاف طور پر محسوس کیا کہ اس شخص کا لب و لہجہ بدلا ہوا ہے۔ اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں بھی کوئی اور ہی تاثر آگیا تھا۔ اُس پر شراب کا نشہ بھی طاری

تھا۔

"شرط کیا ہے؟" —— شافعیہ نے پوچھا۔

"آج رات تم میری مہمان ہو گی" —— زرتوش نے بازو لمبا کر کے شافعیہ کو اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا —— "کل رات بھی تم میرے ساتھ گزارو گی۔ اب خود ہی سمجھ لو میری شرط کیا ہے"۔

"ہاں میں سمجھ گئی ہوں" —— شافعیہ نے کہا —— "تم میری عصمت اور آبرو کا سودا کر رہے ہو۔ اگر میں یہ سودا قبول نہ کروں تو؟"

"تو ہمیشہ میرے ساتھ رہو گی" —— زرتوش نے کہا —— "میں تمہیں اپنی لونڈی بنا کر رکھوں گا۔ اگر مجھے پریشان کرو گی یا بھاگنے کی کوشش کرو گی تو میں تمہیں بڑی ہی بُری موت ماروں گا"۔

"کیا تم بھول گئے ہو میں کون ہوں؟" —— شافعیہ نے کہا —— "میں شیخ الجبل کی بڑی قیمتی ملکیت ہوں۔ تم جانتے ہو حسن بن صباح اللہ کا اُتارا ہُوا امام ہے اور اس میں اتنی طاقت ہے کہ اُسے پتہ چل جائے گا میں کہاں ہوں۔ تم یہ نہیں جانتے کہ وہ تمہیں کس انجام کو پہنچائے گا۔ آدھا زمین میں گاڑ کر وہ تم پر خونخوار کتے چھوڑ دینے کا حکم دے گا اور تمہارے قبیلے کی تمام لڑکیوں کو یہاں سے اٹھوا کر قلعہ الموت میں اکٹھا کر لے گا"۔

"جانتا ہوں" —— زرتوش نے کہا —— "بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ حسن بن صباح اللہ کا نہیں ابلیس کا بھیجا ہُوا امام ہے اور اس کے پاس وہی طاقت ہے جو ابلیس کے پاس ہوتی ہے اور مجھ جیسے سردار ایسی طاقت سے محروم ہوتے ہیں۔ تم جس عصمت اور آبرو کا سودا قبول نہیں کر رہیں' وہ عصمت اور آبرو تمہارے پاس ہے ہی نہیں۔ میں نے تم جیسی حسین لڑکیاں تو دیکھی ہیں لیکن کبھی کسی کو ہاتھ لگا کر نہیں دیکھا۔ میں تمہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ زندگی میں پہلی بار تم جیسی شگفتہ کلی میرے ہاتھ آئی ہے۔ میں تمہارے حسن اور جوانی سے پورا پورا لطف اٹھاؤں گا۔ ... کیا تم میری اس شرافت کی قدر نہیں کرو گی کہ میں نے تمہیں صرف دو راتیں رکھنے کے لئے کہا ہے؟ اس کے بعد تم آزاد ہو گی اور میرے آدمی تمہارے ساتھ جائیں گے"۔

"میں نے بڑے ہی بدصورت اور شیطان فطرت آدمی دیکھے ہیں" —— شافعیہ نے

کہا ــــ "لیکن کبھی کسی کے ساتھ واسطہ نہیں پڑا تھا۔ تم پہلے بدصورت آدمی ہو جس کے جال میں پھنسی ہوں۔ تم دو راتیں کہتے ہو؟ میں دو لمحے بھی یہاں ٹھہرنا گوارا نہیں کروں گی.... اپنا انجام سوچ لو"۔

زرتوش طنزیہ سی ہنسی ہنس پڑا اور شافعیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں نے تمہیں پہلی نظر دیکھا تو یقین نہیں آیا تھا کہ تم انسان ہو" ــــ زرتوش نے کہا ــــ "پھر یقین ہو گیا کہ تم انسان ہی ہو.... یہ بتا دو کہ تم یہاں اکیلی کس طرح آئی ہو اور کس طرح راستہ بھول گئی ہو؟ یہ سُن لو کہ تم میری شرط پوری کئے بغیر یہاں سے جا نہیں سکو گی۔ اگر جان کی بازی لگاؤ گی تو میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا.... بولو کہاں سے آئی ہو اور کہاں جا رہی ہو!"

شافعیہ گہری سوچ میں کھو گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ اس شخص کو اپنی اصلیت بتا دے اور یہ بھی کہ وہ اپنے چچا وغیرہ کے ساتھ ایک خزانہ اٹھانے گئی تھی اور وہاں سب قتل ہو گئے ہیں۔ خزانے کے خیال سے شافعیہ کا دماغ روشن ہو گیا۔ اُس نے سوچا کہ اس شخص کو خزانے کا لالچ دیا جائے تو یہ بہت خوش ہو گا اور جان بخشی کر دے گا.... شافعیہ نے اُسے خزانے کے متعلق سب کچھ بتا دیا اور یہ بھی کہ کس طرح وہ بھی اپنے چچا کے ساتھ اس غار تک گئی تھی اور کس طرح کچھ ڈاکو اور لٹیرے آ گئے جو جانتے تھے کہ یہاں خزانہ ہے۔ شافعیہ نے اسے یہ ساری واردات سنا دی لیکن اپنے متعلق یہی بیان رکھا کہ وہ حسن بن صباح کی جنت کی حور ہے اور خزانے کے لالچ میں آ گئی تھی۔

"میں تمہیں اس جگہ کا راستہ بتا دیتی ہوں" ــــ شافعیہ نے کہا ــــ "دو دنوں کی مسافت ہے۔ وہاں اب سوائے کٹی اور جلی ہوئی لاشوں کے کچھ نہیں ہو گا۔ جاؤ اور وہ بکس اٹھا کر لے آؤ"۔

"بدقسمت اور بے عقل لڑکی!" ــــ زرتوش نے کہا ــــ "میں جانتا ہوں تم جھوٹ نہیں بول رہیں۔ تم جانتی ہو میں خزانے کی طرف چل پڑا تو تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ تم نے مجھے دھوکہ نہیں دیا لیکن وہ سب لوگ جو اس غار میں خزانے پر مارے گئے ہیں، انہوں نے اپنے آپ کو دھوکا دیا تھا۔ ہم لوگ اس خزانے کے لالچ میں کبھی نہیں آئے۔ ان خزانوں پر بڑے بڑے جابر بادشاہ کٹ مرے ہیں"۔

"تم وہاں جاؤ تو سہی!" ــــ شافعیہ نے کہا ــــ "اب وہاں مرنے مارنے والا کوئی

نہیں آئے گا۔ وہ جو آئے تھے وہ اس خزانے کے حصہ دار تھے اور وہ تمام خزانہ خود لے جانا چاہتے تھے"۔

"میں کہہ رہا ہوں یہ لالچ مجھے نہ دو" ــــ زرتوش نے کہا ــــ "ہم لوگ تمہاری تہذیب سے، تمہارے رہن سہن سے اور تمہارے شاہانہ طور طریقوں سے دُور جنگلوں میں رہنے والے لوگ ہیں۔ تم ہمیں جنگلی کہہ لو، وحشی اور درندے کہہ لو لیکن ہم جو کچھ بھی ہیں، اپنے آپ میں خوش اور مطمئن ہیں.... تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ یہ لوگ چھپا ہُوا خزانہ اٹھانے گئے تو سب مارے گئے بلکہ جل بھی گئے۔ ہمارے بزرگ ہمیں بتا گئے ہیں کہ کبھی کسی چھپے ہوئے اور مدفون خزانے کے لالچ میں نہ آنا۔ لُوٹا ہُوا خزانہ جہاں کہیں بھی چُھپا کر رکھا جائے، وہاں بدروحوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ یہ بدروحیں سانپوں کی شکل میں ظاہر ہو سکتی ہیں یا بڑے زہریلے بچھّو بن جاتی ہیں۔ خزانے تک پہنچنے والے جونہی خزانے پر ہاتھ رکھتے ہیں، سانپ یا بچھّو نکل آتے ہیں اور ڈس کر انہیں وہیں ختم کر دیتے ہیں۔ کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ بدروحیں نہ ہوں تو وہاں جنّات پہنچ جاتے ہیں جو انسانوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں اور خزانے کی حفاظت کرتے ہیں۔ تمہارے آدمیوں پر جن لوگوں نے حملہ کیا تھا، انہیں بدروحیں یا جنّات لائے تھے اور وہاں تک پہنچایا تھا۔ چونکہ وہ بھی خزانہ اٹھانے گئے تھے اس لئے آپس میں لڑ مرے اور بدروحوں یا جنّات نے مشعلوں سے انہیں جلا ڈالا۔ کیا تم نے کبھی سنا نہیں کہ مدفون خزانوں پر سانپ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں؟"

"میں تمہیں جانے پر اُکسا نہیں رہی" ــــ شافعیہ نے کہا ــــ "میں نے ایک خزانے کی نشاندہی کی ہے۔ کبھی دل میں آئے تو وہاں چلے جانا"۔

"میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گا" ــــ زرتوش نے کہا ــــ "تم جس حسن بن صباح کو اللہ کا بھیجا ہُوا امام کہتی ہو، اُس کے بڑے ہی دلکش اثرات میرے قبیلے تک آئے تھے۔ مجھے بڑی ہی حسین لڑکیوں کے اور ایسے ہی خزانوں کے لالچ دیئے گئے تھے۔ حسن بن صباح کے بھیجے ہوئے آدمی اس امید پر آئے تھے کہ قبیلے کا سردار جال میں آ گیا تو سمجھو پورا قبیلہ ہاتھ آ گیا۔ میرا قبیلہ جنگجو ہے، شہسوار ہے، حسن بن صباح مجھے اور قبیلے کو اپنی طاقت بنانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا مذہب نہیں چھوڑا۔ ہمارے کچھ اپنے عقیدے ہیں۔ ہاں، اسلام کا کچھ اثر قبول کیا ہے۔ وہ اس لئے کہ اسلام کوئی لالچ نہیں دیتا، اسلام کوئی

لالچ قبول نہیں کرتے۔ اگر مسلمانوں کے سلطان حکمرانی کو دماغ پر سوار کر لیں اور ان کے امیر امارت کو اپنا نشہ بنا لیں تو پھر حسن بن صباح جیسے ابلیس کامیاب نہ ہوں تو کیوں نہ ہوں۔ ان کی نسبت تو ہم جنگلی اور وحشی اچھے ہیں جنہوں نے حسن بن صباح کی ابلیسیت کو قبول نہیں کیا"۔

"ایک بات سنو" —— شافعیہ نے کہا —— "تم باتیں کتنی اچھی اور عقل کی کرتے ہو لیکن ایک بے بس، بھٹکی ہوئی اور کمزور سی لڑکی پر رحم نہیں کرتے"۔

"تو نے مجھے حسن بن صباح سے ڈرانے کی کوشش کی ہے" —— زرتوش نے کہا۔

"اگر میں کہوں کہ میں مسلمان ہوں اور حسن بن صباح کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں تو میرے ساتھ تمہارا سلوک کیا ہو گا؟" —— شافعیہ نے کہا۔

"میں کہوں گا تم مجھے دھوکہ دے رہی ہو" —— زرتوش نے کہا —— "مجھے کچھ بھی کہہ لو.... میں وحشی ہوں، درندہ ہوں.... میں دو راتیں تمہیں اپنے پاس رکھوں گا۔ کیا یہ رحم نہیں کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنا قیدی نہیں بنا رہا؟.... تم مجھے اس خواہش سے محروم نہیں کر سکو گی۔ تمہاری نجات اسی میں ہے کہ دو راتوں کے لئے مجھے قبول کر لو"۔

شافعیہ پھر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اُسے اپنے حُسن کا اچھی طرح اندازہ تھا وہ جب اُس سیاہ فام شخص کو دیکھتی تھی تو اُس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ سوچتے سوچتے اسے ایک روشنی نظر آئی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" —— زرتوش نے کہا —— "میں تم پر کوئی ظلم نہیں کر رہا۔ اس کے بعد تم آزاد ہو گی اور یہ ایک مرد کا وعدہ ہے"۔

"صرف آج کی رات!" —— شافعیہ نے کہا —— "میری یہ شرط مان لو.... صرف آج کی رات.... صبح مجھے رخصت کر دینا"۔

"چلو، مان لیا" —— زرتوش نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کپڑا مجھے دے دو" —— شافعیہ نے کہا۔

"کپڑا صبح ملے گا" —— زرتوش نے کہا —— "یہ کپڑا صبح تمہارا ہو گا۔ رات کو یہ میرا ہے"۔

اس دوران زرتوش شراب ایک ایک گھونٹ پیتا رہا تھا۔ شافعیہ کو رضامند دیکھ کر

اُس نے کچھ اور شراب چڑھا لی۔ اُس نے بڑے پیار سے شافعیہ کو بستر پر لٹا دیا۔ اُس پر ایک تو شراب کا نشہ طاری تھا اور اس کے ساتھ شافعیہ کے حُسن و جوانی کا نشہ بھی شامل ہو گیا۔ وہ دیکھ نہ سکا کہ شافعیہ کا دایاں ہاتھ اپنے نیفے کے اندر چلا گیا ہے۔ زرتوش اُس کے اوپر جھکا تو شافعیہ نے پوری طاقت سے خنجر اُس کے دل کے مقام پر اتار دیا۔ زرتوش پیچھے ہٹا۔ شافعیہ بڑی تیزی سے اٹھی اور خنجر کا ایک وار اور کیا۔ زرتوش پیٹھ کے بل گرا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ وہاں رکھ لئے تھے جہاں اس کو خنجر لگے تھے۔ اُس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ خنجر صحیح مقام پر لگے تھے۔ خون کا فوارہ پھوٹ آیا تھا۔ شافعیہ اسے دیکھتی رہی۔ زرتوش کے دونوں ہاتھ جو سینے پر رکھے ہوئے تھے ڈھیلے پڑ گئے اور اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

شافعیہ نے اس کے چغے کے اندر ہاتھ ڈالا اور وہ کپڑا نکال لیا جس پر زرتوش نے کوئلے سے راستے بنائے تھے۔ یہ کپڑا اس نے اپنے کپڑوں کے اندر نیفے میں اُڑس لیا۔ اب اسے یہ خطرہ نظر آنے لگا تھا کہ زرتوش کے نوکر چاکر جاگ رہے ہوں گے۔

وہ آہستہ آہستہ باہر نکلی۔ باہر خاموشی تھی۔ کسی اور خیمے میں روشنی نہیں تھی۔ وہ سب شاید سو گئے تھے اور وہ اس خیال سے سو گئے ہوں گے کہ ان کے سردار کو بڑا خوبصورت شکار مل گیا ہے اور وہ اب شراب اور بدکاری میں مگن ہو گا۔ شافعیہ دبے پاؤں گھوڑوں تک پہنچی۔

زینیں قریب ہی رکھی تھیں۔ اس نے اپنے دونوں گھوڑوں پر زینیں رکھیں اور اچھی طرح کس لیں۔ خیمے میں جا کر اُس نے اپنی تلوار اٹھائی اور کمر کے ساتھ باندھ لی۔ باہر جا کر اُس نے دیکھا کہ ایک گھوڑے پر اس کے کھانے والے تھیلے بندھے ہوئے تھے اور ایک مشکیزے میں پانی اچھا خاصا موجود تھا۔ اب اسے پانی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ یہ جنگل تھا اور جنگل میں پانی کی کمی نہیں ہوتی۔

اسے ایک خیال آ گیا۔ یہ تو اس نے دیکھا نہیں تھا کہ کس طرف جانا ہے۔ وہ پھر خیمے میں چلی گئی۔ دو دیئے جل رہے تھے۔ شافعیہ نے کپڑا نیفے سے نکال کر اپنے سامنے زمین پر پھیلایا اور دیکھا کہ اسے کس طرف جانا ہے۔ یہ راستہ اچھی طرح دیکھ لیا۔ کپڑا لپیٹ کر پھر نیفے میں اُڑس لیا اور خیمے سے نکل آئی۔

وہ گھوڑے پر سوار ہوئی اور گھوڑا چل پڑا لیکن اُس نے گھوڑے کو زیادہ تیز نہ چلنے

دیا تاکہ اس کے قدموں کی آواز خیموں کے اندر تک نہ پہنچ سکے۔ خاصی دُور جا کر اُس نے باگوں کو جھٹکا دیا تو گھوڑے کی رفتار تیز ہو گئی۔

○

وسم کوہ میں امن قائم ہو چکا تھا۔ باطنیوں کی لاشیں گھسیٹ کر قلعے سے دور چند ایک لمبے چوڑے گڑھے کھود کر ان میں پھینک دی گئیں اور اوپر مٹی ڈال دی گئی تھی۔ سالار اوریزی کے لشکر کے شہیدوں کو الگ الگ قبروں میں پورے احترام سے دفن کیا گیا تھا۔

سلطان برکیارق اپنے دونوں بھائیوں محمد اور سنجر کے ساتھ وسم کوہ پہنچ گیا تھا اور تینوں بھائیوں نے سالار اوریزی، مزمل آفندی اور بن یونس کو دل کھول کر خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔

”لیکن سالار اوریزی!“ ——— برکیارق نے پہلے روز یہاں پہنچ کر کہا تھا ——— ”صرف قلعہ سر کر کے ہمارا کام ختم نہیں ہو جاتا۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ حسن بن صباح اور اس کے اثرات کو اور اس کے پھیلائے ہوئے غلط عقائد کو ختم کیا جائے۔ اس کے لئے قلعہ اَلمُوت کو سر کرنا ضروری ہے ورنہ ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو گی“۔

”آپ پوری سلطنت کا لشکر قلعہ اَلمُوت کے محاصرے کے لئے لے جائیں“ ——— مزمل آفندی نے کہا ——— ”آپ اس قلعے کو سر نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے نہیں کہ باطنی بڑے زبردست جنگجو ہیں بلکہ وجہ یہ ہے کہ قلعہ بلندی پر بنایا گیا ہے اور اس کے تین اطراف سے دریا گزرتا ہے۔ آپ ایک بار اس قلعے کو دیکھ لیں“۔

”میں نے یہ قلعہ بڑی اچھی طرح دیکھا ہُوا ہے“ ——— سالار اوریزی نے کہا ——— ”میں خود کہا کرتا ہوں کہ اس قلعے کو سر کرنا اگر ناممکن نہیں تو بہت ہی مشکل ضرور ہے۔ لیکن سوچنے والی بات یہی ہے کہ اصل طاقت کہاں ہے۔ وہ ہے حسن بن صباح۔ اگر اس ایک شخص کو سر کر لیا جائے تو صرف قلعہ اَلمُوت ہی نہیں بلکہ ان باطنیوں کے تمام قلعے اور ان کے تمام اسرار ہمارے قدموں میں آ گریں گے۔ ہمیں تین چار ایسے جانبازوں کی ضرورت ہے جو قلعہ اَلمُوت میں داخل ہو کر حسن بن صباح کو اُسی طرح قتل کر دیں جس طرح حسن بن صباح کے فدائی ہمارے علماء اور حاکموں کو قتل کر چکے ہیں اور کرتے جا رہے ہیں“۔

”میں آج تک کیا کہتا آ رہا ہوں“ ——— مزمل آفندی نے کہا ——— ”دو جانباز تو یہاں بیٹھے ہیں۔ ایک میں ہوں اور دوسرا بن یونس…… میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم سیدھے جا کر حسن بن صباح کو قتل نہیں کر سکتے۔ ہمیں کچھ چالبازیاں کرنی پڑیں گی۔ آپ اجازت دیں تو میں کچھ اور جانباز تیار کر لوں“۔

اس مسئلے پر بہت دیر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا اور یہ سب اس نتیجے پر پہنچے کہ جس طرح حسن بن صباح زمین دوز وار کرتا ہے اور سامنے لڑنے کے لئے نہیں آتا، اسی طرح اسے ختم کرنے کے لئے بھی کوئی طریقۂ کار طے کرنا پڑے گا…… تاریخ کے دامن میں جو واقعات اب تک محفوظ ہیں، ان سے یہ شہادت ملتی ہے کہ مسلمان سالار اور دوسرے حاکم آپس میں اس قسم کی باتیں تو کر لیتے تھے لیکن عملی طور پر وہ ایسے طریقے اختیار نہیں کرتے تھے جو حسن بن صباح کے طریقوں کے توڑ ثابت ہو سکتے۔ مسلمان میدانِ جنگ میں لڑنے کی مہارت اور جذبہ رکھتے تھے لیکن حسن بن صباح لشکروں کی دُوبدُو لڑائی کا قائل نہیں تھا۔ وہ سانپوں اور بچھوؤں کی طرح ڈنک مارا کرتا تھا۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اُس نے اپنے فدائی تیار کر رکھے تھے اور وہ فدائی زہریلے ناگوں اور بچھوؤں جیسے ہی تھے۔

سلطان برکیارق نے اپنا ایک مسئلہ پیش کر دیا۔ اس نے کہا کہ اُس کی صحت اس قابل نہیں رہی کہ سلطانی کے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکے۔ مسلمان مؤرخوں میں سے اکثر نے تو سلطان برکیارق کی بیماری کا ذکر ہی نہیں کیا اور جن دو مسلمان مؤرخوں نے ذکر کیا ہے، وہ اتنا ہی کیا ہے کہ سلطان برکیارق علیل ہو گیا تھا۔ البتہ ایک یورپی تاریخ دان جیمز سٹیفن نے تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ سلطان برکیارق ذہنی طور پر ٹھیک نہیں رہا تھا۔

اس نے لکھا ہے کہ سلطان برکیارق ایک باطنی لڑکی کے زیرِ اثر آ گیا تھا اور اس نے اس دوران بڑے غلط فیصلے کئے تھے اور اپنی ماں تک کی بے ادبی کی تھی۔ برکیارق نے اس لڑکی کو جو اس کی بیوی بن گئی تھی، اپنے ہاتھوں قتل کیا تھا اور اس سے برکیارق کے ضمیر سے گناہ کا بوجھ اُتر جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہ ہُوا۔

خانہ جنگی کا بوجھ بھی برکیارق نے اپنے ضمیر پر لے رکھا تھا۔ اس نے اپنی ماں کے قدموں میں جا سر رکھا تھا اور معافیاں مانگی تھیں۔ اُس نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی بہت

عبادت کی تھی اور وہ اپنے گناہوں کی بخشش مانگتا رہتا تھا لیکن خانہ جنگی میں جو لوگ مارے گئے تھے، برکیارق اپنے آپ کو ان سب کا قاتل سمجھتا تھا۔ اس نے سلطنت کے امور کے سلسلے میں بڑے اچھے فیصلے کئے تھے اور اس نے اپنی زندگی سلطنت کے استحکام کے لئے اور عوام کی خوشحالی کے لئے اور حسن بن صباح کی تباہی کے لئے وقف کر دی تھی۔ اسے علماء نے یقین دلایا تھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کے گناہ معاف کر دیئے ہیں لیکن جب وہ تنہا ہوتا تو اپنے ضمیر کا سامنا کرنے سے گھبراتا اور پریشان ہو جاتا تھا۔

یہ ایسا ذہنی مرض تھا جس نے اس کے دماغ پر یعنی سوچنے کی قوت پر اور جسم پر بھی اثر کیا۔ اس کی جسمانی حالت یہ ہو گئی تھی کہ جوانی میں ہی وہ بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔ طبیبوں نے اس کے علاج میں دن رات ایک کر دیا تھا۔ اسے ایسی ایسی دوائیاں تیار کر کے دی تھیں جن کا کوئی عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن مرض بڑھتا ہی گیا اور برکیارق ایسے مقام پر آ پہنچا جہاں اس نے محسوس کیا کہ وہ جسمانی اور ذہنی لحاظ سے معذور ہو گیا ہے۔

"ہم تینوں بھائیوں نے سلطنت آپس میں تقسیم کر لی تھی" ـــ برکیارق نے کہا ـــ "مجھے توقع تو یہ تھی کہ یہ تقسیم سلطنت کے اندرونی مسائل اور دفاعی ضروریات کے لئے اچھی ثابت ہو گی۔ یہ اچھی ہی ثابت ہو رہی تھی کیونکہ ہم تینوں بھائیوں میں اتفاق اور اتحاد قائم رہا اور انہوں نے میرے ہی فیصلوں کو تسلیم کیا لیکن میں اب شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ میں اب سلطنت کا کاروبار سنبھالنے کے قابل نہیں رہا۔ میں تم سب سے مشورہ نہیں لے رہا بلکہ فیصلہ سنا رہا ہوں کہ آج سے میرے دونوں بھائی، محمد اور سنجر سلطنت کے سلطان ہوں گے اور سلطنت تین کی بجائے دو حصوں میں تقسیم ہو گی لیکن اس کا مرکز مرو میں ہی رہے گا"۔

سب پر سناٹا سا طاری ہو گیا۔ برکیارق کا یہ فیصلہ اچانک اور غیر متوقع تھا۔ سالار اوریزی نے برکیارق کے اس فیصلے کے خلاف کچھ کہا اور دوسروں نے اس کی تائید کی لیکن برکیارق اپنے فیصلے پر قائم رہا اور اس نے یہ بھی کہا کہ تم لوگ میرے معاملے میں جذبات میں آ گئے تو اس کا سلطنت کو نقصان ہو سکتا ہے۔ کچھ دیر بحث مباحثہ جاری رہا لیکن برکیارق نے سختی سے اپنا آخری فیصلہ ایک بار پھر سنایا اور سب کو خاموش کر دیا۔

"میں سلطنت سے لاتعلق نہیں ہو جاؤں گا" ـــ برکیارق نے کہا ـــ "جہاں کہیں تمہیں میری ضرورت محسوس ہوئی، میں پہنچوں گا اور میری جان اور میرا مال سلطنت کے لئے وقف رہے گا"۔

برکیارق بظاہر خوش و خرم نظر آتا تھا اور وہ ہر بات بڑے ہی خوشگوار انداز میں کرتا تھا۔ اس نے اگر کبھی اپنی بیماری کا ذکر کیا تو اس میں مایوسی اور اداسی کی جھلک نہیں تھی۔ اس نے مزمل کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"مزمل!" ـــ برکیارق نے مسکراتے ہوئے کہا ـــ "شمونہ میرے ساتھ آئی تھی اور وہ میرے ساتھ واپس نہیں جائے گی۔ میں حیران ہوں کہ راستے میں اس نے میرے ساتھ کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ اب تمہارے ساتھ شادی کر ہی لینا چاہتی ہے بلکہ وہ ایک ہی بات کرتی ہے کہ وہ جو جہاد کرنا چاہتی ہے اس کا اسے موقع نہیں مل رہا... کیا تم پسند نہیں کرو گے کہ وسم کوہ کی فتح کی خوشی میں تمہارا نکاح آج ہی پڑھا دیا جائے؟"

سب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے برکیارق کی تائید کی۔ یہ شادی بہت عرصہ پہلے ہو جانی چاہئے تھی اور ہونی ہی تھی لیکن مزمل اور شمونہ پر ایسی کیفیت طاری رہتی تھی کہ شادی کو وہ نظرانداز کرتے چلے آ رہے تھے۔ دونوں نے اپنی زندگی کا ایک ہی مقصد بنا لیا تھا اور وہ تھا حسن بن صباح کا قتل اور باطنیوں کا قلع قمع.... مزمل اور شمونہ جوانی کے آخری مرحلے میں داخل ہو چکے تھے۔ شمونہ کو جب اطلاع ملی تھی کہ وسم کوہ فتح کر لیا گیا ہے اور اس میں مزمل آفندی اور بن یونس کا خاصا ہاتھ ہے اور ان دونوں نے کامیابی سے باطنیوں کو دھوکا دیا ہے تو وہ اُڑ کر مزمل کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی لیکن اکیلے وہاں تک جانا ممکن نہیں تھا۔ اسے پتہ چلا کہ سلطان برکیارق وسم کوہ جا رہا ہے تو وہ فوراً برکیارق کے پاس جا پہنچی اور کہا کہ وہ بھی جانا چاہتی ہے۔ اس طرح برکیارق اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

اسی شام وسم کوہ میں مزمل اور شمونہ کی شادی ہو گئی۔

اگلے روز برکیارق نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے محمد اور سنجر کے ساتھ ایک روز بعد مرو کے لئے روانہ ہو جانا تھا۔ یہ لوگ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ کوئی سلطان پسند نہیں کرتا کہ وہ جب کھانے پر بیٹھا ہوا ہو تو دربان اندر آ کر اسے اطلاع دے کہ فلاں شخص آیا ہے یا فلاں واقعہ ہو گیا ہے لیکن برکیارق نے اپنے دربانوں کو کہہ رکھا تھا کہ وہ

کھانے پر بیٹھا ہو یا گہری نیند سویا ہُوا ہو، کوئی خاص واقعہ ہو جائے یا کوئی خاص آدمی اسے ملنے آجائے تو اسے جگا لیا جائے۔ یہ دربانوں کی صوابدید پر تھا کہ وہ ملاقاتیوں کی چھان بین کر کے دیکھیں کہ یہ ملاقات فوری طور پر ضروری ہے یا نہیں۔

قلعہ وسم کوہ میں برکیارق کھانے پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اُن کے ساتھ اُس کے دو بھائی تھے، سالار اوریزی تھا، مزمّل آفندی اور بن یونس تھے اور وسم کوہ کا نیا امیر بھی تھا جسے برکیارق نے مقرر کیا تھا۔ دربان اندر آیا اور کہا کہ ایک خاتون بہت ہی بُری حالت میں آئی ہے اور کہتی ہے کہ بہت عرصے سے سفر میں تھی اور مرتے مرتے منزل پر پہنچی ہے۔

برکیارق نے کہا کہ اسے فوراً اندر بھیج دو۔

ایک جواں سال عورت کھانے کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کے کپڑوں پر گرد اَٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا جیسے لاش قبر سے نکل آئی ہو۔ اُس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور اُس کا منہ کھلا ہُوا تھا۔ اگر دربان اُسے سہارا نہ دیتا تو وہ گر پڑتی۔ برکیارق کے کہنے پر اسے بٹھا دیا گیا اور اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔

"میرا نام شافعیہ ہے" — عورت نے بڑی ہی مشکل سے یہ الفاظ باہر کو دھکیلے — "میں یہیں کی رہنے والی ہوں اور ابو جندل کی بھتیجی ہوں...." — اتنا کہہ کر وہ ایک طرف کو لڑھک گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

"اسے اٹھا کر فوراً طبیب کے پاس لے جاؤ" — برکیارق نے کہا — "یہ بیمار تو ہے ہی، بھوکی اور پیاسی بھی لگتی ہے۔ یہ ہوش میں آجائے تو اسے کھانے کو کچھ دے دینا۔ اس کے بعد میں اگر یہاں ہُوا تو مجھے بتانا۔ میں چلا گیا تو سالار اوریزی کو اطلاع دے دینا"۔

شافعیہ سولہ سترہ دنوں کے بعد وسم کوہ پہنچی تھی۔

○

برکیارق مَرو پہنچا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ ہر طرف اعلان کروا دیا کہ وہ اب سلطان نہیں اور اب محمد اور سنجر سلطان ہیں۔ برکیارق نے عوام میں مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ لوگوں نے یہ فیصلہ سنا تو چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ بعض یہ سمجھے کہ بھائیوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور چھوٹے دونوں بھائی جیت گئے ہیں، انہوں نے بڑے بھائی کو سلطانی سے معزول کر دیا ہے۔

عوام کا یہ ردِّعمل برکیارق تک پہنچا تو اس نے یہ انتظام کیا کہ سرکاری اہلکار لوگوں کو تمام سلطنت میں بتا دیں کہ یہ فیصلہ اس نے خود بیماری کی وجہ سے کیا ہے اور لوگ محمد اور سنجر کے وفادار ہو جائیں۔

لوگوں کو جب یہ معلوم ہُوا کہ برکیارق بیمار ہے تو مسجدوں میں اس کی صحت یابی کی دعائیں ہونے لگیں۔ اس کی بیماری کی خبر تمام تر سلطنت میں پھیل گئی اور اصفہان تک بھی پہنچی۔

اصفہان کی جامعہ مسجد کا خطیب اُس وقت کا ایک بڑا ہی مشہور عالم قاضی ابوالعلاء صاعد بن ابو محمد نیشاپوری تھا۔ عالم ہونے کے علاوہ وہ مردِ میدان بھی تھا۔ اس کے خطبوں میں جہاد کی تلقین زیادہ ہوتی تھی۔ وہ جب خطبہ دیتا تو اس میں الفاظ کا ہیر پھیر اور پیچیدگیاں نہیں ہوتی تھیں بلکہ ایسی سادہ زبان میں خطبہ دیا کرتا کہ معمولی سے ذہن کے لوگ بھی اصل بات سمجھ جاتے تھے۔ وہ باطنیوں کا بہت بڑا دشمن تھا۔ اسے پتہ چلا کہ برکیارق بیمار ہو گیا ہے اور بیماری نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ اس نے سلطانی چھوڑ دی ہے تو وہ اسی وقت مَرو کے لئے روانہ ہو گیا۔

بڑے ہی لمبے سفر کے بعد وہ مَرو پہنچا اور برکیارق کا مہمان ٹھہرا۔ برکیارق اسے اپنا دینی اور روحانی پیشوا سمجھا کرتا تھا۔ قاضی ابوالعلاء نے برکیارق سے پوچھا کہ اس کی بیماری کیا ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ برکیارق وقت سے پہلے مرجھا گیا ہے لیکن اسے ظاہری طور پر کوئی بیماری نہیں۔ برکیارق نے اسے بتایا کہ وہ خود نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے ذہن پر کیا اثر ہو گیا ہے کہ وہ کھویا کھویا سا رہتا ہے اور یوں خوف سا محسوس کرتا ہے جیسے کوئی ناخوشگوار واقعہ یا حادثہ ہونے والا ہو۔

قاضی ابوالعلاء نے اس سے تمام علامات پوچھیں اور اس کے طبیب کو بلایا۔ طبیب آیا تو قاضی نے طبیب سے پوچھا کہ اس نے برکیارق میں کیا بیماری دیکھی ہے۔

"یہ پتہ چل جاتا تو میں اب تک انہیں صحت یاب کر چکا ہوتا" — طبیب نے کہا — "میں اپنا تمام تر علم اور تجربہ آزما چکا ہوں لیکن سلطان ٹھیک نہیں ہو رہے۔ معلوم ہوتا ہے ان کے ذہن اور دل پر کوئی ایسا بوجھ ہے جسے یہ بیان نہیں کر سکتے یا سمجھ ہی نہیں سکتے"۔

قاضی نے برکیارق سے بہت پوچھا کہ وہ دل پر کیا بوجھ لئے ہوئے ہے لیکن برکیارق

نے بتانا مناسب نہ سمجھا یا وہ بیان ہی نہ کر سکا کہ اسے اندر ہی اندر کیسی دیمک کھا رہی ہے۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے" ——— قاضی ابوالعلاء صاعد نے کہا ——— "آپ کے والد محترم ملک شاہ کو باطنیوں نے دھوکے میں ایسا زہر پلا دیا تھا جو آہستہ آہستہ انہیں کھاتا رہا اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے آپ کو بھی باطنیوں نے کوئی چیز کھلا دی ہے جس کا آپ کو پتہ ہی نہیں چلا"۔

"میں نے اس شک کے پیش نظر بھی دوائیاں دی ہیں" ——— طبیب نے کہا ——— "اگر انہیں کسی بھی قسم کا زہر پلا دیا گیا ہوتا تو اس کے اثرات ان دوائیوں سے ختم ہو جاتے۔ یہ کچھ اور ہی ہے"۔

"میں آج رات تنہائی میں بیٹھوں گا" ——— قاضی نے کہا ——— "اللہ نے مجھے کشف کی کچھ طاقت عطا فرمائی ہے۔ مجھے کچھ شک ہے کہ یہ سفلی تعویذ کا اثر ہے۔ حسن بن صباح سفلی عمل سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ وہ یہ عمل اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال بھی کرتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے آج رات پتہ چل جائے گا"۔

برکیارق نے قاضی ابوالعلاء صاعد کے لئے ایک خاص کمرہ تیار کروایا جس میں مصلّیٰ، قرآن پاک اور جو کچھ بھی قاضی نے کہا رکھ دیا گیا۔ رات عشاء کی نماز کے بعد قاضی ابوالعلاء نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور مصلے پر بیٹھ گیا.....وہ رات کے آخری پہر تک مراقبے میں رہا اور پھر تہجد ادا کی، اذان کے بعد فجر کی نماز پڑھی اور سو گیا۔ طلوعِ آفتاب کے کچھ دیر بعد وہ کمرے سے نکلا اور برکیارق کے پاس گیا۔

"میرا شک صحیح نکلا ہے" ——— اس نے برکیارق سے کہا ——— "یہ سفلی تعویذ کا اثر ہے لیکن یہ حسن بن صباح نے نہیں کیا بلکہ یہاں کوئی آدمی ہے جس نے اپنے طور پر آپ کو ختم کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ میں اس کا توڑ کر دوں گا لیکن یہاں نہیں۔ میں کل صبح اصفہان کے لئے روانہ ہو جاؤں گا۔ اس تعویذ کے لئے کم از کم تین راتوں کا چلّہ کرنا پڑے گا پھر تعویذ لکھا جائے گا۔ جب یہ تعویذ تیار ہو گیا تو میں آپ کو بھیج دوں گا۔ اسے کس طرح استعمال کرنا ہو گا، وہ میں تعویذ لانے والے کو بتا دوں گا"۔

برکیارق کو باطنی معاف نہیں کر سکتے تھے۔ داستان گو پہلے تفصیل سے سنا چکا ہے کہ برکیارق ایک لڑکی کے ساتھ شادی کر کے نادانستہ طور پر حسن بن صباح کا آلۂ کار بن گیا

تھا۔ یہ اس لڑکی کا کمال تھا لیکن وقت نے ایسا پلٹا کھایا کہ برکیارق کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کی عقل سے پردہ اُٹھ گیا۔ یہ شمونہ کا کمال تھا۔ برکیارق نے اپنی اس بیوی کو اپنے ہاتھوں قتل کیا اور اس کے بعد اس نے حکم دے دیا کہ جہاں کہیں کوئی باطنی نظر آئے اسے قتل کر دیا جائے۔ باطنی اپنے اتنے زیادہ ساتھیوں کا خون کیسے معاف کر دیتے! انہوں نے جس طرح دوسری کئی ایک شخصیات کو قتل کیا تھا، برکیارق کو بھی قتل کر دیتے لیکن انہیں موقع نہیں مل رہا تھا کیونکہ برکیارق جدھر بھی جاتا تھا، اس کے اِرد گِرد محافظوں کا حصار ہوتا تھا۔ اگر قاضی ابوالعلاء کی تشخیص صحیح تھی تو یہ عمل باطنیوں نے ہی کیا تھا۔

قاضی ابوالعلاء اگلے روز فجر کی نماز کے فوراً بعد واپس اصفہان کو چل پڑا۔ اُس کے ساتھ دس بارہ آدمی تھے جو اس کے ایسے مرید تھے کہ اس پر جانیں قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ قاضی کو کہیں اکیلا نہیں جانے دیتے تھے کیونکہ اُس وقت تک باطنی کئی ایک علماء دین کو قتل کر چکے تھے۔

اصفہان میں اہل سنّت کی اکثریت تھی۔ وہ اپنے خطیب قاضی ابوالعلاء صاعد کی غیر حاضری بڑی بُری طرح محسوس کر رہے تھے۔ وہ پوچھتے تھے خطیب کہاں گئے۔ انہیں جتایا گیا کہ سلطان برکیارق بیمار ہے اور اس کی عیادت کو گئے ہیں۔ یہ تو لوگوں کو پہلے پتہ تھا کہ برکیارق بیمار ہے لیکن جب انہیں یہ پتہ چلا کہ جامع مسجد کا خطیب اس کی عیادت کو گیا ہے تو لوگ متفکر ہوئے کہ برکیارق کچھ زیادہ ہی بیمار ہو گیا ہے۔ وہاں کے لوگ برکیارق کو اس لئے زیادہ عزیز رکھتے تھے کہ اس نے باطنیوں کے قتلِ عام کا حکم دیا تھا۔ اصفہان میں باطنیوں نے مسلمانوں کا اچھا خاصا کشت و خون کیا تھا۔

آخر ایک روز اصفہان کے لوگوں کو پتہ چلا کہ ان کا خطیب واپس آ گیا ہے۔ کئی لوگ اس کے گھر جا پہنچے اور برکیارق کی صحت کے متعلق پوچھا۔ قاضی ابوالعلاء نے انہیں کہا کہ اتفاق سے کل جمعہ ہے، میں مسجد میں سب کو بتاؤں گا کہ برکیارق کس بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے اور اب اس کی حالت کیا ہے۔

اگلے روز جمعہ تھا۔ جمعہ کے روز تو جامع مسجد نمازیوں سے بھر جایا کرتی تھی لیکن اُس جمعہ کی نماز کے وقت یہ حالت ہو گئی تھی کہ مسجد کے اندر تِل دھرنے کو جگہ نہیں رہی تھی اور بہت سے نمازیوں کو مسجد کے باہر صفیں بچھانی پڑیں۔ سب سلطان برکیارق

کی بیماری کے متعلق تازہ اطلاع سننے آئے تھے۔ خطبے سے پہلے قاضی ابوالعلاء صاعد منبر پر کھڑے ہو کر بڑی ہی بلند آواز سے برکیارق کی بیماری کے متعلق بتانے لگا۔

"برکیارق بن ملک شاہ کو کوئی جسمانی بیماری نہیں" ـــــ قاضی ابوالعلاء نے کہا ـــــ "میں نے مراقبے میں بیٹھ کر کشف کے ذریعے معلوم کیا ہے۔ برکیارق پر سفلی تعویذ کا اثر ہو گیا ہے اور یہ کارستانی کسی باطنی کی ہے۔ سب لوگ برکیارق کی صحت یابی کے لئے دعا کریں۔ کوئی پتہ نہیں کس کی اللہ سُن لے اور برکیارق کی صحت بحال ہو جائے۔ میں اس کے لئے ایک تعویذ تیار کر رہا ہوں جس میں تین چار دن لگ جائیں گے۔ اس تعویذ سے انشاء اللہ اس پر جو سفلی اثرات ہیں رفع ہو جائیں گے"۔

نماز کے بعد برکیارق کی صحت یابی کے لئے خصوصی دعا کی گئی۔

قاضی ابوالعلاء نے یہ اعلان کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی کہ وہ تعویذ تیار کر رہا ہے۔ اس کے ذہن سے شاید یہ حقیقت نکل گئی تھی کہ باطنی نظر نہ آنے والے سائے کی طرح ہر جگہ موجود رہتے ہیں اور ذرا ذرا خبر اوپر پہنچا کر اس کے خلاف جو کارروائی ضروری ہو کرتے ہیں۔

اگلے روز فجر کی نماز کے وقت جماعت کھڑی ہوئی تو قاضی ابوالعلاء امامت کے لئے مصلّے پر جا کھڑا ہوا۔ عموماً یوں ہوتا تھا کہ اس کے پیچھے پہلی صف میں اُس کے خاص آدمی کھڑے ہوتے تھے تاکہ قاضی پر کوئی حملہ نہ کر سکے۔ اُس روز فجر کی نماز کے وقت جب قاضی مصلّے پر کھڑا ہوا اور تکبیر پڑھی جا رہی تھی تو دوسری صف سے ایک آدمی بڑی تیزی سے آگے بڑھا اور اگلی صف کے دو آدمیوں کو ... سے دھکا دیا۔ دونوں آدمی اس دھکے سے سنبھل نہ سکے اور امام کے ساتھ ٹکرائے۔ اس شخص نے اتنی دیر میں خنجر نکال لیا تھا۔ قاضی ابوالعلاء چونک کر پیچھے مُڑا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ پیشتر اس کے کہ اُسے پتہ چلتا یہ کیا ہوا ہے خنجر اس کے دل میں اُتر چکا تھا۔ خنجر باہر نکلا اور پھر اُس کے دل میں اتر گیا۔

نمازی تو کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔ اِدھر قاضی مصلّے پر گرا اُدھر اس کا قاتل منبر پر چڑھ گیا اور خنجر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر کیا اور بڑی زور سے نعرہ لگایا ـــ "شیخ الجبل امام حسن بن صباح کے نام پر" ـــ اور اس نے خنجر نیچے کو کھینچا اور اپنے سینے میں اتار لیا۔

ایک اور عالم دین باطنیوں کی نذر ہو گیا.... یہ پانچویں صدی ہجری کا آخری سال

تھا۔

قاضی ابوالعلاء صاعد بن ابو محمد نیشاپوری کے قتل کی اطلاع مرو پہنچی تو تصور کیا جا سکتا ہے کہ سلطان کے محل میں کیا ردِ عمل ظاہر ہوا ہو گا۔ وہ تو ایک دھماکہ تھا جس نے پہلے تو سب کو سُن کر دیا اور اس کے بعد سب شعلوں کی طرح بھڑک اٹھے۔ برکیارق کا سب سے چھوٹا بھائی سنجر کچھ زیادہ ہی جوشیلا تھا لیکن وہ ایسا جذباتی نہیں تھا کہ عقل پر جذبات کو غالب کر دیتا۔ پھر اسے فنِ حرب و ضرب میں بہت ہی دلچسپی تھی اور اس میں قیادت کے جوہر بھی تھے۔ ابھی وہ جوان تھا اور جوانی نے ایسا جوش مارا کہ اُس نے اعلان کر دیا کہ وہ باطنیوں کے قلعوں پر حملے کرے گا اور واپس مرو میں اس وقت آئے گا جب باطنیوں کا نام و نشان مٹ چکا ہو گا۔

اُس وقت سلطنتِ سلجوقیہ کا وزیرِ اعظم فخرالملک ابوالمظفر علی تھا۔ وہ اس سلطنت کے مشہور وزیرِ اعظم نظام الملک خواجہ طوسی مرحوم کا بیٹا تھا۔ پندرہ برس پیشتر ایک باطنی نے نظام الملک خواجہ طوسی کو قتل کر دیا تھا۔ اب اس کا بیٹا ابوالمظفر علی وزیرِ اعظم تھا اور سلطان نے اسے فخرالملک کا خطاب دیا تھا۔ وہ اپنے باپ جیسا دُوراندیش اور دانشمند تھا۔ اُسے قاضی ابوالعلاء کے قتل کی خبر ملی تو وہ اُسی وقت سلطان کے محل پہنچا۔

وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سلطان محمد اور سلطان سنجر کا ردِ عمل کیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ردِ عمل بڑا ہی شدید ہے تو اسے خطرہ محسوس ہوا کہ یہ دونوں بھائی غم و غصے سے مغلوب ہو کر کوئی غلط فیصلہ یا جلد بازی کر گزریں گے۔ اس نے انہیں مشورہ دیا کہ یہ منصوبہ اسے بنانے دیں کہ انتقامی کارروائی کیسے کی جائے اور کب کی جائے۔

"اب ہم سوچنے میں مزید وقت ضائع نہیں کریں گے" ـــ محمد نے کہا ـــ "اب ہمیں الموت پر یا باطنیوں کے دوسرے بڑے اڈے قلعہ شاہ در پر حملہ کر دینا چاہئے۔ میں یہی فیصلہ کرتا ہوں اور میں اس فیصلے کی تائید چاہتا ہوں۔ قلعہ شاہ در میں حسن بن صباح کا استاد رہتا ہے۔ ہم پہلے اس اڈے کو تباہ کریں گے"۔

شاہ در وہ بند شہر تھا جہاں سے حسن بن صباح اپنے استاد احمد بن عطاش سے تربیت حاصل کر کے نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک وسیع و عریض علاقے پر چھا گیا تھا اور اس نے الموت میں جنت بھی بنا لی تھی۔

وزیرِ اعظم ابو المظفر علی اپنے مرحوم باپ کی طرح صرف وزیرِ اعظم ہی نہیں تھا بلکہ سالار بھی تھا یعنی جنگجو تھا اور میدان جنگ میں قیادت کی اہلیت بھی رکھتا تھا۔ اُس نے برکیارق، محمد اور سنجر سے کہا کہ اسے اجازت دیں کہ وہ قلعہ شاہ در کے محاصرے کا منصوبہ تیار کرے اور اپنے لشکر کو اپنی نگرانی کے تحت تیار کرے۔

"آپ ضرور کریں" —— محمد نے کہا —— "لیکن تین چار دنوں سے زیادہ وقت ضائع نہ ہو۔ اس حملے اور محاصرے کی قیادت میں خود کروں گا۔ آپ منصوبہ تیار کر لیں اور لشکر کو بھی ضروری تربیت دے لیں"۔

اُدھر قلعہ وسم کوہ میں شافعیہ اگلے روز ہوش میں آئی۔ اُس نے ہوش میں آتے ہی پہلی بات طبیب کو یہ بتائی کہ وہ چار پانچ دنوں سے بھوکی ہے اور صرف پانی پیتی رہی ہے۔ طبیب نے اپنے ایک آدمی سے کہا کہ وہ مریضہ کے منہ میں قطرہ قطرہ شہد اور قطرہ قطرہ دودھ ٹپکاتا رہے۔ اسے فوراً اتنی غذا نہیں دینی تھی جس سے پیٹ بھر جاتا کیونکہ اس کا جسم اتنی زیادہ غذا کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس وقت برکیارق مَرو جانے کے لئے وسم کوہ سے رخصت ہو چکا تھا۔

طبیب نے سالار اوریزی کو اطلاع دی کہ مریضہ ہوش میں آ گئی ہے۔ سالار اوریزی اُسی وقت پہنچا اور مریضہ کی حالت دیکھی۔ وہ تو زندہ لاش تھی۔ ابھی کچھ کہنے کے قابل نہیں تھی۔ وہ شافعیہ کو تسلی دلاسہ دے کر وہاں سے آ گیا۔ اس نے بہتر یہ سمجھا کہ مریضہ کے ساتھ کوئی عورت ہونی چاہئے۔ وہاں عورتوں کی تو کمی نہیں تھی لیکن محسوس یہ کیا گیا کہ اس لڑکی کے ساتھ کوئی عقل والی عورت ہو۔ اوریزی نے اس لئے یہ محسوس کیا تھا کہ شافعیہ نے سرگوشی میں ایک آدھ بات بڑی مشکل سے کہی تھی اور یہ بات ایسی تھی کہ اوریزی سمجھ گیا کہ یہ کوئی عام سی قسم کی لڑکی نہیں اور اس کا کوئی خاص پس منظر ہے۔ اسے یہ شک بھی ہُوا تھا کہ یہ باطنیوں کی ہی لڑکی ہو گی۔

سالار اوریزی نے مزمل کے ساتھ بات کی تو مزمل نے کہا کہ وہ شمونہ کو لڑکی کے پاس بھیج دے گا جس کا یہ فائدہ بھی ہو گا کہ عورت عورت کے ساتھ دل کی بات کر دیا کرتی ہے۔ شمونہ تجربہ کار عورت تھی جس سے یہ امید رکھی جا سکتی تھی کہ وہ شافعیہ کے سینے سے راز کی کوئی بات، اگر ہوئی تو نکال لے گی۔

دن گزر گیا اور رات گہری ہونے لگی۔ شافعیہ کو اتنا زیادہ شہد دودھ دیا جا چکا تھا

کہ اس کے جسم میں جان آ گئی اور وہ تھوڑا تھوڑا بولنے لگی۔ رات کو اُس نے اپنے ہاتھ سے شہد ملا دودھ پیا اور پھر اسے تھوڑی سی ٹھوس غذا دی گئی۔ شمونہ اس کے ساتھ رہی۔ شافعیہ بے ہوشی کی نیند سو گئی اور اگلے روز سورج نکل آنے کے خاصا بعد جاگی۔ شمونہ نے دیکھا کہ اب وہ اچھی طرح بول سکتی تھی۔

شمونہ نے اس سے پوچھا وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ شافعیہ نے کہا کہ وہ یہیں سے گئی تھی اور واپس یہیں آ گئی ہے۔

"یہاں سے گئی تھی تو میرے ساتھ میری چھوٹی بہن تھی اور چچا بھی تھا" —— شافعیہ نے کہا —— "واپس آئی ہوں تو اکیلی ہوں"۔

شافعیہ نے شمونہ کو اپنی پوری داستان سنا ڈالی کہ وہ کس طرح اور کیوں یہاں سے رخصت ہوئی تھی اور کہاں تک گئی اور کس طرح واپس آئی ہے۔ اُس نے کسی بات پر پردہ نہ ڈالا۔

شمونہ اُسی وقت گھر گئی اور مزمل کو شافعیہ کی ساری داستان سنائی۔ مزمل اُسی وقت سالار اوریزی کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ لڑکی نے اپنے متعلق کیا سنایا ہے۔ سالار اوریزی نے کہا کہ وہ حیران تھا کہ اس کا یہ عہدیدار شمیر ابلک کہاں غائب ہو گیا ہے۔ اُس کی کہیں لاش نہیں ملی تھی نہ ہی وہ کہیں زخمی حالت میں پڑا تھا۔ اب شافعیہ نے سالار اوریزی کو اس سوال کا جواب دے دیا۔

شافعیہ زرتوش کو قتل کر کے وہاں سے نکلی تو نقشے نے اُس کی صحیح رہنمائی کی۔ وہ تین چار دن گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھی سفر طے کرتی رہی۔ اسے اس جنگل میں کوئی بستی اور کوئی انسان نہ ملا۔ اس نے بہت مشکلات برداشت کیں۔ اسے یہ احساس رہا ہی نہیں تھا کہ کتنے دن اور کتنی راتیں گزر گئی ہیں۔ وہ جنگل سے نکل کر بنجر ویرانوں میں داخل ہوئی جہاں پانی کا ایک قطرہ بھی نظر نہیں آتا تھا نہ وہاں کوئی سبز پتا دکھائی دیتا تھا۔ وہ وہاں سے بھی نکل آئی۔

سفر کے آخری آٹھ دس دن اس کے لئے قیامت کے دن تھے۔ اُس پر ایک آفت یہ پڑی کہ ایک گھوڑے کو رات کے وقت زہریلے سانپ نے ڈس لیا اور گھوڑا تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اب اس کے پاس ایک گھوڑا رہ گیا تھا۔ وہ اس پر سوار ہوئی اور دو دنوں بعد پھر ایک ہرے بھرے جنگل میں داخل ہوئی اور طوفانِ باد و باراں میں پھنس گئی۔ بڑا

ہی خوفناک طوفان تھا۔ بجلی کڑکتی تھی اور دو مرتبہ بجلی دو درختوں پر گری اور ٹہن ٹوٹ کر نیچے آ پڑے۔ آگے ایک ندی تھی جس میں سیلاب آگیا تھا۔ شافعیہ نے رکنے کی بجائے گھوڑا ندی میں اُتار دیا لیکن سیلاب اس قدر تیز و تند تھا کہ گھوڑے کو اپنے ساتھ بہانے لگا۔ بہت دُور جا کر پانی پھیلا تو گھوڑا پانی میں چل کر باہر نکل آیا لیکن شافعیہ یہ معلوم نہ کر سکی کہ وہ اب کہاں ہے۔ اس نے کپڑا نکالا۔ اس کپڑے پر کوئلے کی لکیریں ڈالی گئی تھیں۔ مصیبت یہ آ پڑی کہ وہ سیلاب میں اتری تھی اور تمام کپڑے بھیگ گئے تھے اس لئے اس کپڑے سے کوئلے کی لکیریں مٹ گئی تھیں۔

وہ اللہ کے بھروسے آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ ایک اور دن کی مسافت کے بعد اس کے راستے میں ایک اور چشمہ آگیا۔ وہاں وہ گھوڑے کو پانی پلانے کے لئے رُک گئی۔ اس نے خود بھی پانی پیا لیکن اس کے پاس کھانے کا سامان ختم ہو چکا تھا۔ وہ جب پانی پی چکی تو اسے یاد آیا جب وہ خزانے والی غار کی طرف جا رہی تھی تو یہ چشمہ راستے میں آیا تھا۔ اس چشمے کے قریب ایک اونچی ٹیکری تھی۔ وہ اس ٹیکری پر چڑھ گئی اور ادھر اُدھر دیکھا۔ اسے دو اور نشانیاں نظر آگئیں اور یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ وہ ایک دن زیادہ سے زیادہ دو دن کی مسافت دور رہ گئی ہے اور اب اس کی منزل آئی کہ آئی۔

پھر یوں ہُوا کہ وہ ایک جنگل میں جا رہی تھی۔ اب اس کے دل پر ایسا بوجھ نہیں تھا کہ وہ ایک بار پھر راستہ بھول گئی ہے۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ صحیح راستے پر جا رہی ہے۔ پہلے وہ اللہ کی مدد اور رہنمائی مانگتی تھی، اب اس نے اللہ کا شکرانہ ادا کرنا شروع کر دیا۔ وہ جا رہی تھی کہ اچانک سات آٹھ بھیڑیئے کہیں سے نکلے اور اُس کی طرف دوڑ پڑے۔ گھوڑے کو ایڑ لگانے کی ضرورت نہیں تھی، گھوڑا ڈر کر ہی خود بھاگ اُٹھا اور بہت ہی تیز بھاگا۔ بھیڑیئے بھی رفتار کے بہت تیز تھے اور یقیناً بھوکے تھے اس لئے وہ دوڑے ہی چلے آ رہے تھے اور فاصلہ بہت کم ہوتا جا رہا تھا۔

شافعیہ نے سوچا کہ بھیڑیوں نے گھوڑے کو پکڑ لیا تو گھوڑا گرے گا اور وہ بھی گھوڑے کے ساتھ گرے گی اور کچھ بھیڑیئے گھوڑے کو اور کچھ اسے مار کر کھانا شروع کر دیں گے۔ وہ سوچنے لگی کہ گھوڑے سے کس طرح کود کر اُترے اور کسی اور طرف دوڑ پڑے لیکن کودنا تو شاید آسان تھا لیکن خطرہ یہ تھا کہ دو چار بھیڑیئے ان کے پیچھے دوڑ کر اسے پکڑ لیں گے۔

شافعیہ نے سامنے دیکھا ایک پھیلا ہُوا بہت بڑا درخت راستے میں آ رہا تھا۔ درخت کا ایک ٹہن زمین سے متوازی تھا۔ شافعیہ نے سوچ لیا کہ وہ اس ٹہن کو پکڑ لے گی اور گھوڑا اس کے نیچے سے نکل جائے گا۔ گھوڑا پوری رفتار سے جا رہا تھا اور بھیڑیئے اس کے اتنے قریب آگئے تھے کہ آدھے دائیں طرف اور آدھے بائیں طرف ہو گئے تھے۔ درخت قریب آگیا۔ شافعیہ نے رکابوں سے پاؤں نکال لئے اور جب وہ درخت کے نیچے سے گزری تو ہاتھ اوپر کر کے ٹہن پکڑ لیا۔ اس کا خیال تو یہ تھا کہ ٹہن بڑے آرام سے اُس کے ہاتھ میں آ جائے گا اور گھوڑا نیچے سے نکل جائے گا لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ وہ کس رفتار سے جا رہی ہے۔ اُس نے ٹہن پکڑ لیا اور ٹہن نے جب اُسے اتنی زیادہ رفتار سے روک لیا تو اسے یوں لگا جیسے اس کے بازو ٹہن کے ساتھ رہ گئے ہیں اور باقی جسم گھوڑے کے ساتھ چلا گیا ہے۔ اسے اپنے بازو کندھوں سے الگ ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ وہ گر پڑی۔ کچھ چوٹ گرنے سے آئی اور دونوں بازو کندھوں سے شدید درد کرنے لگے۔ اُسے حاصل صرف یہ ہُوا کہ بھیڑیوں سے بچ گئی تھی۔ گھوڑا اور بھیڑیئے دُور نکل گئے تھے۔

شافعیہ نے ذرا بلند زمین پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ اسے کچھ ایسی امید تھی کہ شاید گھوڑا اتنا تیز دوڑے کہ بھیڑیئے ہار کر اسے چھوڑ دیں اور گھوڑا واپس آ جائے لیکن یہ امید ایک جھوٹی امید تھی۔ گھوڑا ایک طرف مڑا تھا اور بھیڑیئے لپک جھپٹ کر اُس کی ٹانگوں پر منہ ڈال رہے تھے۔ آخر شافعیہ نے اپنے گھوڑے کو گرتے دیکھا۔ وہ ایک بار اُٹھا لیکن بھیڑیوں نے اسے پھر گرا لیا اور اس کے بعد وہ اُٹھ نہ سکا۔

اب شافعیہ نے منزل تک پیدل پہنچنا تھا۔ وہ گھوڑے کی پیٹھ پر رہتی تو ایک یا زیادہ سے زیادہ دو دن بعد منزل پر پہنچ جاتی لیکن نہ جانے کتنے دن اسے اپنا جسم اپنی ٹانگوں پر گھسیٹنا تھا۔ وہ بھیڑیوں کی طرف سے مطمئن ہو گئی تھی کیونکہ بھیڑیوں کو پیٹ بھرنے کے لئے اتنا بڑا اور اتنا تندرست گھوڑا مل گیا تھا۔ اب بھیڑیوں کو شافعیہ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ پھر بھی شافعیہ اس راستے سے ہٹ کر چلنے لگی۔

وہ چھٹے یا ساتویں دن دسم کوہ پہنچی لیکن اس حالت میں جیسے وہ اپنی لاش اپنے کندھوں پر اُٹھائے وہاں پہنچی ہو۔

سالار اوریزی نے شافعیہ کی یہ داستان سنی تو اُس نے کہا کہ اس لڑکی کو سرکاری

حیثیت دے کر خصوصی مہمان بنا کر رکھا جائے۔

⊙

مرو میں روز و شب بڑے ہی سرگرم تھے۔ فوج کو محاصرے کی اور قلعہ توڑنے کی اور پھر دست بدست لڑائی لڑنے کی تربیت دی جارہی تھی۔ یہ راز چھپایا نہ گیا کہ قلعہ شاہ در کو محاصرے میں لیا جائے گا۔ اس ٹریننگ کی نگرانی وزیراعظم فخرالملک ابوالمظفر علی کر رہا تھا۔ محمد اور سنجر اس کے پیچھے پڑے ہوئے تھے کہ وہ لشکر کو فوراً کوچ کے لئے تیار کرے لیکن ابوالمظفر علی جلد بازی کا قائل نہیں تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ بے شک قیادت محمد اور سنجر ہی کریں لیکن وہ خود ساتھ ہوگا۔ وہ لوگوں کو بھی ترغیب دے رہا تھا کہ اپنی فوج میں شامل ہو جائیں اور باطنیوں کے خلاف جہاد میں شریک ہوں۔

لوگ جوق در جوق فوج میں شامل ہو رہے تھے اور ابوالمظفر علی ان سب کو بڑی تیزی سے ٹریننگ دلوا رہا تھا۔ برچھیاں اور تیر الگ بن رہے تھے اور وزیراعظم ان کی بھی نگرانی کرتا تھا۔ مختصر یہ کہ ہر طرف ابوالمظفر علی ہی نظر آتا تھا۔ اپنے عوام میں وہ پہلے ہی مقبول تھا لیکن اب لوگوں نے اسے باطنیوں کے خلاف ان تیاریوں میں دیکھا تو اس کے کردار کے اور زیادہ قائل ہو گئے اور اسے بڑی ہی اونچی اور قابلِ قدر شخصیت سمجھنے لگے۔ وہ لوگوں سے کہتا تھا کہ خانہ جنگی میں جو لوگ مر گئے تھے ان کا انتقام لینے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ ایک ایسی تلقین تھی جو لوگوں کو فوج میں شامل ہونے پر اکسا رہی تھی۔

مشہور تاریخ دان ابنِ اثیر نے ایک بڑا ہی دردناک واقعہ لکھا ہے۔ وہ یوں ہے کہ محرم کی دس تاریخ تھی، اس روز ابوالمظفر علی نے روزہ رکھا۔ صبح کے وقت وہ روزمرہ معمولات کے لئے باہر نکلا تو اس نے محمد اور سنجر سے اور اپنے تین چار احباب سے کہا کہ گذشتہ رات اس نے حضرت حسینؓ کو خواب میں دیکھا ہے۔ حضرت حسینؓ اسے کہتے ہیں — "جلدی آ جاؤ، آج کا روزہ تم نے ہمارے پاس آ کر افطار کرنا ہے"۔

"فخرالملک!" — ایک بڑے قریبی دوست نے ابوالمظفر علی سے کہا — "ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔ خواب مبارک ہے لیکن میری ایک بات مان لیں۔ آج کا دن اور آنے والی رات آپ گھر سے باہر نہ نکلیں۔ مجھے کچھ خطرہ سا محسوس ہو رہا ہے"۔

"حضرت حسینؓ یاد فرمائیں اور میں گھر میں چھپ کر بیٹھ جاؤں!" — ابوالمظفر علی نے مسکراتے ہوئے کہا — "بلاوا آیا تو میں حاضری ضرور دوں گا"۔

اس روز ابوالمظفر علی نے روزمرہ معمول سے ہٹ کر یوں کیا کہ گھر چلا گیا اور زیادہ وقت نفل پڑھنے اور تلاوتِ قرآن میں گذارا۔ کچھ صدقہ بھی دیا۔ عصر کے وقت گھر سے باہر نکلا۔ اسے گھر کے سامنے ہی ایک مفلوک الحال شخص ملا جو رونی صورت بنائے اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"مسلمان تو جیسے ختم ہی ہو گئے ہیں" — اس شخص نے مایوسی کے لہجے میں کہا — "کوئی ایک بھی نہیں رہا جو مجھ مظلوم کی فریاد سنے"۔

"میں سنوں گا میرے بھائی!" — ابوالمظفر نے اس کے اور قریب ہو کر پوچھا — "بتاؤ تو سہی تم پر کس نے ظلم کیا ہے؟"

اس شخص نے اپنی جیب میں سے ایک کاغذ نکالا اور ابوالمظفر علی کی طرف بڑھا کر بولا کہ میں نے اپنی فریاد لکھ لی ہے اور یہ پڑھ لے۔ ابوالمظفر علی اس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر پڑھنے لگا تو اس شخص نے بڑی تیزی سے کپڑوں کے اندر سے چھری نکالی اور ابوالمظفر علی کے پیٹ میں گھونپ کر ایسی پھیری کہ ابوالمظفر علی کا پورا پیٹ چاک ہو گیا۔

ابوالمظفر علی تو گر پڑا لیکن اتفاق سے کچھ آدمی وہاں سے گزر رہے تھے، انہوں نے دیکھ لیا، یہ پہلا باطنی تھا جس نے فوراً ہی اپنے آپ کو مار نہ لیا۔ اسے شاید خودکشی کی مہلت نہ ملی کیونکہ ان آدمیوں نے اسے پکڑ لیا تھا اور اس کے ہاتھ سے چھری بھی لے لی تھی۔

فخرالملک ابوالمظفر علی کے قتل کی خبر فوراً ہی شہر میں پھیل گئی اور لوگ اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔ برکیارق، محمد اور سنجر بھی پہنچ گئے۔ اس وقت ابوالمظفر علی فوت ہو چکا تھا۔ قاتل ابھی وہیں تھا۔ سلطان سنجر نے کہا کہ اسے اسی چھری سے یہیں اس طرح قتل کیا جائے کہ اس کی گردن کاٹ کر اور سر الگ کر کے پھینک دیا جائے۔

"او باطنی کافر!" — محمد نے اس سے پوچھا — "تو نے دوسرے باطنی قاتلوں کی طرح خودکشی کیوں نہیں کر لی؟"

"میں جانتا ہوں مجھے قتل کے بدلے قتل کیا جائے گا" — قاتل نے کہا — "میں مرنے سے پہلے تم لوگوں کے ساتھ ایک نیکی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ تمہارے اپنے اردگرد ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں تم اپنا مخلص اور ہمدرد سمجھتے ہو لیکن وہ باطنی ہیں اور

وہ ایک ایک آدمی کو قتل کریں گے"۔

باطنی نے سات آٹھ آدمیوں کے نام لئے۔ وہ کوئی اونچے عہدوں والے آدمی نہیں تھے لیکن ان کی کچھ نہ کچھ سرکاری حیثیت تھی۔ اُس وقت برکیارق، محمد اور سنجر پر ایسی کیفیت طاری تھی کہ ان کی آنکھوں میں خون اُترا ہُوا تھا۔ ابنِ اثیر نے لکھا ہے کہ انہوں نے اُسی وقت ان سات آٹھ آدمیوں کو بلوا لیا اور جلّاد کو بھی بلا کر حکم دیا کہ اس باطنی کے قتل سے پہلے ان سات آٹھ آدمیوں کی گردنیں اُڑا دی جائیں۔ وہ سب آدمی چیختے چلّاتے رہے کہ یہ سب جھوٹ ہے لیکن اُن کی گردنیں اُڑا دی گئیں۔

جلّاد آخری آدمی کو قتل کر چکا تو ابوالمظفر علی کے قاتل نے پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ اُس سے پوچھا وہ کیوں ہنسا ہے۔

"ہنسوں نہ تو اور کیا کروں!" ـــــ باطنی نے کہا ـــــ "یہ سب بے گناہ تھے۔ میں نے یہ سوچ کر ان کے نام لئے تھے کہ میں تو مر ہی رہا ہوں تو کیوں نہ چند مسلمانوں کو ساتھ لے کر مروں۔ تم سب جاہل اور گنوار ہو کہ عقل سے ذرا بھی کام نہیں لیتے"۔

سلطان کے حکم سے اسے بھی جلّاد کے حوالے کر دیا گیا۔ جلاد نے اس کی گردن اپنی تلوار سے نہ کاٹی بلکہ حکم کے مطابق اُسے نیچے گرایا اور اسی کی چھُری سے اس کا سر اس کے جسم سے الگ کر دیا گیا۔

"اب ہم قلعہ شاہ در کا محاصرہ کریں گے" ـــــ سنجر نے انتہائی غصے کے عالم میں کہا ـــــ "کل صبح کوُچ ہو گا"۔

ابوالمظفر علی کے قتل نے مَرْو کی آبادی کو تو جیسے آگ لگا دی تھی۔ لوگ مقتول کے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ روکے ہوئے سیلاب کی طرح یہ ہجوم بے قابو ہُوا جا رہا تھا اور انتقام انتقام کے فلک شگاف نعرے زمین و آسمان کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ ابوالمظفر علی کے قتل کی خبر صحیح معنوں میں جنگل کی آگ کی طرح شہر سے نکل کر مضافاتی علاقوں میں پہنچ گئی۔ وہاں کے لوگ بھی شہر کی طرف دوڑ پڑے۔

برکیارق کے چھوٹے بھائی سنجر نے ابوالمظفر کی لاش کے قریب کھڑے ہو کر اعلان کر دیا تھا کہ اب قلعہ شاہ در کا محاصرہ ہو گا اور کل کوُچ کیا جائے گا لیکن ان کے بزرگ مشیروں نے کہا کہ ایسے فیصلے غصے اور جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں کئے جاتے ورنہ جلد بازی میں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ان مشیروں کا مشورہ یہ تھا کہ اطمینان سے بیٹھ کر کوُچ کا اور محاصرے کا منصوبہ تیار کر لیا جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کوچ چند دنوں بعد کیا جائے کیونکہ شہریوں کا جوش و خروش اور جذبۂ انتقام ایسا نظر آ رہا ہے کہ لشکر میں کچھ اور شہری شامل ہو جائیں گے۔

محاصرے کا منصوبہ تو بالکل تیار تھا جو ابوالمظفر علی مرحوم نے بنایا تھا۔ اس کے مطابق لشکر کو اُسی کی نگرانی میں ٹریننگ دی گئی تھی۔ اب کوُچ کا دن ہی مقرر کرنا تھا۔ مقتول وزیرِ اعظم کی تجہیز و تکفین ہو چکی تو برکیارق، محمد، سنجر اور جنگی امور کے مشیروں کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں سالاروں کو بھی شامل کیا گیا۔ اسی کانفرنس میں ضروری امور طے کر لئے گئے اور کوچ کا دن بھی مقرر ہو گیا۔ اس روز مَرْو میں اور اِردگِرد کے علاقوں میں

منادی کرا دی گئی کہ جو لوگ لشکر میں شامل ہونا چاہتے ہیں وہ فوراً مرو پہنچ جائیں۔۔۔۔ تین چار دنوں میں اس لشکر کی نفری بے انداز ہو گئی اور کوچ کا دن آگیا۔ کسی بھی مؤرخ نے یہ نہیں لکھا کہ اس لشکر کی تعداد کتنی تھی اور اس میں سوار کتنے اور پیادے کتنے تھے۔ صرف یہ لکھا ہے کہ ایک تو باقاعدہ فوج تھی اور اس کے ساتھ ایک لشکر غیر فوجیوں کا تیار کیا گیا تھا۔ یہ لوگ گھوڑے اپنے لائے تھے اور ہتھیار بھی ان کے اپنے تھے۔

ایک فیصلہ یہ بھی کیا گیا کہ اس لشکر کی قیادت سنجر نہیں بلکہ اس کا بڑا بھائی محمد کرے گا۔

پھر صبح طلوع ہوئی۔ تمام تر لشکر جس میں باقاعدہ فوج بھی تھی اور تربیت یافتہ شہری بھی، میدان میں ترتیب سے کھڑا ہو گیا۔ محمد گھوڑے پر سوار لشکر کے سامنے آیا اور اُس نے لشکر سے خطاب کیا۔

"اسلام کے مجاہدو!" ——— محمد نے بلند آواز میں کہا ——— "یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔ ہم کوئی ملک فتح کرنے نہیں جا رہے۔ ہم ابلیسیت کو جڑوں سے اکھاڑنے جا رہے ہیں۔ یہ کسی سلطان کی جنگ نہیں اور یہ کسی سلطنت کی بھی جنگ نہیں۔ یہ ہم سب کی ذاتی جنگ ہے۔ ہم سب کا اللہ ایک، رسولؐ ایک اور ایمان ایک ہے۔ ہم سب ایک ہی جذبے سے سرشار ہو کر ایک ہی ہدف پر جا رہے ہیں۔ ہم نے کوئی ملک فتح نہیں کرنا۔ فتح ہو گی تو یہ اسلام کی فتح ہو گی اور اگر خدانخواستہ ہم پسپا ہو آئے تو ہم پر اللہ کی لعنت پڑے گی۔ میں تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہم نے حسن بن صباح کے ابلیسی فرقے کو ختم کرنا ہے، بیگناہوں کے خون کا انتقام لینا ہے، خون خرابہ روکنا ہے اور مت بھولو کہ یہ وہ ابلیسی فرقہ ہے جس نے یہاں بھائی کو بھائی کا دشمن بنا دیا اور بھائی نے بھائی کا خون بہا دیا تھا۔ ان باطنیوں نے ہمارے علمائے دین کو قتل کیا، نظام الملک خواجہ حسن طوسی جیسی شخصیت کو قتل کیا اور اب ان کے بیٹے ابوالمظفر علی کو قتل کر دیا ہے۔۔۔۔ اور یہ تو تم جانتے ہو کہ اس فرقے نے اصفہان میں، شاہ در میں اور کئی دوسری جگہوں پر کس بے رحمی سے مسلمانوں کو قتل کیا ہے۔ تم نے لڑنا ہے اور کسی اجر کے لالچ کے بغیر لڑنا ہے۔ فتح تبھی حاصل کر سکو گے جب اللہ کی راہ میں خون کے نذرانے پیش کرو گے۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ اللہ کسی کا جذبۂ جہاد اور جذبۂ ایثار فراموش نہیں کیا کرتا۔ میں ایک آخری بات کہوں گا۔ تم میں سے کسی کے دل میں کوئی

شک اور شبہ ہے یا کوئی وہم ہے یا وہ دلی طور پر اس جہاد کے لئے تیار نہیں تو میں اُسے اجازت دیتا ہوں کہ وہ ابھی لشکر سے نکل جائے۔ کوچ شروع ہو گیا اور کسی نے پیٹھ دکھانے کی کوشش کی تو اُسے وہیں قتل کر دیا جائے گا"۔

ایک فلک شگاف نعرہ بلند ہوا۔ اس نعرے میں اُن عورتوں اور بچوں کی آوازیں بھی شامل تھیں جو لشکر کو رخصت کرنے کے لئے اور خدا حافظ کہنے کے لئے وہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ مکانوں کی چھتوں پر بھی عورتیں کھڑی تھیں۔ لشکر وہاں سے چلا تو عورتوں نے ہاتھ پھیلا کر اللہ سے لشکر کی سلامتی اور فتح کی دعائیں مانگیں۔

○

قلعہ اَلمُوت میں حسن بن صباح کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ وزیرِ اعظم ابوالمظفر علی کو قتل کر دیا گیا ہے اور قاتل نے خودکشی کر لی ہے۔ کچھ دنوں بعد اسے دوسری اطلاع یہ دی گئی کہ سلطنتِ سلجوقیہ کا ایک بہت بڑا لشکر شاہ در کی طرف کُوچ کر گیا ہے اور اب تک وہاں پہنچ چکا ہو گا۔۔۔۔ یہ غالباً" پہلا موقع تھا کہ حسن بن صباح مُسکرایا نہیں بلکہ اس کے چہرے پر سنجیدگی کا تاثر آگیا۔ اس سے پہلے اسے اطلاع ملتی تھی کہ مسلمانوں نے فلاں قلعے کا محاصرہ کر لیا ہے تو وہ یوں مسکرا اٹھتا تھا جیسے اسے کوئی غم اور کوئی فکر نہ ہو۔ مسلمان کوئی قلعہ فتح کر لیتے تو بھی حسن بن صباح کے چہرے پر پریشانی کا ہلکا سا بھی تاثر نہیں آتا تھا لیکن اب یہ سن کر کہ سلطنتِ سلجوقیہ کا لشکر شاہ در پہنچ چکا ہو گا تو وہ خلاؤں میں دیکھنے لگا۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حسن بن صباح کے پاس فدائیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ تو ایک لشکر تھا۔ حسن بن صباح کسی بھی فدائی کو اشارہ کر دیتا تو وہ فدائی اپنی جان اپنے ہاتھوں لے لیتا تھا لیکن یہ فدائی ایک منظم فوج کی طرح لڑنے کا تجربہ نہیں رکھتے تھے۔ فدائیوں کے خنجر اور ان کی چھُریاں چلتی تھیں۔ وہ دھوکے میں قتل کرتے تھے یا زمین کے نیچے سے وار کر جاتے تھے۔ حسن بن صباح نے سلطنتِ سلجوقیہ میں خانہ جنگی کرا دی تھی۔ اس نے ایسی بہت سی شخصیات کو قتل کروا دیا تھا جنہیں کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ اُس وقت تک دو وزیرِ اعظم فدائیوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے۔ یہ حسن بن صباح کا ہی کمال تھا لیکن اس کے ایک اشارے پر جانیں قربان کر دینے والا فدائیوں کا لشکر میدان میں آ کر جنگ نہیں لڑ سکتا تھا۔

حسن بن صباح کو قلعہ شاہ در کے محاصرے کی اطلاع ملی تو وہ متفکر ہو کر گہری سوچ میں کھو گیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے سر اٹھایا اور اپنے مشیروں وغیرہ کو بلایا۔

"شاہ در بڑا ہی مضبوط قلعہ بند شہر ہے" ——— حسن بن صباح نے کہا ——— "لیکن اب ہمیں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ ہم نے سلجوقیوں کو جتنی ضربیں لگائی ہیں' وہ ان کی برداشت سے باہر ہو گئی ہیں۔ اب وہ زخمی شیر کی طرح انتقام لینے نکلے ہیں۔ یہ مت بھولو کہ شاہ در میرے لئے قلعہ اَلموُت سے زیادہ مقدس ہے۔ وہاں میرا پیر و مرشد عبدالملک بن عطاش رہتا ہے۔ شاہ در کو ہر قیمت پر بچانا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلجوقی اس شہر کو فتح کر لیں۔ اگر انہوں نے یہ قلعہ سر کر لیا تو وہ میرے پیر و مُرشد کی بڑی ہی تذلیل اور توہین کریں گے۔ ہمارے پاس ایسا کوئی منظم لشکر نہیں جو یہاں سے کوُچ کر جائے اور محاصرے کو محاصرے میں لے لے۔ ہمیں اپنا طریقہ کار اختیار کرنا پڑے گا۔ یہاں سے دس فدائی بھیج دو۔ وہ اپنے آپ کو اہلِ سنت کہلائیں گے اور مبلّغ بن کر جائیں گے۔ وہ سلطان محمد کو قتل کریں گے اور سپہ سالار کو بھی قتل کریں گے اور اگر دو اور سالاروں کو قتل کر دیں تو محاصرہ نہ صرف ٹوٹ جائے گا بلکہ پورے کا پورا لشکر بھاگ جائے گا"۔

"اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا" ——— ایک معمر مشیر نے کہا ——— "صرف سلطان مارا گیا تو محاصرے میں ذرا سی بھی جان نہیں رہے گی۔ میں اپنے منتخب کئے ہوئے فدائی بھیجوں گا"۔

"میرا پیر و مُرشد عبدالملک بن عطاش اتنا کچا نہیں کہ وہ شہر سلجوقیوں کو دے دے گا" ——— حسن بن صباح نے کہا ——— "وہ کوئی نہ کوئی ڈھنگ کھیلے گا اور میرا خیال ہے وہ سلجوقیوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو جائے گا' پھر بھی میں اسے فرض سمجھتا ہوں کہ باہر سے اُس کی مدد کروں۔ میں دس قلعے دے سکتا ہوں' شاہ در نہیں دوں گا..... فدائیوں کو فوراً بھیج دو"۔

اُس زمانے میں ایسے ہی ہوتا تھا۔ سپہ سالار مارا جاتا تو پورے کا پورا لشکر بددل ہو جاتا تھا۔ بادشاہ خود اپنے لشکروں کی قیادت کیا کرتے تھے لیکن بادشاہ مارا جاتا تو سارا لشکر بھاگ اٹھتا تھا۔ حسن بن صباح کی یہ سوچ بے بنیاد نہیں تھی کہ محمد کو قتل کر دیا جائے۔ محمد سلطان تھا جس کے مارے جانے سے محاصرے نے ٹوٹ جانا تھا۔ باطنی فدائیوں کے

لیے کسی کو قتل کر دینا معمولی سا کرتب تھا۔ فدائیوں کو پکڑے جانے کا اور سزا کا تو کوئی ڈر ہی نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے شکار کو قتل کر کے اپنے آپ کو بھی مار ڈالتے تھے۔

شاہ در قلعہ بند شہر تھا اور یہ قلعہ اَلموُت کے بعد باطنیوں کا بڑا مضبوط اڈہ تھا۔ اس شہر کا جو قلعہ تھا وہاں بہت سے برُج اور برُجیاں تھیں۔ شہر کے اِردگِرد جو شہر پناہ تھی وہ کوئی معمولی سی دیوار نہ تھی بلکہ خاصی چوڑی تھی' بلند بھی تھی اور بہت ہی مضبوط۔ یہ شہر ایسی جگہ آباد کیا گیا تھا کہ اس کے پیچھے اور ایک پہلو پر اونچی پہاڑی تھی۔ ان اطراف سے قلعے پر حملہ کرنا خودکشی کے برابر تھا۔ دوسری دو اطراف میں دیوار پر چھوٹی بڑی برُجیاں تھیں جن میں ہر وقت تیر انداز اور برچھیاں پھینکنے والے تیار رہتے تھے۔ شہر کی چاروں اطراف کی لمبائی تاریخ میں چھ کوس لکھی ہے۔

اس شہر کا حکمران حسن بن صباح کے پیر استاد عبدالملک بن عطاش کا ایک بیٹا احمد بن عبدالملک تھا۔ اس کا ایک بھائی احمد بن عطاش بھی وہیں تھا۔ دونوں جنگجو تھے اور دھوکہ دہی اور فریب کاری میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔

سلطان برکیارق نے جب باطنیوں کے قتلِ عام کا حکم دیا تھا تو حسن بن صباح نے اس کے جواب میں حکم دے دیا تھا کہ مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا جائے۔ داستان گو یہ قتل اور انتقامی قتل کا سلسلہ سنا چکا ہے۔ باطنی قافلوں کو لُوٹا کرتے تھے اور اس طرح انہوں نے بے پناہ مال و دولت اکٹھا کر لیا تھا۔ سلجوقی سلطانوں نے یہ لُوٹ مار کا سلسلہ خاصی حد تک روک دیا تھا۔ دو شہروں مَروْ اور رے میں سلطان کے حکم سے کسی باطنی کو زندہ نہیں رہنے دیا گیا تھا۔ اس کے جواب میں شاہ در میں عبدالملک بن عطاش کے حکم سے مسلمانوں کو قتل کیا جانے لگا اور وہاں سے مسلمان بھاگ کر دوسرے شہروں میں چلے گئے تھے۔ اس سے پہلے شاہ در میں مسلمانوں کی آبادی اچھی خاصی تھی اور اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ عبدالملک بن عطاش نے قافلے لُوٹنے کا حکم بھی دے دیا تھا۔ ان لوگوں نے تین چار قافلے لُوٹے تھے جن میں سے ایک قافلہ حجاج کا تھا۔ اس قافلے میں بہت سے ملکوں کے حاجی تھے' ہندوستان کے حاجی بھی اس میں شامل تھے۔ یہ خبریں سلجوقی سلطنت کے سلطان تک پہنچتی رہی تھیں اور اس کا ایک ہی حل سوچا گیا تھا کہ شاہ در پر حملہ کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر دی جائے۔

اب اس شہر کو محاصرے میں لے لیا گیا تھا۔

شاہ در کو محاصرے میں لینے کی اطلاع وسم کوہ سالار اوریزی کو بھی مل گئی۔ وہ تو قلعہ الموت پر حملے کے منصوبے بناتا رہتا تھا اور اس مقصد کے لئے وہ زمین ہموار کر رہا تھا اور اس نے ایک فوج بھی تیار کرنی شروع کر دی تھی۔ اسے جب شاہ در پر محاصرے کی اطلاع ملی تو اس نے مزمل آفندی اور بن یونس کو بلایا۔ یہ دونوں ابھی تک وہیں تھے۔ ان دونوں نے بھی باطنیوں کو تہس نہس کر دینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

"میں نے تم دونوں کی مدد سے وسم کوہ تو فتح کر لیا ہے" —— سالار اوریزی نے کہا —— "لیکن مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں یہاں ہوں' مجھے اس وقت شاہ در ہونا چاہئے تھا۔ میں اس قلعے کو اپنے ہاتھوں تباہ کرتا۔ ان باطنیوں نے وہاں کسی ایک بھی مسلمان کو زندہ نہیں چھوڑا۔ زندہ وہی رہا جو وہاں سے بھاگ آیا تھا"۔

"الموت کو فتح کرنے کی تیاریاں جاری رکھیں" —— مزمل نے کہا —— "اگر آپ نے الموت فتح کر لیا تو آپ کا یہ کارنامہ تاریخ قیامت تک لوگوں کو سناتی رہے گی اور یہ تاریخ اسلام کا ایک درخشاں باب ہو گا..... لیکن میں ایک بات سوچتا ہوں۔ میں نے الموت اچھی طرح دیکھا تھا۔ اب سنا ہے کہ الموت ایک بند شہر بن گیا ہے اور کوئی اجنبی وہاں چلا جائے تو اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کس طرف جا رہا ہے یا وہ کس طرف سے آیا تھا۔ یہ بھی سنا ہے کہ اس کا دفاع اور زیادہ مضبوط کر دیا گیا ہے لیکن اس شہر کے اب دو حصے بن گئے ہیں۔ ایک جو شہر ہے اوپر نظر آتا ہے اور دوسرا شہر اس کے نیچے ہے جسے آپ زمین دوز کہہ لیں۔ سنا ہے نیچے ایسی بھول بھلیاں ہیں جن میں گیا ہوا آدمی نکل نہیں سکتا۔ میرا خیال ہے الموت پر حملے سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ اس شہر کے اندر کیا ہے اور اسے کس طرح فتح کیا جا سکتا ہے"۔

"تم وہاں کس طرح جا کر دیکھ سکتے ہو؟" —— سالار اوریزی نے پوچھا۔

"اتفاق اچھا ہوا ہے کہ یہ بات آج ہی ہو گئی ہے" —— مزمل نے کہا —— "میں آپ کے ساتھ یہ بات کرنا ہی چاہتا تھا۔ میں اور بن یونس الموت جائیں گے۔ ہمارا جانے کا سب سے بڑا مقصد حسن بن صباح کا قتل ہو گا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ کام تقریباً ناممکن ہے لیکن میں دوسرا کام ضرور کروں گا۔ وہ یہ کہ اس شہر کے نیچے جا کر دیکھوں گا کہ وہاں کیا ہے اور پھر شہر کے اردگرد گھوم کر دیکھوں گا کہ اس میں کس طرح لشکر کو داخل

کیا جا سکتا ہے۔ جب تک یہ پتہ نہیں چلے گا' ہم کتنا ہی بڑا لشکر لے جائیں' کامیاب نہیں ہو سکیں گے"۔

"شہر کے اندر جانے کے لئے تمہارا روپ بہروپ کیا ہو گا؟" —— سالار اوریزی نے پوچھا۔

"فدائی!" —— مزمل نے جواب دیا —— "ہم دونوں حسن بن صباح کے فدائی یا پیروکار بن کر جائیں گے"۔

"یہ بات ہم پر چھوڑیں" —— بن یونس نے کہا —— "ہم نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ ہم مارے جائیں گے۔ اگر آپ ابلیسیت کے اس طوفان کو روکنا چاہتے ہیں تو کسی نہ کسی کو تو اپنی جان قربان کرنا پڑے گی..... ان ہزارہا جانوں کو یاد کریں جو حسن بن صباح کے حکم سے باطنیوں کے ہاتھوں ضائع ہوئیں اور پھر اس خانہ جنگی کو یاد کریں جس میں بے حساب خون بہہ گیا تھا۔ ہم نے اس خون کا حساب چکانا ہے۔ ہم جس روز ان جانوں کو اور خون کو بھول گئے اس روز ہمارے عظیم دین اسلام کا زوال شروع ہو جائے گا"۔

مزمل اور بن یونس کا عزم اور منصوبہ یہ تھا کہ جس طرح باطنی مسلمانوں کے معاشرے میں' مذہب اور سرکاری انتظامیہ میں کسی نہ کسی بھیس اور بہروپ میں مخلص اور بے ضرر افراد کی حیثیت سے داخل ہو کر ڈنک مار جاتے ہیں اسی طرح ایک جماعت تیار کی جائے جو حسن بن صباح کے اندرونی حلقوں تک پہنچ جائے اور پہچانی نہ جا سکے اور اسی طرح باطنیوں کی جڑوں میں بیٹھ کر ان کا خاتمہ کیا جائے۔ مزمل کی بیوی شمونہ بھی یہی لگن اپنے دل میں لئے پیچ و تاب کھاتی رہتی تھی۔ اب اسے پتہ چلا کہ مزمل اور بن یونس الموت جا رہے ہیں تو وہ بھی تیار ہو گئی۔ شافعیہ کے دل میں شمونہ کی ایسی محبت پیدا ہو گئی تھی کہ جب اس نے سنا کہ شمونہ الموت جا رہی ہے اور کیوں جا رہی ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس کے دل میں بھی باطنیوں کے خلاف زہر بھرا ہوا تھا۔ ویسے بھی وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ وہ تھی تو نوعمر لیکن خزانے والے غار سے تنہا نکلنے کے دوران اسے جو تجربات ہوئے تھے' ان سے اس کی شخصیت میں پختگی پیدا ہو گئی تھی اور پھر اس کے اندر ایک عزم بھی پیدا ہو گیا تھا جسے وہ اچھی طرح سمجھ نہیں سکی تھی لیکن شمونہ کے ساتھ رہنے سے اس کے سامنے ہر ایک چیز واضح ہو گئی۔ اس نے

شمونہ نے کہا کہ وہ بھی ان کی مہم میں شامل ہونا چاہتی ہے۔

شمونہ نے مزمّل اور بن یونس کے ساتھ بات کی تو انہوں نے اس خیال سے شافعیہ کو اپنے ساتھ لے جانا بہتر سمجھا کہ وہ جس بہروپ میں جائیں گے' اس میں ایک نوجوان لڑکی کارآمد ثابت ہوگی.... ان چاروں نے زیادہ انتظار نہ کیا۔ پانچ گھوڑے لئے۔ چار گھوڑوں پر یہ پارٹی سوار ہوئی اور پانچویں گھوڑے پر کھانے پینے کا اور دیگر سامان لاد لیا گیا۔ ان کی منزل قلعہ اَلمُوت تھی۔ اَلمُوت دراصل موت کی منزل تھی۔ زیادہ تر امکان یہی تھا کہ وہ زندہ واپس نہیں آسکیں گے۔ مزمّل کو پہلے وہاں کا تجربہ ہو چکا تھا۔ وہ تو زندہ ہی آیا تھا لیکن وہ جس جذبے والا مزمّل تھا وہ مر گیا تھا۔ شمونہ نے شافعیہ کو ذہن نشین کرا دیا تھا کہ وہ جہاں جا رہے ہیں وہاں موت زیادہ قریب ہوگی اور اگر وہ زندہ رہی تو ذلت و خواری میں زندہ رہے گی۔ شافعیہ نے یہ سنا تو اس نے کہا کہ وہ جو عزم ساتھ لے کر چلی ہے' اس پر وہ اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہے۔

○

شاہ در کا محاصرہ مکمل ہو چکا تھا اور شہر میں داخل ہونے کے لئے حملے بھی شروع ہو گئے تھے۔ محمد نے اور اس کے سالاروں نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ بہت ہی مضبوط' ان کی توقعات سے بھی زیادہ مستحکم قلعہ ہے جسے چند دنوں یا چند مہینوں میں سر نہیں کیا جا سکے گا۔ شہر پناہ پر تیراندازوں اور برچھیاں پھینکنے والوں کا ایک ہجوم کھڑا تھا۔ ان کے سامنے پتھروں کی بڑی مضبوط آڑیں تھیں۔

محمد نے لشکر کے ساتھ یہاں پہنچتے ہی جاسوسوں سے رپورٹیں لی تھیں۔ سلجوقیوں کا جاسوسی کا نظام مضبوط اور کارآمد تھا۔ شاہ در میں بھی جاسوس موجود تھے جو محاصرے سے پہلے ہی باہر نکل آئے تھے کیونکہ انہوں نے محمد کو اندر کی ساری صورتِ حال اور احوال و کوائف بتانے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ شاہ در میں کوئی باقاعدہ فوج نہیں لیکن ہر شہری لڑنے کے لئے تیار ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان شہریوں کو قلعے سے باہر لایا جائے تو یہ باقاعدہ جنگ لڑنے کے قابل نہیں اور نہ ہی انہیں ایک لڑنے والے لشکر کی ترتیب اور تنظیم کا علم ہے' البتہ ان میں جذبہ بڑا ہی سخت ہے۔ جاسوسوں نے یہ بھی بتایا کہ اس شہر میں مسلمان نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کو اس شہر سے قتلِ عام اور لوٹ مار کے ذریعے بھگا دیا گیا یا قتل کر دیا گیا تھا۔

اندر کی ایک اور بات معلوم ہوئی۔ یہ جاسوسوں نے نہیں بتائی تھی' ایک اور ذریعے سے معلوم ہوئی تھی۔ داستان گو یہ ذریعہ بعد میں بتائے گا.... شاہ در کے باطنیوں نے چند مہینے پہلے ایک قافلہ لُوٹا تھا۔ اس قافلے میں زیادہ تر حجاج تھے جو حج سے واپس آ رہے تھے۔ اس میں امیر کبیر تاجر بھی تھے۔ مال و دولت کے علاوہ باطنیوں نے قافلے سے کچھ نوجوان اور خوبصورت لڑکیاں بھی اغوا کر لی تھیں۔ تاریخ میں ایسی ایک مغویہ لڑکی کا ذکر ملتا ہے جس کا نام نُور تھا۔ وہ عراق کی رہنے والی تھی اور اپنے باپ کے ساتھ حج کا فریضہ ادا کرنے گئی تھی۔ باپ کے علاوہ اس کے ساتھ اس کی ماں بھی تھی اور ایک بھائی بھی۔ ماں اور بھائی باطنی ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ باپ بچ گیا تھا وہ کسی طرح شاہ در اپنی بیٹی کے پیچھے آ گیا تھا۔

اُس وقت نُور کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی اور وہ کچھ زیادہ ہی حسین تھی۔ اس قسم کی لڑکیوں کو قلعہ اَلمُوت بھیج دیا جاتا تھا جہاں انہیں حسن بن صباح کی جنت کی حوریں بنایا جاتا اور خاص تربیت دی جاتی تھی۔ ان لڑکیوں میں اگر کوئی اور خصوصی ذہانت ہوتی تو انہیں دوسرے علاقوں میں تخریب کاری کے لئے بھیج دیا جاتا تھا۔ نُور کچھ ایسی حسین لڑکی تھی کہ یہ حسن بن صباح کے پیر استاد عبدالملک بن عطاش کے چھوٹے بھائی احمد بن عطاش کو پسند آ گئی اور اس نے نُور کے ساتھ شادی کر لی۔ اُس وقت احمد بن عطاش کی عمر پچاس سال تھی۔

لڑکی روز و شب روتے گزارتی تھی۔ اس کی ماں ماری گئی تھی اور اس کا بھائی بھی قتل ہو گیا تھا۔ اس کا باپ اپنی اس بیٹی کے ساتھ اتنی محبت اور پیار کرتا تھا کہ وہ بھی ساتھ آ گیا اور احمد بن عطاش کا ملازم بن گیا۔ نُور اپنے باپ کو اس روپ میں دیکھتی تو اور زیادہ روتی اور کڑھتی تھی۔ نُور کے باپ نے احمد بن عطاش کا اعتماد حاصل کر لیا۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ یہاں سے اپنی بیٹی کو کسی طرح نکال کر لے جائے لیکن کوئی ذریعہ اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

آخر ایک روز باپ بیٹی کو خبر ملی کہ سلجوقیوں کے لشکر نے شہر کا محاصرہ کر لیا ہے۔ نُور نے وضو کیا اور اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے نفل پڑھنے لگی۔ وہ روتی جاتی اور نفل پڑھتی جاتی تھی۔ آخر اُس نے دُعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور سسکیاں لے لے کر اللہ کو پکارا اور کہا' یا اللہ اپنے اُس گھر کی لاج رکھ لے جس کا حج کر کے آئی ہوں۔ شیطان'

کے ان چیلوں کو تباہ کر دے۔ اُس نے اللہ سے شکوہ بھی کیا کہ اللہ نے اسے حج کا کیا اجر دیا ہے۔ وہ بار بار کہتی تھی کہ شیطان کے ان چیلوں کو تباہ کر دے۔ اُس کی آواز بلند ہوتی چلی گئی اور اسنے میں احمد بن عطاش کمرے میں داخل ہُوا۔ اُس نے نُور کی یہ دُعا سن لی تھی۔

"اللہ اس گھر کی لاج رکھے گا جہاں تم موجود ہو" —— احمد بن عطاش نے طنزیہ کہا —— "فوراً" اٹھو اور یہ دعا ختم کرو.... تم میری بیوی ہو اور تم آزاد نہیں ہو سکتیں"۔

"اگر میرا اللہ سچا ہُوا تو تم ذلیل ہو کر مرو گے" —— نُور نے احمد بن عطاش سے کہا —— "تم نے مجھے اللہ کی عبادت سے روکا ہے۔ تم ذلیل ہو کر مرو گے.... میں تمہیں ذلّت کی موت مرتا دیکھوں گی"۔

نُور نے پہلی بار اپنے خاوند کے خلاف زبان کھولی تھی۔ اس کی آواز میں غصہ اور انتقام تھا اور اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ احمد بن عطاش نے اس کے منہ پر بڑا ہی زوردار تھپڑ مارا۔ نُور چپ ہو گئی اور احمد بن عطاش کمرے سے نکل گیا۔

○

داستان گو اس داستان کے آغاز میں سنا چکا ہے کہ عبدالملک بن عطاش کسی سفلی عمل کا یا ایسے ہی کسی اور عمل کا ماہر تھا جس سے دوسروں کو نقصان پہنچایا جا سکتا تھا یا دوسروں پر اثر انداز ہُوا جا سکتا تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس نے یہ عمل حسن بن صباح کو بھی سکھایا تھا لیکن بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح نے یہ عمل کم ہی استعمال کیا تھا' اس کی شخصیت کا اور کردار کا اپنا ہی ایک جادو تھا جس کے زور پر اس نے وہ مقبولیت حاصل کی تھی جس نے تاریخ میں ایک نئے اور انوکھے باب کا اضافہ کر دیا تھا۔

عبدالملک بن عطاش ضعیف العمر تھا۔ اس نے شہر اور دیگر امور اپنے بیٹوں کے حوالے کر دیئے تھے اور وہ خود اسی سفلی عمل میں لگا رہتا تھا۔ ایک مؤرخ لکھتا ہے کہ اس کا ایک خاص کمرہ تھا جس میں کوئی اجنبی چلا جاتا تو اس پر غشی طاری ہونے لگتی تھی کیونکہ اس کمرے میں ایک تو بدبو ناقابلِ برداشت تھی اور دوسرے یہ کہ اس میں انسانی کھوپڑیاں اور دوسری ہڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کمرے میں چند ایک پنجرے رکھے ہوئے تھے۔ کسی میں سانپ بند تھا اور کسی میں اُلّو بند کئے ہوئے تھے۔

تاریخ میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ اس نے کوئی ایسا عمل کیا ہو کہ فلاں شہر یا فلاں سلطان یا فلاں بادشاہ تباہ ہو جائے اور وہ تباہ ہو گیا ہو لیکن اس کے ہاتھ میں کوئی تھوڑی بہت طاقت ضرور تھی جسے مؤرخین نے سفلی عمل کہا ہے۔

اسے جب اطلاع ملی کہ سلجوقی لشکر نے شہر کو محاصرے میں لے لیا ہے اور لشکر اتنا زیادہ ہے کہ شہر کو فتح کر ہی لے گا تو وہ اپنے اس خاص کمرے میں پہنچا اور ایک پنجرے میں سے ایک اُلّو نکالا۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ اس کا خاص نوکر ہر وقت کمرے کے دروازے کے باہر موجود رہتا تھا جسے وہ کسی ضرورت کے تحت اندر بلا لیا کرتا تھا۔ یہ خاص نوکر نُور کا باپ تھا۔

عبدالملک بن عطاش دو دن اور دو راتیں کمرے میں بند رہا۔ اس دوران نوکر اسے صرف دودھ پلاتا رہا جس میں شہد ملا ہوتا تھا۔ اس کے بعد اس نے نوکر سے کہا کہ وہ فلاں اور فلاں آدمی سے کہے کہ ایک نابینا آدمی کہیں سے پکڑ کر لایا جائے۔ یہ حکمران خاندان تھا جس کا حکم چلتا تھا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک بھکاری سا نابینا پکڑ کر لایا گیا اور اسے عبدالملک بن عطاش کے حوالے کر دیا گیا۔ عبدالملک اسے اپنے کمرے میں لے گیا اور دو دن اور دو راتیں اُسے اپنے ساتھ رکھا۔ معلوم ہُوا کہ عبدالملک اس نابینا کے جسم پر چھری کی نوک مارتا تھا اور وہاں سے جو خون نکلتا تھا وہ اس اُلّو کو پلاتا تھا۔

یہ نابینا جب اس کمرے سے نکلا تو اس کے جسم پر بہت سے زخم تھے جو ایسے ہی تھے کہ وہاں چھری بار بار چبھوئی گئی تھی۔ عبدالملک بن عطاش نے نوکر سے کہا کہ اسے طبیب کے پاس لے جا کر اس کی مرہم پٹی کروا دے اور پھر اسے اس کے بیٹے احمد بن عبدالملک کے پاس لے جائے اور کہے کہ اسے اچھی خاصی رقم انعام کے طور پر دے دی جائے.... یہ کارروائی مکمل ہو گئی تو نوکر پھر واپس عبدالملک کے پاس آیا۔

عبدالملک نے اسے اندر بلایا اور کہا کہ اس اُلّو کو پکڑ کر رکھے۔ نوکر نے اُلّو پکڑا اور عبدالملک کے کہنے پر اس کا منہ کھولا۔ عبدالملک نے اس کھلے ہوئے منہ میں چھوٹا سا ایک کاغذ تہہ در تہہ کر کے ڈال دیا اور نوکر سے کہا کہ اس کا منہ کالے دھاگے سے اچھی طرح باندھ دے۔ نوکر نے باندھ دیا۔ پھر عبدالملک بن عطاش نے یہ اُلّو پنجرے میں بند کر دیا اور نوکر کے ساتھ کچھ باتیں کیں۔ اس نوکر پر اسے پورا پورا اعتماد تھا اور کچھ

رازداری بھی تھی۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس نوکر نے یہ اعتماد اس مقصد کے لئے پیدا کیا تھا کہ اسے کبھی یہ موقع مل جائے کہ اپنی بیٹی نور کو اس سے آزاد کرا کے نکل بھاگے اور سلجوقیوں کے پاس پہنچ جائے۔

محمد نے اپنے تیر اندازوں کو کئی بار دیوار کے قریب جا کر اوپر کے ہجوم پر تیر چلانے کے لئے بھیجا لیکن اوپر سے بارش کی طرح تیر آتے تھے اور محمد کے تیر انداز پیچھے ہٹ آتے تھے۔ محمد نے حکم دیا کہ فوری طور پر بڑی کمانیں تیار کی جائیں جن سے نکلے ہوئے تیر دور سے دیوار کے اوپر تک پہنچ جائیں۔

محمد اپنے ایک سالار کے ساتھ قلعے کے اِرد گِرد گھوم رہا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا اور دیکھ رہا تھا کہ کوئی ایسی جگہ نظر آ جائے جہاں سے دیوار توڑنے کی کوشش کی جائے یا کوئی اور ذریعہ نظر آ جائے۔ محمد چونکہ سلطان تھا اور اس لشکر کا کمانڈر بھی تھا اس لئے سلجوقی پرچم بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کے پیچھے' دائیں بائیں اور آگے اس کے سوار محافظ تھے جنہوں نے اسے حصار میں لے رکھا تھا۔

پرچم اور محافظ دو ایسی نشانیاں تھیں کہ دور سے پتہ چل جاتا تھا کہ وہ بادشاہ ہے' سلطان ہے یا اس لشکر کا سپہ سالار ہے۔ پھر دشمن کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اسی پر حملہ کیا جائے یا زیادہ تر تیر وہیں پھینکے جائیں اور اسے مارا جائے تاکہ پرچم گر پڑے۔ پرچم گرنے کی صورت میں یا لشکر کے کمانڈر یا بادشاہ کے مارے جانے کی صورت میں پورا لشکر بددل ہو کر پسپا ہو جایا کرتا تھا۔

محمد کے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا۔ وہ جدھر جاتا تھا تیر اُدھر ہی زیادہ آتے تھے لیکن وہ تیروں کی زد سے باہر تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک درخت کے قریب پہنچا تو ایک تیر درخت کے تنے میں آن لگا اور وہیں کھُب گیا۔ وہاں تو تیروں کی بارش آ رہی تھی اس لئے ایک ایک تیر کو دیکھنے کا کوئی مطلب نہیں تھا لیکن یہ تیر جو درخت کے تنے میں زمین سے ذرہ اوپر لگا تھا' محمد کی نظروں میں آ گیا۔ اس تیر کے ساتھ کوئی کاغذ یا کپڑا بندھا ہوا تھا۔ محمد رُک گیا اور اس نے ایک محافظ سے کہا کہ یہ تیر تنے سے نکال لائے۔ محافظ گھوڑے سے اترا اور وہ تیر تنے سے نکال کر محمد کو دے دیا۔

محمد نے ٹھیک دیکھا تھا۔ تیر کے درمیان میں تہہ کیا ہوا ایک کاغذ یا چھوٹا سا کپڑا دھاگے سے لپٹا ہوا تھا۔ محمد نے جلدی جلدی سے دھاگا اتارا اور دیکھا' یہ کاغذ جیسے باریک

چمڑے کا چند انچ چوڑا اور اتنا ہی لمبا ٹکڑا تھا اور اس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ محمد نے تحریر پڑھی۔ اس میں لکھا تھا کہ آج یا کل یا کسی بھی وقت شہر سے ایک الّو اڑے گا جو آپ کے لشکر کی طرف آئے گا اور شاید یہ الّو تمام تر لشکر کے اوپر سے چکر کاٹ کر شہر میں واپس آ جائے یا کہیں غائب ہو جائے۔ یہ الّو جونہی نظر آئے اُسے تیروں سے مار گرائیں اور جہاں یہ گرے وہیں اس پر خشک گھاس وغیرہ ڈال کر آگ لگا دینا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔

یہ شہادت بھی ملتی ہے کہ عبدالملک بن عطاش نے کہا تھا کہ اس نے جو عمل کیا ہے اس سے سلجوقیوں کا پورا لشکر نہیں تو لشکر کا کمانڈر اندھا ہو جائے گا۔ اگر آنکھوں سے اندھا نہ ہُوا تو عقل سے اندھا تو ضرور ہی ہو جائے گا اور پھر وہ جو بھی فیصلہ یا جو بھی کارروائی کرے گا وہ اس کے خلاف جائے گی۔

محمد نے اس پیغام کو بے معنی اور فضول سمجھ کر پھینک نہ دیا۔ اسے معلوم تھا کہ باطنی اور خصوصاً" عبدالملک بن عطاش کالا جادو جانتے ہیں اور انہوں نے ضرور کچھ عمل کیا ہو گا اور یہ پیغام اپنے ہی کسی جاسوس نے باہر پھینکا ہو گا۔ محمد نے یہ پیغام اپنے سالاروں کو پڑھ کر سنایا اور کہا کہ تمام لشکر میں یہ پیغام پہنچا دیا جائے اور انہیں بتا دیا جائے کہ جونہی انہیں الّو اُڑتا ہُوا اپنی طرف آتا نظر آئے اس پر تیر چلائیں اور اسے گرانے کی کوشش کریں اور وہ جب گر پڑے تو اس کو وہیں جلا ڈالیں.... پیغام فوراً" تمام لشکر تک پہنچ گیا۔

اس پیغام کے بعد لشکر کی حالت یہ ہو گئی کہ وہ شہر کی دیوار پر کھڑے تیر اندازوں پر تیر چلاتے تھے اور بار بار اوپر بھی دیکھتے تھے.... وہ دن گزر گیا اور رات کو بھی سپاہی اوپر دیکھتے رہے۔ پھر اگلا دن طلوع ہوا۔ ایک طرف سے شور اٹھا کہ وہ الّو اڑا۔ سب نے دیکھا کہ ایک الّو شہر میں سے اڑا اور ایک طرف سے سلجوقی لشکر کے اوپر گیا۔ لشکر کے مجاہدین نے اس پر تیر چلائے اور اتنے تیر چلائے کہ اس کا بچ کر نکلنا ممکن نہیں تھا۔ الّو گرا اور سب نے دیکھا کہ چار پانچ تیر اس کے جسم میں اُتر گئے تھے۔

محمد کو اطلاع دی گئی تو وہ گھوڑا سرپٹ دوڑاتا وہاں پہنچا۔ اُس نے دیکھا کہ الّو کا منہ کالے دھاگے سے بندھا ہُوا تھا۔ محمد نے حکم دیا کہ ابھی گھاس وغیرہ لائی جائے اور آگ لگا دی جائے۔ وہاں خشک گھاس کی کمی نہیں تھی۔ مجاہدین گھاس لے آئے اور خشک

ٹہنیاں بھی اٹھا لائے اور الاؤ کے اوپر ڈھیر کر کے آگ لگا دی۔

کیا اللہ نے نورُ کی دعا سن لی تھی؟.... کیا یہ معجزہ تھا؟.... آخر یہ کون تھا جس نے دشمن کے گھر سے یہ پیغام پھینکا تھا؟.... بہر حال یہ اللہ کا خاص کرم تھا کہ خطرہ ٹل گیا تھا۔

○

اُدھر مزمّل، بن یونس، شمونہ اور شافعیہ اَلموُت کی طرف جا رہے تھے۔ الموُت میں خطرہ شمونہ اور مزمّل کے لئے تھا۔ حسن بن صباح کے خاص آدمی ان دونوں کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ مزمل حسن بن صباح کو قتل کرنے گیا تھا اور حسن بن صباح نے اس کا دماغ اُلٹا چلا دیا تھا اور وہ واپس مَرو یہ ارادہ لے کر گیا تھا کہ سلطان ملک شاہ کو قتل کر دے گا۔

شمونہ تو حسن بن صباح کی خاص چیز بنی رہی تھی۔ اب شمونہ جوان نہیں تھی بلکہ جوانی کی آخری حد پر تھی پھر بھی حسن بن صباح اور اس کے آدمی اسے اچھی طرح پہچان سکتے تھے۔ اس طرح مزمّل اور شمونہ نے بہت بڑا خطرہ مول لے لیا تھا۔ مزمل نے داڑھی پوری طرح بڑھالی تھی اور شمونہ نقاب میں تھی۔ شافعیہ کا چہرہ بھی نقاب میں تھا لیکن انہیں اَلموُت پہنچ کر کہیں نہ کہیں بے نقاب ہونا ہی تھا۔ انہوں نے اپنے بچاؤ کی کچھ ترکیبیں سوچ لی تھیں لیکن جو خطرہ انہوں نے مول لیا تھا وہ کوئی معمولی خطرہ نہیں تھا۔

پہلے دن کے سفر کے بعد انہوں نے سورج غروب ہونے کے بعد ایک بڑی خوبصورت جگہ پر قیام کیا۔ یہ ایک ندی تھی جس کے کنارے انہوں نے ڈیرہ ڈال دیا۔ انہیں رات بھر وہیں رکنا تھا۔ گھنے درخت تھے، خودرو پودے تھے اور سامنے ایک ٹیکری تھی۔ وہ بھی سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ انہوں نے گھوڑوں کو کھول دیا۔ گھوڑوں نے پانی پیا اور پھر گھاس کھانے لگے۔

شام تاریک ہو گئی تو انہوں نے دو مشعلیں جلائیں اور زمین میں گاڑ دیں۔ کھانا کھولا اور دسترخوان بچھا دیا۔ چاروں کی نظریں دسترخوان پر لگی ہوئی تھیں۔ مزمّل نے ویسے ہی اوپر دیکھا تو اسے سات آٹھ قدم دور ایک آدمی کھڑا نظر آیا۔ اس آدمی کے قدموں کی آہٹ نہیں سنائی دی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے زمین میں سے اوپر سے اٹھ آیا ہو۔ یہ شک بھی ہوتا تھا کہ یہ کوئی جن ہے جو انسان کے روپ میں ظاہر ہوا ہے۔ اس نے لمبی سفید عبا پہن رکھی تھی اور اس کے سر پر عمامہ تھا۔ وہ جواں سال تھا اور اس کی داڑھی

بڑی اچھی طرح تراشی ہوئی تھی۔ وہ جس لباس میں تھا، یہ اس علاقے کے معززین کا لباس تھا۔

"آؤ بھائی!" —— مزمّل نے اسے کہا —— "دسترخوان تیار ہے، آؤ ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ"۔

"میں مہمان نہیں" —— اس آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا —— "میں پہلے سے یہاں موجود ہوں۔ تم لوگ ابھی ابھی پہنچے ہو اس لئے تم مہمان ہو اور میں میزبان ہوں۔ ہم دس آدمی ہیں جو اس ٹیکری کے دوسری طرف پڑاؤ کئے ہوئے ہیں۔ کھانا مجھے پیش کرنا چاہئے تھا"۔

مزمّل اور شمونہ اسے بڑی ہی غور سے دیکھ رہے تھے۔ یہ دونوں ہلتی ہوئی جھاڑیوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔

"میں ابھی آیا" —— اس سفید پوش نے کہا اور وہاں سے چل پڑا۔

یہ ٹیکری کوئی زیادہ لمبی نہیں تھی۔ مٹی کے اونچے ڈھیر کی مانند تھی۔ وہ آدمی اس ٹیکری کے پیچھے چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس آیا۔ اس کے واپس آنے تک مزمّل اور اس کی پارٹی حیران و پریشان رہی اور یہ لوگ کچھ بھی نہ سمجھ سکے کہ یہ شخص آیا کیوں تھا اور یہ چلا کیوں گیا ہے۔ خطرہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ ایک بڑی ہی خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی۔ اس آدمی نے کہا تھا کہ وہ دس آدمی ہیں۔ دس آدمی ان دو آدمیوں پر آسانی سے قابو پا سکتے تھے اور شمونہ اور شافیعہ کو اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔

وہ آدمی آیا تو اس نے ہاتھوں میں کچھ اٹھا رکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ ان لوگوں کے پاس آ کر دو زانو ہوا اور جو کچھ اُس نے ہاتھوں میں لے رکھا تھا وہ ان کے دسترخوان پر رکھ دیا۔ وہ بھنے ہوئے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے تھے۔ وہ چمڑے کا ایک چھوٹا سا مشکیزہ بھی لایا تھا۔ بڑا ہی خوبصورت مشکیزہ تھا اور یہ بھرا ہوا تھا۔ پانی ہی ہو سکتا تھا۔

"یہ مشکیزہ اپنے پاس رکھیں" —— اس نے کہا —— "یہ ایک خاص شربت ہے۔ یہ پی کر دیکھیں۔ تمہاری طبیعت ہشاش بشاش ہو جائے گی اور تھکن کا تو نام و نشان نہیں رہے گا.... میں تمہارے کھانے میں اور زیادہ مخل نہیں ہونا چاہتا"۔

وہ اٹھا اور چلا گیا۔ وہ ٹیکری کی اوٹ میں ہوا تو مزمّل اٹھا اور دبے پاؤں تیز تیز چلا

ٹیکری پر چڑھ گیا اور ٹیکری کے اوپر جا کر لیٹ گیا۔

مزمّل نے دیکھا کہ ٹیکری سے بیس پچیس قدم دور تین مشعلیں جل رہی تھیں۔ اسی کے لباس جیسے دس آدمی نیم دائرے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ مزمّل چھپتا چھپاتا، پھونک پھونک کر قدم رکھتا ٹیکری سے اتر گیا۔ وہ ان لوگوں کی باتیں سننا چاہتا تھا۔

جب وہ نیچے اُترا تو وہ کھڑا نہ رہا بلکہ بیٹھ کر آہستہ آہستہ سرکتا گیا۔ وہ آدمی جو انہیں گوشت دے گیا تھا' وہ اپنے ساتھیوں کے پاس جا پہنچا تھا اور وہ ہنس بھی رہا تھا۔ مزمل اٹھا اور جھک کر ایک چوڑے تنے والے درخت تک جا پہنچا اور اس طرح چھپتا چھپاتا ان کے قریب چلا گیا جہاں سے وہ ان کی باتیں سن سکتا تھا۔

"کمال کی چیز ہے بھائیو!" — اس آدمی نے کہا — "دوسری بھی بُری نہیں لیکن اس کی عمر شاید تیس برس سے ذرا اوپر ہو گئی ہے۔ پھر بھی اچھی چیز ہے"۔

"شیخ الجبل کی نظرِ کرم ہے بھائی!" — ایک نے کہا — "یہ اُسی کا کرم ہے کہ ہمیں سفر میں اتنی خوبصورت چیز مل گئی ہے"۔

"اب سوچو انہیں یہاں لائیں کیسے!" — ایک نے کہا۔

"یہ اپنی چیزیں سمجھو بھائی!" — ایک اور بولا — "دو آدمی ہمارا کیا بگاڑ لیں گے؟ پہلے کھانا کھا لو اور انہیں بھی کھانا کھانے دو۔ مشکیزہ بھی انہیں ہمارا یار دے آیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں اس دنیا کی ہوش بھی نہیں رہے گی"۔

مزمّل نے اور کوئی بات نہ سنی۔ اس کا شک رفع ہو گیا تھا۔ وہ جس طرح چھپتا چھپاتا وہاں تک پہنچا تھا اُسی طرح دبے پاؤں جھکا جھکا' ایک درخت سے دوسرے درخت تک اوٹ میں چلتا ٹیکری تک پہنچا اور ٹیکری کے اوپر جانے کی بجائے ایک طرف سے ٹیکری سے گھوما اور اپنے ساتھیوں تک پہنچ گیا۔

اس کی غیر حاضری میں شمونہ نے مشکیزہ کھولا تھا اور پھر اسے سونگھا تھا۔ اس کا تو لڑکپن اور نوجوانی کا زیادہ حصہ ان باطنیوں کے ساتھ اور حسن بن صباح کے ساتھ گزرا تھا۔ اس نے مشکیزہ سونگھا تو اٹھی اور مشکیزہ ندی میں انڈیل دیا۔

"ہوشیار رہنا بھائی!" — مزمل نے کہا — "شیخ الجبل کے آدمی ہیں.... حسن بن صباح کے.... اب یہ دیکھنا ہے کہ حسن بن صباح کے ہاں ان کی کیا حیثیت ہے اور یہ کہاں جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے فدائی ہوں لیکن ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا"۔

"باطنی ہی معلوم ہوتے ہیں" — شمونہ نے کہا — "میں نے مشکیزہ کھول کر دیکھا اس میں حشیش ملا ہُوا شربت تھا۔ میں ندی میں انڈیل آئی ہوں۔ اب یہ آدمی آئے تو انہیں یہی بتائیں گے کہ ہم نے مشکیزہ خالی کر دیا ہے اور شربت واقعی اچھا تھا"۔

"ان کا گوشت بھی نہ کھاؤ" — بن یونس نے کہا — "اس میں بھی کچھ ملا ہُوا ہو گا۔ میں سمجھتا ہوں' ان کی نظر شافعیہ اور شمونہ پر ہے۔ ہم سے انہوں نے کیا لینا ہے"۔

مزمل نے گوشت کے تمام ٹکڑے بیٹھے بیٹھے ندی میں پھینک دیئے اور اپنا کھانا کھا لیا۔ اتنے میں ان دس میں سے تین آدمی آ گئے۔ مزمّل اور بن یونس نے انہیں بیٹھنے کو کہا اور وہ تینوں بیٹھ گئے۔

"مشکیزے والا شربت پی لیا ہے؟" — ایک نے پوچھا۔

"پی لیا ہے" — مزمّل نے جواب دیا اور مسکراتے ہوئے کہا — "اس شربت نے ہمیں جتایا ہے کہ ہم اور تم آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ایسے دو مشکیزے اور دے دو' ہم وہ بھی پی جائیں گے" — مزمل نے ان کے ذرا قریب سرک کر رازدانہ لہجے میں کہا — "ہم شاہ در سے آ رہے ہیں اور شیخ الجبل کے پاس جا رہے ہیں۔ ہم دونوں بھی فدائی ہیں۔ اس لڑکی کو شیخ الجبل کی خدمت میں پیش کرنا ہے"۔

"تم لوگ محاصرے سے کس طرح نکل آئے ہو؟" — ایک سفید پوش نے پوچھا۔

"ہم محاصرے سے ایک روز پہلے نکل آئے تھے" — مزمّل نے کہا — "محاصرے کی اطلاع تو ہمیں پہلے ہی مل چکی تھی۔ شیخ الجبل امام حسن بن صباح کے پیرو مرشد عبدالملک بن عطاش نے ہمیں ایک پیغام دے کر امام کی طرف بھیجا ہے"۔

"پیغام کیا ہے؟" — ایک نے پوچھا۔

"یہ جانتے ہوئے کہ تم ہمارے ہی بھائی ہو' یہ راز تمہیں نہیں بتاؤں گا" — مزمّل نے کہا — "اور تم مجھ سے پوچھو گے بھی نہیں۔ اپنا آپ تم پر اس لئے ظاہر کر دیا ہے کہ تمہارے متعلق یقین ہو گیا ہے کہ تم اپنے ہی آدمی ہو"۔

"کیا شاہ در کے فدائی حملہ آوروں کے سالاروں کو ختم نہیں کر سکتے تھے؟" — ایک اور سفید پوش بولا۔

"کیوں نہیں کر سکتے تھے!" — مزمّل نے کہا — "لیکن ہمیں حکم ہی کچھ اور دیا

گیا ہے اور ہم اس حکم کی تعمیل کے لئے جا رہے ہیں.... اگر ہم دونوں کو حکم ملتا تو ہم برکیارق، محمد اور سنجر کو اور ان کے ایک دو سالاروں کو ختم کر چکے ہوتے"۔

"وہ ہم کر لیں گے" ـــــ ایک سفید پوش نے بے اختیار کہہ دیا ـــــ "دیکھتے ہیں محاصرہ کس طرح قائم رہتا ہے"۔

"یہ وہی دس فدائی تھے جو حسن بن صباح کے حکم سے بھیجے جا رہے تھے اور ان کا کام یہ تھا کہ انہوں نے محمد اور اس کے سالاروں کو قتل کرنا تھا۔ ان کے قتل کا طریقہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ یہ ان کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

○

یہ تینوں فدائی کچھ دیر باتیں کر کے اور اپنی اصلیت بے نقاب کر کے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد مزمّل نے اپنے ساتھیوں کو بتایا آج رات سونا نہیں۔ بتایا نہیں جا سکتا کہ آج رات کیا ہو جائے۔

اس رات بہت کچھ ہو گیا۔ انہوں نے مشعلیں جلتی رکھیں۔ انہیں جلائے رکھنے کا ایک مقصد یہ تھا کہ درندے آگ کے قریب نہیں آتے۔ اس کے علاوہ انہیں روشنی کی ضرورت تھی۔

آدھی رات سے کچھ پہلے تک سبھی جاگ رہے تھے۔ وہ بیٹھے ہوئے نہیں بلکہ لیٹے ہوئے تھے۔ انہیں اس طرح محسوس ہوا جیسے کوئی ٹیکری کے قریب آ رہا ہے۔ وہ جنگل کا کوئی جانور اور درندہ بھی ہو سکتا تھا لیکن مزمّل اور بن یونس کو کچھ اور ہی شک تھا۔ مزمّل نے سرگوشی میں سب سے کہا کہ اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے گہری نیند سوئے ہوئے ہوں۔

وہ دو آدمی تھے۔ مزمّل اور بن یونس آنکھیں ذرا سی کھول کر دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے لیٹنے کا یہ انتظام کیا تھا کہ مزمّل تھا، اس کے قریب شافعیہ تھی پھر بن یونس تھا اور اس سے ذرا پرے شمونہ تھی۔ دونوں آدمی دبے پاؤں ان کے بالکل قریب آ گئے۔ ایک مزمّل کے اوپر جھکا اور دوسرا بن یونس کے اوپر۔ دونوں نے آہستہ آہستہ خراٹے لینے شروع کر دیئے۔

پھر دونوں اکٹھے ہو کر شافعیہ پر جھکے۔ وہ رکوع کی پوزیشن میں چلے گئے تھے۔ ایک نے اپنے ساتھی سے سرگوشی کی ـــــ "انہیں کوئی ہوش نہیں.... آرام سے اٹھاؤ" ـــــ

اور وہ دونوں اپنے اپنے بازو شافعیہ کے نیچے کر کے اٹھانے لگے۔

پیشتر اس کے ان دونوں کو پتہ چلتا کہ یہ کیا ہوا ہے ایک کی پیٹھ میں مزمّل کا اور دوسرے کی پیٹھ میں بن یونس کا خنجر اتر چکا تھا۔ ان دونوں نے ان پر ایک ایک اور وار کیا اور پھر دونوں کو گھسیٹ کر ندی میں پھینک دیا۔ ندی تو ایسی گہری نہیں تھی لیکن پہاڑی ندی ہونے کی وجہ سے اس کا بہاؤ بڑا تیز تھا۔ ندی چند قدم ہی دور تھی۔ مزمّل اور بن یونس بڑے اطمینان سے آ کر پھر اسی طرح لیٹ گئے۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ تین اور سفید پوش آ گئے۔ انہوں نے بھی وہی کارروائی کی جو پہلے ان کے دو ساتھی کر چکے تھے۔ ان میں سے بھی ایک نے سرگوشی کی کہ یہ ہوش میں معلوم نہیں ہوتے۔ دوسرے نے سرگوشی میں کہا کہ معلوم نہیں وہ دونوں کہاں چلے گئے ہیں۔ پھر یہ بھی شافعیہ کو اٹھانے کے لئے جھکے اور پھر مزمّل اور بن یونس کے خنجر حرکت میں آ گئے۔ وہ تینوں فدائی تھے جو زندگی اور موت کو کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے لیکن ان کے ساتھ جو ہوا وہ ان کے لئے غیر متوقع تھا۔ اگر انہیں معلوم ہوتا یا ذرا سا بھی شک ہوتا تو وہ اپنے ہتھیار ہاتھوں میں تیار رکھتے لیکن ان پر جو حملہ ہوا وہ اچانک تھا۔

"مزمّل بھائی!" ـــــ بن یونس نے کہا ـــــ "اب باقی جو پانچ رہ گئے ہیں، ان کا انتظار یہاں نہ کرو۔ چلو ان لڑکیوں کو بھی تلواریں یا خنجر دو۔ پہلے وہ آئے تھے اب ہم چلتے ہیں"۔

پیشتر اس کے باقی پانچ یا ان میں سے دو تین آتے، ان چاروں نے جلدی جلدی سے ایک سکیم تیار کر لی اور سامنے والی ٹیکری کے اوپر چلے گئے۔ دونوں لڑکیوں کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ مزمّل اور بن یونس خنجروں سے مسلح تھے۔

ٹیکری پر جا کر وہ بیٹھ گئے اور آہستہ آہستہ سرکتے آگے بڑھے اور اس طرف اتر گئے۔ ان کی مشعلیں بھی جل رہی تھیں اور وہ پانچوں کھڑے اپنے ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے۔

مزمّل کی قیادت میں اس کے ساتھی چھپتے چھپاتے آگے بڑھتے گئے اور اتنی آگے چلے گئے جہاں سے وہ ان کی باتیں سن سکتے تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے ہمارے اپنے بھائی ہمیں ایک لڑکی کے پیچھے دھوکہ دے

رہے ہیں۔

"سب چلو اور ان کو دیکھتے ہیں" — ایک نے کہا — "اگر وہ کوئی گڑبڑ کر رہے ہوئے تو انہیں یہیں ختم کر دیں گے"۔

پانچوں چل پڑے۔ مزمل اور اس کے ساتھی ذہیں جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گئے۔ وہ پانچوں ان کے قریب سے گزرے۔ مزمل کے اشارے پر سب نے ان پر خنجروں اور تلواروں سے حملہ کر دیا۔ مزمل کی بدقسمتی کہ اس کا پاؤں کسی جھاڑی میں یا درخت کی جڑ کے ساتھ اٹک گیا اور وہ منہ کے بل گرا۔ اس کے ساتھیوں نے حملہ بھرپور کیا تھا لیکن ان پانچ سفید پوشوں میں سے ایک الگ ہو گیا اور وہ مزمل کے قریب اس حالت میں آیا کہ مزمل اٹھ رہا تھا۔ اس سفید پوش فدائی نے بڑی تیزی سے اپنا خنجر نکالا اور مزمل پر وار کیا۔ مزمل نے وار بچا تو لیا لیکن خنجر اس کے دائیں کندھے میں اتر گیا اور یوں لگا جیسے ہنسلی کٹ گئی ہو۔ مزمل نے جوابی وار ایسا کیا کہ فدائی پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ مزمل نے بڑی تیزی سے دو تین خنجر مارے اور اسے گرا لیا۔ اس کے ساتھیوں نے باقی چار کو گرا لیا اور ان سب پر اتنے وار کیے گئے کہ ان کا زندہ رہنا ممکن ہی نہ رہا۔

انہوں نے بہت بڑا اور خطرناک شکار مارا تھا لیکن مزمل ایسا زخمی ہوا کہ اس کا خون اُمڈ اُمڈ کر باہر آ رہا تھا۔ وہ اب آگے کو سفر کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ بن یونس نے اس کے زخم میں کپڑا ٹھونس کر اوپر ایک اور کپڑا باندھ دیا اور سب نے فیصلہ کیا کہ یہیں سے اور اسی وقت واپسی کا سفر اختیار کیا جائے تاکہ دوپہر تک دسم کوہ پہنچ جائیں۔ مزمل کا اتنا زیادہ خون ضائع نہیں ہونا چاہیے تھا۔ انہوں نے اُسی وقت رختِ سفر باندھا اور واپسی کے سفر کو روانہ ہو گئے۔ انہوں نے ان دس فدائیوں کا سامان دیکھا ہی نہیں نہ ہی اسے یہ ہاتھ لگانا چاہتے تھے، البتہ ان کے گھوڑے اور ہتھیار اپنے ساتھ لے لئے۔ یہ ان کا مالِ غنیمت تھا۔ انہیں غالباً یہ اندازہ نہیں ہو گا کہ انہوں نے ان دس فدائیوں کو قتل کر کے شاہ در کے محاصرے میں کیسی جان ڈال دی ہے۔ یہ دس فدائی وہاں پہنچ جاتے تو محمد بھی نہ ہوتا اور وہاں کے سالار بھی مارے جاتے پھر محاصرے نے بُری طرح ناکام ہونا تھا۔

○

محاصرہ بڑا ہی سرگرم ہو گیا تھا لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ چونکہ مرو کا لشکر انتقام سے پاگل ہوا جا رہا تھا اس لئے سالاروں کو یہ مشکل پیش نہیں آتی

تھی کہ وہ انہیں آگے کس طرح دھکیلیں بلکہ مشکل یہ پیش آ رہی تھی کہ یہ لشکر بار بار دیوار کے قریب یا دروازوں کی طرف اٹھ دوڑتا تھا اور اسے روکنا پڑتا تھا۔ وہاں شجاعت اور بے خوفی کی تو ضرورت یقیناً تھی لیکن عقل کے بغیر شجاعت بڑی ہی نقصان دہ تھی۔

یہاں تک دلیرانہ کارروائی کی گئی کہ ایک رات دیوار کے قریب جا کر کمند اوپر پھینکی گئی۔ کمند چھوٹی دو بُرجیوں کے درمیان اٹک گئی اور دو تین مجاہدین رسہ پکڑ کر اوپر جانے لگے۔ دیوار کے اوپر سے تیر آتے تھے اور ان تیر اندازوں کو دُور رکھنے کے لئے سلجوقی تیر اندازوں نے بے پناہ تیر پھینکنے شروع کر دیئے۔ مجاہدین رسہ چڑھتے گئے لیکن کچھ دور سے دیوار والے تیر اندازوں نے رسہ چڑھتے مجاہدین پر تیر پھینکنے شروع کر دیئے اور برچھیاں بھی پھینکی گئیں اور ان پر جلتی ہوئی مشعلیں بھی پھینکیں۔ مجاہدین زخمی بھی ہوئے اور دو کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ اگر اس آگ کے باوجود اوپر ہی جاتے رہتے تو رسے کو بھی آگ لگ سکتی تھی۔ بہرحال اوپر جانا ممکن نہ رہا اور یوں کچھ مجاہدین شدید زخمی ہو کر رسے سے اتر آئے۔

شہر کے دو اطراف پہاڑی تھی۔ اس طرف بھی تیر اندازوں کو لے جایا گیا لیکن وہاں مشکل یہ تھی کہ پہاڑی کے دامن اور شہر کی دیوار کے درمیان فاصلہ بہت تھوڑا تھا۔ مجاہدین پہاڑی پر چڑھتے تھے تو شہر پناہ کے تیر انداز ان پر تیروں کی بارش برسا دیتے تھے۔

دروازے توڑنے کی بھی کوشش کی گئی۔ مجاہدین کلہاڑوں سے توڑنے کے لئے دروازوں تک پہنچ گئے لیکن آدھے ہی زندہ واپس آ سکے۔ دروازہ توڑنے کا ایک اور طریقہ بھی اختیار کیا گیا۔ وہ یہ تھا کہ درختوں کے بہت وزنی تنے کاٹے گئے، ان سے شاخیں وغیرہ اتار دی گئیں اور بے شمار مجاہدین نے ایک تنے کو کندھوں پر اٹھایا اور دوڑتے ہوئے ایک دروازے تک گئے اور اس تنے کا اگلا سرا دروازے پر مارا۔ دروازے اتنے مضبوط تھے کہ نہ ٹوٹ سکے۔ توڑے تو جا سکتے تھے لیکن اوپر سے برچھیاں اور تیر آتے تھے۔

آخر منجنیقیں استعمال کی گئیں۔ یہ سب چھوٹی منجنیقیں تھیں جن میں زیادہ وزنی پتھر نہیں ڈالے جا سکتے تھے۔ بہرحال ہر منجنیق ایک من وزنی پتھر پھینک سکتی تھی۔

شہر پناہ کے ارد گرد گھوم پھر کر دیکھا گیا شاید کہیں سے ذرا سی دیوار کمزور ہو۔ ایسی دو تین جگہیں دیکھی گئیں اور منجنیقوں سے وہاں پتھر مارے گئے لیکن دیوار اس قدر چوڑی

تھی کہ اس میں شگاف ڈالنا ممکن نہیں تھا۔

اُدھر قلعہ اَلمُوت میں حسن بن صباح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وہ صبح و شام اس خبر کا منتظر رہتا تھا کہ اس کے ان دس فدائیوں نے جنہیں اس نے خود بھیجا تھا' محمد اور اس کے تمام سالاروں کو قتل کر دیا ہے اور خودکشی کر لی ہے لیکن ایک مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا تھا اور اسے ایسی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ اُسے شاہ در کے اندر سے خبر نہیں جا سکتی تھی کیونکہ شہر محاصرے میں تھا۔ اسے باہر کے جاسوس خبریں پہنچاتے تھے۔ وہ یہ جواز تو قبول کرتا ہی نہیں تھا کہ قتل کا موقعہ نہیں ملا۔

اس نے آخر اپنے جاسوس بھیجے اور کہا کہ ان دس فدائیوں کا سراغ لگاؤ' وہ کہاں چلے گئے ہیں۔ انہیں پتہ نہ چلے' در پردہ یہ معلوم کرو کہ انہوں ابھی تک اپنا کام کیوں نہیں کیا۔

اس کے جاسوس قلعہ اَلمُوت سے شاہ در کے مضافات میں پہنچ گئے۔ انہوں نے بہت تلاش کیا۔ مَرو بھی گئے اور رے بھی گئے لیکن وہ دس فدائی انہیں کہیں نظر نہ آئے۔ آخر کسی اور نے جنگل میں سے گزرتے بکھری ہوئی ہڈیاں دیکھیں اور سفید عمامے اور پھٹی ہوئی عبائیں بھی دیکھیں۔ کچھ اور نشانیاں بھی وہاں موجود تھیں۔ کھوپڑیاں دیکھیں تو یہ پوری دس تھیں۔ یہ حسن بن صباح کے دس فدائی ہی ہو سکتے تھے جن کی لاشیں درندوں اور گِدھوں نے کھا لی تھیں۔ کچھ اور نشانیاں مل گئیں اور حسن بن صباح کو اطلاع دی گئی کہ فدائی اپنے ہدف تک پہنچ ہی نہیں سکے تھے۔ تاریخ میں شہادت ملتی ہے کہ ضعیف العمر عبدالملک بن عطاش کسی کسی وقت دیوار پر جا کھڑا ہوتا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بلند آواز سے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکالتا رہتا اور سلجوقی لشکر کی طرف پھونکیں مارتا رہتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس کا سفلی علم یا اس کا جو کوئی عمل ان کے ہاتھ میں تھا' ناکام ہو چکا تھا۔ وہ یہ فقرہ بار بار کہا کرتا تھا —

"دشمن آنکھوں سے اندھا نہ ہُوا تو عقل سے اندھا ہو جائے گا"۔

محاصرے کو تین چار مہینے گزر گئے تو شاہ در والوں نے ایک بڑی دلیرانہ کارروائی شروع کر دی۔ رات کے وقت شہر کا کوئی ایک دروازہ کھلتا اور اس میں سے دو سو یا تین سو آدمی برچھیوں اور تلواروں سے مسلح بڑی ہی تیزی سے باہر نکلتے اور بالکل سامنے سلجوقی لشکر پر ٹوٹ پڑتے۔ جس قدر نقصان کر سکتے کر کے اسی تیزی سے واپس چلے

جاتے تھے۔ ان کا اپنا جانی نقصان تو ہوتا تھا لیکن سلجوقی لشکر کا جانی نقصان کئی گنا زیادہ ہو جاتا تھا۔ بے شمار سلجوقی شدید زخمی بھی ہو جاتے تھے۔ تیسری چوتھی رات شاہ در کے اندر سے ایسا ہی حملہ اچانک آتا اور پھر واپس چلا جاتا تھا۔ ان کا انداز بگولے جیسا ہوتا تھا۔

یہ دلیرانہ کارروائی ڈیڑھ دو مہینے چلتی رہی۔ آخر محمد نے دیکھا کہ محاصرہ طول پکڑ رہا ہے اور ذرا سی بھی کامیابی نہیں ہو رہی تو اس نے حکم دیا کہ منجنیقیں شہر کے اِرد گرد لگا کر کم وزنی پتھر شہر کے اندر پھینکے جائیں اور اس کے ساتھ ہی فلیتے والے تیر آگ لگا کر مسلسل اندر پھینکے جاتے رہیں۔

دو تین مؤرخوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ شہر سے جو آدمی حملہ کرنے کے لئے باہر آتے تھے' ان میں سے بعض اتنے زخمی ہوتے تھے کہ واپس نہیں جا سکتے تھے۔ ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ شہری محاصرے سے تنگ آ چکے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ محاصرہ جلدی ٹوٹ جائے یا شہر محاصرہ کرنے والوں کے حوالے کر دیا جائے۔ شہری ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو گئے تھے اور زیادہ نقصان تاجروں اور دکانداروں کا ہو رہا تھا۔ انہیں باہر سے مال مل ہی نہیں رہا تھا۔ مؤرخوں نے لکھا ہے یہ تھی وجہ کہ محمد نے شہریوں کو اور زیادہ پریشان کرنے کے لئے شہر پر پتھر اور فلیتے والے آتشی تیر برسانے شروع کر دیئے تھے۔ محاصرے کو آٹھ نو مہینے ہو چلے تھے۔

○

ایک صبح شہر کا ایک دروازہ کھلا اور ایک آدمی باہر آیا جس کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا۔ باہر آتے ہی اس کے پیچھے دروازہ پھر بند ہو گیا۔ یہ آدمی سلجوقی لشکر کے قریب آ گیا اور اس نے بلند آواز سے کہا کہ وہ سلجوقی سلطان کے لئے ایک پیغام لایا ہے۔

ایک سالار کو جو وہاں کہیں قریب ہی تھا' اطلاع دی گئی۔ سالار آیا اور وہ اس آدمی کو سلطان محمد کے پاس لے گیا۔ یہ پیغام قلعے کے حاکم احمد بن عبدالملک کی طرف سے تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ ہم لوگ تمہارے ایک اللہ اور ایک رسولؐ اور ایک قرآن کو مانتے ہیں اور ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری رسولؐ ہیں۔ اس کے بعد ہم شریعت کی پوری پابندی کرتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ہمیں آزادی سے زندہ رہنے کا حق نہیں دیا جا رہا۔ ہمارا اختلاف صرف امامت پر ہے۔ آپ ہمارے امام کو نہیں مانتے تو یہ اتنی بڑی بات نہیں کیونکہ امام نبی یا رسول نہیں ہوتا۔ پھر ہم اطاعت قبول

کرتے ہیں تو کیا شریعت میں جائز ہے کہ ایک ہی مذہب کا ایک فرقہ اطاعت قبول کرلے تو اسے ظلم و تشدّد کا نشانہ بنایا جائے اور اسے جینے کے حق سے محروم رکھا جائے؟

چونکہ اس پیغام میں اطاعت کا ذکر بھی تھا اس لئے محمد نے اپنا رویّہ کچھ نرم اور صلح جُو کر لیا لیکن اس میں چونکہ مذہب کا ذکر بھی تھا اس لئے محمد نے بہتر سمجھا کہ علماء سے فتویٰ لے لیا جائے۔ محمد نے پیغام کا جواب دیا کہ وہ اپنے علمائے سُنّت والجماعت سے فتویٰ لے کر فیصلہ کرے گا۔

اس موقعہ پر علمائے دین نے اپنا وہی کردار پیش کیا جو آج تک چلا آ رہا ہے۔ ابوالقاسم رفیق دلاوری نے لکھا ہے کہ علماء اس مسئلے پر متحد اور متفق نہ ہوئے۔ بعض علماء نے تو یہ فتویٰ دے دیا کہ حسن بن صباح کا فرقہ اسلام کا ہی ایک فرقہ ہے اس لئے اس فرقے پر تشدّد جائز نہیں۔ بعض علماء نے کوئی بھی فتویٰ دینے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ اُس وقت ایک بڑے ہی مشہور عالم دین تھے جن کا نام شیخ ابوالحسن علی بن عبدالرحمٰن سمنجانی تھا۔ انہوں نے فتویٰ دیا کہ باطنی اسلام کا فرقہ نہیں بلکہ ان کے عقائد خلافِ اسلام ہیں اور ان کے اعمال ایسے ہیں کہ ان کا قتل واجب ہے اور حالات و واقعات گواہ ہیں کہ باطنی قتل و غارت گری میں یقین رکھتے ہیں اور ان میں ابلیسیّت کا عنصر غالب ہے۔ انہوں نے فتوے میں یہ بھی لکھا کہ باطنی اپنے امام کا حکم مانتے ہیں اور شریعت کو الگ رکھتے ہیں۔ یہ فرقہ اُن چیزوں کو بھی حلال قرار دیتا ہے جو شریعتِ اسلامی کی رُو سے حرام قرار دی جا چکی ہیں۔ لہٰذا اس فرقے کو بخشنا اسلام کے حق میں نہیں۔

محمد نے یہ فتویٰ شاہ در احمد بن عبدالملک کی طرف بھیج دیا۔ شہر کے اندر سے ایک اور پیغام آیا جس میں لکھا تھا کہ حاکمِ قلعہ درخواست کرتا ہے کہ سلجوقی سلطان اپنے علمائے دین کو شہر کے اندر بھیجے تاکہ باطنیوں کے علماء کے ساتھ بحث مباحثہ ہو سکے اور پھر یہ معاملہ کسی نتیجے پر پہنچایا جائے۔

اُس وقت اصفہان کے قاضی ایک عالم دین قاضی ابوالعلاء صاعد بن یحیٰی تھے جو شیخ الحنفیہ تھے۔ محمد نے انہیں شاہ در بلوایا۔ قاضی بن یحیٰی آئے تو محمد نے انہیں بتایا کہ انہیں شاہ در کے اندر حاکمِ شہر کے پاس بھیجا جا رہا ہے۔ متعدّد مؤرخوں نے لکھا ہے کہ اصفہان کے اس قاضی کو شاہ در احمد بن عبدالملک کے اس مطالبے پر بھیجا گیا تھا کہ اس نے جو مسئلہ پیش کیا تھا اس مسئلے پر شاہ در کے علماء سے بحث کرنی تھی تاکہ کسی نتیجے پر یا کسی فیصلے پر پہنچا جائے۔

قاضی صاعد بن یحیٰی چار محافظوں کے ساتھ شہر کے اندر چلے گئے۔ توقع تو یہ تھی کہ ان کا سارا دن شہر میں ہی گزر جائے گا کیونکہ مسئلہ بڑا نازک اور پیچیدہ تھا جس پر بحث اتنی جلدی ختم نہیں ہو سکتی تھی لیکن قاضی موصوف جلدی واپس آ گئے اور سلطان محمد سے ملے۔

"سلطانِ محترم!" ـــــ قاضی بن یحیٰی نے کہا ـــــ "اپنا وقت ضائع نہ کریں اور یہ شہر کسی نہ کسی طرح فتح کرنے کی کوشش کریں۔ یہ باطنی انتہائی عیّار لوگ ہیں۔ حاکمِ شہر کے چہرے پر میں نے ابلیسیّت اور عیّاری کا بڑا نمایاں تاثر دیکھا ہے۔ انہیں کسی بھی شرعی مسئلے پر بات نہیں کرنی تھی اور نہ یہ کوئی وضاحت چاہتے ہیں۔ مجھے ان کے علماء نے بحث تو کی لیکن صاف پتہ چل رہا تھا کہ یہ لوگ کچھ اور چاہتے ہیں۔ میں نے یہ بھی اپنے دماغ اور تجربے سے معلوم کر لیا۔ اس شہر کا حاکم اور حاکم کا بوڑھا باپ صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ کسی طرح یہاں سے ٹل جائیں یا انہیں اتنا وقت مل جائے کہ یہ شہر کو بچانے کی مزید تیاری کر لیں۔ یہ لوگ صرف وقت اور مہلت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

محمد کے ساتھ اس کے سالار بھی تھے۔ سالاروں نے قاضی صاعد بن یحیٰی کی تائید کی اور کہا کہ ان باطنیوں کو مزید مہلت نہ دی جائے۔

"قابلِ احترام قاضی اصفہان!" ـــــ محمد نے کہا ـــــ "میں آپ کے سامنے طفلِ مکتب ہوں، میرے دل میں اسلام اور شریعت کا احترام ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ میرا کوئی قدم اور کوئی کارروائی شریعت کے خلاف نہ ہو جائے۔ آپ یہ بتائیں کہ انہوں نے یہ جو مسئلہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے کہ باطنی مسلمان ہیں وغیرہ یہ کہاں تک صحیح ہے اور کیا ہمیں شریعت اجازت دیتی ہے کہ انہیں ختم کیا جائے یا بخش دیا جائے؟"

"کوئی دوسرا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا" ـــــ قاضی بن یحیٰی نے دو ٹوک لہجے میں کہا ـــــ "یہ باطنی ابلیس کے پجاری ہیں۔ انہیں بخشنا غیر اسلامی فعل ہے۔ ان لوگوں کا دوسرا گناہ یہ ہے کہ یہ شریعت کے قائم کئے ہوئے اصولوں کو توڑ موڑ کر قرآن کی خلاف ورزی اور توہین کر رہے ہیں.... آپ ان کے خلاف جنگ جاری رکھیں"۔

"ایک اور بات بتائیں" ـــــ محمد نے پوچھا ـــــ "کیا آپ نے یہ دیکھنے کی کوشش

کی تھی کہ اندر شہر کا کیا حال ہے اور شہریوں کا ردِ عمل اور ان کی حالت کیا ہے؟"

"ہاں سلطان!" ـــــ قاضی موصوف نے کہا ـــــ "یہ تو مجھے صاف طور پر پتہ چل گیا ہے کہ شہر کی حالت بہت بُری ہے اور شہری شہر کے حاکم کے پیچھے بُری طرح پڑے ہوئے ہیں کہ محاصرہ کسی نہ کسی طرح ختم کروایا جائے۔ یہ بات حاکمِ شہر نے خود بھی کہی ہے۔ اُس نے انداز تو اپنا اختیار کیا تھا لیکن میں اصل بات سمجھ گیا۔ اُس نے کہا تھا کہ شہر میں گھوم پھر کر دیکھیں۔ آپ لوگوں نے اتنی سنگ باری کی ہے کہ کئی مکان ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں اور لوگوں نے گھروں میں بیٹھنا اور سونا چھوڑ دیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ آتشی تیروں نے کئی مکان جلا ڈالے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ شہر کا امن و امان ختم ہو چکا ہے اور نوبت فاقہ کشی تک پہنچ رہی ہے.... میں نے شہر کی یہ حالت اپنی آنکھوں دیکھی ہے۔ حاکمِ شہر وقت اور مہلت چاہتا ہے کہ اس کے شہری ذرا سانس لے لیں اور ان کا تعاون حاصل کر لیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی حاکمِ شہر آپ کو دھوکہ دے کر باہر سے رسد منگوانا چاہتا ہے۔ آپ محاصرے میں شدت پیدا کر دیں۔ فتح انشاء اللہ آپ کی ہو گی"۔

○

محمد نے قاضی اصفہان کو پورے احترام سے رخصت کیا اور اپنے کچھ گھوڑ سوار محافظ ساتھ بھیجے۔

محمد نے محاصرے میں یوں شدت پیدا کی کہ منجنیقوں سے سنگ باری اور تیز کر دی اور فلیتوں والے تیر اور زیادہ پھینکنے شروع کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی تقریباً" ہر رات دروازوں پر حملے شروع کر دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ شہریوں کے حوصلے بالکل ہی پست ہو گئے اور دیکھا گیا کہ شہرپناہ پر تیر اندازوں کی تعداد آدھی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ ان میں کچھ تو مر گئے اور کچھ زخمی ہوئے تھے لیکن بہت سے اچھے بھلے تیر انداز بھی منہ موڑ گئے تھے۔ وہ اب اُس ذہنی کیفیت تک پہنچ گئے تھے جہاں جذبے ختم ہو جاتے ہیں اور ہتھیار ڈالنے کا ارادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مختصر بات یہ کہ لڑنے والے شہری اب یہ چاہتے تھے کہ وہ مزاحمت کم کر دیں اور سلجوقی لشکر شہر لے لے تاکہ یہ قیامت جو اُن پر دن رات گرتی رہتی ہے، ختم ہو جائے۔

چند ہی دنوں بعد شہر کا ایک دروازہ کھلا اور ایک آدمی جو گھوڑے پر سوار تھا ہاتھ میں

جھنڈا لئے باہر آیا اور دروازہ پھر بند ہو گیا۔ یہ سوار کوئی پیغام لایا تھا۔ اسے سلطان کے پاس لے گئے۔

حاکمِ شہر نے اس پیغام میں استدعا کی تھی کہ اُسے اجازت دی جائے کہ وہ اس شہر کی آبادی کے ساتھ نکل جائے اور اسے دوسری اجازت یہ دی جائے کہ وہ قلعہ خالنجان میں چلا جائے۔ آبادی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ شاہ در کی تمام تر آبادی وہاں سے جانا چاہتی تھی بلکہ مطلب یہ تھا کہ جو لوگ یہاں سے جانا چاہتے ہیں انہیں جانے دیا جائے۔

خالنجان اصفہان سے تھوڑی ہی دور ایک قلعہ تھا۔ کسی وقت باطنیوں نے اس قلعے پر قبضہ کر لیا تھا اور اسے اپنا ایک اور اڈہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن سلطان ملک شاہ مرحوم نے اس قلعے پر اچانک ایسی یلغار کی کہ قلعے پر قبضہ کر لیا اور اُسی باطنی کو زندہ رہنے دیا جو بھاگ نکلا تھا۔ اب وہ قلعہ کسی کے بھی قبضے میں نہیں تھا۔

یہاں یقیناً" عبدالملک بن عطاش یاد آتا ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ سلجوقی سلطان اور لشکر اگر آنکھوں سے اندھے نہ ہوئے تو عقل سے اندھے ہو جائیں گے۔ وہ مسلسل اپنا عمل کرتا رہا تھا اور شہرپناہ پر کھڑے ہو کر اور ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کچھ بڑبڑاتا اور باہر والے لوگوں پر پھونکیں مارتا رہتا تھا۔ کچھ ایسی شہادت ملتی ہے کہ اس کے کرنے کچھ نہ کچھ اثر ضرور دکھایا تھا۔

محمد دیکھ چکا تھا کہ حاکمِ شہر نے مذہب کے نام پر کس قسم کی عیّاری اور مکاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسے اصفہان کے قاضی نے بھی بتایا تھا کہ یہ باطنی صرف عیّاری کر رہے ہیں کہ انہیں کچھ مہلت اور وقت مل جائے۔ پھر بھی محمد کا رویّہ یہ تھا کہ شاہ در کے حاکم نے نئی استدعا باہر بھیجی کہ اسے اس کی بجائے دوسرا قلعہ دے دیا جائے تو محمد نے یہ استدعا قبول کر لی اور شہر پر سنگ باری اور آتشی تیر اندازی رکوا دی تھی اور پھر اس پیغام کا جواب دیا کہ ایک مہینے کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس عرصے میں جس کسی نے اس شہر سے نکلنا ہے نکل جائے۔

شاہ در کے باطنیوں نے اپنی ابلیسی ذہنیت کا ایک اور مظاہرہ کر دیا۔ وہ اس طرح کہ محمد کے لشکر کے کچھ لوگ شہر میں بھیج دیئے گئے اور ان کے ساتھ ایک سالار کو بھی بھیج دیا۔ ان کا کام یہ تھا کہ جو لوگ شاہ در سے نکل رہے ہیں، انہیں جلدی نکالا جائے اور کوئی

مزید گڑبڑ نہ ہو لیکن سلجوقی لشکر کا ایک عہدیدار کسی گلی میں جا رہا تھا تو تین چار باطنیوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ یہ اس کی اپنی شجاعت اور قسمت تھی کہ وہ صرف زخمی ہوا' مرا نہیں لیکن باطنیوں نے اپنی نیت ظاہر کر دی تھی۔

سلطان محمد کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے آدمیوں کو شہر سے باہر نکال کر پھر شہر پر سنگ باری شروع کر دی اور آگ والے تیر پہلے سے کہیں زیادہ تعداد میں چھوڑنے شروع کر دیئے۔ شہر میں چیخ و پکار بلند ہونے لگی اور نفسانفسی کا عالم پیدا ہو گیا۔

اب حاکمِ شہر احمد بن عبدالملک خود اپنے چند ایک محافظوں کے ساتھ شہر کے ایک دروازے سے باہر آیا۔ ایک محافظ نے سفید جھنڈا اٹھا رکھا تھا۔ وہ سلطان محمد سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے محمد تک پہنچا دیا گیا۔

اس نے محمد سے معافی مانگی اور کہا کہ یہ چند ایک اشخاص تھے جنہوں نے سلجوقی عہدیدار پر حملہ کیا تھا اور اس میں حاکم شہر کی رضا شامل نہیں تھی۔ محمد نے پہلے تو اس کی معافی قبول نہ کی اور کہا کہ اب وہ بزورِ شمشیر یہ شہر لے گا اور اس کے بعد شہریوں سے اور حاکمِ شہر اور اس کے خاندان سے پورا پورا انتقام لے گا لیکن حاکمِ شہر گڑگڑا کر معافی مانگ رہا تھا۔ محمد نے صاف کہہ دیا کہ اسے قلعہ خالنجان نہیں دیا جائے گا۔

احمد بن عبدالملک رو پڑا اور اس نے کہا کہ خالنجان اسے نہ دیا جائے' اس کی بجائے ایک اور چھوٹا سا قلعہ جس کا نام ناظر و طبس تھا' اسے دے دیا جائے اور اس کے بعد وہ امن و امان سے رہے گا۔

سلطان محمد کے دل میں رحم کی موج اٹھی اور اس نے باطنیوں کی یہ شرط اور درخواست قبول کر لی اور انہیں اجازت دے دی کہ وہ اس قلعے میں منتقل ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی سلطان محمد نے حکم دیا کہ شاہ در کی شہر پناہ اسی طرح رہنے دی جائے لیکن قلعہ مسمار کر دیا جائے۔ سلجوقی لشکر نے اُسی وقت قلعے کو مسمار کرنا شروع کر دیا۔

شاہ در پر سلجوقی سلطان کا قبضہ تو ہو گیا تھا لیکن باطنی سانپ اور بچھو تھے جو ڈسنے سے باز نہیں آ سکتے تھے۔ اس شہر کا قلعہ بہت ہی بڑا اور پیچ در پیچ تھا۔ اس میں چھوٹی بُرجیاں اور اس سے بڑے بُرج اور اس سے بڑے بُرج بھی تھے۔ کسی نے دیکھ لیا کہ ایک بڑے بُرج میں کوئی چھپا بیٹھا ہے۔ ایک سالار کچھ مجاہدین کو ساتھ لے کر دیکھنے گیا۔ دیکھا وہاں عبدالملک بن عطاش کا چھوٹا بھائی احمد بن عطاش چھپا بیٹھا تھا۔ اسے پکڑ لیا گیا۔

...بہت بڑا بُرج تھا جس کے کئی حصے تھے۔ اس کے کچھ کمرے بالائی منزل میں تھے۔ ...اطلاع ملی تو اس نے کہا کہ صرف اس بُرج کی ہی نہیں بلکہ ایسے تمام بُرجوں کی ...لی جائے۔ اس بُرج کی تلاشی لی گئی تو تاریخ کے مطابق 80 اور باطنی برآمد ہوئے۔ ...خنجروں اور چھوٹی تلواروں سے مسلح تھے اور چند ایک کے پاس کمانیں اور تیروں ...بھری ہوئی ترکشیں بھی تھیں۔ ان سب کو سلطان کے سامنے لے جایا گیا۔ تب ...لوم ہوا کہ احمد بن عطاش کا ایک جواں سال بیٹا بھی اس کے ساتھ تھا۔

"ابن عطاش!" — محمد نے احمد بن عطاش سے پوچھا — "تو یہاں چھپا کیا کر رہا ...؟... اگر سچ بولو گے تو شاید پہلے کی طرح اب بھی میرے دل میں رحم کی لہر اٹھ آئے ...اگر جھوٹ بولنے کا ارادہ ہے تو میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ تجھے کیسی کیسی اذیتیں دے ...کر ماروں گا"۔

"کیا سلطان اتنی سی بھی بات نہیں سمجھ سکتا؟" — احمد بن عطاش نے بڑی دلیری ...جواب دیا — "میں تمہاری پیٹھ میں خنجر اتارنے کے لئے یہاں رک گیا تھا۔ ہم ...اتنی جلدی شکست تسلیم نہیں کیا کرتے"۔

"میں نے تیری ایک پیشین گوئی سنی تھی" — محمد نے کہا — "تو نے پیشین گوئی ...کی تھی کہ اصفہان میں تیری شوکت اور عظمت کے نقارے بجیں گے۔ اب بتا کہاں گئی ...عظمت؟"

"میری پیشین گوئی غلط نہیں نکلی" — احمد بن عطاش نے کہا — "سلطان اب ...جا کر اصفہان میں دیکھ لے کہ لوگ میرا نام ایک پیر و مرشد کی طرح لیتے ہیں۔ میں ...نے یہ نہیں کہا تھا کہ اصفہان پر میری حکومت ہو گی۔ میری پیشین گوئی کا مطلب یہ تھا کہ ...لوگوں کے دلوں پر میری حکومت ہو گی اور میں اصفہان میں جدھر سے بھی گزروں گا' ...میرے آگے سجدے کریں گے"۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ سلطان محمد کی ہنسی نکل گئی۔

"میں تجھے اصفہان کی گلیوں میں ہی پھرا رہا ہوں" — محمد نے کہا اور اپنے پاس ...کھڑے دو سالاروں کو حکم دیا — "اس شخص کو اور اس کے بیٹے کو پاؤں میں بیڑیاں ...ڈال کر اور ہاتھ باندھ کر اور ان دونوں کے منہ کالے کر کے اصفہان کی تمام گلیوں میں ...پھرا کر اور پھر سرِعام ان دونوں کے سر کاٹ کر بغداد خلیفہ کے حضور پیش کر آؤ"۔

اصفہان وہاں سے قریب ہی تھا۔ اُسی وقت احمد بن عطاش اور اس کے جواں سال بیٹے کے پاؤں میں اور ہاتھوں میں زنجیریں ڈال دی گئیں اور وہیں ان کے منہ کالے کر دیئے گئے۔

سلطان محمد کی یہ کچہری کسی کمرے میں نہیں بلکہ باہر ایک درخت کے نیچے لگی ہوئی تھی۔ ایک تو وہاں وہ 80 باطنی کھڑے تھے جنہیں بُرجوں میں سے پکڑا گیا تھا اور بہت سے شہری اور سلجوقی لشکر کے کچھ مجاہدین بھی وہاں موجود تھے۔ جب احمد بن عطاش اور اس کے بیٹے کو زنجیریں ڈال کر ان کے منہ کالے کر دیئے گئے تو تماشائیوں کے ہجوم میں سے ایک نوجوان لڑکی نکلی اور دوڑ کر احمد بن عطاش کے سامنے آن کھڑی ہوئی.... وہ اُس کی بیوی نُور تھی جس کا پیچھے ذکر آچکا ہے۔

"اے سیاہ رُو انسان!" ---- نُور نے بڑی بلند آواز میں کہا ---- "تُو نے مجھے عبادت سے اُٹھایا تھا اور میں نے تجھے کہا تھا کہ تُو ذلیل و خوار ہو کر مرے گا.... اب بتا اللہ تیرا ہے کہ میرا!"

جس وقت لوگ شاہ در سے نکل رہے تھے اُس وقت احمد بن عطاش کا شاہی خاندان بھی شہر سے جا رہا تھا۔ نور کو موقع ملا تو وہ تیز دوڑ پڑی اور سلطان محمد تک آن پہنچی۔ اُس کے ساتھ اُس کا باپ بھی تھا جو عبدالملک بن عطاش کا قابلِ اعتماد ملازم بن گیا تھا۔ باپ نے محمد سے اپنا تعارف کرایا اور اپنی بیٹی کے متعلق بھی بتایا کہ اُسے قافلے سے اغوا کر کے احمد بن عطاش نے اپنی بیوی بنا لیا تھا۔ اس باپ نے ہی عبدالملک بن عطاش کے متعلق ساری باتیں بتائی تھیں کہ کس طرح اُس نے الّو کے ذریعے کالا جادو کیا تھا اور اس کے بعد اپنا جادو چلاتا ہی رہا تھا۔ نُور کے باپ نے محمد کو بتایا کہ چمڑے پر لکھا ہُوا پیغام تیر کے ذریعے اُسی نے باہر پھینکا تھا۔ اس باپ نے اور بھی بہت سی باتیں بتائیں۔

محمد نے حکم دیا کہ نُور اور اس کے باپ کو سلطان کے مہمان سمجھ کر رکھا جائے اور ابھی انہیں مَرو بھیج دیا جائے۔

احمد بن عطاش اور اس کے بیٹے کو دو اونٹوں پر بٹھا کر اصفہان بھیج دیا گیا۔ ان کے ساتھ ایک عہدیدار تھا اور پچاس مجاہدین گھوڑوں پر سوار تھے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ ان دونوں کو اصفہان کی گلیوں اور بازاروں میں گھمایا پھرایا گیا اور ساتھ ساتھ یہ اعلان کیا جاتا رہا کہ ان کا جرم کیا ہے اور یہ لوگ کالے جادو کے ذریعے یا کسی سفلی عمل کے ذریعے

سلجوقی لشکر کو تباہ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ پھر انہیں شہر کے وسط میں کھڑا کر کے سارے شہر کو اکٹھا کیا گیا اور ان کے سر تن سے جدا کر دیئے گئے۔ سلطان محمد کے حکم کے مطابق دونوں کے سر بغداد لے جائے گئے جو دارالخلافہ تھا اور یہ سر خلیفہ کو پیش کئے گئے۔ خلیفہ نے ان سروں کی نمائش کی اور پھر دونوں سر آوارہ کتوں کے آگے پھینک دیئے۔

اُس وقت احمد بن عطاش کی پہلی بیوی قلعہ ناظر و طبس میں پہنچ چکی تھی۔ اسے اطلاع دی گئی کہ اس کے خاوند کا اور اس کے جوان بیٹے کا سر کاٹ دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے دونوں کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے اصفہان کی گلیوں میں گھمایا گیا تھا۔ یہ عورت بیوی بھی تھی اور جوان بیٹے کی ماں بھی۔ وہ قلعے کی سب سے اونچی بُرجی پر چڑھ گئی اور اُس نے چھلانگ لگا دی اور یوں اس نے خودکشی کر لی۔

سلطان محمد شاہ در پر اپنے لشکر کا قبضہ مضبوط کر کے واپس مَرو آ گیا۔ اس کا استقبال بڑی ہی شان و شوکت سے کیا گیا کیونکہ وہ باطنیوں کے بہت بڑے اڈے کو تباہ کر کے آیا تھا۔ مَرو میں ہر کوئی فکرمند اور پریشان تھا کہ شاہ در کو فتح نہیں کیا جا سکے گا' اللہ محمد اور لشکر کو خیریت سے واپس لے آئے۔ محمد لشکر کے ساتھ صرف خیریت سے ہی واپس نہ آیا بلکہ وہ فاتح کی حیثیت سے اپنے دارالحکومت میں داخل ہُوا۔

○

سلطان محمد نے اپنے چھوٹے بھائی سنجر کو شاہ در بھیج دیا اور اُس کے سپرد یہ کام کیا کہ وہاں کے سرکاری انتظامات کو اپنے سانچے میں ڈھال کر رواں کرے اور قلعہ جو مسمار کیا گیا ہے' اسے از سرِ نو تعمیر کرے لیکن اس کی شکل قلعے جیسی نہ ہو۔

"....اور میرے بھائی!" ---- محمد نے اپنے بھائی سنجر سے کہا ---- "اصل کام جو تمہیں وہاں کرنا ہے وہ غور سے سن لو۔ شاہ در کی تقریباً آدھی آبادی وہاں سے نہیں گئی۔ ان لوگوں نے وہیں رہنا پسند کیا ہے۔ خیال رکھنا کہ یہ سب باطنی ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ حسن بن صباح کے فدائی ہی ہوں اور یہ محض اس کے پیروکار ہوں لیکن محتاط ہونا پڑے گا کہ ان میں کچھ فدائی ہو سکتے ہیں' فدائی نہ ہوئے تو حسن بن صباح کے جاسوس تو ضرور ہوں گے۔ یہ انتظام میرا ہو گا کہ یہاں سے بڑے بڑے تجربہ کار جاسوس اور مخبر مستقل طور پر شاہ در بھیج دوں گا۔ وہ وہاں کے ہر گھر کے اندر بھی نظر رکھیں گے اور کوئی

ذرا سا بھی مشکوک شخص نظر آیا تو اسے تمہارے سامنے کھڑا کر دیں گے..... ہمارا مقصد یہ ہے کہ جس طرح حسن بن صباح نے اور اس کے پیر استاد عبدالملک بن عطاش نے شاہ در کو اپنا ایک مضبوط اڈہ بنا رکھا تھا اسی طرح ہم اس شہر کو اپنا دوسرا مرکز بنالیں گے جہاں سے تبلیغ بھی ہوگی اور دوسری کارروائیاں بھی کی جایا کریں گی۔ میں یہاں کے پورے پورے خاندان شاہ در بھیج کر وہاں آباد کر دوں گا۔ ان خاندانوں کے افراد کو بتایا جائے گا کہ وہ کس طرح وہاں کے باطنیوں کو واپس اسلام میں لے آئیں..... تم کل صبح روانہ ہو جاؤ"۔

سنجر اگلی صبح روانہ ہو گیا۔

دو تین دنوں بعد محمد نے دربارِ عام منعقد کیا۔ اس میں وہ ان مجاہدین کو انعام و اکرام دینا چاہتا تھا جنہوں نے شاہ در کے محاصرے کو کامیاب کرنے کے لئے غیر معمولی شجاعت کے مظاہرے کئے تھے۔ اس نے نُور اور اس کے باپ کو خصوصی انعام دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا کارنامہ پہلے سنایا جا چکا ہے۔ محمد نے نُور اور اس کے باپ کو اپنے محل میں ایک کمرہ دے دیا تھا اور انہیں شاہی مہمان کی حیثیت دی تھی۔

اگلے روز دربار منعقد ہوا اور محمد نے پورے لشکر کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ پھر چند ایک نام پکارے اور انہیں اس طرح انعام دیئے کہ ان کے کارنامے بھی بیان کئے۔ آخر میں نُور اور اس کے باپ کو آگے بلایا گیا۔ محمد نے نُور کے باپ کا کارنامہ سنایا اور کہا کہ وہ جو اُلّو تیروں سے گرایا گیا تھا" وہ پورے لشکر کے لئے خطرناک ہو سکتا تھا لیکن نُور کے باپ نے ایک تیر کے ساتھ پیغام باندھ کر باہر بھیج دیا اور اس طرح اس اُلّو کو مار لیا گیا۔ پھر محمد نے اعلان کیا کہ نُور کو اور اس کے باپ کو کیا انعام دیا جا رہا ہے۔

سلطان محمد کے وزیرِ اعظم کا نام سعد الملک تھا جو اس وقت دربار میں موجود تھا اور سلطان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ انعام و اکرام کی یہ تقریب ختم ہوئی تو دربار برخاست کر دیا گیا۔ نُور کا باپ محمد کے پاس جا کھڑا ہوا اور سرگوشی میں کہا کہ وہ اس کے ساتھ ایک خفیہ بات کرنا چاہتا ہے لیکن اس طرح کہ کوئی اور موجود نہ ہو اور کسی اور کو پتہ بھی نہ چلے کہ وہ سلطان کو ملا ہے۔ سلطان نے اسے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں چلا جائے اور سلطان خود اس کے پاس آ جائے گا۔

محمد سلطان تھا۔ اسے چاہیئے تھا کہ اس شخص کو اپنے دربار میں بلاتا لیکن اس نے کہا

کہ وہ اس شخص کے کمرے میں جائے گا۔ یہ محمد کے کردار کی بلندی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نُور کے باپ نے نہ صرف یہ کہ تیر کے ذریعے باہر ایک پیغام پہنچایا تھا پھر خود بھی وہاں سے اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر سلطان کے پاس آ گیا تھا بلکہ اس نے سلطان محمد کو شاہ در کے شاہی خاندان کے اندر کی بہت سی باتیں بتائی تھیں اور یہ بھی کہ یہ لوگ سلطانوں کے خلاف کیا کیا کارروائیاں کرتے اور کس طرح کیا کرتے تھے۔ یہ ساری معلومات بڑی قیمتی تھیں۔

محمد نُور اور اس کے باپ کے پاس چلا گیا۔

"سلطان عالی مقام!" ___ نور کے باپ نے کہا ___ "دربار میں آپ کے بائیں طرف ایک معزز انسان بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ سلطنت کا وزیرِ اعظم ہے.... کیا یہ واقعی آپ کا وزیرِ اعظم ہے؟"

"ہاں!" ___ محمد نے کہا ___ "یہ میرا وزیرِ اعظم ہے اور اس کا نام سعد الملک ہے... کیوں "کیا بات ہے؟"

"پھر تو مجھے سوچ اور سمجھ کر بات کرنی چاہئے" ___ نُور کے باپ نے قدرے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا ___ "ہو سکتا ہے میری نظروں نے دھوکا کھایا ہو لیکن...."

"نظروں نے دھوکا کھایا ہے یا نہیں" ___ محمد نے اُس کی بات کاٹ کر کہا ___ "تمہیں جو بات کہنی ہے کہہ ڈالو۔ مجھے تم پر اعتماد ہے۔ کہو "کیا بات ہے!"

"اگر میں غلطی پر ہوں تو معاف کر دیجئے گا" ___ نُور کے باپ نے کہا ___ "آپ کے اس وزیرِ اعظم کو میں نے تین بار شاہ در میں عبدالملک بن عطاش کے پاس بیٹھے دیکھا ہے۔ وزیرِ اعظم ہر بار رات کو وہاں پہنچا اور پوری رات عبدالملک کے ساتھ رہا تھا"۔

"اسے تو میں نے بھی وہاں دیکھا تھا" ___ نُور جو پاس ہی بیٹھی تھی بول پڑی ___ "مہمانوں کو شراب پلانا میرا کام تھا۔ میں نے اس شخص کو عبدالملک بن عطاش کے کمرے میں اس کے ساتھ بیٹھے دیکھا اور شراب پیش کی تھی اور اس نے شراب پی تھی"۔

"کیا تم یہ تینوں دن بتا سکتے ہو؟" ___ محمد نے کہا ___ "اگر دن یاد نہ ہوں تو یہ تو بتا سکو گے کہ یہ کتنے کتنے وقفے کے بعد وہاں گیا تھا؟"

نُور کے باپ نے کچھ سوچ کر بتایا کہ اس کی یہ تین ملاقاتیں تین تین چار چار مہینوں

کے وقفے سے ہوئی تھیں۔ نُور نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔ سلطان محمد گہری سوچ میں کھو گیا۔

"تمہاری اطلاع غلط نہیں ہو سکتی" ـــــ محمد نے اس طرح کہا جیسے اپنے آپ سے بات کی ہو ـــــ "تینوں بار اس نے مجھے کہا تھا کہ وہ سلطنت کے دورے پر جا رہا ہے۔ تینوں بار اس نے مختلف جگہیں بتائی تھیں اور ہر بار چند دن مرو سے غیر حاضر رہا تھا"۔

"اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ یہی شخص تھا" ـــــ نُور کے باپ نے کہا ـــــ "اگر آپ مجھے اور نُور کو اس کے سامنے کھڑا کر دیں تو ہم یہی بات اس کے منہ پر کہہ دیں گے"۔

"نہیں!" ـــــ محمد نے کچھ دیر سوچ کر کہا ـــــ "تمہارا کہنا کافی نہیں۔ اگر میرے وزیرِ اعظم کا تعلق درپردہ حسن بن صباح کے استاد کے ساتھ ہے تو یقیناً یہ اتنا چالاک اور عیّار ہو گا کہ ثابت کر دے گا کہ تم غلط کہہ رہے ہو۔ تم کوئی ثبوت تو پیش نہیں کر سکتے۔ میں اسے کسی اور طرح پکڑوں گا.... تم دونوں کسی کو یہ پتہ نہ چلنے دینا کہ تم نے یہ بات مجھے بتائی ہے"۔

محمد اور سنجر کے باپ سلطان ملک شاہ نے خواجہ حسن طوسی کو اپنا وزیرِ اعظم بنایا تھا اور اسے نظام الملک کا خطاب دیا تھا۔ نظام الملک عالم فاضل انسان تھا اور سپہ سالاری کے جوہر بھی جانتا تھا۔ وہ باطنی فدائیوں کے ہاتھوں قتل ہُوا تو نظام الملک کے بڑے بیٹے ابوالمظفر علی کو وزیرِ اعظم بنایا گیا اور اسے فخر الملک کا خطاب دیا گیا۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح بڑا ہی قابل اور عالم انسان تھا۔ وہ بھی فدائیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تو نظام الملک کا ایک بیٹا رہ گیا تھا جس کا نام ابو نصر احمد تھا۔ قابلیت کے لحاظ سے وہ بھی اپنے باپ اور بڑے بھائی جیسا تھا لیکن محمد کے ہاتھ میں سلطنت آئی تو اس نے سعد الملک کو وزیرِ اعظم بنا دیا۔ اس شخص سے سلطان محمد کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گیا تھا لیکن اب اس کے متعلق یہ رپورٹ ملی کہ وہ حسن بن صباح کے استاد عبد الملک بن عطاش کے ہاں جاتا رہا ہے۔

سلطان محمد نے اپنے بڑے بھائی برکیارق اور چھوٹے بھائی سنجر سے بات کی۔ تینوں بھائیوں نے اپنے ایک معتمد خاص کو بلا کر مشورہ کیا اور ان سب نے ایک طریقہ سوچ لیا۔ اسی شام وزیرِ اعظم سعد الملک نُور اور اس کے باپ کے کمرے میں گیا۔ دونوں اسے دیکھ کر گھبرا سے گئے۔ یہ شخص اپنا راز چھپائے رکھنے کے لئے ان دونوں کو غائب کرا سکتا

تھا لیکن اُس نے بات کچھ اور کی۔

"آج کا انعام تمہیں مبارک ہو" ـــــ سعد الملک نے بڑے ہی خوشگوار لہجے میں کہا ـــــ "میں یہ کہہ کر تم پر احسان نہیں دھر رہا کہ تمہیں میرے کہنے پر انعام دیا گیا ہے۔ قلعہ الموت کی فتح ویسے ہی حاصل نہیں ہو گئی۔ تم نے مجھے دو تین بار عبد الملک بن عطاش کے ہاں دیکھا ہو گا۔ تم مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہوئے ہو گے کہ میں تو سلجوقی سلطان کا وزیرِ اعظم ہوں۔ میں تمہیں ایک تو مبارکباد کہنے آیا تھا دوسری یہ بات کہنی تھی کہ میں وہاں جاسوس بن کر گیا تھا اور عبد الملک پر یہ ظاہر کیا تھا کہ میں درپردہ باطنی ہوں اور شیخ الجبل کے لئے کام کر رہا ہوں۔ وہ بوڑھا اپنے آپ کو بڑا جادوگر اور استاد سمجھتا تھا لیکن میں اُس کے دل میں اُتر گیا اور ایسے راز حاصل کر لئے جو اُس کی شکست کا باعث بنے"۔

"سلطان کو تو معلوم ہو گا کہ آپ وہاں جاسوس بن کر جاتے رہے ہیں" ـــــ نُور کے باپ نے کہا ـــــ "آپ کو تو بے انداز انعام ملنا چاہیئے"۔

"نہیں!" ـــــ سعد الملک نے کہا ـــــ "میں نے جو کیا وہ سلطان کے لئے نہیں بلکہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا تھا۔ مجھے انعام و اکرام کی ضرورت نہیں.... میں تمہیں یہ کہنے آیا ہوں کہ کبھی سلطان کے ساتھ ذکر نہ کر دینا کہ تم نے مجھے وہاں دیکھا تھا۔ میں جس مقصد کے لئے وہاں جاتا رہا ہوں وہ میں نے پا لیا ہے لیکن اب اُسے پتہ چلا کہ میں وہاں جاتا رہا ہوں تو میرے خلاف بڑا ہی بے بنیاد اور خطرناک شک پیدا ہو جائے گا"۔

"نہیں محترم وزیرِ اعظم" ـــــ نُور کے باپ نے کہا ـــــ "ہم ایسی اونچی حیثیت کے بندے تو نہیں ہیں کہ سلطان کے ساتھ اس کے وزیرِ اعظم کی باتیں کریں۔ میں نے اپنی اس بیٹی کو اس بوڑھے کے پنجوں سے آزاد کرانا تھا وہ کرا لایا ہوں۔ اب میرے جینے کا ایک ہی مقصد ہے کہ اُس بیٹی کو کسی جوان اور معزز آدمی کے ساتھ بیاہ دوں اور خود اللہ اللہ کرتے زندگی پوری کر جاؤں"۔

"میں یہ فرض ادا کروں گا" ـــــ سعد الملک نے کہا ـــــ "تمہاری بیٹی کی شادی ایسے ہی آدمی کے ساتھ کروں گا جیسا تم چاہتے ہو۔ یہ میری اپنی بیٹی ہے"۔

نُور کے باپ نے ہاتھ جوڑ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ انہیں انعام و اکرام اور دولت کی ضرورت نہیں، اس کی بیٹی ٹھکانے لگ جائے۔

دو دن گزر گئے۔ رات گہری ہو چکی تھی اور سعد الملک کھانے سے فارغ ہو کر اپنے خاص کمرے میں جا بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ملازم نے اسے اطلاع دی کہ ایک گھوڑ سوار آیا ہے اور اس سے ملنا چاہتا ہے۔ ملازم نے یہ بھی بتایا کہ گھوڑ سوار کی حالت اور حلیہ بتاتا ہے کہ بڑا لمبا سفر کر کے آیا ہے.... سعد الملک نے اسے فوراً بلوالیا۔

"بہت دور سے آئے معلوم ہوتے ہو" ــــ سعد الملک نے اس آدمی سے کہا اور پوچھا ــ "کہاں سے آرہے ہو؟"

"قلعہ ناظرد طبس سے!" ــــ اس آدمی نے جواب دیا اور اِدھر اُدھر دیکھا جیسے وہ کوئی راز کی بات کہنا چاہتا ہو ــــ "امام کے پیرو مُرشد عبد الملک بن عطاش نے بھیجا ہے ... کیا میں یہاں کُھل کر بات کر سکتا ہوں؟"

"ضرور کرو" ــــ سعد الملک نے کہا ــــ "اونچی آواز میں نہ بولنا.... کیا پیرو مُرشد ابھی ناظرد طبس میں ہی ہیں؟"

"ایک دو دنوں بعد وہاں سے اَلَمُوت چلے جائیں گے" ــــ اس آدمی نے کہا ــ "انہوں نے آپ کو یہ پیغام دیا ہے کہ اب آپ آسانی سے اور بے خطر شاہ در جا سکتے ہیں کیونکہ اب شاہ در آپ کی سلطنت میں آگیا ہے اور آپ اس سلطنت کے وزیر اعظم ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ اپنے کچھ آدمی پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ آپ وہاں جائیں گے تو یہ آدمی خود ہی آپ کو مل جائیں گے۔ پیرو مُرشد نے کہا ہے کہ محمد اور سنجر کو جلدی ختم کرنا ہے لیکن یہ آپ نہیں کریں گے بلکہ یہ شاہ در کے آدمی کریں گے"۔

"ان آدمیوں کے نام جانتے ہو؟" ــــ سعد الملک نے پوچھا۔

"نہیں!" ــــ اس آدمی نے مسکرا کر کہا ــــ "کیا آپ جانتے نہیں کہ نام نہیں بتائے جاتے؟ میں یہاں زیادہ نہیں رکوں گا۔ میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔ یہاں اپنا کوئی آدمی ہے تو آپ اسے یقیناً جانتے ہوں گے۔ مجھے اس کے گھر کا راستہ بتادیں یا وہاں تک پہنچانے کا کوئی بندوبست کر دیں۔ میں کل علی الصبح واپس چلا جاؤں گا"۔

"ایک نہیں یہاں اپنے تین آدمی ہیں" ــــ سعد الملک نے کہا ــــ "میں تمہیں ان میں سے ایک کے گھر پہنچادوں گا"۔

سعد الملک نے ایسی باتیں کیں جن سے صاف پتہ چل گیا کہ یہ شخص باطنی ہے اور باطنیوں کے لئے ہی کام کر رہا ہے۔ اُس نے اس آدمی کو ایک گھر کا پتہ اور راستہ سمجھادیا

اور کہا کہ نہ وہ خود اس کے ساتھ جا سکتا ہے نہ کسی ملازم کو بھیج سکتا ہے کیونکہ اس سے اس کے خلاف شک پیدا ہو جائے گا۔

"اب میری بات غور سے سن لو" ــــ سعد الملک نے کہا ــــ "دروازے پر تین بار دستک دینا۔ اندر سے آواز آئے گی کون ہے۔ تم نے کہنا ہے 'ملک الملک'۔ پھر دروازہ کھلے گا اور اندر جا کر بتانا کہ تم کہاں سے آئے ہو اور یہاں تک کس طرح پہنچے ہو"۔

○

صبح سعد الملک حسبِ معمول اپنے دفتر گیا۔ پہلے سلطان محمد سے ملا اور معمول کے مطابق کچھ باتیں کیں اور اپنے روزمرّہ کام میں لگ گیا۔ اس نے سلطان محمد کے رویّے میں کوئی تبدیلی نہ دیکھی سوائے اس کے کہ سلطان اس صبح پہلے سے کچھ زیادہ ہی مسکرا کر باتیں کرتا تھا۔

آدھا دن گزر گیا تو محمد نے سعد الملک کو بلوایا۔ سعد الملک سلطان کے دفتر والے کمرے میں داخل ہُوا تو ٹھٹھک کر رک گیا۔ اُس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ سلطان اکیلا نہیں تھا۔ اُس کے پاس ایک تو نُور بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ نُور کا باپ بیٹھا ہُوا تھا۔ ایک طرف وہ آدمی کھڑا تھا جو رات اس کے پاس گیا تھا اور عبد الملک بن عطاش کا پیغام دیا تھا۔ اس کے ساتھ تین آدمی زنجیروں میں جکڑے کھڑے تھے۔

"آگے آؤ سعد الملک!" ــــ محمد نے اسے کہا ــــ "ڈرو مت۔ یہ سب تمہارے اپنے آدمی ہیں اور انہیں تم بڑی اچھی طرح جانتے ہو۔ یہ سب تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ تین آدمی جو زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں' وہ آدمی ہیں جو اس مکان میں رہتے تھے جہاں تم نے اس آدمی کو بھیجا تھا۔ ہم نے رات کو ہی انہیں اُس مکان پر چھاپہ مار کر پکڑ لیا تھا"۔

سعد الملک پر غشی طاری ہونے لگی تھی۔ اس کی زبان بالکل ہی بند ہو گئی تھی۔

"اور ان دونوں کو تو تم اور زیادہ اچھی طرح جانتے ہو" ــــ سلطان محمد نے نُور اور اُس کے باپ کی طرف اشارہ کر کے کہا ــــ "اس لڑکی کے ہاتھوں تو تم نے کئی بار شراب بھی پی ہے۔ اسے تو تم کبھی بھی بھول نہیں سکو گے۔ یہ تمہارے پیرو مُرشد کی بیوی تھی .... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"میں وہاں جاسوسی کے لئے جاتا رہا ہوں" ــــ سعد الملک نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز

میں کہا۔ اس سے آگے وہ بول نہ سکا۔

"تم نے کبھی مجھے راز کی کوئی بات تو بتائی نہیں تھی" ——— محمد نے کہا ——— "تم وہ سانپ ہو جس نے اس سلطنت کی آستین میں پرورش پائی ہے اور اس سلطنت کو ڈنک مارا ہے۔ کیا تم نے دیکھ نہیں لیا کہ فتح حق کی ہُوا کرتی ہے' باطل کی نہیں؟ میں تمہارا یہ جھوٹ مان بھی لوں کہ تم وہاں جاسوسی کے لئے جاتے رہے ہو تو تمہارے پاس اس کا کیا جواز ہے کہ تم ان تین فدائیوں کو جانتے تھے اور انہیں گرفتار نہیں کیا بلکہ میرے ایک جاسوس کو اپنا آدمی سمجھ کر ان کے پاس رات بسر کرنے کے لئے بھیجا.... اب سزا کے لئے تیار ہو جاؤ"۔

اگلی صبح گھوڑدوڑ کے میدان میں سلطنت کے تمام تر لشکر کو ایک ترتیب میں کھڑا کیا گیا۔ شہری بھی تماشہ دیکھنے آ گئے۔ کچھ دیر بعد سعد الملک اور تین فدائیوں کو جنہیں ان کے مکان سے گرفتار کیا گیا تھا' میدان میں لایا گیا اور لشکر کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد سلطان محمد' اس کا چھوٹا بھائی سنجر اور ان کا بڑا بھائی برکیارق اپنے تین چار بڑے حاکموں کے ساتھ گھوڑوں پر سوار وہاں آ گئے۔ باقی سب نے گھوڑے پیچھے روک لئے۔ محمد آگے چلا گیا اور ان مجرموں کے قریب جا گھوڑا روکا۔

"تم سب اپنے وزیرِ اعظم کو بیڑیوں میں بندھا ہُوا دیکھ کر حیران ہو رہے ہو گے" ——— سلطان محمد نے اپنے لشکر سے خطاب کیا ——— "یہ شخص جسے میں نے وزیرِ اعظم بنایا تھا' درپردہ حسن بن صباح کا کام کرتا رہا ہے اور شاہ در کی فتح سے پہلے چوری چھپے وہاں حسن بن صباح کے استاد عبدالملک بن عطاش کے پاس جاتا رہا ہے۔ اس سے یہ اگلوانا ممکن نہیں کہ اس کے حکم سے یا اس کے ہاتھوں ہمارے کتنے آدمی قتل ہو چکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ اس نے ہمارے بہت سے آدمی قتل کروائے ہیں۔ یہ سانپ میری آستین میں پلتا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ باپ اپنے بیٹے پر' بیٹا اپنے باپ پر' ماں اپنی بیٹی پر اور بیٹی اپنی ماں پر اعتماد نہ کرے لیکن میں یہ صورت پیدا نہیں ہونے دوں گا۔ میں ہر کسی کو صاف لفظوں میں بتا رہا ہوں کہ ہم نے شاہ در فتح کر لیا ہے تو اب ہم قلعہ اَلمُوت بھی لے لیں گے اور اس باطل فرقے کا قلع قمع کر کے ہی رہیں گے۔ اپنا جرم اپنے ساتھیوں سے چھپایا جا سکتا ہے لیکن مت بھولو کہ اللہ کی ذات بھی موجود ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ گناہگاروں کو پکڑ لیا کرتا ہے۔ یہ گناہگار سعد الملک اپنے ان

تین قاتل فدائیوں کے ساتھ پکڑا گیا ہے اور آج اسے سزائے موت دی جا رہی ہے"۔

سلطان محمد نے جلّادوں کو اشارہ کیا۔ جلّاد آگے آئے اور ان چاروں کو ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑا کر کے انہیں آگے کو جھکا دیا اور ایک ہی بار چاروں کی تلواریں حرکت میں آئیں اور چار سر جسموں سے کٹ کر مٹی میں جا پڑے۔

تمام مؤرخوں نے لکھا ہے کہ سعد الملک ایسا ڈھکا چھُپا رہا تھا کہ کسی کو ذرا سا بھی شک نہ ہُوا۔ اسے سزائے موت دی گئی اور وہیں سلطان محمد نے اعلان کیا کہ اب سلطنت کا وزیرِ اعظم نظام الملک خواجہ حسن طُوسی کا چھوٹا بیٹا ابو نصر احمد ہو گا۔

ابو نصر احمد اپنے باپ اور بڑے بھائی کی طرح عالم فاضل تھا اور سلطنت کے امور کو بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اُس نے وہیں اعلان کر دیا کہ میں اب قلعہ اَلمُوت پر فوج کشی کروں گا اور اس کی قیادت بھی میں خود کروں گا۔ جس طرح ہم نے شاہ در فتح کر لیا ہے اسی طرح ہم اَلمُوت کا قلعہ بھی لے لیں گے۔

لشکر سے تکبیر کے نعرے بلند ہونے لگے اور ان نعروں سے زمین و آسمان ہل رہے تھے۔

سلطان محمد نے قلعہ شاہ در فتح کر کے احمد بن عطاش کی یہ شرط مان لی تھی کہ وہ‘ اس کا خاندان اور شہر کے جتنے لوگ شہر سے جانا چاہتے ہیں‘ انہیں قلعہ ناظر و طبس جانے کی اجازت دے دی جائے۔ یہ دراصل شرط نہیں بلکہ ایک درخواست تھی جو ایک ہارے ہوئے حاکمِ قلعہ نے سلطان محمد کے آگے پیش کی تھی۔

سلطان محمد نے یہ درخواست قبول کر کے بڑی غلطی کی تھی۔ اگر وہ یہ درخواست قبول نہ کرتا تو تاریخ کا رخ بدل جاتا لیکن سلطان محمد پر فتح کی خوشی اس حد تک طاری ہو گئی تھی کہ اُس نے بادشاہوں والی فیاضی کا مظاہرہ کیا اور ان سانپوں اور بچھوؤں کو اجازت دے دی کہ وہ زندہ رہیں اور جہاں جانا چاہتے ہیں وہاں چلے جائیں۔

اس درخواست میں یہ بھی تھا کہ شہر سے جانے والے آدھے لوگ ناظر و طبس جائیں گے اور باقی قلعہ الموت جائیں گے۔ ان دونوں گروہوں کو سلطان محمد مسلح حفاظت دے جو انہیں وہاں تک پہنچا دے۔ سلطان محمد نے یہ درخواست بھی قبول کر لی۔ شاہ در سے جو لوگ جا رہے تھے انہیں غیر مسلح کر دیا گیا تھا یعنی وہ نہتے تھے۔ انہوں نے اس خطرے کا اظہار کیا تھا کہ راستے میں ان پر قافلے لوٹنے والوں کا حملہ ہو سکتا ہے یا کوئی اور مصیبت ان پر نازل ہو سکتی ہے۔

پہلے سنایا جا چکا ہے کہ شاہ در کی فتح کوئی معمولی فتح نہیں تھی بلکہ اس فتح کی اہمیت ایسے تھی جیسے حسن بن صباح کی پیٹھ میں خنجر اتار دیا گیا ہو۔ قلعہ الموت کے بعد باطنیوں کا دوسرا مضبوط اور پُرخطر اڈہ شاہ در تھا۔ اس فتح کی خبر دارالحکومت میں پہنچانے کے لئے تیز رفتار قاصد روانہ کر دیئے گئے تھے۔ یہ خبر قلعہ وسم کوہ میں سالار اوریزی تک

بھی پہنچ گئی۔ اُس وقت مزمّل آفندی شدید زخمی حالت میں پڑا تھا۔ پھر یہ خبر حسن بن صباح تک بھی پہنچی اور کچھ دنوں بعد شاہ در کے وہ لوگ جو قلعہ الموت جانا چاہتے تھے‘ وہ بھی اُس کے پاس پہنچ گئے۔

عبدالملک بن عطاش کو راستے میں اطلاع مل گئی تھی کہ اُس کے چھوٹے بھائی احمد بن عطاش اور اُس کے بیٹے اور اُس کے 80 باطنی فدائیوں کو مرو میں قتل کر دیا گیا ہے۔ عبدالملک کو یہ اطلاع اُن جاسوسوں نے پہنچائی تھی جو مرو میں موجود تھے۔

عبدالملک کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔ یہ صدمہ اس کے لئے کوئی معمولی صدمہ نہیں تھا۔ ویسے بھی عبدالملک بوڑھا آدمی تھا اور اس میں قوتِ برداشت کم ہو گئی تھی۔ پھر اُسے یہ اطلاع بھی ملی کہ احمد بن عطاش کی بیوی نے اپنے خاوند کی یہ خبر سن کر کہ اسے جلاد کے حوالے کر دیا گیا ہے‘ ایک بلند مکان سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی ہے۔ عبدالملک کے لئے یہ دوسرا صدمہ تھا۔

عبدالملک بن عطاش قلعہ ناظر و طبس میں پہنچا۔ یہ قلعہ اصفہان کے قریب ہی تھا۔ عبدالملک نے دو ایلچی اور کچھ اور آدمی اصفہان بھیجے۔ اصفہان میں باطنیوں کے جو جاسوس تھے‘ انہوں نے عبدالملک کو یہ خبر دے دی تھی کہ سلطان محمد اس وقت اصفہان میں ہے اور کچھ دنوں بعد اپنے دارالحکومت مرو چلا جائے گا۔ عبدالملک نے سلطان محمد کی طرف ایلچی اس درخواست کے ساتھ بھیجے تھے کہ اس کے چھوٹے بھائی احمد اور احمد کے بیٹے اور احمد کی بیوی کی لاشیں دے دی جائیں۔

احمد اور اس کے بیٹے کی لاشیں ایک ہی گڑھے میں پھینک کر اوپر مٹی ڈال دی گئی تھی۔ دونوں کے سر کاٹ کر بغداد خلیفہ کے پاس بھیج دیئے گئے تھے۔ احمد کی بیوی کو ان آدمیوں نے جو اس کے ساتھ تھے‘ باقاعدہ دفن کیا تھا۔ عبدالملک کے ایلچی سلطان محمد کے پاس پہنچے تو سلطان محمد نے انہیں اجازت دے دی کہ وہ ان تینوں کی لاشیں نکال کر لے جائیں۔

ایک روز یہ تین لاشیں قلعہ ناظر و طبس پہنچ گئیں۔ عبدالملک نے جب دیکھا کہ اس کے بھائی اور بھائی کے بیٹے کی لاشیں بغیر سروں کے ہیں تو اُس پر غشی طاری ہونے لگی۔ وہ اپنا کالا جادو اور شعبدہ بازی بھول ہی گیا۔ اُس کی تو کمر ہی دوہری ہو گئی۔ ان تینوں لاشوں کو احترام کے ساتھ دفن کیا گیا۔

عبدالملک بن عطاش حسن بن صباح کا استاد اور پیر و مرشد تھا۔ مختلف مؤرخوں نے مختلف رائے دی ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح سر تا پا اندر اور باہر سے ابلیس تھا۔ اُس نے اپنے اس پیر و مرشد اور استاد کو بھی دھوکے دیئے تھے اور کوشش یہ کی تھی کہ اسے اتنی اہمیت اور مقبولیت نہ ملے جتنی اسے حاصل ہو گئی تھی، یہاں تک کہ بعض لوگ حسن بن صباح کو امام ہی نہیں نبی بھی کہنے لگے تھے۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح نے عبدالملک کے ساتھ پوری وفاداری کی تھی۔ ذہنی طور پر حسن بن صباح عبدالملک کو پیر استاد مانتا تھا اور جب اسے یہ اطلاع ملی کہ عبدالملک شاہ در سلجوقیوں کو دے کر قلعہ ناظروطبس میں آگیا ہے اور اس کے چھوٹے بھائی کو اور بھائی کے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے تو اس نے ضروری سمجھا کہ قلعہ ناظروطبس جا کر اپنے استاد کی دلجوئی کرے۔

حسن بن صباح جب قلعہ الَموت سے ناظروطبس کے سفر کو روانہ ہُوا تو یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا کا بادشاہ یہی اکیلا شخص ہو۔ اس کے لئے ایسی پالکی تیار کی گئی تھی جسے بیس آدمی اٹھاتے تھے۔ دس آگے اور دس پیچھے۔ پالکی کے پردے خالص ریشم کے تھے اور باقی پالکی کمخواب سے تیار کی گئی تھی۔ اس کے اندر بڑے ہی نرم گدّے اور گاؤ تکئے رکھے گئے تھے۔ حسن بن صباح کے ساتھ اس پالکی میں اس کی جنت کی دو حُوریں بھی تھیں جو اُس کی مٹھی چاپی کرتی جا رہی تھیں۔ اُس وقت حسن بن صباح بُوڑھا ہو چکا تھا۔ تقریباً بیس فدائی تلواروں اور برچھیوں سے مسلح اُس کے آگے آگے جا رہے تھے۔ بیس پچیس دائیں طرف اور اتنے ہی بائیں طرف اور اتنے ہی اس کے پیچھے تھے۔ یہ سب گھوڑوں پر سوار تھے اور ان کے لباس بڑے ہی دلکش اور دلفریب تھے۔ اس کے پیچھے اونٹوں پر سامان تھا اور اس سامان میں خورد و نوش کی وہ اشیاء تھیں جو جنت میں ہی کسی کو مل سکتی ہوں گی۔ ان اونٹوں کے ساتھ ساتھ اور کچھ پیچھے سو ڈیڑھ سو مریدوں کا گروہ تھا۔ وہ بھی سب کے سب مسلح تھے۔

حسن بن صباح کا یہ قافلہ جب پہلا پڑاؤ کرنے لگا تو فدائیوں نے اُس جگہ کو حصار میں لے لیا۔ اس کے لئے زمین پر نرم و گداز گدّے بچھا دیئے گئے اور اِردگرد ریشم کے پردے تان دیئے گئے۔ باہر کا کوئی آدمی اُس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس

شخص نے مسلمانوں کے خون کے دریا بہا دیئے تھے۔ اس نے نہایت اہم اور تاریخ ساز شخصیتوں کو قتل کروا دیا تھا۔ سینکڑوں قافلے اس کے اشارے پر لُوٹے گئے تھے۔ قافلوں کے ساتھ جو کمسن اور جوان بچیاں تھیں وہ اغوا کی گئی تھیں اور انہیں جنت کی حُوریں بنایا گیا تھا۔ اب اس شخص کو ہر لمحہ اپنی جان کا غم لگا رہتا تھا۔ اسے کوئی ملنے کے لئے جاتا تو اس کے پاس جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی اور اگر کسی کو اجازت مل بھی جاتی تو اس کی جامہ تلاشی بڑی سختی سے کی جاتی تھی۔

دو پڑاؤ کے بعد جب حسن بن صباح کا قافلہ ناظروطبس کے قریب پہنچا تو قافلے کا ایک سوار گھوڑا دوڑاتا قلعے میں پہنچا اور عبدالملک کو اطلاع دی کہ شیخ الجبل امام حسن بن صباح کی سواری آ رہی ہے۔ یہ خبر قلعے میں فوراً پھیل گئی۔ ان تمام باسیوں کو جو وہاں موجود تھے خوشیاں منانی چاہئے تھیں کہ شیخ الجبل ان کے ہاں آ رہا ہے لیکن سب پر موت کی مُردنی چھا گئی اور ان کے سر جھک گئے۔ وہ سب شکست خوردہ تھے۔ شاہ در جیسا قلعہ سلجوقیوں کو دے آئے تھے۔ عبدالملک کے تاثرات کچھ اور تھے۔ غموں نے اور بڑھاپے نے اُسے جھکا دیا تھا۔ اُس نے حکم دیا کہ قلعے کے تمام لوگ قلعے سے باہر جا کر راستے میں دونوں طرف کھڑے ہو جائیں اور اپنے امام کا استقبال کریں۔

آخر حسن بن صباح کی سواری قلعے تک پہنچی اور قلعے کے لوگ دونوں طرف کھڑے بازو لہرا لہرا کر نعرے لگا رہے تھے۔

"بند کر دو یہ نعرے!" — پالکی میں سے حسن بن صباح کی آواز گرجی — "ان ہارے ہوئے بزدلوں کو کیا حق ہے کہ وہ زندہ باد اور مُردہ باد کے نعرے لگائیں.... انہیں کہو خاموش رہیں"۔

اُس کا یہ حکم لوگوں تک پہنچا دیا گیا اور وہاں موت کا سکوت طاری ہو گیا۔

عبدالملک بن عطاش اُس کے استقبال کے لئے دروازے تک نہ آیا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد حسن بن صباح اس کے کمرے میں داخل ہُوا۔ عبدالملک نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن حسن بن صباح نے آگے بڑھ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور اسے اٹھنے نہ دیا۔ عبدالملک کے آنسو جاری ہو گئے اور کچھ دیر بعد وہ سسکنے لگا۔ حسن بن صباح اس کے پاس بیٹھ گیا اور اُسے تسلیاں دینے لگا۔

"ابنِ صباح!" — عبدالملک نے کچھ دیر بعد کہا — "تم لوگوں کو دھوکے میں قتل

کروانا جانتے ہو لیکن قلعوں کے دفاع کا تمہیں کوئی خیال نہیں۔ ہمیں ایک باقاعدہ فوج تیار کرنی چاہئے ورنہ تم دیکھ لینا ایک روز قلعہ الموت بھی ہم سے چھن جائے گا"۔

"پیرو مرشد!" ـــــ حسن بن صباح نے پُراعتماد لہجے میں کہا ـــــ "وہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔ البتہ اُس وقت کا انتظار کریں جب سلجوقیوں کی سلطنت ہمارے قدموں کے نیچے ہو گی اور یہ سلطان اور ان کے خاندان ہمارے قیدی ہوں گے۔ میں جانتا ہوں آپ پر احمد اور اس کے بیٹے کا اور اس کی بیوی کا غم حاوی ہو گیا ہے۔ شاہ در ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے تو اس کا اتنا غم نہ کریں۔ ہمیں قلعوں کی نہیں لوگوں کی ضرورت ہے۔ ہم لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہے ہیں"۔

"ہوش میں آ ابنِ صباح!" ـــــ عبدالملک نے کہا ـــــ "میں نے تجھے شیخ الجبل اور امام بنایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تو اپنی طاقت اور مقبولیت کا اندازہ بڑا غلط لگا رہا ہے۔ خوش فہمیوں سے نکل۔ اگر ہمارا یہی حال رہا تو ہمارا فرقہ سُکڑ سمٹ کر صرف ہم تک رہ جائے گا۔ سلجوقیوں کو ہم پر یہ پہلی فتح حاصل ہوئی ہے' یہ کوئی معمولی فتح نہیں۔ ہم شاہ در کو ناقابلِ تسخیر سمجھتے تھے لیکن اہلِ سنت سلجوقیوں کے ہاتھ میں بھی کوئی طاقت آگئی ہے۔ میں نے اپنا وہ جادو چلایا جو کبھی ناکام نہیں ہُوا تھا لیکن میں نے اُلو چھوڑا تو سلجوقیوں کے تیراندازوں نے اسے تیروں سے گرا لیا۔ اس سے مجھے خیال آیا کہ سلطان محمد کو کسی طرح پہلے پتہ چل گیا تھا کہ قلعے کے اندر سے ایک اُلو اُڑے گا جو پُورے لشکر پر اُڑ کر واپس آجائے گا لیکن اُلو اُڑا اور تیراندازوں نے اُسے گرا لیا.... بتاؤ' میں کیا سمجھوں!"

"نہیں پیرو مرشد!" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "میں اس شکست کو فتح میں بدل کر دکھاؤں گا۔ آپ اس صدمے کو اپنے اندر جذب کر لیں اور میری رہنمائی اسی طرح کرتے رہیں جس طرح کرتے رہے ہیں.... یہ بتائیں آپ وہاں کیا چھوڑ آئے ہیں؟"

"میں وہاں جانباز قسم کے فدائی چھوڑ آیا ہوں" ـــــ عبدالملک نے کہا ـــــ "وہ عقل اور ہوش والے ہیں۔ وہ کسی کو یوں قتل نہیں کریں گے کہ قتل کیا اور خودکشی کر لی۔ میں انہیں پوری ہدایات دے کر آیا ہوں۔ وہ مسجدوں میں امام بنیں گے۔ بچوں کو قرآن اور احادیث کی تعلیم دیں گے اور وہ زندگی کے ہر شعبے میں معزز افراد کی حیثیت سے رہیں گے۔ میں زیادہ کیا بتاؤں' وہ بڑے ہی زہریلے سانپ ہیں جو میں شاہ در میں

چھوڑ آیا ہوں۔ وہ ان سلجوقیوں کو ایسے ڈنک ماریں گے کہ وہ شاہ در سے بھاگ جائیں گے.... مجھے گلہ اور شکوہ تم سے ہے کہ ہم اتنا زیادہ عرصہ محاصرے میں رہے کہ نہ جانے کتنے چاند طلوع ہوئے اور ڈوب گئے لیکن تم سے اتنا بھی نہ ہُوا کہ کچھ فدائی بھیج دیتے جو سلطان محمد اور اس کے سالاروں کو اسی طرح قتل کر دیتے جس طرح وہ پہلے قتل کرتے چلے آئے ہیں"۔

"مجھے محاصرے کی اطلاع مل گئی تھی" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "میں نے دس منتخب فدائی بھیج دیئے تھے جنہوں نے سلطان محمد اور اس کے سالاروں وغیرہ کو قتل کرنا تھا لیکن آپ سن کر حیران ہوں گے کہ ان دس فدائیوں کا کچھ پتہ ہی نہ چلا کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ آخر کچھ عرصے بعد یہ اطلاع ملی کہ ان دس کی لاشیں جنگل میں پڑی ہیں اور انہیں جنگل کے درندے کھا چکے ہیں"۔

"تم نے ابھی نقصان کا اندازہ نہیں کیا ابنِ صباح!" ـــــ عبدالملک نے کہا ـــــ "ہماری آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ختم ہو گیا ہے۔ ہمیں جو دولت اور قیمتی اشیاء قافلوں سے ملتی تھیں' وہ اب نہیں مل سکیں گی۔ شاہ در بڑی موزوں جگہ تھی۔ میں نے جو آخری قافلہ لٹوایا تھا' اس سے ہمیں بے شمار دولت ملی تھی۔ میں شاہ در میں بے انداز خزانہ چھوڑ کر آیا ہوں۔ میں سمجھ نہیں سکتا وہ خزانہ وہاں سے کس طرح نکلوا سکتا ہوں"۔

"وہ خزانہ کہاں ہے؟"

"وہ میں نے ایسی جگہ چھپا لیا تھا جہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا" ـــــ عبدالملک نے جواب دیا ـــــ "شاہ در میں اپنے جو آدمی چھوڑ آیا ہوں' اُن میں ایک یا دو آدمی اس جگہ سے واقف ہیں۔ میں ذرا سنبھل لوں تو یہاں سے آدمی بھیجوں گا جو وہ خزانہ نکالنے کی کوشش کریں گے.... یہ بعد کی باتیں ہیں ابنِ صباح! فوری طور پر کرنے والا کام یہ ہے کہ فوج تیار کرو۔ اگر نہیں کرو گے تو قلعہ الموت بھی خطرے میں رہے گا۔ مت بھولو کہ سلجوقیوں کے حوصلے اس فتح سے بلند ہو گئے ہیں اور ان کے لئے یہ معمولی فتح نہیں کہ انہوں نے احمد کو سزائے موت دی ہے"۔

یہ اُس دَور کا واقعہ ہے جب حسن بن صباح کی ابلیسیت ایک پُرکشش اور پُراثر عقیدے کی شکل میں دُور دُور تک پھیل گئی تھی اور اس کے اثرات سلجوقی سلطنت میں

داخل ہو چکے تھے۔ یہ ایک ایسا سیلاب تھا جو زمین کے نیچے نیچے آیا تھا اور لوگ شیخ الجبل کو نبی تک ماننے پر اتر آئے تھے۔ سلجوقی سلاطین پکے مومن تھے اور وہ اہلِ سُنت والجماعت بھی تھے۔ وہ دل اور روح کی گہرائیوں سے اس فتنے کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے اور سرگرمِ عمل بھی تھے لیکن یہ فتنہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ایک بڑی پرانی کتاب — "تاریخِ آلِ سلجوقی اصفہانی" — میں یہ سراغ ملتا ہے کہ سلجوقی سلاطین میں وہ کون سی کمزوری تھی جس نے باطنیوں کو اپنے باطل عقیدے پھیلانے کا موقع مل گیا۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کا جاسوسی کا نظام بڑا ہی کارگر ہوا کرتا تھا۔ مسلمانوں کے جاسوس کفار کے درمیان موجود رہتے تھے اور پل پل کی خبر پیچھے بھیجتے تھے لیکن سلطان ملک شاہ کے باپ الپ ارسلان نے یہ محکمہ نہ جانے کس مصلحت کی بنا پر توڑ دیا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ مسلمانوں کے جاسوس واپس آگئے۔؟

الپ ارسلان کو جاسوسوں کی ضرورت نہیں رہی تھی اور اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ابھی حسن بن صباح کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں تھا۔ حسن بن صباح سلطان ملک شاہ کے دور میں اٹھا تھا۔ سلطان ملک شاہ نے بھی جاسوسی کی طرف توجہ نہ دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسن بن صباح کے جاسوس ہی نہیں بلکہ اس کے تخریب کار بھی مسلمانوں میں آگئے اور انہیں کوئی بھی پہچان نہ سکا۔ انہوں نے نفسیاتی تخریب کاری بھی کی اور نظریاتی بھی اور اس کے بعد انہوں نے اہم شخصیتوں کے قتل کا سلسلہ شروع کر دیا۔

یہ تھی مسلمانوں کی وہ کمزوری جس سے باطنی فرقے نے فائدہ اٹھایا۔ سلطان ملک شاہ کے وزیرِ اعظم نظام الملک خواجہ حسن طوسی نے شدت سے محسوس کیا کہ جاسوسوں کے بغیر دشمن پر کاری ضرب نہیں لگائی جا سکتی۔ سلطان ملک شاہ نظام الملک کا تو مرید تھا اور وہ اس کی راہنمائی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا کرتا تھا۔ نظام الملک نے جاسوسی کا نظام از سرِ نو قائم کرنے کی تجویز پیش کی اور سلطان ملک شاہ نے اسے فوراً" تسلیم کر لیا۔

ابتدا میں مسلمان جاسوسوں کو بہت ہی دشواریوں اور خطروں کا سامنا کرنا پڑا۔ حسن بن صباح کے جاسوس انہیں فوراً" پہچان لیتے تھے۔ مزمل آفندی کی مثال پہلے تفصیل سے سنائی جا چکی ہے۔ مزمل حسن بن صباح کو قتل کرنے گیا تھا لیکن واپس یہ ارادہ لے کر آگیا کہ وہ سلطان ملک شاہ اور نظام الملک کو قتل کرے گا۔ یہ حسن بن صباح کے ایک

خاص نظام کا کمال تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے جاسوس کامیابیاں حاصل کرنے لگے لیکن ابھی تک ان کا یہ نظام کمزور تھا۔ اب شاہ در کے محاصرے کے دوران نورُ کے باپ نے تیر کے ذریعے پیغام باہر بھیجا تو سلطان محمد نے سوچا کہ یہ تو اللہ کی خاص نوازش تھی کہ ایک آدمی کے دل میں باطنیوں کے خلاف عناد بھرا ہوا تھا اور اس نے سلطان محمد کی مدد کی تو کیوں نہ ان باطنیوں میں اپنے جاسوس چھوڑ دیئے جائیں جو ذرا ذرا سی بھی باتیں آ کر بتاتے رہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے چھوٹے بھائی سنجر کو شاہ در بھیجا تھا اور اسے خاص طور پر کہا تھا کہ اس شہر میں جو لوگ پیچھے رہ گئے ہیں وہ بظاہر بے ضرر سے لگتے ہیں لیکن ان میں فدائی اور حسن بن صباح کے خاص جاسوس اور تخریب کار یقیناً" ہوں گے۔ سلطان محمد نے سنجر سے کہا تھا کہ وہ باطنیوں کے بہروپ میں اپنے جاسوس شاہ در بھیجے گا۔

یہ صحیح ہے کہ سلجوقیوں نے باطنیوں کے ہاتھوں بہت ہی نقصان اٹھایا تھا۔ سلجوقیوں نے حوصلہ ہارنے اور مایوس ہونے کی بجائے اپنا جہاد اس باطل کے خلاف جاری رکھا۔ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ بدی کے خلاف لڑنے والوں کی مدد اللہ یقیناً" کیا کرتا ہے۔ یہ ایک معجزہ تھا کہ حسن بن صباح کے بھیجے ہوئے دس فدائی جنہوں نے سلطان محمد اور اس کے سالاروں کو قتل کرنا تھا' خود قتل ہو گئے۔ یہ بھی تو ایک معجزہ تھا کہ عبدالملک کے کالے جادو کو اس کے اپنے ہی قابلِ اعتماد ملازم نے ضائع کر دیا۔ وہ جو پیغام تیر کے ساتھ بندھا ہوا باہر آیا' وہ یوں تھا جیسے آسمانوں سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے پھینکا ہو۔

حسن بن صباح اپنے پیرو مرشد عبدالملک بن عطاش کو تسلیاں دے کر اور اس کا حوصلہ مضبوط کر کے واپس الموت چلا گیا۔

○

سنجر شاہ در پہنچ گیا تھا۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ شاہ در کی جو آبادی پیچھے رہ گئی تھی اسے ایک میدان میں اکٹھا کر لیا۔ زیادہ تر آبادی یہاں سے چلی گئی تھی۔ پیچھے جو لوگ رہ گئے تھے' ان کی تعداد پانچ چھ ہزار تھی۔ جانے والے سب باطنی تھے اور جو پیچھے رہ گئے تھے' وہ بھی باطنی تھے لیکن کچھ تعداد مسلمانوں کی بھی تھی۔

سنجر نے اس آبادی کے صرف مردوں ہی کو باہر اکٹھا نہ کیا بلکہ عورتوں اور بچوں کو بھی ان کے ساتھ بلوا لیا۔

باطنیوں کے چہروں پر خوف و ہراس نمایاں تھا۔ عورتوں پر تو خوف زدگی طاری تھی۔ ان کی آنکھیں ٹھہری ٹھہری تھیں اور چہروں پر گھبراہٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ ان میں جواں سال اور بڑی اچھی شکل و صورت کی عورتیں بھی تھیں۔ ان میں کمسن اور نوجوان لڑکیاں بھی تھیں۔ اصل خطرہ تو انہیں تھا۔ اُس زمانے میں فاتح فوج مفتوحہ شہروں کی عورتوں سے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا کرتی تھی۔ ان لوگوں کے چہروں پر بھی یہی خوف نظر آ رہا تھا کہ نہ جانے اب انہیں کیا سزا ملے اور ان کی بیٹیوں کے ساتھ کیا سلوک ہو۔

سلجوقی فوج کی کچھ نفری اس ہجوم کے اِردگرد کھڑی کر دی گئی تھی اور فوج کی باقی نفری قلعہ مسمار کر رہی تھی۔

سنجر گھوڑے پر سوار وہاں آیا اور اُس نے پہلے سارے مجمع کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔ لوگوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔

"تم لوگ ڈرے ڈرے سے کیوں لگتے ہو؟" —— سنجر نے کہا —— "کیا تم مجھے اور اس فوج کو اجنبی اور غیر سمجھتے ہو؟.... ہم نے نہ کوئی قلعہ فتح کیا ہے اور نہ ہی تم لوگوں کو فتح کیا ہے۔ میری ایک بات اچھی طرح سن لو۔ نہ میں فاتح ہوں نہ تم مفتوح ہو۔ ہم نے صرف یہ فتح حاصل کی ہے کہ اس شہر سے باطل کو نکال دیا ہے۔ کیا تم خوش نہیں ہو گے کہ جن لوگوں نے تمہیں اللہ کی راہ سے ہٹا کر کفر کی راہ پر ڈالا تھا' وہ مارے گئے ہیں یا یہاں سے جا چکے ہیں؟.... تمہارے دوسرے خوف سے بھی میں واقف ہوں۔ تم ان لڑکیوں کے لئے یقیناً" پریشان ہو رہے ہو۔ ہم یہاں ان کی عزت کے ساتھ کھیلنے نہیں بلکہ ان کی عزت کی حفاظت کرنے آئے ہیں۔ اپنی بیٹیوں سے کہو کہ یہ تمہارا اپنا شہر ہے' اس کی گلیوں میں بے خوف و خطر گھومو پھرو اور اگر تمہاری عزت پر فوج کا کوئی آدمی یا کوئی اور ہاتھ ڈالتا ہے تو میرے دروازے ہر کسی کے لئے کھلے ہیں۔ میں فریاد سنوں گا اور اس آدمی کو تمہارے سامنے جلاّد کے حوالے کروں گا....

"بڑے لمبے عرصے تک تم محاصرے میں رہے ہو۔ تم پر پتھر برستے رہے ہیں اور تم پر آگ بھی برستی رہی ہے۔ تم مجھے اور میری فوج کو دل ہی دل میں کوس رہے ہو گے اور بددعائیں دے رہے ہو گے کہ ہم نے تم پر پتھر برسائے اور آگ بھی برسائی اور تمہارے کئی گھر جلا دیئے ہیں لیکن سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس شہر پر یہ پتھر اور آتشی تیر اللہ نے

برسائے۔ ہم تو اس کا ایک سبب بنے تھے۔ ایسا کیوں ہوا؟.... صرف اس لئے کہ تمہیں اللہ کے راستے سے ہٹایا گیا اور تم نے اسی کو دین اور مذہب سمجھ لیا۔ یہاں شیطان کی حکمرانی رہی ہے۔ یہ تمہارا امام جسے تم نبی بھی مانتے ہو' کہاں ہے؟.... یہ امام کا پیر و مُرشد جسے تم یوں مانتے تھے جیسے وہی تمہیں اگلے جہان جنت میں داخل کرے گا' وہ شکست کھا کر بھاگ گیا ہے"۔

سنجر نے انہیں بتایا کہ عبدالملک بن عطاش جسے وہ پیر و مرشد سمجھتے رہے ہیں' کالے جادو میں یقین رکھتا تھا اور اس نے محاصرہ توڑنے کے لئے کالا جادو استعمال کیا تھا اور ایک اُلّو کو اُڑایا تھا لیکن وہ اُلّو تیروں سے مار کر گرا لیا گیا۔ سنجر نے کہا کہ جہاں ایمان میں بجھے ہوئے تیر چلتے ہیں وہاں جادو نہیں چل سکتا۔ سنجر نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ سنایا کہ انہوں نے کس طرح فرعون کے جادوگروں کو نیچا دکھایا تھا اور کس طرح ان جادوگروں کے سانپوں کو حضرت موسیٰؑ کا عصا نگل گیا تھا اور پھر حضرت موسیٰؑ کو دریائے نیل نے راستہ دے دیا اور فرعون کو غرق کر دیا تھا۔

"یہ لوگ تو کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے" —— سنجر نے کہا —— "یہ سرتاپا ابلیس ہیں اور یہ لوگ ابلیس کی پوجا کرتے ہیں اور انہوں نے تم سب کو بھی ابلیس کا پجاری بنا دیا ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ یہ شہر ہماری عملداری میں آ گیا ہے اور وہ ابلیس یہاں سے نکل گئے ہیں۔ ہم یہاں تم پر حکومت کرنے نہیں آئے۔ ہم بادشاہ نہیں نہ تمہیں اپنی رعایا سمجھتے ہیں۔ ہم اللہ کا وہ پیغام اور حکم لے کر آئے ہیں جس کے مطابق تمام انسان برابر ہیں.... نہ کوئی بادشاہ نہ کوئی رعایا.... اب میں چاہوں گا کہ تم خود زبان سے بولو.... کیا یہ غلط ہے کہ یہاں قافلوں کے لٹیرے رہتے تھے اور یہاں قافلوں کا لوٹا ہوا مال آتا تھا؟"

سنجر نے تمام مجمعے پر اپنی نگاہیں گھمائیں اور خاموش رہا۔

"بولو!" —— کچھ دیر بعد اس نے کہا —— "دل میں کوئی بات نہ رکھو۔ کہو میں نے جھوٹ کہا ہے یا سچ!"

"ہاں سلطان!" —— آخر ایک آدمی کی آواز آئی —— "یہاں قافلوں کا لوٹا ہوا مال آتا تھا"۔

"اور یہاں اغوا کی ہوئی بچیاں اور نوجوان لڑکیاں لائی جاتی تھیں"۔

"ہماری بچیوں کو یہاں سے اٹھایا گیا ہے" ــــ ایک اور آواز آئی ــــ "ہماری بچیوں کے ساتھ شادی کر کے انہیں غائب کیا گیا ہے"۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں لُوٹی ہوئی یہ دولت اور یہ بچیاں کہاں جاتی رہی ہیں" ــــ سنجر نے کہا ــــ "یہ تمام دولت قلعہ الَمُوت اس حسن بن صباح کے پاس اکٹھی ہوتی رہی ہے جسے تم امام اور نبی اور نہ جانے کیا کیا مانتے ہو۔ تمہاری بچیاں اور قافلوں سے اٹھائی ہوئی بچیاں وہاں حوریں بنائی گئی ہیں"۔

"ہمیں ایک بات بتاؤ سلطان!" ــــ ایک ضعیف العمر آدمی نے ہجوم سے آگے بڑھ کر کہا ــــ "قافلے ہم نے تو نہیں لُوٹے اور بچیوں کو ہم نے تو اغوا نہیں کیا پھر ہمیں کس گناہ کی سزا دی گئی ہے؟ تمہاری فوج کے آتشی تیروں نے میرا گھر کیوں جلا دیا ہے؟ شہر میں گھوم پھر کر دیکھو' بہت سے گھر جلے ہوئے نظر آئیں گے۔ تمہاری فوج کے برسائے ہوئے پتھروں سے ہمارے بچے ہلاک ہوئے ہیں"۔

"میں نے شہر میں گھوم پھر کر دیکھ لیا ہے" ــــ سنجر نے کہا ــــ "جن لوگوں کے گھر جل گئے ہیں یا پتھروں سے تباہ ہوئے ہیں' انہیں وہ گھر دیئے جائیں گے جو بالکل ٹھیک کھڑے ہیں۔ اگر وہ پورے نہ ہوئے تو جلے ہوئے گھر سرکاری خزانے سے نئے کر دیئے جائیں گے۔ جب تک یہ مکان نہیں بنتے' میں تمام لوگوں کا مالیہ' لگان اور دیگر محصولات معاف کرتا ہوں"۔

سنجر نے اسلامی فاتحین کی روایات کے عین مطابق شاہ در کے لوگوں کے دلوں سے خوف و ہراس نکال دیا اور انہیں یہ تاثر دیا کہ انسان واجب التکریم ہے اور اس شہر کے لوگوں کو پوری تکریم دی جائے گی اور ان کے حقوق پورے کیئے جائیں گے۔ سنجر ان لوگوں کے دلوں کو فتح کرنا چاہتا تھا لیکن ان لوگوں میں حسن بن صباح کے تخریب کار موجود تھے جنہیں عبدالملک بن عطاش اور احمد بن عطاش خاص طور پر پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ سنجر جب اس مجمعے سے خطاب کر رہا تھا' اُس وقت دو آدمی ان لوگوں کے پیچھے کھڑے تھے اور سنجر کا ایک ایک لفظ غور سے سن رہے تھے۔

"یہ شخص ہمارے لئے مشکل پیدا کر رہا ہے" ــــ ایک نے دوسرے سے کہا ــــ "اگر یہاں کے لوگوں نے اس سلطان کی باتوں کو دل میں بٹھا لیا اور انہیں دل و جان سے قبول کر لیا تو ہمارے لئے ایک مسئلہ پیدا ہو جائے گا"۔

"کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو گا" ــــ دوسرے نے کہا ــــ "یہ لوگ ہمارے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ ہمارا شکار یہ سلطان سنجر ہے' لوگ نہیں"۔

"اور اب میں ایک نہایت ضروری بات کہنا چاہتا ہوں" ــــ سنجر نے اپنے خطاب کے آخر میں کہا ــــ "مجھے معلوم ہے کہ حسن بن صباح اور اس کے استاد عبدالملک بن عطاش کے تخریب کار یہاں موجود ہیں۔ وہ مسجدوں میں بھی موجود ہوں گے اور وہ ہر جگہ تمہارے درمیان گھومتے پھرتے رہیں گے۔ انہیں پکڑنا یا ان کی نشاندہی کر کے پکڑوانا تمہارا فرض ہے۔ اگر تم اپنے فرض سے کوتاہی کرو گے تو ایک بار پھر تمہیں تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تم میں سے کوئی آدمی کسی ایسے شیطان کو پکڑ کر لائے گا یا نشاندہی کرے گا' اسے بے دریغ انعام دیا جائے گا"۔

سلطان محمد نے جب سنجر سے کہا تھا کہ وہ شاہ در چلا جائے اور وہاں کا انتظام سنبھالے تو اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے تربیت یافتہ آدمی شاہ در بھیجے گا جو جاسوسوں اور تخریب کاروں کو زمین کے نیچے سے بھی نکال لائیں گے۔ کچھ آدمی تو سنجر کے ساتھ ہی آ گئے تھے اور کچھ بھیجے جا رہے تھے۔

○

داستان گو اس داستان کو پیچھے اُس مقام پر لے جا رہا ہے جہاں مزمل آفندی' بن یونس' شمونہ اور شافعیہ نے دس باطنی فدائیوں کو جنگل میں قتل کیا تھا۔ مزمل شدید زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے دائیں کندھے میں ایسا خنجر لگا تھا کہ ہنسلی سے بھی نیچے چلا گیا تھا۔ وہاں سے خون اُمڈ اُمڈ کر باہر آ رہا تھا جسے نہ روکنے کی صورت میں موت کا خطرہ تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ آگے جانے کی بجائے پیچھے وسم کوہ چلے جائیں۔ وہ اُسی وقت واپس چل پڑے تھے۔

وسم کوہ ایک دن کی مسافت تھی۔ وہ آدھی رات کو چلے تو ان کا ارادہ تھا کہ بہت تیز چلیں گے تاکہ جلدی منزل پر پہنچ جائیں اور مزمل کا خون روک دیا جائے لیکن مزمل کا گھوڑا تیز دوڑتا یا چلتا تھا تو جھٹکوں سے اس کا خون اور زیادہ نکلنے لگتا تھا۔ اس کے زخم میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا اور اوپر بھی کپڑا باندھ دیا گیا تھا لیکن خون پوری طرح رکا نہیں تھا۔ اس کے باوجود مزمل نے گھوڑے کی رفتار تیز رکھی لیکن راستے میں ہی اُس پر غشی طاری ہو گئی اور گھوڑوں کی رفتار کم کر دی گئی۔

اگلے روز آدھا دن گزر چکا تھا جب یہ لوگ وسم کوہ پہنچ گئے۔ مزمّل کا چہرہ اور جسم پیلا پڑ گیا تھا جو اس امر کی نشانی تھی کہ جسم میں خون ذرا سا ہی باقی رہ گیا ہے۔ اسے فوراً سالار اوریزی کے پاس پہنچایا گیا۔ طبیب اور جراح دوڑے آئے اور انہوں نے مزمل کا خون روکنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

سالار اوریزی کو بتایا گیا کہ وہ دس فدائیوں کو قتل کر کے واپس آ گئے ہیں اور فدائیوں سے ایسا اشارہ ملا تھا جیسے وہ شاہ در جا رہے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ سلطان محمد اور اس کے سالاروں کو اسی طرح قتل کر دیں جس طرح انہوں نے پہلے اہم شخصیتوں کو قتل کیا تھا۔

مزمّل آفندی دو دنوں بعد ہوش میں آیا اور اس نے پہلی بات یہ پوچھی کہ وہ کہاں ہے اور اس کے ساتھی کہاں ہیں۔ اسے بتایا گیا کہ وہ وسم کوہ میں ہے اور اللہ نے اسے نئی زندگی عطا فرمائی ہے۔ اس کے بعد اس نے طبیب اور جراح سے کہا کہ اسے بہت جلدی ٹھیک کر دیں تاکہ وہ قلعہ الموت کے لئے روانہ ہو سکے۔ طبیب اور جراح اسے کہتے تھے کہ وہ جسم کو زیادہ ہلائے نہیں ورنہ زخم پھر کھل جائے گا۔ دراصل مزمل جوشیلا آدمی تھا۔ وہ برداشت نہیں کر رہا تھا کہ چارپائی پر ہی لیٹا رہے۔

اس کا زخم ملتے ایک مہینہ گزر گیا تھا۔ اس دوران وسم کوہ میں یہ خبر پہنچی کہ شاہ در فتح کر لیا گیا ہے اور اس شہر کی زیادہ تر آبادی وہاں سے نکل گئی ہے۔ پھر یہ خبر بھی وہاں پہنچی کہ عبدالملک ناظر و طبس چلا گیا ہے۔ اس قلعے میں پہنچے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے۔

مزمّل آفندی آخر بالکل ٹھیک ہو گیا ۔ اسے ایسی غذائیں دی جاتی رہی تھیں کہ اس کے خون کی کمی پوری ہو گئی تھی۔ اسے جب یہ خبر ملی کہ عبدالملک قلعہ ناظر و طبس چلا گیا ہے اور اس کے ساتھ شاہ در کی کچھ آبادی بھی وہاں گئی ہے تو مزمّل فوراً سالار اوریزی کے پاس گیا۔ بن یونس کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔

"سالارِ محترم!" ـــــ مزمل نے کہا ـــــ "آپ قلعہ ناظر و طبس لے سکتے ہیں"۔

"وہ کیسے؟" ـــــ سالار اوریزی نے پوچھا۔

"عبدالملک چند دن پہلے وہاں پہنچا ہے" ـــــ مزمّل نے کہا ـــــ "اس کے ساتھ شاہ در کی کچھ آبادی ہے اور کوئی فوج اس کے پاس نہیں۔ اس قلعے میں پہلے سے کچھ لوگ آباد ہوں گے جو اتنی جلدی اس کی لڑائی نہیں لڑیں گے۔ ہم اس قلعے کو محاصرے میں

نہیں لیں گے۔ میں نے ایک ترکیب سوچی ہے"۔

اس نے اور بن یونس نے سالار اوریزی کو اپنا پلان بتایا۔ سالار اوریزی پہلے ہی پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ وہ ایک عرصے سے وسم کوہ میں بیٹھا ہے اور کچھ کر نہیں رہا۔ وہ تو باطنیوں کا ایسا دشمن تھا کہ کسی پر شک ہوتا کہ یہ حسن بن صباح کا پیروکار ہے تو اسے قتل کروا دیتا تھا۔ اس نے تجویز سنی تو مزمّل اور بن یونس کو اجازت دے دی کہ وہ اس پر عمل کریں۔

"ایک پہلو پر غور کر لیں" ـــــ بن یونس نے کہا ـــــ "سلطان محمد نے عبدالملک کو اجازت دی ہے کہ وہ قلعہ ناظر و طبس چلا جائے۔ سلطان نے اسے حفاظتی دستہ بھی دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سلطان نے اس شخص کی جان بخشی کر دی تھی۔ اگر آپ اس قلعے پر چڑھائی کر کے یہ قلعہ لے لیتے ہیں تو سلطان شاید اس کارروائی کو پسند نہ کرے اور وہ اسے حکم عدولی بھی سمجھ سکتا ہے"۔

"میں سلطان کے حکم کا نہیں اللہ کے حکم کا پابند ہوں" ـــــ سالار اوریزی نے کہا ـــــ "ہمارا اصل مقصد یہ ہے کہ حسن بن صباح کی ابلیسیت کو کچل اور مسل دیا جائے۔ میں وہ قلعہ اپنی ذات کے لئے سر نہیں کرنا چاہتا۔ تم اپنی تجویز پر عمل کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں"۔

○

حسن بن صباح عبدالملک عطاش کو تسلی دے کر اور اس کا حوصلہ مضبوط کر کے قلعہ الموت جا چکا تھا۔ عبدالملک نے خود بھی بہت کوشش کی تھی کہ اس کا حوصلہ مضبوط ہو جائے لیکن یہ کام کوئی آسان نہیں تھا۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی، اس کے بیٹے اور بھائی کی بیوی کے موت کے غم کو اپنی ذات میں جذب کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا، اور اس کوشش میں کامیاب بھی ہو رہا تھا لیکن اسے جو چیز کھائے جا رہی تھی وہ انتقام کا جذبہ تھا۔ یہ جذبہ آگ بن کے جلا رہا تھا۔ اسے حسن بن صباح پر غصہ بھی تھا کہ اس نے قاتل تو ہزارہا پیدا کر لئے تھے لیکن لڑنے والا کوئی ایک آدمی بھی تیار نہیں کیا تھا۔ شاہ در سے اس کے ساتھ جو لوگ گئے تھے ان میں مردوں کی تعداد چھ سات ہزار تھی۔ باقی ان کی عورتیں، بوڑھے اور بچے تھے۔ عبدالملک نے سوچا کہ ان ہی کو فوج کی صورت میں منظم کر لے۔

سب سے پہلے ضرورت ہتھیاروں کی تھی۔ شاہ در سے انہیں نہتہ کرکے نکالا گیا تھا۔ انہیں گھوڑے اور اونٹ بھی نہیں دیئے گئے تھے۔ وہ سب پیدل یہاں تک پہنچے تھے.... ایک روز اس نے ان تمام آدمیوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور انہیں بتایا کہ یہاں پہلا کام تو یہ ہے کہ از سرِنو آباد ہونا ہے لیکن اس سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ باقاعدہ لڑائی کی تیاری شروع کردی جائے تاکہ سلجوقیوں سے اس شکست کا انتقام لیا جائے۔

اُس نے دیکھا کہ ان لوگوں پر کچھ خوف و ہراس سا طاری تھا جیسے وہ لڑنے کے لئے تیار ہونے سے گھبرا رہے ہوں۔ اگر عبدالملک کوئی سالار ہوتا یا عام سا حاکم ہوتا تو لوگ شاید اس کا حکم ماننے سے انکار کردیتے لیکن عبدالملک ان کا پیرو مُرشد اور ان کے امام شیخ الجبل کا استاد تھا۔ وہ جانتے تھے کہ امام حسن بن صباح بھی اسے اپنا پیر استاد مانتا ہے۔ یہ ایسی وجہ تھی کہ کوئی بھی اس کے آگے بول نہیں سکتا تھا۔ کسی نے جرأت کرکے لوگوں کی نمائندگی یہ کہہ کر کی کہ ابھی تو ہمارے پاس ہتھیار بھی نہیں اور گھوڑے بھی نہیں۔

"سب کچھ آجائے گا" ـــــ عبدالملک نے گرج کر کہا ـــــ "ہتھیار اور گھوڑے اَلموُت سے آجائیں گے۔ میں آج ہی قاصد کو الموُت روانہ کردوں گا اور پیغام بھیجوں گا کہ ہمیں گھوڑے اور ہتھیار فوراً بھیجے جائیں۔ تم لوگ اب ایک فوج کی صورت میں منظم ہو کر لڑو گے"۔

اس نے جوشیلی اور اشتعال انگیز تقریر ہی کر ڈالی جس میں اس نے ان لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ اللہ کی نگاہ میں برتری انہیں حاصل ہے سلجوقیوں کو نہیں۔ اُس نے کہا کہ جنت کے حقدار تم ہو' سلجوقی نہیں لیکن جنت حاصل کرنے کے لئے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ اس طرح اس نے اپنے آدمیوں کو بنی نوع انسان سے برتر ثابت کیا اور سلجوقیوں کے خلاف وہ زہر اگلا کہ اس کے یہ آدمی لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ عبدالملک آخر استاد تھا اور استاد بھی ایسا جس نے حسن بن صباح کو تعلیم و تربیت دے کر امام اور شیخ الجبل بنا ڈالا تھا۔

اس سے اگلے ہی روز کا ذکر ہے' سورج سر پر آگیا تھا جب دو مرد اور دو عورتیں قلعہ ناظر و طبس میں داخل ہوئیں۔ یہ چاروں گھوڑوں پر سوار تھے اور پانچویں گھوڑے پر کچھ سامان لدا ہوا تھا۔ ایک گھوڑے پر مزّمل آفندی سوار تھا' دوسرے پر بن یونس' تیسرے پر شمونہ اور چوتھے گھوڑے پر شافعہ سوار تھی۔ انہوں نے تین دنوں کا سفر دو

دنوں میں طے کر لیا تھا۔ وہ جب قلعے میں داخل ہوئے تو لوگ ان کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ ہر کوئی ان سے یہی ایک سوال پوچھ رہا تھا کہ وہ کہاں سے آرہے ہیں۔

"لوگو! تیار ہو جاؤ" ـــــ مزّمل نے آواز میں گھبراہٹ کا تاثر پیدا کرکے کہا ـــــ "قلعہ وسم کوہ سے سلجوقیوں کی فوج آرہی ہے۔ یہ وہی فوج ہے جس نے قلعہ وسم کوہ فتح کیا تھا۔ اس فوج کو سلطان کا حکم ملا ہے کہ قلعہ ناظر و طبس میں جا کر کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑو.... پیر استاد عبدالملک بن عطاش کہاں ہیں؟.... ہم بڑی مشکل سے وہاں سے نکل کر آئے ہیں.... ہمیں پیر استاد تک پہنچا دو' ہم انہیں خبر کردیں"۔

لوگوں میں افراتفری بپا ہو گئی اور وہ اپنے اپنے گھروں کو دوڑ پڑے۔ اگر بات صرف لڑنے کی ہوتی تو وہ لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے مگر وہاں تو یہ عالم تھا کہ وہ نہتے تھے۔ اگر ان کے پاس ہتھیار ہوتے تو بھی ان کا خوف و ہراس بجا تھا۔ شاہ در میں ان پر جس طرح منجنیقوں کے پتھر اور آتشی تیر گرے تھے' اس کا خوف ابھی تک ان پر طاری تھا۔

مزّمل کا یہ چھوٹا سا قافلہ ابھی عبدالملک تک نہیں پہنچا تھا کہ عبدالملک کو پہلے ہی کسی نے اطلاع دے دی کہ باہر سے کوئی لوگ آئے ہیں اور انہوں نے لوگوں میں بھگدڑ بپا کردی ہے اور لوگ گھبراہٹ کی حالت میں بھاگے دوڑے پھر رہے ہیں اور بعض لوگ بھاگ جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ عبدالملک باہر نکل آیا تھا اور اپنی آنکھوں سے لوگوں کی خوفزدگی اور نفسا نفسی دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں مزّمل' بن یونس' شمونہ اور شافعہ اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور گھوڑوں سے اترے۔

"کون ہو تم؟" ـــــ عبدالملک نے پوچھا ـــــ "کہاں سے آئے ہو؟"

مزّمل اور بن یونس گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ کر عبدالملک کی طرف بڑھے اور جھک کر اُس کے گھٹنے چھوئے اور پھر اُس کے ہاتھوں کو پکڑ کر چوُما اور آنکھوں سے لگایا۔ عبدالملک نے غصیلی آواز میں پوچھا کہ وہ ہیں کون اور آئے کہاں سے ہیں اور انہوں نے لوگوں سے کیا کہہ دیا ہے کہ یہاں بھگدڑ مچ گئی ہے۔

"ہم آپ کے مرید ہیں یا پیرو مُرشد!" ـــــ مزّمل نے ادب و احترام سے کہا ـــــ "ہم امام حسن بن صباح پر جانیں قربان کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ میری بیوی ہے اور یہ لڑکی میری بہن ہے۔ یہ میرا بھائی ہے۔ اس کی بیوی اور دو بچے وسم کوہ میں ہی رہ گئے ہیں۔ سلجوقیوں نے وسم کوہ فتح کر لیا تو ہم کوشش کے باوجود وہاں سے نکل نہ سکے اور یہ

اتنا لمبا عرصہ وہیں رہے۔ ہم یہ ظاہر کر کے وہاں وقت گذارتے رہے کہ آپ کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں اور ہم اہلِ سُنّت والجماعت ہیں۔ وسم کوہ کا حاکم سپہ سالار اوریزی ہے۔ میں نے اُس کی ملازمت حاصل کر لی تھی اور میں نے اُس پر اپنا اعتماد جما لیا تھا"۔

"میں نے تم سے کچھ اور پوچھا؟" ـــــ عبدالملک نے بے صبر ہو کر کہا ـــــ "یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ تم وسم کوہ سے آئے ہو' یہ بتاؤ کہ ان لوگوں کو کیا کہہ دیا ہے کہ یہ بھاگے دوڑے پھر رہے ہیں؟"

"گستاخی معاف یا پیر استاد!" ـــــ مزمل نے جھک کر کہا ـــــ "یہ لوگ خوش قسمت ہیں کہ ہم نے بروقت اطلاع دے دی ہے کہ ان کی طرف کیا قیامت بڑھی چلی آ رہی ہے.... انہوں نے ہم سے پوچھا تو ہم نے انہیں بتایا کہ وسم کوہ سے فوج چل پڑی ہے اور اس فوج کو سلطان کا حکم ملا ہے کہ شاہ در سے عبدالملک بن عطاش اتنے ہزار لوگوں کے ساتھ ناظر و طبس کے قلعے میں چلا گیا ہے' اپنی فوج بھیجو اور ان سب کو قتل کر کے اس قلعے پر قبضہ کر لو.... ہم نے لوگوں کو بس یہ بات بتائی ہے"۔

عبدالملک انہیں اپنے گھر میں لے گیا۔ اجڑے تھے تو لوگ اجڑے تھے' عبدالملک کا رہن سہن یہاں بھی شاہانہ تھا۔ اُس نے جو مشروب مزمّل وغیرہ کو پیش کیے' وہ کوئی بادشاہ ہی اپنے ہاں رکھ سکتا تھا۔ گھر لے جا کر عبدالملک نے شمونہ اور شافعیہ کو اپنی عورتوں کے حوالے کر دیا اور مزمّل اور بن یونس کو اپنے پاس بٹھا لیا۔

"سلطان نے تو ہمیں امان دے دی تھی" ـــــ عبدالملک نے کہا ـــــ "ہم نے اسے جس طرح کہا اس نے اسی طرح کر دیا۔ ہم نے کہا کہ شاہ در سے جانے والے آدھے لوگ ناظر و طبس چلے جائیں گے اور آدھے قلعہ الموُت جائیں گے۔ ہم نے کہا کہ ہماری حفاظت کے لئے ایک ایک دستہ ساتھ بھیجا جائے۔ سلطان محمد نے یہ بھی قبول کر لیا اور دو دستے ساتھ کر دیئے لیکن اب اُس نے ہم پر فوج کشی کا حکم دے دیا ہے"۔

"صرف فوج کشی کا نہیں' قتل کا بھی حکم دیا ہے" ـــــ بن یونس نے کہا ـــــ "ہم دونوں نے سالار اوریزی کی ملازمت حاصل کر لی تھی۔ میرا بھائی مزمل تو اُس کا قابلِ اعتماد آدمی بن گیا تھا۔ اس کی موجودگی میں سلطان کا حکم آیا تھا کہ قلعہ ناظر و طبس میں فوج بھیج کر سب کو قتل کر دیا جائے اور عبدالملک کو بالکل نہ بخشا جائے"۔

"کیا یہ ہمارے ساتھ دھوکہ نہیں ہُوا؟" ـــــ عبدالملک نے کہا ـــــ "میں نے اس

سلجوقی سلطان پر اعتبار کیا تھا اور میں خوش تھا کہ اس نے کشادہ ظرفی اور فیاضی کا مظاہرہ کیا ہے کہ مجھے اور وہاں سے نکلنے والے ہر شخص کو اجازت دے دی تھی...."

"آپ اس کی یہ چال سمجھے نہیں یا پیر اُستاد!" ـــــ مزمل نے اُس کی بات کاٹ کر کہا ـــــ "اس نے آپ کے لوگوں کو دو حصوں میں کاٹ کر بکھیر دیا۔ یہ غلطی آپ کی ہے کہ آپ نے خود ہی اس کا کام آسان کر دیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ آدھے آدمی اَلمُوت چلے جائیں گے اور آدھے اس قلعے میں آ جائیں گے۔ اس نے آپ کی یہ شرطیں اس لئے مان لی تھیں کہ آپ قلعہ چھوڑ دیں اور وہ قلعے میں داخل ہو جائے"۔

"اب زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں" ـــــ بن یونس نے کہا ـــــ "فوج وسم کوہ سے چل پڑی ہے۔ اس وقت مسئلہ صرف یہ ہے کہ آپ کو اور آپ کے خاندان کے ہر فرد کو بچا لیا جائے"۔

"فوج کب تک یہاں پہنچے گی؟" ـــــ عبدالملک نے پُوچھا۔

"دو دنوں بعد!" ـــــ مزمّل نے کہا ـــــ "آپ یہاں سے نکلنے کی تیاری کریں۔ ہم آپ کے ساتھ اَلمُوت جائیں گے۔ یہاں پہلے جو لوگ آباد تھے' ان کے پاس گھوڑے بھی ہیں اور اونٹ بھی۔ ہم ان میں سے گھوڑے بھی لے لیں گے اور اونٹ بھی لیکن یہاں سے روانگی رات کے وقت ہو گی تاکہ لوگوں کو پتہ نہ چلے کہ آپ جا رہے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کے سامنے نکلے تو لوگ آپ کے خلاف ہو جائیں گے"۔

○

وہاں کے لوگوں میں افراتفری بپا رہی اور شام تک کچھ لوگ اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر قلعے سے نکل گئے۔ وہ قلعہ اَلمُوت کی طرف جا رہے تھے۔ عبدالملک نے مزمل' بن یونس' شمونہ اور شافعیہ کو اپنے گھر میں ہی رکھا۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ آدھی رات کے وقت نکلیں گے اور قلعہ اَلمُوت کا رخ کر لیں گے۔ عبدالملک مزمّل اور بن یونس کو اس لئے بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا کہ ان کے پاس تلواریں اور خنجر تھے۔ شمونہ اور شافعیہ بھی تلواروں سے مسلح تھیں اور ان کے پاس بھی خنجر تھے۔

عبدالملک کہتا تھا کہ اُسے اپنی جان کا کوئی غم نہیں۔ وہ اپنے خاندان کی عورتوں کو محفوظ کرنا چاہتا تھا اور دوسرا اس کا الموُت جانے کا مقصد یہ تھا کہ اس نے حسن بن صباح کو مجبور کرنا تھا کہ وہ فوج تیار کرنے اور سلجوقیوں کے ساتھ باقاعدہ جنگ لڑ کر انہیں ختم

کرے۔ شہر کے لوگوں سے دو اونٹ اور کچھ گھوڑے لے لئے گئے تھے۔ یہ سارا انتظام خفیہ رکھا گیا تھا۔ رات کو جب قلعے کے اندر خاموشی طاری ہو گئی اور لوگ گہری نیند سو گئے تو وہ اونٹ اور گھوڑے عبدالملک کے گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ اس کا خاندان تیار تھا اور جو سامان ساتھ لے جانا تھا وہ بھی تیار کر لیا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک قافلہ شہر سے نکلا۔ چونکہ اس شہر میں فوج تھی ہی نہیں اس لئے دروازوں پر کوئی پہرہ اور کوئی پابندی نہیں ہوتی تھی۔ اُس شام لوگوں نے خود ہی شہر کے دروازے بند کر لئے تھے۔ ایک دروازہ کھول لیا گیا اور یہ قافلہ نکل گیا۔

مزمّل اور بن یونس اس قافلے کے محافظ تھے۔ ناظرو طبس سے کوئی ایک میل دُور گئے ہوں گے کہ مزمل نے گھوڑے کے ساتھ بندھی ہوئی مشعل کو آگ لگائی۔ عبدالملک نے پوچھا کہ مشعل کی کیا ضرورت ہے' چاند اوپر آ رہا ہے۔ مزمّل نے کوئی جواب نہ دیا اور مشعل بلند کر کے دائیں بائیں تین بار ہلائی اور پھر مشعل بجھا دی۔

عبدالملک نے پوچھا کہ یہ اُس نے کیا کیا ہے۔ مزمّل نے اُسے ویسے ہی باتوں میں ٹال دیا.... ذرا ہی دیر بعد دُور سے گھوڑوں کے ہلکے ہلکے ٹاپ سنائی دینے لگے جو تیزی سے بڑھتے آ رہے تھے۔ عبدالملک نے چونک کر کہا کہ یہ گھوڑ سوار نہ جانے کون ہیں۔ مزمل نے کہا کہ کوئی ایسا خطرہ نہیں' ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی اپنے ہی آدمی ہوں اور وہ مشعل کی روشنی دیکھ کر اِدھر آ رہے ہوں۔

وہ سوار جو آ رہے تھے' جنگل میں کہیں چھپے ہوئے تھے۔ وہ مزمّل اور بن یونس کے ساتھ وسم کوہ سے آئے تھے اور ناظرو طبس سے کچھ دور ان سے الگ ہو گئے تھے۔ اُن کی تعداد چالیس پچاس تھی۔ انہیں کچھ دُور جا کر چھپے رہنا تھا اور مزمل کے اسی اشارے کا انتظار کرنا تھا۔ طے یہی کیا گیا تھا کہ مزمل اور بن یونس عبدالملک کو آدھی رات کے وقت قلعے سے نکالیں گے۔ ان کی یہ سکیم کامیاب ہو گئی تھی اور مزمل نے انہیں مشعل کا اشارہ دے دیا تھا۔

گھوڑ سواروں نے قریب آ کر اس قافلے کو گھیرے میں لے لیا اور مزمّل نے عبدالملک سے کہا کہ وہ گھوڑے سے اُتر آئے۔ وہ گھوڑے سے اُترا ہی تھا کہ ایک گھوڑ سوار نے تلوار نکالی اور عبدالملک کا سر تن سے جدا کر دیا۔

اُس کے خاندان کی جو عورتیں تھیں' انہوں نے چیخ و پکار شروع کر دی۔ مزمّل نے

عورتوں سے کہا کہ ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا جائے گا اور انہیں واپس قلعے میں بھیج دیا جائے گا۔ اس خاندان کے دو آدمی بھی ساتھ تھے۔ انہیں بھی قتل کر دیا گیا اور پھر عبدالملک کی لاش اور اس کا سر اٹھا کر یہ قافلہ واپس ناظرو طبس چلا گیا۔

ایک گھوڑ سوار نے عبدالملک کا سر اپنی برچھی کی اَنی سے اُڑس لیا اور اس کے خاندان کی عورتوں کو قلعے میں داخل کر کے سب وسم کوہ کی طرف چل پڑے۔ مزمّل کا خیال تھا کہ عبدالملک کا سر قلعہ اَلمُوت کے دروازے پر رکھ آتے ہیں لیکن سواروں کا کمانڈر نہ مانا اور اس نے کہا کہ اس کا فیصلہ سالار اوریزی کرے گا۔

تیسری صبح یہ سوار وسم کوہ پہنچ گئے۔ وہ برچھی جس میں عبدالملک کا سر اُڑسا ہُوا تھا' سالار اوریزی کو پیش کی گئی۔ سالار اوریزی نے کہا کہ یہ سر کپڑوں میں لپیٹ کر سلطان محمد کے پاس بھیج دیا جائے۔ شاید یہ سر بھی وہ بغداد بھیجنا چاہتا ہو.... اس کے بعد تاریخ میں اس کا سراغ نہیں ملتا کہ اس کا سر بغداد میں بھیجا گیا تھا یا نہیں۔ یہ صاف شہادت ملتی ہے کہ سالار اوریزی نے سلطان کے حکم کے بغیر ہی اپنی آدھی فوج قلعہ ناظرو طبس اس حکم کے ساتھ بھیج دی کہ اس قلعے پر قبضہ کر لیا جائے۔ فوج کو یہ حکم بھی دیا گیا کسی کے ساتھ ذرا سی بھی زیادتی نہ کی جائے بلکہ لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور انہیں یقین دلایا جائے کہ ان کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی اور کسی عورت پر دست درازی نہیں ہو گی۔ فوج اس حکم کو بڑی اچھی طرح سمجھتی تھی۔ وہ زمانہ چونکہ قتل و غارت کا زمانہ تھا، باطنی مسلمانوں کو قتل کرتے تھے اور مسلمانوں کی طرف سے باطنی جوابی قتل ہوتے تھے اور فوج تک کو یہ حکم دے دیا جاتا تھا کہ جہاں کہیں کوئی باطنی نظر آئے' اُسے قتل کر دیا جائے۔ ان حالات میں سالار اوریزی نے اپنی فوج کو خاص طور پر کہا کہ کسی پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔

فوج چلی گئی اور پانچویں چھٹے روز ناظرو طبس سے قاصد آیا اور اُس نے بتایا کہ وہاں امن و امان ہے اور جو لوگ بھاگ رہے تھے انہیں روک لیا گیا ہے۔ اس پیغام کے ملنے کے بعد سالار اوریزی ناظرو طبس چلا گیا۔ مزمّل اور بن یونس بھی اُس کے ساتھ گئے۔ شمونہ اور شافعیہ وسم کوہ میں ہی رہیں۔

سالار اوریزی نے اس قلعہ بند آبادی کے تمام لوگوں کو اکٹھا کر کے ویسا ہی لیکچر دیا جیسا سنجر نے شاہ در میں دیا تھا۔ اُس نے خاص طور پر زور دے کر کہا کہ اللہ کے راستے پر

واپس آ جاؤ۔ تمہیں جنہوں نے پیرو مُرشد اور امام بن کر گمراہ کیا تھا' ان کا انجام دیکھ لو۔ تم نے اپنے شیخ الجبل اور امام حسن بن صباح کے استاد کی لاش دیکھ لی ہو گی۔ اُس کی لاش کے ساتھ سر نہیں تھا۔ اگر یہ اللہ کا اتنا ہی برگزیدہ شخص تھا تو وہ اس انجام کو کیوں پہنچا؟..

.. مختصر یہ کہ اوریزی نے ان لوگوں کو باطنی فرقے سے نکالنے کے لئے بہت کچھ کہا۔ وہ لوگ پہلے ہی خوفزدہ تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ سلجوقی فوج آئی اور اس نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ یہ موقع ہوتا ہے جب فاتح فوج شہریوں پر ٹوٹ پڑتی ہے اور پہلا ہلّہ وہاں کی عورتوں پر بولتی ہے لیکن اس فوج نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ اس کی بجائے اس فوج کا کماندار شہر سے بھاگنے والوں کو روکتا تھا اور روک روک کر واپس ان کو گھروں میں بھیجتا تھا اور پھر لوگوں کو یقین دلاتا تھا کہ وہ ان کے محافظ بن کر آئے ہیں' لٹیرے بن کر نہیں۔

جب سالار اوریزی ان لوگوں کے سامنے گیا تو لوگ پہلے ہی مطمئن ہو چکے تھے۔ اوریزی کی ایک ایک بات ان کے دلوں میں اُترتی جا رہی تھی۔ وہ تو اب عقیدوں' فرقوں اور مذہب کی بات ہی نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے شاہ در میں بہت بُرا وقت دیکھا تھا۔ اب تو وہ اپنے اہل و عیال کی سلامتی اور عزت و آبرو چاہتے تھے۔ وہ انہیں ملتی نظر آ گئی تو وہ سالار اوریزی کی ہر آواز پر لبیک کہنے لگے۔

سالار اوریزی نے اپنا ایک خاص ایلچی سلطان محمد کی طرف یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اس نے اس طرح قلعہ ناظرو طبس اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ سالار اوریزی کو توقع یہ تھی کہ سلطان ناراض ہو گا کہ اس کے حکم کے بغیر ایسا کیوں کیا گیا لیکن جب ایلچی واپس آیا تو پتہ چلا کہ سلطان اس اقدام پر بہت ہی خوش ہُوا ہے اور سالار اوریزی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

○

قلعہ ناظرو طبس کے لوگوں نے سالار اوریزی کی اطاعت قبول کر لی تھی لیکن ان میں کچھ کٹر باطنی بھی تھے جن کے دلوں پر ذرا سا بھی اثر نہ ہُوا۔ وہ حسن بن صباح کے پیر و مُرشد عبدالملک بن عطاش کا قتل برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی اَلَمُوت جا پہنچا اور حسن بن صباح کو جا اطلاع دی کہ پیر استاد عبدالملک بن عطاش قتل کر دیئے گئے ہیں۔

حسن بن صباح پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ اُس کے دل میں اپنے پیر استاد کا احترام تھا یا نہیں' یہ الگ بات ہے' اُس کے لئے اصل دھچکہ یہ تھا کہ سلجوقیوں نے بھی اس کی طرح اہم شخصیتوں کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اُس آدمی نے جو حسن بن صباح کو اطلاع دینے گیا تھا' تفصیل سے بتایا کہ کس طرح دو آدمی اور دو عورتیں وہاں آئی تھیں اور انہوں نے کیا افواہ پھیلائی اور وہ کس طرح عبدالملک کو لے گئے تھے اور اگلی صبح عبدالملک کی لاش شہر کے ایک دروازے میں پڑی ملی تھی۔

حسن بن صباح یکلخت چونکا اور واہی تباہی بکنے لگا۔ اُس کے مشیر اور دیگر درباری اٹھ کھڑے ہوئے اور تھر تھر کانپنے لگے۔ انہوں نے حسن بن صباح کو اتنے غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر صورتِ حال میں خندہ پیشانی سے بات کیا کرتا تھا اور تبسم اُس کے ہونٹوں پر رہتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جن ہونٹوں پر مسکراہٹ رہتی تھی' ان ہونٹوں سے جھاگ پھُوٹنے لگی اور وہ جب غصے سے بولتا تھا تو یہ جھاگ اُڑ اُڑ کر سننے والوں پر پڑتی تھی۔ وہ اپنے پیر استاد کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ یہ ممکن نہ تھا اس لئے اُس کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ اپنے فدائیوں کو سالار اوریزی یا سلطان محمد اور سنجر کو قتل کرنے کے لئے کہہ دیتا لیکن اس کے لئے وقت اور موقع درکار تھا۔

غصے سے وہ پاگل ہُوا ہی جا رہا تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ عبدالملک کی دونوں بیویاں اور دو بیٹیاں اور ان بیٹیوں کے ایک ایک دو دو بچے آئے ہیں۔ حسن بن صباح باہر کو دوڑ پڑا۔ اپنے پیر استاد کے ان پسماندگان کا استقبال وہ آگے جا کر کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے استقبال یوں کیا کہ عبدالملک کی بوڑھی بیوی کے قدموں میں گر پڑا اور اس کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ اس کی دوسری بیوی ابھی جوانی کی عمر میں تھی۔ حسن بن صباح انہیں اپنے کمرے میں لے آیا۔

"کیا سلجوقیوں نے آپ کو چھوڑ دیا ہے؟" —— حسن بن صباح نے پوچھا —— "یا آپ خود کسی طریقے سے وہاں سے نکل آئی ہیں؟"

"سلجوقی سالار اوریزی آیا تھا" —— بڑی بیوی نے جواب دیا —— "اُس نے ہمیں بڑے اچھے لہجے میں کہا کہ یہاں رہنا چاہتی ہو تو رہ سکتی ہو۔ تمہاری حفاظت کی ذمہ داری ہم پر ہو گی' اور اگر اَلَمُوت جانا چاہتی ہو تو اپنے محافظوں کے ساتھ اَلَمُوت تک پہنچا دوں گا .... میں نے کہا ہمیں اَلَمُوت پہنچا دیا جائے۔ مجھے زیادہ ڈر اس جوان بیٹی کا تھا لیکن یوں لگتا

تھا جیسے یہ جوان بیٹی کسی کو نظر آئی ہی نہیں ورنہ ایسی جوان لڑکی کو کون معاف کرتا ہے لیکن سالار اوریزی نے جیسا کہا تھا ویسا کر کے دکھا دیا۔ ہمیں محافظ دستہ دے کر رخصت کیا اور وہ دستہ ہمیں قلعہ اَلَموُت کے باہر چھوڑ کر چلا گیا ہے"۔

حسن بن صباح نے حکم دیا کہ اسے ایک خاص قسم کے فدائی کی ضرورت ہے۔ اُس نے بتایا کہ سالار اوریزی کو قتل کرنا ہے۔ اس کے آدمی اچھی طرح جانتے تھے کہ کون سے آدمی کو قتل کرنے کے لئے کس قسم کے فدائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ حسن بن صباح کا مطلب سمجھ گئے پھر بھی حسن بن صباح نے انہیں مزید سمجھا دیا کہ سالار اوریزی بڑا ہی ہوشیار اور دانشمند آدمی ہے اور اس کی نظریں گہرائی تک چلی جاتی ہیں اس لئے اس کے مطابق کوئی فدائی بھیجا جائے اور اس کا جواں سال ہونا ضروری ہے۔

تاریخوں میں لکھا ہے کہ حسن بن صباح کو ہر بڑی شخصیت کی نفسیات تک سے بھی واقفیت تھی۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اُس کا جاسوسی کا نظام بڑا ہی کارگر تھا۔ اس میں عام قسم کے یا اوسط درجہ کے آدمی نہیں تھے بلکہ اونچی حیثیت کے لوگ بھی تھے اور خاص طور پر عقلمند آدمی بھی تھے۔

داستان گو پہلے تفصیل سے سنا چکا ہے کہ حسن بن صباح کی جنّت میں فدائی پرورش پاتے تھے۔ اُن کے دماغوں پر حشیش اور انتہائی خوبصورت لڑکیوں کا قبضہ ہوتا تھا۔ ان کی اپنی تو کوئی سوچ ہوتی ہی نہیں تھی۔ حسن بن صباح کی ایک جنّت اور بھی تھی۔ اس کے متعلق تاریخوں میں کم ہی لکھا گیا ہے لیکن دو وقائع نگاروں نے اس کی بھی تفصیلات لکھی ہیں جو مختصراً یوں ہیں کہ کچھ نوجوانوں کو ایک خاص قسم کی بوٹی کا نشہ پلایا جاتا تھا اور انہیں ایسی جگہ رکھا جاتا تھا جہاں غالباً اسی بوٹی کا ہلکا ہلکا دُھواں پھیلا رہتا تھا۔ اس نشے کا اور اس دھوئیں کا اثر یہ ہوتا تھا کہ وہ آدمی اگر کنکریاں کھا رہا ہو تو یوں محسوس کرتا جیسے مرغن کھانے کھا رہا ہے۔ انہیں کھانے تو مرغن ہی دیئے جاتے تھے لیکن ان کے تصورات میں ایک جنّت آباد کر دی جاتی تھی جس میں حوُریں بھی ہوتی تھیں اور شراب بھی ہوتی تھی لیکن وہ حقیقت میں نہ حوریں ہوتی تھیں نہ شراب، وہ آدمی اس تصوّر کو حقیقت سمجھتے تھے۔ تاریخ سے ایسے اشارے ملتے ہیں کہ اس خیالی جنّت میں بہت ہی تھوڑے نوجوانوں کو رکھا جاتا تھا کیونکہ باہر بھیجے جانے کی صورت میں ان کا نشہ اُتر بھی سکتا تھا۔ ان میں سے اگر کسی کو الَموُت سے باہر بھیجا جاتا تو ساتھ حشیش کا نشہ دیا جاتا تھا۔

حشیش ایسی چیز تھی جو دماغ کو حقیقی حالت میں آنے ہی نہیں دیتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد چھبیس ستائیس سال عمر کا ایک خوبرو آدمی حسن بن صباح کے سامنے لا کر کھڑا کیا گیا۔ اس آدمی نے حسن بن صباح کے آگے سجدہ کیا۔ حسن بن صباح نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ سجدے سے اٹھا۔

"ہمیشہ کے لئے جنّت میں رہنا چاہتے ہو؟" — حسن بن صباح نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں یا امام!" — اس آدمی نے جواب دیا — "آپ کا حکم ہو گا تو ہمیشہ جنّت میں رہنا چاہوں گا اور آپ جہنم میں پھینکیں گے تو وہاں بھی میری زبان پر آپ ہی کا نام ہو گا"۔

"نہیں، جہنم میں نہیں پھینکوں گا" — حسن بن صباح نے کہا — "میں تمہیں اُس جنّت میں بھیج رہا ہوں جس میں تم ہمیشہ رہو گے اور ہمیشہ جوان رہو گے"۔

اگر ہم آج کل اور جدید دَور کی زبان میں بات کریں تو یہی کہیں گے کہ اس جوان آدمی اور اس جیسے دوسرے آدمیوں کی برین واشنگ ایسی خوبی سے کر دی گئی تھی کہ وہ حسن بن صباح کے اشارے پر جہنم میں جانے کے لئے بھی تیار ہو جاتے تھے۔ یورپ کے دو تین نفسیات دانوں نے حسن بن صباح کی جنّت کا نفسیاتی تجزیہ بھی کیا ہے جو یہاں پیش نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ بڑا ہی خشک اور سائنسی موضوع ہے۔ حسن بن صباح کا اپنا ایک طریقہ اور انداز تھا جو وہ ایسے نوجوانوں پر استعمال کرتا تھا۔ اُس نے اس جواں سال آدمی کو بتایا کہ وہ دسم کوہ جائے گا اور وہاں اسے ایک سپہ سالار دکھایا جائے گا جس کا نام اوریزی ہے۔ اسے قتل کرنا ہے اور خود بھی قتل ہو جانا ہے۔ اگر وہ اس شخص کو قتل کر کے زندہ نکل سکتا ہے تو یہ اُس کی اپنی قسمت ہے۔ وہ واپس یہاں آئے گا تو جنّت میں رہے گا اور اگر اپنے آپ کو مار لے گا یا کسی کے ہاتھوں قتل ہو جائے گا تو اس سے زیادہ خوبصورت جنّت میں جائے گا۔

حسن بن صباح کے فدائی کوئی اور دلیل تو سمجھتے ہی نہیں تھے۔ ان کے دماغوں پر حشیش اور عورت اور لذّت پرستی سوار ہوتی تھی۔ جان لینے اور جان دینے کو تو وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے..... اس جواں سال آدمی کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا کہ وہ یہ کام کس طرح کرے گا اور وہ اکیلا نہیں ہو گا۔ وہاں دو آدمی اسے ملیں گے جو اسے اپنی پناہ میں

رکھیں گے اور اوریزی کے قتل میں اس کی راہنمائی اور مدد کریں گے۔

حسن بن صباح نے ایسے انداز سے بات کی تھی جیسے اُس نے اس جواں سال شخص پر بہت بڑی نوازش کی ہو کہ اسے اپنے حکم کی تعمیل کا موقع دیا ہو۔

○

وسم کوہ ایک قلعہ بند شہر تھا جس کے متعلق پہلے تفصیل سے سنایا جا چکا ہے کہ یہ کس طرح اور کتنی مدت میں فتح کیا گیا تھا۔ اب اس کے اندر کے حالات بالکل نارمل تھے۔ عام خیال یہی تھا کہ اس قصبے میں اب کوئی باطنی نہیں رہا لیکن یہ سوچنے والے حقیقت سے بے خبر تھے۔ وہاں چند ایک باطنی موجود تھے جو صرف باطنی ہی نہیں تھے بلکہ حسن بن صباح کے جاسوس اور تخریب کار بھی تھے۔ وہ اس معاشرے میں اُس طرح گھل مل گئے تھے کہ ان پر ذرا سا بھی شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ وسم کوہ کی خبریں الموت پہنچاتے رہتے تھے۔ ابھی تک انہوں نے کوئی تخریبی کارروائی نہیں کی تھی۔ شاید انہیں ایسا کوئی مشن دیا ہی نہیں گیا تھا۔ ان کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں تھی، پانچ سات ہی ہوں گے۔

وسم کوہ میں دو ادھیڑ عمر آدمی رہتے تھے۔ ان کے گھر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ دونوں بیوی بچوں والے تھے۔ ایک بڑھئی کا کام کرتا تھا اور دوسرا سبزیاں کاشت کر کے لوگوں کو بیچتا تھا۔ دونوں نے معاشرے میں اپنی باعزت جگہ بنا رکھی تھی اور لوگ انہیں عزت و احترام سے دیکھتے تھے۔ وہ بھی سب میں گھل مل کر رہتے تھے۔ وہ جو بڑھئی کا کام کرتا تھا، اس کے گھر ایک جواں سال آدمی آیا جو اس کا مہمان سمجھا گیا لیکن وہ وہیں رہنے لگا۔ بڑھئی نے اور اس سبزی فروش نے لوگوں کو بتایا کہ یہ بڑھئی کا بھتیجا ہے۔ رے میں رہتا تھا اور اس کا باپ مر گیا ہے۔ اب یہ اپنے بڑھئی چچا کے ساتھ رہنے کے لئے یہاں آیا ہے اور اپنے چچا کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اس کا نام عبید عربی بتایا گیا۔

عبید عربی خاموش طبع انسان تھا۔ لوگوں سے کم ہی ملتا اور بولتا تو بہت ہی کم تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی سی چھائی رہتی تھی۔ کوئی اسے سلام کرتا، ملتا تو اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ جاتی تھی۔ پھر فوراً ہی مسکراہٹ غائب ہو جاتی اور چہرے پر اداسی عود کر آتی تھی۔ اُس کے انداز سے یوں لگتا تھا کہ وہ اس کوشش میں ہے کہ کسی کی طرف نہ دیکھے اور کوئی اس کے ساتھ سلام دعا نہ لے.... یہ وہی خوبرو جوان تھا جسے حسن بن

صباح نے ذاتی طور پر وسم کوہ سالار اوریزی کے قتل کے لئے بھیجا تھا۔

وہ اس بڑھئی کا بھتیجا تھا یا نہیں، اس کا باپ مر گیا تھا یا نہیں، بہرحال یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ بڑھئی اور سبزیاں اُگانے اور بیچنے والا اس کا پڑوسی باطنی تھے۔ وہ صرف باطنی نہیں تھے بلکہ تجربہ کار جاسوس اور تخریب کار تھے۔ وسم کوہ سے قلعہ الموت تک خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ ان دونوں نے عبید عربی کو اپنی پناہ میں رکھا اور اس جواں سال اور خوبرو آدمی نے ان دونوں کی ہدایات اور رہنمائی سے سالار اوریزی کو قتل کرنا تھا۔

وسم کوہ میں ایک وسیع و عریض میدان تھا جسے گھوڑ دوڑ کا میدان کہا کرتے تھے۔ فوجی وہاں لڑائی کی مشق وغیرہ کیا کرتے تھے اور سوار گھوڑے دوڑاتے تھے۔ سالار اوریزی ہر روز کچھ دیر کے لئے وہاں جاتا اور گھوڑے پر سوار اس میدان میں گھوم پھر کر فوجیوں کو ٹریننگ کرتے دیکھا کرتا تھا اور پھر واپس آ جاتا تھا۔ ایک روز عبید عربی ان لوگوں میں کھڑا تھا جو فوج کا یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ سالار اوریزی ان لوگوں کے قریب سے گزرا تو عبید عربی اُس کی طرف چل پڑا۔ ایک فوجی نے دوڑ کر اُسے وہیں روک لیا اور پوچھا کہ وہ آگے کیوں آیا ہے۔

"میں فوج میں بھرتی ہونا چاہتا ہوں" —— عبید عربی نے کہا —— "میں اسی لئے سپہ سالار کے سامنے جانا چاہتا ہوں"۔

"نہیں بھائی!" —— فوجی نے کہا —— "میں تمہیں وہ جگہ دکھا دوں گا جہاں فوج میں آدمی بھرتی کئے جاتے ہیں۔ تم وہاں چلے جانا اور تمہیں بھرتی کر لیا جائے گا"۔

"میں صرف بھرتی کے لئے سپہ سالار سے نہیں ملنا چاہتا" —— عبید عربی نے کہا —— "یہ سپہ سالار مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میں اس کا عقیدت مند ہوں۔ یہ بہادر سالار ہے اور پکا مسلمان ہے۔ میں اس کے ساتھ ہاتھ ملانا چاہتا ہوں اور اس کے ہاتھ چومنا بھی چاہتا ہوں"۔

"نہیں میرے بھائی!" —— فوجی نے کہا —— "بڑا سخت حکم ہے کہ کوئی باہر کا آدمی سپہ سالار کے قریب نہ جائے۔ تمہیں بھی سپہ سالار سے ملنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی"۔

"وہ کیوں؟" —— عبید عربی نے پوچھا۔

"یہ تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے" —— فوجی نے کہا —— "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ

حسن بن صباح کے فدائی یہاں کتنے ہی حاکموں کو قتل کر چکے ہیں۔ ان کا طریقہ قتل یہی ہے کہ عقیدت مند بن کر یا فریادی بن کر کسی حاکم کے قریب روتے دھوتے چلے جاتے ہیں اور خنجر نکال کر اُس حاکم کو قتل کر دیتے ہیں پھر خود کشی کر لیتے ہیں"۔

دراصل عبید عربی یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سالار اوریزی کے قریب جایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اسے پتہ چل گیا کہ وہ یا کوئی اور اس سالار کے قریب نہیں جا سکتا۔ اسے اب کوئی اور طریقہ سوچنا تھا۔

○

سورج غروب ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ شافعیہ قلعہ وسم کوہ کی دیوار پر اکیلی ہی ٹہل رہی تھی۔ وہ تو اس دنیا میں رہ ہی اکیلی گئی تھی۔ اسے ماں باپ یاد آ رہے تھے اور پھر اسے اپنا چچا ابو جندل یاد آنے لگا۔ اس چچا کے مارے جانے کا اسے کوئی افسوس نہیں تھا لیکن اس کے دل پر بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پہلے سنایا جا چکا ہے کہ وہ اپنے چچا ابو جندل کے ساتھ دُور دراز کے ایک پہاڑی علاقے میں خزانے کی تلاش میں گئی تھی۔ شافعیہ کو کسی خزانے کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں تھی لیکن ابو جندل شافعیہ اور اس کی بہن کو بھی ساتھ لے گیا تھا کہ پیچھے ان کی دیکھ بھال اور حفاظت کرنے والا کوئی نہ تھا۔

ابو جندل جس طرح خزانے والے غار میں مارا گیا تھا اور جس طرح شافعیہ وہاں سے نکلی اور جن مصائب میں اُلجھتی اور نکلتی واپس وسم کوہ پہنچی تھی، وہ داستان گو پہلے ہی تفصیل سے سنا چکا ہے۔

شافعیہ قلعے کی دیوار پر چلتے چلتے رک گئی اور اُس جنگل کی طرف دیکھنے لگی جس میں سے گزر کر وہ واپس آئی تھی۔ اس کے دل پر ہَول سا طاری ہونے لگا۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرنے لگی کہ وہ یقینی موت کے پیٹ میں سے نکل آئی تھی۔ وسم کوہ میں اس کا اپنا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں رہا تھا لیکن وہ یہیں واپس آ گئی۔

وہ خوش قسمت تھی کہ اسے مزمّل اور شمونہ کی پناہ مل گئی تھی۔ ان دونوں نے اسے وہی پیار دیا جو اس کے ماں باپ اور پھر اس کا چچا ابو جندل اپنے ساتھ ہی لے کر اس دنیا سے اٹھ گئے تھے۔ پھر وہ اللہ کا شکر اس لئے بھی ادا کرنے لگی کہ ابو جندل نہ صرف باطنی تھا بلکہ حسن بن صباح کا جاسوس اور تخریب کار تھا لیکن شافعیہ اس کے راستے سے ہٹ کر اللہ کی راہ پر آ گئی۔ اس راہ پر مزمّل اور شمونہ نے اور سالار اوریزی نے بھی اس

کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

سورج اُفق تک پہنچ گیا تھا اور شفق بڑی ہی دلکش ہوتی جا رہی تھی۔ شافعیہ اس شفق کے رنگ دیکھنے لگی.... اسے اپنے پیچھے قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ سنائی دی۔ یہ چاپ بتا رہی تھی کہ کوئی خراماں خراماں چلا آ رہا ہے۔ شافعیہ نے پیچھے دیکھا۔ ایک خوبرو جوان آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا۔

شافعیہ نے اُسے دیکھا اور پھر شفق کی طرف نظریں پھیر لیں لیکن اچانک اُس نے پھر پیچھے دیکھا۔ اُسے اس جواں سال آدمی کا چہرہ کچھ کچھ مانوس سا اور کچھ شناسا سا لگا۔ اُس نے اس چہرے کو اور غور سے دیکھا اور ذہن پر زور دے کر یاد کرنے لگی کہ یہ چہرہ اسے کہاں نظر آیا تھا۔ اسے اتنا یاد آیا کہ یہ چند دنوں، چند مہینوں یا چند سالوں پہلے کی بات نہیں بلکہ بڑی ہی پرانی بات ہے کہ یہ چہرہ یا اس سے ملتا جلتا چہرہ دیکھا تھا۔

اس نے اس شخص سے نظریں ہٹالیں اور وہ جواں سال شخص اسی رفتار سے چلتا آیا اور شافعیہ کے قریب پہنچ گیا۔ شافعیہ نے ایک بار پھر منہ اُس کی طرف کر کے دیکھا۔ وہ آدمی بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ اس آدمی کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ چونک اٹھا ہے اور وہ شافعیہ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے اور ان کے درمیان بمشکل ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ وہ جوان آدمی شافعیہ کی ہی عمر کا تھا۔ اُس وقت شافعیہ کی عمر پچیس چھبیس سال ہو گئی تھی۔

"کیا تم مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہو؟" ___ شافعیہ نے بلا جھجک پوچھا اور جواب سنے بغیر کہا ___ "کوشش کرو.... ضرور کوشش کرو.... مجھے بھی کچھ ایسے لگ رہا ہے کہ ہم پہلے بھی کبھی ملے ہیں۔ اگر ملے نہیں تو ایک دوسرے کو دیکھا ضرور ہے.... اور کچھ ایسے بھی لگتا ہے جیسے ہم نے صرف ایک دوسرے کو دیکھا ہی نہیں بلکہ کسی جگہ ہم اکٹھے رہے ہیں"۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے بُرا نہیں جانا" ___ اس شخص نے کہا ___ "جو تم محسوس کر رہی ہو وہ میں بھی محسوس کر رہا ہوں"۔

"تم ناصر تو نہیں ہو؟" ___ شافعیہ نے پوچھا ___ "خدا کی قسم، تم ناصر ہو.... اب یاد آیا.... میری یادیں مجھے دھوکہ نہیں دے سکتیں۔ تم میرے بچپن کے ساتھی ہو۔ مجھے وہ کشادہ گلی یاد آ گئی ہے جہاں ہم کھیلا کرتے تھے اور تم مجھ سے اور میں صرف

تم سے کھیلا کرتی تھی.... کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"تم غلط نہیں کہہ رہیں" ـــ اس شخص نے کہا ـــ "تمہیں میرا نام یاد نہیں رہا۔ شاید بچپن میں میرا نام ناصر ہی ہو گا لیکن بعد میں میرا نام عبید عربی ہو گیا تھا..... ہاں، تم میرے بچپن کی ساتھی ہو۔ اس کے بعد تم وہاں سے چلی گئی تھیں، از پھر شاید تمہیں ایک دو مرتبہ دیکھا ہو اور اس کے بعد میں کہاں کہاں پھرا اور مجھ پر کیا گزری، یہ لمبی کہانی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے بہت ہی خوشی ہوئی ہے"۔

"کیا تم نے شادی کر لی ہے؟" ـــ شافیعہ نے پوچھا۔

"نہیں شافیعہ!" ـــ عبید عربی نے کہا ـــ "لڑکیاں تو بہت ملیں لیکن پیار والی کوئی نہ ملی۔ میں تمہیں دل کی بات بتاتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ مجھے جسم نہیں چاہئے، وہ محبت چاہئے جو روح کے اندر سے پھوٹا کرتی ہے اور روح کے غنچوں کو بھی کھلا دیتی ہے"۔

اس خوبرو جواں سال آدمی نے شافیعہ کی روح کے مرجھائے ہوئے غنچے کو تر و تازہ کر کے کھلا دیا۔ اُس کا ذہن ایک ہی اُڑان میں ماضی کے اُس دور میں پہنچ گیا جب وہ عبید عربی کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ اسے گئی گزری باتیں یاد آنے لگیں۔ ان کا ساتھ بچپن تک ہی نہیں بلکہ بچپن سے نکل کر لڑکپن تک پہنچ گیا تھا۔ شافیعہ کے ماں باپ ایک دوسرے کے بعد اسی عمر میں مر گئے تھے اور اسے اور اس کی چھوٹی بہن کو ان کے چچا ابو جندل نے سنبھال لیا اور بڑے پیار سے پالا پوسا تھا۔ جب ماں مر گئی اور دو چار مہینوں بعد اس کا باپ بھی مر گیا تو وہ عبید عربی کے ساتھ پہلے سے زیادہ کھیلنے لگی تھی اور اب وہ کھیلتی کم تھی اور عبید کو اپنے پاس بٹھا کر باتیں زیادہ کرتی تھی۔ عبید اس کچی عمر میں بھی شافیعہ کو تسلیاں اور دلاسے دیا کرتا تھا۔

"نہیں.... نہیں!" ـــ شافیعہ نے عبید عربی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ـــ "تمہارا نام ناصر تھا، عبید عربی نہیں.... میں تمہیں ناصر ہی کہوں گی.... میرے دل میں وہ ناصر زندہ ہو گیا ہے"۔

شافیعہ کے جذبات میں جو ہلچل بپا ہو گئی تھی ویسی ہی عبید عربی کے جذبات میں پیدا ہوئی۔ اُسے یاد آنے لگا کہ اس شافیعہ کے ساتھ اسے کتنا پیار تھا۔ اس کے بغیر وہ خوش رہتا ہی نہیں تھا۔ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ تو کھیلتا ہی نہیں تھا۔ اُسے وہ وقت یاد آنے لگا جب ماں باپ کی موت کے بعد شافیعہ اُس کے پاس بیٹھ کر رویا کرتی اور انہیں یاد کیا کرتی

تھی تو عبید کس پیار سے اسے بہلایا کرتا تھا۔

"شافیعہ!" ـــ عبید عربی نے کہا ـــ "تم اُس عمر میں خوبصورت تو تھیں لیکن اتنی نہیں جتنی آج ہو"۔

عبید عربی نے یہ بات کچھ ایسے جذباتی لہجے میں اور خوشگوار انداز میں کی تھی کہ شافیعہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس بے ساختہ ہنسی نے اُس کی ذات سے وہ سارا غبار اُڑا دیا جو اسے کچھ دیر پہلے پریشان کئے ہوئے تھا وہ محسوس کیا کرتی تھی جیسے اس کی ذات سے اور اس کے اندر سے دھواں اٹھتا رہتا ہے جس سے اس کا دم گھٹ جاتا ہے۔ عبید عربی کی شگفتگی نے اُس کی یہ ساری گھٹن ختم کر دی۔

سورج غروب ہو گیا تھا اور قلعے میں کئی جگہوں پر مشعلیں جل اٹھی تھیں۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ شافیعہ کو یہ خیال آیا ہی نہیں کہ شمونہ اور مزمل اس کے لئے پریشان ہوں گے۔

"تمہاری شادی تو ہو چکی ہو گی!" ـــ عبید عربی نے پوچھا۔

"نہیں!" ـــ شافیعہ نے جواب دیا ـــ "شادی کی بات سامنے آتی ہے تو یوں لگتا ہے اپنے آپ کو کسی کے ہاتھ بیچ رہی ہوں۔ شاید گم گشتہ پیار کی تلاش میں ہوں جو ملنا محال نظر آتا ہے"۔

"وہ مل گیا ہے" ـــ عبید عربی نے کہا ـــ "ہم دونوں کو مل گیا ہے۔ کس کے پاس رہتی ہو؟"

"اپنا کوئی بھی نہیں رہا" ـــ شافیعہ نے جواب دیا ـــ "اللہ کے دو ایسے بندے مل گئے ہیں جن کے دلوں میں وہی پیار ہے جو میرے ماں باپ کے دلوں میں ہُوا کرتا تھا.... میں تمہیں ان سے ملواؤں گی"۔

"تمہیں یہاں زیادہ دیر رکنا نہیں چاہئے" ـــ عبید عربی نے کہا ـــ "جن کے پاس رہ رہی ہو، وہ تمہارے خون کے رشتہ دار نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تم پر کوئی شک کریں"۔

"تم اپنی بتاؤ" ـــ شافیعہ نے پوچھا ـــ "تمہارا گھر کہاں ہے؟ پہلے تو تمہیں وسم کوہ میں کبھی نہیں دیکھا"۔

"میرے بھی ماں باپ مر گئے تھے" ـــ عبید عربی نے جواب دیا ـــ "تم اصفہان سے اپنے چچا کے ساتھ ہمیشہ کے لئے چلی گئی تھیں تو ان کے تھوڑے ہی عرصہ بعد

میرے ماں باپ بھی مر گئے تھے۔ میں کہیں اور رہتا تھا لیکن اب یہاں رہنے کے لئے آ گیا ہوں۔ یہاں ایک بڑھئی ہے، وہ میرا چچا ہے۔ میں اب اسی کے ساتھ رہوں گا اور اس نے مجھے اپنا کام سکھانا شروع کر دیا ہے.... آؤ چلیں، کل کہاں اور کس وقت ملو گی؟"

"جہاں کہو گے" — شافعیہ نے بڑے ہی جذباتی لہجے میں جواب دیا — "جس وقت کہو گے آ جاؤں گی"۔

"قلعے کے باہر آ سکو گی؟" — عبید عربی نے پوچھا اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر بولا — "قلعے کے ساتھ ہی سبزیوں کا ایک باغ ہے۔ وہ بہت ہی خوبصورت جگہ ہے وہاں درخت بہت زیادہ ہیں اور ان پر بیلیں چڑھی ہوئی ہیں اور وہاں پھولدار پودے بھی ہیں۔ وہ باغ یہاں ہمارے ایک پڑوسی کا ہے۔ وہ سبزیاں اُگاتا ہے اور قلعے میں بیچتا ہے۔ فوج کو بھی سبزیاں وہی دیتا ہے۔ اگر کل کسی وقت وہاں آ سکو تو میں وہیں ملوں گا۔ اس باغ کے مالک سے ڈرنے اور جھجکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ ہمارا پڑوسی ہے اور میرے چچا کا بھائی بنا ہُوا ہے"۔

"ہاں وہ باغ!" — شافعیہ نے مسرت بھرے لہجے میں کہا — "میں دو تین بار اس باغ میں گئی ہوں۔ بہت ہی خوبصورت جگہ ہے.... میں وہاں آ جاؤں گی"۔

انہوں نے اگلے روز کی ملاقات کا وقت مقرر کر لیا اور پھر قلعے کی دیوار سے اتر کر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

○

شافعیہ تو عبید عربی کی ذات میں گم ہو گئی تھی۔ اُسے تو جیسے احساس ہی نہ رہا تھا کہ شام بہت گہری ہو گئی ہے اور اسے اپنے گھر پہنچنا ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ مزّمل اور شمونہ اس سے پوچھیں گے کہ وہ کہاں رہی ہے تو وہ کیا جواب دے گی۔ اس نے کوئی جھوٹ گھڑنا چاہا تو ضمیر نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ وہ مزّمل اور شمونہ کے آگے جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھی۔ انہوں نے جو پیار اور جو احترام اسے دیا تھا، اس کی قدر وہ صرف اس طرح کر سکتی تھی کہ ان کے ساتھ مخلص رہے اور صداقت کا دامن نہ چھوڑے۔

وہ گھر میں داخل ہوئی تو شمونہ اس کے لئے خاصی پریشان ہو رہی تھی۔ مزّمل نے اسے بتایا کہ وہ اس کی تلاش میں نکلنے ہی والا تھا۔ دونوں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں چلی گئی تھی۔ وہ کھانے کے لئے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"بچپن کا ایک ساتھی مل گیا تھا" — شافعیہ نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا — "اس کے ساتھ قلعے کی دیوار پر کھڑی بچپن کو یاد کرتی رہی ہوں"۔

"کون ہے وہ؟" — شمونہ نے پوچھا۔

"کچھ دن ہوئے یہاں آیا ہے" — شافعیہ نے جواب دیا — "ہم بچپن میں اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ آج اس عمر میں ملاقات ہوئی ہے اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو فوراً پہچان لیا تھا"۔

"اگر تم اسے اچھی طرح جانتی ہو پھر تو کوئی بات نہیں" — مزّمل نے کہا — "اگر اسے اتنا ہی جانتی ہو کہ بچپن میں تمہارے ساتھ کھیلا کرتا تھا تو پھر محتاط رہنا۔ آج کل کسی کا بھروسہ نہیں"۔

"نہ ملو تو بہتر ہے" — شمونہ نے کہا۔

"یہ بات غلط ہے" — مزّمل نے کہا — "اُسے ضرور ملو۔ اگر وہ شہر میں ابھی ابھی آیا ہے تو اُسے ضرور ملو لیکن یوں نہیں کہ تمہیں اس سے بچپن میں پیار تھا بلکہ اس لئے ملو کہ اسے غور سے دیکھو اور یہ جانچ پڑتال کرنے کی کوشش کرو کہ یہ کوئی غلط آدمی تو نہیں.... وہ حسن بن صباح کا بھیجا ہُوا فدائی بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے جس طرح قلعہ ناظرو طبس لیا ہے، اسے حسن بن صباح بخشے گا نہیں۔ ہم نے اس کے پیرو مرشد کو قتل کیا ہے۔ حسن بن صباح انتقام لے گا اور ضرور لے گا۔ ہو سکتا ہے وہ سپہ سالار اوریزی کو بھی قتل کروا دے.... ایسا کوئی اجنبی شہر میں نظر آئے تو اسے ہمیشہ شکی نظروں سے دیکھو"۔

مزمل آفندی نے یہ جو بات کہی تھی بالکل ٹھیک کہی تھی۔ سالار اوریزی نے جاسوسوں اور مخبروں کو بلا کر خاص ہدایات دی تھیں کہ قلعے میں کوئی اجنبی آئے تو اُسے اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھیں۔ شہر میں فدائیوں کی موجودگی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ سالار اوریزی نے ایک خاص ہدایت یہ دی تھی کہ تاجروں کا جب مال آتا ہے تو اسے ضرور دیکھیں۔ اگر مال اُتارتے وقت اچھی طرح نہ دیکھ سکیں تو یہ دیکھیں کہ اس میں سے مختلف اشیاء کہاں کہاں جاتی ہیں' وہاں جا کر دیکھیں۔ اوریزی نے بڑی عقلمندی کی بات کی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ جہاں فدائی ہوں گے وہاں حشیش ضرور ہو گی۔ حشیش باہر ہی سے آتی ہو گی۔ اس حشیش کے ذریعے فدائیوں کو پکڑا جا سکتا تھا۔ اس سے پہلے کسی شہر میں اور کسی قلعے میں ایسی جانچ پڑتال اور دیکھ بھال کا کسی کو کبھی خیال نہ آیا تھا۔ اوریزی کو احساس تھا کہ عبدالملک بن عطاش کو مروا کر وہ خود بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس پر قاتلانہ حملہ ہونا ہی تھا۔

شافعیہ کی زبانی معلوم ہوا کہ اس خوبرو جوان سال آدمی کا اصل نام ناصر تھا اور وہ یہاں آکر عبید عربی بن گیا تھا لیکن شافعیہ نے نام کی طرف توجہ دی ہی نہیں تھی۔ نام پر توجہ دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ عبید عربی نے کہا تھا کہ کبھی وہ ناصر ہوا کرتا تھا اور پھر اس کا نام عبید عربی رکھ دیا گیا تھا۔ شافعیہ نے اس کی اس بات اور وضاحت کو سچ مان لیا تھا۔

"شافعیہ!" — شمونہ نے کھانے کے بعد شافعیہ سے کہا — "اب تم اپنے لئے کسی کو منتخب کر ہی لو"۔

شمونہ نے شافعیہ کو یہ مشورہ اس لئے دیا تھا کہ یہ لڑکی عالمِ شباب میں ہے اور غیر معمولی طور پر حسین بھی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پیار کے دھوکے میں آکر حسن بن صباح کی جنّت میں ہی پہنچا دی جائے۔

"میں عبید کو کسی دن گھر لاؤں گی" — شافعیہ نے کہا — "آپ دونوں بھی اسے دیکھ لیں اور مجھے بتائیں کہ میرا انتخاب کیسا ہے"۔

"تمہارا انتخاب یقیناً اچھا ہو گا شافعیہ!" — مزمل نے کہا — "لیکن ہم صرف یہ نہیں دیکھیں گے کہ عبید کتنا خوبرو ہے اور تمہیں کتنا چاہتا ہے' ہمیں تو اس کی اصلیت اور اس کا باطن دیکھنا ہے۔ ہم تمہیں کسی فریب کار کے چنگل میں نہیں جانے دیں گے"۔

شافعیہ نے وہ رات بے چینی سے کروٹیں بدلتے گزاری۔ آنکھ لگتی تھی تو اُسے خواب میں عبید عربی نظر آتا تھا۔ آنکھ کھل جاتی تو اسی کے تصوّر میں گم ہو جاتی۔ وہ محسوس کرنے لگی جیسے رات بڑی ہی لمبی ہو گئی ہو۔ آخر صبح طلوع ہوئی اور شافعیہ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ملاقات کا وقت ابھی دُور تھا۔ وقت گزارنے کے لئے وہ کام کاج میں مصروف ہو گئی اور ملاقات کا وقت قریب آگیا۔

"میں اُسے ملنے جا رہی ہوں" — شافعیہ نے شمونہ سے کہا — "میری اتنی فکر نہ کرنا' میں بچّی تو نہیں ہوں"۔

"پھر بھی محتاط رہنا" — شمونہ نے کہا — "اُسے اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھو اور اُسے یہاں ضرور لانا"۔

شافعیہ گھر سے نکلی پھر قلعے سے نکل گئی اور سبزیوں والے باغ میں جا پہنچی۔ عبید عربی اس کے انتظار میں وہاں پہلے سے موجود تھا۔ شافعیہ کو دیکھ کر دوڑا آیا اور اُس کا بازو پکڑ کر باغ کے اندر ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں درختوں پر چڑھی ہوئی بیلوں نے چھاتہ سا بنا رکھا تھا۔ اس کے نیچے گھاس تھی اور تین اطراف بیلوں اور پودوں کی اوٹ تھی۔ تنہائی میں بیٹھنے کے لئے وہ جگہ موزوں تھی اور رومان پرور بھی تھی۔ دونوں وہاں جا بیٹھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دونوں دنیا سے بے خبر ہو گئے۔

"پہلے ایک فیصلہ کر لو" — شافعیہ نے عبید عربی سے کہا — "میں تمہیں ناصر کہا کروں یا عبید؟"

"عبید بہتر ہے" — عبید عربی نے جواب دیا — "نام کو اتنی اہمیت کیوں دیتی ہو؟ ... اگر محبت ہے تو نام کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ محبت نہیں تو بڑے پیارے پیارے نام بھی بھدے اور بے معنی لگتے ہیں"۔

اُس روز انہوں نے بہت باتیں کیں۔ پیار کی باتیں' گزرے ہوئے وقت کی باتیں لیکن ایسی نہیں کہ دلوں پر اُداسی اور ملال آ جاتا۔ شافیعہ نے اسے کہا تھا کہ ایسی کوئی بات یاد نہ کرو نہ یاد دلاؤ جس میں تلخیاں ہوں۔ وہ کہتی تھی کہ ہم آہیں بھریں گے' فریادیں کریں گے اور روئیں گے تو بھی ہمیں ماں باپ نہیں مل جائیں گے نہ ان کا پیار ملے گا۔ پیار تو ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دینا ہے۔

وہ ایک دوسرے میں گم ہو گئے۔ محبت کی وارفتگی اور خود سپردگی ایسی جیسے یہ دو جسم ایک ہو جانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ شافیعہ کہتی تھی کہ وجود ہو تو محبت کا ہو' ہمارے اپنے کوئی وجود نہیں۔ اگر ہیں تو انہیں اس طرح پاک اور صاف رکھنا ہے کہ خیال ہی نہ آئے کہ جسم کو تسکین کی ضرورت ہے۔

عبید عربی نے اُسے یقین دلایا کہ اُس کی نظر جسم پر ہے نہیں۔ وہ بار بار ایک تشنگی کا اظہار کرتا تھا۔ یہی وہ تشنگی تھی جس سے شافیعہ مری جا رہی تھی۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے پیار و محبت کے چشمے بن گئے۔ وہ یوں محسوس کرنے لگے جیسے یہ چشمے سوکھ گئے تھے اور اچانک پھوٹ پڑے ہوں۔

دن آدھا گزر چلا تھا جب وہ کسی کی آواز پر اچانک بیدار ہو گئے اور گھروں کو جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں تمہیں کسی دن اپنے گھر لے چلوں گی" — شافیعہ نے کہا — "میں تمہیں اُن لوگوں سے ملواؤں گی جن کے پاس میں رہتی ہوں.... انہیں تم میرے ماں باپ ہی سمجھو"۔

"شافیعہ!" — عبید عربی نے کہا — "ان کے پاس لے جانے سے پہلے مجھے خود سمجھ لو۔ میں کچھ نہیں چاہتا' میں پیار کا تشنہ ہوں"۔

وہ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

○

محبت نے ان پر دیوانگی طاری کر دی تھی۔ اُسی شام وہ دونوں قلعے کی دیوار پر وہیں

کھڑے تھے جہاں گذشتہ شام ان کی ملاقات ہوئی تھی۔

اگلے روز وہ پھر سبزیوں کے باغ میں اُسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ شام کے وقت وہ پھر قلعے کی دیوار پر کھڑے تھے۔

اس طرح وہ آٹھ دس روز ملتے رہے اور ایک روز شافیعہ عبید عربی کو اپنے گھر لے گئی۔ شمونہ کو عبید خاص طور پسند آ گیا تھا۔ مزمّل نے اس کے ساتھ کچھ ایسے ذاتی سوال کئے جنہیں وہ ضروری سمجھتا تھا۔ عبید عربی نے اُسے مایوس نہ کیا۔

"میری ایک خواہش ہے" — عبید عربی نے مزمّل سے کہا — "میں سپہ سالار اوریزی سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کے ہاتھ چومنے کو جی چاہتا ہے۔ اس نے جو کارنامے کر دکھائے ہیں وہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ عبدالملک بن عطاش کو کون قتل کر سکتا تھا!.... یہ قلعہ وسم کوہ کوئی اور فتح نہیں کر سکتا تھا اور پھر جس طرح اس سالار نے قلعہ ناظر و طیس لیا ہے' یہ اسی کی دانشمندی اور عسکری فہم و فراست کا نتیجہ ہے۔ مجھے اس سے ملوا دیں"۔

"میں ملواؤں گا" — مزمّل نے کہا۔

"میں دراصل فوج میں جانا چاہتا ہوں" — عبید عربی نے کہا — "میں سپہ سالار اوریزی کے ماتحت سلطنت کی اور اسلام کی خدمت کرنا چاہتا ہوں"۔

شمونہ اور مزمّل کو ذرا سا بھی شک نہ ہوا کہ عبید عربی حسن بن صباح کا بھیجا ہوا فدائی ہے۔ مزمّل دلی طور پر تیار ہو گیا تھا کہ اسے سالار اوریزی سے ملوا دیا جائے گا۔ اُس نے عبید عربی سے کہا کہ سالار اوریزی سے ملاقات تو کرا دی جائے گی لیکن تمہاری جامہ تلاشی ہو گی اور تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہو گا۔

"میں نے ان سے ملنا ہے" — عبید عربی نے کہا — "ان کے سامنے کسی ہتھیار کی نمائش نہیں کرنی"۔

عبید عربی کو وسم کوہ میں آئے دو مہینے ہو گئے تھے اور قلعہ الموت میں حسن بن صباح اس خبر کا انتظار بڑی بے تابی سے کر رہا تھا کہ سالار اوریزی کو عبید عربی نے قتل کر دیا ہے۔ اس دوران بڑھئی نے اپنے ایک جاسوس کو یہ پیغام دے کر قلعہ الموت بھیجا تھا کہ امام سے کہنا سالار اوریزی کو اتنی جلدی قتل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کوئی آدمی اس کے قریب نہیں جا سکتا۔ بڑھئی نے حسن بن صباح کو یقین دلایا تھا کہ یہ کام ہو جائے گا اور

عبید عربی موقع ڈھونڈنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ بڑھئی نے پیغام میں یہ بھی کہا تھا کہ عبید عربی نے اُس گھر تک رسائی حاصل کرلی ہے جس گھر کے افراد سالار اوریزی کے قابلِ اعتماد لوگ ہیں بلکہ یہ اُس حلقے کے لوگ ہیں جو سالار اوریزی کی دوستی کا ذاتی حلقہ ہے۔ امید ہے ان لوگوں کے ذریعے سالار اوریزی تک عبید عربی پہنچ جائے گا۔

ایک روز شافعہ نے صاف طور پر محسوس کیا کہ عبید کچھ پریشان ہے اور بولتا ہے تو اس کی زبان لڑکھڑاتی ہے۔ شافعہ نے پوچھا تو اُس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ شافعہ کو ٹال دیا لیکن باتیں کرتے کرتے عبید کی بے چینی بڑھتی گئی۔ ایک بار تو اُس نے یوں کیا کہ شافعہ کا ایک ہاتھ اُس کے ہاتھ میں تھا اور اُس نے اپنی انگلیاں شافعہ کی انگلیوں میں اُلجھا رکھی تھیں۔ عبید عربی نے اپنے ہاتھ کو اتنی شدت سے مروڑا جیسے اس کے ہاتھ میں لڑکی کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ لکڑی کا ایک ٹکڑا تھا اور اسے وہ توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شافعہ درد سے بلبلا اٹھی۔ اس نے عبید کا چہرہ دیکھا تو چہرہ لال سرخ ہوا جا رہا تھا۔ شافعہ نے بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے نکالا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا کہ اُسے کیا ہو گیا ہے۔

"کچھ نہیں شافعہ!..... کچھ نہیں ہوا" ــــ عبید عربی نے اُکھڑی اُکھڑی آواز میں کہا ــــ "کبھی کبھی ایسے ہو جاتا ہے..... میں جلدی ہی اپنے آپ میں آ جاؤں گا۔ یوں محسوس کرتا ہوں جیسے کوئی غیبی طاقت میرے وجود کے اندر آ کر مجھ پر غالب آنے کی کوشش کر رہی ہو..... تم گھبراؤ نہیں۔ چلو گھر چلیں..... میں شام تک ٹھیک ہو جاؤں گا اور ہر روز کی طرح دیوار پر ملیں گے"۔

عبید عربی کی یہ حالت دیکھ کر شافعہ کو بھی ویسی ہی بے چینی محسوس ہونے لگی تھی۔ عبید عربی نے اُسے بہت تسلی دی اور کہا کہ وہ شام کو اُسے بالکل ہشاش بشاش دیکھے گی۔ شافعہ اپنے گھر چلی گئی اور عبید عربی بڑھئی کے گھر چلا گیا۔

شافعہ اُس کی یہ کیفیت سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ عبید کو جسمانی اینٹھن ہو رہی تھی جو صاف علامت تھی کہ یہ شخص نشے سے ٹوٹا ہوا ہے۔

"تمہیں امام کی قسم ہے کوئی بندوبست کرو" ــــ عبید نے بڑھئی سے کہا ــــ "آج تو میری حالت بہت ہی بگڑ گئی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لڑکی کو یا کسی اور کو کچھ شک ہو جائے۔ اگر آج مجھے حشیش نہ ملی تو میں پاگل ہو جاؤں گا اور ہو سکتا ہے اس پاگل پن میں

تمہاری گردن مروڑ دوں"۔

"آج شام تک امید ہے تمہارا نشہ پورا ہو جائے گا" ــــ بڑھئی نے کہا ــــ "میں نے تمہیں بتایا ہے کہ یہاں آنے والے مال کو کھول کر دیکھا جاتا ہے۔ سالار اوریزی نے بڑا سخت حکم جاری کر رکھا ہے کہ حشیش کا ایک ذرّہ بھی اس قلعہ بند شہر میں نہ آئے اور اگر کسی کے پاس حشیش یا اس قسم کا کوئی اور نشہ پکڑا جائے' اسے فوراً قید خانے میں بند کر دیا جائے"۔

سالار اوریزی نے یہ حکم یہ سوچ کر جاری کیا تھا کہ حشیش صرف فدائی یا حسن بن صباح کے جاسوس اور تخریب کار پیتے ہیں۔ یہ نشہ ان باطنیوں کا ہی تھا۔ سالار اوریزی نے سوچا تھا کہ ان لوگوں کو یہاں نشہ نہ ملا تو یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ پھر بھی کسی نہ کسی طریقے سے حشیش وہاں پہنچ ہی جاتی تھی مگر اتنے زیادہ دن ہو گئے تھے' الموت سے حشیش نہیں آئی تھی۔ عبید عربی نشے سے ٹوٹا ہوا تھا۔

دن کے پچھلے پہر جب سورج مغرب کی طرف اُتر رہا تھا' شافعہ قلعے کی دیوار پر جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ ہر شام اُس کی عبید عربی کے ساتھ ملاقات ہوتی تھی۔ شافعہ گھر سے نکلنے ہی لگی تھی کہ مزمل آ گیا۔ اس نے شافعہ کو بازو سے پکڑا اور اندر شمونہ کے پاس لے گیا۔

"میں تمہیں بہت بُری خبر سنانے لگا ہوں شافعہ!" ــــ مزمل نے کہا ــــ "وقتی طور پر تمہیں یہ خبر بُری لگے گی لیکن اچھا ہوا کہ ایک بہت بڑے خطرے کا پہلے ہی علم ہو گیا ہے"۔

شمونہ اور شافعہ کے رنگ اتنی سی بات سے ہی اُڑ گئے۔ دونوں خبر سننے کو بے تاب ہو گئیں۔

خبر یہ تھی کہ تاجروں کا مال اونٹوں سے قلعے سے باہر اُترا تھا۔ مال سے مال کے تبادلے وہیں ہوا کرتے تھے۔ جس روز تاجروں کا مال آتا تھا' اُس روز وہاں بہت ہی رونق اور لوگوں کا جمگھٹا ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہاں منڈی لگتی تھی لیکن اتنے زیادہ لوگ ہر روز نہیں ہوتے تھے۔ سالار اوریزی کے حکم کے مطابق وہاں کچھ لوگ گھومتے رہتے اور دیکھتے پھرتے کہ کون کیا لایا ہے اور یہاں کون کیا خرید کر قلعے کے اندر لے جا رہا ہے۔

ایک مخبر نے ایک آدمی کو دیکھا جو الگ تھلگ کھڑا تھا اور اُس کے ہاتھ میں کپڑے کا

ایک تھیلا تھا۔ یہ تھیلا اتنا سا ہی تھا کہ چغے کے اندر چھپایا جا سکتا تھا۔ مخبر نے دیکھا کہ بڑھئی اور عبید عربی اس کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے پھر بڑھئی نے وہ تھیلا اُٹھا لیا اور اپنے چغے کے اندر کر کے اوپر بازو رکھ دیئے اور ایک طرف چل پڑا۔ عبید عربی بھی اس کے پیچھے گیا۔

مخبر کو کچھ شک سا ہوا۔ اُس نے ان دو آدمیوں کو بتایا جو کسی بھی تاجر کا مال کھول کر دیکھ سکتے تھے۔ یہ دونوں آدمی دوڑتے ہوئے بڑھئی اور عبید عربی کے پیچھے گئے۔ انہیں دیکھ کر وہ دونوں بھی دوڑ پڑے اور ایک دروازے میں داخل ہو گئے۔ یہ قلعے کی ایک طرف کا دروازہ تھا۔

وہ بھاگ کر جا ہی کہاں سکتے تھے۔ انہیں قلعے کے اندر پکڑ لیا گیا۔ انہیں یہ تھیلا جس آدمی نے دیا تھا' وہ پہلے ہی کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ اس تھیلے کو کھول کر دیکھا تو اس میں خشک حشیش بھری ہوئی تھی۔ یہ خاصی لمبی مدت استعمال کے لئے کافی تھی۔ بڑھئی اور عبید عربی کو پکڑ کر کوتوال کے پاس لے گئے۔ کوتوال نے دونوں کو قید خانے میں بھیج دیا۔

شافعیہ نے جب سنا کہ عبید عربی قید خانے میں بند ہو گیا ہے تو اس کے آنسو بہنے لگے اور وہ مزمّل کے پیچھے پڑ گئی کہ وہ اسے قید خانے میں لے چلے' وہ عبید عربی سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ عبید عربی ایسا آدمی نہیں۔ شمونہ اور مزمّل اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگے کہ کسی انسان کا پتہ نہیں ہوتا وہ درپردہ کیا ہے لیکن شافعیہ عبید عربی کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں تھی۔ وہ کہتی تھی عبید ایسا آدمی نہیں اور یہ ضرور کہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔

مزمّل نے شافعیہ کی یہ جذباتی حالت دیکھی تو وہ پریشان سا ہو گیا۔ اُس نے شافعیہ سے کہا کہ وہ جا کر معلوم کرتا ہے کہ عبید عربی حشیش اپنے پاس رکھنے کا مجرم ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے اُسے معلوم ہی نہ ہو اور یہ حشیش اُس کے چچا بڑھئی کے لئے آئی ہو۔

○

مزمّل آفندی اور بن یونس سالار اوریزی کے خاص آدمی تھے۔ اوریزی نے ان دونوں کو جاسوسی کے محکمے میں باقاعدہ طور پر رکھ لیا تھا لیکن اوریزی کے ساتھ ان کے تعلقات دوستانہ بھی ہو گئے تھے۔ قید خانے میں کوئی اور آدمی نہیں جا سکتا تھا لیکن مزمّل اور بن یونس کے لئے کہیں بھی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ مزمّل بن یونس کو ساتھ لے کر

قید خانے کے مہتمم سے ملا اور کہا کہ وہ ان دو قیدیوں سے ملنا چاہتا ہے جنہیں گذشتہ روز حشیش کے سلسلے میں گرفتار کر کے یہاں بھیجا گیا تھا۔

مہتمم نے اُسی وقت قید خانے کے داروغہ کو بلا کر کہا کہ ان دونوں کو اُن دو قیدیوں کے پاس لے جائے جن کے قبضے سے حشیش برآمد ہوئی تھی۔ داروغہ ان دونوں کو لے گیا اور داروغہ نے ہی انہیں بتایا کہ بڑھئی کو ایذارسانی والے کمرے میں لے جایا گیا ہے اور اُسے بہت ہی اذیتیں دی جا رہی ہیں لیکن وہ بتا نہیں رہا کہ یہ حشیش کہاں سے آئی تھی۔ اُس پر شک یہ ہے کہ وہ فدائی ہے اور الموت کا جاسوس بھی ہے۔ عبید عربی کے متعلق داروغہ نے بتایا کہ وہ کوٹھڑی میں بند ہے اور وہ تو یوں سمجھو کہ پاگل ہو چکا ہے۔ داروغہ نے یہ رائے دی کہ وہ نشے سے ٹوٹا ہوا معلوم ہوتا ہے اور بھول ہی گیا ہے کہ وہ انسان ہے۔

بڑھئی کو تو دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی' مزمّل اور بن یونس اُس کوٹھڑی تک گئے جس میں عبید عربی بند تھا۔ اُس نے جب مزمّل کو دیکھا تو دوڑ کر سلاخوں تک آیا اور سلاخوں کو پکڑ کر جھنجھوڑنے لگا۔

”خدا کے لئے مجھے تھوڑی سی حشیش دے دو“ ــــ عبید عربی نے چلّا چلّا کر کہا ــــ ”میں مر جاؤں گا.... مجھے اتنی زیادہ اذیت دے کر نہ مارو.... مجھے حشیش دو' نہیں دیتے تو مار ڈالو“۔

مزمّل نے اُسے بتایا کہ حشیش تو قلعے میں بھی نہیں داخل ہو سکتی' اُسے قید خانے میں حشیش کیسے دی جا سکتی ہے!.... عبید عربی نے یہ سنا تو اس نے سلاخوں کو پکڑ کر بڑی زور زور سے اپنا سر سلاخوں کے ساتھ مارا۔ اس کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔ داروغہ ساتھ تھا۔ اُس نے جب اس قیدی کی یہ حالت دیکھی تو دو تین سنتریوں کو پکارا۔

تین سنتری دوڑے آئے۔ داروغہ نے انہیں کہا کہ وہ رسّیاں لے آئیں اور اس قیدی کے ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ دیں اور ٹانگیں بھی باندھ دیں۔

وہ طریقہ بڑا ہی ظالمانہ تھا جس سے عبید عربی کے ہاتھ اور پاؤں باندھے گئے۔ مزمّل اور بن یونس وہاں سے آ گئے۔ عبید عربی کی چیخیں دور تک ان کا تعاقب کرتی رہیں۔

”اسے تھوڑی سی حشیش دے دی جائے تو یہ بتا دے گا کہ حسن بن صباح کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہے“ ــــ مزمّل نے داروغہ سے کہا ــــ ”صاف پتہ چلتا ہے یہ

نشے سے ٹوٹا ہوا ہے"۔

"پھر بھی نہیں بتائے گا" ــــ داروغہ نے کہا ــــ "ہمیں ان لوگوں کا بہت تجربہ ہے۔ اسے تھوڑی سی بھی حشیش مل گئی تو یہ شیر ہو جائے گا۔ پھر تو یہ بولے گا ہی نہیں"۔

مزمل اور بن یونس قید خانے سے مایوسی کے عالم میں نکل آئے۔ ان دونوں کو اگر کچھ دلچسپی تھی تو وہ شافعیہ کے ساتھ تھی۔ ان دونوں کو تو یقین ہو گیا تھا کہ عبید عربی حشیش کے نشے سے ٹوٹا ہوا ہے اور یہ مشکوک آدمی ہے۔ اب یہ معلوم کرنا تھا کہ اس کا تعلق حسن بن صباح کے ساتھ ہے یا نہیں لیکن شافعیہ نہیں مان رہی تھی۔ ان دونوں نے گھر جا کر شافعیہ کو یقین دلانے کی کوشش کی بھی لیکن وہ نہیں مانتی تھی۔ وہ روتی اور بُری طرح تڑپتی تھی۔ کہتی تھی مجھے سالار اوریزی تک لے چلو، میں عبید کو قید خانے سے نکلوا لوں گی.... سالار اوریزی قلعے کا امیر بھی تھا۔ وہ عبید عربی کو چھوڑ سکتا تھا لیکن مزمل اور بن یونس ایسی سفارش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سالار اوریزی باطنیوں کے معاملے میں کس قدر حساس ہے اور انتقام سے بھرا ہوا ہے۔

اگلے روز شافعیہ کی جذباتی حالت بہت ہی بگڑ گئی اور اُس نے رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ اُس نے مزمل کو مجبور کر دیا کہ وہ آج بھی قید خانے میں جائے اور عبید عربی کو دیکھ کر آئے اور اُسے بتائے کہ وہ کس حال میں ہے۔

مزمل چلا گیا اور عبید کو دیکھ آیا۔ عبید کی حالت اب یہ تھی کہ اُس کے ہاتھ پاؤں تو بندھے ہوئے تھے، ماتھے سے خون رِس رہا تھا اور وہ ایسی بُری طرح چیخ اور چلا رہا تھا جیسے کسی کُتے کو باندھ کر مارا پیٹا جا رہا ہو۔

مزمل نے شافعیہ اور شمونہ کو عبید عربی کی یہ حالت بالکل ایسے ہی بتائی جیسی وہ دیکھ کر آیا تھا۔ یہ سن کر شافعیہ کی حالت بھی ویسی ہی ہونے لگی۔ شمونہ عورت تھی، شافعیہ کی یہ حالت اُس سے برداشت نہ ہو سکی اور وہ رونے لگی۔ مزمل نے شافعیہ سے کہا کہ چلو دونوں سالار اوریزی کے پاس چلتے ہیں۔

"کیا سالار اوریزی اُسے چھوڑ دے گا؟" ــــ شمونہ نے پوچھا۔

"چھوڑے گا تو نہیں!" ــــ مزمل نے جواب دیا ــــ "میں سالار اوریزی سے صرف یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ وہ طبیب کو قید خانے میں بھیجے کہ وہ عبید عربی کو

دیکھے اور کوشش کرے کہ اس کے ذہن سے نشے کا اثر اتر جائے اور وہ صحیح حالت میں آ جائے پھر اس سے پوچھیں گے کہ حشیش اس کے پاس کہاں سے آئی تھی۔ بس یہ ایک صورت ہے کہ ہم عبید عربی کو بچا سکتے ہیں۔ اگر وہ نہیں بتائے گا تو ہم بھی اس کی کوئی مدد نہیں کریں گے۔ پھر تو ہم یہی سمجھیں گے کہ وہ حسن بن صباح کا آدمی ہے۔ اس صورت میں اگر شافعیہ مر بھی گئی تو ہم پرواہ نہیں کریں گے"۔

اُس زمانے میں قیدی کے ساتھ کسی کو ذرا سی بھی دلچسپی اور ہمدردی نہیں ہُوا کرتی تھی۔ قید خانے میں قیدی مرتے ہی رہتے تھے۔ قید خانے میں ڈالے جانے کا مطلب ہی یہی ہوتا تھا کہ یہ شخص بڑا خطرناک مجرم ہے اور یہ ذرا سے بھی رحم کا حقدار نہیں۔

○

مزمل اور شمونہ سالار اوریزی کے پاس جا پہنچے۔ انہوں نے ابھی بات شروع کی ہی تھی کہ شافعیہ بھی روتی چلاتی وہاں پہنچ گئی۔ دربان اُسے اندر جانے سے روکتا تھا لیکن شافعیہ اسے دھکیلتی اور اس کا منہ نوچتی تھی۔ آخر دربان نے اندر جا کر سالار اوریزی کو بتایا کہ ایک لڑکی باہر یوں واویلا بپا کئے ہوئے ہے اور روکے رکتی نہیں۔ سالار اوریزی نے اُسے بھی اندر بلا لیا۔

سالار اوریزی کو بتایا جا چکا تھا کہ ایک بڑھئی اور اُس کا جواں سال بھتیجا حشیش کے ساتھ پکڑے گئے ہیں اور انہیں یہ حشیش باہر کا ایک آدمی دے کر غائب ہو گیا تھا۔ سالار اوریزی نے حکم دے دیا تھا کہ یہ مرتے ہیں تو مر جائیں، ان سے پوچھیں کہ یہ کون لوگ ہیں، ان کا تعلق باطنیوں کے ساتھ ضرور ہو گا۔ اب مزمل اور شمونہ سالار اوریزی کو عبید عربی اور شافعیہ کی ملاقاتوں کا قصہ سنا رہے تھے۔ شافعیہ اندر گئی تو اس نے اپنا واویلا بپا کر دیا۔ وہ کہتی تھی عبید ایسا آدمی نہیں، ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

سالار اوریزی شافعیہ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اس لڑکی کے متعلق سب کچھ جانتا تھا اور اُسے معلوم تھا کہ یہ لڑکی کس طرح اس قلعے میں پہنچی تھی اور اس نے اور کیا کچھ کیا ہے لیکن اوریزی کسی مشکوک آدمی کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ شافعیہ کی جذباتی حالت یہ تھی کہ اُس نے عبید عربی کی رہائی کی خاطر آگے بڑھ کر اوریزی کے پاؤں پکڑ لئے۔ وہ کہتی تھی کہ اُسے قید خانے میں جانے دیا جائے، وہ عبید سے صحیح بات پوچھ لے گی اور وہ اُسے بتا بھی دے گا۔

سالار اوریزی نے حکم دیا کہ طبیب کو قید خانے میں بھیجا جائے کہ وہ عبید عربی کی مرہم پٹی کرے اور اگر کوئی دوائی کارگر ہو سکتی ہے تو وہ بھی دے، اور شافعیہ کو بھی قید خانے میں جانے دیا جائے کہ یہ عبید کی حالت اپنی آنکھوں دیکھ لے۔

طبیب اور شافعیہ قید خانے میں گئے۔ مزمل اور شمونہ ان کے ساتھ تھے۔ قید خانے کے دو سپاہی بھی ان کے ساتھ ہو لئے تاکہ عبید عربی کو قابو میں رکھا جائے۔

عبید کی حالت پہلے سے زیادہ بُری اور قابلِ رحم ہو چکی تھی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور وہ فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اور اُس کے حلق سے بڑی ڈراونی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر سلاخوں والا دروازہ کھول دیا۔ شافعیہ دوڑ کر اندر چلی گئی۔ کوٹھڑی میں ناقابلِ برداشت بدبُو تھی۔ عبید نے شافعیہ کو دیکھا تو رو رو کر اس کی منتیں کرنے لگا کہ انہیں کہو اسے کھول دیں۔ اُس نے چیخنا چلاّنا بند کر دیا۔ وہ اب شافعیہ شافعیہ ہی کہے جا رہا تھا۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ بہہ کر اُس کے چہرے پر جم گیا تھا۔ شافعیہ نے فرش پر بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اُسے اس طرح تسلی دلاسے دینے لگی جیسے ماں دودھ پیتے بچے کے ساتھ پیار کیا کرتی ہے۔

"شافعیہ.... شافعیہ!" — عبید عربی ہانپتی آواز میں کہہ رہا تھا — "مجھے پاگل ہونے سے بچا لو.... ان لوگوں سے مجھے بچا لو.... اپنی پناہ میں لے لو مجھے شافعیہ!.... شافعیہ!"

طبیب عبید کی مرہم پٹی کرنا چاہتا تھا اور اُسے کوئی دوائی بھی دینی تھی لیکن شافعیہ کی وارفتگی اور دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ اُس نے عبید کو اپنی گود میں اور زیادہ گھسیٹ لیا اور اپنا ایک گال اُس کے چہرے پر رکھ دیا۔ شافعیہ تو شاید بھول ہی گئی تھی کہ وہاں اُس کے اور عبید کے سوا کوئی اور بھی موجود ہے۔

"تم میری پناہ میں ہو عبید!" — شافعیہ نے اُس کے ساتھ پیار کرتے ہوئے کہا — "ہم دونوں اللہ کی پناہ میں ہیں۔ تم پاگل نہیں ہو گے، اور یہ لوگ جو یہاں موجود ہیں، تمہارے ہمدرد اور غمخوار ہیں.... زخم کی مرہم پٹی کروا لو پھر میں تمہارے پاس بیٹھوں گی"۔

"نہیں!" — عبید عربی نے شافعیہ کا ایک بازو دونوں ہاتھوں میں بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا اور بولا — "تم چلی جاؤ گی۔ مجھے ان لوگوں کے حوالے کر کے نہ جانا۔ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے.... پانی پلاؤ شافعیہ، پانی.... مجھے کچھ چاہئے، پتہ نہیں کیا چاہئے"۔

شافعیہ نے اُسے بٹھا کر اپنے ہاتھوں پانی پلایا پھر اپنے ہاتھوں اُس کے چہرے سے خون دھو ڈالا اور پھر طبیب نے اُس کی مرہم پٹی کر دی۔ اگر شافعیہ اُسے مرہم پٹی کروانے کو نہ کہتی تو وہ طبیب کو اپنے قریب بھی نہ آنے دیتا.... عبید عربی کی ذہنی حالت بالکل بگڑ گئی تھی۔ وہ بے معنی سی باتیں بھی کر جاتا تھا اور اُس کی بعض باتیں تو پلّے ہی نہیں پڑتی تھیں۔ اُس کی زبان جیسے اکڑی ہوئی تھی جو صحیح الفاظ بھی بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

اُس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا — "خدا نے آدم کو جنت سے نکال دیا تھا" — اُس نے یہ الفاظ اس طرح کہے تھے جیسے خواب میں بول رہا ہو۔ شافعیہ کے سوا یہ الفاظ کوئی نہ سمجھ اور سن سکا۔

طبیب نے تھوڑے سے پانی میں ایک دوائی کے چند قطرے ڈال کر شافعیہ کو پیالہ دیا کہ اسے پلا دے۔ شافعیہ کے ہاتھ سے اُس نے یہ دوائی پی لی۔ کچھ دیر انتظار کیا گیا تو دیکھا کہ عبید عربی پر خاموشی طاری ہو گئی تھی اور نیند سے اُس کا سر ڈولنے لگا تھا۔ یہ دوائی کا اثر تھا۔

ذرا ہی دیر بعد عبید عربی کی آنکھیں بند ہو گئیں اور سر ڈھلک گیا۔ اُسے فرش پر لٹا دیا گیا۔ طبیب نے اشارہ کیا کہ سب لوگ یہاں سے نکل چلیں۔ شافعیہ وہاں سے اٹھتی نہیں تھی لیکن طبیب نے اُس کے کان میں کچھ کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سب باہر نکل آئے اور کوٹھڑی کا دروازہ پھر مقفّل کر دیا گیا۔ شافعیہ سلاخوں کو پکڑ کر وہیں کھڑی سوئے ہوئے عبید عربی کو دیکھتی رہی۔ شمونہ نے اُسے پکڑا اور ساتھ لے آئی۔ یہ سب داروغہ کے ساتھ قید خانے کے دفتر میں جا بیٹھے۔

"میں حیران ہوں محترم طبیب!" — داروغہ نے کہا — "کل یہی شخص سلاخوں کے ساتھ اپنا سر پھوڑ رہا تھا۔ اگر ہم اسے باندھ نہ دیتے تو اب تک یہ زندہ نہ ہوتا۔ میں حیران ہوں آج اس لڑکی کو دیکھ کر یہ قیدی آگ سے پانی بن گیا ہے"۔

"میں نے اسے بڑی ہی غور سے دیکھا ہے" — طبیب نے یوں بات کی جیسے قاضی فیصلہ سنا رہا ہو — "مجھے اس کے کل کے رویّے کے متعلق سب کچھ بتا دیا گیا تھا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ لگ کر وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ میں نے

لئے جو دوائی دی ہے' یہ صرف نیند کے لئے ہے' میں اسے سلانا چاہتا ہوں تاکہ اس کا تھکا ٹوٹا ہوا ذہن ٹھکانے پر آ جائے۔ اسے علاج نہ سمجھا جائے۔ میں نے اس کا علاج دیکھ لیا ہے۔ یہ علاج صرف شافعیہ کے پاس ہے۔ شافعیہ اس کے پاس آتی رہے تو یہ اپنی صحیح ذہنی حالت پر آ جائے گا۔ یہ نشے سے ٹوٹا ہوا ہے اور خطرہ ہے کہ یہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے گا"۔

طبیب نے تشخیص کر کے کچھ ہدایات دیں اور زور دے کر کہا کہ اس قیدی کو شافعیہ کے ساتھ کچھ دن رکھا جائے۔ یہ اپنے دل کی ڈھکی چھپی باتیں بھی شافعیہ کے آگے اگل دے گا۔

قید خانے سے نکل کر یہ سب لوگ سالار اوریزی کے پاس گئے۔ طبیب نے سالار اوریزی کو عبید عربی کے متعلق ساری رپورٹ دی اور اسے بھی کہا کہ عبید کا علاج شافعیہ ہے۔

"سالارِ محترم!" —— شافعیہ نے کہا —— "اگر آپ مجھے عبید کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دیں تو کیا میں اس کے ساتھ قید خانے کی کوٹھڑی میں رہوں گی؟.... میں اس کے ساتھ وہاں بھی رہنے کو تیار ہوں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اسے کسی اچھی جگہ منتقل کر دیا جائے جہاں میں اس کے ساتھ دل جمعی کے ساتھ رہ سکوں؟.... میں پہلے جو بات نہیں مانتی تھی وہ اب مان لی ہے۔ عبید نشے سے ٹوٹا ہوا ہے۔ مجھے اس سے پہلے کبھی شک بھی نہیں ہوا تھا کہ یہ کوئی نشہ کرتا ہے۔ اگر آپ اس سے کچھ اور پوچھنا چاہتے ہیں تو وہ میں پوچھ لوں گی.... مجھے پورا یقین ہے کہ یہ باطنی نہیں"۔

"جذبات سے نکلو شافعیہ!" —— سالار اوریزی نے کہا —— "مجھے اب یقین ہونے لگا ہے کہ عبید اور یہ بڑھئی حسن بن صباح کے بھیجے ہوئے آدمی ہیں۔ مجھے خطرہ یہ نظر آ رہا ہے کہ عبید تمہیں محبت کا دھوکہ دے رہا ہے اور یہ لوگ تمہیں یہاں سے اڑا لے جائیں گے اور قلعہ الموت میں حسن بن صباح کے حوالے کر دیں گے۔ یہ لوگ اتنے پکے ہوتے ہیں کہ بڑھئی نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا حالانکہ اُسے ایسی اذیتیں دی گئی ہیں جو ایک تندرست گھوڑا بھی شاید برداشت نہ کر سکے۔ عبید ابھی کچا معلوم ہوتا ہے"۔

شافعیہ نے سالار اوریزی کو کہا تھا کہ عبید کو کسی اچھی جگہ منتقل کر دیا جائے تو وہ اس سے اگلوا لے گی کہ وہ اصل میں کیا ہے' کہاں سے آیا ہے اور کس ارادے سے آیا ہے اور اس بڑھئی کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے۔ سالار اوریزی کو تو اصل راز کی ضرورت تھی۔ کسی کو اذیت میں ڈالنا ضروری نہیں تھا۔ اُس نے حکم دے دیا کہ عبید عربی کو کسی اچھی جگہ منتقل کر دیا جائے۔ یہ جگہ قید خانے کے باہر بھی ہو سکتی ہے اور وہاں پہرہ کھڑا کر دیا جائے' یعنی عبید کو قیدی قرار دے کر رکھا جائے اور شافعیہ جس وقت چاہے اور جتنی دیر تک چاہے اس کے پاس رہ سکتی ہے۔

○

عبید عربی کو اُسی دن قلعے میں ایک کمرہ تیار کر کے بھیج دیا گیا اور باہر دو سپاہی پہرے پر کھڑے کر دیئے گئے۔ اس کمرے میں بڑا اچھا پلنگ اور نرم بستر تھا اور ضروریات کی دوسری چیزیں بھی وہاں موجود تھیں۔ ایک ملازم بھی وہاں بھیج دیا گیا۔

اُس رات شافعیہ عبید عربی کے کمرے میں گئی اور اُس نے دیکھا کہ بہت دیر سو کر وہ کچھ سکون میں آ گیا تھا۔ اُسے دراصل یہ تھوڑا سا سکون اس لئے ملا تھا کہ اُسے قید خانے سے نکال دیا گیا تھا اور شافعیہ اس کے پاس تھی۔ ویسے وہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ شافعیہ اُس کے پاس پلنگ پر اسی طرح بیٹھی جس طرح وہ سبزیوں کے باغ میں بیلوں اور پودوں کی اوٹ میں بیٹھا کرتے تھے۔ اب اس کمرے میں جس کا دروازہ بند تھا اور کسی کے آنے کا خطرہ نہیں تھا' شافعیہ نے اور زیادہ جذباتی مظاہرے کئے جن میں بناوٹ نہیں بلکہ اُس کی روح شامل تھی۔ عبید اس کے ساتھ اس طرح لگ کر بیٹھ گیا تھا جس طرح ڈرا سہما ہوا بچہ ماں کی آغوش کی پناہ میں جا دبکتا ہے اور اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ عبید عربی حشیش کے نشے سے ٹوٹا ہوا تھا۔ جن فدائیوں کو باہر قتل یا کسی دوسری واردات کے لئے بھیجا جاتا تھا' انہیں حشیش ملتی رہتی تھی اور وہ جیسا نشہ بھی طلب کرتے' انہیں مل جاتا تھا لیکن وسم کوہ میں' جیسا کہ سنایا جا چکا ہے' سالار اوریزی نے حشیش اور دوسری نشلی اشیاء کی بھی بندش لگا رکھی تھی۔ حشیش نہ ملنے کے اثرات تو دماغ پر بہت ہی بُرے ہوتے تھے لیکن سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا کہ ایسا آدمی جو نشے سے ٹوٹا ہوا ہوتا تھا' محض نشے کی خاطر راز اُگل دیتا تھا۔ عبید کو پاگل ہو جانا چاہئے تھا لیکن شافعیہ ایک ایسا نشہ تھا جس نے عبید کے دماغ سے حشیش نہ ملنے کے اثرات زائل کرنے شروع کر دیئے۔

اس کے ساتھ طبیب کی دوائی کے اثرات بھی تھے۔ طبیب اپنی دوائی کی خوراک کم کرتا جا رہا تھا۔ اس سے عبید کو نیند کم آنے لگی تھی۔ مختصر یہ کہ شافیعہ کے والہانہ پیار نے اور طبیب کی دوائی نے عبید کو نشے کی طلب کی اذیّت سے نکال لیا۔ ایک روز شافیعہ پیار ہی پیار میں اُسے اس بات پر لے آئی کہ وہ اپنا آپ بے نقاب کر دے۔

عبید عربی تو جیسے اسی انتظار میں تھا کہ شافیعہ اس سے یہ بات پوچھے۔ اُس نے بڑی لمبی کہانی شروع کر دی۔ اُس نے شافیعہ کو سنایا کہ جب شافیعہ اصفہان سے اپنے چچا ابوجندل کے ساتھ ہمیشہ کے لئے چلی گئی تھی، تو عبید عربی تھوڑا ہی عرصہ بعد اپنے ماں باپ کے ساتھ ایک قافلے میں کہیں جا رہا تھا۔ اُس کا باپ تاجر تھا اور مال بیچنے اور خریدنے کے لئے جا رہا تھا۔ پہلی بار وہ اپنی بیوی اور عبید کو بھی ساتھ لے گیا۔ اُس وقت عبید کا نام ناصر تھا اور یہی وہ نام تھا جو اُس کے ماں باپ نے رکھا تھا۔

راستے میں قافلے پر لٹیروں کا حملہ ہو گیا۔ عبید عربی نے سنایا کہ لٹیروں نے جہاں سب کچھ لُوٹ لیا وہاں یہ ظلم بھی کیا کہ خوبصورت بچّیوں اور جوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے اور ایک لٹیرے نے اُسے بھی اٹھا لیا۔ اُسے ابھی تک یاد تھا کہ اُس لٹیرے نے اپنے ساتھی سے کہا تھا کہ بڑا ہی خوبصورت بچہ ہے۔ اُس وقت اس کی عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ عبید نے سنایا کہ اُس کی ماں بھی اور اُس کا باپ بھی لٹیروں کے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے۔ اُس نے اپنے ماں باپ کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ تو رو رو کے بے ہوش ہو گیا تھا۔

لٹیروں نے اُسے شاہ در پہنچا دیا۔ شاہ در میں اس کی تربیت ہونے لگی اور وہ بڑا ہونے لگا۔ جب اس کی عمر انیس بیس سال ہو گئی تو اسے قلعہ اَلموُت بھیج دیا گیا۔ وہاں اُسے حسن بن صباح کو پیش کیا گیا جس نے اسے جنّت میں داخل کر لیا۔ اسے دوسروں کی طرح حشیش پلائی جاتی تھی اور وہاں بڑی خوبصورت لڑکیاں تھیں جن کے ساتھ وہ رہتا اور عیش و تفریح کرتا تھا۔

اُسے وہاں ہر عیش اور موج حاصل تھی لیکن پیار کہیں بھی نہیں تھا۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ شیخ الجبل ایک دن اُسے بلائے گا اور کہے گا کہ اپنا خنجر نکالو اور اپنے آپ کو قتل کر لو۔ یہ مظاہرہ اُس کے سامنے چند مرتبہ ہوُا تھا اور ہر بار ایک فدائی اپنے ہی ہاتھوں ہلاک ہو جاتا تھا۔

عبید عربی کی شخصیت ہی بدل گئی اور وہ اُس ذہنی مقام تک پہنچ گیا جہاں وہ خود چاہنے

لگا کہ شیخ الجبل اسے حکم دے کہ اپنا پیٹ چاک کر دو تو وہ اُسے اپنا پیٹ چاک کر کے دکھا دے۔ پھر بھی پیار کی تشنگی پوری طرح ختم نہ ہوئی۔ حسن بن صباح کی جنّت میں ایک سے ایک حسین اور نوجوان لڑکی تھی لیکن وہ سب خوبصورت اور پرُکشش جسم تھے۔ ان کے اندر جیسے دل تھا ہی نہیں اور روح بھی نہیں تھی۔

آخر ایک روز اُسے شیخ الجبل امام حسن بن صباح نے بلایا اور کہا کہ تم وسم کوہ جاؤ گے اور وہاں سپہ سالار اوریزی کو قتل کرنا ہے اور پھر بھاگنے کی کوشش نہ کرنا بلکہ وہیں اپنے آپ کو اسی خنجر سے ہلاک کر لینا۔

وہ یہاں آیا۔ یہ بڑھئی اُس کا چچا بالکل نہیں لگتا بلکہ یہ اسی کام کے لئے یہاں موجود ہے کہ کوئی فدائی آئے تو اُسے پناہ دی جائے اور یہاں کی خبریں اَلموُت بھیجی جائیں۔ اس نے سبزیوں کے باغ کے مالک کا نام بھی لیا اور کہا کہ وہ بھی حسن بن صباح کا آدمی ہے۔ عبید نے بتایا کہ وہ ابھی دیکھ رہا تھا کہ سالار اوریزی کو کس طرح اور کہاں قتل کیا جا سکتا ہے کہ اتنے میں اسے شافیعہ مل گئی اور شافیعہ سے اُسے وہ پیار مل گیا جس کے لئے وہ مرا جا رہا تھا۔

بڑھئی اور سبزیوں والے کے پاس حشیش ختم ہو گئی۔ انہوں نے عبید کو دوسرے نشے پلائے لیکن وہ حشیش ہی طلب کرتا تھا۔ حشیش آئی اور پکڑی گئی۔ اس سے جو حالت اس کی ہوئی وہ پہلے سنائی جا چکی ہے۔ اُس نے حیرت کا اظہار کیا کہ حشیش کے نشے سے وہ اس حد تک ٹوٹ گیا تھا کہ اُس نے اپنا سر پھوڑ لیا تھا لیکن اُس نے قید خانے میں شافیعہ کو دیکھا تو نشے سے ٹوٹنے کے اثرات کم ہو گئے۔ دراصل پیار کی پیاس کے اثرات زیادہ زہریلے تھے۔ شافیعہ نے والہانہ محبت کا مظاہرہ یہ کیا کہ اُسے قید خانے سے نکلوا لیا اور اس کمرے میں لے آئی۔ مختصر یہ کہ حشیش پر شافیعہ کی والہانہ محبت غالب آ گئی اور عبید نے اپنا یہ راز اُگل کر یوں سکون محسوس کیا جیسے اُس کے وجود میں زہر بھرا ہوُا تھا اور یہ زہر نکل گیا ہو۔

"میں اس گناہ کا کفّارہ ادا کرنا چاہتا ہوں شافیعہ!" ––– عبید عربی نے کہا ––– "سپہ سالار اوریزی کو یہ ساری بات سنا دو اور اُسے کہو کہ مجھے جو سزا دینا چاہے وہ میں ہنسی خوشی قبول کر لوں گا"۔

سالار اوریزی نے اُسے کوئی سزا نہ دی۔ بڑھئی اور سبزیوں کے باغ کے مالک کو سزِ

عام سزائے موت دی گئی۔ ان کی لاشیں اور سر شہر سے دور جنگل میں پھینک دیئے گئے۔

○

حق و باطل کا تصادم اُسی روز شروع ہو گیا تھا جس روز غارِ حرا سے نُورِ حق کی کرنیں پھوٹی تھیں۔ حق و باطل کے لشکروں نے میدانوں اور صحراؤں میں خونریز لڑائیاں لڑیں، دشت و جبل میں برسرِپیکار ہوئے، پہاڑوں، دریاؤں اور سمندروں میں ان کے معرکے ہوئے اور ہوتے ہی چلے آ رہے تھے۔ دونوں فریقوں کی فوج کے خون سے صحراؤں کی ریت اور سمندروں کا پانی لال ہو گیا۔ مطلب یہ کہ حق و باطل جب بھی باہم متصادم ہوئے، دُوبدُو معرکہ آرا ہوئے لیکن حسن بن صباح اٹھا تو اس نے حق کے خلاف ایک ایسی جنگ شروع کر دی جس کا حق پرستوں کے ہاں کوئی تصوّر ہی نہ تھا۔ یہ ایک زمین دوز جنگ تھی۔ یہ ساری داستان جو اب تک داستان گو سنا چکا ہے، ایسی ہی انوکھی جنگ کی داستان ہے۔ یہاں اسے دوہرانے کی ضرورت نہیں۔

اہلِ سنّت حق پرستوں نے پہلے پہل اسی لئے بہت نقصان اٹھایا کہ وہ اس طریقۂ جنگ سے واقف نہ تھے۔ وہ تو مردانِ حُر تھے جو میدان میں اُتر کر لڑا کرتے تھے۔ یہ سنایا جا چکا ہے کہ کتنی ہی اہم شخصیات باطنیوں کے ہاتھوں قتل ہو گئیں لیکن اب مسلمان اس طریقۂ جنگ کو سمجھ گئے اور انہوں نے باطنیوں کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ شاہ در کی فتح تاریخ اسلام کا ایک سنگِ میل ثابت ہوئی۔ یہ بھی سنایا جا چکا ہے کہ حسن بن صباح کے پیر و مرشد عبدالملک بن عطاش کا قتل بھی ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ حسن بن صباح کو کہیں سے بھی اپنے فرقے کے نقصان کی کوئی خبر ملتی تھی تو وہ مسکرا دیا کرتا تھا جیسے اُسے اس کی کوئی پرواہ نہ ہو۔ اُس کے قلعے لے لئے گئے تو بھی اُس نے ہنس کر ٹال دیا مگر اب اس پر سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔

حسن بن صباح کا پیر و مرشد تو مارا ہی گیا تھا اور حسن بن صباح نے یہ انتہائی کڑوا گھونٹ بھی نگل لیا تھا لیکن عبدالملک اس کے سامنے ایک اور مسئلہ رکھ گیا تھا۔ وہ یہ کہ اس نے قلعہ ناظر و طبس میں حسن بن صباح سے ملاقات کے دوران کہا تھا کہ اُس نے شاہ در سے کچھ دور اچھا خاصا خزانہ چھپا کر رکھا ہُوا ہے جسے وہ بوقتِ ضرور استعمال کرے گا۔ اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے علاوہ صرف دو آدمی ہیں جو جانتے ہیں کہ یہ خزانہ کہاں ہے۔

عبدالملک نے یہ بات یوں کی تھی جیسے اُسے یقین تھا کہ اُس نے تو مرنا ہے ہی نہیں۔ وہ یہ خزانہ پیچھے چھوڑ کر دنیا سے اُٹھ گیا یا اٹھا دیا گیا۔ اُس نے حسن بن صباح کو یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ خزانہ کہاں ہے۔ یہی بتایا تھا کہ دو آدمی جانتے ہیں لیکن اُس نے ان دو آدمیوں کے نام نہیں بتائے تھے نہ یہ بتایا کہ وہ کہاں ہیں۔ حسن بن صباح کو تو خزانے کی ضرورت ہروقت رہتی تھی۔ ضرورت نہ بھی ہوتی تو بھی اُس کی فطرت خزانوں کی متلاشی رہتی تھی۔ وہ اب اس سوچ میں گم رہنے لگا کہ اپنے پیر و مرشد کا یہ خزانہ کس طرح ڈھونڈے اور وہ جانتا تھا کہ جب تک ان دو آدمیوں کا اتا پتہ نہ ملے، خزانہ نہیں مل سکے گا۔

عبدالملک حسن بن صباح کے آگے ایک اور مسئلہ رکھ گیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ ہم لوگ چوری چھپے قتل کرانا جانتے ہیں اور ہمارے پاس ایسے فدائی موجود ہیں جو قتل کر کے خودکشی کر لیتے ہیں لیکن ایسے قاتل فوجوں کی یلغار کو نہیں روک سکتے نہ ہی وہ محاصرے کو توڑ سکتے ہیں۔ اس کے لئے باقاعدہ فوج کی ضرورت ہے اور اس فوج کو محاصرہ توڑنے کی اور محاصرہ کرنے کی اور میدان میں لڑنے کی تربیت دی جائے۔ اُس نے حسن بن صباح سے یہ بھی کہا تھا کہ جن سلجوقیوں نے شاہ در لے لیا ہے وہ اب سیدھے اَلمُوت پر آئیں گے اور کوئی بعید نہیں کہ وہ اَلمُوت کو بھی فتح کر لیں.... حسن بن صباح نے اس تجویز پر سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اُس نے اپنے مشیروں کو بتا دیا تھا کہ وہ ایک لشکر تیار کر لیں اور پھر اس کی تربیت کا بندوبست کیا جائے گا۔

○

جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے کفّار کو شکست دینے کے لئے ابابیلیں بھیج دی تھیں جن کی چونچوں میں کنکریاں تھیں، اسی طرح حسن بن صباح کے فرقے کے خاتمے کے لئے خداوند تعالیٰ نے کنکریوں والی ابابیلوں کا ہی بندوبست کر دیا۔ یہ اللہ کی مدد تھی اور اللہ حق پرستوں کو کچھ عرصہ آزمائش میں ڈال کر ان کی مدد کا بندوبست کر ہی دیا کرتا ہے ورنہ شافعیہ جیسی حسین و جمیل اور مصیبت زدہ لڑکی ایسے باطنیوں کی ہلاکت کا باعث نہ بنتی جو سالار اوریزی کو قتل کرنے آئے تھے اور وسم کوہ میں رہ کر نہ جانے اور کتنی اور کیسی تباہی لاتے۔ ایسا دوسرا کردار جو تاریخ کے اس باب میں اُبھرا وہ نُور تھی اور اس کے ساتھ اس کا باپ تھا۔

شافیعہ کی طرح نورُ بھی حسین و جمیل اور جواں سال لڑکی تھی۔ اُس کی داستان سنائی جا چکی ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ شاہ در کی فتح کا باعث اس کا باپ بنا تھا اور وہ خود بھی۔ اب وہ مُروؔ میں سلطان کے محل میں تھی۔ سلطان محمد نے اُسے اور اُس کے باپ کو خاصا انعام و اکرام دیا تھا اور دونوں کو محل میں رہنے کے لئے جگہ دے دی تھی۔

نورُ اب آزاد تھی۔ حسین بھی تھی' جوان بھی تھی۔ اُسے اب زندگی سے لطف اٹھانا چاہیے تھا' اور یہ اُس کا حق بھی تھا۔ اُس پر جو گزری تھی' وہ بڑا ہی دردناک حادثہ تھا۔ اُسے ایک بوڑھے نے زبردستی اپنی بیوی بنا لیا تھا لیکن اُس کی حیثیت ایک زر خرید لونڈی کی سی تھی۔ وہ تو جہنم سے نکل کر جنت میں آئی تھی۔ اب اُس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ اپنی پسند کا کوئی آدمی دیکھ کر اس کے ساتھ شادی کر سکتی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک امیر زادہ اُس کی راہ میں آنکھیں بچھانے کو بے تاب تھا لیکن اس کی اپنی بے تابیاں کچھ اور ہی نوعیت کی تھیں۔ اُس کے اندر انتقام کی آگ جل رہی تھی۔ بعض اوقات بیٹھے بیٹھے وہ کسی سوچ میں کھو جاتی اور اچانک پھٹ پڑتی اور باپ سے کہتی کہ وہ کچھ کرنا چاہتی ہے۔ وہ اس پر مطمئن نہیں تھی کہ اس کا خاوند سزائے موت پا گیا ہے اور عبدالملک بن عطاش بھی جہنم واصل ہو چکا ہے اور ان کا انتہائی مضبوط اڈہ جسے شاہ در کہتے تھے' حق پرستوں کے قبضے میں آ گیا ہے۔ انتقام کا جذبہ اُسے بے حال کئے جا رہا تھا۔

باپ اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا اور کہتا تھا کہ اب اُس کی شادی کسی موزوں آدمی کے ساتھ ہو جائے اور وہ اپنے اس فرض سے سبکدوش ہو کر باقی عمر اللہ اللہ کرتے گزارے۔ نورُ کہتی تھی کہ شادی تو اسے کرنی ہی ہے لیکن وہ باطنیوں کے خلاف کچھ کئے بغیر کسی کی بیوی بننا پسند نہیں کرتی۔

ایسی ہی باتیں کرتے کرتے ایک روز نورُ نے باپ سے کہا کہ وہ شاہ در جا کر آباد ہو جائیں تو شاید اسے چین آ جائے۔ اُس کا یہ خیال اچھا تھا۔ جس شاہ در میں وہ زر خرید بیوی یا لونڈی تھی' اس شاہ در میں جا کر وہ آزادی سے گھومنا پھرنا چاہتی تھی۔ اس کے باپ نے اپنی کوئی رائے ضرور دی ہو گی لیکن نورُ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ باپ کو ساتھ لے کر شاہ در چلی جائے گی اور باقی عمر وہیں گزارے گی.... ایک روز اُس نے اپنے باپ کو مجبور کر دیا کہ وہ سلطان کے پاس جائے اور اُسے کہے کہ وہ انہیں شاہ در بھجوانے کا بندوبست کر دے اور وہاں ان کا کوئی ذریعۂ معاش بھی ہو جائے تو وہ باقی عمر وہیں گزاریں گے۔

اُس کا باپ سلطان محمد کے پاس گیا اور عرض کی کہ وہ اسی طرح سلطان کے محل میں سرکاری ٹکڑوں پر زندہ نہیں رہنا چاہتے کیونکہ یہ ان کے وقار کے خلاف ہے۔ باپ نے کہا کہ وہ کوئی ایسا بوڑھا تو نہیں ہو گیا کہ اپنے ہاتھوں کچھ کما نہ سکے' وہ شاہ در کو ہی موزوں سمجھتا ہے جہاں وہ اپنی روزی خود کمائے گا۔

سُلطان محمد نے اُسی وقت حکم دے دیا کہ نورُ اور اُس کے باپ کو شاہ در پہنچا دیا جائے اور سنجر کو یہ پیغام دیا جائے کہ اس باپ بیٹی کو اتنی زمین دے دی جائے جو انہیں باعزت روٹی بھی دے اور معاشرے میں پُر وقار مقام بھی بن جائے.... اس طرح کچھ دنوں بعد نورُ اور اُس کا باپ شاہ در پہنچ گئے۔ انہیں سرکاری انتظامات کے تحت گھوڑا گاڑی میں وہاں تک پہنچایا گیا تھا۔ سنجر کو سلطان کا حکم دیا گیا کہ انہیں زمین اور مکان فوراً" دے دیا جائے۔ سنجر تو ان پر بہت ہی خوش تھا۔ نورُ کے باپ نے جو کارنامہ کر دکھایا تھا' اس کی قیمت تو دی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ سنجر نے انہیں ایک تو بڑا ہی اچھا مکان دے دیا اور قلعے کے باہر اچھی خاصی زرخیز زمین بھی دے دی۔ کچھ مالی امداد بھی دی تاکہ یہ اپنی زمین کی کاشت شروع کر سکیں۔

باپ بیٹی اس مکان میں آباد ہو گئے اور پھر باپ نے ایسے نوکروں کا انتظام کر لیا جن کا پیشہ کاشتکاری تھا۔

○

نورُ اُس محل میں گئی جہاں عبدالملک اور اُس کا بھائی احمد شہنشاہوں کی طرح رہتے تھے۔ وہ جب اس محل میں داخل ہوئی تو اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ یوں محسوس کرنے لگی جیسے اُس کا خاوند یہیں ہے اور جوں ہی وہ اندر داخل ہوئی' خاوند اُسے دبوچ لے گا لیکن جب وہ اس محل میں داخل ہوئی تو سنجر کی دونوں بیویوں نے اس کا استقبال بڑے ہی پیار اور خلوص کے ساتھ کیا۔ وہ جانتی تھیں کہ اس لڑکی اور اس کے باپ نے شاہ در کی فتح میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ نورُ نے وہ کمرہ دیکھا جس میں وہ اپنے بوڑھے خاوند کے ساتھ راتیں بسر کرتی تھی۔ اب اس کمرے میں کوئی پلنگ نہیں تھا نہ اُس وقت کی کوئی چیز موجود تھی۔ وہاں سنجر کے تین بچے اتالیق سے دینی تعلیم لے رہے تھے.... نورُ کو روحانی تسکین ہوئی۔ اُس کی ذات میں انتقام کی جو آگ بھڑک رہی تھی' وہ کچھ سرد ہو گئی۔

اُس کا باپ علی العسیح اپنی زمین پر چلا جاتا اور نوکروں سے کام کروایا کرتا تھا۔ انہیں کچھ کھیتیاں تو ایسی مل گئی تھیں جن میں فصل پک رہی تھی۔ نُور اپنے لئے اور باپ کے لئے کھانا تیار کر کے وہیں کھیتوں میں لے جایا کرتی تھی۔ باپ اُسے کہتا تھا کہ کھانا نوکر لے آیا کرے گا لیکن نُور آزاد گھومنا پھرنا چاہتی تھی اور اُسے یہ کھیت جو قلعے کے باہر تھے، بڑے ہی اچھے لگتے تھے۔ یہ اُس کی نئی زندگی کا آغاز تھا۔

ایک روز دوپہر کے وقت باپ کے ساتھ کھانا کھا کر نُور کھیتوں کی طرف نکل گئی۔ فصل کی ہریالی سمندر کی لہروں جیسی لگتی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے لہلہاتے کھیت اُس پر کچھ اور ہی کیفیت طاری کرنے لگے۔ وہ دو کھیتوں کے درمیان آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی کہ سامنے اسے ایک جواں سال آدمی آتا نظر آیا۔ اس شخص کی عمر تیس سال سے کچھ اوپر لگتی تھی۔ بڑا ہی خوبرُو جوان تھا۔ دُور سے ہی نُور کو اُس کا چہرہ شناسا اور مانوس لگا۔ وہ آدمی بھی نُور کو دیکھ کر کچھ ٹھٹھک سا گیا اور پھر اُس نے اپنے قدم تیز کر لئے۔ اُسے بھی نُور کا چہرہ ایسا لگا جیسے یہ چہرہ اُس نے کئی بار دیکھا ہو۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور پھر دونوں کے قدم تیز ہو گئے اور دونوں ایک دوسرے کے سامنے رک گئے۔

"اللہ کرے وہ خبر غلط ہو جو میں نے سنی ہے" ـــــ بس آدمی نے کہا ـــــ "سنا تھا آپ بیوہ ہو گئی ہیں اور عبدالملک بن عطاش بھی قتل کر دیا گیا ہے اور...."

"تم نے جو سنا ہے وہ ٹھیک سنا ہے" ـــــ نُور نے مسکرا کر کہا ـــــ "اب یہ نہ کہنا کہ تمہیں یہ خبر سن کر دِلی رنج ہوا ہے۔ مجھے ذرا سا بھی رنج اور ملال نہیں ہوا اور میں اب آزاد اور خوش ہوں.... مجھے تمہارا نام یاد ہے۔ حاذق ہے نا تمہارا نام؟.... اب مجھے آپ نہ کہنا۔ میں تم سے تین چار برس چھوٹی ہوں اور مجھے تم کہو تو زیادہ اچھا لگے گا"۔

اس آدمی کا نام حاذق ہی تھا۔ وہ شاہ در کا ہی رہنے والا تھا۔ نُور کو یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ شخص کیا کام کرتا ہے۔ وہ اتنا ہی جانتی تھی کہ شاہ در کے محاصرے سے پہلے اونچی حیثیت کا آدمی تھا۔ تیسرے چوتھے روز عبدالملک سے ملنے آیا کرتا تھا۔ نُور کے خاوند احمد سے بھی بڑے پیار اور دوستانہ انداز سے ملا کرتا تھا اور خاصا وقت ان کے پاس اندرونی ایک کمرے میں بیٹھا رہتا تھا۔ اس محل میں حاذق کو خصوصی احترام حاصل تھا۔ کبھی نور سے اس کا آمنا سامنا ہو جاتا تو نُور کو وہ مسکرا کر اور بڑے ادب و احترام سے سلام کیا کرتا تھا۔

نُور کو یہ شخص دِلی طور پر اچھا لگتا تھا لیکن اس کے ساتھ اُسے بات کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ صرف مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ اونچی حیثیت کا ہونے کے علاوہ یہ شخص خوبرو تھا۔ دراز قد تھا اور قد و کاٹھ میں اتنی جاذبیت تھی کہ عورتیں اُسے رک کر دیکھتی تھیں۔ تب نُور کے دل میں ایک خواہش سر اٹھانے لگی کہ اس شخص کو کسی دن روک لے اور اپنے کمرے میں بٹھائے اور اس کے ساتھ باتیں کرے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ حاذق اسے بہت ہی اچھا لگتا تھا۔ یہ دراصل اُس کا نفسیاتی اور جذباتی معاملہ تھا۔ وہ حاذق کو اپنے بوڑھے خاوند کے مقابلے میں دیکھتی تھی۔ باہر کا کوئی اور آدمی تو اس محل میں جا ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ واحد آدمی تھا جو وہاں جاتا تھا اور اسے محل میں خصوصی پوزیشن حاصل تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ نُور کے دل میں اپنے خاوند کے خلاف انتقامی جذبہ بھی پرورش پا رہا تھا۔ نُور حاذق کو دیکھ کر مسکرا اٹھتی تھی۔ اس مسکراہٹ میں صحرا میں بھٹکتے ہوئے مسافر کی پیاس تھی اور اس مسکراہٹ میں پنجرے میں بند پنچھی کی تڑپ تھی۔ اُس کی اس بے ساختہ مسکراہٹ میں بیڑیوں میں جکڑی ہوئی لونڈی کی آہیں اور فریادیں تھیں۔ نُور پر پابندیاں ایسی لگی ہوئی تھیں کہ وہ حاذق کو روک نہیں سکتی تھی لیکن اُس کی مسکراہٹوں کو تو بیڑیاں نہیں ڈالی جا سکتی تھیں۔ حاذق اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو اُس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔

○

اب وہ حاذق اس کے سامنے کھیتوں میں کھڑا تھا۔ نُور نے پہلے تو کچھ یوں محسوس کیا جیسے وہ حاذق کو خواب میں دیکھ رہی ہو یا یہ اُس کا تصور ہو لیکن جب باتیں ہوئیں تو حاذق اُس کے سامنے حقیقی روپ میں آ گیا.... اب نُور آزاد تھی۔ شاید اسی لئے وہ پہلے سے زیادہ حسین لگتی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی اور مظلومیت کے تاثرات نہیں تھے جو اس کے چہرے پر چپک کے رہ گئے تھے۔ اس کی بیڑیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ شاہ در کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ عبدالملک کا محل تو وہیں تھا لیکن اب اس میں وہ نحوست اور ابلیسیت نہیں تھی۔ اب نُور کے اور حاذق کے درمیان کچھ بھی، کوئی بھی انسان حائل نہیں ہو سکتا تھا۔

"میرا خیال تھا تم یہاں نہیں ہو گے" ـــــ نُور نے حاذق سے کہا اور بے اختیار اُٹھ،

کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"مجھے جانا ہی کہاں تھا!" —— حاذق نے نُور کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا —— "یہ لوگ حسن بن صباح کے فرقے کے تھے اور میں اہلِ سنّت ہوں اور پکا مومن ہوں۔ میں نے تو اللہ کا شکر ادا کیا ہے کہ ان کا تختہ اُلٹ گیا ہے اور اسلام ایک بار پھر شاہ در میں داخل ہو گیا ہے۔"

"کیا تم شہر میں رہتے ہو؟" —— نُور نے پوچھا۔

"نہیں!" —— حاذق نے ایک گاؤں کی طرف اشارہ کر کے کہا —— "میں اُس گاؤں میں رہتا ہوں،... اکیلا ہی رہتا ہوں"۔

"اکیلا کیوں؟" —— نور نے پوچھا۔

"بیوی دھوکہ دے گئی ہے" —— حاذق نے جواب دیا —— "اَلَمُوت بھاگ گئی ہے۔ وہ باطنیوں کے جال میں آ گئی تھی۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا۔ مجھے اس کا کوئی غم نہیں۔ وہ ایک ابلیس کی مرید تھی' اچھا ہُوا اُسی کے پاس چلی گئی ہے اور میں دھوکے اور فریب سے محفوظ ہو گیا ہوں"۔

نُور نے حاذق کو بتایا کہ یہ اتنی زیادہ زمین اور کھیتیاں اُسے اور اُس کے باپ کو سلطان نے عطا کی ہیں اور شہر میں بڑا ہی اچھا اور کشادہ مکان بھی دیا ہے۔ حاذق نے اسے بتایا کہ اس نے آگے گاؤں کے اردگرد تمام کھیتیاں اس کی ہیں اور ان کھیتوں نے اُسے اچھی خاصی دولت دی ہے اور شہر میں عزّت بھی دی ہے۔

"آؤ میں تمہیں اپنے باپ سے ملواؤں" —— نُور نے کہا اور حاذق کا بازو پکڑ کر اُس طرف چل پڑی جہاں اُس کا باپ کام کروا رہا تھا۔

نُور کے باپ نے دیکھا کہ اُس کی بیٹی ایک آدمی کو اپنے ساتھ لا رہی ہے تو وہ اُس کی طرف چل پڑا۔ ذرا قریب گیا تو اس کے قدم رکنے لگے کیونکہ وہ حاذق کو پہچانتا ہی نہیں بلکہ جانتا بھی تھا۔ نُور کا باپ عبدالملک کا قابلِ اعتماد خادم بنا ہُوا تھا۔ کئی بار حاذق عبدالملک کے پاس نُور کے باپ کی موجودگی میں آیا اور ان کی باتیں نُور کے باپ نے بھی سنیں۔ اس کی نگاہ میں حاذق باطنی تھا اور عبدالملک کا بڑا ہی پکا اور برخوردار مرید تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ حاذق حسن بن صباح کے فرقے کا خاص آدمی تھا۔

حاذق نے آگے بڑھ کر نُور کے باپ سے مصافحہ کیا اور پھر اُس کے ساتھ بغلگیر ہو گیا

لیکن جس وارفتگی کا مظاہرہ اُس نے کیا تھا اتنی ہی سرد مہری کا مظاہرہ نُور کے باپ نے کیا۔

"میں کس طرح یقین کر سکتا ہوں کہ تم باطنی نہیں ہو؟" —— نُور کے باپ نے پوچھا۔

"کیا یہ بھی کوئی پیچیدہ مسئلہ ہے؟" —— حاذق نے جاں فزا مسکراہٹ سے جواب دیا —— "میرا یہاں موجود ہونا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ میں پکّا مسلمان ہوں اور ان باطنیوں کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں نُور کو بتا چکا ہوں کہ میری بیوی باطنی تھی اور وہ مجھے دھوکہ دے کر اَلَمُوت بھاگ گئی ہے۔ میں پہلے جان ہی نہ سکا کہ وہ ان شیطانوں کے چنگل میں آئی ہوئی ہے۔ آپ نے مجھ پر بجا طور پر شک کیا ہے۔ عبدالملک اور اس کے بھائی اور بیٹے کو میں نے اپنا دوست بنا رکھا تھا۔ یہ محض ایک فریب تھا۔ وہ دیکھیں میری کھیتیاں۔ کتنی دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر میں ان لوگوں کے ساتھ بگاڑ کر رکھتا تو وہ مجھے قتل کر کے میری اتنی وسیع و عریض جائیداد پر قبضہ کر لیتے۔ میں اپنی اس جائیداد کو اور اپنی حیثیت کو بچانے کی خاطر ان کے سامنے باطنی بنا رہا اور گھر میں باقاعدہ صوم و صلوٰۃ کی پابندی کرتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ میں سر اونچا کر کے اور سینہ تان کر اس شہر میں گھومتا پھرتا ہوں۔ اگر میں باطنی ہوتا تو میں پہلی صف کا باطنی ہوتا۔ میری کارروائیاں بڑی ہی تباہ کن ہوتیں لیکن یہاں مجھے جاننے والے جو لوگ ہیں ان سے پوچھو' وہ تمہیں بتائیں گے کہ میں نے کوئی ایسی حرکت یا کوئی ایسی بات کی ہو۔ عبدالملک بڑا استاد بنا پھرتا تھا لیکن میں اُسے بے وقوف بناتا رہا اور اُسے اپنی مٹھی میں بند رکھا۔ اس کے قتل کی خوشی جتنی مجھے ہوئی ہے وہ شاید کسی اور کو نہیں ہو گی۔ اللہ نے اس خاندان پر قہر نازل کیا اور پورا خاندان ہی ختم ہو گیا ہے"۔

حاذق نے اور بھی بہت سی باتیں کہہ کر ثابت کر دیا کہ وہ حسن بن صباح کا پیروکار نہیں بلکہ مردِ مومن ہے اور اب اسلام کے فروغ اور اس عظیم دین کی بقا کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتا ہے۔ وہ جب وہاں سے رخصت ہُوا تو نُور بڑی بے تابی سے کچھ دور تک اس کے ساتھ گئی اور چلتے چلتے اُس سے پوچھا کہ وہ اُسے کب اور کہاں ملے گا۔

حاذق نے اُسے بتایا کہ کل وہ شہر میں جو باغ ہے' اسے وہاں ملے گا۔ اُس نے وقت بھی بتا دیا اور باغ کا ایک خاص گوشہ بھی۔ شہر کے اندر یہ بڑا ہی خوبصورت باغ تھا جہاں اچھی حیثیت کے لوگ سیر سپاٹے کے لئے جایا کرتے تھے۔

حاذق چلا گیا اور نُور نے یوں محسوس کیا جیسے اُس کا چین اور سکون حاذق کے ساتھ ہی چلا گیا ہو۔ اُس نے اپنے آپ پر قابو پالیا ورنہ اُس کے قدم حاذق کے پیچھے ہی اُٹھ چلے تھے۔ وہ وہیں کھڑی حاذق کو جاتا دیکھتی رہی۔ اگر باپ اُسے آواز نہ دیتا تو وہ حاذق کو دیکھتی ہی رہتی۔

نُور اپنے باپ کے پاس پہنچی تو باپ سے یہ نہ پوچھا کہ اُس نے کیوں بلایا ہے بلکہ اس کے ساتھ حاذق کی ہی بات چھیڑ دی۔ وہ باپ سے منوانا چاہتی تھی کہ حاذق باطنی نہیں اور یہ پکا مسلمان ہے۔ نُور کے باپ کو مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی نہ صرف یہ کہ قائل ہو چکا تھا بلکہ وہ حاذق کا گرویدہ بن گیا تھا۔ یہ حاذق کی زبان کا جادو تھا جو باپ بیٹی پر اثر کر گیا تھا۔ اُس کے بولنے کا انداز بڑا ہی پیارا اور اثر انگیز تھا۔

"اتنی بڑی حیثیت کا آدمی اکیلا رہتا ہے" ۔۔۔ نُور نے کہا ۔۔۔ "اس کی زمینیں دیکھو کتنی دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں"۔

"میں تمہاری بات سمجھتا ہوں نُورا!" ۔۔۔ نُور کے باپ نے کہا ۔۔۔ "میں جانتا ہوں تم نے کیا سوچ کر یہ بات کہی ہے لیکن کسی سے متاثر ہو کر فوراً ہی اپنی آئندہ زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ کر لینا اچھا نہیں ہوتا۔ میں تمہارے متعلق ہی سوچتا رہتا ہوں۔ یہ اب مجھے سوچنے دو کہ تمہارے لئے حاذق کا انتخاب کروں یا اور انتظار کر لوں"۔

نُور تو اپنی زندگی کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن ابھی اس نے باپ کے ساتھ کھل کر بات نہ کی۔

○

وسم کوہ میں سالار اوریزی نے یہ جو تجربہ کیا تھا کہ حشیش کا داخلہ شہر میں بند کر دیا جائے اور تاجروں کا سامان کھول کر دیکھا جائے، پوری طرح کامیاب رہا تھا۔ اس کی کامیابی کا ایک واقعہ سنایا جا چکا ہے۔ اُس نے دوسرا تجربہ یہ کیا تھا کہ کوئی شخص اُس کے قریب نہ آئے۔ اگر کسی کا اس کے قریب آنا بہت ہی ضروری ہوتا تو اس شخص کی پوری طرح جامہ تلاشی لی جاتی تھی۔ سالار اوریزی نے سنجر کو پیغام بھیجا کہ وہ بھی شاہ در میں یہی طریقے اختیار کرے۔ شاہ در ایک بڑا شہر تھا اور بڑی منڈی بھی تھی اور یہاں سے اناج دوسرے مقامات کو جاتا تھا۔ سالار اوریزی نے سنجر کو تفصیلی پیغام بھیجا کہ وہ تاجروں کا

سارا سامان کھلوا کر دیکھا کرے اور ایسا انتظام کرے کہ شہر کے اندر جو سامان لایا جائے، خواہ وہ چھوٹی سی پوٹلی کیوں نہ ہو، کھول کر دیکھی جائے۔

سالار اوریزی نے دوسرا طریقہ یہ پیغام میں شامل کیا کہ سنجر کسی بھی آدمی کو، خواہ وہ غریب ہو یا امیر، اپنے قریب نہ آنے دے اور کسی کا آنا ضروری ہی ہو تو اُس کی جامہ تلاشی لی جائے۔

جس وقت سالار اوریزی کا قاصد سنجر کے پاس بیٹھا یہ پیغام دے رہا تھا، اُس وقت نُور شہر کے سب سے بڑے اور بڑے ہی خوبصورت باغ میں حاذق کے پاس ایک ایسے گوشے میں بیٹھی تھی جہاں انہیں ٹھنڈی ہواؤں کے سوا کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نُور بالکل اُسی طرح حاذق میں جذب ہو گئی تھی جس طرح شافعیہ نے اپنے آپ کو عبید عربی کی ذات میں تحلیل کر لیا تھا۔ یہ صرف محبت نہیں بلکہ عشق کی دیوانگی تھی۔ نُور پر تو اُس صحرانورد کی کیفیت طاری تھی جو بھٹک بھٹک کر، پیاس سے مرا مرا کرتا اور اپنے آپ کو گھسیٹتا ایک نخلستان میں پہنچ گیا ہو اور اُس نے فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ باقی عمر اسی نخلستان میں گذار دے گا۔ وہاں ٹھنڈا پانی تھا اور گھنے پیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں تھی۔

اس کے بعد نُور کی زندگی ایک بڑے ہی حسین خواب کی طرح گزرنے لگی۔ نُور نے حاذق کو بتا دیا تھا کہ اُس کا باپ علی الصبح نکل جاتا ہے اور وہ گھر میں دوپہر تک اکیلی ہوتی ہے۔ حاذق نے نُور کو اپنے ایک دوست کا گھر بتا دیا تھا جو اکیلا رہتا تھا۔ پھر ملاقاتوں کا یہ سلسلہ شروع ہو گیا کہ حاذق کبھی نُور کے گھر آ جاتا اور کبھی نُور حاذق کے دوست کے گھر میں چلی جاتی اور وہ بہت دیر اس طرح بیٹھے رہتے جیسے ان کے جسم ایک ہو گئے ہوں۔ حاذق نے نُور کو تو جیسے ہپناٹائز کر لیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ نُور ہپناٹائز ہونا چاہتی تھی۔ اُس پر خود سپردگی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔

اس کے ساتھ ہی حاذق تقریباً ہر روز نُور کے باپ سے ملتا تھا اور اُس کی زمینوں میں عملی دلچسپی لیتا تھا۔ وہ اس طرح کہ اس نے نُور کے باپ کے نوکروں کے ساتھ اپنے مزارعے بھی لگا دیئے۔ نُور کا باپ کاشتکاری سے واقف نہیں تھا۔ حاذق نے اس کا یہ کام آسان کر دیا۔ نُور کے باپ نے دو تین مرتبہ حاذق کو شام کے کھانے پر اپنے گھر مدعو کیا۔ یہ باپ اپنی بیٹی کی جذباتی حالت بھی دیکھ رہا تھا اور حاذق کی نیت کو اور خلوص کو بھی دیکھ رہا تھا جس میں اسے کوئی شک و شبہ والی بات نظر نہیں آتی تھی۔

ایک روز حاذق نے نُور کے باپ سے نُور کو مانگ ہی لیا۔ نُور کا باپ تو اسی کا منتظر تھا۔ حاذق کے منہ سے بات نکلی ہی تھی کہ نور کے باپ نے بصد خوشی ہاں کر دی۔

اب شادی کا دن مقرر کرنا تھا۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا' کسی دن بھی یہ بات طے ہو سکتی تھی.... شام گہری ہوئی ہی تھی کہ حاذق کے گھر ایک گھوڑ سوار بڑے لمبے سفر سے آیا۔ حاذق اُٹھ کر اور بازو پھیلا کر اُس سے بغلگیر ہو کر ملا۔ یہ سوار اَلمُوت سے آیا تھا اور حسن بن صباح کا ایک پیغام لایا تھا۔ حاذق نے اپنے نوکر سے کہا کہ وہ ٹھنڈا مشروب لائے لیکن سوار نے کہا کہ پہلے وہ پیغام سن لے' کھانا پینا بعد کی بات ہے۔

"حاذق بھائی!" ـــــ سوار نے کہا ـــــ "یہ تو تم جانتے ہو کہ شیخ الجبل کے پیر استاد عبدالملک بن عطاش قتل ہو چکے ہیں.... یہ جو انقلاب آیا ہے' اس سے تم واقف ہو۔ اس کے متعلق بات کرنا بیکار ہے۔ شیخ الجبل امام حسن بن صباح کو ایک اور غم کھا رہا ہے۔ اُس کے پیرو مُرشد نے اُسے بتایا تھا کہ شاہ در کے قریب اُنھوں نے ایک خزانہ چھپایا تھا۔ وہ جگہ کسی کو معلوم نہیں۔ امام نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے کہ شاہ در میں دو آدمی ہیں جو اس خزانے سے واقف ہیں۔ خزانہ ایسی چیز ہے کہ بھائی اپنے بھائی کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ وہ دو آدمی خزانے پر ہاتھ صاف کر جائیں گے۔ امام نے تمہارے لئے پیغام بھیجا ہے کہ پہلے ان دو آدمیوں کا سُراغ لگاؤ۔ یہاں کے معاملات تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ اپنے تمام آدمیوں کو تم جانتے ہو۔ شیخ الجبل امام حسن بن صباح کو یہ خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ جب ہمارے لوگ شاہ در سے بھاگے تھے تو وہ دو آدمی بھی بھاگ گئے ہوں گے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس خزانے کو ذہن سے اتار دینا چاہئے"۔

"عمار بھائی!" ـــــ حاذق نے حسن بن صباح کے اس قاصد سے کہا ـــــ "تم شاید نہیں جانتے کہ میں امام حسن بن صباح کا کس قدر شیدائی اور گرویدہ ہوں۔ یہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ میں اس کی عظیم ذات کو دھوکہ دوں گا۔ خزانے سے جو دو آدمی واقف ہیں' ان میں ایک تو میں ہوں اور دوسرا شاہ در کے اندر رہتا ہے۔ وہ بھی دھوکہ دینے والا آدمی نہیں۔ ہم دونوں یہاں اسی لئے ٹھہرے ہوئے ہیں کہ امام کا حکم آئے اور ہم یہ خزانہ نکال کر اُس کے قدموں میں رکھ دیں۔ اگر کچھ دن اور امام کا حکم نہ آتا تو میں خود اَلمُوت پہنچ جاتا اور امام کو اس خزانے کے متعلق بتا دیتا"۔

"تو اب میں امام کو جا کر کیا جواب دوں؟" ـــــ عمار نے پوچھا۔

"کہنا کہ خزانہ کچھ دنوں تک المُوت پہنچ جائے گا" ـــــ حاذق نے جواب دیا ـــــ "تم کل صبح ہی واپسی سفر پر روانہ ہو جانا"۔

"شیخ الجبل امام نے مجھے ایک اور بات بھی کہی تھی" ـــــ عمار نے کہا ـــــ "اُس نے کہا تھا کہ تمہیں یا کسی دوسرے کو میری ضرورت ہو تو میں یہاں رکا رہوں"۔

"نہیں!" ـــــ حاذق نے کہا ـــــ "تم چلے جاؤ۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ ہم دو آدمی کافی ہیں.... میں امام کے لئے ایک حُور بھی لا رہا ہوں"۔

"کون ہے وہ؟" ـــــ عمار نے پوچھا ـــــ "کہاں سے ملی ہے؟"

"شاہ در کے امیر احمد بن عطاش کی نوجوان بیوی تھی" ـــــ حاذق نے جواب دیا ـــــ "ہمارے ہاتھوں سے شاہ در جو نکلا ہے' اس کے پیچھے اسی لڑکی اور اس کے باپ کا ہاتھ تھا.... لیکن عمار بھائی ایک مشورہ دو۔ مجھے پہلی بار کسی لڑکی کے ساتھ دلی بلکہ روحانی محبت ہوئی ہے۔ اپنی جنّت کی حوروں کے ساتھ بھی وقت گزرا ہے اور زندگی میں چند اور لڑکیاں بھی آئی ہیں لیکن وہ سب جسمانی معاملہ تھا۔ یہ پہلی لڑکی ہے جو میرے دل میں اُتر گئی ہے اور میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن امام کی اجازت کے بغیر میں شادی نہیں کروں گا"۔

"حاذق بھائی!" ـــــ عمار نے کہا ـــــ "تم یہ خزانہ امام تک پہنچا دو اور ساتھ یہ کہہ دینا کہ یہ لڑکی تمہیں انعام کے طور پر دے دے تو مجھے یقین ہے امام انکار نہیں کرے گا۔ کیا تم لڑکی کو ساتھ لا رہے ہو؟"

"لڑکی کو بھی اور لڑکی کے باپ کو بھی ساتھ لا رہا ہوں" ـــــ حاذق نے جواب دیا ـــــ "اگر میں لڑکی کو ساتھ نہ لایا تو یہ کسی سلجوقی کے قبضے میں چلی جائے گی"۔

"میں امام کو پہلے ہی بتا دوں گا" ـــــ عمار نے کہا ـــــ "اور تمہاری سفارش بھی کر دوں گا"۔

○

وہ دوسرا آدمی جو اس خزانے سے واقف تھا' حاذق کا وہی دوست تھا جو شاہ در شہر میں اکیلا رہتا تھا اور نُور حاذق سے اس کے گھر میں کئی بار ملی تھی اور ہر بار اُس نے وہاں خاصا وقت گزارا تھا۔ اگلے ہی روز حاذق علی الصبح شہر کے دروازے کھلتے ہی آ گیا اور نُور کے گھر آ پہنچا۔ نُور کا باپ ابھی روزمرّہ کے کام کاج کے لئے گھر سے نہیں نکلا تھا۔ نُور

اسے دیکھ کر خوش بھی ہوئی اور حیران بھی کہ حاذق اتنی سویرے کیوں آ گیا ہے۔ حاذق نے انہیں بتایا کہ وہ ایک ضروری بات کرنے آیا ہے۔

"تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ عبدالملک کے ساتھ میرے تعلقات کتنے گہرے تھے" — حاذق نے کہا — "تمہیں اندازہ نہیں کہ ہم کس حد تک ایک دوسرے کے ہمراز تھے۔ میں تمہارے ساتھ ایسی بات کرنے لگا ہوں جس کا کسی کے ساتھ ذکر نہ ہو ورنہ ہم تینوں قتل ہو جائیں گے۔ بات یہ ہے کہ عبدالملک نے شاہ در سے کچھ دور ایک جگہ بہت بڑا خزانہ چھپایا تھا۔ میں اُس کے ساتھ تھا اور ہمارے ساتھ ایک اور دوست تھا۔ عبدالملک مجھے باطنی سمجھتا تھا اور قابلِ اعتماد دوست بھی۔ میں اُس کی زندگی میں اُسے ایسا دھوکہ نہیں دینا چاہتا تھا کہ اپنے دوست کو ساتھ لے کر وہ خزانہ اُڑا لے جاتا اور پھر کبھی اِدھر کا رُخ ہی نہ کرتا۔ اب وہ اس دنیا سے اٹھ گیا ہے اور اُس کے گھر کا کوئی مرد زندہ نہیں رہا تو میں نے سوچا کہ میں یہ خزانہ کیوں نہ نکال لوں!"

"یہ تمہارا جائز حق ہے" — نُور نے کہا — "میرے دل سے پوچھو تو مجھے خزانے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں لیکن چونکہ یہ خزانہ ان باطنیوں کا تھا بلکہ باطنیوں کے پیرو مُرشد کا تھا اس لئے اسے اڑا لینا یا نکال لینا ایک نیکی کا کام ہے اور یہ تمہارا جائز حق ہے"۔

"مجھ سے پوچھو تو میں بھی یہی کہوں گا" — نُور کا باپ بولا — "خزانہ نکالو اور اپنی ملکیت میں رکھو"۔

"لیکن میں اس خزانے کا اکیلا مالک نہیں بننا چاہتا" — حاذق نے کہا — "تم نے اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا ہے۔ خزانے پر میرا اتنا حق نہیں جتنا تم دونوں کا ہے۔ نُور پر ان لوگوں نے جو ظلم ڈھائے ہیں، میں اس کی یہ قیمت دے سکتا ہوں کہ ان لوگوں کا خزانہ نُور کے قدموں میں رکھ دوں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا"۔

"یہ بھی تو سوچو" — نُور کے باپ نے کہا — "یہ سارا خزانہ لُوٹ مار کا ہے۔ نہ جانے یہ لوگ کب سے قافلوں کو لُوٹ رہے ہیں اور یہ خزانہ اکٹھا کرتے رہے ہیں۔ اس خزانے کو نکال ہی لینا چاہئے"۔

"تمہیں بھی تو لُوٹا گیا تھا" — حاذق نے کہا — "اللہ کا کرم دیکھو، تم سے جو لُوٹا گیا تھا، اس سے کئی گنا زیادہ تمہیں اللہ نے دے دیا ہے.... خزانہ تو سمجھو نکل آیا۔ اب میں

وہ بات کہنے لگا ہوں جو بہت ہی ضروری ہے۔ ہم جب خزانہ نکالنے جائیں گے تو تم دونوں ہمارے ساتھ ہو گے۔ پھر ہم یہاں واپس نہیں آئیں گے ورنہ خزانہ چھپانا مشکل ہو جائے گا۔ ہم وہیں سے اصفہان چلے جائیں گے جہاں ہمیں جاننے اور پہچاننے والا کوئی نہیں ہو گا۔ میں تمہیں خواب نہیں دکھا رہا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم تینوں وہاں شاہانہ زندگی بسر کریں گے"۔

حاذق دراصل نُور اور اُس کے باپ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے تیار کر رہا تھا۔ وہ تیار ہو گئے تو اُس نے انہیں بتانا شروع کیا کہ خزانہ کہاں ہے اور کس قسم کے خطروں میں سے گزر کر خزانے تک پہنچا جائے گا.... شاہ در سے تقریباً ایک دن کی مسافت پر ایک بہت بڑی جھیل ہُوا کرتی تھی۔ یہ جھیل نیم دائرے میں تھی۔ اس کے درمیان خشکی تھی اور اس خشکی پر بڑی اونچی اور کچھ نیچی چٹانیں تھیں۔ ان کے پیچھے خشکی ہی تھی لیکن کچھ آگے جا کر جھیل کا پانی پھر وہاں پھیل گیا تھا۔ اس جھیل کے کناروں پر دلدل تھی۔ یہ جگہ مگرمچھوں کے لئے بڑی موزوں تھی۔ اس جھیل میں مگرمچھ رہتے تھے جن کی تعداد بہت زیادہ تو نہیں تھی لیکن تھوڑی بھی تھی تو یہ تعداد بہت ہی خطرناک تھی۔ مگرمچھ بہت بڑے بڑے تھے اور ان میں مگرمچھوں کی وہ قسم بھی پائی جاتی تھی جن کی لمبائی تھوڑی سی ہوتی ہے۔

نُور نے پوچھا کہ ان مگرمچھوں سے کس طرح بچا جائے گا تو حاذق نے بتایا کہ اس کا انتظام وہ کرے گا اور یہ انتظام انہیں جھیل پر پہنچ کر دکھایا جائے گا۔ حاذق نے یہ بھی کہا کہ انہیں جان کے خطرے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

خزانہ ایسی چیز ہے کہ انسان جان کا خطرہ بھی مول لے لیا کرتا ہے۔ باپ بیٹی ان خطروں میں کودنے کے لئے تیار ہو گئے اور حاذق نے انہیں جتا دیا کہ کس روز روانہ ہونا ہے۔ اُس نے انہیں یہ بھی بتایا کہ روانگی کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ شاہ در کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ جائیں گے۔

○

دو دنوں بعد نُور اور اُس کا باپ گھر سے نکلے تو ان کے ساتھ گھر کا کچھ ضروری سامان تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے شاہ در سے نکل رہے تھے۔ کسی نے ان کی طرف توجہ نہ دی کہ یہ کیا اٹھا کر لے جا رہے ہیں اور کسی کو ذرا سا بھی شک نہ ہُوا کہ یہ آج واپس نہ آنے کے

لئے جا رہے ہیں۔ شہر سے نکل کر وہ اپنی کھیتوں میں گئے اور وہاں رکے نہیں۔۔ کام کرنے والے نوکروں نے کچھ دیر بعد آنا تھا۔ وہ چلتے چلے گئے اور حاذق کے گھر جا پہنچے۔ ایسے ہی طے کیا گیا تھا۔ حاذق ان کا منتظر تھا۔

کچھ دیر بعد حاذق کا دوست بھی آ گیا۔ انہوں نے سارا دن وہیں گذارا۔ حاذق اور اس کا دوست باہر چلے گئے تھے کیونکہ انہوں نے بہت سے انتظامات کرنے تھے۔

شام گہری ہو گئی تو شاہ در کے تمام دروازے بند ہو گئے اور شہر باہر کی دنیا سے کٹ گیا۔ شہر سے تھوڑی ہی دور چھوٹے سے ایک گاؤں سے ایک گھوڑا گاڑی نکلی۔ یہ گھوڑا گاڑی حاذق کے گھر سے نکلی تھی۔ یہ کوئی شاہانہ بگھی نہیں تھی بلکہ باربرداری والی تھی۔ اس پر تازہ کٹی ہوئی ہری فصل کے چند ایک گٹھے لدے ہوئے تھے اور کچھ گھریلو سامان تھا جس میں دو تین چارپائیاں بھی تھیں۔ گھوڑوں کی باگیں حاذق کے ہاتھ میں تھیں اور اس کے ساتھ اس کا دوست بیٹھا ہوا تھا۔ پیچھے سامان پر نور اور اس کا باپ سوار تھے۔

اس سامان کے ساتھ پانچ بھیڑیں بھی تھیں جو اس گاڑی میں جا رہی تھیں۔ حاذق نے نور اور اس کے باپ کو بتایا تھا کہ یہ سامان نئی جگہ لے جانا بالکل ضروری نہیں، یہ اس لئے ساتھ لے جایا جا رہا ہے کہ خزانے کے بکس اس سامان کے نیچے چھپائے جائیں گے۔ خزانے والی جگہ سے اصفہان تک کئی دنوں کی مسافت تھی اور لٹیروں کا خطرہ بھی تھا۔ بھیڑوں کے متعلق اس نے بتایا کہ یہ جھیل پر جا کر بتائے گا۔

جھیل تک کا سفر تقریباً" ایک دن کا تھا لیکن حاذق نے کچھ دور جا کر گھوڑے دوڑا دیئے اور یہ سفر تیزی سے کم ہونے لگا۔ گھوڑے بڑے ہی تندرست اور اچھی نسل کے تھے۔ راستہ صاف تھا اس لئے ان کی رفتار تیز ہی تیز ہوتی چلی جا رہی تھی۔ آدھے راستے میں حاذق نے گاڑی روک لی تاکہ گھوڑے ذرا دم لے لیں۔

آدھی رات کے بہت بعد وہ جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔ حاذق نے گاڑی کو جھیل کے کنارے سے کچھ دور دور رکھا تاکہ مگرمچھ گھوڑوں پر لپک نہ سکیں۔ مگرمچھ پانی میں اپنا شکار پکڑا کرتا ہے، خشکی پر آ کر وہ شکار نہیں کھیلا کرتا۔ حاذق نے ایسی جگہ جا گاڑی روکی جہاں چار پانچ کشتیاں کنارے پر رکھی ہوئی تھیں۔ یہ پانی میں نہیں بلکہ خشکی پر تھیں۔

سب گھوڑا گاڑی میں سے اُترے۔ حاذق نے سامان میں سے چار بڑی مشعلیں نکالیں اور چاروں کو جلا لیا۔ ان کے دستے ایک ایک گز سے زیادہ لمبے تھے اور ان کے

شعلے تو بہت ہی اوپر جا رہے تھے۔ حاذق نے ایک ایک مشعل سب کو دے دی۔ اب چاروں کے ہاتھوں میں ایک ایک مشعل تھی۔

وہ جھیل کے کنارے پڑی ہوئی کشتیوں کے قریب گئے۔ دو کشتیاں تو بالکل ٹوٹ گئی تھیں۔ ان سب میں ایک کشتی بڑی بھی تھی اور صحیح سلامت بھی تھی اور اس میں دو چپو لگے ہوئے تھے۔ حاذق اور اس کے دوست نے پانچوں بھیڑوں کو اُٹھا کر کشتی میں ڈال لیا اور پھر حاذق کے کہنے پر سب کشتی میں سوار ہو گئے۔ دونوں دوستوں نے چپو سنبھال لئے۔

کشتی کنارے سے ذرا ہی دُور گئی ہو گی کہ مشعلوں کی روشنی میں دو تین مگرمچھوں کے منہ پانی سے اُبھرے ہوئے نظر آئے۔ یہ مگرمچھ بڑی تیزی سے کشتی پر حملہ کرنے کے لئے آ رہے تھے۔ حاذق کے دوست نے چپو چھوڑ کر ایک بھیڑ کو اٹھایا اور پانی میں پھینک دیا۔ سارے مگرمچھ اس بھیڑ کی طرف ہو گئے اور اُس پر ٹوٹ پڑے۔ بھیڑ نے ایسی خوفزدگی کے عالم میں آوازیں نکالیں کہ دل دہل جاتے تھے۔

یہ مگرمچھ اس بھیڑ کو چیرنے پھاڑنے لگے۔ یوں لگا جیسے پانی میں طوفان آ گیا ہو، کشتی آگے نکل گئی۔ کچھ آگے گئے تو دو اور مگرمچھ کشتی کی طرف آتے نظر آئے۔ حاذق کے دوست نے ایک اور بھیڑ کو اٹھا کر پانی میں پھینک دیا۔ یہ مگرمچھ بھی بھیڑ پر جھپٹ پڑے اور کشتی آگے نکل گئی۔

حاذق نے نُور اور اُس کے باپ کو جایا کہ اب مگرمچھوں کا کوئی خطرہ نہیں رہا کیونکہ جھیل کے سارے مگرمچھوں کو پتہ چل گیا تھا کہ پانی میں کوئی نیا شکار آیا ہے۔ وہ سب بڑی تیزی سے تیرتے اپنے اُن ساتھیوں تک جا پہنچے جو ان بھیڑوں کو چیر پھاڑ رہے تھے۔

○

آخر کشتی اُس خشکی تک جا پہنچی جو اس جھیل کے درمیان تھی۔ وہاں بھی ایک بھیڑ پھینکی پڑی کیونکہ وہاں کنارے پر تین چار مگرمچھ موجود تھے۔ بھیڑ کے گرتے ہی وہ بڑی تیزی سے اس تک پہنچے اور حاذق اور اس کا دوست کشتی کو کنارے تک لے گئے اور دونوں کود کر خشکی پر گئے اور کشتی کا رسہ کھینچ کر ایک بڑے پتھر کے ساتھ باندھ دیا۔ نُور اور اُس کے باپ کو بھی اُترنے کے لئے کہا گیا۔ دونوں بڑے آرام سے اُتر گئے۔

حاذق آگے آگے جا رہا تھا۔ زمین بڑی ہی ناہموار تھی۔ چھوٹے بڑے پتھروں پر

پاؤں پڑتے اور پھسلتے تھے۔ ذرا آگے گئے تو چٹانوں کی گلیاں سی آگئیں۔ حیرت والی بات یہ تھی کہ یہ خشکی جھیل کے درمیان میں تھی لیکن وہاں گھاس کی ایک پتّی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ ایسی چٹانیں بھی آئیں جن کے درمیان سے گزرنا ناممکن نظر آتا تھا لیکن یہ لوگ جسم کو سکیڑ سمیٹ کر گزر گئے۔ انہیں کئی موڑ کاٹنے پڑے اور چٹانیں اونچی ہی اونچی ہوتی چلی گئیں۔

قدرت نے ان چٹانوں کی شکل و صورت ایسی بنائی تھی کہ یہ انسانی معماروں کی بنی ہوئی لگتی تھیں۔ بعض جگہوں پر گلیاں اتنی تنگ تھیں اور چٹانیں اتنی اونچی کہ وہاں دم گھٹتا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے یہ چٹانیں آگے بڑھ کر ان انسانوں کو کچل ڈالیں گی۔ آخر ایک گلی ایک غار کے دہانے پر جا ختم ہوئی۔

اس دہانے میں داخل ہوئے تو یوں لگا جیسے وہ ایک کشادہ کمرے میں آگئے ہوں۔ ایک جگہ بہت سے پتھر ڈھیر کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔ حاذق نے سب سے کہا کہ یہ پتھر ایک طرف پھینکنے شروع کر دو۔ نُور کو بھی پتھر اُٹھا اُٹھا کر پھینکنے پڑے۔ کچھ پتھر تو زیادہ ہی وزنی تھے۔

پتھر آدھے ہی ہٹائے گئے ہوں گے کہ ان کے نیچے پڑے ہوئے چار بکس نظر آنے لگے۔ باقی پتھر بھی ہٹا دیئے گئے۔

حاذق اور اُس کے دوست نے چاروں بکسوں کے ڈھکنے اٹھا دیئے۔ بکس مقفّل نہیں تھے۔ جب ڈھکنے اُٹھے تو نُور اور اُس کے باپ کو تو جیسے غشی آنے لگی ہو۔ ان بکسوں میں سونے کے سکّے اور زیورات تھے اور ہیرے اور جواہرات تھے اور ایک بکس میں بڑے قیمتی، رنگ دار اور چمکدار چھوٹے چھوٹے پتھر تھے۔ یہ بادشاہوں کے کام کی چیزیں تھیں یا بڑے ہی امیر لوگ ان کے خریدار تھے۔ مشعلوں کی روشنی میں سونا، ہیرے، جواہرات اور یہ پتھر چمکتے تھے اور ان میں سے رنگا رنگ کرنیں پھوٹتی تھیں۔ حاذق نے کہا کہ اب زیادہ وقت ضائع نہ کرو اور یہ بکس کشتی تک پہنچاؤ۔ اُس وقت حاذق اور اُس کے دوست کی جذباتی کیفیت ایسی ہو گئی تھی جیسے انہوں نے کوئی نشہ پی لیا ہو۔ یہ خوشی کی انتہا تھی اور یہ خزانے کا نشہ یا جادو تھا جو ان کے دماغوں کو چڑھ گیا تھا۔ وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے جو خوشی کی انتہا کی علامت تھی۔

"یا شیخ الجبل!" —— حاذق کے دوست نے بازو اوپر کر کے کہا —— "یہ سب تیری

دولت ہے۔ ہم یہ خزانہ تیرے قدموں میں رکھیں گے"۔

"ہمارے پیر اُستاد عبدالملک کی روح بھی خوش ہو جائے گی جب ہم اَلمُوت....."
—— حاذق بولتے بولتے چُپ ہو گیا اور لہجہ بدل کر بولا —— "بکس جلدی اٹھاؤ، ہمیں اصفہان پہنچنا ہے"۔

نُور کے باپ نے ان دونوں کی باتیں سن لی تھیں۔ حاذق نے اپنے دوست کی طرف دیکھا اور نُور کے باپ نے منہ پھیر لیا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اُسے یقین ہو گیا کہ یہ دونوں باطنی ہیں اور یہ خزانہ اَلمُوت لے جائیں گے۔ نُور کے باپ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اُس کے اور اس کی بیٹی کے ساتھ یہ کیا سلوک کریں گے۔ اُس نے بڑی تیزی سے سوچ لیا کہ کیا کرنا ہے۔

بکسوں کے دونوں طرف لوہے کے کُنڈے لگے ہوئے تھے جنہیں پکڑ کر بکس اٹھائے جاتے تھے۔ ایک بکس حاذق اور اس کے دوست نے اِدھر اُدھر سے پکڑ کر اٹھا لیا اور دوسرا بکس نُور اور اُس کے باپ نے اٹھایا۔ بکس وزنی تو تھے لیکن وہ اٹھا کر باہر لے آئے۔ اب ان کے لئے چلنا خاصا دشوار ہو گیا تھا لیکن وہ بکسوں کو کہیں اٹھاتے اور کہیں گھسیٹتے دھکیلتے جھیل تک لے آئے۔

انہوں نے یہ دونوں بکس کشتی میں رکھ دیئے۔ نُور کے باپ نے دیکھا کہ کشتی کا اگلا حصہ خشکی پر تھا اور زیادہ تر حصہ پانی میں تھا۔ جب حاذق اور اس کا دوست بکس رکھ کر واپس پھر غار کی طرف گئے تو نُور کے باپ نے کشتی کو دھکیل کر پانی میں کر دیا۔ کشتی رسے سے بندھی ہوئی تھی اس لئے اس کے بہہ جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ باپ بیٹی کشتی سے کود کر اُترے اور خزانے کی طرف چلے گئے۔

○

جس طرح وہ چاروں پہلے دو بکس اٹھا کر لے آئے تھے اسی طرح باقی دو بکس بھی اٹھا لائے۔ ایک ایک ہاتھ سے بکس اٹھاتے تھے اور دوسرے ہاتھوں میں ایک ایک مشعل تھی۔

اب وہ کشتی کی طرف بکس اٹھا کر آ رہے تھے تو پہلے کی طرح نُور اور اُس کا باپ پیچھے نہیں تھے بلکہ آگے آگے آ رہے تھے۔ وہ اتفاقیہ آگے آگے نہیں آئے تھے بلکہ نُور کے باپ نے کچھ سوچ کر یہ پھرتی دکھائی تھی کہ غار میں جا کر بکس اٹھا لیا اور تیزی سے غار سے

نکل آیا تھا۔

نورؔ اور اس کے باپ نے بکس کشتی میں رکھا اور دونوں کشتی میں آ گئے۔ حاذق اور اُس کا دوست بکس اٹھائے ہوئے کشتی کے قریب آئے تو نورؔ کے باپ نے لپک کر بکس پکڑا اور گھسیٹ کر کشتی میں کر لیا۔ اب اُن دونوں نے کشتی میں سوار ہونا تھا۔ نورؔ کے باپ نے فوراً اپنی مشعل نورؔ کے ہاتھ سے لی اور بڑی ہی تیزی سے مشعل پہلے حاذق کے جسم کے ساتھ لگائی اور پھر فوراً ہی اُس کے دوست کے جسم کے ساتھ لگا دی۔

مشعل کا شعلہ بہت بڑا تھا۔ اس شعلے نے دونوں کے کپڑوں کو آگ لگا دی اور آگ نے یکلخت اُن کے پورے لباس کو لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی نورؔ کے باپ نے نورؔ سے کہا کہ مشعل آگے کرو اور کشتی کا رسہ جلا ڈالو.... رسہ بندھا ہوا تھا جسے کھولنے کے لئے نورؔ یا اُس کے باپ کو کشتی سے اُترنا تھا لیکن اتنا وقت نہیں تھا۔ نورؔ نے مشعل آگے کر کے رسّے کے درمیان لگا دی۔ فوراً ہی رسہ جل گیا اور کشتی پانی میں آ گئی بلکہ آہستہ آہستہ چل پڑی۔

حاذق اور اس کے دوست کے کپڑوں کو آگ لگی تو دونوں پانی میں کود گئے۔ آگ تو بجھ گئی لیکن ان کے جسم جل گئے تھے جن پر پانی پڑا تو تکلیف بڑھنے لگی۔ آخر وہ دونوں جوان اور دلیر آدمی تھے۔ پانی میں ہی دونوں نے اپنی تلواریں نکال لیں اور کشتی کی طرف لپکے۔ اتنی سی دیر میں نورؔ اور اس کے باپ نے مشعلیں کشتی میں ٹھونک کر تیزی سے چپّو مارے تو کشتی کنارے سے دُور آ گئی لیکن وہ دونوں بھی کشتی کے قریب آ گئے۔

نورؔ کے باپ نے نورؔ سے کہا کہ دونوں چپّو سنبھالو اور کشتی کو رُکنے نہ دینا۔ حاذق اور اس کا دوست بڑی تیزی سے تیرتے کشتی کے قریب آئے اور انہوں نے کشتی کو پکڑنے کی کوشش کی۔ نورؔ کے باپ نے دونوں مشعلیں اٹھا کر ایک کا شعلہ حاذق کے چہرے پر اور دوسری کا شعلہ اس کے دوست کے چہرے پر رکھ دیا اور زور سے آگے کو دھکیلا۔ تصوّر میں لایا جا سکتا ہے کہ اُن کی آنکھیں تو فوراً ہی بیکار ہو گئی ہوں گی اور چہرے تو بُری طرح جلے ہوں گے۔ دونوں کی اس طرح چیخیں سنائی دینے لگیں جیسے بھیڑیے غرّا اور چلّا رہے ہوں۔ اب ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ آگے بڑھتے‘ وہ تو ڈوب رہے تھے۔

نورؔ کے باپ نے ایک چپّو نورؔ کے ہاتھ سے لے لیا اور دونوں تیزی سے چپّو چلانے لگے۔ دونوں دائیں بائیں جھیل میں دیکھ رہے تھے کہ مگرمچھ نہ آ جائیں۔ آ بھی جاتے تو

ان کے پاس بندوبست موجود تھا۔ دو بھیڑیں ابھی کشتی میں موجود تھیں لیکن اب مگرمچھوں کو شکار مل گیا تھا۔ یہ تھا حاذق اور اُس کا دوست۔ دُور سے ان دونوں کی بڑی ہولناک آوازیں سنائی دیں جو فوراً ہی ختم ہو گئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے دونوں کو مگرمچھوں نے پکڑ لیا ہو۔ مشعلوں کی روشنی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ کشتی میں مشعلیں کھڑی رکھنے کا انتظام تھا۔ نور کے باپ نے دونوں مشعلیں ان جگہوں میں پھنسا دی تھیں۔

○

نورؔ کے باپ نے یہ کوشش نہ کی کہ کشتی کو اُس جگہ تک لے جائے جہاں سے انہوں نے کشتی لی تھی اور جہاں گھوڑا گاڑی رکی کھڑی تھی۔ اُن دونوں نے کشتی کو قریبی کنارے پر لگا دیا اور اُتر آئے۔ دونوں نے پورا زور لگا کر کشتی کو اتنا کھینچا کہ آدھی کشتی خشکی پر آ گئی۔

باپ نے نورؔ سے کہا کہ وہ کشتی کے قریب کھڑی رہے اور اگر کشتی پانی میں جانے لگے تو اسے پکڑ کر کھینچ لے۔ وہ خود گھوڑا گاڑی لینے چلا گیا۔ اب وہ ہر خطرے سے نکل آئے تھے۔

نورؔ کا باپ گھوڑا گاڑی وہیں لے آیا اور کشتی کے قریب روک کر باپ بیٹی کشتی سے بکس اتارنے لگے۔ وہ علاقہ ایسا تھا جہاں سے کسی انسان کا گزر نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہ علاقہ کسی راستے میں نہیں آتا تھا اور خطرناک بھی اتنا تھا کہ اِدھر سے کوئی گزرتا ہی نہیں تھا۔

دونوں نے زور لگا کر چاروں بکس گھوڑا گاڑی میں لاد لئے اور سوار ہو گئے۔ گھوڑوں کی باگیں باپ نے سنبھال لیں اور گاڑی شاہ در کی طرف موڑ کر چل پڑے۔ نورؔ ابھی دیکھ رہی تھی کہ باپ یہ خزانہ کہاں لے جاتا ہے۔ نورؔ کی توجہ دراصل خزانے پر تھی ہی نہیں۔ وہ بہت بڑے صدمے سے دوچار تھی۔ اُسے جس کے ساتھ روحانی محبت ہو گئی تھی‘ اسے وہ اپنے ہاتھوں جلا کر اور ڈبو کر جا رہی تھی۔ حاذق کے خیال سے اور اس کے انجام سے اُسے اتنا شدید صدمہ ہوا کہ اس کے آنسو بہہ نکلے اور پھر وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

”روتی کیوں ہو؟“ ——باپ نے نورؔ سے کہا —— ”کیا ہمیں خوش نہیں ہونا چاہئے کہ ہم بہت بڑے دھوکے سے بچ گئے ہیں؟.... یہ باطنی تھے اور یہ سیدھے الموت جا

رہے تھے۔ مجھے تو یہ راستے میں ہی قتل کر دیتے اور تمہیں وہاں لے جا کر حسن بن صباح کے حوالے کر دیتے اور وہ ابلیس تمہیں اپنی جنت کی حُور بنا دیتا۔ آج تم ایک خاوند کی تلاش میں ہو' وہاں ہر روز تمہارا ایک نیا خاوند ہوتا.... اللہ کا شکر ادا کرو جس نے ہمیں اس ذلت سے بچا لیا ہے۔ خدا کی قسم مجھے اس خزانے کی خوشی نہیں' خوشی ہے تو یہ ہے کہ میں آخر تمہیں بچا لایا ہوں"۔

نورؔ کو اصل غم تو یہ تھا کہ اُس کی قسمت میں یہی لکھا گیا تھا کہ ایک فریب کار کے چُنگل سے نکلے تو ایک اور فریب کار کے جال میں آ جائے.... نورؔ کے لئے یہ صدمہ برداشت کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بہرحال اس نے یہ انتہائی تلخ گھونٹ نگلنے کی کوشش شروع کر دی اور باپ اسے سمجھاتا بجھاتا گیا اور پھر اسے اُمید بھی دلاتا رہا کہ اُس کے لئے ایک مردِ حق یقیناً" منتظر ہے۔ اللہ نے جہاں اتنا کرم کیا ہے وہاں وہ یہ کرم بھی ضرور کرے گا کہ نورؔ کی شادی ہو جائے گی۔

نورؔ کے باپ نے گھوڑے دوڑا دیئے۔ وہ بہت جلدی شاہ در پہنچنا چاہتا تھا۔ راستے میں وہ ایک جگہ رکے۔ گاڑی میں کھانے پینے کا سامان موجود تھا۔ گھوڑوں نے سستا لیا اور باپ بیٹی نے کھا پی لیا اور پھر گاڑی میں سوار ہوئے اور باپ نے گھوڑے دوڑا دیئے۔

○

دن تقریباً" آدھا گزر گیا تھا۔ سنجر اپنے دفتر میں بیٹھا روزمرّہ کے کام کاج میں مصروف تھا۔ اس کے ذمے بڑا ہی نازک اور پیچیدہ کام تھا۔ اُس نے اس شہر کو ازسرِنو آباد کرنا تھا اور اس شہر کو باطنیوں سے صاف بھی کرنا تھا۔ دربان نے اسے اطلاع دی کہ باہر ایک آدمی آیا ہے جس کے ساتھ ایک بڑی خوبصورت اور جواں سال لڑکی ہے اور وہ گھوڑا گاڑی پر آئے ہیں۔ دربان نے بتایا کہ یہ وہی باپ بیٹی ہیں جنہیں کچھ عرصہ پہلے یہاں ایک مکان دیا گیا تھا اور زمین بھی دی گئی تھی۔

سنجر نے کسی حد تک بے دلی سے کہا کہ انہیں اندر بھیج دو۔ اُس نے غالباً" یہ سوچا ہو گا کہ اپنی کسی ضرورت کی خاطر آئے ہوں گے۔ دربان نے باہر جا کر انہیں کہا کہ وہ اندر چلے جائیں لیکن نورؔ کے باپ نے کہا کہ وہ اندر نہیں جانا چاہتے' سلطان خود باہر آ جائے۔

سنجر کو جب یہ بتایا گیا کہ باپ بیٹی اُسے باہر بلا رہے ہیں تو سنجر جھنجلاہٹ کے عالم

میں باہر آ گیا۔ نورؔ کے باپ نے اسے کہا کہ وہ گھوڑا گاڑی تک چلے۔ اُس وقت سنجر نے قدرے اُکتاہٹ سے کہا کہ آخر بات کیا ہے؟ وہ کسی کو یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ کوئی اُسے جدھر لے جانا چاہے وہ اُس طرف چل پڑے۔ نورؔ اور اُس کا باپ کچھ بھی نہ بولے اور اُسے گھوڑا گاڑی تک لے گئے۔

نورؔ کے باپ نے گاڑی پر جا کر چاروں بکس کھول دیئے اور سلطان کو اشارہ کیا کہ وہ اوپر آ جائے۔ سنجر پہلے ہی اُکتایا ہُوا تھا' وہ غصے کی حالت میں گھوڑا گاڑی پر چڑھا اور جب اُس نے کھلے ہوئے بکس دیکھے تو اُس پر کچھ اور ہی کیفیت طاری ہو گئی۔

"یہ مال کہاں سے آیا ہے؟" — سنجر نے ہکلاتی ہوئی زبان سے پوچھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر کہا — "یہ تو بے انداز اور بے حد قیمتی خزانہ ہے"۔

"یہ میں سلطان کو اندر بیٹھ کر بتاؤں گا کہ یہ مال کس طرح آیا ہے" — نورؔ کے باپ نے کہا — "یہ سارا مال نہ آپ کا ہے نہ میرا ہے بلکہ یہ سلطنتِ سلجوقیہ کا مال ہے اور یہ وہ خزانہ ہے جو یہ باطنی ابلیس قافلوں سے لُوٹتے رہے ہیں"۔

سنجر نے فوراً" چاروں بکس اٹھوائے اور اپنے کمرے میں رکھوا دیئے پھر اُس نے باپ اور بیٹی کو اپنے پاس بٹھا کر پوچھا کہ یہ خزانہ کہاں سے آیا ہے۔

نورؔ کے باپ نے اسے ساری داستان سنا ڈالی۔

"میں تمہیں اس میں سے دل کھول کر انعام دوں گا" — سنجر نے کہا۔

"میں اس میں سے ایک ذرّہ بھی نہیں لوں گا" — نورؔ کے باپ نے کہا — "یہ سلطنت کی ملکیت ہے اور یہ اللہ کی امانت سمجھ کر استعمال کی جائے۔ میں اپنا انعام لے چکا ہوں۔ مجھے مکان مل گیا ہے اور زمین بھی مل گئی ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے"۔

داستان گو داستان کو واپس اُس مقام تک لے جاتا ہے جہاں عبید عربی کی نشاندہی پر بڑھئی اور سبزیوں کے تاجر کو پکڑا گیا اور ایک روز کے بعد انہیں جلاد کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

سالار اوریزی نے عبید عربی کو بڑے پیار اور شفقت سے اپنے پاس بٹھلایا اور اُس سے پوری بات سنی تھی اور عبید عربی نے اُسے اپنی وہی داستان سنائی تھی جو وہ شافعہ کو سنا چکا تھا۔ اس کا یہ بیان پچھلے باب میں تفصیل سے پیش کیا جا چکا ہے۔

"اے سلجوقی سالار!" — عبید عربی نے کہا تھا — "میں اللہ کے وجود کا قائل ہو گیا ہوں۔ میں تو آپ کو قتل کرنے آیا تھا لیکن آج آپ سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اپنے ہاتھوں قتل کر دیں.... ہمارا خدا بھی حسن بن صباح تھا' رسول بھی حسن بن صباح اور حسن بن صباح کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات کو یوں قدر و احترام سے سنا کرتے تھے جیسے یہ بات آسمان سے اُتری ہو۔ ہمارے لئے نیکی اور بدی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ہمارا امام کہا کرتا ہے کہ جو فعل تمہیں اچھا لگتا ہے وہ کرو اور اسے گناہ مت سمجھو۔ گناہ اس فعل کو کہتے ہیں جو تم نہ کرنا چاہو لیکن یہاں آ کر میں نے اپنی اصلیت کو پا لیا ہے"۔

"تمہیں اس کا اجر اللہ دے گا" — سالار اوریزی نے کہا تھا — "تم اُن کا انجام بھی دیکھ لو گے جن کی تم نے نشاندہی کی ہے اور تمہیں جو صلہ ملے گا وہ سب لوگ دیکھیں گے.... میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا ان دونوں کے علاوہ تم ایسے آدمی بتا سکتے ہو جو وسم کوہ میں موجود ہوں؟"

"نہیں قابلِ احترام سالار!" — عبید عربی نے کہا تھا — "ضرور ہوں گے لیکن یہ

ضروری نہیں ہوتا کہ کسی جگہ ہر باطنی دوسرے باطنیوں کو جانتا ہو۔ حسن بن صباح کے بعض فدائیوں کو یوں چھپا کر رکھا جاتا ہے کہ کوئی دوسرا فدائی بھی اسے نہیں جانتا.... میں چونکہ آپ کو قتل کرنے کے لئے آیا تھا اس لئے میں ان ہی دو آدمیوں سے واقف ہو سکا جن کے ذمے مجھے پناہ میں رکھنا تھا۔ مجھے آپ کے قتل کے بعد خودکشی کر لینی تھی یا موقع ملتا تو فرار ہونا تھا اور میرے پکڑے جانے کا بھی امکان تھا۔ اِس صورت میں آپ نے تشدد اور ایذارسانی کے ذریعے مجھ سے یہ راز اگلوا لینا تھا کہ یہاں کتنے باطنی ہیں اور وہ کہاں کہاں رہتے ہیں اور ان میں فدائی کون کون ہیں۔ میں نے اپنے اس راز پر اپنی جان دے دینی تھی لیکن ایذارسانی سے بڑے مضبوط آدمی بھی ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور وہ راز اگل دیتے ہیں.... پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ ان کا سراغ لگا لوں۔ یہ بھی سن لیں کہ آپ کو تو ان لوگوں نے قتل کرنا ہی ہے' میری جان بھی خطرے میں آ گئی ہے۔ میں نے حسن بن صباح کے دو بڑے ہی اہم اور تجربہ کار آدمی پکڑوا دیئے ہیں اور اب یہ لوگ موقع ملتے ہی مجھے قتل کر دیں گے لیکن میں جان کی بازی لگا کر باقی باطنیوں کا سراغ لگاؤں گا"۔

سالار اوریزی نے کہا کہ وہ اُسے بچائے رکھنے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ دوسرے باطنیوں اور فدائیوں کا سراغ کہاں سے لگائے.... سالار اوریزی نے یہ بھی کہا کہ یہ دونوں آدمی جو عبید نے پکڑوائے ہیں کچھ بھی نہیں بتائیں گے۔

"یہ امید دل سے نکال دیں" — عبید عربی نے کہا — "انہیں آپ کوئی لالچ دے سکتے ہیں جو یہ کسی قیمت پر قبول نہیں کریں گے۔ دوسرا طریقہ ایذارسانی کا ہے۔ یہ لوگ مرنا پسند کریں گے لیکن بتائیں گے کچھ بھی نہیں۔ میرا معاملہ کچھ اور ہے۔ آیا تو میں بھی مارنے اور مرنے کے لئے تھا لیکن میری جذباتی دنیا میں جو شدید زلزلہ آیا' یہ مجھے آپ کے سامنے اس صورت میں لایا جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ اسے میں اللہ تعالیٰ کا ایک معجزہ کہتا ہوں لیکن یہ دونوں آدمی اُس درجے کے باطنی ہیں جو فخر سے اپنی جانیں دے دیا کرتے ہیں۔ انہیں یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ آپ انہیں سزائے موت دیں گے"۔

"یہ تو میرا فیصلہ ہے" — سالار اوریزی نے کہا — "کل سارے شہر میں منادی کرواؤں گا کہ دو باطنیوں کو قلعے کے باہر سزائے موت دی جائے گی اور تمام لوگ اس

وقت اکٹھے ہو جائیں۔ پھر میں انہیں...."

"گستاخی معاف قابلِ احترام سالار!" ـــ عبید عربی نے سالار اوریزی کی بات کاٹ کر کہا ـــ "آپ کی باقی بات بعد میں سنوں گا' ایک طریقہ میرے دماغ میں آگیا ہے جس سے باطنیوں کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ ان دونوں کو سرِعام سزائے موت دیں گے۔ یہ آپ بہت اچھا کریں گے کہ شہر کے تمام لوگوں کو اکٹھا ہونے کو کہہ رہے ہیں۔ یہاں جتنے باطنی ہیں یا بڑھئی اور سبزیوں کے باغ کے مالک جیسے آدمی ہیں' وہ بھی لوگوں میں شامل ہوں گے۔ ان دونوں کے سر جلاد کاٹ چکے گا تو مجھے پورا پورا یقین ہے کہ ایک یا دو آدمی اَلمُوت کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ یہ ان کے فرائض میں شامل ہے کہ اس قسم کا سنگین واقعہ فوراً" اَلمُوت جا کر حسن بن صباح کو سنائیں۔ آپ یہ بندوبست کریں کہ چند ایک آدمی شہر کے ہجوم سے باہر باہر دیکھتے رہیں۔ وہ جب کسی ایک یا دو یا تین آدمیوں کو گھوڑوں پر سوار المُوت کی طرف رُخ کر کے جاتا دیکھیں تو انہیں گھیر کر پکڑ لیں۔ وہ یقیناً" حسن بن صباح کے آدمی ہوں گے"۔

"وہ سب کے سب تو نہیں ہوں گے!" ـــ سالار اوریزی نے کہا ـــ "دوسرے پھر بھی شہر میں ڈھکے چھپے رہیں گے' بہرحال مجھے تمہاری یہ تجویز بہت پسند آئی ہے۔ میں اس پر عمل درآمد کرواؤں گا"۔

"جو تجربہ اور دانشمندی آپ کو حاصل ہے وہ مجھے نہیں" ـــ عبید عربی نے کہا ـــ "لیکن میں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ منادی میں یہ بھی شامل کریں کہ تمام لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ گھروں میں سے نکل کر قلعے کے باہر اکٹھے ہوں اور ان دو آدمیوں کو جلاد کے ہاتھوں کٹتا دیکھیں.... اس طرح یہ ہو گا کہ کوئی باطنی اپنے گھر میں بیٹھا نہیں رہے گا"۔

"تم اور شافعیہ بہت بڑے انعام کے حقدار ہو عبید!" ـــ سالار اوریزی نے خوش ہوتے ہوئے کہا ـــ "میں سمجھ نہیں سکتا کہ تم دونوں کو کیا انعام دوں"۔

"انعام کی حقدار تو شافعیہ ہے" ـــ عبید عربی نے کہا ـــ "اگر آپ ہم دونوں کو انعام دینا ہی چاہتے ہیں تو سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ مجھے شافعیہ کو اور شافعیہ مجھے دے دیں"۔

"یہ تو طے ہے" ـــ سالار اوریزی نے کہا ـــ "ان دونوں باطنیوں کو پرسوں جہنم

داخل کر کے میں تم دونوں کا نکاح پڑھا دوں گا"۔

سالار اوریزی نے اُسی وقت مزمّل آفندی اور بن یونس کو بلوا لیا اور عبید عربی کی تجویز انہیں سنائی۔ انہوں نے آپس کے صلاح مشورے سے طے کر لیا کہ یہ کارروائی کس طرح کی جائے۔

○

اگلی صبح سورج طلوع ہوا ہی تھا کہ وسم کوہ کا بچہ بچہ قلعے کے باہر گھوڑ دوڑ کے میدان کے اردگرد اکٹھا ہو گیا تھا۔ منادی میں یہ حکم بھی شامل تھا کہ تمام لوگ حکماً" باہر آئیں گے۔ عورتیں اُس طرف جو قلعے کی دیوار تھی' اُس پر اکٹھی ہو گئی تھیں۔ گھر بالکل خالی ہو گئے تھے۔ بڑھئی اور سبزیوں کے باغ والے کو قلعے سے نکالا گیا۔ ان کے ہاتھ ان کی پیٹھوں کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ چار محافظ انہیں لے جا رہے تھے۔ ہجوم نے اس طرف سے انہیں راستہ دیا اور ان دونوں کو میدان کے وسط میں لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد سالار اوریزی اپنے چھ گھوڑ سوار محافظوں کے ساتھ قلعے سے باہر نکلا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔

محافظ ہجوم کے پیچھے رک گئے اور سالار اوریزی وہاں جا پہنچا جہاں دونوں باطنیوں کو کھڑا کیا گیا تھا۔ مزمّل آفندی اور بن یونس بھی وہیں تھے لیکن وہ تماشائیوں کے ہجوم کے پیچھے گھوڑوں پر سوار تھے اور ایک دوسرے سے دُور دُور تھے۔ ان کی نظریں ہجوم پر لگی ہوئی تھیں اور وہ دونوں ایک جگہ رُکتے نہیں تھے بلکہ گھوڑوں کو آہستہ آہستہ ہجوم کے پیچھے پیچھے چلا رہے تھے۔ ان کے ساتھ سالار اوریزی کے محافظ دستے کے دو گھوڑ سوار بھی تھے۔ وہ بھی ہجوم کے پیچھے پیچھے ایک طرح کی گشت کر رہے تھے۔ محافظ دستے کے دو آدمی شہر کی دیوار پر اُس جگہ کھڑے تھے جہاں سے قلعہ اَلمُوت کی طرف جانے والا راستہ نظر آتا تھا۔ وہاں سے اَلمُوت تک دو دنوں کی مسافت تھی۔

"اے ایمان والو!" ـــ سالار اوریزی نے بڑی ہی بلند اور گونج دار آواز میں ہجوم سے خطاب کیا ـــ "یہ دو آدمی میرے یا سلطنتِ سلجوقیہ کے مجرم نہیں بلکہ یہ اللہ' رسولؐ اور دینِ اسلام کے مجرم ہیں۔ یہ حسن بن صباح کے پیروکار ہیں جسے ابلیس نے زمین پر اُتارا ہے۔ یہ دونوں باطنی یہاں فدائیوں کو پناہ میں رکھتے تھے اور اب انہوں نے ایک ایسے فدائی کو پناہ دی تھی جو مجھے قتل کرنے آیا تھا لیکن اللہ کی قدرت دیکھو کہ یہ

دونوں میرے ہاتھوں قتل ہو رہے ہیں۔ اگر حسن بن صباح اللہ کا بھیجا ہوا نبی ہے یا اُس کے ہاتھوں میں کوئی خدائی طاقت ہے تو ان دونوں کو قتل ہونے سے بچا لے لیکن اس کے پاس جو طاقت ہے وہ ابلیسیت کی طاقت ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اِن دونوں کو ذاتی انتقام کے طور پر قتل کر رہا ہوں۔ میں اللہ کی راہ میں ہر وقت قتل ہونے کے لئے تیار رہتا ہوں۔ تمام لوگوں پر یہ واضح ہو جائے کہ باطنی ہونا بہت بڑا جرم ہے جس کی سزا موت ہے۔ اس شہر میں ابھی اور باطنی موجود ہیں۔ یہ تم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ جس کسی پر شک ہو کہ وہ باطنی ہے' اس کے متعلق اطلاع دے۔ یہ بھی سُن لو کہ صرف شک پر بھی میں سزائے موت دوں گا۔ اگر حسن بن صباح یہ اعلان کر دے کہ اُس کا مذہب بالکل الگ تھلگ ایک مذہب ہے جس کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تو پھر کسی باطنی کو صرف اس لئے سزا نہیں دی جائے گی کہ وہ باطنی ہے۔ ہر کسی کو مذہبی آزادی حاصل ہے لیکن یہ لوگ اسلام کا چہرہ مسخ کر رہے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ یہ ایسا گناہ ہے جسے میں معاف نہیں کر سکتا کیونکہ معاف کرنے کو بھی میں گناہ سمجھتا ہوں۔ حسن بن صباح کے حکم سے ہمارے بہت سے علمائے دین' خطیب اور امام اور وزیر قتل کئے جا چکے ہیں۔ ان باطنیوں نے مَرو میں خانہ جنگی بھی کروادی تھی۔ میں ان بے گناہوں کے خون کا انتقام لے رہا ہوں"۔

سالار اوریزی ایک طرف ہٹ گیا اور اُس کے اشارے پر جلاد جو سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھا اور ہاتھ میں چوڑے پھل والی تلوار تھی' تیزی سے آگے آیا اور اس نے ایک باطنی کو زمین پر دو زانو کر کے اُسے آگے کو جھکا دیا۔ اس کی تلوار بلند ہوئی اور دوسرے ہی لمحے اس باطنی کا سر اس کے جسم سے الگ ہو کر مٹی میں گر پڑا تھا۔ اس کے بعد دوسرے باطنی کو بھی اسی طرح جہنم واصل کر دیا گیا۔

سالار اوریزی نے حکم دیا کہ ان کی لاشیں دُور جنگل میں لے جا کر پھینک دی جائیں۔

○

اتنا بڑا ہجوم باطنیوں کی لاشوں کی طرف دوڑ پڑا۔ لوگ لاشوں کو ٹھڈ مارنے لگے اور ان پر انہوں نے تھوکا بھی۔ ہجوم میں سے مختلف آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ پیچھے والے لوگ کہہ رہے تھے کہ انہیں بھی لاشوں پر تھوکنے کا ثواب حاصل کر لینے دیا جائے۔ ایک

بڑی ہی بلند اور دبنگ آواز گرج رہی تھی ـــــ "زندہ رہے گا تو صرف اسلام رہے گا" ـــــ معلوم نہیں یہ کون تھا۔ لوگ اسلام زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے اور آگے بڑھ بڑھ کر باطنیوں کی لاشوں پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتے تھے۔ کچھ لوگ ان باطنیوں کی کھوپڑیوں کو ٹھڈ مار مار کر ہجوم سے باہر لے گئے اور اسی طرح ٹھڈ مارتے مارتے دُور جنگل تک لے گئے اور کہیں پھینک کر واپس آئے۔ تھوڑی سی دیر میں دونوں لاشوں کی کھال اتر چکی تھی اور اب لوگ انہیں پتھر مار رہے تھے۔

سالار اوریزی نے شہر کی دیوار پر دو آدمی کھڑے کر رکھے تھے۔ وہ اس ہجوم کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ دو گھوڑ سوار ہجوم میں سے نکل کر اُس راستے پر ہو گئے تھے جو الموت کو جاتا تھا۔ مزمّل' بن یونس اور ان کے دو اور ساتھی ان سواروں کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ دیوار پر جو آدمی کھڑے تھے وہ بڑی تیزی سے دوڑتے نیچے آئے اور انہیں مزمّل آفندی نظر آیا جو اس بے قابو اور بپھرے ہوئے ہجوم کے اردگرد اپنے گھوڑے پر سوار گشت کر رہا تھا۔

دیوار سے اُتر کر آنے والے آدمیوں نے مزمّل کو بتایا کہ وہ دیکھ نہیں سکا کہ دو سوار ہجوم میں سے نکل کر الموت کی سمت چلے گئے ہیں۔ مزمّل نے گھوڑا دوڑا کر اور کچھ آگے جا کر دیکھا۔ اُسے وہ دونوں سوار نظر آ گئے۔ اتنی دیر میں وہ خاصی دُور نکل گئے تھے۔

"بن یونس اور دوسرے دو آدمیوں کو ڈھونڈ کر جلدی لاؤ" ـــــ مزمّل آفندی نے ان آدمیوں سے کہا ـــــ "میں ان دونوں کے پیچھے جاتا ہوں اور تم دونوں بھی پیچھے پیچھے آ جانا"۔

مزمّل آفندی نے گھوڑا تیز نہ دوڑایا۔ رفتار اتنی ہی رکھی کہ وہ دونوں سوار اُس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں۔ آگے گھنا جنگل تھا اور ٹیکریاں اور چٹانیں بھی تھیں جن کی وجہ سے راستے میں کئی موڑ تھے اور ان موڑوں کی وجہ سے سوار نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔

مزمّل کم و بیش ایک میل دُور نکل گیا تھا جب بن یونس چار آدمیوں کے ساتھ گھوڑے دوڑاتا اُس تک پہنچ گیا۔ یہ چار آدمی سالار اوریزی کے محافظ دستے کے منتخب سوار تھے۔ وہ صرف شہسوار ہی نہیں تھے بلکہ بڑے ہی تجربہ کار چھاپہ مار بھی تھے.... الموت کی طرف جانے والا یہ راستہ ٹیکریوں میں سے جاتا تھا اور آگے آگے جانے والے

دونوں سوار نظر نہیں آتے تھے۔ مزمّل آفندی نے اپنی اس سوار جماعت کے ساتھ گھوڑوں کو ایڑ لگا دی اور ٹیکریوں کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ اگلے دونوں سوار اس راستے سے آگے نکل گئے تھے اور وہ مزمّل کو نظر آ گئے۔ اس جماعت نے اپنے گھوڑوں کی رفتار خاصی کم کر دی۔ شک تو یہ تھا کہ یہ دونوں آدمی باطنی ہیں اور اَلموُت حسن بن صباح کو اطلاع دینے جا رہے ہیں کہ عبید عربی نے ان دو آدمیوں کو پکڑوا کر سزائے موت دلوا دی ہے جن کے ہاں اُس نے پناہ لی تھی لیکن یہ دونوں سوار کوئی عام سوار بھی ہو سکتے تھے۔ انہیں روک کر پوچھنا تو بے کار تھا کہ وہ کون ہیں۔ انہوں نے یہ تھوڑے ہی بتا دینا تھا کہ وہ باطنی ہیں اور الموُت جا رہے ہیں۔ مزمّل آفندی اور بن یونس سوچ رہے تھے کہ یہ کس طرح معلوم کیا جائے کہ یہ دونوں مشکوک ہیں۔

اگلے دونوں سوار چلتے چلے گئے اور پیچھے والے چھ سوار اُن کی رفتار سے ذرا تیز چلتے گئے۔ آگے علاقہ کچھ ہموار آ گیا تھا۔ ذرا اور آگے گئے تو آگے جانے والے دونوں سواروں میں سے ایک نے پیچھے دیکھا۔ اُس نے اپنے ساتھی کو اپنے سر سے کچھ اشارہ کیا تو اُس نے بھی پیچھے دیکھا۔ دونوں نے گھوڑوں کی رفتار خاصی تیز کر لی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنے تعاقب میں آنے والے سواروں سے خاصا زیادہ آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔

"یہ ہمارے ملزم ہیں" ——— مزمّل آفندی نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا ——— "انہیں جانے نہ دینا"۔

سب نے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی اور گھوڑے دوڑ پڑے۔ اگلے دو سوار اگر مشتبہ یا ملزم نہ ہوتے تو وہ پرواہ ہی نہ کرتے بلکہ رُک کر دیکھتے کہ ان لوگوں نے گھوڑے کیوں دوڑائے ہیں لیکن انہوں نے بھی گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور ان کے گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ تعاقب میں جانے والے سواروں کے جو گھوڑے تھے وہ فوجی گھوڑے تھے جنہیں بڑی اچھی خوراک ملتی تھی اور تھے بھی وہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے۔ تھوڑی ہی دُور جا کر ان گھوڑوں نے اگلے سواروں کے ساتھ فاصلہ بہت ہی کم کر دیا۔

اگلے دونوں سوار ایک دوسرے سے الگ الگ ہو گئے۔ ایک دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف چلا گیا۔ ان کے تعاقب میں جانے والوں کی تعداد چھ تھی۔ انہوں نے بھی اپنے گھوڑوں کو پھیلا دیا یعنی تین ایک طرف اور تین دوسری طرف ہو گئے اور گھیرا ڈالنے کے انداز سے ان کے پیچھے گئے۔ اُن دونوں سواروں نے بچ نکلنے کے لئے گھوڑوں

کو انتہائی تیز رفتار کر لیا لیکن فوجی گھوڑے اُن پر جا پہنچے۔

"زندہ پکڑنا ہے" ——— مزمّل نے بڑی ہی بلند آواز سے اپنے ساتھیوں سے کہا ——— "پکڑے نہ جائیں تو زخمی کر کے گرا لو، قتل نہیں کرنا"۔

ایک سوار گھیرے میں آ کر رُک گیا۔ اُس نے تلوار نکال لی اور تعاقب میں جانے والوں نے بھی تلواریں نکال لیں لیکن اس آدمی نے مقابلہ نہ کیا بلکہ تلوار اپنے دل کے مقام پر رکھ کر ایسی دبائی کہ آدھی تلوار اس کے جسم میں داخل ہوئی اور پیچھے سے اُس کی نوک باہر آ گئی۔ وہ گھوڑے سے گرا اور جب اسے جا کر دیکھا تو اُس نے اتنا ہی کہا کہ تم کسی فدائی کو زندہ نہیں پکڑ سکو گے اور پھر اس کے ساتھ ہی اُس نے آخری سانس لی اور مر گیا۔

اس کا ساتھی بھی گھیرے میں آ گیا تھا لیکن اُس نے تلوار تو نکالی، خودکشی نہ کی بلکہ مقابلے میں اُتر آیا۔ پہلے تو اس کا مقابلہ تین سواروں کے ساتھ تھا۔ اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر جس طرح گھوڑے کو گھما پھرا کر پینترے بدلے اور تلوار گھمائی اس سے پتہ چلا کہ یہ بڑا ہی ماہر تیغ زن ہے۔ اُس نے ایک آدمی کو زخمی بھی کر دیا لیکن زخم شدید نہ تھا۔

تین سواروں نے گھوم گھوم کر اس پر وار کئے لیکن وہ ہر وار بچاتا گیا حتیٰ کہ اُس کا گھوڑا ذرا سا زخمی ہو گیا۔ توقع تھی کہ گھوڑا زخمی ہو کر بھاگ اُٹھے گا اور سوار کے قابو سے نکل جائے گا لیکن سوار نے اسے قابو میں رکھا۔ وہ شخص دراصل جان کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ اُسے آخر مارے ہی جانا تھا لیکن وہ اس کوشش میں تھا کہ جاتے جاتے دو تین آدمیوں کو بھی لیتا جائے۔

پہلے تو اس کا مقابلہ تین آدمیوں کے ساتھ تھا۔ اُن کے ساتھی نے اپنے آپ کو خود ہی قتل کر لیا تھا اس لئے جو تین آدمی اس کی طرف گئے تھے وہ بھی اِدھر آ گئے اور اب یہ اکیلا سوار چھ آدمیوں کے گھیرے میں آ گیا تھا اور مزمّل نے ایک بار پھر کہا کہ اسے زندہ پکڑو۔

اب یہ چھ کے چھ آدمی اس کوشش میں تھے کہ یہ سوار خودکشی کے لئے اپنی تلوار اپنے پیٹ پر رکھے تو فوراً جھپٹ کر تلوار چھین لی جائے لیکن وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کر رہا تھا بلکہ جم کر اور پینترے بدل بدل کر چھ گھوڑ سواروں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اُسے زخم آ چکے تھے اور یہ سب زخم اُس کی ٹانگوں پر تھے۔ یہ چھ تیغ زن سوار اس کوشش میں تھے

کہ اسے جان سے نہ مارا جائے اور اتنا سا زخمی کر دیا جائے کہ گر بھی پڑے اور زندہ بھی رہے۔

آخر یوں ہُوا کہ مزمّل کے ایک سوار نے پیچھے سے آ کر اُس کی تلوار والا ہاتھ زخمی کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اُسے ایسا پکڑا کہ گھوڑے سے گرا دیا۔ تین چار سواروں نے اُتر کر اُس پر قابو پا لیا۔ انہوں نے دوسرا کام یہ کیا کہ اسی کی چادر پھاڑ کر اُس کے زخموں پر باندھ دی تاکہ وسم کوہ تک اس کا خون اتنا نہ نکل جائے کہ وہ زندہ ہی نہ رہ سکے۔ اُسے اُسی کے گھوڑے پر ڈال دیا گیا۔ اُس پر غشی طاری ہو چکی تھی۔ اس کے دوسرے ساتھی کا گھوڑا بھی پکڑ لیا گیا اور اُس کی لاش وہیں پڑی رہنے دی۔

جب یہ قافلہ واپس وسم کوہ کے قریب آیا تو بن یونس کو ایک احتیاط کا خیال آ گیا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وسم کوہ میں اور باطنی بھی ہوں گے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ ان کے دو ساتھی اَلمُوت روانہ ہو گئے ہیں۔ احتیاط یہ کرنی چاہئے کہ انہیں یہ معلوم نہ ہو سکے کہ اَلمُوت جانے والوں میں سے ایک مارا جا چکا ہے اور دوسرے کو زخمی کر کے پکڑ لائے ہیں۔

بن یونس نے بڑی اچھی بات سوچی تھی لیکن ان کے پاس کوئی ایسا کپڑا نہیں تھا جس سے اس باطنی کو چھپا لیتے۔ مزمّل نے اپنے ساتھیوں کو وہیں روک لیا اور ایک سے کہا کہ وہ وسم کوہ جائے اور وہاں سے ترپال یا کمبل یا بڑے سائز کی دو بوریاں لے آئے.... اس سوار نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

وسم کوہ کوئی دُور نہیں تھا' وہ سامنے نظر آ رہا تھا۔ سوار دو بڑی بوریاں لے کر واپس آ گیا۔ بے ہوش باطنی کو اس طرح دو بوریوں میں بند کر کے گھوڑے پر ڈال لیا گیا جیسے یہ کوئی سامان ہو۔ یہ قافلہ چل پڑا اور وسم کوہ میں داخل ہُوا اور وہاں سے سالار اوریزی کے ہاں جا پہنچا۔ انہوں نے زخمی باطنی کو گھوڑے سے اُتارا اور اندر ایک کمرے میں لے گئے۔ اُس سے بوریاں اُتار دیں اور جب سالار اوریزی نے دیکھا تو فوراً حکم دیا کہ جرّاح اور طبیب کو لایا جائے۔

○

طبیب اور جرّاح آئے تو سالار اوریزی نے انہیں بتایا کہ یہ بے ہوش زخمی باطنی ہے اور اس کے سینے کے راز نکالنے ہیں۔ جرّاح نے کہا کہ پہلے اس کے زخموں کا

بندوبست کریں گے تاکہ خون رک جائے ورنہ یہ خوُن نکل جانے سے ہی مر جائے گا۔

"خون نکل جانے دو" — بوڑھے طبیب نے کہا — "اس کے جسم میں اتنا ہی خون رکھا جائے گا جو اسے زندہ رکھے گا۔ اس کا زیادہ سے زیادہ خون نکل جانا چاہئے"۔

جرّاح نے اور باقی سب نے حیرت زدگی کے عالم میں طبیب کی طرف دیکھا۔ وہ اتنا ہی جانتے تھے کہ خون نکل جانے سے انسان مر جاتا ہے لیکن طبیب کا تجربہ کچھ اور کہتا تھا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ یہ باطنی ہے اور اس کے سینے سے راز نکالنے ہیں۔ باطنی اپنی جان دے دیا کرتے تھے' راز نہیں دیتے تھے۔ طبیب جانتا تھا کہ باطنیوں کے خون میں حشیش کے علاوہ نہ جانے کیسی کیسی جڑی بُوٹیوں کے اثرات شامل ہوتے ہیں۔ اُس نے کچھ عرصہ گزرا مَرو میں دو باطنیوں کا یہی علاج کیا تھا کہ وہ اتفاق سے زخمی تھے اور طبیب نے ان کا خون بہہ جانے دیا تھا اور پھر انہیں ایسی غذا اور ایسی دوائیاں دیتا رہا تھا کہ نیا خون پیدا ہُوا تو وہ باطنی راز دینے پر آ گئے تھے۔ اس باطنی پر بھی طبیب وہی طریقہ آزما رہا تھا۔ اس طبیب نے کوئی جڑی بُوٹی دریافت بھی کر لی تھی جو ذہن کو نارمل حالت میں لے آتی تھی اور جسم پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوتے تھے۔

"کیا خون نکل جانے سے یہ مر نہیں جائے گا؟" — سالار اوریزی نے پوچھا۔

"میں زندگی اور موت کی ضمانت نہیں دے سکتا" — طبیب نے کہا — "میں صرف یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ یہ زندہ رہ گیا تو آپ اسے بدلے ہوئے روپ میں دیکھیں گے اور اگر اس کے زخم فوراً ٹھیک کر دیئے گئے اور یہی خون اس کے جسم میں رہا تو پھر آپ ایذا رسانی کے ذریعے اس کی جان لے سکتے ہیں' راز نہیں"۔

سب خاموش ہو گئے اور طبیب نے زخمی کے منہ میں قطرہ قطرہ پانی ٹپکانا شروع کر دیا۔ اس پانی میں اُس نے دوائی ملا دی تھی۔ کچھ دیر پانی پلا کر اُس نے زخمی کے منہ میں وہ دودھ ٹپکانا شروع کر دیا جس میں شہد ملا ہُوا تھا۔ زخمی کے زخموں سے خون اُمڈتا ہی چلا آ رہا تھا۔ وہ تنومند جوان تھا اور اس کے جسم میں سیروں کے حساب سے خون موجود تھا۔

○

سورج غروب ہو رہا تھا جب طبیب نے اپنی انگلیاں زخمی کی نبض پر رکھ دیں۔ زخمی کے چہرے کا رنگ ایسا پھیکا پڑ گیا تھا جیسے اس کی زندگی کا بھی سورج غروب ہو رہا ہو۔ اُس کے زخموں کے نیچے ایک خاصا بڑا برتن رکھا ہوا تھا' وہ بھر چکا تھا.... طبیب نے جرّاح سے

کہا کہ اب وہ اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر دے تاکہ مزید خون نکلنا بند ہو جائے۔ زخمی بے ہوش تھا اور اب اس کی سانسوں کا تسلسل کمزور سا ہو گیا تھا۔ جرّاح نے زخموں کو صاف کر کے مرہم پٹی شروع کر دی۔

دوائیاں لگا کر پٹیاں باندھ دی گئیں تو طبیب نے ایک بار پھر زخمی کے منہ میں پانی ٹپکانا شروع کر دیا جو اس کے حلق سے اُترتا چلا جا رہا تھا۔ یہ ثبوت تھا کہ وہ زندہ ہے اور پانی قبول کر رہا ہے ورنہ پانی اس کے منہ سے واپس نکلنا شروع ہو جاتا۔ اس طرح خاصا پانی ٹپکا کر طبیب نے پھر اُسے شہد ملا دودھ قطرہ قطرہ دینا شروع کر دیا۔

"بہتر ہے آپ سب اپنے اپنے کام کاج میں لگ جائیں" ــــ طبیب نے کہا ــــ "اپنے اپنے ٹھکانے پر چلے جائیں اور آرام کریں۔ یہ کل دوپہر کے بعد شاید ہوش میں آئے گا اور اب میں یقین سے کہتا ہوں کہ یہ اللہ کی رضا سے زندہ رہے گا"۔

وہ رات گزر گئی' اگلا دن بھی گزر گیا اور پھر ایک رات اور آ گئی۔ طبیب اس دوران زخمی کے منہ میں کچھ نہ کچھ ٹپکاتا رہا۔ اس میں شہد ملا دودھ بھی تھا' دوائی ملا پانی بھی تھا اور کچھ اور دوائیاں بھی تھیں اور وہ زخمی کے زخموں کو بھی دیکھ رہا تھا کہ ان سے خون تو نہیں نکل رہا.... خون بند ہو چکا تھا اور اب زخمی کے منہ میں طبیب کچھ ٹپکاتا تھا تو زخمی اپنا منہ خود ہی کھول دیتا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہوش میں آ رہا ہے لیکن اس قدر کمزوری محسوس کر رہا ہے کہ اس سے بولا بھی نہیں جاتا۔

وہ رات گزری اور اس رات کے بطن سے جس صبح نے جنم لیا' وہ صبح امید افزا ثابت ہوئی۔ زخمی نے بڑی ہی نحیف آواز میں پوچھا' میں کہاں ہوں!

"اپنے عزیزوں کے پاس!" ــــ طبیب نے کہا ــــ "دل پر کوئی غم اور بوجھ نہ رکھو۔ تم وہاں ہو جہاں تمہارے لئے پیار ہی پیار ہے"۔

○

زخمی ابھی اتنا کمزور تھا کہ وہ اُٹھ بیٹھ نہیں سکتا تھا لیکن وہ ہوش و حواس میں آ گیا تھا۔ طبیب اس کی ہر حرکت بڑی غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں دائیں بائیں گھومتی تھیں اور آنکھوں کی ان حرکات کو بھی طبیب بڑی اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ طبیب کے انداز میں ایسی شفقت تھی جس کا اظہار زخمی زبان سے تو نہیں کرتا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے معلوم ہوتا تھا جیسے متاثر تو ہو رہا ہے لیکن یہ سمجھ نہیں پا

رہا کہ وہ ہے کہاں!

ایک دن اور ایک اور رات گزر گئی جب سے زخمی یہاں آیا تھا' تین مرتبہ اُن کے زخموں کی پٹی بدلی گئی تھی اور اب خون نہیں نکلتا تھا۔ وہ بیٹھنے لگا اور اُسے مقوی غذائیں دی جانے لگیں جو وہ اپنے ہاتھ سے کھاتا تھا۔

طبیب نے مزمّل آفندی' بن یونس اور باقی ان افراد کو جن کا زخمی کے کمرے میں جانے کا امکان تھا' خصوصی ہدایات دے دی تھیں کہ زخمی کے ساتھ اُن کا رویّہ اور باتیں کس قسم کی ہوں گی۔ جب طبیب نے دیکھا کہ اب زخمی کے ہوش و حواس بحال ہو گئے ہیں اور صرف جسمانی کمزوری ہے تو اُس نے سالار اور ریزی اور دو تین اور افراد کو کمرے میں آنے کی اجازت دے دی۔ زخمی کا ردِ عمل یہ تھا کہ وہ حیرت سے ہر فرد کو دیکھتا اور اس کے ماتھے پر شکن آ جاتے جیسے وہ اپنے آپ سے پوچھ رہا ہو کہ یہ کون لوگ ہیں اور اسے اس سوال کا جواب نہ مل رہا ہو۔ زخمی سالار اور ریزی کو اچھی طرح جانتا تھا اور تقریباً" ہر روز اُنہیں دیکھتا تھا۔ مزمّل آفندی اور بن یونس سے بھی وہ واقف تھا اور جب عبید عربی اُس کے سامنے آیا تو بھی وہ سوچ میں گم ہو گیا کہ اس جواں سال خوبرو آدمی کو کہاں دیکھا تھا۔

"میں شاید ایک بڑے ہی حسین خواب سے بیدار ہُوا ہوں" ــــ زخمی نے کہا ــــ "میں خواب میں ایک بہت ہی خوبصورت اور بڑی ہی خوشنما جگہ دیکھ رہا تھا جس میں حسین اور نوجوان لڑکیاں بھی تھیں اور کہتے تھے یہ جنّت ہے اور یہ حُوریں ہیں.... معلوم نہیں وہ خواب تھا یا یہ خواب ہے جو میں دیکھ رہا ہوں" ــــ اُس نے کچھ دیر سوچ کر جھنجلاہٹ کے لہجے میں کہا ــــ "میں خواب اور حقیقت میں اُلجھ کر رہ گیا ہوں"۔

طبیب نے اُسے ایک دوائی دی جس کے اثر سے وہ سو گیا۔ طبیب نے الگ جا کر سالار اور ریزی وغیرہ سے کہا کہ اب یہ جواں سال باطنی ہمارے قبضے میں آ گیا ہے۔ اگر میں کامیاب نہ ہوتا تو یہ تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوتا اور مقابلے پر اُتر آتا۔ اس کے ذہن سے زخمی ہونے سے پہلے کی زندگی کی ہر بات نکل گئی ہے۔ اب اس سے پوچھنا ہے کہ وہاں کیا ہوتا تھا اور وہ یہاں کیا کرتا تھا۔

یہ تبدیلی اُسی رات سامنے آ گئی۔ زخمی کو بدستور مقوّی غذا کھلائی جا رہی تھی۔ طبیب نے اسے دوائیاں بھی دیں اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ زخمی پچھلی زندگی کی باتیں

یوں ذہن پر زور دے دے کر یاد کرتا تھا جیسے اُس نے واقعی خواب دیکھا تھا۔ زخمی چُپ ہو گیا اور خلاؤں میں گھُورنے لگا جیسے اُسے کوئی خاص بات یاد آ گئی ہو یا وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"وہ میری بہن تھی" ——— زخمی نے کہا اور اُس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا جو غصے کی علامت تھی۔ اس نے غضبناک آواز میں کہا —— "وہ میری بہن تھی اور میں اُس کے ساتھ..... نہیں..... نہیں..... میں اس شیطان کو قتل کر دوں گا"۔

وہ بے قابو ہو چلا تھا' طبیب اور سالار اوریزی نے پیار اور محبت اور شفقت سے اُسے ٹھنڈا کر لیا اور پوچھا کہ وہ اصل بات بتائے اور حسن بن صباح کو قتل کرنے کا انتظام وہ خود کریں گے۔

اُسے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ اس کی ایک بہن تھی جو اُسے یاد آئی تو اس کا ذہن بیدار ہو گیا اور زخمی ہونے سے پہلے کی ساری زندگی اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ اُس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ قلعہ اَلمُوت حسن بن صباح کو یہ اطلاع دینے جا رہا تھا کہ ہمارے دو آدمی اس شخص نے پکڑوا کر مروا دیئے ہیں جسے اَلمُوت سے سالار اوریزی کو قتل کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ وہ جس انداز اور جس لہجے میں بات کر رہا تھا اس میں رنج و ملال تھا' تاسف بھی تھا اور کچھ عتاب بھی تھا۔ اس نے بتایا کہ اُس کا باپ حسن بن صباح کا ایسا مرید تھا کہ اسے خدا کا بھیجا ہوا نبی سمجھتا تھا۔ اس کی عمر پندرہ سولہ سال تھی اور اس کی ایک چھوٹی بہن تھی جس کی عمر تیرہ سال تھی۔ ان کی ماں فوت ہو گئی۔

وہ اور اس کی بہن اپنے باپ کے لئے مسئلہ بن گئی۔ باپ نے دوسری شادی نہ کی اور ایک روز وہ اُسے اور اس کی بہن کو ساتھ لے کر اَلمُوت چلا گیا۔ یہ لوگ بغداد کے رہنے والے تھے۔

باپ نے اَلمُوت جا کر اُسے اور اس کی بہن کو حسن بن صباح کے سامنے پیش کر دیا اور التجا کی کہ امام اس کے بچوں کو قبول کر لے اور یہ اس کے لئے بڑی سعادت ہو گی۔ اس کی بہن بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ باپ ان دونوں کو حسن بن صباح کے حوالے کر کے وہاں سے آ گیا۔

بہن بھائی کو پہلے اپنی ماں یاد آیا کرتی تھی' اب باپ بھی یاد آنے لگا اور پھر گھر کی یاد

بھی ستانے لگی لیکن یہ کیفیت صرف دو تین دن رہی۔ وہاں حسن بن صباح کے استادوں نے ان دونوں کی ایسی برین واشنگ کی کہ وہ اپنی ماں' باپ اور گھر کو بھول گئے۔ انہیں الگ الگ کر دیا گیا تھا۔ یہ تو انہیں معلوم ہی نہ ہو سکا کہ انہیں جو شاہی کھانے کھلائے جا رہے ہیں ان کھانوں میں حشیش کے علاوہ اور بھی اشیاء ملی ہوئی ہوتی ہیں جو انسان کی سوچ اور فکر اور شخصیت کو ہی بدل دیتی ہیں۔ اس شخص کو اپنی بہن کے ساتھ بہت ہی پیار تھا لیکن بہن کو اس سے الگ کر دیا گیا تو اس نے ذرا سا بھی محسوس نہ کیا کہ اس کی بہن اب اس کے ساتھ نہیں اور نہ جانے اُسے کہاں لے گئے ہیں۔ وہ نہ سمجھ سکا کہ حسن بن صباح انسانی فطرت سے بڑی اچھی طرح واقف ہے۔ وہ جانتا تھا کہ فدائی اُس وقت بننے شروع ہوتے ہیں جب عقل اور روح ابھی کچّی ہوتی ہے اور پھر فدائی اس وقت بنتے ہیں جب ان تمام اعمال کی نہ صرف اجازت دے دی جاتی ہے بلکہ ان کا ارتکاب لازمی قرار دے دیا جاتا ہے جن میں لذّت اور لطف ہوتا ہے۔ وہ دراصل یہ بیان کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اَلمُوت میں انسانوں کے ضمیر مار دیئے جاتے ہیں۔ ضمیر کے احتجاج اور ردّعمل کو دبانے کے لئے ہی وہاں حشیش پلائی جاتی تھی اور گناہوں کا نشہ بھی طاری کر دیا جاتا تھا۔ اصل نشہ تو ان حسین اور نوجوان لڑکیوں کا ہوتا تھا جنہیں اس جنّت کی حُوریں کہا جاتا تھا اور انہیں خاص تربیت دی جاتی تھی۔ ان لڑکیوں کی بھی برین واشنگ کی ہوئی ہوتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو سچ مچ جنّت کی حُوریں سمجھتی تھیں۔ حسن بن صباح کے عقیدے کی بنیاد یہ تھی کہ جو بات یا جو عمل اور فعل دل کو اچھا لگے کر گزرو۔

اُس نے بتایا کہ تھوڑے ہی عرصے بعد اُس کے دل سے خون کے رشتوں کا تقدّس صاف ہو گیا۔ کسی فدائی کو کہا جاتا کہ اپنی ماں کا گلا کاٹ دو یا اپنے باپ کو قتل کر دو تو وہ یوں اپنی ماں اور اپنے باپ کو قتل کر دیتا تھا جیسے وہ اس کے بدترین دشمن تھے اور وہ ان دونوں کو قتل کرنے کے لئے ہی پیدا ہوا تھا۔ حسن بن صباح نے بعض بیٹوں کے ہاتھوں اپنے باپوں کو قتل کروایا' بعض باپوں نے حسن بن صباح کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے بیٹوں کو قتل کر دیا تھا۔

اس باطنی نے جس نے اپنا نام ابنِ مسعود بتایا تھا ایک بڑی ہی تکلیف دہ بات سنائی۔ اُس نے کہا کہ ساڑھے چار پانچ سال بعد جب وہ پکا فدائی بن چکا تھا' اسے جو حُور دی گئی وہ اس کی سگی چھوٹی بہن تھی۔ ان دونوں کی ذات میں یہ احساس بیدار ہوا ہی نہیں کہ یہ

بہن بھائی ہیں۔ ابنِ مسعود کا یہ احساس وسمِ کوہ میں آٹھ نو سال بعد بیدار ہوا تھا جب طبیب نے اس کے ذہن کو بیدار کر دیا تھا۔ اُس کا خون ایک بار پھر جوش میں آ گیا اور وہ مٹھیاں بھینچ کر اور دانت پیس کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں حسن بن صباح کو قتل کروں گا" ——اُس نے کہا —— "پھر میں اُسی خنجر سے اپنے آپ کو مار لوں گا"۔

"بیٹھ جاؤ ابنِ مسعود!" —— طبیب نے کہا —— "تمہاری یہ خواہش اور یہ ارادہ بھی پورا ہو جائے گا لیکن ابھی اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔ تمہارے زخم ابھی کچے ہیں۔ اگر تم نے خون کو یوں گرمایا اور لتنا ابال دیا تو زخم کھل سکتے ہیں پھر تم کچھ نہیں کر سکو گے"۔

سالار اوریزی نے بھی اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے تسلیاں دیں کہ وہ بھی یہی کام کرنا چاہتے ہیں اور وہ صرف حسن بن صباح کو ہی قتل نہیں کریں گے بلکہ اَلموُت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ اس طرح دوسروں نے بھی کچھ نہ کچھ کہہ کر اسے ٹھنڈا کر لیا۔

وہ بار بار یہی کہتا تھا کہ حسن بن صباح کو اپنے ہاتھوں قتل کرے گا اور اپنی بہن کو وہاں سے واپس لے آئے گا۔ ایک بار تو اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی بہن کا سامنا بھی نہیں کر سکے گا اور وہ بہن کو بھی قتل کر دے گا۔

اس سے پوچھا گیا کہ فدائی بن کر وہ کیا کام کیا کرتا تھا.... اُس نے اپنے اُن کاموں کی تفصیل سنائی جو اس سے گزرے ہوئے چھ سات برسوں کے عرصے میں کروائے گئے تھے۔ یہ پُراسرار غارت گری اور عیش و عشرت کی روئیداد تھی۔ اُس نے کہا کہ قتل کرنا اور پھر قتل ہو جانا اور سینے میں خنجر اُتار لینا ایسے ہی تھا جیسے کوئی آدمی سو گیا اور جاگ اٹھا اور پھر سو گیا۔ اس نے بتایا کہ اَلموُت میں انسان کو اُس مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں وہ خودکشی میں بھی لذّت محسوس کرتا ہے۔

"اس کے بعد مجھے قافلے لُوٹنے کا کام دے دیا گیا تھا" —— ابنِ مسعود نے کہا —— "میں آج پہلی بار محسوس کر رہا ہوں اور اپنے آپ پر لعنت بھیجتا ہوں کہ میں درندوں سے بڑھ کر ظالم تھا اور میں نے معصوم بچوں اور بے گناہ مردوں اور عورتوں کا خون بہایا ہے۔ ہم قافلوں پر اس طرح جھپٹ پڑتے تھے جس طرح بھیڑیئے بھیڑوں کے ریوڑ پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ہم بھیڑیوں سے کم نہ تھے۔ کوئی آدمی ذرا سی بھی مزاحمت کرتا یا یہ شک ہوتا کہ یہ مزاحمت کرے گا ہم اس کے سینے میں خنجر اُتار دیا کرتے تھے۔ میں نے

ہن کی گودیوں سے بچے اور بچیاں نوچی ہیں۔ ہمارے لئے حکم تھا کہ کوئی خوبصورت بچہ اور کوئی خوبصورت بچی نظر آئے تو اُسے اٹھا لاؤ۔ ہم قافلے کو لوٹ کر واپس آتے تو پیچھے ون کی ندی چھوڑ آتے تھے۔ کچھ دُور تک ہمیں چیختی چلاّتی ماؤں اور دھاڑیں مار مار کر روتے آدمیوں کی جگر پاش آوازیں سنائی دیتی تھیں جو ہمارے گھوڑوں کے ٹاپوں میں ب جاتی تھیں۔ ہمیں اس کامیابی پر اس قدر خوشی ہوتی تھی کہ ہم چیختے اور چلاّتے تھے۔ ہمارے ساتھ قافلے سے اٹھائی ہوئی چند ایک نوجوان لڑکیاں بھی ہوتی تھیں۔ ہم ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور عیش موج کر کے جشن مناتے تھے.... مجھے آج یہ بھی یاد نہیں کہ کتنے انسان میرے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں۔ کیا وہ سینکڑوں میں تھے یا ہزاروں میں، مجھے کچھ یاد نہیں.... میں نے یہ قتل و غارت نشے کی حالت میں کی تھی اور کبھی یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک خواب تھا اور اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی اور اب میں بیدار ہوں لیکن وہ حقیقت تھی۔ مجھے درندہ بنا دیا گیا تھا اور میں اس میں روحانی لذّت محسوس کرتا تھا .... اب میں انتقام لوں گا۔ مجھے جنہوں نے قاتل بنایا تھا، اب میں انہیں قتل کروں گا"۔

"تم اکیلے یہ کام نہیں کر سکو گے" —— سالار اوریزی نے کہا —— "قتل کرنے جاؤ گے اور جاتے ہی خود قتل ہو جاؤ گے۔ ہم تمہیں بار بار کہتے ہیں کہ یہ ہمارا کام ہے۔ ہم اس اڈے کو ہی اکھاڑ پھینکیں گے جہاں قاتل تیار کئے جاتے ہیں اور معصوم بچوں کو گناہوں کی وادیوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور جہاں بہن بھائی کا مقدس رشتہ بھی دم توڑ جاتا ہے.... انتقام لینے کے لئے کوئی خاص طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ تم صرف یہ بتا دو کہ یہاں وسمِ کوہ میں کون کون باطنی ہے اور فدائی کون کون ہے۔ ان کی نشاندہی کرو اور ہم پہلے انہیں پکڑتے ہیں اور تلوار تمہارے ہاتھ میں دیں گے کہ یہ لو ان کی گردنیں اُڑا دو"۔

ابنِ مسعود نے تین مکان بتائے اور کچھ لوگوں کے نام بھی لئے۔ سالار اوریزی نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر اپنے محافظ دستے کے کماندار کو بلایا اور ان مکانوں پر چھاپہ مارنے کے لئے کچھ ضروری ہدایات دیں۔ اُس نے کہا کہ ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہو۔

چھاپہ مار دستہ فوراً گھوڑوں پر سوار ہوا اور ان تینوں مکانوں پر بیک وقت چھاپہ مارا گیا۔ ان تینوں مکانوں میں سے جو افراد پکڑے گئے ان میں تین جوان سال اور بڑی خوبصورت عورتیں تھیں، سات آدمی تھے اور بچہ ایک بھی نہ تھا۔ ان کو پکڑنے کے لئے

بڑھے تو ان میں سے چار نے خنجر نکال لئے لیکن وہ مقابلے پر نہ آئے بلکہ خنجر اپنے دلوں میں اُتار لئے اور گرفتاری سے بچ کر دنیا سے ہی اُٹھ گئے۔ دو آدمیوں نے بڑے آرام سے اپنے کپڑوں کے اندر سے کچھ نکالا اور منہ میں ڈال لیا۔ وہ وہیں کھڑے رہے۔ چھاپہ مارنے والے انہیں پکڑنے کو آگے بڑھے تو وہ بڑے اطمینان سے خود ہی آگے آ گئے اور چھاپہ ماروں نے انہیں گرفتار کر لیا لیکن چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ وہ گر پڑے اور مر گئے۔ انہوں نے زہر کھا کر خودکشی کر لی تھی۔

تین عورتیں جو پکڑی گئی تھیں' ان کے چہروں پر ذرا سا بھی کوئی خوف یا ملال نہ تھا بلکہ ہونٹوں پر ہلکی ہلکی سی مسکراہٹیں تھیں۔ تینوں مکانوں میں سے کچھ مقدار حشیش کی اور کچھ جڑی بوٹیاں برآمد ہوئیں اور سونے کی شکل میں خاصا مال ملا۔ اس کے علاوہ خنجر تلواریں اور تیر و کمان ملے۔

صرف ایک آدمی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ چھاپہ مار اس گھر میں داخل ہوئے تو وہ جواں سال آدمی بالائی منزل کے ایک کمرے میں سے نکلا۔ اُس نے نیچے دیکھا اور چھت سے اس طرح کودا کہ منڈیر سے لٹکا اور گلی میں کود گیا۔ ایک چھاپہ مار اُسے پکڑنے کے لئے باہر کو دوڑا لیکن وہ جواں سال باطنی چھاپہ ماروں کے کھڑے گھوڑوں میں سے ایک گھوڑے پر کود کر سوار ہُوا اور ایڑ لگا دی۔ جتنی دیر میں اُسے پکڑنے والا چھاپہ مار اپنے گھوڑے پر سوار ہوتا تھا اتنی دیر میں وہ باطنی دُور نکل گیا تھا۔ چھاپہ مار کچھ دُور تک اس کے تعاقب میں گیا لیکن وہ بہت ہی فاصلہ طے کر گیا تھا اور اب اُس کے پیچھے جانا بے کار تھا۔

سات ہی آدمی ہاتھ آئے تھے جن میں سے چھ نے خودکشی کر لی اور ساتواں بھاگ نکلا۔ پیچھے تین عورتیں رہ گئیں جنہیں سالار اوریزی کے حوالے کر دیا گیا۔ سالار اوریزی نے ان سے پوچھا کہ وہ ان کی بیویاں تھیں اور وہ یہاں کیا کرتی تھیں۔

"ہم میں سے کوئی بھی کسی کی بھی بیوی نہیں تھی" ——— ان تینوں میں سے ایک نے بڑا احمقانہ لہجے میں کہا ——— "ہم ان سب کی داشتائیں تھیں اور ان کی تفریح کا ذریعہ' ہمارا کوئی اور کام نہیں تھا۔ ہم صرف یہ بتا سکتی ہیں کہ قتل کی باتیں ہوتی رہتی تھیں اور پھر یہ پتہ چلا کہ عبید عربی نام کے ایک آدمی نے بھانڈہ ہی پھوڑ دیا ہے"۔

ان عورتوں سے راز لینے کی بہت کوشش کی گئی لیکن وہ کچھ بھی نہ بتا سکیں' اور

آخر اسی کو سچ مان لیا گیا کہ یہ کچھ بھی نہیں جانتیں۔

○

یہ سارا واقعہ بہت بڑا کارنامہ تھا جو خواہ کسی نے ہی سرانجام دیا تھا' یہ سالار اوریزی کے کام آیا۔ اتنی بڑی کامیابی کو وہ اپنے تک ہی محدود نہیں رکھ سکتا تھا۔ اُس نے سلطان محمد کو اطلاع دینے کے لئے ایک قاصد مَرو بھیج دیا۔ دوسرا قاصد سنجر کی طرف شاہ در بھیجا۔ سنجر بھی سلطان ہی تھا۔

سالار اوریزی کا قاصد سلطان محمد کے پاس پہنچا اور پیغام سنایا تو سلطان محمد کچھ دیر قاصد کو دیکھتا رہا جیسے اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو یا جیسے وہ قاصد کی بات نہ سمجھ سکا ہو۔ اسے توقع نہیں تھی کہ کہیں سے اس قسم کی خبر بھی آئے گی کہ حسن بن صباح کے ایسے آدمی بھی پکڑے جائیں گے اور راز فاش کر دیں گے جو پتھر دل تھے۔ سلطان محمد کی حیرت زدگی کی دوسری وجہ یہ بھی کہ ایک دو روز پہلے اُسے سنجر نے پیغام بھیجا تھا کہ بہت بڑا خزانہ ہاتھ آیا ہے۔ اس خزانے کے ساتھ دوسری اچھی خبر یہ تھی کہ حسن بن صباح کے دو بڑے ہی تجربہ کار تخریب کار پکڑے گئے اور انہیں مگرمچھوں نے کھا لیا تھا۔

اُس وقت حسن بن صباح کی سلطنت دُور دُور تک پھیل گئی تھی اور وہ اس سلطنت کا بے تاج بادشاہ تھا۔ کم و بیش ایک سو چھوٹے اور بڑے قلعے باطنیوں کے قبضے میں تھے۔ یہ کوئی باقاعدہ سلطنت نہیں تھی' یہ حسن بن صباح کے اثرات تھے جو لوگوں نے اس انداز سے قبول کر رکھے تھے کہ حسن بن صباح دلوں پر راج کرتا تھا۔ تاریخ نویسوں نے بھی اس کے زیرِ اثر علاقوں کو اُس کی سلطنت ہی لکھا ہے.... اتنی بڑی سلطنت میں حسن بن صباح کے دو چار تخریب کاروں اور فدائیوں کا مارے جانا کوئی ایسا نقصان نہیں تھا کہ حسن بن صباح کے بازو اور اس کے اثرات کمزور ہو جاتے۔ اُس کے پاس پچاس ہزار سے زائد فدائی تھے لیکن نُور کے باپ نے جس طرح خزانہ حاصل کر لیا تھا اور اس کے تخریب کاروں کو مگرمچھوں کے حوالے کر دیا تھا اور پھر عبید عربی نے جو پردے اٹھائے اور اور دو باطنیوں کو سزائے موت دلوائی تھی اور پھر ابنِ مسعود کا واقعہ تھا' اس سے یہ فائدہ ہوا کہ سلطان محمد' سلطان سنجر اور سالار اوریزی اور ان کے دیگر سالاروں کے حوصلوں میں جان آ گئی اور ان سب نے ان واقعات کو خدائی اشارہ سمجھا کہ فتح حق پرستوں کی ہو گی۔

اُدھر اَلَموُت میں وسم کوہ سے بھاگا ہُوا باطنی حسن بن صباح کے پاس پہنچا اور اُسے بتایا کہ وسم کوہ میں کیا انقلاب آگیا ہے۔ اس نے تفصیل سے سنایا کہ عبید عربی جو سالار اوریزی کو قتل کرنے گیا تھا' اُس نے اپنے ہی دو آدمی سالار اوریزی سے قتل کروا دیئے ہیں اور پھر ایک اور پرانے فدائی ابنِ مسعود نے وسم کوہ کے تمام باطنیوں کو پکڑوا دیا ہے لیکن وہ پکڑے نہیں گئے بلکہ انہوں نے خودکشی کرلی ہے۔

مؤرخ لکھتے ہیں کہ حسن بن صباح اس قسم کی خبروں سے کبھی پریشان نہیں ہُوا تھا لیکن اب اسے ایسی کوئی خبر ملتی تھی تو وہ گہری سوچ میں کھو جاتا اور اُس کے چہرے پر رنج والم کا تاثر آ جاتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو عمر تھی۔ وہ خاصا بوڑھا ہو چکا تھا۔ دوسری وجہ اُس کے پریشان ہونے کی یہ تھی کہ اُس نے ابھی تک اپنی فوج نہیں بنائی تھی۔ فوج سے مراد تربیت یافتہ لشکر تھا جسے وہ میدانِ جنگ میں لڑا سکتا۔ اُس کے پاس فدائیوں کی کوئی کمی نہیں تھی اور اس کے فدائی اُس کے اشارے پر اپنی جانیں قربان کر دیا کرتے تھے لیکن وہ صرف چھُری چاقو چلانا جانتے تھے اور لوگوں کو دھوکے میں لا کر قتل کرنے کے فن کے ماہر تھے۔ اُس نے تھوڑے عرصے سے اپنے مشیروں اور مصاحبوں سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ باقاعدہ فوج تیار کی جائے جو باقاعدہ جنگ کی تربیت یافتہ ہو۔ وہ مشیروں سے کہتا تھا کہ سلجوقی ایک نہ ایک دن اَلَموُت پر حملہ ضرور کریں گے۔ بے شک اَلَموْت کا قلعہ ناقابلِ تسخیر تھا۔ ایک تو وہ وسیع وعریض چٹان پر بنایا گیا تھا اور اُس کے تین طرف دریا تھا لیکن وہ بے خبر نہیں تھا کہ مسلمان قربانی دینے پر آ گئے تو وہ اس قلعے میں داخل ہو جائیں گے۔

اُس نے اسی وقت اپنے مشیروں وغیرہ کو بلایا اور بتایا کہ وسم کوہ میں کیا ہُوا ہے اور ایسا انتظام ہونا چاہئے کہ کوئی پیروکار اس طرح غداری نہ کرے۔ کچھ دیر صلاح مشورے اور بحث مباحثے کے بعد یہ فیصلہ ہُوا کہ ہر شہر اور قصبے میں دو دو فدائی بھیج دیئے جائیں جو وہاں اپنے آدمیوں پر نظر رکھیں اور اُن سے ملتے ملاتے رہیں اور جہاں کہیں شک ہو کہ فلاں شخص غداری کرے گا کسی ثبوت کے بغیر اس شخص کو قتل کر دیا جائے۔

جب سے حسن بن صباح کا پیر استاد عبدالملک بن عطاش قتل ہُوا تھا' حسن بن صباح کچھ مغموم سا رہنے لگا تھا۔ شاید وہ تنہائی محسوس کر رہا تھا..... وسم کوہ سے بھاگ کر آنے والا آدمی حسن بن صباح کو ساری بات سنا چکا تو حسن بن صباح کو اپنا پیرو مرشد بہت یاد

آیا۔ اس پر کبھی کوئی مشکل آپڑتی تو وہ اپنے مرشد کی طرف قاصد بھیج کر مشورہ لے لیتا یا اسے اپنے ہاں بلا لیتا تھا۔ اب وسم کوہ کی یہ خبر سن کر اسے اپنا پیرو مرشد عبدالملک بن عطاش یاد آیا لیکن اب اسے اپنے مرشد سے زیادہ وہ خزانہ یاد آیا جسے نکلوانے کے لئے اس نے قاصد کو حاذق کے پاس بھیجا تھا اور حاذق نے قاصد کو یقین دلایا تھا کہ وہ کچھ دنوں بعد وہ خزانہ شیخ الجبل امام حسن بن صباح کے قدموں میں لا رکھے گا۔ بہت دن گزر گئے تھے' شاہ در سے حاذق نے کوئی اطلاع نہیں بھیجی تھی کہ اس نے خزانہ نکال لیا ہے یا نہیں۔ اسے یہ خیال آ رہا تھا کہ حاذق خزانہ نکال چکا ہوتا تو اب تک وہ الموُت پہنچ گیا ہوتا۔ حاذق نے خزانہ شاہ در تو نہیں لے جانا تھا۔

حسن بن صباح کو شک ہونے لگا کہ حاذق دھوکہ نہ دے گیا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ خزانہ ایسی چیز ہے جو باپ بیٹے کو اور سگے بھائیوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیتا ہے.....

وسم کوہ سے بھاگا ہُوا آدمی ابھی اس کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ حسن بن صباح کے دو تین مصاحبین بھی وہاں موجود تھے۔ اس نے ان کے ساتھ شاہ در کے خزانے کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ خزانہ پیرو مُرشد عبدالملک بن عطاش چھپا گیا تھا اور دو آدمی اس خزانے کی اصل جگہ سے واقف تھے اور اس جگہ تک پہنچنے کا راستہ صرف اِن دو کو معلوم تھا لیکن ابھی تک وہ دونوں نہیں پہنچے۔

"یا امام!" ــــ ایک مصاحب نے کہا ــــ "زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ خزانے کا معاملہ ہے۔ اس آدمی کو ایک بار پھر شاہ در بھیجیں اور وہ حاذق سے مل کر واپس آئے اور بتائے کہ وہ کیا کر رہا ہے..... ہو سکتا ہے حاذق وہاں موجود ہی نہ ہو۔ اگر وہ شاہ در سے جا چکا ہے تو اس کا ایک مطلب تو یہ ہوگا کہ وہ خزانہ نکال کر کہیں غائب ہو گیا ہے یا وہ زندہ ہی نہیں"۔

"ہمارا آدمی شاہ در تک ہی جا سکتا ہے" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "یہ تو ہم میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں کہ وہ خزانہ ہے کہاں!"

"مجھے معلوم ہے یا شیخ الجبل!" ــــ وسم کوہ سے بھاگ کر جانے والے آدمی نے کہا ــــ "آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں نے ایک لمبا عرصہ شاہ در میں گذارا ہے اور میں حاذق کے ساتھ رہا ہوں اور ہمارے پیر استاد عبدالملک بن عطاش مجھ پر پُورا اعتماد رکھتے تھے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ میں شاہ در چلا جاؤں؟"

حسن بن صباح تو خوشی سے اُچھل پڑا۔ اُسے تو توقع ہی نہیں تھی کہ کوئی اور بھی اس خزانے سے واقف ہو گا جو اس کا پیر و مرشد نہ جانے کتنے عرصے سے کہیں رکھ رہا تھا۔ اس نے اس آدمی سے کہا وہ فوراً شاہ در کو روانہ ہو جائے۔

"یا شیخ الجبل!" ـــــ ایک معمّر مصاحب نے کہا ـــــ "اگر یہ شخص خزانے والی جگہ سے واقف ہے تو اس کے ساتھ دو تین آدمی بھیج دیئے جائیں۔ اگر حاذق شاہ در میں نہ ملے تو یہ شخص خزانے والی جگہ چلا جائے اور دیکھے کہ وہاں کچھ ہے بھی یا نہیں۔ اگر حاذق بھی نہیں اور خزانہ بھی نہیں تو صاف ظاہر ہے کہ یہ مال و دولت حاذق لے اُڑا ہے"۔

حسن بن صباح نے اُسی وقت یہ انتظام کرنے کا حکم دے دیا۔ اُس نے دوسرا حکم یہ دیا کہ خزانہ اگر حاذق نے نکال لیا ہے تو وہ جہاں کہیں نظر آئے اُسے قتل کر دیا جائے....

باطنیوں اور خصوصاً فدائیوں کے لئے اپنے دشمن کو ڈھونڈ نکالنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

وسم کوہ سے بھاگ کر آنے والا یہ جوان سال آدمی جس کا نام حیدر بصری تھا، دو روز بعد دو آدمیوں کو ساتھ لے کر شاہ در کے لئے روانہ ہو گیا۔

○

سلطنتِ سلجوقیہ کے دارالسلطنت مَروْ میں فوجی سرگرمیاں عروج کو پہنچی ہوئی تھیں۔ حسن بن صباح کی طاقت کو کچلنے کے لئے ایک فوج تیار ہو رہی تھی۔ لوگ اس فوج میں شامل ہو رہے تھے اور انہیں جنگ کی تربیت دی جا رہی تھی۔ اب اس فوج کا ہدف قلعہ الموُت تھا۔ سب جانتے تھے کہ الموُت کو فتح کرنا اگر ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ضرور ہے۔ فوج کو ذہن نشین کرایا جا رہا تھا کہ قلعہ اَلموُت کی ساخت کیسی ہے اور شکل و صورت کیسی ہے اور وہ کس طرح ایک چٹان پر بنایا گیا ہے اور اس کے دروازے تک پہنچنے میں کیسی کیسی دشواریاں اور خطرے حائل ہیں۔

یہ حکم تو سلطان محمد کا تھا کہ ایسی فوج تیار کی جائے جس کی نفری کم نہ ہو اور اگر کم ہو بھی تو اس میں ایسا جذبہ اور ایسی اہلیت اور صلاحیت ہو کہ اگلی جنگ کو فیصلہ کُن بنا سکے اور اس کے بعد باطنی فرقے کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو لیکن سلطان محمد ضرورت سے زیادہ محتاط تھا۔ وہ ابھی اس فوج کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھا۔ سلطان محمد کا وزیر ابو نصر احمد تھا۔ ابو نصر احمد سلطان محمد کے باپ سلطان ملک شاہ کے وزیر خواجہ حسن طوسی

نظام الملک مرحوم کا چھوٹا بیٹا تھا۔ ابو نصر احمد اپنی نگرانی میں یہ فوج تیار کروا رہا تھا اور وہ اس کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن تھا۔ اس معاملے میں وہ سلطان محمد سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ اُس کا ارادہ یہ تھا کہ اَلموُت پر فوراً حملہ کر دیا جائے تاکہ حسن بن صباح کو مزید تیاری کا موقع نہ ملے۔

سلطان محمد اُسے ابھی حملے کی اجازت نہیں دے رہا تھا لیکن ابو نصر احمد کا باطنیوں کے خلاف جذبہ بڑا ہی شدید تھا اور کبھی کبھی تو وہ جذباتی بھی ہو جایا کرتا تھا۔ ایک تو مسلمان کی حیثیت سے وہ حسن بن صباح کو ابلیس کہتا اور اس سے شدید نفرت کرتا تھا اور اس کے ساتھ ابو نصر احمد حسن بن صباح کو اپنا ذاتی دشمن بھی سمجھتا تھا۔ پہلے اس داستان میں سنایا جا چکا ہے کہ ابو نصر احمد کے باپ نظام الملک مرحوم کو حسن بن صباح کے ایک فدائی نے قتل کیا تھا۔ پھر ابو نصر احمد کا بڑا بھائی ابوالمظفر علی وزیر بنا تو اُسے بھی ایک فدائی نے قتل کر دیا تھا۔ ابو نصر احمد اپنے باپ اور اپنے بھائی کے خون کا انتقام لینے کو بے تاب تھا۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ابو نصر احمد کی یہ ایک خامی تھی کہ وہ جذبے میں جذبات کو شامل کر لیتا تھا اور پھر بھول جاتا تھا کہ جنگ میں کچھ احتیاط بھی لازمی ہوتی ہے۔

اب ابو نصر احمد کو خبر ملی کہ وسم کوہ میں دو باطنی بلکہ حسن بن صباح کے دو فدائی صراطِ مستقیم پر آ کر حسن بن صباح سے متنفر ہو گئے ہیں تو وہ اپنے کسی خیال کے پیشِ نظر وسم کوہ جانے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ اس نے سلطان محمد سے اجازت چاہی اور ساتھ یہ وجہ بتائی کہ وہ ان دونوں فدائیوں سے قلعہ اَلموُت کے اندر کی باتیں معلوم کرے گا جو حملے میں ہمارے کام آئیں گی۔ سلطان محمد نے اُسے اجازت دے دی۔

○

ایک روز ابو نصر احمد محافظ دستے کے آٹھ گھوڑ سواروں کے ساتھ وسم کوہ روانہ ہو گیا۔ اس کے سامنے دو اڑھائی دنوں کی مسافت تھی۔ اس مسافت کو کم کرنے کے لئے اُس نے گھوڑوں کی رفتار تیز رکھی اور اپنے محافظوں سے کہا کہ شام سے پہلے کہیں پڑاؤ نہیں کیا جائے گا.... گھوڑے دن بھر چلتے رہے اور شام کو پہلا پڑاؤ کیا۔ گھوڑوں کو کھلایا پلایا گیا اور خود بھی کھا پی کر تھوڑا سا آرام کیا اور آدھی رات سے کچھ بعد ابو نصر احمد نے روانگی کا حکم دے دیا۔ اس طرح اگلے روز کے پچھلے پہر یہ قافلہ وسم کوہ پہنچ گیا۔

سالار اوریزی ابو نصر احمد کو دیکھ کر بہت ہی خوش ہوا۔ وہ بھی ابو نصر احمد کا ہم خیال

تھا اور چاہتا تھا کہ اَلمُوت پر فوراً" حملہ کیا جائے لیکن دونوں مجبور تھے کیونکہ سلطان اجازت نہیں دے رہا تھا۔ رات کھانے سے فارغ ہوتے ہی ابو نصر احمد کے کہنے پر سالار اوریزی نے ابنِ مسعود کو بلا لیا اور اس کا تعارف ابو نصر احمد سے کروایا۔

سالار اوریزی نے ابنِ مسعود کے جذبات اور باقی ساری باتیں ابو نصر احمد کو سنائیں۔ ابو نصر احمد نے بے تحاشا خراجِ تحسین پیش کیا اور اس سے کہا کہ وہ اسے اپنی فوج میں بڑا عہدہ دے گا۔

"مجھے کسی چھوٹے بڑے عہدے کی خواہش نہیں" ——— ابنِ مسعود نے کہا ——— "قابلِ احترام سالار اوریزی نے آپ کو بتا دیا ہے کہ میرا عزم کیا ہے اور میرے سینے میں کیسی آگ بھڑک رہی ہے۔ میں حسن بن صباح کو اپنے ہاتھوں قتل کروں گا اور اپنی بہن کو واپس لاؤں گا"۔

"کیا تمہاری بہن تمہارے کہنے پر تمہارے ساتھ آجائے گی؟" ——— ابو نصر احمد نے پوچھا۔

"نہیں!" ——— ابنِ مسعود نے جواب دیا ——— "میں تو نشے کی کیفیت سے نکل کر ہوش و حواس میں آگیا ہوں لیکن میری بہن اُسی کیفیت میں ہو گی جس میں اُسے رکھا جاتا ہے۔ وہ تو مجھے پہچانے گی ہی نہیں۔ اگر پہچان بھی لے گی تو مجھے اپنا بھائی تسلیم نہیں کرے گی۔ اُسے اٹھا کر لانا پڑے گا"۔

"یہ کام اکیلے نہیں کر سکو گے" ——— ابو نصر احمد نے کہا ——— "یہ ایک فوج کا کام ہے اور فوج بھی ایسی جو بہت ہی طاقتور ہو.... میں نے ایسی فوج تیار کر لی ہے۔ میں تمہیں اس فوج کے ساتھ لے جاؤں گا اور تم میری راہنمائی کرو گے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ قلعے کا محاصرہ کر کے ہم قلعے میں کس طرح داخل ہو سکتے ہیں اور جب داخل ہو جائیں گے تو اندر ہمارا کیسا مقابلہ ہو گا"۔

"اصل مقابلہ تو اندر ہو گا" ——— ابنِ مسعود نے کہا ——— "اگر میں یہ کہوں کہ اَلمُوت میں داخل ہونا ناممکن ہے تو آپ شاید تسلیم نہ کریں۔ اَلمُوت ایک قلعہ بند شہر ہے جو ایک چٹان پر کھڑا ہے۔ اگر آپ نے یہ باہر سے دیکھا ہے تو آپ نے ضرور محسوس کیا ہو گا کہ محاصرہ کیسے کریں گے۔ محاصرہ چٹان کے نیچے ہو گا جس سے اندر والوں کو یہ تکلیف پہنچا سکیں گے کہ باہر سے رسد اندر نہیں جا سکے گی اور اندر سے کوئی باہر نہیں آ

سکے گا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ چٹان کے دامن میں کھڑے ہو کر تیر پھینکیں اور وہ قلعے کی دیواروں تک پہنچ جائیں"۔

"دروازے کیسے ہیں؟" ——— ابو نصر احمد نے پوچھا۔

"بہت مضبوط!" ——— ابنِ مسعود نے جواب دیا ——— "چٹانوں جیسے مضبوط۔ بڑی موٹی لکڑی کے بنے ہوئے ہیں اور ان پر لوہے کے خول چڑھے ہوئے ہیں.... قابلِ صد احترام وزیر! قلعہ اَلمُوت قدرت کا ایک شاہکار ہے یا اسے ایک عجوبہ سمجھیں۔ یقین نہیں آتا کہ یہ انسانی ہاتھوں سے تعمیر ہُوا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ چٹان کا ایک حصہ ہے اور اسے قدرت نے اپنے ہاتھوں بنایا ہے۔ آپ حسن بن صباح کی دانش اور عقل تک نہیں پہنچ سکتے۔ محاصرے میں نقصان آپ کا ہو گا۔ وہ اس طرح کہ اوپر سے جو تیر نیچے آئیں گے وہ خطا نہیں جائیں گے"۔

"قلعے میں داخل ہونے کی ایک ہی صورت ہے" ——— سالار اوریزی نے کہا ——— "اندر کچھ آدمی ہوں جو حسن بن صباح کے مخالف اور ہمارے حامی ہوں۔ وہ اندر سے دروازے کھول دیں یا ایک ہی دروازہ کھول دیں"۔

"اَلمُوت کے اندر آپ کو کوئی ایک بھی انسان حسن بن صباح کا مخالف نہیں ملے گا" ——— ابنِ مسعود نے کہا ——— "وہ تو آپ کے مقابلے میں جانوں کی بازی لگا دیں گے۔ آپ کو کوئی غدار نہیں ملے گا' البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ابھی سے کچھ آدمی باطنیوں کے بہروپ میں الموت میں داخل کر دیں۔ یہ آدمی یہ ظاہر کرتے رہیں کہ وہ حسن بن صباح کے مرید یا پیروکار ہی نہیں بلکہ اس کے شیدائی ہیں لیکن محترم سالار! آپ کسی پتھر دل آدمی کو بھی اندر بھیج دیں تو وہ چند دنوں کے اندر اندر ہی آپ کا آدمی نہیں رہے گا۔ الموت میں ایسے آدمی موجود ہیں جو کسی مشکوک کو دیکھیں تو یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے اس شخص کا ضمیر اور اس کی روح بھی دیکھ لی ہو۔ اسے وہ قتل نہیں کرتے بلکہ جنت میں داخل کر دیتے ہیں۔ پھر وہ خدا کو بھی بھول جاتا ہے۔ اور جب وہ باہر نکلے گا تو اس عزم کے ساتھ نکلے گا کہ آپ کو قتل کر دے"۔

"تم نے اَلمُوت میں تین سال گزارے ہیں" ——— ابو نصر احمد نے کہا ——— "کیا تم کوئی طریقہ نہیں سوچ سکتے؟ ہمارے پاس ایسے جانباز موجود ہیں جو اپنی جانیں قربان کر دیں گے لیکن صرف جان قربان کر دینے سے ہی کچھ حاصل نہیں ہُوا کرتا۔ اپنا مقصد پورا

ہو جائے اور جان چلی جائے تو ہم لوگ کہتے ہیں کہ شہیدوں کا لہو رنگ لایا کرتا ہے"۔

"میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ اندر کیا ہے اور یہ قلعہ کس قسم کا ہے" ــــ ابنِ مسعود نے کہا ــــ "آپ کی فوج قلعے میں داخل ہو بھی گئی تو اصل لڑائی قلعے کے اندر ہو گی۔ عموماً" یوں ہوتا ہے کہ فاتح فوج قلعے میں داخل ہوتی ہے تو قلعے کی فوج ہتھیار ڈال دیتی ہے یا شہر کی آبادی اپنی فوج کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ ہتھیار ڈال دے ورنہ فاتح فوج شہر کو تباہ کر دے گی لیکن الموٗت میں معاملہ اُلٹ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی فوج کو اندر کھینچنے کے لئے خود ہی دروازے کھول دیئے جائیں اور آپ اس خوش فہمی میں اندر چلے جائیں کہ آپ نے قلعہ سر کر لیا۔ تو یہ ایک بڑا ہی خطرناک پھندہ ہو گا جس میں آپ کی فوج پھنسا کر تباہ و برباد کر دی جائے گی۔ قلعے کے اندر آپ کو بھول بھلیاں ملیں گی۔ ان میں سے وہی گزر سکتا ہے جو ان سے واقف ہو۔ اجنبی ان بھول بھلیوں میں بھٹک جاتے ہیں۔ قلعے اور شہر کے نیچے چٹان کاٹ کاٹ کر وسیع تہہ خانے بنے ہوئے ہیں اور ان میں بھی جو راستے ہیں وہ بھول بھلیوں جیسے ہیں۔ اندر جا کر آپ کی فوج بکھر جائے گی یا فرد فرد بکھیر دی جائے گی پھر فدائی اور دوسرے باطنی آپ کی فوج کو کاٹ دیں گے"۔

ابنِ مسعود اچھا خاصا تجربہ کار اور ہوش مند معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہر بات جنگی نقطۂ نگاہ سے کر رہا تھا۔ ابو نصر احمد اور سالار اوریزی اس سے جو تفصیلات معلوم کر رہے تھے' وہ سب جنگی نوعیت کی تھیں۔ وہ سالاروں کی نگاہ سے الموٗت کے اندرونی ماحول کو دیکھ رہے تھے۔

"مگرمچھ بڑا ہی خوفناک جانور ہوتا ہے" ــــ ابنِ مسعود نے کہا ــــ "جانور نہیں میں تو اسے درندہ کہوں گا۔ اس پر نہ تیر اثر کرتا ہے نہ برچھی نہ تلوار لیکن اس کا بھی ایک نازک حصہ ہوتا ہے اور وہ ہے اس کا پیٹ۔ وہاں ذرا سا چاقو مارو تو مگرمچھ بے بس ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قلعہ الموٗت ایک پہاڑ نظر آتا ہے جسے زلزلے کے شدید جھٹکے بھی راستے سے نہیں ہٹا سکتے لیکن اس میں بھی ایک دو کمزوریاں ہیں۔ ایک کمزوری اس شہر کی آبادی ہے۔ یہ لوگ آپ کی فوج کے خلاف لڑیں گے لیکن جلدی حوصلہ ہار جائیں گے۔ اصل لڑنے والے فدائی ہیں جن کی تعداد ہزارہا ہے اور وہ پورا ایک لشکر ہے لیکن یہ لشکر پُراسرار قتل اور خود کشی میں مہارت رکھتا ہے۔ یا چھری چاقو چلا سکتا ہے۔ ان لوگوں کو امام نے حکم دے رکھا ہے کہ ہتھیار ڈالنے یا پکڑے جانے سے بہتر یہ ہے کہ

خود کشی کر لو۔ یہ لوگ جانوں کی بازی لڑا کر آپ کا مقابلہ کریں گے لیکن جوں ہی دیکھیں گے کہ مقابلہ آسان نہیں تو اپنی تلواریں اور خنجر اپنے ہی جسموں میں اتار لیں گے لیکن یہ مرحلہ اُس وقت آئے گا جب آپ کی فوج بھی اسی طرح جانوں کی بازی لڑا کر یا یوں کہیں کہ دیوانگی کے عالم میں لڑے گی اور ان لوگوں پر غالب آ جائے گی....

"اب میں آپ کو الموٗت کا وہ پیٹ دکھاتا ہوں جو مگرمچھ کی طرح بہت ہی نازک ہے۔ وہاں آپ چاقو کی نوک سے کھال چیر کر اسے بے بس بھی کر سکتے ہیں اور اس میں داخل بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ الموٗت کی تین اطراف دریا بہتا ہے۔ قلعے کے پچھلے حصے میں جو چٹان ہے اس کے نیچے دامن میں ایک دروازہ چٹان کاٹ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ وہاں سے دریا چٹان کے ساتھ ٹکرا کر گزرتا ہے۔ یہ دروازہ جو ایک غار کے دہانے جیسا ہے' تقریباً" آدھا دریا میں ڈوبا رہتا ہے۔ اندر کی طرف بڑا ہی مضبوط دروازہ لگایا گیا ہے جو اندر سے مقفل رہتا ہے۔ دریا کا پانی اس دروازے تک آ جاتا ہے اور اگر دروازہ کھولا جائے تو پانی اور اندر آ جاتا ہے لیکن آگے راستہ دریا کی سطح سے اونچا بنایا گیا ہے اس لئے پانی آگے تک نہیں آ سکتا۔ اس دروازے تک پہرہ بھی ہوتا ہے لیکن بہت اندر کی طرف سنتری گشت کرتا ہے۔ یہ قلعے کا تہہ خانہ ہے جس میں اترو تو آگے بھول بھلیاں آ جاتی ہیں۔ ان میں سے وہی اس دروازے پر پہنچ سکتا ہے جو ان بھول بھلیوں سے واقف ہو"۔

"یہ دروازہ کس مقصد کے لئے بنایا گیا ہے؟" ــــ ابو نصر احمد نے کہا۔

"نکل بھاگنے کے لئے!" ــــ ابن مسعود نے کہا ــــ "میں فدائیوں کے اُس درجے تک پہنچ گیا تھا جس درجے کے ہر فدائی کو قلعے کے بہت سے راز بتا دیئے جاتے ہیں۔ میں نے یہ ساری بھول بھلیاں اور یہ راستے دیکھے ہوئے ہیں۔ دریا کی طرف یہ چور دروازہ اس لئے بنایا گیا تھا کہ ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ قلعہ کوئی طاقتور فوج فتح کر لے تو حسن بن صباح اور اس کے قریبی مصاحب اور مشیر وغیرہ اس دروازے سے بھاگ نکلیں۔ دروازے سے کچھ دور کشتیاں ہر وقت تیار رہتی ہیں۔ کوئی مان ہی نہیں سکتا کہ دریا میں دروازہ بھی ہو گا۔ اندر سے اس دروازے تک جو راستہ جاتا ہے وہ ایسی بھول بھلیوں میں سے گزر کر جاتا ہے کہ کوئی بھولے بھٹکے بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ میں پہنچ سکتا ہوں"۔

"بس اتنا ہی کافی ہے" ـــ ابو نصر احمد نے کہا ـــ "میں جو معلوم کرنا چاہتا تھا وہ تم نے زیادہ ہی تفصیل سے بیان کر دیا ہے جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ مجھے ایسے ہی ایک آدمی کی ضرورت تھی جو اَلمُوت کے اندر چلا جائے اور دروازہ کھول دے۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہاں کوئی چور دروازہ بھی ہے۔ وہ تم نے بتادیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ صرف تم اس دروازے تک پہنچ سکتے ہو.... اب تم بتاؤ کہ اَلمُوت کو محاصرے میں لیں تو کیا تم اندر جاکر وہ دروازہ کھول سکتے ہو؟"

"ایک بات آپ بھول گئے محترم وزیر!" ـــ سالار اوریزی نے کہا ـــ "پہلا کام تو یہ ہے کہ یہ یا کوئی اور قلعے میں داخل ہو۔ سوال یہ ہے کہ وہ داخل کس طرح ہو گا؟"

"وہ میں ہوں گا" ـــ ابنِ مسعود نے کہا ـــ "یہ خبر حسن بن صباح تک پہنچ چکی ہو گی کہ میں نے وسم کوہ میں تمام باطنیوں کی نشاندہی کر کے سب کو مروادیا ہے۔ ان میں سے ایک بھاگ گیا تھا۔ وہ یقیناً حیدر بصری تھا۔ میں اَلمُوت چلا جاؤں گا اور حسن بن صباح سے کہوں گا کہ ان باطنیوں کو پکڑوانے اور مروانے والا یہی حیدر بصری تھا اور میں تو سلجوقیوں کا قیدی بن گیا تھا اور انہوں نے مجھ پر اتنا تشدد کیا ہے کہ میرے تو ہوش بھی ٹھکانے نہیں رہے اور اب میں فرار ہو کر آیا ہوں"۔

"ہم تمہیں ایسے خطرے میں بھی نہیں ڈالنا چاہتے" ـــ ابو نصر احمد نے کہا ـــ "حسن بن صباح استادوں کا استاد ہے۔ وہ تمہاری بات کو سچ مانے گا ہی نہیں"۔

"یہ آپ مجھ پر چھوڑیں" ـــ ابنِ مسعود نے کہا ـــ "جس طرح لوہے کو لوہا کاٹتا ہے اسی طرح فریب کار ہی فریب کار کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میں کیا ڈھونگ رچاؤں گا' یہ تو ابھی سوچنا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میں حسن بن صباح کو دھوکہ دے سکوں گا"۔

سب دیکھ رہے تھے کہ ابنِ مسعود حسن بن صباح اور اس کے فرقے کے خلاف اس قدر بپھرا اور بھڑکا ہُوا تھا کہ وہ نتائج کی پرواہ کئے بغیر اس قسم کے خطرے مول لینے کو بھی تیار ہو گیا تھا کہ وہ اَلمُوت جاکر حسن بن صباح جیسے ابلیس کو دھوکہ دے گا اور پھر اس کے بعد چور دروازہ بھی کھول دے گا۔ بہرحال سالار اوریزی اور ابو نصر احمد کو یہ کاوش نہ کرنی پڑی کہ وہ ابنِ مسعود کو دلائل دے کر یا کسی اور طریقے سے اَلمُوت جانے کے لئے تیار کرتے۔ وہ خود ہی تیار ہو گیا تھا۔ اب سوال یہ سامنے آیا کہ ابنِ مسعود کب جائے اور

اسے کس طرح بھیجا جائے اور اسے کس طرح اندر اطلاع بھیجی جائے کہ اب وہ وزبا والا دروازہ کھول دے۔

اس سوال پر جب بات شروع ہوئی تو مشکل یہ سامنے آئی کہ سلطان محمد کو کس طرح راضی کیا جائے کہ وہ اَلمُوت پر حملے کی اجازت دے دے۔ ابو نصر احمد کہتا تھا کہ فوج بالکل تیار ہے۔ سالار اوریزی ابو نصر احمد کا ہم خیال تھا.... آخر طے یہ پایا کہ جب فوج مَرو سے کوچ کرے گی تو پانچ سات روز پہلے وسم کوہ ابنِ مسعود کو اطلاع بھجوادی جائے گی کہ اب وہ اَلمُوت چلا جائے۔ المُوت کو محاصرے میں لیا جائے گا تو ابنِ مسعود اگر حسن بن صباح کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا تو وہ کسی رات شہر کی دیوار سے مشعل ہلائے گا جو یہ اشارہ ہو گا کہ اس نے پچھلا دروازہ کھول دیا ہے اور پھر ابو نصر احمد کچھ جانبازوں کو دریا کی طرف سے قلعے میں داخل کر دے گا اور وہ کام کر لیں گے۔

"نہیں قابلِ احترام وزیر" ـــ ابنِ مسعود نے کہا ـــ "مجھے اتنا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ بہتر یہ ہے کہ میں کل صبح روانہ ہو جاؤں گا اور اپنا کھیل کھیلوں گا۔ اگر میں کامیاب ہو گیا تو مجھے خاصا وقت چاہئے کہ میں ان راستوں سے اور زیادہ واقف ہو جاؤں اور ان راستوں کے سنتریوں کے ساتھ بھی علیک سلیک ہو جائے اور انہیں یہ تاثر ملے کہ میں اس طرف امام کی اجازت یا حکم سے آتا جاتا رہتا ہوں.... آپ جب کبھی اَلمُوت کو محاصرے میں لیں گے تو میں دریائی دروازہ کھول کر مشعل سے آپ کو اشارہ دے دوں گا"۔

وزیر ابو نصر احمد اور سالار اوریزی ابنِ مسعود کی اس تجویز سے متفق ہو گئے اور اسے کہہ دیا کہ وہ اگلی صبح جس حلیے اور جس حالت میں جانا چاہتا ہے' روانہ ہو جائے۔

○

اگلے روز ابو نصر احمد مَرو کو واپسی سفر پر روانہ ہُوا تو سالار اوریزی بھی اس کے ساتھ تھا۔ ابو نصر احمد نے ہی سالار اوریزی سے کہا تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ چلے اور دونوں مل کر سلطان محمد کو قائل کریں گے کہ وہ فوری طور پر حملے کی اجازت دے دے۔

تقریباً تین دنوں کی مسافت کے بعد دونوں مَرو پہنچے اور اگلے روز دونوں سلطان محمد کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے سلطان محمد کو تفصیل سے بتایا کہ کس طرح انہوں نے اَلمُوت کی اندرونی ساخت اور دیگر احوال و کوائف کے متعلق کتنی قیمتی

معلومات حاصل کر لی ہیں اور جس شخص نے یہ معلومات دی ہیں وہ محاصرے سے پہلے اَلَمُوت میں داخل ہو چکا ہو گا۔ دونوں نے سلطان محمد کو ابنِ مسعود کی ساری باتیں سنائیں اور کہا کہ انہیں حملے کی اجازت دی جائے۔

بہت دیر تبادلۂ خیالات اور بحث مباحثہ ہوتا رہا اور آخر سلطان محمد نے ابو نصر احمد کو اَلَمُوت پر حملے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ یہ بھی کہا کہ کوچ ایک مہینے بعد ہو گا اور اس ایک مہینے میں فوج کو دن رات تیاری کروائی جائے گی۔ سلطان محمد نے دوسری بات یہ کہی کہ اس حملے میں سالار اوریزی شامل نہیں ہو گا بلکہ وہ واپس وسم کوہ جا کر اپنی فوج تیار کرے گا اور ابو نصر احمد کو جتنی بھی کمک کی ضرورت ہو گی وہ سالار اوریزی وسم کوہ سے بھیجتا رہے گا۔

اُس وقت جب ابو نصر احمد اور سالار اوریزی مَرو میں سلطان محمد کے پاس بیٹھے ہوئے تھے' اَلَمُوت میں حسن بن صباح کو اطلاع دی گئی کہ وسم کوہ سے ایک فدائی جو اپنا نام ابنِ مسعود بتاتا ہے' بڑی بُری حالت میں آیا ہے اور شرفِ ملاقات کا متمنی ہے..... حسن بن صباح کسی فدائی کو نہیں ٹالا کرتا تھا' اس نے ابنِ مسعود کو بلا لیا۔

ابنِ مسعود جب حسن بن صباح کے سامنے گیا تو رُک گیا۔ اس کی حالت بہت ہی بُری تھی۔ کپڑے انتہائی میلے اور جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ اُس کے ایک پاؤں سے تھوڑا تھوڑا خون نکل رہا تھا۔ اُس کے سر کے بال مٹی سے اَٹے ہوئے اور اُلجھے ہوئے تھے۔ اُس کے جسم سے بدبو آتی تھی۔

وہ حسن بن صباح کے کمرے میں داخل ہُوا تو صاف نظر آتا تھا کہ اُس کی ٹانگیں اس کے جسم کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہیں۔ وہ پاؤں گھسیٹ رہا تھا۔ وہ رُکا' اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوئیں پھر اس کا سر ڈولا اور وہ اس طرح گرا کہ پہلے اُس کے گھٹنے فرش پر لگے پھر پہلو کو لُڑھک گیا۔

حسن بن صباح نے کہا کہ اسے طبیب کے پاس لے جایا جائے اور وہ اس کا علاج معالجہ کرے اور اسے کچھ کھلایا پلایا بھی جائے۔

"یہ کون ہے؟" ـــــ حسن بن صباح نے پوچھا ـــــ "مجھے اس کا نام ابنِ مسعود بتایا گیا ہے اور یہ وسم کوہ سے آیا ہے۔ کیا یہ وہی ابنِ مسعود نہیں جس کے متعلق حیدر بصری نے یہاں آ کر بتایا تھا کہ ابنِ مسعود نے وہاں تمام فدائیوں کو پکڑوا دیا تھا اور ان

سب نے اپنی جانیں اپنے ہاتھوں لے لی ہیں؟"

حسن بن صباح کو بتایا گیا کہ یہ وہی ابنِ مسعود ہے۔ حسن بن صباح کچھ حیران تھا کہ اس نے اگر وسم کوہ میں اپنے ساتھیوں کو پکڑوا دیا تھا تو اسے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا اور سلجوقی ایسے تو بے مرّوت نہیں کہ اسے انعام و اکرام نہ دیتے اور اس حالت میں اسے چھوڑ دیتے۔ حسن بن صباح کے مشیروں نے کہا کہ ان سوالوں کے جواب یہی شخص دے سکتا ہے۔ اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا چاہئے۔

حیدر بصری کو حسن بن صباح نے اس کام کے لئے شاہ در کے لئے روانہ کر دیا تھا کہ وہ حاذق سے ملے اور اس سے پوچھے کہ اس نے ابھی تک خزانہ اَلَمُوت کیوں نہیں پہنچایا۔ حیدر بصری کے ذمے یہ کام بھی تھا کہ حاذق اگر شاہ در سے غیر حاضر ہے تو حیدر بصری اسے ڈھونڈے اور اگر وہ نہ ملے تو حیدر بصری اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اس جگہ چلا جائے جہاں خزانہ رکھا ہے اور وہ وہاں سے اٹھا کر اَلَمُوت پہنچا دے..... حیدر بصری نے حسن بن صباح کو بتایا تھا کہ اسے معلوم ہے وہ خزانہ کہاں ہے اور وہاں سے کس طرح نکالا جا سکتا ہے۔

ابنِ مسعود رات بہت دیر بعد ہوش میں آیا۔ اسے نہلایا گیا' صاف ستھرے کپڑے پہنائے گئے اور پھر اسے کچھ کھلایا پلایا گیا۔ طبیب نے اسے سلا دیا تاکہ اس کی کمزوری کم ہو جائے اور پھر یہ غشی میں نہ چلا جائے۔

اگلی صبح اسے حسن بن صباح کے پاس لے گئے۔ حسن بن صباح اُس کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وسم کوہ میں یہ انقلاب کس طرح آیا ہے۔ حیدر بصری نے اسے بتایا تو تھا لیکن ابنِ مسعود کو دیکھ کر اسے کچھ شک ہونے لگا اور اب وہ ابنِ مسعود سے وسم کوہ کی واردات سننے کو بے تاب تھا۔

ابنِ مسعود کو جب حسن بن صباح کے کمرے میں داخل کیا گیا تو اس سے اچھی طرح چلا نہیں جاتا تھا۔ حسن بن صباح نے اسے اپنے سامنے بٹھایا اور پوچھا کہ وہ اس حالت میں کہاں سے آیا ہے اور اس پر کیا گزری ہے اور وسم کوہ میں کیا ہُوا تھا۔

"میں سلجوقیوں کی قید سے فرار ہو کر آیا ہوں یا شیخ الجبل!" ـــــ ابنِ مسعود نے لرزتی کانپتی اور قدرے نحیف آواز میں کہا ـــــ "وہ ظالم سلجوقی مجھ سے اَلَمُوت کی باتیں پوچھتے تھے اور یہ بھی پوچھتے تھے کہ یہاں اور کون کون تمہارے فرقے کا آدمی ہے۔ میں

انہیں کوئی جواب نہیں دیتا تھا تو وہ مجھے ایسی ایسی اذیتیں دیتے تھے جو شاید ہی کوئی انسان برداشت کر کے زندہ رہ سکتا ہو لیکن میں اپنے شیخ الجبل اور امام کو ذہن میں رکھ لیتا تھا اور میرا جسم ہر اذیت برداشت کر لیتا تھا۔ میں نے انہیں کچھ بھی نہیں بتایا"۔

"پھر تمہارے ساتھیوں کی نشاندہی کس نے کی تھی؟" ـــــ حسن بن صباح نے پوچھا ـــــ "تم شاید نہیں جانتے کہ تمہارا ایک ساتھی حیدر بصری یہاں پہنچ گیا ہے اور وہ پوری بات سنا چکا ہے"۔

"حیدر بصری!" ـــــ ابن مسعود نے کہا ـــــ "اس نے تو یہاں پہنچ کر اپنے مطلب کی کہانی سنائی ہی تھی۔ میں نہیں جانتا نہ جاننا چاہوں گا کہ حیدر بصری نے آپ کو کیا بات سنائی ہے، میں یہ بتانے آیا ہوں کہ ہم سب کو حیدر بصری نے مروایا ہے۔ اس سے پہلے ہمارا ایک فدائی عبید عربی وہاں سالار اوریزی کو قتل کرنے گیا تھا لیکن ایک بڑی خوبصورت اور جوان لڑکی کے جال میں آگیا اور اس نے اُن دو آدمیوں کو مروا دیا جنہوں نے اسے آپ کے حکم کے مطابق پناہ میں رکھا تھا۔ سالار اوریزی نے ان دونوں کو گرفتار کر کے سرِعام ان کے سر قلم کر دیئے ہیں"۔

ابن مسعود نے عبید عربی کا نام اس لئے نہیں لیا تھا کہ وہ اسے کسی مصیبت میں ڈالنا چاہتا تھا بلکہ اس لئے کہ اسے یہ یقین تھا کہ اب یہ باطنی اسے پکڑ کر الموت نہیں لا سکیں گے۔

"یا شیخ الجبل!" ـــــ ابن مسعود نے کہا ـــــ "عبید عربی کی نشاندہی پر حیدر بصری پکڑا گیا۔ حیدر بصری نے یقیناً سلجوقیوں سے منہ مانگا انعام لیا اور ہم سب کو پکڑوا دیا۔ سلجوقیوں نے سب سے پہلے مجھے پکڑا اور پوچھا کہ یہاں باطنی کون کون ہیں۔ میں نے انہیں صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میرے جسم کی بوٹیاں نوچنی شروع کر دو، میں اپنے کسی ساتھی کا سراغ نہیں دوں گا۔ تب سالار اوریزی نے خود آ کر مجھے بتایا کہ تمہارے ایک ساتھی حیدر بصری نے سب کچھ بتا دیا ہے اور اسے اتنا زیادہ انعام دیا گیا ہے جو تم لوگ تصوّر میں بھی نہیں لا سکتے۔ میں نے کہا کہ تم لوگوں کو ہر باطنی کا پتہ چل گیا ہے تو مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔ یا شیخ الجبل، انہوں نے مجھے تو مار ہی ڈالا تھا اور شاید وہ یہی سمجھ بیٹھے تھے کہ میں اب یہاں سے نکل ہی نہیں سکتا۔ جسمانی طور پر میں بہت ہی کمزور ہو گیا تھا۔ آخر ایک روز مجھے فرار کا موقع مل گیا اور میں وہاں سے نکل آیا۔ یا امام! آپ کے عظیم

نام پر میں نے اس جسمانی حالت میں، بھوکے پیاسے یہ سفر طے کیا ہے"۔

ابن مسعود کی آواز یوں ڈوبتی چلی جا رہی تھی جیسے وہ ابھی بے ہوش ہو جائے گا۔ وہ ذرا خاموش ہُوا اور لمبے لمبے سانس لئے اور پھر کمزور سی آواز میں بولنے لگا۔

"یہاں میں اتنی مسافت پیدل طے کر کے جھوٹ بولنے نہیں آیا یا امام!" ـــــ ابنِ مسعود نے کہا ـــــ "میں وہیں وسم کوہ میں رہتا تو اپنی جنت کی حُوروں جیسی ایک نوجوان لڑکی کا خاوند ہوتا۔ مجھے ایسی دو لڑکیاں یوں دکھائی گئی تھیں کہ انہیں باری باری میرے حوالے کر دیا گیا تھا۔ میرے لئے وہاں شہزادوں جیسی زندگی تھی لیکن میں شیخ الجبل کو جان دے سکتا ہوں، دھوکہ نہیں دے سکتا"۔

"اگر حیدر بصری کو تمہارے سامنے بٹھا دیا جائے" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "اور وہ وہی بیان دے، جو وہ دے چکا ہے تو تم اسے کس طرح جھٹلاؤ گے؟"

"یا شیخ الجبل!" ـــــ ابنِ مسعود نے کہا ـــــ "اس وقت تک حیدر بصری کو میرے سامنے بیٹھا ہُوا ہونا چاہئے تھا۔ آپ اسے بلاتے کیوں نہیں؟ میں تو اس امید پر آیا تھا کہ حیدر بصری کی موجودگی میں یہ سارا بیان دوں گا"۔

"وہ شاہ در چلا گیا ہے" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "اُسے آ لینے دو۔ تمہیں ایک بار پھر حیدر بصری کی موجودگی میں یہ بیان دینا پڑے گا"۔

"میری ایک التجا ہے یا شیخ الجبل!" ـــــ ابن مسعود نے کہا ـــــ "آپ اسے یہاں فوراً بلوا لیں۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ میرے جسم پر آپ کو کوئی زخم یا کوئی چوٹ نظر نہیں آئے گی، لیکن آپ کی آنکھ میرے جسم کے اندر دیکھ سکتی ہے تو آپ کو حیرت ہو گی کہ میں زندہ کس طرح ہوں۔ میرے جسم کے اندر اتنی چوٹیں ہیں کہ میں شاید جانبر نہیں ہو سکوں گا۔ میں مرنے سے پہلے چاہتا ہوں کہ آپ کو یقین ہو جائے کہ میں سچا اور حیدر بصری جھوٹا اور دھوکہ باز ہے"۔

حسن بن صباح کو جیسے یقین ہونے لگا تھا کہ ابن مسعود جھوٹ نہیں بول رہا لیکن حیدر بصری کو اس نے شاہ در بھیج دیا تھا۔ حسن بن صباح نے اپنے دو مشیروں سے بات کی کہ حیدر بصری کب تک واپس آ سکتا ہے۔ مشیروں نے کچھ باتیں کیں، کچھ مشورے دیئے اور حسن بن صباح کچھ دیر ان کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور اُس کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے کہ وہ تو خزانہ لانے گیا ہے، اُسے ابھی واپس نہ بلوایا جائے تو ٹھیک ہے۔

"کیسا خزانہ؟" ــــ ابنِ مسعود نے بیدار ہوتے ہوئے بلکہ چونک کر پوچھا ــــ "کون سا خزانہ؟.... اگر آپ نے اسے کہیں سے خزانہ یا کوئی قیمتی مال لانے کے لئے بھیج دیا ہے تو پھر یہ توقع نہ رکھیں کہ وہ واپس آجائے گا۔ آپ ایک بڑے زہریلے سانپ کو اعتماد میں لے رہے ہیں۔ اس کے پیچھے کچھ آدمی بھیجیں جو اسے پکڑ کر لے آئیں۔ کوشش کریں کہ وہ خزانے تک نہ پہنچ سکے"۔

ابنِ مسعود کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ خزانے کا معاملہ کیا ہے۔ شاہ در سے دُور جھیل میں سے جو خزانہ حاذق نکالنے گیا تھا اس کے متعلق ابنِ مسعود کو کچھ بھی معلوم نہ تھا پھر بھی وہ دماغ لڑا لڑا کر بات کر رہا تھا اور اس کی ہر بات اب قیاس آرائیوں سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ اسی حسن بن صباح کا تربیت یافتہ تھا۔ اسی شیخ الجبل اور امام نے اسے بدی اور ابلیسیت کے راستے پر ڈالا تھا۔ اس نے بہت حد تک حسن بن صباح کو متاثر کر لیا تھا۔ اس کے بولنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابنِ مسعود کو سچا سمجھنے لگا ہے۔ اس نے یہ فیصلہ سنایا کہ ابنِ مسعود کو حیدر بصری کی واپسی تک قید میں نہ ڈالا جائے بلکہ اپنی نگرانی میں رکھا جائے اور یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ یہ قلعے سے باہر نہ جائے۔

○

اُس وقت حیدر بصری اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ شاہ در میں اپنے باطنی ساتھیوں کے ہاں بیٹھا ہوُا تھا۔ اس نے حسن بن صباح سے یہ تو کہہ دیا تھا کہ وہ عبدالملک بن عطاش کے خزانے والی جگہ سے واقف ہے لیکن شاہ در پہنچ کر اسے خیال آیا کہ اس جگہ تک پہنچنے کا طریقہ اور راستہ تو اسے معلوم ہی نہیں نہ یہ معلوم ہے کہ خزانہ چٹانوں میں کس جگہ رکھا گیا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ پریشانی کے عالم میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

وہ عبدالملک بن عطاش کے عروج کے زمانے میں شاہ در رہ چکا تھا۔ حاذق بھی یہیں تھا۔ حیدر بصری بھی حاذق کے درجے کا فدائی تھا اس لئے وہ عبدالملک بن عطاش کی محفل میں جایا کرتا تھا اور کبھی کوئی راز کی بات ہوتی تو اس میں بھی حیدر بصری کو شامل کیا جاتا تھا لیکن جہاں تک خزانے کا تعلق تھا' عبدالملک بن عطاش نے حیدر بصری کو اس سے ناواقف رکھا تھا۔ اسے اس خزانے کا جو پتہ چلا تھا وہ حاذق نے اسے بتایا تھا۔ حاذق کے ساتھ حیدر بصری کی بڑی گہری دوستی تھی۔ جب حاذق نے اسے خزانے کے متعلق

جتایا تو اس نے پوری طرح غور نہیں کیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایسے شاہی خزانوں کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اب حسن بن صباح نے اس کا براہِ راست تعلق پیدا کر دیا اور اسے شاہ در بھیج دیا کہ وہ خزانہ نکال کر لے آئے اور حیدر بصری نے پورے اعتماد کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ لے آئے گا مگر جب تفصیلات جاننے کی ضرورت پڑی تو حیدر بصری کو خیال آیا کہ وہ تو صرف ایک جھیل اور جھیل کے درمیان تھوڑے سے چٹانی علاقے سے آگاہ ہے اور اس سے زیادہ اسے کچھ بھی معلوم نہیں۔

ایک روز نوُر کا باپ اکیلا اپنے کھیتوں میں گھوم پھر رہا تھا۔ نوُر اپنے گھر میں تھی۔ اچانک دو آدمیوں نے پیچھے سے نوُر کے باپ کو پکڑ لیا۔ وہ پیچھے مُڑا تو دیکھا کہ ان میں ایک حیدر بصری تھا جسے وہ بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ پہلے سنایا جا چکا ہے کہ نور کا باپ عبدالملک کا خاص معتمد ملازم تھا اس لئے عبدالملک کے پاس جو لوگ آتے جاتے رہتے تھے انہیں نوُر کا باپ بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔

"اوہ' حیدر بصری ہو!" ــــ نوُر کے باپ نے مسرت کے لہجے میں کہا ــــ "تم پھر آ گئے ہو؟.... تمہیں مل کر میرا دل خوش ہو گیا ہے لیکن میرے دوست! بہت احتیاط سے رہنا۔ سلجوقی سلطان سنجر یہاں موجود ہے اور سلجوقی ذرا سے شک پر بھی باطنیوں کو پکڑ لیتے ہیں"۔

"ہمیں دھوکہ نہ دے بُڈھے!" ــــ حیدر بصری نے کچھ طنز اور غصے کے لہجے میں کہا ــــ "مجھے اَلموُت میں معلوم ہو گیا تھا کہ توُ نے اور تیری بیٹی نوُر نے پیر و مُرشد عبدالملک بن عطاش کو دھوکہ دیا تھا اور اس کی شکست کا باعث بنے تھے"۔

"اور اب یہ سلجوقیوں کا وفادار بن گیا ہو گا" ــــ حیدر بصری کے ساتھی نے طنزیہ کہا ــــ "اس کے پاس اتنی خوبصورت لڑکی جو ہے"۔

نوُر کے باپ نے پُر اعتماد اور پر اثر لہجے میں انہیں بتانا شروع کر دیا کہ اس نے کسی کو دھوکہ نہیں دیا بلکہ عبدالملک بن عطاش نے یہاں سے جاتے وقت ان کی پرواہ ہی نہ کی اور باپ بیٹی کو سلجوقی فوج کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلے گئے۔ اس نے انہیں یہ یقین دلانے کی بھی کوشش کی کہ وہ ابھی تک حسن بن صباح کا پیروکار ہے اور اس نے اپنی بیٹی کسی کے حوالے نہیں کی نہ ہی وہ اسے یہاں کسی سے بیاہے گا۔

"تم نہیں جانتے حیدر بصری!" ــــ نور کے باپ نے کہا ــــ "کہ تمہیں دیکھ کر

مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ میں تم جیسے کسی ساتھی کے انتظار میں تھا کہ وہ مجھے اور میری بیٹی کو الموُت پہنچا دے۔ حاذق تھا۔ اس سے میں چوری چھپے مل لیا کرتا تھا اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے اور میری بیٹی کو الموُت لے جائے گا لیکن وہ ایسا گیا کہ واپس ہی نہیں آیا"۔

"یہاں نہیں!" — حیدر بصری نے کہا — "ہمارے ساتھ چلو اور وہاں باتیں ہوں گی۔ ہم تمہیں پہلے ہی بتا دیتے ہیں کہ تمہیں ہم نے زندہ چھوڑنا ہی نہیں۔ چونکہ تم ہمارے ساتھی رہے ہو اس لئے تمہیں یہ موقع دیں گے کہ جو کہنا چاہتے ہو کہہ لو"۔

"تمہاری جگہ نہیں تم میرے گھر چلو" — نوُر کے باپ نے کہا — "وہاں تمہیں میری بیٹی بھی ملے گی اور پھر میں تمہیں یقین دلا دوں گا کہ میں تمہارا ہی ساتھی ہوں اور یہاں کچھ مجبوری اور زیادہ تر اپنے مقصد کے لئے رکا ہوُا ہوں"۔

حیدر بصری اور اس کا ساتھی اس کے ساتھ جانے پر راضی نہیں ہو رہے تھے۔ حیدر بصری نے اس خطرے کا اظہار کیا کہ وہ انہیں پکڑوا دے گا۔

"تم مجھے یرغمال بنائے رکھو" — نوُر کے باپ نے کہا — "تم دونوں کے پاس خنجر تو ضرور ہوں گے۔ اگر نہیں تو پھر تم فدائی ہو ہی نہیں سکتے۔ تمہیں جہاں شک ہوُا کہ میں نے تمہیں دھوکہ دیا ہے اور اب تم پکڑے جاؤ گے تو خنجر میرے سینے میں اتار دینا اور نکل بھاگنا اور نکل نہ سکے تو اپنے آپ کو ختم کرنا تو جانتے ہی ہو.... میں کہتا ہوں میرے ساتھ چلو"۔

حیدر بصری اور اس کا ساتھی کوئی جاہل اور گنوار تو نہ تھے کہ اس کی باتوں میں آ جاتے۔ وہ بھی تجربہ کار آدمی تھا اور اتنی زیادہ عمر میں اس نے عملی زندگی کا بہت تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ بہت سی بحث اور جھک جھک کے بعد حیدر بصری اور اس کے ساتھی کو اپنے گھر میں لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

نوُر نے حیدر بصری کو دیکھا تو اسے پہچاننے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی۔ نوُر نے حیدر بصری کو اپنے سابق خاوند عبدالملک بن عطاش کے ساتھ کئی بار دیکھا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی نوُر کے باپ نے نوُر کو آنکھوں سے ایسا اشارہ دے دیا جو نوُر سمجھ گئی اور بڑے تپاک سے حیدر بصری سے ملی۔ نوُر نے بھی ایسی باتیں کیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک باطنی ہے اور حسن بن صباح کو اپنا امام سمجھتی ہے۔ اُس نے حیدر

بصری اور اس کے ساتھی کی خوب خاطر تواضع کی۔

اس دوران حیدر بصری اور اس کا ساتھی نوُر کے باپ کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ انہیں نوُر کے باپ پر ابھی اعتبار نہیں آیا اور اسے شاہ در کی شکست کا مجرم سمجھ رہے ہیں۔ نور کے باپ نے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے کوئی زیادہ باتیں نہ کیں اور یہ کہا کہ حاذق یہاں ہوتا تو وہ ثبوت پیش کرتا کہ وہ ابھی تک حسن بن صباح کا مرید ہے یا نہیں.... یہاں سے حاذق کی بات چلی تو نوُر کے باپ نے کہا کہ وہ اتنا ہی جانتا ہے کہ حاذق کسی جگہ کی بات کر رہا تھا کہ وہاں پیر و مُرشد عبدالملک بن عطاش نے خزانہ رکھا تھا۔

خزانے کی بات شروع ہوئی تو حیدر بصری کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ وہ اسی خزانے کے لئے آیا ہے اور وہ خزانے والی جگہ سے بھی واقف ہے لیکن یہ بھول گیا ہے کہ اس جگہ تک کس طرح پہنچا جا سکتا ہے۔

نوُر کے باپ نے حیدر بصری کی یہ بات سنی تو اس کے دماغ میں روشنی چمکی اور اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔

"اب میں تمہیں یقین دلا سکوں گا کہ میں کس کا وفادار ہوں" — نوُر کے باپ نے حیدر بصری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "میں تمہیں وہاں تک لے جاؤں گا اور سیدھا خزانے تک پہنچا دوں گا۔ ظاہر ہے تم لوگ خزانہ نکال کر واپس شاہ در نہیں آؤ گے بلکہ وہیں سے الموُت چلے جاؤ گے۔ میں نور کو بھی ساتھ لے چلوں گا اور تم لوگ خزانے کے ساتھ ہم دونوں کو بھی الموُت لے چلنا۔ اس طرح میں اور میری بیٹی سلجوقیوں کی قید سے اور اس پابند زندگی سے آزاد ہو جائیں گے"۔

نور کے باپ نے حیدر بصری اور اس کے ساتھی کو بتایا کہ حاذق کے ساتھ اس کا یارانہ بڑا ہی گہرا اور رازدارانہ تھا۔ حاذق نے اسے خزانے والے راز میں بھی شریک کر رکھا تھا۔

حیدر بصری نے جب یہ بات سنی تو وہ بھول ہی گیا کہ نوُر کا باپ مشتبہ اور مشکوک آدمی ہے۔ اس کے ذہن پر تو اس کا شیخ الجبل امام حسن بن صباح سوار تھا۔ اس نے نوُر کے باپ سے کہا کہ وہ اس خزانے کو نکالنے میں اس کی مدد کرے اور وہ اسے اور اس کی بیٹی کو الموُت پہنچا دے گا۔

ظاہر ہے یہ تفصیلات اور یہ منصوبے کوئی اتنی جلدی طے نہیں ہوئے ہوں گے۔ ہُوا یہ کہ نوُر کے باپ نے کہا کہ وہ ایک اپنے قابلِ اعتمو آدمی کو بھی ساتھ لے جائے گا اور تمام انتظامات مکمل کرلے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ انسے باہر نکلنا پڑے گا تاکہ وہ آدمی کو بھی تیار کرلے۔ حیدر بصری اور اس کے ساتھی کو یہ سن کر شک ہُوا کہ یہ شخص انہیں پکڑوا دے گا۔ حیدر بصری نے یہ شک صاف الفاظ میں ظاہر کردیا۔

"پھر اس کا مطلب یہ ہو گا" — نور کے باپ نے کہا — "کہ تم صرف مجھے اور میری بیٹی کو اپنے ساتھ قیدی بنا کر لے جاؤ گے اور خزانہ تمہارے ساتھ نہیں ہو گا۔ اگر خزانہ چاہئے تو مجھے باہر نکلنے دو۔ یہ ہے میری بیٹی۔ اسے یرغمال بنا کر جہاں جی چاہے لے جاؤ۔ میں دلی طور پر یہ چاہتا ہوں کہ ہم سب الموُت اکٹھے جائیں اور خزانہ ہمارے ساتھ ہو۔ اس طرح مجھے یہ فائدہ حاصل ہو گا کہ شیخ الجبل میری نیّت پر شک نہیں کرے گا اور اس کے دل سے یہ الزام نکل جائے گا کہ شاہ در کی شکست کا ذمّہ دار میں ہوں"۔

نوُر کے باپ نے اس مسئلے میں بھی حیدر بصری کو اپنا ہم خیال بنالیا اور اسے کہا کہ وہ ایک بڑی گھوڑا گاڑی اور تین زندہ بھیڑوں کا انتظام کرلے۔ حیدر بصری نے پوچھا کہ بھیڑوں کو کیا کرنا ہے تو نور کے باپ نے کہا کہ یہ وہاں چل کر بتاؤں گا۔ وہ جب حاذق کے ساتھ خزانے والی جھیل تک جا رہا تھا تو حاذق پانچ بھیڑیں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ نوُر کے باپ نے اس سے پوچھا تھا کہ بھیڑوں کا کیا استعمال ہو گا تو حاذق نے یہی جواب دیا تھا کہ وہاں چل کر بتاؤں گا۔

مختصراً" یہ واقعہ یوں ہُوا کہ حیدر بصری اور اس کا ساتھی گھوڑا گاڑی کا انتظام کرنے چلے گئے اور نور کا باپ یہ بتا کر کہ وہ اپنے آدمی کے پاس جا رہا ہے، سلطان سنجر کے وزیر کے پاس چلا گیا اور اسے بتایا کہ دو فدائی اس کے جال میں آگئے ہیں لیکن وہ انہیں پکڑوانا نہیں چاہتا بلکہ بہت بُرے انجام تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اس نے وزیر کو یہ بھی بتایا کہ انہیں حسن بن صباح نے اسی خزانے کے لئے بھیجا ہے جو سلطنت کے سرکاری خزانے میں جمع ہو چکا ہے۔

وزیر نے اسے اجازت دے دی اور کہا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی بیٹی کو بھی پوری طرح محفوظ رکھے اور کوئی خطرہ مول نہ لے اور اسے جو کچھ بھی چاہئے وہ یہاں سے لے لے۔

○

رات کا پہلا پہر گزر گیا تھا۔ شاہ در شہر پر نیند کا غلبہ طاری ہو چکا تھا۔ شہر کے مضافات کی ایک چھوٹی سی بستی میں ایک گھوڑا گاڑی نکلی جس کا رُخ اس جھیل کی طرف تھا جس کے وسط میں عبدالملک بن عطاش کا خزانہ تھا اور جو اب وہاں نہیں تھا۔ گاڑی کے آگے دو گھوڑے جُتے ہوئے تھے اور ان کی باگیں نوُر کے باپ کے ہاتھ میں تھیں۔ گاڑی میں نور بھی تھی، حیدر بصری اور اس کے دو ساتھی تھے اور ایک آدمی وہ تھا جسے نور کا باپ اپنے ساتھ لایا تھا۔ گاڑی میں تین بھیڑیں بھی تھیں۔ نور کا باپ راستے سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس راستے پر وہ جا بھی چکا تھا اور واپس بھی آچکا تھا۔

شہر سے کچھ دور جا کر نوُر کے باپ نے گھوڑوں کی رفتار تیز کردی۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ صبح طلوع ہونے تک وہ آبادیوں سے دُور جنگل بیابان میں جا پہنچے۔ اس نے سب کو بتادیا تھا کہ پوری رات گاڑی چلتی رہے گی اور صبح کے وقت کہیں رکیں گے۔

صبح طلوع ہوئی تو وہ ایک ایسے جنگل بیابان میں پہنچ چکے تھے جس کے پیڑ پودوں کے لئے انسان ایسا جانور تھا جو انہوں نے پہلے کبھی دیکھا نہ ہو۔ دُور دُور تک کسی آبادی کا نام و نشان نہ تھا اور پتہ چلتا تھا کہ ادھر سے کبھی کسی انسان کا گزر نہیں ہُوا۔ نوُر کا باپ اس بیابان میں سے پہلے حاذق کے ساتھ گزرا تھا۔ انہوں نے کچھ دیر گھوڑوں کو آرام دیا اور خود بھی کچھ کھایا پیا اور پھر چل پڑے۔

نور اور اس کا باپ حاذق کے ساتھ اس طرف آئے تھے تو حاذق بڑی جلدی میں تھا۔ اس نے گھوڑوں کو اتنا زیادہ دوڑایا تھا کہ گھوڑے پسینے سے نہا گئے اور ہانپ کانپ رہے تھے۔ اب گھوڑوں کی باگیں نوُر کے باپ کے ہاتھ میں تھیں اور اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کیا کرنا ہے اور اس نے اپنے ساتھی کو بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا اور نور کو بھی۔ اب وہ بڑے آرام سے گھوڑوں کو چلا رہا تھا اور ایک اور رات آگئی۔

وہ گھوڑوں کو کھلانے پلانے کے لئے اور خود آرام کرنے کے لئے رک گئے۔ وہ گزشتہ رات جاگتے رہے تھے اس لئے جوں ہی لیٹے سب سو گئے۔ نور کا باپ اور اس کا ساتھی حیدر بصری اور اس کے ساتھیوں کو سوتے میں بڑے آرام سے قتل کر سکتے تھے لیکن نوُر کا باپ اس قدر جلا بھُنا ہُوا تھا کہ وہ انہیں بڑے ہی خوفناک انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ نوُر کا باپ قافلے کے ساتھ جا رہا تھا کہ ان باطنی لٹیروں نے اُس قافلے کو لوُٹ لیا اور

اس کی بیٹی کو اٹھا کر لے آئے تھے اور اس کے باقی بچوں کو انہوں نے قتل کر دیا تھا اور اس کی بیوی کو بھی قتل کر دیا تھا۔ اس کے سینے میں ان باطنیوں کے خلاف انتقام کے شعلے بھڑکتے رہتے تھے۔

رات گزر گئی اور یہ قافلہ گھوڑا گاڑی میں سوار ہو کر چل پڑا۔ نور کا باپ حاذق کے ساتھ آیا تھا تو رات کو جھیل پر پہنچے تھے لیکن اب نورؔ کا باپ دن کے وقت وہاں پہنچ رہا تھا۔ فاصلہ بہت ہی تھوڑا رہ گیا تھا۔ نور کے باپ نے دانستہ رات وہاں گذاری تھی۔

کچھ دیر بعد وہ جھیل پر پہنچ گئے۔ نورؔ کے باپ نے دو چیزیں دور سے ہی دیکھ لیں۔ ایک تو چار پانچ مگرمچھ تھے جو جھیل سے نکل کر خشکی پر سوئے ہوئے تھے۔ دوسری چیز وہ کشتی تھی جس میں وہ خزانہ نکال کر لایا تھا۔ وہ کشتی اسی جگہ جھیل کے کنارے موجود تھی جہاں اس نے اور نورؔ نے اسے گھسیٹ کر آدھا خشکی پر کر دیا تھا۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی کشتیاں بھی پڑی تھیں لیکن اصل کشتی ان سے کچھ دور تھی۔ نورؔ کے باپ نے گھوڑا گاڑی وہاں جا کر روکی اور سب کو اُترنے کے لئے کہا۔

سب اُترے اور بھیڑوں کو بھی اتار لیا گیا پھر بھیڑوں کو کشتی میں پھینک کر سب سوار ہو گئے اور چپو نور کے باپ نے اور اس کے ساتھی نے سنبھال لئے۔ کشتی جوں ہی جھیل میں ذرا آگے گئی تو تین چار مگرمچھ بڑی تیزی سے کشتی کی طرف آئے۔ نور کے باپ نے کہا کہ ایک بھیڑ جھیل میں پھینک دو۔

ایک بھیڑ حیدر بصری نے اٹھائی اور جھیل میں پھینک دی۔ سارے مگرمچھ اس بھیڑ پر ٹوٹ پڑے۔ کچھ اور آگے گئے تو دو اور مگرمچھ آ گئے۔ نورؔ کے باپ نے حیدر بصری سے کہا کہ ایک اور بھیڑ جھیل میں پھینک دے جو اس نے پھینک دی۔ نورؔ کا باپ اور اس کا ساتھی بڑی تیزی سے چپو مار رہے تھے۔ جھیل کا پانی پُرسکون تھا اس لئے کشتی کی رفتار خاصی تیز تھی۔

چھوٹے مگرمچھ بھی جھیل میں نظر آ رہے تھے لیکن وہ سب اُدھر کو ہی چلے گئے جدھر مگرمچھوں نے دو بھیڑوں کو پکڑ لیا اور اسے اپنی اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

آخر کشتی اس خشکی پر جا لگی جس پر چٹانیں تھیں اور اس ذرا سے اس چٹانی علاقے کے وسط میں خزانے والے غار تھے۔ نور کے باپ نے حیدر بصری اور اس کے ساتھیوں سے کہا کہ وہ اُتر جائیں اور وہ کشتی باندھ کر آتا ہے۔ نور کے باپ کا ساتھی اور نورؔ بھی

اس طرح اُٹھ کھڑے ہوئے جیسے کشتی میں سے اتریں گے۔ حیدر بصری اور اس کے دونوں ساتھی کود کر خشکی پر چلے گئے۔ نورؔ کے باپ نے انہیں کہا کہ وہ آگے چلیں۔

جونہی ان تینوں نے پیٹھ پھیری، نور کے باپ نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور دونوں نے چپو مارنے شروع کر دیئے اور کشتی خشکی سے ہٹ آئی اور تیز ہی تیز ہوتی چلی گئی۔ حیدر بصری اور اس کے ساتھیوں نے گھوم کر دیکھا تو وہ حیران رہ گئے کہ یہ لوگ کشتی کہاں لے جا رہے ہیں۔ آخر حیدر بصری نے بلند آواز سے پوچھا کہ تم لوگ کہاں جا رہے ہو۔

"ان چٹانوں کے اندر چلے جاؤ" ـــ نور کے باپ نے کہا ـــ "تمہیں خزانہ مل جائے گا۔ ہمیں خزانے کی ضرورت نہیں"۔

نورؔ کے باپ اور اس کے ساتھی نے بڑے بلند قہقہے لگائے۔ تب حیدر بصری سمجھا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ تینوں نے جھیل میں چھلانگیں لگا دیں اور کشتی کی طرف تیرنے لگے۔ انہیں غالباً یہ توقع تھی کہ وہ تیر کر اس ساحل پر پہنچ جائیں گے جہاں سے وہ کشتی میں سوار ہوئے تھے لیکن مگرمچھوں نے انہیں دیکھ لیا اور بڑی تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔ نورؔ کے باپ نے کشتی کی رفتار اور تیز کر دی اور کنارے جا لگے۔ انہوں نے ایک بھیڑ بچا لی تھی جسے اٹھا کر وہ کشتی سے نکل آئے اور ان تین باطنیوں کے انجام کا تماشا دیکھنے لگے۔

ان تینوں کی آخری چیخیں آسمان کا سینہ چاک کر رہی تھیں لیکن یہ چیخیں الموت تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ کچھ دیر تک ان کی چیخیں اور آہ و بکا سنائی دیتی رہی اور وہ تینوں دکھائی دیتے رہے اور پھر مگرمچھ انہیں پانی کے نیچے لے گئے۔

نورؔ کے باپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے بازو پھیلائے اور لمبی آہ بھری اور پھر نورؔ اور اپنے ساتھی کو سر کا اشارہ کیا کہ آؤ چلیں۔

یکے بعد دیگرے ایسے واقعات ہو گئے تھے اور ہوتے چلے جا رہے تھے جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ سلسلہ جاری رہا تو حسن بن صباح زوال پذیر ہو جائے گا۔

کچھ عرصہ پہلے تک یوں نظر آتا تھا جیسے فتح اور ہر ابلیسی کام میں کامیابی حسن بن صباح کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔ اس کے جانباز فدائی سلطنتِ سلجوقیہ کی جڑوں میں اتر گئے تھے۔ اُس نے مسلمانوں میں خانہ جنگی تک کرا دی تھی۔ اپنوں نے اپنوں کا اس قدر خون بہا دیا تھا کہ تاریخ کے اوراق آج بھی اس خون سے لال ہیں۔ حسن بن صباح نے جس سیاسی، معاشرتی اور مذہبی شخصیت کو اور جس حاکم کو قتل کرنا چاہا وہ اپنے فدائیوں سے کرا دیا.... حکمرانی تو سلجوقیوں کی تھی لیکن لوگوں کے دلوں پر حسن بن صباح راج کرتا تھا۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو اس کے مُرید ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو اسے نبی مانتے تھے اور زیادہ تر لوگ آسمان سے اترا ہوا امام سمجھتے تھے۔ دوسرے وہ لوگ تھے جن پر حسن بن صباح اور اس کے فدائی دہشت بن کر آسیب کی طرح سوار ہو گئے تھے۔

لوگ یقین سے کہتے تھے کہ حسن بن صباح کے پاس کوئی جادو ہے ورنہ ایسا کبھی نہ ہوتا کہ ایک آدمی ایک طاقتور سلطنت کے لئے اتنا خطرناک اور دہشتناک مسئلہ بن جاتا۔ مؤرخوں نے بھی یہی لکھا ہے۔ تاریخ ایسی شہادت پیش کرتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کے ہاتھ میں جادو ضرور تھا لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ دن کو رات یا رات کو دن بنا دیتا۔

○

سلطنتِ سلجوقیہ کی فوج میں اور لوگوں میں بھی بددلی سی پائی جاتی تھی جیسے وہ حسن بن صباح کو شکست نہیں دے سکیں گے۔ اس فوج نے باطنیوں کے قبضے میں آئے ہوئے جس قلعے کا بھی محاصرہ کیا وہاں سے فوج ناقابلِ برداشت جانی نقصان اٹھا کر پسپا ہو آئی تھی۔

پھر لوگوں کے کانوں میں یہی ایک خبر پڑتی تھی کہ آج حسن بن صباح نے وزیرِ اعظم کو یا کسی حاکم کو یا کسی عالمِ دین کو قتل کروا دیا ہے۔ لوگ فدائیوں کو جن بھوت سمجھنے لگے تھے لیکن سالار اوریزی نے وسم کوہ کا قلعہ فتح کر لیا، پھر شاہ در پر بھی قبضہ ہو گیا اور پھر حسن بن صباح کے پیر استاد عبدالملک بن عطاش کو بھی قتل کر دیا گیا اور اس کے علاوہ لوگوں کو یہ خبریں ملنے لگیں کہ باطنی فدائی پکڑے جانے لگے ہیں اور وہ اپنے ساتھیوں کو بھی پکڑوا رہے ہیں اور یہ بھی کہ وہ حسن بن صباح کے غدار اور مسلمانوں کے وفادار ہو گئے ہیں تو لوگوں کی نگاہوں میں حسن بن صباح ایک انسان کے روپ میں سامنے آنے لگا۔

سلطان محمد کا وزیرِ اعظم ابو نصر احمد مَروْ میں اَلمُوت پر حملے کے لئے بہت بڑی فوج تیار کر رہا تھا اور زیادہ تر وقت اس کی ٹریننگ پر صرف کرتا تھا۔ وہ وزیرِ اعظم تھا لیکن ہمہ وقت سپہ سالار بن گیا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ فوج میں حسن بن صباح کو پُراسرار اور ایسی شخصیت سمجھا جا رہا ہے جس کے ہاتھ میں کوئی غیبی طاقت ہے۔ فوج کا جذبہ اور لڑنے کا حوصلہ مضبوط کرنے کے لئے ابو نصر احمد ساری فوج کو اکٹھا کر کے سناتا رہتا تھا کہ باطنیوں پر کس طرح کامیابیاں حاصل کی جا رہی ہیں۔

وہ فوج کو قرآن کی وہ آیات سناتا رہتا تھا جن کا تعلق جہاد کے ساتھ ہے۔ یہ آیت تو وہ اکثر سنایا کرتا تھا ——"وہ لوگ جو ایمان والے ہیں، اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کافر طاغوت کے لئے لڑتے ہیں۔ شیطان کے ساتھیوں کے خلاف جہاد کرو۔ یقیناً" شیطان کی چالیں کمزور ہیں"۔

پہلے سنایا جا چکا ہے کہ وہ سالاروں اور ان سے کم درجہ کمانداروں کو پوری طرح آرام بھی نہیں کرنے دیتا تھا۔ انہیں اکٹھا کر کے اَلمُوت کے محاصرے اور تسخیر کے طریقے بتاتا اور ان کے مشورے اور تجاویز غور سے سنتا تھا۔ اس کے جوش و خروش اور سرگرمیوں میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے ابنِ مسعود نے اَلمُوت کے اندر کی

معلومات دے دی تھیں۔ وہ اب اپنے سالاروں کو الموت کے اندر کے نقشے بنا بنا کر دکھاتا اور انہیں یقین دلاتا تھا کہ الموت کو فتح کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔

عُبید عربی اور ابنِ مسعود جیسے پتھر دل فدائی جو کسی دوسرے کی اور اپنی جان لے لینے کو ایک پُرلطف کام سمجھتے تھے، اپنے امام حسن بن صباح کی جان کے دشمن ہو گئے تھے۔ ان کے ایمان پر ابلیسیت کے جو پردے پڑ گئے تھے، وہ انہوں نے اتار پھینکے تھے۔

یہ تمام واقعات لوگوں کو سنائے جاتے رہے تو ان میں جو بددلی پیدا ہو گئی تھی وہ نکل گئی۔ لوگ تسلیم کرنے لگے کہ اللہ ان کی مدد کر رہا ہے۔ لوگوں کو مسجدوں میں خطبوں میں بتایا گیا کہ اللہ اُن کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ یہ آیت فوج میں شامل ہونے والے لوگوں کو ذہن نشین کرا دی گئی تھی کہ لڑو اُس وقت تک جب تک کفر کا فتنہ موجود ہے اور جب تک رُوئے زمین پر اللہ کی حکمرانی قائم نہیں ہو جاتی۔

ان حالات سے یہی پتہ چلتا تھا کہ حسن بن صباح کا زوال شروع ہو گیا ہے۔

○

داستان گو سنا چکا ہے کہ ابنِ مسعود الموت چلا گیا تھا اور اُس نے غداری کا سارا الزام حیدر بصری کے سر تھوپ دیا اور خود مظلوم اور مسلمانوں کی قید سے فرار کا ہیرو بن گیا تھا۔ اس وقت اسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ حیدر بصری کو امام شیخ الجبل نے شاہ در خزانہ نکالنے کے لئے بھیج دیا ہے۔ ابنِ مسعود کو جب پتہ چلا تو اُس نے کہا کہ اسے خزانہ مل گیا تو وہ واپس ہی نہیں آئے گا۔

اس نے یہ الفاظ منہ سے نکال تو دیئے تھے لیکن وہ شیخ الجبل کے آگے جھوٹ بولنے کی سزا سے بے خبر نہیں تھا.... سزائے موت.... اگر حیدر بصری خزانہ لے کر یا خزانے کے بغیر ہی آ جاتا تو ابنِ مسعود کو گھٹنوں تک زمین میں گاڑ کر اُس پر خونخوار کتے چھوڑ دیئے جاتے لیکن یہ بھی اللہ کی مدد تھی کہ حیدر بصری اور اس کے ساتھیوں کو خزانے والی جھیل کے مگرمچھ ہضم کر چکے تھے اور حیدر بصری نے اب کبھی واپس نہیں آنا تھا۔

نُور کے باپ نے بڑا ہی خوفناک انتقام لیا تھا۔ یہ پچھلے باب میں سنایا جا چکا ہے۔ نُور کے باپ نے اپنی انتقامی کارروائی کو یہیں پر ختم نہیں کر دیا تھا۔ حیدر بصری اور اس کے ساتھیوں کو مگرمچھوں کے حوالے کر کے وہ اپنے ساتھی اور نُور کے ساتھ گھوڑا گاڑی میں سوار ہُوا اور واپس چل پڑا۔ اب اُس نے کچھ سوچ کر گھوڑوں کو دوڑایا نہیں، رفتار

آہستہ رکھی۔ اُس نے اپنے ساتھی سے کہا کہ وہ دو یا تین راتیں راستے میں ہی گذارے گا۔

چوتھے روز وہ شام کے بعد اُس وقت شاہ در میں داخل ہُوا جب رات تاریک ہو گئی تھی۔ وہ دانستہ ایسے ہی وقت شہر میں داخل ہونا چاہتا تھا جب اُسے وہ باطنی نہ دیکھ سکیں جنہیں معلوم تھا کہ وہ حیدر بصری کے ساتھ خزانے والی جھیل کو گیا تھا۔ ان باطنیوں کے صرف ایک گھر سے وہ واقف تھا۔ وہ لوگ اسے نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ وہ شہر کے ساتھ ہی ایک گاؤں میں رہتے تھے۔

وہ سیدھا سلطان سنجر کے وزیر کے گھر کے سامنے جا رکا اور وزیر کو پتہ چلا تو اُس نے اسے اندر بلا لیا.... نُور کے باپ نے وزیر کو بتایا کہ وہ کیا کر آیا ہے اور اب وہ کیا کرے گا۔ وزیر اُس کی بات سن کر خوش تو بہت ہُوا لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے، محتاط ہو کر کرے اور اپنی اور اپنی بیٹی کی حفاظت سے بھی کوتاہی نہ کرے۔

اُس نے گھوڑا گاڑی وہیں چھوڑی اور وزیر سے درخواست کی کہ اس گاڑی کو چھپا کر رکھ دیا جائے اور یہ کسی کے سامنے نہ آئے.... وزیر نے گھوڑا گاڑی اور گھوڑے کو چھپا کر رکھنے کا حکم دے دیا۔ نُور کا باپ نُور اور اپنے ساتھی کو ساتھ لے کر وہاں سے اپنے گھر گیا اور انہیں یہ کہا کہ دو دن وہ باہر نہ نکلیں اور کسی کو پتہ نہ چلے کہ وہ واپس آ گئے ہیں۔

○

دو روز بعد نُور کا باپ شہر سے نکلا اور گاؤں میں اُس باطنی کے گھر گیا جہاں باطنی اکٹھے ہُوا کرتے تھے۔ وہاں تین چار باطنی موجود تھے جن میں ایک فدائی تھا۔

"آ گئے تم لوگ؟" ___ ایک دو نے بیک زبان کہا ___ "گھوڑا گاڑی کی آواز نہیں آئی.... حیدر اور دوسرے کہاں ہیں؟"

نُور کا باپ کوئی جواب دیئے بغیر یوں چارپائی پر بیٹھا جیسے نڈھال ہو کر گر پڑا ہو۔ اُس نے سر جھکا کر دونوں ہاتھ سر پر رکھ لئے جو کوئی اچھی نشانی نہیں تھی۔ باطنیوں نے گھبرائی ہوئی سی آواز میں پوچھا ہُوا کیا ہے؟

"کیا بتاؤں دوستو!" ___ نُور کے باپ نے بڑی ہی کمزور اور شکست خوردہ آواز میں کہا ___ "شیخ الجبل کے طفیل میری اور میری بیٹی اور میرے ساتھی کی جان بچ گئی ہے اور

میری جوان بیٹی کی عزت بھی بچ گئی ہے.... حیدر بصری اور اس کے ساتھی خزانہ لے کر کہیں اور نکل گئے ہیں۔ وہ آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اتنا ہی سنا کہ وہ اسی گھوڑا گاڑی پر مصر چلے جائیں گے۔ بہر حال وہ اَلمُوت نہیں گئے۔ غداری کر گئے ہیں"۔

باطنی اُس سے پوچھنے لگے کہ یہ سب ہُوا کیسے؟.... نوُر کے باپ نے کہا کہ وہ خیریت سے خزانے کے غار تک پہنچ گئے تھے اور بکس اٹھا کر لائے، کشتی میں بھی رکھ لئے مگر مچھوں نے حملہ کیا تو ان کے آگے بھیڑیں پھینک کر کنارے سے آ لگے اور پھر بکس گاڑی میں ڈال لئے۔

نوُر کے باپ نے رنج و الم سے دبی ہوئی آواز میں بتایا کہ وہاں سے چلنے لگے تو وہ آگے بیٹھا اور گھوڑوں کی باگیں ہاتھوں میں لے لیں لیکن حیدر نے اس کے ہاتھوں سے باگیں لے کر اسے پیچھے بٹھا دیا اور گاڑی چلا دی۔ کچھ دیر کے سفر کے بعد ایسی جگہ پہنچے جہاں سے دو راستے نکلتے ہیں۔ ایک شاہ در کی طرف آتا ہے اور دوسری پگڈنڈی کسی اور طرف چلی جاتی ہے۔

اُس نے الم ناک آواز میں آہستہ آہستہ سنایا کہ حیدر نے گھوڑا گاڑی دوسری پگڈنڈی کی طرف موڑ دی اور نور کے باپ نے اسے بتایا کہ شاہ در کو وہ دوسرا راستہ جاتا ہے۔ حیدر نے نہ جانے کس زبان میں کچھ کہا تو حیدر کے ساتھیوں نے نوُر کے باپ کو اور اس کے ساتھی اور نوُر کو بھی اٹھا کر دوڑتی گھوڑا گاڑی سے باہر پھینک دیا اور گھوڑے دوڑا دیئے۔ جتنی دیر میں وہ اٹھتے اور سنبھلتے تھے، گھوڑا گاڑی دور آگے جا کر ایک موڑ مڑ چکی تھی اور چٹانوں کے پیچھے چھپ گئی تھی۔

پھر نوُر کے باپ نے سنایا کہ وہ بیابان، سنسان اور خطرناک جنگل تھا اور نور کا باپ صرف اپنی جوان اور خوبصورت بیٹی کے متعلق پریشان تھا۔ ان کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا جو کوئی راہزن یا ڈاکو لوٹ لیتا، سب سے زیادہ قیمتی چیز نوُر تھی۔ اسے چھپائے رکھنا بہت ہی مشکل نظر آ رہا تھا۔ وہ شاہ در کی طرف آنے والی پگڈنڈی پر ہو گئے اور شیخ الجبل کو یاد کرتے چل پڑے۔

"ہمیں زندہ واپس آنے کی کوئی امید نہیں تھی" —— نور کے باپ نے سنایا —— "جنگل میں ذرا سی بھی آہٹ ہوتی تھی تو میں ڈر جاتا کہ یہ راہزن ہی ہوں گے۔ ہم خاصی

دُور نکل آئے تو پیچھے سے سات اونٹ آتے نظر آئے۔ اب تو ہم اور زیادہ ڈرے۔ ہماری تلواریں گھوڑا گاڑی میں چلی گئی تھیں۔ بھاگنا بھی بے کار تھا۔ شتر سواروں نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور وہ اونٹوں پر سوار ہو کر اونٹ ہمارے پیچھے دوڑا دیتے اور ہمیں پکڑ سکتے تھے....

"ہم نے اپنے آپ کو قسمت اور تقدیر کے حوالے کر دیا۔ اونٹ قریب آ گئے تو میں نے دیکھا کہ سات میں سے چار اونٹوں پر سامان لدا ہُوا تھا اور تین خالی تھے۔ ان کے ساتھ پانچ آدمی تھے۔ وہ ہمارے قریب آئے تو ان کا انداز ایسا تھا جس سے یہ شک نہیں ہوتا تھا کہ یہ راہزن یا ڈاکو ہیں۔ انہوں نے ہمیں مسکرا کر دیکھا اور ایک نے پوچھا کہ تم لوگ کون ہو اور کہاں جا رہے ہو.... میں نے انہیں یہ جھوٹا بیان دیا کہ ہم اونٹوں پر آ رہے تھے اور شاہ در جا رہے ہیں، راستے میں دو راہزنوں نے سامان بھی لُوٹ لیا ہے اور اونٹ بھی لے گئے ہیں....

"میری یہ بات سن کر ایک نے کہا کہ وہ اگر ڈاکو تھے تو اتنی خوبصورت لڑکی کو کیوں چھوڑ گئے ہیں؟ میں نے دوسرا جھوٹ بولا کہ اُس وقت یہ لڑکی جنگل کے اندر ایک اوٹ میں چلی گئی تھی۔ اس نے وہاں سے دیکھ لیا تھا اور چھپی رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ میری بیٹی ہے پھر میں نے اُن شتربانوں کی منت سماجت کی کہ ہمیں اونٹوں پر شاہ در پہنچا دیں اور وہ جتنی اُجرت مانگیں گے، وہاں انہیں دے دی جائے گی۔ وہ کوئی بھلے لوگ تھے جو ہمیں اونٹوں پر سوار کر کے یہاں لے آئے اور میں نے انہیں کچھ اُجرت دے دی لیکن راستے میں انہوں نے تین دن لگا دیئے۔ ہم تینوں تو گھر میں نڈھال ہو کر پڑے رہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ ہمارے ساتھ جو ہُوا وہ کن الفاظ میں سنائیں گے کہ وہ سننے والے مان لیں"۔

"وہ تو ہم نے مان لیا ہے" —— ایک باطنی نے کہا —— "یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ تم جیسے بوڑھے نے حیدر بصری اور اس کے ساتھیوں کو اپنے صرف ایک ساتھی کے ساتھ قتل کر دیا ہو اور خزانہ ہضم کر لیا ہو، اب یہ سوچو کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے"۔

"تم سب ان کے تعاقب میں نکل جاؤ تو بھی ان تک نہیں پہنچ سکتے" —— نوُر کے باپ نے کہا —— "یہ تو دیکھو کہ دن کتنے گزر گئے ہیں۔ اب یہی ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی اَلمُوت چلا جائے اور شیخ الجبل کو بتا دے کہ خزانہ حیدر بصری لے اُڑا ہے۔ وہ المُوت گیا

ہوتا تو ہمیں اس کے ساتھی راستے میں پھینک کیوں جاتے!؟"

اُن میں سے ایک آدمی اُسی وقت اَلمُوت جانے کے لئے تیار ہوا اور گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ نُور کا باپ اٹھا اور دکھ زدہ آدمی کی طرح سر جھکائے ہوئے اس گھر سے نکل آیا۔

○

اَلمُوت میں ابنِ مسعود باقاعدہ قید میں تو نہیں تھا لیکن اس کی باقاعدہ نگرانی ہو رہی تھی۔ حسن بن صباح نے کہا تھا کہ یہ خیال رکھا جائے کہ یہ شخص کہیں یہاں سے نکل نہ جائے۔

ابنِ مسعود ایک کشمکش میں جکڑا رہتا تھا۔ جوں جوں دن گزر رہے تھے، اُس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اسے ہر لحہ یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ حیدر بصری خزانہ لے کر آ جائے گا اور اس کا پول کھل جائے گا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ حیدر بصری کو جھٹلانے کی پوری کوشش کرے گا لیکن آنے کی صورت میں خطرہ یہ تھا کہ حسن بن صباح نے اُسی کو سچا اور دیانتدار سمجھنا تھا۔ اس صورت میں حسن بن صباح کے منہ سے یہی الفاظ نکلنے تھے کہ اس شخص ابنِ مسعود کو لے جاؤ اور عبرت ناک موت مار ڈالو۔

آخر ایک روز بلاوا آ گیا۔ ابنِ مسعود اندر سے کانپتا ہوا امام کے کمرے تک پہنچا۔ اس نے نیفے میں خنجر اڑس لیا تھا اور یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ امام جب اسے سزائے موت سنائے گا تو وہ خنجر نکال کر امام کے دل میں اتار دے گا۔

"آؤ ابنِ مسعود!" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "مجھے یہ تو خوشی ہے کہ تم سچے نکلے اور اب میں تمہیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں کہ تم سلجوقیوں کی قید سے فرار ہو آئے ہو لیکن اس اطلاع نے مجھے بہت دکھ دیا ہے کہ حیدر بصری اپنے ساتھیوں کے ساتھ سارا خزانہ لے اُڑا ہے۔ معلوم ہُوا ہے کہ وہ مصر جا رہا ہے۔ دن اتنے گزر گئے ہیں کہ اب اس کا تعاقب محض بے کار ہے"۔

"یا شیخ الجبل!" ــــ ابنِ مسعود نے کہا ــــ "کیا مصر میں ہمارا کوئی آدمی نہیں؟"

"وہ انتظام تو میں کر ہی دوں گا" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "لیکن یہ تو بہتے دریا کی تہہ میں سے سُوئی ڈھونڈنے والی بات ہو گی۔ مصر بہت بڑا ملک ہے جس کے کئی شہر اور قصبے ہیں، معلوم نہیں یہ بدبخت کہاں جا آباد ہو گا"۔

"یا شیخ الجبل!" ــــ ابنِ مسعود نے بڑی جاندار اور پُراعتماد آواز میں کہا ــــ "اب میں وہ باتیں بھی کر سکتا ہوں جو پہلے آپ تک نہیں پہنچائی تھیں۔ حیدر نے سلجوقیوں کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ دریا کی طرف اَلمُوت کا ایک چور دروازہ ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس دروازے تک کس طرح پہنچا جا سکتا ہے۔ اَلمُوت کا محاصرہ ضرور ہی ہو گا اور سلجوقیوں کی کوشش یہ ہو گی کہ وہ دریا والے دروازے سے اندر آئیں گے"۔

"اندر سے دروازہ کون کھولے گا؟" ــــ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ان کے ایک دو آدمی آپ کے پیروکاروں کے بہروپ میں قلعے میں پہلے ہی آ جائیں گے" ــــ ابنِ مسعود نے کہا ــــ "انہیں اس دروازے تک اندر سے پہنچنے کا راستہ معلوم ہو گا۔ حیدر بصری نے انہیں بڑی اچھی طرح سمجھا دیا تھا"۔

"وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "میں اس کا بندوبست کر لوں گا"۔

"ایک عرض ہے یا شیخ الجبل!" ــــ ابنِ مسعود نے کہا ــــ "آپ کا بندوبست یقیناً بے مثال ہو گا لیکن وہ دروازہ میری ذمہ داری میں دے دیں پھر اس تک کسی کے پہنچنے کا امکان بالکل ہی ختم ہو جائے گا۔ میں دسم کوہ میں بہت عرصے بعد پکڑا گیا اور قید ہُوا تھا۔ اس سے پہلے میں وہاں اتنا زیادہ عرصہ رہا ہوں کہ فوج کے بے شمار چیدہ چیدہ آدمیوں کو پہچانتا ہوں۔ وہ کسی بھی بہروپ میں آئے، میں انہیں پہچان لوں گا۔ اس سے پہلے مجھے مَرو جانے دیں"۔

"وہاں جا کر کیا کرو گے؟" ــــ حسن بن صباح نے پوچھا ــــ "کیا پکڑے نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں یا شیخ الجبل!" ــــ ابنِ مسعود نے جواب دیا ــــ "دسم کوہ میں مجھے بہت سے لوگ پہچانتے ہیں، مَرو میں نہیں۔ میں مَرو سے واقف ہوں اور کچھ عرصہ وہاں رہا ہوں لیکن لوگوں میں زیادہ اٹھا بیٹھا نہیں.... سلطان محمد کا وزیرِ اعظم ابو نصر احمد اَلمُوت پر حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ اُسے قتل کیا جا سکتا ہے لیکن میں کہتا ہوں اسے قتل نہیں کریں گے۔ اسے قتل کر دیا تو اس کی جگہ کوئی اور وزیرِ اعظم بن جائے گا اور وہ حملے کی تیاری جاری رکھے گا بلکہ سلطان کو خوش کرنے کے لئے فوراً حملہ کر دے گا۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ ابو نصر احمد کو زندہ رہنے دیا جائے اور اسے اپنے اثر میں لے لیا جائے۔ مجھے یہ بھی

معلوم ہے کہ سلطان محمد پر اس وزیرِ اعظم کا اثر غالب ہے۔ ہم اس وزیرِ اعظم کو اپنے جال میں لا کر سلطان محمد کو اپنے رنگ میں رنگ سکتے ہیں"۔

"یہ کام کون کرے گا؟"

"میں کروں گا یا شیخ الجبل!" — ابنِ مسعود نے جواب دیا — "آپ مجھے مَرو جانے دیں اور میں زرّیں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا"۔

"زرّیں کون ہے؟"

"وہ میری سگی بہن ہے" — ابنِ مسعود نے جواب دیا — "آپ کو یاد نہیں رہا' میرا باپ ہم دونوں کو آپ کی خدمت میں پیش کر گیا تھا۔ زرّیں جنّت میں ہے اور میں اس کے ذریعے ابو نصر احمد کو اپنے ہاتھ میں لے لوں گا۔ بڑی ہی خوبصورت اور تیز طرار لڑکی ہے۔ وہاں میں اپنے آپ کو چھپا کر رکھوں گا۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ابو نصر احمد جذباتی اور حُسن پرست ہے۔ اسے ہم شیشے میں اتار لیں گے"۔

حسن بن صباح گہری سوچ میں کھو گیا۔

"آپ کو یاد ہو گا یا شیخ الجبل!" — ابنِ مسعود نے کہا — "ہم نے ان کے ایک وزیرِ اعظم سعید الملک کو اپنے اثر میں لے ہی لیا تھا۔ وہ بہت عرصہ ہمارے زیرِ اثر رہا تھا پھر نہ جانے کس غدار نے یہ راز فاش کر دیا اور سلطان نے اس وزیرِ اعظم کو جلاّد کے حوالے کر دیا تھا۔ ابو نصر احمد کو بھی اپنے ساتھ ملانا کوئی مشکل کام نہیں۔ آپ مجھے مَرو جانے دیں اور یہ اجازت بھی دیں کہ میں زرّیں کو اپنے ساتھ لے جاؤں.... ہاں' یہ بھی یاد آیا یا شیخ الجبل! آپ نے سلطان برکیارق کو بھی تو اپنی مُٹھی میں لے لیا تھا.... اگر آپ میرا مشورہ قبول کریں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ ابُو نصر احمد کو بھی اسی طرح آپ کی مٹھی میں دے دیں گے"۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حسن بن صباح بوڑھا ہو گیا تھا۔ اُس میں پہلے والی بات نہیں رہی تھی۔ وہ مشورے کم ہی سنا کرتا تھا۔ اُس پر پے در پے چوٹیں ہی ایسی پڑی تھیں کہ اس کا دماغ کچھ کمزور ہو گیا تھا۔ سب سے بڑی چوٹ تو یہ تھی کہ اس کا پیرو مُرشد عبدالملک بن عطاش مرا نہیں بلکہ مار دیا گیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اس نے جو جادو حسن بن صباح کو سکھایا تھا وہ اس کے ساتھ ہی قبر میں چلا گیا تھا۔

یہ چوٹ بھی کچھ کم نہ تھی کہ اس کے اپنے فدائی جن پر اسے مکمل بھروسہ تھا' اتنا

زیادہ خزانہ لے کر غائب ہو گئے تھے۔ یہ تو اسے ابھی معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا ایک اور قابلِ اعتماد فدائی جس کا نام ابنِ مسعود تھا اور جو اس کے سامنے بیٹھا اسے مشورے دے رہا تھا' اسے بہت بڑا فریب دے رہا تھا۔ اس فدائی کو یہ فریب کاری حسن بن صباح نے خود ہی سکھائی تھی اور وہ اس کا اور اس کے استادوں کا ہی شاگرد تھا۔ یہ طلسم سامری تھا جو ابنِ مسعود سامری کے ہی خلاف استعمال کر رہا تھا اور حسن بن صباح جیسا ابلیس اس کا پورا پورا اثر لے رہا تھا۔

حسن بن صباح نے اُسی وقت اپنے دو تین مشیروں کو بلایا اور ابنِ مسعود نے جو مشورے دیئے تھے' وہ ان کے آگے رکھے اور پوچھا کہ ان مشوروں پر عمل کیا جائے یا نہیں۔

کچھ دیر تک بحث مباحثہ چلا۔ ابنِ مسعود نے مشیروں کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا اور یہ فیصلہ لے لیا کہ ابنِ مسعود اپنی بہن زرّیں کو ساتھ لے کر مَرو چلا جائے اور اس کے ساتھ دو آدمی بھیجے جائیں جو راستے میں ان کی حفاظت کریں کیونکہ اتنی حسین اور نوجوان لڑکی اس کے ساتھ جا رہی ہے.... ابنِ مسعود نے انہیں بتایا تھا کہ وہ اپنے ان آدمیوں کو جانتا ہے جو مَرو میں رہتے ہیں۔

○

ابنِ مسعود یہ فیصلہ لے کر وہاں سے نکلا اور اپنی بہن زرّیں کی تلاش میں جنّت کی طرف چلا گیا۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ جنّت کا وہ علاقہ اس قدر حسین' سرسبز اور شاداب تھا جو الفاظ کے احاطے میں آ ہی نہیں سکتا۔ وہاں کے پیڑ پودے اور پھول ایسے تھے جو عام طور پر دیکھنے میں نہیں آیا کرتے تھے۔ وہاں کے پرندے بھی کچھ ایسے تھے جن کا تعلق اس علاقے کے ساتھ نہیں تھا' وہ دُور دُور سے لائے گئے تھے۔ یہ رنگا رنگ پرندے تھے۔ وہاں سے ایک ندی گزرتی تھی جو بڑی ہی شفاف تھی۔ عجوبہ یہ تھا کہ اَلموُت بلند اور بڑی ہی چوڑی چٹان پر آباد تھا لیکن اس بلندی پر بھی یہ مصنوعی ندی بنائی گئی تھی۔ دریا سے مصنوعی طریقوں سے پانی اوپر چڑھایا جاتا تھا اور یہ ندی جنّت کے درمیان سے بل کھاتی گزرتی تھی۔

اُس جنّت میں جو حوریں گھومتی پھرتی' شوخیاں کرتی اور ہنستی کھیلتی نظر آتی تھیں' وہ اس زمین کی لڑکیاں لگتی ہی نہیں تھیں۔ اصل بات جو مؤرخوں نے لکھی ہے وہ یہ

تھی کہ جسے اس جنت میں داخل کیا جاتا تھا اسے پہلے تھوڑی سی حشیش پلا دی جاتی تھی؛ اور بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ حشیش کے علاوہ ایک خاص قسم کی جڑی بوٹی تھی جو حسن بن صباح کی دریافت تھی۔ اسے کسی کیمیاوی عمل سے گذار کر نشہ آور بنا دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ جنت میں کئی جگہوں پر اُس جڑی بوٹی کو کاشت کر دیا گیا تھا جس کا اثر یہ تھا کہ اس کی خوشبو بھی نشہ طاری کر دیتی تھی۔ حشیش کے علاوہ اس جڑی بوٹی کا نشہ بھی پلا دیا جاتا تھا۔

اس کا اثر کچھ ایسا تھا کہ انتہائی بھدی اور بدنما چیزیں بھی بڑی ہی دلکش اور خوشنما لگتی تھیں۔

اپنی جانیں ہنستے کھیلتے ہوئے قربان کرنے والے فدائی اسی جنت کے نکالے ہوئے آدم تھے۔ انہیں جب یہاں سے نکالا جاتا تھا تو وہ تڑپتے، بے حال ہوتے، چیختے اور چلاتے تھے کہ انہیں یہاں سے نہ نکالا جائے لیکن ان کی برین واشنگ اس حد تک ہو چکی ہوتی تھی کہ انہیں کہا جاتا تھا کہ وہ فلاں جگہ جائیں، فلاں کو قتل کریں پھر اسی خنجر سے اپنے آپ کو بھی قتل کر دیں اور پھر وہ ہمیشہ اس جنت میں رہیں گے۔

ابنِ مسعود بھی اس جنت میں رہ چکا تھا اور وہ یہاں سے نکل کر حشیش پیتا رہا تھا لیکن اس پر جنت کی حقیقت جس طرح بے نقاب ہوئی، وہ بیان ہو چکی ہے.... اب ایک عرصے بعد اور ایک بدلے ہوئے نارمل انسان کی طرح وہ اس جنت میں اپنی بہن کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا تو اسے اپنے دل میں خلش سی محسوس ہو رہی تھی اور ضمیر میں ایک کانٹا سا اتر گیا جس کی چبھن اسے بے چین کئے ہوئے تھی۔ اُسے کئی لڑکیاں نظر آئیں اور وہ سب ایک ایک نوجوان کو ساتھ لئے عشق و محبت کا کھیل کھیل رہی تھیں اور بعض بے حیائی کے مظاہرے کر رہی تھیں۔ ان کی ہنسی جلترنگ جیسی مترنم تھی۔ ابنِ مسعود اپنے خون میں حرارت محسوس کرنے لگا تھا۔ حرارت تو وہ پہلے بھی محسوس کیا کرتا تھا لیکن اب اس حرارت میں ایمان کی تپش تھی۔

"عمر!" —— اسے کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔

اُس نے رُک کر ادھر دیکھا۔ اُس کا نام عمر بن مسعود تھا۔ اسے ابنِ مسعود کہتے تھے اور صرف اس کی بہن تھی جو اسے عمر کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ اُس نے اُدھر دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی تو اسے اپنی بہن نظر آئی جو اُس کی طرف دوڑتی آ رہی تھی۔ وہ

"ہاں!" —— طبیب نجم نے جواب دیا —— "اسے دوائی پلائی جائے گی لیکن آپ نے بتایا ہے کہ وہ قید خانے کی کوٹھڑی میں بہت زیادہ اودھم برپا کر رہا ہے۔ آپ اسے دوائی کس طرح پلائیں گے؟ یہ کام آپ کو کرنا ہو گا"۔

"ہاں محترم طبیب!" —— نظام الملک نے کہا —— "میں نے ایک انتظام تو کیا ہے کہ اس شخص پر قابو پایا جا سکے...... ذرا ٹھہریئے..... میں معلوم کرتا ہوں کہ وہ آدمی واپس آیا ہے یا نہیں"۔

نظام الملک نے دربان کو بلا کر پوچھا کہ وہ آدمی آیا ہے کہ نہیں۔ دربان کو معلوم تھا کہ کس شخص کے متعلق پوچھا جا رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ ابھی ابھی آیا ہے۔ نظام الملک نے اسے کہا کہ اسے فوراً اندر بھیج دو۔ دربان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد وہی آدمی جو قید خانے میں حسن بن صباح کا جاسوس بن کر مزمل آفندی کے پاس گیا اور اسے ٹھنڈا کر آیا تھا اندر آیا۔

"کہو بھائی!" —— نظام الملک نے اُس سے پوچھا —— "کیا کر کے آئے ہو!"

"سب ٹھیک کر آیا ہوں" —— اس شخص نے جواب دیا —— "وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ میں نے اسے کہا ہے کہ آئندہ اس کے کھانے پینے کا انتظام میں کروں گا۔ اس نے بخوشی یہ صورت قبول کر لی ہے۔ اس نے مجھ پر مکمل اعتماد کیا ہے"۔

"آفرین!" —— نظام الملک نے کہا پھر وہ طبیب سے مخاطب ہوا —— "اب اُسے وہ دوائی آسانی سے پلائی جا سکے گی جو آپ اسے دینا چاہیں گے"۔

نظام الملک نے اس آدمی کو باہر بھیج دیا۔

"میں آپ کو خبردار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں" —— طبیب نے کہا —— "دوائی تو میرے پاس تیار ہے۔ یہ میرا پہلا تجربہ ہو گا۔ اس دوائی کا اثر یہ ہو گا کہ مزمل بے ہوش ہو جائے گا یا یوں کہہ لیں کہ سو جائے گا۔ ایسا ہونا تو نہیں چاہئے لیکن میں ڈرتا ہوں کہ دوائی کی مقدار ایک آدھا قطرہ بھی زیادہ ہو گئی تو اس شخص کی موت واقع ہو سکتی ہے"۔

"نہیں میرے بزرگ!" —— شمونہ نے تڑپ کر کہا اور طبیب کے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر التجا کے لہجے میں بولی —— "ایسا نہ کہیں۔ جان لینی ہے تو میری لے لیں۔ موت واقع ہو تو میری ہو۔ مجھے کوئی طریقہ بتائیں۔ اگر کہیں تو میں اس کی کال کوٹھڑی میں بند ہو جاتی ہوں۔ شب و روز اس کے ساتھ رہوں گی اور مجھے امید ہے کہ اسے

اِلیس اپنی اصلی ذہنی اور جذباتی حالت میں لے آؤں گی"۔

"شمونہ بیٹی!" ___ نظام الملک نے کہا ___ "ہم مزمل جیسے قیمتی آدمی کو زیادہ دیر تک ایسی حالت میں نہیں دیکھ سکتے۔ میں بھی تمہاری طرح مزمل کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں"۔

"گھبراؤ نہیں لڑکی!" ___ طبیب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ___ "میں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ ضرور ہی مر جائے گا' میں نے صرف اظہار کیا ہے ایک خطرے کا۔ ہمیں یہ خطرہ مول لینے دو۔ زیادہ تر کام تو تم نے کرنا ہے اور یہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم نے کیا کرنا ہے"۔

"محترم طبیب!" ___ نظام الملک نے کہا ___ "آپ وہ دوائی دے دیں۔ صرف یہ خیال رکھیں کہ اس کی مقدار کم رکھیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ جڑی بوٹیوں سے بنائی ہوئی دوائی کسی کی جان بھی لے سکتی ہے"۔

"میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ اس دوائی میں کیا کیا ڈالا گیا ہے" ___ طبیب نے کہا ___ "یہ نایاب جڑی بوٹیوں سے بنی ہے جو ہمارے علاقے میں شاید ہی کہیں نظر آئیں۔ اس میں صحرائی سانپ کے زہر کا کُشتہ بھی شامل ہے۔ اس میں کچھوے کی چربی بھی ایک خاص عمل سے گزار کر شامل کی گئی ہے۔ یہ تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ صحرائی سانپ ملنا کتنا دشوار ہے۔ صحرا کہاں ہے' اور کون وہاں سانپ کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہو گا۔ بہرحال میں نے یہ سانپ حاصل کیا اور اس کا زہر مار کر دوائی میں شامل کیا ہے"۔

طبیب نے شمونہ اور نظام الملک کو کچھ ہدایات دینی شروع کر دیں۔

○

سورج غروب ہو گیا۔ قید خانے کی راہداریوں کی مشعلیں جلا دی گئیں۔ کچھ دیر بعد قیدیوں میں کھانا تقسیم ہونے لگا۔

ایک سنتری نے مزمل آفندی کی کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور خود ایک طرف ہو گیا۔ کوٹھڑی میں وہ شخص داخل ہوا جو مزمل کو ٹھنڈا کر گیا تھا۔ اس نے کھانا اُٹھا رکھا تھا۔ سالن اور روٹیوں کے علاوہ ایک پیالہ دودھ کا بھرا ہوا تھا۔ مزمل یہ کھانا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"تمہارے چہرے پر حیرت کیوں؟" ___ اس آدمی نے کہا ___ "میں نے تمہیں کہا

تھا کہ آئندہ تمہارے کھانے کا انتظام میں کیا کروں گا۔ تمہیں اب یہی کھانا ملا کرے گا۔ میں نے تمہارے فرار کا انتظام کر لیا ہے۔ تمہیں دو یا تین دن انتظار کرنا پڑے گا۔ آرام سے کھانا کھاؤ اور یہ دودھ پی لو۔ میں جا رہا ہوں"۔

اس شخص نے یہ بات مزمل کے کان میں اتنی دھیمی آواز میں کہی تھی کہ سنتری کو سنائی نہیں دیتی تھی..... کوٹھڑی کا دروازہ پھر بند ہو کر مقفل ہو گیا۔ سنتری اس راہداری میں جس میں مزمل آفندی کی کوٹھڑی تھی' آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا۔ یہ اس کی اور اس جیسے سنتریوں کی ہر رات کی ڈیوٹی تھی لیکن یہ سنتری جب مزمل کی کوٹھڑی کے آگے سے گزرتا تھا تو اس کے قدم رک جاتے اور مزمل کو وہ سلاخوں میں سے غور سے جھانکتا تھا۔ مزمل کھانا کھا رہا تھا۔ سنتری دوسرے چکر پر آیا تو دیکھا کہ مزمل نے دودھ کا پیالہ منہ سے لگا رکھا تھا۔

سنتری آگے نکل گیا اور کہیں رک گیا تھا۔ کچھ وقت گزار کر وہ پھر راہداری میں آیا اور حسبِ معمول مزمل کی کوٹھڑی کے سامنے آ کر بہت آہستہ ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ پیالہ فرش پر پڑا تھا۔ مزمل نے سارا دودھ پی لیا تھا اور وہ دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا سر ڈول رہا تھا اور آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ سنتری دو چار قدم آگے گیا اور رک گیا۔ وہ پھر واپس آیا تو دیکھا کہ مزمل فرش پر پیٹھ کے بل پڑا تھا اور اس کے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ سنتری دوڑ پڑا اور راہداری سے نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہی شخص آیا جو مزمل کا دوست بن کر اسے کھانا اور دودھ دے گیا تھا۔ سنتری اس کے ساتھ تھا۔ اس کے اشارے پر سنتری نے دروازہ کھولا۔ وہ شخص اندر گیا اور مزمل کے پاس بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس نے مزمل کے سر پر ہاتھ رکھ کر ہلایا۔

مزمل بیدار نہ ہوا۔

دوسری بار اس آدمی نے مزمل کے سر کو ذرا زور سے ہلایا' پھر بھی مزمل کی آنکھ نہ کھلی۔ وہ آدمی اٹھا اور سنتری کو یہ کہہ کر تیزی سے نکل گیا کہ کوٹھڑی کو مقفل کر دو۔

وہ آدمی دوڑتا ہوا راہداری سے نکلا' دوڑتا ہوا ہی قید خانے سے نکلا' باہر اس کا گھوڑا کھڑا تھا' اس پر سوار ہو کر اس نے ایڑ لگا دی۔ قید خانہ شہر سے ذرا دُور ویران اور بنجر سے علاقے میں تھا۔

اُس نے گھوڑا ملک شاہ کے دروازے پر جا روکا اور وہ کود کر گھوڑے سے اُترا۔ وہ دوڑتا ہوا اندر چلا گیا۔ دربان اور محافظ کھڑے تھے لیکن انہوں نے اُسے نہ روکا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ شخص آئے تو اسے روکنا نہیں۔

وہ ایک کمرے میں چلا گیا جہاں طبیب نجم مدنی' نظام الملک اور شمونہ موجود تھے۔

"کیا خبر ہے؟" ـــــ نظام الملک نے پوچھا۔

"بڑی اچھی خبر ہے" ـــــ اس آدمی نے جواب دیا ـــــ "وہی اثر ہُوا ہے جو محترم طبیب نے بتایا تھا۔ وہ اتنی گہری نیند سو گیا ہے کہ میں نے اسے زور زور سے ہلایا' اُس کے سر کو جھنجوڑا لیکن اُس کے پپوٹوں میں ذرا سی بھی حرکت نہیں ہوئی"۔

"کیا وہ زندہ ہے؟" ـــــ شمونہ نے تڑپ کر پوچھا۔

"ہاں' وہ زندہ ہے" ـــــ اس آدمی نے جواب دیا ـــــ "کیا میں اتنا احمق نظر آتا ہوں کہ مجھے سوئے ہوئے اور مرے ہوئے آدمی میں فرق معلوم نہ ہو؟"

"نظام الملک!" ـــــ طبیب نجم نے کہا ـــــ "اسے یہاں لے آؤ"۔

○

کچھ دیر بعد مزمل آفندی کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا۔ ایک چارپائی کوٹھڑی میں داخل ہوئی جس کے ساتھ چار آدمی تھے۔ چارپائی فرش پر رکھ کر ان آدمیوں نے فرش پر پڑے ہوئے مزمل کو اٹھایا اور چارپائی پر ڈال دیا۔ اس میں بیداری کے کوئی آثار نہیں تھے۔

ان آدمیوں نے چارپائی اٹھائی اور کوٹھڑی سے نکل گئے پھر وہ قید خانے سے بھی نکل گئے۔

نظام الملک' طبیب اور شمونہ بیتابی سے انتظار کر ... ن میں شمونہ بہت ہی بے چین اور بیتاب تھی۔ اس کے حسین چہرے پر گھبراہٹ اور دل میں دعائیں تھیں۔ وہ بار بار باہر دیکھتی تھی۔

آخر وہ لوگ مزمل کو اٹھائے ہوئے آ گئے اور چارپائی اسی کمرے میں لا رکھی۔ شمونہ نے لپک کر مزمل کی کلائی پکڑی اور اس کی نبض محسوس کی۔ اس کے چہرے پر سکون اور اطمینان کا تاثر آ گیا۔ مزمل آفندی زندہ تھا۔

مزمل کو اٹھا کر پلنگ پر ڈال دیا گیا اور وہ آدمی چارپائی اٹھا کر کمرے سے نکل گئے۔

"شمونہ!" ـــــ طبیب نے مزمل کی نبض پر انگلیاں رکھے ہوئے کہا ـــــ "خطرہ ٹل

گیا ہے۔ نبض بالکل ٹھیک چل رہی ہے۔ اگر دوائی کا اثر وہ ہوتا جو میں نے بتایا تھا کہ ہو سکتا ہے تو مزمل کی نبض اس وقت تک خاموش ہو چکی ہوتی۔۔۔۔ ہم چلے جائیں گے۔ تم یہاں رہو گی اور اگر تمہیں ساری رات جاگنا پڑا تو جاگتی رہنا۔ میں نے تمہیں ساری بات بتا دی ہے اور اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ تم نے کیا کرنا ہے۔ دودھ وہ رکھا ہے' یہ جاگ اٹھے تو پہلا کام یہ کرنا کہ اسے یہ دودھ پلا دینا اور جو کچھ تم نے کرنا ہے وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ یہ پھر سو جائے گا۔ اسے زبردستی بیدار کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم خود بھی سو جانا۔ یہ بہت دیر بعد' کل دن کو کسی وقت جاگے گا۔ آج رات کے پچھلے پہر اسے کچھ بیدار ہونا چاہئے"۔

"اور شمونہ!" ـــــ نظام الملک نے کہا ـــــ "دروازے کے باہر چار آدمی ہر وقت موجود رہیں گے۔ کوئی مشکل پیش آ جائے یا مزمل بیدار ہو کر پھر ہنگامہ برپا کرے یا بھاگنے کی کوشش کرے تو یہ آدمی اسے سنبھال لیں گے"۔

"اب یہ سوچ لو شمونہ!" ـــــ طبیب نجم نے کہا ـــــ "اب تم پر منحصر ہے کہ اسے سنبھال لیتی ہو یا مزید بگاڑ دیتی ہو۔ تم خود عقل والی ہو اور مردوں کو لگام ڈالنا جانتی ہو۔ یہ تو پہلے ہی تمہاری محبت میں گرفتار ہے"۔

شمونہ نے انہیں تسلی دی کہ وہ مزمل کو سنبھال لے گی۔ وہ دونوں کمرے سے نکل گئے اور شمونہ اُس پلنگ پر بیٹھ گئی جس پر مزمل پیٹھ کے بل پڑا دھیمے دھیمے خراٹے لے رہا تھا۔

○

یہ کمرہ خاص طور پر مزمل آفندی کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ نظام الملک کے گھر کا کوئی کمرہ اسی طرح تیار کیا جا سکتا تھا لیکن طبیب نے وہ مناسب نہ سمجھا کیونکہ مزمل نظام الملک کی دشمنی لے کر آیا تھا۔ خطرہ تھا کہ بیداری کے بعد اسے پتہ چلتا کہ وہ نظام الملک کے گھر میں ہے تو وہ پھر بے قابو ہو سکتا تھا۔ نظام الملک نے سلطان ملک شاہ کو اس سارے واقعے سے باخبر رکھا ہُوا تھا۔ طبیب نے سلطان سے کہا تھا کہ وہ اس کے محل کا ایک کمرہ استعمال کرنا چاہتا ہے۔ سلطان نے بخوشی اجازت دے دی تھی۔

اس کمرے کی زیب و زینت کا اہتمام طبیب نے اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق کیا تھا۔ بستر نہایت نرم ملائم اور آرام دہ تھا۔ کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں پر خاص

رنگ کے پردے لٹکائے گئے تھے۔ قالین بیش قیمت اور دلفریب تھا۔ کمرے میں خاص قسم کے پھولوں والے پودے جو گملوں میں لگے ہوئے تھے، رکھوائے گئے تھے۔ طبیب نے ایک خاص قسم کا عطر تیار کر رکھا تھا جو اس نے تھوڑا تھوڑا بستر پر اور پردوں پر مل دیا تھا۔

شمونہ کے لئے طبیب نے کچھ سوچ کر انتخاب کیا تھا کہ یہ کون سا لباس پہنے۔ اُس نے شمونہ سے کہا تھا کہ وہ بالوں کو گوندھ کر یا باندھ کر نہ رکھے بلکہ بال کھلے چھوڑ دے۔ اُسے قمیض ایسی پہنائی گئی تھی کہ اُس کے کندھے اور بازو ننگے رکھے گئے تھے۔ طبیب نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو کس طرح استعمال کرے گی۔ طبیب نے زور دے کر کہا تھا کہ اپنے جسم کو بچا کر رکھے اور اپنی روح کو پیار اور محبت کے ذریعے مزمل کی روح پر غالب کر دے۔ شمونہ نے طبیب سے کہا تھا کہ وہ اس کھیل کی مہارت اور تجربہ رکھتی ہے۔ مزمل کے معاملے میں سہولت یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے۔

شمونہ سوئے ہوئے مزمل کو دیکھتی رہی۔ وہ اس کے بیدار ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ کبھی وہ اٹھ کھڑی ہوتی اور کمرے میں ٹہلنے لگتی۔ کبھی وہ مزمل کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگتی۔ اس کا انداز ایک ماں جیسا تھا جس کا بڑا ہی پیارا بچہ سویا ہوا ہو۔

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی۔ شمونہ کو غنودگی آنے لگی تھی۔ وہ سو ہی جانے کو تھی کہ مزمل کے جسم کو حرکت ہوئی۔ شمونہ بیدار ہو گئی اور مزمل کے پلنگ پر جا بیٹھی۔ مزمل نے کروٹ بدلی۔ شمونہ کو معلوم تھا کہ اب اس نے کیا کرنا ہے۔

مزمل نے کروٹ اس طرح بدلی تھی کہ اُس کا منہ شمونہ کی طرف تھا۔ شمونہ اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ مزمل کا ایک ہاتھ شمونہ کی گود میں آ گیا۔ شمونہ وہ ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے آہستہ آہستہ مسلنے لگی۔ پھر اس نے مزمل کے بالوں میں انگلیاں پھیرنی شروع کر دیں۔

مزمل کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔

"مزمل!" ـــــ شمونہ نے اس پر جھک کر اپنے ہونٹ مزمل کے کان کے قریب کر کے کہا ـــــ "تم میرے پاس آ گئے ہو۔ اب کوئی ہمیں جدا نہیں کر سکتا"

مزمل کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں اور وہ پیٹھ کے بل ہو گیا۔ شمونہ اس پر

اس طرح جھک گئی کہ اس کے ریشم جیسے کھلے بال مزمل کے گالوں اور گردن پر رینگنے لگے۔

"میں کہاں ہوں؟" ـــــ مزمل نے خوابناک آواز میں پوچھا ـــــ "تم کون ہو؟"

"تم میرے پاس ہو" ـــــ شمونہ نے پیار بھری آواز میں کہا ـــــ "تم اُس پیار کی جنت میں آ گئے ہو جہاں کوئی کسی کا خون نہیں بہا سکتا۔ میں ہوں تمہاری روح"۔

"میں قید خانے میں ہوں؟" ـــــ مزمل نے یوں پوچھا جیسے نیند میں بول رہا ہو۔

"ہاں تم میرے دل کے قید خانے میں بند ہو" ـــــ شمونہ نے پہلے سے زیادہ پیاری آواز میں کہا ـــــ "تم میری محبت کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہو"۔

مزمل آفندی کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ اُس کے اور مزمل آفندی کے چہرے کے درمیان فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے آپ ہی شمونہ کے بالوں میں الجھ گیا۔ شمونہ کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ اُس نے آنکھیں مزمل کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ طبیب نے شمونہ کو جو ہدایات دی تھیں، ان کے مطابق اس نے مزمل کے ساتھ باتیں کیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مزمل ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ کمرے کو دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں سارے کمرے میں گھوم گئیں۔

"شمونہ!" ـــــ مزمل نے دھیمی سی اور حیرت زدہ سی آواز میں پوچھا ـــــ "تم کب آئیں؟..... تم جھوٹ تو نہیں بولو گی..... میں کہاں سویا تھا؟..... میں نے..... میں نے شمونہ!..... میں نے شاید خواب دیکھا ہے" ـــــ اُس کے ماتھے پر شکنیں ظاہر ہوئیں جیسے وہ ذہن کے ویرانے میں کچھ ڈھونڈ رہا ہو لیکن اُسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

شمونہ نہیں چاہتی تھی کہ مزمل ایک بار پھر سو جائے۔ وہ اسے بیدار رکھنا چاہتی تھی اور اُسے واپس اسی ذہنی کیفیت میں لانا چاہ رہی تھی جس کیفیت میں وہ حسن بن صباح کو قتل کرنے کے ارادے سے روانہ ہوا تھا لیکن طبیب نجم مدنی نے اسے کہا تھا کہ یہ جاگ اٹھے تو اس کے ساتھ ایک دو باتیں کرنا اور یہ تمہیں پہچان لے کہ تم شمونہ ہو اور اس کے بعد اسے پھر دودھ کا پیالہ پلا دینا۔ شمونہ کو معلوم تھا کہ اس دودھ میں وہی دوائی شامل کی گئی ہے لیکن اس کی مقدار اب کم رکھی گئی ہے۔

"مزمل!" ـــــ شمونہ نے اس کے گالوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا ـــــ "تم بڑے لمبے اور بڑے کٹھن سفر سے واپس آئے ہو۔ میں تمہیں دودھ پلاؤں گی پھر د

جانا، تھکن دور ہو جائے گی تا تو میں تمہارے پاس بیٹھوں گی اور ہم پھر وہی پیار کی باتیں کریں گے"۔

شمونہ اٹھی اور دودھ کا پیالہ اٹھالائی۔ مزمل اسے حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شمونہ نے پیالہ اپنے ہاتھوں میں ہی رکھا اور اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ مزمل نے دو تین سانسوں میں دودھ پی لیا۔ دودھ میں اتنا میٹھا ڈالا گیا تھا جس سے دوائی کا ذائقہ دب گیا تھا۔

مزمل پھر غنودگی میں چلا گیا۔ شمونہ کو طبیب نے بتایا تھا کہ یہ پھر غنودگی میں جائے گا تو اس کے ساتھ کیا باتیں کرنی ہیں اور اس وقت تک یہ باتیں کرنی ہیں جب تک یقین نہ ہو جائے کہ یہ سو گیا ہے۔

شمونہ نے اب جو پیار کی باتیں شروع کیں تو اس کے اپنے آنسو نکل آئے۔ پیار کی ان باتوں میں ایک انسان کی دوسرے انسان سے محبت کی بات نہیں تھی بلکہ بنی نوع انسان کی محبت ان باتوں میں رچی بسی ہوئی تھی۔ طبیب کا دراصل مطلب یہ تھا کہ غنودگی کے عالم میں مزمل کے ذہن سے تخریب کاری اور قتل کے خیالات نکال کر اس میں پیار و محبت اور روحانیت کا نور بھرا جائے۔ شمونہ نے ایسے پُر اثر طریقے سے یہ باتیں آہستہ آہستہ کیں کہ مزمل نے شمونہ کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہونٹوں سے لگایا اور اس کے ساتھ ہی وہ گہری نیند سو گیا۔ شمونہ کو ایسی بری نیند آئی تھی کہ وہ بھی وہیں لڑھک گئی اور سو گئی۔

○

صبح طلوع ہوئی تو طبیب اور نظام الملک یہ دیکھنے آئے کہ رات کس طرح گزری ہے۔ نظام الملک نے دروازے پر دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔ خاصی دیر گزر جانے کے بعد بھی اندر سے کوئی جواب نہ آیا نہ شمونہ باہر نکلی تو اس نے ایک بار پھر دستک دی۔ پھر بھی کوئی جواب نہ آیا تو نظام الملک نے دروازہ کھولا اور طبیب کو ساتھ لے کر وہ اندر چلا گیا۔ دیکھا کہ شمونہ اس طرح گہری نیند سوئی ہوئی تھی کہ اس کا سر مزمل کے سینے پر تھا اور اس کی ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹک رہی تھیں۔ مزمل ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا طبیب نے وہ پیالہ دیکھا جس میں رات کو پلانے والا دودھ تھا۔ پیالہ خالی تھا۔

"آئیں، نظام الملک!"۔۔۔ طبیب نے کہا۔۔۔ "شمونہ نے اسے رات کو دودھ پلا

دیا تھا۔ پیالہ خالی پڑا ہے۔ یہ دوپہر کے بعد جاگے گا۔ شمونہ شاید جلدی جاگ اٹھے۔ اس کی نیند بتاتی ہے کہ یہ رات بھر سو نہیں سکی"۔

دونوں کمرے سے نکل گئے۔

تین دن اور راتیں مسلسل مزمل کو یہ دوائی دودھ میں ملا کر پلائی جاتی رہی۔ ہر بار دوائی کی مقدار کم کرتے چلے گئے۔ وہ جب بیدار ہوتا تھا تو شمونہ اس کے ساتھ اس طرح کی باتیں کرتی تھی جس طرح اسے طبیب نجم مدنی نے بتائی تھیں۔ اس وقت مزمل کا ذہن نیم بیدار ہوتا تھا اور شمونہ جس پیارے انداز میں بات کرتی تھی وہ اس کے ذہن میں اترتی چلی جاتی تھی۔

یہ عمل طبیب کی نگرانی میں جاری رکھا گیا اور چوتھے دن اسے کوئی دوائی نہ دی گئی۔ جب وہ بیدار ہوا تو طبیب نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کی کنپٹیاں اپنے دونوں انگوٹھوں سے آہستہ آہستہ ملنی شروع کر دیں اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ باتیں کیں۔ یہ ایک قسم کا وہ عمل تھا جسے آج ہپناٹزم کہتے ہیں۔ یہ برین واشنگ جیسا ہی ایک عمل تھا جو سات آٹھ روز چلتا رہا اور کامیاب رہا۔ مزمل خاصی تیزی سے واپس اپنے آپ میں آ گیا۔ طبیب کو توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اصلی ذہنی کیفیت میں آ جائے گا۔ طبیب کی دوائی کا اپنا اثر تو تھا ہی، خود طبیب نے کہا کہ اس دوائی کے اثر کو تیز اور کئی گنا زیادہ کرنے میں شمونہ کا ہاتھ تھا۔ ایک روز نظام الملک مزمل کے سامنے آیا۔ کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ مزمل کا ردعمل اور رویہ کیا ہو گا۔ طبیب نجم بھی وہاں موجود تھا اور شمونہ بھی تھی۔ کمرے کے دروازے کے ساتھ ہی باہر نظام الملک کے محافظ تیار کھڑے تھے۔

مزمل آفندی نے نظام الملک کو دیکھا اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔ نہایت آہستہ آہستہ اٹھا۔ نظام الملک بازو پھیلا کر اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے ہوئے اس کی طرف تیزی سے بڑھا۔

مزمل نے بھی بازو پھیلا دیئے اور دوسرے لمحے وہ ایک دوسرے کے بازوؤں میں تھے۔

"کیوں مزمل!"۔۔۔ نظام الملک نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑے پیار سے پوچھا۔۔۔ "کہاں چلے گئے تھے؟... میں تو سمجھا کہ تم چلے ہی گئے ہو

"یہ تو میں بتا نہیں سکتا" ـــــ مزمل نے کہا ـــــ "آپ کو دیکھ کر کچھ یاد آتا ہے.... یہ بھی یاد آتا ہے کہ آپ نے مجھے جانے سے روکا تھا اور میں پھر بھی چلا گیا تھا"۔

"اور اب؟" ـــــ نظام الملک نے بڑے پیارے لہجے میں پوچھا ـــــ "اب تو نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں!" ـــــ مزمل نے مسکرا کر جواب دیا ـــــ "نہیں جاؤں گا..... اب کہیں نہیں جاؤں گا"۔

دو تین دن اور گزرے تو مزمل کو سب کچھ یاد آنے لگا۔ اب ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ اس کی حالت پھر بگڑ جائے گی۔ اس پر ایک اور ہی قسم کی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ پچھتاوے' شرمندگی اور حسن بن صباح سے انتقام لینے والی کیفیت تھی۔ نظام الملک اور شمونہ نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور ایک دو دن صرف کر کے اسے اس کیفیت سے نکال لیا۔

"مزمل آفندی!" ـــــ ایک روز نظام الملک نے اسے کہا ـــــ "جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ وہاں تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا۔ یہ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ باطنی کس طرح تم جیسے جذبے والے آدمی پر بھی غالب آجاتے ہیں اور اسے اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں"۔

"میں بتا سکتا ہوں" ـــــ مزمل آفندی نے کہا ـــــ "مجھے وہاں گزارا ہوا ایک ایک لمحہ یاد آگیا ہے..... میں خود چاہتا ہوں کہ آپ کو وہ ساری روداد سناؤں۔ آپ کسی اور خیال سے مجھ سے وہ باتیں سننا چاہتے ہیں لیکن میں اس خیال سے آپ کو سنانا چاہتا ہوں کہ آپ کو پتہ چلے کہ میں کتنا مجبور ہو گیا تھا۔ میرا دماغ میرے قابو سے نکل گیا تھا"۔

"وہ بھول جاؤ" ـــــ نظام الملک نے کہا ـــــ "تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارے ذہن پر قبضہ کس طرح کیا گیا تھا؟"

"انہوں نے مجھے کال کوٹھڑی میں بند کر دیا" ـــــ مزمل آفندی نے کہا ـــــ "اس کوٹھڑی میں ایسی بدبو تھی جیسے وہاں مردار یا انسانی لاشیں گل سڑ رہی ہوں۔ مجھے تین دن نہ کچھ کھانے کے لئے دیا گیا اور نہ پینے کے لئے پانی کا گھونٹ دیا گیا۔ ایک طرف میرا خون کھولتا تھا' ابلتا تھا کہ میں دھوکے میں آگیا ہوں۔ اگر میں حسن بن صباح کو قتل کر چکا ہوتا تو پھر وہ مجھے کیسی ہی اذیتیں کیوں نہ دیتے' میں برداشت کر لیتا اور اس موت کو خندہ

پیشانی سے قبول کر لیتا جو آہستہ آہستہ اور مجھے اذیتیں دے دے کر مارتی۔ دوسری طرف جسم جواب دے رہا تھا۔ میں سات آٹھ دن بھوکا رہ سکتا تھا لیکن پانی کے بغیر ایک دن بھی گزارنا محال تھا.....

"اس کمرے میں جو بدبو تھی وہ میں بیان ہی نہیں کر سکتا کہ یہ کیسی تھی۔ اس بدبو نے میرا دماغ ماؤف کر کے رکھ دیا۔ پھر میں خود اپنا خون پی رہا تھا کیونکہ میں جس مقصد کے لئے آیا تھا وہ پورا نہیں ہوا تھا۔ ایک طرف بھوک اور پیاس اور دوسری طرف یہ جلنا اور کڑھنا۔ تیسرے چوتھے دن مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میں بہت جلدی پاگل ہو جاؤں گا بلکہ پاگل پن شروع ہو چکا تھا۔ پھر ایک روز مجھے آدھی روٹی اس طرح دی گئی کہ دروازہ کھلا اور وہیں سے ایک آدمی نے میری طرف آدھی روٹی اس طرح پھینکی جیسے کُتے کی طرف کوئی چیز پھینکی جاتی ہے۔ اس نے مٹی کا ایک غلیظ سا پیالہ دروازے کے قریب رکھ دیا اور چلا گیا۔ میں اپنی خودداری اور اپنے وقار کو بھول گیا تھا۔ میں کتوں کی طرح ہی روٹی کے آدھے ٹکڑے پر جھپٹ پڑا اور گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل اس چھوٹے سے پیالے تک گیا جو وہ آدمی دروازے کے اندر رکھ گیا تھا۔ وہ تھوڑا سا سالن تھا۔ میں نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ یہ کس چیز کا شوربہ تھا یا گدلا نمکین پانی تھا' میں لقمے اس میں ڈبو ڈبو کر حلق میں اتارتا گیا۔ آدھی روٹی ذرا سی دیر میں ختم ہو گئی اور اس سے میری بھوک اور تیز ہو گئی۔ میں اٹھا اور دروازے کی سلاخیں پکڑ کر چلانے لگا کہ مجھے اور روٹی دو' خدا کے لئے مجھے اور روٹی دو.....

"ایک سنتری آیا۔ میں دروازے کی سلاخیں پکڑے کھڑا تھا۔ اُس نے سلاخوں کے درمیان سے میرے منہ پر اتنی زور سے گھونسہ مارا کہ میں پیچھے دیوار کے ساتھ جا لگا سر کا پچھلا حصہ بڑی زور سے ٹکرایا تھا جس سے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر غشی میں پڑا رہا.....

"جب میں ہوش میں آیا تو میں کوٹھڑی میں نہیں تھا۔ وہ ذرا بہتر اور صاف ستھرا کمرہ تھا۔ میں فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ ایک آدمی ہاتھ میں برچھی لئے میرے پاس کھڑا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ میری آنکھیں کھل گئی ہیں تو اس آدمی نے میرے پہلو میں پاؤں سے ٹھوکر لگا کر کہا' ہوش آگئی ہے؟ میں تو بول بھی نہیں سکتا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ آدمی باہر نکل گیا پھر وہ فوراً ہی واپس آگیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جس کی چال ڈھال'

ڈیل ڈول اور لباس ایسا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ شخص کوئی بڑا عہدیدار ہے"۔

مزمل آفندی نے آگے اپنی جو داستان سنائی وہ کچھ اس طرح تھی۔ یہ معزز آدمی اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"مزمل آفندی!" ــــ اس آدمی نے کہا ــــ "تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

"پانی!" ــــ مزمل کے منہ سے جیسے سسکی نکلی ہو ــــ "پانی..... پانی.....!"

"تم یہاں کیوں آئے تھے؟" ــــ اس عہدیدار نے کہا ــــ "میرے سوال کا جواب دو گے تو پانی مل جائے گا..... تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

"قتل ہونے کے لئے!"۔ مزمل نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ اپنے منہ سے باہر دھکیلے۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں"۔ عہدیدار نے کہا۔

مزمل آفندی کا منہ پیاس کی شدت سے کھل گیا تھا۔ وہ تو اب سرگوشی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بولنے کے قابل نہیں۔ اس کے ہونٹ ہلے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس نے دو مرتبہ پانی پانی کہا ہے۔

"نہیں!" ــــ عہدیدار نے کہا ــــ "پانی نہیں ملے گا"۔

مزمل کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ پیاس کی شدت نے اس پر غشی طاری کر دی تھی۔

مزمل آفندی ہوش میں آیا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ اب فرش پر نہیں ایک نرم سے بستر پر پڑا ہے۔ اس کے پاس ایک نوخیز دوشیزہ بیٹھی ہوئی تھی۔ مزمل نے آنکھیں کھولیں تو اسے سب سے پہلی جو چیز نظر آئی وہ اس لڑکی کی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ مزمل نے نظام الملک کو سنایا کہ وہ اسے خواب سمجھا۔

"اٹھو مزمل!" ــــ لڑکی نے بڑے پیار سے کہا ــــ "کھانا کھا لو"۔

"پانی!" ــــ مزمل کے ہونٹوں سے سرگوشی پھسلی ــــ "پانی!" ــــ مزمل کا منہ کھلا رہا۔ اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور اس کی زبان اکڑ گئی تھی۔

"خالی پیٹ پانی نہیں دوں گی" ــــ لڑکی نے کہا ــــ "پہلے کھانا کھا لو..... تھوڑا سا کھا لو پھر پانی پینا"۔

مزمل اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ اس لڑکی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ مزمل نے دیکھا کہ یہ نہایت اچھا سجا سجایا کمرہ تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک گول میز رکھی ہوئی تھی اور اس میز پر کھانا پڑا ہوا تھا۔ تب مزمل کو پکے ہوئے گوشت اور روٹیوں کی بُو محسوس ہوئی۔ وہ فوراً اٹھا اور میز کے قریب پڑے ہوئے سٹول پر بیٹھ گیا۔

وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سالن ایک قسم کا نہیں بلکہ تین چار قسم کے سالن تھے۔ یہ کسی شہزادے یا بہت بڑے حاکم کا کھانا تھا۔ مزمل آفندی ذرا جھینپ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کھانا اس کے لئے رکھا گیا ہے لیکن وہ اس قدر بھوکا تھا کہ اس نے نتائج سے بے پرواہ کھانا شروع کر دیا۔ وہ شائستہ اور معزز خاندان کا تہذیب یافتہ بیٹا تھا لیکن بھوک نے اور پیاس نے اس کا دماغ ایسا ناکارہ کر دیا تھا کہ وہ جانوروں کی طرح کھانا کھا رہا تھا۔ اسے یہ بھی خیال نہیں رہا تھا کہ سالن میز پر گر رہا ہے۔ وہ دسترخوان کے آداب بھول چکا تھا۔

بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے پیچھے چند ایک نوالے حلق سے اتار کر وہ صراحی پر لپکا جو میز پر پڑی ہوئی تھی۔ لڑکی بڑی تیزی سے آئی اور اس نے مزمل کے ہاتھ سے صراحی لے لی۔

"پانی میں پلاؤں گی" ــــ لڑکی نے کہا ــــ "بہت تھوڑا تھوڑا! ایک ایک گھونٹ پلاؤں گی..... ایک ہی بار پانی نہیں پینا"۔

لڑکی نے ایک خوشنما پیالے میں تھوڑا سا پانی ڈال کر مزمل کو دیا۔ مزمل ایک ہی بار یہ پانی پی گیا اور پھر کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ تھوڑا سا کھا کر وہ پھر صراحی پر جھپٹا لیکن لڑکی نے پہلے کی طرح اس کے ہاتھ سے صراحی لے لی اور اب ذرا زیادہ پانی پیالے میں ڈال دیا۔ مزمل نے وہ پانی بھی ایک ہی سانس میں پی ڈالا۔

دیکھتے ہی دیکھتے مزمل تمام روٹیاں اور اتنے زیادہ سالن صاف کر گیا۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے سالن والے برتن دُھلے ہوئے ہیں۔ مزمل نے ان میں لقمے پھیر پھیر کر ان برتنوں کو صاف کر دیا تھا۔ اب کے اس نے لڑکی سے پانی مانگا۔

"اب پانی نہیں" ــــ لڑکی نے بڑی دلفریب مسکراہٹ سے کہا ــــ "اب شربت پلاؤں گی"۔

لڑکی نے ایک اور صراحی اٹھائی اور اس میں سے شربت گلاس میں انڈیل دیا جو

مزمل نے اٹھا کر ایک ہی بار خالی کر دیا۔

مزمل آفندی لڑکی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اسے اتنی غلیظ کوٹھڑی سے نکال کر یہاں کیوں لایا گیا ہے اور ایسا امیرانہ کھانا اسے کیوں دیا گیا ہے لیکن وہ کچھ بھی نہ پوچھ سکا کیونکہ اس پر غنودگی طاری ہو گئی تھی اور وہ بستر کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ لڑکی نے اسے کہا کہ وہ سو جائے۔ وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھا تو حیرت زدہ نظروں سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک سوال تھا لیکن یہ سوال زبان پر آنے سے پہلے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور لڑکی نے اسے سہارا دے کر پلنگ پر لٹا دیا۔

○

صبح جب مزمل اس کمرے سے نکلا تو اس نے یوں محسوس کیا جیسے یہ دنیا بالکل ہی بدل گئی ہو۔ اس کے سامنے ایک وسیع باغ تھا جس میں ایسے ایسے پھول تھے جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ گھاس بہت ہی سرسبز تھی اور یہ گھاس اوپر سے اس طرح تراشی ہوئی تھی جیسے زمین پر سبز رنگ کا قالین بچھا ہوا ہو۔ مزمل آگے بڑھا تو سرے سے لڑکی نکل آئی۔ وہ بھی اس کے ساتھ چل پڑی۔

"کیا تم مجھے کچھ بتا سکتی ہو؟" ـــــ مزمل نے لڑکی سے پوچھا ـــــ "مجھے اس غلیظ کوٹھڑی میں سے نکال کر اس امیرانہ کمرے میں کیوں لایا گیا۔ اور ایسا مرغن اور پُرلطف اور لذیذ کھانا کیوں دیا گیا ہے؟"

"تمہیں امام کے حکم سے قید خانے سے نکالا گیا" ـــــ لڑکی نے جواب دیا ـــــ "اور یہ کھانا اسی کے حکم سے تمہیں کھلایا گیا ہے اور مجھے امام نے ہی تمہاری خدمت کے لئے بھیجا ہے"۔

"کون امام؟" ـــــ مزمل نے حیران سا ہو کے پوچھا۔

"امام حسن بن صباح!" ـــــ لڑکی نے جواب دیا۔ مزمل چلتے چلتے رک گیا اور اس نے حیرت زدگی کے عالم میں لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی مسکرا رہی تھی۔

"کیا میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟" ـــــ مزمل نے کہا جیسے اپنے آپ سے بات کر رہا ہو۔

"میں سمجھتی ہوں تم کیا سوچ رہے ہو" ـــــ لڑکی نے کہا ـــــ "امام کو کل بتایا گیا ہے کہ تم اسے قتل کرنے کے لئے آئے تھے۔ اسے یہ بھی بتایا گیا کہ تمہیں قید خانے کی

انتہائی غلیظ کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا ہے۔ امام نے تمہیں قید خانے میں ڈالنے والوں کو بلایا اور حکم دیا کہ انہیں بیس بیس کوڑے لگائے جائیں کیونکہ انہوں نے اس کے حکم کے بغیر ایک مہمان کو قید خانے میں ڈال دیا تھا۔ اس طرح تمہاری رہائی کا حکم دیا گیا اور تم یہاں پہنچ گئے..... کیا تم واقعی حسن بن صباح کو قتل کرنے آئے تھے؟"

"ہاں!" ـــــ مزمل نے یوں کہا جیسے اسے شرمندگی تھی کہ وہ حسن بن صباح کو قتل کرنے آیا ہے۔

"امام کسی وقت یہاں آئے گا" ـــــ لڑکی نے کہا ـــــ "یا وہ تمہیں اپنے پاس بلائے گا"۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں نہ آئے؟" ـــــ مزمل نے پوچھا ـــــ "اور کیا یہ ممکن ہے کہ وہ مجھے اپنے پاس نہ بلائے؟"

"تم یہ کیوں سوچ رہے ہو؟"

"میں نے اگر اسے کہہ دیا کہ میں اسے قتل کرنے آیا تھا تو وہ پھر مجھے قید خانے میں پھینک دے گا" ـــــ مزمل نے کہا ـــــ "میں اس کے آگے جھوٹ نہیں بول سکوں گا"۔

"تم نہیں جانتے مزمل!" ـــــ لڑکی نے کہا ـــــ "امام حسن بن صباح ایک برگزیدہ اور اللہ کی بڑی پیاری شخصیت ہے۔ وہ صرف سچ سنتا ہے اور سچ بولتا ہے..... تم صاف کہہ دینا کہ میں آپ کے دشمنوں سے متاثر ہو کر آپ کو قتل کرنے چلا آیا تھا"۔

لڑکی مزمل کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے حسن بن صباح کی ایسی تصویر پیش کرتی رہی جو کسی فرشتے کی یا کسی پیغمبر کی ہی ہو سکتی تھی۔ باتیں کرتے کرتے وہ مزمل کو واپس کمرے میں لے آئی۔ مزمل نے کمرے میں پہنچتے ہی اسی شربت کی فرمائش کی جو لڑکی نے گذشتہ رات اسے پلایا تھا۔ صراحی کمرے میں ہی رکھی تھی۔ لڑکی نے اسے پیالہ بھر دیا جو مزمل نے پی لیا۔

مزمل کا جی چاہتا تھا کہ یہ لڑکی اس کے ساتھ باتیں کرتی رہے اور وہ خود بھی بولے اور بولتا ہی چلا جائے۔ اس غلیظ اور بدبودار کوٹھڑی کی قید نے، بھوک اور پیاس نے اس کے دماغ پر ایسا اثر کیا تھا جیسے اس کی سوچنے کی صلاحیت سو گئی ہو یا آدمی سے زیادہ صلاحیت مر ہی گئی ہو۔ پھر اس کے دماغ پر یہ لڑکی اور اس کی باتیں غالب آ گئیں۔ بات وہی ہوئی کہ ایک تو یہ لڑکی نشہ بن کر اس پر طاری ہوئی اور دوسری یہ بات کہ اس لڑکی

نے اسے حشیش پلانی شروع کر دی تھی۔

○

مزمل کے ذہن پر اور ضمیر پر بھی اب کوئی بوجھ نہیں تھا۔ وہ ایسے احساس سے سرشار اور مخمور ہوا جا رہا تھا جیسے وہ باطنیوں میں سے ہی ہو اور یہ احساس بھی کہ وہ مکمل طور پر ہوش میں ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ مزمل نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ لڑکی نے جا کر دروازہ کھولا۔

"امام تشریف لا رہے ہیں" ۔۔۔ مزمل کو باہر سے آواز سنائی دی۔

لڑکی نے دروازے کے دونوں کواڑ کھول دیئے۔ حسن بن صباح کمرے میں داخل ہوا۔ مزمل اسے دیکھ کر اٹھا اور حیرت سے اسے دیکھتا ہی رہا۔

لڑکی دروازہ بند کر کے باہر ہی کھڑی ہو گئی۔ کمرے میں حسن بن صباح اور مزمل رہ گئے۔ حسن بن صباح کے چہرے پر سنجیدگی سی تھی۔ مزمل اسے خاموشی سے دیکھتا رہا اور حسن بن صباح آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کمرے میں سناٹا طاری تھا۔ یہی وہ حسن بن صباح تھا جسے قتل کرنے کو مزمل اس قدر بے تاب تھا کہ منع کرنے کے باوجود وہ اسے قتل کرنے یہاں پہنچ گیا تھا لیکن اب اس کی حالت یہ تھی کہ اس کے دماغ میں یہ بھی سوچ نہیں آ رہی تھی کہ وہ حسن بن صباح کا سامنا کس طرح کرے اور کیا کہے۔ اس کا دل اس جذبے سے خالی ہو چکا تھا جو جذبہ اسے یہاں لایا تھا۔

دہکتے ہوئے انگارے برف کے ٹکڑے بن گئے تھے۔

"مزمل آفندی!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے مزمل کے سامنے کھڑے ہو کر کہا ۔۔۔ "مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ تم میرے قلعے میں مہمان بن کر آئے اور تمہیں ان بدبختوں نے قید خانے میں بند کر دیا..... تم مجھے قتل کرنے آئے ہو"۔

حسن بن صباح مزمل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہا تھا اور مزمل یوں محسوس کر رہا تھا جیسے یہ شخص اس کی روح میں اتر گیا ہو۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اس نے اتنا ہی محسوس کیا کہ وہ کچھ بولنا چاہتا ہے لیکن نہ دماغ اس کا ساتھ دے رہا ہے نہ زبان میں حرکت ہو رہی ہے۔

حسن بن صباح نے چغہ پہن رکھا تھا جو اس کے ٹخنوں تک لمبا تھا۔ اس کے چغے

محمد نے محاصرے کا بنیادی اصول یہ دیا کہ قلعے پر چڑھائی کرنی ہی نہیں نہ آگے بڑھ کر دروازے توڑنے ہیں بلکہ شہر میں داخل ہونے کی ذرا سی بھی کوشش نہیں کرنی بلکہ یہ کرنا ہے کہ شہر کو محاصرے میں لے کر بیٹھ جانا ہے خواہ یہ محاصرہ سالوں تک لمبا ہو جائے۔

ایک روز مرو سے فوج نکلی۔ اس کا رخ الموت کی طرف تھا۔ کچھ نفری دسم کوہ سے بلوا کر اس میں شامل کی گئی تھی اور کچھ نفری شاہ در سے بھی بلوالی گئی تھی۔ اس فوج کا سپہ سالار امیر نوش گین شیر گیر تھا۔ مؤرخوں نے لکھا ہے کہ یہ سپہ سالار جذبات کے جوش میں آنے والا نہیں تھا بلکہ ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کرنے کا عادی تھا۔ یہ اس کی بنیادی فوجی تربیت تھی اور اس میں دوہری صلاحیت پائی جاتی تھی جو ایک کامیاب سپہ سالار کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

اس فوج نے الموت کو محاصرے میں لے لیا۔ سلطان محمد کو اچھی طرح معلوم تھا کہ محاصرہ صرف تین اطراف ہو سکتا ہے۔ وہ فوج کا حوصلہ قائم رکھنے کے لئے رات کو بھی باہر گھومتا پھرتا اور فوجیوں کے ساتھ باتیں کرتا رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے نمونیہ ہو گیا اور طبیبوں نے بہت کوشش کی اور اسے مرو چلنے کو بھی کہا لیکن اس نے فوج کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

پانچ چھ دن ہی گزرے ہوں گے کہ سلطان محمد کی یہ بیماری اچانک اتنی بڑھ گئی کہ طبیب بھی کچھ نہ کر سکے اور سلطان محمد فوت ہو گیا۔

جب فوج میں یہ خبر پھیلی کہ سلطان کا انتقال ہو گیا ہے تو یکلخت فوج میں بدامنی سی پھیل گئی۔ سپہ سالار امیر نوش گین شیر گیر نے یہ صورت حال دیکھی تو اس نے محاصرہ اٹھا لیا۔ فوج اس حالت میں واپس آئی کہ اس کے ساتھ سلطان محمد کا جنازہ بھی تھا۔

اس طرح اب کے بھی الموت صاف بچ گیا اور حسن بن صباح اس پر قابض رہا۔

○

سلطان سنجر کو شاہ در میں سلطان محمد کے انتقال کی خبر پہنچی تو وہ بھاگم بھاگ مرو پہنچا۔ ادھر دسم کوہ سے سالار اوریزی بھی آ گیا اور جہاں جہاں امیر مقرر تھے، وہ سب آ گئے۔ سب حیران اور پریشان تھے کہ یہ کیا ہوا کہ سلطان کا انتقال ہو گیا اور فوج محاصرہ اٹھا کر واپس آ گئی۔

سالار اوریزی اور ابو نصر احمد حیران تھے کہ ابنِ مسعود، مزمّل آفندی اور بن یونس الموٗت گئے تھے لیکن انہوں نے کچھ بھی نہ کیا اور واپس بھی نہ آئے۔ ایک خیال یہ ظاہر کیا گیا کہ حسن بن صباح نے تینوں کو اپنا جادو چلا کر فدائی بنا لیا ہو گا۔

اب تو وہاں صورتِ حال ایسی بن گئی تھی کہ ایک دو یا چند ایک افراد کا کسی کو خیال ہی نہیں آ رہا تھا۔ اب تو سلطنتِ سلجوقیہ خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ سنجر اب پوری سلطنت کا سلطان ہو گیا تھا۔ اُس کا سب سے بڑا بھائی برکیارق پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ اُس نے حکم جاری کر دیا کہ الموٗت کو ہر قیمت پر فتح کرنا ہے اور پوری کی پوری فوج کو تیار کر کے الموٗت لے جایا جائے اور محاصرے کو طول دینے کی بجائے چٹان پر جا کر شہر پر یلغار کی جائے۔

ایک بار پھر فوج کو تیار کیا جانے لگا۔ اُدھر حسن بن صباح ایک بار پھر پہلے والے جوش و کمال میں آ گیا۔ وہ خود اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ اسے خدا نے کوئی مافوق الفطرت طاقت دے رکھی ہے کہ الموٗت کے محاصرے کے لئے جو بھی آتا ہے، اُس پر ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے کہ وہ اپنی فوج کو واپس بھگا لے جاتا ہے۔

سنجر کچھ زیادہ جوشیلا سلطان تھا اور اس میں دلیری اور بے خوفی سب سے زیادہ تھی۔ اُس پر انتقام کا جذبہ بھی غالب تھا۔ اُس نے ساری سلطنت کی فوج مرو اکٹھی کر لی اور اپنی نگرانی میں اس فوج کو تیار کرنے لگا۔

اس نے زیادہ انتظار نہ کیا۔ ایک سال کے اندر اندر وہ تمام کا تمام لشکر لے کر الموٗت جا پہنچا۔ قیادت اس نے پاس رکھی اور محاصرے کو مکمل کرنے کے پورے انتظامات کر دیئے۔

اُس کا خیمہ فوج سے ذرا دُور الگ تھلگ تھا اور اس خیمے میں اس کا بستر زمین پر بچھایا جاتا تھا۔

محاصرے کو ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ سلطان سنجر ایک صبح جاگا تو اس نے اپنے بستر کے قریب تکیئے کی طرف ایک لمبا خنجر زمین پر گرا ہوا پایا۔ اس کے دستے کے ساتھ ایک کاغذ بندھا ہوا تھا۔ وہ تو دیکھ کر ہی گھبرا گیا۔ خنجر کے دستے سے کاغذ کھول کر پڑھا۔ اس پر فارسی زبان میں حسن بن صباح کی طرف سے مختصر سا پیغام لکھا ہوا تھا جس کا ترجمہ یہ ہے ـــــ "اے سلطان سنجر! ہمیں یہ اذیت دینے سے باز آ جاؤ۔ اگر تمہارا پاسِ خاطر نہ ہوتا تو

یہ خنجر زمین میں گاڑنے کی بجائے تمہارے نرم سینے میں گاڑنا آسان تھا"۔

خنجر اور اس پیغام نے سلطان سنجر کو پسینے میں نہلا دیا۔ وہ کوئی ایسا ڈرپوک آدمی بھی نہ تھا لیکن وہ اس خیال سے ڈرا کہ اس کے اپنے محافظوں میں ایک یا دو فدائی موجود ہیں ورنہ کوئی پرندہ بھی سلطان کے خیمے کے قریب سے نہیں گزر سکتا تھا۔

اُس نے اُسی وقت سالاروں کو بلا کر یہ خنجر اور پیغام دکھایا کہ معلوم کیا جائے کہ فوج میں یا محافظ دستے میں کون باطنی فدائی ہے.... اُس نے یہ حکم دے تو دیا لیکن خود ہی بولا کہ ایسے آدمی کو ڈھونڈ نکالنا ممکن نہیں۔

سالار رخصت ہوئے ہی تھے کہ اُسے اطلاع دی گئی کہ حسن بن صباح کا ایک ایلچی ملنے آیا ہے۔ اُس نے ایلچی کو اپنے خیمے میں بلا لیا۔ ایلچی نے کہا کہ اسے شیخ الجبل نے صلح کی درخواست کے لئے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ اپنی شرائط بتائیں۔

ایک بڑی قدیم کتاب "نامۂ خسرواں" کے باب "حالاتِ حسن بن صباح" میں یہ شرائط تفصیل سے لکھی ہیں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان سنجر کا حوصلہ اس خنجر اور پیغام کو دیکھ کر ایسا مجروح ہوا کہ اس نے ایلچی کو اپنی شرائط بتائیں جو مختصراً" یہ تھیں کہ آئندہ حسن بن صباح کہیں بھی کوئی قلعہ تعمیر نہ کرے نہ کسی چھوٹے یا بڑے قلعے کو سر کرنے کی کوشش کرے۔ دوسری شرط کہ باطنی وہ اسلحہ اپنے پاس نہ رکھیں جو فوج کے استعمال کے لئے ہوتا ہے خصوصاً" منجنیق۔ تیسری شرط یہ تھی کہ حسن بن صباح اپنے فرقے میں نئے مرید شامل نہ کرے اور اپنی تبلیغ بند کر دے۔

ایلچی چلا گیا اور خاصی دیر بعد واپس آ کر اُس نے بتایا کہ شیخ الجبل نے تینوں شرائط تسلیم کر لی ہیں۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ حسن بن صباح کے لئے ان شرائط میں کوئی نقصان نہیں تھا۔ اُسے کوئی قلعہ تعمیر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ باطنیوں نے کم و بیش پچاس قلعوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ فوجی اسلحہ اور منجنیقیں باطنیوں کے کسی کام کی نہیں تھیں۔ انہیں صرف ایک چھری یا خنجر کی ضرورت ہوتی تھی۔

تیسری شرط یہ تھی کہ حسن بن صباح اپنے فرقے کی تبلیغ بند کر دے۔ یہ شرط بھی اُس نے یہ سوچ کر مان لی کہ وہ تو خفیہ طور پر بیعت لیا کرتا تھا۔ کسی کو اس کا پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ اس کی تبلیغ بھی زیرِ زمین یعنی خفیہ طور پر ہوتی تھی۔

سلطان سنجر نے تحریری معاہدے پر اپنی مہر لگائی اور حسن بن صباح نے بھی اپنے

دستخط کئے اور محاصرہ اٹھالیا گیا۔

فدائیوں نے اپنی قتل و غارت کی کارروائیاں پھر شروع کر دیں۔ ایک دو سال ہی گزرے تھے کہ حسن بن صباح انتقال کر گیا۔ وہ اٹھائیس ربیع الثانیہ 518ھ کے روز فوت ہوا تھا۔ اُس وقت اس کی عمر نوّے سال تھی اور اُس نے 35 سال قلعہ الموت میں بیٹھ کر لوگوں کے دلوں پر حکومت کی تھی۔

اُس کی موت اُس کے فرقے کے لئے خاصی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اُس کے جانشین مقرر ہوتے رہے لیکن اس کا فرقہ تین فرقوں میں تقسیم ہوتا چلا گیا اور جوں جوں وقت گزرتا گیا باطنی فدائی کرائے کے قاتل بن گئے، جنہیں کسی بھی مذہب کے لوگ اپنے مخالفین کے قتل کے لئے استعمال کر سکتے تھے۔

ان فدائیوں کو حشیشین کہا جانے لگا کیونکہ یہ حشیش کے بغیر جیسے زندہ ہی نہیں رہ سکتے تھے اور اسی نشے میں قاتلانہ کارروائیاں کرتے تھے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ انہوں نے صلاح الدین ایوبی پر چار مرتبہ قاتلانہ حملے کئے تھے۔ آخر تیمور نے آکر الموت کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اس پُراسرار شہر کا نام ونشان ہی مٹا دیا۔ (ختم شد)